رسائل کے دفینوں سے

اردو ادب کی بازیافت

دوسری جلد

العصر

لکھنؤ

۱۹۱۲-۱۹۱۷ء

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

پیارے لال شاکر

کے

ماہنامہ

العصر

(۱۹۱۳ - ۱۹۱۷ء)

کا انتخاب

خدا بخش لائبریری، پٹنہ

۱۹۸۰ء

العصر کے اس انتخاب میں شامل لکھنے والے اور تصویر والے

اشاریہ

پیش گفتار

پیارے لال شاکر میرٹھی باشندۂ میرٹھ، شاگرد حضرت شوکت میرٹھی، مذہباً عیسائی ... مدتوں منشی نوبت رائے نظر سے دوستی اور رفاقت
ہی اور کلام میں بھی ان سے مشورہ کرتے رہے[1]۔

پیدائش میرٹھ میں ۱۳ مارچ ۱۸۸۰ء کو ہوئی، ۲۰ فروری ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔ قبر پہاڑ گنج دہلی کے مسیحی قبرستان میں ہوئی[2]۔

جوانی اور ادھیڑ عمر میں لکھنؤ میں رہے اور آخر عمر دہلی میں دریا گنج دہلی کے محلہ کلاں محل میں واقع مسیحی بستی میں گزری۔ (اس انتخاب
ں لکھنؤ کے العصری عہد کی ایک تصویر کے ساتھ آخر عمر کی ایک تصویر مسٹر ٹھامس کی عنایت سے شائع کی جا رہی ہے)۔

انگریزی، اُردو، فارسی پر عبور تھا اور سنسکرت اور ہندی سے واقف تھے۔ 'میگھ دوت' کا ترجمہ ان کی یادگار ہے۔ آخر میں مسیحی لٹریچر کی طرف
جہ تھی اور پادری اسٹیورڈ کے ساتھ مدتوں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بہت سے مضامین لکھے، بہت سے ترجمے مسیحی دعاؤں اور نغماتِ حمد کے
بھی کیے۔ ایک رسالہ 'کوکنِ ہند'، بھی نکالا تھا، اور میتھوز لابل کے ساتھ مل کر ایک رسالہ 'زندگی' بھی مدت تک نکالتے رہے[2]۔

اولاد میں ایک بیٹا مہندر کمار تھا، جو بچپن ہی میں گھر سے نکل گیا تھا اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ایک بیٹی پریم لتا ہیں، یہ پونہ
کے مسٹر لے۔ ڈبلو ٹھامس کی بیوی ہیں۔ بڑی بیٹی پربھاوتی کی شادی بمبئی میں ماسٹر علی بخش سے ہوئی تھی۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں؛ خورشید
مینا کماری اور مدھو[2]۔

الہ آباد کا ماہنامہ 'ادیب' اور لکھنؤ کا ماہنامہ 'العصر'، اُردو کے دو چوٹی کے رسالے تھے، جن سے 'شاکر' کا نام وابستہ ہے۔ 'ادیب' انڈین
پریس الہ آباد کا پرچہ تھا۔ یہ جنوری ۱۹۱۰ء میں نکلا اور ساڑھے تین سال چل کر جون ۱۹۱۳ء کا پرچہ نکل کر بند ہو گیا۔ ایک سال چار ماہ نوبت رائے نظر
اس کے ایڈیٹر رہے، ان کے بعد، ایک سال آٹھ ماہ پیارے لال شاکر نے مرتب کیا اور آخری چھ مہینے حسیر عظیم آبادی نے۔

انڈین پریس کی ملازمت چھوڑنے کے بعد شاکر نے 'العصر' کے نام سے اپنا ذاتی پرچہ نکال کر 'ادیب' کی پیاس بجھائی۔ مارچ ۱۹۱۳ء
میں اس کا پہلا شمارہ نکلا اور دسمبر ۱۹۱۷ء میں آخری۔ کاغذ، کتابت اور طباعت کے ساتھ ساتھ مشتملات کا وہ اعلیٰ معیار جو 'ادیب' کو چھوڑ کر کسی
دوسرے اُردو پرچے میں کم ہی مل سکے گا ذاتی پرچہ ہونے کے باوجود 'العصر' نے برقرار رکھا، یہ غیر معمولی بات ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ
مضامین کا تنوع اور خالص ادب کے ساتھ ساتھ سماجی اور سائنسی علوم پر متوازن زور بھی اسی انداز پر قائم رہا۔

یہ **العصر** کے اٹھاون شماروں کا انتخاب ہے، جو پانچ سال (مارچ ۱۳ء تا دسمبر ۱۷ء) پر پھیلا ہوا ہے۔ اس انتخاب میں ۳ تحریریں
'العصر' کے تعارف کے طور پر، ۳۲ مشاہیر کی نادر عکسی تصویریں، ۹ مشاہیر کی تحریریں (ابوالکلام آزاد، عبداللہ عمادی، ندرت میرٹھی، رشید احمد صدیقی،
عبدالماجد دریابادی، شرر، نادر کاکوروی اور اقبال اور حالی)، ۱۴ مشاہیر پر تفصیلی مضامین اور ۶ نظمیں، ۱۵ مضامین اور ۳ نظمیں اُردو زبان کے

۱۔ خمخانۂ جاوید (ج ۴) ۱۹۲۶ء ۲۔ پیارے لال شاکر کے داماد مسٹر لے۔ ڈبلو ٹھامس کے خطوط سے ماخوذ۔

مسائل پر، ۵ تحریریں غالب کے بارے میں، ۴ مضامین اسلام، ہندومت، پارسیت کے تحت علمی وفنی ترقیوں پر، ۳ مضامین علوم وفنون پر، ۳ تاریخ ہند پر، ۵ انشائیے، ۵ مضامین مذہبی عقائد وافکار پر ——— اور ۱۸ مضامین فلسفہ وسائنس اور صنعت وحرفت پر ہیں۔

یہ سب وہ تحریریں اور تصویریں ہیں جو 'العصر' کے سوا شاید کہیں اور نہ ملیں گی۔ **تصاویر میں**: پیارے لال شاکر، مظہر الحق، رابندر ناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو، گھوشال، تعشق، اوج گیاوی، رشید احمد ارشد، فیروز الدین مراد، اور مانی جائسی کی یہ تصاویر کسی دوسری جگہ مشکل ہی سے ملیں گی۔ **ابوالکلام آزاد** کے یہ مضامین کسی دوسری جگہ شائع نہیں ہوئے۔ عبداللہ عمادی، ندرت میرٹھی اور رشید احمد صدیقی کے مضامین اپنے مصنفوں کی طرف نسبت کے سبب اہمیت رکھتے ہیں۔ ایشور چند ودیا ساگر پر اُردو میں اتنا طویل مضمون کسی دوسری جگہ اتفاق ہی سے مل سکے گا۔ عماد الملک، نصیر حسین خیال، حالی، تعشق لکھنوی، بیان یزدانی میرٹھی، مضطر خیرآبادی، نظر لکھنوی اور نولکشور کے وارث پراگ نرائن کے بارے میں معاصرانہ شہادت کی اہمیت رکھنے والی ایسی تحریریں کسی دوسری جگہ کم ملیں گی۔ **اُردو زبان کی ترقی کے مسائل اور اُردو صحافت** کے بارے میں ۱۹۱۴ء کے آس پاس کی صورت حال پر یکجا اتنا مواد خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ مرزا غالب کے بارے میں اس رسالے میں منظوم و منثور جو بھی کام کی چیز نظر آئی انتخاب میں لے لی گئی ہے۔ اقبال کی ایک نظم 'دردِ عشق' کا بھی نقشِ اول 'العصر' میں مل جاتا ہے۔ زبانِ اُردو اور اکابرِ ہندستان کے بارے میں منظومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی نادر کاکوروی اور حالی کی دو نادر نظمیں بھی منتخب کر لی گئی ہیں۔ معاً بعد زبان اور صحتِ زبان کے مسائل پر تبصروں کے ذیل میں یا عام مضمون کے طور سے جو تحریریں قابلِ توجہ نظر آئیں انہیں لیا گیا ہے۔ پھر اسلام، ہندومت اور پارسیت کے بارے میں چند علمی دلچسپی کے حامل مضامین کے ساتھ تحریر، جادہ اور ہندسہ کی تاریخ پر مضامین منتخب کیے گئے ہیں۔ تین مضمون، تاریخ ہند کے بارے میں ہیں۔ پانچ تحریریں انشائیے کے طور سے ہیں۔ پھر حکمت واخلاق (مذہبی افکار) اور اس کے بعد فلسفہ وسائنس پر سب سے بھاری بھرکم حصّہ مضامین ہے، جو صنعت وحرفت پر ختم ہوتا ہے۔ **آخر میں تمام مجلّدات کی فہرست مضامین بھی تمام وکمال دے دی گئی ہے۔**

لکھنے والوں میں کچھ تو معروف نام ہیں: فضل حق آزاد، ابوالکلام آزاد، حالی، شرر، بشیر الدین احمد دہلوی، (نذیر احمد کے لڑکے) جے، آر، رائے (لاہور کے بیرسٹر)، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، سیّد جالب دہلوی، تیرتھ رام فیروزپوری، حکیم حبیب الرحمٰن (ڈھاکہ)، سیّد حسن برنی (صاحب البیرونی)، آغا رفیق بلند شہری، شمس اللہ قادری، ضیاء الدین احمد برنی (عظمت رفتہ، وغیرہ کے مصنف)، سیّد محمد یوسف قیصر بھوپالی، شفق عمادپوری، مانی جائسی، نادر کاکوروی، ندرت میرٹھی، نواب ذوالقدر جنگ، رشید احمد ارشد تھانوی، فیروز الدین مراد (علی گڑھ یونیورسٹی کے طبیعیات کے پروفیسر)، مرزا سلطان احمد (مرزا غلام احمد قادیانی کے بھائی)، موہن لال فہم لکھنوی (ناول نگار) آرسی دت (مشہور مورخ)، رام رچھپال سنگھ شیدا، دہلوی (دلی سے ایک گلدستہ نکالتے تھے)۔

کچھ لکھنے والے وہ ہیں جو عام طور سے تو معروف نہیں، لیکن ادیب، زمانہ، اور العصر میں مستقلاً لکھتے تھے، یعنی عبدالخالق خلیق دہلوی، سیّد محمد فاروق شاہ پوری، قطب الدین خاں راقی، لطافت حسین خاں، محمد ابراہیم خاں تجلّی۔

کچھ نام بالکل غیر معروف ہیں یعنی بیدِ منگرولی، خوشتر منگرولی، عشقی، قمر، ولی الدین چشتی، کیول سنگھ، سیّد ابراہیم محب، محفوظ الحق احسن، یوسف قریشی، ضیا، عباس بدایونی ــ ناظر، سخن دوست، نقّاد سخن اور سیّد القلم غالباً عبدالماجد دریابادی اور نظر لکھنوی کے قلمی نام ہیں۔

اِس انتخاب کی اشاعت اُردو علوم وادبیات کے ارتقا میں ایک بھولی بسری کڑی کی بازیافت ہے۔ ایسی بازیافتوں سے ماضی میں بھراؤ آجاتا ہے اور مستقبل کے لیے اعتماد اور حوصلہ مندی۔

عابد رضا بیدار ●●

فہرست

مشاہیر کے بارے میں

صنعت و حرفت :

فہرست مضامین :

فہرست تصاویر :

غلط نامہ

- ص ۳ کا آخری لفظ 'جو'، ص ۶۶ پر عنوان کے نیچے کا ہندسہ '(ا)' ص ۱۱۷ کا زیریں حصّہ 'اساتذہ اُردو کی فارسی شاعری'، ص ۲۳۴، ۳۹-۲۳۸، ۲۳۹، ۴۶-۲۴۵، ۲۴۹، ۵۲-۲۵۱، ۳۵۳، ۳۶۱، ۴۴۲، ۹۰-۴۹، ۵۳۴ پر پیشانی کے عنوانات دواں —— اور، ص ۴۲۹، ۴۷۱، ۴۹۸، ۵۱۶، ۵۳۵، ۵۵۷ پر رسالہ کا نام 'العصر' نظرانداز/ قلمزد کردیے جائیں۔
- ص ۹۷-۴۹۲ کا مضمون 'سادگی' ادبیات کے سیکشن میں شمار کیا جائے۔ ص ۴۲-۲۴۱ پر دو لخت نظم 'زبانِ اُردو' کو مسلسل سمجھا جائے۔
- ص ۵۸۰ پر 'فہرست مضامین کے بعد 'جلد اوّل' اور ص ۵۸۲ پر 'جلد دوم' بڑھایا جائے۔
- کتابت کے اغلاط : ص ۳۰۹/ سطر ۱۱ 'شہر پور' کی جگہ 'شہر یور' پڑھا جائے۔

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

ادبِ اُردو کا ماہوار باتصویر رسالہ

العصر

مرتبہ

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

جلد اوّل

مارچ لغایت جولائی سنہ ۱۹۱۳ء

جس مین

ساٹھ سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً پچاسی مضامین

پونے تین سو صفحات مین درج ہین

اور

تیس ۳۰ نایاب و نادر تصاویر شامل ہین

مقام اشاعت دفتر "العصر" لکھنؤ

العصر کے قواعد

یہ باتصویر ماہوار رسالہ، جو اُردو علم ادب کی ترقی کا اعلیٰ نمونہ ہے، ہر ماہ کے آخر مین لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ ملک کے نامور اہل قلم، مُسلّم الثبوت اساتذہ، اور بہترین انشاپردازا سے وقیع، دلچسپ، اور مفید بنانے مین سرگرم ہین۔ مضامین کی نوعیت ایسی ہے جو ہر طبقہ کے لیے دلچسپ ہو۔ کوشش کیگئی ہے کہ اس کے مضامین نثر ہون خواہ نظم، تعلیم یافتہ ستورات کے لیے بھی اُسی قدر دلچسپ، مفید اور خوشگوار ثابت ہون جسقدر تعلیم یافتہ اصحاب اور بالغ نظر حضرات کے لیے۔

اسکی ضخامت ۵۶ صفحات ہوتی ہے، اور صفحہ مین دو کالم ہونے کی وجہ سے اسمین معمولی تقطیع کے ایک سو صفحات سے زائد گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہر ماہ التزامًا ایک رنگین اور متعدد عکسی تصاویر دی جاتی ہین، جنمین مشہور مصورونکی صناعی کے نمونے، مشاہیر حضرات کے فوٹو، تاریخی عمارات کے نقشے، اور دیگر دلچسپ واقعات کے مرقعے ہوتے ہین۔ بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعرونکی نظمین بھی حاصل کی جاتی ہین، جو تصویر کی دلکشی کو دوبالا کر دیتی ہین۔ قدردانون کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکے حجم اور تصاویر کی تعداد مین اضافہ ہوتا رہیگا۔

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی مین بھی اعلیٰ درجے کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کے ساتھ تصاویر چھاپ کر اسمین اضافہ کیجاتی ہین جو اسکی مقررہ ضخامت سے علٰحدہ ہوتی ہین۔ بہر نوع قدردانانِ علم ادب کے لیے ایسا پرچہ مہیا کیا گیا ہے جو کمی قیمت کے ساتھ انگریزی میگزینون سے مشابہ ہے۔

اسکی سالانہ قیمت للعہ رمع محصول ہے۔ اِس قیمت مین اِن خصوصیات کے ساتھ کوئی پرچہ نہین مل سکتا، بلکہ اس ارزانی کے ساتھ اسقدر تصاویر بھی کہین دستیاب نہین ہوسکتین۔ نظر برین معزز ناظرین رسالہ سے استدعا ہے کہ اگر یہ خدمات قابل قبول ہون تو علاوہ ذاتی قدردانی کے اسکی توسیع اشاعت مین بھی حتی الامکان امداد فرمائین۔

خریداری کے لیے پیشگی قیمت آنا ضروری ہے۔ نمونہ مفت نہین بھیجا جائے گا بلکہ ۷ روصول ہونے یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا۔ نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھا جائے تاکہ پرچہ پہنچنے مین دقت نہ ہو۔

اِس رسالہ مین مذہبی مباحث اور موجودہ پالٹیکس پر کوئی مضمون نہ چھاپا جائیگا۔ ناتمام مضامین بھی نہین لیے جائینگے۔

جس مضمون کے ساتھ تصویر کی ضرورت ہو اُسکا مضمون نگار حضرات خود بندوبست فرمائین۔

طلبا، اور کم استطاعت اصحاب کے لیے "العصر" کا ایک سستا ایڈیشن بھی شائع ہوتا ہے۔ اسمین صرف ایک تصویر ہوتی ہے اور کاغذ ایوری فنش کے بجائے دیسی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکی سالانہ قیمت سے رمع محصول ہے۔

جملہ خط وکتابت پتہ ذیل پر ہونی چاہیئے:

پیارے لال شاکر (میرٹھی) مالک و ایڈیٹر رسالہ العصر۔ لکھنؤ

اڈیٹوریل

کچھ اپنی نسبت

توکل علی اللہ العصر کا پہلا نمبر ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ مضامین کے لحاظ سے پبلک خواہ کچھ ہی رائے قائم کرے، اُسکو اختیار ہے، مگر ہم درخواست کرتے ہین کہ سب سے پہلے اُس تمہیدی مضمون کو جسمین کسی حد تک توضیح مقاصد کی گئی ہے، ملاحظہ فرما لیا جائے کہ العصر کے ذریعہ سے کن خدمات کی انجام دہی کا ارادہ کیا گیا ہے۔

یہ بات بے تامل یقین کر لینی چاہیے کہ مین معمولی استعداد کا آدمی ہون۔ نہ تو مجھے زباندانی کا غرہ ہے، نہ تجربہ کاری کا ادعا۔ ہان، چونکہ گزشتہ دس بارہ سال سے اخباری دنیا سے مجھے خاص تعلق رہا ہے اسلیے اب اسی کوچہ کی ہوا سر مین سما گئی ہے، اور اس کا شوق بدرجۂ اتم دامنگیر ہو گیا ہے، اور اسی وجہ سے خیال ہے کہ ملک کے علم دوست حضرات کی بدولت شاید کسی قابل ہو جاؤن۔

ملک مین بہت سے موقت الشیوع رسالے شائع ہوئے اور ہوتے رہین۔ مگر باستثناء چند، انکا اجرا زیادہ تر تجارتی اغراض سے ہوا ہے۔ یہ ایک بہت بھاری نقص ہے جو اخبارات و رسائل کے حق مین زہر قاتل کا اثر رکھتا ہے کیونکہ تجارتی پرچون کے اڈیٹر عموماً بدلتے رہتے ہین، اور اڈیٹرون کی تبدیلی کے ساتھ پرچون کا مقررہ معیار یا امتیاز خصوصی قائم نہین رہتا، ع ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

اس جگہ اس امر کا اظہار کر دینا نامناسب نہو گا کہ العصر میرا ذاتی پرچہ ہے یعنی صرف اڈیٹر ہی نہین بلکہ مین ہی اس کا پروپرائٹر بھی ہون۔ پس اگر ملک نے اس کی قدر کی تو کچھ شک نہین کہ کم از کم میری حیات مستعار تک العصر جاری رہیگا انشاء اللہ تعالے العصر کو مین نے اپنی معاش کا ذریعہ نہین بنایا ہے، بلکہ اسکو مین محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے خالص علمی و ادبی خدمات کی غرض سے شائع کرتا ہون۔ اِس سے جو کچھ آمدنی ہو گی، وہ اسی کی بہتری مین صرف ہو گی۔ ہان اُس روز کا نہایت بیتابی کے ساتھ انتظار کرتا ہون کہ مین اپنا تمام وقت اسکو زیادہ بہتر اور کارآمد بنانے کی سعی مین صرف کر سکون۔

اب اِس مختصر نوٹ کو ختم کر کے مُلکی اخبارون، رسالون، اور اہل قلم کی سچی رایون کا انتظار کرتا ہون، اور گوش برآواز ہون۔ کاش!

ندائین آنے لگین انّ سعیکم مشکور

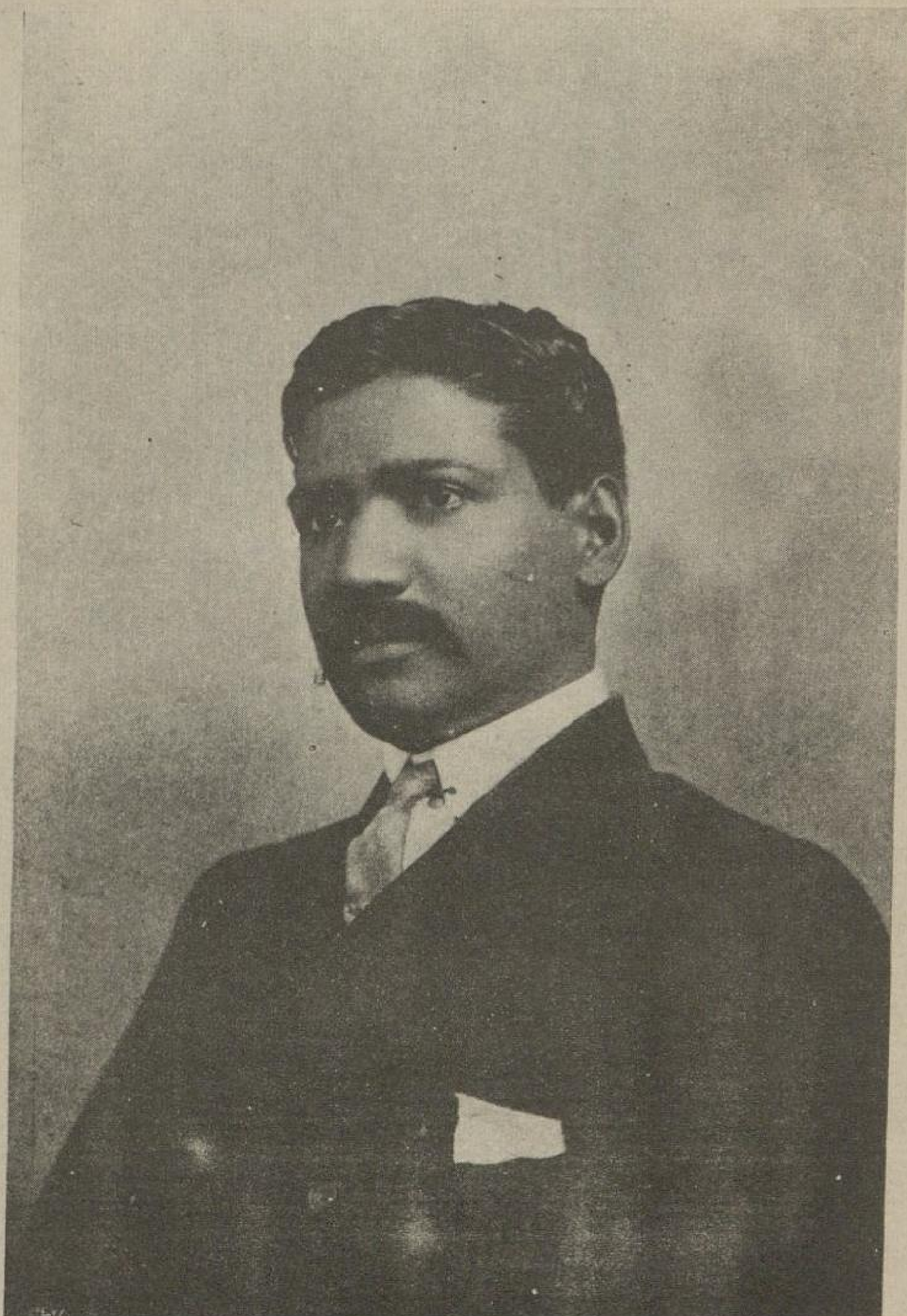
ایک گزارش

ہم سمجھتے ہین کہ ہمارے معاونین العصر کو اُس حالت سے گرا ہوا نہ پائین گے جسکا اشتہار مین وعدہ کیا گیا تھا۔ تاہم ترقی کی ابھی بہت گنجایش ہے، اور ہماری بھی یہ کوشش رہیگی کہ ہر نمبر گزشتہ نمبر سے بدرجہا بہتر ہو۔

تصاویر کے متعلق چند باتین خاص طور پر قابل گزارش ہین۔ ہمین گندہ نما جو فروشی منظور نہین، اس لیے ہم پہلے ہی اس بات کو جتا دینا مناسب و ضروری خیال کرتے ہین کہ العصر کی تصاویر کی کوئی خاص تعداد مقرر نہین کی گئی ہے۔ اس نمبر مین ایک رنگین اور چھ سادہ تصویرین دیگئی ہین۔ ممکن ہے کہ آئندہ نمبرون مین اس سے زیادہ تصویرین ہون، اور اسی طرح اس تعداد سے کم تصویرین ہونیکا بھی امکان ہے۔ لیکن اس سے یہ نہین سمجھنا چاہیے کہ ہم مصارف سے گھبراتے ہین۔ ہرگز نہین۔ پرچے کے مصارف کا جو بجٹ تیار کیا گیا ہے، اُسمین کسی طرح تخفیف نہین ہو سکتی۔ اگر کسی نمبر مین تصویرون کی تعداد کم ہو گی تو ہم اُس کمی کو اُس نمبر کے صفحات کی تعداد بڑھا کر پورا کر دین گے۔ ہماری رائے مین خوش معاملگی کا اقتضا بھی یہی ہے!

العصر کے متعلق ہم نے ہر قسم کی خوش سلیقگی کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ صورت و سیرت دونون کے لحاظ سے العصر بہترین رسالہ ثابت ہو۔ اگر ہمارے معاونین کو کوئی نقص محسوس ہو، تو وہ صفائی کے ساتھ ہمین تحریر کر دین۔ ہمین اُن کے مشورون سے فائدہ اُٹھانے مین ہرگز عار نہو گا۔

ہمارے ارادے بہت وسیع ہین! اور یہ ظاہر ہی ہے کہ ایسے مہتم بالشان مقاصد کی کامیابی کُل ابنائے وطن اور حامیانِ اُردو کی دستگیری پر منحصر ہے۔ جو





مسٹر مظہر الحق بیرسٹر ایٹ لا - بانکی پور
جو بلوہ کانپور کے مقدمہ میں ماخوذین کی طرف سے وکالت کر رہے ہیں



MR. MOHAMED 'ALI, B.A., (STANDING)

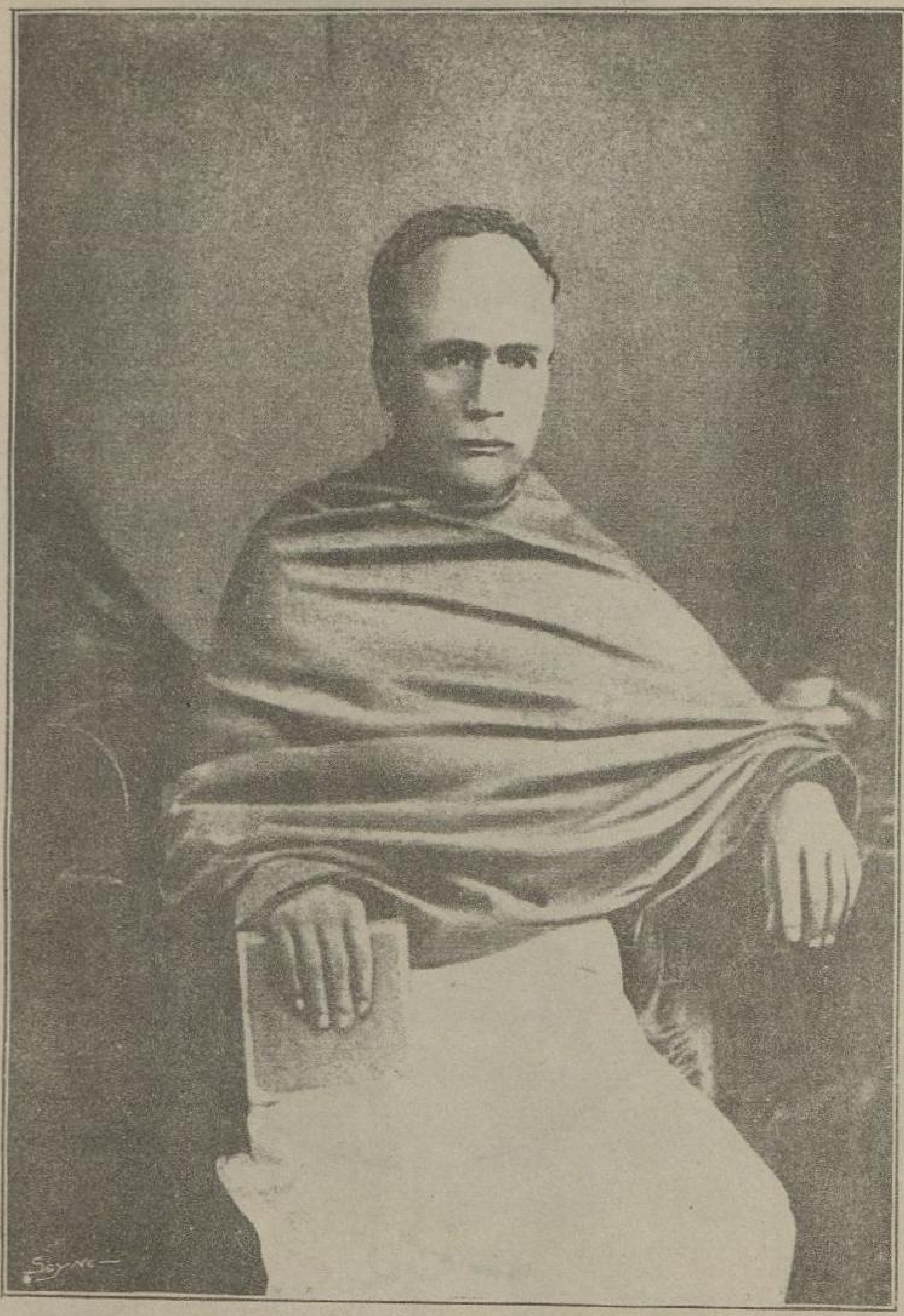
AND

DR. MUKHTAR AHMED ANSARY.

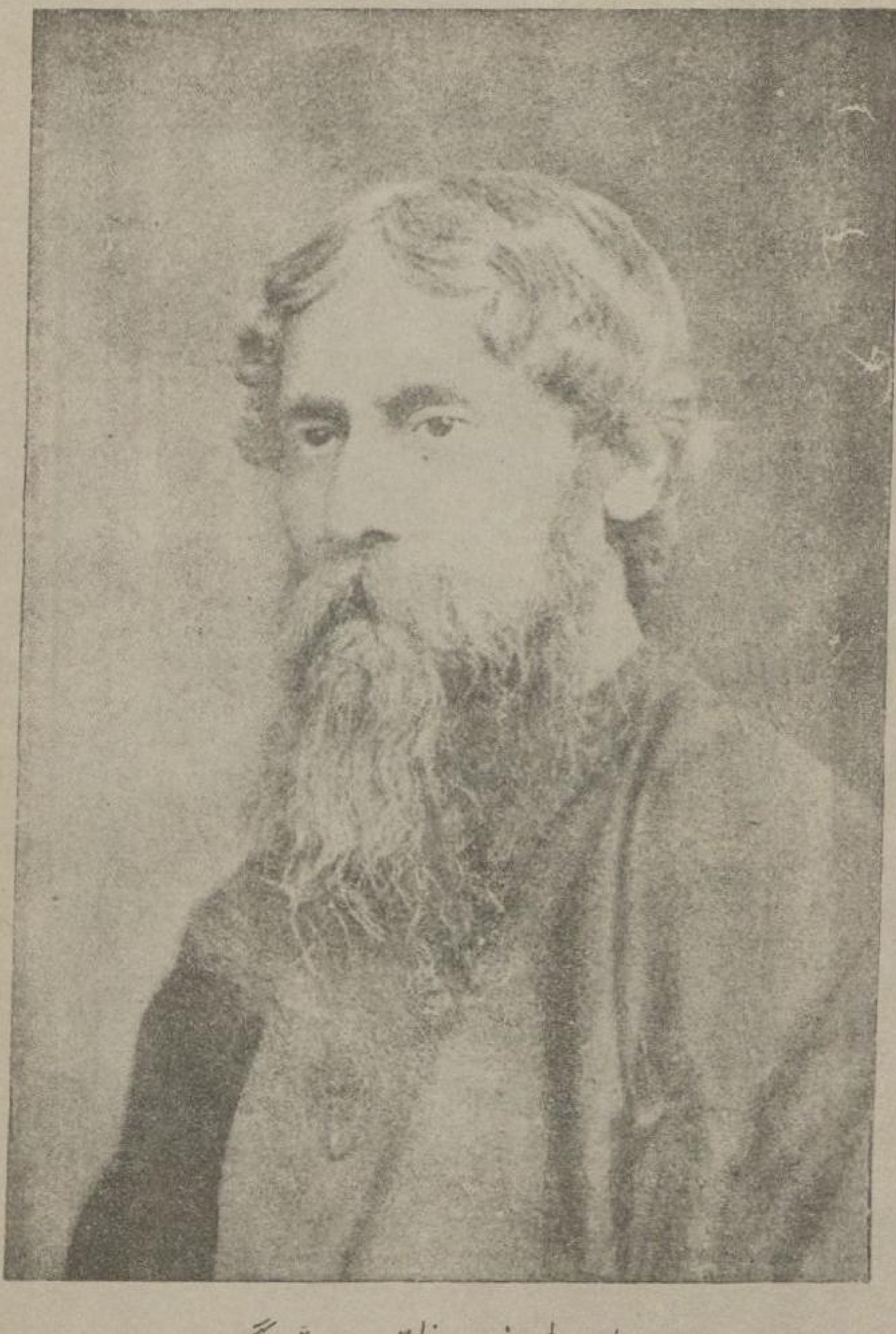


مسز اینی بیسنٹ

(اپنے اخبار "نیو انڈیا" کے مقدمہ میں آپ خاص کوشش
فرما رہی ہیں، اور اگر اپنی کوششوں میں کامیاب
ہوگئیں تو کچھہ شک نہیں کہ اخبارات
ہند کو بہت مفاد حاصل ہونگے)



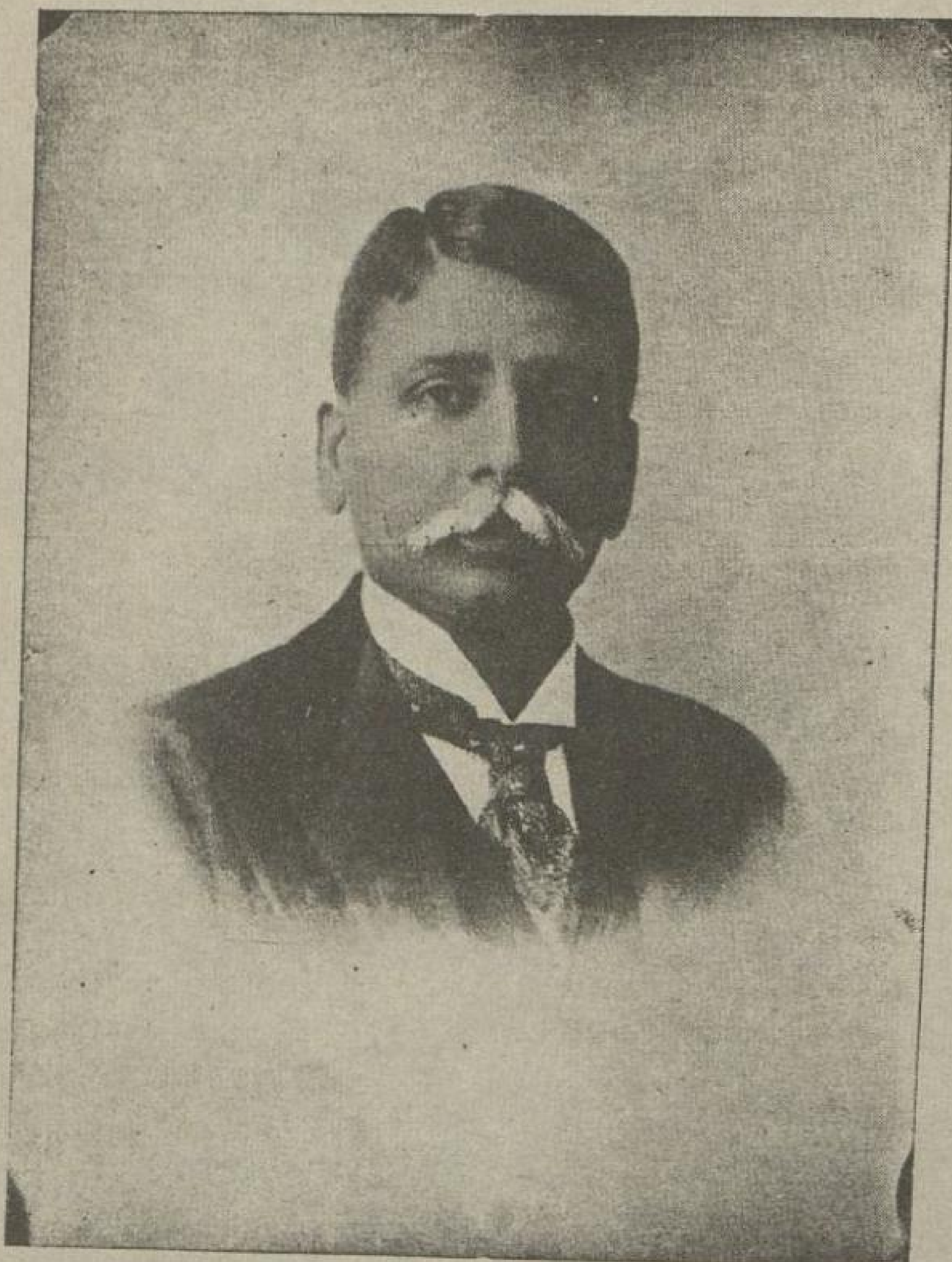
پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر



بابو را بندر ناتهہ ٹیگور



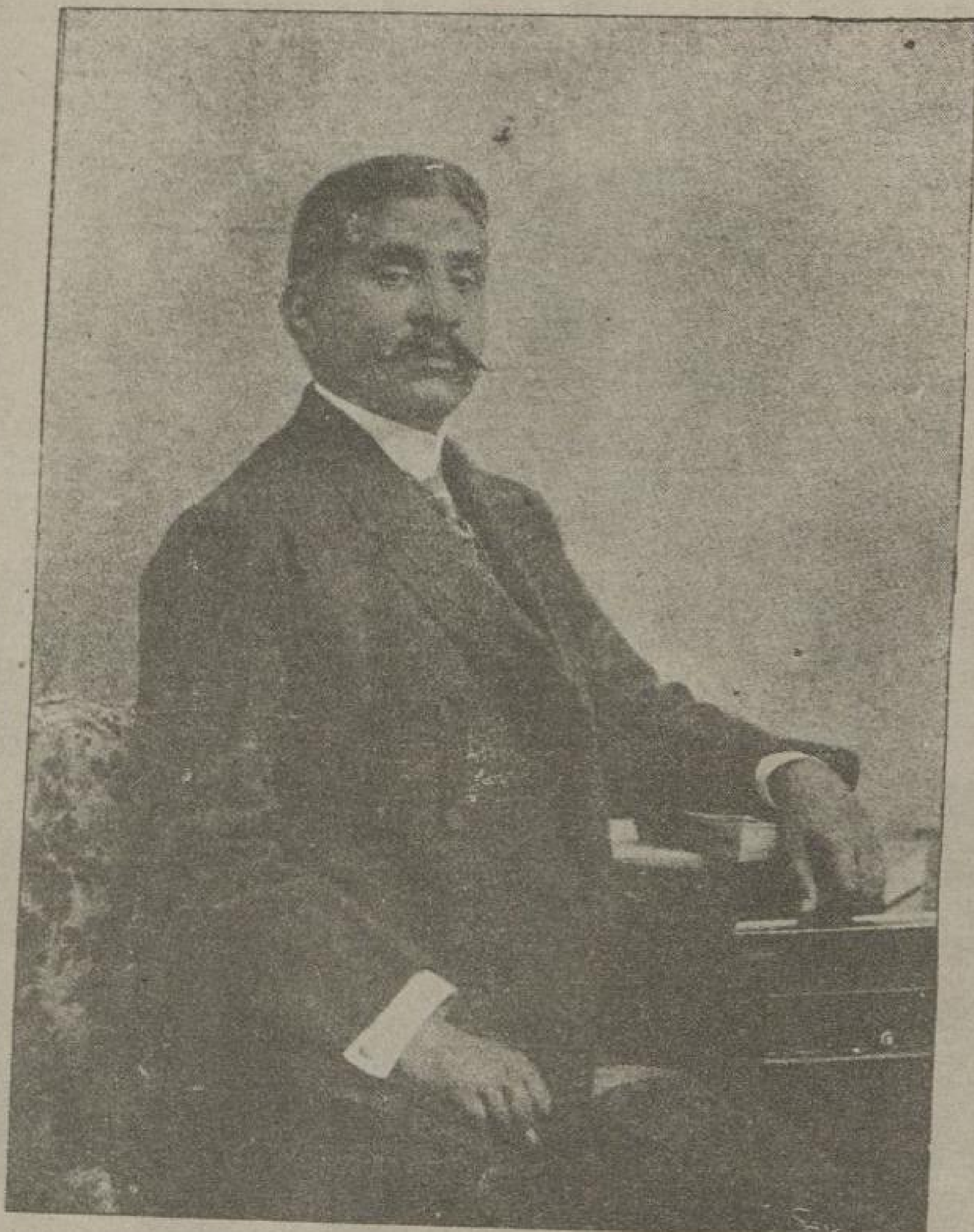
مسز سروجنی نایڈو



رائٹ آنریبل سید امیر علی، ایم-اے-ایل-ایل-ڈی-سی-آئی-ای
(حال مین آپ مسلم لیگ (لندن) کی صدارت سے مستعفي هوے هين

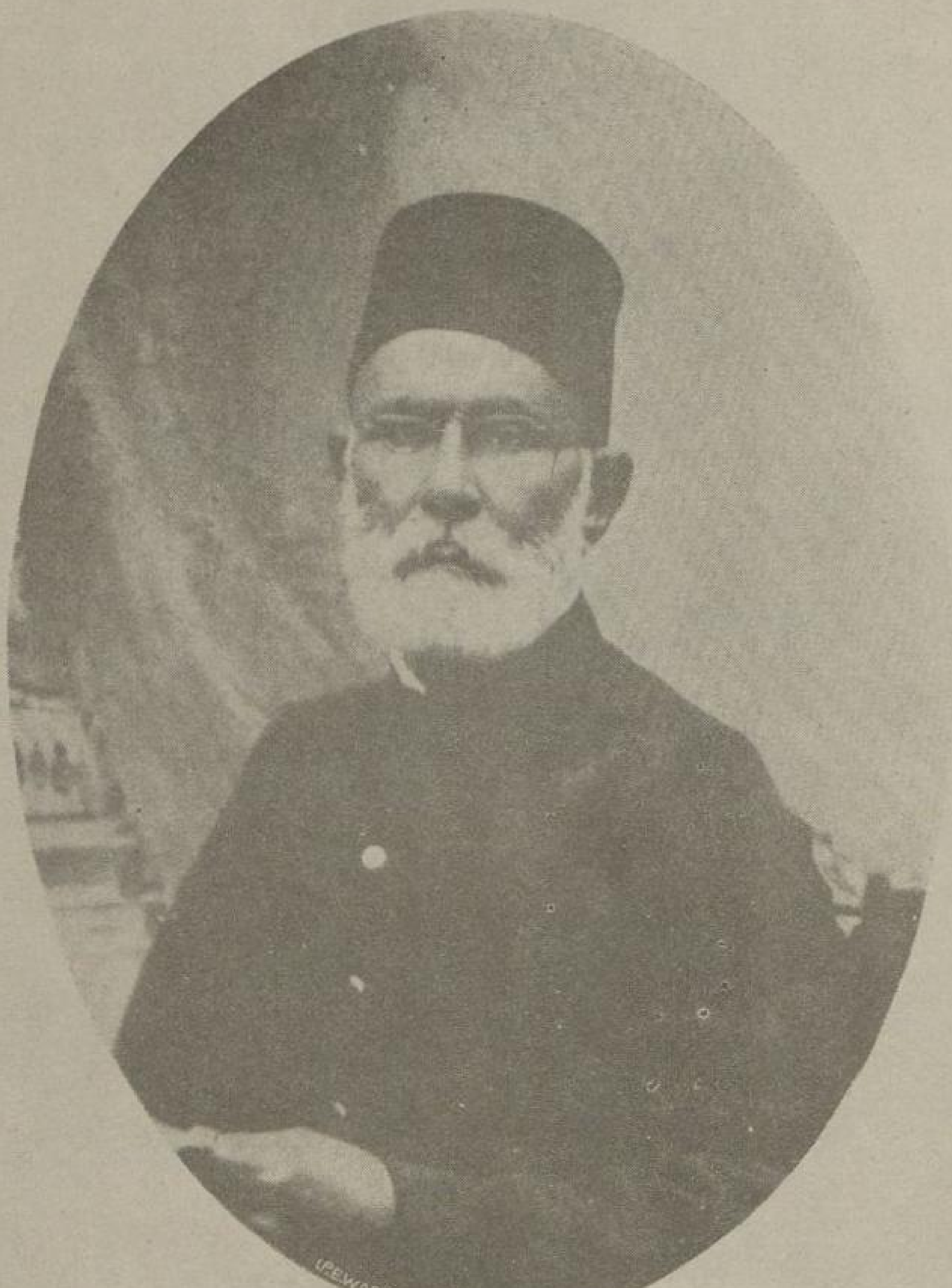


THE HON'BLE NAWAB 'IMADUL-MULK BAHADUR MOULVI
SYED HUSAIN BILGRAMI, B.A., C.S.I.,
CHIEF ADVISER TO H. E. THE PRIME MINISTER OF HYDERABAD DECCAN.



آنریبل مسٹر ایس سنہا

(اڈیٹر رسالہ "ہندوستان ریویو" الہ آباد)



SHAMSUL 'ULAMA MOULANA ALTAF HUSAIN, "HALI."



سید محمد مرتضیٰ "بیان" و "یزدانی" (میرٹھی) مرحوم

Alhilal Press



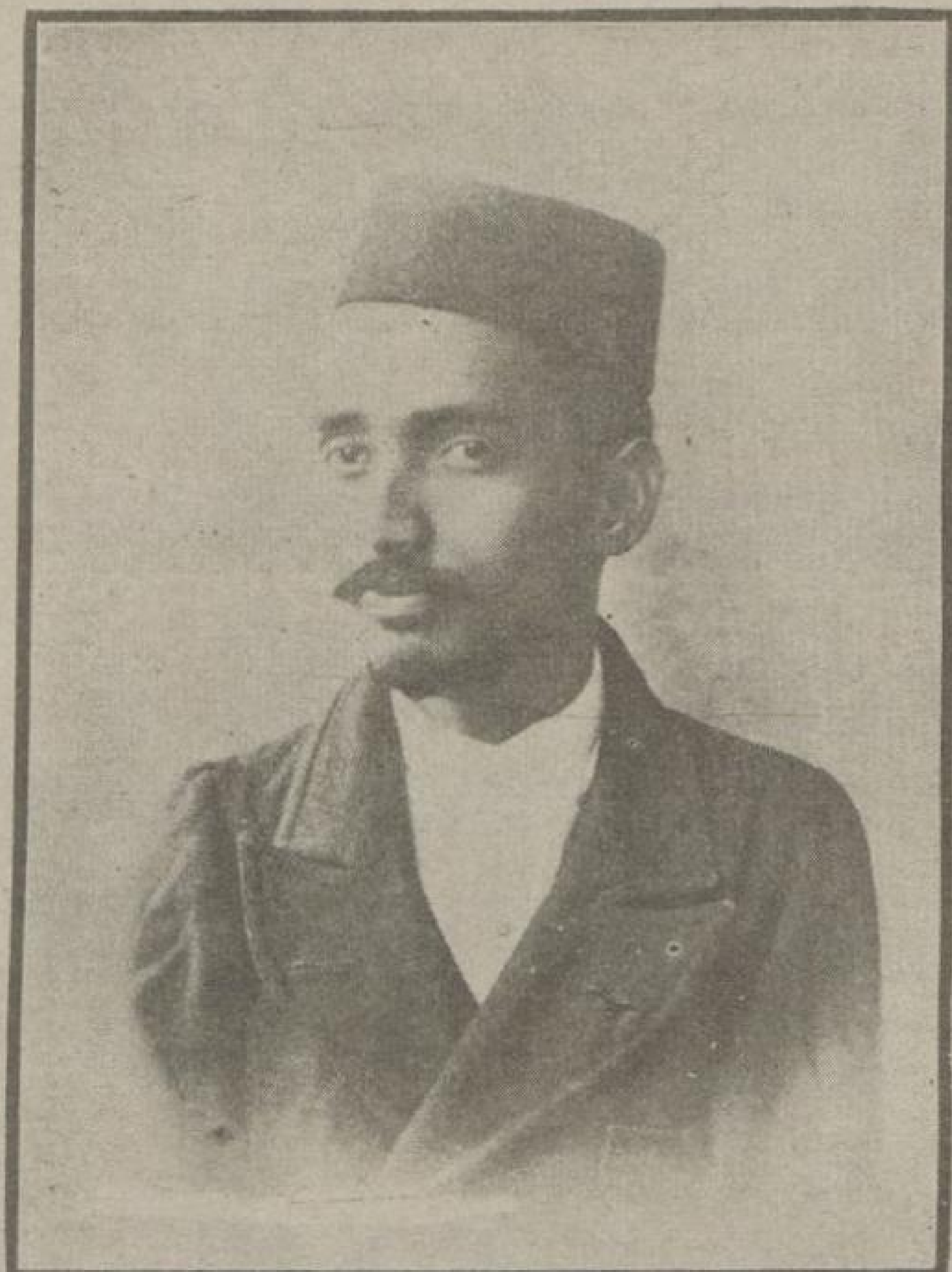
میر تعشق لکھنوی (مرحوم)



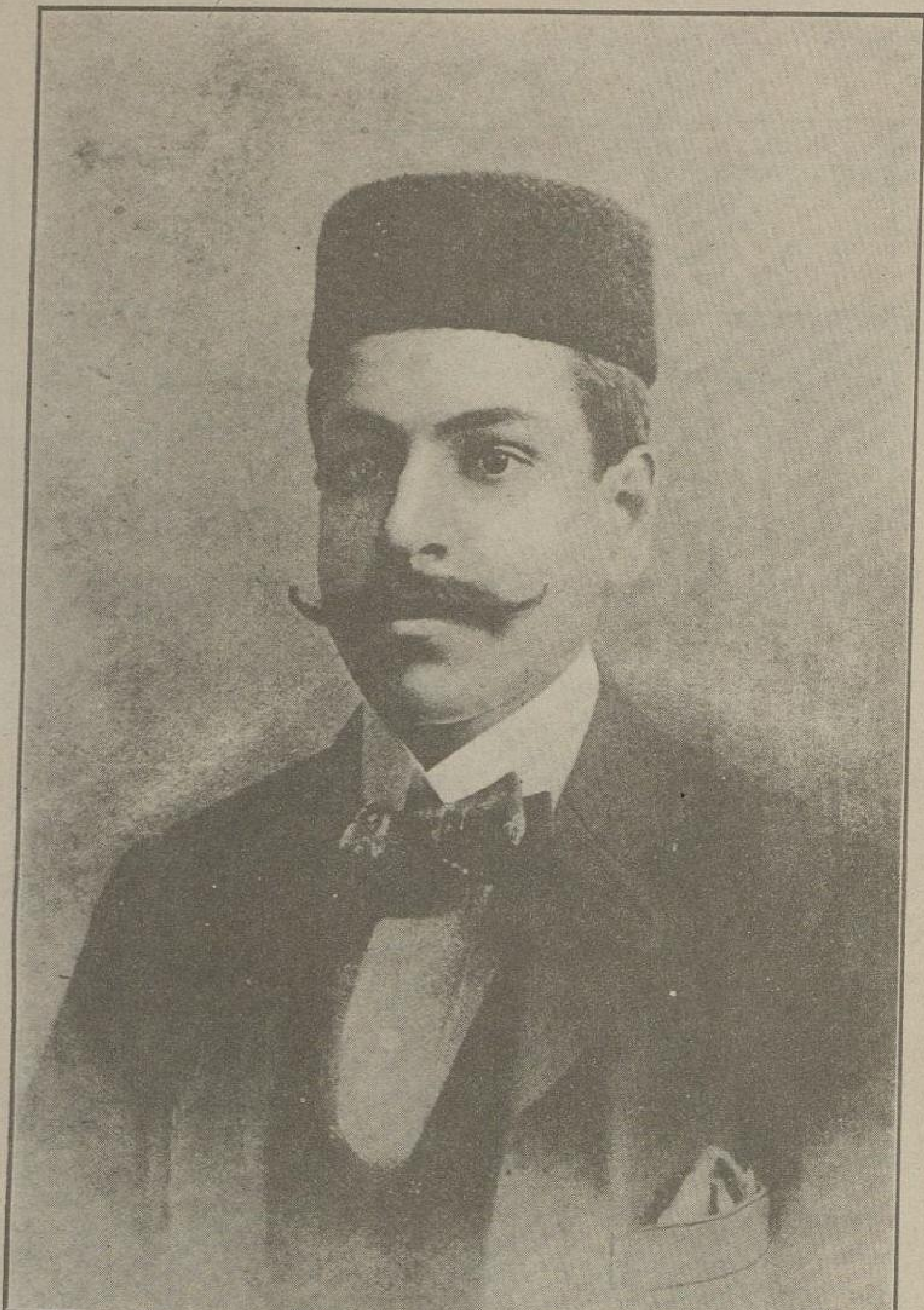
افتخار الشعرا خان بہادر اعتبار الملک مولوی سید افتخار حسین صاحب مضطر اقتدار جنگ



سید الشعراء حضرت صمیم (بلند شہری)



حافظ محمد یعقوب صاحب اوج (گیاوی)

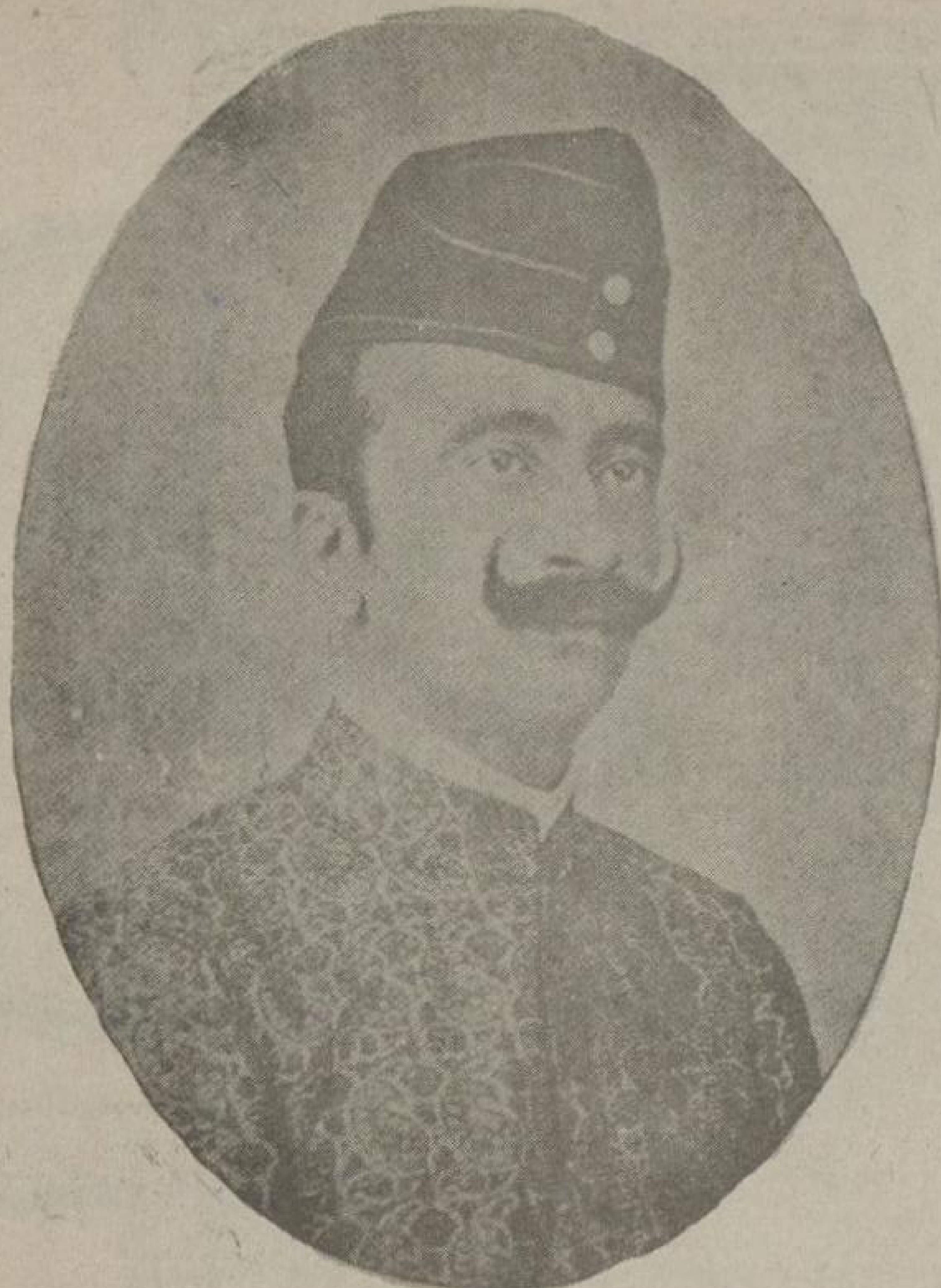


لالہ سری رام صاحب ایم اے (دہلوی)

مولف ''خمخانۂ جاوید''



نواب ذوالقدر جنگ بہادر، ایم اے، بیرسٹر ایٹ لا —
(صدر مجلس استقبالی اُردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ سنہ ۱۹۱۶ ع)

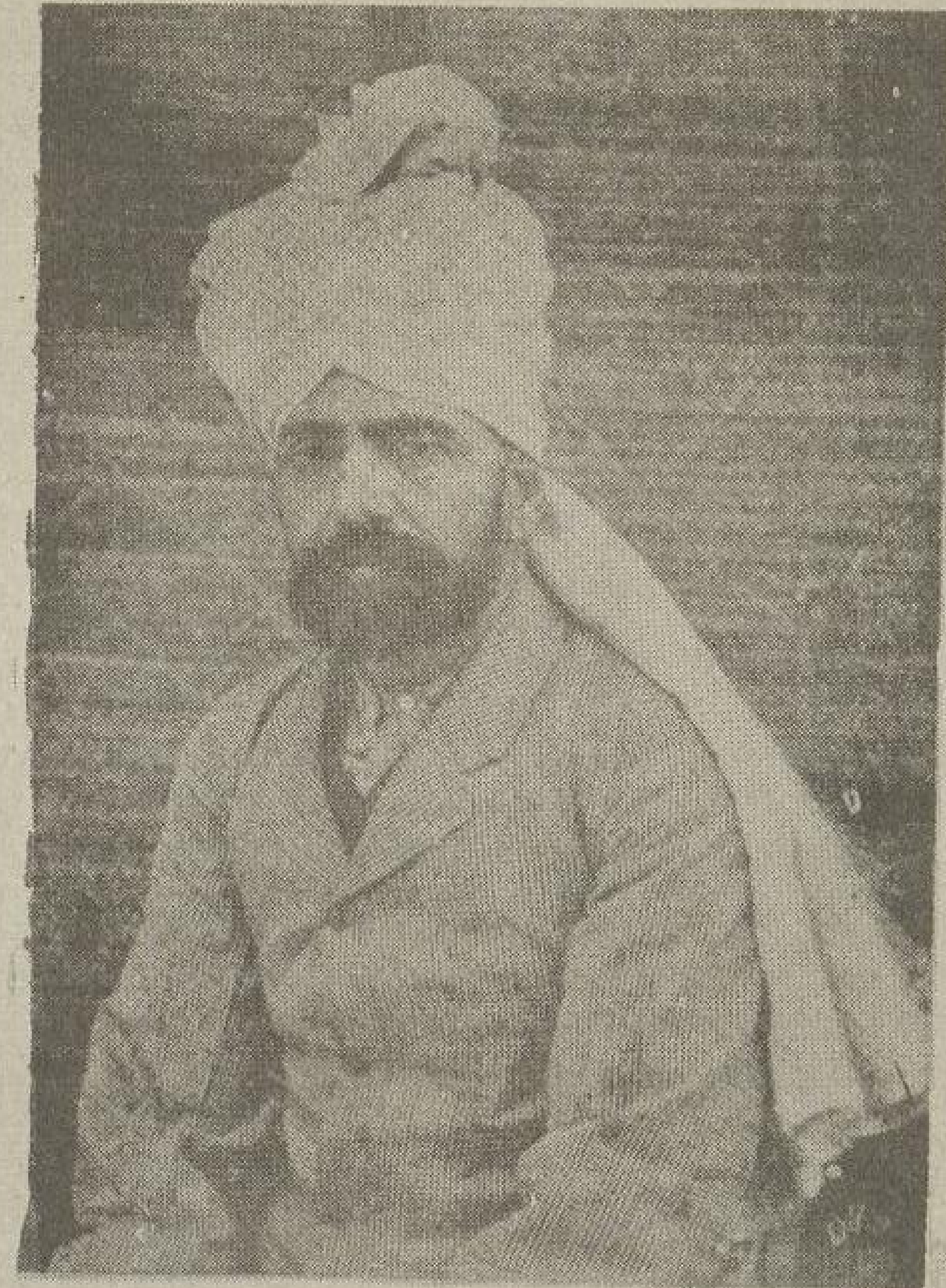


نواب نصیر حسین خان صاحب "خیال"
(پریسیڈنٹ اُردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ سنہ ۱۹۱۶ ع)



M. MOHD. HUSAIN SAHIB.

محوی



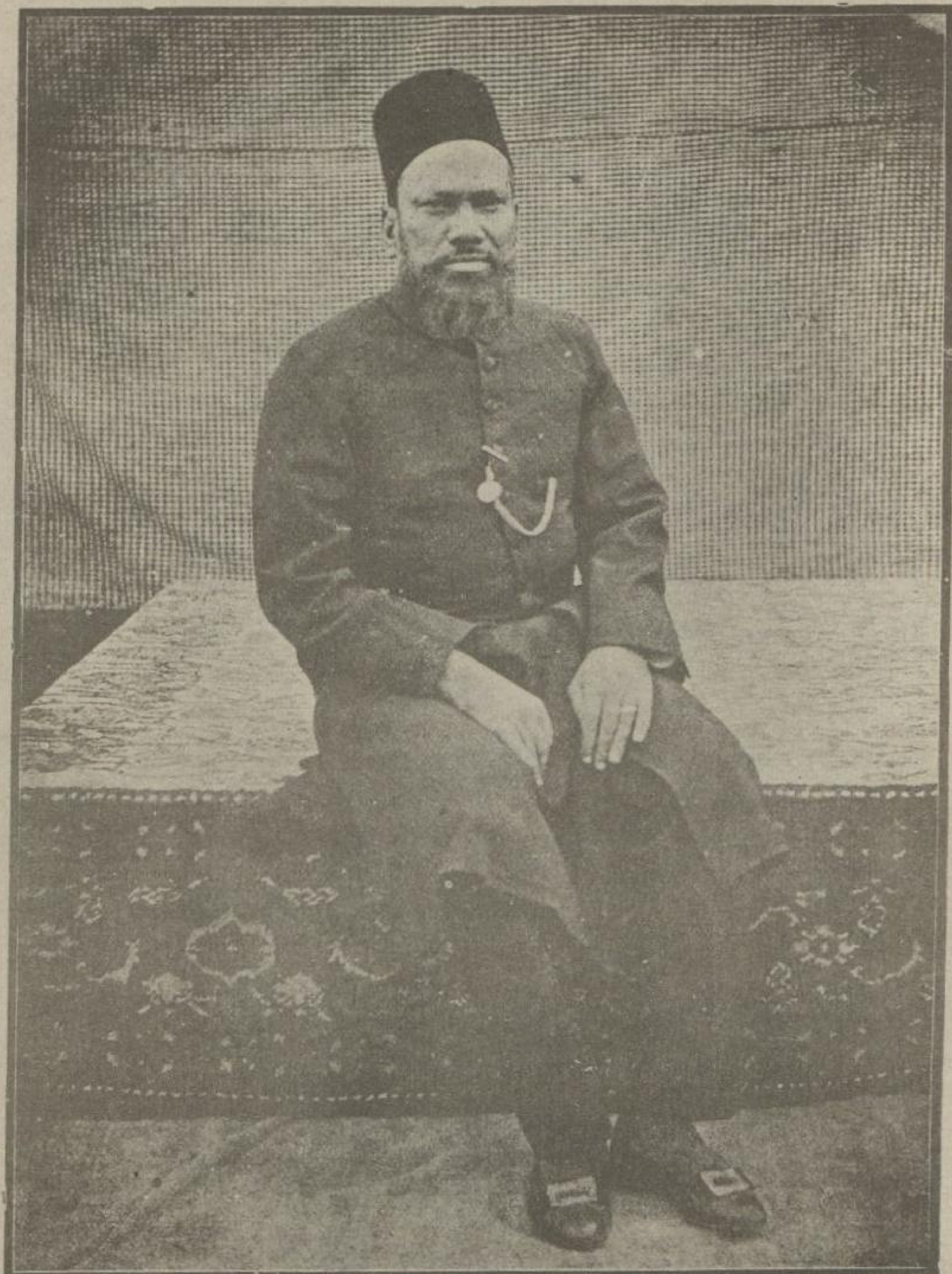
KHAN BAHADUR MIRZA SULTAN AHMAD SAHIB.

EXTRA ASST. COMMISSIONER, PANJAB.

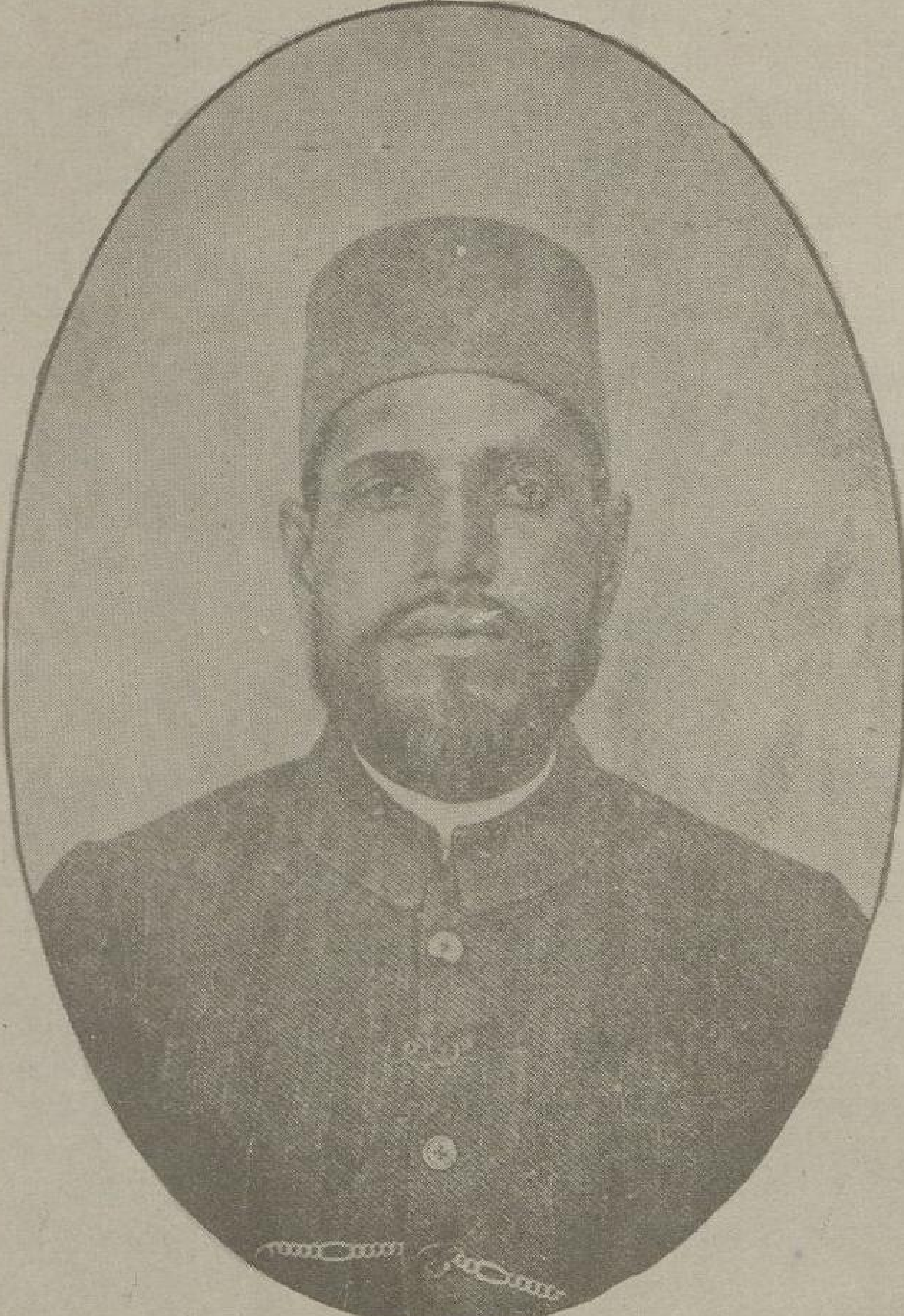


M. RASHID AHMAD SAHIB.

ارشد



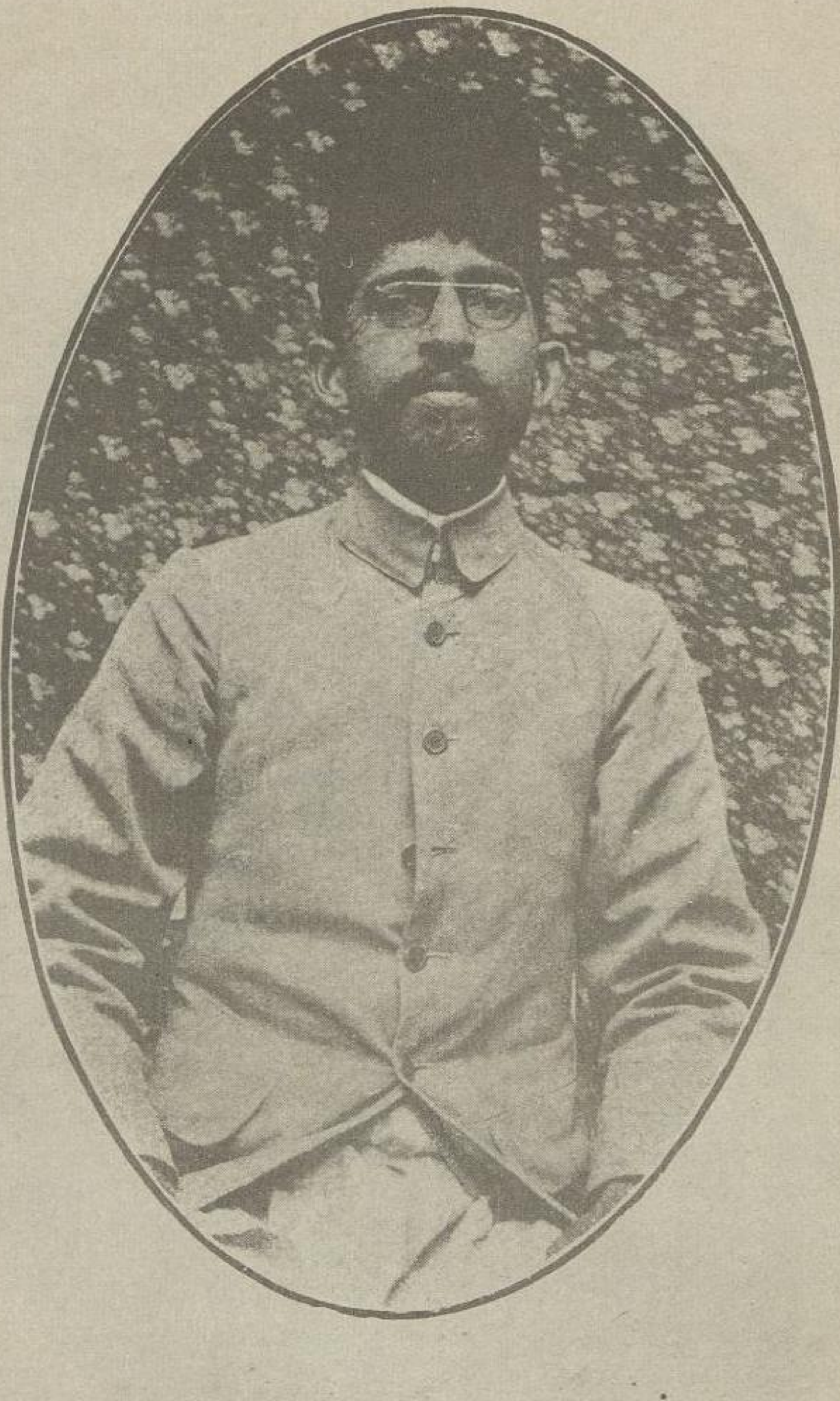
مولوی بشیرالدین احمد صاحب دہلوی



مولوي محمد عبدالرزاق صاحب
مؤلف البرامکه و نظام الملک طوسی

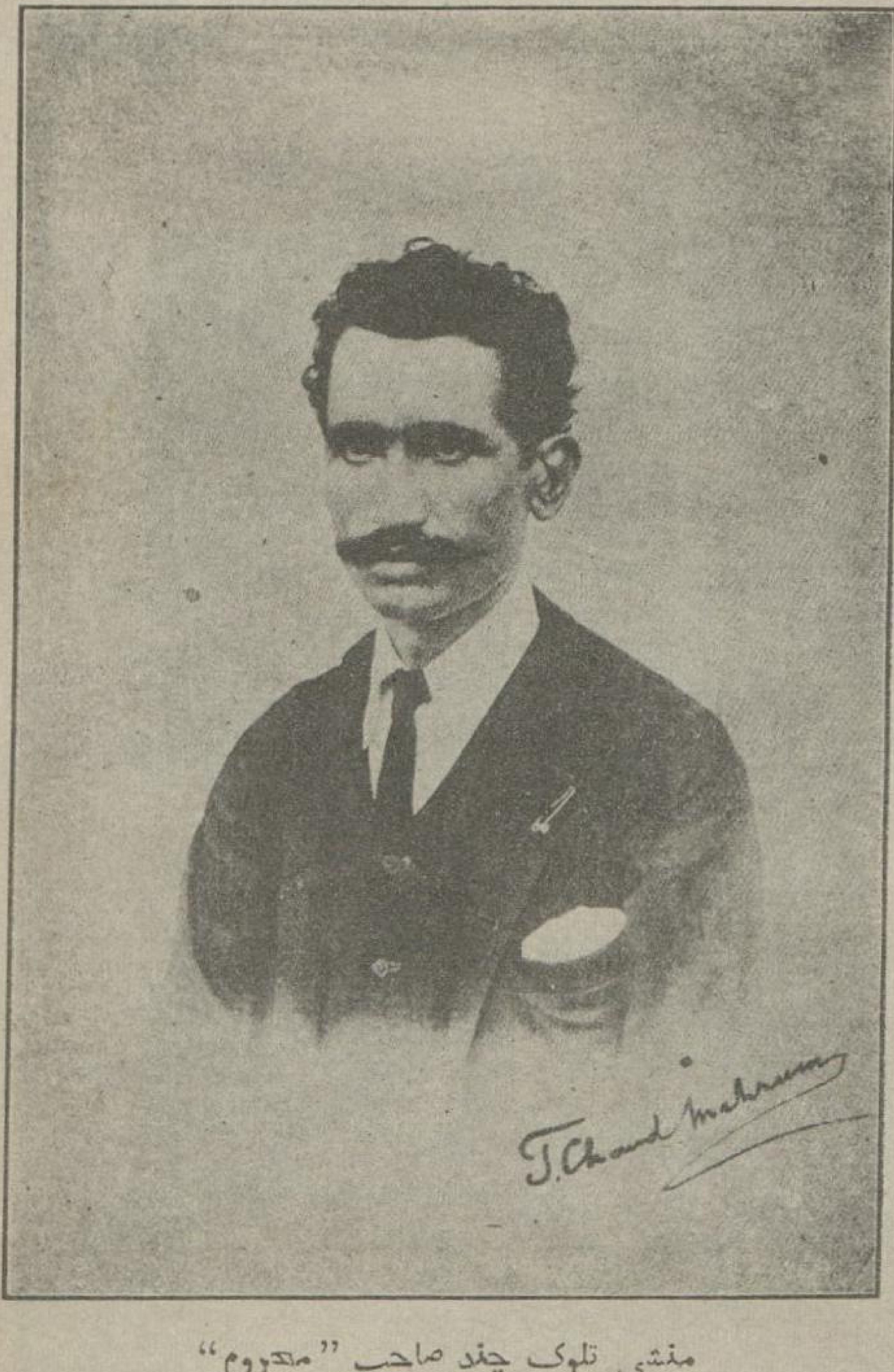


قاري محمد سرفراز حسين صاحب عزمي دهلوي (عليگ)
سياح جاپان و انگلستان
[مصنف شاهد رعنا-سعيد-سعادت-درد دل-قطرات اشک-دل کا عجائب خانه-اسلام بانئ قاری]



شیخ فیروزالدین مُراد صاحب ایم ایس سی بی اے

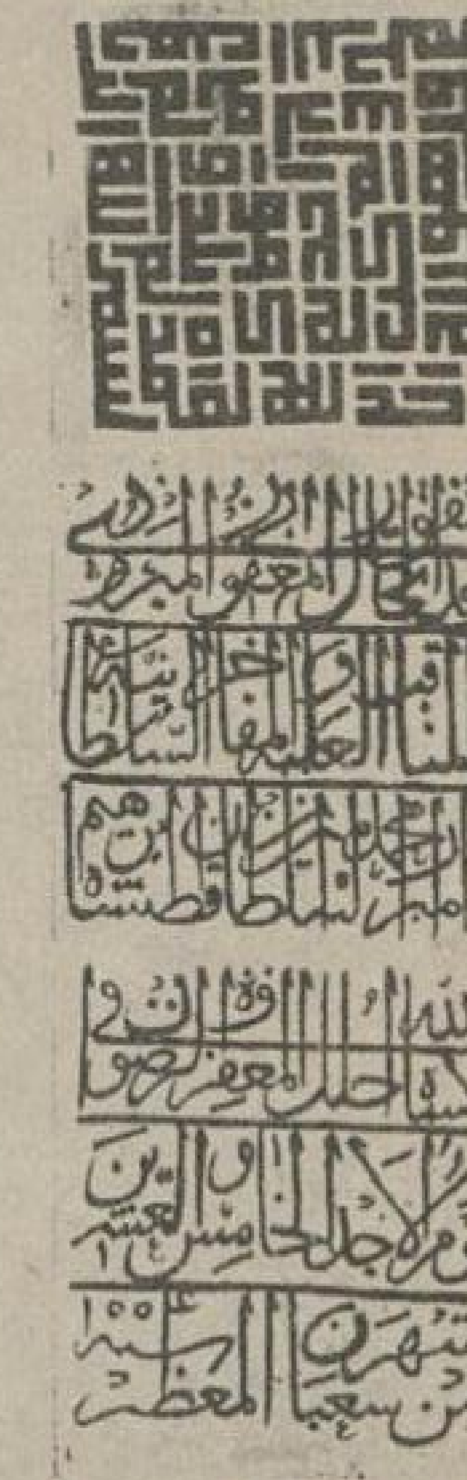
SHEIK FIROZ UD DIN MURAD, B.A., M. Sc.



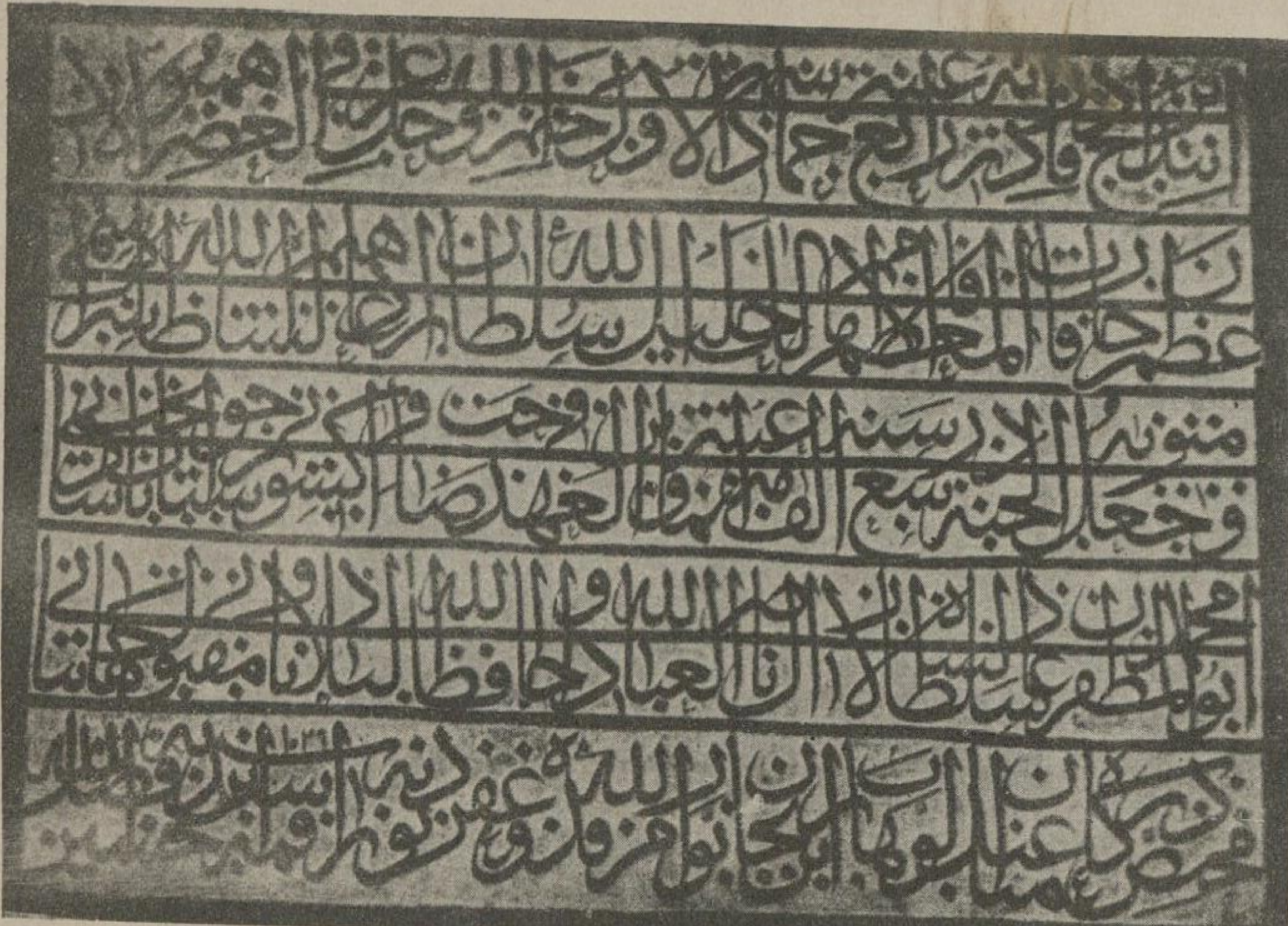
منشی تلوک چند صاحب "محروم"



مسٹر سید کلب احمد صاحب مانی (جائسی)



کتبۂ مقبرۂ مرزا محمد امیر
(فرزند سلطان ابراھیم قلی قطب شاہ)
واقع گولکنڈہ
(بخط کوفی و طغرا)



کتبۂ برج قادریہ، واقع رایچور (دکن)



نقل طغرا جامع مسجد، بیرون قلعہ، واقع رایچور (دکن)



طغرا ''یا اللہ محمد علی ولی اللہ'' بر قبر بیرون قلعہ گولکنڈہ (دکن)

(جانب غرب واقع لودھاواڑی اندرون رمنہ)

الاخلاق

تمہید

مشرق کے علوم و فنون، صنائع و تجارت، معاشرت و سیاست، مختصراً یہ کہ تمام مظاہرِ زندگی اصلاح طلب ہین۔ اس لیے یہ صحیح ہی کہ مشرق کو کسی اصلاح سے استغنا نہین، لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار صداقت ہی کہ قوم مین مذہبی، سیاسی اجتماعی، وغیرہ گونہ گون اصلاحات کا آغاز اُس وقت تک کامیاب نہین ہوتا جب تک کہ اسکے افراد مین ایک ایسا گروہ نہ موجود ہو جس مین طول تفکر، حُسنِ تمیز، اصابتِ رائے اور جراُتِ اخلاقی ہو۔

یہ گروہ عموماً نوجوانون مین سے پیدا ہوتا ہی۔ کیونکہ اُن مین بڑھاپے کی عافیت اندیشیون کے بدلے جوانی کی ولولہ خیزیان ہوتی ہین، جو اُن کو حریت، بیستی، بلندی اور حق گوئی کی طرف بڑھاتی ہین۔ اس لیے ایک مصلح کا فرضِ اولین نوجوانانِ قوم کی اخلاقی اور دماغی پرداخت ہی۔

تعریف

جس طرح کہ سنگِ چقماق مین آگ پوشیدہ ہی، اسی طرح انسان مین گوناگون صدہا قوی پوشیدہ ہین۔ ان قویٰ سے جب ابتدً کام لیا جاتا ہی تو کسی قدر تعمد و تکلف کی ضرورت ہوتی ہی، لیکن جب عرصہ تک برابر سلسلۂ استعمال جاری رہتا ہی، تو پھر ان کی یہ حالت ہو جاتی ہی کہ ان کے استعمال کے لیے قصد و ارادہ کی ضرورت نہین رہتی بلکہ حسب موقع وہ از خود کار فرما ہونے لگتے ہین اور اگر بہت زیادہ عرصہ تک اُن کا استعمال جاری رہتا ہی، تو وہ اِس طرح جزوِ زندگی بنجاتے ہین، کہ اُن سے علیحدگی کے لئے نہ صرف ارادہ کی ضرورت ہوتی ہی بلکہ تکلیف ہوتی ہی جب انسان کی محنت

کے استعمال کا اس درجہ تک خوگر ہو جاتا ہو تو یہ خوگری عادت یا خلق کہلاتی ہے۔

اخلاق کی تشکل پذیری

تم نے بارہا دیکھا ہوگا ایک آہنی تار بالکل سیدھا تھا، مگر جب کسی شکل پر لپیٹا گیا تو اُسکی بھی وہی شکل ہوگئی، اور اگر زیادہ عرصہ تک لپٹا رہا تو وہ شکل تار میں اُس درجہ راسخ ہوگئی کہ اس کا سیدھا کرنا دشوار ہوگیا۔ قوی اخلاقی کی بھی بعینہ یہی حالت ہو۔ وہ ابتدء بے تشکل ہوتے ہیں لیکن جب عرصہ تک ایک مخصوص اسلوب پر استعمال کیئے جاتے ہیں تو وہ ایک خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اقسام اخلاق

گو ہماری زبان میں اخلاق کا استعمال اکثر اخلاقِ حسنہ بلکہ اخلاق حسنہ کی ایک خاص صنف یعنی خاطر مدارات کے معنی میں ہوتا ہو، چنانچہ خوش اخلاق اُس شخص کو کہتے ہیں، جو ملاقات میں اعتنا و التفات کو کام فرماتا ہو، مگر واقعہ یہ ہو کہ اخلاق کا دائرۂ معانی اس قدر تنگ نہیں۔ اخلاق مجموعۂ عادات کا نام ہو۔ اگر عادات اچھے ہیں تو وہ شخص خوش اخلاق ہو اور اگر بُرے ہیں تو بداخلاق ہو۔

میں اسوقت اخلاق کی پیش پا افتادہ تقسیم حمیدہ و ذمیمہ سے گذر کے دو اور تقسیمیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) اخلاق طبیعی۔ یہ وہ اخلاق ہیں جو انسان اپنے ساتھ لیکے پیدا ہوتا ہو۔ اِن کا استیصال ناممکن، مگر تقویت و تضعیف ممکن ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا، بعض لوگوں میں ان کی صحبت کے عام اخلاق کے خلاف بعض عادتیں پائی جاتی ہیں، یہ وہی عادات ہیں جن کو ہم فطری کہتے ہیں۔

(۲) اخلاق کسبی۔ یہ وہ اخلاق ہیں جو انسان صحبت سے سیکھتا ہو اور رفتہ رفتہ وہ اُس میں قریباً اتنے ہی جاگزین ہو جاتے ہیں، جتنے کہ اخلاق طبیعی راسخ ہوتے ہیں۔

یہ تقسیم ہنٹ کی تھی، پروفیسر ڈیوی امریکی نے اخلاق کی حسب ذیل تقسیم کی ہے۔

وہ اخلاق جن کا تعلق۔

۱۔ ادراک سے ہو۔

۲۔ جذبات سے ہو۔

۳۔ ارادہ سے ہو۔

اخلاق متعلق بادراک وہ اخلاق ہیں، جن کے ذریعہ سے کذب و صدق وہم و شک ظن و یقین وغیرہ میں تمیز ہوتی ہو۔

اخلاق متعلق بہ جذبات وہ اخلاق ہیں، جن کا تعلق جذبات سے ہو، جیسے حسن دوستی، لذت پسندی وغیرہ۔

اخلاق متعلق بارادہ وہ اخلاق ہیں، جن کا تعلق ارادہ سے ہو، جیسے صبر، استقلال، حلم وغیرہ۔

سرچشمہائے اخلاق

انسان میں اخلاق کے تین سرچشمے ہیں

(۱) وراثت

(۲) مؤثرات

(۳) ارادہ

وراثت۔ عموماً بچہ جس شخص سے جس قدر قریب ہوتا ہو، اُسی قدر اُس سے زیادہ مشابہ ہوتا ہو، مثلاً بچہ سب سے زیادہ والدین سے قریب ہوتا ہو، اِس لیے وہ نسبتاً سب سے زیادہ والدین سے مشابہ ہوتا ہو۔ والدین کے بعد والدین کے والدین سے قریب ہوتا ہو، اِس لیے تیسری یا چوتھی پشت کے لوگوں کی بہ نسبت اُن سے زیادہ مشابہ ہوتا ہو، وہلم جرا۔ مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں بسا اوقات اِس کے خلاف شہادتیں ملتی ہیں۔

مؤثرات خارجیہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) فضاء مادی، جیسے آب و ہوا چنانچہ تجربہ سے ثابت ہوتا ہو کہ معتدل

ممالک کے لوگ عموماً راحت طلب، عیش پسند اور کاہل ہوتے ہین لیکن غیر معتدل ممالک کے لوگ چاق و چوبند، چست، چالاک، محنتی اور جفاکش ہوتے ہین۔ غیر معتدل ممالک مین گرم ممالک کے باشندے سریع الانفعال ہوتے ہین، وہ جسقدر جلد خوش ہوتے ہین اُسی قدر جلد ناراض ہوتے ہین سرد ممالک کے باشندے بطی الانفعال ہوتے ہین مگر جب متاثر ہو جاتے ہین تو وہ تاثر پھر جلد زائل نہین ہوتا۔ وغیرہ

۲۔ فضاء اخلاقی، احباب، اصدقاء، معلمین وبیک لفظ صحبت یا سوسائٹی۔ اسپنسر کہتا ہے کہ انسان اپنے والدین سے زیادہ اپنے ہم نشینون سے مشابہ ہوتا ہے۔ صحبت کے اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، ایک پیشے کے لوگون مین بہت سے اخلاق مشترک ہوتے ہین، بلکہ یہان تک دیکھا گیا ہے کہ اگر دو نہایت ہی قریبی رشتہ دار دو مختلف پیشے کرتے ہون تو اُن دونون کے اخلاق باہم دیگر اُس سے کم مشابہ ہوتے ہین جتنے کہ دونون کے اخلاق اپنے اپنے ہم پیشہ لوگون سے مشابہ ہوتے ہین"۔ ایک فرانسیسی مثل ہے کہ "تم اپنے ہم نشینون کو مجھے بتا دو، مین تمھین یہ بتا دون گا کہ تم کیسے ہو"

ارادہ۔ اخلاق کے دو سبب یعنی اسلاف اور صحبت (سوسائٹی) کا انتخاب انسانی قدرت سے باہر ہے، لیکن تیسرا سبب یعنی ارادہ اسکی قدرت مین ہے۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ وراثت اور صحبت کا اثر نہایت سخت راسخ ہوتا ہے، تاہم اگر انسان کا ارادہ اگر قوی ہے تو اس اثر کو زائل کر سکتا ہے۔

اگر ہم عبرت آموز نظر سے اشخاص کی زندگی کا مطالعہ کرین گے تو ہم کو بہت سے لوگ ملین گے جن مین اُن کے بزرگان خاندان اور اُن کی صحبت کے خلاف اخلاق موجود ہونگے۔ یہ بالکل بدیہی ہے کہ ان اخلاق کا سرچشمہ نہ وراثت ہوگی اور نہ صحبت؛ اب جو چیز رہجاتی ہے، وہ طبیعت کا میلان اور ارادے کی مساعدت ہے پس یہی دو چیزین اُنکا سرچشمہ ہونگی۔ اسی بنا پر علماء اخلاق کا یہ خیال ہے کہ انسان کا مستقبل وراثت اور صحبت سے زیادہ اُسکے ارادے پر موقوف ہے۔ اس نظریہ کی مزید تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ دنیا مین جتنے ارباب اخلاق پیدا ہوے ہین وہ ایسی قومون مین سے پیدا ہوے ہین جن کی اخلاقی حالت نہایت بدتر تھی اور قطعاً ان مین سے اتنے بڑے ارباب اخلاق کے پیدا ہونے کی امید نہین کی جا سکتی تھی۔

ارادے کے مدارج مختلف ہین۔ بعض اشخاص کا ارادہ فطرتاً نہایت قوی ہوتا ہے، اور بعض کا کمزور، اور بعض کا متوسط درجہ کا۔

جس طرح جسم ورزش اور نگہداشت سے بڑھتا ہے، بعینہ یہی حالت ارادے کی بھی ہے۔ اگر کوشش کی جائے تو ایک کمزور ارادہ قوی اور ایک قوی ارادہ قوی تر ہو سکتا ہے۔ بچپن مین تمام قویٰ انسانی کا آغاز ظہور ہوتا ہے اس وقت وہ ہر طرح کی تربیت قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے ہین اس لیے ارادے کی تربیت اور تقویت کا بہترین زمانہ طفولیت کا زمانہ ہے۔ اسی لیے مغرب مین بچون کو تیسرے یا چوتھے ہی برس سے استواری عزم و پختگی ارادہ کی تعلیم دیجاتی ہے۔

اخلاق کی آراستگی

اخلاق کی ماہیت اور اسباب کے معلوم ہونے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی آراستگی یا تہذیب کا کامیاب ترین ذریعہ کیا ہے؟

قدرت نے انسان مین مختلف قویٰ ودیعت کیے ہین، جن کی نشو و نما کے لیے غذا اور ورزش کی ضرورت ہے۔ مگر جس طرح کہ اُن قویٰ کے جوہر مختلف ہین اسی طرح اُن کی غذا اور ورزش مختلف ہے جسمانی قویٰ کی غذا اور ورزش ماکولات و مشروبات اور العاب ریاضیہ (جمناسٹک) ہین، مگر اخلاقی قویٰ کے لیے یہ چیزین بیکار ہین ان کی غذا افکار عالیہ اور ان کی ورزش زمانہ کی کشمکش ہے۔ جس طرح کہ ہر شخص کے جسم کے لیے ایک ہی قسم کی غذا اور ایک ہی نوعیت اور ایک ہی حد تک کی ورزش مفید نہین اسیطرح ہر شخص کے لیے ایک ہی نوعیت کے افکار عالیہ اور ایک ہی نوعیت و شدت کی کشمکش زمانہ مفید نہین، اس لیے آراستگی اخلاق کے متعلق کیلیے دو امر نہایت ضروری ہین۔

۱۔ اخلاقی غذا کے لیے ایسے افکار کا انتخاب، جو اُس کی طبیعت کے

کے مناسب ہون۔

۲۔ زندگی کی اُن کشمکشون سے اجتناب جو اُس کی طبیعت کے غیر مناسب ہون۔

شرائط کامیابی

جس طرح انسان کی جسمانی ترقی کیلیے اسلاف کی صحت، آب و ہوا کی عمدگی قوی کے استعمال و تعطیل مین اعتدال، حزن و مسرت مین توازن وغیرہ شرائط ہین اسی طرح اخلاقی ترقی کے لیے بھی چند شرائط ہین۔

اولین شرط والدین کے جسم و عقل کی تندرستی ہی۔ مگر افسوس کہ جسقدر یہ شرط مقدم ہی اُسی قدر اس کی طرف سے غفلت کی جاتی ہی مائین جو بچون کے پالنے مین رات کو رات اور دن کو دن نہین سمجھتین اور باپ جو اولاد کی تعلیم و تربیت مین کسی چیز سے بھی دریغ نہین کرتے عموماً اس نہایت اہم شرط سے چشم پوشی کرتے ہین۔ وہ اپنی صحت لذائذ زندگی یا غفلت کی بدولت تباہ کردیتے اور اُس کا خمیازہ نہ صرف وہ خود کھینچتے ہین بلکہ اُن کے بعد آنے والی نسلین پشتہا پشت تک کھینچتی رہتی ہین۔ یہ واقعہ ہی کہ ہزارہا بچون کی جسمانی دماغی اور اخلاقی کمزوری کے ذمہ دار اُن کے والدین کی کمزوری ہی۔

دوسری شرط حسنِ تربیت ہی بیشک یہ صحیح ہی کہ جوانی یا بڑھاپے مین اصلاحِ اخلاق محال نہین لیکن قریب بمحال ضرور ہی۔ کیونکہ انسان جسوقت پیدا ہوتا ہی اُسوقت وہ ایک لوحِ سادہ ہوتا ہی۔ وہ ہر قسم کے نقش قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہی لیکن جب ایک نقش کھنچ جاتا ہی تو اُس کا مٹنا اکثر دشوار طلب اور کبھی ناممکن ہو جاتا ہی۔ اس لیے جو قوم چاہتی ہی کہ اُس کی آیندہ نسلون کی اخلاقی حالت عمدہ ہو اُس کو چاہیے کہ اس سادہ لوح پر شروع ہی سے عمدہ نقش کھینچے۔ اس کے لیے اس کو حسب ذیل امور ملحوظ رکھنا چاہئین:۔

۱۔ ایسی فضا کا انتخاب جو اخلاق رذیلہ کی سمیت سے محفوظ ہو۔

۲۔ اخلاقی قوی کا صحیح اندازہ تاکہ جو حصہ کمزور ہو اُس کو خاص طور پر قوی کیا جاے۔

۳۔ مرکز نظر کے لیے کوئی بلند شے پیش کرنا۔

۴۔ افکار عالیہ کی تلقین۔

۵۔ روزانہ زندگی مین اصولِ اخلاق کا نفاذ۔

حسب ذیل قوی کو خاص طور پر اُبھارنا چاہیے:۔

۱۔ حقیقت پرستی۔

۲۔ جرأتِ اخلاقی۔

۳۔ استواری عزم۔

ابتدائی تربیت اور مشرق

مشرق مین بچون کی اخلاقی تربیت کا بہترین آلہ "قمچی" یا "قسمہ" سمجھا جاتا ہی۔ یہ نہایت سخت غلطی ہی۔ مارنے سے بجز اسکے کہ بچے کے دل مین معلم کی ہیبت اور اس عادت سے نفرت پیدا ہو اور کوئی فائدہ نہین ہو سکتا۔

بچے کی اخلاقی تربیت کا صحیح ترین اصول یہ ہی کہ جس عادت سے باز رکھنا منظور ہو پہلے اُسکے فوائد و نقصانات اُسکو سمجھائے جائین، اور اُس کے بعد اسکے چال چلن کی نگرانی رکھی جائے۔ فراموشی کے وقت اُسکو یاد دہانی کی جائے، یاد دہانی کے ساتھ بچے کو اُس کے فوائد و مضار کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اس طرح بچہ بہت جلد خود بخود تعمیل حکم کرنے لگے گا۔

بچے کی پہلی اخلاقی درسگاہ گھر ہی اور اس کے بعد مدرسہ کا نمبر ہی گھر مین صرف زمین تیار ہوتی ہی تخم پاشی درحقیقت مدرسہ مین آکر ہوتی ہی۔ اس لیے جسطرح زمین کے تیار کرنے مین سخت توجہ کی ضرورت ہی اسی طرح تخم پاشی اور اُس کی آبیاری کے لیے بھی اعتنا شدید کی حاجت ہی۔ نصاب مین اخلاقی کتابون کا داخل کرنا یا دار الخطابہ دلکچر روم مین اخلاقی تقریرون کا ہونا، اُسوقت تک مفید نہین ہو سکتا جب تک کہ خود مدرس کی شخصیت با اخلاق نہو۔ کتاب کے نقوش اور تقریرون کے ہوائی توجات معلم ہین۔ مگر مردہ لیکن مدرس زندہ معلم ہی اور یہ ظاہر ہی کہ

کہ انسان پر جو ایک زندہ معلم کا اثر ہو سکتا ہے وہ ایک مردہ معلم کا نہیں ہو سکتا۔ پس اگر مدرس کی کتابِ زندگی میں اخلاقی سبق نہیں تو محض نصاب کی کتابوں یا دار الخطابہ میں بلاغت کار تقریروں سے اخلاقی تربیت کی امید غلط امید ہے۔

دیگر امور کی طرح یہ نکتہ بھی مغرب کے پیشِ نظر اور مشرق کے پس پشت ہے۔ مغرب میں بچوں کے لیے مصنف، معلم، اور مربی زبردست شخصیت و علمیت کے لوگ ہوتے ہیں مگر مشرق میں اس کے بالکل برعکس ہے۔ موخر الذکر میں بچوں کی تعلیم و تربیت کم درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے۔ اس کو صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دیگر ذرائع سے معاش پیدا نہیں کر سکتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مشرق کے فرزند اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی مغرب کے فرزندوں سے اخلاق میں پیچھے رہتے ہیں۔

ابو الکلام آزاد

العصر

فلسفۂ تشکیک

ہستی کے مت فریب مین آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

عالم مین ہزارون چیزین مرئی اور غیر مرئی، محسوس اور غیر محسوس ہمارے سامنے ہین، لیکن اُن کی حقیقت و ماہیت ہم سے مخفی ہے، ہم تجربہ، اختبار، استقرا، اور دلائل سے اصلیت اور واقعیت کے چہرہ سے پردہ اُٹھانا چاہتے ہین، اور آخر چند نتائج تک پہنچ کر رہ جاتے ہین۔

ہم مین بعض محتاط اس بنا پر کہ اس سے پہلے بھی ہم سینکڑون نتائج تک پہنچے، لیکن وہ واقعی نہ تھے، نیز ہمارے قوائے فکر و عمل اسقدر کمزور ہین کہ تحقیق واقعیت اور اثبات حقیقت کا بارگران نہین اُٹھا سکتے اور حقائق و ماہیات اشیاے عالم اس درجہ خفی و تاریک ہین کہ موجودہ آلات فکر و نظر اُس کو روشن نہین کر سکتے، ہمارے ہر نتیجہ کو حقیقت سے عاری اور واقعیت سے معطل قرار دیتے ہین، بلکہ کبھی کبھی وہ خود اس کے انکار کی جرأت کرتے ہین کہ عالم مین کوئی حقیقت ہے، اُنکی نظر مین ہر شے تخیل اور دماغ کا اختراع ہے۔

دوسرا گروہ اُسکے بالمقابل بجوش مدعیانہ کہتا ہے کہ عالم حقائق سے معمور ہے، ہمارے تجارب، اختبارات، دلائل صحیح اور ہمارے نتائج و استنباطات قطعی ہین۔ اشیا حقائق واقعیہ ہین، اور برہان و تجربہ نے جن نتائج تک پہنچایا ہے، وہ اس وقت تک یقینی ہین جب تک اُن کے خلاف کوئی دلیل صحیح نہو۔

ایک معتدل گروہ آگے بڑھتا ہے اور فریق اول کو مخاطب کرتا ہے، دوستو! جب تم آلات فکر کو ناکافی، دلائل کو غیر موصل الی المطلوب اور عالم کو حقائق سے عاری تعیین کرتے ہو، تو تم کیونکر کہتے ہو کہ ہم کسی شے مین کوئی حقیقت نہین پاتے؟ کیا ابھی تم نے جن خیالات کو ظاہر کیا کہ: ہمارے آلات عمل و فکر ناکافی ہین، دلائل غیر موصل الی المطلوب ہین، اور عالم حقائق سے عاری ہے، کیا تم خود اُنکی صحت کا یقین کر کے اِن اصول کی حقیقت کے قائل نہین ہوگئے؟ اور اگر اُن کو بھی تم حقیقت نہین کہتے تو یہ تو نہ کہو کہ ہمارے دلائل ناکافی ہین، آلات عمل ناقص ہین، اور عالم سراسر نقش تخیل۔

پھر یہ گروہ دوسرے فریق کی طرف مخاطب ہوتا ہی:- دوستو! یاد ہوگا کہ تم نے اپنی گفتگو مین کہا ہی کہ ہمکو دلائل و تجارب نے جن نتائج و استنباطات تک پہنچایا ہی وہ اُس وقت تک یقینی ہین جب تک اُنکے خلاف کوئی دلیل صحیح قائم نہو؛ اِن فقرون سے ظاہر ہی کہ تم اپنے موجودہ دلائل و نتائج کو متیقن اور غیر ممکن الخطا نہین سمجھتے ہو، پھر کیا یہ ممکن نہین کہ جن معلومات و تخیلات کی صحت کی بناپر ان دلائل و نتائج کو تم یقینی سمجھتے ہو وہ صحیح نہون اور تم قلتِ معلومات، یا نقص آلاتِ فکر، یا خطاے طرقِ فکر کی بناپر غلطی سے صحیح یقین کررہے ہو، اور مسائل متعددہ مین تم کو اپنی یہ غلطی روزانہ نظر آتی ہی، پھر کوئی سبب معقول نہین ہی کہ تم اپنے موجودہ حقائق و نتائج کو اگر غلط نہ یقین کرو تو صحیح بھی یقین نہ کرو۔

یہ تین فرقے فلسفہ کے تین اسکول یا تین اصول ہین:-

۱۔ اول توہمیہ - یا سوفسطائیہ:- جو عالم مین حقیقت کا قائل نہین۔ یعنی نفی حقیقت کرتا ہی۔

دوم - ایقانیہ:- جو عالم مین حقائق کا قائل اور اُن کے علم و معرفت کا مدعی ہی، یعنی اثبات حقیقت کرتا ہی۔

سوم تشکیکیہ یا لاادریہ: جو ان دونون کے وسط مین ہی، نہ وہ توہمیہ کی طرح نفی حقیقت کرتا ہی اور نہ ایقانیہ کی طرح اثباتِ حقیقت بلکہ وہ نفی و اثبات دونون مین متردد ہی۔ واقعات، دلائل اور نتائج سب اُسکے سامنے ہین، لیکن اُن مین سے نہ وہ کسی کی صحت کا مدعی ہی اور نہ کسی کی خطا کا۔ وہ کہتا ہی کہ: ممکن ہی کہ یہ صحیح ہو اور ممکن ہی کہ صحیح نہ بھی ہو۔

فرقۂ تشکیکیہ جسکو عربی مین عموماً "لاادریہ" کہتے ہین، اور جو لفظی ترجمہ ہی Agnostic کا مسیح سے تقریباً چارسو برس قبل اس کی بنیاد یونان مین پڑی تھی۔ اس مذہب کا موسس اول یونانی فلاسفر پیرون ہی، جو ۳۶۰ (قبل مسیح) مین پیدا ہوا تھا۔ سکندر کے حملۂ مشرق مین یہ شریک تھا، اس لیے اکثر مورخین کا یہ بیان ہی کہ پیرون نے ایران و ہندوستان کے فلسفہ کو بھی ان ممالک کے علما سے حاصل کیا تھا۔

پیرون کے فلسفہ کا سنگ بنیاد جس کی طرف اوپر کی سطرون مین بھی اشارہ ہو چکا یہ ہی: کہ انسان جب عدم سے وجود مین آتا ہے اُسکے چارون طرف سینکڑون چیزون کا وجود ہوتا ہی۔ اب اسکے لیے دو راہین ہین۔ ایک تو یہ ہی کہ جو وہ سمجھتا ہی اُس کو وہ حقیقت غیر قابل نقض سمجھ لے، یا ہر چیز کا انکار کر دے کہ وہ حقیقت سے معری ہین، اور یہ دونون افراط و تفریط سے خالی نہین، اس لیئے اب انسان کے سامنے صرف تیسری راہ ہی کہ کسی شے پر کوئی حکم نہ کیا جائے۔

حقیقی لاادری اس سنگ بنیاد کو حقیقت نہین سمجھتا، کیونکہ یہ بھی حکم علی الشی ہی، اور نہ وہ نہین جانتا کہ یہ صحیح ہی یا نہین۔ اکثر اشخاص بظاہر حال اس نظریہ کو سُن کر ہنس دین گے، لیکن حقیقت مین یہ کوئی ہنسنے کی شے نہین ہی، بلکہ ایک دقیق امر ہی۔ بعض لوگ نافہمی سے اعتراض کرتے ہین، کہ دنیا مین سینکڑون چیزین ہین جن کا علم ہم کو نہایت آسانی سے حاصل ہو سکتا ہی۔ مثلاً حرارتِ نار، برودت آب، صلابت سنگ، نرمی حریر۔ ہاتھ سے چھوکر، آنکھ سے دیکھ کر، زبان سے چکھ کر اور کان سے سن کر تم بدیہی شے پر فطرۃً اور بداہتہً مختلف حکم کرتے ہو، اور کبھی تم کو شک نہین ہوتا، پھر کیونکر کہتے ہو کہ ہم کسی شے پر حکم نہین کرتے۔

لیکن اس قسم کے اعتراضات حواس و آلات فکر کے طرق علم و معرفت سے ناواقفیت کی بناپر پیدا ہوتے ہین۔ اولاً یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے تمام دلائل و براہین کا مبنی کیا ہی؟ صرف دو چیزین: استعمال حواس اور استقراء، لیکن ان مین سے کون سی چیز ہی جو خطا سے معصوم ہی؟

حواس علی الاقل پانچ ہین: باصرہ، سامعہ، ذائقہ، لامسہ، شامہ باصرہ سے ہم صرف نور اور لون کا احساس کرتے ہین، سامعہ آواز

کو دریافت کرتی ہی، ذائقہ لذت کو، لامسہ سختی و نرمی کو، اور شامہ بُو کو۔ اب جو تم کسی چیز کو دیکھتے ہو تو کہتے ہو کہ یہ پتھر ہے لیکن تم نے کیونکر جانا کہ پتھر ہی؟ آنکھ تمکو صرف اُس کا سیاہ یا سپید رنگ بتاتی ہی، اور قوت لامسہ صرف اُس کی سختی کو محسوس کرتی ہی لیکن کیا پتھر ہونے کے ثبوت کیلئے صرف یہی مقدمات کافی ہین کہ یہ شے سیاہ اور سخت ہی، اور جو شے سیاہ اور سخت ہو وہ پتھر ہی، اِس لئے یہ پتھر ہی؟ کیا یہ ممکن نہین کہ ایک لوہے کے ٹھوس جسم پر یا ایک منجمد مادہ پر سیاہ رنگ چڑھا دیا جائے؟ تمکو خود اِس قسم کی غلطیان ہمیشہ پیش آتی ہین۔

ثانیاً: تمکو حواس کی غلطی سے بھی انکار نہو گا، جب تم کسی سریع الحرکۃ شے پر سوار ہوتے ہو تو تمھاری سریع الحرکۃ سواری ساکن اور ساکن زمین متحرک نظر آتی ہی، کبھی کبھی تم کو چاند متحرک نظر آتا ہی، حالانکہ اُس کے نیچے ابر حرکت کر رہا ہی، اور اِس قسم کی بیسیون مثالین تم خود پیش کرتے ہو، پھر کوئی وجہ نہین کہ اور دوسرے امور مین جن مشاہدات و تجارب پر تم اپنے اصول و نتائج کی بنیاد قائم کرتے ہو، وہ حواس کی غلطی سے محفوظ ہون۔

ثالثاً: حواس سے تم ایک شے کا مشاہدہ کرتے ہو، اُس پر ایک حکم قائم کرتے ہو، اور اُس کو تم مبنی علی المشاہدہ اور مبنی علی البداہتہ سمجھتے ہو، حالانکہ تمھین خبر نہین کہ جلدی مین غیر مشاہد راستون کو بھی طے کر گئے ہو۔ جب تم نے ایک سیاہ شے کو دیکھ کر کہا کہ پتھر ہی، تو تم نے فرض کر لیا ہی کہ ہماری نظر ہم کو دھوکا نہین دے رہی ہی، معلوماتِ سابقہ کی بنا پر بغیر چھوئے تم نے سختی بھی محسوس کی، اسکے بعد تم نے یہ فرض کیا ہی کہ یہ صفات جس مین ہون وہ پتھر ہی، لیکن ان مین سے ہر ایک محتاجِ دلیل ہی۔

فرقہ تشکیکیہ، ایقانیہ کے مقابلہ مین حسبِ ذیل دس اصول قائم کرتا ہی:-

(۱) مقدارِ عمر، ترکیبِ جسم، قوتِ حواس اور درجۂ احساس مین تمام انسان مختلف ہین، اور اِس لیے ایک ہی شے مین مختلف اشخاص کو جو مقدارِ عمر، ترکیبِ جسم، قوتِ احساس اور درجۂ احساس مین مختلف ہین مختلف حیثیات اور خصائص نظر آتے ہین۔

(۲) اخلاقی اور تشریحی حیثیت سے افرادِ انسان مختلف ہین، اسلیے مختلف امور کے متعلق ان کے احساسات بھی مختلف ہونگے۔

(۳) ایک ہی انسان مین بتعدد اعضاے حاسہ مین، اس کا یہ نتیجہ ہی کہ ہر عضو ایک خاص کیفیت و مقدار وغیرہ کو محسوس کرتا ہی، اِس لیے یہ کیونکر کہا جا سکتا ہی کہ جو خصوصیت و خاصیت تم کو نظر آ رہی ہی وہ خود اُس شے مین موجود ہی یا ہمارے اعضاے حاسہ مین ہی؟

(۴) ایک ہی انسان ایک ہی شے کو خواب، بیماری، حزن اور غم، پیری اور ضعف کی مختلف حالتون مین مختلف طور سے محسوس کرتا ہی، پھر کس طرح یقین کیا جائے کہ تم جو ایک خاص حالت مین ایک شے محسوس کرتے ہو، اور پھر دوسری حالت مین اُس کو ایک اور شے محسوس کرتے ہو، کیونکر کہا جائے کہ ان مختلف حالات کے احساس مین کون سا احساس صحیح ہی؟

(۵) کسی شے پر کوئی حکم عموماً اسکے صفات و خصائص ظاہری پر موقوف ہوتا ہی، اور صفات و خصائص کا یہ حال ہی کہ قلت و کثرت اور زیادت و نقص کی حالت مین بالکل بدل جاتے ہین۔ اب جب تم ایک مقدارِ مخصوص کو مشاہدہ کر کے اُس پر کوئی خاص حکم قائم کرتے ہو تو کیا یہ غیر ممکن ہی کہ اُس کی کم و بیش مقدار مین وہ صفات و خصائص بدل جائین؟

(۶) کسی شے کے متعلق جب کوئی حکم کوئی انسان کرتا ہی تو یہ حکم صرف مشاہدہ پر مبنی نہین ہوتا، بلکہ اُس مین اُس کی تربیت خاص، عقائدِ خاص، پابندی بعض قوانینِ خاص اور سوسائٹی کے مخفی اثرات کا بہت کچھ حصہ شامل ہوتا ہی، یہی وجوہ ہین کہ مختلف التربیۃ، مختلف العقائد، مختلف الاقالیم اشخاص، مسائل کثیرہ مین ہمیشہ مختلف الآرا رہتے ہین۔

(۷) اشیاے عالم باہم اِس قدر مختلط ہین کہ ایک دوسرے

علیحدہ نہین ہو سکتین، اس لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس شے پر تم کوئی حکم کرتے ہو وہ مستقلاً بھی اُس شے کے لیے صحیح ہے؟ تم اشیا کے خصائص بتاتے ہو، لیکن کیا اُس مین موادِ مختلطہ کے خصائص شامل نہین؟ جب تم آنکھ سے ایک رنگ دیکھتے ہو تو کیا اُس مین اخلاطِ چشم کے خصائص داخل نہین؟

(۸) ایک ہی شے مختلف قرب و بعد، مختلف جوانب و سمتِ رویت، مختلف اسبابِ رویت کی بنا پر مختلف نتائج پیدا کرتی ہے، پھر ایک خاص مقدارِ قرب و بعد، ایک خاص سمتِ رویت، بعض خاص اسبابِ رویت مین جو چیز نظر آتی ہے، بالکل ممکن ہے کہ دوسری حالتون مین وہی شے اور کیفیات مین نظر آئے۔ پھر اُن مین سے کون حقیقی ہے؟

(۹) قلت و کثرتِ التفات و توجہ مختلف نتائج ظاہر کرتی ہے، پھر جس مقدارِ توجہ و فکر سے تم ایک حالت کا اندازہ کر رہے ہو، اُس سے کم یا زیادہ توجہ و فکر کی حالت مین دوسری حالتین پیدا ہوتی ہین، کون صحیح ہین۔

(۹) ہم جب کسی چیز پر کسی قسم کا حکم کرتے ہین تو عموماً ہمارے حواس نامعلوم قیود اور بندشون مین گرفتار ہوتے ہین، ہم نہین کہہ سکتے کہ جب ہم اُن سے آزاد ہوتے تو ہم کیا حکم کرتے؟

اِن اصول عشرہ کے علاوہ فرقۂ تشکیلیہ کے اور بعض اہم اصول بھی ہین، جن کی تفصیل وقت طلب ہے۔

فلسفۂ تشکیلیہ کا سنگِ بنیاد جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے مسیح سے ۴۰۰ برس قبل رکھا گیا تھا، اسکے بعد ہمیشہ اسکے اعوان و اتباع ہر عصر مین موجود رہے ہین۔ فلاسفۂ یورپ مین بھی اس خیال کی کمی نہین، مشہور فیلسوف ہکسلے و اسپنسر اسی فلسفہ کے مرید تھے، حقیقت یہ ہے کہ ایک فلسفی اسرارِ عالم کو جس حد تک کھولتا ہے اُسکے سامنے پھر گرہین نظر آتی ہین، اُن کو کھولتا ہے تو کچھ اور عقدے جابجا پیدا ہو جاتے ہین ؎

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود
گشت رازِ دگر آن راز کہ افشا می کرد

وَمَا اُوتِیتُم مِنَ العِلمِ اِلَّا قَلِیلًا، جب انسان کی بےبسی کا یہ عالم ہے کہ محسوسات مین بھی اسکو مشکل سے تیقن و عدمِ تیقن کے فیصلہ کرنے مین کامیابی ہوتی ہے، تو جو امور ماوراے احساس و مافوق الطبیعۃ ہین اُنکی نسبت کیونکر فیصلہ ہو گیا کہ باطل محض اور حدیثِ خرافہ ہین، افی اللہ شک؟ فاطر الارض والسماء!

ابو الکلام آزاد (دہلوی)

الندوہ

روح اور اُس کا مسکن

اور حکماء مادّیین کے احکام و آراء

مشاہیر علما کے احکام و آراء

جو لوگ علم الحیات کی تاریخ سے واقف ہین، اُن کے لیے یہ کہنا ضروری نہین کہ نباتات مین بھی روح فرض کی گئی ہے۔ اریزو کا مشہور طبیعی انڈریا سیسل پینیس (۱۵۱۹-۱۶۰۳) جو اس وقت تک اطالیا مین دوران خون کا مکتشف سمجھا جاتا ہی، اُس نے اپنی کتاب ڈی پلینٹس لائبری مین نباتاتی روح کی ماہیت اور اُسکے مسکن کے متعلق ایک طویل بحث چھیڑی ہے۔

روح کو کہان رہنا چاہیے؟ اسکے متعلق ہمین دقیقہ رس سیسلپنیس کے تفصیلی دلائل کے تتبع کی چندان ضرورت نہیں ہے۔ صرف اسقدر جان لینا کافی ہوگا کہ بالآخر روح نباتاتی کو وہ اُس مقام پر رکھتا ہی جہان تنا اور جڑین آ کے ملتی ہین۔

یہ مقام جو بعد کو کولیٹ یا گردن کے نام سے مشہور ہوا اسکے متعلق لینوس کے بعد بھی ایک توہم پرستانہ عزت کے ساتھ یہ خیال کیا جاتا رہا کہ یہان زندگی کا کوئی خاص مرکز قائم نہین کیا گیا ہی۔

لیکن فرانس کا ایک مشہور عالم برگنڈین میریٹ المتوفی سنہ ۱۶۹۴ء اپنی کتاب مین صاف صاف کہتا ہی "ہم نباتات کی روح کے متعلق کچھ نہین جانتے۔ اسلیے نباتات کے علم وظائف الاعضاء مین اس کا فرض کرنا ذرہ بھی مفید نہین۔"

روح اور مادّہ کے زیرین طبقہ مین جو باہمی تعلق ہی اُسکی تاریخ کے گذشتہ اوراق اگر کافی مقدار مین اُلٹین تو ہمین نظر آئے گا کہ ابتداءً عقلی کامون کے لیے نظام عصبی مین کوئی جگہ تسلیم نہین کی گئی تھی۔ قدیم مصری سمجھتے تھے کہ روح دل مین رہتی ہی۔ ارسطو کا بھی یہی خیال تھا۔

یہ خیال عہد نبوین کے مشہور فلسفی ڈیکو کے وقت تک زندہ رہا۔ چنانچہ وہ ڈیکارٹ کے علی الرغم ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ نفس کا مسکن دماغ نہین بلکہ دل ہے۔

حجاب حاجز

یونانیون کا ایک دوسرا قدیم خیال یہ ہو کہ روح یا نفس حجاب حاجز کا مسکن (Diaphragm)[۱] ہو' جسکی یادگار ہماری زبان کے ایک لفظ (Phrenzy) جنون مین ابھی تک باقی ہو۔ کیونکہ وہ لفظ فرین (Phreen) سے مشتق ہو جو یونانی زبان مین حجاب حاجز کو کہتے ہین۔ فرین سے بہت سے الفاظ مشتق ہوئے جن مین سے بعض متداول اور بعض قلیل الاستعمال ہین مثلاً Phreno-pathia جو اب عقل کے علاج کے لیے بہت کم استعمال کیا جاتا ہو یا Phrenetise جو اس وقت تک عام طور پر ایسے شخص کو کہتے ہین' جسکی عقل مین بآسانی ہیجان اور برانگیختگی پیدا کی جا سکے۔ یا (Phrenitis) جو درحقیقت اشتعال دماغ کے بالکل مرادف ہو۔ اسی طرح Phrenology جو ایک فرضی علم کا نام ہو' اسی فرین سے مشتق ہوا ہو۔

یہ خیال کہ روح کا مسکن حجاب حاجز ہو' کیونکر پیدا ہوا؟ اسکا سمجھ مین آنا چندان مشکل نہین' یہ حجاب حاجز سانس کے لیے اس درجہ ضروری ہو کہ اسپر جذبات کے شدید ہیجان کا بہت سخت اثر پڑتا ہو۔ ہر جاندار محسوس کرتا ہو کہ جذبات کے ہیجان سے سینہ ابھر آتا ہو اور سانس پھولنے لگتی ہو' اسلیے جذبات کا ہیجان سینے اور اُسکے خاص عضلہ حجاب حاجز مین پیدا ہوتا ہو یا رہتا ہو۔ یہ ہو وہ دلیل جو قدما اس خیال کی تائید مین بیان کرتے تھے!

جذبات اور مختلف اعضائے شکم

کیا اتنے قدیم زمانہ سے جس کا آغاز ہمارے حافظہ کی دسترس سے باہر ہو' تلی (طحال) کے متعلق یہ خیال نہین کیا جاتا ہو کہ وہ غیظ و غضب اور رشک و حسد کا گھر ہے؟ انگلستان کا سب سے بڑا شاعر شیکسپیر بھی پیٹ کے مختلف حصون مین تقسیم جذبات کے مذہب کو تسلیم کرتا تھا' مثلاً وہ محبت کی جگہ جگر کو قرار دیتا ہو۔ البتہ وہ دوسرے نظریہ بھی سے ناواقف نہین ہو۔ بلکہ یقیناً دماغ کے متعلق بھی سُن چکا ہو کہ وہی روح کا گھر ہو۔ چنانچہ وہ "شاہ جان" کے ڈرامے مین پانچوین ایکٹ کے ساتوین سین مین کہتا ہو: "بہت دیر ہو گئی' اُسکی تمام خون مین زندگی فساد پذیر طور پر متاثر ہو چلی ہے۔ اور اُسکا دماغ (جسکے متعلق بعض لوگ کہتے ہین کہ وہ روح کی ناپائدار قیامگاہ ہو) اپنی بیہودہ سرائیون سے فانی ہستی کے ختم ہونے کی پیشین گوئی کر رہا ہو"

روح اور معدہ

بلجیم کا قدیم کیمیادان وان ہیلمنٹ (المتوفی ۱۵۷۷-۱۶۴۴) غالباً ارباب علم مین سب سے آخری شخص ہو جو روح کی جگہ سر کے باہر مانتا ہو۔ وان ہیلمنٹ کے نزدیک روح قعر معدہ مین رہتی ہو' اور اسکے ثبوت مین جو دلائل پیش کرتا ہو وہ ایک عجیب و غریب قسم کا ذخیرۂ دلائل ہو۔ اُسکے نزدیک اگرچہ روح کے تمام حرکات اور احساسات دماغ اور اعصاب کے ذریعہ سے ظاہر ہوتے ہین مگر اسکا اصلی تخت حکومت قعر معدہ ہی مین ہو' اور وہ خود بھی دہن معدہ مین رہتی ہو" اسکی تائید مین وہ کہتا ہو: "جذبات کا عظیم الشان ہیجان ہمیشہ بالائے معدہ پر محسوس ہوتا ہو"۔ نیز یہ کہ "اگر ایک شخص کا سر توپ کے گولے سے اُڑ جائے تو اُس کا دل تھوڑی دیر تک حرکت کرتا رہیگا لیکن

---

[۱] ڈائی ایفرم (Diaphragm) ایک یونانی نژاد لفظ ہو۔ یہ ایک حیوانی عضلہ کا نام ہو جو سینے اور شکم مین حائل ہو۔ علوم طبیہ کا جب عربی مین ترجمہ ہوا تو اُسوقت اس کے لیے کوئی نیا لفظ نہین وضع کیا گیا بلکہ اسی کو معرب کر لیا چنانچہ متقدمین کی تصانیف مین "دائی ایفرم" بصورت "دی ایفرغما" اکثر ملتا ہے۔ متاخرین نے اس کے لیے "حجاب حاجز" وضع کیا' جو ڈائی ایفرم کا قریباً لفظی ترجمہ ہو۔

اگر بالائے معدہ کوئی شدید صدمہ پہنچے تو فوراً دل کی حرکت بند ہوجائیگی، اور اُسی کے ساتھ اس کا شعور یا آگہی بھی رخصت ہوجائے گی"۔

اپنے اس خیال کی تعبیر وہ اس نازک انداز مین کرتا ہے:

"اگرچہ وہ ایک جگہ رہتی ہے، مگر مقامی حیثیت سے نہین رہتی۔ تم دیکھتے ہو کہ بتّی مین روشنی رہتی ہے۔ ٹھیک یہی مثال معدہ اور روح کی ہے"۔

روح اور مرکزی نظام عصبی

روح کے سر سے باہر کسی دوسری جگہ رہنے کے متعلق ان خیالات کے ساتھ خیالات کے بعض دوسرے مدرسے بھی موجود ہین جنکے نزدیک نفس کا تعلق مرکزی نظام عصبی سے ہے۔ ولادتِ مسیح سے تین سو برس قبل اسکندریہ کے ہیروفلس کا خیال یہ تھا کہ مقدمۃ الراس کے سوراخون مین (جو تمام جسم مین سب سے زیادہ اندرونی سوراخ ہین) جو سیال مادّہ ہوتا ہے، اُسی مین روح رہتی ہے، خاص کر چوتھے سوراخ کو وہ مسکن عقل سمجھتا تھا۔

ہیروفلس کا یہ خیال ہمارے لیے بہت ہی دلچسپ ہے۔ کیونکہ یقیناً اس سوراخ کے نیچے نظام عصبی کے بعض نہایت اہم مراکز موجود ہین۔ انصاف یہ ہے کہ سب سے پہلے کلاڈیس گیلن (متوفی ۲۰۰ء) نے یہ تعلیم دی تھی کہ "دماغ ہی وہ جگہ ہے جہان روح اور ذہن دونون رہتے ہین"

ہم گیلن کی موت اور ویسیلی اسکی عظیم الشان تصنیف کی درمیانی صدیون کو نظر انداز کر سکتے ہین کیونکہ دماغی خواص کے لیے کسی مقام کے تعین کے متعلق وضاحت کے ساتھ غور کرنے مین اُن سے کسی قسم کی مدد نہین ملتی۔

علم تشریح کا اب الاباء ویسیلی اس (۱۵۱۴-۱۵۶۴) جسکے لیے علم وظائف الاعضاء کے مسائل کسی طرح بھی دلچسپی سے خالی نہ تھے نفس کے متعلق اس حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ اسکا تعلق دماغ سے ہے، حسب ذیل ملحمانہ ریمارک کرتا ہے:-

"لیکن دماغ اپنے وظائف[1] تخیل استدلال، غور اور حافظہ (یا اور کسی طرح، غرضکہ خواہ تم اُس شخص کا مذہب اختیار کرو یا اُس شخص کا، اور چاہے تم اصلی روح کی چند قیام گاہون کا نام لینے کو ترجیح دو یا کوئی ترتیب و درجہ بندی قائم کرلو) کیسے انجام دیتا ہے؟ مین اسکے متعلق کوئی بھی رائے قائم نہین کرسکتا، اور نہ میرے خیال مین اسکے متعلق کوئی امر علم تشریح سے یا ان علماء الٰہیات کے اندازے سے دریافت ہوسکتا ہے جو حیوانات کو قوت استدلالی بلکہ ان تمام قوتی سے محروم سمجھتے ہین جنکو ہم اصلی روح کہتے ہین"

"اسلیے کہ دماغ کی ساخت کے لحاظ سے بندر، کتا، بلی، گھوڑا، اور تمام چوپائے جن کا امتحان مین نے ابتک کیا ہے بلکہ تمام پرندے اور ہر قسم کی مچھلیان تک انسان سے ہر ایک شے مین مشابہت رکھتی ہین، اور تشریح کے وقت ہمین کوئی ایسا فرق نظر نہین آتا جس سے یہ معلوم ہوسکے

---

[1] اصلی عبارت مین لفظ [illegible] ہے انگریزی مین فنکشن اور ڈیوٹی اور ایسے لفظ ہین جنکے معنی اگرچہ متحد ہین مگر محل استعمال مختلف ہے۔ عربی مین فنکشن کے لیے بحالت مفرد "وظیفہ" اور بحالت جمع "وظائف" آتا ہے۔ ڈیوٹی کے لیے بحالت مفرد "واجب" اور بحالت جمع "واجبات" استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اُردو مین فنکشن اور ڈیوٹی دونون کے لیے لفظ "فرض" ہی بولا جاتا ہے جو اگرچہ صورۃً غلط نہین ہے مگر توسع زبان اور تدقیق علمی کے لحاظ سے صحیح نہین اسی لیے ایک عرصے سے ہم وظیفہ اور وظائف کو فرائض کے معنون مین استعمال کرتے ہین تاکہ اپنے صحیح معنون مین یہ الفاظ رائج ہوجائین۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اُردو کے بڑے بڑے مترجمون نے بھی آجتک اس فرق کو محسوس نہین کیا، اور ہر جگہ فرض ہی کا لفظ لکھتے رہے جب تک ملک مین عربی دان مترجم علوم جدیدہ پیدا نہونگے اردو کی یہ بدبختی لاعلاج رہے گی۔ اس حقیقت پر رویئے تو بہت سے مدعیان علم و تراجم کو شاق گذرتا ہے۔ یہ دوسری مصیبت ہے۔

کہ حیوانات کے فرائض سے ہمین اسطرح بحث کرنا نہین چاہیے جس طرح کہ ہم انسان کے فرائض سے بحث کرسکتے ہین"

"اور اگر جسم و دماغ کے باہمی تناسب کے لحاظ سے دیکھیے تو سب سے زیادہ ایپ اور اسکے بعد کُتّے کا دماغ بڑا نظر آتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن جانورون کے متعلق معلوم ہوگیا ہے کہ اُنھین اصلی روح کے قویٰ ملے ہین اُنکے دماغ بھی نسبتہً بڑے ہین"

"مین نے مدرسنشین علماء الٰہیات اور دنیادار فلاسفہ کی تحریرون مین تین جوفون کے متعلق جو کچھ پڑھا ہے اُسپر مجھے حیرت ہوتی ہے"

اس آخری فقرہ مین ڈیسیلی اس جس خاص رائے سے اتفاق نہ کرسکا وہ لوگون کا یہی خیال تھا کہ دماغ کا ایک بہت ہی اندرونی جوف قدرت نے صرف احساسات کے لیے رکھا ہے۔ مثلاً اس کا درمیانی حصہ تخیل کے لیے ہے۔ آخری حصہ حافظہ کے لیے وغیرہ وغیرہ۔

دراصل اس خیال کے موجد علماء عرب ہین جسے بعد مین ڈنس اسکوٹس اور طامس آکنیوئس وغیرہ نے اختیار کیا۔

روح اور پی نی ال گلینڈ

ان کوششون کے بعد روح مین ایک مقامی حیثیت پیدا کرنے کے لیے جو کوشش کی گئی، اُس کا بانی ایک فرانسیسی عالم رینی ڈیکارٹ ہے۔ یہ کوشش جس قابلیت سے کی گئی تھی اُسیقدر اسے شہرت بھی حاصل ہوئی۔ یورپ کے فلسفی اعظم نے روح کو پی نی ال گلینڈ[1] مین رکھا ہے۔

یورپ کے اس جلیل القدر فلسفی نے روح کے قیام کے لیے پی نی ال گلینڈ کو تجویز کیا۔ مقامی مسکن کے اس انتخاب کی تائید مین دلائل تو کیا البتہ اُن کی ایک نمایش ضرور تھی۔ اسکے موجودہ خیال کے مطابق روح ایک ایسی شے تھی جو نہ تو تقسیم ہوسکتی تھی اور نہ جگہ مین پھیل سکتی تھی۔ اس لحاظ سے اسکے رہنے کے لیے جسم کا کوئی حصہ سادہ اور تنہا پی نی ال گلینڈ کے برابر موزون نہ تھا۔ ڈیکارٹ کہتا تھا کہ یہان روح ایک حاکم یا نگران کی طرح رہتی ہے، تمام حواس اسے اطلاع دیتے رہتے ہین اور وہ اُن اطلاعات کے مناسب ہر طرف احکام جاری کرتی ہے۔ مگر ڈیکارٹ کے خیالات کا ایک پہلو بالکل تاریک تھا۔ کیونکہ انکے تبعین کو ادنیٰ درجہ کے حیوانات مین نفسِ ناطقہ کے وجود سے انکار رہتا، اور اس بنا پر اُنکی یہ تعلیم تھی کہ وحشی مخلوقات کے اعضا کی حرکت نادانستہ اور بلا ارادہ ہوتی ہے۔ اس فلسفیانہ حماقت کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ بعض ڈیکارٹیون نے ادنیٰ درجہ کے حیوانات پر صریح ظلم کیے۔

ڈیکارٹ کی بڑی بدقسمتی سے جب اس خوردبین کے ذریعہ سے اس عضو کا امتحان کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ اسمین کچھ لاغر غُلّے، کولا، چونا اور بعض اور ارضی مادہ کے بلورات ہوتے ہین۔ غرض روح کے لیے یہ ایک نہایت ہی ناموزون قیامگاہ تھا۔

اسکے بعد اب ہمین اس موضوع پہ ایک جلیل القدر انگریز اور اپنے آغاز عمر مین ہاروے کے شاگرد طامس ولس ایم۔ ڈی کے خیالات پر توجہ کرنا چاہیے۔ ولس نے اگرچہ اعصاب پر بہت کچھ لکھا ہے مگر عام قارئین کو ڈیکارٹ کی طرح اسکے خیالات بہت کم معلوم ہونگے۔ ڈیکارٹ کے خیال کے بموجب تو روح حتی الامکان قریباً ایک ناقابل تقسیم نقطہ ہے جو ایک ایسے عضو مین رہتا ہے جو بالکل بسیط و وحید ہے۔ مگر ولس کے نزدیک دو روحین ہین جن مین سے ایک خون مین وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے اور دوسری نظام عصبی مین رہتی ہے۔ ولس کا دعویٰ تھا کہ روح خون مین اسطرح رہتی ہے جیسے آگ مین شعلہ، اور نظام عصبی مین اسطرح جیسے آگ مین روشنی۔ دماغ سے روح کا جس طرح کا تعلق ہے اسکی تشریح ولس نے یہ کی ہے:

"خون کا سب سے زیادہ ہلکا اور روح آمیز حصہ شرائین کے ذریعہ سے دماغ کی طرف چڑھتا ہے، یہان پہنچ کے اُسکی تقطیر ہوتی ہے اور حیوانی روحین نکلتی ہین۔ یہ روحین دماغ کے اگلے اور پچھلے حصون پر چڑھتی ہین اور

---

[1] دماغ کے بالکل اندرونی حصے مین ایک چھوٹا سا غدود مٹر کے دانے کے برابر ہوتا ہے جسکو موجودہ علم تشریح کی اصطلاح مین "پی نی ال گلینڈ" کہتے ہین۔

وہاں سے تمام اعصاب میں اُتر جاتی ہیں"

اختیاری احساسات و حرکات کے لیے وہی روحیں ہیں جو دماغ کے اگلے حصہ میں رہتی ہیں اور پچھلے حصہ میں جو رہتی ہیں وہ غیر اختیاری حرکات کے لیے ہیں۔

موجودہ تجارب کی روشنی میں یہ آخری خیال دلچسپ ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ جس طرح بیان کیا گیا ہے ہم حرف بحرف اُسے طرح تسلیم نہیں کر سکتے تاہم یہ خیال اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جو اب ایک امر واقعہ ہے یعنی یہ کہ دماغ کے پچھلے حصے کی تمام کارروائیاں شعور کے دائرہ سے باہر ہوتی ہیں یقیناً وِسؔ کو یہ خیال جھلملاتا ہوا نظر آیا تھا کہ احساسات اور اُنکی یادگاریں دماغ کے مایۂ خمیر کے تغیرات ہیں۔ چنانچہ اس نے ان صورتوں کا تذکرہ اسی انداز میں کیا ہے۔

وِسؔ کی ایک کتاب جس کا نام "حیوانات کی روح کے متعلق" ہے اسم بامسمیٰ ہے۔ اس کتاب میں وِسؔ نے روح کو دماغ کے نصف دائروں میں رہنے کی اجازت دی ہے۔

لیکن بہرحال وہ یہاں بھی اُن لوگوں کی بدولت چین سے رہنے نہ پائی، جن کو یقین ہے کہ اسکے رہنے کے لیے کوئی محدود جگہ جسمانی ڈھانچے کے اندر چاہیے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس خیال کی مخالفت کرتے رہے، جب ہم علم سائنس کے درخشاں نوجوان ذہین نیکولس سٹینسن المتوفی سنہ ۱۲۸۶ء کے پاس آتے ہیں تو ہم اُس اولین کوشش کے پاس آتے ہیں جو موجودہ رائے کے اظہار کے لیے کی گئی ہے یعنی یہ کہ "وظائف" کی جگہ دماغ کے اندر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے علم القیافہ والے نقل کرتے ہیں اور علم وظائف الاعضاء والے مانتے ہیں۔

سٹینسن نے جہاں عصبی مادہ کے سفید مغز میں ریشیوں کے وجود پر بحث کی ہے وہاں اس خیال کو اسطرح ادا کیا ہے۔

"اگر درحقیقت سفید مادہ بالکل ریشہ دار ہے تو ہمکو یقیناً یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان ریشوں کی ترتیب کسی خاص ایسی وضع پر رکھی گئی ہے جسکے ساتھ یقیناً حرکات کا اختلاف وابستہ ہے۔

لیکن اس تجربہ کے ساتھ اتنے مشکلات ہیں کہ نہ معلوم کسی خاص طرح کی تیاری کے بغیر ہم اس طریق امتحان کو عمل میں آتے کبھی دیکھ بھی سکینگے یا نہیں؟"

"ہم کو اس خاص طریقہ کی تیاری کے لیے دو سو برس تک انتظار کرنا پڑا" یہ خیال علماء کے دل میں عرصہ سے جاگزین تھا کہ ایک روح تو مرکزی ہے" اور دوسری اعصاب، حواس، اور متحرک اعصاب میں کارفرما ہے۔ چنانچہ سر اسحٰق نیوٹن جیسے دماغی قوتوں کے دیونے بھی یہی فرض کیا ہے۔

لیکن مشہور جرمن مفکر جارج ارنسٹ المتوفی سنہ ۱۲۶۰ء جو اختراق کے خیال کا بانی ہے، اُس نے پھر یہ خیال ظاہر کیا کہ روح تمام جسم میں ساری و نافذ ہے۔ اُس نے کہا کہ روح درحقیقت ایک "حساس ہوا" ہے جو تمام جسم میں نافذ ہو کے ہر عضو اور ہر نسیج پر قابض ہو جاتی ہے۔ اسکے ان خیالات کو ہوائیت اور ان خیالات کے قائل کو ہوائی کہتے ہیں۔

اس مسئلہ کے متعلق موجودہ ارباب فکر اب اس سوال پر پہنچے ہیں کہ "کیا احساس کے لیے صرف دماغی عمل کی ہمراہی کی ضرورت ہے یا اسکے ساتھ زیرین مرکزوں اور پی نی ال گلینڈ کی معیت بھی ہونی چاہیے؟ اس سوال کا جواب اس مسئلہ کا حقیقی حل ہے۔

اس وقت علماء حیات میں ایک شخص بھی نہیں ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ احساس میں بیداری پی نی ال گوارڈ کی کارگذاری سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ نظام عصبی کے متعلق جو تجارب ہوئے ہیں وہ اس نتیجہ کے منافی ہیں رہا ذہن اور ہیجان جذبات کے لیے کسی مقام کی تعین کا مسئلہ تو اُسکی حالت یہ ہے کہ احساس کے مادی تعلقات کے متعلق علمی (سائنٹفک) طور پر جو کچھ تحقیق ہو چکا ہے اُس سے علماء قیافہ نہ آگے بڑھے ہیں نہ پیچھے ہٹے ہیں۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ جان جوزف گال المتوفی

۱۸۲۸ء (جسکے متعلق مشہور ہے کہ وہ علم القیافہ کا بانی ہے) وہ بھی اسکا قائل تھا۔ کیونکہ یہ تو اُس پر ایک بہتان ہے۔ وہ بیچارہ نہ تو اس نام کا واضع ہے اور نہ ان خیالات وعقائد کا بانی جن کا نام علم القیافہ رکھا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ گال پر اس خیال کا رنگ چڑھ گیا تھا کہ بعض عقلی اوصاف کا مسکن دماغ ہے مگر کب؟ جب اُسکا سِن آگیا تھا۔

اُس نے بجا طور پر یہ فرض کیا ہے کہ عقلمندانہ گفتگو اور یادداشت کے لیے خاص خاص مرکز ہین۔

بیشک گال نے جرمنی کی مختلف یونیورسٹیون مین مختلف دماغی وظائف پر تقریرین کین لیکن جس حیثیت سے آج ہم علم القیافہ کو جانتے ہین، یہ بات اسمین گال کے ایک رفیق نے پیدا کی جو کمتر ایک عالم اور زیادہ سے زیادہ ایک ہردلعزیز خطیب تھا۔

علم القیافہ کے عقائد یا اسکی ہرزہ سرائیان اسقدر مشہور اور ان کی تغلیط اتنے بار ہو چکی ہے کہ اب ہم انکے دام تزویر مین تو نہین آسکتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ہم مین سے بہت سے لوگ ایسے ہون جنکو اس جوش وخروش کا علم نہ ہو جو علم القیافہ نے گذشتہ صدی کے ابتدائی سالون مین پیدا کیا تھا۔

ایڈنبرا مین علم القیافہ کی جو سوسائٹی قائم ہوئی تھی اسمین ۱۳۰ ممبر تھے۔ لندن کی سوسائٹی مین ۳۰۰ ممبر تھے۔ اور گلاسگو کے "اینڈرسن کالج" مین اسکی ایک کرسی (چیر) قائم کی گئی تھی۔

اب یہ سوال نہین ہے کہ روح کہان رہتی ہے؟ سوال صرف یہ ہے کہ دماغی نسیج کا کون سا تغیر ایسا ہے جس کی وجہ سے عقلی عمل کے لیے جسمانی عمل کا رفیق پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب تو ارعقل کام کرتے ہین تو اُنکے ساتھ تو ارجسمانی بھی کام کرنے لگتے ہین۔ رہا یہ کہ ان دونون عملون مین نہایت شدید ارتباط و وابستگی ہے، تو یہ ایک ایسا امر ہے جسمین کسی کو شک نہین۔

ابھی تھوڑے عرصہ قبل تک علمارقیافہ اسپر قائم تھے کہ وہ احساس کے حالات کو اُن عصبی خلایا کے حالات پر محمول کردیا کرتے تھے جو ایک گورے رنگ کے مادہ مین ہوتے ہین۔ یہ مادّہ ایک غلاف مین لپٹا ہوا اُن نصف دائرون مین ہوتا ہے جو دماغ کے اندر ہوتے ہین۔

لیکن آکسفورڈ کے ڈاکٹر میک ڈوگل وظائف الاعضائی علم القیافہ کے ماہر ہین۔ انھون نے بعض ایسی شہادتین پیش کی ہین جن سے پتہ چلتا ہے کہ بعض ایسے نقطے ہین جہان عصبی خلایا کے اعمال آکے ملجاتے ہین اس طرح جیسے احساس کا مرکز یہی خلایا ہین۔

یہ مسئلہ تمامتر خصوصیین (اکسپرٹس) کی دلچسپی کا ہے اور وہی اسکو حل بھی کرسکتے ہین۔

لیکن اگر یہ مسئلہ حل ہوجائے، جب بھی یہ واقعہ تو بدستور باقی رہے گا کہ علم طبیعی (نیچرل سائنس) کو کسی ایسے نفس کا علم نہین جو مادہ سے علیحدہ ہو، بلکہ جو کچھ اسکے علم وتجربہ مین آیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاص قسم کا مادہ ہے جس کا تعلق اس شے کی بقا و ترقی سے ہے، جس کو ہم نفس کہتے ہین۔

ابوالکلام آزاد (دہلوی)

العصر

غرائب الافلاک

اولم ینظروا فی ملکوت السماوات والارض وما خلق اللہ من شئی؟

گرمیون کی راتون مین جبکہ آسمان ابر وغبار سے صاف، ور چھوٹے بڑے ستارون سے جگمگا رہا ہو تو کون ایسا بیدل ہی جسکی نظر ایکبار اس باصرہ نواز جمال طبیعی کی طرف نہ اُٹھ جائے گی؟ ان دیکھنے والون مین کتنے ہی ایسے ہونگے جو ایکبار تو ضرور اپنے دل سے پوچھ لیتے ہونگے کہ:-

چیست این گنبد طلسمی کار؟

لیکن اگر آج جبکہ فطرت کے نوامیس واسرار کے کشف وادراک مین انسان کو اس درجہ توغل وانہماک ہی ہمارے دلون مین یہ خیال پیدا ہوتا ہی تو آج سے بہت پہلے اُسوقت بھی لوگون کے دلون مین یہ خیال پیدا ہو چکا ہی جبکہ نوامیس طبیعہ سے انسان کے جہل اور عدم ارتقاء فکری کا یہ حال تھا کہ وہ ہر اثر طبیعی کے لیے ایک علیحدہ خدا مانتا تھا، اور اسطرح اسکے ہزارہا خودساختہ معبود تھے جن کے ہیاکل ومعابد مین اس کا سرنیاز خم اور دست دعا بلند ہوتا تھا۔

حیوان اور انسان، دونون ایک ہی شے کو دیکھتے ہین، وہ شاگر حیوان کیلیئے ضرورت کی ہوتی ہی اور اُسکو اس وقت اس شے کی حاجت بھی ہوتی ہی تو وہ رُکتا ہی اور اس سے متمتع ہوتا ہی، ورنہ ایک غلط انداز نظر ڈالتا ہوا گذر جاتا ہی،

لیکن انسان بہرحال رُکتا ہی اور سوچتا ہی کہ یہ کیا ہی؟ کہان سے آئی؟ کیونکر آئی؟ وغیرہ وغیرہ

یہی شے ہی جسکو "تجسس وتفحص" کہتے ہین، اور یہی انسان کے تمام علوم ومعارف کا سرچشمہ، اور اُسکے مساعی ومجاہدات فکریہ کا محرک اصلی ہی اور اسی لیے قرآن کریم نے جابجا تدبر وتفکر پر زور دیا ہی،

لیکن یہ کیسی عجیب بات ہی کہ اس تجسس کے عمل کا آغاز زمین اور اسکے قرب وجوار کی اشیاء کے بجائے سب سے پہلے آسمان سے ہوتا ہی!

تم نے دیکھا ہوگا کہ بچے جب پوری طرح بولنے لگتے ہین اور اپنی مان کی آغوش مین شب کو صحن مین بیٹھتے ہین، تو کون و مافی الکون کے متعلق انکے سوالات کا آغاز آسمان اور ستارون ہی سے ہوتا ہے، وہ پوچھتے ہین کہ آسمان کیا ہے؟ کیا ستارے اسمین جڑے ہوے ہین؟ چاند بھی جڑا ہے؟ چاند کیا چلتا ہے کیا اسکے بھی ہماری طرح پانون ہین۔

اسکے مقابلہ مین آب و آتش، خاک و باد، اشجار و اثمار، حیوانات و جمادات یعنی جو چیزین زمین کے متعلق ہین، انکی نسبت سوال کی نوبت بمشکل سن شعور تک پہنچنے کے بعد آتی ہوگی۔

نوع کا دماغ بالکل افراد کے دماغ کے مشابہ ہوتا ہے پس جسطرح کہ افراد کے دماغ پہلے سما و مافی السماء کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہین اسیطرح غالباً نوع کا دماغ بھی سب سے پہلے سما و مافی السماء کی طرف متوجہ ہوا۔

وجہ تقدم خواہ صرف یہی ہو، یا اسکے علاوہ اور اسباب بھی ہون مگر تاریخ علوم کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ انسان کا قدیم ترین سرمایۂ علمی آسمان ہی کے متعلق ہے۔

دنیا کے قدیم ترین لوا برداران علم ہندوستانی، مصری اور کلدانی ہین اور تاریخ علوم کا یہ ایک اہم مبحث رہا ہے کہ ان مین سے شرف اولیت کا حقدار کون ہے۔

اس بحث کا نہ تو یہ موقع ہے اور نہ ضرورت ہے اس لیے ہم اس کو قلم انداز کرتے ہین، شرف اولیت خواہ کسی کو حاصل ہو، مگر تینون قومون مین علوم فلکیہ نہایت ترقی کر چکے تھے انکے جانشین یونانی ہوے۔ یونانیون مین بھی علوم فلکیہ کی گرم بازاری رہی۔

ان تمام امم سابقین نے علوم فلکیہ کی بیحد خدمت کی، اور بعض مسائل تو ایسے دریافت کیے کہ اگر آج باین ہمہ تقدم علوم و توسع معلومات و انکشافات وہ مسائل دریافت ہوتے تو علمی دنیا صدا ہاے تحسین و آفرین سے گونج اٹھتی۔

ان اسلاف کے دریافت کردہ بعض قواعد ایسے ہین جن سے گو بوقت کسی وجہ خاص سے صحیح نتائج نہ نکالے جا سکین، مگر وہ قواعد بجاے خود بالکل صحیح اور بہترین قواعد ہین، اور آج ہمارے بہت سے مسائل کا مبنی و اساس۔

مثلاً زمین، آفتاب، اور ماہتاب کو لو۔ زمین سے یہ دونون ستارے بہت دور ہین مگر ان دونون کے بُعد مین کیا نسبت ہے؟ ارسترافس نے آج سے دو ہزار دو سو برس پہلے قیاس سے کہا تھا کہ یہ نسبت ایک اور بیس کی ہے یعنی چاند زمین سے جسقدر دور ہے سورج اس سے ۱۹ گونہ زیادہ دور ہے۔ ہرچند کہ ارسترافس کا یہ قیاس صحیح نہین آفتاب و ماہتاب کے بُعد مین اس سے کہین زیادہ نسبت ہے، مگر باین ہمہ جس قاعدہ کی بنا پر اُس نے یہ نتیجہ نکالا تھا، وہ قاعدہ بالکل صحیح اور اس درجہ دقیق و غامض ہے کہ اس زمانے کے فلکیین مین سے عوام ایک طرف، خواص کا ذہن بھی شاید وہان تک نہ پہنچتا۔

تمام علوم کی طرح علم الفلک پر بھی تقدم و تاخر اور ترقی و تنزل کے مختلف دور گزر رہے ہین۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ اوج ترقی پر تھا، نئے ستارون کے انکشافات، مقدار رفتار، سمت رفتار، ایام طلوع و غروب وغیرہ وغیرہ مسائل کی تحقیقات سے اسکے سرمایہ مین اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ تنزل شروع ہوا، یہان تک کہ بالآخر رفتار ترقی جمود و سکون سے بدل گئی۔ اسوقت کے علم الفلک کا سرمایہ صرف اسلاف کے آرا و افکار تھے۔

یہی حالت رہی یہان تک کہ گلیلیو اطالی پیدا ہوا۔ گلیلیو نے اس جمود کو حرکت سے بدلا اور اس انقلاب عظیم کی داغ بیل ڈالی جو ہم اسوقت دیکھ رہے ہین۔

دراصل اس انقلاب کا سبب وہ چھوٹی سی دوربین تھی جو اس نے ۱۶۰۹ء مین بنائی تھی۔ اس دوربین سے اس نے ستارون کے دیکھنے

مین مدد لی اس تجربہ مین جب اسکو کامیابی ہوئی تو اسی اصول پر اُس نے ایک بڑی دوربین بنائی - اس بڑی دوربین کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ مشتری کے گرد گردش کرنے والے چاند نظر آ گئے -

گلیلیو کی دوربین ایک خاص حد تک بڑھائی جا سکتی تھی - پس اگر آلات رصدیہ کی ترقی اس دوربین تک آ کے رُک جاتی تو یقیناً یہ انقلاب اسقدر عظمت و وسعت اختیار نہ کر سکتا -

لیکن بند ٹوٹ چکا تھا اور عرصہ کے رُکے ہوے پانی مین حرکت شروع ہو گئی تھی، یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی جمود طویل کے بعد حرکت شروع ہوتی ہے تو پھر بغیر کسی شدید امداد کے وہ نہین رک سکتی چند ہی سال گذرے تھے کہ اسی اصول پر بلور سے دوربینین بنائی گئین جو بہت زیادہ بڑھائی جا سکتی تھین چنانچہ اسی زمانہ مین ہرشل نے اتنی بڑی دوربین بنائی جس کا چونگا ۴۰ قدم (فیٹ) لمبا تھا - اس دوربین سے اُس نے وہ ستارے دیکھے جو گو حجم مین آفتاب سے بہت زیادہ بڑے ہین مگر اپنی بُعد مسافت کی وجہ سے کروڑون سال مین اُن کی روشنی ہم تک پہنچتی ہے - یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نور کی رفتار فی ثانیہ (سکنڈ) دو لاکھ میل ہے

دوربین کی اس غیر معمولی ترقی نے اکتشافات کا دروازہ کھول دیا اور ایسے ایسے عجیب و غریب حقائق ہیئتہ بے نقاب ہوے جنکا وہم و گمان بھی قدما کو نہ تھا -

تم نے بارہا تارون بھری رات مین چھوٹے چھوٹے صدہا ستارے چمکتے ہوے دیکھے ہون گے، مگر شاید کبھی تمھین ان کی اصلی حقیقت کا وہم بھی نہ ہوا ہو گا -

یہ ترقی یافتہ دوربین بتاتی ہین کہ یہ ستارے جو ہمین اسقدر صغیر الحجم مثل نقطے کے نظر آتے ہین، دراصل ہمارے آفتاب کی طرح بڑے بڑے آفتاب ہین - ان مین سے بعض ایک ہین اور بعض دو کا مجموعہ انکے رنگ کی طرح ان کا مادہ قوام یا یہ خمیر بھی مختلف ہے بعض بلکل قوام گیس سے ہے اور بعض چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہین -

اسی طرح ایک ستارہ ہے جسے عرب "غول" کہتے ہین - اس ستارہ کی یہ حالت ہے کہ کبھی کبھی اسقدر ماند پڑ جاتا ہے کہ بمشکل نظر آتا ہے - عنترہ عبسی ایک مشہور شہسوار اور نبرد آزما عربی شاعر ہے وہ کہتا ہے ؎

والغول بین یدی یظہر تارة
ویکاد یخفی مثل ضوء المشعل

ترجمہ :- اور ستارہ غول کبھی تو اسقدر پر نور ہوتا ہے کہ خوب ظاہر و واضح نظر آتا ہے اور کبھی اسقدر ماند ہو جاتا ہے کہ مشعل کی روشنی کی طرح معلوم ہوتا ہے کہ چھپ جانے کو ہے

اس تغیر و ظلمت و نور کے اسباب پہلے غیر معلوم تھے مگر اب تحقیق ہو گئے ہین - اصل یہ ہے کہ جسطرح ہماری زمین کے گرد چاند گردش کرتا ہے اسی طرح اس ستارے کے گرد بھی ایک اور ستارہ گردش کرتا ہے - یہ دوسرا ستارہ خود روشن نہین ہے بلکہ تاریک ہے - اس لیے جب وہ گردش کرتے کرتے غول کے اس حصے کے سامنے آ جاتا ہے جو ہماری زمین کے بلمقابل ہے تو غول کا نور کم ہو جاتا ہے اور ہماری نظر سے تقریباً مخفی و مستور ہو جاتا ہے - پھر یہ دوسرا ستارہ جسقدر ہٹتا جاتا ہے اُتنا ہی غول بھی نظر آتا جاتا ہے یہان تک کہ بالکل درخشان اور چمکتا ہوا نمایان ہو جاتا ہے -

ستارہ "قطب" دراصل چار ستارون کا مجموعہ ہے، انھین سے تین تو نہایت درخشان ہین اور ایک کسی قدر کم روشن ہے -

"رجل الجبار" دراصل دو آفتاب ہین - اس میں سے ایک سفید اور ایک نیلگون ہے -

تم نے دیکھا ہو گا کہ شب کو چھٹکے ہوے تارون مین چند ستارون کے گچھے یا جھرمٹ نظر آتے ہین، موجودہ تحقیق یہ ہے کہ اس قسم کے ستارے کم از کم ایک لاکھ ۴۰ ہزار ہین - بلکہ اغلب یہ ہے کہ تمام ستارون مین سے ایک ثلث اسی طرح مزدوج ہین -

جس طرح ہمارا عالم شمسی ہے اسیطرح ان نجوم مزدوجہ کے بھی عوالم شمسیہ ہین۔ بالفاظ واضح تر جسطرح ہمارے عالم مین ایک آفتاب ہے وہ اپنی جگہ پر ساکن ہے اسکے گرد تمام دوسرے سیارے گردش کرتے ہین اسیطرح ان نجوم مزدوجہ مین بھی ایک ستارہ مثل مرکز کے اپنی جگہ پر قائم ہے اور باقی ستارے اسکے گرد پھر رہے ہین۔ البتہ ہمارے عالم اور ان ستارون کے عوالم مین فرق یہ ہے کہ ہمارے عالم کے ستارون کے حجم مین باہم بہت فرق ہے مثلاً ہمارا آفتاب مشتری سے ۱۰۴۰ گونہ بڑا ہے اور اپنے تمام سیارات کے اعتبار سے ۷۰۰ گونہ۔ مگر ان نجوم مزدوجہ کے عالمون مین شاید اسقدر تفاوت نہین، وہان بڑے سے بڑا ستارہ چھوٹے سے چھوٹے ستارے سے چار گونہ بڑا ہے۔

بعض علماء کہتے ہین کہ اغلب یہ ہے کہ ان ستارون مین سے ہر ستارہ ہمارے آفتاب کے مانند ہے یعنی اتنا ہی یا اُس سے زیادہ بڑا ہے اور اُسکے گرد دیگر سیارات گردش کرتے ہین۔ اس خیال کا جزو اول یعنی کبر حجم تو ایک غیر مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ البتہ دوسرا جزو یعنی اسکے گرد ستارون کی گردش البتہ ایک حد تک محل نظر ہے، کیونکہ اسکے ثبوت کی کوئی دلیل نہین، اور برعکس اسکی نفی کی تائید مین دلائل ملتے ہین۔

پہلے رصد کا قاعدہ یہ تھا کہ رصدگاہ مین بیٹھکے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے تھے ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کسقدر وقت ضائع کرنے والا اور موجب تعب و دقت تھا، مگر اختراعات کی کثرت و آلات و ادوات کے توفر نے جہان اور بہت سی انسانی مصائب کو کم کیا، وہان اس علمی مصیبت کو بھی آسان کردیا۔

علما نے رصدگاہون مین بیٹھنا کم کردیا، اسکے بدلے دوربینون کو اسطرح رکھا کہ وہ ستارون کے ساتھ ساتھ گھومتی جائین پھر اُن دوربینون سے آلات تصویر کو اسطرح ملا دیا کہ وہ بھی دوربینون کے ساتھ ساتھ گھومتے رہین اور اجرام سماویہ کے ہر رُخ کا عکس ان آلاتِ تصویر پر پڑتا رہتا ہے اسطرح بغیر رصدگاہون مین بیٹھنے کی زحمت گوارا کیے وہ تمام باتین معلوم ہوجاتی ہین جو کئی کئی دن تک بیٹھنے کے بعد معلوم ہوتی تھین۔ یہ آلات تصویر ستارون کی ہر نقل و حرکت کی تصویر لے لیتے ہین۔ گویا اب یہی آلات تصویر ان علماء راصدین کی قائم مقامی کرتے ہین جو رصدگاہون مین لیل و نہار مراقب رہا کرتے تھے۔

اس طریقہ سے علاوہ اقتصاد وقت و محنت کے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ستارہ خواہ کتنی ہی دور ہو اسکا نور جاہے جسقدر بھی کم ہو اور حرکت و تغیر خواہ کتنی ہی خفیف ہو مگر لوحِ تصویر پر ہر نقل و حرکت پوری پوری آجاتی ہے اور وہ دقیق و تاریک چیزین جو آنکھ کے دسترس سے باہر تھین اور اسلیے رہ جاتی تھین اب کسی طرح نہین رہ سکتین؟

فن آلات سازی کی ترقی نے وہ وہ محیر العقول کرشمے دکھاے ہین کہ اگر آج سے چند صدیان پہلے یہ آلات ہوتے تو صاحب آلات ساحر یا شعبدہ باز سمجھا جاتا۔ اگر آج سو برس پہلے کے لوگ زندہ ہوجائین اور دنیا کے موجودہ حالات دیکھین تو غالباً اپنے آپ کو عالم خواب یا کسی طلسم کدہ مین سمجھین کیونکہ آج اسرار و نوامیس طبیعت کے انکشاف اور آلات کی ترقی سے جو حیرت انگیز کام انجام پارہے ہین، ان تک اسلاف کا وہ مخیلہ بھی نہ پہنچا تھا، جو ساحرون اور اجنہ کی ہوش ربا داستانین تصنیف کیا کرتا تھا۔

ترقی آلات کی ایک مثال وہ آلہ ہے جسکو رنگ نما[1] spectroscope کہتے ہین اس آلہ سے نور کے مختلف رنگ جدا کیے جاتے اور ان رنگون کے

لیکن انوان نورنما کی ترکیب طویل و ثقیل تھی۔ اگر نور حذف کردیا جائے اور

---

[1] یہ نام دو لفظون سے مرکب ہے ایک اسپیکٹرا اور دوسرا اسکوپ۔ اسپیکٹرا جمع ہے اسپیکٹرم کی جو ایک لاطینی نژاد کلمہ ہے۔ اسپیکٹرم کے لغوی معنی ہین وہ مختلف رنگ جو آنکھین بند کرنے کے بعد نظر آتے ہین۔ مگر اصطلاح مین نور کے ان رنگون کو کہتے ہین جو ایک مثلث آلہ کے ذریعہ سے جسے Prism کہتے ہین، جدا کرکے اس طرح دکھلائے جاتے ہین گویا وہ کسی جالی پر پھیلا دیے گئے ہین۔ اسکوپ کے معنی ہین نما، پس اسپیکٹرا اسکوپ کے لفظی معنی ہوئے انوان نورنما اور یہی اس آلہ کی تعریف ہے۔

امتحان و اختبار سے اس جسم منور کے مادہ کا سُراغ لگایا جاتا ہے مثلاً ایک جسم منور مسی ہے تو اسکے نور کی تحلیل سے سبز خطوط پیدا ہو نگے یا اگر رنگ کا ہے تو نیلگون خطوط پیدا ہون گے۔ وقس علی ذلک۔

اس آلہ "رنگ نما" سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جسم منور کا قوام جامد ہے یا کوئی گیس؟ اور آیا وہ کسی گیس کے لفافہ میں ملفوف ہے یا نہیں؟

جس طرح ٹرین کی سیٹی سے اسکے قرب و بُعد اور سمت کا اندازہ ہو جاتا ہے اسی طرح اجرام سماویہ کے نور سے انکی سمت و سرعت رفتار کا بھی علم ہو جاتا ہے صرف شعاعوں یا انکے عکس کو دیکھکے علماء فلک معلوم کر لیتے ہین کہ یہ ستارہ آرہا ہے یا جارہا ہے؟ اور نیز یہ کہ اسکی رفتار سریع ہے یا بطی؟ غرضکہ اجرام سماویہ کے متعلق ہماری معلومات کا ایک بڑا ذریعہ انکا نور ہے۔ صرف ایک نور سے ہم ان کے مادہ، قوام، سمت رفتار، اور سرعت و بطی سیر کو معلوم کر لیتے ہین لیکن اُس آلہ "رنگ نما" سے استفادہ آسان نہین کیونکہ اس سے صرف خطوط نظر آتے ہین، اور انُ خطوط سے عناصر کا اندازہ کیا جاتا ہے بعض عنصر مثلاً لوہے سے متعدد اور مختلف اللون خطوط پیدا ہوتے ہین، مگر چاندی کے خطوط اس سے مختلف اور سونے کے ان دونون سے متبائن ہوتے ہین پس اصلی نقطہ کمال اس امر کی تمیز ہے کہ کون خط کس عنصر کے سبب سے پیدا ہوا ہے؟ اور آیا یہ متعدد خطوط کسی ایک عنصر کا نتیجہ ہین یا چند عناصر کے، اور وہ عناصر کون کون ہین؟

اسکے لیے ضرورت ہے کہ راصد (رصدگاہ سے مطالعہ فلک کرنے والا) تجربہ کار، دقیق التمیز، اور صادق التخمین ہو۔

اس آلہ "رنگ نما" کے استعمال سے معلوم ہوا ہے کہ ستارہ شعری، جو ہم سے کئی ملین پر ہے، فی ثانیہ ٦٦ میل کے حساب سے ہم سے دور ہوتا ہے ڈیڑھ دن تک یہی حالت رہتی ہے، اسکے بعد اسی شرح رفتار سے وہ قریب ہونا شروع ہوتا ہے۔

علماء فلک نے پچاس ملین تصویرین ایسے ستارونکی لی ہین جو مختلف مجامع مین منقسم ہین، خود مجامع کی بھی دو قسمین ہین۔ آلہ "رنگ نما" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونون قسمون کی سمتین بالکل مقابل و محاذی ہین۔

یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ ہمارا نظام شمسی یعنی آفتاب مع اپنے تمام سیارون کے ۱۲ میل فی ثانیہ کے حساب سے سماک رامح کی طرف بڑھ رہا ہے اور جسطرح ہمارا نظام سماک رامح سے ملنے کے لیے اسکی طرف جارہا ہے اسیطرح خود سماک رامح بھی ہمارے نظام شمسی کیطرف بسرعت تمام آرہا ہے۔

قدیم علم الفلک مین صرف ایک آفتاب مانا جاتا تھا، مگر موجودہ علماء نے جدید آلات رصدیہ کی مدد سے ایک ہزار ملین آفتاب دریافت کئے ہین یہ تمام آفتاب مع اپنے سیارات کے اس فضائے بسیط مین گردش کرتے رہتے ہین۔ جب کبھی دو آفتابون مین تجاذب ہوتا ہے اور وہ قریب آجاتے ہین تو انکی رفتار ۴ سو میل فی ثانیہ ہو جاتی ہے اس حساب سے وہ ایک گھنٹے سے کم مین مقابل بھی ہو جاتے ہین اور جدا بھی ہو جاتے ہین،

آفتابونکی کثرت، انکی گردش، اور تجاذب و تقارب کے وقت انکی سرعت رفتار کی بنا پر علماء فلک کا خیال ہے کہ دو آفتاب خواہ کتنی ہی دور ہون، مگر ان کا تصادم ہر وقت ممکن ہے اور ظاہر ہے کہ جسوقت دو ایسے آفتابون مین جو چار سو میل فی ثانیہ کے حساب سے چل رہے ہون، تصادم ہوگا تو کیسی قیامت برپا ہوگی!

یہ ہین ان صدہا غرائب افلاک مین سے چند عجائب، جو جدید علم الفلک نے ہمین بتائے پس علم الفلک اپنے قدیمی مرکز پر رہتا تو یہ تمام حقایق اسیطرح ہمیشہ مستور و مخفی رہتے جسطرح کہ اس دور جدید سے پہلے تک رہے۔ ابوالکلام آزاد (دہلوی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲) الوان کو رنگ سے بدل لیا جائے تو "رنگ نما" ہو سکتا ہے یہ ترکیب سبک و سہل ہے اور آسانی زبانون پر جاری ہو سکتی ہے اسی لیے ہم نے "رنگ نما" کو اختیار کیا۔ البتہ اس صورت مین معنی لغوی معنی اصطلاحی کسیقدر عام ہونگے، مگر مداول و استعمال سے اس نقص کی تلافی ہو جائے گی اور تھوڑے عرصے کے بعد "رنگ نما" سے بھی اصطلاح خاص کا استبادر ہونے لگا جسطرح کہ آج خوردبین "دوربین" "مرغ باد نما" وغیرہ سے خاص خاص آلات ہی متبادر ہوتے ہین۔ منہ۔

(سائنس کا ایک سبق)

قدرت کا وہ ناز پروردہ کرشمہ جو اپنی تدریجی ترقی کی رفتار مین مختلف صورتین بدل کر باغ عدن[1] مین انسان کی شکل بنکر ظاہر ہوا، اسکو ہمارے خاکی نہاد سیارہ (زمین) مین سب سے پہلے جن چیزون سے سابقہ پڑا ہوگا وہ وہی معمولی چیزین تھین جو مدت العمر اسکے ساتھ رہین۔ فرش خاک اس کا نرم بچھونا رہا ہوگا۔ اور ہوا کی گرمی اسکے مزاج مین بالیدگی پیدا کرتی ہو گی۔ چند روز کے بعد رہتے رہتے، اسکے دل مین ایک نئی قسم کا اہتزاز ہوا ہوگا، اور پیش آنے والی ضرورتون نے اسے کچھ اور سامان فراہم کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ اب اس نے پہلے پہل ہمت کر کے دریا کے پانی کا پتہ لگایا ہوگا، اور پتھرون سے آگ نکالی ہو گی۔ یہ دریافت اپنی حیثیت کی پہلی دریافت ہو گی جس کی نوعیت اسی وقت پکار اٹھی کہ آئندہ نسل کو ترقی کرنا ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی مددگی قابلیت اپنے آپ مین خود پیدا کرے!

بہت دن گذر گئے ہون گے اور اس نے دیکھا ہو گا کہ دنیا کی قیمتی چیزین ہین (فی زعمہ) سب کی سب اسی مٹی، ہوا، پانی، اور آگ کی محتاج ہین، اور ہر ایک مین کوئی نہ کوئی جزان کا ضرور پایا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ نہ تھا کہ کیمیاوی تحلیل سے اجزاء کی بساطت یا ترکیب دریافت کی جاتی اسکے واسطے اس نے فقط اپنی وجدانی شعور اور دماغی احساس سے کام لیکر ایک کلیہ مرتب کر لیا کہ "جب اسکی محدود دنیا کی تمام چیزون مین انھین چارون کی آمیزش ہے تو خود انمین کسی کی آمیزش نہونی چاہیئے" (دیکھو حکمۃ الافرنج "مطبوعہ مصر ۱۸۹۹ء صفحہ ۷)۔

تجربہ اور حکمت کا یہ پہلا سبق تھا جسپر سائنس کا ایک بڑا دفتر تیار ہوا۔ عناصر کی اصطلاح مقرر ہوئی، اور مان لیا گیا کہ مٹی ہوا آگ پانی، یہی چار عنصر ہین۔ ابتدا مین یہ ایک سطحی تحقیقات تھی جو ایک سرسری انکشاف سے پیدا ہوئی تھی۔ اسکو ساتھ آٹھ ہزار برس ہونے کو آئے ہین، آؤ! دیکھین اس دیرینہ دریافت مین کچھ اضافہ بھی ہوا یا نہین۔

اضافہ ہوا، اور ہوتا جاتا ہے، ابھی کل کی بات ہے کہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی (مرحوم) امرتسر مین علماء ندوہ کو مخاطب کر کے فرماتے تھے ؎

از عناصر سہ و خمسست آمدہ اینک بشمار
تو ہمان در گرد آتش دا آتشی و باد

لیکن آج منکشف ہوا کہ وہی عناصر جو اسوقت ہمارے شمس العلماء کے خیال مین ۳۰ ہو گئے تھے، اب انکی تعداد ۸۰ تک پہنچ گئی ہے جنمین چھ روشنی دینے والے عنصر ہین۔ جدید تحقیقات سے ثابت ہے کہ عناصر اربعہ بھی مرکب ہین، اور انمین بھی اجزا پائے جاتے ہین۔ لیکن ان اجزا سے ترکیب ممکن بھی ہے یا نہین؟ یہ مسئلہ بحث طلب ہے!

اصل یہ ہے کہ اجزاء دو طرح کے ہین۔ ایک تقویمی اور دوسری تحلیلی۔ اجزائے تقویمی وہ ہین جن سے ذات کا قوام ہو، جیسے جسم کے لیے مادہ صورت یا انسان کے لیے حیوان اور ناطق ہونا۔ اجزائے تحلیلی وہ ہین، جو ہیات کل کے معدوم ہونے پر حاصل ہوے ہون۔ جیسے ایک خط کے چار ٹکڑے کہ ہر ٹکڑا جزو تحلیلی ہے۔

مثلاً ہوا مین چار چیزین ہین:۔ (۱) آکسیجن (۲) نیٹروجن (۳) کاربونک ایسڈ گیس (۴) واٹری ویپر۔ لیکن کیا در اصل ان اجزاء سے ہوا کا قوام بھی ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی مین ملے گا، کیونکہ یہ اجزاء کل سے موخر ہین، اور کسی جز کو کل سے موخر نہونا چاہیئے، بیشک یہ اجزائے تحلیلی ہین، اور اِن (قو

---

[1] علم سے ثابت ہے کہ ہوالیہ شلا نہیں ہر ایک کی صورت مین انسان کچھ دور رہ چکا ہے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے آدمی کی شکل اختیار کی ہے۔ باغ عدن کا وقعہ تورات کی پہلی کتاب "سفر تکوین" (بیدائش) مین مذکور ہے۔ اس باغ کا محل وقوع ارض عراق کا میسوپوٹیمیا یعنی بین دو آبہ دجلہ و فرات کی زمین تھی جسکا عربی نام عہد بنی عباس مین جزیرہ ابن عمر تھا۔

تو اجزائے تحلیلی پر جزئیت کا اطلاق خود بطور مسامحہ ہے مع ہذا بے اجزائے تقویمی کے ترکیب بھی نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہوا کو مرکب کہنا صحیح نہیں ہے تنقیح و توضیح کے لیے ہم چند اصول مرتب کرتے ہیں:۔

(۱) جتنے مادیات ہیں وہ یا بسیط ہیں یا مرکب۔

(۲) ہر مرکب کی انتہا لامحالہ کسی بسیط پر ہوگی، ورنہ تسلسل لازم آئے گا۔

(۳) جتنے مادیات ہیں ان سب کا قوام عناصر سے ہے۔

(۴) عناصر حقائق میں ایک دوسرے سے متخالف ہیں۔

(۵) مجموعہ اجزاء کی حقیقت بعینہ کل کی حقیقت ہے جیسے مجموعہ حیوان ناطق بعینہ انسان ہے۔

عناصر میں مثلاً ایک عنصر ہوا ہے۔ وہ بسیط ہے یا مرکب؟ اگر مرکب ہے تو اسکے اجزاء ہوائی ہی ہیں یا کسی اور عنصر کے؟ اگر کسی اور عنصر کے ہیں تو اسکے سب عنصر ہوائی ہونا چاہیے (از روے اصول پنجم) حالانکہ وہ ان کے متخالف ہیں (از روے اصول چہارم) اور اگر وہ اجزا بھی ہوائی ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرکب ہیں یا بسیط؟ مرکب ہیں تو (مثلاً) عنصر غیر متناہی سے مرکب ہونگے جسکو ہم ابھی باطل کر آئے ہیں۔ اور اگر بسیط ہیں تو مدعا ثابت ہے۔ الغرض قول فیصل یہ ہے کہ مثلاً ہوا اگر مرکب ہے تو بہ ترکیب تحلیلی مرکب نہ بہ ترکیب تقویمی۔

اس بحث سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ عناصر چار اور یہ چاروں بسیط ہیں۔ جدید تحقیقات سے انمیں جو اجزاء دریافت ہوے ہیں وہ اجزائے تحلیلی ہیں جن سے کسی جسم کی ترکیب نہیں ہو سکتی۔

اب ہم یہاں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ موجودات عالم کی دو حیثیتیں ہیں: ایک محسوس اور دوسری غیر محسوس۔ دوسری حیثیت کو اس بحث سے تعلق نہیں۔ محسوسات میں کرہ زمین ہے، اور اسکے محیط کرہ ہوا، اور اسکے گرداگرد اجرام سماوی وغیرہ انمیں بھی دو قسمیں ہیں: ایک عناصر دوسرے افلاک۔ عناصر کی تعداد معلم ثانی ابو نصر فارابی نے صرف چار بتائی ہے یعنی

پانی مٹی آگ ہوا لیکن درحقیقت یہ ان کا نہیں بلکہ ان سے پیشتر ابو موسی جابر ابن حیان طرطوسی متوفی ۱۶۱ھ کا مذہب ہے جو امام جعفر صادق کے شاگرد رشید تھے اور جن کو انگریزی فرانسیسی میں جیبر کہتے ہیں۔

اہل یورپ جابر کو فن کیمیا کا موجد بتاتے ہیں۔ جابر کی رائے میں ہر جسم کی ترکیب کے لیے ضروری ہے کہ اسمیں یہ چاروں عنصر مختلف نسبتوں سے جمع ہوں اور کوئی نہ کوئی عنصر بقیہ عناصر پر غالب ہو مٹی کا عنصر غالب ہوا تو جسم ٹھوس ہوگا، مائیت کو غلبہ ہوا تو اسمیں سیلان کی کیفیت ہوگی، ہوا کے جز میں زیادتی ہونے سے گیس[۱] اور آتشی کیفیت بڑہنے سے جسم محترق ہو جائیگا خواہ با حتراق شدید جیسے چراغ کی روشنی، یا احتراق خفیف جیسے لوہے کا زنگ۔

عام طور سے احتراق کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جسم محترق ہو اور اسمیں تدریجاً پراگندگی ہوتا جائے اور اس سے روشنی و حرارت بڑھتی جائے لیکن متقدمین علماء عرب نے یہ تعریف کی ہے کہ جسم کسی ایسے جزو سے جس سے حموضت اور ترشی کی تولید ہوتی ہے (مثلاً آکسیجن) متحد ہو جائے اس سے روشنی یا حرارت پیدا ہوئی تو یہ احتراق شدید ہے ورنہ خفیف۔ جیسے آکسیجن کے ساتھ جست اور رانگے کا اتحاد۔ متاخرین علماء یورپ میں موسیو لافوازیہ کی بھی یہی رائے ہے اور موسیو برتلو نے بھی اسکو پسند کیا ہے۔

اجسام محسوسہ کی دوسری قسم (افلاک) کے متعلق عام رائے حکماء اسلام کے خلاف ہے اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمان افلاک سبعہ میں فقط ایک ایک

لافوازیہ یورپ کا ایک مشہور عالم تھا۔ اسکا قول ہے کہ "علم کیمیا کا موضوع یہ ہے کہ اجسام کو عناصر میں تحلیل کر سکیں اور اسکی غایت و غرض تحلیل اجسام ہے" برتلو اسپر یہ ریمارک کرتا ہے کہ "کیمیا علم تحلیل و ترکیب کا نام ہے اور یہ ترکیب عناصر نہ مرکبات سب میں عام ہے اور اسکی کوئی حد محدود نہیں"

[۱] گیس جس کو اہل مصر "غاز" اور اہل عرب "ہموطیہ" کہتے ہیں اس کے دریافت کا فخر بھی جابر ہی کو حاصل ہے ۱۲

سیارہ کے وجود کے قائل تھے، اور انھیں زحل اور اسکے حلقوں وغیرہ سے اطلاع نہ تھی۔ اعتراض کی بنیاد جس قیاس مع الفارق پر رکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حکماء اسلام ہر فلک کو خاص خاص سیاروں سے منسوب کرتے ہیں، جسکا مطلب وہ یہ سمجھے کہ مسلمانوں کی نگاہ ہر فلک میں ایک ہی ایک سیارہ تک محدود ہے۔ حالانکہ یہ صریح الزام لا یلزم ہے۔ کواکب سبعہ سے افلاک کے منسوب کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اور سیاروں کا علم ہی نہ رہا ہو نہیں اہل عرب کا مذہب یہ تھا کہ خاص سیارے بھی سات ہیں، اور اسی سبب سے وہ افلاک کو بھی انھیں سیاروں سے منسوب کرتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اسکے بھی قائل ہیں کہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے سیارے ہیں جو انھیں سیاروں کے گرد گردش کرتے ہیں۔

ابن ماجہ کا قول ہے کہ "چھوٹے چھوٹے سیاروں میں جو بڑے بڑے سیاروں کے گرد گردش کرتے ہیں، بعض ایسے بھی ہیں جو حرکت میں کسی کے تابع نہیں ہیں"۔ اس قول کا مطلب اب سیکڑوں برس کے بعد یورپین تحقیقات سے یہ ظاہر ہوا کہ زحل کے گرد ۹ سیارے گردش کرتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جتنے چھوٹے سیارے کسی بڑے سیارے کے گرد گردش کرتے ہیں ان سب کی گردش اسی سمت کو ہوتی ہے جس سمت کو خود وہ بڑا سیارہ گھومتا ہے لیکن زحل کے سیارات تسعہ میں ایک ایسا سیارہ دریافت ہوا ہے جسکی حرکت فی نفسہ مستقل اور حرکت زحل کے برعکس ہے۔

افلاک کے یہ معنی نہیں ہیں جو آجکل مستعمل ہیں۔ حکماء عرب کواکب کے اس مدار کو فلک کہتے ہیں جو طبائع یعنی عناصر کے گوناگوں تغیرات کی آخری حد ہو۔ افلاک کی یہ اسلامی تعریف کئی صدی قبل کی ہے جدید تحقیقات نے اتنے دن کے بعد اختلاف بھی ظاہر کیا تو لفظی کہ الفلک عند الافرنج ہو الاثیر المنتشر فی الفضاء الذی فیہ مدارات الکواکب۔ الفاظ کو بدل ڈالو تو مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔

افلاک کو عناصر کا آخری تغیر اس لیے کہتے ہیں کہ عناصر میں تدریجی ترقی ہے ارضیت کا مائیت میں، مائیت سے ہوائیت میں، اور پھر ناریت میں، لیکن نہایت اتصال سے، جسمیں ہر ایک بالقوہ مستعد ہو کہ صعود خواہ ہبوط سے جسم متصل میں مستحیل ہو جائے یہ استحالہ بسا اوقات بالفعل بھی ہوتا ہے صعود سے جن اجسام کا استحالہ ہوگا، ان میں لطافت زیادہ ہوگی، افلاک تک پہنچ کر یہ استحالہ ختم ہو جاتا ہے، اور افلاک تمام اجسام متصلہ سے اسقدر زیادہ لطیف ہیں کہ قوت حاسہ انھیں ادراک بھی نہیں کر سکتی۔ لطافت میں کواکب بھی افلاک کے پہلو بہ پہلو ہیں لیکن فلاسفہ اسلام قائل ہیں کہ حرکات کواکب کی آواز سنی جا سکتی ہے۔ اہل یورپ پہلے تو اس ادعائے محض پر خوب مضحکہ اڑاتے رہے، مگر آخر البرٹسن صاحب نے ایک آلہ ایجاد کر کے یہ ادعا پاس کر دی۔ اس آلہ میں ٹیلیفون اور فونوگراف دونوں کے خواص ہیں۔ اس کا رخ جس میں شیشہ لگا ہوتا ہے، ستارہ کی طرف کر دیا جائے تو اسکی روشنی اسکے ذریعہ سے آلہ میں آجائے گی، اور وہاں وہ آواز کی شکل میں منتقل ہو جائے گی۔

استحالہ کی کیفیت یوں سمجھو کہ حرارت کا درجہ سنٹی گریڈ سے تحت الصفر نیچے اتر گیا تو پانی ایک جسم جامد یعنی برف میں مستحیل ہو جائے گا۔ اور اگر حرارت بڑھتے بڑھتے سو درجہ سے متجاوز ہو گئی تو بخارات پیدا ہوں گے، اور اسی پانی کا گیس بن جائے گا۔ اب اگر اس گیس کی تحلیل کیجائے تو ایک ایسا جزو محترق ملے گا۔ جو لیمپ میں پٹرول کی طرح روشن ہو جائے گا۔ بڑے بڑے شہروں میں ہوائی گیس سڑکوں کی روشنی کے لیے اسی سے بناتے ہیں، جو دراصل ہیڈروجن یعنی وہ جز ہے جس سے پانی کی تولید ہوتی ہے،

جب کبھی حرارت کی کمی یا زیادتی کا کوئی ذریعہ ملے گا تو ان اجسام کی تعداد بڑھ جائے گی جن میں بالفعل استحالہ ممکن ہے سخت سے سخت دھات کو بھی (مثلاً لوہا اور پلاٹین یعنی امریکن سلور) ڈیڑھ دو ہزار درجہ تک کی حرارت پہنچا کر پگھلا سکتے ہیں، اور آزوت (جو ہوا کا جزو اصلی و اساسی ہے) اور آکسیجن (جس سے ترشی اور رائسٹہ کی تولید ہو جاتی ہے) جیسے اجسام ہوائی بھی حرارت کے درجہ تحت الصفر گم کرنے سے پگھل جاتے ہیں۔ آزوت پگھلانے کے لیے ۱۱۰ درجہ تحت الصفر سے کم، اور آکسیجن کے لیے ۱۴۰ درجہ سے کم، اور

ہیڈروجن کے لیے ۲۳۴ درجہ سے حرارت کم کردینی چاہیئے۔

نمائش پیرس مین ہوا پانی مین تحلیل کر کے عام نظارہ کے لیے ایک شیشہ مین بحفاظت پیش کی گئی تھی۔ تماشائی جب اس مین رومال وغیرہ ڈالتے تھے تو وہ بھیگ جاتا تھا لیکن باہر نکالتے ہی رومال سے ایک کثیف دھوان نکلتا تھا۔ کیونکہ قاعدہ ہو کہ جب حرارت پہنچیگی تو بخارات پیدا ہونگے۔

ہوا کو ٹھوس پتھر کی شکل مین بھی بنا کر دکھا سکتے ہین۔ پروفیسر ڈیس نے کئی مرتبہ اسکی آزمائش کی۔ اسمین ایک مقناطیسی قوت بھی پائی جاتی ہو۔ کہ لوہا اگر اس سے چھو جاے تو بمشکل چھوٹے گا۔ ہوا اس ٹھوس حالت مین ایسی سرد ہوتی ہو کہ ابھی تک اسکا صحیح اندازہ نہین ہوسکا۔ غالباً نقطۂ انجماد سے ۳۲۰ درجہ نیچے ہو۔ جعفر برمکی وزیر اعظم خلافت عباسیہ نے جس پیرمرد کو زخم چشم کی دوا کے لیے ۲ تولہ ہوا کا سفوف استعمال کرنے کی ہدایت کی تھی، وہ آج اگر ہوائی منجمد کی حقیقت پہ مطلع ہوتے تو شاید اپنے حکیمانہ مزاج پر انھین ناز ہوتا۔

عبداللہ عمادی

قوّتِ خیال

انسانی عنصر مین دو بڑے قیمتی جوہر رکھے گئے ہین **عقل** اور **خیال**۔ عقل مفاہیم کلیہ کا خزانہ اور خیال جزئیات کا خزانہ ہی۔ اِن دونون ظرفون مین مظروف آتے جاتے رہتے ہین لیکن بہت کم انسان ہین جو مفاہیم کلیہ اور جزئیات ذہنیہ کی ایک دوسرے سے شناخت کر سکین۔ مثلاً ہمارے ذہن مین جب انسانیتِ کلی کا خیال آئیگا تو فوراً معلوم ہوجائیگا کہ یہ وہی انسانیت ہی جو تمام افراد انسانی مین پائی جاتی ہے۔ یہ وہی ماہیتِ کلیہ ہی جس سے تمام افراد انسانی متصف ہین پس مفہوم کا جملہ افراد پر صادق آنا مفہوم کلیہ ہی اور ہر فرد کی نسبت جُدا جُدا خیال ہونا مفہوم ذہنی ہی۔ مثلاً زید کا تصور عقل مین نہین ہی بلکہ خیال مین ہی۔ بمبئی اور کلکتہ وغیرہ کے تصور کا خزانہ عقل نہین بلکہ خیال ہی۔ جب ہم غوص کرتے ہین تو یہ فرق فی الفور محسوس ہوجاتا ہی۔ یعنی بمجرد انتقال اور صدور کے معلوم ہوجاتا ہی کہ فلان شے کا تصور عقل مین ہی اور فلان کا خیال مین۔

خیال مین **قدرت** نے بڑے بڑے اثر رکھے ہین اور اسکو بو العجب حکمتون سے مرکب کیا ہی۔ تمام کاروبار اور تمام سلطنتون کا انتظام محض خیال ہی پر موقوف ہی۔ خیال مین ایک قوّتِ مقناطیسی بھی موجود ہی جو ایک انسان سے دوسرے انسان پر سرایت کرتی ہی۔ مثلاً کسی شخص کی جانب سے تمھارے دل مین رنج اور کدورت ہی تو فوراً اُس کے دل مین بھی کدورت پیدا ہوجائیگی اور جس طرح تم اُس سے کھنچوگے وہ بھی تم سے کھنچے گا۔ "**دل سے دل کو راہ**" ہونے کے یہی معنی ہین۔ ایسے ہی ہر شخص کو اپنے دوست یا دشمن کی غائبانہ حالت بھی اسی خیال کے ذریعے سے معلوم ہوجاتی ہی۔ مثلاً کوئی حرمان نصیب عاشق فراق یار مین تمام رات بسترِ غم پر لوٹے اور یار جفا کار کسی رقیب کے پہلو مین رہے مگر صبح ہوتے ہی جب اِن دونون کی آنکھین چار ہونگین تو شب کا پردہ کھُل جائیگا اور عاشق شرم آلود نگاہون کو دیکھکر صاف کہ دے گا ؎

مجھکو گھڑی گھڑی کی خبر رات بھر ملی
تم تھے جہان وہین مرا ایک خیال تھا — ندرت

جن لوگون نے کچھ حاصل کیا ہی صرف تصفیۂ خیال اور اتحاد و اجتماع خیال سے۔ خیال ہمیشہ منتشر رہتا ہی اور اسکو انسانی تعلقات زیادہ منتشر رکھتے ہین۔ جب کسی شخص پر مصائب نازل ہوتے ہین اور افکار کا ہجوم ہوتا ہی تو قوّتِ خیال بھی تھک جاتی ہی کیونکہ اُسکو کسی ایک کام پر جمنے کا موقع نہین ملتا۔ بہت سے خیالات کا تراکم اور تزاحم ہو کر ایک خیال بھی اپنے ظرف مین جمکر نہین رہ سکتا۔ روح جو مدبّر بدن ہی خیالات کی اصلاح چاہتی ہی مگر بہت سے خیالات کا جمنا تو درکنار ایک خیال بھی اپنا قدم نہین جما سکتا۔ پس ناقص اور فاسد خیالات کو دل سے نکالنا انسان کا پہلا فرض ہے۔

کسی کی نسبت تمھارا عمدہ خیال ہوگا یا جس کو تم عمدہ بہتر اور پیارا سمجھوگے وہ بھی تمکو ایسا ہی سمجھے گا اور اُسکو تمھارے ایسے خیال کی کسی ذریعے سے ضرور اطلاع ہوجائے گی۔ جب کوئی "ہچکی" لیتا ہی تو عوام یہ خیال کرتے ہین کہ ہمکو کوئی یاد کر رہا ہی اور جب عورتون کی "بائین آنکھ" پھڑکتی ہی تو وہ یہ خیال کرتی ہین کہ اُن کا کوئی پیارا اُن سے ملے گا۔ یہ کیا بات ہی وہی قوّتِ خیال ہی جس کی کشش کا اثر دل سے گزر کر انسانون کے جسم تک پہنچتا ہی۔ **تصوّف** کے تمام نکتے مسمریزم وغیرہ کے شعبدے اسی قوّتِ خیال سے وابستہ ہین۔

حیوانات مین اگرچہ عقل نہین لیکن قوّتِ خیال ضرور ہی جس کو واہمہ کہو یا آخذہ۔ مشہور ہی کہ برفستانی ملک کے طیور جب موسم سرما مین کابل وغیرہ سے آتے ہین تو وہان انڈے دیکر چھوڑ آتے ہین اور گو وہ ہندوستان کی جھیل

اور تالابون مین ایک عرصے تک رہتے ہین لیکن محض خیال کی سرگرمی سے اُن کو سیتے ہین اور ہندوستان سے واپس جانے پر بچے پاتے ہین - گویہ بات ایک عام قصے کے طور پر مشہور ہے - لیکن جب ہم خیال کی مقناطیسی قوت پر نظر ڈالتے ہین تو ہمکو چندان تعجب معلوم نہین ہوتا -

خیال بھی بے شک عمدہ چیز ہو لیکن تصفیہ خیال بڑی چیز ہو - اسکی مثال ایسی ہو کہ جسطرح خالص سونا ناقص دھات ملنے سے مغشوش ہوا ور پھر کوئی شخص کیمیائی قوت سے تجربہ کر کے سونے کو علیحدہ کر دے - اِسی طرح تصفیہ خیال سے ناقص خیالات جُدا ہو کر انسان کا دل سچے اور پاک خیالات کا مسکن بن جاتا ہو - جب انسان اپنے دل کو تصفیہ کی صیقل سے صاف کرتا ہو تو دل آئینہ کی طرح روشن ہو جاتا ہو اور اسکو عجائبات قدرت معلوم ہونے لگتے ہین اُمورِ قدرت مین جو تدبر اور تفکر کی ہدایت کیگئی ہو تو اُسکے یہی معنی ہین کہ دل کو ناقص خیالات سے صاف کر دو تو جلوۂ حقیقت تمکو نظر آئیگا آئینۂ زنگ اور کدورت سے صاف ہو تو اصل جوہر آشکارا ہو جائے - اب رہا یہ امر کہ تصفیہ خیال کیونکر ہو اور اسکے لیے کونسا بہتر ذریعہ اور آلہ ہو تو مین جواب دونگا کہ اُس سچے معبود سے لو لگانا چاہیے جس کے وجود کی کم و بیش تمام مذاہب ہدایت کرتے ہین گو بسا اوقات جھوٹ مین سچ اور کھوٹے مین کھرا ملا ہوا ہوتا ہو - یہ امر ہر شخص کے "کانشنس" پر منحصر ہو کہ جس طریقے کو وہ بہتر سمجھتا ہو اُسکے ذریعے سے منزلِ مقصود پر پہنچنا چاہتا ہو خواہ اُس کا خیال کیسا ہی ہو -

ہر شے کے واسطے حد اور انتہا ہو مگر خیال کا میدان اسقدر وسیع ہو کہ اُسکے لیے فی حد ذاتہ کوئی انتہا قائم نہین کی جا سکتی - ابھی یہ خیال سمندر مین پیرتا ہو ابھی یہ خیال آسمان مین تھگلی لگاتا ہو - ابھی یہ خیال اپنے گھر کی چار دیواری مین محدود ہو جسطرح خدا کی ماہیت کا معلوم ہونا محال ہو ایسے ہی انسان کیلئے ظاہر و باطن مین خیال کا اندازہ و تخمینہ محال ہے -

انسانی خیال کی تاریخ بھی کوئی ایسی نہین جس سے اُسکے مختلف کوائف کا پورا نقشہ اُتر سکے - مگر ہان جتنی انسانی تاریخین موجود ہین ایک مجمل طور پر انسانی خیال کے نقش کو لوح خاطر پر مرتسم کرتی ہین - فرہاد و شیرین کا قصہ، لیلیٰ مجنون کا افسانہ، نل دمن کی داستان، وامق و عذرا کی کہانی تغیرات خیال کا نمونہ ہین -

یہ دل کیا تھا ایک خیال تھا خیال ہی نے تیشۂ فرہاد مین روانی اور بازو مین طاقت پیدا کی ورنہ کون اُمید کے بھروسہ پر اتنی مدت تک سنگ تراشی کرتا - اگر مجنون کا خیال کسی قدرتی خوبی سے نہ لپٹا ہوا ہوتا تو عرب کے دشوار گزار میدان اور پُر خار جنگل ایک جلیل القدر شہزادہ پا پیادہ طے نہ کرتا اور لیلیٰ کے تصور مین اپنی عمر عزیز کو فضول نہ کھوتا - آہا کیا خیال تھا کہ ایک معشوق مجازی کے پردے مین شاہد حقیقی کی تلاش تھی - معشوق ظاہری کا نہ ملنا ہی دلالت کرتا ہو کہ اسکو شاہد باطنی کا جلوہ نظر آگیا تھا اور وہ ایک ٹٹی کی آڑ مین "شکار" کھیلتا تھا - واہ یہ خیال بھی کیا رفیق طریق ہو کہ کبھی ہمارا ساتھ نہین چھوڑتا - زوال مین سایہ بھی ساتھ نہین دیتا - مگر یہ خیال اُسوقت بھی برابر کشور دل مین اورنگ نشین ہو کر جلوہ ریزی کرتا ہو - ایک شاعر نے اپنے خیال کو کس خوبی سے باندھا ہو ؎

میرا خیال بعد مرے پُر فشان رہے
افسوس ہو کہ مین نہ رہون اور جان رہے

ریل سے تار سے نگاہ سے جلد پہنچنے والا یہی خیال ہو - تار برقی تو دو گھنٹہ مین لندن تک پہنچتی ہو مگر ہم اپنے خیال کو آناً فاناً مین عالم بالا تک پہنچا سکتے ہین -

علما و جُہلا کے خیال مین صرف صحت و غیر صحت کا فرق ہوتا ہو ورنہ ماہیت شے مین کچھ اختلاف نہین - علما ایک صحیح خیال اُس شے کا کر سکتے ہین جس کو وہ سوچتے ہین برعکس اسکے جہلا غلطی کرتے ہین محسوسات مین تو شاید جاہلون کا خیال بھی چندان غلط نہین ہوتا - مگر تصورات مین اکثر غلط ثابت ہو جاتا ہو - اسیواسطے ناقص خیال کے درست کرنے کا آلہ تعلیم

قرار دیا گیا ہے

مویدِ خیال شاید منطق سے زیادہ کوئی شے نہین صغریٰ کبریٰ اور نتیجہ خیال ہی کی شطرنج ہی۔ مبارک ہین وہ لوگ جن کا خیال صحیح اور درست ہی۔ یہ حکماء متقدمین کا خیال ہی تھا جسنے زمین کو متحرک ثابت کر دیا ورنہ جمیع اقالیم کے باشندے ساکت خیال کرتے تھے اور کر رہے ہین۔ یہ خیال کتنا وسیع ہی کہ ہر طبیعت مین نئی شکل سے پیدا ہوتا ہی اور ایک سے دوسرے کا خیال لگا نہین کھاتا۔

جب قومی خیال ایک سمت مین یکسان ہو جاتا ہی اُسوقت اُس قوم کی ترقی شروع ہونے لگتی ہی۔ قومی خیال کی شراب ایسی طربناک ہی کہ سرپرستانِ قوم اسکو وہسکی اور شاپیئین سے جو محض حیوان بنانیکے آلات ہین کہین بہتر سمجھتے ہین اور اسکی مداومت کو دل و جان سے پسند کرتے ہین۔ اگر یہ قومی خیال نہوتا تو نپولین کی فوج ظفر موج کبھی مصر و فرانس پر قابض نہوتی۔ قومی خیال کے دلدادے بڑے مبارک لوگ ہین۔ پچھلے ازمنہ مین لوگ ان کو ولی کہتے تھے اور اُس زمانے مین قومی سرپرست اور لیڈر بولتے ہین۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قوتِ خیال فی حد ذاتہٖ ہر حال مین اپنا اثر دکھاتی ہے اور اسکی کوئی حد اور انتہا نہین تو ہم اتنا ضرور کہین گے کہ اسکی توسیع مین علمی مذاق کو ضرور شامل کرنا چاہیئے کیونکہ بغیر علمی تائید کے یہ قوتِ خیال کچھ بھی نہین۔

قُدرت میرٹھی

حیات بعد الممات

(۱)

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہورِ ترتیب

کائناتِ عالم کے نظامِ تمدن میں خلاّق عالم نے کچھ ایسی گوناگونی و دل فریبی پیدا کر دی ہے کہ عقلِ انسانی باوجودیکہ عقلِ کُل کی ایک ذاتی تجزّی ہونے کا دعوی کرتی ہے اس کی عقدہ کشائی سے بالکل عاجز و حیران ہے۔ بظاہر تو قدرت کی کرشمہ سازیاں انسانی قلوب کو اپنا گرویدہ بنا ہی لیا کرتی ہیں لیکن نہایت جانفرسا و پریشاں کُن خیالات ہیں جو دماغ میں ایک جو اس مختل کی طرح ہمیشہ چکر لگایا کرتے ہیں اور جن کا ماخذ یہ ہے "حیات بعد الممات" یعنی ہستی انسانی کے فنا کے بعد صورتِ تکوین وجود کیا رہتی ہے۔ یہ نہایت ہی اہم و جامع مسئلہ ہے۔ یہی وہ خیالات ہیں جو زمانہ کے مختلف دورِ بین قومی رفارمروں نے ترقی و وسعت دے دے کر لوگوں کو سکھائے اور ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ لیکن ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ بہرحال جہاں تک لوگوں نے اسکی تحقیقات کی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق انسانی ہستی سے بالکل روحانی ہے، اور بقاءِ ہستی کا تعلق ایک دوسرے عالم سے ہے جسے ہم عالم ارواح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ عالم ارواح خود ایک مسئلۂ متنازعہ ہے۔ کچھ لوگ اسکے وجود کے قائل ہیں اور کچھ اسکی ہستی کے منکر۔ علماے ہنود آواگون (تناسخ روح) کے پیرو ہیں اور انکا عقیدہ ہے کہ روح (ہستی) ہمیشہ نقل قالب کرتی ہے اور اُسکی اچھی یا خراب حالت اُسکے پچھلے افعال کی جزا یا سزا ہے۔ اسکا فنا، نقل قالب کرتے کرتے بالکل پاک ہو کر ہستیِ حقیقی میں مل جانا ہے جس کو وہ نروان یا آتما کا پرماتما میں وصل ہو جانا یا دوسرے الفاظ میں "واصل بحق ہو جانا" کہتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ اسکے بارے میں کچھ اور کہتا ہے۔ فی نفسہٖ دونوں

مَوت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے لیکن عقائد میں کچھ متمائز تفریق نظر آتی ہے۔ وہ سزا و جزا کے تو ضرور قائل ہیں لیکن ایک دوسرے طریق سے۔ وہ کیا؟ روح انسانی کا مرکز اصلی ذاتِ حقیقی ہے۔ پتلۂ خاکی کے فنا ہو جانے کے بعد روح (جو غیر فانی ہے اور جسکے ہر دو فرقے قائل ہیں) کچھ مدت مقررہ کے لیے ایک دوسرے عالم میں رکھی جاتی ہے جسے عالم ارواح کہتے ہیں۔ کسی ایک خاص روز میں کائناتِ عالم فنا ہو جائے گی اور اُس روز ہر ہستی کی روح کو اپنے اپنے افعال کی سزا یا جزا ملیگی۔ سزا یہ ہوگی کہ دوزخ میں روحیں ڈالی جائینگی اور جزا یہ ہوگی کہ بہشت میں۔ ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں عقائد میں کس درجہ کی روحانیت پائی جاتی ہے اور قریب قریب جتنے فرقے ہیں وہ سب اپنے اصول کو روحانیت کی عمیق تہ میں رکھتے ہیں۔ نئی روشنی کے سائنٹفک لوگ اس مسئلہ ہی سے کچھ بیزار ہیں کہ وہ اس پر خامہ فرسائی نہیں کرتے بہرحال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ واقعی قابل اطمینان حلّ زندگی کن کن اصولوں پر مبنی ہے۔ ہر چیز کے ثبوت کا انحصار اسکے عملی یا ذہنی تجربات پر ہے۔ ہر شخص جو کچھ بذات خود دریافت یا معلوم کرتا ہے وہ دوسروں پر ظاہر کرتا ہے اور اُسکی تعلیم دیتا ہے۔ اُسکے خیالات کا صائب ہونا اُسکے مذاق سلیم پر منحصر ہے۔ اب تک انسان نے جو کچھ ایجادیں کیں یا اصولات قائم کیے اُسے بذات خود ایک دفعہ تجربہ کر لیا ہے یا مشاہدات کی رُو سے ایک حقیقی اصول قائم کر لیا ہے۔ اس امر کو جانے دیجیے کہ اُسکے تجربات کو لوگوں نے صحیح مانا یا نہیں یا اُسکے خیالات کا ایک صحیح معیار قائم کر سکے یا اُسکو غلط ٹھیرایا لیکن شخص مذکور نے خود تو

اُسکو جان لیا ہی۔ اسی طرح مسئلہ فنا و بقا کو ہر شخص نے تسلیم تو ضرور کر لیا۔ تسلیم کرنے سے یہ مراد نہیں کہ جو کچھ اصول ٹھیرا دیے اُسکو مان لیا بلکہ یہ کہ ہر شخص ایک دفعہ پیدا ہوتا ہی اور پھر مرجاتا ہی اور اسکو ہر کڑی سے ایک نہ ایک دفعہ ہمیشہ جھیلتا ہی۔ لیکن کوئی شخص آج تک ایسا نہ پیدا ہوا (فرضی و مذہبی قصص سے قطع نظر کرکے) جو یہ بتا سکے کہ وہ کس حالت سے مرا؟ مرنے کے بعد کیا کیا مراحل پیش آئے؟ کیا اُسکو اپنی پچھلی ہستی یاد تھی؟ کیا اُسکو معلوم تھا کہ مرنے کے بعد پھر اُسکی کیا حالت ہو گی؟ کیا نقل قالب کرتے وقت اُسے نقل کی کیفیت محسوس ہوئی تھی؟ اُس دوسرے عالم کی کیا کیفیت تھی وغیرہ وغیرہ۔ میرا تو خیال ہی کہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اِن سوالات کا اطمینان بخش جواب دینے میں سچا اُتر سکے۔ کوئی شخص عالمِ ارواح سے انھیں حواس انھیں خیالات کے ساتھ واپس نہیں آسکا کہ اُس سے وہاں کی کچھ کیفیت معلوم ہو سکتی۔ اب اگر کوئی شخص کہہ سکتا ہی کہ یہ سب باتیں کشف و ضمیر سے معلوم ہوئیں تو یہ مسئلہ ذرا توضیح طلب ہی۔ یہ بات غالباً ہر شخص مان لیگا کہ ہر فرد انسانی میں ایک نہایت اہم و زبردست قوّت ہوتی ہی جسے ہم قوّتِ اِرادی کہتے ہیں۔ قوّت ارادی ہی گویا اس مرکّب عنصری کی روح رواں ہی۔ یہی قوت ہر فرد میں یکساں صورت میں پیدا کی گئی ہے اور اسکے خواص و واقعیت ہر حالت ہر زمانہ ہر قوم میں بالکل ایک طرح کی ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ "نہیں قوّتِ ارادی بالکل یکساں نہیں پیدا کی گئی ہے" تو اُسکا دعویٰ بالکل پوچ ہے۔ کیونکہ پتلۂ خاکی کا صانع حقیقی ایک ہی ہے اور مادۂ تکوین وجودِ حیاتِ انسانی ایک ہی مادۂ کثیف یا لطیف سے مرکب ہی۔ حیات و ممات بالکل عناصر اربعہ کی ترتیب و پریشانی پر منحصر ہے۔ بہرحال انسان بصورت ساخت و وجود ہمیشہ یکساں ہی۔ تفریق مشربی و مذہب تفریق ساخت و ہستی سے بالکل جداگانہ ہی۔ یہاں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ہر انسان کی قوّتِ ارادی ایک ہی۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ کسی میں کم کسی میں زیادہ یہ انسان کے مختلف قوائے ذہنی کے سریع الحس یا بطی الحس یا مضبوط یا کمزور ہونے کی وجہ ہی۔ کشف و ضمیر کیا ہیں؟ اپنے قوائے ذہنی و قوّتِ ارادی میں ایک ایسی حرکت غیر متناہی پیدا کرنا کہ جب اُس میں ذرا سی ہَل چَل ڈال دیجیے ذاتِ خود میں وہ روشنی کا تلاطم پیدا ہو کہ انسان (مرادِ ہستیِ انسان) اپنی موجودہ حالت کو بالکل بھول جائے اور عالَمِ استغراق میں ہو کر اپنی ہستی کو چشمِ باطن بیں سے ملاحظہ کرے۔ بہرحال یہ تو صوفیائے کرام کا کشف تھا۔ علمائے فلسفۂ جدیدہ یہ کہیں گے کہ کشف وہ ہی کہ انسان اپنی قوّتِ ارادی کو اس درجہ تکمیل کو پہونچائے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے قوائے ذہنی کو اپنی قوّۃ ارادی کے ذریعہ سے متاثر کر سکے۔

اب اگر عالَمِ ارواح کا پتہ کسی نے لگا لیا ہوگا تو محض اپنی قوّتِ ارادی ہی سے۔ لیکن جہاں تک ہم دیکھتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہی کہ جتنے مہاتماؤں رشیوں پیغمبروں اور درویشوں نے اس عالم راز کا پتہ لگایا سبھوں نے اُسے مختلف حالتوں میں پایا اور ہر ایک نے مختلف اُصول قائم کیے۔ ہنود کے علمانے اِس عالم کو دوسری حالت میں پایا۔ اسلامی فلسفہ اسکی بابت کچھ اور کہتا ہی۔ مہاتما بدھ کے اقوال اور ہیں۔ مسیحی پیشواؤں نے ایک دوسرا پہلو اختیار کر لیا۔ غرض مختلف مذاہب میں مختلف صورت میں عالَمِ ارواح کی تعلیم دی گئی ہی۔ قطع نظر مذہبی اختلاف کے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر اس بیّن تفریق کی وجہ کیا ہی؟ سب سے بڑی وجہ اس باہمی اختلاف کی یہ ہی کہ پیشواؤں نے اصول تو سادے و آسان مقرر کیے لیکن امتداد زمانہ سے اُس میں فروعات ایسی پیدا کر دی گئیں کہ اب وہی سہل الاصول قواعد کچھ ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ ایک ناقابل اطمینان صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ آفت ہر مذہب میں پائی جاتی ہی۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہی۔ روحانیت کا مسئلہ ہی ایسا ہی۔ عوام تو

سمجھ ہی نہیں سکتے، رہے تعلیم یافتہ لوگ ان میں بھی ایک معقول تعداد محض تقلید ہی تقلید کرتی ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو شاید سمجھے ہوئے ہیں لیکن ان کا سمجھنا ہی کیا وہ بالکل "صم بکم" رہتے ہیں۔ بہرحال یہ بات نہیں ہے کہ اس عالمِ اجسام کے سوا اور کوئی عالم ہی نہیں ہے۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ ابھی اُس کی کافی چھان بین نہیں ہو سکی ہے اور لوگ اس کے آخری زینہ تک نہیں پہنچے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ متقدمین نے اسکی تلاش میں بڑی سرگرانی کی ہے اور روحانیت اور عالمِ ارواح پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب تک قابل اطمینان صورت نہیں پیدا ہو سکی۔ اس کے فرقے بھی بالکل جدا ہو گئے لیکن وہ بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچے۔ مختلف مذاہب ہوئے لیکن وہ بھی آخر میں ناکامیاب رہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سب باتیں لاطائل و فضول ہوئیں لیکن ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ قابل اطمینان راستہ ابھی تک اُن لوگوں کو نہیں ملا ہے۔ اگر لوگوں نے اس کا پتہ لگا لیا تو پھر اُنکی تعلیم میں یہ اختلاف کیوں ہے؟ ہر ایک پیشوا کو ایک ہی تعلیم دینی چاہیے تھی۔ کیونکہ سب لوگوں نے ایک ہی قوتِ ارادی سے عالمِ ارواح کا پتہ لگایا تھا۔ روحانیت کا سوال اب تک حل نہیں ہوا اور "حیات بعد الممات" ایک ایسے گہرے راز سے تعلق رکھتا ہے کہ انسان کو فنا ہونے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے اور جب وہ فنا ہو گیا تو اُسکے معلومات بھی فنا ہیں اور یہ مسئلہ جوں کا توں ہی رہ گیا۔

مادۂ تکوین و وجود ہستی میں اگر فلسفۂ جدیدہ کا لحاظ رکھا جائے تو اثبات باری میں ایک نہایت اہم رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ جن اشیاے موجودہ میں مذاہب مختلفہ نے ایک نادیدہ دست تصرف کو صانع حقیقی گردانا ہے اُن کی ساخت و صنعت میں علماے متاخرین نے ایک ترکیب و ساخت مادی کا اصول قائم کیا ہے۔ اِن دو مخالف تعلیموں کا ہمارے مضمون سے ایک گہرا تعلق ہے۔ جن متقدین نے اصولِ روحانیت کو صورتِ ہستی کا ایک حقیقی معیار گردانا ہے اُنکی تعلیم کا دائرہ دُنیا (مراد نظام عالم کی صورتِ موجودہ) ہی تک جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ صورتِ حال و صورتِ ماضی کا انتہا ایک نہایت جامع و اہم مستقبل پر رکھتے ہیں اور منزلِ ہستی کو عالمِ بقا کے زائرین نہیں بلکہ مہاجرین کی جادہ پیمائی کا ایک دور وسطی سمجھتے ہیں۔ مسئلہ روحانیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان کا لبدِ خاکی کو چھوڑنے کے بعد ایک اور ہی عالم میں ہوتا ہے۔ لیکن صورت ہستی بقاے دوام کی منزل پر پہنچنے کے بعد ایسی نہیں رہتی کہ اُسپر اصول ہستی کو مدنظر رکھ کر ہم وجودِ حقیقی کا اطلاق کر سکیں۔ وجودِ حقیقی سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ شے (روح۔ آتما۔ ہستی وغیرہ) بصورت کسی خاص نوعِ معلومہ کے ہو بلکہ وہ ایسی صورت میں ہوتی ہے جس پر محض ایک ہستی کا قدام ہو سکتا ہے۔ قدم ہستی کے وجود کا معیار دنیا کے لوگ نہیں کر سکتے۔ اب یہاں سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ انسان کشف و ضمیر سے اُس وجودِ حقیقی کا اندازہ کیسے کر سکتا ہے؟۔ عالم دوام و بقا کے وجود ہستی کا معیار اُس حواس سے کیونکر معلوم ہو سکتا ہے جبکہ عالمِ ارواح کے وجود کا نظام صورتِ موجودہ سے بالکل جداگانہ ہے۔ دنیاوی روحیں اپنی اُس صورت کو کیونکر معلوم کر سکتی ہیں جو اپنے قالب کو دنیا کے پورے نظام تمدن میں منہمک چھوڑ کر پرواز کر گئی ہیں۔ ہر شے کی صورت ماسبق صورتِ موجودہ سے اِن حالتوں میں اختلاف کرنے لگتی یا اِن وجوہ سے چیزیں بطور خود اختلاف کرنے لگتی ہیں (۱) شے مذکور کا نظامِ اسباب (۲) مختلف حواس خمسہ سے معیار قائم کرنا (۳) عالمِ مختلفہ کے مختلف نظام قدرت۔ اِن اصولوں کو مدنظر رکھ کر ہم موجودہ مذہبی تعلیم کی کسوٹی پر کہاں تک سچے اُتر سکتے ہیں۔ صرف مسئلہ روحانیت کو لے لیجیے کیونکہ ہمیں کسی اور شے سے یہاں مطلب نہیں ہے۔ عالمِ دنیا و عالمِ بقا کے ہستیِ دوام میں کتنی متمائز تفریقیں نظر آتی ہیں

اس بات میں تو غالباً کسی فرد کو عذر نہ ہوگا کہ صرف روح ہی ایک ایسی شے ہے جو اِن دونوں عالم میں ایک بین تفریق ڈالے ہوئے ہے۔ لیکن روح بذاتِ خود ایک مسئلہ معرکۃ الآرا ہے۔ بہرحال خواہ جو کچھ ہو میرا مطلب اُس شے موجودہ سے ہے جو قالب انسان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتی ہے اور جسکے نکل جانے پر انسان کو مردہ کہا جاتا ہے۔ اب صورتِ حال و صورتِ مستقبل سے اسکا مقابلہ کیجیے ہم اُنھیں اصولات کو مدنظر رکھ کر اسکا معیار قائم کرینگے جنھیں ہم اوپر درج کر آئے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اسکا اندازہ ہر سہ اصولات سے ہو سکتا ہے۔

(۱) شئی مذکور کا نظام اسباب - نظام اسباب ملاحظہ فرمائیے۔ انسان کے وجود کی بنا اُسکے قالب میں یا نظامِ جسم میں ایک حرکت غیر امتزاجی پیدا ہونا۔ مختلف عادات۔ حرکات۔ سکنات وغیرہ سے اُسکا تربیت پانا۔ اخلاقی و معاشرتی زندگی بسر کرنے سے روح پر نیک اثر ہونا اور بُرے خیالات و افعال قبیحہ سے اُسکو متاثر کرنا۔ اِن صورتوں سے انسان کے اعضای رئیسہ متاثر ہو کر روح پر اپنا ایک گہرا تصرف اور اُسکی شکل نوعیہ میں تفریق ڈالتے رہتے ہیں۔ ہر سہ دفعات بذاتِ خود ایک نہایت بسیط مضمون سے تعلق رکھتے ہیں

(۲) مختلف حواس خمسہ کا معیار قائم کرنا۔ جن حواسات سے لوگ معیارِ ہستی قائم کرتے ہیں چونکہ وہ بذاتِ خود اختلاف رکھتے ہیں اس لیے ثبوت میں بھی اختلاف ہونا ضروریات سے ہے۔ جس شخص نے کسی چیز کی ماہیت محض آواز سن کر دریافت کی ہے اُس کے خیالات گو بذاتِ خود درست ہوں لیکن اُس شخص کے خیالات سے مطابقت نہیں کر سکتے جس نے اُس کو چھو کر دریافت کیا ہے۔ اثباتِ وجودِ ہستی کا جس شخص نے محض قیاسی اصول قائم کیا ہے جبکہ فلسفیوں اور منطقیوں نے دعوے کیا ہے، اُنکا دعوے از سر تا پا اختلاف کرے گا اُن لوگوں سے جنھوں نے اس کا عملی اصول قائم کیا ہے جیسا کہ صوفیوں اور درویشوں کا اصول ہے۔

اب رہا تیسرا اصول "عالم مختلفہ کے مختلف نظام قدرت" ہر شے دو مختلف عالم میں ہونے سے اختلاف کرنے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص عالم محویت میں ہو تو اُسے وہ چیزیں جو اُس نے عالم بیداری میں دیکھی ہیں مختلف نظر آئیں گی۔ کیونکہ ایک تو اُسکے دماغ کی کیفیت حال دگرگوں ہے اور دوسرے ہر دو نظام اسباب ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اسکے خلاف کرنے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اُس شخص نے اُن چیزوں کو ہر حالت میں مختلف پایا بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہر عالم میں نظام قدرت ہی جداگانہ ہوتا ہے۔

آمدم بر سر مطلب - ان حواساتِ ظاہری سے عالم ارواح کا پتہ ہم کیسے لگا سکتے ہیں جبکہ اسباب دریافت ہر حالت میں اختلاف رکھتے ہیں دنیا کے نظام اسباب اور ہی ہیں۔ حواسات بالکل جداگانہ ہیں۔ عالم ارواح ان تمام باتوں سے بالکل مبرّا و منزّہ ہے۔ رہا کشف و ضمیر کشف و ضمیر سے انسان کسی دوسرے عالم کا پتہ نہیں لگاتا بلکہ وہ ذاتِ خود میں اس درجہ منہمک ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذاتِ ہستی کو بالکل بھول جاتا ہے۔ اس لیے اگر اُس نے کسی بات کا پتہ لگایا تو بس یہی لگایا کہ ذاتِ خود سے ذاتِ موجودہ کو کیا تعلق ہے؟۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ انسان اپنے جذبات میں بالکل جذب ہو جاتا ہے (لفظ انسان یہاں پر بحث طلب ہے۔ انشاء اللہ آئندہ کسی نمبر میں ہم لفظ "انسان" کے مادہ و معنی پر کافی روشنی ڈالینگے) گویا وہ اُس وقت ایک دوسرے عالم میں ہوتا ہے لیکن وہ عالم ارواح میں نہیں ہوتا۔

عالم ارواح کی ایک یہ بھی صفت ہے کہ وہ روح کے پرواز ہو جانے کے بعد روح کا مسکن ہو جاتے ہیں اور جب تک روح کو جسم سے تعلق ہے اُس کا وہاں تک گزر ہونا ناممکن ہے۔

رشید احمد (صدیقی)

ایشور چندر ودیا ساگر

کلکتہ کے مغرب مین تقریباً ۵۲ میل کے فاصلے پر بیر سنگھا ایک مقام ہے۔ گذشتہ صدی کے شروع مین موضع بنالی پور سے بیزجی باپند ویادھیہ نام کا ایک غریب برہمن خاندان اِس جگہ آکر آباد ہوا۔ اس کنبہ کا سربراہ رام جے تارک بھوشن نامی ایک شخص تھا جسکی بیوی دُرگا دیوی وہان کے ایک نامی گرامی پنڈت اماپتی تارک لنکر کی بیٹی تھی۔ رام جے چونکہ ایک مذہبی خیال کا آدمی اور سیر و سیاحت کا شایق تھا اس لیے وہ بسا اوقات سالہا سال تک گھر سے غائب رہتا تھا اور اس اثنا مین اپنی بیوی کو اُس کے باپ کے پاس چھوڑ جایا کرتا تھا۔ لیکن اماپتی تارک لنکر چونکہ خود نہایت مفلوک الحال تھا اس لیے دُرگا دیوی اور اس کے بچّون کا بوجھ اسکے واسطے اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریب عورت کو اپنا اور اپنے بچّون کا پیٹ پالنے کے لیے چرخہ کاتنا پڑا۔ لیکن اس سے اسے اسقدر کم آمدنی ہوتی تھی کہ وہ امدادی روپیہ جو اسے وقتاً فوقتاً اپنے باپ کی طرف سے ملتا تھا ملا کر بھی اپنے کنبہ کو بمشکل فاقہ کشی سے بچا سکتی تھی۔ ان لڑکون مین سب سے بڑے کا نام ٹھاکر داس تھا جو اپنی عمر کے پندرھوین سال مین اپنی ماں، اپنے چھوٹے بھائی، اور اپنی چار بہنون کے گزارے کیلئے روزی تلاش کرنے کلکتہ پہنچا۔ ہرچند ماں اور باپ دونون کی طرف سے وہ ایسے خاندانون سے تعلق رکھتا تھا جو سنسکرت مین فضیلت رکھنے کے لیے مشہور تھے تاہم وہ خود اس زبان مین بہت کم مہارت رکھتا تھا اور چونکہ اُسے اپنے سنسکرت کے مایہ علم مین صلاح یا اضافہ کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس لیے ناچار اس نے انگریزی کی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی کیونکہ اس زمانہ مین اس زبان کی تھوڑی بہت شُدبُد رکھنے والون کو یورپین تاجرانہ کوٹھیون مین ملازمت مل جایا کرتی تھی۔ یہ واقفیت اس نے ایک تاجر کے کلرک سے حاصل کی۔ اس کوشش مین اکثر اوقات اسے شام کی روٹی کے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ کچھ مدت کے لیے ایک فیاض منش شودر نے اپنے خرچ سے اسکی رہائش اور خوراک کا انتظام کر دیا لیکن اس شخص کی آمدنی چونکہ خود اس کے اپنے اخراجات کی بمشکل کفیل ہو سکتی تھی اس لیے ٹھاکر داس کو بیچ بیچ مین فاقہ کرنا پڑتا تھا جس سے تنگ آکر آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی پیتل کی تھالی فروخت کر کے تھوڑی سی نقدی حاصل کر لون۔ لیکن جب وہ تھالی بیچنے چلا تو اُسے کوئی خریدار نہ ملا مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔ رفتہ رفتہ مفلسی یہان تک قادر ہوئی کہ ایک دن اُسے بالکل کھانا نہ ملا اور بھوک کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے وہ بازار مین ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ اسطرح چلنے پھرنے سے بھوک اور بھی تیز ہوئی اور وہ تھک کر ایک عورت کی دوکان کے آگے جو خشکہ بیچتی تھی بیٹھ گیا۔ اسے اِس حالت مین بیٹھا دیکھکر اس عورت نے سبب دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا مجھے پیاس بہت لگ رہی ہے ذرا سا پانی پیا چاہتا ہون۔ عورت نے خیال کیا برہمن دیوتا ہے خالی پیٹ پانی پلانا ٹھیک نہ ہوگا اس لیے اس نے اسے تھوڑے سے چاول دیے جنھین وہ جلدی جلدی کھا گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھکر اسنے پوچھا کیا تمنے آج کھانا نہین کھایا؟ جس کا جواب بلا تشبہہ اس نے نفی مین دیا۔ عورت رحمدل تھی۔ اسکی حالت دیکھکر دل پسیجا۔ تھوڑا دہی اور چاول کیلے کے پتے پر ڈالکر اس کے آگے رکھ دیے اور کہہ دیا آئندہ کبھی اس طرح بھوکے ہو تو میرے یہان چلے آیا کرو۔ اس واقعہ کے تھوڑی مدت بعد اُسے آٹھ روپیہ ماہوار کی ملازمت ملگئی۔

غریب درگا دیوی کے لیے یہی ایک بڑی بھاری رقم تھی۔ انہی ایام مین ٹھاکر کی شادی ایک فاضل پنڈت کی بیٹی بھگوتی دیوی سے ہوگئی اور ان کا پہلوٹھا بچہ ایشور چندر پیدا ہوا۔

ایشور چندر ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ ان کے دادا رام جے کو خواب میں نظر آیا کہ میرے خاندان میں ایک بیٹا پیدا ہوگا جو تمام خاندان کا نام روشن کرے گا اور اپنے ہموطنوں کو بیشمار فوائد پہنچائیگا۔ اسی قسم کی پیشین گوئی بھونند بھٹاچاریہ نامی ایک جوتشی نے بھی کی تھی۔ بالآخر ستمبر ۱۸۲۰ع میں بھگوتی دیوی کے گھر وہ مضبوط، صحت ور، اور خوبصورت بچہ پیدا ہوا جسکی صورت دیکھکر ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساری توقعات پوری کر دکھائیگا۔

بچہ چونکہ ورشبھ راس میں پیدا ہوا تھا اس لیے بڈھا رام جے اسے مذاقاً "بچھڑا" کہا کرتا تھا اور فی الحقیقت اسے اپنی زندگی کے اندر مختلف غلطیوں اور تعصبات کا مقابلہ کرنے میں ایک سانڈ کی طرح جد وجہد کرنا پڑی۔ بچہ اپنے دادا کی طرح جسمانی طور پر مضبوط تھا چنانچہ ایک موقعہ پر جب عالم شباب میں وہ کسی سیاحت کو طے کر رہا تھا اسکا ایک ریچھ سے مقابلہ ہو گیا جس نے ہر چند اسے بہت زخمی کر دیا تاہم اس نے اسے لوہے کا ڈنڈا مار کر جان سے مار دیا۔

جب ایشور چندر کی عمر پانچ برس کی ہوئی تو انھیں بیر سنگھ کی ایک پاٹ شالا میں تعلیم حاصل کرنے بھیجدیا گیا جہاں انھوں نے کالی کنت چٹوپادھیا نامی معلم سے بنگالی زبان کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آخرالذکر انکی تعلیم سے پدرانہ دلچسپی رکھتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی بھر شاگرد کی اس سے خوب ہی محبت رہی۔

نوجوان ایشور چندر بڑا ہی شوخ طالب علم تھا۔ وہ اپنے ہمسایہ کے باغیچوں سے پھل چرا لاتا، انکی فصلیں خراب کرتا اور کپڑے جو دھو کر خشک کرنے کے لیے دھوپ میں رکھے ہوتے انھیں خراب کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمسایہ کے لوگ اکثر اس کے شاکی و نالاں پائے جاتے تھے لیکن باوجود اسکے اُستاد نے کبھی اس سے زیادہ مار پیٹ کا سلوک نہیں کیا۔

ایشور چندر کی عمر ۹ برس کی تھی کہ ان کے والد ٹھاکر داس انھیں مزید تعلیم دلانے کلکتہ لے گئے۔ ان دنوں سڑکوں کی حالت نہایت خراب تھی جسکی وجہ سے ۵۶ میل کا فاصلہ تین یوم میں پورا ہوا اور یہیں سے انکی پیادہ روی کی وہ طاقتیں ترقی پذیر ہونا شروع ہوئیں جو بعد میں انکے اندر نمایاں طور پر موجود پائی جاتی تھیں۔ بسا اوقات اُنھوں نے بیر سنگھا اور کلکتہ کا درمیانی فاصلہ صرف ایک دن میں طے کیا اور ایک موقع پر اُنھوں نے ۲۵ گھنٹہ میں ۱۰۰ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ چلنے میں بڑے بڑے مضبوط جوان ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور بارہا دیکھا جاتا تھا کہ وہ اپنے ہمسفروں کو آرام دلانے کی خاطر ان کا بوجھ بھی اپنے ہی سر پر رکھ لیتے تھے۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں بھی جب کہ امراض اور بڑھاپے کی وجہ سے انکی جسمانی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی ایک روز جبکہ وہ کرم اٹار میں جہاں وہ علٰحدگی کی زندگی بسر کرتے تھے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سمیت سیر کرتے پھر رہے تھے، ان کے پوتوں میں سے ایک نے جو جوان عمر تھا کہا "دیکھوں آپ مجھ سے بھی زیادہ تیز چلنے والے ہیں۔ کسی روز ہمارا اور آپ کا مقابلہ ضرور ہوگا" عمر رسیدہ ایشور چندر نے جواب دیا کہ "کسی روز کیا ابھی کر کے دیکھ لو" اتنا کہکر اُنھوں نے دھوتی کو خوب کس لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نوجوان اور اس کے بعض ہمراہیوں کو چند فرلانگ پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ شیخی باز نوجوان نے ان تک پہنچنے کی جان توڑ کر کوشش کی مگر رہ گیا۔ بوڑھا بابا دور سے اسکی کوششوں کو دیکھتا اور مسکرا کر چپ رہ جاتا تھا۔

جب ایشور چندر کو کلکتہ پہنچایا گیا تو ان کے والد ٹھاکر داس کو صرف ۸؍ ماہانہ ملتے تھے لیکن اس پر بھی اُنھوں نے اس بات کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ انھیں بہتر سے بہتر ممکن تعلیم دلائی جائے۔ ایک شریف النفس کا سیٹھ نے باپ بیٹے پر رحم کھا کر انھیں نہ صرف اپنے ہاں رہنے کے لیے جگہ دی بلکہ کھانے کپڑے کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس کنبہ کے سبھی آدمی بالخصوص ایک بیوہ عورت (رلمنی) ایشور چندر سے بے حد محبت کرتی تھی اور اسے اپنے بیٹے سے بھی بڑھ کر سلوک کیا کرتی تھی۔ ایشور چندر نے جہاں اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس کا ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ "میں نے رلمنی سے بڑھکر مہربان محبت کرنے والی اور فراخدل عورت نہیں دیکھی

اِس پاکباز عورت کی تصویر مدت العمر میرے دل پر نقش رہے گی۔ وہ ایک دیوی تھی جسکی مین اپنی مان سے بھی بڑھکر تعظیم کرتا ہون' اور بڑھاپے مین بھی جب کبھی اسکی یاد آتی ہو تو بے اختیار آنکھون سے آنسو نکل پڑتے ہین"۔ ایشور چندر جب تک زندہ رہے ہمیشہ عورت کی عزت و تکریم کرتے رہے۔ اِس احساس کی بنا عام خیال کے بموجب اس نیک سلوک کے باعث ان کے دل مین قائم ہوئی تھی جو رلمنی نے ان سے اور اس خنکہ بیچنے والی عورت نے ان کے والد سے کیا تھا۔

کلکتہ پہنچنے کے بعد ابتدائی تین ماہ کا عرصہ ایشور چندر نے ایک ورنیکولر پاٹ شالا مین بسر کیا جہان اُنھون نے تھوڑی بہت بنگالی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انھین سنسکرت کالج مین داخل کرا دیا گیا جس جگھ عمر رسیدہ پنڈت پرانے طریق پر طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے معلم اور متعلم دونون فرش پر بوریہ بچھا کر بیٹھا کرتے تھے۔ حاضری مین باقاعدگی یا پابندی اوقات کا فریقین کو خیال نہ ہوتا تھا اور معلمون مین سے بعض دن کا ابتدائی حصہ سو کر گذارا کرتے تھے۔ تعلیم کے آٹھ کورس مقرر تھے جن کی سرسری تفصیل حسب ذیل تھی:۔

(۱) گرامر یعنی ویاکرن۔

(۲) علم ادب یعنی ساہتیہ۔

(۳) علم کلام۔

(۴) قانون یا سمرتی۔

(۵) فلسفہ۔

(۶) ویدانت۔

(۷) علم نجوم۔

(۸) آیور وید۔

ظاہر ہی کہ اِن سب کو ختم کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی تھی لیکن اس زمانہ کے معلم بڑے قابل اور فاضل لوگ ہوتے تھے اور تعلیم نہایت اطمینان بخش طریقہ پر دی جاتی تھی۔ ایشور چندر کو جنوری ۱۸۲۹ء مین اس جگھ داخل کرایا گیا تھا اور ۱۸۴۱ء تک اِس جگھ زیر تعلیم رہے۔ بالآخر جب اُنھون نے تعلیم ختم کی تو ان کی عمر ۲۱ برس کی تھی۔ اس جگھ اُنھون نے جو ۱۲ سال بسر کیے اس کے دوران مین اُنھون نے علوم کی ۶ شاخون مین سے چھ مین کامیابی حاصل کی۔ ان کی تعلیم کا زمانہ نہایت ہی شاندار تھا' یعنی ایسا جو صرف نادر قابلیت اور خوبی کے لوگون کو نصیب ہو سکتا ہو۔ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کالج کی ایک جماعت سے دوسری مین ترقی کرتے رہے۔ سوائے ایک کے وہ تمام امتحانات مین نمبر اول پر رہے اور ہمیشہ انعام اور وظائف حاصل کرتے رہے۔ زمانہ طالب علمی کے تیسرے سال مین ساہتیہ کے پروفیسر نے انھین اپنی جماعت مین داخل کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انکی عمر اسوقت صرف ۱۱ سال کی تھی لیکن آخر کار اسے بھی انکی قابلیتون کا قائل ہو کر داخل کرنا پڑا۔ ۱۳ سال کی عمر مین سنسکرت کے ایسے عمدہ شلوک لکھ سکتے تھے کہ سب لوگ انکی تعریف کرتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی ہی مین ان کا رسوخ اسقدر بڑھ چکا تھا کہ ایک پنڈت کو انکی سفارش پر فلسفہ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ تعلیم ختم کرنے سے پہلے وہ خود بھی گرامر کے قائم مقام پروفیسر مقرر ہو گئے اور ایکمرتبہ جب نیائے شاستر کے ایک دقیق مسئلہ پر انکی پنڈت رام موہن ترک سدہانت سے جو اپنے عصر کا بڑا نامور فیلسوف ہو گذرا ہی' بحث ہو گئی تو اُنھون نے اسے ازروے استدلال مغلوب کر دیا جب اِس واقعہ کی خبر بڈھے ٹھاکر داس کو ملی تو وہ فوراً کالج مین پہنچا اور پنڈت جی کے پاؤن کی خاک اپنے بیٹے کے سر پر رکھی تاکہ وہ انکسار کا سبق سیکھ سکے۔ ایک اور عمر رسیدہ پروفیسر کو انکی دور اندیشی اور عاقبت بینی کے خیال پر یہان تک اعتماد تھا کہ جب اس نے بڑھاپے مین ایک جوان لڑکی سے دوبارہ شادی کرنے کا ارادہ کیا تو اس مسئلہ پر ان سے رائے لینی ضروری خیال کی بجا لیکہ اِن دونون اِن کی عمر صرف ۲۰ سال کی تھی۔ ایشور چندر نے اپنے معلم کے دلائل کو بڑے صبر و تحمل سے سنا اور وہ صرف اِسی نتیجہ پر پہنچ سکے کہ بڈھے پنڈت کا اپنی پوتی کی عمر کی لڑکی سے

شادی کرنا حد درجہ کی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی پر دلالت کرتا ہے، اس لیئے اسے صاف لفظون مین بتا دیا کہ آپ اگر یہ کام کرین گے تو سخت غلطی کے مرتکب ہونگے۔ لیکن اسوقت ان کے کہنے کی پروانہ کی گئی اور نہ صرف بڈھے نے اِس لڑکی سے شادی کر لی بلکہ وہ ایشور چندر کو اپنی بیوی دکھانے کے لیئے ساتھ بھی لے گیا۔ وہ اپنے معلم کے ہمراہ بہت کچھ تامل کے بعد گئے اور لڑکی کو دو روپیہ منھ دکھائی کے دیئے۔ وہ غور سے اس کا منھ دیکھے بغیر واپس ہونے ہی کو تھے کہ بڈھے نے ان کا بازو پکڑ کر اسکا چہرہ پورے طور پر دیکھنے پر مجبور کیا۔ ایشور چندر نے اس حسین لڑکی کے چہرہ کی طرف دیکھا اور فوراً وہان سے لوٹ آئے۔ جب اُنھون نے اس بات پر غور کیا کہ قدرتی طور پر اس غریب کو عنقریب مختلف دشواریان اور مصیبتین پیش آنے والی ہین تو بے اختیار انکی آنکھون سے آنسو نکل پڑے۔ ان کے خیالات بالکل سچ ثابت ہوئے اور لڑکی چھوٹی عمر ہی مین بیوہ ہو گئی۔

جب ایشور چندر نے سنسکرت کالج کا آخری امتحان پاس کر لیا تو انھین "ودیا ساگر" (بحر العلوم) کا خطاب دیا گیا۔ اسکے علاوہ کالج کے سارے پروفیسرون نے جُدا جُدا طور پر انھین سندات دین کیونکہ انمین سے ہر ایک کو اس قسم کے ہونہار شاگرد کا معلم ہونے پر فخر تھا۔ ان دنون انکی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ چھوٹی عمر ہی مین وہ کسقدر ذہین اور محنتی تھے۔

لیکن خالی ذہانت رکھنے سے کسی شخص کو قابل ذکر قابلیت حاصل نہین ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ودیا ساگر کو ہمیشہ اس مقولہ کی صداقت کا اعتراف تھا کہ "ذہانت کے ساتھ غیر معمولی محنت سے بھی کام لیا جائے تو انسان اس رفعت پر پہنچ سکتا ہے جو دُنیا مین اس کا نام روشن کرے۔" اگر کسی شخص کو ودیا ساگر کے برابر ذہانت حاصل ہوتی لیکن وہ غیر معمولی محنت اور جدوجہد کا معتقد نہ ہوتا تو شاید اُن حالات مین کام کرتے ہوئے جو ایشور چندر کو پیش آئے وہ کبھی ان کے برابر ناموری حاصل نہ کر سکتا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ودیا ساگر ایک بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کی آمدنی صرف اتنی تھی کہ جس سے وہ بمشکل اپنا اور اپنے کنبہ کے لوگون کا گذارا چلا سکتا تھا۔ اِن حالات مین جیسا بُرا بھلا کھانا کپڑا نصیب ہوتا اسی کو غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اتنی توفیق حاصل نہ تھی کہ کوئی اچھا سا مکان کرایہ لیا جائے یا کوئی نوکر کام کرنے کے لیئے رکھین۔ ان وجوہ سے ودیا ساگر کو بچپن مین خراب کھانا، بُرے کپڑے، مضر صحت مکان، اور رادئی نواحات مین زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ انھین اپنے والد اور بھائیون کے سبھی کام مثلاً سودا خریدنا، کھانا پکانا، جھاڑو دینا، کپڑے دھونا، صفائی کرنا، خود ہی کرنا پڑتے تھے۔ اِن بواعث سے انھین صبح اور رات کے پہلے حصّہ مین مطالعہ کرنے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ لیکن ان مشکلات پر بھی جب کبھی انھین وقت ملتا وہ مطالعہ مین منہمک رہتے تھے۔ بسا اوقات دیکھا جاتا تھا کہ ترکاری پک رہی ہے اور یہ کتاب لیئے پاس بیٹھے پڑھ رہے ہین یا مدرسہ کو جا رہے ہین تو راستہ مین کتاب دیکھتے جاتے ہین۔ ان کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور وہ وقت کی بے حد قدر کرتے تھے۔ لیکن اِس پر بھی چونکہ انھین بہت کم اور ناکافی وقت مل سکتا تھا اسلیئے وہ بہت رات تک مطالعہ کرتے تھے۔ سُنا گیا ہے کہ وہ رات کے دس بجے سوتے تھے، اور ان کے اصرار پر ان کا والد ۱۲ بجے اُنھین جگا دیا کرتا تھا۔ اسوقت سے لیکر صبح تک وہ برابر مطالعہ مین مصروف رہتے تھے۔

ان کے سونے کی جگہ ایک ۳ × ۲ فٹ کے برآمدہ مین تھی جہان وہ اتنی ہی لمبی چوڑی چٹائی پر لیٹ رہتے تھے۔ لیکن جب ان کا تیسرا بھائی انکے پاس آکر رہنے لگا تو ایک ہمسایہ نے ازراہ عنایت اِن کے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کمرہ دیدیا جس کا فرش بہت سیلا تھا جہان مچھر، کھٹمل اور جھینگر بکثرت تھے۔ لیکن جو شخص دن رات مین اسقدر محنت کرتا ہو اسے مچھرون، پسوؤن، یا جھینگرون کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ چھوٹی عمر مین وہ پستہ قد تھے اور انکا سر غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ اس لیے ان کے ہم جماعت

طلبہ انھین "جیسورے کائی" یا "کسورے جائی" کہا کرتے تھے جس سے مراد جیسور کی اس مچھلی سے ہو جس کا سر بہت بڑا ہوتا ہو۔ ان کا والد باوجود محبت کرنے کے اکثر اِن سے سختی کا سلوک کرتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے ابتدائی ایام مین وہ ہر روز رات کے وقت ان کا سبق سُنتا اور ذراسی غلطی بھی ہو جاتی تو اُنھین مارتا پیٹتا تھا۔ اِن ایام مین وہ اِس بات پر بھی مُصر رہتا تھا کہ رات کو فلان وقت سے پہلے نہ سوتا اور اِس سے پہلے کبھی ان کی آنکھ لگ جاتی تو انھین بڑی سختی سے بیدار کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی نیک دل رمینی ان کی سفارش کر دیا کرتی تھی لیکن ایک موقع پر تو ان کے والد نے انسے اسقدر سختی کا سلوک کیا کہ باوجود ایک مطیع اور فرمانبردار لڑکا ہونے کے انھین بھاگ کر رام دھن گنگولی (ایک معمر ہمسایہ) کے مکان مین پناہ لینا پڑی۔ اتفاقات زمانہ سے آخر ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ سنسکرت کالج کے پرنسپل بنے اور رام دھن گنگولی ان کے ماتحت چھوٹی حیثیت مین کام کیا کرتا تھا۔ انھین واپس اپنے والد کے مکان پر پہنچا یا گیا لیکن باپ کی طرف سے ان کے ساتھ جو بدسلوکی ہوتی رہی تھی اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عمداً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ طبیعت کے ایسے پکے تھے کہ جب ایک بات کا مصمم ارادہ کر لیا تو مار پیٹ کے باوجود اپنے ارادہ سے باز نہ آئے۔ لیکن آخر کار اِن کے والد کو اپنی غلطی محسوس ہو گئی، اور اس نے اِن سے محبت و نرمی کا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اِس واقعہ سے والدین ایک بہت اچھا سبق حاصل کر سکتے ہین۔ نہ صرف والدین بلکہ استادون اور تمام با اختیار لوگون کا فرض ہو کہ وہ بجاے سختی کے نرمی سے کام لیا کرین۔ انسانی طبیعت کو مطیع کرنیکا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہین کہ نرمی اور محبت کا سلوک کیا جائے۔ حد درجہ کے شریف، مطیع، اور نیک بچے بھی غیر معمولی سختی اور عدم توجہی سے نافرمانبردار اور گستاخ بن جاتے ہین۔ جب دیکھا جائے کہ وہ اِس غلط راستے پر چلنے لگے ہین تو لازم ہو کہ وہ شخص جو اِن پر اختیار رکھتا ہو فوراً اپنی روش بدلکر ان سے مہربانی اور ہمدردی کا سلوک کرنے لگے۔

جب وہ کالج مین تعلیم پا رہے تھے اور ان کی عمر ۱۴ برس کی تھی انکی شادی دین مے دیوی سے ہوئی جو شترگھن بھٹاچارجی نامی ایک مرفہ الحال اور عزت دار برہمن کی خوبصورت بیٹی تھی۔ اپنی بیوی سے انھین شروع ہی سے بے حد محبت رہی اور اسی کے بطن سے ان کا بیٹا نارائن چندر اور چند لڑکیان پیدا ہوئین۔ اسکا انتقال ان کے دو سال قبل ہو گیا تھا۔

سنہ ۱۸۴۱ء مین جب اُنھون نے سنسکرت کالج کی طرف سے "ودیا ساگر" کا خطاب حاصل کیا تو اس کے ساتھ ہی اِن کی زندگی کے پہلے اہم حصہ کا خاتمہ ہو گیا یعنی اُس حصہ کا جس مین اُنھون نے اپنی مشرقی تعلیم مکمل کی تھی۔ لیکن یہ تعلیم انکی اِس کامل تعلیم کا محض ایک جزو تھی جسکی بدولت وہ اپنی زندگی مین کارہائے نمایان سرانجام دیسکے۔ انھین اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے انگریزی سیکھنا ضروری تھا جو سنسکرت کالج مین اُنھون نے بدرجہُ اقل سیکھی تھی۔ کالج سے نکلنے کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے انکے دل مین اس بات کی تیز خواہش پیدا ہوئی کہ انگریزی زبان سیکھین اور وہ واقعہ یہ تھا کہ سنہ ۱۸۴۱ء مین انھین فورٹ ولیم کالج کا ہیڈ پنڈت مقرر کیا گیا جہان وہ انگریز سویلینون کو ملک کی ورنیکولر زبانین سکھایا کرتے تھے۔ اِس حیثیت مین ہر روز ان کا واسطہ انگریز طلبہ سے پڑتا تھا، اور چونکہ اسی سلسلے مین انکا اکثر دیگر نامی گرامی انگریزون سے میل جول ہوتا تھا اس لئے قدرتی طور پر ان کے دل مین اس بات کی کوشش پیدا ہوئی کہ انگریزی کی خاصی تعلیم حاصل کرین۔ پس اُنھون نے بڑی محنت، استقلال، اور ہمت کے ساتھ اس زبان کو سیکھنا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے مین اِس پر بخوبی قادر ہو گئے۔ اس زبان مین بہت جلد اُنھون نے یہان تک قابلیت حاصل کر لی کہ اِنکے انگریزی مضامین کی عام

طور پر تعریف کی جاتی تھی۔ مشہور و معروف ڈاکٹر درگا چرن بنرجی (جو بابو سریندر ناتھ بنرجی کے والد بزرگوار تھے) اور راج نرائن باسو ہردو صاحب نے انھین انگریزی سیکھنے مین بہت کچھ مدد دی اور انھی ایام مین انکی ملاقات مشہور و معروف زمیندار راجہ رادھا کنت دیب بہادر، مشہور بنگالی مصنف اکشے کمار دت اور بعض دیگر مشاہیر بنگال سے ہوئی۔ وہ خود بعض عمر رسیدہ عالمون کو سنسکرت پڑھایا کرتے تھے اور ان کا طریق تعلیم ایسا عجیب اور جدید تھا کہ جو مضمون سنسکرت کالج کے دیگر پروفیسر برسون مین پڑھاتے اُسکو یہ تھوڑے عرصہ مین پڑھا سکتے تھے۔ اپنے ایک شاگرد کی خاطر جس نے بعد مین ایک لائق اُستاد ثابت ہو کر ان کا نام بخوبی روشن کیا اُنھون نے سنسکرت کی مشہور ویاکرن (گرامر) "مگدہ بودھ" کو رات بھر کے اندر اندر خلاصہ کر کے بنگالی زبان مین لکھ لیا تھا۔

جن دنون وہ ہیڈ پنڈت کا عہدہ رکھتے تھے ہندوستان کے لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل تھے۔ وہ فورٹ ولیم کالج کا معائنہ کرنے گئے اور بہت دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۶ء تک بنگال کے مختلف حصون مین ۱۰۱ ورنیکولر اسکول جاری ہو گئے۔ ان اسکولون سے ان طلبہ کو بہت فائدہ حاصل ہوا جو سنسکرت کالج سے تعلیم پا کر نکلتے تھے کیونکہ ان اسکولون کے لیے معلم مقرر کرنے کا کام ودیاساگر کے سپرد تھا۔ اس مین شک نہین کہ انکی اس کارروائی سے سنسکرت کالج کے پروفیسر بہت ناراض ہوئے تاہم حقیقت یہ ہے کہ اُنھون نے جن اُستادون کو نامزد کیا اُن سب کی حالت مین کبھی اپنے ضمیر کا خون نہین کیا۔ راستی کے بقدر پابند تھے کہ ایک موقعہ پر کسی بات پر سنسکرت کالج کے پرنسپل سے تکرار ہو گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان سے کوئی ایسی بات کرانا چاہتے تھے جسے یہ اپنے ضمیر کے خلاف پاتے تھے۔ آخرکار یہ اپنے عہدہ سے استعفا دینے پر آمادہ ہو گئے گو بعد مین یہان تک نوبت نہ پہنچنے پائی تاہم ان کے اس طریق عمل سے ان کے افسرون کی نظر مین انکی وقعت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اپنے موجودہ عہدہ پر وہ ۵۰ ماہوار تنخواہ پاتے تھے جو کسی طرح بھی زیادہ متصور نہین ہو سکتی لیکن جب ایک موقعہ پر سنسکرت کالج مین انھین گرامر کے پروفیسر کی جگہ دی جانے لگی جس سے انھین ۱۰ زیادہ ملنے کی اُمید تھی تو اُنھون نے اپنے نفع کی پروا نہ کرتے ہوئے یہ عہدہ مشہور و معروف تارا ناتھ ترک واچسپتی کو دلا دیا کیونکہ وہ انھین اپنے سے زیادہ قابل شخص سمجھتے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جبکہ اُنھون نے ۵۴ گھنٹہ مین ۱۰ میل کا فاصلہ طے کیا اور وہ بھی محض اس غرض سے کہ تارا ناتھ سے گھر اس عہدہ کے لیے عرضی دلا دین۔ جب اس فاضل پروفیسر اور اسکے باپ نے ودیاساگر کی زبانی یہ پیغام سُنا تو ان کی حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی اور وہ یک زبان ہو کر کہنے لگے۔ "ودیاساگر تم انسان نہین فرشتہ ہو!" اس واقعہ سے اس بات کا پورے طور پر ثبوت ملتا ہے کہ لارڈ ہارڈنگ کے قائم کردہ اسکولون کی آسامیان پُر کرنے مین اُنھون نے کس قدر دیانت داری سے کام لیا ہوگا۔

۱۸۴۶ء مین فورٹ ولیم کالج سے ان کا تعلق قطع ہو گیا اور وہ سنسکرت کالج کے اسسٹنٹ سکرٹری بنے۔ فورٹ ولیم کالج مین اُنھون نے پانچ سال تک جو کام کیا تھا اس سے دیگر فوائد کے علاوہ اُنھین ایک خاص فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اُنھون نے انگریزی کی تعلیم حاصل کر لی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کالج مذکور سے ان کا تعلق ان کی خوش نصیبی کی دلیل تھا کیونکہ اسی کی بدولت انکے خیالات کو وسعت اور آرا کو اہمیت حاصل ہوئی اور اسی کے وسیلے سے اُنھون نے بہ حیثیت ایک مصلح و ہوا خواہ بنی نوع انسان بڑے بڑے معرکہ کے کام سرانجام دیئے۔ یہ خیال غیر درست نہ ہوگا کہ حامی تعلیم کی حیثیت مین ان کے کام کی ابتدا فورٹ ولیم کالج ہی مین ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہان پر کالج کا کام کرنے کے علاوہ پرائیویٹ طور پر بھی وہ تدریس کا کام کرتے تھے۔ اس سے ہرچند کہ انھین کوئی خاص مالی

فائدہ نہین ہوا تاہم ان کے دل مین اس بات کا رجحان ضرور پیدا ہو گیا کہ سنسکرت تعلیم کو سادہ اور جدید اُصولون پر قائم کیا جائے اور یہی وہ بات تھی جو بعد مین ان کے لیے موجب شہرت ثابت ہوئی۔ ۱۸۴۶ء مین جب وہ سنسکرت کالج کے نائب سکرٹری بنے تو اس بارے مین انھین کام کا کافی موقعہ مل گیا اور بہت جلد اُنھون نے اپنے ضبط انتظام اور باقاعدگی سے شہرت حاصل کر لی۔ لیکن جب کالج کے سکرٹری یا منتظم خاص نے انکی بعض اصلاحی کارروائیون پر اعتراض کیا تو انھین مجبوراً اپنے عہدہ سے دست بردار ہو کر پرائیویٹ زندگی اختیار کرنا پڑی۔ ان کے ذاتی اعزاز اور خودداری کا ثبوت ایک اور واقعہ سے بھی ملتا ہے جو انہی ایام مین ہوا تھا۔ سنسکرت کالج کے نائب سکرٹری کی حیثیت مین انھین ایک روز ہندو کالج کے مسٹر کر کے ہان جانے کا اتفاق ہوا جس نے اِن سے اچھا سلوک نہ کیا۔ جب یہ اس سے ملنے گئے تو اس نے انھین نہ تو کرسی دی اور نہ اچھی طرح پیش آیا بلکہ ٹانگین پھیلا کر آرام چوکی پر لیٹا رہا۔ ودیا ساگر کو اس سے رنج تو بہت ہوا لیکن اُنھون نے اسوقت اِس معاملہ کو رفت گزشت کر دیا اور مسٹر کر سے جو کام تھا اسے سر انجام دیکر واپس چلے آئے۔ لیکن اُنھون نے اپنے دلمین اس بات کا عہد کر لیا تھا کہ مین مسٹر کر کو اس بارے مین ضرور سبق سکھاؤن گا چنانچہ بہت جلد ایک موقع اس قسم کا درپیش ہوا کہ مسٹر کر ان سے ملنے کے لیے آئے۔ ودیا ساگر نے کمرہ سے تمام کرسیان اُٹھوا دینا اور خود اسی حالت مین بیٹھکر جس مین اُنھون نے مسٹر کر کو بیٹھا دیکھا تھا نوکر سے کہا کہ صاحب کو اندر آنے دو۔ اِس حالت مین مجبوراً صاحب کو کھڑا رہنا پڑا اور ودیا ساگر کے ہاتھون اپنی اس طرح توہین ہوتے دیکھکر وہ سخت ناراض ہوئے یہان تک کہ آخر اس کی بڑی سختی سے شکایت لکھ بھیجی تعلیمی کونسل کے سکرٹری نے ودیا ساگر سے کیفیت طلب کی جسکے جواب مین اُنھون نے لکھا کہ مین اس سبق پر عمل کر رہا ہون جو خود مسٹر کر نے مجھے سکھایا تھا۔ اس بیان کو اطمینان بخش سمجھا گیا اور مسٹر کر کو جواباً لکھ دیا گیا کہ آپ ودیا ساگر سے اپنے طور پر اس معاملہ کو طے کر لین۔ چنانچہ بعد مین ایسا ہی ہوا۔

سنسکرت کالج سے ودیا ساگر کا تعلق صرف تھوڑے ہی دن قطع رہا کیونکہ دسمبر ۱۸۵۰ء مین انھین علم ادب کی پروفیسری کا عہدہ پیش کیا گیا جسے اُنھون نے اِس شرط پر منظور کر لیا کہ مجھے پرنسپل یا اس انسٹی ٹیوشن کے افسر اعلیٰ کے برابر انتظامی اختیارات دیے جائین۔ ان کا تقرر اس وقت عمل مین آیا تھا جبکہ سنسکرت کالج مین طلبہ کی تعداد کے بتدریج کم ہوتے جانے سے تعلیمی کونسل کو اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہین انسٹی ٹیوشن کو بند ہی نہ کرنا پڑے۔ پس سب سے اول اُنھون نے ودیا ساگر کو جو کام تفویض کیا وہ یہ تھا کہ کالج کی ترقی کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کرین اور اس کام کو اُنھون نے ایسے حسن طریقت سے سر انجام دیا کہ کونسل نہ صرف انکی اعلیٰ قابلیت اور دانشمندی کی قائل ہو گئی بلکہ جو طریق عمل اُنھون نے اپنی رپورٹ مین قائم کیا تھا اِس پر عمل پیرا ہونے کے لیے بھی رضامند ہو گئی۔ پس اس نے اُنکی اصلاحات مجوزہ کو سر بسر منظور کر لیا اور انھین باقاعدہ طور پر کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ اِس طرح پر اختیارات حاصل ہو جانے پر اُنھون نے بہت سی اُن اصلاحات کو عمل مین لانا شروع کیا جنھین وہ اِس وقت جب چند سال بیشتر نائب سکرٹری کی حیثیت سے عمل مین نہ لا سکے تھے۔ حاضری کی باقاعدگی اور دیگر اُمور مین پروفیسرون اور طلبہ دونون کو یکسان طور پر تنبیہ کی گئی۔ سزائے جسمانی کا طریقہ موقوف کر دیا۔ تعلیم انگریزی کو جبری بنا دیا گیا اور اس بات کی عام اجازت دیدی گئی کہ کالج مین چھوٹی ذاتون کے لڑکے بھی پڑھ سکتے ہین۔ علاوہ برین سنسکرت تعلیم کو ایسے طریق پر مرتب کیا گیا کہ اسمین بہت کچھ سادگی پیدا ہو گئی اور وہ زمانہ موجودہ کے معیار تعلیمی کے مطابق اور ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہو گئی۔

ان کا منشائے دلی یہ تھا کہ کالج کو ایک ایسے دار العلوم کی حیثیت دیجایے جہان نہ صرف سنسکرت کی اعلیٰ وارفع تعلیم حاصل ہوسکے بلکہ اس کے ذریعہ سے ورنیکولر لٹریچر کی اصلاح ہو اور یہان سے جو استاد تعلیم پاکر نکلین وہ تعلیم عامتہ کی اشاعت مین مدد دے سکین۔ یہ بیان کرنا غیر ضروری ہوگا کہ مناسب وقت گذرنے پر ان کا یہ منشا تمام وکمال پورا ہوگیا لیکن اسمین کلام نہین کہ اس کے حصول مین انھین بڑے صبر اور محنت واستقلال سے کام لینا پڑا۔ قریب قریب جتنے معلم ان کے ماتحت کام کرنے والے تھے وہ سب کسی وقت مین انکے اُستاد رہ چکے تھے اور ان سب کو ضبط کے دائرۂ انتظام مین لانا واقعی ایک مشکل کام تھا۔ لیکن انھون نے اپنے ذہن رسا کی مدد سے ایسی ایسی ترکیبین سوچین کہ بڈھے طوطون کو بھی پڑھا ہی لیا۔

قبل ازین بیان کیا جاچکا ہے کہ ودیاساگر بڑے خوش مزاج تھے۔ اس خوبی کے علاوہ قدرت نے انکی طبیعت مین مذاق سلیم کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سزائے جسمانی سے انھین جو نفرت ابتدا ہی سے تھی اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ بچپن مین وہ خود اس کا شکار رہ چکے تھے اور اسی کی وجہ سے چند مرتبہ انھین اپنے والد کے احکام کی بھی خلاف ورزی کرنا پڑی تھی۔ شروع سے آخر تک ان کے دل مین یہی خیال پختہ رہا کہ کسی تعلیمی انسٹی ٹیوشن کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اُستادون اور طالبعلمون کا باہمی برتاؤ حُسن سلوک پر مبنی ہو۔ ہر کام مین طلبا اپنے استادون کی امداد پر کمربستہ ہون اور اُستاد بجائے خود ان سے مہربانی اور نرمی سے پیش آئین۔ جن دنون وہ کالج کی عمارت مین رہتے تھے متعدد طلبہ کالج کا وقت ختم ہونے کے بعد ان کے پاس پرائیویٹ طور پر ملنے جاتے اور وہ ہمیشہ ان کی تواضع کسی نقل سے یا دلچسپ گفتگو کے ذریعے سے کرتے تھے۔ ایسے موقعون پر وہ ہمیشہ انھین صیغہ واحد حاضر مین مخاطب کرتے جس سے طلبہ کی انسے پوری بے تکلفی تھی۔ لیکن بوقت ضرورت وہ انھی طلبہ سے سختی کے ساتھ بھی پیش آسکتے تھے گو ایسی صورتون مین انکی سختی صرف عارضی اور اسی قدر ہوتی تھی جتنی کہ ان کے خیال مین ان کے لیے مفید ہو جسوقت وہ نقص جو اس بدمزگی کا موجب بنا ہو دور ہو جاتا ان کا نرم دل فوراً پگھل جاتا تھا اور وہ پھر اسی نرمی سے سلوک کرنے لگ جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر اُنھون نے تمام جماعت کو عمداً احکام کی خلاف ورزی کرنے پر خارج کردیا لیکن جب اگلے روز وہی طالب علم ان کے مکان پر جاکر معافی کے طلب گار ہوے تو اُنھون نے اِن سب کو تہ دل سے معافی دیدی۔ اسوقت دوپہر کا وقت تھا اور جس وقت طلبا سیڑھیون سے اُتر رہے تھے انمین سے ایک نے یونہی مذاقیہ طور پر دوسرے سے کہا کہ اگر ودیاساگر کا دل ویسا ہی رحیم ہوتا جیسا کہ مشہور ہے تو وہ یقیناً ہمین کچھ کھانے کے لئے کہتے"۔ یہ الفاظ ہرچند کہ دبی زبان سے کہے گئے تھے تاہم وہ ودیاساگر کے کان مین پڑگئے۔ اُنھون نے تمام طلبہ کو واپس بلاکر کچھ کھانے کو دیا جس پر طلبہ مین سے ایک کہنے لگا۔ "بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے نیک نفس کے دل مین غصّہ رہ سکے؟"

جسوقت سنسکرت کالج کے تعلیمی سسٹم مین ترمیم کی گئی تو بنگالی زبان مین بہت سی درسی کتابون کا لکھنا بھی لازم ٹھہرا۔ بالآخر یہ کام بھی ودیاساگر کے ذمہ پڑا اور اُنھون نے ۱۸۵۱ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان متعدد کتابین شائع کین۔ اِن کی علمی مصروفیتون کی ابتدا ۱۸۴۷ء سے ہوچکی تھی جبکہ اُنھون نے درسی کتابون کے علاوہ "سکنتلا" اور "سیتر بن باس" (سیتا کی جلاوطنی) ایسی بعض معرکۃ الآرا کتابین لکھین۔ مسٹر رومیش چندر دت آنجہانی انکی علمی قابلیت کا ذکر بدین الفاظ کرتے ہین:-

ادبی قابلیت کے معاملہ مین اس وقت تک بنگال بھر مین کوئی شخص انکے پایہ کا نہ سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ بعد مین لوگ بابو بنکم چندر چٹرجی کی قابلانہ محنت کی داد دینے لگے۔

فی الحقیقت اُنھون نے اور ایک بنگالی مصنف بابو اکشے کمار دت نے

مگر زمانہ حال کی شاندار بنگالی نثر کی بنا قائم کی تھی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ اُنھون نے زندگی کے آخری ایام تک جاری رکھا اور بیان کیا جاتا ہی کہ اُنھون نے صرف پانچ گھنٹہ مین شیکسپیر کا مشہور و معروف ڈراما Comedy of Errors "بھرنتی ولاس" کے نام سے لکھا تھا۔

سنسکرت کالج کے پرنسپل کی حیثیت مین ودیا ساگر نے جو خدمات سرانجام دین انکی حکام بالادست نے یہان تک قدر کی کہ ۱۸۵۵ء مین انکی تنخواہ دوگنی کر دی گئی اور اُنھین چار اضلاع کا خاص انسپکٹر اس غرض سے مقرر کیا گیا کہ وہ اِس نئی تعلیمی پالیسی کو رواج دین جسکی ابتدا ۱۸۵۴ء کی مشہور تعلیمی مراسلت کے ذریعے سے ہو چکی تھی۔ اِس پالیسی کا مطلب یہ تھا کہ ورنیکولر تعلیم کا آسان زینہ بنانا چاہیئے۔ اِس عہدہ کے لیے اِن سے بہتر شخص کا انتخاب ناممکن تھا کیونکہ جس تندہی، محنت اور قابلیت سے اُنھون نے کام کیا اِس سے بہت کم لوگ کام لے سکتے ہین۔ اُنھون نے چارون اضلاع مین لڑکون اور لڑکیون کے لیے متعدد ماڈل اسکول جاری کرائے اور بنگال کے اول نارمل اسکول کی خود ہی بنا قائم کرکے اسکی نگرانی کی۔ ۱۸۵۶ء تک سب کام اچھی طرح چلتا رہا حتی کہ آخر کار اس سال بنگال مین ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا عہدہ قائم ہوا اور اسپر ایک نوجوان سویلین کا تقرر عمل مین آیا۔ اِس نوجوان نے جس کا نام مسٹر گارڈن ینگ تھا ودیا ساگر کے کام کی قدر نہ کی اور ۱۸۵۸ء کے قریب انھین بالواسطہ طور پر سرکاری ملازمت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا۔ ودیا ساگر سے اِس شخص کا جو سلوک تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہی کہ اس نے ایک زنانہ اسکول کے متعلق رقوم اخراجات کی ادائیگی منع کر دی۔ یہ اسکول سر ایف ہالیڈے لفٹنٹ گورنر بنگال کی زبانی منظوری سے کھولا گیا تھا البتہ اِس کے متعلق مسٹر ینگ کی ضابطہ منظوری نہ لی گئی تھی۔ لفٹنٹ گورنر موصوف ودیا ساگر پر بہت مہربان تھے اور انھین بہت عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب انھین اِس معاملے کی خبر پہنچی تو اُنھون نے ودیا ساگر کو اس عہدہ سے جسکی تنخواہ انھین ۵۰۰ روپیہ ماہوار ملتی تھی مستعفی ہونے سے منع کیا لیکن ودیا ساگر نے سمجھ لیا تھا کہ میرا اب اِس عہدہ پر رہنا میری خودداری مین فرق لاتا ہی۔ پس اُنھون نے استعفا داخل کر ہی دیا۔ اِس ستعفا کو منظور کرتے ہوئے نواب لفٹنٹ گورنر نے انھین اطلاع دی کہ "ہندوستان مین اشاعت تعلیم کے بارے مین آپ نے جو کوشش بڑی سرگرمی سے مدت دراز تک کی ہے اِس کا گورنمنٹ تہ دل سے اعتراف کرتی ہی۔"

اِس زمانہ مین ودیا ساگر کی عمر ۳۸ برس کی تھی۔ بہ اعتبار ایک معلم و ادیب کے اُنھون نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اِس زمانہ کی تمام تعلیمی انجمنون سے ان کا تعلق تھا اور وہ کلکتہ یونیورسٹی کے ممبر بھی تھے۔ اِن کے ریٹائر ہونے کا افسوس اِن کے ہندوستانی و یورپین احباب کو یکسان طور پر ہوا اور اندیشہ تھا کہ آئندہ انکی ذات سے پبلک کو استفادہ حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ بقول مسٹر دت اُنھون نے ملازمت کی نسبت ملازمت سے علیحدگی کے ایام مین اپنے آپ کو زیادہ مفید ثابت کر دکھایا۔ انھین اپنی کتابون سے معقول نفع حاصل ہو رہا تھا اور تعلیمی کام سے انکی دلچسپی بدستور سابق تھی حتی کہ آخر کار ان کی بے غرضانہ کوششون کا نتیجہ کلکتہ کے میٹروپولیٹین انسٹی ٹیوشن کی صورت مین نمودار ہوا جو اپنی قسم کے انسٹی ٹیوشنون کے لیے ایک قابل فخر و یادگار نمونہ تھا۔ انکی مدد سے مسٹر بیتھیون نے کلکتہ مین جو زنانہ اسکول قائم کیا تھا اس کے ساتھ آنریری سکرٹری کی حیثیت مین انکا تعلق مدتون قائم رہا اور وہ چار سو روپیہ ماہوار کے خرچ سے اپنے وطن مین تین اسکول بھی برابر چلاتے رہے۔ اسکے علاوہ اُنھون نے مختلف حصو نمین متعدد اسکول قائم کیے اور ان کے چلانے مین مدد دیتے رہے۔

(۲)

اسمین کچھ شک نہین کہ ودیاساگر نے تعلیمی حلقہ مین بہت کچھ کوشش کی لیکن جس مخصوص کام کے لیے اسوقت تک انکا نام روشن ہی اور جو بات زمانہ آئندہ مین بھی ان کی شہرت برقرار رکھنے والی ہی وہ مجلسی اصلاح کے میدان مین انکی دلیرانہ کوشش اور غریبون اور محتاجون کی فیاضانہ امداد ہی مجلسی صلاح کے بارے مین سب سے پہلی کوشش جو انکی طرف سے عمل مین آئی وہ یہ تھی کہ وہ سنسکرت کالج کے پروفیسرون کے خلاف رائے ادنیٰ ذات کے لڑکون کو بھی کالج مین داخل کرنے پر زور دیتے تھے اور اسبارے مین اُنھون نے یہان تک مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ اگر گورنمنٹ انکی اس کارروائی مین مانع آتی تو وہ اپنے عہدہ سے دست بردار ہونے تک کیلئے آمادہ تھے۔ دوسری کوشش جو ان کی طرف سے عمل مین آئی یہ تھی کہ زنانہ اسکول کے متعلق مسٹر بیتھیون نے ان سے مدد چاہی اور وہ اس کے لیے پورے طور پر آمادہ ہوگئے بحالیکہ اس کارروائی سے کلکتہ کے راسخ الاعتقاد ہنود مین بہت اضطراب پھیل گیا تھا۔ لیکن سب سے معرکہ کی فتح جو انھون نے اہل بنگالہ کے غیض وغضب کے شدید طوفان مین حاصل کی غریب ہندو بیوگان کے حقوق کی حمایت کے متعلق تھی۔ اس موقعہ پر بنگالیون مین جسقدر ہلچل اور اضطراب پیدا ہوا اسکی مثالین بہت کم دیکھنے مین آتی ہین۔ مسٹر دت فرماتے ہین:۔

بنگال کے ہر شہر اور ہر گاؤن مین اسی بات کا چرچا تھا۔ مشہور بنگالی شاعر ایشور چندر گپت اور بنگالی گوتون کے سردار وشرتھی نے نوجوان مصلح کی نسبت طرح طرح کے طنزیہ اشعار لکھے۔ گاؤن کے لوگ جب کبھی الاؤ پر جمع ہوکر بیٹھتے تو اس معاملے پر گفتگو کرتے تھے۔ شانتی پور کے جلاہون نے ساریون کے کنارون پر ازدواج بیوگان کے گیت بُنکر نمودار کیے۔ غرض بنگال کے ہر گھر مین کیا مرد اور کیا عورتین اسی انقلاب عظیم کے متعلق چرچا کرتے تھے۔

اس پر اکتفا نہ کر کے بعض گنوار لوگون نے اِن سے ذاتی طور پر بھی گستاخانہ سلوک کیا۔ بعض نے مارپیٹ کی دھمکی دی اور بعض انکی جان کے لیوا بنے۔ لیکن اس سے ان کے ارادہ یا ہمت مین ذرا فرق نہین آنے پایا۔ ایک روز اُنھون نے سُنا کہ فلان دولت مند آدمی نے اپنے نوکرون کو میری زدوکوب کے لیے متعین کیا ہی اور وہ اس بات کا مشورہ کر رہے ہین کہ کوئی مناسب موقع ملے تو بدسلوکی کی جائے۔ یہ خبر پاتے ہی وہ بڑی دلیری سے اس امیر کے مکان پر جا پہنچے۔ نوکرون مین سے ایک نے ان کے آنے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "مین نے ایسا ایسا سنا تھا۔ سوچا کہ تم لوگون کو میری تلاش کی خواہ مخواہ تکلیف اُٹھانا پڑے گی۔ اَب مین تمھارے سامنے کھڑا ہون جو کچھ جی مین آئے مجھ سے سلوک کرو" اتنا سنکر وہ سب شرمندہ ہوگئے اور اُنھون نے فوراً معذرت طلب کی۔

ایک اور موقع پر جب وہ ریل مین سفر کر رہے تھے ایک پُرانے خیال کا پنڈت بھی انھی کے کمپارٹمنٹ مین سوار تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ مین جس سے گفتگو کر رہا ہون وہی ودیاساگر ہے۔ بے سمجھے سوچے انکی نسبت طرح طرح کی بدکلامیان کرتا رہا۔ ایشور چندر بھی چپ چاپ سنا کیے اور اس بات کو ظاہر نہ ہونے دیا کہ مین ہی وہ شخص ہون۔ منزل مقصود پر پہنچکر جب دونون گاڑی سے اُترے تو کسی ذریعے سے پنڈت کو معلوم ہوگیا کہ یہی ایشور چندر ہی جسکی توہین خود اسی کے مُنھ پر کرتا رہا ہون۔ بہت نادم ہوا یہان تک کہ غش کھاکر گر پڑا لیکن اُنھون نے اپنے ہاتھ سے اسے ہوش مین لانے کی کوشش کی اور بعد مین ہر طرح کا اطمینان دلایا۔

عقد بیوگان کی تحریک کے ایام مین ودیاساگر کو طرح طرح کی مشکلات پیش آئین۔ لیکن غصہ کے اس طوفان مین وہ چٹان کیطرح استقلال کے ساتھ کھڑے رہے۔ وہ اپنے دشمنون کے رکیک حملون کا جواب طریق مذکور پر دیتے تھے اور دیانت دارانہ نکتہ چینی کا "فاضلانہ بحث اور قومی استدلال کے ذریعے سے"۔ ان کی کوششون کا سمجھدار لوگون کے دلون پر جو اثر پڑتا تھا اسکا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہی کہ اِس زمانے کے بڑے بڑے آدمی

مثلاً پرسن کمار ٹیگور، رام گوپال گھوش، پرتاب چندر سنگھ، دوارکا ناتھ متر، نرنیدر ناتھ سین وغیرہ سبھی ان کے حامی تھے۔ انھین ایام مین جب عقد بیوگان کی حمایت مین ایک ناٹک کا کھیل کیا گیا تو ان بڑے بڑے آدمیون مین سے بعض نے اس مین پارٹ لیے اور کیشب چندر سین نے اسٹیج مینجر کے فرائض ادا کیے۔ اِس تمام تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۶ء مین گورنمنٹ نے عقد بیوگان کو قانوناً جائز ٹھیرایا اور ودیا ساگر نے اپنی زیست مین کم از کم ستر ایسی شادیان کرائین۔ کسی شخص کے لیے اس قدر کامیابی واقعی بہت اہم ہے لیکن اس جد وجہد مین ان کا روپیہ بھی بہت صرف ہوا۔ چونکہ ان اخراجات کے لیے انکی آمدنی پورے طور پر کافی نہ ہوسکتی تھی اس لیے اُنھون نے کم وبیش ۵۰ ہزار روپیہ قرض لیے اور مدت العمر خود ہی اسے اُتارنے کی کوشش مین لگے رہے۔ انکے بعض دوستون نے ادائگی قرضہ کے لیے چندہ جمع کرنے کی تحریک کی لیکن اُنھون نے بڑی سختی سے انھین ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اُنھون نے عقد بیوگان کو اپنی زندگی کا مدعائے عظیم بنا لیا تھا اور اس مدعا کو حاصل کرنے مین انھین اپنی جان تک کی پروا نہ تھی چنانچہ اپنے بیٹے نارائن چندر کی شادی کے موقعہ پر اُنھون نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ ہندو بیوگان کے متعلق اپنی کوششون کو مین اپنی زندگی کا سب سے زیادہ نیکی اور پارسائی کا کام سمجھتا ہون۔

معلوم ہوتا ہے کہ بیوگان کو مدد دینے کا مصمم ارادہ ودیا ساگر کے دل مین چھوٹی عمر ہی مین ہوچکا تھا چنانچہ انکی عمر ابھی ۱۴ سال ہی کی تھی کہ اُنھون نے دیکھا کہ ایک لڑکی جو بچپن مین ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھی شادی کے بعد بہت جلد بیوہ ہو گئی اور ایک اور بیوہ کے گھر ناجائز بچہ پیدا ہوا جسے اس عورت کی شرمناک کارروائی پر پردہ پوشی کرنے کے لیے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ وہ آخر دم تک اپنے اُصول پر قائم رہے گو ان کے بہت سے دوستون نے ایک بار حامی بھر کر بعد مین انکا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک موقعہ پر جبکہ کسی بیوہ کی شادی ہونیوالی تھی اور ودیا ساگر اسمین شریک ہونے جا رہے تھے اُنھون نے مشہور ومعروف مصلح راجہ رام موہن رائے کے بیٹے رام پرشاد رائے کو ہمراہ چلنے کیلیئے کہا لیکن جب وہ متامل ہوا تو اُنھون نے بانی برہمو سماج کی تصویر کی طرف جو دیوار سے لٹک رہی تھی اشارہ کرکے کہا کہ "بہتر ہو آپ اسے وہان نہ لٹکائین بلکہ اُتار کر ردی مین پھینکدین"۔

ودیا ساگر نے تمدنی اصلاح کے متعلق جو بیشمار کوششین کین ان مین ایک وہ بھی تھی جو اُنھون نے کلین براہمنون مین کثرت ازدواج کی خرابی کو روکنے کے بارے مین کی۔ اس معاملے پر انکی توجہ انکی ایک رشتہ دار عورت نے مبذول کرائی تھی جسکی شادی ایک کلین براہمن سے ہوچکی تھی اور جو اپنے شوہر کے تغافل سے تنگ آچکی تھی۔ اُنھون نے حسب معمول اس کام کو پوری کوشش سے شروع کیا اور ایک سے زیادہ عرضی ہزارہا لوگون کی دستخطی گورنمنٹ کی خدمت مین پیش کی۔ اس تحریک سے اِس معاملے کے انسداد کے لیے کوئی قانون تو پاس نہ ہوا البتہ عام رائے مین بہت کچھ اصلاح ہوگئی اور اس وقت سے یہ خرابی دن بدن کم ہوتی گئی۔

یہان پر ودیا ساگر کے اصلاحی کامون کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور اب ان کے اس کام کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُنھون نے بحیثیت ہوا خواہ بنی نوع انسان کیا اور اس مین یہان تک کامیابی حاصل کی کہ کل بنگالی قوم آجتک ان کا نام عزت وتکریم کے ساتھ لیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی عمر ہی سے انھین رفاہ عامہ کا خیال پیدا ہوچکا تھا چنانچہ جن دنون وہ سنسکرت کالج مین ۱۵-۱۶ سال کی عمر مین وظیفہ یاب تھے تو بوقت ضرورت اپنے بیمار ہم جماعتون کی تیمار داری کرتے۔ کسی شکستہ حال فقیر کو دیکھ پاتے حسب استطاعت اسکی مدد سے دریغ نہ کرتے۔ اور اگر خود پاس نہ ہوتا تو دوسرے سے مانگ کر دینے کو بھی موجب عار نہ سمجھتے تھے۔ جن دنون کالج مین تعطیلین ہوتین وہ دیہات مین جاکر بیمارون اور

محتاجون کی خبر گیری اور امداد کیا کرتے تھے۔ جب انھین فورٹ ولیم کالج مین جگہ ملگئی تو ان کے وسائل امداد بھی کسیقدر وسیع ہو گئے۔ اس زمانے مین انھین ۵۰ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور اس مین سے حتی الامکان کافی روپیہ بچا کر وہ اس سے غریب غربا کی مدد کرتے تھے۔ محتاجون کی خبر گیری کرنے مین انھین خاص طور پر آنند (مسرت) حاصل ہوتا تھا اور متعدی امراض کے مریضون کے پاس جانے سے بھی نہ ڈرتے تھے۔ کوئی اجنبی خواہ کتنا غریب ہی کیون نہ ہو یہ انکی مدد پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر ایک شخص کو جو کسی کھاتے پیتے گھرانے مین نوکر تھا ہیضہ ہو گیا۔ آقا نے مارے ڈر کے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ غریب بازار مین پڑا دم توڑ رہا تھا کہ ودیا ساگر کی نظر اسپر پڑ گئی۔ یہ فوراً اسے اُٹھوا کر اپنے ہان لے گئے اور جب تک صحت یاب نہ ہوا اسکی تیمارداری کرتے رہے۔ جن تین اسکولون کا ذکر قبل ازین ہو چکا ہے ان کے علاوہ اُنھون نے اپنے گاؤن مین ایک خیراتی شفاخانہ بھی کھلوایا جس کا ماہوار خرچ سو روپیہ تھا۔ جن دنون وہ خاص انسپکٹر مدارس کی حیثیت مین دورہ کیا کرتے تھے تو انکی یہ حالت تھی کہ راستے مین کسی شخص کو بیمار و نحیف پڑا پاتے تو اسے اُٹھوا کر پالکی مین لٹاتے اور خود ساتھ ساتھ چلتے جاتے حتی کہ کسی سرائے تک پہنچ جاتے اور وہان ہر طرح اس کے آسائش و علاج کا انتظام کرکے آگے بڑھتے جب کہین جاتے تو کچھ متفرق سکے پاس رکھ لیتے اور راستے مین کوئی حاجتمند نظر آتا تو انکی امداد سے بالکل دریغ نہ کرتے تھے۔ کوئی شخص جو ان کے پاس جا کر اپنی مصیبت کی کہانی بیان کرتا ضرور ان سے مدد حاصل کرتا تھا اور کوئی نہین کہہ سکتا کہ انھون نے در پردہ کتنی بیوگان اور یتیمون کی کھانے کپڑے اور اور ضروری سامان کے ذریعے سے مدد کی۔ وہ متعدد غریب لڑکون کو اپنے ہان رکھکر ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔ اسطرح ایک موقعہ پر تو ایک سو لڑکے ان کے ہان کھانا کھاتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گداگر اور اجنبی ان تک بڑی آسانی سے رسائی حاصل کرسکتے تھے اور اسی وجہ سے اُنھون نے کبھی کوئی دربان نہین رکھا کہ مبادا کوئی حاجتمند ان سے ملے بغیر واپس چلا جائے۔ چند آدمی قرض کی بلا مین اسطرح پھنسے ہوئے تھے کہ ان کا رہا ہونا دشوار اور ناممکن نظر آتا تھا اور وہ تباہی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اُنھون نے اپنے پاس سے انکی مدد کرکے قرض سے انھین خلاصی دلائی۔ ایک بوڑھا برہمن ۲۰۰۰ روپیہ کا مقروض تھا اور قرض خواہ اس غریب کی جو تھوڑی بہت پونجی تھی اسکی تاک مین لگا ہوا تھا۔ انھین جب اس معاملہ کی خبر ملی تو اپنے طور پر معاملہ کو اوپر ہی اوپر طے کردیا اور برہمن کو مطلق خبر نہ ہوسکی کہ مجھ پر یہ مہربانی کس نے کی ہے۔ لیکن یہ سب کوششین ۱۸۶۶ء کے قحط کے موقعہ پر ان کی عظیم الشان امدادی کوششون کے مقابلہ مین ہیچ تھین۔ ان کے گاؤن مین قحط سے سخت مصیبت نازل تھی جب یہ وہان پہنچے تو دیکھا کہ ان کی والدہ نے غربا کی امداد پہلے سے شروع کررکھی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر ایک سو غریبون کو روزمرہ کھلایا کرتی تھین لیکن ودیا ساگر کی نظر مین یہ مدد ناکافی تھی۔ اُنھون نے اپنے خرچ سے وہان اور آس پاس کے گاؤن مین لنگر جاری کرکے ایسا انتظام کیا کہ ایک ہزار غربا کو روزانہ مفت کھانا ملتا رہا۔

وہ ادنیٰ سے ادنیٰ ذات کی عورتون کو اپنے ہاتھ سے کھانا دیکر اپنے رشتہ دارون کے لئے ایک مثال قائم کرکے دکھاتے تھے۔ صرف کھانا کھلانے کو انکی امداد کے لیے غیر مکتفی سمجھ کر اُنھون نے حاملہ اور زچہ عورتون کے لیے جداگانہ مکانات کھلوا دیئے۔ ان کی ان تمام کوششون کا اعتراف بارہا گورنمنٹ کی طرف سے ہوا لیکن اس اعتراف کا سب سے بڑا ذریعہ، "ودیا ساگر" "ودیا ساگر" کے وہ بلند نعرے تھے جو ہر روز سیکڑون ہزارون بھوکون اور محتاجون کے منہ سے خود بخود نکلتے تھے۔ اس کے تین سال بعد بردوان مین ایک مہلک قسم کا بخار پھوٹ نکلا جہان اُنھون نے اپنی رفاہ عامہ کی کوششون سے پورے طور پر کام لیا۔ اِن کا مونمن

ان کے ہزارون روپیہ خرچ ہو گئے مگر انھین اسکا کبھی خیال نہین آیا کیونکہ اس کام سے انھین جسقدر خوشی ہوئی وہ اور کسی طرح نہ ہوتی تھی اور گوان کی آمدنی ان غیر معمولی اخراجات کے لیے کبھی مکتفی نہ ہوئی تاہم وہ خوش تھے کہ مین اس کو بہترین مصرف مین لا رہا ہون۔ اسبارے مین انکے دلی خیالات اور محسوسات کا اظہار انکی وصیت سے ہوتا ہے جس مین اُنھون نے نہایت دور کے رشتہ دارون اور متوفی دوستون کے کنبہ والون تک کو فراموش نہین کیا۔

ان حالات مین یہ بات ذرا بھی تعجب خیز نہین کہ رام کرشن پرمھنس ایسے شخص کو جو بنگال مین زمانہ حال کا سب سے بڑا مذہبی آدمی ہو گذرا ہے اور جس کے پیرو ہزارون کی تعداد مین موجود ہین یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ودیاساگر کے مکان پر جاکر ان سے ملاقات کرے جب اس نے اس معاملہ کا ذکر اپنے بعض مقلدون سے کیا تو وہ اِس پر نہایت متعجب ہوئے لیکن اسنے انھین بتایا کہ اگر ایسر ایشور کی مہربانی نہ ہوتی تو ودیاساگر اتنا بڑا آدمی نہ بن سکتا۔ اس کے بعد ایک موقع پر سوامی جی خود ودیاساگر سے ملنے گئے اور کہنے لگے کہ "مین ندی، نالے، اور دریا عبور کرکے اب ساگر (سمندر) دیکھنے آیا ہون"۔ ودیاساگر نے اُسی لہجہ مین جواب دیا "مجھے آپ کے تشریف لانے کی بہت خوشی ہے لیکن میری دانست مین آپکو ساگر مین کھاری پانی اور کوڑیون کے سوا اور کچھ نہ ملے گا"۔ سوامی جی نے استعارہ کی لطافت کو قائم رکھتے ہوے کہا "مین جس سمندر کے پاس آیا ہون وہ دودھ شہد وغیرہ رتنون (جواہر) سے بھرا ہوا ہے اور مجھے پوری توقع ہے کہ مین اس کے اندر سے انمول موتی حاصل کر سکونگا"۔ اس پرلطف گفتگو کے بعد دونون مین بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی اور آخر دونون خوشی خوشی ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

لیکن باوجود مذہبی خیال اور مذہبی خصلت کا انسان ہونے کے معلوم ہوتا ہے کہ ودیاساگر کسی خاص مذہبی فرقہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ایک موقعہ پر اُنھون نے کہا تھا کہ:۔

اس قسم کے فرقے دراصل باہمی تفرقہ پیدا کرتے ہین۔ اگر ایک شخص اس بات کا قائل ہے کہ میرے پاپ گنگا اشنان سے دور ہوجائین گے اور دوسرا اس بات کا کہ شوجی کی بھگتی ہی کے ذریعے سے انسان کو موکش حاصل ہو سکتا ہے تو دونون کو ان کے عقائد مبارک رہین۔ میرے لیے وشویشور (شوجی) اور ان پورنہ (گنگا) میرے والدین ہین اور مین تہِ دل سے انھی کی پرستش کرتا ہون۔ مین کسی حالت مین فرقہ بندی کا حامی نہین ہو سکتا کیونکہ اگر کوئی فریق غلطی پر ہوا تو مین دوسرون کے گناہون کا جوابدہ ٹھیرایا جاؤنگا اور پرماتما مجھے جھوٹ کے لیے سزا دین گے۔

غرض یہ کہ اُنھون نے اپنا مذہبی عقیدہ کبھی کسی پر ظاہر ہی نہین کیا گو اس مین شک نہین کہ اپنے ماتا پتا (والدین) ہی کی وہ "ان پورنہ" اور "وشویشور" ہی کیطرح پرستش کرتے رہے۔ وہ ہر روز صبح اُٹھکر انھین یا انکی تصاویر کو پرنام کیا کرتے تھے اور کسی اہم کام کو شروع کرنے سے پیشتر ان کی آشیش (برکت) ضرور حاصل کر لیتے تھے۔ والدین کی تعظیم ان کے دل مین یہان تک گھر کر چکی تھی کہ ازدواج بیوگان کے معاملے کو چھیڑنے سے پہلے بھی اُنھون نے ان سے اجازت حاصل کرنا ضروری سمجھا اور اگر ان کے ایک مرتبہ والد کی سختی سے تنگ آکر سرکش ہو جانے کے معاملے کو مستثنےٰ قرار دیدیا جاے تو انکی ساری عمر مین ایک بات بھی ایسی نظر نہین آتی جو انکی پابندی فرض و تعظیم والدین پر حرف لانیوالی ہو۔ ان کو سب سے بڑی محبت اپنی ماں سے تھی اور اسی سے یہ فیاض منشی ورثہ مین ملی تھی۔ ایک موقع پر صرف اپنی ماں کی خوشی پوری کرنے کے لیے وہ کلکتہ سے پیدل چلکر اپنے گاؤن مین پہنچے تھے۔ راستے مین اُنھون نے کہین آرام بھی نہ کیا اور دو بڑے دریاؤن کو جو خوب چڑھاؤ پر تھے عبور کرکے عین وقت پر اسکے پاس جا پہنچے! اُنھون نے عزم کر لیا تھا کہ اگر مجھے گاؤن جانے کے لیے فورٹ ولیم کالج سے چھٹی

نہ ملی تو نوکری چھوڑ دونگا۔ باپ سے انھین جو باتین ورثہ مین ملین وہ کام کی باقاعدگی اور سلیقہ اور پوری محنت تھین۔ چونکہ ان کے والدین پاک صاف، اور محبت سے معمور، دل رکھتے تھے اس لیے خدا نے انھین جو بیٹا دیا وہ ہر پہلو سے کامل نمونہ کا درجہ رکھتا تھا۔ جن دنون انکی شہرت بنگال مین چارون طرف پھیلی ہوئی تھی اِن دنون بھی اُنھون نے اپنے والدین کی خاطر ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت کا کام سرانجام دینے مین انکار نہین کیا۔ جب وہ کرم ٹانڑ مین سادہ زندگی بسر کرنے والے سنتھالیون کے ساتھ جنگل مین رہا کرتے تھے تو ان کے ساتھ گھل مل گئے تھے کہ وہ انھین اپنی ہی برادری کا آدمی سمجھتے تھے۔ ہر روز صبح کے وقت اِن لوگون کی جھونپڑیون مین جاتے اور انھین کسی چیز کی ضرورت ہو تو بہم پہنچاتے تھے۔ بھوکون کو روٹی، ننگون کو کپڑا، اور بیمارون کو دوا دینا اِن کا فرض تھا اور بسا اوقات انھین پھل اور مٹھائی بھی دیا کرتے تھے۔ انکے لیے اُنھون نے ایک اسکول کھولدیا اور ان کی مچھلیان خود خرید کر ان کی آمدنی مین اضافہ کرنے کا طریقہ نکالا۔ انکے جنگلی ناچ سے وہ بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ جنگل کی سبزی ترکاری بطور تحفہ انکے روبرو پیش کرتے جسے وہ بڑی خوشی سے قبول کر لیتے تھے۔ اِن مین سے بعض انھین ازراہ محبت باپ اور بھائی اور بعض چچا کہا کرتے تھے اور وہ اِن صاف باطن لوگون کے مہربانانہ سلوک سے بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک سنتھال کسی عورت کو ہمراہ لیے ان کے پاس آیا اور ان سے اس کے لیے کپڑا مانگا۔ اُنھون نے جواب دیا میرے پاس اسوقت اس کے دینے لائق کوئی کپڑا نہین ہے۔ لیکن سنتھال انکی طرف سے انکار کا لفظ سننے کا عادی نہ تھا۔ اس نے ودیا ساگر سے الماری کی چابی لیکر خود ہی بکس کھول لیا اور اس بے تکلفی سے گویا وہ خود ہی اس گھر کا مالک ہے ایک قیمتی کپڑا نکالکر اس عورت کے حوالہ کر دیا۔ ودیا ساگر اس شخص کی اس بے تکلفی سے بہت ہی خوش ہوے۔ سامان عیش سے انھین فطری نفرت تھی۔ ایک بار اُنھون نے ایک گھوڑا گاڑی رکھ لی تھی مگر پھر جلدی ہی اسے بیچ ڈالا۔ لباس انکا بے حد سیدھا سادہ ہوتا تھا۔ یعنی ایک معمولی دھوتی، چادر، اور پاؤن مین سلیپر۔ وضع کی پابندی اسقدر تھی کہ لفٹنٹ گورنرون سے بھی اسی لباس مین ملاقات کی۔ اِس قسم کے سادہ کپڑے پہننے کی وجہ سے بعض اوقات عورتین ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتی تھین۔ جن دنون وہ انسپکٹر مدارس تھے تو ایک موقع پر کسی دیہاتی اسکول کا معائنہ کرنے گئے۔ اسکول کی عمارت کے قریب بہت گنوار ان کی صورت دیکھنے جمع ہو گئے۔ عورتین بھی بہت تھین اور وہ قدرتی طور پر اس بات کی متوقع تھین کہ کوئی بڑا آدمی شاندار کپڑون والا دیکھنے مین آئے گا لیکن جب وہ دھوتی چادر پہنے ایک عام آدمی کی طرح پیدل چلتے نظر آے تو انکی حیرت بہت بڑھ گئی۔ ایک بڑھیا جو گھنٹون دھوپ مین کھڑی انکا انتظار کرتی رہی تھی اسے تو کسی طرح اِس بات کا یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ شخص ودیا ساگر ہو سکتا ہے۔ انکی طرف بہت دیر تک گھورتی رہنے کے بعد وہ آخر کار کہنے لگی "کیا مین اِس اُڑیہ قلی کو دیکھنے اتنی دیر تک دھوپ مین جلا کی؟ نہ گاڑی، نہ چپکن، نہ چغہ، نہ پگڑی، نہ گھڑی، رام رام! ایسا آدمی! اور لوگ کہتے تھے وہ اتنا بڑا آدمی ہے! واہ کیسا پاگل پن ہے!"

لیکن گو وہ خود اسقدر سادہ لباس پہنتے تھے، اور خانگی معاملات مین نہایت کفایت شعاری برتتے تھے تاہم اپنے شاندار کتب خانے کی کتابونکو خوب بنا سنوار کر رکھتے تھے۔ یہان تک کہ ولایت سے انکی جلدین بندھوانے مین بہت سا روپیہ صرف کیا کرتے تھے۔ آخری ایام مین وہ کسی شخص کو اپنی کتاب عاریتاً نہ دیتے تھے۔ انکی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی کتابون سے بے حد محبت کرتے تھے اور لیجانیوالون پر انھین ایک طرح کی بے اعتباری تھی جو کسی طرح بے وجہ نہین

کہی جا سکتی۔ ایک بار ایک دوست ان سے ایک نہایت قیمتی مسودہ مطالعہ کی غرض سے مانگ کر لے گیا لیکن بجائے پڑھنے کے اس نے اسے بیچ ڈالا۔ اس طرح پر اسنے اس مسودہ سے نفع تو حاصل کیا مگر وہ نفع ذہنی نہین بلکہ مالی تھا۔ کچھ مدت بعد ودیاساگر نے اس سے کتاب واپس مانگی تو بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگا "مدت ہوئی کہ کتاب آپ کو واپس کر چکا ہون"۔

سطور بالا مین جو کچھ لکھا جا چکا ہو اس سے اس بات کا بآسانی اندازہ ہو سکتا ہو کہ ودیاساگر ایک ایسا شخص تھا جس پر ہر قوم یا ہر ملک کو فخر حاصل ہو سکتا ہو۔ انکی زندگی کی ہر بات مین کوئی نہ کوئی سبق ضرور پایا جاتا ہو۔ انمین وہ تمام صفات موجود تھین جو کسی شخص کو بڑا بناتی ہین اور انمین سب سے زیادہ قابل ذکر خوبیان صداقت، مہربانی، سادگی، استقلال آزادگی، فیاضی، اور جوش تھین۔ والدین کی وہ جسقدر تعظیم کرتے تھے اسے دیکھتے ہوئے پورانک زمانہ کا سمان نظر و نین پھر جاتا ہو۔ زمانہ طالب علمی مین انھون نے جو سختیان اور تکالیف جھیلین ان سے ہر نوجوان نہایت قیمتی سبق حاصل کر سکتا ہو۔ ان کا زمانہ اُستادی ہمارے روبرو زمانہ قدیم کے رشیون کی مثال پیش کرتا ہو جو جنگلون کے اندر رہ کر اپنے مقدس آشرمون مین بڑے پیار و محبت سے اپنے چیلون کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ بہ اعتبار ایک سوشل ریفارمر کے اُنھون نے جو کام کیئے وہ انکی فیاضانہ فطرت کو بخوبی واضح کرتے ہین۔

ایشور چندر ودیاساگر نے ۷۰ سال سے زائد عمر حاصل کر کے ۲۹ جولائی سنہ ۱۸۹۱ء کو انتقال کیا۔ جس وقت ان کی ارتھی شمشان کو لے جانے لگے تو ہزارہا مرد و زن، پیر و جوان، ہر مذہب و ہر ملت کے لوگ اس کے ہمراہ تھے اور وہ سب کے سب اس بات پر متفق تھے کہ اگر زمانہ حال مین کسی شخص نے سادہ زندگی بسر کرتے ہوئے اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھنے کی عملی مثال قائم کی ہو تو وہ ودیاساگر تھا جسے ہزارہا غریب لوگ "دیاساگر" کہکر خوش ہوتے تھے۔

تیرتھ رام

آنریبل مولوی سیّد حسین بلگرامی

مملکت آصفیہ، اس خیال سے کہ اُس کے حکمران اسلامی روایات کے علم پرور ہین، اور اِس لحاظ سے کہ وہان اس گئی گذری حالت مین بھی معارف شناسی اور علم پروری کی وہی خصوصیات نمایان ہین جو کسی زمانہ مین دولت عباسیہ اور فرمانروایانِ قرطبہ کے ساتھ مختص سمجھی جاتی تھین، اقطاع ہند مین بانود سمجھی جاتی ہو۔ شروع سے لیکر ابتک دولت نظام مین ترقی و اصلاح کے کئی دور ہو چکے ہین لیکن مورخین کا اجماع ہو کہ سر سالار جنگ اعظم کا زمانہ حیدرآباد کا "عہد زرین" تھا۔ حقیقت حال بھی یہی ہو کہ اس دانشمند مدبر کے وقت مین حیدرآباد کے سیاسی اقتدار اور ملکی عظمت کا دائرہ اسقدر وسیع تھا کہ آج ہماری نگاہین اُن کا حصر کرنے سے عاجز ہین۔ اُن تمام تاثیرات کے اعتبار سے جو وزارتِ عظمیٰ کی بدولت دکن کو نصیب تھی اُس شہرت اور وقعت کو دیکھتے ہوے جو اُس عہد مین حیدرآباد کی شاہی خاندان کو حاصل ہوئی اور علم دوستی اور معدلت پژوہی کے اُس جوش کا اندازہ کرتے ہوئے جس سے اپنے اپنے وقت پر ہر شخص نے فائدہ اُٹھایا، بے جا نہوگا اگر یہ کہا جاے کہ حیدرآباد مین سالار جنگی کارنامے اُسی عزت و شان سے دیکھے جاتے ہین جو کبھی بغداد مین برامکہ اور دارالسلطنت سلاجقہ مین نظام الملک طوسی کے حصے مین آئی تھی۔

سر سالار جنگ کے عملیات کی نمایان کامیابی کا ایک گہرا اور سچا راز یہ بھی تھا کہ اُنھون نے اپنے گرد ہندوستان کے تمام لائق اور یکتا افراد جمع کر رکھے تھے۔ حیدرآباد کی تعلیمی حالت اُسوقت ایسی نہ تھی کہ وہان کی آب وہوا سے قابل جوہر پیدا ہو سکتے اور اسکی ضرورت تھی کہ بیرونی حصص سے ایسے اشخاص چیدہ، بلائے جائے جنکی دماغی قوتین حیدرآباد کے عروج کا مرکز قرار پاتین۔ سر سالار جنگ کا سا دور بین آدمی اِس ضرورت سے قطع نظر کر نہین سکتا تھا چنانچہ اُنھون نے شمالی ہند کے بہت سے نامور لوگون کو از راہ قدردانی حیدرآباد طلب کیا اور اُن کے سپرد وہ گرانبار فرائض کئے گئے جن کے انجام دینے کی اُنمین فطرتی قابلیت موجود تھی۔ اِن لوگون مین جو بزرگ سب سے پیشتر حیدرآباد کے سیاسی پلیٹ فارم پر نمودار ہوے وہ آنریبل مولوی سید حسین صاحب بلگرامی تھے جن کے چہل سالہ کارنامے اسبات کے شاہد ہین کہ جسطرح وہ ارکان دولت نظام کے زمرہ مین اپنے اور ہمعصرون سے پہلے شریک ہوکر الفضل للمتقدم کے مصداق ہوے اسیطرح بے لوث کارگذاری اور مستقل شہرت کے میدان مین بھی وہ کسی سے پیچھے نہین رہے۔

مولوی سید حسین صاحب بلگرامی ہندوستان کے اُس طبقے سے تعلق رکھتے ہین جنکی قابلیت اور علمیت اور اُسی کے ساتھ اجتہادِ رائے مسلم ہو۔ بلگرام اودھ کا مشہور قصبہ ہو اور اُسکی خاک کچھ ایسی مردم خیز واقع ہوئی ہو کہ آجتک وہان سے متعدد نامور اور ذی شہرت اصحاب نکل چکے ہین۔ توطن کے لحاظ سے مولوی سید حسین صاحب کو اُنھین اسلاف کی جانشینی کا فخر ہو جنکی عظمت کا نقارہ

آج بھی اُسی زور شور سے بج رہا ہو۔ لیکن باریک بین نگاہین مولوی صاحب کی بزرگی و ناموری کا حصہ دار تمام ہندوستان کو سمجھتی ہین اور واقعیت بھی یہی ہو۔

آنریبل مولوی سید حسین بلگرامی! خدا جانے اس نام مین کیا جادو ہو اور دو چار الفاظ کے اس مجموعے مین کیا تاثیر ہو؟ قلم اس جادو اور اس تاثیر کا فوٹو کھینچنے سے عاجز ہو لیکن ذوق سلیم ان کی کیفیات کا اندازہ کر سکتا ہو کہا جاتا ہو کہ لفظون کے ظاہری معانی کے علاوہ باطنی مطالب بھی ہوتے ہین۔ اگر یہ سچ ہو تو ہم کہین گے کہ آنریبل موصوف کے نام نامی سے جو معنوی مطلب ذہن نشین ہوتا ہو وہ عبارت ہو سوز و گداز قوم سے، عام ہمدردی سے، بے لوث محبت سے، حقیقی خدمت ملک سے، ایثار نفس سے، علم دوستی سے، صاف گوئی سے، راستبازی سے، اور اُن تمام اوصاف سے جو اِس یگانہ روزگار کے حصے مین آئی ہین۔ ایک بات اور بھی عجیب ہو کہ اس نام کی تاثیر، مسمریزم کی طرح محدود یا پابند نہین ہو بلکہ لامحدود اور غیر پابند، ساری فضائے ہند مین یہ تاثیر پھیلی ہوئی ہو، اور مسلم، ہندو، عیسائی، پارسی ہر ایک کے قلب اُس سے متاثر ہوتے ہین۔

مولوی صاحب کے حالات ملک مین اس کثرت سے زبان زد ہین کہ اُن کا تفصیلی اعادہ تحصیل حاصل سے زیادہ نہوگا۔ مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ بلگرام کے ایک معزز و موقر خاندان کے رکن رکین اور فرد فرید ہین۔ آپ کا خاندان عراق عرب سے بلگرام آیا تھا۔ عہد مغلیہ مین آپ کے بزرگون کا رسوخ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور جب ہند کی عنان حکومت برٹش گورنمنٹ کے قبضے مین آئی اُس وقت بھی آپ کے خاندانی عروج و ترقی کی رفتار یکسان طور پر تیز رہی۔ آپ کے خاندان مین علم و فضل کا چرچا جو کچھ آجکل ہو وہی حالت بزرگون کی بھی تھی اسی وجہ سے آپ کی تعلیم کا انتظام بھی نہایت معقول رہا۔ گویا آپ کو عربی، فارسی یا انگریزی کی جو تعلیم دلائی گئی وہ بالکل با اُصول تھی۔ انگریزی زباندانی مین آپ کو جو ید طولیٰ اُس وقت حاصل ہو اُسکی بنیاد گویا زمانہ طالب علمی پڑ چکی تھی۔ مطالعہ علمی کا شوق آپ کی طبیعت ثانیہ بنا ہوا تھا۔ کتابون کے ساتھ آپ کو عشق تھا حیدر آباد مین بھی باوجود فرائض منصبی کی گرانباری کے آپکا بہت کچھ وقت لائبریری مین کٹتا تھا جسکو بیش بہا اور نادر کتب کا مجموعہ کہنا بالکل صحیح ہوگا۔

مضمون نویسی اور انشاپردازی کا شغف بھی آپ کو ابتداء سے ہو چنانچہ جب آپ لکھنؤ مین تھے تو ایک انگریزی اخبار نکال رکھا تھا جسکی ترتیب و تالیف آپ ہی کے ذمہ تھی۔ اِن تمام باتون نے آپ کی شہرت کا دائرہ بہت وسیع کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب ۱۸۷۳ء مین نواب سر سالار جنگ بہ تقریب دورہ شمالی ہند آئے تو آپ کو اُن سے تعارف حاصل کرنے کا بہت اچھا ذریعہ پیدا ہوگیا۔ نواب سر سالار جنگ کی مردم شناس نظر آپکے جوہر طبعی کو پہچان گئی چنانچہ آپکو لکھنؤ سے حیدر آباد جانا پڑا اور وہان آپکو صدارت عظمیٰ کے معتمد خصوصی (پرائیویٹ سکرٹری) کا منصب تفویض ہوا۔ وزیر اعظم دکن کی پرائیویٹ سکرٹری شپ کی ذمہ داریان کوئی معمولی نہین ہوتین لیکن مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے جس خوبی اور دانشمندی سے اپنے فرائض انجام دیئے ہین اُن کی یاد ہنوز اس وقت تک حیدر آباد والون کے دلون مین موجود ہو۔ رازداری کی صفت آپ مین نہایت قیمتی صفت ہو اور نواب سر سالار جنگ کا اعتماد کلی حاصل کرنے مین اِس سے بیش بہا امداد پہنچی۔ نواب موصوف آپ پر اپنا دلی عندیہ تک ظاہر کرنے مین حیص بیص نہ کرتے تھے۔ حیدر آباد مین اب بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہون گے جو نواب صاحب اور سید صاحب کے بے تکلفانہ اور راستبازانہ برتاؤ کی چشم دید شہادت دے سکین گے۔

۱۸۸۲ء مین حضرت غفران مکان میر محبوب علیخان مرحوم تخت نشین ہوئے اور انتظام مملکت کے لیے اسٹیٹ کونسل مقرر ہوئی اُسکے

سکرٹری بھی مولوی سید حسین مقرر ہوئے۔ سٹیٹ کونسل کے ختم ہونے پر مولوی صاحب موصوف کو حضور نظام مرحوم کے پرائیویٹ سکرٹری شپ کا قلمدان سپرد ہوا۔ اس خدمت کو آپنے بہت زمانہ تک انجام دیا اور غائت درجہ کی نیکنامی اور راستبازی سے جو لوگ ریاستی کاروبار سے واقف ہین اور اُسکی پیچیدگیون کا کچھ تجربہ رکھتے ہین وہ مولوی سید حسین صاحب کی مشکلات کا ایک حد تک اندازہ لگا سکتے ہین لیکن مولوی صاحب نے اس خداداد قابلیت و عقلمندی سے اپنا کام انجام دیا ہو کہ شاید و باید۔

آخر آخر مین آپ کے تفویض نظامت و تعلیمات عامہ ممالک محروسۂ سرکار عالی" کا عہدہ تفویض ہوا تھا اور وظیفہ یاب ہونے سے پیشتر تک آپ اسی منصب پر مامور تھے۔ ہم اسجگہ آپ کی تعلیمی خدمات کا تبصرہ کرنے پر آمادہ نہین، نہ قلت گنجایش اسکی اجازت دیگی، لیکن یہ ضرور کہین گے کہ آپ نے اگرچہ حیدرآباد یونیورسٹی علحدہ قائم نہین کی، صنعتی تعلیم کو بڑے پیمانہ پر جاری نہین کیا، تعلیم نسوان کو بھی بہت محدود حالت مین رکھا: تاہم حیدرآباد کے حالات و واقعات کا اندازہ کرنے کے بعد اس صیغے مین آپ سے جو کچھ ہو سکا وہ کم نہین ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہین کہ مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کو ہر ایک قسم کی تعلیم رائج کرنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی لیکن حکام بالادست کی طرف سے اُنھین کسی قسم کی امداد نہین پہنچی۔ آج جو کچھ تعلیم وغیرہ کا چرچا حیدرآباد مین ہورہا ہو وہ سب مولوی صاحب کی ذاتی کوششون کا نتیجہ ہو۔ اکثر یہ اعتراض ہوتا ہو کہ آپ کے زمانہ مین صنعتی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہین کی گئی لیکن یہ صحیح نہین ہو۔ توجہ ضرور ہوئی ہو، ہان اُسکے نتائج کچھ زیادہ مستقل اور دیرپا نہین نکلے۔ اور اُسکی اصلی وجہ وُہی تھی جو ہم اوپر لکھ آئے ہین۔ ہمین اتفاق سے اُس زبردست یادداشت کی ایک نقل ملگئی ہو جو آپ نے ممالک محروسۂ سرکار عالی مین تعلیم صنعت و حرفت کو رواج دینے کے متعلق قلمبند فرمائی تھی۔ یہان اُسکا اقتباس درج کیا جاتا ہو کہ ناظرین بھی اسکو پڑھکر آپ کی اصابت رائے کا اندازہ کرسکین:-

سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کی بنیاد اُن ہی اُصول پر جاری ہو جنکی پابندی قدیم سے چلی آتی ہو۔ غور کیا جائے تو نوعیت سب کی یکسان ہو۔ غریب، امیر، عہدہ دار، ساہوکار، مزارع، اہل حرفہ سبھی کے بچّون کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہو یا وہ علوم جن سے لکھنے پڑھنے مین مدد ملے اور دفتر یا حجرہ مین بیٹھکر دماغ سے کام لینے کی عادت پڑجائے۔ ظاہر ہو کہ یہ طریقہ تعلیم کا فرض کرلیتا ہو کہ امیر و غریب سب کو دُنیا مین بہ آزادی یا بآسائش معیشت پیدا کرنے کیلئے فقط دماغ ہی سے کام لینا بس ہو۔ املا و انشا کا فن، ساری مشکلون کو حل کرسکتا ہو.... کچھ شک نہین کہ یہ صفات جنکا ذکر اوپر ہوا بجائے خود کسب کے قابل ہین اور نہایت درجہ مفید ہین... مگر شاید تمام آبادی ملک کا اگر حساب کیا جائے تو سنٹو مین پانچ بھی ایسے نہ نکلین گے جن کو انشا و املا سے کام لینے کی بالعادت ضرورت رہتی ہو۔ پس عامۂ خلائق کا تمام تعلیمی وقت ایسے فنون کی تحصیل مین صرف کرانا اُصول تعلیم کے خلاف ہو۔ عموماً رعایا کو اس قسم کی تعلیم دینا چاہیئے جو کسب معیشت مین اُنکو مدد پہنچائے اور اُن کے اذہان کو اسقدر صیقل دیدیے جس سے وہ اپنے روزمرہ کے معاملات کو جلد سمجھ سکین..... جو بچے فقط چشم و دماغ سے پڑھنا اور ہاتھ سے لکھنا سیکھتے ہین اور اُن اعضا سے اور کوئی کام نہین لیتے اُن سے کیونکر اُمید کیجا سکتی ہو کہ وہ سن شعور کو پہنچکر ہل درست چلالین گے یا کوئی دستکاری کا کام بھی بہتر کرسکینگے ..... حاصل تقریر یہ ہو کہ مزارعین و اہل حرفہ وغیرہ کی اولاد کو محض کتابی تعلیم نہ دینا چاہیئے بلکہ ایک معتدبہ حصّہ اُن کے تعلیمی وقت کا صنعت اور حرفت کے سکھانے مین صرف کرنا چاہیئے۔ کتابی تعلیم اُن کو فقط اسقدر دینا چاہیئے کہ وہ لکھنے پڑھنے مین دوسرے کے محتاج نہ رہین اور اپنی صنعت وحرفت مین عقل و فہم سے کام لے سکین اور اُسمین اختراع و ایجاد کرنے پر

قادر ہون۔

ان خیالات کے اظہار فرمانے کے بعد آپ نے تجویز بنائی ہو کہ اضلاع دکن مین کہان کہان صنعتی مدارس کھولے جانے چاہیئے۔ اِس یادداشت سے کم از کم اسقدر پتہ ضرور چلتا ہو کہ آپ بھی اُسی صنعتی تعلیم کے مؤید تھے جسکی ضرورت عام طور پر ہندوستان مین محسوس ہو رہی ہو۔

اسی طرح یہ اعتراض بھی بسا اوقات وارد کیا جاتا ہو کہ باوجود تعلیم نسوان کے بہترین اور پرجوش حامی ہونیکے آپ کے زمانۂ نظامت مین مدارس نسوان نے خاطرخواہ ترقی نہین کی۔ لیکن یہ اعتراض بالکل بودا اور نادرست ہو۔ حیدرآباد مین دو ایک زنانہ اسکول بہت خوبی سے کام کر رہے ہین۔ اِس سے زیادہ زنانہ اسکولون کی ضرورت کیا تھی؟ وہ اسکول تو بہت سے قائم ہو سکتے تھے مگر پڑھنے والیان کہان سے آتین۔ ہان اگر والدین مین لڑکیون کو تعلیم دلانے کا شوق ہو جائے تو مدارس کی کثرت مفید ہو سکتی ہو۔

مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کا زمانۂ زندگی زیادہ تر حیدرآباد مین گذرا ہو۔ وہان کے کئی انقلابات اُنکی نظرون کے سامنے ہوئے۔ اُنھین ریاستی زندگی کا خاص تجربہ ہو۔ چنانچہ اسوقت تک وہان کتنی سازشین ہوئین، پارٹی فیلنگ کا زور بڑھا، وزارتین بدلین، حسد و عناد کی گرم بازاریان رہین، لیکن آپ کی کوہ وقاری دیکھنے کے قابل ہو کہ آپنے اپنے اُصول سے ذرہ بھر جنبش نہین کی۔ ایک سیدھا راستہ جو شروع مین اختیار کیا اُس پر سے نہین ہٹے۔ انقلابون اور سازشون اور دھڑہ بندیون کے طوفان نے آپ کی طبیعت پر کوئی اثر نہین کیا۔ آپ ہر دَور مین یکسان معزز و ممتاز و معتمد رہے، اور یہی اعتماد و امتیاز تھا جسکی وجہ سے حضور نظام مرحوم کی آپ پر خاص نظر عنایت تھی۔ آپ نے کئی مرتبہ فرائض منصبی سے سبکدوش ہونے کے لیے استعفا دیا لیکن مرحوم نے نامنظور فرمایا حضور حال کی تعلیم و تربیت کا ایک حصہ آپ کے سپرد تھا اور یہ بڑی خوشی کی بات ہو کہ زمانۂ حال مین گورنمنٹ نظام نے آپ کی سالہا سال کی تجربکاری سے فائدہ اُٹھانے کے لیے آپ کو مشیر وزارت مقرر فرماکر حد درجہ کی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہو۔ گورنمنٹ نظام سے آپ کو جو خطابات حاصل ہین اُن کی تفصیل یہ ہو۔ نواب علی یار خان، مؤتمن جنگ، عماد الدولہ عماد الملک بہادر، اور گورنمنٹ ہند کی طرف سے جہان ایک مرتبہ آپ وائسرائیگل کونسل کے اور بالآخر مجلس وزیر ہند کے رُکن مقرر ہوئے، آپ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے خطاب سے ممتاز ہین۔ انگریزی سوسائٹی مین آپ کو جو نمایان وقعت و امتیاز حاصل ہو اُسکا حال بھی کسی باخبر سے پوشیدہ نہین۔ آپ ہندوستانیون اور انگریزون کے میل جول کے زبردست حامی ہین۔ علی گڈھ کالج مین ایک دفعہ آپ نے اِسی مبحث پر نہایت قابل قدر خیالات ظاہر فرمائے تھے۔

ملکی خدمات سے الگ ہو کر دیکھیئے تو آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین بالقابہ کے قومی کارنامے بھی قابل رشک نظر آتے ہین۔ علی گڈھ کالج کے آپ مربیون مین ہین اور حیدرآباد مین علیگڈھ کاز،، کو جو تقویت پہنچی وہ سب آنریبل بلگرامی کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ ٹرسٹیان کالج کے آپ کچھ عرصے تک پریسیڈنٹ رہ چکے ہین۔ دو مرتبہ آپ نے کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اپنی بیش بہا آرا سے قوم کو مستفید ہونے کا موقع دیا۔ مملکت آصفیہ کی بے نظیر علم دوستی کی مثالین جو دور آخر سے تعلق رکھتی ہین زیادہ تر نواب صاحب قبلہ کی بدولت قائم ہوئین۔ کئی اہل قلم اور مصنف دولت نظام کے وظیفہ خوار ہین اور ان سبھون کو آپ ہی کی کوشش سے فراغ بالی نصیب ہوئی ہو۔

نواب عماد الملک بہادر کی علمی کارگذاریون کا تبصرہ جداگانہ مضمون کا محتاج ہو۔ ہم یہان چند سطور مین ان کا مختصر ذکر کرین گے۔

آپ کی انگریزیت، عربیت اور فارسیت مسلّم ہے۔ آپ کی انگریزی زباندانی کا اقرار یورپین اہل قلم تک کو ہے۔ آپ کے کئی مضامین انگریزی زبان مین چھپکر شائع ہو چکے ہین۔ اسلامی ڈیپوٹیشن نے جو اڈیرس شملہ پر حضور وائسرائے بہادر کی خدمت مین پیش کیا تھا اُسے آپ ہی نے قلمبند فرمایا تھا۔ اُسکے متعلق اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ لٹریری حیثیت سے بھی وہ ایک یادگاری چیز ہے۔ آپ کی "تاریخ دکن" جو انگریزی زبان مین مدوّن ہوئی ہے قابل دید چیز ہے جسمین زبان دانی کے علاوہ تاریخی تحقیقات کی حدین کھنچی ہوئی پائی جاتی ہین۔ بہت زمانہ ہوا آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا تھا لیکن بعض موانعات کے باعث اُسکی تکمیل اُس زمانے مین نہو سکی۔ اَب معلوم ہوا ہے کہ آپ کی توجہ اس طرف پھر مبذول ہوئی ہے۔ خدا کرے آپ اس کار خیر کو جلد تر اتمام کو پہنچائین۔ اسلامی دُنیا کی یہ سخت ترین ضرورت ہے جس کی آپ کے ہاتھون پورے ہونیکی اُمید کی جاتی ہے۔

سطور بالا مین آپ کے حالات جو کچھ درج کیے گئے ہین وہ محض ایک خاکہ ہے ورنہ آپ کے واقعات زندگی اور آپ کی مختلف النوع خدمات کے تذکرہ کیلئے رسالون کی ضخامت سے کام نہین نکل سکتا۔ آپ کی ذات ہندوستان کے لیے مغتنمات سے ہے۔ اگر ہمارے گوش شنوا اور چشم بینا ہون تو آپ سے ہم بہت سے مفید سبق حاصل کر سکتے ہین۔ خدائے پاک و برتر آپ کا سایہ ہما پایہ ملک اور قوم کے سر پر عرصۂ مدید تک قائم رکھے اور آپ کے فیضان سے خاص و عام کو مستفیض ہونے کا موقع عطا فرمائے۔ آمین!۔

آنریبل نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی سی ایس آئی

تمہید ہندوستان کے مسلمانون مین کسی کا نام اس قدر مانوس و مشہور نہین ہی جیسا نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی کا ہی۔ آپکی عالمانہ قابلیت اور قوت فیصلہ کے سبب سے یورپ والے اور ہندی سب واجب التعظیم سمجھتے ہین۔ ملک ہند کی سب سے بڑی ریاست مین ذمہ داری کی کتنی ہی اعلیٰ خدمتون پر ان کا رہنا اس بات کا شاہد ہی کہ وہ اعلیٰ ترین عہدہ جو گورنمنٹ نے ان کو عطا کیا تھا انکے لیے کتنا مناسب و موزون تھا۔ لوگون کو عموماً یہ بات شاید نہ معلوم ہوگی کہ حیدرآباد کوئی چالیس برس سے مسلمانون کے جوہر قابلیت دکھانے اور ناموری حاصل کرنے کا میدان بنا ہوا ہی اور اس ریاست کے لیے یہ امتیاز نواب مختار الملک مرحوم کے طفیل سے حاصل ہوا ہی۔ وہ ہمیشہ اس فکر مین رہتے تھے کہ لائق سے لائق لوگون کو ڈھونڈھ کر سرکار نظام مین جگہ دیجائے۔ اس مضمون کا زیر بحث بھی وہ شخص ہی جو شمالی ہند کے مسلمانون مین سب سے پہلے حیدرآباد کے عہدہ دارون مین داخل ہوا اور زیادہ تر اسی کی زحمت کشی اور انتہائی راست بازی کا نواب مختار الملک پر یہ اثر پڑا کہ انھون نے ہندوستان ہی سے عہدہ داران ریاست کے تقرر کا مصمم ارادہ کر لیا اور پھر اسی ارادہ نے بتدریج یہ عملی صورت اختیار کی کہ حیدرآباد کے حال اور آئندہ طبقہ کے واسطے ایک قابل قدر اور گران بہا نظیر قائم ہوگئی۔

خاندان آپکے آباو اجداد ساتویں صدی ہجری (۱۲۱۰ء) مین ہندوستان آئے اور ہر دوئی علاقہ اودھ مین جہان اسوقت ایک چھوٹے سے راجہ کا عمل تھا۔ اقامت اختیار کی۔ آپکے دادا اس خاندان کے پہلے شخص ہین جو گورنمنٹ کی اعلیٰ خدمت پر سرفراز ہوے اور اپنی آخر عمر مین بادشاہ اودھ کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار مین سفیر مقرر ہو کر آئے۔ یہی زمانہ ہی جب سرکار نظام کی طرف سے میر عالم سفیر ہو کر کلکتہ مین آئے ہین۔ انکی عمر زیادہ تر کلکتہ ہی مین گزری۔ ان کے سب لڑکے وہین پیدا ہوے اور وہین سے تعلیم پائی۔ آپ کے والد اور چچا نے نصاب علوم مشرقیہ کی تکمیل مدرسہ کالج مین کی جسے لارڈ وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا۔ اور غالباً مسلمانون مین سب سے پہلے یہی لوگ ہین جنھون نے اُس مدرسہ مین انگریزی زبان حاصل کی ۱۸۳۵ء مین آپکے والد ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوے اور ۱۸۷۵ء تک بنگال و بہار کے مختلف اضلاع مین نہایت قابلیت و امتیاز کے ساتھ سرکاری خدمتون کو انجام دے کر وظیفہ یاب ہوے۔ آپکے چچا آنریبل سید اعظم الدین حسین خان جب ملکی خدمتون کی طرف متوجہ ہوے تو پہلے لارڈ ہارڈنگ کے اڈی کانگ اور ترجمان مقرر ہوے پھر پولیٹیکل ایجنٹ کے عہدہ پر مامور ہو کر امرائے سندھ کی ریاستون مین بھیجے گئے کیونکہ وہ لوگ اپنے ملک مین کسی یورپین کے آنے کے روادار نہ تھے اسی زمانہ مین دریائے اٹک کی نگرانی و صدارت کا عہدہ بھی انھین کے سپرد تھا۔ اسکے بعد صوبہ بہار مین یہ ڈپٹی کلکٹر اور ناظم محکمہ بندوبست مقرر ہوے اور آخر عمر تک اسی اقتدار کے ساتھ رہے۔ ہندوستان کے لوگون مین یہ پہلے شخص تھے جن کو گورنمنٹ نے طبقہ "ستارہ ہند" مین شامل ہونے کا اعزاز عطا کیا جس زمانہ مین ان کا تقرر چوبیس پرگنہ مین تھا گورنمنٹ نے ان کو دو مرتبہ مجلس وضع قوانین بنگال کا رکن بھی مقرر کیا تھا آپکے قلعہ بند لوگون مین یہ بزرگ نہایت ہی ممتاز تھے۔ ان کا گھر اور مال و متاع باغیون نے لوٹ لیا تھا۔

ابتدائی حالات مولوی سید حسین بلگرامی ۱۸۴۴ء مین بمقام گیا پیدا ہوے اور چودہ برس کی عمر تک عربی و فارسی کی تحصیل طالب علمانہ حیثیت سے کرتے رہے انگریزی کی تحصیل آپنے بھاگلپور مین شروع کی وہان سے پٹنہ کے سکول مین بھیجے گئے۔ ۱۸۶۱ء مین پٹنہ اکیڈمی سے انٹرنس اور ۱۸۶۶ء مین درجہ اول کے اعلے طبقہ مین گریجوائٹ ہوے آپ کے والد مرحوم یہ چاہتے تھے کہ جن ملکی خدمتون پر وہ خود مامور تھے اسی صیغہ مین یہ بھی داخل ہون لیکن بمقتضائے مذاق علمی آپنے صیغہ تعلیمات مین ملازمت پسند کی اور صوبجات متحدہ کے ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ مین ملازم اور لکھنؤ کے کیننگ کالج مین عربی زبان کے پروفیسر مقرر ہو گئے کچھ عرصہ کے بعد آپنے اوقات فرصت کو ایک ماہنا انگریزی میگزین کے تالیف کرنے اور ترتیب دینے مین

صرف کرنا شروع کیا، اور اس طرح گویا اس سلیس طرز بیان اور شستگی زبان کی بنا ڈالی جو آپ کی ہر انگریزی تحریر کے خصوصیات میں سمجھی جاتی ہے۔

۱۸۷۲ء میں سر سالار جنگ اعظم لکھنؤ تشریف لائے اور جنرل بیرو کی وساطت سے آپ کو اُن سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ سر سالار جنگ بہادر کی نگاہِ مردم شناس نے نوجوان پروفیسر کی خداداد لیاقت کا اندازہ کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد میں ایک خدمت قبول کرنے کی آپ سے خواہش کی گئی۔ سر سالار جنگ بہادر نظام ملکی کے جو منصوبے پیش نظر رکھتے تھے اور جنھوں نے حیدرآباد کی تاریخ پر بڑا اثر ڈالا ہے اُن کے تکمیل کے لیے اپنے ہم خیال لوگوں سے کام لینا زیادہ پسند کرتے تھے، اور خاص ریاست میں ملکی مواد چونکہ اس زمانہ میں چندان بکار آمد نہ تھا اس سبب سے انھوں نے چند سال کے لیے بیرونی اعانت و امداد سے کام لیا۔ آپ کے اثر سے جو لوگ دکن میں دُور دُور سے کھنچ آئے انھیں مولوی چراغ علی، مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک (جو اب سے کچھ پیشتر علی گڈھ کالج کی مجلس اُمنا (ٹرسٹیان) کے سکرٹری تھے) قابل ذکر ہیں۔

ملازمت حیدرآباد | حیدرآباد میں مراجعت کرنے کے بعد سر سالار جنگ بہادر نے پھر سرکاری خدمت پر آپ کو مقرر کرنا چاہا، مگر مولوی سید حسین بلگرامی جون ۱۸۷۳ء تک حیدرآباد نہیں آئے۔ آنے کے بعد وزیر اعظم کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے آپ ہمیشہ اس قدر شناس وزیر کے شکر گذار و فرمانبردار رہے۔ سرکار نظام سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد آپ نے اپنے تعلقات کا اظہار اس اعلیٰ مدبر ملک دکن کے ساتھ ان پُر اثر الفاظ میں کیا تھا:—

> اب سے چالیس برس پہلے میرے قدردان آقا سر سالار جنگ نے مجھے بلایا۔ ان کا کریمانہ انداز اور مردم شناسی و معاملہ فہمی کا وسیع تجربہ یہ اثر رکھتا تھا کہ جس شخص کو ایک دفعہ ان سے سابقہ پڑا وہ ہمیشہ ان کا دم بھرا کرتا تھا ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ یکسان وزیر اعظم کے جان نثارون میں تھے۔

۱۸۷۶ء میں سر سالار جنگ نے یورپ کا سفر کیا اور ان کے ساتھ ان کے نوجوان اسسٹنٹ بھی تھے نواب صاحب کے ساتھ آپ نے روم، پیرس وغیرہ کی سیر کی اور جہان جہان وزیر اعظم دکن کے استقبال کے جلسے ہوے ان سب میں آپ بھی شریک رہے۔

یورپ سے واپس آنے کے بعد امورِ عامہ کی معتمدی پر آپ کا تقرر ہوا جس صیغہ میں اور شعبوں کے علاوہ تعلیمات عامہ پر پورا اختیار حاصل تھا۔ آٹھ برس تک اس خدمت پر آپ ایک معتمدِ مقتدر کی حیثیت سے رہے اور بہت کچھ مفید اصلاحیں کین ۱۸۸۴ء میں اعلیٰ حضرت غفران مکان کی تخت نشینی ہوئی اور مولوی سید حسین بلگرامی ان کے پرائیوٹ سکرٹری مقرر ہوے اور "علی یار خان بہادر موتمن جنگ" کے خطاب سے سرفراز ہوے۔ کئی برس کے بعد "عماد الدولہ" پھر "عماد الملک" کا خطاب ملکی خدمتون کے حسن کارگذاری کے صلہ میں اعلیٰ حضرت مرحوم نے مرحمت فرمایا۔ گو چند سال کے لیے آپ کے ذمہ جو خدمتین تھین وہ معتمد پیشی کے صیغہ مین منضم ہو گئی تھین لیکن بحکم اعلیٰ حضرت مرحوم آپ کو اُس خدمت کی پوری تنخواہ اور اعزاز اور تمام منافع وظیفہ یاب ہونے کے زمانہ تک ملا کیے۔

انڈیا کونسل کی ممبری سے قبل از وقت مستعفی ہو کر جب آپ ولایت سے واپس تشریف لائے تو اسکے کچھ عرصہ بعد جب نواب میر یوسف علی خان بہادر سالار جنگ ثالث کو قلمدان وزارت تفویض ہوا ہے تو گورنمنٹ نظام نے آپکی سالہا سال کی تجربہ کاری سے فائدہ اُٹھانے کے لیے آپکو مشیر وزارت مقرر فرمایا اور کچھ شک نہیں کہ آپ نے نہایت ہی عمدگی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیا۔ اب آپ سرکاری خدمات سے ریٹائر ہو چکے ہین۔

حیدرآباد کا صیغہ تعلیمات | بڑے بڑے مدارج پر اقتدار و اعزاز حاصل کرنے کے بعد نواب عماد الملک بہادر نے اپنے جوہر قابل اور وسعت معلومات کو صیغہ تعلیمات مین صرف کرنے کی ہمت کی صدارت تعلیمات عامہ ملک دکن، جو اُس زمانہ مین کس مپرسی کی حالت مین تھی آپ نے پسند کی اور ۱۸۸۷ء سے اپنے وظیفہ یاب ہونے کے زمانہ یعنی ۱۹۰۷ء تک آپ صیغہ تعلیمات ریاست دکن کے ڈائرکٹر رہے اور باوجود بے جا سی مشکلون کے آپ نے اس صیغہ مین نمایان کامیابی حاصل کی۔ لندن ٹائمز لکھتا ہے کہ آپ کی بعض رپورٹون سے ظاہر ہوتا ہے کہ چند در چند اہم مشکلین آپ کو پیش آئیں اور ان مشکلون

کے سلجھانے کے لیے ایسی کارآمد تدابیر اختیار کیگئین جن کا خیال مین آجانا ہی نظر کی وسعت اور علم کی بے لوث محبت پر جو علم کو علم سمجھکر کی جائے اور نیز آپکے عالمانہ مذاق پر دلیل واضح ہو جس سے آپکا روشن خیال اور ہواخواہ اشاعت علم ہونا ظاہر ہوتا ہو۔ آپ کے زمانۂ نظامت مین ملک دکن کی تعلیمی حالت مین روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ ذیل کے شمار و اعداد سے اس بات کا بین ثبوت ملتا ہو کہ صیغۂ تعلیم مین آپکے کارنامے کس درجہ قابل ستایش ہین:۔۔۔

طلبہ	مدارس	سنین
۲۰۶۶۴	۲۵۴	۱۸۸۶-۸۷
۴۰۹۷۵	۵۸۰	۱۸۹۱-۹۲
۵۵۲۴۲	۸۱۲	۱۸۹۶-۹۷
۵۶۹۷۲	۸۴۷	۱۹۸۱-۰۹

مگر بمقتضای راستی جو آپکا امر اعادی ہو نظام کلب کے مجمع مین ۲۲ اگست ۱۹۰۵ء کو آپ نے یہی کہا کہ تعلیمات مین جیسی ترقی چاہیئے تھی میرے کئے ہو سکی اور جو کچھ ہوئی وہ نہایت محدود ہو۔ اور یہ بات آپنے اس بنا پر کہی تھی کہ بہ نسبت اور مقامون کے حیدرآباد کے طبقۂ عوام مین بیداری مغزی کے آثار زیادہ تر ظاہر نہین ہوے۔ آپنے یہ بھی بیان کیا کہ برٹش انڈیا کے مقابلہ مین حیدرآباد کی رفتار تعلیم مین بہت سست ہو اور حیدرآباد کو اسکے قدم بقدم رہنے مین دشواریان پیش آتی ہین۔

تعلیم کے باب مین آپ کی قطعی رائے یہ ہو کہ تعلیم کی غایت درستی اخلاق کو سمجھنا چاہیئے۔ آپ فرماتے ہین:۔۔

مین نے اس بات پر بہت زور دیا کہ تعلیم تربیت سے علحدہ نہونے پائے مغربی تعلیم بغیر اس تربیت کے جو یورپ مین تعلیم کی جزو اعظم ہو مشرق کے ناتربیت یافتہ لوگون کو ضرور مضر ہوگی۔

آپ اس بات کو معلم اور متعلم دونون کی سخت غلطی سمجھتے ہین کہ چند کتابین رٹ کر فقط امتحان مین کامیاب ہو جانے کو مد نظر رکھین۔ آپ گفتگو کار ٹن طریقۂ تعلیم کے بڑے طرفدار اور سرگرمی سے ساعی ہین۔ اسبات پر آپ بہت زور دیتے ہین کہ سکولون مین لیڈی معلمہ رکھی جائین تاکہ اپنا اثر بچون پر اس کمسنی کے زمانہ مین ڈالسکین جبکہ طبایع بہت آسانی سے اثر پذیر ہو سکتی ہین۔ اس طرز تعلیم کے لیے آپنے ایک کلیہ قایم فرمایا جسکے الفاظ یہ ہین۔ "محبت داری اور تربیت"

آپ ہی کے ساعی جمیلہ کا یہ اثر ہو کہ بچون کی تعلیم کے لیے حیدرآباد مین عموماً لیڈی معلمہ مقرر کرنے کا رواج ہو۔

عام کارگزاریان نواب عماد الملک بہادر کا موجودہ امتیاز فقط عہدۂ جلیلہ پر فائز ہونے اور محض حسن کارگزاری کے سبب سے نہین ہو بلکہ آپ کا ایک قدیم معزز خاندان سے ہونا، عربی و فارسی کے علم ادب مین عالمانہ استغراق رکھنا، حقیقۃ اسلام کا فدائیون کی طرح وثوق بالجزم کرنا وہ صفات ہین جن کا اثر آپکے ہم مشرب لوگون کے دل پر بہت پڑا ہو۔ حیدرآباد کی ذمہ دارانہ اور محنت طلب خدمات پر فایز رہنے کے باوجود بھی آپ فرصت کا تھوڑا بہت وقت نکال لیا کرتے تھے۔ اور وہ بالعموم مفید ترین کامون پر صرف ہوتا تھا۔ سر سید احمد خان مرحوم نے اپنے ہم خیال احباب مین آپ کو شمار کیا ہو۔ چنانچہ مولانا حالی حیات جاوید کے حصۂ دوم صفحہ (۵۰۱) مین یون تحریر فرماتے ہین:۔۔۔

"نواب عماد الملک کو ان کی نیکی اور راستبازی اور علم و فضل اور درستہ العلوم کی حقیقی خیر خواہی اور خیر اندیشی کی وجہ سے وہ ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے سید محمود کو اور انکی نسبت یہ کہتے تھے کہ وہ انسان نہین بلکہ ایک نور مجسم ہو"

کتنے ہی سال تک آپ علیگڈھ کالج کے ٹرسٹی رہے۔ اور اب بھی ہین جو لوگ اس مدرسہ سے تعلق رکھتے ہین وہ خوب جانتے ہین کہ یہ کالج ان قابل قدر اور بے ریا کوششون کے لیے جو آپنے اس کے لیے کی ہین کس قدر زیر بار احسان ہو۔ سنہ ۱۹۰۶ء مین جو ایجوکیشنل کانفرنس رامپور مین ہوئی اس مین صدر نشین آپ تھے۔ وہان جو تقریر آپنے کی ہو وہ عملی لحاظ سے اہل اسلام کے لیے مفید مشورون سے پر ہو اس مین کوئی شک نہین کہ جب سے سر سید نے کانفرنس منعقد کی مسلمانون مین اتحاد و اتفاق کی خوبیون کا احساس پیدا ہو گیا ہو لیکن اسکے علاوہ جو فائدے اس سالانہ مجلس سے

...جو مختلف مقامات مین منعقد ہوتی رہتی ہی مرتب ہوے ہین اور جس مین قطاع ...ہند کے مختلف شہرون سے مسلمان آکر یکجا ہوا کرتے ہین انھین نواب عماد الملک ...نے بہت توضیح سے اسی جلسہ مین جس کے وہ صدر نشین تھے، بیان فرمائے ہین۔ ...آپ فرماتے ہین:—

اس کانفرنس کے سالانہ مجمع تین غایتون پر متضمن ہین۔

اول یہ کہ مختلف بلاد کے سربرآوردہ مسلمانون مین یہ جلسے ارتباط بڑھانے کا باعث ہین۔ بہت لوگ انمین ایسے یکجا ہو جاتے ہین جنھین یون کبھی ملنے کا اتفاق نہوتا۔ دوسرے یہ کہ لوگون کو اس بات کا موقع ملتا ہی کہ مسئلہ تعلیم مین ایک دوسرے کی راے سے اور اپنے اُن دوستون اور ہم مذہبون کے تجربہ سے مستفید ہون جو ہندوستان کے بلاد مختلفہ کے رہنے والے ہین۔ آخری اور سب سے بڑھ کر اہم یہ غایت ہی کہ ہمارے فرقہ کے سربرآوردہ لوگ باہم ملین اور جن قومی منافع مین مشارکت ہی اُن کے ترقی دینے مین مشورہ کرین اور ان کے حاصل کرنے کی بالاتفاق فکر کرین اسکے علاوہ کانفرنس سے یہ بھی مقصود ہی کہ ہم ایسے ذرائع سوچ کر پیدا کرین جن سے اہل مغرب کی سی شائستگی کا ہم مین رواج ترقی پذیر ہو اور علیگڈھ کے انگلو اورنٹیل کالج کو اس مقصود کے حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھکر جہانتک ہم سے ہوسکے اسکی اعانت کرین۔ یہ ایک ایسی تعلیم گاہ ہمارے پاس موجود ہی جو ایسے اصول پر قائم ہوئی ہی جس کی خوبی کا روسارے قوم نے اعتراف کر لیا ہی اور جس مین بہت کچھ ابتک کامیابی حاصل بھی ہو چکی ہی۔

باب تعلیم مین تجربہ کار و یگانۂ روزگار سمجھ کر گورنمنٹ نے آپ کو یونیورسٹی کمیشن کا رکن مقرر کیا جسکے صدر سر تہامس ریلے تھے اس کمیشن کا مقصد تھا کہ بعض مشرقی اقوام پر مغربی تعلیم کا جو برا اثر پڑا ہی اُسکے انسداد کے وسائل دریافت کرین آپنے کمیشن کے ساتھ تمام ملک ہند کا دورہ کیا جس سے آپ کو اس بات سے مطلع ہونے کا بہت اچھا موقع ملا کہ اہل ہند کو تعلیم کے متعلق کیا کیا ضرورتین لاحق ہین۔

وایسراے کی کونسل آپ کے وسیع تجربہ سے فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے لارڈ کرزن نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل مین آپ کو شریک کیا جس مین یہ اہم مسئلہ زیر بحث و مطمح نظر تھا کہ ملک ہند کی یونیورسٹیون مین کیا کیا اصلاح ہونا چاہیئے۔ سنہ ۱۹۰۳ع کا بجٹ جس مین ابتدائی تعلیم اور اسکے بعد والے درجون کے واسطے زیادتی مصارف کی منظوری زیر بحث تھی، اس پر آپنے جو اسپیچ کی ہی وہ نہایت مہتم بالشان ہی، یہ ثابت کرتا تھا ایک تعلیم یافتہ استھمن مناسب وقت اور مناسب مقام پر ملک دکن کے لاکھون کروڑون ناتعلیم یافتہ لوگون کی طرف سے بحث کر رہا ہی۔

ہندوؤن اور مسلمانون کا مسئلہ کانگرس والون مین بعض لوگون نے یہ عقیدہ قائم کر رکھا تھا کہ پولیٹکل و سیاسی امور مین ملک کے ترقی کرنے کو مسٹر بلگرامی سد راہ ہین۔ مگر جو لوگ آپ کو جانتے ہین ان سے پوچھیے کہ یہ اعتراض ان پر وارد کرنے کی کوئی وجہ نہین۔ کہا جاتا ہی کہ کانگرس کو آپ ناپسند کرتے تھے۔ ہان اس حیثیت سے ناپسند کرتے تھے جس حیثیت سے کہ کانگرس قائم ہوئی تھی نہ یہ کہ اسکے نفس مطلب کے مخالف ہون۔ یہی وجہ تھی کہ مرحوم سر سید احمد خان نے جب ابتدا کانگرس کی تحریک کی تو اس کی طرفداری کرنے پر کمر باندھ کر آپ اُٹھ کھڑے ہوے۔ لارڈ منٹو بالقابہ کی خدمت مین تمام مسلمانان ہند کی طرف سے جو ڈیپوٹیشن اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ع کی پہلی تاریخ کو حاضر ہوا اور اس وفد نے جو مدتین آپ سے حاصل کین اُن سے ظاہر ہوتا ہی کہ جمہور اہل اسلام کے دل مین آپ کی کسقدر عظمت ہی۔ اور اس وفد نے جو اڈریس پیش کیا تھا وہ اسی قادر الکلام ادیب کے رشحات قلم کا نمونہ تھا جسکے احتجاج مین ادب شائستگی اور طرز بیان مین قوت و متانت قابل ستایش تھی۔ خود حضور وایسراے نے فرمایا کہ "یہ درخواست بہت پر مغز ہی" اس سے گویا مسلمانان ہند کی سیاسی ترقی کا راستہ پڑا اور وایسراے نے امید دلائی کہ طبقۂ اہل اسلام کو مطمئن رہنا چاہیے کہ اگر ملک مین اڈمنسٹریٹیو ریفارم جاری ہوگا تو اس طبقہ کے سیاسی حقوق و منافع کا ضرور لحاظ کیا جائے گا" اس اقرار کا جسقدر لحاظ کیا گیا عموماً لوگ اس سے واقف ہین۔

مگر یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ جو وصف جس کا مسلم ہو آپ اس کے مرتبہ سے چشم پوشی کرتے ہین آپ کو مرحوم مسٹر انند موہن بوس کے ساتھ بے انتہا محبت و تعلق خاطر تھا مسٹر گوکھلے ایسے امتیاز افراد کے آپ ہمیشہ مداح رہے اس سے بھی بڑھکر یہ بات ہو کہ جس زمانہ مین آپ تعلیمات حیدر آباد کے صدر تھے مختلف مذہب اور فرقے کے لوگون کے ساتھ آپکا سلوک یکسان تھا جو بین ثبوت اس بات کا ہو کہ آپ کو کسی مذہب کی طرفداری کا خیال نہ تھا۔ آپ کے ماتحت دو انسپکٹر ہندو و مسلمان ایک یوریشین ریاست کے چھ ہائی اسکولون کی ہیڈ ماسٹری بھی اسی طرح ہندو مسلمان اور یوریشین اصحاب مین تقسیم تھی۔

ہندوؤن اور مسلمانون مین انتخاب جداگانہ کے مسئلہ مین جسے لارڈ مارلے کے ریفارم اسکیم سے تعلق تھا آپنے صاف صاف کہدیا کہ یہ امر نہایت ہی ضروری ہو اور یہی ایک صورت ہو جس سے فریقین مین کبھی نزاع واقع نہو گی آپنے فرمایا

ہندوؤن کے مقابلہ مین مسلمان تھوڑے سے ہین۔ انکے منافع کا لحاظ رکھنا ضروری ہو۔ ابھی تک انکے حقوق بہت اچھی طرح محفوظ ہے۔ ہر قسم کے نظام جمہوریت مین جماعت قلیل کے حقوق فنا و تراع ہوا کرتے ہین ایسے حقوق کی حفاظت خود انگلنڈ مین بھی نہین ہو سکتی جہان سب لوگ یکسان ہین اور کسی قسم کا مذہبی یا قومی اختلاف واقع نہین ہوا ہو علیحدہ علیحدہ انتخاب ہونا فریقین کے لیے متحد ہو کر کسی شخص واحد کے حکم مین ہو جانے کی نفی نہین کرتا بلکہ اس قسم کے اتحاد کا مؤید ہو۔ اگر انتخابی مجلس مین دونون فرقون کے لوگ شریک ہوے اور دونون سے باہم ووٹ لیا گیا تو ہمیشہ دونون فرقون مین نزاع ہوا کرے گی۔ ہندو محض کثرت عدد کے سبب سے باسانی مسلمانون کو شکست دیا کرین گے۔ اور اس وجہ سے کہ ہندوستان کے اکثر مقامات مین دونون فرقون کے درمیان تعصب پھیلا ہوا ہو ہندو ہمیشہ یہ چاہین گے کہ ہندو ہی کو انتخاب کرین اور اس سے باہمی رنجشین اور کدورتین بڑھتی رہین گی۔

انڈیا کونسل قانون مجریہ سنہ ۱۸۶۱ء کی رو سے لارڈ مارلے کو جو اختیارات کونسل سے تھے انھون نے فوراً اس سے فائدہ اُٹھایا، اور مسٹر گپتا اور مولوی سید حسین بلگرامی کو انڈیا کونسل کا رکن مقرر کیا۔ آپنے نومبر سنہ ۱۹۰۷ء کی گیارھوین تاریخ کو رکنیت کی کرسی کو مزین کیا اور لنڈن ٹائمز نے اس خبر کو اس طرح شائع کیا:—

ایک واقعہ جو تاریخ کی رو سے مہتم بالشان و قابل توجہ ہو۔ انڈیا آفس مین سکرٹری آو اسٹیٹ کی کونسل سے باضابطہ منظوری صادر ہونے کے بعد اسی ہفتہ کے اندر اور اس دفتر کے قائم ہونے کے پچاس برس بعد وقوع مین آیا کہ ایک ہندوستانی شخص پہلے پہل اسکا رکن مجلس مقرر ہوا۔"

پھر اسی مضمون کا ایک شائبہ لارڈ مارلے کی اس آخری اسپیچ مین تھا جو مجلس عامہ مین انھون نے کی۔ انھون نے اپنی کونسل کے ہندوستانی ممبرون کے تقرر کے نتائج بواسطہ و بلاواسطہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ "بہر طور یہ تحریک ہندوستان سے بہت ہی مہتم بالشان ہوئی ہو جو ہندوستان اور انگلنڈ کے درمیان نیک تعلقات رکھنے کے باب مین ہو"

آپ اس آفس کی تین کمیٹیون مین کام کرتے رہے جو کونسل کے ماتحت تھین یعنی مالگذاری اور عدالت امور عامہ اور اسٹور جس زمانہ مین ریفارم اسکیم تیار ہو رہی تھی آپنے مسلمانون کے حق مین نہایت مفید کام اس آفس مین کیئے۔ لارڈ مارلے نے کئی دفعہ اپنے دونون ہندوستانی مشیرون کی حسن کارگزاری کا اعتراف کیا، اسمین شک نہین کہ انھون نے ان دونون ممبرون سے اہل ہند کے دل و زبان کی حالت کا صحیح اندازہ کیا۔ حسب معمول آپ کی اختتام خدمت کا زمانہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۷ء ہوتا مگر سوء اتفاق سے انگلستان کی سخت سردی سے آپکی طبیعت بے مزہ رہنے لگی۔ اس سبب سے نومبر سنہ ۱۹۰۹ء مین آپ مستعفی ہوے۔ بزمانۂ قیام انگلستان آپنے مسلمانون اور ہندوستان کے دوسرے فرقون مین بڑا رسوخ پیدا کیا تھا اور ان فرقون مین باہم ارتباط پیدا کرنے کے لیے جتنی تحریکین کی گئین ان سب مین آپ شریک ہوتے گئے۔ جنوری سنہ ۱۹۰۸ء کی پہلی تاریخ کو طبقہ ستارہ ہند مین شامل ہونے کا

امتیاز آپنے حاصل کیا۔

تصنیفات و تالیفات آپ تمام عمر طالب علم رہے۔ عربی و انگریزی کے علم ادب پر جو قدرت آپ کو حاصل ہی اسکے لحاظ سے ہندوستان کے ادیبون کے طبقۂ اوّل مین آپ کا شمار کیا جاتا ہی آپ کا تاریخ دکن کا مجموعہ یعنی

Historical aud descriptive sketeh of His Highness the Nizam's dominions,

اور سوانح عمری سرسالار جنگ اوّل مرحوم بہت مستند کتابین سمجھی گئی ہین۔ پہلی کتاب ممالک محروسہ سرکار نظام کی مفصل تاریخ ہی جس مین ملک کی زراعت و معدنیات کا بھی مفصل حال درج ہی۔ آپ کو نظم کی طرف بھی توجہ ہی۔ اپنی انگریزی نظمین جو آپنے احباب مین شائع کرنے کی غرض سے طبع کرائی ہین وہ مشرقی جذبات کا نمونہ ہین اور ایک ہندوستانی شاعر کا قابل قدر کلام خیال کی جاتی ہین، ترجمہ قرآن مجید اسلامی نقطۂ خیال سے قطع نظر اپنے جداگانہ فوائد کے لحاظ سے بھی ایک گران قدر علمی خدمت سمجھے جانے کے قابل ہی۔ ان چیزون کے علاوہ آپکے قلم سے آجتک بیشمار علمی ادبی و تاریخی مضامین ایسے نکلکر مقبول ہو چکے ہین جنکے اندر مستقل دلچسپی اور دائمی انتفاع کا سامان موجود ہی۔

خاتمہ نواب عماد الملک بہادر اگرچہ کوئی مشہور مقرر نہین ہین لیکن انکی سیدھی سیدھی اور پرزور دلائل کے سننے مین ایک خاص لطف آتا ہی۔ وہ گفتگو مین تکلفات کو راہ نہین دیتے۔ مقصود اصلی بغیر کسی ہیر پھیر کے بیان کرتے ہین اور جو کچھ کہتے ہین وہ موثر اور دلنشین ہوتا ہی۔ بہت سی علمی مجالس جو حیدرآباد مین قائم ہین انکی مدد اور رہنمائی سے قائم ہوئی ہین۔ انھین حیدرآباد سے نہایت محبت ہی بلکہ فی الحقیقت انھون نے یہان توطن اختیار کر لیا ہی۔ ان کی پرائیوٹ زندگی بہت ہی سادہ طور پر بسر ہوتی ہی ان کی فرصت کا بڑا حصہ لائبریری مین صرف ہوتا ہی جو کہ بے حد نایاب و بیش قیمت کتابون کا ایک قابل تعریف ذخیرہ ہی۔ انکے شوق کتب بینی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہی کہ وہ جب کبھی وقار آباد کو جاتے ہین جو شہر سے فاصلہ پر ہی اور جہان آپ کا باغ واقع ہی تو سامان ہمراہی مین زیادہ تر وہ تصنیفات ہوتی ہین جو اکثر انکے زیر مطالعہ رہتی ہین۔ میانہ قد جسم بلند بالا حیدرآبادی سپید دستار زیب سر شاندار چہرہ پر کتری ہوئی داڑھی سیاہ آنکھین جن سے خلوص مذاق اور بردباری ٹپکتی ہی خوش مزاج و خوش خلق۔ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی بہادر دکن کے مشہور فاضل اور صاحب تصانیف کی ظاہری و باطنی خوبیون کا یہ ایک مجمل گر دلکش خاکہ ہی۔ خدا انھین عرصہ دراز تک زندہ و قائم رکھے اور آپکے فیوض سے خاص و عام کو بہرہ اندوز ہونے کا موقع عطا فرمائے۔ آمین!

نواب نصیر حسین خان صاحب خیال ؒ

نواب خیال قوم کے اُن منتخب اور برگزیدہ لوگون مین ہین جنکا نام دنیائے اُردو مین ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا، اور یہ دردِ وطن کے اُن مشہور سپوتون مین ہین، جن کی ذات سے ہماری بہت سی امیدین وابستہ ہین۔

نواب صاحب موصوف حسینی الحسنی سیّد، پوترٹون کے رئیس اور ایک خاندانی بزرگوار ہین۔ آپ کے مورث اعلیٰ عرب سے ایران آئے۔ وہان اِس خاندان کو خاص عروج و وقار حاصل ہوا اور بالآخر قدرت و اختیار اتنا بڑھا، کہ سیّد حسین فیروزی شاہِ طہران ہوگئے اور اُن کے پوتے کبیر المشائخ گورنر ہرات رہے، اور دوسرے ارکین خاندان بھی مراتب اعلیٰ پر پہنچے، پھر اس خاندان نے ہندوستان کا رُخ کیا، اور اپنی عظمت و وجاہت ساتھ لایا، اور اسکے اکثر ممبر صوبہ داری اور وزارت کے درجہ تک پہنچے۔ مغلون کے عہد مین اس خاندان نے عدیم المثال ترقی کی، اور یہ اُسی قدیم وجاہت و بزرگی کا اثر تھا کہ قطب الملک نواب سیّد عبد اللہ خان، اور امیر الامرا نواب سیّد حسین علیخان "بادشاہ گر" کہلائے اور عرصہ تک سلطنت اُنہی دو مشہور بھائیون کے زور بازو سے چلتی رہی۔

امیر الامرا سید حسین علیخان شروع مین صوبہ دار بہار مقرر ہوئے اور عظیم آباد مین عرصہ تک رہے، یہ صوبہ اُن کی جاگیر مین تھا جب نواب صاحب ممدوح فرخ سیر کو ساتھ لیکر نکلے، اور اُسے بادشاہ بنا کر وزیر ہوئے تو اُنکی جاگیر اُن کے چھوٹے بھائی نواب زین الدین علی خان بہادر (نواب خیال کے پردادا) کے ہاتھ آئی، اور وہ بہار مین مقیم ہوگئے، اور اسطرح یہ خاندان دہلوی سے بہاری بن گیا۔ سادات بارہ کے زوال کے بعد، اِس خاندان کا بھی شاید بہار مین زوال ہو جاتا، لیکن نواب علی وردی خان، مہابت جنگ، (صوبہ دار بنگالہ) کے تعلقات اور رشتہ داری سے اِس کا وہ اگلا عروج عرصہ تک قائم رہا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت تک اِس خاندان کی عظمت و حشمت بدستور قائم و برقرار رہی۔

صوبۂ بہار اپنی زرخیزی کے ساتھ ہمیشہ مردم خیز بھی بنا رہا ہے۔ دلّی جب مٹی تو عظیم آباد (پٹنہ) آباد تھا۔ دلّی کے باکمالون نے اسطرف کا رُخ کیا، اور امیر الامرا کے خاندان نے دلّی والون کو اپنے یہان جگہ دیکر عظیم آباد کو گویا شاہجہان آباد بنائے رکھا۔

عرصے اُردو کی نشو و نما دلّی مین ہو چکی تھی، امیر الامرا اور اُن کا خاندان مرزا عبد القادر بیدل کا دلدادہ تھا، مرزا اُردو کے حامی اور

سلطان العصر کی گذشتہ اشاعت مین نواب صاحب ممدوح کی تصویر شائع ہو چکی ہے (ایڈیٹر)

نواب اُس کے سرپرست تھے۔ اِس ذریعہ سے یہ زبان بہار و عظیم آباد مین پھیلی، جسے بعد کو اسی خانوادہ کے ایک دوسرے بزرگ نواب علی وردی خان، مہابت جنگ (صوبہ دار بنگال و بہار) نے چمکایا، اور پھر مہاراجہ شتاب رائے نے اس کی وہ پرورش کی کہ آخر وہان میرؔ آسخ کا سا صاحب کمال پیدا ہوا، جس نے شعر و شاعری مین اپنا ایک الگ اسکول قائم کر کے زباندانی کا سکّہ جمادیا، نواب ہدایت علیخان اسد جنگ، (متخلص بہ ضمیر) اور اُن کے مشہور فرزند نواب غلام حسینخان (صاحب سیر المتاخرین) اسی گھرانے کے ایک رکن اور اُردو کے سرپرست اور مربیون مین سے تھے۔

غرض نواب صاحب خیال کا خاندان امارت و وجاہت ذاتی کے ساتھ علم و ادب کے لیے بھی ہمیشہ مشہور و معروف رہا ہے اور آج سے نہین، دو سو برس سے یہ اُردو کی پرورش و خدمت کر رہا ہے اور غالبًا اسی کو یاد کر کے، اور بہار مین اس زبان کی پامالی کو دیکھ کر نواب صاحب نے اپنے اڈریس مین یہ گرم فقرہ ارشاد فرمایا ہے کہ۔۔۔ افسوس کہ امیر الامرا سید حسین علی خان کی جاگیر اور مہاراجہ شتاب رائے کی زمین ایسی شکار گاہ بنی"! واقعی اِن سے زیادہ اور کس اس زبان کا ایسا درد ہو سکتا ہے۔!!

اِس خاندان کی دوسری شاخ پانی پت مین ہے جس کے مورث اعلی شمس الدولہ نواب لطف اللہ خان بہادر، صادق وزیر محمد شاہ تھے وہان یہ خاندان نواب زادون کے لقب سے مشہور ہے پانی پت کے خواجہ زادے، اور نواب زادے ایک دادا کی اولاد ہین۔ عجیب بات یہ ہے کہ جسطرح بہار مین یہ خاندان امارت و ریاست کے ساتھ علمیت و فضیلت کے لیے بھی مشہور رہا، اسیطرح پانی پت مین بھی دو سو برس سے ریاست اور علم و فضل دونون کا مرکز دکھائی دیا، اور وہان خواجہ حالی مرحوم اور ریہان خان بہادر شاد عظیم آبادی اس قدیم و مشہور خاندان کے ایسے بزرگ ہین جنھین زمانہ عرصہ تک یاد رکھے گا۔

غرض ایسے قدیم اور علم و فضل سے بھرے ہوئے خاندان مین آپ ۱۸۷۸ء مین بمقام عظیم آباد پیدا ہوئے۔ آپ کے گھر کا ادب قاعدہ اور آپ کے گھرانے کی تہذیب و زبان عام طور پر تسلیم ہے اور اس لیے اس کی تقلید کی جاتی ہے۔ اُسوقت کے اُمرا و رؤسا کی طرح آپ کی تعلیم بھی شروع ہوئی، اور درسیات تمام کر کے انگریزی کی طرف مائل ہوئے۔ علم ادب اور زباندانی کا خاندانی شوق چونکہ کمسنی ہی سے تھا اور قدرت نے بھی اُسکے لیے موزون دل و دماغ عطا کیا تھا، اِس وجہ سے قلم و قرطاس کے سوا کسی اور طرف مائل نہین ہوئے اور ہوش سنبھالتے ہی مضمون نگاری کی جانب متوجہ دکھائی دیے۔ مشہور رسالہ "حسن" (حیدر آباد) مین اکثر آپکے مضامین (فرضی نامون سے نکلا کیے) وہ پرچہ بند ہوا تو اس ادب و لٹریچر کے شوق و ذوق کی پیاس اور چشمون سے بجھائی گئی، اور جبکہ نوجوان رؤسا دوسرے دوسرے مشاغل مین پھنستے ہین آپ نے ۱۹ برس کی نوخیز عمر مین (۱۸۹۷ء) عظیم آباد سے ایک رسالہ "ادیب" نکالا۔ اس کے ادب و لٹریچر کو دیکھ کر سر سید مرحوم اور مولوی عبدالحلیم شرر نے اسوقت یہ رائے قائم کی تھی کہ اگر یہ رسالہ جاری رہا تو عظیم آباد اور صوبہ بہار دلی اور لکھنؤ کی تقلید سے آزاد ہو جائے گا۔

۱۸۹۹ء مین آپ کی شادی ہوئی اور اِس تعلق سے کلکتہ مین قیام ہوا تو "ادیب" کو بند کرنا پڑا، لیکن آپکے اشہب قلم کی رفتار کسی وقت مین سُست نہ دکھائی دی۔ عادت کے مطابق فرضی نامون سے مختلف اخبار و رسائل مین مضامین لکھے جو مقبول عام ہوتے رہے۔ ۱۹۰۳ء مین آپ کا ایک مشہور و معروف مضمون "اصلاح" مین نا ہدلب خیرات" کے نام سے نکلا اور رنگ مین ایک انقلاب سا ہو گیا، اور ایک عرصہ کے بعد غالبًا یہ وہ مضمون تھا جس مین دوستون کے اصرار سے آپ نے اپنے نام کا اظہار کیا تھا۔ پھر ۱۹۱۱ء مین مولوی ظفر علی خان کی سخت فرمائش پر

"مرثیہ اور مرزا دبیر" پر ایک مبسوط مضمون دکن ریویو کے متعدد نمبرون مین شائع ہوا کیا، اور آپکے زورِ قلم اور تنقیدی نظر کی دنیانے ادبی اور اسی مضمون سے مرثیہ کی غرض و غائت سمجھ مین آئی۔ پھر ایک عجیب و لطیف مضمون "خالا اُون کا مارا آغا" سنہ ۱۹۱۳ء مین (ادیب الہ آباد) کے کئی نمبرون مین آپکے نام نامی سے شائع ہوا۔ یہ مضمون اور خصوصاً اُس کی تمہید، اُردو کی جان، اور حقیقتاً وہ لٹریچر ہی جس کی نظیر ایڈیسن اور پکوک پیپرز کے سوا کہین اور نہین مل سکتی۔ اُردو مین یہ بالکل نئی چیز تھی، اور اس سے نواب صاحب کی فارسی پر بھی وہ قدرت معلوم ہوتی ہی جو اس زمانہ مین مفقود ہی! یہ قصہ اسطرح پڑھا گیا، کہ ہزارون کو ابتک اسکے فقرات یاد ہین۔ یہ مضمون اس لیے لکھا گیا تھا کہ دوسرے اس رنگ کو اور رشوخ کرین، مگر اس کا تتبع آسان نہ تھا، اور جہانتک مجھے علم ہی ابتک اس انداز مین کوئی قلم نہ اُٹھا سکا!

مجھے جہانتک غور کرنے کا موقع ملا، نواب صاحب جب کوئی چیز لکھتے ہین تو اُسے اپنا کر لیتے ہین، اور اُن کے قلم سے ہمیشہ کوئی نئی بات ہی نکلتی ہی جو مقبول عام ہو جاتی ہی۔ اُردو کانفرنس صدارتی ایڈریشن ہی دیکھیے کہ کس انداز و پرواز سے زمانہ کے سامنے پیش کیا کہ آئندہ اِس مادہ مین جو کچھ بیان ہوگا، ہمیشہ اُسی کی تقلید کی جائے گی۔ اس خطبہ نے نہ صرف اُردو کی بھولی بسری داستان ہی کہ سنائی، اور موجودہ تذکرون کو پس و پشت ڈال دیا بلکہ مادرِ وطن کی وہ ہم ہزار سالہ تاریخ بھی بیان کر دی ہی جس سے ہمارے معلومات مین وسعت و ترقی ہو گئی۔ ہندو مسلم رشتہ کو بھی اسطرح سلجھا دیا کہ آجتک بڑے سے بڑے مقرر سے بھی نہو سکا۔ نہ کبھی کانگریس کا ایسا ایڈریس سنایا گیا، اور نہ لیگ کے کسی صدر نے ایسا جامع و مانع بیان ہمارے سامنے پیش کیا۔ اُنکے معلومات کو دیکھیے اُن کی تحقیقات پر نظر کیجیے، اور خطبہ کی اسپرٹ در پالیسی کو سمجھیے اُسکے لٹریچر "زبان" اور اُس کے ادب و طرزِ ادا کو سراہیے۔ یہ ایڈریس ہر اعتبار سے ہماری قومیت کو مستحکم کرنے والا، اور ہماری زبان کو سیولائزڈ (مہذب) زبانون کے ہمرتبہ ثابت کرنے والا ہی۔

علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ نواب صاحب موصوف نے ایک حدتک دیگر قومی معاملات مین بھی حصہ لیا ہی۔ سنہ ۱۹۰۶ء کے مشہور و معروف مسلم ڈیپوٹیشن، مین جو بمقام شملہ لارڈ منٹو کی خدمت مین حاضر ہوا، وہ اسمین شریک اور اسکے سرگرم کارکن تھے، اور ریفارم اسکیم مین شروع سے اخیر تک مشورہ دیتے اور کام کرتے رہے آپ مسلم لیگ کے بانیون مین نہ صرف شمار ہوتے بلکہ ابتک اُسکے سرگرم ممبر ہین سنہ ۱۹... مین آپ نے مسلم لیگ کی شاخ بنگالے مین قائم کی، اور نواب سر شمس الہدیٰ کے ساتھ بحیثیت جوائنٹ سکرٹری عرصہ تک کام کرتے رہے، تعلیمی معاملات سے اُنھین خاص دلچسپی بلکہ شغف ہی۔ سنہ ۱۹۰۴ء مین ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوے۔ تعلیمی کانفرنس، (علیگڈھ) کی آواز بنگالہ مین زیادہ تر آپ ہی کی کوششون سے عام ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۹ء مین علیگڈھ کالج کے آپ ٹرسٹی مقرر کیے گئے اور اس تعلیمی انسٹی ٹیوشن سے آپ کی دلچسپی کچھ چھپی ہوئی نہین ہی۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ آپ کی عنایات اور مہربانیون کا ہمیشہ ممنون ہی ہی طلبا کے ساتھ اُنھین خاص محبت ہی، اور ہمیشہ ان کی امداد پر تلے رہتے ہین۔

سنہ ۱۸۹۹ء مین آپ کی شادی کلکتہ مین نواب انتظام الدولہ مرزا احمد بیگ (وزیر شاہ اودھ) کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے دو صاحبزادے ہوے، لیکن افسوس کہ وہ نونہال آٹھ آٹھ سال کی عمر پاکر مرجھا گئے، اور جب سے موصوف علمی دنیا سے الگ ہو کر گوشہ عافیت مین زندگی بسر کرنے لگے ہین۔ عرصہ سے اُن کی صحت بھی اچھی نہین رہتی، پٹنہ کو تو کبھی کا خیرباد کہا جا چکا ہی لیکن کلکتہ مین بھی اب برائے نام ہی قیام رہتا ہی۔ عموماً جاڑون پر رہتے، اور وہان تنہائی مین علمی تحقیقات مین زندگی بسر کرتے ہین۔ فی الحال مرثیہ گویون کا ایک تذکرہ

مرتب کر رہے ہیں۔ گارسن دی تاسی کا مشہور تذکرہ شعرائے اُردو، (ہسٹری دی لٹریچر ہندوی) جو فرنچ زبان میں اور چار جلدوں میں ہے۔ آپ اس کا اُردو ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ کام سرعت سے جاری ہے۔ خدا کرے اُن کی صحت اتنی درست ہو جائے کہ یہ چیزیں جلد پبلک کے ہاتھوں تک پہنچیں۔

العصر کے صفحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں اس مضمون کو تمام کرتا اور نواب صاحب کے لیے دعا کرتا ہوں کہ ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

محفوظ الحق احسن (عظیم آبادی)

شمس العلماء خواجہ حالی

اُردو شاعری کا جنم بھوم ہندوستان ہی لیکن اُسکی نشو و نُما فارسی شاعری کے زیراثر ہوئی ہی۔ قاعدہ ہی کہ ابتدائی تاثرات کا رنگ انسانی طبائع پر آخر عمر تک گہرا رہتا ہی۔ اسی اُصول سے جب اُردو شاعری کے مختلف پہلوؤن پر نگاہ کرتے ہین تو ہمین اسبات سے کہ سنسکرت اور بھاشا کا اسپر پرتو تک نہین پڑا تعجب نہین ہوتا میر و سودا سے لیکر غالب و مومن تک ایک لکیر کے فقیر بنے رہے ہین۔ اِن صاحب کمالون کے علو ئے مرتبت مین کسکو شک ہو سکتا ہی۔ خصوصًا غالب کے، جنھون نے اِس اندھی تقلید کے نقصانات کا اندازہ کرکے آخر اپنے لیئے ایک دوسرا راستہ تلاش کر لیا۔ لیکن اسے اِن بزرگون کا طبعی رجحان کہیئے یا بعض خارجی و اضطراری اسباب کا نتیجہ کہ اپنے گلدستے کو اپنے باغ کے پھولون سے زیب دینے کی جگہ اُنھین اصفہان و شیراز کے باغبانون کا منت پذیر ہونا پڑا،

اور اِس ایک فروگذاشت سے اُردو شاعری مین بعض ایسے عیوب پیدا ہو گئے جو ابتک اُسکے صاف و شفاف دامن کو داغدار بنائے ہوئے ہین۔

عرب سے قطع نظر خود عجم کی شاعری نے ابتک کئی پلٹے کھائے لیکن اُردو شعرا نے جو راگ روز اول سُنا تھا اُسی پر آخر تک سر دھنتے رہے۔ ہم اساتذۂ اُردو کی دماغ سوزیون کے دلی اعتراف کا ثبوت کئی دفعہ زبان قلم سے بھی دیچکے ہین اور اسمین کلام نہین، اُنھین کے کارنامے آج بھی اُردو لٹریچر کی لاج قائم رکھے ہین لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہین ہوسکتی کہ اگر اُنھون نے "اصلیت" سے ذرا بھی کام لیا ہوتا تو اُردو شاعری مین تاثیر کلام کے اعتبار سے بھی کوئی کمی نہ رہتی۔ ہمارے بعض شعرا نے جنمین میر، درد، غالب، داغ، مجروح وغیرہ خصوصیت سے ذکر کے قابل ہین اپنے کلام مین تاثیر پیدا کرنیکی کوشش بہ کامیابی کی ہو اور اکثر نے جذبات انسانی اور وارداتِ عشق کی صحیح اور سچی تصویر اُتارنے مین کمال کردکھایا ہو جسکا اقرار آجکل بھی کیا جاتا ہو جبکہ ایک گروہ بدقسمتی سے ملک مین ایسا پیدا ہو گیا ہو جسنے ایشیائی شاعری کی ہجوگوئی کا بار اپنے ذمہ لے رکھا ہو۔ اُن اُستادون کا کلام جو مبالغہ و تصنع سے بری ہو بلحاظ محسوسات قلب کے لحاظ سے ہر طرح قابل قدر ہو اور چونکہ یہ باتین فطری وسیع النظری اور نازکخیالی کا نتیجہ ہوتی ہین اسلیئے نمین وہ بے مزگی اور سیٹھاپن نہین ہو جو عموماً چبائے ہوئے لقمے مین ہوتا ہو۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہو کہ یہ دلپذیر عملی نظیرین شاذ شاذ پائی جاتی ہین۔ الغرض سنسکرت اور بھاشا بلکہ عربی کے ساتھ بھی اعتنا نہ کرنیسے جو نقصانات ابتک عائد ہوئے اور ہورہے ہین اُن کی تلافی اور بھی مشکل ہوتی اگر یہی سلوک مغربی خیالات کے ساتھ بھی کیا جاتا جن سے مستفید ہونے کے لیے ہمین حکومت برطانیہ عظمیٰ کا منت پذیر ہونا چاہیئے۔ طرز معاشرت اور عادات و خصائل کیطرح حکمران جماعت کے علم ادب کا اثر مفتوح قوم پر پڑنا ضابطہ قدرت کی سب سے پہلی دفعہ کے عین مطابق ہو۔ اسلامی ادبیات کا اثر ہندوؤن پر جیسا کچھ پڑا اُسکا ثبوت کایستھون اور کشمیری پنڈتون مین مل سکتا ہو۔ نسیم اور سرشار اور سرور ایسے جادو نگار اگر اس دُنیا مین نہین ہین تو چکبست اور آبر وغیرہ بجائے خود مثالین ہین۔ برٹش گورنمنٹ کے ظل عاطفت مین ہندوستانیون کو مغربی طرز پر تعلیم پانے کا موقع ملا اور اس سے جہان اور بہت سے مادی و اقتصادی فوائد حاصل ہوئے وہان علمی منافع بھی نظرانداز نہین کیئے جاسکتے۔ لٹریچر کیطرف ہمین ان دنون جو تھوڑا بہت اعتنا پیدا ہو گیا ہو وہ سب اُس یورپی تشویق کا نتیجہ ہو جو نت نئی صورتون مین آئے دن جلوہ گر ہوتی رہتی ہو۔

ممکن نہ تھا کہ مغرب اور مشرق باہم ملین اور ایک دوسرے کے معائب و محاسن سے متاثر نہون۔ مشرق کے متعلق مغرب نے جو رائے قائم کی ہو ہمین اُس سے یہان کوئی بحث نہین لیکن ہمارے لیے بہت سی باتون مین مغرب نے آئینہ کا کام دیا ہو اور اسی آئینہ مین جس پر جدید اُصول تنقید کی جلا کیگئی تھی ہمین اپنے علم ادب کے خط و خال مُظہر آئے ہین اور ہمین ایک حدتک معلوم ہو گیا ہو کہ اسکی حالت کیا تھی؟ اَب کیا ہو؟ اور آئیندہ کیا ہونی چاہیئے؟

فارسی، عربی، اور دیگر زبانونکی شاعری مختلف طبقون مین منقسم کی جاسکتی ہو۔ مثلاً

عشقیہ شاعری

رزمیہ شاعری

اخلاقی و مذہبی شاعری

نیچرل شاعری

قومی شاعری۔

عشق و محبت کے عنوان سے جسقدر مسالہ ہمارے اسلاف نے مہیا کیا ہو اُس سے ایک نہین بلکہ بیسیون اور سیکڑون مندر پیکر حسن کی پرستش کیلئے تیار ہو سکتے ہین۔ رزمیہ شاعری کی کمی انیس و دبیر کے مراثی نے پوری کر دی ہو۔ اخلاقی اور مذہبی صنف سخن کی ترتیب جُداگانہ طور پر ہمارے یہان نہین ہو لیکن اساتذۂ اُردو کی غزلیات اکثر و بیشتر اخلاق و آداب کے مضامین سے مملو پائی جاتی ہین۔ نیچرل شاعری اُردو مین مفقود تھی لیکن مولنا آزاد نے ایک ایسی شاہراہ کی داغ بیل ڈالدی ہو جس پر چلنے کے بعد "برگ درختان سبز" کا ذوق آفرین منظر خود بخود آنکھون کے سامنے آجاتا ہو۔

نیچرل شاعری کیطرح قومی شاعری کا نام لیوا بھی شعراء اُردو مین کوئی نہ تھا لیکن انگریزی مثل ہو کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہو" اور حقیقت شناس نظرون سے پوشیدہ نہین کہ جسطرح یہ مثل قدیم زمانے مین اُن نتائج کے اعتبار سے جو علمی اور تمدنی دُنیا مین ظہور مین آچکے ہین صحیح ثابت ہوئی ہو اسیطرح آج بھی وہ صحیح ہو۔ مغربی تعلیم کے اثر سے ہندوستان مین بھی خیالات و جذبات کا جو انقلاب لازمی طور پر پیدا ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ ایک طرف اگر ہربرٹ سپنسر اور ہکسلے کے فلسفہ نے ارسطو و بو علی سینا کی شہرت پر اپنا حق جمایا تو دوسری طرف گولڈ سمتھ ٹینیسن، اور بیرن کا رنگ تخیل میر و سودا کی مصوری پر غالب آنے لگا۔ صحیفہ فطرت کے حقیقی مفسرین کی اُردو مین کمی تھی لیکن شمس العلماء مولنا آزاد مرحوم کا مجموعۂ نظم [illegible] اسکا ثبوت ہو کہ اُردو مین بھی معرفت کردگار کے ایک ایک ورق مین دفتر کی وسعت پیدا کی جا سکتی ہو۔ [illegible] ادبیات کی خوش قسمتی ہو کہ آجکل علمی رسائل مین بعض اوقات نیچرل نظمین اس پایہ کی شائع ہوتی رہتی ہین جو اپنے صحیح معنون مین اُردو شاعری کا بہترین حصہ سمجھی جانے کی مستحق ہوتی ہین۔

رنگہائے قومی شاعری؟ اسکا وجود متقدمین کے کلام مین نہین ہو اور متاخرین مین بھی حالی سے پہلے کسی نے اسپر توجہ نہ کی تھی۔ قاعدہ ہو کہ ضرورت سے اسباب خود بخود منتج ہوتے ہین۔ مسلمانون کی حالت جیسی کچھ زبون تھی اُسکی صحیح اور سچی تصویر یہان دکھانا تحصیل حاصل ہو۔ مختصراً سمجھ لینا چاہیئے کہ حکومت کے ساتھ دولت و عزت اور اخلاق و آداب بھی اُنسے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ جہالت، لاعلمی، خودغرضی اور وہ تمام عیوب جو کسی تنزل پذیر قوم کے جزو لاینفک خیال کیے جاتے ہین مسلمانو نمین موجود تھے۔ ضرورت تھی ایک ایسے شخص کی جو انھین ذلت و ادبار کے اس قعر سے نکالے اس اہم منشاء کی تکمیل کے لیے سرسید مغفور کی ذات مقدر ہو چکی تھی۔ مرحوم نے اپنی بیش قیمت عمر فلاکت زدہ مسلمانونکی فلاح و بہبودی کی کوششونمین صرف کر دی اور آج اس مردہ قوم مین جو کچھ زندگی کے آثار پائے جاتے ہین وہ انھین کی مسیحائی کا صدقہ ہو۔

سرسید نے اپنے مبارک مقصد کی تکمیل کیلئے اپنے گرد و پیش بہت سے قابل آدمی جمع کر لیے تھے۔ مولنا حالی بھی اُسی قومی نورتن کے روشن اور درخشندہ جواہر ہین۔ شک نہین کہ سرسید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت بھی تھی جو اپنی سحر آفرینیون سے اعجاز کا کام لیکر جمود کو حرکت مین لاوے اور [illegible] جوش پیدا کرے۔ [illegible] بڑے بڑے کام کیے ہین اُن [illegible] مشہور ہین۔ حالی کی معجز بیانی [illegible] کا قبضہ نہین دلا دیا اور نہ [illegible] کرے اُسکی بغاوت کی تاریخ مین حکومت خود اختیاری [illegible] لیکن اتنا سب کو معلوم

ہی کہ جس زمانے مین سر سید کشتی اسلام کو جہالت و فلاکت کے بھنور مین چکر کھاتے دیکھکر اُسکے محفوظ رکھنے کی مساعی مین مصروف تھے اور بہت کم لوگ اُنکی پروا کرتے تھے اُسی وقت حالی کی ایک جگر دوز چیخ نے مسلمانون مین وہ ہلچل ڈالدی کہ سوتے بیدار ہو گئے، بیٹھے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جو لوگ کھڑے تھے وہ دوڑنے لگے۔

مسدس جزر و مدِ اسلام یا مسدس حالی دُنیا کے اُن علمی ادبی کارنامون مین شمار کیا جاتا ہی جن کا پائدار اثر کسی قوم کے اخلاق معاشرت، اور تمدن پر پڑ سکتا ہی۔ حالی نے جسوقت اسلام کی گزشتہ شان و شوکت کی تصویر دکھا کر موجودہ ادبار و ذلت کا مرقع مؤثر الفاظ مین پیش کر کے مسلمانون سے صاف صاف کہدیا کہ جس کی یہ حالت ہو۔ مصرع

وہ قوم آج ڈوبیگی گر کل نہ ڈوبی

یہ ایک بجلی تھی جو آنکھون کے سامنے دوڑ گئی، رعد کی کڑک تھی جسنے دلونکو ہلادیا۔ وہ دماغ جو اپنے متعلق کبھی سوچنے کے عادی نہ تھے روشن ہو گئے۔ پہلو مین درد پیدا ہوا اور درد بھی قوم کا۔ نگاہین منزلِ مقصود کی تلاش مین اِدھر اُدھر دوڑنے لگین اور ان تمام تحریکون سے کم از کم اسقدر فائدہ ضرور مرتب ہو گیا کہ مسلمانون کو اپنی پست حالت کا اندازہ ہو گیا اور اُنھین اپنا ایک نصب العین مقرر کر کے اُسکی جد وجہد مین مصروف ہونا پڑا۔

ملٹن کی ایک خاص نظم کی بابت کہا جاتا ہی کہ اگر وہ اسکے سوا اور ایک سطر بھی نہ لکھتا تاہم یہ نظم اُسکے کمالِ فن کی کفالت کرتی۔ حالی کا بھی یہی حال ہی۔ حالی کی علمی شہرت اسی کے بدولت ہوئی اور اُنھین قومی رہنمائی کی سند اسی نے دلوادی ہی۔ بہت سے لوگ جو حالی کو غلطی سے شاعر نہین سمجھتے وہ بھی مسدس کی خوبیون کے معترف ہین اور اُسکے مطالعہ سے اثر اندوز ہوتے ہین۔

خیال کرنے کی بات ہی کہ تیرہ سو سال کے اسلامی واقعات کا نظم مین قلمبند کرنا کہ زبان کی لطافت، واقعات کی صحت، طرز بیان کی خوبی اور سب سے زیادہ یہ کہ کلام کی تاثیر کا کوئی پہلو نظر انداز ہونے پائے کوئی آسان بات نہ تھی لیکن مولینا حالی نے اِن تمام مرحلون کو جس خوش اسلوبی سے طے کیا ہے وہ اُنھین کا حق تھا اور اسکا انصاف کچھ وہی کر سکتے ہین جنھین مبدء فیاض سے مذاق سلیم و وجدان صحیح کا وافی حصہ ملا ہے۔ یہان اُن لوگون سے سوال نہین جو فطرتاً نکتہ چین اور عیب جو واقع ہوئے ہین یا جنھین یہ بات خواہ مخواہ قہر معلوم ہوتی ہی کہ دہلی و لکھنؤ کے آگے پانی پت کا نام بھی لیا جائے۔

مسدس حالی سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہی اور تسلسل مضمون کا اسقدر لحاظ کیا گیا ہی کہ اگر کہین درمیان سے دو ایک بند چھوڑ کر پڑھا جائے تو مطالب کی وہ وضاحت نہین باقی رہتی۔

تاثیر سخن اور سوز و گداز کے ماسوا مسدس حالی کی ایک بلا امتیاز خصوصیت یہ بھی ہی کہ اُسکا مطالعہ لڑکون، جوانون، اور بوڑھون کیلئے یکسان معنی خیز و موثر اور فرحت بخش ہی۔ یہ صفت اُردو کی شاید کسی اور کتاب مین نہوگی۔ فارسی مین "گلستان" البتہ یہی وصف رکھتی ہی۔

مسدس حالی نئی طرز کی شاعری کا سنگ بنیاد خیال کیا جاتا ہی اور یہ خیال اصلیت پر مبنی ہی۔ حالی کی تقلید شعرائے اُردو کو اس وجہ سے ناگزیر تھی کہ خیالات کا جو انقلاب علمی نقطۂ خیال سے پیدا ہوا تھا وہ بہر حال پُرانی اور بے کیف شاعری کے حق مین ضرر رسم قاتل تھا جن لوگون نے دور بین نظر سے کام لیکر اس رمز کو پیشتر سے سمجھ لیا اُنھون نے حالی کے اتباع پر اپنے طرز سخن مین تبدیلی کر دی۔ اگر وہ ایسا نکرتے تو بھی زمانہ ایک نہ ایک دن

اُنھین ایسا کرنے پر مجبور کرتا۔

مولانا حالی کی اُس شہرت کا کفیل جو اُنھین آج ملک کا سرمایۂ ناز اور قوم کا چشم و چراغ بنائے ہوئے ہو اُن کا جدید رنگ کا کلام ہو لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ رنگ اختیار کرنیسے پہلے وہ شاعری کے کوچہ سے نابلد تھے۔ اُن کے ابتدائی حالات سے ناظرین واقف ہونگے لیکن ہم سیاق عبارت کیلئے یہان اختصار مدنظر رکھکر اُن کے سوانح قلمبند کرتے ہین اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اُنھون نے کن کن تجربون کے بعد موجودہ طرز سخن کی پابندی اختیار کی ہو۔

مولانا حالی پانی پت کے ایک معزز خاندان کے سپوت ہین۔ پانی پت مین ایک محلہ انصاریون کا ہو۔ یہ خواجہ ملک علی صاحب کی اولاد مین جو ہرات سے ہندوستان آئے۔ بزرگ آدمی تھے۔ بادشاہ نے سر آنکھون پر لیا۔ پانی پت اور اُسکا ملحقہ علاقہ اُنھین بطور مدد معاش دیا گیا۔ آپکو اُس پرگنہ کا منصب قضارت بھی حاصل تھا۔ نرخ بازار کا تعین، نماز عیدین کی امامت، بزرگو نکے مزارات کی تولیت، بھی ان کے تفویض تھی۔ مولانا حالی نسلاً انصاری اور بطناً سید ہین۔ آپ کے والد بچپن ہی مین اختلال دماغ کے عارضہ مین مبتلا ہوگئے تھے۔ ۹ سال کی عمر مین سایۂ مادری بھی سر سے اُٹھ گیا۔ ایسی حالت مین باقاعدہ تعلیم و تربیت کا ہونا بظاہر غیر ممکن تھا۔ لیکن حالی کو تحصیل علم کا فطرتی شوق تھا اور اپنی ذاتی کوشش سے اُنھون نے وہ کچھ کر دکھایا جو دوسرون کیلئے باوجود ہر قسم کی سہولت و آسانی کے محال سمجھا جاتا ہو۔

میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد سید جعفر علی فارسی کے ماہر کامل تھے۔ مولانا حالی نے فارسی انھین سے پڑھی۔ عربی کی تعلیم مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے پائی۔ ۱۷ سال کی عمر مین آپ کی شادی ہوگئی تھی۔ اسوقت تک آپ کی تعلیم درجہ تکمیل کو پہنچی تھی اور اس معاشرتی پابندی کے بعد ناممکن تھا کہ وہ اسکا سلسلہ بدستور جاری رکھتے لیکن جن لوگونکی قسمت مین ناموری لکھی ہوتی ہو اُن کیواسطے حصول مقصد کا راستہ خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔

ان کے دلمین تحصیل علمی کا شوق باقی تھا۔ اور حسن اتفاق سے سسرال بھی خوشحال ملا کہ گھر بار کی فکرون کا ناقابل برداشت بار ان پر نہ پڑ سکا۔ طلب صادق تھی۔ اگر کوئی رُکاوٹ بھی ہوتی تو اُسکا خیال نہوتا۔ بسم اللہ کہکے آپ دہلی چل کھڑے ہوئے۔ اِس زمانے مین دہلی کی حالت گئی گذری نہ تھی۔ اہل کمال کا مجمع تھا۔ طالبا کمال کیلئے دلی چھوڑ اور کوئی جگہ بشکل ملسکتی تھی حالی دلی پہنچے اور ۱۸۵۵ء تک وہین رہے اور علوم منطق و فلسفہ اور صرف و نحو وغیرہ کی تحصیل انتہائی درجہ تک بہ اطمینان تمام کی۔ دلی سے پانی پت واپس آنیکے بعد بھی آپ کا علمی مطالعہ برابر جاری رہا۔ ۱۸۵۶ء مین ضلع حصار کی محکمہ کلکٹری مین ایک مختصر سی جگہ پر مامور ہوئے لیکن ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانۂ غدر کی پریشانیون مین یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی۔ لیکن امن و سکون ہو جانے کے بعد اُنھین گورنمنٹ پنجاب کے دار الکتب (بک ڈپو) مین ایک جگہ مل گئی۔ یہان آپ کے ذمہ یہ خدمت سپرد تھی کہ کتابون کی عبارت زمانۂ حال کے مذاق کے مطابق درست کیا کرتے تھے اور حشو و زوائد سے پاک کر کے اُسے جدید نمونے پر لاتے تھے۔ اس خدمت پر آپ جب تک مامور رہے آپ کا قیام لاہور مین رہا۔ اُسوقت لاہور آجکل کا لاہور نہ تھا جس شخص نے دہلی کے ارباب کمال کی دلچسپ صحبتون کے لطف اُٹھائے ہون اُسکی دلبستگی کا سامان لاہور مین کیا ہوتا۔ پھر وطن اور اہل وطن کی مفارقت اُسپر مستزاد تھی اور سب پر طرہ یہ ہوا کہ اُسی زمانے مین وہان چیچک اور ہیضہ کی دست برد نے شہر کو وحشت ناک بنا دیا تھا

بے دیار و بے وطن آدمی کیلئے اس مصیبت مین اسکے علاوہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ اپنی بپتی اپنے آپ سے کہکر دلکوڈھارس دے۔ اُنکی بعض قدیم غزلوںمین جہان لاہور کی پریشان کن زندگی کی حسرتناک تصویر کھینچی ہو وہان بزرگان دہلی کی یاد بھی آگئی ہو اور سچمچ یہ مین بہت دردناک ہوگیا ہو۔ مثلاً ایک غزل مین فرماتے ہین ؎

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد   نہ مین بُلبُل نہ گھر میرا چمن ہے
کرون تجھ سے بیان کچھ دردِ غربت   مگر جوشِ سخن مُہرِ دہن ہے
رہے لاہور مین اگر سو جانے   یہی دُنیا یہی دارالمحن ہے
یہان بیگانگی ہے اسقدر عام   کہ بُلبُل ناشناسائے چمن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھین اہل لاہور   تصور مین مرے اِک انجمن ہے
مری خلوت مین ہے ہنگامۂ بزم   خموشی مین مری ذوقِ سخن ہے
بتاؤن تم کو ہون کس باغ کا پھول   جہان ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤن تمکو ہون کس مصر کی بو؟   جہان غربت وطن پر خندہ زن ہے
نہ لینے دیگا جنت مین بھی آرام   یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے

یہ اشعار بھی اُسی زمانے کے تصنیف ہین ؎

شہر و دریا سے باغ و صحرا سے   بو نہین آتی آشنائی کی
بختِ ہمد استانی شیدا   تو نے آخر کو نارسائی کی
صحبتِ گاہ گاہیِ رشکی   تو نے بھی ہمسے بیوفائی کی

لیکن اُنھین لاہور مین بہت زیادہ عرصہ تک قیام نہین کرنا پڑا۔ چار برس کے بعد "اینگلو عربک سکول" دہلی کی مدرسی پر مقرر ہو کر وہان سے واپس آئے۔ دلی واپس آکر حالی کو وہی لطف ملا جو شاعرون کے الفاظ مین بُلبُل کو رہائی کے بعد چمن کی سیر سے حاصل ہوتا ہو یا غریب الوطن مسافر کو غربت کی کلفت و مصیبت جھیلنے کے بعد وطن پہنچکر عزیز و اقارب یا احباب کی ملاقات سے۔

ابھی مولنا حالی عربک سکول مین مدرس ہی تھے کہ اتفاق سے نواب آسمان جاہ مرحوم جو کسی زمانے مین دولت آصفیہ کے مدار المہام اور اسلامی معارف پروری کے روایات کے حامل تھے، کالج دیکھنے کیلئے علیگڈھ آئے۔ مولنا حالی بھی موجود تھے اُن کو بھی باریابی کا موقع دیا گیا اور آپ کے لیے ۷۵ روپیہ ماہوار کا علمی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ ۱۳۰۳ھ مین جب مولنا حالی علیگڈھ ڈیپوٹیشن کے ساتھ جس کو خود سرسید کی سرگردگی کا فخر حاصل تھا حیدرآباد گئے تو آپ کا وظیفہ بھی ۷۵ سے پورے سو روپے کردیے گئے۔

اِن واقعات سے معلوم ہوسکتا ہو کہ آپ کی زندگی کا بہترین حصّہ دہلی مین بسر ہوا ہو، اور اگر میر و غالب اپنے مطول قیام دہلی کے لحاظ سے دہلوی اور ناسخ و آتش اسی اعتبار سے لکھنوی کہلائے جانیکے مستحق ہین تو مولینا حالی نے کیا قصور کیا ہو کہ اُنھین دہلوی کہنا تو ایک طرف رہا اُنکی زبان آجتک ہدف و ملامت کا نشانہ بنائی جاتی ہو۔ یہ ایک اُصولی بحث ہو۔ اسکا تصفیہ ماہران علم اللسان کرسکتے ہین لیکن اسکے باوصف ہمارے خیال مین دہلوی یا لکھنوی کا اضافی لقب مولینا حالی کی دستار فضیلت کا طرہ نہین بن سکتا بلکہ اُن کا کمال اُن کی عظمت کی دلیل ہو۔

زمانۂ قیام دہلی مین مولنا حالی کو اُن ذی کمال ارباب فن کی صحبت مین شریک ہونے کا موقع ملا ہو جو اپنے وقت کے فرد فرید تھے۔ ایشیائی شاعری کی زندگی اُس زمانے مین اُن کے دم سے وابستہ تھی۔ وہ شاعر تھے اور شاعر گر بھی، یہ بات ناممکن تھی کہ اُن کے ذوق شعر گوئی کو دیکھکر مولنا حالی کو شوق نہ پیدا ہوا ہو۔ فطرت سے اُنھین وہ صفات عطا ہوئی تھین جو شاعر کو شاعر بناتی ہین۔ اُنسے کام لینے کے لیے ایک معمولی سی تحریک کی ضرورت تھی۔ غالب سا مردم شناس شاعر مولنا حالی کی نسبت کہتا تھا کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو

ظلمکر و گے۔ بالآخر اُنھین بھی اِن بزرگون کا ہمنوا ہونا پڑا اور آج اُن کا پُرانا کلام دیکھکر ہم اندازہ کرسکتے ہین کہ ابتدا مین اُن کا رنگ طبیعت کیا تھا۔

غالب کا نام اُردو شعراء کی فہرست مین "فلسفی شاعر" کے لقب سے لکھا جاتا ہی۔ حالی کو بھی زانوے تلمذ انھین کے آگے تہ کرنا پڑا کسی مجبوری سے نہین بلکہ اس سبب سے کہ جس راستے پر چلنے کو یہ کمر بستہ تھے اُسکی رہنمائی غالب سے بہتر کوئی نہ کرسکتا تھا۔ کہا جاتا ہی کہ ابتداً نواب شیفتہ سے اصلاح لی۔ نواب موصوف کے ساتھ انھین ایک عرصہ تک یکجائی حاصل تھی ممکن ہی کہ شاگرد بھی ہوگئے ہون البتہ اسمین کلام نہین کہ نواب شیفتہ جو خود بھی مشاق شاعر تھے، اُنکی صحبت بھی مولٰنا حالی کی تشویق و تحریص کا باعث ہوئی۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ پہلے مومن کے شاگرد تھے پھر غالب سے اصلاح لینے لگے۔ جہانگیر آباد سے جو اُنکی ریاست تھی غزلین بغرض اصلاح غالب کے پاس آتی تھین۔ حالی بھی جب تک جہانگیر آباد مین رہے اُن کا کلام بھی غالب کے پاس نظرثانی کی غرض سے آیا کرتا تھا۔

یہ کہنا تحصیل حاصل ہی کہ مولٰنا حالی کا ابتدائی کلام زلف و رُخ، ساق و ساعد کے تذکرہ سے مالامال رہا ہوگا۔[1] ابتداء مین یہ امر ناممکن العمل تھا کہ وہ اس طرز سخن کے عیوب سے جنھین اُنکے اور تمام ساتھی محاسن سمجھتے ہون واقف ہو جاتے اُنھون نے اسوقت تک جو کچھ پڑھا تھا یہی پڑھا تھا اور جو کچھ دیکھا تھا یہی دیکھا تھا۔ دُنیا مین کوئی اصلاحی کام بغیر کسی ذاتی مشاہدہ و تجربہ کے آجتک نہین ہوا اور حقیقت حال بھی یہی ہی کہ جب تک انسان کو بطور خود کسی چیز کے حسن و قبح نہ معلوم ہون وہ اُس کے متعلق اچھی یا بُری رائے کسطرح قائم کر سکتا ہی۔

گورنمنٹ پنجاب کے بُک ڈپو کی ملازمت سے پیشتر قیاساً مولٰنا حالی کے خیالات وہی تھے جو طرزِ قدیم کے تعلیم یافتہ آدمی کے ہو سکتے ہین لیکن بُک ڈپو کا تعلق اس قسم کا تھا کہ جو کوئی کتاب کسی زبان سے ترجمہ یا تالیف ہو کر شائع کیجاتی وہ پہلے اُنکی نظر سے گذرتی۔ اس قسم کی کتابون مین تراجم کا حصّہ زیادہ تھا۔ اِن کے مطالعہ سے مولٰنا حالی کو مغربی لٹریچر پر عبور کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا اور جب مغرب کے طرز ادا اور اسلوب بیان سے جسمین دلفریبی کے ساتھ اصلیت کا بھی پہلو عموماً موجود ہوتا ہی مانوس ہو گئے تو اُنکی آنکھین کھلین اور اُنھون نے دیکھا کہ اُنکی شاعری کا درجہ کیا ہی۔ اصلی پھولون کے آگے مصنوعی پھول کبھی پسند نہین ہوتے۔ اُنھون نے معلوم کرلیا کہ ہماری شاعری بالکل پست حالت مین ہی اور جس چیز سے یورپ والے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام لیتے ہین ہمارے یہان وہ حد درجہ مخرب اخلاق بنگئی ہی اور اُس سے اصلاح و ترقی مین امداد حاصل کرنے کی توقع اُسوقت تک بالکل فضول ہی جب تک اُسمین اُسکے حقیقی اوصاف نہ پیدا کیے جائین خیالات یہ اُلجھن تھی جسمین مولٰنا حالی شروع شروع مین یقیناً گرفتار ہونگے لیکن فراست و ذکاوت کی امداد سے بالآخر اُنھون نے نتیجہ نکال لیا کہ اُردو شاعری نہایت ذلیل ہو رہی ہی اور فائدے کی جگہ اُس سے ملک و قوم کو نہایت سخت مضرت پہنچ رہی ہی۔ اور جب اُردو فن سخن کے چہرے کے بدنما خال و خط جنھین تصنع اور استعارون کے پوڈر نے چھپا رکھا تھا اِسطرح ظاہر ہو گئے تو جس راستے پر پہلے قدم رکھے تھے اُسے یکقلم ترک کرنے کی ٹھان لی۔ خیالات مین انقلاب آیا اور خود اُنھین کے لفظون مین

---

[1] یہ صرف قیاس ہی قیاس ہی ورنہ دیوان حالی کی قدیم غزلیات ... نہین ملتا۔ راقم الحروف کا خیال ہی کہ مولٰنا کی صرف دو ہی قدیم غزلین ... ہوا ایک حد تک مذاق جدید کے موافق سمجھی جاسکتی ہین اور جنھین ... اُنکا ...

"جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی"

مولنا حالی اپنے طرز کے موجد اور نیچرل اور قومی شاعری کے مجدد ہین۔ اس اعتبار سے اُن کا مرتبہ شعراء اُردو مین وہی ہے جو انگریزی مین گولڈ اسمتھ کا ہے جس نے اپنے یہان کی شاعری کو جو بنزلہ ایک چمن کے تھی فضول گوئی اور مبالغہ پسندی کی جھاڑیون سے صاف کیا ہے۔ مولنا حالی اور گولڈ اسمتھ مین ایک طرح کی یون بھی مماثلت ہے کہ دونون کو ابتداء مین خاص وعام کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ گولڈ اسمتھ کے یہ الفاظ اس کا ثبوت ہین:۔

اے میری پیاری نظم! تو اُن موقعون سے پہلے بھاگنے والی نظم ہے جہان نفسانی خواہشون کی طغیانی ہوتی ہے۔ تو اس بے قدری کے زمانے مین بجائے اس کے کہ دلون کو اپنی طرف مائل اور پاک شہرت حاصل کرے ہر جگہ ملامت کیجاتی ہے۔ تیری بدولت عام جلسون مین مجھے شرمندہ ہونا پڑتا ہے لیکن جب تنہا ہوتا ہون تو تجھپر فخر کرتا ہون۔

مولنا حالی بھی ایک عرصہ تک "ملامت" اور "شرمندگی" کا نشانہ بن چکے ہین۔ ایک بات اور بھی ان کے خلاف مخالفت کا جوش بڑہانے کی باعث ہوئی اُسے نفس شاعری سے حقیقت مین کوئی تعلق نہین مولنا حالی سرسید کی تعلیمی مہم مین ہمیشہ دست راست کی حیثیت سے شریک تھے۔ اُس زمانے مین عامہ مسلمین سرسید سے نہایت بدظن تھے اور اُن کے رفقا کو بھی کافر و بدعتی سمجھتے تھے۔ ممکن ہے کہ اگر سرسید کا ساتھ دینے کا "الزام" اُن کے سر نہوتا تو انکی جدید طرز شاعری کی شاید اس درجہ لے دے نہوتی۔ بہر کیف اعتراضات اور اختلافات عامہ جسطرح مصلحان قوم کے لیے ناگزیر چیز ہوتی ہین اُسی طرح علوم وفنون کے نقطۂ خیال سے بھی۔ ہمارے کنسروٹیو علماء آج بھی فلسفۂ جدید کے نام سے برافروختہ ہوجاتے ہین۔ انگلینڈ مین جارج سوم کے وقت مین جب دخانی انجن وغیرہ ایجاد ہو رہے تھے تو دستکارون کا غیض وغضب انتہائی درجے پر پہنچا ہوا تھا۔ ڈیوڈ ہیوم نے جو انگلستان کا ایک وسیع النظر مورخ تھا جب اپنے رسالے شائع کیے تو پادریون مین اُسکی مخالفت کا ایک طوفان عظیم برپا ہو گیا تھا۔ مختصر یہ کہ اصلاح کا کام کچھ عرصہ تک اعتراضات کا ہدف بنا رہتا ہے حالی کیونکر مستثنے رہتے، مخالفت کی ترکش مین کوئی تیر نہ تھا جو اُنپر نہ چھوڑا گیا ہو لیکن اُنکی سلامت روی اور مستقل مزاجی نے سپر کا کام دیا اور جو کچھ گولڈ اسمتھ نے اپنی نظم کو خطاب کرکے کہا تھا کہ

جہان کہین تجھپر نکتہ چینی ہو تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور باد مخالف کے جھگڑون پر غالب آئیو اور اپنے درد ناک نالون سے سچ کی مدد کیجیو

وہ مولنا حالی نے اپنے قول وفعل سے ثابت کر دکھایا۔ ایکدفعہ جو مشاعرے سے یہ کہکر اُٹھے کہ ؎

بلبل کی چمن مین ہمزبانی چھوڑی
بزم شعراء مین شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہمکو چھوڑا
ہمنے بھی تری رام کہانی چھوڑی

تو پھر نہ بیٹھے۔ بزم نشینون کا اصرار، پچھلی اُنسیت، دوستونکی مروت، ان تمام نے دامن پکڑا مگر حالی نے یہ کہکر پیچھا چھڑایا ؎

اب اُلفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ
سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل مین آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانیوالی

جو تجویز ہونہار ہوتی ہے اُسکی کامیابی کے اسباب بھی خودبخود پیدا ہو جاتے ہین۔ حالی کو چارطرف سے معترضین اور مخالفین دشمنی کی نظرون سے گھور رہے تھے لیکن سرسید اور اُنکا گروہ ہمدردانہ محبت کے ساتھ انھین دیکھتا تھا اور پھر جیسے جیسے تعلیم پھیلتی گئی اور لوگون کے خیالات مین صلاحیت آتی گئی ویسے ویسے مخالفت کی جگہ اُنس کو ملتی گئی۔

کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات کا نام نامی ایک عرصے تک اُردو کے یورپین محسنین کے زمرہ مین لیا جائیگا۔ کرنل صاحب نے اپنی

ذات سے مشرقی علوم وفنون کو جو تقویت پہنچائی ہو وہ باخبر صحاب سے مخفی نہین۔ آپ نے ایک مجلس مشاعرہ بھی قائم کی تھی اور اُسمین جدت کا یہ پہلو رکھا تھا کہ بجائے مصرع طرح کے کسی خاص عنوان پر شعراء کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا۔ مولنا آزاد نے بھی سب سے پہلے اِسی گلشن مین جدت طرازی کے نغمے سنائے تھے اور حالی کی نظمین برکھارت، نشاطِ اُمید، مناظرہ رحم وانصاف، حب وطن وغیرہ اسی مشاعرے مین پڑھی گئی تھین۔ گویا فکر کے سانچے مین جذبات کی تصویرین جو آئندہ ڈھلکر نکلنے والی تھین اُن کا یہ ابتدائی نمونہ تھا۔

لیکن مولنا حالی کے علمی کارنامون مین جنکا تعلق اُنکی عمر کے اولین حصہ سے ہی دو ایک کتابین اور بھی قابل ذکر ہین مثلاً تریاق مسموم جو اُن کے ایک ہموطن مسلمان کی ایک کتاب کے جواب مین ہی جس نے مسیحی ہونیکے بعد اسلام پر اپنے خیال کے مطابق چند اعتراضات قلمبند کرکے کتابی صورت مین شائع کیے تھے۔ اسیطرح آپ نے ایک کتاب تعلیم نسوان کے متعلق لکھی تھی جو آج شاید کمیاب ہی لیکن ہمارے خیال مین اُسکی دوبارہ اشاعت خالی از نفع نہوگی اور اِس زمانے مین جبکہ نصاب تعلیم مستورات کی تکمیل مین دقتین واقع ہو رہی ہین مولنا حالی ایسے بصر کی تصنیف کی موجودگی بہت کارآمد ہوسکتی ہی۔ اس کتاب کے صلے مین تعلیمی دربار دہلی کے موقع پر آپ کو گورنمنٹ کے جانب سے چار سو روپیہ کا اعزازی انعام بھی عطا ہوا جو لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھون آپ کو ملا تھا۔ یہ کتاب غالباً پنجاب کے مدارس مین کچھ عرصہ تک داخل کورس بھی رہ چکی ہی۔ اِن دونون کتابون کے علاوہ آپنے طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان مین تھی۔ مصر کے ایک عالم نے اُسکا عربی ترجمہ کیا اور مولنا حالی نے اُسے اُردو کا لباس پہنایا۔ یہ علمی خدمات ہر طرح مستحق شکریہ تھین اور ساتھ ہی انسے حالی کی لیاقت وعلمیت کا سکہ بھی بیٹھ سکتا تھا لیکن آپ کی مابعد کی تصنیفات اور شاعری نے آپ کی منزلت کو جس رُتبہ پر پہنچا دیا ہی وہ اول الذکر کے ذریعے سے ناممکن تھا

مولنا کی مستقل تصانیف کی فہرست یہ ہوسکتی ہے:۔

حیات سعدی
مسدس حالی
دیوان حالی
شکوۂ ہند
یادگار غالب
حیات جاوید

ان کے علاوہ آپ کی بیشمار نظمین مستقل قدر وقیمت کی چیزین ہین اور بہت سے علمی مضامین شرح تہذیب الاخلاق اور دوسرے ملکی رسائل مین وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہین بجائے خود ایک ضخیم کتاب ہین حیات سعدی، یادگار غالب، اور حیات جاوید، مین اول الذکر شیخ سعدی کی ثانی الذکر مرزا اسد اللہ خان غالب کی اور آخری کتاب سر سید احمد خان کی مشرح اور مبسوط لائف ہی۔ یہ کتابین آجکل ہندوستان کے تعلیمیافتہ طبقے مین عام طور پر مستند اول ہین غالب کے کلام اور تصانیف کی تنقید یادگار غالب مین جس پیرایے مین کیگئی ہی وہ حالی ہی کا حق تھا۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ حقیقت مین غالب کے واقعی طور پر پہچاننے والون مین اُن کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔

"حیات سعدی" غالباً اپنی قسم کی پہلی کتاب ہی اور اُسکے محاسن وفضائل کے متعلق اسیقدر کہنا کافی ہوگا کہ "سعدی شیرازی" کو ہندوستان جدید سے روشناس کرنیکی خدمت "سعدی پانی پتی" سے بہتر کوئی نہ انجام دیسکتا تھا۔

سر سید کی لائف اُس مقدس بزرگ اور قومی خادم کی تمام عمر کی جانکاہی اور جانفشانیون کی مطول داستان ہی۔ جو لوگ سر سید کے متعلق ذرا ذراسی بات بھی دریافت کرنے کے خواہشمند ہون اُنھین اِس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہی۔

یہ تینون کتابین مفصل ریویو کی محتاج ہین۔ محض دو ایک سطرونسے اُنکی ظاہری و باطنی خوبیون کا انکشاف ناممکن ہی۔ اِس مضمون مین چونکہ ہمین اپنی رائے زنی کو اُنکی شاعری تک محدود کرنا ہی اس لیے ہمین افسوس ہی کہ انکی نثر تصانیف کی بابت تفصیل سے نہین لکھ سکتے۔

اَب ہم مولٰنا حالی کی شاعری پر نگاہ تنقید ڈالتے ہین۔ سب سے پہلے ہم اُن کے دیوان کو لیتے ہین اُسکے بعد اُنکی متفرق نظمون کو دیکھین گے۔ مسدس حالی کی نسبت ہمین جو کچھ کہنا تھا وہ تمہید مین گذر چکا ہی۔

۱۸۹۳ء مین مولٰنا حالی کا دیوان شائع ہوا۔ ولی دکھنی کا کلیات جب پہلے پہل دلی مین آیا تھا تو اُسوقت وہان کی علمی مجالس مین جو کیفیت پیدا ہوئی تھی وہی ہندوستان کے لٹریری حلقونمین دیوان حالی کی اشاعت سے دیکھنے مین آئی۔ اپنے اپنے وقت مین دونون نئی چیزین تھین اور دیکھنے والون کے لیے حیرت و استعجاب بڑہاتی تھین لیکن اِن دونون کے ابتدائی تاثرات مین فرق ہی۔ ولی کے کلام کی تقلید کا شوق بہت جلد تمام ہندوستان مین پھیل گیا اور آج بھی اُسکی لکیر کے فقیر یہان کونے کونے مین موجود ہین۔ لیکن حالی کے کلام کو یہ عزت نہین ملی۔ اُنکی روش سے اہل ملک پہلے سے کچھ واقف تھے لیکن دیوان حالی کی اشاعت تک وہ قابل مصنف کی ہمہ گیر طبیعت کے رنگ سے ناواقف تھے۔ عام مذاق کو دیکھتے ہوے پُرجوش خیر مقدم کی توقع حضرت حالی کو خود بھی نہ تھی اور ایسا ہی ہوا کہ اُنکے مجموعۂ افکار نے قدامت پسندونکو بجائے خوش کرنے کے ملول کر دیا۔ اعتراضات کی بھرمار اور مخالفت کے طومار سے اُنھون نے حالی کا ناطقہ بند کرنا چاہا لیکن مستقبل شناس آنکھین اب سے کئی صدیون آگے تک کے واقعات نگاہ مین رکھتی ہین۔ حالی یہ بھی جانتے تھے کہ اس قسم کی مخالفت بھی لازمی چیز ہی اگر اسکا مقابلہ ثابت قدمی سے کر لیا تو میدان مارا ہوا ہی۔ یہی بات آخر کو سچ ثابت ہوئی۔ وہی طبائع جن کے لیے کلام حالی زہر سے زیادہ تلخ تھا اُسمین اب شہد و شکر کی حلاوت پاتی ہین۔ اسمین شک نہین کہ ابھی باشندگان ہند کی ایک کثیر تعداد ایسی ہی جو اُنھین قدما کی عظمت کا مستحق نہین جانتی تاہم اُن کے کلام کے سودمند نتائج کا ہر شخص کو اقرار ہی اور حالی کی سب سے بڑی جیت یہی ہی۔

دیوان حالی مین سب سے پہلے اور مقدمہ او ردیباچہ کے بعد قطعات کو جگہ دی گئی ہی جو اخلاقی نکات پر مبنی ہین۔ پھر غزلیات کی باری آتی ہی۔ اُسکے بعد رُباعیات ہین۔ آخر مین قصائد، ترکیب بند، مدحیہ قطعے، متفرقات، اور تاریخین ہین۔ دیوان کا مقدمہ بجائے خود فن شاعری پر ایک مبسوط اور معرکۃ الآرا کتاب ہی۔ اس مین شعر کی مدح و ذم، تاثیر سخن، مختلف ممالک کی شاعری کے مدارج، اسلام اور شاعری، شاعری کے عروج و زوال، شاعری اور سلطنت کے تعلقات عہد وسطی اور زمانہ اخیر کی شاعری کا فرق، سوسائٹی پر شاعری کا اثر، غرض اس قسم کے اکثر نہایت نازک اور دلچسپ مسائل پر بہت خوبی سے معنی خیز رائے زنی کی ہی۔ اُردو شاعری کے عیوب روز روشن کیطرح ظاہر کیے ہین، لیکن اساتذۂ متقدمین کا ذکر نہایت متانت اور تہذیب سے کیا گیا ہی۔ خواہ مخواہ کسی کو اعتراضات کا نشانہ نہین بنایا۔ آخر مین اُردو فن شعر کی اصلاح

کے باب مین جو قابل قدر خیالات ظاہر کئے گئے ہین وہ حصہ بھی خواہان ادب اردو کے خاص غور و خوص کا محتاج ہے۔ جو شعراء قدیم شاہراہ سے ہٹکر حالی کے قدم بقدم چلے ہین انسے قطع نظر اگر پرانی شاعری کے دلدادہ اور حالی کے نام پر خار کھانیوالے حضرات اسے ٹھنڈے دل سے دیکھین تو ممکن نہین کہ انھین حالی کی رائے سے اتفاق نہ کرنا پڑے۔

یہ ممکن ہے کہ حالی کے مخالفین انکی شاعری کو کسی پایہ کا نہ سمجھین اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حالی کی شاعری کسی پایہ کی نہ بھی ہو تاہم مقدمہ دیوان حالی اپنے ذی منزلت مصنف کی اصابت رائے کی کافی دلیل ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالی کو فن شاعری کے اصول و فروع اور اسکی تاریخ پر کتنا قابو حاصل ہے۔ جس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے اسکے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور اپنے خیالات کی تائید عقلی دلائل کے ساتھ مشرق و مغرب کے ان اہل الرائے اشخاص کی آراء سے کی ہے جو ہر طرح مستند اور قابل قبول سمجھی جاسکتی ہین۔

اخلاقی قطعات، گلستان کے باب ہشتم کے نصائح کا گویا جواب ہین جو سبق آموز باتین انھین سوجھی ہین انھین نظم کا لباس پہناکر قوم کے سامنے پیش کردیا ہے۔ چند عنوان مختلف قطعون کے درج کئے جاتے ہین۔ ناظرین انسے نفس مطلب کا قیاس کرسکتے ہین "چھوٹون کا بڑا بن جانا"۔ "شعر کی طرف خطاب"۔ "بے تمیزی ابنائے زمان"۔ "آزادی کی قدر"۔ "قحط اہل اللہ"۔ "فیشن کی تعریف"۔ "استفادہ"۔ "اسراف" اور علیٰ ہذا القیاس۔

ان مین سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نصیحت کی تلخی کو قصے اور مکالمے کی چاشنی دیکر خوشگوار بنایا ہے۔ پند و موعظت کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے گفتہ آید در حدیث دیگران کے مصداق اسطرح ادا کیا جائے کہ سامع کو اسکی تمیز نہو کہ خطاب اسیکی طرف ہے۔ دوسری خوبی ان قطعات مین یہ ہے کہ جن مضامین پر طبع آزمائی کیگئی ہے وہ زمانہ جدید کی ضروریات کے مطابق ہین۔ دور ازکار و جدت اور حشو و نشر کی موشگافیون سے سروکار نہین رکھا بلکہ جو بات کہی ہے وہ جچی تلی اور آج کل کے رنگ مین۔ اس فرق کو بوضاحت ذہن نشین کرنے کیلئے ہم ان کا ایک منتخب قطعہ درج کرتے ہین۔ اس سے ناظرین کو ہمارے منشا کے سمجھنے مین آسانی ہوگی۔ فرماتے ہین ؎

حالی سے کہا ہمنے کہ ہے اسکا سبب کیا — جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپکے سب اگلے سخنور — جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلون کو ملامت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اسکا — یارون کیلئے ہے یہ بیان موجب رقت
کرتے تھے بخیلون کو ملامت سلف اسوقت — جب قوم مین افراط سے تھی دولت و ثروت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال — گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کی ایسی — پرواز کی ہو چیونٹیون کو جیسی ہدایت

بعض قطعے اختصار مضمون و کثرت معنی کے اعتبار سے بے مثل ہین۔ "قحط اہل اللہ" کے عنوان سے ایک جگہ فرماتے ہین ؎

کل خانقاہ مین تھی حالت عجب طاری — جو تھا سو چشم پرنم۔ اپنا تھا یا پرایا
"دنیا سے اٹھ گئے سب جو تھے مرید صادق" — یہ کہکے شیخ کا دل بیساختہ بھر آیا
ہم نے کہا "مریدی باقی رہی نہ پیری" — یہ کہکے ہم بھی روئے اور سبکو بھی رلایا

"شعر" کو خطاب کرکے آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اسکے صحیح ہونے مین کسکو شک ہوگا۔ کہتے ہین ؎

اے شعر دلفریب نہو تو تو غم نہین — پر تجھپہ حیف ہے جو نہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہان سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
اہل نظر کی آنکھ مین رہتا ہے گر عزیز — جو بے بصر ہین انسے نہ رکھ ساز باز تو
چپ چاپ اپنے پیچ سے کئے جا دلون مین گھر — اوچھا کبھی نہ کر علم امتیاز تو

پہلے دو شعر اس امر کی تشریح ہین کہ شعر فی الحقیقت کسکو کہتے ہین آخری دونون اشعار کی لے گولڈ سمتھ کی تان کا مزا دیتی ہے جو کہتا

ہی کہ "تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور بادِ مخالف کے جھگڑون پر غالب آئیو" "ترکِ سوال" کی نصیحت کس جدت کے ساتھ نئے پیرایے مین کی ہی۔ معنوی طور پر گویا یہ بھی جتا دیا ہی کہ مہذب اور ترقی یافتہ اقوام گداگری کو سخت عیب خیال کرتی ہین۔ دیکھیئے ؎

عادت تھی اِک فقیر کی کرتا تھا جب سوال　　انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اُسکی جب یہی دیکھی گئی روش　　پوچھا کسینے اُس سے کہ اسکا سبب ہی کیا
بولا کہ عادت اس لیے کی ہی یہ اختیار　　چھٹ جائے تا کہ مجھسے یہ لیکا سوال کا
پہلے تو بھاگو انسے ملتی تھی روز بھیک　　آتا تھا مانگنے مین بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہی سوال کا اس قوم پر مدار　　منت سے عجز سے کبھی ملتا نہین ٹکا
امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت　　گر چند روز اور رہا اس سے سابقہ

ظاہر ہی کہ پند و نصیحت مین زبان اور لطفِ بیان کا چٹخارا بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہی خصوصًا جب شاعر کو خود یہ باتین ناپسند ہون۔ جو لوگ اس قسم کے قطعات مین واسوختِ امانت یا مثنوی میر حسن کا مزا ڈھونڈھتے ہون وہ غلطی پر ہین۔ مجلس وعظ ہمسنِ احباب کی صحبت کیطرح کبھی کیفیت انگیز نہین ہو سکتی۔ البتہ کہین کہین کلام کی روانی اور محاورات کے استعمال سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہی۔ مثلاً ؎

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو　　ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہین کام کا تمکو اندازہ ہرگز　　جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت　　تو چیخ اُٹھے دو دن مین ہمسائے گھر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر　　تو پھر گھاٹ کے آپ ہین اور نہ گھر کے
جو کھانا تو بیحد جو پینا تو آتِ گت　　غرض یہ کہ سرکار ہین پیٹ بھر کے

زبان او طرزِ بیان کی کمی قطعات مین رہگئی ہی اور یہ کمی بعض اوقات ناگزیر ہوتی ہی اُسکی تلافی غزلیات مین بہت کچھ ہو گئی ہی۔ غزلیاتِ حالی دو حصون مین باعتبار اوقاتِ فکر تقسیم ہو سکتی ہین یعنی قدیم و جدید۔ دونون قسم کی غزلون کا مقابلہ کرنیسے رنگِ طبیعت کے تدریجی تغیرات کی تمیز بآسانی ہو جاتی ہی۔ قدیم غزلون کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہی کہ ابتدا مین بھی آپ کا مذاق بہت سنجیدہ اور متین تھا۔ یہ ہو سکتا ہی کہ اِس مجموعہ مین آپ کی وہ غزلین عمدًا نہ شامل کیگئی ہون جنمین مستی سرمہ اور کنگھی چوٹی کے مضامین لکھے گئے ہون۔ کیونکہ ہمارا خیال ہی "اسکی بابت ہم اوپر بھی کہین کنایۃً لکھ چکے ہین کہ پہلے پہل انسان کو اسی قسم کے خیالات نظم کرنے پڑتے ہین۔ تاہم اگر ان قدیم غزلونکو جنکی صراحت موجود ہی بالکل ابتدائی نہ سمجھا جائے تو بھی اِن سے یہ قیاس ہو سکتا ہی کہ رنگِ جدید اختیار کرنیسے پیشتر اُنکی شاعری کا کیا عالم تھا۔ ہمارے خیال مین اُصولاً یہ سخت غلطی ہو گی اگر ہم کلامِ حالی مین میر، جرأت اور داغ کی خصوصیات تلاش کرین جب حالی نے اپنا مشرب ہی جدا رکھا تو اُنمین پرانی باتونکا ہونا ایسا ہی ناممکن ہی جسطرح افلاطون کا شیکسپیر بن جانا۔ دیکھنا صرف یہ ہی کہ شاعری کا جو مفہوم حالی نے قرار دیا ہی اُس لحاظ سے اُن کے کلام کی کیا حالت ہی اور جب ہم اس معیار پر اُسکو دیکھتے ہین تو وہ کھرا اُترتا ہی۔ اُنکی پرانی غزلین بھی اُنکی اعتدال پسندی اور سلامت روی کا ثبوت ہین۔ دیکھیے یہ مطلع کس قدر بلیغ ہے ؎

ہی جستجو کہ خوب سے ہی خوبتر کہان　　اَب ٹھیرتی ہی دیکھیے جا کر نظر کہان

اسی کے ساتھ یہ شعر غالب کے طرزِ بیان کی یاد دلاتا ہی ؎

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر　　تھا اُسکو ہم سے ربط مگر اسقدر کہان

مندرجۂ ذیل مطلع باعتبار اختصار و طرزِ ادا کے کتنا اچھا ہی ؎

رنج اور رنج بھی تنہائی کا　　وقت پہنچا مری رُسوائی کا

ایک غزل کے یہ چند اشعار قابل ملاحظہ ہین ؎

پیش از ظہورِ عشق کسیکا نشان نہ تھا　　تھا حُسن میزبان کوئی مہمان نہ تھا

ملتے ہی اُنکے بھول گئیں کلفتیں تمام | گویا ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا
کچھ میری بیخودی سے تمھارا زیان نہیں | تم جانتا کہ بزم مین اک خستہ جان تھا
رات اُسکو بات بات پہ سنو سنو دیے جواب | مجکو خود اپنی ذات سے ایسا گمان نہ تھا

اور دیکھیے فرماتے ہین ؎

اب وہ اگلا سا التفات نہیں | جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
رنج کیا کیا ہین ایک جان کے ساتھ | زندگی موت ہے حیات نہیں
ذرہ ذرہ ہے مظہر خورشید | جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

زندگی کو کس خوبی سے موت ثابت کیا ہے۔ اور آخری شعر معرفت شناسی کا گویا آئینہ ہے۔ اسیطرح ایک یہ شعر کسقدر مضمون خیز ہے ؎

کوئی محرم نہیں ملتا جہان مین | مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان مین

یہ مختصر انتخاب اُنکی قدیم غزلیات کا ہے۔ جدید طرز پر جو کچھ کہا ہے وہ دُنیا ہی اور ہے۔ مضمون آفرینی کے ساتھ سوز و گداز اور درد کا پہلو ہاتھ سے جانے نہین پایا۔ اِن غزلونمین ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اکثر مسلسل اور قطعہ بند ہین، شروع سے آخر تک ایک ہی مضمون کے اشعار لکھے گئے ہین، اور سلسلۂ خیالات کے اسطرح قائم رہنے سے عجیب لطف پیدا ہوجاتا ہے، شادمانی الوداع، جوانی الوداع، اِس زمین مین کہتے ہین اور کس حسرت سے کہتے ہین ؎

اے بہار زندگانی الوداع | اے شباب اے شادمانی الوداع
اے بیاض صبح پیری السلام | اے شب قدر جوانی الوداع
روز گار ضعف و سستی الصلا | وقت سعی و جانفشانی الوداع
فرصت عشق و جوانی الفراق | دور عیش و کامرانی الوداع
تجکو سمجھے تھے نعیم جاودان | اے نعیم جاودانی الوداع

آلگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

ہم اوپر ایک جگہ کہہ چکے ہین کہ حالی کے کلام کو خود اُن کے مقرر کردہ معیار پر جانچنا چاہیے۔ اس لیے ہمین یہان یہ دیکھنا ہے کہ مولانا نے غزل گوئی کے کیا اُصول رکھے ہین اور پھر یہ کہ خود اُنھون نے اُنکی پابندی کہان تک کی ہے عشقیہ مضامین کے متعلق آپکی رائے ہے کہ

وہ ایسے جامع الفاظ مین ادا کیے جائین جو دوستی اور محبت کی تمام انواع واقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہون۔

نفس مضمون کے متعلق آپ کا خیال ہے کہ اسکا دائرہ وسیع کرنا چاہیے، یعنی محض عشق و محبت کی باتون پر محدود نہ کرنا چاہیے بلکہ

جس بات کا سچا جوش اور ولولہ اُٹھے خواہ اُسکا منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت ...... یا حب وطن یا قومی ہمدردی ...... یا کوئی جذبہ جذبات انسانی مین سے اُسکو بھی غزل مین بیان کرسکتے ہین۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا یہ مشورہ بہت بعد از وقت ہے۔ متقدمین نے خود غزلیات کا انحصار عشقیہ باتون پر نہین رکھا۔ ہان اُن کے یہان حب وطن، ایثار نفس، قومی ہمدردی، اور اسی قبیل کے مضامین پر بہت کم توجہ کیگئی ہے اور شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ اُن کے زمانے مین اسکی ضرورت نہ تھی۔ ہان آجکل اس قسم کے جوش آفرین خیالات کے ذریعے سے قوم کے جمود کو توڑنا فرض تھا اور اس مین کلام نہین کہ اس مقصد کی تکمیل مولانا حالی کے دم سے ہوئی مختصر یہ کہ مولانا کی غزلیات اُن مضامین سے لبریز ہین جنکی تاثیر کسی مردہ قوم مین زندگی کی حرکت پیدا کرسکتی ہے۔ فرماتے ہین ؎

معنی کا تم نے خالی دریا اگر بہایا | یہ تو بتائین حضرت کچھ کرکے بھی دکھایا
اے بانگ طبل شاہی دن ہوگیا جب آخر | خواب گران سے تونے ناحق ہمین جگایا
تقلید قوم ہی پر گر ہے مدار تحسین | تو ہمنے دوستونکی تحسین سے ہاتھ اٹھایا

باپ کا ہے جبھی پسر وارث | ہو ہنر کا بھی اُسکے گر وارث

گھر ہنر ور کا ناخلف نے لیا　　تیرا ہی کون اے ہنر وارث
ہوا گر ذوقِ کسب سے آگاہ　　کرین میراث سے حذر وارث
قوم بے پر ہی دین بیکس ہے　　گئے اسلام کے کدھر وارث

جو جذبات قومی امراض کے حق مین اکسیر سمجھے جاتے ہین اُنکے اُکسانے مین مولنٰنا حالی نے کمال دکھایا ہی - جو لوگ اپنی پست حالت دیکھکر ہمت ہار بیٹھے تھے اُنھین اسطرح ڈھارس دیتے ہین ؎

ہی کہین اقبال کی نوبت کہین اُوبار کی　　سبکو کرنی ہونگی پوری اپنی اپنی باریان
زیست بے عقلونکو ہو جائے بسر کرنی محال　　اتنی بھی اے عاقلو اچھی نہین ہشیاریان

تلخی دوران کے ہین سب شکوہ سنج　　یہ بھی ہی یارو! کوئی رنجو نہین رنج
رنج و شادی یان کے ہین سب بے ثبات　　اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

پہنچ اے خضر کہ موقع ہے مددگاری کا　　ڈگمگاتی ہی بہت دیر سے منجدھار مین ناؤ
اے شرافت تجھے بکنا ہی اگر مفت تو بک　　آجکل کیجئے کیا ہی یہی بازار مین بھاؤ
قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ　　وقت اب ہاتھ سے جاتا ہی جو آتے ہو تو آؤ

قوم کے ظاہر و باطن کی تصویر جو مندرجۂ تحت شعرون مین الفاظ کے ذریعے کھینچی ہی کتنی صحیح اور سچی ہی ؎

خوبیان اپنے مین گو بے انتہا پاتے ہین ہم　　پر ہر اک خوبی مین داغ اک عیب کا پاتے ہین ہم
دلمین دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہی تنگ　　پر اسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہین ہم
ٹھہرتے جاتے ہین جتنے چشمِ عالم مین بھلے　　حالِ نفسِ دون کا اُتنا ہی برا پاتے ہین ہم
گو بھلائی کرکے ہم جی مین خوش ہوتا ہی جی　　تہ نشین اُسمین مگر دُردِ ریا پاتے ہین ہم
ہی ردائے نیکنامی دوش پر اپنے مگر　　داغ رُسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہین ہم

نور کے ہمنے گلے دیکھے ہین اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپو مین نیا پاتے ہین ہم

اِن اشعار کی کیفیت اور خیالات کی حقیقت قابل داد ہی ؎

صلح ہے اِک مہلتِ سامانِ جنگ　　کرکے ہین بھرنے کو یان خالی تفنگ
عہدِ گیتی پر نہ بھولین کامران　　آخر اسکی آشتی لائیگی رنگ
علم کیا، اخلاق کیا، ہتھیار کیا،　　سب بشر کے مارکھنے کے ہین ڈھنگ
کام کا شاید زمانہ ہوچکا　　دلمین اب اُٹھتی نہین کوئی اُمنگ
کاہشون سے پرورش پاتی ہی روح　　اب لگا کھایا پیا سب آگے انگ

حمد کے یہ چند شعر معانی کے اعتبار سے کسقدر دلچسپ اور مضمون خیز ہین ؎

کامل ہی جو ازل سے وہ ہی کمال تیرا　　باقی ہی جو ابد تک وہ ہی جلال تیرا
کاوش مین ہی آگہی وگدا مین ہی طبیعی　　جو حل ہوا نہوگا وہ ہی سوال تیرا
دل ہو کہ جان تجھسے کیونکر عزیز رکھئے　　دل ہی سو چیز تیری جان ہی سو مال تیرا

لیکن نیچے کے یہ دو شعر اور ہی کیفیت سے پُر ہین ؎

نہ جی رُکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
ہے سدا نامراد جو یان اُنھین بھی اُمیدوار دیکھا
خبر نہین یہ کہ کیا ہی کیسا ہی کون ہی اور تو کہان ہے
پہ اپنے مین اور تجھ مین ہمنے علاقہ اِک اُستوار دیکھا

نعت کا یہ شعر کتنا بلیغ ہی - اِس سے زیادہ صحیح تعریف ناممکن تھی ؎

قال ترا اور حال نشۂ وحدت مین　　اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

مسئلہ عشق کی نزاکت و دقائق سے مولنٰنا حالی بے خبر نہ تھے لیکن بعض متقدمین کی بدولت عشق بھی لڑکون کا کھیل بن گیا اور رفتہ رفتہ عوام الناس اِس پاک جذبہ کو بھی شاہد بازی کا مرادف سمجھنے لگے - حالی کو معلوم تھا کہ اِس حالت مین جبکہ اُسکے حقیقی معانی سے بے خبری کا یہ عالم ہو عشق و محبت کی تعلیم قوم کیلئے غیر مفید ہوگی - یہی سبب ہے کہ اُنھون نے اکثر اسکا ذکر ایسے الفاظ مین کیا ہی جس سے تشویق کی جگہ تخویف کا پہلو نکلتا ہی - کہتے ہین ؎

اے عشق تونے اکثر قومونکو کھا کے چھوڑا　　جس گھر سے سر اُٹھایا اُسکو بٹھا کے چھوڑا

ابرار تجھسے ترسان احرار تجھسے لرزان	جو زد پہ تیری آیا اُسکو گرا کے چھوڑا
راؤنکے راج چھینے شاہونکے تاج چھینے	گردن کشونکو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

آگے چلکر تو صاف صاف کہدیا ہی ـــہ

جیتے جی موت کے تم مُنھ مین نہ جانا ہرگز	دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
عشق بھی تاک مین بیٹھا ہی نظر بازنکی	دیکھنا شیر سے آنکھین نہ لڑانا ہرگز
چاہت اک طلعت مکروہ ہی برقع مین نہان	کسی دلالہ کے دھوکے مین آنا ہرگز
ہاتھ ملتے نہون پیری مین اگر حسرت سے	تو جوانی مین نہ یہ روگ لگانا ہرگز

یہ چارون شعر مولنا حالی کی ایک مشہور غزل سے لیے گئے ہین۔ یہ غزل سرتاپا مرصع ہی اور تسلسل کلام مین جہان دہلی کا ذکر آگیا ہی وہان حسرت و یاس کا عجیب عالم پیدا ہوتا ہی ـــہ

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ	نہ سُنا جائیگا ہم سے یہ فسانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہی دل شوریدہ بہانے مطرب	دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتین اگلی مصور ہمین یاد آئینگی	کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لیکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح	دیکھ اس شہر کے کھنڈر دن مین نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہین یان گوہر یکتا تہ خاک	دفن ہوگا کہین اتنا نہ خزانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی	ہمکو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
کردیا مر کے یگانون نے یگانہ ہمکو	ورنہ یان کوئی نہ تھا ہم مین یگانا ہرگز
داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن مین	نہ سُنے گا کوئی بُلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر	اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزم ماتم تو نہین بزم سخن ہی حالی
یان مناسب نہین رو رو کے رُلانا ہرگز

حالی کی نظرون سے دہلی کا سمان جو گذرا تھا اُسکے درہم برہم ہونے پر جو الم آگین جذبات پیدا ہوسکتے ہین اُنھین حالی سے زیادہ کون محسوس کرسکتا تھا۔ حق یہ ہی کہ حالی نے یہ داستان چھیڑکر اپنے ساتھ سامعین کو بھی خوب رُلایا ہی اسیطرح قومی انقلاب کا فوٹو بھی بعض اوقات نہایت موثر طریقے پر دکھایا ہی۔ اسلامی عروج و زوال کا مرقع ایسا نہین کہ کوئی دیکھکر اپنے دل کو قابو مین رکھ سکے ـــہ

پھر زخم پھوٹ نکلا حالی نہ چھیڑنا تھا	فصل خزان کا قصہ ذکر گل و چمن مین
وہ قوم جو جہان مین کل صدر انجمن تھی	تمنے سنا بھی ہی اُسپر کیا گذری انجمن مین
وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے	ہی کال موتیون کا اب بحر عدن مین
فخر اویس پر ہی بس فخر اب قرن کا	زندہ اویس کوئی باقی نہین قرن مین
خرد و بزرگ سارے ہین بدحواس گویا	لُٹنے کی قافلے کی پہنچی خبر وطن مین
حالی بس اب نہین یان سننے کی تاب باقی	مانا کہ ہی بہت کچھ وسعت ترے سخن مین

نوک زبان تیری سینون کو چھید ڈالا
ترکش مین ہی یہ پیکان یا ہی زبان دہن مین

رُباعیات حالی بھی دیگر اصناف سخن کیطرح مفید خیالات کی جامع ہین۔ کہین وحدت کا ترانہ ہی کہین صلح کُل کی لے اور کہین انقلاب عالم پر فلسفیانہ جذبات کا اظہار۔ یہ دو رُباعیان جن مین وجود وحدت باری تعالی کی پُراثر اور سچی دلائل سے کام لیا گیا ہی بہت مشہور ہین ـــہ

کانٹا ہی ہر اک جگر مین اٹکا تیرا	حلقہ ہی ہر اک گوش مین لٹکا تیرا
مانا نہین جسنے تجکو جانا ہی ضرور	بھٹکے ہوئے دل مین بھی ہی کھٹکا تیرا

ہندو نے صنم مین جلوہ پایا تیرا	آتش پہ مغان نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے	انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

قومون کے باہمی اتفاق اور میل جول کی خوبی یون ظاہر کی ہی

ہندو سے لڑین نہ گبر سے بیر کرین	شر سے بچین اور شر کے عوض خیر کرین
جو کہتے ہین یہ کہ ہی جہنم دُنیا	وہ آئین اور اس بہشت کی سیر کرین

دُنیا کے فانی ہونے سے کسکو انکار ہوگا لیکن یہی خیال بسا اوقات بڑے کامون کی تکمیل مین ہارج ہوتا ہی۔ اس نکتہ کو مولنا حالی یون ادا فرماتے ہین ـــہ

دُنیاے دنی کو نقش فانی سمجھو　　روداد جہان کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا　　ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

غزلیات اور رُباعیات کے بعد قصائد ہین۔ متقدمین نے قصائد نگاری کے جو اُصول موضوعہ مقرر کیئے ہین اُنکے اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ یہ صنف حالی کے مذاق سے کوئی مناسبت نہین رکھتی۔ لیکن اُنکی جدید مدحیہ نظمین اور قصائد اسبات کا ثبوت ہین کہ اِس خارزار مین بھی اُنھون نے اپنا علیحدہ راستہ نکال لیا ہی۔ حال ہین آپ کی ایک تازہ نظم حضور نظام میر عثمان علیخان فرمانرواے دکن کی تخت نشینی کے موقع پر شائع ہوئی تھی اُسکے چند اشعار مندرجہ ذیل سے اُن کا رنگ طبیعت ظاہر ہوگا۔ سعدی کیطرح حالی کا بھی کہنا یہی ہی کہ ؎

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان　　نہی زیر پاے قزل ارسلان
مگو پاے عزت برافلاک نہ　　بگو روے اخلاص بر خاک نہ

مبالغہ اور تصنع کی گلکاریون سے کلام مین گلزار کی سی دلفریبی پیدا کرنیکی جگہ آپنے ممدوح کو اُسکی ذمہ داریون سے آگاہ کرنا پہلا فرض سمجھا ہے۔ فرماتے ہین ؎

فلک مرتبت میر عثمان علیخان　　مبارک تمھین مسند شہریاری
مبارک ہو تمکو وہ دشوار منزل　　جہان چپے چپے پہ ہی ذمہ داری
مبارک بزرگون کی میراث تمکو　　جنھون نے کہ جھیلی ہین کڑیان یہ ساری
اب اُنکی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا　　خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہین دینا ہی اُنکو سہارا　　جو بے یار ہین اُنکی کرنی ہی یاری
نکمے جو ہین اُن کو کامی بنانا　　بڑھانا دل اُنکا جو ہین کاروباری
جگانا اُنھین نیند سے جو ہین ماتے　　پڑھانا اُنھین علم سے جو ہین عاری

قصائد کے بعد مدحیہ قطعات، ترکیب بند، اور تاریخی قطعے ہین اور شاعر کی طبیعی مناسبت کے لحاظ سے بہت اچھے ہین لیکن ہمارے خیال مین اُنکی عظمت و منزلت یہ چیزین نہین بلکہ اُنکی وہ نظمین ہین جنکے عملی نتائج سے مسلمان آج متمتع ہو رہے ہین۔ انکی تعداد ایک دو نہین بلکہ بیسون ہی، اور انمین سے بعض اپنی شہرت کے لحاظ سے مسدس کے بعد ہی جگہ پانے کا استحقاق رکھتی ہین۔ مثلاً قصیدۂ الغیاثیہ اور شکوۂ ہند۔ اول الذکر جس موثر پیرایہ مین لکھا گیا ہی اُسکا اندازہ چوٹ کھائے ہوے دل خوب کر سکتے ہین۔ اسے شروع سے آخر تک دیکھیے اور عالم سکوت مین اسکی معنی آفرینیون اور طرز بیان کی خوبیون کا موازنہ کیجیے۔ اللہ اللہ کس جوش محویت مین کہتے ہین ؎

اے خاصۂ خاصان رُسل وقت دُعا ہی　　اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہی

یہی حال شکوۂ ہند کا ہی۔ ایک ایک لفظ تیر و سنان کا کام کرتا ہی۔ مولنا حالی کے مبصر اور عالی دماغ شاعر ہونیکی سب سے بڑی دلیل یہ ہی کہ اُن کا کلام محل اور موقع کے مناسب ہوتا ہی اسلیئے سامع کے دل و دماغ پر اُسکا اثر ضرور پڑتا ہی۔ یہ صفت اکثر جدید رنگ کے شاعرون مین مفقود ہی اور اسی وجہ سے مخالفین نئی شاعری کو غلطی سے بالعموم بے اثر اور روکھی پھیکی کہنے لگتے ہین۔

حالی کے پہلو مین ایک ستم رسیدہ دل ہی اس لیئے اُن کی زبان سے جو بات نکلتی ہی وہ عموماً سوز و گداز کی مجموعی کیفیات سے مملو ہوتی ہی۔ مرزا غالب، سر سید، اور حکیم محمود خان کے مرثیے اسکی کافی شہادت ہین۔ غالب کا مرثیہ مجروح نے بھی لکھا ہی لیکن حالی کو نہین پہنچے۔ حکیم محمود خان کے نوحہ کی تمہید مین دہلی کی بربادی اور تباہی کا حال کتنا عبرت خیز ہی۔

مولنا حالی کے فیضان قلم سے ذکور و اناث دونون کو فائدہ پہنچا ہی، اور بعض خاص نظمین تو خالص طبقہ نسوان سے متعلق لکھی ہین مناجات بیوہ اس قبیل کی پہلی نظم ہی اور "چپ کی داد" غالباً سب سے آخری۔ مجھے وہ دن نہین بھولتا جب مین نے "چپ کی داد" خود مصنف کی زبان سے سُنی تھی۔ حضور نظام میر محبوب علی خان خلد مقام کی جوبلی جہل سالہ

کا جشن حیدرآباد میں عام طور پر منایا گیا تھا۔ مولانا حالی جو اس دولت ابد مدت کے قدیم متوسلین میں سے ہیں مہاراجہ مدارالمہام کی دعوت پر وہان تشریف لائے تھے۔ "ینگ مس ڈبیٹنگ فورم" کے اہتمام سے بھی ایک جلسہ قرار پایا تھا۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علیخان مولوی عبدالحق وغیرہم شریک تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ صدر نشین تھے۔ مولنا حالی بھی حیدرآباد میں تھے اسلیے آپ سے بھی تشریف آوری کی درخواست کیگئی تھی۔ تازہ نظم لکھنے کا موقع نہین تھا۔ آپ نے جلسہ میں "چپ کی داد" سنائی تھی جلسے کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ وقت مقررہ پر نواب میر فیاض علیخان کی پر فضا کوٹھی حاضرین سے پر تھی۔ اِس ذوق و شوق کے باوجود اکثر احباب کا خیال تھا کہ عالم نسوان کے متعلق مولنا حالی اُن خیالات پر کیا اضافہ کرسکینگے جو دس پندرہ سال کی طول طویل مدت میں مولوی محب حسین نظم و نثر کے ذریعے سے ملک کے سامنے وہان پیش کر چکے تھے لیکن جسوقت مولنا نے اپنی متین اور موثر آواز میں پہلا ہی شعر پڑھا کہ ؎

اے ماؤ بہنو بیٹیو قومونکی عزت تمسے ہے   شہرونکی بستی ہو تمھین دنیا کی زینت تمسے ہے

تو حاضرین کی چیرز نے زمین کو آسمان پر اُٹھا لیا اور اُسکے بعد تو خود رفتگی کا سا عالم تھا۔ مہاراجہ صدر نشین نے اپنی تقریر صدارت میں اِس نظم پر دلی پسندیدگی کا اظہار کرکے یہ تمنا کی تھی کہ اسے کم از کم مملکت نظام کے مدارس نسوان کے نصاب مین داخل کیا جائے۔

اسمین کلام نہین کہ مولنا حالی کا کلام اگر انتخابی شکل میں کورس کی کتابون مین داخل کیا جائے تو بہت فائدہ مند ہوگا۔ پنجاب کی کتابونمین پہلے ہی ایسا کیا جاتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ ہر حصہ ملک کی اُردو کتابین جو لڑکون یا لڑکیون کے لیے تالیف کیجائین اُنمین کلام حالی کو نمایان جگہ دیجائے۔

مولنا حالی اور اُن کے کلام کے متعلق تفصیلی بحث کی گنجائش یہان اِس سے زیادہ نہین نکل سکتی ورنہ ابھی دو ایک پہلوؤن پر اور روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ تاہم اُمید ہے کہ اِن سطور سے ناظرین کو اُنکی شاعری کے متعلق ہمارے ذاتی خیالات کا اندازہ ہو جائیگا اور وہ خود بھی آخری فیصلے پر آسانی سے پہنچ سکین گے۔

حالی کا دم ہندوستان مین غنیمت ہے۔ اُنکی قومی خدمات اگرچہ زیادہ تر مسلمانون تک محدود ہین لیکن اُنکی شاعری ہندو، مسلمان پارسی، عیسائی، سبھون کیلئے یکسان نتیجہ خیز ہے۔ اسکے علاوہ ہندوستان کی مختلف اقوام کے درمیان میل جول اور محبت آمیز روابط قائم کرانے کے وہ ہمیشہ حامی رہے ہین۔ یہ راز اصحاب ہنود سے بھی چھپا ہوا نہین ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کے قدردان مسلمانونسے قطع نظر اور لوگ بھی کثرت سے ہین اور خیالات و جذبات مین جیسے جیسے اصلاح ہوتی جائیگی اُسیطرح کلام حالی کی ہردلعزیزی کا حلقہ وسیع ہوتا جائیگا۔

کم از کم تعلیم یافتہ مسلمانونمین اُنھین "قومی شاعر" کا پوزیشن ضرور حاصل ہے اور اُنکی یہ حیثیت اسلامی جماعتون مین عام طور پر بلا اختلاف عقائد تسلیم کیجاتی ہے۔ اب اُن کے مخالفون کا بھی وہ زور نہین رہا اور اُن کی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ تک جا پہنچی ہے۔ انگلینڈ مین اُنکی رباعیات کا ترجمہ انگریزی مین چند سال پیشتر ہو چکا ہے۔ گویا وہان والون پر ثابت ہو گیا ہے کہ ہندوستانی دماغ بھی انسانی زندگی کی رمز شناسی اور نیچر کی زبردست طاقت سے استفادہ حاصل کرنے کا کم و بیش ملکہ رکھتے ہین۔

حالی کا سب سے بڑا وصف بقول ایک نکتہ رس نقاد کے یہ ہے کہ اُن کا کام اور کلام ایک ہے۔ حقیقت مین قول و فعل کی جو دلپسند مطابقت مولنا حالی کی ذات بابرکات مین ہے وہ کسی اور مین نہوگی آجکل ہندوستان مین ایسے ہی شاعرونکی ضرورت ہے۔ ہمین میر و سودا

یا امیر و داغ کی عظمت سے انکار نہیں بلکہ بہت سی باتوں میں ہم اُنھیں حالی سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن زمانۂ جدید کی تمدنی و معاشرتی اور ادبی ضروریات کا جنکی تکمیل پر بقاء قومی کا انحصار ہے یہ تقاضا ہے کہ حالی ایسے شاعر پیدا ہوں۔ ہم مخالفین کی تشفی کیلئے اُن تمام عیوب و نقائص کو تسلیم کرتے ہیں جو وہ حالی کی "شاعرانہ" سخن سنجی میں بتاتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ہم اُن کی شاعری کو فضول اور یا وہ گوئی نہیں سمجھتے بلکہ برخلاف اسکے ہمارا عقیدہ ہے کہ اُن کی شاعری بہت سے مفید نتائج کا سبب ہے جس سے مسلمان بالخصوص متمتع ہوئے ہیں۔ خود اُن کا یہ شعر اُن کے حسب حال ہے ؎

گو کہ حالی اگلے اُستادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

سید محمد فاروق

اساتذہ اُردو کی فارسی شاعری

زبان اُردو کی ترکیب امتزاجی پر جسنے غور کیا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ زبان جو اسوقت انڈیا کی لنگوا فرینکا ہے کن کن عنصروں سے مرکب ہوئی ہے اور ایشیا و یورپ بلکہ افریقہ تک کی زبانیں کسطرح اسمیں کم و بیش دخیل ہیں۔ ہماری زبان کے اصل الاجزا کی طرف غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہندی سرزمین میں فارسی تخم بویا گیا۔ اُسکا ثمرہ ہے "اُردو" اور بنگالی، مرہٹی، گورکھی، بنگالی وغیرہ یہ پراکتیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں میں نے جو ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے مراد اُسوقت کی ہندوستانی بولی ہے جو اُس قطعہ ملک میں مستعمل تھی جہاں اُردو نے جنم لیا ہے۔ خواہ وہ برج بھاشا ہو اور خواہ سندھی اور مرہٹی۔

فارسی میں عربی سیلاب کچھ اسطرح اُمنڈ کر آیا کہ فارسی حروف تک بدل گئے۔ اسی لیے فردوسی کی زرین یادگار شاہنامہ سمجھا جاتا ہے جسمیں برائے نام عربی الفاظ لائے گئے ہیں۔ اب تو یہ شوق زمانہ نے سرد کر دیا ہے لیکن ہمارے بچپن کی بات ہے کہ اچھے فارسی دان اچھی فارسی اُسکو کہتے تھے جسمیں عربیت کا حصہ کم اور بہت کم ہو اور اسپر جیسی کاہش و کاوش کرتے تھے یہ اُنھیں کی وضع پرستی تک محدود تھی۔ اس مختصر سی تمہید سے غرض صرف اتنی ہے کہ اُردو زبان عربی کی کچھ بہت زیادہ بلاواسطہ ممنون نہیں ہے، اور اگر چند عربی مذاق بزرگوں سے اُردو نے ذرا نفع اُٹھایا ہے تو وہ شمار کے قابل نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ فارسی شاعری کی ابتدا، خود عربی منت اسلام ہے لیکن خود فارسی شاعری پر بحیثیت شاعری عربی کا کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ عرب کی شاعری کی بنا، سادگی جوش اور تقاضائے فطرت پر ہے لیکن فارسی شاعری کو اس حصہ سے کوئی بہرہ نہیں ملا۔ بات یہ ہے کہ تمدن کی اعلیٰ ترقی معاشرت کی انتہائے معراج اور پھر آزادی و آزادروی کا فقدان فارسی شاعری کی جان ہے۔ ایسی حالت میں وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ خود عرب شاعری نے بھی دوسری صدی میں یہی رنگ اختیار کر لیا، اور آورد کے ساتھ آمد کا تبادلہ ہو گیا۔ شہادت کیلئے آج بھی گھر گھر دیوان متنبی موجود ہے۔ عرب کی اصلی شاعری سے یہ اور انکے معاصر کتنے دور ہیں؟ ایک ہی نگاہ میں معلوم ہو سکتا ہے۔

اُردو شاعر کو تکمیل شاعری کے لیے ضرورت تھی کہ وہ ہندی اور فارسی دونوں سے علی وجہ الکمال واقف ہوتا کیونکہ دُنیا میں صرف اُردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جسکو شاعری کا استحقاق

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

اُردو علم ادب نے ابتدا سے آجتک کئی چولے بدلے اور تغیرات کی مختلف منزلین طے کین لیکن ماہران علم اللسان واقف ہین کہ اس قسم کی تبدیلیان ہر زبان کیلئے لابدی ہین البتہ فی زماننا اُردو کی ادبی دُنیا مین خیالات کے اعتبار سے جو خوشگوار انقلاب نمودار ہو رہا ہو وہ بلحاظ اپنے مستقل فوائد کے قابل قدر چیز ہو۔ حقیقت یہ ہو کہ برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ جہان ہمین اور بہت سی برکات سے متمتع ہونے کا موقع ملا ہے وہان ایک یہ بھی ہو کہ ہمارے خیالات و جذبات مغربی خیالات و جذبات سے متاثر ہو رہے ہین اور یہ مُلکی لٹریچر کے حق مین ایک مبارک فال ہے۔

بیشک اسکا فیصلہ وقت کرے گا کہ مغربی تاثرات نے ہمارے علم ادب کو واقعی کوئی نفع پہنچایا ہو یا نہین لیکن ارباب نظر موجودہ واقعات سے آئندہ نتائج کے اخذ کرنے سے قاصر نہین، اور اُن کا خیال ہو اور اُسکی صحت کے کئی قابل قبول ثبوت بھی موجود ہین کہ مغربی لٹریچر کا اثر اُردو ادب کیلئے بہر نوع منفعت بخش ثابت ہوگا۔

یہ ادبی انقلاب جسکی طرف ہم اُوپر اشارہ کر چکے ہین حقیقت مین اُسوقت سے شروع ہوا ہو جب سے ہمین انگریزی تعلیم کی بدولت مغربی خیالات پر عبور کرنیکی قدرت حاصل ہوئی ہو لیکن اسکی اصلی بنا اُسی وقت پڑ چکی تھی جب کلکتہ مین فورٹ ولیم کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور اُن کی پُرجوش جماعت نے اول اول اُردو کے خزانہ کو جن جن گرانمایہ جواہر سے لبریز کیا ہو اُسکی شکریہ آمیز یاد بہی خواہان ملک کے دلون سے کبھی محو نہین ہو سکتی۔ آج بھی ہمارے ملک مین جو اور جسقدر علمی تحریکین قوت سے فعل مین آرہی ہین وہ سب کی سب ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقرر کردہ معیار پر چلائی جاتی ہین۔ فروعات مین اگر کوئی اختلاف ہو تو وہ چندان قابل وقعت نہین۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی مساعی جمیلہ اور اُن کے کار آمد

نتائج کا اعتراف کرینگے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اُن کے اہتمام سے جسقدر بھی کتابین نکلین وہ بجائے خود خوبیون کا مجموعہ ہونیکے سرتاپا مشرقی رنگ مین تھین اور مغربی خصوصیات سے وہ بالکل بے تعلق اور علیحدہ تھین اور شاید یہی سبب ہے کہ اس زمانے مین جبکہ خیالات کی رَو ایک دوسرے جانب کو جارہی ہے، طوطا کہانی، باغ و بہار، بیتال پچیسی کے صفحات ہمارے لیے مستقل دلچسپی اور دلبستگی سے قطعاً خالی نظر آتے ہین۔

علم ادب اُردو کی شاندار شہ نشین مین جس نئے ستون کی کمی تھی وہ در اصل پنجاب کے نامور ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ کے ہاتھون اضافہ ہوا۔ ہمارا مطلب اس سے یہ ہے کہ مغربی لٹریچر سے مشرقی طبائع کو مانوس کرنیکی اہم لیکن دشوار خدمت سب سے پہلے کرنل موصوف نے اپنے ذمہ لی ہے اور انصافاً کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے خزانہ ادب مین جسقدر نئی نئی چیزین یورپ وغیرہ سے لاکر رکھی گئی ہین وہ سب اُنھین کے حُسن تدبیر کا نتیجہ ہے۔

یہ بات بھی اکثر دیکھی گئی ہے کہ ابتدا مین خواہ کوئی کام کتنا ہی مشکل کیون نہو لیکن اگر اُسکی تحریک جاری رہے تو باوجود خارجی اسباب کے مخالف و متضاد ہونیکے کچھ نہ کچھ آدمی ہاتھ بٹانے والے پیدا ہوجاتے ہین خصوصاً ایسی حالت مین کہ وہ کام سربسر اُنھین لوگون کے فائدہ کا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہین کہ کرنل ہالرائڈ کی تحریص و تشویق نے اُنکے گرد ایسے بہت سے آدمی جمع کردیئے تھے جو پہلے پہل اُن کے مددگار تھے لیکن آخرکار وہ اُردو لٹریچر کے اول محسنون مین شمار ہونے لگے۔ انہین پروفیسر آزاد اور مولانا حالی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہین۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جبتک کسی تحریک کا آغاز نہین ہوتا اُسکی مخالفت اور موافقت ہونا یا اُسکی ترقی کے اسباب کا فراہم کرنا ایک غیر یقینی امر ہوتا ہے لیکن جب تحریک چل نکلتی ہے تو یہ باتین خودبخود پیدا ہوجاتی ہین۔ یہ بھی کچھ خدا ہی کیطرف سے ہوتا ہے کہ مفید اور نفع رساں کامون کے ہمدرد بسا اوقات اُس طبقے سے نکل کھڑے ہوتے ہین جن سے اسکی خواب مین بھی توقع نہین ہوسکتی۔ اسی جگہ دیکھ لیجیے اُردو علم ادب مین جتنی نئی نئی چیزین آپ کو ملین گی وہ تقریباً سب کی سب ایسے لوگونکی محنت شاقہ کا ثمرہ ہونگی جنھین اپنی عمر کا معتدبہ حصہ قدیم تعلیم و تربیت کے نذر کرنے کے علاوہ یورپ مین علم ادب وغیرہ سے آگاہی حاصل کرنیکا موقع تک نہین ملا۔ مولنا آزاد، مولوی حالی، پروفیسر ذکاءاللہ، مولوی نذیراحمد، نواب محسن الملک، انہین سے کون بزرگ کس کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور کسے یورپ جاکر یا ہندوستان مین بیٹھکر مغربی خیالا پر عبور کرنیکی نوبت آئی تھی لیکن یہی لوگ ہین جنکے زور قلم نے اُردو ادب کی کایا پلٹ دی اور یہی وہ مبارک نفوس ہین جنکی زبردست دماغی کاوشون نے اُردو لٹریچر کی تاریخ مین ایک شاندار اور روشن باب کا اضافہ کیا ہے۔

بہرکیف اسے اتفاقی بات سمجھو یا کسی خاص سبب کا لازمی نتیجہ کرنل ہالرائڈ نے جو پودھا نصب کیا تھا اُسکے سینچنے والے بہت جلد کئی ایک پیدا ہوگئے اور گو ابھی تک اس پودھے مین پورے طور پر پھل نہین آئے لیکن کوئی یہ بھی نہین کہ سکتا کہ یہ خشک ہوجائیگا۔ سرسید، آزاد، حالی، مہدیعلیخان، چراغ علی، شبلی، ذکاءاللہ، نذیراحمد سبھون نے اپنا پسینہ اس ہونہار نہال کی آبیاری مین صرف کیا اور اُسکی نشوونما کا سامان بہم پہنچایا۔ مذہبی و ملکی، ادبی، معاشرتی، تاریخی، سوانحی مضامین و کتب جو ان حضرات کے قلم سے نکلے اس درخت کی مختلف شاخین سمجھی جاسکتی ہین۔ ان مضامین پر ان بزرگان قوم نے جو کچھ لکھا خوب اور بہت خوب لکھا کہ اخلاف کے لیے اُنکی یہ کتابین نمونہ کا کام دیتی ہین لیکن ابھی ایک چیز کی کمی تھی یعنی جدید اُصول پر قصے اور فسانے لکھے جانے کی ضرورت تھی۔ گو یہ ضرورت ایک

حد تک مولٰنا نذیر احمد کی بعض کتابوں از قسم مراۃ العروس وغیرہ سے پوری ہو گئی تھی لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ کتب عورتوں کیلئے لکھی گئی تھیں اور اسلئے عمداً انمیں بعض اُن اُصول سے احتراز کیا گیا تھا جو مغربی ناولوں کے بنیادی پتھر تسلیم کیئے جاتے ہیں۔

اس مسئلہ پر رائے زنی کرنا تحصیل حاصل ہوگا کہ اُردو میں قصہ نگاری کا قدیم رنگ کیا تھا کیونکہ جو لوگ اُردو جاننے اور پڑھنے والے ہیں ممکن نہیں کہ اُنھوں نے خود طلسم ہوشربا، بوستان خیال، یا فسانۂ عجائب کی بعید از خیال اور خلاف عقل و قیاس سرگذشتوں کا مطالعہ کیا ہو یا کم از کم اُنکی حالت سے آگاہ نہوں۔ اِن کتابوں کے مصنفین کی جدت اور مضمون آفرینی میں کسکو شک ہو سکتا ہے لیکن اسکے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ یہ فسانے اصلیت سے خالی تھے اور اسوجہ سے اُن سے وہ کام نکل سکا جو یورپ میں آج ناولوں کے ذریعہ سے ہو رہا ہے۔ وہاں ان ناولوں اور قصوں سے اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی فوائد حاصل ہوئے اور ہو رہے ہیں اور ہمارے یہاں اِن پُرانے افسانوں سے صرف تفریح طبع مقصود سمجھی جاتی رہی ہے۔ اِسی شوق نے جو زیادہ تر اُمرا اور حکمرانوں کے دلوں میں جاگزین تھا ہمارے یہاں داستان گویوں کی ایک خاص جماعت پیدا کر دی تھی جسکے "باقیات الصالحات" آج بھی ہندوستان کی اسلامی دیسی ریاستوں میں اپنے اسلاف کے کمال کا عملی ثبوت دینے کے لیے موجود ہیں۔ لیکن اب ان باتوں میں کوئی لطف نہ رہ گیا تھا اور خیالات اور مذاق کے تغیرات کے ساتھ ضروری تھا کہ اِس صنف خاص میں بھی کچھ مسالہ اُن لوگوں کی ضیافت طبع کی غرض سے مہیا کیا جاتا جن کا وجدان صحیح دیو، جن، بھوت، پریت کے دور از خیال اور غیر سبق آموز قصص میں کوئی دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ اِس اہم ضرورت کی تکمیل کا احساس سب سے پہلے پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کو ہوا اور وہی اُردو کی جدید طرز کی فسانہ نگاری کے موجد ہیں۔ ہم اوپر کسیقدر حیرت و استعجاب سے اس امر کا اظہار کر چکے ہیں کہ اُردو زبان کے اولین مصلحوں میں ہمیں جتنے نام نظر آتے ہیں وہ سب کے سب قدیم تعلیم و تربیت کے نمونے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ بھی پُرانے زمانے کی یادگار تھے۔ انمیں اتنی بات ضرور تھی کہ وہ انگریزی بھی جانتے تھے اور غالباً مطالعہ کے زور سے اُسمیں مہارت کامل پیدا کر لی تھی۔

یہ امر ابھی تک مابہ النزاع ہے کہ جدید فسانہ نگاری میں اولیت کا سہرا شرر کے سر ہے یا سرشار کے؟[1] قدر دانان اُردو کے دو گروہ ہو گئے ہیں ایک شرر کی فضیلت کا مدعی ہے دوسرا سرشار کی۔ ہمارے یہاں اُصولی اور علمی بحثوں میں بھی ذاتیات تک نوبت آجاتی ہے ورنہ اِس قسم کے مسائل پر رائے زنی کرنا نہ صرف دلچسپی کا موجب ہوتا ہے بلکہ مفید بھی کیونکہ کسی زبان کی تاریخ ان واقعات کے فیصلہ کُن تصفیہ کے بغیر کسی طرح مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ بہر حال یہ بحث ایک عرصے تک جاری رہی اور دونوں گروہ اپنے اپنے عقائد کی تائید عقلی و نقلی دلائل سے کرتے رہے ہم کو اسجگہ "سرشار و شرر" کے قضیے کو از سر نو تازہ کرنا منظور نہیں لیکن ہماری ذاتی رائے اِس باب میں یہ ہے کہ اگر مولینا حکیم برہم کی منطق کی رعایت سے یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ "فسانۂ آزاد" جو سرشار کی شہرت علمی کی بنیاد ہے بعض اسباب سے جدید طرز کے ناولوں کی فہرست میں جگہ پانے کا مستحق نہیں تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ سرشار اُصولاً اُردو ناول نویسی کے موجد ضرور ہیں۔ اِس سے ہمارا منشاء یہ ہے کہ سرشار سب سے پہلے ہندوستانی فسانہ نگار ہیں جنھوں نے اُردو قصوں

[1] مولوی عبد الحلیم صاحب شرر خود سرشار کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ مصرع

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ

اور یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ جدید فسانہ نگاری میں اولیت کا سہرا سرشار کے سر ہے۔ (اڈیٹر)

کو مافوق العادت واقعات سے لبریز کرنیکی جگہ اُنمین اصلیت کا رنگ پیدا کیا ہے۔

سرشار کی اوّلین تصنیف جس نے دُنیائے ادب مین اُنکی ناموری وعظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے ہین "فسانہ آزاد" ہے۔ اُسکو اُردو قصص اور ناولوں مین باعتبار مضمون کے وہی درجہ حاصل ہو جو انگریزی مین "ڈون کوکزاٹ" کو ہو۔ فسانہ کی شان نزول بھی یہی ہو کہ سرشار کے کسی دوست نے اس طرز کی کتاب تصنیف کرنیکی فرمائش کی تھی۔ سرشار نے مستقل کتاب مرتب کرنے کی جگہ پہلے جداگانہ مضمون کی حیثیت سے اسے اودھ اخبار مین چھپوانا شروع کیا اور جب اُنھین معلوم ہو گیا کہ پبلک کو اُس سے بے انتہا دلچسپی پیدا ہو گئی ہو تو اُسے کتابی شکل مین شائع کر دیا۔

"فسانہ آزاد" مین جدید وقدیم رنگ کی آمیزش اس تناسب کے ساتھ لگئی ہو کہ دونون مذاق کے لوگ اُسے پسند کرتے ہین۔ ہم اسجگہ فسانۂ آزاد کی خصوصیات کو نمبروار قلمبند کرنا چاہتے ہین:۔

۱۔ سب سے پہلی اور مفید ترین خصوصیت "فسانہ" کی یہ ہو کہ اُس مین جسقدر واقعات ہین وہ سب کے سب بلا استثنار انسانی طاقتون سے تعلق رکھتے ہین۔ ہمارے پُرانے قصّون مین روحانی تصرفات کا منظر بہت دلکش الفاظ مین پیش کیا جاتا تھا لیکن یہی ایک بات ایسی تھی جو قصّے کو صرف قصہ کی وقعت دلاتی تھی نہ اُس سے اخلاق وآداب پر کوئی اثر پڑتا تھا، نہ کوئی تاریخی یا تمدنی منافع مرتب ہوتے تھے، اور نہ کسی معاشرتی یا منزلی نتائج کا استنباط ہوتا تھا کیونکہ جب پڑھنے والا یہ سمجھے کہ اِس کتاب کا ہیرو محض روحانی طاقتون کی بدولت اپنی مشکلات سے عہدہ برآیا اپنے مقاصد مین کامیاب ہوا تو اس سے اُسکی ہمت وجرأت واستقلال مین کوئی اضافہ نہین ہو سکتا کیونکہ وہ جانتا ہو کہ مُہر سلیمانی یا الہ دین کے چراغ کا حاصل کرنا انسانی طاقت سے قطعاً خارج ہو لیکن اگر اُسکی کامیابی اور مقصدوری خود انسانی کوششون کا نتیجہ ثابت کی جائے تو یقیناً اُس کے عزم اور ارادے بلند ہون گے اور وہ یہ خیال کرے گا کہ اس شخص کی طرح مین بھی اپنے دماغ اور ذہن سے کام لیکر مقصدور ہو سکتا ہون۔

۲۔ دوسری خصوصیت فسانہ کی یہ ہو کہ اسمین جسقدر باتین لکھی ہین وہ ایسی ہین کہ اُنکی اصلیت سے کسی کو انکار کی جرأت نہین ہو سکتی۔ کوئی منظر کوئی سین، کوئی واقعہ ایسا نہین دکھایا گیا جسکی ہوبہو تصویر نہ کھینچدی ہو۔ مثال کے لیے "فسانۂ آزاد" کے ابتدائی صفحات دیکھیے جہان آزاد کتب وغیرہ کی سیر کرتے اور وہان کی کیفیت بامعان نظر دیکھتے پھرتے ہین۔ یہ حالات مطالعہ کیجیئے تو ممکن نہین کہ وہی سمان آنکھون کے سامنے پھر نہ جائے۔

۳۔ ناول کی کئی قسمین ہین، کسی مین کوئی تاریخی واقعہ درج ہوتا ہو، کسی مین رسم ورواج کی کیفیت دکھائی جاتی ہو، کوئی کسی خاص زمانے کی عام معاشرتی وتمدنی حالت کا آئینہ ہوتا ہو۔ فسانہ آزاد اُس وقت کی لکھنؤ کی سوسائٹی کا دلچسپ ترین مرقع ہو۔ سرشار کی دو ایک اور تصانیف (سیر کہسار وغیرہ) اِس خصوصیت کی مشترکہ طور پر حصہ دار ہین۔ سرشار لکھنؤ مین پیدا ہوئے۔ محمد شاہ کا زمانہ تھا اور یہ زمانہ عروج کا تھا۔ لیکن اسلامی سوسائٹی مین جہان تک اُسکا تعلق اودھ سے ہو دلفریب خوبیون کے ساتھ بعض قابل اصلاح عیوب بھی موجود تھے، اور تعجب معلوم ہوتا ہو کہ اِن باریک باریک باتون کو جن پر اکثر خیال بھی نہین جاتا سرشار نے نہایت غور وخوض سے دیکھا اور جانچا۔ اُنھون نے کسی پر کوئی اعتراض نہین کیا، کسی قسم کا الزام نہین لگایا، لیکن محاسن کے ساتھ معایب کا ذکر اس انداز سے کر گئے ہین کہ نکتہ سنج طبائع اُن کا منشا فوراً دریافت کر لیتی ہین۔

۴۔ اُردو نثر مین بیگمات کی زبان خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہو اور اس امر خاص مین دہلی اور لکھنؤ والے دونون ہمنوا ہین کہ جس

محاورے کا ثبوت محلات کی گفتگو سے نہ ملے وہ قابل سند نہیں۔ یہ ایک جُداگانہ بحث ہو ورنہ ہم اسکے متعلق کچھ عرض کرتے۔ لیکن اسمین کلام نہین کہ بیگمات کی زبان کی نقل ہر شخص آسانی سے نہین اُتار سکتا۔ آجتک صرف دو چار آدمی ایسے گذرے ہین جنھون نے اس مین کمال کر دکھایا ہو اور انمین سرشار یقینی طور پر ممتاز ہین۔ اسکا ثبوت "فسانۂ آزاد" اور "سیر کہسار" کے صفحے صفحے سے ملتا ہو۔ وہی الفاظ، وہی محاورے، وہی لب ولہجہ، وہی انداز تقریر، وہی لوچدار باتین، وہی فصاحت، وہی لطافت، گویا آپ اپنے کانون سے کسی خاتون کو گفتگو کرتے ہوئے سن رہے ہین۔

پردہ نشین مستورات کی زندگی مغرب کی نگاہوں اور اُن لوگون کی نظرون مین جو اسلامی طرز معاشرت سے واقفیت نہین رکھتے ایک سربستہ راز بنی ہوئی ہو لیکن سرشار کے فسانۂ آزاد مین اسکے چہرے سے پردہ اُٹھا دیا گیا ہو۔ اور کم از کم لکھنؤ کی بیگمات کی سوسائٹی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہو وہ صحیح اور بالکل صحیح ہو۔ تعجب معلوم ہوتا ہو کہ جو کام ایک مسلمان اہل قلم عمدگی کے ساتھ نکرتا وہ سرشار نے کرکے اپنی واقفیت کا ثبوت دیا ہو۔ یہ وصف اُسی شخص مین ہو سکتا ہو جسے اپنی آنکھوں سے محلات کی زندگی کا طور طریق دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ کہا جاتا ہو کہ سرشار کو ایسے مواقع خوش نصیبی سے ملے تھے۔ پڑوس مین مُسلمانون کے مکانات تھے۔ اُس زمانہ مین ہندو مسلمانون کے تعلقات بالکل برادرانہ تھے۔ سرشار کو اپنی عمر کے ابتدائی حصے مین ان گھرونمین جانے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا اور یہی تجربہ اور مشاہدہ ہو جو اُن کی تصویر مین اصلیت کا رنگ پیدا کرنیوالا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہو کہ اس مرقع مین بعض نقش و نگار خیالی اور فرضی ہین، مثلاً حسن آرا اور سپہر آرا کی آزادانہ معاشرت اور ان کے ساتھ آزاد کے تعلقات کا اسدرجہ بے تکلف ہونا۔ یہ باتین بہت قبل از وقت ہین اسیطرح آزاد کو اُن کی محبوبہ کی جانب سے جنگ مین شریک ہو کر داد مردانگی دینے کی صلاح ایک ایسا فعل ہو کہ تاوقتیکہ عورتونکی تعلیم و تربیت باقاعدہ طریقے سے اُصولاً نہو وہ اس قسم کے جذبات کو کبھی اپنے دلمین جگہ نہین دے سکتین۔ تاہم تصویر کا یہ رُخ گویا اس بات کا شاہد ہو کہ آزادی نسوان کی جو مساعی آجکل بعض اسلامی حلقون مین ہو رہی ہین اگر یہ کامیاب ہوئین تو تقریباً ایک صدی کے بعد مخدرات اسلام کی معاشرت منزلی یا جذبات اخلاقی مین جو تغیر ہوگا وہ غالباً اسی قبیل کا ہوگا۔

۵۔ زبان کی خوبیون کا ایک پہلو اوپر دکھانیکے بعد صرف اسقدر کہنا رہجاتا ہو کہ بیگمات کی گفتگو سے قطع نظر دوسری صورتون مین بھی فسانۂ آزاد کے مصنف نے اپنے اشخاص افسانہ کے طرز کلام کی نقل اُتارنے مین کمال کر دکھایا ہو۔ مُلا اور واعظ سے افیونی اور سرائے کی بھٹیاری تک کی بول چال اس صفائی سے دکھائی گئی ہو کہ باید و شاید۔

۶۔ یہی مکالمون کا حال ہو۔ ناول نویس کے لیے یہ منزل بہت دُشوار گذار ہوتی ہو کیونکہ اُسے اپنا مافی الضمیر دوسرون کی زبان سے اسطرح ادا کرنا پڑتا ہو کہ سُننے والونکو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ متکلم اور مخاطب کے درمیان کوئی توسل اور بھی ہو۔ سرشار اس دقت پر بھی بخوبی اسلوبی غالب آئے ہین اور اُنھون نے اس راستے کو اسطرح طے کیا ہو کہ کسی جگہ تکان کے آثار نہین پائے جاتے۔

۷۔ سرشار کے فسانہ کے کیرکٹر بولتے ہوئے ہین اور یہ صفت بھی بہترین ناولون کا حصہ سمجھی جاتی ہو۔ آزاد اور خوجی پر اُن کا طبعی رنگ اتنا گہرا ہو کہ وہ جہان کہین اور جس جگہ بھی نظر آتے ہین دور سے شناخت ہو جاتے ہین

آزاد اور خوجی کی جو شہرت اب علمی و ادبی دُنیا مین پائی جاتی ہے اُسکی مثال الف لیلہ کے خاص خاص کیرکٹرون کے سوا اور کسی کو نصیب نہین ہوئی۔ یہ بھی سرشار کے باکمال ہونے اور اُنکی تصنیف کے قبولیت عامہ کا فخر حاصل کرنیکی ایک واضح دلیل ہے۔

۸۔ اسمین شک نہین کہ تاریخی ناول فن فسانہ نگاری کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہو لیکن بسا اوقات اُسمین صحیح اور مستند واقعات کے ساتھ

عشق و محبت کی سرگزشت کا فرضی پیوند لگایا جاتا ہو جس سے اصل کتاب پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہو۔ البتہ یہ نقص اُن ناولون مین نہین ہوتا جنمین کسی خاص ملک، قوم ملت، یا کسی خاص وقت کے مراسم اور رواج یا سوسائٹی کی عام حالت دکھائی جاتی ہو۔ اس قسم کی تصانیف ہر زمانہ مین دلچسپی کی چیز سمجھی جاتی ہین کیونکہ اُن کے ذریعے سے سچے حالات بلافرق معلوم ہونے کی وجہ سے آنیوالی نسلین بھی اُن سے دلچسپی لے سکتی ہین اور اسطرح کتاب کی عمر غیر محدود ہوتی ہو۔ سرشار کا فسانہ اور سیر کہسار اسی قسم کے ناول ہین جنمین اگر واقعات سب فرضی ہین لیکن اُنھین گرد و پیش کے جن حالات و واردات کے ساتھ منسلک کیا ہو اُن کے صحیح اور دلچسپ ہونے مین کلام نہین جسطرح ہم ان کتابون کے مطالعہ سے لکھنؤ کی قدیم سوسائٹی (جسکی کچھ جھلک اس زمانے مین بھی وہان پائی جاتی ہو) کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتے ہین۔ اسیطرح آئندہ زمانے مین بھی اگر کسی کو یہ شوق ہوا تو اُس کیلئے معلومات کا بہترین ذریعہ فسانۂ آزاد یا اسی قسم کا اور لٹریچر ہوگا۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد غالبًا سب کو اعتراف ہوگا کہ "فسانہ" کا شمار جائز استحقاق کے ساتھ کم از کم اُردو کی اُن زندہ جاوید کتابون مین ہونے کے لائق ہو جو اپنی مستقل دلبستگی اور دوامی مفاد کے سبب خاص و عام سے قبولیت کا سرٹیفکٹ لیکر مدت مدید تک رائج پذیر رہتی ہین۔ اس قسم کی تصانیف مصنف کیلئے عمومًا سرمایۂ ناز ہوتی ہین اور اس لحاظ سے اگر سرشار کو فسانۂ آزاد پر فخر ہو تو کچھ نازیبا نہین۔

اکثر معترضین کا خیال ہو کہ بہت سے محاسن کے ساتھ فسانۂ آزاد مین چند عیوب بھی ایسے موجود ہین جو نظر انداز نہین ہو سکتے مثلًا کتاب کی ضخامت اسقدر ہو کہ طوالت بعض مرتبہ مطالعہ کی دلچسپی کو کم کر دیتی ہو۔ اسیطرح مضامین اور واقعات کا غیر مسلسل ہونا بھی اُصول تنقید کے لحاظ سے قابل اعتراض ہو۔ بعض اہل نظر فسانۂ آزاد کو حد بذلہ نویسی کا نمونہ ہی نہین سمجھتے۔ یہ باتین ایک زمانہ تک معرض بحث مین رہ چکی ہین اور یہان اُن کا اعادہ تحصیل حاصل ہوگا۔

فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار کی اور تصانیف بھی ہین لیکن درحقیقت اُن کا علمی امتیاز فسانۂ آزاد سے قائم ہوا ہو۔ تصنیفات مابعد مین سے سیر کہسار، جام سرشار اور کامنی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہین لیکن انمین سے کوئی فسانہ کے رتبہ کی نہین۔ سیر کہسار تک تو خیر لیکن اسکے بعد شاید ضرورتًا اُنھین ایسی کتابین لکھنا پڑین جو عمومًا "بھرتی" کے لقب سے یاد کیجاتی ہین۔ پی کہان، ہشو، بچھڑی ہوئی دُلھن وغیرہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ قلم برداشتہ لکھی گئی ہین۔ اِن سے تفریح کے سوا اور کوئی فائدہ نہین متصور ہو سکتا۔

ایک رائے سرشار کی کتابون کے متعلق یہ بھی ہو کہ اُن کے تمام ناولون مین فسانۂ آزاد سے لیکر "ہشو" اور "پی کہان" تک ایک ہی قسم کی سوسائٹی کا رنگ دکھایا ہو اور ایک ہی طرح کے کیرکٹر پیش کیئے گئے ہین۔ یہ خیال بالکل صحیح ہو لیکن اسکی وجہ یہ تھی کہ جس معاشرت کی تصویر اُنھون نے دکھائی ہو اُسکے اور صرف اُسی کے خط و خال سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اگر دوسری راہ وہ اپنے لیے نکالتے تو شاید اُنھین بھی اس قسم کے الزامات کا ہدف بننا پڑتا کہ

عرب مین دہشتون کا کیا ذکر یا

مغربی ہیروئین کی سیاہ اور چلیدار زلفین کہان۔

ہمارے خیال مین اگر سرشار تاریخی ناولون کی طرف توجہ کرتے تو غالبًا اپنی قابلیت سے اُسمین بھی مرد میدان ثابت ہوتے لیکن یہ رنگ اُن کے طبعی مذاق کے بالکل مخالف تھا اور ابتدا اُنھین اس دشوار گذار گھاٹی کے طے کرنے مین ناقابل بیان مشکلات کا سامنا ہوتا اور انیر غالبًا اسکے بعد بھی یقینًا اُنھین پبلک مین یہ رسوخ نہ حاصل ہوتا جو فسانۂ آزاد کیوجہ سے ہوا۔

کسی کتاب یا کسی مصنف کی تصانیف کی قدر و منزلت یہ دیکھنے سے بھی معلوم ہو سکتی ہو کہ اُس کتاب یا اُن کتابونکی وجہ سے اُس زبان کے عام علم ادب پر کیا اثر پڑا۔ سرشار نے ناول نویسی کی جدید شاہراہ دکھا کر اُردو اہل قلم کا ایک معقول گروہ اُسپر چلنے کیلئے تیار کر دیا ہو اور اب جسقدر نئے ناول لکھے جاتے ہین وہ اُصولی طور پر سرشار کے نمونے پر ہوتے ہین۔ اُصول سے ہمارا یہ مطلب ہو کہ اگرچہ سین، پلاٹ، اور واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے بعض جدید ناول فسانۂ آزاد سے افضل ثابت ہوئے ہین، لیکن فی الحقیقت یہ فسانۂ آزاد کے اتباع و تقلید سے اس لئیے باہر نہین کہے جا سکتے کہ سب سے پہلے فسانۂ آزاد ہی نے جدید قصہ نویسی کا نمونہ پیش کر کے دکھایا تھا کہ قدیم و جدید افسانو نمین مابہ الامتیاز فرق کیا ہو اور فطرت انسانی کے کارنامے کس طرح آشکارا کرنا چاہئیے۔ بہرحال اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ سرشار کی تصنیفات نے اُردو کے فن افسانہ نویسی کو خاص تقویت پہنچائی ہو اور اسکا اعتراف تو اُن لوگون کو بھی ہو جو سرشار کو اس عزت کا مستحق نہین سمجھتے جو انھین ملک نے دے رکھی ہے۔

جدید طرز کے افسانون کے ماسوا سرشار کی علمی خدمات کی تفصیل کچھ اور بھی ہو جسے ہم اختصار کے ساتھ اس جگہ قلم بند کرین گے۔ سب سے پہلے اُن کے مضامین مراسلۂ کشمیر اور اودھ پنچ وغیرہ مین نکلتے اور مقبولیت حاصل کرتے رہے۔ سنہ ۱۸۷۸ء مین اُنھون نے علم طبیعیات کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کر کے شمس الضحیٰ نام رکھا۔ انگریزی اُنھون نے کیننگ کالج لکھنؤ مین پڑھی تھی اور گو وہ کسی امتیازی ڈگری کے مالک نہ تھے لیکن ذاتی لیاقت اس پایہ کی تھی کہ شاید ہر قسم کا کام وہ انگریزی مین کر سکتے تھے۔ ایڈوکیٹ اور پاینر مین اُن کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ مراسلات ڈفرنیہ کے نام سے اُنھون نے لارڈ ڈفرن کے خطوط کا ترجمہ بھی کیا ہو۔ یہ خطوط مطالب کے اعتبار سے بہت دقیق ہین اور اسکا صاف و صحیح ترجمہ خود اس بات کی دلیل ہو کہ سرشار کی قابلیت انگریزی دانی مین "فاضلانہ" ضرور تھی۔

عربی فارسی کی تعلیم اُسوقت شرفاے ہنود مین عام طور پر رائج تھی اور سرشار بھی ان دونون زبانون مین ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چار برس کی عمر مین انکے باپ پنڈت بیج ناتھ کا انتقال ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہو کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانیکے باوصف تعلیم اُنکی باقاعدہ ہوئی۔ اسکا ثبوت اُن کے علمی مضامین سے بھی ملتا ہو۔

سنہ ۱۸۷۸ء مین منشی نولکشور نے اودھ اخبار کا انھین ایڈیٹر مقرر کیا۔ اُنکے زمانے مین جو شہرت اور ہر دلعزیزی اس اخبار کو حاصل ہوئی، اُسکی نظیر اُسکی پچھلی اور مابعد کی زندگی مین نہین ملتی۔ خصوصاً جس زمانے مین فسانۂ آزاد باقساط اُسمین شائع ہوتا تھا اُسوقت اودھ اخبار کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی اور شاید یہ پہلی کامیابی تھی جو کسی اُردو اخبار کے حصہ مین آئی۔

اودھ اخبار سے قطع تعلق ہو جانیکے بعد وہ اپنا خاص رسالہ خُمکدۂ سرشار نکالنے لگے جسمین یہ التزام رکھا گیا تھا کہ اُسکے ہر نمبر مین ایک مکمل ناول نکلتا تھا۔ پی کہان، بچھڑی ہوئی دُلھن، اور رُقّم دہم اسی مین نکلے تھے۔

سنہ ۱۸۹۵ء مین جب مین حیدر آباد گیا تو حضرت سرشار وہان پہلے سے موجود تھے۔ مولٰنا عرشی جو دربار آصفی کے نامور فارسی گو شاعر گذرے ہین اُن سے سرشار کے روابط بہت بڑھے ہوئے تھے اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ مجھے بھی عرشی صاحب کے توسط سے اُن کی خدمت مین نیاز حاصل کرنیکا موقع بارہا ملا۔ عجیب طباع اور بذلہ سنج آدمی تھے جبتک بیٹھے رہتے حاضرین کو اپنی دلچسپ باتون سے محظوظ کیا کرتے ہز اکسلنسی مہاراجہ کشن پرشاد اُس زمانے مین وزیر افواج نظام تھے۔ اُن کے دولتکدہ پر حضرت سرشار رہتے تھے۔ مہاراجہ بہادر اُن پر بہت عنایت کرتے تھے۔ آخر دم تک سرشار پھر اُن سے جدا نہوے۔ حیدر آباد مین بھی حضرت سرشار نے اپنے علمی مشاغل کا سلسلہ از سرِ نو جاری کر لیا تھا

حضور نظام مرحوم کی سالگرہ کی یادگار مین دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام نثر اور نظم کے پرچے مہاراجہ بہادر کی سرپرستی مین حضرت سرشار کے اہتمام سے شائع ہوتے تھے۔ بالخصوص دبدبۂ آصفی ان کے مضامین سے لبریز رہتا تھا لیکن اکثر مضامین دوسرون کے نام سے چھپتے تھے تاہم طرز تحریر سے یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ اسکے مصنف حضرت سرشار ہی ہین۔

سرشار اسم بامسمیٰ سرشار تھے۔ آبِ آتشین سے اُنھین اس درجہ اُنس تھا کہ کسی وقت اُسکی کیفیت سے خالی نہوتے تھے۔ جہان کہین جاتے تو ملازم کے ساتھ ایک بوتل ضرور رہتی۔ مینوشی کا شغل اُن کی خلوت وجلوت کا رفیق تھا۔ اس بے اعتدالی نے جہان ایک طرف اُنکے قوائے جسمانی کو صدمہ پہنچایا وہان دوسری طرف اُنکے آفتابِ کمال کو بھی گہن لگا دیا تھا۔ قاعدے کی بات ہو کہ انسان جسقدر معمّر اور مسن ہوتا ہو اُسیقدر اُسکا ہنر پختگی پاتا جاتا ہو لیکن سرشار کی جُداگانہ کیفیت تھی جیسے جیسے وہ بڑھتے گئے ویسے ویسے اُن کے جوہر فن کی جلا ماند پڑتی گئی اور اگر بسبب غائر نظر سے دیکھا جاے تو سبسے قوی یہی ہوگا کہ اُنھون نے "بنت العنب" کو منھ لگا کر خود کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

سرشار کا اصلی نام پنڈت رتن ناتھ در تھا لیکن وہ زیادہ تر اپنے تخلص سے مشہور ہین۔ اسکے باوجود بہت کم لوگون کو معلوم ہوگا کہ فن شعر گوئی مین بھی اُنھین مہارت تھی۔ بیشک وہ شاعر تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے لیکن اُنکی علمی عظمت کی کفالت اُنکی دوسری تصانیف سے ہوتی ہو نہ کہ اُن کے چند متفرق اشعار یا دو ایک مختصر مثنوی اور نظمون سے جن کے کہین کہین کے اشعار اکثر لوگونکو یاد مین تحفۂ سرشار ایک مثنوی ہو لیکن اُس سے پختگی کلام اور رنگینی خیالات کا ثبوت کچھ زیادہ نہین ملتا۔ تاہم قیاس سے کہا جا سکتا ہو کہ اگر سرشار نے شعر گوئی کیطرف کچھ اور توجہ کی ہوتی تو وہ اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر ہوتے ایک شعر اُن کا یہ ہو۔ ناظرین مضمون کی نزاکت کا اندازہ کرین ؎

حال سب میری سخت جانی کا — باڑھ کھتی ہے مڑ کے خنجر سے

دو شعر اور دستیاب ہوئے ہین جو تبرک سمجھے جانے کے قابل ہین ؎

پینے پہ جب آتے ہین تو پھر بس نہین کرتے — میخانے مین سنتے نہین سرشار کسی کی

سیاہ بخت و تبہ روزگار ہم بھی ہین — جوابِ زُلفِ پریشان یار ہم بھی ہین

شاعری مین حضرتِ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ لیکن اُنکے اشعار گواہ ہین کہ اُنھون نے صنائع وبدائع کی پابندی مین اپنے اُستاد کی پیروی نہین کی بلکہ صاف اور شُستہ زبان کو ترجیح دی ہو۔ تحفۂ سرشار کی تمہید اسکے ثبوت مین پیش کیجا سکتی ہو جسمین کہتے ہین ؎

لندن کی پلا دو آتشہ مے — آ پیرِ مغان کدھر چھپا ہے

دو آتشہ پوا شراب اچھوتی — خوشبو خوش رنگ تیز جو بھی

سرخوش شرابِ ناب لائے — بوتل مُنھ سے مرے لگا دے

بدمست ہون پی کے ایک چلّو — زاہد کو بنائین خوب اُلّو

برسائے شراب ناب ساقی — دکھلا دے آفتاب ساقی

فتوے کا شتی کا کون مانے — لاکھون نہین یون کھلے خزانے

رم جھم یہ برس رہا ہے پانی — بے مے ہے حرام زندگانی

ساقی نامہ سرشار سے اچھا کون لکھ سکتا تھا جنکے گھر کی شراب لونڈی تھی۔ ظرافت کا مادہ اُن کی طبیعت مین کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اسکا رنگ اُن کی تمام تصانیف مین موجود ہو اور اوپر کا جو تھا شعر بھی اُنکی شوخ کلامی اور آزاد مشی کا ثبوت ہو۔ مندرجۂ ذیل شعرون مین صبح صادق کی کیفیت کس دلکش پیرائے مین دکھائی ہے ؎

جھلکا جھلکا سپیدۂ صبح — ہلکا ہلکا سپیدۂ صبح

تارے چھپتے ہین جھلملا کر — ہے نور سا جلوہ گر فلک پر

بھینی بھینی مہک گلونکی — اور نغمہ زنی وہ بلبلون کی

اے ساقی مہ لقا بدہ مے — اے مردِ خدا بخواب تا کے

وقتِ سحر اور خنک ہوا ہو — بے مے سب کر کرا مزا ہے

اِک چلّو کے دینے میں یہ تکرار | اُٹھو جاگو سحر ہوئی یار
مرغانِ چمن یہ نکتہ رانی | چون برہمنان بوید بوانی
نوبت رنگت جما رہی ہے | شہنائی مزا دکھا رہی ہے

بعض مختص المقام تشبیہین اور استعارے نہایت پُرلطف ہین مثلاً طیور کی خوش الحانی کی مشابہت برہمنون کی وید خوانی سے کس قدر کیفیت خیز ہے اسطرح "کاشی کا فتوی" جو کہین بگذر چکا ہے نئی چیز ہے اور لطف سے خالی نہین۔ اگر ہندو شعراء اپنے مذہبی اور قومی خصوصیات کو اسطرح اُردو تلمیحات و استعارات مین داخل کر سکین تو یقیناً عجیب دلپسند اضافہ ہوگا۔

اسی مثنوی مین ہندوستان کی گزشتہ عظمت کا فوٹو ان الفاظ مین پیش کیا ہے ؎

اَب ہند مین کیا رہا ہے بھائی | فریاد ہے ہند وُو دُھائی
مصری اسی باغ کے تھے اِک گل | شاگرد تھے ہند کے جزو کل
اِک پھول اسی چراغ کے تھے | اِک بوند اسی ایاغ کے تھے
سقراط سے لیکے تابہ لقمان | طفل مکتب تھے اہلِ یونان
آگے اسکے زمین سے تا مہ | سب کرتے تھے زانوئے ادب تہ
رامائن مین دکھائے وہ ڈھنگ | ہومر کا بھی جم سکا نہ کچھ رنگ
رنگت ملٹن کی بھی ہے پھیکی | سُبحان اللہ والمیسکی
کالیداس آن خدائے بینش | سرمایہ ناز آفرینش
جھنڈے بید کی مین بھی گڑے تھے | یونانی جیب مین پڑے تھے
دعوی جس کو ہو جان مل کا | دیکھے وہ فلسفہ کپل کا

وہ علم وہ فضل اَب ڈبویا
جو کچھ سیکھا تھا سب وہ کھویا

غزلیات کہنے کے سرشار معمولاً عادی نہ تھے لیکن اکثر ان کے زمانہ حیات مین انھین کے اہتمام سے بمقام حیدرآباد مہاراجہ شاد بہادر کی ڈیوڑھی مین مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سرشار خود تو کچھ نہ کہتے تھے لیکن مقامی شعرا کو اصرار کے ساتھ شرکت کے لیے مدعو کرتے تھے اور ان کی خاطر سے اکثر مشاہیر کو وہان جانا پڑتا تھا اور اسطرح مشاعرے نہایت رونق سے ہوا کرتے تھے۔

تاہم کچھ تو شاید اس وجہ سے کہ حیدرآباد مین اُنھین باوجود علمی مذاق کی کثرت کے اپنے ہم خیال نہ مل سکے اور کچھ اس وجہ سے کہ شراب خانہ خراب نے اُن کو زیادہ تر گوشہ نشینی کی زندگی پر مجبور کر دیا تھا اُن کے دم سے وہان وہ علمی چرچا نہ ہونے پایا جس کی اُمید سرشار ایسے مشہور انشا پرداز کی موجودگی سے بہر صورت ہو سکتی تھی۔ خود محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفی جو ایک معنی مین اُن کے ذاتی رسالے تھے اُن کی عدم توجہی سے کچھ زیادہ ہر دلعزیز نہ ہو سکے مضامین وغیرہ کے اعتبار سے بھی وہ بہت کم رتبہ تھے البتہ کبھی کبھی کوئی مضمون ایسا نکل جاتا تھا جس کی طرز بیان کہہ اُٹھتی تھی کہ یہ حضرت سرشار کی جودت طبع کا نمونہ ہے۔

حیدرآباد اُنھین موت کھینچکر لیگئی تھی اور وہ پھر وہین کے خاک کے پیوند ہوئے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد مین اس خبر نے حیرت و استعجاب کی ناقابل بیان کیفیت پیدا کر دی تھی کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار مرگِ ناگہانی کے شکار ہوئے۔ چونکہ اِس سے پہلے اُن کی علالت کا حال بھی کسی کو نہ معلوم ہوا تھا اس وجہ سے غیر متوقع انتقال سے سب کو سکتہ سا تھا۔ بہر کیف جس مٹی مین امیر و داغ کی ہڈیون کا پیوند ہونا مقدر ہو چکا تھا وہی سرشار ایسے اہلِ کمال کا بھی مدفن بنی ؏

خدا بخشے بہت سی خوبیان تھین مرنے والے مین

سید محمد فاروق

میر تعشق لکھنوی

خواجہ آتش اور شیخ ناسخ کے کارنامے اُردو شاعری کی تاریخ مین ایک یادگاری چیز سمجھے جاتے ہین۔ اسلیے کہ انھین ذی حوصلہ نفوس کی بدولت لکھنو دہلی کی تقلید سے آزاد ہوا اور بجائے خود ایک مرکز بن گیا۔ اگرچہ یہ امر ابھی تک مابہ النزاع ہے کہ دہلی سے علٰحدہ ہوکر لکھنو نے جو رنگ اختیار کیا وہ کس حد تک ادبی و علمی نقطۂ خیال سے فن سخن اُردو کے لیے مفید ثابت ہوا تاہم اس واقعہ کے مہتم بالشان ہونے مین شبہ نہین لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو لکھنو کے مرثیہ گو شعرا نے جو کام کیا ہے وہ آتش و ناسخ کی خدمات سے کہین زیادہ مستحق ستایش ہے۔ اُردو شاعری مین مرثیہ گوئی کی گری ہوئی حالت کا اندازہ کچھ اس ضرب المثل سے ہو سکتا ہے جسکا استعمال انیس و دبیر وغیرہما کی مساعی جمیلہ کے بعد تقریبًا ترک ہو گیا ہے۔ پیشتر "بگڑا شاعر" "مرثیہ گو" ہوا کرتا تھا لیکن مرثیہ گوئی اب ایک مستقل فن ہو گئی ہے اور کوئی شاعر جس مین خداداد ذہانت کے ساتھ ذاتی قابلیت بھی نہ ہو وہ مرثیہ گوئی کے تمام مراحل بہ خوش اسلوبی طے کرنے کی جرأت نہین کر سکتا۔ مختصر یہ ہے کہ لکھنو کے مرثیہ گویون نے نہ صرف اُردو شاعری کی شاخ مین ایک دلکش و دلفریب پھول کا اضافہ کیا ہے بلکہ اپنے وطن کے لیے بھی ایک مستقل اور پائدار نوعیت شہرت پیدا کر دیا ہی۔ میر تعشق کا نام نامی ان اساتذہ کی فہرست مین نہایت جلی حرفون مین لکھا گیا ہی جنھون نے میر انیس اور مرزا دبیر کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری گویا اپنا فرض سمجھ رکھا تھا اور اس فرض کے ادا کرنے مین اُنھون نے اپنی بیش بہا عمر کا سب سے زیادہ حصہ صرف کر دیا۔

میر تعشق مرحوم کی مرثیہ گوئی کوئی پوشیدہ بات نہین ہی لیکن اکثر شیدائیان ادب کو غالبًا اس سے آگاہی نہ ہوگی کہ انھین غزل گوئی مین بھی مہارت حاصل تھی۔ کارپردازان "معیار" کا خدا بھلا کرے کہ میر صاحب کی جستہ جستہ غزلیات کا ایک مختصر مجموعہ تیار کرکے شائقین کے مستفید ہونے کا سامان بہم پہنچا دیا ہی۔ ورنہ کوئی یہ بھی نہ جان سکتا تھا کہ تعشق نے سیکڑون مرثیون، سلامون، اور رباعیون کے علاوہ غزلین بھی کہی تھین، جن کے مطالعہ سے یہ عقدہ حل ہو سکتا ہی کہ غزل گوئی کا میدان بھی اُنکا مارا ہوا ہی۔ یہ ممکن ہی کہ ان کی غزلیات اُن تمام محاسن کا مجموعہ نہون جو اس صنف کلام کی خصوصیات مین داخل سمجھی جاتی ہین لیکن اسکے باوجود بھی کسی کو اُنکی قادر الکلامی اور طباعی مین شک کرنے کی گنجائش نہین۔ اس مختصر مضمون مین سب سے پیشتر اُنکے حالات بالاختصار قلمبند کیے جاتے ہین اور اسکے بعد اُنکے کلام پر ایک سرسری تنقیدی نظر ڈالی جائیگی۔ اور اصل غزلیات کے اقتباسات باخبر ناظرین کو بجائے خود اُنکی شاعری کے متعلق رائے قائم کرنے مین کافی سہولت پیدا کر دین گے۔

میر تعشق کا نام سید مرزا تھا اور سید صاحب کے نام سے بھی مشہور تھے

آپ کے والد محمد مرزا اُنس اساتذہ لکھنو مین غیر معمولی وقعت رکھتے ہین آپکے بھائی سید حسین مرزا عشق بھی جن کی روایات شاعری و مرثیہ گوئی کے علمبردار آجکل حضرت رشید ہین مستغنی عن التعریف ہین یہ لوگ بجائے خود آفتاب تھے جو آسمان شعر و سخن پر اُفق لکھنو سے طلوع ہوے اور اُردو کی دنیاے ادب کو اپنے نورانی شعاع سے ایک عرصہ تک منور رکھا حضرت اُنس مرحوم کا شمار ناسخ مغفور کے ارشد تلامذہ مین ہوتا ہے اور بجا ہوتا ہی۔ اسی طرح جناب عشق کی محققانہ قابلیت اور اجتہادی لیاقت آجتک ضرب المثل بنی ہوئی ہی۔ غرض کہ میر تعشق اُس مشہور خاندان کے ایک ممتاز رکن تھے جس کے اسلاف نے دنیاے شاعری مین غیر معمولی کارہائے نمایان کیے ہین اور جس کے اخلاف کو اس وقت تک اپنے ذی رتبہ اجداد کا نام روشن رکھنے کا فخر حاصل ہی۔ صاحب خمخانہ جاوید نے حضرت تعشق کو بھی جناب ناسخ کا تلمیذ رشید ہونا بیان کیا ہی لیکن اڈیٹر معیار جن کے ذرائع معلومات زیادہ تر مستند سمجھے جا سکتے ہین، دیوان تعشق کے دیباچہ مین اسکے متعلق کوئی حوالہ نہین دیتے۔ تاہم تعشق کی عزت و شہرت کا کفیل خود انکا کمال ہی نہ کہ سلسلۂ تلمذ۔ اس لیے دیکھنے کی بات صرف یہ ہی کہ انکا کلام کیسا تھا نہ یہ کہ وہ شاگرد کس کے تھے۔ اگرچہ یہ دریافت بھی خالی از دلچسپی نہ تھی کہ وہ کونسا چابکدست جوہری تھا جس نے اس در شاہوار کی آب و تاب اور جلا بڑھانے کی خدمت انجام دی۔

حضرت تعشق کے حالات زندگی اس درجہ کمیاب ہین کہ اُن کے دیباچۂ دیوان مین بھی جس مین نسبتہً تفصیلی کوائف کا مکمل ہونا ضروری تھا، چند معمولی باتون کے سوا کچھ نہین لیکن غور سے کام لیا جاے تو یہ منکشف ہوتا ہی کہ حضرت تعشق ایک قناعت پسند اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔ مذہبی رنگ اُن مین زیادہ تھا۔ شاید یہی سبب ہو کہ اُن کے تعلقات کے کسی سرکار دربار سے وابستہ ہونے کا ثبوت نہین ملتا۔ ورنہ کم از کم لکھنؤ مین بہت سے لوگ اس وقت بھی چشمدید حالات بیان کر سکتے تھے۔ آپ کی عمر کا معتدبہ حصہ کربلاے معلیٰ مین بسر ہوا لیکن خمیر لکھنؤ کا تھا۔ بالآخر یہین کی خاک مین پیوند ہوے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم کی اولاد معنوی آپ کے ضخیم و جسیم مجموعۂ مراثی ہین جن سے آپ کا نام قیامت تک قائم رہے گا۔ مجموعۂ غزلیات بہت مختصر ہے۔ بیان کیا جاتا ہی کہ آپ کی غزلیات کا بیشتر حصہ تلف ہو گیا ہی۔ جسکی صحت کے تسلیم کرنے کے بعد اُردو زبان کی شوم بختی کا اعتراف کرنا پڑتا ہی تاہم جو کچھ بھی موجود ہی وہ اسکا حق رکھتا ہی کہ اُردو کے ایک نامور شاعر کی یادگار کے طور پر وقعت و منزلت کی نظر سے دیکھا جاے۔

حضرت تعشق کا دیوان غزلیات جس کے وجود مین لانے کا شرف جناب آبر لکھنوی کے حصہ مین آیا ہی کم و بیش پینتالیس صفحات پر ہے جس مین سرورق اور دیباچہ کو بھی شامل سمجھنا چاہیے۔ ساحر صاحب کا یہ ارشاد قابل غور ہے:-

آپکے کلام کا زیادہ حصہ مرثیہ، سلام، رباعی کا ہی۔ غزل گوئی کم کی تاہم جس قدر بھی حصہ غزلیات کا ہی وہ کمیاب نہین بلکہ نایاب زمانہ ہی حسن اتفاق اور اُردو ادب کی خوش قسمتی سے ایک مجموعہ آپ کے کلام کا دستیاب ہو گیا جس کو ملک مین پیش کر کے مین بجاے خود نازان ہون کہ اگر کوئی مجھسے اُردو کی خدمت ہو سکی ہی تو وہ یہی ہی کہ مین اُس کلام کو پردۂ خفا سے باہر لایا جس پر لکھنؤ کی اُردو شاعری کو فخر و ناز ہے

ایک دفعہ رسالۂ معیار مین جناب عزیز لکھنوی نے حضرت عشق کی غزل گوئی کی تعریف ان الفاظ مین فرمائی تھی:-

"یہی وہ شاعر ہے جسکو ہم تمام خوشگویان اہل دہلی کے مقابل مین تن تنہا پیش کرتے ہین"

سطور بالا کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ لکھنؤ کے علم دوست شعرا حضرت تعشق کو کس نگاہ سے دیکھتے ہین۔ یہ ضرور نہین کہ اُنکا

یہ خیال قطعی طور پر صحیح ہو تاہم اس سے ایک حقیقت کا انکشاف یقینی ہوتا ہے جس مین مبالغہ کے ساتھ سچائی کو بھی تھوڑا بہت دخل ہے -

کلام تعشق پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈالنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ دو خصوصیتین اُسکا جزو لاینفک بنی ہوئی ہین - اول پُرگوئی اور دوسرے پختہ مشقی - شق اول کے متعلق صرف اسی قدر کہدینا کافی ہوگا کہ انکی بہت کم غزلین آٹھ - دس شعر یا اس سے کم کی ہین - ورنہ ساری غزلیات کافی طور پر طول ہین اور پھر لطف یہ ہے کہ اگر اُنکا طبیعی رنگ پیش نظر رکھا جائے تو ایک شعر بھی بھرتی کا نہین معلوم ہوتا بعض غزلون مین مقطع ندارد ہے لیکن اسکے باوجود بھی کسی غزل کی حیثیت اس قدر مختصر نہین کہ کوئی ستم ظریف غالب مرحوم کی طرح اُنھین بھی کم از کم مقطع کی عدم موجودگی کے سبب سے "صاحب دیوان" ہونے کی مشکلات سمجھائے - اس سے ایک قیاس اور بھی ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ نامکمل غزلین زیادہ طویل ہون یا ان زمینون مین دو غزلہ یا سہ غزلہ بھی کہا گیا ہو - اس "طول کلامی" سے اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ حتی الوسع دلپسند اور موزون قافیہ کوئی رہنے نہین پایا - ورنہ ناتجربہ کار شاعر بہترین قافیہ اول تو نکال نہین سکتے اور اگر خوش قسمتی سے ایسا ہوتا بھی ہے تو برجستہ بندش نہونے کے سبب اُس مین کوئی لطف نہین پیدا ہوتا -

پختہ مشقی کے متعلق صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ تعشق نے اپنے لیے جو رنگ پسند کیا اُس مین کسی قسم کی خامی نہین پائی جاتی - یہ سوال کہ اُنکا یہ رنگ بالعموم مطبوع ہے یا نہین جداگانہ پہلو رکھتا ہے جسکا جواب ضمنی طور پر دوران تنقید مین خود بخود ادا ہو جائیگا - تاہم اسمین شبہہ کی گنجائش نہین کہ لکھنؤ کے ایک خاص طبقہ مین اُنکا کلام نمایان منزلت رکھتا ہے جسکے بیشتر افراد آتش کے بعد شاعری کا سہرہ انکے سر دیکھنا چاہتے ہین - اُنکے حسن عقیدت کا اس سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ "خوشگوئی" کو رکاب گنج کی لونڈی سمجھتے ہین - رکاب گنج ہین حضرت تعشق کا مکان تھا -

کلام تعشق کی خصوصیت عمومی جسپر ناظرین کی نگاہ سب سے پہلے پڑتی ہے ضایع و بدایع لفظی ہے یعنے اُنکے بیشتر اشعار لفظی تناسب و تشبیہات و استعارات کا "گورکھ دھندا" ہین - اس سے سمجھنا چاہیے کہ ان کا فطرتی جوش طبیعت جو شاعری کے لیے آب حیات سے کم نہین ہوتا اس سے حقیقت مین جو کام لینا چاہیے تھا نہین لیا گیا اور وہ انھین لیکر کہین سے کہین پہنچگیا - اسکی مثال بعینہ آب روان کی ہے کہ اگر اس سے اصولاً فائدہ اُٹھانا منظور ہو تو اُسکے لیے خاص تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہین ورنہ وہ باختیار خود قابل کاشت زمین کو سیراب کر سکتا ہے اور بنجر کو بھی اور آخری صورت مین اس سے زیادہ کچھ حاصل نہین ہوتا کہ جا بجا خار دار جھاڑیان یا اسی قسم کے بے مصرف پودے عارضی طور پر نکل آتے ہین - حاشا و کلا یہان تعشق پر کوئی ایراد و اعتراض مقصود نہین بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے استثناءً کہا گیا ہے؛ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہتے تو اپنی طبیعت کے زور سے اُس شاعری کے جوہر بھی اسی طرح دکھا سکتے تھے جو اپنی صفات معنوی، درد، تاثیر، سوز و گداز کے اعتبار سے اہل دل کی نظر مین وقیع سمجھی جاتی ہے اور جسکے دلپذیر نظارے سے کلام تعشق بھی کلیتہً مبرا نہین کہا جا سکتا - حضرت تعشق کا طبعی رنگ ان چند شعرون سے بخوبی آشکار ہو سکتا ہے ؎

سوئے دریا خندہ زن جو یار جانی پھر گیا   موتیون کی آبرو پر آج پانی پھر گیا
سوئیان سی کچھ دلِ وحشت مین چبھنے لگین   ٹھیک ہونے کو لباسِ ارغوانی پھر گیا

راہ مین صاحب اکسیر کھڑے ہین مشتاق   خاکساران درِ یار چلے آتے ہین

تری گرمیان جب کبھی یاد آئین   دم سرد بھرنے لگا دم کسی کا

یہی مضامین اگر میر و غالب کے رنگ مین ادا کیے جاتے تو سننے والون کے

قلوب اثر پذیر ہوتے اور ضرور ہوتے۔ لیکن تعشق کے یہ اشعار سننے والون کے دل و دماغ کو اپنی باطنی خوبیون کے عوض ظاہری اور لفظی بھڑک پر متوجہ کرتے ہین۔ تعشق پر کچھ منحصر نہین کسی شاعر کا کلام ہو۔ اگر اُس مین یہ التزام کیا جائے کہ ایک مصرعہ مین لباس کا ذکر آئے تو دوسرے مین سوئیون کا تذکرہ ضرور ہو، "خاکساران دربار" کے "مشتاق"، "صاحب اکسیر" ہی بنائے جائین، "گرمیان" یاد آئے "تغیر کسی کا دم" "دم سرد نہ بھرے" اور علی ہذالقیاس تو یقینی طور پر اُس سے زیادہ جذبات کی پامالی اور حسیات کی بے قدری کا افسوس ناک منظر کہین اور نہین مل سکتا۔

ایک بات یہ بھی ہو کہ جب شاعر کو اس رنگ مین بدرجۂ کمال غلو پیدا ہو جاتا ہو تو اپنے اس رنگ کو ہر ایک موقع پر قائم رکھنے کے لیے اُس کو بسا اوقات نہایت معمولی و متداول تشبیہون اور استعارون سے کام لینا پڑتا ہو۔ اسکی وضاحت کے لیے مندرجۂ ذیل اشعار کافی ہونگے ؎

لکھا تھا خط مین اُنھین حال آہ سوزان کا سنا ہو راہ مین بجلی گری کبوتر پر

مرغ وحشی کی طرح اُڑکے گیا جانب دشت حال خط مین جو رقم تھا تری سودائی کا

کمال خط مین رقم تھا جو شوق اُس کا تمام رات رہی چاندنی کبوتر پہ

کیا ہی تیغ نگہ سے کسی پری نے شہید بجا ہے مہر سلیمان ہوا ہنے محضر پہ

جن الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے وہ ایک دوسرے کی مناسبت سے جبراً و قہراً شعر مین لائے گئے ہین گویا شاعر کے خیال مین اگر ایسا نہ ہوتا تو قانون شعری کے لحاظ سے قابل الزام ٹھہرنے کا خدشہ تھا۔ منصفی شرط ہو ان شعرون مین تاثیر جذبات یا سوز و گداز کا کوئی بھی پہلو نکلتا ہے۔ اس قسم کے پاُفتادہ مضامین اور بےلطف تشبیہات کسی جندی کے لیے سرمایۂ نازش ہو سکتی ہین لیکن تعشق ایسے جید سخنگو۔ جن کی مرثیہ گوئی کا مرتبہ ادبی و علمی اعتبار سے نہایت ارفع ہے۔ اُن کی شہرت و وقعت مین کوئی اضافہ نہین کر سکتین۔ ممکن ہو کہ مخصوص طبایع اس قسم کے تلازمہ کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھین لیکن فن سخن کے ماہرین جانتے ہین کہ محاکات شاعری کو ان سے کوئی تعلق نہین۔ شعر کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ سامع کو مجذوب بنا دے۔ یا دوسرے الفاظ مین یون کہنا چاہیے کہ شعر وہی ہے جسکے مضامین اور جذبات سے سامع مثل شاعر کے متاثر ہو لیکن جب شعر کا دار و مدار محض چند الفاظ کی ظاہری نشست و برخاست ہو تو اُس مین لطائف معنوی کا نام کہان جس سے سننے والے کے دل پر کوئی مستقل اثر پڑسکے۔ مندرجۂ ذیل اشعار اسی قبیل کے ہین ؎

کہتے ہو قیامت کی ہوا بند ہوئی ہے دم آج رُکا ہے مگر اے یار کسی کا

دیکھنا کیسی مبارک ہوگی صیادی تجھین دام مین طائر جو آئیگا ہما ہو جائیگا

کیا کنوئین مجکو دکھائیگی مری آوارگی چاہ میرے واسطے ہر نقش پا ہو جائیگا

دل جل کے رہ گئے ذقن رشک ماہ پر اُس قافلے کو پیاس نے مارا ہی کاہ پہ

بخیہ جراحت دل نازک مزاج کا موقوف ہو ہے حضور کی تار نگاہ پر

درد و غم سے جو تپان تھا وہ ملا دل مجکو اس لیے دفن کیا ہو لب ساحل مجکو

بالکل معمولی مضامین ہین جن مین جذبات و ذوقیات کا پتہ نہین۔ انکو پڑھکر کسی کا دل کیا خوش ہوگا تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا سخت غلطی ہوگی کہ تعشق کا دیوان اسی قسم کے اشعار کا مجموعہ ہو، نہین بلکہ اُسے ایک دوکان سمجھنا چاہیے جس مین "پھیکے پکوان" کے علاوہ طبقۂ خواص کے کام و زبان کے لذت یاب ہونے کا سامان بھی موجود ہے۔ مثلاً مندرجۂ ذیل اشعار جن مین لکھنو کا رنگ غالب ہو بہ جستگی و تازگی مضامین کے لحاظ سے قابل داد ہین۔ کہتے ہین ؎

شب کو گیا کیا باغ مین جلوے بہار ہو گئے چاندنی کے پھول جو توڑے ستارے ہو گئے

برق ہو چین بن گئیں موتی شرارے ہو گئے ذل جلے جب فرقِ دریا مین تمھارے ہو گئے
رات کو تیر مجھے دھوکا ہوا اے ماہ رو بے خودی مین جا بجا کیا کیا اشارے ہو گئے

ذیل کا اقتباس بھی اسی نوعیت کا ہے ؎

باغ مین پھولون کو تو مدّ آئی سواری آپکی کس قدر ممنون ہے بادِ بہاری آپ کی
بیوفائی آپ کی غفلت شعاری آپکی میرے دل نے عادتین سیکھی ہین ساری آپ کی
سیکڑوںین ٹوٹے جاتے ہین بہم ٹکرا کے جام مفسدہ پرداز ہے چشمِ خماری آپ کی

اسی طرح جب نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو اکثر غزلون مین درد اور سوز و گداز کی تصویرین بھی دیکھنے مین آجاتی ہین - مثلاً یہ اشعار واقعی موثر ہین ؎

بھرے ہین آنکھو مین آنسو دامن میٹھے ہو یہ کس غریب کی تربت کے پاس بیٹھے ہو
بیان شمع ہے ہم خاک ہون گے پروانو یہ حال دیکھنے کو آس پاس بیٹھے ہو
قفس مین بھی ہو اسیر و تمھین ہی سودا لگائے فصلِ بہاری کی آس بیٹھے ہو

اس غزل مین یہ شعر بیت الغزل کی حیثیت رکھتا ہے - فرماتے ہین ؎

مجھی کو ناز سے دیکھا جلا جو پروانہ تم ایک بزم مین مردم شناس بیٹھے ہو

معنی آفرینی اسکا نام ہے اور طرز ادا نے اور جان ڈالدی ہے - سبحان اللہ مرحبا!

جذبۂ تاثیر کے لحاظ سے یہ اشعار بھی لائق توصیف ہین ؎

کچھ نہ پوچھو گور غریبان پر بھی سامان ہو گیا چاند تارے چرخ سے ٹوٹے چراغان ہو گیا

دل ہر مردہ غلد مین جانئے سے کیا ہو جائیگا ہم جہان ہونگے وہ گھر ماتم سرا ہو جائیگا
خبر کسی کو ضعیفون کے قتل کی نہوئی ہم ایک قطرۂ خون تھے زبانِ خنجر پر

ذیل کے اشعار ایک غزل سے لیے گئے ہین - پہلے دونون شعرون مین حسرت و یاس کا رنگ بہت اچھا دیا گیا ہو - تیسرے شعر مین اندازِ بیان بہت دلچسپ ہے - چوتھا شعر جدت یا معنی آفرینی کے اعتبار سے نہ سہی لیکن بحیثیت مجموعی اچھا ہو اور ایک سچے واقعہ کی حقیقت کا اس سے انکشاف ہوتا ہے ؎

یادِ غم دل سے کبھی جاتی نہین اب تو بھولے سے ہنسی آتی نہین
کچھ خبر ملتی نہین دل کی مجھے آج نالون کی صدا آتی نہین
قبر مین رکھکر مجھے کہنے لگے کیون ؟ طبیعت اب تو گھبراتی نہین
بے ترے رہتی ہے الجھن رات بھر کروٹین لیتے ہین نیند آتی نہین

ایک غزل ہے ؎

اس چمن مین کیون کوئی حاجت روا پیدا کرون مثلِ غنچہ دامنِ دل سے قبا پیدا کرون

اس مین بھی تین شعر نہایت پُرکیفیت ہین اور عجیب و غریب انداز مین کہے گئے ہین ؎

موج دریائے بلا کی چاہیے کشتی مجھے ہو جو بالکل ناموافق وہ ہوا پیدا کرون
مجھسے لاکھون خاک کے پتلے بنا سکتا ہے تو مین کہان سے ایک تیرا سا خدا پیدا کرون
طائرِ بے آشیان ایسا ہون بجلی گر پڑے ایک تنکے کا اگر مین آسرا پیدا کرون

تم دامنِ نظارہ سے دو خلعت آخر ۱ محتاج کفن کو ہے تن زار کسی کا

تلاشِ شبِ وصل مین پھر رہا ہون ۲ مر آپ دیوانہ پن دیکھتے ہین

مین زاہدون کے سامنے ہون تارک الصلوٰۃ ۳ کس سے کہون کہ لائق سجدہ جبین نہین

اب اگر تخفیف ہوتی ہو تو گھبراتا ہون مین ۴ درد دل اتنے دنون سے ہو کہ عادت ہو گئی

روئی قبر مین جب کسی طائر کو دیکھا کو دبے ۵ فرطِ الفت سے یہ جانا روح ہو دلدار کی

(۱) دامنِ نظارہ کی ترکیب نہایت اچھوتی اور دلکش ہو - مضمون بھی صاف و دلپسند ہے

(۲) اسمین مصرع ثانی کا استفہام غایت درجہ لطیف و برجستہ ہے - مضمون مین بھی تازگی موجود ہے -

(۳) اسکا مضمون نہایت بلند ہے - اس قماش کا کلام شاعرون کو بقاے دوام کا زینہ بخشتا ہو - کاش اسکی مثالین اور کثرت سے ہوتین! نہایت وسیع و بلیغ مضمون ہے اور سجدہ نہ کرنے کی توجیہ کس درجہ معقول، بامعنی اور

دلنشین ہے گویا نیازمندی اور خاکساری کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

(۴) اس شعر کا مضمون بالکل نیچرل اور مطابق قانون قدرت ہے۔ اسی مضمون کو حضرت غالب نے بھی کس خوبی سے فرمایا ہے ؎

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں مجھپر پڑیں اتنی کہ آسان ہو گئیں

تعشق کا شعر بھی نہایت بلند پایہ ہے اور ادائے بیان میں ایک خاص قسم کی نزاکت موجود ہے۔

(۵) پانچویں شعر کا مضمون جدّت کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ طائر اور روح انسانی میں ایک خاص مماثلت ہے جس نے شاعر کے مطلب میں حیرت انگیز لطف پیدا کر دیا ہے۔

اس زمین میں ہماری آنکھیں، تمھاری آنکھیں، تعشق کی ایک مطول غزل ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ اس میں اُنھوں نے نہایت شگفتہ اشعار نکالے ہیں۔ ورنہ قدرتاً اس قسم کی طرحوں میں آورد کا رنگ زیادہ ہوتا ہے اور شاعر کو رعایت لفظی، بعید از قیاس تشبیہات وغیرہ سے کام لینا پڑتا ہے تعشق کی اس غزل کا غالب حصہ صاف و شستہ اشعار سے مملو ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جوش پر تھیں صفت ابر ہماری آنکھیں — بہہ گئیں آنسوؤں کے ساتھ ہماری آنکھیں
دور سے دیکھکے تم کو کوئی جی بھرتا ہے — کر رہی ہیں فقط ایام گذاری آنکھیں
لطف دیکھا نہ کسی چیز کا اشکوں کے سوا — آئی تھیں رونے کو دنیا میں ہماری آنکھیں
تم کو شرم آتی ہے ہم قابل نظارہ نہیں — نہ رہا حسن تمھارا نہ ہماری آنکھیں
کور ہو جاؤں مگر عشق میں رونے کو نہ روک — ناصحا دل سے زیادہ نہیں پیاری آنکھیں
فرش ہو جاتی ہیں تم پاؤں جہاں رکھتے ہو — ادب آموز محبت ہیں ہماری آنکھیں
بعد مدت کے ذرا ہوش میں آیا ہوں میں آج — پھر دکھا دے مجھے ساقی وہ خماری آنکھیں

ان دو شعروں کا انداز بھی دیکھیے ؎

منھ جو فرقت میں زرد رہتا ہے — کچھ کلیجے میں درد رہتا ہے
کہتے ہیں دل کی چوٹ کا ہے نشاں — منھ تعشق جو زرد رہتا ہے

یوں بھی چھوٹی بحروں میں انکے اشعار بیشتر صاف ہیں ہر ایک غزل میں دو ایک شعر نکل آئے ہیں جنکی بندش اور برجستگی بعض اوقات میر کے کلام کی یاد دلا جاتی ہے۔ اسکا اندازہ ذیل کے انتخاب سے بخوبی ہوگا ؎

چھوٹ جائیں ہم عذاب ہجر سے — اب تو کوئی ایسی صورت کیجیے
دور جانا ہے کہ ہے قصد عدم — مہربان اب ہم کو رخصت کیجیے
لوگ کہتے ہیں مسیحا آپ کو — کچھ علاج درد فرقت کیجیے
موت ہے غارتگری کی تاک میں — جمع کیا اسباب راحت کیجیے

ہم ہیں سو حسرتیں ہیں اور دل ہے — مہربان دیکھنے کی محفل ہے
شب فرقت میں کوئی پاس نہیں — ایک بس میں ہوں اک مرا دل ہے
زور سے آہ کر نہیں سکتا — زخم دل میں وہ سخت مشکل ہے

نہ چونکے حضور آپ سوتے تھے غافل — پکارا کیا رات بھر دل ہمارا
نہ تھی آس پھرنے کی جو اس گلی سے — گلے مل کے رخصت ہوا دل ہمارا

تلاش یار کا تھا دھیان کل تک — ہمیں ہے اپنے دل کی جستجو آج
ہوا ترک محبت پر نہ راضی — رہی تا دیر دل سے گفتگو آج
ترے در پر پڑے دم توڑتے ہیں — نکلتی ہے ہماری آرزو آج

آخر میں تعشق مرحوم کی ایک غزل کے جو بہ حساب ترتیب دیوان کی آخری غزل ہے چند اشعار لکھکر اس مختصر مضمون کا بھی خاتمہ ہے ؎

خلخال اُسکے پاؤں کی زنجیر بنائیں گے — طوق گلوئے فتنۂ محشر بنائیں گے
اپنا مزار متصل در بنائیں گے — گھر بھی تمھارے گھر کے برابر بنائیں گے
کہتے ہیں وہ یہ سرمہ کا دنبالہ پونچھکر — اس نیچے کو توڑ کے خنجر بنائیں گے
چھلا حضور ہاتھ کا دیدیجیے ہمیں — دل کے جہاز کا اسے لنگر بنائیں گے
فرماتے ہیں مرے دل نازک کو توڑکر — دیکھیں تو شیشہ گر اسے کیونکر بنائیں گے

سید محمد فاروق (شاہبیوی)

سیّد محمد مرتضیٰ بیاںؔ ویزدانی میرٹھی

زمانہ کسی وقت اور کسی دور میں کاملین فن سے خالی نہیں رہتا۔ جس طرح اقطاب ابدال کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ یہ روحانی رہنما ہر زمانے میں موجود رہتے اور اپنے فیوض و برکات سے ایک عالم کو سیراب کیا کرتے ہیں اُسی طرح جسمانی دنیا بھی متعدد اشخاص کے وجود پُر جود کے فیضان و بخشش سے کبھی محروم نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اصحاب خلقی طور پر نام و نمود کی خواہش نہیں رکھتے اور اس وجہ سے اُنھیں عام طور پر رُوشناس ہونے کا موقع نہیں ملتا اور اکثر انقلاب عالم کی عبرت انگیز کیفیات سے اس درجہ متأثر ہوتے ہیں کہ اُنھیں ذاتی طور پر اپنے آپ کو پبلک کے سامنے لانے میں پس و پیش ہوتا ہے، اور اس طرح اُنکے کارنامے پردۂ خفا میں مستور رہ جاتے ہیں۔ انھیں لوگوں میں اُن اشخاص کا بھی شمار ہو سکتا ہے جو اپنی قابلیت و علمیت کے لحاظ سے ہر طرح قابل عزت ہوتے ہیں لیکن ناقدری اور نامرتبہ شناسی چونکہ عوام کی آنکھ پر پردہ بنکر پڑ جاتی ہے اس لیے وہ اُنکی صحیح پوزیشن کو معلوم نہیں کر سکتے۔

گرےؔ نے جو انگلستان کے طبقۂ شعراء کا ایک ممتاز رکن ہونے کی حیثیت سے معرفی سے مستغنی ہے اپنے مشہور و معروف مرثیہ میں اسی مسئلہ پر کس قدر غائر نظر ڈالی ہے اور کتنی فلسفیانہ دقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کتنے آبدار موتی سمندروں کی تہ میں اس طرح رہ جاتے ہیں کہ انسانی آنکھ تک اُن کی ضو بھی نہیں پہنچتی اور کتنے ہی خوشرنگ پھول ایسے جنگلوں میں کھلتے ہیں جنکی گوناگوں دلچسپیوں کا آدمیوں کو علم بھی نہیں ہوتا“۔ گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جس طرح بہت سے قیمتی موتیوں اور دلفریب پھولوں کی رسائی انسان تک نہیں ہوتی اور وہ سمندروں اور جنگلوں میں پوشیدہ رہجاتے ہیں اسی طرح کتنے قابل دماغ ایسے ہونگے جن کے کارنامے بجاے خود سرمایۂ ناز اور کارآمد ہونے کے باوصف گمنامی کی حالت میں رہ جاتے ہیں اور اہل دنیا کو اُن سے مستفید ہونے اور تمتع حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ غور سے دیکھیے۔ ”گرےؔ“ نے گویا اُن بے نشان لیکن ذی احترام لوگوں کی اصلی صورت کھینچ کر دکھا دی ہے جنکی خدمات فاضلہ اور صفات عالیہ اُنھیں مشاہیر عالم میں نمایاں وقعت دلانے کے لیے کافی تھیں لیکن استحقاق کے باوجود وہ شہرت نہ پا سکے، اور اُنکی ذہنی و دماغی کاوشوں کے نتائج دنیا پر آشکار نہ ہو سکے۔ سچ پوچھیے تو یہ اُنکی نہیں بلکہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اُنکے خرمن فضل و کمال کی خوشہ چینی سے بھی محروم رہے۔

ہر ملک، ہر قوم۔ ہر فرقے، اور ہر طبقے میں اس قسم کے گمنام لیکن اقبالمند لوگ گذر چکے ہیں اور اب بھی اگر کھوج کرو تو تمھیں بہت سے مل سکتے ہیں۔ ہندوستان اس وقت علوم و فنون کی کساد بازاری میں مشہور آفاق ہے اور اسلیے یہاں تحصیل کمال کی تشویق و تحریص کے اسباب بھی مفقود ہیں لیکن اگر کوشش سے تلاش کیا جائے تو یہاں اب بھی آپ کو ایک معقول تعداد ایسے بزرگ سیرت اصحاب کی مل سکتی ہے جو اپنے اوصاف کے لحاظ سے آنکھوں پر بٹھائے جانے کے قابل تھے یا ہیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہم اُنھیں جانتے تک نہیں گویا جس عالم گمنامی میں وہ پیدا ہوے اُسی بےخبری میں وہ پیوند خاک ہو گئے یا ہو جائیں گے۔

اُردو شاعری کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو شعراء قطار در قطار نظر آئینگے۔ ناموں کی گنتی کرنا ہو تو اکثر تذکرے موجود ہیں۔ ان میں جہاں بہت سے مستحق اعزاز و تکریم نظر آئینگے وہاں بھرتی کے بھی ہوں گے۔ میرؔ و سوداؔ انشاؔ و مصحفیؔ، ناسخؔ و آتشؔ، اور غالبؔ و ذوقؔ بلاشبہہ ہمارے علم ادب کے قابل فخر محسنین میں ہیں اور انکے احسانات سے اُردو شاعری کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی لیکن اِن محسنوں اور سرپرستوں کی تعداد یہین پر نہیں ختم ہو جاتی بلکہ بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے بمصداق

نیکی کُن و بدریا انداز

اُردو اور ادب اُردو کے لیے کیا کچھ نہیں کیا لیکن کسی سے داد طلب نہیں ہوئے اور پبلک اُنکے کارناموں سے ناواقف رہگئی۔

حضرت بیان یزدانی اُردو شعراء کے اسی طبقہ میں شمار ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہی کہ عوام ان سے ایک حد تک شناسائی کا فخر رکھتے ہیں تاہم اُن کی اجتہادی قابلیت و نیز علمیت کے لحاظ سے اُنکا دائرۂ شہرت بالکل محدود رہا اور عام طور پر کسی کو اُنکے کلام کی عظمت، اُنکے ذاتی اوصاف، اور خاندانی حالات سے آگاہی نہیں۔ طبقۂ خواص میں گو اُنکے کلام کو بہت بڑی حد تک رسائی حاصل ہو لیکن وہ بھی اُنکی شناسائی مرتبہ نہیں رکھتے۔

حضرت بیان اس زمانہ کے سربرآوردہ شعراء میں سے تھے جنکی علمیت اور نکتہ شناسی انصافاً اُنھیں بہت سے پیشرو مشاہیر سے ممتاز ثابت کرتی ہی۔ ایسے ذی علم لوگوں کا تذکرہ خالی از افادہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہم کسی قدر تفصیل سے اُن کے حالات قلمبند کرتے ہیں اور اسکے بعد اُن کے کلام پر اپنی ناچیز رائے کا اظہار کریں گے۔ ان سطور کے مطالعہ سے ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ بیان کا درجہ شاعری میں کیا ہی اور اُنھوں نے اپنے دل و دماغ سے کام لیکر اپنی فطرتی طباعی اور سخن سنجی کا کیسا کچھ ثبوت دیا ہے۔

سید محمد مرتضیٰ نام تھا۔ بیان و یزدانی تخلص کرتے تھے۔ انکے والد سید گوہر علی کے آٹھ لڑکے تھے جنمیں سے ایک حضرت بیان سے بڑے تھے اور باقی چھوٹے۔ ذاتی فضائل و اوصاف سے قطع نظر حضرت بیان نسباً بھی بڑے آدمی تھے انکا خاندان ساداتِ رضوی سے تھا اور مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ اِن کے نانا سید عمردراز علی جھانسی اور کالپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور اُنکے زمانۂ حیات تک بیان اور اُنکی والدہ زیادہ تر اُنھیں کے پاس رہتے تھے۔

سید بیان میرٹھ کے رہنے والے تھے لیکن اُنکے آبا و اجداد جارچہ ضلع بلند شہر میں سکونت رکھتے تھے۔ سید بیان کا ننھال میرٹھ کے قریب کسی موضع میں تھا اور انھیں تعلقات نے بالآخر میرٹھ کو اُنکا گھر بنا دیا۔

سید عمردراز علی بیان کے نانا نہایت اعزاز و امتیاز کے آدمی تھے جھانسی وغیرہ میں اب تک اُنکے مداح اور جاننے والے موجود ہیں۔ ایک مدت تک جھانسی میں ڈپٹی کلکٹری کی اور وہیں ۱۸۵۶ء میں بیان پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں شفیق نانا کا سایہ اُٹھ گیا۔ لیکن دو برادرِ نیک بانی انکی تعلیم و تربیت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر اُسے کما حقہ انجام تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

سید گوہر علی خود ایک قابل بزرگ تھے اور جیسا کہ پہلے زمانہ میں شریف خاندانوں کا عام دستور تھا وہ پڑھے لکھے تھے اور علوم مشرقی میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے۔ سید بیان کی ابتدائی تعلیم اُنھوں نے خود کی اور جب تعلقات ملازمت کی وجہ سے وہ اس کام سے معذور ہوئے تو مرزا باقر علی بیگ نے جو "میرٹھ میں فرقۂ شیعہ کے پیش نماز تھے" سید بیان کی تعلیم کی تکمیل کرائی۔

مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے سید انشا کی تعلیم کا ذکر کر کے اُنکے ذاتی جوہر کو اِن الفاظ میں نمایاں کیا ہے:۔

باپ کے بے مثال دے سکتے ہیں کہ عزیز بیٹے کو اس خوبصورتی سے تعلیم کیا مگر بیٹا جو جوہر دار طبیعت اپنے ساتھ لایا تھا اُسکی کوئی مثال نہیں ہی۔

یہی کیفیت سید بیان کی ہی۔ اُن میں خداداد قابلیت کا مادہ موجود تھا جو باپ اور اُستاد کی بزرگانہ اور شفقت آلود توجہات کے ساتھ سونے میں سہاگے کا کام کر گیا۔ اُنھیں کتب بینی کا شغف بحد تھا اور اسکے ذریعہ سے اُنھوں نے تجربے، مشاہدے، اور معلومات کے وہ تمام درجے بسہولت طے کر لیے جنکو عبور کرنا معمولی آدمی کے حیطۂ امکان سے باہر ہوتا ہی۔ اُنکی بلند نظری اور وسعتِ خیال کا ثبوت اُنکے کلام سے بھی ملتا ہی جسکے دیکھنے والے کو بہت جلد معلوم ہو جاتا ہی کہ شاعر کا دماغ گوناگوں جذبات و کمالات کا ایک بیش قیمت مخزن ہی۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ سید بیان کو حسنِ سیرت و حسنِ صورت مساوی طور پر مبدءِ فیاض سے عطا ہوئے تھے۔ وہ نہایت خوش رنگ وجیہ تھے خلیق،

انکسار، اور ہمدردی کی صفات بھی اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ طبیعت شناس بھی بلا کے تھے۔ ہر شخص سے اُسکے مذاق کے موافق گفتگو کرتے تھے۔

وہ بہت خوبصورت تھے اور رنگ گورا چٹا تھا۔ اسکے متعلق ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ غدر کے زمانہ میں جبکہ امن و امان کا جنازہ ملک سے اٹھ چکا تھا سید بیانؔ کو بعالمِ طفلی کہیں ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا پڑا اتفاق سے راستہ میں باغیوں کی ایک جماعت سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اُن نامرادوں نے انھیں انگریز کا بچہ سمجھکر گرفتار کر لیا اور ڈیڑھ سو روپیہ لیکر چھوڑا۔

شروعِ جوانی میں اُنھیں ایک مرض لاحق ہو گیا تھا جسے دماغی عارضہ کہہ سکتے ہیں لیکن اُسکی ماہیت و نوعیت کے متعلق حکمی رائے قائم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مؤلف خمخانۂ جاوید کا خیال ہے کہ اس عارضہ کو بظاہر وہم سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔" اس باب میں جو حالات سید بیانؔ کے برادر عزیز سید حسین صاحب میرٹھی سے دستیاب ہوئے ہیں وہ بے کم و کاست درج کرتے ہیں۔ سید صاحب موصوف شہرت و قابلیت میں اپنے برادرِ معظم کے شریک و سہیم ہیں اور صوبجات متحدہ میں بعہدۂ تحصیلداری ممتاز ہیں۔ علمی رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے آپ کی معنی یاب طبیعت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ آپ رقمطراز ہیں ؎

حالتِ مرض یہ تھی کہ قریب دو سیر وزن کی کپڑے کی گٹھری بنا کر دماغ پر رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ دماغ بغیر اسکے اُڑا جاتا ہے۔ تاریک کمرے میں شب و روز رہتے تھے۔ اُسکے دروازوں پر بھی پردے پڑے رہتے کہ روشنی مطلق نہ آسکے۔ ہاونڈی کے بجنے اور چھالیہ کاٹنے کی آواز بھی اُنھیں ناقابلِ برداشت تکلیف دیتی تھی۔ نہایت خفیف شور سے بھی وہ سخت پریشان ہو جاتے تھے۔ اگر کسی ضرورت سے باہر نکلتے تو چھتری لگا کر۔ کہتے تھے کہ تاروں کی روشنی سے اذیت پہنچتی ہے اور تارے دماغ میں چبھتے ہیں۔ اس مرض میں وہ تمام عمر مبتلا رہے۔ البتہ چند سال کے بعد مرض میں وہ شدت نہ رہی تھی جو آغاز میں تھی۔ شور سے اب مطلق پریشان نہ ہوتے تھے۔ مکانِ تاریک کی نشست ترک کر دی تھی۔ کپڑوں کی گٹھری سر سے کندھوں پر اُتر آئی تھی۔

ان باتوں پر غور کرنے کے بعد سوائے اسکے کیا نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ انکا دماغ نہایت نازک واقع ہوا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اُنکی دماغی کاوشیں بدستور جاری تھیں۔

سید بیانؔ کئی اعتبار سے واقعی شاعر تھے۔ شاعری اور جنون کا ایک درجہ رکھا گیا ہے۔ جس طرح عالمِ جنون میں انسان کو اور باتوں کا کوئی احساس نہیں ہوتا اسی طرح حقیقی شاعر کی توجہ بھی فروعات کی طرف نہیں جاتی۔ وہ اپنی دُھن میں مست رہتا ہے اور عالمِ خیال کی محویت اُسپر طاری رہتی ہے۔ اسے قیدِ علائق سے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلقاتِ نکاح چونکہ آدمی پر غیر معمولی ذمہ داری کا بار ڈالدیتے ہیں اور طرح طرح کے آلام اور ترددات میں پھنسا دیتے ہیں اس لیے انگلستان کے اکثر شعراء نے شادی نکرنا ہی اپنے لیے اچھا سمجھا تھا۔ ہماری ذاتی رائے میں مناکحت ہر انسان کے لیے ایک اخلاقی اور معاشرتی فرض ہے اور مذہب نے اسکی ضرورت و اہمیت جس طریقہ پر تسلیم کرائی ہے اُس سے بھی کسیکو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی باایں ہمہ یہ ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہوتا ہے جسکے اُٹھانے کی اگر کسی میں طاقت نہ ہو تو وہ معذور سمجھا جا سکتا ہے۔ سید بیانؔ ذاتی طور پر دنیاوی علائق سے مستغنی واقع ہوئے تھے۔ وہ طبعاً آزادی پسند تھے۔ لباس، خورش، کسی چیز میں وہ تصنع و آرائش یا تکلف کے پابند نہ تھے۔ بے غل و غش زندگی بسر کرنا اور چمنِ سخن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کرنا اُنکا نصب العین تھا۔ اسی لیے اُنھوں نے کوئی شادی نہیں کی اور باوجود اصرار کے "سنتِ پیغمبری" سے اپنے "گلو" کو بچائے رکھا۔

آزاد منشی کے ساتھ ظرافت میں بھی وہ یکتا تھے۔ مزاج میں استقلال بدرجۂ اتم موجود تھا۔ آخری دفعہ جب بیمار پڑے تو آثارِ موت ظاہر تھے۔ لیکن مستقل مزاجی کا عالم وہی تھا۔ بسترِ مرگ پر بھی خلقی ظرافت نے ساتھ نہ چھوڑا اور عزم و استقلال کے وہی دم خم تھے۔ مرنے سے پہلے ایک کارڈ اپنے عزیز بھائی کو لکھا تھا جسے اس مصرعہ پر ختم کیا تھا ع

برائے مُردنِ من غم مخور بقای تو باد

آخر وہ وقت بھی آگیا جس سے کسی ذی روح ہستی کو چارہ نہیں بسنہ۱۹۰۰ء کے موسم سرما میں سید بیانؔ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور تقریباً دو مہینہ کی علالت کے بعد میرٹھ میں انتقال کیا۔ اِنّا لِلّٰہ و انا الیہ راجعون ؎

رہے گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہی حضرت سلامت

سید بیانؔ کی شاعری پر نظر

حضرت بیانؔ کی شاعری کا پایہ بہت ارفع و اعلیٰ ہی اور وہ اپنے فضائل و محاسنِ کمال کے وسیلہ سے اُس درجہ تک پہنچ گئے تھے جو معمولی شاعروں کے منتہائے نظر سے بھی اُدھر ہی۔ علمیت، دماغی قابلیت، طبع کی جولانی، فکر کی بلندی خیالات کی نیرنگی، یہی باتیں ہوتی ہیں جو شاعر کے کلام کو مستند اور قابلِ قدر بنا دیتی ہیں اور انھیں اوصاف کی بدولت بیانؔ نے بھی اپنی لافانی عظمت کا سامان مہیا کر لیا ہی۔

بیانؔ کے کلام پر غائر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ وہ ہر بیشہ کے شیر اور ہر میدان کے مرد تھے۔ پُرگوئی کے ساتھ مضامین آفرینی کا پہلو عموماً نظر انداز ہو جاتا ہی لیکن بیانؔ نے سب کچھ کہا ہی اور جو کچھ کہا ہی بہت زیادہ کہا ہی۔ افسوس ہی کہ اُن کا کلیات ابتک شائع نہیں ہوا ورنہ ہر شخص بجائے خود اندازہ کر سکتا کہ خیالات و جذبات پر انھیں کہاں تک قدرت حاصل تھی اور اُنکی سخن سنجی اور نغز گوئی کن کن دلچسپیوں اور رنگینیوں کا دلفریب مجموعہ بنی ہوئی تھی ہمیں میر سید حسین صاحب کی مہربانی سے بیانؔ کے مختلف اصنافِ سخن پر غلط انداز نظر ڈالنے کا موقع ملا ہی اور اُسکے دیکھنے کے بعد ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ موجودہ شاعرانِ اُردو میں تو کوئی ایسا نہیں جو اُنکی نظیر کے طور پر پیش کیا جا سکے بلکہ شعرائے ماسلف میں بھی اکثر سے بیانؔ اگر بڑھے ہوئے نہیں تو کم بھی نہیں رہے۔

بیانؔ کے ایک پختہ کار سخن گو ہونے کی اس سے زیادہ قوی دلیل اور کیا ہو سکتی ہی کہ وہ جس رنگ میں چاہتے تھے بے تکلف کہتے تھے۔ زبان پر اُنھیں خاصہ قابو تھا۔ وزن دار اور موزوں الفاظ گویا اُنکے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے تھے۔ خیالات کی گوناگوں کیفیات کبھی میرؔ کے رنگ میں نظر آئینگی کبھی غالبؔ کے۔ کہیں ذوقؔ کی متانت اپنی ہو بہو تصویر میں جلوہ گر ہوگی کہیں جراتؔ و داغؔ کی شوخیِ بیاں کا لطف حاصل ہوگا۔ اس نیرنگی کے باوجود اُنکی خاص طبیعت کا رُجحان مطالعہ کرنیوالے کے قلب پر خود بخود ظاہر ہو جاتا ہی اور یہ خصوصیت اُنکے ہر صنف کلام میں موجود ہی۔

بیانؔ کی اُردو غزلیں بہت دھوم دھام کی ہیں اور اُنکی پُرگوئی کی مثال مشاہیر میں وزیرؔ لکھنوی کے سوا کسی اور میں بمشکل مل سکتی ہی لیکن بیانؔ نے موخر الذکر کی پیروی رعایاتِ لفظی کے اعتبار سے کہیں نہیں کی۔ اور اگر کسی جگہ کی بھی ہی تو خوبی سے نہ اس طرح کہ سامع کا خیال معانی و مطالب سے ہٹ کر الفاظ کی طرف چلا جائے۔

کئی کئی زمینوں میں سہ غزلہ اور چار غزلہ تک کہا ہی لیکن کہیں اور کسی پہلو سے بھرتی نہیں۔ شعر کے بعد شعر پڑھیے اور آمد کا لطف اُٹھائیے۔ اُنکے کلام کا بعض حصہ ایسا ہی کہ اگر کوئی شخص سرسری نظر سے بھی دیکھے تو غالبؔ کے اشعار کا دھوکا ہوتا ہی۔ وہی ترکیبیں، وہی الفاظ کی نشست، وہی خیالات کی پیچیدگی، وہی مضمون کی دقت۔

اصل یہ ہی کہ اس قسم کی ہمہ گیر طبیعت ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آتی جن سخن ورانِ کامل کو قدرتی طور پر فضل و کمال کا یہ درجہ ملتا ہی وہ ماں کے پیٹ سے صاحبِ فن پیدا ہوتے ہیں اور لاریب کہ بیانؔ بھی ایک فطری شاعر تھے اور اُنکے جوہر کمال کو اُنکے ذاتی علم و قابلیت نے اور جلا دی تھی بچپنے ہی سے اُنھیں شعر گوئی کا شوق دامن گیر تھا اور اپنے والد کی ناراضی کے باوجود وہ فکرِ سخن میں منہمک رہتے تھے۔ ہمارے یہاں بالعموم مشاہیر کے حالاتِ زندگی شرح و بسط سے منضبط کرنے کا طریقہ مروج نہیں ورنہ بیانؔ کی شاعری کے مختلف مدارج پر غور کرنا خالی از دلچسپی نہ تھا۔ تاہم دو تین اشعار اُنکی

ابتدائی مشق کے جو ہم پہنچے ہیں اُنکے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آغاز ہی سے اُنکی طبیعت کس قدر معنی یاب واقع ہوئی تھی۔ تقریباً پندرہ برس کی عمر کے یہ تین اشعار اُنکی یادگار ہیں ؎

گھبرا کے جہاں سے یہ تم کش ترے گھر جائے ۔ اور در ہو ترا بند تو بتلا کہ کدھر جائے
ہٹ ہٹ کے اندھیرا اگر و آنکھوں کے آگے ۔ واں تک تو نظر آؤ جہاں تک کہ نظر جائے
رنگ اُڑ گئے ہو غمخوار مرا حال نہ کہنا ۔ میں جانتا ہوں آنکھ دو میری خبر جائے

سخن فہم حضرات دیکھیں گے کہ دوسرا شعر کس قدر بلیغ ہے اور تیسرے شعر میں غالب کے رنگ کی جھلک موجود ہے۔ یہ صفت ہر شخص میں نہیں ہو سکتی اور پھر اس عمر میں اس پایہ کے شعر کہنا کوئی معمولی بات نہیں۔

بیان فنِ شعر میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ صاحب "خمخانۂ جاوید" نے انھیں سید احمد حسن فرقانی کا شاگرد رشید لکھا ہے اور اسی تلمذ کے ساتھ وہ اکثر علمی حلقوں میں مشہور بھی ہیں لیکن فی الحقیقت اُنھوں نے زانوئے شاگردی کسی کے آگے تہ نہیں کیا۔ میر سید حسین صاحب برادر حضرتِ بیان سے اس بارے میں استصواب کیا گیا تھا اسکے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ

برادر مرحوم حقیقت میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ میر احمد حسین فرقانی اُن کے ماموں تھے۔ برادر مرحوم اُنکی تعظیم کرتے تھے اور اسلیے اُنکو اپنا اُستاد بھی لکھدیتے تھے۔ ورنہ حقیقت میں اُنھوں نے اُنکو ایک شعر بھی بنظر اصلاح نہیں دکھلایا بلکہ بحیثیت شاعرانہ اُن میں اکثر مباحثہ بھی ہو جاتا تھا۔

درحقیقت جو صاحبِ کمال "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کے مصداق اپنی طبیعت میں خود جوہرِ فن رکھتے ہیں وہ دوسروں کے مشورہ سے عموماً مستغنی ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اُستاد کی نظرِ تربیت سونے کو اکسیر کر دیتی ہے اور شاگرد کے ذاتی اوصاف کو اور چمکا دیتی ہے۔ بیان اس سے محروم تھے لیکن اُنھوں نے اپنی زوردار طبیعت کی بدولت اپنے لیے خود ایک ایسی شاہراہ پیدا کرلی جہاں ذوقِ سلیم کے سوا اور کسی رہنما کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بیان کا کلام اُنکے کمال کی دلیل ہے۔ اُنھوں نے جس طرح چاہا اپنی طبیعت کا رنگ دکھایا اور اسمیں شک نہیں کہ اُنکا ہر رنگ چوکھا ہی رہا۔ غالب کے کلام کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت اُنکے خیالات کا اچھوتا پن ہے۔ معمولی سے معمولی بات کو وہ جدت کے ساتھ کہتے ہیں کہ سنکر جی خوش ہو جاتا ہے۔ بیان بھی اس امرِ خاص میں غالب کے پے بہ پے ہیں۔ مبتذل مضامین کو وہ ایسی شگفتگی سے باندھتے ہیں کہ سنکر لطف آجاتا ہے۔ بعض جگہ محض ایک دو لفظ سے وہ شعر میں جان ڈالدیتے ہیں۔ ذیل میں دو چار شعر اسی نمونہ کے ملاحظہ ہوں ؎

اُٹھے زمیں سے لالۂ خونیں کفن کی طرح ۔ محشر ہے ایک کھیت شہیدانِ یار کا
پیتی گلے سے تیغ تو سودا نہ سر د ہوا ۔ یہ جونک خون چوس گئی جسمِ زار کا
لائے گھسیٹ کر ترے در سے شہید کو ۔ دامن لہولہان ہے روزِ شمار کا
دامنِ دشتِ قیامت ہے اکا دکھی سی گلی ۔ گل کھلائے غضب لے چاکِ گریباں تونے

خیالات کی جدت ان اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

ترے چلنے سے سینہ میں زمیں کے ۔ اُٹھا اک درد محشر کے بہانے
ہمیں نے پنجۂ دستِ جنوں سے ۔ کیے ہیں کوہ کی چوٹی میں شانے
کون آتا ہے قیامت کسے شرم آتی ہے ۔ کہ مرا خون چھپایا تہِ داماں تونے

رفتارِ معشوق سے محشر برپا ہونا، دستِ جنوں سے کوہسار کے ٹکڑے اُڑانا، یا معشوق کا عرصۂ قیامت میں شرمسار آنا، اُردو شاعری کے متداول مضامین ہیں مگر بیان نے ہر مضمون کو جدت کے ساتھ نظم کیا ہے۔ رفتارِ یار سے زمین کے سینہ میں محشر کے بہانے درد اُٹھنا بالکل نیا خیال ہے۔ تیسرے شعر کے معنی بھی نہایت لطیف ہیں کہ خود قیامت نے معشوق کے محجوب ہونے کے خیال سے عاشق کے خون کو اپنے دامن میں چھپایا ہے۔

ذیل کے اشعار کس درجہ بلیغ واقع ہوے ہیں۔ ان کی داد اہلِ نظر خوب دیں گے ؎

نہ کھولی آنکھ وقتِ نزع بیمارِ محبت نے ۔ کسیکا پردہ رکھنا تھا کوئی آنکھوں میں پنہاں تھا
کس رشکِ مہر و ماہ کا آوارہ گرد ہوں ۔ ہو آسماں نقاب مرے مشتِ غبار کا

رکھا ہے پاؤں واں ترے مشتاقِ دید نے　　ہے شمعِ طور نام جہاں خار خار کا

بے ٹھکانوں کو ڈھونڈھتا ہوں میں　　کہ پتے ہیں ترے ٹھکانے کے

میرے نالوں سے کانپتی ہے برق　　منھ میں تنکے ہیں آشیانے کے

ہر ایک شئی میں پنہاں تیرا مقام نکلا　　توڑا جو بت کدہ کو بیت الحرام نکلا

موخرالذکر طرح میں بہ تبدیل قافیہ ایک غزل لکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ معانی، زبان اور سلاست بیان خصوصیت سے قابل غور ہے ؎

ڈھنگ بے ڈھنگ ہیں زمانے کے　　رنگ بیرنگ ہیں زمانے کے

موے مشکیں نے باندھ لیں مشکیں　　یہی سرہنگ ہیں زمانے کے

اک نیا رنگ روز لاتے ہیں　　آپ ہم رنگ ہیں زمانے کے

واہ رے نقش! واہ رے نقاش!　　آئینے دنگ ہیں زمانے کے

گردشِ آسماں فلاخن ہے　　آدمی سنگ ہیں زمانے کے

تیسرے شعر کا مضمون کس قدر لطیف ہے اور آخری شعر میں گردش آسمان کو فلاخن سے اور انسان کو پتھر سے کتنی قریب الفہم اور معنی خیز تشبیہ دی گئی ہے۔

اِن اشعار پر بادی النظر میں غالب کا دھوکا ہوتا ہے ؎

سرِ شوریدہ پائے دشت پیما شامِ ہجراں تھا　　کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا

گئے تھے رونے دل کو لیے بیٹھے ہیں تلووں کو　　فرو رگ رگ میں نشتر تھے نہاں نس نس میں پیکاں تھا

انکا منجملۂ اربابِ وفا ہو جانا　　میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا

غمِ الفت گلوگیرِ نفس ہے پھیر دو خنجر　　نہیں آسان ہو مشکل۔ ہمیں آساں ہو مشکل ہے

مشکل ہے، قاتل ہے، اس زمین میں سید بیانؔ نے جو غزلہ کہا ہے اور چاروں غزلیں بہت دھوم دھام سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک غزل جسکا ایک شعر یہ ہے بہت مشہور ہے اور اربابِ نشاط کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے ؎

چلی آتی ہیں نذریں دھوم سے دربارِ قاتل تک　　کسیکا سر ہتھیلی پر کسی کے ہاتھ میں دل ہے

چاروں غزلیں مصنف کے اصلی رنگ طبیعت کا دل فریب نمونہ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ انکا ہر شعر دوسرے شعر سے بڑھا ہوا ہے۔ جو لوگ غزلوں میں شکوہ الفاظ و بدیۂ مضمون کی تصویر دیکھنا چاہیں وہ ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیں ؎

شہادت منزلِ مقصود ہے ملاح قاتل ہے　　یمِ مواجِ بیتابی دمِ شمشیر ساحل ہے

تگ و تازِ سمندِ جسم تا ایوانِ قاتل ہے　　اُڑے لے سرِ شوریدہ اب نزدیک منزل ہے

مزا پھرتا ہے ہونٹوں پر تلاشِ خونِ بسمل ہے　　زباں بگڑی ہوئی ہے کیا چھری تیغِ قاتل ہے

وہ مجنوں ہوں وہ میر شاہدِ لیلیٰ شمائل ہے　　زمیں جسکا بیاباں چرخ ناقہ عرش محمل ہے

وہ محفل محفلِ شادی ہے ہر سو رقصِ بسمل ہے　　شہیدِ ناز ہے دولھا۔ دلھن شمشیرِ قاتل ہے

یہ شعر کس موثر انداز میں کہا گیا ہے ؎

قیامت کی نگاہِ یاس نے کیوں نیچہ مارا　　کہ قاتل نیم بسمل ہے دمِ شمشیر بسمل ہے

"شاہدِ لیلیٰ شمائل" کی تعریف اوپر ایک مطلع میں گذر چکی ہے۔ اسی محمل کے قافیہ کو ایک مقطع میں پھر اُسی شان سے نظم کرتے ہیں ؎

مرا دل لے بیاں مجنوں ہے اُس لیلیٰ شمائل کا
غبارِ عالمِ ایجاد جس کی گردِ محمل ہے

ذیل کے شعر میں تکرار کتنی پُر لطف ہے اور مضمون بھی نہایت شگفتہ ہے ؎

وہ ہیں چشمِ تصور میں لگی ہے چشمِ شوق اُن سے　　تماشا ہے کہ دل قاتل میں ہے اور دل میں قاتل ہے

وہ کہتے ہیں مرا پیکاں میں کہتا ہوں مرا ارماں　　وہ کہتے ہیں مرا مسکن میں کہتا ہوں مرا دل ہے

"نگاہِ یاس" والا شعر نہایت پُر اثر ہے۔ زار و نالی کے مضامین انکے کلام میں کم نظر آتے ہیں باایں ہمہ جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔ یہ شعر کتنا حسرت آمیز ہے ؎

خدا ٹھنڈا رکھے اے شمع تجھکو　　کھڑی روتی ہے بیکس کے سرہانے

اسی طرح ارمان کی "جواں مرگی" کا ماتم بہت پُر درد ہے ؎

عمر بھر قید رہا ہائے جوانمرگ ہوا　　کچھ بھی دنیا میں نہ دیکھا مرے ارماں تو نے

اس غزل کا مطلع قابل دید ہے اور دنیائے فانی کی کیفیات کا آئینہ ہے کہتے ہیں ؎

کیا ہوا اُن کو اتارے تھے جو مہماں تو نے　　کچھ بتایا نہ لبِ گورِ غریباں تو نے

ناظرین سخن فہم نے غور کیا ہوگا کہ بیانؔ کس قسم کے شعر گو تھے اور انکا دلی رجحان کس طرف تھا۔ جدت پسندی کے باوجود انکے کلام کا حصہ ایسا بھی ہے جو سلاست اور سادہ گوئی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ؎

ہو چکا کسی کی آرزو سے ہماری آرزو نکلی لہو سے
یہ ٹوٹے گی ہوئے گل سے واعظ مری توبہ کو کیا نسبت وضو سے

ترا کشتہ اُٹھا یا اللہ بانے چلے محشر کو مٹی میں دبانے
نگاہیں قہر میں ڈوبی ہوئی ہیں لگے تم زہر میں چھریاں بجھانے

مرے مجموعۂ خاطر پہ تو نے کیا جو تیرے گیسوے صبا نے
یہ ہے شام فرقت یہ ہے شام فرقت نہ ہوگی نہ ہوگی سحر دیکھ لینا

وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنا تعلق اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا
اب مجھے کھوکے نہ روؤ کہ اگر روئیگی شمع جان پڑ جائیگی کیا خاک میں پروانے کی

جلوہ سے ڈال دیا چشم تماشا پہ نقاب یہ نئی وضع ہے ظالم ترے شرمانے کی
مجھے بھی نقد آمرزش کی محشر میں ضرورت ہو شہنشاہا کمی کیا ہو تری سرکارِ رحمت میں

جہاں پُر شور ہوئے دل پژمردہ گنجِ عزلت میں کہیں مارا نجائے جنگ ہفتاد و دو ملت میں

مضامین کی دھوم دھام اور الفاظ و ترکیب کی بلند پائگی کے اعتبار سے جس شخص کی غزلیں بسا اوقات قصیدوں کا دھوکا دیتی ہوں اُسکے قصیدہ کا کیا کہنا۔ ہمیں افسوس ہو کہ سید بیانؔ کا کوئی اُردو قصیدہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ اُنکے قصائد جہاں تک قیاس کیا جا سکتا ہو عموماً فارسی میں ہیں۔ سید بیانؔ اُردو کی طرح فارسی کے ایک نغز گو اور جید شاعر تھے۔ اور اس میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ فارسی قصائد کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہو کہ وہ اس معرکہ میں بھی اچھے اچھوں سے نمبر لیگئے ہیں۔ اُصولاً اُنکے قصیدے خاقانی کے اور ادائے مطالب کے لحاظ سے انوری کے قصیدوں کے ہم پلہ ہیں۔ منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں ایک قصیدہ کہا ہے جسکی تمہید قابل دید ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے خوشا کوکبۂ گل کہ بگلزار رسید زاد شبگیر زد و لالہ بہ دیوار رسید
جعد را سنبل پُر پیچ چو شانہ آراست کس صبا شانہ کش طرۂ طرار رسید
در بہاراں گل اگر فرد بہائے دارد خار را سرو قدے داں کہ ز فرخار رسید
باد در صحن چمن طبلۂ عطار گشود پنبہ ساں غنچہ ازاں طبلۂ عطار رسید
سرو خضریست کہ پیرایۂ خضرا در بر لب جو صورتِ عباسؑ علمدار رسید
رنگ چوں آلِ محمد بہ ریا ہیں داوند خلۂ سبز چو سادات باشجار رسید
از سمک تا بہ سمانیست وجودِ خلشے گل زگلزار و زجو ماہی بے خار رسید

سرو کی تشبیہ حضرت عباس علمدار سے کس قدر لطیف و بامعنی ہی۔ اسی طرح آخری شعر میں خلش نہ ہونے کا ثبوت "ماہی بیخار" سے کتنا اچھا بہم پہنچایا ہو۔

میرٹھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا۔ اُس میں سید بیانؔ بھی شریک تھے۔ اسکے لیے ایک قصیدہ بڑے معرکہ کا کہا ہو تشبیب کتنی بلند ہے ؎

ساقی بیا درے زدن کا وانِ باران آمدہ وز کوہساراں قطرہ زن ابرِ بہاراں آمدہ
اُردی بہشت آمد کنوں گلشن بہشت آمد کنوں از خشت خشت آمد کنوں تا گل بہ ایواں آمدہ
از گل نشاط انگیختن وز باد عنبر بیختن از ابر لؤلؤ ریختن وز چاک داماں آمدہ
مرغ از طرب دستاں زند گلخندہ چوں مستاں زند چقماق در بستاں زند برقے کہ رخشاں آمدہ

قصائد میں حصۂ غالب مدح ممدوح کا ہوتا ہو لیکن چونکہ تعریف میں مبالغہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہو اس لیے سامعین کے دل پر اُسکا اثر چنداں نہیں ہوتا۔ سید بیانؔ نے اسی قصیدہ میں مسٹر محمود مرحوم اور آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی تعریف نہایت معنی خیز طور پر کی ہو اور چونکہ اُسمیں واقعیت کو بھی دخل دیا گیا ہو اس لیے مضمون مزیدار ہوگیا ہو۔ مسٹر محمود کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

ترکان تازی را اگر پیرِ حجازی را اگر محمودِ غازی را اگر با فر سلطاں آمدہ
دانش ورش راچ کند دانائے ہند شاں بخ کند عزت کلاہش کج کند فرش فراواں آمدہ

مولوی سید حسین بلگرامی کی مدح میں یہ شعر داد طلب ہیں ؎

آں سید جید حسین آں مصطفیٰ را نورِ عین صدرِ شرف را زیب و زین در بزم اعیاں آمدہ
گویند نامی گوہر است او بلگرامی گوہر است لا بل گرامی گوہر است کز معدن عدناں آمدہ

منشی عبد الکریم سی آئی ای کی تعریف اِن الفاظ میں کرتے ہیں ؎

بخلوت در۔ ندیم بارگاہِ عزتے جہانی بجلوت در۔ مشیرِ قیصرِ ہندوستاں بینم

با قلیمِ دو آب اندر دو پنجاب این منم
دو دستِ امتناں گستردہ انگشتِ عطارِدِ

سید بیاں کے قصائد و غزلیات کا ذکر اُسوقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اُنکے نعتیہ کلام پر بھی سرسری نظر نہ ڈالیجائے۔ اس صنف خاص میں متاخرین شعراے اُردو میں حضرت محسن کاکوروی نے قابل رشک امتیاز حاصل کیا ہے۔ حضرت غلام امام شہید بھی مداحِ رسولِ امی کی حیثیت سے نہایت ناموری پا چکے ہیں۔ ان بزرگوں کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت اُنکی وہ تاثیر کلام ہے جو صرف سچے عاشقانِ نبیؐ کے دلوں میں پیدا ہو کر زبان اور قلم سے نکل سکتے ہیں۔ مضامین آفرینی کے اعتبار سے نواب رضوان مرادآبادی بھی ذکر کے قابل ہیں۔ لیکن فی الحقیقت اور بہت کم شاعروں نے اس طرف توجہ کی ہے۔ ہر شاعر کے دیوان میں چند نعتیہ غزلیں موجود ہونگی لیکن وہ صرف تیمناً و تبرکاً داخل کیجاتی ہیں۔ امیر مینائی لکھنوی نے البتہ پورا دیوان نعتیہ قصائد و غزلیات کا مرتب کیا ہے اور اُردو میں اس قسم کے مستند کلام کی جو کمی تھی وہ اس سے بہت کچھ پوری ہو گئی ہے۔ سید بیاں کا نعتیہ کلام محسن و شہید کے برابر نہیں رکھا جا سکتا لیکن اُنھوں نے بھی آں حضرت کی شان میں اپنی طرز میں اچھا کہا ہے اور بعض بعض چیزیں تو واقعی اس قدر موثر ہیں کہ گویا دل سے نکلی ہیں۔ اُنکی ایک نعتیہ غزل بہت مشہور ہے جسکا مطلع ہے ؎

بے نقاب آج تو او گیسوؤں والے آجا
خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹائے آجا

اس غزل کا یہ شعر بیحد کیفیت انگیز ہے ؎

کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے آجا
ہوں سیہ کار مرے عیب کھُلے جاتے ہیں

اِسی کے چند اور اشعار قابل داد ہیں ؎

راہ میں چھوڑ گئے قافلہ والے آجا
بیکسی پر مری خوں روتے ہیں چھالے آجا

خلوتِ راز میں لے نازکے پالے آجا
پہنچا محبوب تو شاطۂ رحمت نے کہا ق

لے گُل گلشنِ لولاکَ لمَا۔ لے آجا
رنگ وحدت ہے یہاں غنچۂ خلوت ہے یہاں

پڑ رہے ہیں ترے بیمار کے لالے آجا
صورتِ لالہ ہے پُر داغ بیاں کا سینہ

ایک نعتیہ غزل اور قابل تذکرہ ہے جو ایک متداول زمین میں لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی چیدہ چیدہ اشعار دیکھنے کے لائق ہیں ؎

کہ ہے اللہ کا دیدار نظارہ محمدؐ کا
ضیاے دیدۂ حق بیں ہو رُخسارہ محمدؐ کا

یہ سیپارہ محمدؐ کا وہ صد پارہ محمدؐ کا
قمر سمجھیں کہ ہم قرآن رُخسار محمدؐ کا

کریگا سامنا کیا کوئی مہ پارہ محمدؐ کا
وہ محبوب الٰہی ہے کیا ہے اُسنے مہ پارہ

سدا بجتا ہے پانچوں وقت نقارہ محمدؐ کا
اذاں ہے شور اُس سلطانِ بے کوس شاہی کا

میں دُکھیارا محمدؐ کا میں دُکھیارا محمدؐ کا
وہ شافی میرے دردوں کا وہ کافی میرے دردوں کا

نعتیہ کلام کے آخر پر منقبت حضرت علی کے یہ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین کو سید بیاں کی پُرگوئی اور قادر الکلامی کے ساتھ اُنکی وسیع نظری کا بھی اندازہ ہو سکے۔ لکھتے ہیں ؎

باغِ ابراہیم میں فصلِ بہار آنکو ہے
خانۂ حق میں علی سا گلعذار آنکو ہے

گلفشانِ شاخسارِ ذوالفقار آنکو ہے
جھومتا ہے بادِ فروردیں سے کعبہ کا غلاف

دیو در، عفریت کش، ضیغم شکار آنکو ہے
قلعہ کُن، خیبر شکن، عنتر فگن، اژدر شگاف

وہ مقدس بندۂ پروردگار آنکو ہے
بعض بندے جسکو نادانی سے کہتے ہیں خدا

آیۂ لَا سَیفَ اِلَّا ذوالفقار آنکو ہے
لَا فتیٰ اِلَّا علی کا غلغلہ اُٹھنے کو ہے

چوتھے شعر میں نُصیریوں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت علی کو (معاذ اللہ) خدا کہتے ہیں۔

مرثیہ بھی آجکل جداگانہ فن کی صورت اختیار کیے ہوے ہے۔ اور اس فن میں انیس و دبیر یا اُنکے جانشینوں نے جو نام پیدا کیا ہے اُسکے آگے کسی کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ غالب نے بھی اس میدان میں تلوار بیان میں کر لی تھی حالانکہ جذبات نگاری کا فطری ملکہ جو اُنھیں تھا اُسکی نظیر کسی اور شاعر کے کلام میں ملنا غیر ممکن ہے۔ بیاں نے میر انیس کی طرز پر تین چار مرثیے کہے ہیں اور بجاے خود وہ بہت کچھ قدر کے شایاں ہیں۔ ایک مسدس کی فخریہ تمہید یوں لکھی ہے ؎

دریاے فیض کانِ شرف ہے سخن مرا
خورشید آسمانِ شرف ہے سخن مرا

چترِ خدا یگانِ شرف ہے سخن مرا   شاہنشہِ جہانِ شرف ہے سخن مرا

اس زور شور سے کوئی لشکر بڑھا نہیں

اس اوج موج سے کوئی دریا چڑھا نہیں

بسمل کیا عدو کو ستم ہے زباں مری   گویا زبانِ تیغِ دو دم ہے زباں مری

تیغِ علی کی طرح علم ہے زباں مری   سیفِ خدا خدا کی قسم ہے زباں مری

فقرے پکارتے ہیں کہ معجز نگار ہوں

مدحت طرازِ بادشہِ ذوالفقار ہوں

اُنکے مراثی کو بلا استیعاب دیکھتے ہوئے یہ کہدینا مشکل ہے کہ سید بیاںؔ کا مرتبہ مرثیہ گوئی میں کیا درجہ ہے۔ تاہم اوپر کے دو بند اُنکے انداز کے ذہن نشین کرنیکے لیے کافی ہیں۔ انیسؔ و دبیرؔ دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتے۔ لیکن اُنکے خاندان والوں نے اپنے گرامی منزلت بزرگوں کا نام اچھی طرح روشن کیا ہے گویا ابھی تک مرثیہ گوئی اُن لوگوں کا موروثی ترکہ ہے۔ یقینی بات ہے کہ اُردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُنکی ملکیت کے دعویدار بھی پیدا ہوتے جائینگے اور ایکدن اپنا حصہ لیکر رہیں گے۔ سید بیاںؔ اور اسی قسم کے دوسرے شعراء کی یہ کوششیں اُسی دعوے کا ابتدائی ثبوت ہیں اور اسی قبیل سے شعرا غالباً ایکدن اپنی مساعی جمیلہ سے دنیا پر ثابت کردینگے کہ کوئی علم اور کوئی فن کسی خاص شخص یا کسی خاص طبقہ کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ صاحبِ ہمت کے آگے پہاڑ بھی سرنگوں ہوتا ہے۔

سید بیاںؔ کے مراثی گو انیسؔ و دبیرؔ کی ٹکر کے نہیں ہیں لیکن اُن کے تصنیف کردہ "سلام" بہر صورت اس قابل ہیں کہ لکھنؤ کے مشاہیر کے بالمقابل لائے جائیں۔ مونسؔ کا ایک مشہور سلام ہے جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

عذابِ نارِ سقر سے معاف ہم بھی ہیں   کہ عبدِ ہاشم و عبد مناف ہم بھی ہیں

اجل کے تیغِ علیؑ نے کہا کہ بسم اللہ   بہ عین حضور بہ تیغ کے غلاف ہم بھی ہیں

کبھی تو یاد کرا دے کعبۂ خلیل اللہ   کہ مستحقِ ثوابِ طواف ہم بھی ہیں

نجف ہو یا کہ ہو جنات عدن ہو یا کہ بہشت   علی جہاں ہیں وہیں بے اختلاف ہم بھی ہیں

صراطِ بال سے باریک ہو تو ہو مونسؔ

کچھ اسمیں فرق نہیں مو شگاف ہم بھی ہیں

اسی ردیف و قافیہ میں سید بیاںؔ کے اشعار دیکھیے ؎

سخن کے معرکہ میں گرم لاف ہم بھی ہیں   برنگِ تیغِ علیؑ بے غلاف ہم بھی ہیں

زبانِ چیں سے کہا آستین مولا نے   کہ سیفِ دستِ خدا کے غلاف ہم بھی ہیں

زمیں پکاری کہ خاکِ درِ حسینؑ ہو ہمیں   کہا فلک نے شریکِ طواف ہم بھی ہیں

کہا حسینؑ کے اعضا نے قطع ہو ہو کر   مقطعات بلا اختلاف ہم بھی ہیں

بیاںؔ بہشت میں مونسؔ سے چلکے کہتے ہیں

کچھ اسمیں فرق نہیں مو شگاف ہم بھی ہیں

مقطع میں سید بیاںؔ نے شاعرانہ شوخی سے کام لیا ہے۔ مونسؔ اپنے موشگافی کے دعوے میں بال برابر فرق تسلیم کرتے ہیں اور بیاںؔ اپنے موشگاف ہونے میں اتنا فرق بھی جائز نہیں رکھتے۔ عبد مناف کا قافیہ بیاںؔ نے بھی یوں نظم کیا ہے ؎

کہا یہ حُر نے شہِ دیں سے ہو کے پیوستہ   کہ سروِ گلشنِ عبد مناف ہم بھی ہیں

اس سلام میں سید بیاںؔ نے قافیہ پیمائی کی شان نہایت عمدگی سے دکھلائی ہے بہت سے نامانوس اور دقیق الفاظ کو غایت خوبی سے نباہا ہے۔ ملاحظہ ہوں ؎

یہ آفتاب کا ہے قول حیطِ ابیض سے   برائے مسندِ شہ زرباف ہم بھی ہیں

غبارِ شاہ کا ہے قول روشنائی میں   عیونِ شمس و قمر کے شیاف ہم بھی ہیں

پکارے گر کے صنم جب علیؑ نے کی تقطیع   کہ بیتِ ربِ عُلا کے زحاف ہم بھی ہیں

اس شعر کا مضمون کتنا بیساختہ ہے ؎

رسولؐ کہتے ہیں مولا کے خاکسار ہوئے   فلک کرے تو کرے انحراف۔ ہم بھی ہیں

ایک اور سلام کا مطلع کس قدر پُر درد ہے ؎

صدا مجرائی آتی تھی لبِ شمشیرِ قاتل سے   رگیں پیاسے گلے کی خشک ہیں کٹتی ہیں مشکل سے

اسکا ایک اور شعر مضمون و طرزِ بیان کے لحاظ سے خوب ہے لیکن بیاںؔ نے باندھا

یاے اول کانوں کو اجنبی سا معلوم ہوتا ہے ؎

لبِ دریا پیاسے رہ گئے حضرت یہی غم ہے ۔۔۔ کہ اب تک موج اب تک سر کو ٹکراتی ہے ساحل سے

دو ایک معرا نظمیں "محرم نامہ" وغیرہ کے نام سے لکھی ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

آگیا ساقی غم کا مہینا ۔۔۔ توڑ دے ساغر پھوڑ دے مینا
آنا آنا دوڑ کے آنا ۔۔۔ خندۂ جام کو آنکھ دکھانا
بارہ مہینے عیش پہ لپکے ۔۔۔ ہفتہ عشرہ اشک بھی ٹپکے
شیشۂ سبز تڑاق سے ٹوٹے ۔۔۔ ساغرِ سرخ پڑاق سے ٹوٹے
ساغرِ مُل نہ مینا بھر دے ۔۔۔ خونِ جگر سے مینا بھر دے

شاعری خوب ہے لیکن جذبات صحیح نہیں۔ طرزِ بیان ایسا ہونا چاہیے تھا کہ سامعین کے دلوں کو گداز کرے۔ ان اشعار کو سنکر قلوب پر رنج و غم کے اثرات طاری نہیں ہو سکتے بلکہ خیال کو تلازمے اور استعارے اپنی طرف پھیر لیتے ہیں۔ مولنا حالی کا وہ اصولی اعتراض جو آپ نے مثنوی گلزار نسیم کے اُس حصہ پر کیا ہے جہاں بکاؤلی پھول چوری جانے پر گریہ و فریاد کرتی ہوئی یہ کہتی ہے ؎

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون ۔۔۔ ہے ہے مجھے داغ دے گیا کون
شبنم کے سوا جُڑانے والا ۔۔۔ اوپر سے تھا کون آنے والا

سید بیان کے شعروں پر بھی صادق آتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ اس مضمون کو پُر درد انداز سے لکھنے پر قادر نہ تھے۔ اسی قسم کی ایک اور نظم کے مندرجۂ تحت اشعار سے ہمارے خیال کی تصدیق ہو جائیگی ؎

چاند محرم کا نظر آیا ۔۔۔ آنکھ میں یا لختِ جگر آیا
تڑپ رہے ہیں رسولؐ کے جانی ۔۔۔ بند ہوا ہے دانہ پانی
روتے ہیں بچے پیاس کے مارے ۔۔۔ دُرِ نجف بے آب ہیں سارے
شاہ کا سر اور نیزۂ اُمت ۔۔۔ نقل ہے جس کی مہرِ قیامت
رہتے تھے جن ہونٹ نبیؐ کے ۔۔۔ ایسے گلے پر دانت چھری کے

صاف و سادہ الفاظ ہیں لیکن کم و بیش تاثیر سے مملو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مضامین لکھنے پر قادر تھے۔ یہ اتفاقی بات ہے کہ کسی نظم میں طبیعت کا رُجحان کسی خاص سمت ہو جائے۔ واجد علی شاہ اختر کا فارسی مرثیہ بہت درد انگیز لکھا ہے۔ مفصلۂ ذیل انتخابی شعروں میں ہستیِ ناپائدار کا خاکہ اچھا کھینچا ہے ؎

بیا تا بنالیم چوں قُمریاں ۔۔۔ کہ شاہاں کجایند و میراں کجا
بگورِ ابۂ تاجداراں خرام ۔۔۔ نہ چاؤش و ہاروں نہ کوس و دما
نہ آں تاج بینی نہ آں تارکش ۔۔۔ بہ زنداں سرائے سکندر درآ
کنوں یکدرم نیست زنیساں اثر ۔۔۔ فیا حسرتا ثُمّ وا حسرتا
نشیند یکے تا نہ خیزد دگر ۔۔۔ ابر تختِ اقبال نگست جا
مکاری سرود الرحیل الرحیل ۔۔۔ منادی زند الفنا الفنا

سید بیان جس زمانہ میں ایشیائی شاعری کے چمن کو اپنی آبیاریِ فکر سے نشو و نما کا سامان بہم پہنچا رہے تھے اُسی وقت ہندوستان میں وہ گروہ نمودار ہو رہا تھا جس کی دور بیں نگاہوں نے بتا دیا تھا کہ مغربی شاعری کے اتصال سے اُردو شاعری میں یقینی طور پر انقلاب آنے والا ہے۔ موخر الذکر گروہ کے افراد کی انقلاب انگیز کوششیں شروع ہو چکی تھیں اور پروفیسر آزاد و مولنا حالی کے مقلدوں کی ایک نئی جماعت کے ہاتھوں ایشیائی طرزِ سخن کی اصلاح کا کام شروع ہو چکا تھا۔ سید بیان ان حالات سے کیسے ناواقف رہ سکتے تھے۔ غالباً اُنھوں نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ہماری قدیم شاعری ترمیم و اصلاح کی محتاج ہے۔ اُنکے کلام میں قومی غزلیات موجود ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بزم عزائے قومی میں جہاں حالی اپنا مرثیہ پڑھ پڑھ کر فدائیانِ قوم کو تڑپا رہے تھے سید بیان بھی آنسو بہانے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ انکے یہاں اکثر قومی طرحیں ہوتی تھیں اور اُنپر وہ خود اور اُنکے تلامذہ طبع آزمائی کرتے تھے۔ اُنھوں نے ایک مسدس "ایشیائی شاعری کی الوداع" کے عنوان سے لکھ کر

قدیم شاعری کا حق رفاقت ادا کیا ہے جسکا ایک بند یہ ہے ؎

تاراج تیرا سب اے شاہزادی   غمی سے مبدل ہوئی تیری شادی
مرادوں کے بدلے ملی نامرادی   زمانہ نے تصویر تیری مٹا دی
نہ وہ چاندسی شکل نکھری ہوئی ہے
نہ وہ عنبریں زلف بکھری ہوئی ہے

ایک قومی غزل کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے ؎

کیا عالمِ سکوت میں ہے گلستانِ قوم   کوئی نہیں ہے بلبلِ جادو بیانِ قوم
وہ ٹوٹ کر گرا متحمل نہیں کوئی   اللہ کس زمیں پہ رکھوں آسمانِ قوم
اب تک تو کچھ گیا نہیں دیکھ آنکھ کھولکر   مٹ جائیگا تو پھر نہ ملے گا نشانِ قوم

کانفرنس والے قصیدہ میں علم کی ضرورت ان الفاظ میں بتائی ہے ؎

شاہنشہ دیں گفتہ است باشرع وآئیں گفتہ   لو کان بالقیس گفتہ است یں گفتہ برہان آمدہ
ہم علم ابداں بایدت ہم علم ادیاں بایدت   ہم ایں وہم آں بایدت کا علم علمان آمدہ
خواہ سرت و بیم را از کف مدہ تسلیم را   کیں فاتح است اقلیم را فتحش نمایاں آمدہ

حضرتِ بیان نیچرل نظمیں بھی خوب لکھتے تھے۔ نمونہ کے طور پر ہم ایک نظم کے چند اشعار نقل کرتے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ نیچرل مضامین کو کس ندرت اور کس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ جاڑے کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

دھوم مچاتی سردی آئی   دانت بجاتی سردی آئی
ڈھک گیا منھ اور چھپے ہاتھ   جاء البرد مع الجبات
دانت کی ڈونڈی گھر کا اکھاڑا   روئی کے بیج نے سب کو پچھاڑا
گھر گھر بانٹی دولت اس نے   سب کو دیا ہے خلعت اس نے
کسی کا شالی مول میں بھاری   کسی کا کمل تول میں بھاری
آگ سے بچ بچ لاگ ہے سب کو   آس اولاد کی آگ ہے سب کو
گود میں لی چھاتی سے لگالی   آج کل آگ ہے ننھی بالی
شب کو انگیٹھی سب کے قریں ہے   کوکوں پر اب مہر نہیں ہے

مولنا جعفر علی کا مرثیہ ترکیب بند لکھا ہے۔ پہلے بند کے یہ دو چار شعر دنیا کی حالت کا آئینہ ہیں ؎

ہائے جہانِ گذراں کچھ نہیں   غیرِ خداوندِ جہاں کچھ نہیں
وادیِ امکاں میں عبث دوڑ دھوپ   ماحصلِ ریگِ رواں کچھ نہیں
کھانہ طلسماتِ فلک کا فریب   گنبدِ نیرنگ ہے یاں کچھ نہیں
عالمِ شہود نہیں کوئی شے   آئی صدا غیب سے ہاں کچھ نہیں

اُن کے بعض حصۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑے واقف کار شخص تھے۔ انگریزی الفاظ بہت برجستہ استعمال کرتے تھے اور غیر زبان کے الفاظ ہونے کے باوصف اس طرح باندھتے تھے کہ بھدے نظر نہ آئیں۔ میرٹھ کے ایک سکول میں کوئی جلسہ منعقد ہوا تھا۔ صاحب ضلع وغیرہ رونق افروز ہوئے تھے۔ وہاں انھوں نے ایک نظم پڑھی تھی جسمیں انگریزی الفاظ کی کھپت قابل دید ہے ؎

لال کرتی کا سپاہی ہے گلاب   کالی پلٹن کا ہے سنبل سولجر
جھانکتی ہے صورتِ نرگس خوشی   کہتی ہیں کلیاں چٹک کر کم ہیر
کرتے ہیں پتے مسرت کے چیرز   دیتے ہیں طائر خوشی کا لیکچر
لیتی ہے بلبل کنارِ شوق میں   کہتے ہیں ہنس ہنس کے گل مائی ڈیر

مسٹر محمود کی تعریف میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

در روے آں شیوا بیاں لرزد ایڈیسن از زباں   پیچیدہ ملکنت در دہاں لب زیرِ دنداں آمدہ
تا در ادب بکشادہ لب زیں درگشن بکشادہ لب   سحبانِ اقصاے عرب ہومر زبوناں آمدہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مختلف ممالک کے قدیم وجدید علوم تاریخ و ادب پر کافی دسترس حاصل تھی ورنہ ہمارے بزرگ جن کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی ہو اُن کے لیے ایڈیسن اور ہومر سے روشناس ہونا کچھ کم حیرتناک بات نہیں۔

معلوم ہوتا ہے سید بیان کو سہرا لکھنے کا شوق تھا۔ ذوق و غالب والی طرح پر کم و بیش تین چار سہرے لکھے ہیں اور دوسری زمینوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ہم انکے منتخب اشعار نیچے لکھتے ہیں اور ان کے متعلق

اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں ؎

بنا ہے کعبۂ ابرو کا طاق چھوچھو کر　　نقاب نور حرم کی حریم کا سہرا
گلوں کو جان کے مہمان سرفراز کیا　　گواہ ہے ترے خُلقِ عظیم کا سہرا
لگی جو غنچۂ گُل کو چراغِ حُسن کی لَو　　تو بنگیا یدِ بیضا کلیم کا سہرا
پھول جھڑتے ہیں ترے خندۂ پیشانی سے　　ہے بنا تا حَسَنا حسنِ حسیں کا سہرا

پھول جوہی کا وہی ہے جو میسّر ہو تجھے　　کیوں نہ پھر ناز کرے پڑھکے ترے سر سہرا
دام ہر رنگ زمیں بود گرفتار شدیم　　رُخ پرنور ہے کندن تو ہے پُر زر سہرا
لپٹی ہیں تارِ نظر پہ جو چچا کی نظریں　　بنگیا روشنیِ صبح مکرّر سہرا
بوسے دیتا ہے جبیں پہ کبھی رُخساروں پہ　　زانکہ منظور نظر و اشتہ ایں ہر سہرا
گرمیِ حسن سے ٹپکے جو عرق کے موتی　　بنگئے رُخ کی شعاعوں میں اُلجھکر سہرا

اشعار کو تضمین کرنے میں بھی بیان کو امتیاز حاصل تھا۔ ناسخ کے مشہور و معروف مطلع سرِ دیوان پر کس برجستگی اور چُستی سے مصرعے لگائے ہیں کہ دل سے بیساختہ مرحبا نکلتی ہے ؎

مرا دیدہ ہے منبع آدمِ ثانی کے طوفاں کا　　مرا پہلو ہے مشہد کشتۂ امید و ارماں کا
مرا حلقوم ہے مغرب ہلالِ تیغِ بُرّاں کا　　مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ایسے ہی وزیر کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے اور خوب کیا ہے ؎

حُسن و قبحِ روئے زیبا کھُل گیا　　شرح کے خط سے معمّا کھُل گیا
مو بمو مضمون سارا کھُل گیا　　عاقبت بینوں پہ نکتا کھُل گیا
حُسنِ عارض عارضی تھا کھُل گیا
خط کے آتے ہی لفافا کھُل گیا

رعایتِ لفظی و معنوی کے اعتبار سے ناسخ کے شعر والی تضمین بالکل اچھوتی ہے۔ اس شعر پر اور لوگوں نے بھی مصرعے لگائے ہیں مگر کوئی بھی اسکی خوبی کو نہیں پہنچتے۔

تاریخی مادے بھی بہت بامعنی اور برجستہ کہتے تھے۔ کسی عزیز کے یہاں لڑکا پیدا ہونے کی تاریخ کہی ہے ؎

ہوا احسانِ عظیمِ احدی سے لڑکا　　گُلِ رُخ دیکھکے جس کا دلِ بلبل پھڑکا
رُخِ فرزند سے ہے حق کی تجلی پیدا　　طور کا شعلۂ خاموش دوبارا بھڑکا
جوشِ عشرت کا ہوا نوبتِ اقبال بجی　　چرخ پر سے خوشی و عیش کا بادل کڑکا
زینتِ تاجِ سعادت ہے یہ تابندہ گُہر　　فکرِ تاریخ میں یوں طبع کا توسن بھڑکا
دیکھ کر روئے ولا ہاتفِ غیبی نے کہا
زیب کیا دیتا ہے ماں باپ کو موتی لڑکا

۱۳۱۵ھ

اپنے والد کے انتقال کی تاریخ کہی ہے ع گوہر افتاد ز تاجِ آفاق۔ ۱۳۱۰ھ

رباعیاتِ بیان بھی قابل قدر چیزہیں۔ بطور نمونہ دو ایک درج کی جاتی ہیں ؎

کیا نور ہے کیا نور ہے کیا نور ہے تو　　باطن سے عیاں بصر سے مستور ہے تو
عرشِ صمدی کجا۔ کجا جبلِ ورید　　کتنا نزدیک کس قدر دور ہے تو

حضرت کو طبیبِ دردِ امت پایا　　کیا نسخۂ تبرۂ قیامت پایا
رحمت کا زلال اور شفاعت کی شکر　　بیمار نے کس مزے کا شربت پایا

اکثر رباعیوں میں فخریہ مضمون باندھا ہے ؎

پروردہ خلاقِ جہاں ہے یہ فقیر　　سُن اسکی صدا کہ خوش بیاں ہے یہ فقیر
خلاق نے بھرا ہے کوٹ کر مغزِ سخن　　ہرچند کہ مُشتِ استخواں ہے یہ فقیر

فیضِ سخن آفریں ہے دمساز مرا　　کیوں روحِ قدس نہو ہم آواز مرا
بیٹھے رہیں بس چرخِ چہارم پہ مسیح　　دکھلائے سخن زمیں پہ اعجاز مرا

پہیلیاں بھی کہتے تھے مثلاً یہ انگشتری کی پہیلی ہے :۔

ہت ترے سر پہ پتھر پیٹ میں انگلی

غرض کہ ہر فن میں کمال رکھتے تھے۔ اُردو میں نثر بھی خوب لکھتے تھے لیکن اُنکی نثر بعض اوقات مقفّیٰ ہونے سے نثرِ غالب کی لطافت سے عاری ہوتی تھی۔ باایں ہمہ اکثر جگہوں پر بیساختہ لکھ گئے ہیں اور مقفّیٰ ہونے کے باوجود اس میں کوئی سستی یا اور عیب نہیں پیدا ہونے پایا۔ ایک

جگہ دفتر وجود کے عنوان سے لکھتے ہیں :-

دفتر وجود ایک سپید وسیاہ کتاب ہے۔ آسمان وزمین کے پٹھے لگے ہوئے ہیں۔ منقش جلد بندھی ہے۔ بحر محیط کا دائرہ اُسکی لاجوردی جدول شمار کی گئی ہے۔ کرہ بسیط کا احاطہ اُسکا گنجان حاشیہ قیاس کیا گیا ہے۔ ایام ولیالی یعنی دن اور رات اُسکے کالے اُجلے ورق ہیں۔ ذرّوں نے ورق پر رُوپہلی افشاں چُنی ہے۔ ستاروں نے سُنہرے نقطے لگائے ہیں۔ مہتاب نے جلد پر چاندی کا کام کیا ہے۔ دھوپ نے اوراق پر سونا پھیرا ہے۔ نشو ونباتی کی رنگ آمیزیاں صفحات کتاب کے بینائی نقش ونگار ہیں۔ لالہ وگل کا ظہور، سرو وسنبل کی نمود حواشی کی پھول پتیاں ہے

دلچسپ مرقع ہے ہر اک نقش یہاں کا   نقشہ کسی اُستاد نے کھینچا ہے جہاں کا

نثر آزاد کی رنگینی اور نثر غالب کی لطافت کو یہ نثر نہیں پہنچ سکتی لیکن اس سے اتنا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر سید بیان کو اُردو میں "پنج رقعہ" لکھنے کی خدمت سپرد کیجاتی تو وہ اسے کس عمدہ اسلوب سے پورا کرتے۔

صندلینہ کی جھپن سیر کے عنوان سے انکا ایک نثر مضمون اُس طرز تحریر کا نمونہ ہے جو کسی زمانہ میں اُردو اہل قلم کا نصب العین تھا۔ اس قسم کی تحریریں اب بھی ناولوں میں نظر آجاتی ہیں لیکن تبدیل مذاق کے ساتھ اب انکے قدرداں یہاں رہے نہیں :-

قامت کی شوخیاں رَومیں، قیامت کے فتنے جلو میں، پتی ہلتی تو ٹھٹک جاتی، پرچھائیں پڑتی تو جھجک جاتی، نرگس آنکھیں بچھا کر منتیں کرتی تو سمندِ ناز سے نیچے اُترتی، شوخی کا سُرنگ تراٹے بھرتا تو آنچل سبزہ پر اٹھکیلیاں کرتا۔ پوشاک کی کلیاں لہک جاتیں۔ گل سے پیرہن کی لپٹ جاتی تو نکہتِ گل دوڑ کر لپٹ جاتی۔

حضرت بیان کے احسانات جو اُردو زبان پر ہیں یہیں ختم نہیں ہوجاتے بلکہ اُنکا قلم ہر طریقہ سے اُردو علم ادب کی خدمت کرتا رہا ہے۔ ایک عرصہ تک "جلوہ طور" اُن کے مفید مطلب مضامین سے مزین ہوتا رہا ہے۔ "طوطی ہند" کا نام اُنھیں کی بدولت آج تک چل رہا ہے۔ وہ مدت تک اُسکے باقاعدہ ایڈیٹر تھے۔ اُسکے پہلے دو صفحے "سیر ٹھپنچ" کے عنوان سے چھپتے تھے جبکے ظریفانہ مضامین خود حضرت بیان کی ظرافت پسند طبیعت سے نکلتے تھے ایک عرصہ تک اودھ پنچ سے معرکہ آرائی رہی۔ اودھ پنچ کے بیسیوں نامہ نگار اپنے پرچہ کی مدد کے لیے کمربستہ میدان میں نکل آئے تھے مگر اس شیر نے تن تنہا سب کا جواب دیا اور اپنا نام رکھ لیا۔

آخر میں اُنھوں نے اپنا ایک خاص رسالہ لسان الملک کے نام سے جاری کیا جو بارہ برس تک نکلتا رہا۔ اس میں مضامین نظم ونثر مساوی طور سے درج ہوتے تھے۔ انکی غزلیات اور انکے شاگردوں کے کلام کے لیے بھی اسمیں گنجایش نکالی جاتی تھی۔ لسان الملک سنہ ۱۸۸۶ء میں جب جاری ہوا تھا شاید اُسوقت تک نظم ونثر کا مشترکہ مذاق پیدا کرنیوالا کوئی پرچہ نہ نکلا تھا۔ علمی مضامین کے علاوہ ادبی مسائل پر بھی زور دار تحریریں ہوتی تھیں۔ مولانا حالی کی مثنوی حقوق اولاد پر ایک اعتراضی مضمون نظم حضرت بیان نے اسی پرچہ میں مسلسل چھپوایا تھا۔

لسان الملک میں ایک عرصہ تک حل المطالب کے نام ایک سلسلہ مضامین نکلتا رہا ہے۔ یہ حضرت بیان کی شرح دیوان غالب ہے۔ غالباً یہ شرح کتابی صورت میں آج تک شایع نہیں ہوئی ورنہ ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہوتا۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر کی شرح درج کیجاتی ہے جس سے بیان کی نکتہ رسی اور سخن فہمی کا بھی ایک حد تک اندازہ ہوجائیگا :-

شعر غالب :-   سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

لغات :- سبزہ - روئیدگی، خط - مسیں، محاسن، کاکل - سر کے اوپر کے بال لیکن استعمال زلف وگیسو وغیرہ سب پر ہوتا ہے۔ زمرد - پنّا، ایک ہرے رنگ کا جواہر ہے۔ حریف - مدمقابل، دم - سانس، افعی - سانپ

معنی :- مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک معشوق کے سبزۂ خط نہ آیا تھا کاکل افعی کی طرح بل کی کھاتا رہا اور عاشقوں کو زہریلی اداؤں سے ایذائیں دیتا رہا، مگر

کے اثر سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے اور اُسکی نیش زنی کی طاقت بالکل جاتی رہتی ہے
اسکی کیا وجہ کہ خط زمردی پیدا ہوا اور زلف کی ایذا رسانی کا وہی عالم رہا۔ شاید
یہ وہ افعی ہے جس پر زمرد کا اثر نہیں چلتا۔ مراد یہ ہے کہ خط کے آنے سے سُلطان
حُسن کی سپاہ کمزور ہو جاتی ہے۔ ہمارے معشوق کا بڑھا ہوا حُسن خط کے آنے سے
بھی نہیں گھٹتا۔ ظاہر ہے کہ صاف چہرے پر زلف کی اداؤں میں کمی نہیں آتی۔ حاصل ؎

یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے ۔ وگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے

شرح معانی و مطالب کا اسلوب عموماً عام فہم ہے۔ لیکن اس شعر کے حل میں مارکو نشتر زن کہا گیا ہے
اسکی صحت میں ہمیں کلام ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سید بیان ایک جامع کمال شخص تھے۔ اُنکی
ادبی حیثیت ناظم و ناثر ہونے کے اعتبار سے یکساں ممتاز و مستند ہونی چاہیے اور یہ افسوس کہ
اُنکی عمر نے وفا نہ کی ورنہ اُردو ادب کی بہت سی خوشگوار اُمیدیں اُنسے پوری ہوتیں۔ ایسے
ذی ہنر مشاہیر کی موت کی تلافی اگر کوئی چیز اس عالم میں کر سکتی ہے تو وہ اُنکے بیش قیمت کارنامے ہیں۔ سید بیان آج دنیا میں موجود نہیں لیکن اُنکے کارنامے اور اُنکی علمی خدمات ادب
ہمیشہ اُنکے نام کو صفحۂ تاریخ پر روشن رکھینگی۔ اُنھوں نے خود ہی کہا ہے ؎

نفس گم اور سخن باقی رہیگا ۔ نہ ہوگا نام اور ہونگے ترانے

اعتبار الملک جناب مضطر (خیرآبادی)

ایشیائی شاعری کی دنیا مین جناب مضطر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہین۔ آپ کے مختلف عاشقانہ اشعار لوگون کو یاد ہین۔ آپ کی طبیعت کی روانی اور پُرگوئی بھی حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ کلام مین عاشقانہ رنگ کے ساتھ تصوف کی جھلک بھی موجود ہے، اور یہ متصوفانہ مذاق خاندانی ہے۔ اول تو آپ سید رضوی ہین۔ دوسرے یہ کہ آپ کے آباو اجداد عارف اور صوفی گذرے ہین۔ زہد و ریاضت مین ساری عمرین گذاردی ہین اور درویشانہ کمالات و خرقِ عادات کا ظہور ہوا کیا ہے۔ آپ کے پردادا حضرت سید عشوق علی صاحب قدس سرہٗ عارفِ کامل تھے۔ ان کے زہد و عرفان کی روایات مشہور ہین۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولانا حافظ سید احمد حسین ہے اور رسوا تخلص فرماتے تھے۔ آپ کے دادا کا نام مولانا سید تفضل حسین خان صاحب ہے۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا حافظ سید محمد حسین صاحب بسمل تھے۔ حضرت بسمل کی شاعری کا ہر سخن شناس معترف و مداح تھا۔ حضرت بسمل نواب صاحب بہادر ٹونک کے اُستاد تھے۔ حضرت مضطر کا قیام ٹونک مین حضرت بسمل ہی کے زمانہ سے تھا اور موجودہ خطاب (افتخار الشعرا اعتبار الملک خان بہادر) تمغہ بھی دربار ٹونک ہی سے ملا ہے اور وہی درجہ جو آپ کے برادر معظم حضرت بسمل کو دربار مین تھا آپ کو حاصل ہوا۔

مشہور زمانہ شمس العلما مولانا محمد عبد الحق صاحب (خیرآبادی) آپکے

ماموں تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ محض فارغ التحصیل فاضلہ ہی نہ تھیں بلکہ شاعرۂ بے بدل بھی تھیں۔

جناب مضطر کی ولادت ۱۲۸۲ھ میں ہوئی اور عربی فارسی کی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے پائی۔ مرحومہ بڑی ادیبہ تھیں اور عربی فارسی قصاید اُن کی تصنیفات میں موجود ہیں۔ جناب مضطر نے شاعری میں اپنی والدہ ماجدہ ہی سے اصلاح لی۔ انھوں نے گیارہ برس کے سن میں جو پہلی غزل لکھی اُس کا مطلع حسب ذیل ہے ؎

ڈھونڈھتے ہم کیوں دوائے دردِ دل   تم اگر ہوتے بجائے دردِ دل

اس مطلع کی اصلاح آپ کی والدہ نے اس طرح فرمائی ؎

ڈھونڈھتے ہم کیوں دوائے دردِ دل   کاش تم ہوتے بجائے دردِ دل

پھر آپ نے اپنی ایک غزل حضرت امیر مینائی کے پاس بغرضِ اصلاح بھیجی۔ اس غزل کا مطلع تھا ؎

داغ ہیں سیکڑوں نہاں دل میں   طرفہ پھولا ہے گلستاں دل میں

حضرت امیر نے مصرعۂ اول کو یوں بنایا

سیکڑوں داغ ہیں نہاں دل میں

جناب مضطر نے پھر ایک اور غزل بھیجی جناب امیر نے غزل واپس بھیجکر ارقام فرمایا کہ "آپ کے کلام کو اصلاح کی حاجت نہیں اور جو کچھ دخل دیا گیا وہ استحساناً۔ تم فقیر امیر کا نام روشن کروگے"

ریاست ٹونک سے جناب مضطر کا تعلق بہت قدیم ہے۔ آپ کے دادا سفیر ریاست تھے۔ نواب صاحب بہادر ٹونک نے ۱۹۰۳ء میں جناب مضطر کو اودے پور میواڑ کا وکیل مقرر فرمایا۔ اسکے بعد صدر پولٹیکل ایجنٹ رہے پھر منصبِ اُستادی نواب صاحب پر فائز ہوے۔ یہ اعزاز حضرت بسمل کی وفات کے بعد حاصل ہوا۔ جناب مضطر نے نظامت نمیاہیڑہ کی خدمت بھی بہت خوبی سے ادا کی اور آپ کے نظم و نسق کا اعتراف کیا گیا۔ ریاست کے عہدۂ سول ججی پر بھی مامور رہے۔ پھر بعض وجوہ سے آپ کا تعلق ریاست گوالیار سے ہوگیا اور وہاں بھی معزز عہدہ پر فائز ہوئے۔ الغرض ہر قسم کا اعزاز آپ کو حاصل ہوا اور اسکی اسناد بھی بجناب ریاست ملیں۔

آپ کے سوانحی حالات طویل کو بالاختصار بیان کرنے کے بعد اب آپ کی شاعری کا مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

رنگِ تغزل میں جناب مضطر کی بعض غزلیں بہت مشہور ہوچکی ہیں بعض اشعار میں داغ کا رنگ پایا جاتا ہے مثلاً ذیل کے اشعار میں داغ ہی کے کلام کا لطف حاصل ہوتا ہے ؎

علاجِ دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا   تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا
تمھیں چاہوں تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں   مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا
دمِ آخر مری بالیں پہ مجمع ہے حسینوں کا   پھر آ نالے قضا اسوقت پردا ہو نہیں سکتا

اُسنے یہ کہکے پسِ وصل پشیمان کیا   واہ وا آپنے اچھا مجھے مہمان کیا
کیوں خفا ہوتے ہو جاؤ تو تلاشی لے لو   دوسرا دل ہو مرے پاس تو قربان کیا

ہے انکو کون جتاے دلِ غمگین کا   وہ آپ ہی الگ ہیں سب کچھ ہے انھیں کا

شبِ فرقت قضا آجاتی ہوجاتی تو اچھا تھا   کسی پر جان بھی قرباں ہوجاتی تو اچھا تھا
لگاکر ٹھوکریں کہتے ہیں وہ گورِ غریباں پر   یہ بستی اور بھی ویراں ہوجاتی تو اچھا تھا

ذیل کے شعر میں معشوق کے ترکِ ستم کو عجب خوبی سے ثابت کیا ہے معشوق کی ستم شعاری میں بھی ایک شانِ محبت و وفا پیدا کی ہے یعنی ہم پر معشوق کو ستم کرنے میں ایسا لطف ملتا تھا کہ پھر ہمارے بعد کسی پر ظلم ہی نہیں کیا یہ اس لیے کہ ایسا ستم دوست اسکو کوئی نہ ملا اور گویا ہم نے مٹ کے معشوق کو بارحم بنادیا یعنے۔

ستم کی خو نہ رہی شیوۂ جفا نہ رہا   مجھے مٹا کے انھیں کوئی حوصلہ نہ رہا

ذیل کے شعر میں بعد مرگ حسرت وصال کو بہت ہی اچھوتے انداز طریقہ سے بیان کیا ہے۔ مدفن و دامن کا قافیہ آپ کے حصہ کا ہے۔ باقی اشعار بھی بہت بامزہ ہیں۔

گذر اُس وقت ہوا ہے سرِ مدفن اُن کا　　اُٹھ لے دستِ طلب چھوڑ نہ دامن اُنکا
یاالٰہی یہ تمنا ہے کہ روزِ محشر　　لب پہ ہو نام ترا ہاتھ میں دامن اُنکا
کھل پڑا دل جو ہاتھ اُٹھانے کے لیے　　خاک پر لوٹ گیا گوشۂ دامن اُنکا

حق رسمِ محبت کا کچھ دیر ادا کرنا　　وعدہ کے ستم کرنا تھم تھم کے جفا کرنا
اے عمر نہ ہو جانا ختم اُسکی جدائی میں　　جبتک وہ جفا برتے تو مجھ سے وفا کرنا

ان دونوں اشعار میں آخری شعر اے عمر نہ ہو جانا الخ میں عشق جفا سے یار کو کتنا عزیز ثابت کیا ہے اور حد کیسی اچھی قائم کی ہے کہ جبتک وہ مجھ پر جفا کرے اے عمر تو مجھ سے وفا کرنا یعنی مجھ کو زندہ رکھنا۔

دعا سے کچھ ہوا التجا سے کچھ نہ ہوا　　بتوں کے عشق میں یادِ خدا سے کچھ نہ ہوا

مذکورۂ بالا شعر محض عاشقانہ ہی نہیں ہے بلکہ سچا واقعہ بیان کیا ہے یعنی ہم نے بتوں کے عشق میں جو یادِ خدا کی وہ بالکل رائگاں گئی خدا کی یاد میں ترک ماسوا کامل طور پر ہو اور خلوص تو ضرور ہے ورنہ دعا اور التجا بیکار ہے۔

مُہریں لگی ہوئی ہیں خطِ سرنوشت پر　　پیشانیوں پہ داغ تری آستان کے ہیں

ذیل کے شعر کی شوخی ملاحظہ ہو۔ مصرعۂ ثانی میں اہلِ وفا کا خوف معشوق کی زبان سے کس طنزیہ لہجہ میں بیان کر گئے ہیں۔

کون نکلا یہ مرے پاس سے کہہ کر مضطر　　ان سے اللہ بچائے جو وفا کرتے ہیں

ذیل کا یہ شعر بھی خاص لطف رکھتا ہے۔ گو خود عشق یار میں گم ہوں مگر میرا تعلق دوست سے اس قدر گہرا اور مشہورِ عام ہے کہ معشوق کو دیکھکر فوراً ہی لوگ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ معشوق مضطر کے ہیں۔ بہت اچھا تغزل اور حسن و عشق کے تعلقات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

تمہارے نام سے سب لوگ مجھکو جانتے ہیں　　میں وہ کھوئی ہوئی شے ہوں کہ جسکا پتہ تم ہو

مرتے دم یادِ بتاں جائے مری جان کے ساتھ　　میرا اللہ اُٹھائے مجھے ایمان کے ساتھ

جناب مضطر کا ذیل کا شعر بھی قابلِ داد ہے۔ چارہ گر سے بدگمانی اور رقابت نئے رنگ سے ظاہر کی ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے معشوق کو دیکھکر میرے علاج کو آیا ہے یعنی اسیر عاشق ہو چکا ہے اسلیے میں اُسکا علاج نہیں کرانا چاہتا مجھے خوفِ جان ہے۔

آیا ہے اُنکو دیکھ کے میرے علاج کو　　اب اور کچھ گمان مجھے چارہ گر سے ہے

ذیل کے دونوں شعروں میں دوسرا شعر حد درجہ لطف انگیز ہے۔ جدائی میں کثرتِ یاس یا نا اُمیدیِ وصل سے راحت و سکون پیدا ہونا جذباتِ فطرت میں داخل ہے۔ جب انسان کسی شے کے ملنے سے مایوس ہو جاتا ہے تو آخر کار صبر ہو جاتا ہے اور صبر باعثِ آرام ہے۔

حسن نے قہر کیا شام نے آفت ڈھائی　　آرزو مفت میں بدنام ہوئی جاتی ہے
ہے یہی یاس تو کچھ دن میں جدائی تیری　　سببِ راحت و آرام ہوئی جاتی ہے

اپنے قولِ وفا کو بھول گئے　　تم تو بالکل خدا کو بھول گئے
اُن سے دو دن بھی چاہ نبھ نہ سکی　　مضطرِ بے نوا کو بھول گئے

دل میں رکھے تجھے وہ جان کا نقصان کرے　　ہائے ظالم تجھے کیسے کوئی مہمان کرے
مضطرا سختیِ الفت نہیں جھیلی جاتی　　میرا اللہ یہ مشکل مری آسان کرے

اب کون پھرے کوئے بتِ دشمنِ دیں سے　　اللہ کے گھر کیوں نہ چلے جائیں یہیں سے

حال میں جناب مضطر کا ایک حمدیہ دیوان* بنام "نذرِ خدا" شائع ہوا ہے اور نعتیہ دیوان "نیازِ مصطفےٰ" زیرِ طبع ہے۔ یہ حمدیہ دیوان اپنی سادگیِ بیان میں خاص انداز رکھتا ہے۔ کچھ انتخاب ملاحظہ ہو۔

زندگی پاتے ہی اندازِ وفا کو دیکھا　　آنکھ کھُلتے ہی خدائی میں خدا کو دیکھا

---

* قیمت ۱۲ (علاوہ محصول) سرور پرنٹنگ کمپنی لکھنؤ سے مل سکتا ہے ۱۲

حسن سے جلوۂ وحدت کا پتہ چلتا ہے　　بحثے پردے میں خدائی کے خدا کو دیکھا
بس گئی دل میں محبت تو کھلے راز نہان　　اٹھ گیا آنکھ سے پردے تو خدا کو دیکھا

الٰہی تو ہی اپنی حکمت کو سمجھے　　کہ درد وفا دردمندوں میں ڈالا

رنگ صد نقش تو ہی معنی تصویر میں ہے　　کار پرداز قضا پردۂ تقدیر میں ہے
دل میں کرتا ہے تو ہی شوق شہادت پیدا　　جان دینے کا مزا خنجر و شمشیر میں ہے

اپنی غرض کیا غرض اسکی رضا سے کام ہے　　فکر خودی میں کیوں پڑوں مجھکو خدا سے کام ہے
پردۂ ناز ہے ترا جلوہ چشم شوق ہے　　دیدہ کو کیا غرض ہمیں تیری ادا سے کام ہے

کوئی گھر جہاں میں بنائے کیا کوئی رہ کے اسکو چلے گئے　　یہ تو چند دن کا سماں ہے یہ تو چند دن کی بہار ہے

گریۂ عشق میں ہمکو کمی پڑتی تھی　　اسلیے چھوڑ دیا قلب کا چھالا میں نے

ترے سامنے دست حسرت پسارے　　چلے خالی ہاتھوں یہ سامان والے

سکر میں بزم خرابات کے جھگڑے توڑے　　تو نے خود جنکو بھرا تھا وہی شیشے توڑے
پھول گلشن کے چنے شاخ سے پتے توڑے　　تو نے کھلنے بھی نہ پائے تھے وہ غنچے توڑے

سچ ہے قدرت تری نرالی ہے　　تو نے مٹی میں جان ڈالی ہے
جب میں آیا تو ہاتھ خالی تھا　　جب میں اٹھا تو ہاتھ خالی ہے

صحرا میں غریبوں کا نگہبان وہی ہے　　مشکل جو کرے وقت پہ آسان وہی ہے
رحمت کا غم و درد میں سامان وہی ہے　　یہ جان ہے کیا چیز مری جان وہی ہے

دارو ے درد دل بیمار ترے ہاتھ ہے　　تو ہی مالک چارۂ آزار ترے ہاتھ ہے
غنچۂ دلکو خداوند کھلائیگا تو ہی　　خوبی رنگ گل گلزار ترے ہاتھ ہے
کون پوچھیگا بھلا میدان محشر میں مجھے　　میری عزت داور داد ترے ہاتھ ہے

یا معبود میں بیمار دوائے آزار نہ سوچ　　عشق میں پڑ کے دوائے دل بیمار نہ سوچ
اسکی رحمت کے بھروسہ پہ بسر کر اپنی　　کیسی گذریگی قیامت میں دل زار نہ سوچ

باغ عالم میں ٹھہرنے کا بھروسہ کیا ہو　　بوئے گل ہم نے تو دیکھی ہے ہوا کی پابند

تری حمد جاری ہے سب کی زبان پر　　پکارا گیا تو زمین آسمان پر

تصدق ہے تیری خدائی تجھی پر　　ہے زیبا تری کبریائی تجھی پر

یہی ذوق ہے گلوں کو بو یہ ہے شان جل جلالہ　　یہ اسی کا جلوہ ہے چار سو یہ ہے شان جل جلالہ
وہی چارہ گر دم یاس ہے وہی دردمند کی آس ہے　　وہی غمزدوں کا حکیم ہے یہ ہے شان جل جلالہ

الٰہی دکھا دے دیار مدینہ　　بنا مجھکو گرد و غبار مدینہ
بنا ساکن ذات محبوب خالق　　زہے عزت و افتخار مدینہ
گدا کر کے دے جل کر حاصل ہو مجھکو　　سلام شہ کامگار مدینہ
الٰہی بنا دے مری خاک کو تو　　غبار سر رہ گذار مدینہ

حسرت دیدار کی چھپنے میں کچھ نہیں مزا　　میں بھی تو تجھکو دیکھ لوں بند نقاب کھولدے

نہیں دل دکھانا گوارا تجھے　　سنی اسکی جس نے پکارا تجھے

اُسکا جلوہ ہی شمعِ بزمِ جہان اُسکی رحمت بہارِ عالم ہی

مرے دل کی جو آرزو جانتا ہی یہ تونے ہی دی اسکو تو جانتا ہی
تری چارہ گر داروے دردِ پنہان نہ مین جانتا ہون نہ تو جانتا ہی

تکبر زمانہ کا توڑا ہی تونے گلا نخوتون کا مروڑا ہی تونے

مخلوق کا سرمایۂ آرام تو ہی ہی عالم کا معاون سحر و شام تو ہی ہی

غرض دیوان حمدیہ (نذر خدا) مین جناب مضطر نے اپنی مشاقی اور پرگوئی کو ثابت کر دیا اور غالباً اپنے رنگ مین یہ پہلا دیوان ہی جسمین صدہا غزلین حمد ہی مین ہین۔ اساتذہ نے صرف تبرکاً و تیمناً اپنے دیوانون مین کچھ اشعار لکھے ہین یا کوئی نظم مسلسل لکھی ہی مگر جناب مضطر نے پورا دیوان لکھا ہی۔ نقادانِ سخن کو بعض تراکیب اور محاورات فصحاے اُردو کے خلاف اس دیوان مین مل سکین گے لیکن جذبات کے خلوص کو ایک ہی طرز خاص مین مختلف طور سے ادا کرنا اہم کام ہی اس لیے نذر خدا قابل قدر شے ہی۔ ہر منصف سخن فہم حضرت مضطر کی طباعی کی داد دے گا۔

"ناظر"

(نظر لکھنوی کی غزل پر ایک سرسری نظر)

منشی نوبت رائے صاحب نظر کے نام سے کچھ ارباب سخن تو ضرور واقف ہونگے۔ آپ ہندو شعرا مین ایک امتیازی درجہ رکھتے ہین پہلے آپ نے ایک پرچہ "خدنگ نظر" نامے نکالا تھا۔ پھر اسکے بعد آپ کی رسائی الہ آباد کے ادیب (مرحوم) مین ہوئی۔ اس کے بنگالی مالک نے آپ کو ادیب کا ایڈیٹر مقرر کیا مگر بعد چندے آپ وہان سے رخصت ہوے۔ اب آپ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہین۔ زمانہ مین بھی آپ کی تنقیدین شائع ہوئی ہین اور اُس مین شعرائے اُردو کے کلام کا حسن و قبح دکھایا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ یہان اُردو کے نقاد اور فن شاعری کے ماہر ہین۔ کسی شاعر کی تنقید لکھنا اس بات کی کافی شہادت ہو کہ وہ خود فن شاعری مین دستگاہ رکھتا ہو اور وہ جو کچھ کہتا ہو مضامین مفہوم شعر اور بندش کے لحاظ سے قریباً بے عیب ہو۔ ہم نے نظر صاحب کی رنگ تنقید سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہو کہ وہ مدعیان سخن مین ہین۔ اور معمولی شعرا کا کیا ذکر امیر مینائی ایسے سخنور بھی ان کی زد مین آگئے ہین داغ وغیرہ کو بھی ماننے کے طور پر نہین مانتے ہین۔ آپ کو نظر آغا صاحب نظیر لکھنوی سے تلمذ ہو۔ نظیر صاحب خوشگویان لکھنؤ سے ضرور تھے مگر اُن کی شہرت کا دائرہ اثر محدود تھا۔

مجھے اس مختصر مضمون مین کوئی ناگوار بحث شعر و شاعری کے متعلق مقصود نہین ہو مگر انصافاً اتنا ضرور کہنا چاہتا ہون کہ کسی ماہر فن نقاد کے کلام مین خود ایسی کمزوریان نہونا چاہیین جو بدیہی طور پر نظر آئین۔ مین ذیل مین جناب نظر کی ایک مختصر غزل پر اپنے کچھ خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہون اہل نظر انصاف سے دیکھین کہ مین نے جو شکوک ظاہر کیے ہین وہ بیجا ہین یا بجا و صحیح۔ اس مین شک نہین کہ اگر تنقید بے تعصبی سے کی جائے تو اس سے فن شعر گوئی پر اچھا اثر پڑتا ہو اور تنبہ و احتیاط بھی پیدا ہو سکتی ہو۔ جناب نظر کی یہ غزل زمانہ مین چھپی ہو۔ مطلع ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہین ؎

بے پر و بالی ہوئی ہو باعث شادی مجھے
خانۂ صیاد مین حاصل ہو آزادی مجھے

مصرعۂ اولی مین بے پر و بالی ہو جانے کو باعث شادی قرار دے لینا ایک مفروضہ خیال ہو۔ اُس کو خاص باعث شادی کیونکر مان لیا جائے اس لیے کہ بے پر و بالی رنج کا باعث ہو سکتی ہو نہ کہ شادی کا سبب مصرعہ ثانی مین وہ خانۂ صیاد مین اپنے کو آزاد کہتے ہین حالانکہ یہ بالکل محال ہو خانۂ صیاد مین گرفتاری کے بغیر رہنا ممکن نہین۔ طائر قفس مین رہ سکتا ہے۔ اس لیے یہ آزادی بالکل نئی ہو افسوس آپ کسی نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے اپنے دعوی کو ثابت نہ کر سکے۔ آزادی آپ کو صرف اس قدر حاصل ہو کہ پنجرہ مین ادھر سے ادھر پھدکتے پھرین اور قفس کی تیلیون سے زمین و آسمان وغیرہ کو دیکھ سکین۔ اگر اسی کا نام آزادی اور بے پر و بالی کا نام

شادی ہو تو حسنِ تخئیل کا خاتمہ ہو۔ اس لیے کہ بے پَر بالی مین تو طائرِ فکر محو ہو جاتا ہو اور وہ پھر اُڑ بھی نہین سکتا بہر حال یہ مطلع کیا مفہوم اور کیا نازکخیالی دونون طور پر اگر بالکل بے معنی نہین تو بالکل ادنی درجہ کا مطلع ہو اور کسی نقادِ سخن کو ایسا مطلع اپنے سے منسوب نہ کرنا چاہیئے۔

پھر فرماتے ہین ؎

سب سے پہلے دردِ الفت کو کیا مین نے قبول
نالہ و فریاد کی حاصل ہو ایجادی مجھے

مصرعہ اولیٰ مین جو دعویٰ کیا گیا ہو اُس کو صحیح مان لینے کے بعد یہ خیال ظاہر کیا جا سکتا ہو کہ جب آپنے دردِ الفت کو قبول کیا تو عاشقانہ صبر و تحمل کی شان یہ ہو کہ ضبطِ نالہ و فریاد کیا جائے اور جب نالہ و فریاد کیا تو گویا دردِ الفت ناگوارِ خاطر ہوا۔ اور پھر دوسری بات یہ ہو کہ نالہ و فریاد کی ایجاد حاصل ہونا تک تو غنیمت تھا ایجادی چہ معنی دارد ایجادی مین آزادی اور جلادی کی سی یائے فاعلی یا مصدری نہین ہو سکتی۔ اس لیے کہ ایجاد خود مصدر ہو اور اس کے بعد حاصل ہونا ایجاد کی مزید توضیح ہو اب (ی) کا اضافہ زائد در زائد ہو گیا۔ اور یہ فصاحت سے بالکل بعید ہو۔

پھر فرماتے ہین ؎

اپنے دل کا مجمعِ حسرت نظر مین ہو ابھی
کیا پسند آئے کوئی گنجان آبادی مجھے

مصرعۂ اولیٰ مین کہا گیا ہو کہ دل کی حسرتون کا مجمع ابھی میری نظر مین ہو اور دوسرا مصرعہ بطور ثبوت ہو۔ ہر دل خصوصاً عاشق کا دل مجمعِ حسرت ہی سے بھرا رہتا ہو اور تا دمِ مرگ رہتا ہو حسرتین مجسم نہین ہوا کرتین۔ یہ خاص کیفیتین ہین جن کا احساس دلی جذبات اور دماغی خیالات کو ہوا کرتا ہو اس کا بدل گنجان آبادی نہین ہو سکتی۔ اگر دل سے حسرتین ہی نکل جائین تو گنجان آبادی اور صحرا دونون یکسان ہین۔ مفہوم کے لحاظ سے یہ شعر بھی بہت پست ہو اور شاید دوسرے مصرعہ مین آئے کی جگہ (لگے) چاہیے۔

پھر فرماتے ہین ؎

بعد مُردن میری میّت کا تبسّم ہو گواہ
اپنے مرنے کی ہوئی ہو کسقدر شادی مجھے

مرنے کے بعد تبسّم کا ثبوت کسطرح یہ مان لیا جائے۔ مرنے بعد انسان کے لب کسی قدر بدنمائی سے لٹک جاتے ہین اور اُن سے جو کیفیت نظر آتی ہو وہ غمین اور یاس آلودہ ہوتی ہو۔ اس سے کوئی شگفتگی اور تبسّم کا اظہار نہین ہوتا۔ دوسرے مصرعہ مین اس زبردستی کے ہوئے تبسّم کو وجہ شادی بیان کیا ہو اگر ثبوت نذا، کاش کسی طور پر یہ کہا جاتا کہ مرنے کے بعد غم سے نجات ملی اس وجہ سے مین اپنی موت سے خوش ہوا تو کچھ موزون ہو سکتا تھا۔

پھر فرماتے ہین ؎

مشقِ دل کو خون کرنیکی جو الفت مین رہی
رفتہ رفتہ آگیا کچھ فنِ جلادی مجھے

عاشقی مین دل کے خون کرنے کی مشق معمولی بات ہو اور یہ بات بھی جذباتِ عشق سے مخصوص ہو۔ مگر اسکو جلادی سے تعبیر نہین کیا جا سکتا۔ جلاد جن معنون مین استعمال کیا جاتا ہو وہ محتاجِ بیان نہین۔ کوئی عاشق جلّاد نہین ہو سکتا۔ جلّادی ایک ذلیل پیشہ ہو نہ کہ فن اور اس معنوی فرق کو ارباب سخن سمجھ سکتے ہین۔

پھر فرماتے ہین ؎

سانس لینے مین صدا دیتا ہو ہر تارِ نفس
سازِ دردِ عشق ہون کہتے ہین فریادی مجھے

سانس اور تارِ نفس ایک ہی چیز ہو۔ اس لیے سانس لینے مین تارِ نفس کا صدا دینا بالکل لغو ہوا۔ اس لیے سانس کی جگہ "آہ" سے معنی درست ہو سکتے ہین۔ آواز نالہ و فریاد مین نکلتی ہو اور سانس لینے مین جو کیفیت محسوس ہوتی ہو وہ آنکھ سے دیکھی جاتی ہو اور یہ وہ بات ہو جو صرف جناب نظرؔ کو نہین ہر شخص کو حاصل ہو۔ تارِ نفس سازِ درد جب ثابت ہوتا کہ مصرعہ اولیٰ مین

۱؎ ہماری دانست مین یہ شعر قابلِ داد ہے۔ (اڈیٹر)

دردمندانہ سانس یا آہ بھری جائے حالانکہ آپ نے محض سانس لینا کہا ہے مصرعۂ اولیٰ اگر یوں ہوتا تو شاید کچھ مفہوم درست ہو جاتا ع

نغمہ سنج درد پنہانی ہے ہر تار نفس

اس مصرعہ سے اب آپکے مصرعہ ثانی کا ساز درد عشق درست ہو گیا ورنہ بغیر اس کے شعر بالکل بے تال سُر تھا۔ اور یہ مثل اُسکے حسب حال تھی کہ من چہ می سرایم و طنبور من چہ می سراید ؎

زندگی کا لطف تھا زندہ دلی تک اے نظر
مر گیا جب دل تو یکساں ہے غم و شادی مجھے

مقطع میں کوئی نئی بات نہیں ہے بالکل پامال مضمون ہے لیکن غائر نظر سے دیکھئے تو مردہ دلی سے غم و شادی یکساں نہیں نظر آتے بلکہ جب تزکیہ نفس سے جذبات پر قابو اور قدرت حاصل ہو جاتا ہے تو غم و شادی کا فرق اٹھ جاتا ہے اور یہ صفت اُن لوگوں کی ہے جو اپنے دل کو روحانی جذبات سے زندہ کر چکے ہیں اور یہ بات اہل اللہ کو حاصل ہوتی ہے اور جو لوگ انتہائے غم و ہم میں شکستہ خاطر ہو جاتے ہیں اگر ان کی شکستہ خاطری کے اسباب دور ہو جائیں تو پھر یہ سامان عیش و راحت کا طالب ہو مگر ایک صوفی اور اہل اللہ واقعی سامان شادی و راحت کا خواہاں نہیں ہوتا۔

مولانا روم نے اس خیال کو موزوں فرمایا ہے ؎

نقش اثر در رہ است این کہ مردہ ست   از غم بے آتشی افسردہ است

جناب نظر کی غزل میں صرف آٹھ ہی شعر چھپے ہیں اور ان سب کی یہ حالت ہے شاید یہ غزل غیر اصلاحی ہے ابھی تو ایسے اساتذۂ اردو موجود ہیں جن کو کلام دکھا کر عیوب سے پاک کر لیا جائے۔

راقم نے جو خیالات جناب نظر کی غزل پر ظاہر کئے ہیں ان کو ناظرین ملاحظ فرمائیں شاعری کا اہم فرض یہ ہے کہ جس خیال کی تصویر اتاری جائے وہ پوری ہو اور مفہوم شعر سمجھنے میں دل و دماغ کو الجھن نہ ہو اب اسکے بعد نازک خیالی اور مضمون آفرینی کے مدارج طے کرتا ہے اور ہر شاعر اپنے مبلغ علم و معلومات اور وسیع النظری کے موافق شعر کہتا ہے۔ اچھوتے اور پامال مضامین کے فرق کو وہی سمجھتا ہے جس نے اساتذہ کے کلام فارسی و اُردو کی اچھی طرح سیر کی ہے۔

"سخن دوست"

ضمیمہ رسالہ العصر۔ ماہ ستمبر ۱۹۱۳ء

زمانہ مجھکو بُرا کہہ رہا ہے کہنے دو
مین جانتا ہون زمانے کا اعتبار نہین

آج کئی ماہ کے بعد زمانہ نے کروٹ لی۔ ماہ اگست ۱۹۱۳ء کا پرچہ میری نظر سے گزرا۔ اُسمین وہ مضمون بھی بتصرفِ خاص نقل کیا گیا ہے جو "العصر" کے جولائی نمبر مین مہاکوی کالیداس کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ یہ دراصل "اکسیرِ سخن" کا مقدمہ ہے جسکو منشی پریم چند نے تحریر فرمایا تھا۔

ایڈیٹر صاحب زمانہ ایک مدت سے ہمپر خاص مہربانی فرماتے ہین ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء مین کئی دفعہ وہ ہمارے متعلق بے سروپا باتین لکھ چکے ہین جنکی ہمنے پھر پروا نہین کی۔ اس دفعہ آپنے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ یعنی مذکورۂ بالا مضمون نقل کرتے وقت جابجا بیجا تصرف ہی نہین کیا بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ "اکسیرِ سخن" کے نام سے جو نظمین کتابی صورت مین شائع ہوئی ہین "تحقیق طور پر ثابت ہوا ہے" کہ وہ سرور مرحوم کی تصنیف ہین۔

وسط ۱۹۰۹ء مین میری ایک نظم رسالہ مخزن مین شائع ہوئی تھی جسکا عنوان "آج" تھا۔ اُسوقت تک سرور مرحوم سے مجھسے خط وکتابت نہ تھی۔ صرف کانپور مین ایک دفعہ سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اِس نظم کی اُنھون نے بیحد داد دی اور یہین سے خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوا جو اُنکی زندگی تک برابر جاری رہا۔ اُسی زمانہ مین میرا ایک نثر مضمون بعنوان مہاکوی کالیداس مخزن مین شائع ہوا تھا۔ میرے مکرم میر کرامت اللہ صاحب نیر (امرتسری) نے تحریک کی مین خود ہی کالیداس کی تصنیف کا ترجمہ کرون۔ آخرکار مین اس پر آمادہ ہوا اور ترجمہ کے لیے "رتوسنگھار" کو انتخاب کیا۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی نظم (فصل خریف) دسمبر ۱۹۰۹ء کے زمانہ مین شائع ہوئی۔ اس نظم کی اشاعت کے بعد ایڈیٹر صاحب زمانہ نے بقیہ نظمین زمانہ مین شائع کرنے کی غرض سے طلب کین۔ چنانچہ دو اور نظمین (ہمنت اور برکھارت) انھین دیگئین۔ یہ تینون نظمین سرور مرحوم کی زندگی ہی مین زمانہ مین شائع ہوئی تھین۔ اسکے بعد بھی یعنی وسط ۱۹۱۲ء مین ایڈیٹر صاحب زمانہ نے بقیہ نظمین طلب کین مگر مین نے کتابی صورت مین چھاپنے کے خیال سے ان نظمون کی اشاعت مناسب سمجھی۔ مگر چند ماہ کے بعد ہی کرمی جناب نیر کے بیحد اصرار سے اس سلسلہ کی ایک نظم "بسنت رت" جو موسم کے لحاظ سے بھی باموقع تھی انھین بھیجی جو جنوری ۱۹۱۳ء کے نقاد مین شائع ہوئی اور بعد اشاعت منشی دیانرائن نگم کے اخبار "آزاد" مین نقل کیگئی۔

اِس سلسلہ کی تین نظمین سرور مرحوم کی زندگی ہی مین زمانہ مین شائع ہو گئی تھین اُنکی نسبت تو صاحب زمانہ نے کوئی تردید نہین کی۔ اسکے بعد ۱۹۱۳ء کے وسط تک بھی گویا حقیقتِ حال سے بے خبر رہی اب ۱۹۱۴ء مین آپکو "تحقیق طور پر ثابت ہوا ہے" کہ "رتو سنگھار" کا ترجمہ مسٹر شاکر کی مدد سے حضرت سرور مرحوم نے کیا ہے اور اکثر موسمون کی نظمین زمانہ مین ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہین۔" اسپر آپنے نوٹ بھی دیا ہے کہ "مسٹر شاکر نے ان نظمون کے مجموعہ کو اکسیرِ سخن کے نام سے اپنے نام سے شائع کیا ہے۔ زمانہ مین اشاعت کے لیے بھی یہ نظمین ہمکو انھین سے ملی تھین اور ان کے آخر مین انھین کا نام ثبت تھا۔" مین لکھ چکا ہون کہ زمانہ مین اکسیرِ سخن کی تین نظمین سرور مرحوم کی زندگی ہی مین شائع ہو گئی تھین ۱۹۱۰ء مین جب "ہمنت" والی نظم زمانہ مین شائع ہوئی ہے اُسوقت جناب سرور کانپور ہی مین ایڈیٹر صاحب زمانہ کے مہمان تھے۔ اگر ایڈیٹر صاحب زمانہ عدم واقفیت کی وجہ سے معذور تھے تو سرور مرحوم نے کیونکر اپنی نظمون کو میرے نام سے چھپنا گوارا کیا۔ یہ بالکل خلافِ عقل اور خلافِ قیاس بات ہے کہ کوئی مصنف اپنی تصنیف کو دوسرون کے نام سے شائع ہوتے دیکھے اور سکوت اختیار کرے۔ لطف یہ کہ زمانہ کے جن پرچون مین میری یہ نظمین شائع ہوئی ہین اُنھین مین سرور کی نظمین بھی چھپی ہین۔ لہذا ضرور ہے کہ سرور نے زمانہ کے یہ پرچے دیکھے ہونگے۔

اب اصل کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔ اوائل ۱۹۰۹ء مین بمقام الہ آباد ایک پنڈت جی سے زیادہ راہ و رسم ہو جانے پر مین نے اُن سے درخواست کی کہ بعض سنسکرت نظمون کا اُردو ترجمہ کرا دیجیے۔ اُنھون نے درخواست منظور کی چنانچہ مین نے کلکتہ اور بمبئی سے

متعدد انگریزی اور ہندی ترجمے بھی رتو سنگھار اور میگھدوت[1] کے منگائے۔ ترجمہ کرتے وقت ان سے بھی مدد لی جاتی تھی جب رتو سنگھار کا نثر ترجمہ ہو چکا تو اسکو نظم کرنے کی فکر ہوئی۔ خریف کا موسم قریب تھا، لہذا سب سے پہلے یہی نظم کیگئی۔ سرور مرحوم سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا، لہذا مین نے اُنسے درخواست کی کہ آپ بھی ان نظمونکو دیکھ لیا کرین۔ اُنھون نے منظور کیا اور یہ بھی لکھا کہ نثر ترجمہ بھی بھیجدیا کیجیے کہ تفہیم مطالب مین آسانی ہو۔ اسطرح جناب سرور کی شاعرانہ قابلیت سے مین نے استفادہ کیا۔ چار فصلین سرور مرحوم کی زندگی ہی مین نظم ہوئین اور بقیہ دو اُنکی وفات کے بس ڈیڑھ برس بعد لکھی گئین۔ بالفرض اگر اصلاح و مشورہ سے وہ چار نظمین صاحب زمانہ کے نزدیک سرور کی ہو گئین تو ان دو نظمونکی نسبت وہ کیا کہتے ہین۔

سنہ ۱۹۱۲ء مین اڈیٹر صاحب زمانہ نے یہ نظمین کتابی صورت مین شائع کرنیکی غرض سے طلب کین اور ۲۵۔۳۰ جلدین معاوضہ تحریر کیا، اگر مین نے دلی شکریہ کے ساتھ اسکو نامنظور کیا۔ جب یہ نظمین بغرض اشاعت آپکو نہ دی گئین بلکہ خلاف امید اس سلسلہ کی ایک نظم نقاد (مارچ سنہ ۱۹۱۳ء) مین شائع ہوئی تب شاید مقام ملال کے خیال سے ضرورت ہوئی کہ رتو سنگھار کے اصل مترجم کا پتا لگایا جائے، اور نہایت خوشی کی بات ہے کہ بزعم خود آپ اسمین کامیاب بھی ہوئے۔ گو اکسیر سخن کی اشاعت کے ساتھ آٹھ ماہ بعد ہی سہی۔ ع این کار از تو آید و مردان چنین کنند۔

اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی غالباً نامناسب نہوگا کہ طالبعلمی کے زمانہ ہی سے میری طبیعت شعر گوئی کیطرف مائل تھی سنہ ۱۹۰۰ء مین حضرت شوکت میرٹھی مدظلہ سے تلمذ حاصل کیا۔ مگر نظمین لکھنے کا ذوق سنہ ۱۹۰۶ء یا سنہ ۱۹۰۷ء مین ہوا، اور اُسوقت سے مخزن اور زمانہ اور دیگر رسائل مین نظمین شائع ہوئین۔ تحفۂ سرحد کی اڈیٹری کے زمانہ سے شعر گوئی کا بہت کم موقعہ ملا مگر اُس زمانہ مین بھی ملک مین میرا تعارف شاعر ہونے کی حیثیت سے ہو چکا تھا۔ جولائی سنہ ۱۹۰۹ء مین مین زمانہ کا سب اڈیٹر و منیجر ہوا اُسوقت بھی منشی دیا نرائن مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ قیام الہ آباد کے زمانے مین مضمون نگاری ہی میرا ذریعۂ معاش تھا۔ مختلف اخبارات و رسائل کو مضامین نظم و نثر بمعاوضہ زر نقد دیتا تھا۔ چنانچہ خود زمانہ بھی انھین پرچون مین شامل ہے۔ ادیب کی اڈیٹری کے بعد اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی ضرورت نہ رہی۔

تعجب ہے کہ آغاز سال دوان تک اڈیٹر صاحب زمانہ کو یقین تھا کہ مین شاعر ہون اور اسکی وجہ بھی معقول تھی کیونکہ مین کئی فرمائشی نظمین زمانہ کے لیے لکھ چکا تھا۔ ایکدفعہ ایک تصویر کے متعلق تاکید کی تھی کہ تین روز کے اندر اندر نظم لکھکر بھیجدیجائے۔ اسکے جواب مین نظم فسون موسیقی بھیجی گئی جو زمانہ بابتہ ماہ جون سنہ ۱۹۱۰ء مین شائع ہوئی۔ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء کے پرچہ کے لیے بھی ایک خاص نظم کی فرمائش کیگئی لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ اُدھر مین سخت پریشانیون مین مبتلا رہا اور کچھ اس لحاظ سے بھی کہ اس سے پیشتر زمانہ ما آزادی دو ایک مرتبہ مجھ پر بیجا حملے ہو چکے تھے، تعمیل ارشاد کی جرأت نہوئی۔

سرور مرحوم کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام ابتک میرے پاس موجود ہے۔ بعض نظمین مین نے ادیب مین شائع کرائین اور بعض العصر مین چھاپی ہین۔ ان کے علاوہ ابھی کافی ذخیرہ ہے جسکی اشاعت کا حق مرحوم کے برادر کلان نے تحریر کے ذریعہ سے مجھے مرحمت فرمایا ہے۔ یہ مجموعہ کم و بیش دس بارہ جز کا ہوگا۔ کچھ نظمین انمین ایسی ہین جو جناب سرور نے بزمانہ قیام الہ آباد کہی تھین اور جام سرور (جلد دوم) کے لیے مجھے دی تھین۔ بعض وہ نظمین ہین جو خاص میری فرمائش پر کہی گئی تھین۔ جلد دوم کے مرتب ہونے کی صلاح ہو رہی تھی کہ انھین وطن واپس جانا پڑا۔ دسمبر مین وہ خود آنیوالے تھے کہ پیغام اجل آگیا۔ ابتک جلد دوم معرض التوا مین ہی۔ اب کوئی مہینہ بھر سے وہ کلام چھپ رہا ہے۔ اسکی اشاعت کے بعد ملک خود اندازہ کریگا کہ مین نے جناب سرور کے کلام کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اڈیٹر صاحب زمانہ نے خود بھی سرور مرحوم کا یہ کلام بغرض اشاعت مجھ سے طلب کیا تھا اور میرے ہی ذریعہ سے انھین اسکی اطلاع ہوئی تھی۔ میری تحریر سے پیشتر انھین معلوم بھی نہ تھا کہ میرے پاس سرور کا کچھ کلام ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مین سرور کے اس کلام کو بھی اپنے نام سے شائع کرتا۔

رفع بدگمانی و ازالہ غلط فہمی کے خیال سے یہ چند سطور لکھنے کی ضرورت واقع ہوئی ورنہ مین اپنا وقت اس قسم کے بحث مباحث کی نذر نہین کر سکتا جنکو خدا نے عقل و تمیز کی نعمت عطا فرمائی ہے وہ خود اپنی قوت فیصلہ سے کام لین گے اور زمانہ کی اس دل شکن روش پر نفرین کرین گے۔

شاکر (میرٹھی) ۲۵۔ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء

---

[1] میگھدوت مکالو[illegible] کا ترجمہ منظوم مکمل ہو چکا ہے اور حصہ دوم [illegible] مجموعہ بھی جلد کتابی صورت مین شائع ہوگا۔ [2] [illegible]
[illegible]
[illegible]

[3] جہان تک مجھے یاد ہے [illegible] عنوان [illegible] سرا[illegible] و بسنت رت ہین۔

(رائے بہادر منشی پراگ نرائن صاحب بھارگو)

نورِ نگاہ چشم تمنّا سے اُٹھ گیا

زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے

آسمان علم و ہنر رائے بہادر آنریبل منشی پراگ نرائن بھارگو بھی اُن مشاہیر زمانہ بزرگون مین سے تھے جن کو دُنیا باوجود اپنی نت نئی گردشون کے روز نہین پیدا کر سکتی وہ لوگ حیات جاودانی کے مستحق ہین جن کا نام نامی محبت و عزت سے لیا جاتا ہے انتزاع سلطنت اودھ کے بعد شہر لکھنؤ پر جب آئے دن نادرہ آفتین اور مصیبتین نازل ہوا کین کمال و متاع و آبرو کے ساتھ اُنکا وطن عزیز بھی چھوٹنے کو تھا کہ یکایک ایک فرشتہ (منشی نولکشور صاحب مرحوم) پردۂ غیب سے ظاہر ہوا اور ندا کی کہ "آؤ مین تمھین اپنے ظلّ عاطفت مین پناہ دونگا اور تمھاری بگڑی کو بنا دونگا" منشی صاحب مرحوم نے اپنے گرد اہل کمال کا مجمع ہی نہین اکٹھا کیا بلکہ اس گئے گزرے وقت مین بھی علم کی آبرو رکھ لی۔ انھین اہل کمال کی دعاؤن کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو وارث بھی ایسا عنایت فرمایا

مرحوم ایک ہی تھا جو دُنیا سے اُٹھ گیا

جو گویا بطنِ مادری سے ملک و قوم کا درد ساتھ لایا تھا۔ اُنھون نے اپنی قلیل زندگی مین کافی شہرت و نیکنامی حاصل کی جو کارخانہ جات آپ نے وراثت مین پائے تھے اُن کو اپنی خداداد لیاقت و قابلیت سے نہ صرف بدستور جاری رکھا۔ بلکہ اُن کو اور زیادہ ترقی دی۔ پبلک مفاد کے لیے اِن صوبجات مین جو تحریک ہوتی تھی اُنمین آپ کا عملی حصّہ ہمیشہ زیادہ ہوتا تھا۔ یون تو آپ کو سیاسی تمدنی تعلیمی اور حرفتی مسائل سے یکسان دلچسپی تھی مگر موخر الذکر صیغون مین آپ زیادہ منہمک نظر آتے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ تعلیمی اور صنعتی صیغے ہی انسان کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتے ہین بالخصوص ہندوستان ایسے ملک مین۔

رائے بہادر منشی پراگ نرائن صاحب بھارگو نے اپنی والدہ مرحومہ کی یادگار مین دریائے گومتی لکھنؤ کے کنارے نہایت خوبصورت اور عالیشان گھاٹ اور مندر بنوایا تھا اور اسکے ساتھ ہی ایک پاٹ شالہ

بھی قائم کی جسمین نادار طلبا کو نہ صرف مفت تعلیم دیجاتی ہی بلکہ اُن کی رہائش اور طعام کا بھی معقول انتظام ہی۔ ہندو یونیورسٹی مین آپنے تیس ہزار کی بیش بہا رقم چندہ مین دی۔ آگرہ کالج اور بریلی کالج کے آپ ٹرسٹی تھے۔ آگرہ الورا اور لاہور کے بہار گو بورڈنگ ہوس محض آپ ہی کی وجہ سے ابتک قائم ہین۔ صنعتی تعلیم مین آپکو نہایت دلچسپی تھی۔ ایک اسکیم آپکے زیر غور تھی کہ آپکے کارخانون کے ساتھ ایک اسکول کھولا جائے جسمین مزدورون کو مشین وغیرہ چلانے کی تعلیم دیجائے۔ سنہ ۱۹۰۷ء مین حرفتی تعلیم کی جو کمیٹی گورنمنٹ نے قائم کی تھی آپ اُسکے ممبر تھے۔ اِس کمیٹی مین یہ طے پایا تھا کہ کانپور مین ایک ٹیکنالاجیکل انسٹی ٹیوٹ بہت جلد قائم کیا جائے۔ جب بہت عرصہ ہوا اور وہ انسٹی ٹیوشن قائم نہوا اور جنگ کی وجہ سے ملک کو عام طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ صنعت و حرفت کے بغیر ملک کو خوشحالی میسر نہین ہو سکتی اور اِس ترقی کے لیے تعلیم کا ہونا ضروری ہی تو آپنے شاہی کونسل مین اِسکے متعلق ایک رزولیوشن بھی پیش کیا، مگر حضور لفٹنٹ گورنر بہادر کی درخواست پر واپس لے لیا۔ رُڑکی کالج کی نسبت آپ نے گورنمنٹ کو نہایت صائب رائے دی تھی جسکا اعتراف گورنمنٹ گزٹ مین عمدہ الفاظ مین کیا گیا۔ اسی رائے کا اثر تھا جو رُڑکی کالج کے آپ ممبر بنا دیے گئے۔ صوبجات ہذا کی صنعت و حرفت کی ترقی کی تدابیر سوچنے کے لیے سنہ ۱۹۱۲ء مین بورڈ آف انڈسٹریز قائم ہوا تو آپ بھی اُسکے ممبر ہوے۔ اُسی سال آپکو حضور لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنی کونسل کا ممبر نامزد فرمایا۔ اور سنہ ۱۹۱۳ء مین جدید کونسل مین آپ دوسری مرتبہ بھی ممبر انتخاب ہوے۔ پھر اپریل سنہ ۱۹۱۳ء مین صوبجات ہذا کی انڈسٹریل کانفرنس کے آپ پریسیڈنٹ مقرر ہوے۔ آپ کا صدارتی اڈریس بہترین اڈریسون مین شمار کیے جانے کے قابل ہی۔ اسی سال آپ بارھوین انڈین انڈسٹریل کانفرنس کے استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین تھے مگر قضا و قدر کے معاملات مین کِسکو دخل ہی۔ افسوس کہ آپنے چند دن پیشتر داعی اجل کو لبیک کہی۔ علاوہ اُسکے مرحوم کے سیکڑون فائدہ عام کے امور ایسے ہین جن سے ہزارہا بندگانِ خدا کو عظیم فائدے حاصل ہوے۔

آہ! کون جانتا تھا کہ ایسا ہمہ تن خیر جس کے دل مین ہر وقت ملک و قوم کا درد رہتا تھا ہم سے اتنی جلد چھین لیا جائے گا۔ ہم پراگ نرائن کے لیے نہین رو رہے ہین بلکہ لکھنؤ کی بیواؤن یتیمون اور بیکس بیبس طالب علمون کے حال زار پر نوحہ کنان ہین۔ لکھنؤ کے پُرانے رئیسون کی طرح ہزارہا بندگانِ خدا آپکے بھی دامن دولت سے وابستہ تھے۔ لاکھون روپیہ خیر خیرات مین آپ صرف فرماتے تھے سیکڑون شریف حاجتمندون کی آپ اِسطرح خفیہ مدد کرتے تھے جس کی کسی کو خبر نہوتی تھی۔ حیف! آج اُنکے گھرون مین کہرام برپا ہی۔ سچ ہی کہ ایسے لوگ زندۂ جاوید ہین۔ موت اُنکے اجسام پر تو قبضہ کر لیتی ہی مگر اُنکے نیک نام کو جو جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکا ہی ہرگز ہرگز نہین مٹا سکتی!

ناظرین! مرحوم کے ذاتی صفات اور ذاتی خوبیان ایسی تھین کہ جس شخص نے خواہ وہ انگریز ہو یا ہندستانی ہو بنگالی ہو یا دکھنی ہندو ہو یا مسلمان آپ سے ایک مرتبہ ملاقات کر لی بس پھر اُن سے محبت ہو جاتی تھی۔ آپ کے دوستون کی تعداد بیشمار تھی ہر شخص سے آپ کے تعلقات ایسے تھے کہ حقیقی بھائیون مین نہین ہوتے۔ اور یہی وجہ تھی کہ آپکے زمانۂ علالت مین چند ہی خود غرض احباب ہونگے جنھون نے اگر آپ کی کم و بیش خدمت کی ہو۔

ایک مرتبہ ایک ڈپارٹمنٹ کے افسر آپ کی خدمت مین گئے اور بیان کیا کہ فلان چپراسی نے ایسی حرکت کی ہی کہ وہ ڈسمس کر دیا جائے آپ بھی پہلے پہل بہت ناراض ہوے کہنے لگے کہ اُس نے ایک دفعہ ہم کو بھی دھوکا دیا اور ہم غور کر رہے تھے کہ اُسکو کیا سزا دی جائے پھر آپنے

نہایت دھیمی آواز سے دریافت کیا کہ کیون صاحب اُسکو تنخواہ کیا ملتی ہی۔ جواب ملا کہ پانچ روپیہ۔ آپ نے فرمایا کہ آجکل جب ہر چیز اسقدر گران ہی ایک شخص جسکے پیچھے ایک کنبہ بھی ہو پانچ روپیہ ماہوار مین کیسے گذر کر سکتا ہی جب پیٹ نہین بھرتا بال بچے پریشان کرتے ہین تو انسان ہر کام کے لیے مجبور ہو جاتا ہی۔ میری راے مین اُس کی تنخواہ اُتنی ہی کر دی جاے جتنی دیگر چپراسیون کی ہی یعنی سات روپیہ ماہوار اور پھر چند مہینہ کے بعد رپورٹ بھیجیے کہ اُسکی عادتین درست ہوئین یا نہین۔ ناظرین یہ تعجب کی بات نہین ہی کہ اُسکی شکایت پھر مرحوم کے کان تک نہ پہنچی۔

اگر بار خاطر نہو تو ایک اور واقعہ بیان کیا جائے۔ ایک دفعہ ایک بڈھا مسلمان آپ کی خدمت مین حاضر ہوا آپ نے کہا کہ اب کی مرتبہ تو بہت مدت کے بعد آئے ہین کہیے آپ کچھ تیار کر کے بھی لائے اُس نے تنزیب کی تین ٹوپیان پیش کین اور کہنے لگا کہ حضور اسکے تیار کرنے مین مصروف رہا اسی لیے حاضر نہو سکا۔ پوچھا اُن کی قیمت کیا ہی اُس نے جواب دیا کہ حضور ایک دس روپیہ کی۔ ایک پندرہ کی اور ایک پچیس کی۔ آپ نے تینون ٹوپیان لے لین اور اُسکو ساٹھ روپیہ دلوا دیے بعد مین جب دریافت کیا گیا کہ کیا واقعی اتنی قیمت کی یہ ٹوپیان ہین تو آپ نے جواب دیا کہ اِس شخص نے مطبع مین چالیس برس ملازمت کی ہی اب اِسکو پنشن ملتی ہی۔ مگر اُس پنشن مین گزارہ نہین ہوتا۔ جب تکلیف مین ہوتا ہی تو یہ ہمارے پاس آتا ہی اور ہم سے کچھ لیجاتا ہی۔ ٹوپیون کا بہانا ہوتا ہی تاکہ اسکو یہ محسوس نہو کہ مین نے بلا محنت کے یہ روپیہ لیا اور ہمین یہ خیال نہو کہ ہم نے مفت روپیہ دیدیا۔ ناظرین اس قسم کی سیکڑون مثالین ہین جن سے آپ کی غربا پروری اور اپنے ملازمین کے ساتھ محبت کا اندازہ ہو سکتا ہی۔

آپ کو ہر کام کے کرنے مین ایک خوشی محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ جن اصحاب کو آپکے زمانہ علالت مین دیکھنے کا موقع ملا ہی وہ اِس بیان کی تصدیق کر سکتے ہین کہ جسوقت ڈاکٹر آپ کے پھوڑون پر اپریشن کرتا تھا اُسوقت بھی آپ اپنی خوش مزاجی کو نہین چھوڑتے تھے۔ اُردو اور ہندی لٹریچر کی خدمت جو آپ کے مطبع نے آپ کے دوران عہد مین کی وہ مخفی نہین ہی۔ مشرقی اور ہندوستانی زبانون نے جتنی ترقی آپ کے زمانہ مین آپ کے مطبع کے ذریعہ سے کی اُسکی دوسری مثال نہین ملے گی۔

عدالت جوڈیشیل کے فاضل جج کی تقریر کا یہ فقرہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہی کہ "مرحوم صوبجات ہی کے لیے نہین بلکہ اقطاع ہند کیلیے مفید ترین انسان تھے"۔

مضمون کو ختم کرتے وقت ہماری دلی دعا ہی کہ مرحوم کے صاحبزادہ بلند اقبال کو خداوند عالم توفیق خیر عطا فرماے اور اپنے باپ دادا کی طرح ناموری بخشے۔ اور اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنے کا شوق عطا فرماے۔ آمین۔

عشقی

لکھنؤ کا قومی ہفتہ

ہفتہ کرسمس میں جو چہل پہل اور رونق امسال لکھنؤ میں رہی ہے بہت کم کسی شہر میں دیکھی گئی ہو۔ نیشنل کانگرس کے علاوہ دیگر متعدد و مختلف کانفرنسین انجمنین دنون میں اس تاریخی شہر میں منعقد ہوئین جن میں شرکت کی غرض سے ہر صوبہ کے تعلیم یافتہ طبقہ کے ممتاز ترین اصحاب بڑی تعداد میں مجتمع تھے، اور صوبجات متحدہ کے لوگ تو جوق جوق موجود تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف جلسون میں سے بعض کی مفصل اور بعض کی مختصر کیفیت ہدیۂ ناظرین کی جائے۔ سب سے پہلے بالفعل ہم انجمنون یا کانفرنسون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن سے ہمیں بھی کسیقدر تعلق ہو۔

اُردو کانفرنس

اُردو کانفرنس جس کے انعقاد کی تدبیرین تین مہینے سے مسلسل جدوجہد ہو رہی تھی، بالآخر ۲۹ دسمبر کی صبح کو ٹھیک ۹ بجے قیصر باغ کی خوشنما بارہ دری میں منعقد ہوئی۔ بارہ دری مذکور کی آرائش کا اہتمام کارکنان آل انڈیا مسلم لیگ و عالیجناب مسٹر راجہ صاحب محمود آباد کے اسٹاف کی نگرانی میں تھا اور اگرچہ اس سبب سے کہ لیگ کا سالانہ جلسہ ایک روز بعد سے شروع ہونے والا تھا تمام انتظامات مکمل نہ ہوئے تھے تاہم بارہ دری کی محرابون اور ستونون پر رنگین کاغذ کی پھول پتیان جس خوش سلیقگی کے ساتھ لگائی گئی تھین ان سے ایک خاص دل آویزی کی شان پیدا ہو گئی تھی۔ بارہ دری کے وسطی کمرے مین جانب مغرب ایک بلند و وسیع پلیٹ فارم (چبوترہ) متعلا اور نمایان شرکاے جلسہ کے واسطے بنایا گیا تھا جس پر کوچین اور گدے دار کرسیان رکھی ہوئی تھین۔ اس چبوترے کی پشت پر ایک دوسرا چبوترہ خاص اُردو کانفرنس مین شریک ہونے والی خواتین کے لیے تیار کیا گیا تھا جہان پردے کا ایسا اچھا انتظام تھا کہ شاید اس سے پہلے کسی جلسہ مین نہین کیا گیا۔ اور اس حُسن انتظام کے تمامتر ذمہ دار ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب (ایم اے ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لا) تھے۔ وہ چیز جسے ہم "اوری زبان" کے پیارے نام سے موسوم کرتے ہوں اُسوقت تک پوری طرح ترقی پذیر نہین ہو سکتی جبتک خود ہماری ماؤن کو اس تحریک مین پوری دلچسپی نہو۔ اسی خیال کی بنا پر اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ طبقہ ذکور کے ساتھ ساتھ طبقہ اناث کی نمایندگی سے بھی اس جلسے کو بہرہ وافر حاصل رہے۔ اور اگرچہ خواتین کے پاس رقعات دعوت کسی قدر دیر مین پہنچے اور ایک حد تک اُنھین لکھنؤ ہی کی خواتین تک محدود رکھنا پڑا تاہم لکھنؤ و مضافات لکھنؤ کی تقریباً پچیس تیس خواتین اُردو کانفرنس کے اجلاسون مین شریک ہین۔

۸ بجے سے بارہ دری مین مجمع ہونے لگا اور ۹ بجے سے پہلے پہلے وسطی کمرہ اور ڈائس کی سب کرسیان پُر ہو گئی تھین۔ ٹھیک ۹ بجے جناب نواب سید نصیر حسین صاحب خیال (اُمیس پٹنہ) رونق افروز ہوے اور پرجوش نعرہاے آفرین کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ جلسے مین ہر صوبے کے معزز اصحاب شریک تھے۔ جن مین سے خاص خاص اصحاب کے نام یہ ہین:۔ عالی جناب مسٹر راجہ صاحب جہانگیر آباد۔ آنریبل مسٹر محمد علی جناح۔ آنریبل مسٹر مظہر الحق۔ سید نبی اللہ صاحب۔ آنریبل مسٹر یعقوب حسن سیٹھ۔ صفی الدولہ نواب علی حسن خان صاحب۔ شیخ شاہد حسین صاحب۔ مولوی نظام الدین حسن صاحب۔ مسٹر مارگولیتھ (جو یورپ کے مشہور عالم ہین اور آجکل ہندوستان کی سیاحت کر رہے ہین) آنریبل نواب۔ نواب علی چودھری صاحب۔ نواب آغا محمد شفیع خان صاحب۔ آنریبل میان فضل حسین صاحب۔ نواب سلطان علی خان صاحب۔ خشی احتشام علی صاحب۔ آنریبل مسٹر فضل الحق۔ مولانا آزاد سبحانی۔

پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب - مسٹر ممتاز حسین - حاجی موسیٰ خان صاحب - نواب فتح علی خان صاحب قزلباش - سید حبیب اللہ صاحب - مسز نائیڈو (انگریزی زبان کی مشہور شاعرہ) وغیرہ -

سب سے پہلے عالی جناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹر ایٹ لا صدر مجلس استقبالیہ نے اپنی نہایت ہی فصیح و بلیغ تقریر صدارت پڑھی جس کے مطبوعہ نسخے تمام حاضرین کو تقسیم کر دیے گئے تھے اور جو العصر کے اس نمبر میں تمام و کمال شائع کی جاتی ہے - اس خطبے میں خیر مقدم اور بعض رسمی تذکروں کے علاوہ مختصراً اُن متعدد مباحث پر ایک سرسری بحث کی گئی تھی جو زبان اُردو کی توسیع و ترقی کے لیے تمام اہلِ ملک کو پیش نظر رکھنا چاہیئے - یہ صدارتی خطبہ ایسی سلیس اور فصیح عبارت میں لکھا گیا ہے کہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جناب نواب صاحب نے ادب اُردو کا ایک نہایت ہی پاکیزہ نمونہ پیش کیا ہے جو محض اپنی ادبی خوبیوں کی بنا پر اس قابل ہے کہ تمام اُردو خوان اصحاب اس سے لطف اندوز ہوں -

نواب ذوالقدر جنگ بہادر کی تقریر کے خاتمہ پر سید نبی اللہ صاحب (ایم اے ایل ایل ایم بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ) نے ایک مختصر تقریر میں تحریک صدارت کی اور لکھنؤ کے مشہور شاعر مولانا سید علی نقی صاحب صفی نے حسب ذیل شعر میں جو فی البدیہہ موزون کیا گیا تھا اس تحریک کی تائید کی ؎

صفی کل ہمزباں ہوں سب یہی ہے [illegible] اپنا — بدل ہوں میں اس تحریک کی تائید کرتا ہوں

جس کے بعد نواب نصیر حسین صاحب خیال نے جن کی صدارت کا پہلے سے اعلان ہو چکا تھا کرسی صدارت کو زینت بخشی اور ایک مختصر تقریر میں اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کر کے اپنا صدارتی خطبہ پڑھنا شروع فرمایا - یہ خطبہ اگرچہ نہایت طولانی ہے مگر زبان اُردو کی قدیم تاریخ کے متعلق قیمتی معلومات کا ایسا ایک قابل قدر ذخیرہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا - حقیقت میں یہ محض خطبہ نہ تھا بلکہ اگر اسے زبان اُردو کی ایک مستقل تاریخ کہا جائے تو بیجا نہیں - العصر کی محدود ضخامت سے اس خطبہ کو باقساط شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی - کوشش تھی کہ اسی نمبر سے اس کی اشاعت ہوتی مگر چند وجوہ سے ایسا نہ ہو سکا - نواب صاحب نے خود ایک نسخہ تصحیح فرما کر ہمیں ارسال کیا ہے جس کے لیے ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں یقین ہے کہ جو حضرات اس خطبہ کو بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں گے وہ بہت محظوظ ہوں گے -

خطبۂ صدارت کے بعد ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کا حسب ذیل تار پڑھ کر سنایا گیا - جو اُنھوں نے اُردو کانفرنس کے صدر نشین کے نام روانہ فرمایا تھا:-

اُردو کانفرنس کے اغراض و مقاصد نہایت قابل تحسین ہیں اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی (یعنی صدر جلسہ کی) رہنمائی میں جو کارروائی اُس کو کامیاب بنانے کے متعلق کی جائے گی وہ بہت پسند کی جائے گی میں کانفرنس کی کامیابی کا بدل خواہاں ہوں -

اس کے بعد حسب ذیل تجاویز منجانب صدر پیش ہوئیں جو باتفاق آرا و بکمال جوش منظور ہوئیں -

(الف) یہ کانفرنس سید علی محمد عارف یادگار جناب انیس مرحوم اور مشہور محب وطن پنڈت بشن نرائن در متخلص بہ ابر اور نواب سید محمد صاحب آزاد رئیس کلکتہ اور آنریبل منشی پراگ نرائن بھارگو رائے بہادر کی وفات پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہے کہ بزرگان موصوف قوم کے ایک جوہر اور زبان اُردو کے محسن و سرپرست تھے -

(ب) یہ کانفرنس اُس بیش قرار عطیہ کا کمال احسان مندی کے ساتھ شکریہ ادا کرتی ہے جو حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی علم پروری اور دریا دلی سرکار نے پانچ ہزار روپے سالانہ کی صورت میں انجمن ترقی اُردو کو دینا منظور فرمایا ہے - اس بر محل امداد نے درحقیقت انجمن کی بنیادیں مستحکم کر دیں اور کام کرنے والوں کی ہمت اور حوصلے بڑھا دیے ہیں -

(ج) ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ [illegible] کے اُن احسانات عظیم کا جو مدد دینے سے اُردو علم و ادب اور خاص کر انجمن ترقی اُردو پر کیے ہیں

اعتراف کرنا یہ کانفرنس اپنا فرض سمجھتی ہے۔ علاوہ دیگر ان گرانقدر عطیون کے سرکار عالیہ نے ایک معقول سالانہ رقم حال مین انجمن ترقی اُردو کے واسطے عطا کی ہے جس کا یہ جلسہ شکریہ ادا کرتا ہے اور اِس ضمن مین جناب ممدوح کی تصانیف اُردو پر جو حضور کے علمی ذوق کی سب سے نمایان دلیل ہین نہایت مسرت کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کرنے کی جرأت کرتی ہے۔

بعد ازان مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے مختصراً انجمن ترقی اُردو کی گذشتہ کیفیتون، موجودہ کارروائیون، اور پیش نظر تجویزون پر تقریر کر کے شرکائے کانفرنس کو انجمن کے اغراض و مقاصد پر توجہ دلائی اور اِس معنی خیز جملے کو اپنے نہایت مؤثر الفاظ مین بیان کر کے کہ "چندہ مانگنے والا دنیا مین سب سے بُرا سمجھا جاتا ہے۔ لہذا مین چندہ نہین مانگنا چاہتا" اپنی تقریر کو ختم فرمایا۔

پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک نہایت ہی فصیح، مدلل اور پُراثر تقریر فرما کر حسب ذیل تجویز جلسہ کے سامنے پیش کی:۔

اس جلسہ کی رائے مین نہایت ضروری ہے کہ زبان اُردو کا ایک مرکزی کتب خانہ وسیع پیمانے پر قائم کیا جائے اور اُس کے آغاز کرنے کے لیے کم سے کم دس ہزار روپیہ نقد اور مصارف دائمہ کے واسطے معقول سالانہ رقم کا انتظام کیا جائے۔ یہ کام ایک منتخب جماعت کے سپرد ہو جو اِس وقت سے سرمایہ کی فراہمی اور پھر کسی مناسب مقام پر کتب خانہ قائم کرے

اس تجویز کی تائید مختصراً مولانا آزاد سبحانی صاحب نے، پروفیسر مرزا محمد ہادی بی۔ اے رسوا اور خواجہ امیر احمد صاحب انصاری نے فرمائی اور تحریک باتفاق آرا منظور ہوئی۔

اس دوران مین چونکہ گیارہ بج چکے تھے اور کانگریس کے آخری جلسہ کی شرکت کے واسطے حاضرین جلسہ مین سے بعض اصحاب اُٹھنے لگے تھے لہذا مزید کارروائی ملتوی رکھی گئی اور اجلاس اول ختم کر کے اعلان کر دیا گیا کہ اجلاس ثانی دوسرے دن شام کو ۲ بجے ہوگا۔

حسب قرارداد روز اول دوسرا اجلاس ٹھیک ۲ بجے شروع کر دیا گیا اس مجلس مین اگرچہ بعض وہ اصحاب شریک نہین تھے جو پہلے دن رونق افروز ہوئے تھے لیکن مجمع پہلے دن سے بھی زیادہ تھا اور نئے اصحاب کی تعداد اس مجمع مین یقیناً بڑھ گئی تھی۔ جناب نواب نصیر حسین صاحب خیال کو تشریف لانے مین چونکہ کسی قدر توقف ہوا اس وجہ سے جناب مولوی نظام الدین حسین صاحب کی صدارت مین کارروائی جلسہ شروع ہو گئی مگر دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ نواب صاحب تشریف لے آئے اور ان کی صدارت مین بقیہ کارروائی ہوتی رہی۔

پہلے انجمن ترقی اُردو کی شاخ بمبئی کے نمایندے مولوی حبیب الرحمن خان صاحب نے ایک تقریر کے ذریعے سے مندرجہ ذیل تحریک جلسے کے سامنے پیش کی:۔

اُردو کانفرنس کا یہ اجلاس زور دیتا ہے کہ شہر احمدآباد کی جماعت تعلیم المعلمین اُردو (اُردو ٹرینینگ کلاس) جو بمبئی گورنمنٹ نے تین سال سے بطور آزمائش جاری کی ہے آئندہ بہت جلد مستقل کر دی جائے۔

جس کی تائید جناب حاجی ریاض الدین صاحب نے فرمائی اور اپنی تقریر کے دوران مین حاجی صاحب نے مختصراً اُن کوششون کا بھی حوالہ دیا جو صوبہ بمبئی مین اشاعتِ اُردو کے متعلق ہو رہی ہین۔

اسکے بعد جناب پروفیسر بی گھوشال صاحب ایم اے نے "ترقی زبان بذریعۂ تراجم" پر اپنا قابل قدر مضمون پڑھنا شروع کیا جس مین اسلاف اسلام کی علمی کوششون کا ایسی فیاضی کے ساتھ اعتراف کیا گیا تھا کہ ہر طرف سے اِس بنگالی مسیحی مقرر کی انصاف پسندی اور رواداری پر تحسین و آفرین کی بارش ہو رہی تھی اور تمام اصحاب حتی کہ ہمارے محترم آنریبل مسٹر مظہر الحق

بھی اس بات پر سخت متحیر تھے کہ ایک بنگالی نژاد شخص کیونکر ایسی سلاست اور لہجے کی ملائمت کے ساتھ ایسا عالمانہ مضمون اُردو میں پڑھ سکتا ہے اور اسلامی علوم اور مسلمانوں کی بینظیر علمی خدمات پر اس درجے کیسے حاوی ہو سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عموماً اس مضمون کو پڑھ کر اور خصوصاً پروفیسر صاحب کی زبان سے سُن کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی غیر مسلم یا بنگالی شخص کا لکھا ہوا ہے۔ صاحب صدر جلسہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اس مضمون کو وہ اپنے صرفہ سے طبع کرا کے ملک میں شائع فرمائیں گے۔

اِس مضمون کے خاتمے پر خواجہ میر احمد صاحب انصاری بی اے نے ایک پُرزور اور مدلل تقریر کر کے حسب ذیل تحریک جلسے کے سامنے پیش کی:-

"چونکہ اِس صوبے کی یونیورسٹی میں اہل ملک اور گورنمنٹ کی بار بار سفارش کے باوجود ابھی تک اِن صوبجات کی زبان کو کالج کے نصاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے، لہٰذا یہ جلسہ گورنمنٹ اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے باصرار درخواست کرتا ہے کہ کالج کے نصاب میں اُردو کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے داخل کیا جائے۔"

تحریک مندرجۂ بالا کی تائید جناب پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی اے (المتخلص بہ رسوا) نے نہایت دلچسپ تقریر کے ذریعے سے فرمائی جس میں اُنھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ یونیورسٹی کے امتحانات میں السنۂ مشرقیہ کے جو پرچے ہوتے ہیں اُن میں یہ ہدایت ہوتی ہے کہ ترجمے یا جواب مضمون انگریزی میں لکھے جائیں، اور چونکہ مشرقی ادب کو انگریزی لباس پہنانا دشوار بلکہ محال ہے (یہاں اُنھوں نے فارسی سے انگریزی ترجموں کی بعض نہایت پُرلطف مثالیں بیان کیں جنھیں سُن کر لوگ خوب ہنسے) اس وجہ سے یونیورسٹی کی اس ہدایت کا نتیجہ اول تو یہ ہوتا ہے کہ مشرقی علم ادب میں اُن طلبہ کو کوئی معقول دستگاہ نہیں ہونے پاتی۔ دوسرے اُن کی ذہنی ترقی پر بوجہ اس کے کہ اس ذریعہ سے سمجھ کر یاد کرنے کے بجائے رٹنے کی ضرورت زیادہ ہو جاتی ہے نہایت خراب اور مضر اثر پڑتا ہے۔ مرزا صاحب موصوف کی پہلے یہ خواہش تھی کہ کانفرنس کی طرف سے جو رزولیوشن پیش ہو وہ صرف اسی ایک پہلو پر یونیورسٹی کو توجہ دلائے مگر خواجہ امیر احمد صاحب کا رزولیوشن چونکہ زیادہ جامع تھا اس لیے اُنھوں نے اسی کی تائید کے سلسلے میں اپنے خیالات کو بوضاحت ظاہر کرنے کے لیے موقع نکال لیا۔

ہاں یہ تو لکھنے سے رہ ہی گیا کہ دوسرے جلسے کی کارروائی شروع ہونے کے بعد سب سے پہلے مولانا ابو الکلام آزاد کا مندرجۂ ذیل تار پڑھ کر سنایا گیا جو موصوف نے اپنے بندی خانے (واقع رانچی) سے صدر اُردو کانفرنس کے نام بھیجا تھا:-

"میں تہِ دل سے اس پہلی آزاد مجلس کو مبارکباد کہتا ہوں جو قومی زبان کی ترقی کے لیے منعقد ہوئی ہے، اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ کانفرنس کے عزائم، رجحان کار، اور طریق عمل میں رفعت و وسعت فرمائے۔"

مولانا عبد الحلیم صاحب شرر نے ایک بیش قیمت مضمون لکھا تھا جس کی سُرخی تھی "ہندوؤں کا تعلق زبانِ اُردو سے"۔ صاحب موصوف نے جلسہ میں تقسیم کرنے کی غرض سے اس کو چھپوا بھی لیا تھا۔ اب مولانا نے اپنا پُرمغز مضمون پڑھنا شروع کیا، مگر صاحب موصوف کی آواز سارے مجمع تک نہیں پہنچ سکتی تھی، لوگوں کی خواہش ہوئی کہ مولانا کے بجائے کوئی دوسرے صاحب اسے پڑھیں، چنانچہ جناب مولوی عبد الحق صاحب بی اے (سکریٹری انجمن ترقی اُردو) نے اس خدمت کو انجام دیا، مگر چونکہ وقت کم تھا اور ابھی کئی تحریکات باقی تھیں، اس وجہ سے مضمون تمام و کمال نہیں پڑھا جا سکا۔ "العصر" کی موجودہ اشاعت میں یہ مضمون

بھی تمام وکمال شائع کیا جاتا ہے

ختم مضمون پر ایک صاحب نے جو غالباً فرنگی محل کے مدرسہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ اعلان کیا کہ مشہور شاعر مولانا آرضا فرنگی محلی نے اپنے دیوان کے پچاس نسخے انجمن ترقی اُردو کو عنایت فرمائے ہیں۔

اسکے بعد مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے ایک مختصر تقریر کے ذریعے حسب ذیل رزولیوشن جلسہ کی منظوری کے لیے پیش کیا۔

یہ کانفرنس اُردو انسائیکلوپیڈیا تیار کیے جانے کی اس تحریک کو جو لکھنؤ کے بعض ذی علم حضرات نے شروع کی ہے بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور تمام اہل وطن کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ اس کار عظیم میں جہان تک ممکن ہو سعی و امداد کریں۔"

سید سجاد حیدر صاحب (پرائیوٹ سکرٹری راجہ صاحب محمود آباد) اور سید سلیمان صاحب (جانشین علامہ شبلی) نے مختصراً اس رزولیوشن کی تائید فرمائی۔

یہ رزولیوشن ختم ہوا تو جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم نے حسب ذیل تحریک پیش کی:۔

یہ کانفرنس ترقی و اشاعت اُردو کے لیے نہایت ضروری سمجھتی ہے کہ بتدریج ہماری کتابیں اور اخبارات ٹائپ (سیسے کے حروف) میں چھاپے جائیں اور لوگون کو ٹائپ سے مانوس کیا جائے۔

سید صاحب موصوف جا شاء اللہ تعلیم جدید کے خوش ترین ثمرات میں سے ہیں اور مغربی تہذیب لوازم تہذیب کے بدل شیفتہ ہیں اُنکی طرف سے اس قسم کی تجویز کا پیش ہونا چندان مضائقہ نہ رکھتا تھا مگر ستم یہ ہوا کہ انجمن ترقی اُردو کے لائق سکرٹری بھی اُن کے ہم آہنگ ہو گئے جنھیں اب اُردو کتابوں کے چھپوانے کا تلخ تجربہ ہو رہا ہے اور اُنھون نے اُردو زبان کی اشاعت عام کے لیے اس کی ضرورت جتا کر اس تحریک کی تائید فرمائی۔ سید جالب صاحب ایڈیٹر ہمدم نے اُن تجربات کی بنا پر جو لیتھو پریس کے متعلق اُنھیں ایک اخبار نویس کی حیثیت میں اتنی مدت سے حاصل ہوے ہیں، اور نیز اُن علمی دشواریون کے سبب سے جن کا ہمدرد مرحوم کے سلسلہ میں اُن کو اور مسٹر محمد علی مالک و ایڈیٹر ہمدرد کو سامنا کرنا پڑا، اس تحریک کی مخالفت کی اور اس مخالفت کی تائید مسٹر ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر نے کی۔

یہ مسئلہ حقیقتاً اسقدر اہم اور اتنے پہلو رکھتا ہے کہ اس قسم کی کانفرنسون میں اس کا پیش ہونا کچھ مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ اسمین ضرورت ہے اُن لوگون کی رایون کی جنھون نے سنگی چھاپہ اور ٹائپ کے چھاپون کے متعلق کافی تجربات حاصل کیے اور اس مسئلہ پر بحیثیت ایک ماہر فن کے غور کیا ہے جنھون نے خط نستعلیق کے محاسن و معائب پر اور اس ایک بدنما خط سے بدلنے کے مفاد و مضرت پر گہری نظر ڈالی ہے جنھون نے اُس اثر کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے جو مختلف قسم کے حروف کے مطالعہ سے انسان کی قوت باصرہ پر پڑتا ہے، اور جنھون نے اس مسئلہ کی تحقیق پر اپنے وقت عزیز کا کوئی گران قدر حصہ صرف کیا ہو کہ ٹائپ کے رواج سے اُن ملکون کو کیا اقتصادی منافع حاصل ہوے جن میں اُردو کی ہم مشرب و ہمرنگ زبانیں رائج ہیں۔

اس تحریک پر بہت سے اصحاب بحث کرنے کو تیار تھے مگر وقت کہان تھا کہ کسی کی کچھ سُنی جاتی۔ لہٰذا بالآخر یہ طے کیا گیا کہ سر دست اس مسئلہ کو ملتوی کیا جائے اور کسی اور موقع جلسے پر اس کی بحث اُٹھائی جائے۔

اُس کے بعد سید جالب نے حسب ذیل تحریک پیش کی:۔

یہ جلسہ قرار دیتا ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت میں زبان اُردو کی ترقی و تقویت کا کام تمام فرقہ ہاے آبادی کی اعانت سے سرانجام دینے کے قابل بنانے کے لیے انجمن ترقی اُردو کو جس پیمانہ تک وسعت دینے کی ضرورت ہے اُس کی تدابیر سوچنے اور عمل میں لانے کے لیے چند

مقتدر صاحب کی ایک کمیٹی مامور کی جائے اور اس کو حسب ضرورت اپنی طاقت مین اضافہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔

پنڈت کشن پرشاد کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی نے اسکی تائید کرتے ہوئے یہ صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ ہندوؤن سے اِس بات کی توقع رکھنا ناسمجھی ہوگا کہ وہ انجمن ترقی اُردو مین اُسوقت تک پوری دلچسپی ظاہر کرین گے جب تک کہ وہ مسلمانون کی تعلیمی کانفرنس کا ایک شعبہ بنی ہوئی ہے - اور ہندوؤن کا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کیونکہ مسلمانون سے کون توقع رکھتا ہے کہ وہ ہندو سبھا کے کسی شعبے مین کبھی کوئی دلچسپی لے سکین گے۔

یہ تحریک بہ اتفاق آرا منظور ہوئی، اور دمین یہ بھی طے پا گیا کہ پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی اس کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہون

اس موقع پر کلکتہ کے ایک بزرگ نے جن کا نام نامی غالباً ملا صلاح الدین ہے اہل کلکتہ کی طرف سے کانفرنس کو آئندہ سال کلکتہ مین اجلاس کرنے کی دعوت دی۔ اُس کے بعد جناب مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے صاحب صدر جلسا اور دیگر مہمانان کانفرنس کا شکریہ مناسب الفاظ مین ادا کیا اور جناب صدر نے آخری الفاظ مین یہ توقع ظاہر کی کہ آئندہ سال جب پھر اُردو کانفرنس کا انعقاد ہوگا تو ہم اس وقت سے زیادہ کامیابی حاصل کر سکین گے۔

اب کہ ۹ بج چکے تھے، صاحب صدر نے جلسہ کو برخاست کیا اسکے بعد بعض اصحاب کی خواہش کی بنا پر تحریک کی گئی کہ بزم مشاعرہ قائم ہو چنانچہ بہ اتفاق مرزا محمد ہادی صاحب رسوا اس جلسہ کے صدر منتخب ہوے۔ بزم مشاعرہ مین سب سے پہلے مولانا صفی نے اپنی وہ نظم سنائی جو فی الحقیقت اُنھون نے اُردو کانفرنس مین پڑھنے کے لیے لکھی تھی جسکا موقع منتظمین کانفرنس دورانِ اجلاس مین نہ دے سکے۔ اُس کے بعد مسٹر اظہر علی آزاد نے اپنی نظم برق کے چند بند سنائے چونکہ رات زیادہ آگئی تھی اور لوگ کھانا کھا کر نہین آئے تھے، اس لیے بزم مشاعرہ جلد ختم کر دی گئی۔

اُردو پریس کانفرنس

یہ ثابت کرنے کے لیے کسی طویل بحث کی حاجت نہین کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو کے پریس کو اپنی تقویت و اصلاح کے لیے اپنے صیغہ کی ایک مستقل انجمن اور سالانہ جلسہ شوریٰ کی ضرورت ہے اور جبتک اپنے مشترکہ فوائد کی حفاظت مین وہ اس قسم کے اتحادِ عمل کی صورت نہ پیدا کرے گا، اُن جلیل القدر فرائض کی ادائگی سے جو اہل ہند کی اصلاح و ترقی کے متعلق اُس پر عائد ہین ہرگز عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔ اس لیے مُلکی پریس کی کانفرنس درحقیقت ایک نہایت اہم ملکی تحریک ہے۔ جس سے ہندوستانی پبلک کو پوری دلچسپی لینی چاہیے اور محبانِ وطن کو حتی الامکان اس کی ترقی و کامیابی مین مدد دینی چاہیے۔ وہ لوگ بڑے تنگ خیال و ناعاقبت اندیش ہین جو صرف ذاتی کدورتون یا شخصی کاوشون کی بناء پر ایسی ضروری تحریک کی وقعت گھٹائین یا اُسکی کامیابی کے راستہ مین رکاوٹین پیدا کرین۔ بہرحال اُردو پریس کانفرنس کا پہلا اجلاس جیسا بھی منعقد ہوا وہ یقیناً بہت کچھ ہمت افزا ہے اور صرف کوئی ایسا مغرور و خود پرست شخص ہی اس کی وقعت گھٹانی چاہے گا جو تنگدلی کے باعث اپنے بھائیون کی کوششون مین مدد نہ پہنچائے اور پھر اُن کی کوششون کو جو وہ ساری جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے کرتے ہین محض اس بناء پر بنظر حقارت دیکھے کہ وہ خود انمین شریک نہ تھا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُردو پریس مین ایسے اشخاص کی تعداد بہت کم ہے اور تمام ارکین کی متفقہ سعی و کوشش جب مخلصانہ طریق پر عمل مین آئیگی تو انشاء اللہ اُن کی مخالفت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

اس کانفرنس کا پہلا اجلاس حسب قرارداد ۱۰ دسمبر کی شب کو گنگا پرشاد ورما لائبریری (نظیر آباد لکھنؤ) مین بصدارت منشی رام چھپال سنگھ

صاحب شیدا دہلوی ایڈیٹر "ہندوستان" لاہور منعقد ہوا۔ اور بنگال صوبجات متحدہ آگرہ واودھ دہلی، پنجاب اور بمبئی کے اُردو اخبارات ورسالجات کے قریباً ۸۰ قایم مقاموں نے اس میں حصّہ لیا اور تقریباً ۲۵ اُردو اخبارات ورسائل کے ایڈیٹروں نے ہر حصّہ ملک سے تار وخطوط بھیج کر بوجہ ناگریز شرکت سے مجبوری اور مقاصد کانفرنس کے ساتھ اپنی موافقت کا اظہار کیا۔ مسٹر موڈی سکرٹری انڈین پریس ایسوسی ایشن بھی جلسہ میں تشریف رکھتے تھے۔ اول پنڈت کشن پرشاد کول صاحب ایڈیٹر ہندوستانی نے ایک تقریر میں عارضی کمیٹی لکھنؤ کی طرف سے بیرونی ڈیلیگیٹوں کا خیر مقدم کیا اور اُردو پریس کے لیے ایک کانفرنس کی ضرورت جتائی۔ پھر سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم نے اپنی تقریر میں موجودہ کانفرنس کے قیام اور عارضی کمیٹی لکھنؤ کی کارروائیوں کا بالاختصار ذکر کیا اور آخر میں مسٹر شیدا ایڈیٹر ہندوستان لاہور کے لیے صدارت کانفرنس کی تحریک پیش کی جو باتفاق آرا پاس ہوئی اور شیدا صاحب نے کرسی صدارت پر تشریف لا کر اپنا اڈریس پڑھا، جو اگرچہ بہت تنگ وقت میں تیار کیا گیا تھا، لیکن ادبی پہلو سے نہایت دلچسپ تھا اور اُردو پریس کی زار ونزار حالت پر توجہ دلاتے ہوئے اراکین پریس میں اتحاد عمل وامداد باہمی کی ضرورت جتاتا اور اُردو پریس ایسوسی ایشن کے لیے کئی مفید تجاویز پیش کرتا تھا ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ نمبر میں اس تقریر کو تمام وکمال درج کر سکیں۔ تقریر صدارت کے بعد حسب ذیل رزولیوشن باتفاق آرا پاس ہوئے:۔

(۱) اس جلسے کے حاضرین جنہیں ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو کے متعدد اخبارات ورسالجات کے ایڈیٹران شامل ہیں، جو مختلف فرقوں اور جماعتوں کے حقوق وفواید کی نیابت وحفاظت کرنے والے ہیں، اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور قرار دیتے ہیں کہ اُردو پریس کے فوائد کی حفاظت کے لیے ایک اُردو پریس ایسوسی ایشن قائم کی جائے جس کا صدر مقام فی الحال لکھنؤ ہو۔ جلسہ کے تمام شرکا اس ایسوسی ایشن کی ممبری قبول کرتے ہیں۔ اور اپنی تعداد میں اضافہ کا اختیار رکھتے ہیں۔

محرک:۔ سید جالب ایڈیٹر ہمدم مؤید:۔ مسٹر شفاعت علی۔

(۲) اُردو پریس ایسوسی ایشن کا مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان کے اُردو پریس کو بذریعہ تمام آئینی وسائل کے جبریہ قوانین اور اُن کے عمل درآمد کی نقصان رسانی سے محفوظ رکھے۔ اور قانون سازی کے اُردو پریس کی جائز آزادیوں میں رخنہ ڈالنے اور حکام انتظامی کے اخبار نویسوں و وقائع نگاروں اور اراکین پریس کے جائز کام میں خلل انداز ہونے سے اُن کی حفاظت کرے۔

محرک:۔ مسٹر نذیر احمد علیگ ایڈیٹر سادات۔ مؤید: منشی محمد صدیق حسن ایڈیٹر الموّرخ

(۳) اس انجمن کی ایک انتظامی کونسل ہوگی جس میں حسب ذیل عہدہ دار ہوں گے:۔

(۱) پریسیڈنٹ (۲) وائس پریسیڈنٹ ۲-(۳) سکرٹری ایک (۴) جوائنٹ سکرٹری ایک۔ اور خزانچی ایک اور ہر صوبے سے حسب ذیل تعداد اراکین کی جائے گی۔

پنجاب ۱۲۔ صوبہ متحدہ ۸۔ بہار ۲۔ بنگال ۲۔ بمبئی ۳۔ صوبہ دہلی وصوبۂ سرحدی۔ اجمیر وممالک متوسط ایک ایک۔

محرک:۔ منشی دین محمد صاحب ایڈیٹر میونسپل گزٹ۔ مؤید: سید حبیب الحسن صاحب ایڈیٹر شیعہ کالج نیوز

(۴) اراکین کونسل کی ایک کمیٹی انجمن وکونسل کے قواعد وضوابط مرتب کرنے کی غرض سے بنائی جائے جو بعد ترتیب قواعد ممبران کونسل سے اگر ممکن ہو تو جلسہ طلب کر کے ورنہ بذریعۂ خط وکتابت منظوری لے اور بعد ازاں اُن کو چھپوا کر اراکین ایسوسی ایشن کو بھیج دے۔

محرک: منشی عباس حسین ایڈیٹر تمدن۔ مؤید: پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی۔

ترتیب قواعد و ضوابط کی کمیٹی کے لیے حسب ذیل اصحاب منتخب ہوے۔
مولانا سید سلیمان صاحب ایڈیٹر معارف، پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ایڈیٹر ہندوستانی۔ سید جالب صاحب دہلوی ایڈیٹر ہمدم۔

(۵) اُردو پریس کانفرنس اس زمانہ مین جبکہ ایک مہیب عالمگیر جنگ تین براعظمون مین برپا ہو اور سلطنت برطانیہ اپنی تمام تر طاقت و کوشش حق و آزادی کی حمایت و حفاظت کے لیے خرچ کر رہی ہو، تاج برطانیہ کے ساتھ جس کے زیر سایہ بہت سی اقوام جملہ حصص دنیا مین آزادی و آسائش کی زندگی بسر کر رہی ہین اپنی گہری عقیدتمندی اور وفاداری کا اظہار کرتی ہو اور اس ہولناک جنگ کو فتحمندانہ نتیجہ تک پہنچانے کے لیے اُردو پریس کے ہر قسم کی امداد پر آمادہ ہونے کا یقین دلاتی ہو۔

تحریک منجانب صدارت۔

(۶) اُردو پریس کانفرنس قانون مطابع کی غیر آئینی نوعیت اور اُس کی قطعاً غیر ضروری سخت گیریون کے خلاف اُردو اخبارات کے نمایندون کے متفقہ محسوسات کا اظہار کرتی ہو اور حکومت کو باصرار تمام اس حقیقت پر توجہ دلاتی ہو کہ موجودہ حالات مین قانون مطابع نہ صرف غیر ضروری بلکہ حکومت و رعایا دونون کے لیے از حد مضرت رسان ہو اور اس کا جلد سے جلد منسوخ کیا جانا اہل ہند کی آئندہ ترقی اور نیز حکومت کے مفاد کے لیے از بس ضروری و لازمی ہو۔

محرک:۔ قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر صداقت کلکتہ۔ موید:۔ مسٹر بانکے دیال ایڈیٹر جھنگ سیال لاہور۔

(۷) الف۔ اُردو پریس کانفرنس کے اس جلسہ کی راے مین اُردو پریس ایسوسی ایشن کو اخبارات کے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک مستقل سرمایہ قائم کرنا چاہیے جس کی فراہمی کے لیے تین صورتین اختیار کی جائین۔ (۱) ایسوسی ایشن کی کل آمدنی کا دس فیصدی مستقل طور پر اسی سرمایہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے (۲) ہر ممبر چندۂ ممبری کے علاوہ کوئی رقم عطیہ کے طور پر اسی مد مین دیا کرے۔ (۳) تمام ان مقتدر و متمول اصحاب سے جو اُردو اخبارات کی موجودہ حالت سے ہمدردی رکھتے ہین حسب ضرورت مالی اعانت کی درخواست کی جائے۔

(ب) اس سرمایہ کو ایسوسی ایشن کے مقاصد کی کامیابی کے لیے صرف کیا جائے اور اخبارات کے حقوق کی حفاظت کے لیے ملک مین تقریرون اور تحریرون کے ذریعہ سے اس تحریک کو پھیلایا جائے۔

(ج) اس سرمایہ کے متعلق ضروری قواعد و ضوابط بنانا بھی اسی کمیٹی کے سپرد کیا جائے جو پریس ایسوسی ایشن کے قواعد مرتب کرے گی اور بعد منظوری کونسل اُن کو ایسوسی ایشن کے قواعد و ضوابط مین شامل کر دیا جائے۔

محرک:۔ چودھری غلام حیدر صاحب۔ موید:۔ سید ظفر حسن صاحب قائم مقام رسالہ نظام المشائخ دہلی۔

(۸) اس کانفرنس کی یہ طے ہو کہ تمام اُردو اخبارات اس بات کی کوشش کرین کہ ایسے معاملات مین جن کا تعلق اُردو اخبارات یا مطابع سے ہو خواہ بہ اغراض حفاظت حقوق خواہ بضرورت مدافعت باہم گر امداد کرین اور جہان تک پریس کا تعلق ہو بغیر ایسوسی ایشن کی اطلاع یا مشاورت کے ایسی کوئی کارروائی نہ کرین جس کا اثر دوسرے کسی اخبار پر مترشح ہوتا ہو اور جہان کوئی ایسا مناقشہ پیدا ہو وہان اس ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے صفائی و مبادلۂ خیالات کیا جائے۔

محرک:۔ نواب عبد اللہ خان صاحب ایڈیٹر اسلامک میل بمبئی۔ موید: مولوی صبغتہ اللہ صاحب شہید ایڈیٹر النظامیہ۔

(۹) اُردو پریس کانفرنس کا یہ جلسہ گورنمنٹ سے استدعا کرتا ہو کہ اُردو پریس کو ہندوستان کی پبلک کا نمایندہ و ترجمان ہونے کی حیثیت مین سرکاری کاغذات اور رپورٹون کی بہم رسانی و سرکاری اشتہارات کی اشاعت اور دیگر معاملات کے متعلق اُن جملہ سہولتون اور رعایتون کا مستحق سمجھا جائے جو عموماً اینگلو انڈین اخبارات کو اس وقت حاصل ہین۔

محرک :- سید جالب دہلوی ایڈیٹر روزانہ ہمدم مؤید :- شاکر ایڈیٹر العصر

(۱۰) اُردو پریس کانفرنس کا یہ جلسہ قرار دیتا ہے کہ اُردو پریس ایسوسی ایشن کی طرف سے اسوقت کم از کم ۴ قائم مقام انڈین پریس ایسوسی ایشن میں شرکت کے لیے بھیجے جائیں۔ اور فی الحال ایسے اشخاص اس غرض سے منتخب کیے جائیں جو انڈین ایسوسی ایشن کا مقررہ چندہ ادا کر کے شرکت کے لیے تیار ہوں۔

محرک :- حاجی ریاض الدین احمد بریلوی قائم مقام اخبار مفید روزگار بمبئی

مؤید :- مولوی کرم اللہ خان صاحب ایڈیٹر الندوہ۔

(۱۱) اُردو پریس کانفرنس آنریبل منشی پراگ نرائن صاحب بھارگو رائے بہادر کی بے وقت موت پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہے مرحوم صرف زبان اُردو کے محسن و سرپرست ہی نہ تھے بلکہ ہندوستان کے سب سے بڑے اُردو مطبع اور صوبہ ہٰذا کے سب سے پرانے روزانہ اُردو اخبار اودھ اخبار کے مالک تھے۔ یہ کانفرنس اس نقصان کو بھی محسوس کرتی ہے جو آپکی وفات سے نہ صرف ہماری جماعت کو بلکہ ملک و قوم کو پہنچا ہے۔

محرک :- شاکر ایڈیٹر العصر - مؤید :- پنڈت کشن پرشاد صاحب کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی۔

مندرجہ ذیل اصحاب اُردو پریس ایسوسی ایشن کی طرف سے انڈین ایسوسی ایشن کی ممبری کے لیے منتخب کیے گئے :- قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر صداقت۔ جناب شید ادہلوی ایڈیٹر ہندوستان لاہور۔ پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی۔ سید جالب دہلوی۔ ایڈیٹر ہمدم اور رزولیوشن نمبر ۹ متعلقہ کونسل کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل عہدہ دار و ارکین کونسل منتخب ہوئے۔

پریسیڈنٹ قاضی عبدالغفار ایڈیٹر صداقت کلکتہ۔ وائس پریسیڈنٹان جناب شید ادہلوی ایڈیٹر ہندوستان لاہور۔ سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم سکرٹری پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی۔ جوائنٹ سکرٹری شاکر ایڈیٹر العصر۔ خزانچی مولوی اکرام اللہ خانصاحب ایڈیٹر الندوہ لکھنؤ

ارکین کونسل

پنجاب :- ایڈیٹران ہندوستان۔ میونسپل گزٹ جھنگ سیال پنجاب کسان۔ وکیل۔ العصر۔ ستارہ صبح۔

صوبجات متحدہ :- مساوات۔ ہندوستانی۔ نئی روشنی۔ ہمدم۔ اودھ اخبار دلگداز۔ البریہ۔ نیر اعظم۔

بنگال :- صداقت۔

بمبئی :- اسلامک میل۔ مفید روزگار۔

اجمیر :- صلح کل۔

دہلی :- دہلی گزٹ۔

آخر میں سید جالب صاحب نے ایک مختصر تقریر میں حاضرین کو قیام ایسوسی ایشن پر مبارکباد دیتے ہوئے سرگرمی سے کام کرنے اور باہم اتفاق و اتحاد قائم رکھنے پر توجہ دلائی اور صدر کے شکریہ پر جلسہ ۱۲ بجے شب کے برخاست ہوا بعد میں پتہ لگا کہ تعداد اصحاب جو شرکت پریس کانفرنس کا ارادہ رکھتے تھے اجلاس مسلم لیگ کی خلاف توقع طوالت کے باعث نہ آسکے۔

آل انڈیا پریس ایسوسی ایشن

آل انڈیا پریس ایسوسی ایشن کا سالانہ اجلاس ۲۸ دسمبر کی شام کو بوجہ دیگر مصروفیتوں کے ملتوی ہونے کے بعد ۲۹ دسمبر کو چھ بجے شام کے کانگریس کے پنڈال میں مسٹر ہارنیمن قابل ایڈیٹر بمبئی کرانیکل پریسیڈنٹ انڈین پریس ایسوسی ایشن کی صدارت سے منعقد کیا گیا چونکہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی کا اجلاس اسوقت تک ختم نہیں ہوا تھا اس لیے بہت سے ارکین پریس ایسوسی ایشن میں شمولیت کا موقع نہ پاسکے تاہم ہر حصہ ملک کے صاحبان اخبار و مطابع کی ایک معقول تعداد جلسہ میں شامل ہوئی

اور مسٹر ہارنیمین کی سالانہ رپورٹ سنانے کے بعد اُسکو پاس کیا گیا۔ رپورٹ نسبۃً مختصر تھی اور اُس سے یہ معلوم کرکے افسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان کے اراکین پریس قوانین کی سختی اور دیگر مشکلات کے شاکی ہونے کے باوجود اپنی ایسوسی ایشن کے کام مین دلچسپی نہین لیتے اور بعض صاحبان کے ذمہ موعودہ عطایا چندہ کی بقایا چار سو روپے سے زائد موجود ہو۔ ہندوستان کے اخبارون کو اکثر نادہند خریدارونکی شکایت رہتی ہو لیکن جب خود اہل اخبار اپنی ایسوسی ایشن کے متعلق نادہندی کی افسوسناک مثال قائم کرتے ہین تو اُن کی شکایت کا پبلک پر کیا اثر ہو سکتا ہو۔ بہرحال حاضرین جلسہ نے پریس ایسوسی ایشن کا کام زیادہ سرگرمی سے کیے جانے کی ضرورت جتائی اور صوبجات مین ماتحت ایسوسی ایشنین قائم کرنے اور اراکین پریس کو ممبر بنانے کے لیے مرکزی انجمن کی طرف سے کسی عہدہ دار کے دورہ کرنے کی تجویز ہوئی۔ بعد مین نئے سال کے لیے عہدہ دارون کا انتخاب عمل مین آیا اور مسٹر ہارنیمین دوبارہ پریسیڈنٹ اور مسٹر بوڈی سکرٹری منتخب کیے گئے۔ اسکے ساتھ ہی کونسل کے اراکین کا بھی انتخاب ہوا اور بنگال صوبجات متحدہ پنجاب بمبئی و مدراس کی طرف سے چھ چھ اور ممالک متوسط کی طرف سے تین صاحب منتخب کیے گئے۔ بہار کے لیے فی الحال صرف مسٹر سچیدانند سنہا ایڈیٹر ہندوستان ریویو کا انتخاب ہوا اور دیگر اراکین کا انتخاب ملتوی رکھا گیا۔ آخر مین ویسرائے کی خدمت مین جانے والے وفد کا ذکر آیا

سید جالب ایڈیٹر ہمدم و مسٹر کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی نے اُردو پریس کانفرنس کے آیندہ اجلاس لکھنؤ کے لیے جو ۳۱ دسمبر دسمبر کی شام کو دفتر ہندوستانی مین منعقد ہونے والا تھا مسٹر ہارنیمین و مسٹر بوڈی پریسیڈنٹ و سکرٹری مرکزی انڈین پریس ایسوسی ایشن کو دعوت دی اور انھون نے مہربانی سے شرکت کا وعدہ فرمایا پھر صدر کے شکریہ پر جلسہ ۱ بجے برخاست ہوا۔

انڈین انڈسٹریل کانفرنس

ملک کی حقیقی ضروریات اور باشندون کے اصلی مفاد کو مد نظر رکھکر دیکھا جائے تو حرفتی کانفرنس کی اہمیت سیاسی و تمدنی مجالس سے کہین زیادہ ہو لیکن افسوس ہو کہ اس مرتبہ کانفرنس مذکور کے سالانہ سیشن لکھنو مین اول سے آخر تک چند در چند حادثات ناسود اتفاقات کا سامنا رہا اور جس رونق و کامیابی کی امید تھی وہ حاصل نہونے پائی۔ سب سے بڑا سانحہ ارتحال جو حرفتی کانفرنس کی کامیابی مین یقیناً مخل انداز ہوا یہ تھا کہ لکھنؤ ہی کے نہین بلکہ صوبجات متحدہ کے سربرآوردہ حرفتی لیڈر اور انڈسٹریل کانفرنس کی استقبالی کمیٹی کے لائق صدر بابو پراگ نرائن عین اجلاس کانفرنس کے وقت یکایک کلکتہ مین انتقال فرما گئے اور بیرونی مہمانون کے خیر مقدم اور صوبۂ اودھ کی حرفتی و کاروباری حیثیت کی تشریح کے متعلق جو قابلانہ تقریر انھون نے تیار کی تھی وہ اُنکی زبان سے ادا نہو سکی اور اجلاس کانفرنس کو بارونق و کارآمد بنانے مین اُنکی زبردست شخصیت سے جن کوششون کی امید تھی وہ عمل مین نہ آنے پائین۔ دوسرے کانگریس کو حکومت خود اختیاری کے رزولیوشن کی بحث خلاف توقع طوالت پذیر ہو جانے کے باعث اپنی ایک زائد نشست ۳۰ دسمبر کو مقرر کرنی پڑی جس کی کارروائی بارہ بجے دوپہر کے قریب ختم ہوئی اور لوگ تین چار گھنٹہ برابر اجلاس کانگریس مین شریک رہنے کے بعد اسقدر تھک گئے کہ ۱½ بجے حرفتی کانفرنس کے اجلاس کی شرکت اُن کے لیے سخت دشوار ہوئی اور آل انڈیا مسلم لیگ کی پہلی نشست نے بھی جو ۲ بجے سے شروع ہونے والی تھی بہت سے ممتاز اشخاص کو اپنی طرف کھینچ لیا ایک اور سوء اتفاق یہ پیش آیا کہ آنریبل رائے سیتا ناتھ رائے صاحب پریسیڈنٹ انڈسٹریل کانفرنس کے مطبوعہ ایڈریس کی بہت سی کاپیان ۲۹ دسمبر کی سہ پہر کو خدا جانے کس طرح کانگریس پنڈال کے باہر تقسیم کر دی گئین اور اس طرح لوگون کو تقریر صدارت سننے کا کچھ اشتیاق

باقی نہ رہا۔ خدا جانے یہ بے قاعدہ کارروائی کیون ہوئی اور تعجب ہو کہ دوسری طرف اخبارات کو ایڈریس پہلے سے بھیجکر اجلاس کے روز اُسکی اشاعت کا موقع دینے پر توجہ نہین کی گئی اور پریسیڈنشل ایڈریس کا اُردو ترجمہ شائع نہین کرایا گیا حالانکہ اسکی اشاعت ملکی زبان مین دیگر ایڈریسون سے کہین زیادہ ضروری تھی۔ اسیطرح کانفرنس کی سالانہ کارروائی کی رپورٹ بھی پہلے سے شائع نہین کی گئی جو ممبرون کو اُس پر غور کرکے سالانہ اجلاس مین کچھ مفید تجاویز پیش کرنے کا موقع ملتا چنانچہ مسٹر مہتا نے اِس پر اعتراض کیا اور اجلاس مین اسکے متعلق خاص بحث ہوئی جس کے بعد گو رپورٹ منظور کر لی گئی لیکن امید ہے کہ آئندہ کے لیے کارکنان کانفرنس متنبہ ہو جائینگے۔ اجلاس نا وقت منعقد ہونے کے باعث کئی مفید و ضروری مضامین جو لائق صاحبون نے نہایت محنت سے لکھے تھے نہ پڑھے جا سکے۔ اور سرگباشی بابو پراگ نرائن صاحب و مسٹر جی سبرامنی آئر آنجہانی کی وفات پر اظہار افسوس کیے جانے کے علاوہ صرف چار نئے رزولیوشن پاس ہوے اور ایک رزولیوشن مین گذشتہ اجلاس حرفتی کانفرنس کے پچھلے رزولیوشنون کا نمبر ۳ سے نمبر ۱۳ تک سوائے نمبر ۷ و نمبر ۱۲ کے اعادہ کر دیا گیا ہے۔ نئے رزولیوشنون مین پہلے کا جو سر وٹھل داس دامودر ٹھاکرسی نے پیش کیا اور مسٹر رنگا سوامی آئنگر کی طرف سے اس کی تائید ہوئی یہ مطلب تھا کہ ہندوستان کی جو ریلین ابھی تک سرکاری انتظام مین نہین ہین وہ بتدریج موقع ملنے پر لے لیجائین۔ دوسرے رزولیوشن کے ذریعہ سے اُن سوالات پر جو حرفتی کانفرنس سے پوچھے گئے ہین ایک یاد داشت مرتب کرنے کے لیے جو ممبران کمیٹی مین ضبط اور اسٹنڈ اجلاس کانفرنس مین منظور کیجائیگی پانچ اصحاب کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور آنریبل راے سیتا ناتھ راے پریسیڈنٹ و آنریبل مسٹر ہولکر سکرٹری اور سر وٹھل داس دامودر ٹھاکرسی و آنریبل مسٹر نمو مین اس اچی و اس مسٹر ریلا سا گرا بطور ممبران قرار پائے ایک اور رزولیوشن کے ذریعہ سے کانفرنس کے نظام اساسی پر ممبران کمیٹی کی رائین طلب کرنے کا وقت ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء تک اور آخری مسودہ و رپورٹ شائع کرنے کا وقت ۳۰ دسمبر ۱۹۱۶ء تک قرار دیا گیا جس سے امید بندھتی ہے کہ نظام اساسی اگلے سالانہ اجلاس مین پیش اور منظور کیا جا سکے گا۔ آخری رزولیوشن مین نئے سال کے لیے کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے جو سکرٹریان کو مشورہ دیگی ایسے اصحاب ممبر منتخب کیے گئے جو خود بڑی بڑی حرفتون کے مالک و مہتمم یا ملک کی حرفتی ضروریات سے واقف ہین آنریبل مسٹر ہولکر و مسٹر نمو مین اس اچی اس کانفرنس کے جوائنٹ سکرٹریان و مسٹر جے کے مہتا اسسٹنٹ سکرٹری منتخب ہوے اور سکرٹریون کو اخراجات کے لیے ۷ ہزار روپیہ کی اپیل کرنے کا اختیار دیا گیا۔ سب سے زیادہ مفید تجویز یہ پاس ہوئی کہ حرفتی کانفرنس کا صدر دفتر امراوتی کے دور افتادہ مقام کے بجاے بمبئی مین رکھا گیا جہان رہ کر وہ انشاء اللہ بہت سا مفید کام کر سکے گا اور خاص ماہرین کا مشورہ و امداد بھی اُسکو حاصل ہو سکے گی۔ اِسمین کلام نہین کہ آنریبل مسٹر مدہولکر نے حرفتی کانفرنس کی ترقی و تقویت مین بہت کچھ قابل تحسین کام کیا ہو اور حرفتی ہندوستان اُن کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہین ہو سکتا لیکن اُنھی پر عالم ضعیفی مین سارے کام کا بار ڈالنا اور صرف اُنھی کی خاطر امراوتی مین کانفرنس کا صدر مقام رکھنا کسر ناموزون تھا اور لکھنؤ کے اجلاس مین خواہ دوسرا کام کتنا ہی کم ہوا لیکن صدر مقام کی تبدیلی اور سکرٹری شپ مین دوسرے قابل و مستعد اصحاب کی شرکت سے ترقی کا ایک نیا باب کانفرنس کے لیے کھل گیا ہے۔

تیئیسوین آل انڈیا سوشل کانفرنس

۲۷ جنوری کو ۱۱ بجتے ہی لوگ جوق جوق پنڈال مین سوشل کانفرنس کی شرکت کے لیے آنے شروع ہو گئے۔ حسب رواج تحریک و تائید کے بعد بابو جوتی سروپ صاحب صدر جلسہ قرار پائے۔ اس کے بعد پنڈت منوہر لال

زنشی نے اپنی مطبوعہ تحریر استقبالی کمیٹی کی جانب سے پڑھی جناب صدر نے نہایت مفصل خطبۂ صدارت پڑھا جس مین زیادہ تر ہندؤون کے لیے معاشرتی اصلاحات کی تدابیر بتلائی گئی تھین آپ نے فرمایا کہ سوشل کانفرنس کا کام مستقل طور پر ہونا چاہیے اور اُسکی پاس کردہ تجاویز پر عمل کرنے کے لیے ایک مجلس انتظامیہ قائم ہونی چاہیے۔ زنانہ تعلیم پر آپ نے بہت زور دیا لیکن وہ صرف گھریلو تعلیم کے حامی ہین یعنی کسب معاش کے لیے تعلیم دلانا نہین چاہتے۔ صغر سنی کی شادی کے مضر اثرات پر ایک بسیط ریویو فرما کر آپ نے اُسکے ترک کیے جانے کی خواہش کی۔ شادی بیوگان نہ کرنا بہت بڑی اخلاقی غلطی ہے جس کو جہانتک ہو سکے جلد ترک کر دینا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ پرانے زمانہ مین اسکی اجازت تھی چنانچہ ارجن نے امریکہ جا کر ایک بیوہ سے شادی کی تھی (خوب) اِس قبیح رسم کی وجہ سے اسوقت ہندوستان مین ہر پانچ عورتون مین ایک بیوہ ہے۔ زمانۂ قدیم مین ہندوستان مین پردہ کا قطعی رواج نہ تھا۔ چنانچہ سوئمبر (انتخاب شوہر) کی رسم اُسکی شاہد ہے۔ ذات پات کا قطعی وجود نہ تھا بلکہ یہ جو چار فرقے (ورن) ہمارے یہان ہین اُنکی تفریق گُن (عمل) اور کرم (قسمت) کی بنا پر ہے۔ چھوت چھات کی پابندی آپ کے خیال مین ترقی کی راہ مین بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ راجسو یگ کی رسوم مین تمام ہندوستان کیا بلکہ یورپ تک کے لوگ آکر شریک ہوتے تھے اور ساتھ مل کر کھانا کھاتے تھے۔ شادی کے لیے ہمین مختلف ذاتون کیا بلکہ قومون سے اپنا جوڑا تلاش کرنا چاہیے۔ آپ نے جہیز دینے اور بنگال اور بعض دیگر حصص ہند مین لڑکی کے والدین سے شادی کے قبل ایک رقم معین کر لینے کے رواج کی سخت مخالفت کی اور نعرہ ہاے مسرت کے شور مین بیٹھ گئے۔ اُسکے بعد کئی رزولیوشن پیش ہوے جو حسب رواج تحریک و تائید کے بعد پاس کیے گئے۔ پردے کی مخالفت کا رزولیوشن مسز کمودنی بوس بی اے نے پیش کرتے ہوے نہایت فصیح و بلیغ انگریزی مین اُس کے بُرے نتائج پر بحث کی اور اُس کا سبب یہ بتلایا کہ مسلمانون کی حکومت مین اُن لوگون کا دستور تھا کہ خوبصورت عورتون کو ہندؤون سے چھین کر اپنے حرم مین داخل کر لیا کرتے تھے اور کچھ اُنکے اثرات کی وجہ سے ہندؤون نے پردہ کی رسم کو اختیار کر لیا جو ہر طرح خلاف صحت ہے۔ اسکی تائید مسز دشنو بی اے اور مسز برج لال نہرو نے کی عورتون کی تعلیم کے متعلق جو رزولیوشن تھا اس کو ہیمنت کماری چودھری بی اے نے پیش کیا اور مسز گوداوری نے اِسکی تائید کی جلسہ مین اگرچہ محرکین کو صرف ۱۰ منٹ اور موئدین کو صرف ۵ منٹ کی اجازت دی گئی تھی مگر بعض اصحاب کی تقریرین اسقدر دلچسپ تھین کہ لوگون نے خود اُنکو اور موقع دلایا۔

بابو بچتر پرشاد و بسلا پرنسپل شہنشاہ وری پروفیسر سبرونمانیا آئر مسٹر ہر پرشاد سنگھ نے انگریزی مین اور بابو جوالا پرشاد صاحب نے اُردو مین اچھی اچھی تقریرین کین بعض اصحاب نے ہندی بولنے کی بے حد کوشش کی مگر صرف ۲ منٹ تک وہ غیر معروف الفاظ کے برتنے پر قادر رہے اور بعد مین پھر روزمرہ کی اُردو بولنے لگے چند اصحاب البتہ آخر تک اس کوشش مین کامیاب ہوے گو زبان کی لکنت اور الفاظ سے بیگانگی خود اُن کے لب و لہجہ سے مترشح ہوتی تھی مگر ہم اپنے بھائیون کو اُن کی سعی کی داد دیتے ہین بیشک وہ جس بات کا ارادہ کر لیتے ہین اُسپر استقلال سے عمل کر کے دکھلا بھی دیتے ہین خواہ اُن کا روزمرہ اس زبان سے جسمین اُنھون نے تقریر کی کتنا ہی مختلف ہو مگر ہم اس امر کی تعریف کیے بغیر نہین رہ سکتے کہ اُنھون نے ہندی کو اپنی زبان ثابت کرنے مین پورا پورا زور لگایا اور ایک حد تک اُسمین کامیاب بھی ہو گئے۔

انڈین نیشنل کانگرس

کانگرس کا یہ اجلاس ہر اعتبار سے بےنظیر تھا کیا بلحاظ حاضری اور کیا بلحاظ پریسیڈنشل ایڈریس اور کیا باعتبار دیگر تقریر کنندگان کی فصیح و بلیغ

تقریروں اور ہندو مسلم اتحاد اور قومی جوش کا ایک قابل دید نظارہ تھا کانگریس پنڈال ریلوے اسٹیشن سے تھوڑی دور پر بنایا گیا تھا۔ اُسکے گرد و نواح میں اور سڑک کے دونوں طرف بیشمار خیمے ڈیلیگیٹوں کی رہائش کے لیے نصب تھے... ۱۷۰ والنٹیرز ڈیلیگیٹوں کی آسائش اور جلسہ کے انتظام میں مصروف تھے۔ استقبالی کمیٹی نے صرف ۷ ہزار نشستوں کا پنڈال میں انتظام کیا یعنی حاضرین کی تعداد کا اُس نے بالکل غلط اندازہ کیا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تین روپیہ اور پانچ روپیہ والے وزیٹر ٹکٹ ۲۰ دسمبر کو ہی ختم ہو گئے تھے اور دس روپیہ والے ۲۷ دسمبر کو ۲۹، ۳۰ دسمبر کو کسی قیمت کا بھی ٹکٹ ملنا محال تھا۔ لہذا ہزارہا آدمی کانگریس کا اجلاس دیکھنے سے محروم رہے صبح دس بجے ہی سے پنڈال میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہتی تھی بیشمار آدمیوں کو کھڑا رہنا پڑا۔ پلیٹ فارم پر ممبران استقبالی کمیٹی اور سابق پریزیڈنٹان و لیڈران کانگریس اور معزز مہمان متمکن تھے اور اُسکے ایک طرف معزز خواتین اور زنانہ ڈیلیگیٹ جن میں بنگال بمبئی مدراس کی تعلیم یافتہ لیڈیز شامل تھیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اول روز کے اجلاس میں جس وقت مسٹر موزمدار چند اراکین کانگریس کے ساتھ تشریف لائے تو کئی منٹوں تک نعرہ ہائے چیرز کا شور بلند رہا۔ مسٹر تلک، مسز اینی بیسنٹ اور آنریبل مسٹر جناح، راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر گاندھی کی آمد پر بھی پر تپاک خیر مقدم ہوا آنریبل پنڈت جگت نرائن پریزیڈنٹ استقبالی کمیٹی نے ڈیلیگیٹوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے قومی مسائل پر ریویو کیا۔ اُسکے بعد آنریبل سریندر ناتھ بنرجی کی تحریک اور آنریبل مسٹر مدھولکر اور مختلف صوبجات کے قائم مقاموں کی تائید سے آنریبل مسٹر موزمدار صدر جلسہ منتخب ہوئے۔ کانگریس کے خطبۂ صدارت کی ملک بھر میں تعریف ہوئی ہے۔ اس میں صاف الفاظ میں ہندوستانیوں کی خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں اعتدال کو ملحوظ رکھا اور اعلیٰ درجہ کی منطق سے کام لیا گیا ہے۔ فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے قبل ازیں کانگریس کے کسی اجلاس میں ایسی تقریر نہیں ہوئی جس میں سلف گورنمنٹ کے سوال پر اس تکمیل کے ساتھ ایسی بلاغت اور علمی پیرایہ میں بحث کی گئی ہو۔ دوسرے روز کے اجلاس میں اول روز سے بھی زیادہ اژدحام تھا جس وقت مسلم لیگ کے صدر اور ارکان تشریف لائے تو حاضرین نے بڑا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اسی روز سر جیمس مسٹن معہ لیڈی مسٹن صاحبہ تشریف لائے تمام حاضرین نے نعرہ ہائے چیرز سے اُن کا خیر مقدم کیا۔ ہز آنر نے پریزیڈنٹ سے مصافحہ کیا اور اُنکے قریب نشست اختیار کی۔ سر جیمس مسٹن کی موجودگی میں قانون اسلحہ کی منسوخی کا رزولیوشن پیش ہوا اور اس پر بڑی موثر تقریریں ہوئیں مسٹر سردار کا ناتھ ڈیلیگیٹ بہار کی اردو تقریر جو ظرافت کا پہلو لیے ہوئے تھی نہایت دلچسپ تھی قانون پریس کی منسوخی کا رزولیوشن بھی اسی روز پیش ہوا اور اسکے متعلق مسٹر ارنیمین ایڈیٹر بمبئی کرانیکل نے زبردست تقریر کی۔

۲۹ دسمبر کا اجلاس کانگریس کی تاریخ میں ایک خاص دن تھا کیونکہ اس روز سلف گورنمنٹ کا رزولیوشن پیش ہونے والا تھا لیکن بہت لوگ ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے مایوس رہے۔ ایک شخص نے ایک وزیٹر سے تین روپیہ والا ٹکٹ ایک دن کے لیے ستر روپیہ کو خریدا۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی ایک رزولیوشن پر کانگریس میں آجتک ایسے زبردست مقرروں اور نامی گرامی اصحاب کو ایک ہی روز میں سننے کا اتفاق کہیں میسر نہیں ہوا۔ سلف گورنمنٹ کا رزولیوشن آنریبل سریندر ناتھ بنرجی نے پیش کیا۔ مسٹر تلک، مسز اینی بیسنٹ، مسٹر بپن چندر پال، راؤ بہادر مسٹر مدھولکر آنریبل مسٹر مظہر الحق مسٹر حسن امام مسز سروجنی نائیڈو اور کئی دیگر زبردست مقرروں نے اسکی تائید کی۔ وہ لوگ جنھوں نے اس روز کا اجلاس دیکھا ہے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہیں۔ اُسی اجلاس میں یہ مژدہ بھی سنایا گیا کہ کانگریس اور لیگ دونوں کے اتفاق رائے سے مسلمانوں کی نیابت کا خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ صوبجات متحدہ میں مسلمانوں کی نیابت کا حق ۳۰ فیصدی تسلیم کیا گیا ہے اور کوئی مسودہ یا تحریر جس سے مسلمان یا ہندو یا غیر مسلمان حاضر الوقت کونسل کی دو تہائی مخالفت کریں گے اُسکو کوئی غیر سرکاری ممبر کونسل میں پیش کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ غرض ہندو مسلم اتحاد کی وجہ سے اس اجلاس کانگریس کو زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

اُردو انسائیکلوپیڈیا

"دائرۃ المعارف یا اُردو انسائیکلوپیڈیا" جسکی تحریک شائع ہو چکی ہو اُسکے متعلق علم دوستی و اطلاع کے لیے معلومات ذیل بھی شائع کیے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں نے بجائے خود یہ سمجھ لیا ہو کہ اس تحریک سے انگریزی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ترجمہ مقصود ہو، لیکن یہ خیال قطعاً غلط و بے بنیاد ہو۔ در حقیقت ہماری دائرۃ المعارف اس سے بالکل علیحدہ اور ایک مستقل تالیف ہوگی، مشرقی مسائل میں یہ تالیف خود یورپ کو سبق دیگی اور تحقیقات کا ایک نیا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کرے گی، مغربی معاملات میں البتہ برٹانیکا اسکا ایک ماخذ ہوگی، ہر مضمون پر حتی الامکان بہترین مضمون نگار تلاش کر کے اُنسے اور تکمیل و مستقل مضامین لکھائے جائیں گے البتہ جن مباحث پر کوئی بھی قابل اطمینان لکھنے والا نہ مل سکے گا وہاں بے شبہ مجبوراً ترجمہ پر قناعت کرنا پڑے گی لیکن ایسے مواقع نادر الوقوع ہوں گے۔

کام کا جو خاکہ پیش نظر ہو وہ یہ ہو کہ علوم کو مختلف صیغوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو اور ہر صیغہ کو ایک صیغہ دار ایڈیٹر کے ہاتھ میں تفویض کر دیا جائیگا۔ ابتک اسقدر عنوانات تجویز ہوئے ہیں:- (۱) **مذہبیات**، جو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب، تصوف، روحانیت وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہوگا۔ (۲) **لسانیات**، جسکی تحت میں دنیا کی مختلف زبانیں اور انکے لٹریچر آجاتے ہیں۔ (۳) **تاریخ**، (۴) **جغرافیہ** (۵) **فلسفہ**، نفسیات، الٰہیات، منطقیات، اخلاقیات، جمالیات وغیرہ جملہ مباحث فلسفیہ پر یہ عنوان حاوی ہو۔ (۶) **حکمیات**، یعنی اصناف سائنس، مثلاً طبعیات، ارضیات، نباتیات وغیرہ (۷) **ریاضیات**، جسکے ذیل میں ہندسہ، حساب، جبر و مقابلہ وغیرہ شامل ہیں۔ (۸) **طبیعات**، ڈاکٹری، یونانی، ویدک وغیرہ اس کے زیر عنوان آجاتے ہیں۔ (۹) **سیاسیات**، یعنی اصول سیاسی و قانون (۱۰) **عمرانیات**، اقتصادیات، منزلیات وغیرہ کا یہ عنوان جامع ہو (۱۱) **حربیات**، فن حرب، اصول جنگ بحری و بری وغیرہ (۱۲) **صناعیات**، اسکے ماتحت فنون لطیفہ و فنون نافعہ دونوں آجاتے ہیں (۱۳) **لہویات**، یعنی وہ شے جسے انگریزی میں GAMES AND SPORTS سے موسوم کرتے ہیں، شکار، گھوڑ دوڑ وغیرہ کا ذکر اس ذیل میں آجائے گا (۱۴) **تعلیمات**، مسائل متعلق بہ تعلیم و تربیت (۱۵) **زرعیات**، علم زراعت، غلات۔ (۱۶) **تجارت** (۱۷) **شذرات علوم** یا متفرقات، یعنی معلومات عامہ کی وہ ضروری چیزیں جو کسی خاص عنوان کے تحت میں نہیں آسکتیں۔

ان میں سے ہر صیغہ کے لیے ایک مستند فاضل بطور صیغہ دار ایڈیٹر کے کام کرے گا اور اس طرح گویا ۱۷ صیغہ دار ایڈیٹر ہونگے۔ ان اصحاب کے اسماء گرامی ابھی قطعیت کے ساتھ نہیں پیش کیے جا سکتے تاہم کوشش ہو رہی ہو کہ بہتر سے بہتر انتخاب عمل میں آئے۔

صیغہ جات بالا میں سے ہر ایک صیغہ بجائے خود متعدد شعبوں پر تقسیم ہوگا، ہر شعبہ کا ایک ناظم ہوگا اور اسکی مدد کیلیے متعدد مضمون نگار و مترجم ہونگے مثلاً صیغہ مذہبیات کے تحت میں اسلام، ہندو مت، مسیحیت، یہودیت، بدھ، سکھ، تصوف وغیرہ کے متعدد شعبے ہونگے اور ہر شعبہ کے ذیل میں مختلف عنوانات ہونگے جن پر وہی لوگ مضمون لکھیں گے جو اسکی اہلیت و منصب رکھتے ہونگے۔ مذہبیات سے متعلق یہ خاص التزام رکھا جائیگا کہ ناظم و مضمون نگار وہی اصحاب ہو سکیں گے جنکی قیادت و سرداری اُس مذہب یا فرقہ کے لوگوں کے نزدیک مسلم ہوگی۔ ہندو مت پر کوئی ہندو ہی لکھے گا، فرقہ آریہ سماج پر کسی آریہ ہی سے لکھوایا جائیگا، خود اسلامی فرقوں میں شیعہ، حنفی، اہلحدیث، احمدی، غرض ہر فرقہ سے متعلق اسی کے مسلم علماء سے مضامین حاصل کیے جائیں گے۔ اسی طرح صیغہ حکمیات، ارضیات، طبعیات، کیمیائیات وغیرہ آٹھ دس شعبوں میں تقسیم ہوگا اور ہر شعبہ بجائے خود مستقلاً ایک پورا ادارہ ہوگا۔ ناظمین شعبہ و مضمون نگار حضرات کی تعداد اس وقت ایک سو تک پہنچ چکی ہو اور امید ہو کہ انمیں اضافہ ہوتا رہیگا۔ مراسلت کے ذریعہ سے اسقدر عظیم الشان کام کے مراتب کا تفصیل کے ساتھ طے ہونا ایک ناممکن کام نہیں تو کم سے کم ایک سخت دشوار کام ضرور ہو اور بغیر تفصیلات کے طے کیے کام شروع کر دینا سخت خطرناک غلطی ہوگی۔ کام کرنیوالی چند جماعتیں ہونگی، سب سے پہلے صیغہ دار ایڈیٹروں و سب ایڈیٹروں کی ایک مرکزی جماعت لکھنؤ میں ہوگی جسکے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی، راقم، مسٹر عبدالوالی بی اے سابق ایڈیٹر معلومات، اور دو ایک اور حضرات ہونگے۔ دوسری جماعت صیغہ دار ایڈیٹروں کی ہوگی جنکا ذکر گزر چکا۔ تیسری جماعت ہر صیغہ کے ماتحت شعبہ جات کے ناظمین کی ہوگی۔ اور پھر ہر شعبہ سے متعلق عام مضمون نگاروں کی ایک جماعت ہوگی۔ یہ چاروں جماعتیں عملاً کام کرنے والی ہونگی۔ انکے علاوہ ایک مختصر جماعت شوریٰ بھی ہوگی جسکے ارکان وہ بزرگ ہونگے جنکا فضل و کمال مسلم ہو مگر جو بہ سبب کبر سنی یا کسی مشغولیت کے اس کام میں کوئی نمایاں عملی حصہ نہیں لے سکتے۔ ان اصحاب کی رائے و مشورے سے پورا فائدہ اٹھایا جائیگا اور یہی لوگ ارکان شوریٰ سمجھے جائیں گے۔

عبدالماجد بی اے

اڈیٹوریل

انجمن ترقی اُردو

شکر ہو کہ مدت تک خوابِ غفلت میں مدہوش رہنے کے بعد انجمن ترقی اُردو اب پھر بیدار ہوئی ہے، اور سب سے پہلا کام جو ضروری خیال کیا گیا از سرِ نو قواعد و ضوابط کی اشاعت ہے۔ گویا جو کام اپریل ۱۹۰۳ء میں کیا جا چکا تھا اب پھر اُسکی تجدید ہوئی ہے۔ ترقی اسی کا نام ہے!

اس دس گیارہ برس کے عرصہ میں انجمن ترقی اُردو نے کئی پلٹے کھائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ہمیشہ قابل ہاتھوں میں رہی، مگر اسپر بھی ہنوز روز اول ہے۔ اس دفعہ جن مستعد ہاتھوں میں اسکی باگ دی گئی ہے، اُنکے نام نامی ہی اس امر کی کافی ضمانت ہیں کہ اب انجمن ترقیِ اُردو میدانِ عمل میں قدم مارےگی چنانچہ حسب ذیل عہدہ دار مقرر ہوئے ہیں۔

پریسیڈنٹ۔ عالیجناب نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی بہادر سی آئی ای

سکرٹری۔ جناب مولوی عبد الحق صاحب بی اے (دہلوی)

اسسٹنٹ سکرٹری۔ جناب مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظم (لکھنوی)

یہ ایسے نام ہیں جن کی موجودگی میں انجمن ترقیِ اُردو کا مستقبل نہایت شاندار و دلفریب نظر آتا ہے۔ ہر تحریک کی قدر و منزلت اسکی کامیابی و اہمیت کا اندازہ اُسکے کارپردازوں کی قدر و منزلت اور وسیع الخیالی سے کیا جاتا ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ملکی و مادری زبان کی احیا و ترقی و متوقعہ کامیابی کا اندازہ صاحبان موصوف الصدر کے گرامی قدر ناموں ہی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم ناموں کو سراہنا نہیں چاہتے بلکہ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے انجمن ترقی اُردو کا کوئی علمی کام دیکھیں!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ہم انجمن ترقی اُردو کے مشہورہ قواعد و ضوابط نقل کر دیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ انجمن کے مقاصد کیا ہیں، اور اُنکے حصول کے لیے کیا طریقہ تجویز کیا گیا ہے۔

قواعد و ضوابط انجمن ترقی اُردو

۱۔ اس انجمن کا نام "انجمن ترقی اُردو" ہوگا۔

۲۔ اسکے مقاصد حسب ذیل ہوں گے (۱) اصلاح زبان یعنی اُردو زبان میں جو خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں اُنھیں دفع کرنا اور غیر مانوس اجنبی الفاظ و محاورات جو غیر زبانوں کے بلا ضرورت زبان میں داخل ہوتے جاتے ہیں اُنسے بچنا۔ اور صحیح و فصیح زبان کے رواج دینے کی کوشش کرنا۔

(۲) جن اضلاعِ ہندوستان میں اُردو زبان کا رواج نہیں ہے یا کم ہے۔ اُن میں اُردو زبان کے رواج دینے کی کوشش کرنا۔

(۳) قدیم کلام نظم و نثر کو ضائع ہونے سے بچانا اور جدید کو ترقی دینا۔

(۴) علمی کتب کی اشاعت کے ساتھ سائنس اصطلاحات کا لغت مرتب کرنا۔

(۵) اُردو زبان کی قدیم و جدید تالیفات و تصنیفات کا ایک کتب خانہ قائم کرنا۔

(۶) ہر صوبہ کی اُردو گزٹ کیس کو زبان کے لحاظ سے جانچنا۔ اگر نہیں نقص ہوں، تو اُس صوبہ کی گورنمنٹ سے اصلاح کی خواہش کرنا۔

(۷) اور اگر انتظام ممکن ہو اور انجمن کا سرمایہ مساعدت کرے تو اُردو زبان و ادب کے متعلق ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنا۔

۳۔ ان مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے حسب ذیل تدابیر اختیار کیجائینگی

(۱) السنۂ شرقی و مغربی سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا جو ملک کے لیے مفید ثابت ہوں۔ اور تصنیفات و تالیفات کی ڈایرکٹری تیار کرنا۔

(۲) ایسی جدید تالیفات و تصنیفات کرانا جن کی اُردو زبان کو ضرورت ہے۔

(۳) قدیم اساتذہ کی ایسی قلمی کتابوں کا شایع کرانا، جو درحقیقت قابل قدر ہیں، اور جن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ یا جو کبھی کسی زمانہ میں طبع ہوئی تھیں اور اب نایاب ہیں۔

(۴) ماہرانِ علوم و فنون سے علمی کتب و اصطلاحاتِ علمیہ کا لغت مرتب کرانا۔

(۵) علاوہ اسکے جو صاحب اپنی کتاب کا حق تصنیف فروخت کرنا چاہیں

توبشرطیکہ وہ کتاب انجمن کی رائے میں مفید اور عمدہ ثابت ہو، مناسب صلہ دیکر اُسے خریدکرنا۔

(۶) انجمن کے لیے ایک ایسا سرمایہ قائم کرنا جو اُسکی ضرورِیات کیلئے کافی ہو۔

(۷) انجمن کے مقاصد کی اشاعت و امداد کے لیے مختلف صوبوں اور مناسب مقامات میں انجمن کی شاخیں مقرر کرنا۔

۴ - انجمن اُن تمام تالیفات اور تصنیفات اور ترجموں کے لیے جو انجمن کی تحریک سے کرائے جائینگے، یا جن کا حق تالیف وہ خریدنا چاہیگی معقول صلہ دے گی - صلہ کی دو صورتیں ہونگی :-

(۱) یا تو انجمن نقد معاوضہ دیگی - اس صورت میں حق تصنیف انجمن کو حاصل ہوگا۔

(۲) انجمن کوئی نقد معاوضہ نہ دیگی - لیکن کتاب اپنے صرف سے طبع کردیگی

۵ - انجمن کے ارکان حسب ذیل ہونگے :-

(۱) سرپرست - امرا و روسائے ملک جو انجمن کو یکمشت ایک ہزار روپیہ ماہانہ یا سالانہ معتدبہ امداد عطا فرمائیں گے وہ انجمن کے سرپرست کہلائینگے۔

(۲) ارکان دائمی - جو یکمشت پانچ سو روپیہ عنایت کریں گے وہ رکن دائمی (لائف ممبر) قرار پائیں گے۔

(۳) ارکان معمولی - جو صاحب کم از کم ایک روپیہ ماہانہ یعنی ۱۲ عہ سالانہ یا اس سے زائد چندہ دینگے وہ رکن معمولی ہوں گے۔

(۴) وہ نامور اربابِ قلم و صاحبان علم و فن انجمن کے ارکانِ شوریٰ قرار دیے جائیں گے، جن کی خدمت میں انجمن کی طرف سے کوئی کتاب بغرض اظہار رائے یا دیگر امور متعلقہ انجمن مشورۃً پیش کیے جائینگے اور وہ اُس پر اظہار رائے اور مفید مشورہ دینے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

۶ - انجمن کا دفتر اور حساب کتاب آنریری سکرٹری کے پاس رہے گا اور انجمن کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت سکرٹری سے کیجائیگی - آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں سکرٹری سال بھر کی کارروائی وحسابات کے متعلق رپورٹ پیش کرے گا اور ایسی رپورٹ عام طور پر شائع کیجائیگی۔

۷ - انجمن کی جو شاخیں ملک کے مختلف مقامات میں قائم ہونگی اُن کے سکرٹری انجمن کے جنرل سکرٹری کے اسسٹنٹ سکرٹری ہونگے اور اپنے اپنے صوبجات اور مقامات میں اُسکے مشورے اور صوابدید سے کام کرینگے - ایسی انجمنیں یا شاخیں بھی اپنی اپنی ایک سالانہ رپورٹ تیار کرینگی۔

دستخط عمادالملک (سید حسین بلگرامی) | دستخط عبد الحق
پریزیڈنٹ | آنریری سکرٹری

کچھ شک نہیں کہ انجمن کے اغراض و مقاصد نہایت اہم و ضروری ہیں، اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ جملہ ابنائے ملک بہی خواہانِ اُردو ان مقاصد کو نہ صرف نظر استحسان دیکھیں گے بلکہ انکی تائید و تکمیل میں حتی المقدور سعی بلیغ اور امدادِ دلی فرمائیں گے۔

دوسرے مقصد کے تحت میں لکھا گیا ہے کہ "اگر انتظام ممکن ہو، اور انجمن کا سرمایہ مساعدت کرے تو اُردو زبان و ادب کے متعلق ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنا" یہ درست ہے کہ ہر جماعت کو اپنے اغراض و مقاصد کے اظہار و اشاعت کے لیے اپنے ہی ایک رسالہ یا اخبار کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، لیکن ہم اسکے خلاف ہیں کہ انجمن اپنا پرچہ جاری کرے - اخبار یا رسالہ اُسوقت جاری کرنا چاہیے جب انجمن اس سے زیادہ ضروری و اہم مراحل کامیابی کے ساتھ طے کرلے - خدا کے فضل سے ملک میں بکثرت اخبار و رسائل جاری ہیں، مناسب ہے کہ انھیں میں سے کسی کو انجمن اپنا آرگن بنالے - خود العصر بھی اس خدمت کی انجام دہی کے لیے تیار ہے۔

انجمن ترقی اُردو کی رپورٹ بابت سنہ ۱۹۰۳ء میں مولانا شبلی نے تحریر فرمایا تھا کہ "ابتدا میں ہندو صاحبوں کو بطور خود یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کو انجمن کی شرکت سے علٰحدہ رکھا گیا ہے، چنانچہ ایک ہندو اخبار نے اسکا اظہار بھی کیا....." ہم سمجھتے ہیں کہ اب بھی یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے - چنانچہ ارکانِ شوریٰ کی فہرست ۴۴ اصحاب پر مشتمل ہے - اِن میں سے صرف

ہ ہندو ہیں۔ حالانکہ ملک میں بہت سے ہندو ایسے موجود ہیں جو اُردو زبان کے متعلق کافی واقفیت، استعداد، اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ارکان شوریٰ کی فہرست میں ایک بھی لکھنوی ہندو کا نام نہیں۔ حالانکہ پنڈت برج نرائن صاحب چکبست بی اے، اور منشی جوالا پرشاد صاحب سکرٹری اودھ پنچ، اور منشی مہاراج کشن صاحب قمر، اور منشی نوبت رائے صاحب نظر ہر طرح اسکے اہل تھے۔

ایک اور غلطی بھی انجمن سے ہوئی ہے کہ ارکان شوریٰ میں کوئی ہندوستانی مسیحی نہیں لیا گیا۔ ہمارا نام اس میں ضرور ہے مگر اُسکو مستثنےٰ سمجھنا چاہیے۔ ہندوستانی مسیحیوں میں پادری واعظ جوئیل لال صاحب ایم اے دہلی، مسٹر جے۔ آر۔ رلئے جرنلسٹ، لاہور، مسٹر سلیمان شکور گارڈنر (آپ اساتذۂ لکھنؤ میں مستند مانے جاتے ہیں) مسٹر ڈانیل گارڈنر، رئیسان کنور پور چھاؤنی ضلع ایٹہ، ڈاکٹر ٹی۔ ڈیل صاحب لطیف اجمیر، پادری تارا چند صاحب دہلوی اجمیر (وغیرہ) ہندوستانی مسیحی جماعت میں اہل زباں کی سی قابلیت رکھتے ہیں۔ ہماری رائے میں کم از کم تین ہندوستانی مسیحی بھی ارکان شوریٰ بنائے جائیں تو نہایت مناسب ہوگا۔

ارکانِ شوریٰ میں ۳۸ نام مسلمان حضرات کے ہیں۔ ان ۳۸ ممبروں میں بہت سے نام زینت فہرست کے سوا کسی مصرف کے نہیں۔ مناسب ہے کہ کام کے آدمی نظر انداز نہ کیے جائیں۔ کیونکہ نام سے کام نہیں ہوتا بلکہ کام سے نام ہوتا ہے!

ہم اُمید کرتے ہیں کہ انجمن ترقی اُردو ہماری اس جائز نکتہ چینی سے فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کے ہر فریق سے قابل قدر اصحاب کے نام ارکانِ شوریٰ کی فہرست میں داخل کریگی، ورنہ اُسے اپنے مقصد میں کما حقہ کامیابی نہ ہو سکے گی۔

انجمنِ تعلیمِ ابتدائی

گزشتہ پانچ سال میں مسئلۂ تعلیم پر جس قدر توجہ کی گئی، اور جو کوششیں اس بارے میں کی گئی ہیں، انکی مثال ابتدائی تعلیم کی تمام تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ بالخصوص آنریبل مسٹر گوکھلے کی کوششیں اس بارے میں خاص طور سے بار آور ہوئی ہیں، اور اب ابتدائی تعلیم کا مسئلہ اُن معدودے چند مسائل میں شمار کیا جاتا ہے جن پر قوم کی آیندہ زندگی کا انحصار ہے۔ اب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لحاظ سے ہماری حالت نہایت شرمناک ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر ہم کو اس قعر ذلت سے نکلنا منظور ہے تو نہایت اہم مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم مایوس ہو کر ہمت نہیں ہارتے، بلکہ مسئلہ کی اہمیت اور اپنے فرائض کی ذمہ داری ہم میں وہ جوش و ولولہ پیدا کرتی ہے، جسکے روبرو ہر قسم کی مشکلات کے خوف بیجا معلوم ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ بھی اپنی ذمہ داری کو اب، بہ نسبت سابق، زیادہ محسوس کرتی ہے اور قدم بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اگر ہم دیدۂ بصیرت سے دیکھیں تو اکثر ایسے آثار نظر آئینگے جن سے قوی امید پیدا ہوتی ہے کہ آیندہ پانچ سال کا زمانہ ابتدائی تعلیم کے حق میں ایک نہایت مبارک زمانہ ہوگا، جس میں نمایاں ترقی ہوگی اور ہمارے قدم آگے بڑھتے نظر آئینگے۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ نے اُس رزولیوشن میں جس میں ایلیمنٹری ایجوکیشن کمیٹی کے تقرر کا اعلان ہوا تھا، اُمید ظاہر کی تھی کہ

> اگر صوبجات متحدہ کی مالی حالت کو کسی خاص آفت سماوی کا سامنا نہ کرنا پڑا تو ممکن ہو سکے گا کہ آیندہ پانچ سال بعد ابتدائی تعلیم پر گورنمنٹ پینتیس لاکھ روپیہ سالانہ زائد صرف کر سکے، اور اس طور سے ابتدائی مدارس کے طلبا میں تین یا ساڑھے تین لاکھ کا اور اضافہ ہو سکے۔

یہ سب باتیں نہایت ہمت افزا ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان کوششوں کا بہت کچھ حصہ جو گورنمنٹ اب ظاہر کر رہی ہے، اُن کوششوں کا نتیجہ ہے جو رعایا کی جانب سے کانگرس، کانفرنسوں اور کونسلوں میں کی گئی ہیں، اور جنکو اخبارات نے اپنے زور قلم سے تقویت بخشی ہے۔ پس اگر ہم گورنمنٹ کی پالیسی کی تبدیلی سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، اور ہماری یہ خواہش ہے کہ ابتدائی تعلیم جلد لازمی و مفت کر دی جائے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ہمیشہ مستعد رہیں اور اس مسئلہ کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دیں۔

حال میں ایک ایلیمنٹری ایجوکیشن لیگ الٰہ آباد میں، قائم ہوئی ہے جو ان

صوبجات کی تعلیمی ترقی میں بدل وجان کوشش کریگی۔ اس لیگ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:-

(۱) ابتدائی تعلیم کے مفت ولازمی کیے جانے کے خیال کو عوام الناس میں بذریعہ مضامین لکچر و کانفرنس وقتاً فوقتاً اشاعت دینا۔

(۲) ابتدائی تعلیم کے مفت ولازمی کیے جانے کے مسئلہ پر بذریعہ عرضداشت وغیرہ گورنمنٹ کو توجہ دلانا۔

(۳) ایسے ابتدائی درجہ کے مدرسے کھلوانے کی کوشش کرنا جن میں غربا کے لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاسکے اور اُن ابتدائی درجہ کے مدرسوں کی حالت کو سنبھالنا جو ردی حالت میں ہیں۔

لیگ کی کوشش ہمیشہ یہ ہوگی کہ وہ سب فرقوں اور سب مذہبوں کے لوگوں کی ہمدردی اپنے کام کے ساتھ وابستہ کرسکے اور بلالحاظ مذہب وملت سب کی بھلائی کی کوشش کرے۔ البتہ اگر ممکن ہو تو غریب اور پنچ قوموں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کرے۔ یہ امر کہ لیگ کے مدرسوں میں کون سی زبان میں تعلیم دی جائے، اُن لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جائیگا جو مدرسے کے قرب وجوار کے باشندے ہوں۔ حتی الامکان یہ کوشش کی جائیگی کہ اردو ہندی دونوں زبانیں ہر مدرسہ میں پڑھائی جائیں۔

پراونشیل لیگ میں عنقریب تمام اضلاع کے ممبر شریک ہونگے اور اسکے اغراض و مقاصد کے انجام دینے کے لیے ایک انتظامی کمیٹی مع عہدہ داران کے منتخب کیجائے گی اور لیگ کا صدر دفتر الہ آباد میں ہوگا۔ لیگ اس امر کی کوشش کریگی کہ اپنی شاخیں رفتہ رفتہ عنقریب تمام اضلاع میں کھولے جو اس کے زیر نگرانی کام کریں۔ لیکن پراونشیل لیگ خود مدرسے کھولنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیگی۔ بلکہ یہ کام شاخوں کے سپرد ہوگا کہ جہاں ممکن ہو اور شاخیں ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہوں وہاں مدرسے کھولے جائیں۔ پراونشل لیگ اپنے سکرٹری اور دیگر عہدہ داروں اور کام کرنے والوں کے ذریعہ سے شاخوں کو اس امر میں مدد دیگی کہ وہ اپنے اپنے اضلاع میں کمیٹیاں قائم کرسکیں، اور مدرسے کھول سکیں! لیکن مدرسوں کے لیے سرمایہ بہم پہنچانے اور اُنکی نگرانی کرنے کی ذمہ داری انھیں اضلاع کی کمیٹیوں اور شاخوں پر واجب ہوگی۔ مُلکی معاملات کے لحاظ سے اِن صوبجات کی جو کیفیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کی آب وہوا قومی انجمنوں کی سرسبزی وشادابی کے لیے کچھ بہت زیادہ موافق نہیں ہے۔ پس اس امر کو ملحوظ خاطر رکھکر یہ امید کرنا کہ لیگ کے قائم ہوتے ہی کوئی خاص عجیب وغریب ترقی نمایاں ہوگی، امید موہوم ہے۔ لیگ اس امر کی ذمہ داری نہیں لیتی کہ وہ کسی بڑے پیمانہ پر عوام الناس کی تعلیم کا انتظام کریگی۔ لیکن ہم اس امر کی اُمید ضرور کرتے ہیں کہ موجودہ حالت میں ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کو لیگ کے قائم ہونے سے خاص تقویت ہوگی اور بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔ علاوہ بریں یہ بھی اغلب ہے کہ لیگ کے ذریعہ سے اہل اسلام و اہل ہنود پالیٹکس کے دنگل سے باہر نکل کر ان متفقہ اغراض و مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوسکیں گے اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہوسکیں گی۔ بلاشبہہ یہ کام مشکل ہے اور بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن اگر ہم اپنی دُھن کے پکے ہیں، اگر ہمارے ارادوں و عقائد میں استقلال موجود ہے اگر ہم ایثار نفس کے لیے تیار ہیں تو کچھ شبہہ نہیں کہ ہمکو کامیابی ہوگی اور ہمارا صوبہ تعلیمی معاملات میں سب سے پیچھے نہیں رہے گا۔

مذکورۂ بالا تحریر چند نہایت ممتاز ہندو و مسلمانوں کے دستخطوں سے شائع کیگئی تھی اور ۲۰ اگست انعقاد جلسۂ لیگ کی تاریخ قرار پائی تھی۔ اس جلسہ کو جیسی کچھ کامیابی ہوئی وہ نہایت حوصلہ افزا اور اُمید دلانیوالی ہے۔ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ اس میں موجود تھے۔ پہلا رزولیوشن ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے پیش کیا اور دیگر صاحبوں نے اُسکی تائید کی۔ رزولیوشن حسب ذیل تھا۔

یہ جلسہ عوام الناس کے لیے ابتدائی تعلیم کو نہایت ضروری ولازمی سمجھتا ہے اور طے کرتا ہے کہ ان صوبجات کے لیے ایک ایلیمنٹری ایجوکیشن لیگ قائم کیجائے جس کے اغراض یہ ہوں۔ (۱) ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرنا

جہاں مدرسے نہوں وہاں نئے مدرسے قائم کرانا جن میں تعلیم جہانتک ممکن ہو مفت دیجائے اور جو مدرسے ردی حالت میں ہوں اُنکی حالت سنبھالنا (۲) لازمی اور مفت تعلیم کے مسئلہ پر بذریعہ لکچر و مضامین و کانفرنس وغیرہ لوگوں کو توجہ دلانا (۳) مفت و لازمی تعلیم کے مسئلہ پر گورنمنٹ کی توجہ مبذول کرانا۔

دوسرا رزولیوشن لیگ کے ممبروں اور انتظامی کمیٹی و عہدہ داروں کے انتخاب کے باب میں تھا۔ قریب سَو اصحاب شریک لیگ ہوے ہیں، جن میں الہ آباد، لکھنؤ، کان پور، بنارس، فیض آباد، بریلی، گورکھپور، علیگڈھ، اور دیگر اضلاع کے حضرات شامل ہیں۔ آنریبل پنڈت موتی لال نہرو صاحب لیگ کے پریسیڈنٹ منتخب ہوے ہیں، اور آنریبل راجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب بہادر کے سی آئی ای وائس پریسیڈنٹ۔ علاوہ آپ کے آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت بشن نرائن دَر، رائے بہادر بابو گنگا پرشاد ورما، اور ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی صاحب بھی وائس پریسیڈنٹ منتخب کیے گئے ہیں؛ اور لیگ کے سکرٹری پنڈت ہردے ناتھ کنزرو قرار پائے ہیں۔

لیگ کی ممبری کی درخواست و زرچندہ و دیگر خط و کتابت بنام آنریری سکریٹری ایلیمنٹری ایجوکیشن لیگ ملا جنگ روڈ، الہ آباد آنی چاہیے۔

مذکورۂ بالا تحریر سے ظاہر ہے کہ جو اصول لیگ نے ظاہر کیے ہیں، ان میں صاف طور پر اس بات کی خواہش کی گئی ہے کہ ہندو و مسلمان، دونوں قومیں مل کر اس باب میں کوشش کریں اور ابتدائی تعلیم کے دائرہ کو وسیع کرنے میں متفقہ کوشش سے کام لیں۔ یہ ابتدائی تعلیم کے لازمی اور مفت ہونے کی پہلی منزل ہے۔ آنریبل مسٹر گوکھلے نے ابتدائی تعلیم کے لازمی اور مفت ہونے کا جو مسودہ کونسل میں پیش کیا تھا، اگرچہ وہ نامنظور کر دیا گیا، مگر آیندہ وہ وقت بھی ضرور آے گا جس میں مسودۂ مذکور دوبارہ پیش ہو کر پوری قوت کے ساتھ پاس ہوگا۔ اُس وقت سے پہلے اہل ملک کا فرض ہے کہ وہ اپنے دست و بازو پر بھروسا کریں اور ابتدائی تعلیم کے دائرہ کو وسیع کرنے کی غرض سے ہر صوبہ میں متفقہ کوشش سے کثیر التعداد اسکول کھولیں، اور جن امور میں اُنکے درمیان اختلاف رہے ہو اُسکا فیصلہ آپس میں کرکے، اس عمدہ تحریک کو ترقی دیں اور اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیں کہ وہ اس میدان میں دوش بدوش رہکر چلنے کے لیے تیار ہیں، اور ایک دوسرے کے حقوق کی عزت کرتے ہیں۔

دیسی زبانوں سے ہماری غفلت

اگر ہماری تعلیمی درسگاہوں میں تہذیب و تربیت کے حصول کا ذریعہ دیسی زبانیں قرار دی جائیں تو یہ فعل سب سے زیادہ فائدہ رساں، معقول، اور مقتضاے فطرت کے موافق ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم ان زبانوں کو پسند نہیں کرتے، اور یہ غلط اندازہ ہمارے ذہن نشین ہو گیا ہے کہ اگر ہونہار طلباء کی تعلیم میں دیسی زبانیں استعمال کیجائیں گی تو تباہ کُن نتائج پیدا ہوں گے۔ فی الحقیقت ہندوستانی طلباء کی قسمت بہت ہی زبوں ہے، اور غضب یہ ہے کہ اسے زبوں تر بنانے کی کوشش کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ہندوستان کے تعلیم یافتوں کی اوسط عمر ماہرین فن کے تخمینہ کے بموجب ۳۵ سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اسپر بھی اس چند روزہ زندگی کا بیشتر حصہ ایک نہایت مشکل اجنبی زبان، انگریزی، کی تحصیل و تکمیل میں صرف ہو جاتا ہے۔ طلباء کی تمام اعلی قوتیں انگریزی کے ہجا، صرف و نحو، اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف ہو جاتی ہیں، جن میں سے اول الذکر دونوں محض خیالی اور نہایت عسیر الحصول ہیں، اور موخر الذکر بھی موجب پریشانی ہے۔ ہندوستانی طلباء کو صرف انگریزی میں کمال حاصل کرنے کے لیے اپنے گراں قدر ایام عمر میں سے بارہ سال کا زمانہ درکار ہوتا ہے، اور اس طرح سائنس وغیرہ کی نہایت ضروری نظری و عملی شاخوں کے مطالعہ کے لیے جو وقت باقی رہتا ہے وہ بہت ہی ناکافی ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیسی زبانوں کے ادبیات اور علوم و فنون کے حصول کا کسی کو خیال ہی نہیں رہتا۔

"ویدک میگزین" کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ ہماری ہندوستانی یونیورسٹیاں انگریزی زبان سے محبت کے باب میں لارڈ میکالے سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ لارڈ موصوف کو ہندوستانی ادبیات اور علوم و فنون سے بالکل محبت نہ تھی اور

علیٰ ہذا القیاس ان یونیورسٹیوں کو بھی صرف انگریزی سے محبت ہے۔ اسکی وجہ غالباً وہ غلط خیال ہے جو ہماری بدقسمتی سے ان لوگوں کے دماغوں میں جاگزیں ہوگیا ہے کہ ہندوستانی طلباء صرف انگریزی پڑھنے کے لیے پیدا ہوے ہیں، اور انکی زندگی کا منتہائے خیال محض تعلیم انگریزی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ ہر سال انگریزی کے بڑے بڑے مشکل نصاب مقرر کرتی ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ روز بروز اس بوجھ کو اور بھی وزنی کرنے کی فکر انھیں ہر وقت لگی رہتی ہے۔ ہر سال وہ اس قدر کتابیں منظور کرتی ہیں اور اتنے زائد از ضرورت مضامین مقرر کرتی ہیں جو ایک سال کی میعاد کے لحاظ سے نہ صرف نامناسب ہی ہیں بلکہ طلباء کی پریشانی کی موجب ہیں اور اس کا نتیجہ صریح یہ ہے کہ طلباء کی استعداد میں ترقی مسدود ہوتی جاتی ہے لیکن اسپر بھی انھیں اصرار ہے کہ انگریزی کے ناگوار اور تکلیف دہ نصاب میں چند اور کتابوں کا اضافہ طلبا کے لیے اچھے نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ یہ اُمید کس قدر غلط اور خلافِ واقع ہے!

لیکن ہمیں اس امر کے فوائد و نقصانات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ ہم اس بارِ گراں کو کس طرح ہلکا کر سکتے ہیں، اور ہمارے سابقہ علوم و فنون میں سے کون سا قابلِ حفاظت سرمایہ ہے جس کی حفاظت کرنے پر اب ہم بھی قادر ہیں۔ بقول ہمعصر وکیل اگر اس مہلک مرض کا دفیعہ مقصود ہے تو ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی دیسی زبانوں میں تعلیم دینا ضروری ہے، اور اسکے ساتھ ہی کارآمد انگریزی علوم بھی انھیں اس قدر پڑھانا چاہیے جو عملی اور صحیح طریقوں سے چند مہینوں میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں یہ کام اس طریق سے فوراً شروع کر دینا چاہیے کہ ہم دیسی زبانوں سے پھر ایسا ہی فائدہ اُٹھانا شروع کر دیں جیسا کہ ان سے اُٹھانا چاہیے۔ ہمیں اپنے اسکولوں میں، کالجوں میں، غرض کہ ہر حالت میں انھیں عزت کی جگہ دینا چاہیے۔ اور سب سے پہلے ہائی اسکولوں میں انھیں ذریعۂ تعلیم مقرر کرنا چاہیے۔ اگر ہم سے ہو سکے تو یہ کام ایسا ہے جو بغیر کسی توقف کے انجام پا سکتا ہے انٹرنس کا نصاب اس وقت بھی دیسی زبانوں میں پڑھایا جا سکتا ہے۔ ایف۔ اے کا نصاب ایک ہی سال میں دیسی زبانوں میں تیار ہو سکتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ اگر کوشش کیجائے تو بی۔ اے۔ کا کورس بھی زیادہ سے زیادہ دو سال تک تیار ہو سکتا ہے۔ صرف مستقل ارادہ اور اپنی دیسی زبانوں کی سچی محبت درکار ہے۔

ہماری رائے میں اُردو زبان کی روز افزوں ترقی اور ہر دلعزیزی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اسکے ذریعہ سے ہر قسم کے کورس تیار کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔ علمی مصطلحات کی کمی بے شک ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے لیکن اس رکاوٹ کو بہت جلد رفع کیا جا سکتا ہے۔ انجمن ترقی اُردو اپنے مقاصد کے لحاظ سے اصطلاحات کا لغت تیار کر سکتی ہے اور اُس لغت سے انگریزی اور دوسری زبانوں کے علوم و فنون اور نصاب تعلیم کی کتابوں کے تراجم اُردو زبانوں میں شائع کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے جو فوائد عظیم ملک کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کو حاصل ہوں گے انکو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا ناممکن ہے۔

رسالۂ اَدیب الہ آباد

الہ آباد کا نامور رسالہ "اَدیب"، جو اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے دنیاے ادب میں چوٹی کا رسالہ سمجھا جاتا تھا اور جس کے علمی و تحریری کارنامے مدت تک اربابِ ذوق نہیں بھول سکتے، افسوس ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء سے بند ہو گیا اور تشنہ کامانِ ادب کو اپنی یاد میں دل کش حسرت چھوڑ گیا۔ اسکے بند ہو جانے کا افسوس گو تمام ہی خواہانِ اُردو کو ہے، لیکن جو صدمہ ہم کو یا حضرت نظر لکھنوی کو محسوس ہو سکتا ہے، وہ اور ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اُردو میں صرف اَدیب ہی پہلا رسالہ تھا جو یورپ اور مصر و قسطنطنیہ کے زریں رسائل کے مقابلہ میں فخریہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ اُسنے ظاہر کر دیا تھا کہ نفاستِ طبع اور ذوقِ سلیم کا احساس ابھی ہندوستان کے افراد سے مفقود نہیں ہوا ہے۔ اس گلشنِ ادب کی آبیاری کا فخرِ اولیں جنابِ نظر کو حاصل رہا۔ موصوف نے ایک برس چار ماہ اُسکو ایڈٹ کیا۔ انکے بعد ہم ایک برس آٹھ ماہ تک اپنی امکانی کوشش سے اسکی خدمت کرتے رہے۔ ہمارے بعد میر حسین چھ ماہ اَدیب کی خدمتگزاری اور اپنے فرائضِ ایڈیٹری کی ادائی میں مصروف رہے، لیکن افسوس ہے کہ اس

تیسرے دور کا مستقبل جس قدر شاندار بتایا گیا تھا اُسی قدر نامبارک ثابت ہوا۔

ادیب کو دیگر اُردو رسائل کی طرح عام ناقدردانی کی شکایت کبھی نہیں ہوئی بلکہ پبلک نے جس فراخ دلی سے ادیب کی قدرافزائی فرمائی اُتنی کسی دوسرے رسالہ کو مشکل سے حاصل ہوسکتی ہے۔ ہمارے زمانہ میں وہ پندرہ سو چھپتا تھا اور تقریباً تیرہ سو اُسکے خریدار تھے۔ ہمعصر ہندو (لاہور) کا یہ قیاس بالکل خلاف واقع ہے کہ "ادیب کو مالی مشکلات یا خسارہ نے اس ناخوشگوار انجام کے لیے تیار و آمادہ کیا" اور یہ الزام بھی ہمعصر موصوف کا نہایت بیجا اور غلط ہے کہ "ملک کے بہترین رسالے اُردو داں پبلک کی لٹریری بدذاقی اور ناقدردانی کے سبب بموت مر رہے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ بھی کچھ بہت اطمینان بخش حالت میں نہیں ہیں ..... الخ"۔ اس کے بند ہوجانے کا سبب اُردو پبلک کی ناقدردانی اور بدذاقی ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ اسباب اور ہی ہیں، جن کا اظہار یہاں کچھ بے ضرورت اور غیر مفید معلوم ہوتا ہے۔

ہمعصر ہندو نے یہ بھی لکھا ہے کہ ادیب نے ساڑھے سات سال اُردو کی خدمات انجام دیں۔ خوب! ادیب کے بند ہوجانے سے زیادہ ہمیں ایسے اخبار نویس حضرات پر افسوس آتا ہے جن کے معلومات اس قدر کوتاہ اور خیالات اس قدر پست ہیں کہ وہ سیاسی اور اقتصادی معاملات تو کجا ایک معمولی واقعہ کے متعلق بھی صحیح معلومات بہم نہیں پہنچا سکتے۔

یادش بخیر ادیب پر دو آنسو بہاتے ہوئے ہمعصر "آگرہ اخبار" نے العصر کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن نامبارک الفاظ میں اور بُری بدشگونی کے ساتھ۔ ہم اسکو بھی غنیمت سمجھتے ہیں ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

لیکن ہم صرف اس قدر التماس کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ بھی ہندو کی طرح رائے قائم کرنے میں اس قدر عجلت سے کام نہ لیا کریں، اور قیاسی شبدیز کی جولانی دکھاتے ہوئے مستقبل کے واقعات کو حال یا گزشتہ سے مشابہ نہ مان لیا کریں۔ ممکن ہے کہ انکا کہنا درست ہو، العصر کا بھی وہی حشر ہو جو ادیب کا ہوا، مگر ایسی پیشین گوئی بدشگونی میں داخل ہے، اور جب بھی خواہان اُردو العصر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو انکو ایسے الفاظ سے ہمارا حوصلہ پست نہ کرنا چاہیے، بلکہ انکا فرض ہے کہ اب پہلے سے زیادہ خود کوشش کریں اور ہمارا حوصلہ بڑھائیں تاکہ العصر پورے طور پر ادیب کا قائم مقام ہوسکے۔ گو ہمارے خیالات کی جولان گاہ اُس سے بھی بہت وسیع ہے۔

اُردو پریس کانفرنس

منشی لالہ چھپال سنگھ صاحب شیدا (دہلوی) ایڈیٹر اخبار ہندوستانی کی تقریر صدارت

برادران ہم قلم و معاصرین محترم!

آپ کی محل شناسی قابل داد ہے کہ جبکہ تمام تعلیم یافتہ ہند کا عطر اس تاریخی شہر میں ہو کے آیا ہے یعنی جبکہ اور ہند کے تقریباً تمام بہترین دماغ دار الخلافہ اودھ میں نہایت اہم اور متبرک مقاصد سے مجتمع ہیں آپنے اس بے نظیر موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

آج جو لوگ لکھنؤ میں اطراف و جوانب ہند سے فراہم ہوئے ہیں وہ ہندوستان میں برٹش عہد حکومت کے شجر بار دار کے نہایت شیرین پھل ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کی تمام معدنی دولت سے زیادہ قیمتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اگر یہ لوگ نہوتے تو ہندوستان تج دلولینڈ کے مشابہ ہوتا۔ پس ایسے وقت میں جبکہ ہندوستانی قوم نے اپنے عمل ارتقا کی دوڑ میں نہایت لیر قدم اٹھایا ہے بڑا ہی تعجب ہوتا اگر قومی تیزی کے سبب سے ضروری پرزہ کے پیچ کو کسنے کی پروا نہ کی جاتی۔

صاحبان! میرا تو یہ عقیدہ ہے اور امید ہے کہ آپ بھی اس خیال میں میرے ہم نوا ہونگے کہ تمام سوشل، پولٹیکل، اخلاقی اور اقتصادی اصلاحوں کی اصلی بنیاد ایک

آزاد اور زبردست پریس

ہے۔ خیالات ہی تو ہیں جو افراد یا اقوام کو چھوٹا یا بڑا بناتے ہیں خیالات جس قدر بلند اور جس قدر بلند اعلیٰ اور جیسے ادنیٰ ویسے ہی اعمال و افعال سرزد ہوا کرتے ہیں۔ اور جیسے افعال ویسے ہی ادنیٰ اور اعلیٰ حالتیں رونما ہوتی ہیں۔ اس لیے جس قوم کے خیالات اعلیٰ وہی قوم اعلیٰ اور افضل ہے۔ آپ پر مخفی نہیں کہ اچھے اور نفیس خیالات کی اشاعت کا بہترین اور کارگر ذریعہ پریس ہے پس پریس ایسا آزاد ہونا چاہیے جیسی ہوا۔ آپ پر بخوبی روشن ہے کہ ہندوستانی قوم کے خیالات جو نشو و نما پا رہے ہیں اور جو یقیناً ترقی اور بلندی کی طرف جا رہے ہیں یہ سب پریس کی کرشمہ سازی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ

اپنی طاقت کا احساس

پورے طور پر آپ کو ہے یا نہیں۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو مخفی نہ رہیگا کہ اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت ملک کی آبادی کا نہایت جزوی عنصر ہے۔ ان کے خیالات کی اشاعت تائید و حمایت کا سہرا محض دیسی پریس کے سر ہے۔ اردو، ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل اخبارات کا گذران کروڑوں ہندوستانی ہاتھوں تک ہے جہاں انگریزی پریس کی رسائی نہیں ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۰ کروڑ ہندوستانی اُردو زبان پڑھ سکتے ہیں خواہ آپ اس کا نام ہندی رکھ لیجئے یا اُردو اور ۹ کروڑ سمجھتے ہیں عموماً بڑے شہروں اور قصبات کے ایک ایک محلہ میں دو دو چار چار اور دیہات میں ایک گاؤں کی کل آبادی کیلئے ایک ہی پرچہ کفایت کرتا ہے پس اُردو اخبارات کے خریدار اگر کروڑوں تک نہیں تو اس کے پڑھنے والے اور اُن سے واقعات کا علم اخذ کرنے والے کروڑوں سے کم تعداد میں نہیں ہیں آپ دیکھ رہے ہیں کہ

اہل ہند کی وفاداری

پر نہ صرف تمام یورپ بلکہ اہل برطانیہ تک حیران ہیں کیونکہ باشندگان انگلینڈ نے تو اینگلو انڈین اخبارات کی وساطت سے ہمیشہ یہ سنا تھا کہ ہندوستان میں غداری اور بغاوت کی آگ شعلہ زن ہے اور یہ ملک انارکسٹوں اور بم اندازوں کا مسکن ہے۔ لیکن بخلاف اپنی توقعات کے

اُنھون نے دیکھا کہ جنگ شروع ہوتے ہی والیان ریاست سے لیکر ادنیٰ کاشتکار تک سلطنت کے لیے تن من دہن سے سینہ سپر ہو گئے تو اُن کے استعجاب کی کوئی حد نہ رہی لیکن یہ انتہائی جذبۂ وفاداری عامۃ الناس مین کس نے پیدا کیا؟ کیا انگلشمین اور سول ملٹری گزٹ نے کیا یا پونیر اور سٹیٹسمین اور مدراس میل نے نہین بلکہ ورنیکلر پریس نے لیکن ان قابل قدر خدمات کا صلہ اُردو پریس کو یہ ملا ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ مشتبہ نظر سے دیکھے جانے لگا۔ اور ان مین بعض کی ہستیان پریس ایکٹ کے تصدق ہو چکی ہین اس لیے نہین کہ ان مین مغویانہ مضامین درج ہوے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کے مالک حکام کی نظر مین ان نامعلوم افعال کے جن کا پبلک کو کچھ علم نہین مرتکب ہوے تھے یا ہونے والے تھے جو امن عامہ کے لیے خار راہ خیال کیے جا سکتے تھے۔

پریس ایکٹ

کی سختیون کے مسئلہ نے اس وقت ملک کی توجہ کو بڑے زور شور سے اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ہماری تمام پولٹیکل پبلک باڈیز نے اس پر کھلے الفاظ مین عام راے کا اظہار کر دیا ہے انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ متفق الراے ہین کہ یہ قانون جسقدر نامناسب ہے اُس سے بڑھ کر اُس کا عملدرآمد مخل آزادی ہے۔ ملک کی دو اعلیٰ ترین جڈیشل عدالتون نے اس قانون کو بے اصول قرار دیا ہے کلکتہ اور مدراس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان اپنی راے کا اظہار کر چکے ہین کہ یہ قانون صرف اصلی جرم کا انسداد نہین کرتا بلکہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ معصوم سے معصوم تحریرین اسکی رو سے قابل تعزیر ٹھہرائی جا سکتی ہین آپ صاحبان مین سے کوئی صاحب کوئی فقرہ لکھیے خواہ وہ کیسا ہی وفاداری کے جذبات سے لبریز ہو لیکن اس عجیب قانون کی رو سے مین اُسے سڈیشن ثابت کر سکتا ہون مثلاً کوئی اخبار لکھے کہ ہم بڑے ادب کے ساتھ اپنی عادل گورنمنٹ سے یہ التجا کرتے ہین کہ ہندوستانیون کو فوج مین کمیشنڈ عہدے عطا کیے جائین تاکہ ہم ہندوستانی جنگ یورپ مین اپنے سپاہیانہ جوہر بیچ جلد پر دکھلا سکین پریس ایکٹ یہ کہتا ہے کہ اگر لفظاً یا معناً اشارتاً یا کنایتاً یا اور کسی طرح سے کوئی ایسا خیال ظاہر کیا جائے جس سے گورنمنٹ قائم کردہ از روے قانون کی اہانت یا تحقیر کا پہلو نکلتا ہو یا اُس کے خلاف نفرت کا جذبہ پھیلتا ہو تو وہ سڈیشن ہے اب کوئی ضرورت سے زیادہ ذکی حس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ ہندوستانیون کے لیے کمیشنڈ عہدے مانگے گئے ہین جو ابتک نہین دیے جاتے لہذا اخبار نے یہ خیال پبلک کے سامنے پیش کیا ہے کہ گورنمنٹ ہندوستانیونکو کمیشنڈ عہدے فوج مین نہین دیتی اور یہ خیال گورنمنٹ کی غیر فیاضانہ پالیسی اور ہندوستانیون کے ساتھ اس پہلو مین انصاف نہ کرنے کی عملدرآمد کو یاد دلاتا ہے اور اس سے پبلک مین گورنمنٹ کے خلاف یا انصافی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے لہذا اُس نے سڈیشن کا ارتکاب کیا ہے اور یہ بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیار مین ہے کہ وہ اس اخبار سے اسی ارتکاب جرم کے بہانہ سے ضمانت طلب کرے۔ فی الحقیقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات پریس کے متعلق اس قدر وسیع ہین کہ اُس کو وجہ بتلانے کی بھی ضرورت نہین۔ وہ وجہ صرف گورنمنٹ کو بتلائے گا۔ ایسا بھی عموماً ہوتا ہے کہ پرنٹر کے بدل جانے سے یا مکان پریس کے تبدیل کرنے پر ضمانتین طلب کر لی گئی ہین۔ اس کے معنی یہ ہین کہ اخبارات ہند کے پرنٹر خواجہ خضر یا حضرت مسیح یا مہاراجہ بھرتری یا گوپی چند یا گورکھ ناتھ جیسے زندہ جاوید بزرگون کے سوا ان لوگون مین سے ہونا چاہئین جو لقمۂ اجل سے محفوظ نہین رہ سکتے۔ یا یہ کہ وہ عمر بھر کے لیے اسی پرنٹری کے کام کے لیے پابند رہین۔ زندگی کے دوسرے شعبون مین قدم رکھنے کی اُن کو ممانعت ہے۔ اور پریس ایسے مکانون مین ہونے چاہئین جنھین نہ زلزلہ گرا نہ سکے یا دور حوادث جن کی دیوارون کو نہ ہلا سکے۔ آگ جلا نہ سکے سیلاب اُن کو بہا نہ سکے ساگ پلیگ یا ہیضہ پھیلے تو بھی مالکان پریس اس رقبہ سے کسی دوسرے محفوظ کوارٹر مین منتقل نہ ہو سکین ورنہ ضمانت داخل کرنے کا کھٹکا ہر دم موجود ہے۔

صاحبان! تمام دنیا میں اصول قانون یہ ہو کہ جب تک کسی شخص سے کوئی جرم سرزد نہوا ہو وہ معصوم اور بے گناہ سمجھا جاتا ہو لیکن ہمارا قانون پریس اس اصول کی بیخ و بُن پر بھی کلہاڑا رکھتا ہو یعنی آج ایک شخص ایک نیا پریس جاری کرتا ہو یا اخبار نکالنا چاہتا ہو تو بھی مجسٹریٹ کو اختیار ہو کہ اُس سے ضمانت طلب کرے۔ ابھی اُس نے کاغذ پر ایک سطر نہیں چھاپی ہو ابھی تک اُس نے کوئی اخبار نکال کر سڈیشن کا ارتکاب نہیں کیا ہو لیکن یہ فرض کر لیا گیا ہو کہ وہ ضرور مرتکب جرم ہوگا۔ اور یہ فرض کر لینے کا اختیار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو حاصل ہو۔

جایز نکتہ چینی کی بندش

صاحبان جایز نکتہ چینی کا دروازہ اس قانون نے بالکل بند کر دیا ہو آپ کی قلموں کو روک دیا گیا ہو۔ فرض کر لیجیے کہ کسی ضلع میں مقامی حکام کوئی غلطی کرتے میں کیونکہ وہ آخر فرشتے نہیں ہوتے غلطی کا ہر وقت امکان ہو تو اُس غلطی کی تلافی کس طرح ہو، کیونکہ کس اخبار میں یہ طاقت ہو کہ وہ اپنا فرض دیانت داری سے ادا کرکے اُن لوگوں کے اعمال پر نکتہ چینی کرے جن کے اختیار میں ہو کہ ۰۰۵ سے لیکر ۱۰ ہزار تک کی ضمانت طلب کر لیں، یا اگر داخل ہو تو اُس کو ضبط کر لیں بس اخبارات کا کام اب یہ رہ گیا ہو کہ تک تک دیدم دم نکشیدم۔ اور وقت بے وقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کی شان میں قصیدے لکھتے رہیں اور اُن کے ہر فعل پر آمنا و صدقنا کے نعرے لگاتے رہیں۔ ہر قانون میں جُرم کے لیے نیت ایک نہایت ضروری عنصر ہو لیکن یہاں نیت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا ہو۔ نیت آپکی کیسی ہی نیک ہو اور آپ ہزار آرٹیکل اپنے جذبہ وفاداری سے لبریز لکھے ہوں لیکن اگر ایک فقرہ کہیں ایسا لکھا گیا ہو جسکے معنی کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں یا سرکاری مترجم نے جس کا ترجمہ کچھ اور کر دیا ہے تو بھی آپ قانون کی زد میں آ سکتے ہیں چنانچہ ایسا بارہا ہو چکا ہو جس وقت دہلی میں جب وہ ناگوار واقعہ گزرا جس پر تمام ملک کو افسوس ہو یعنی کسی انارکسٹ نے ہندوستان کے محبوب وایسرائے کا قصد جان کیا تو لاہور کے اخبار جھنگ سیال نے اپنے جوش وفاداری کا اظہار کھلی چٹھیوں کے ذریعے کیا اور اس انارکسٹ کے نام جس سے اس فعل اشنع کا ارتکاب ہوا تھا۔ اپیل کی کہ وہ مردوں کی طرح اپنے تئیں حوالۂ پولیس کر دے تاکہ تمام ہندوستانیوں کے دامن سے یہ داغ دھل جائے لیکن اس چٹھی میں ایک فقرہ ایسا تھا جس کو چغل خور لوگوں نے ایسے معنی پہنا دیے جو چٹھی کے باقی تمام خیالات سے لگا نہیں کھاتے تھے اور آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ محض اس فقرہ کی بنا پر اخبار مذکور کی ۲ ہزار کی ضمانت ضبط ہو گئی۔ ایسا ہی ہندوستان کے ساتھ ہوا کہ ایک نہایت وفادارانہ اڈیٹوریل آرٹیکل میں جس میں اہل ہند کو ترغیب دی گئی تھی کہ گورنمنٹ کے لیے اس جنگ میں اپنی جانیں نثار کریں چار لفظوں کا ایک جملہ قابل اعتراض سمجھا گیا اور اُس پر گورنمنٹ کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اخبار کو تنبیہ کی جائے۔ اور محض اڈیٹر کے ۲۵ سالہ گزشتہ رویہ کے خیال سے کوئی سخت اسٹیپ لینا مناسب نہیں سمجھا گیا ورنہ عجب نہ تھا کہ ضمانت طلب کر لیجاتی یا مقدمہ چلایا جاتا بس صاحبان جب تک یہ قانون موجود ہو ہندوستانی پریس اور خاصکر دیسی پریس اپنے فرائض کو پورے طور پر ہرگز ادا نہ کر سکے گا۔ اسمیں محض اہالیان اخبارات ہی کو خطرہ نہیں بلکہ آزادی تحریر کے نہونے سے گورنمنٹ عایا کے دلی جذبات کے علم سے محروم رہتی ہو جن کا جاننا ارباب حل و عقد کے لیے نہایت ضروری ہو کیونکہ رعایا کی خواہشات اور خیالات سے ہر وقت باخبر رہنا اعلیٰ درجہ کے نظام سلطنت کے لیے بیحد ضروری ہو۔

اندرونی اصلاح

صاحبان پریس ایکٹ کا منسوخ کرانا اُردو پریس کی ترقی کا صرف ایک پہلو ہو۔ اور یہ امر گورنمنٹ کے اختیار میں ہو کہ وہ ہماری اس عاجزانہ درخواست کو شرف قبولیت بخشے۔ لیکن اس کو چھوڑ کر پریس کی اصلاح بہت کچھ ہمارے ہاتھ میں ہو اور اس کے لیے آپکو مل جلکر کام کرنے اور جدوجہد

کرنے کی ضرورت ہے۔

سب سے اول یہ امر مین آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہون کہ ہندوستانی قوم مین باہمدگر مغائرت اور بیگانگی کے خیالات کا دور کرنا اُخوت اور حب الوطنی کے جذبات کو ترقی دینا محض آپ کی مساعی جمیلہ پر منحصر ہے۔ آپ دیکھ رہے ہین کہ دنیا کی ہوا کس طرف ہے۔ ہماری تمام قومی تحریکون کا عام میلان اتحاد اور یگانگت کی جانب مائل ہے آپنے ملاحظہ کیا کہ ابھی دو تین روز ہوئے نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ نے سلف گورنمنٹ کے متعلق اتفاق رائے ظاہر کیا ہے۔ قانون اسلحہ۔ قانون پریس ہندستانیون کیلئے اعلیٰ فوجی مناصب کے لیے ملک کی دونون قومی مجلسون نے ایک ہی آواز بلند کی ہے۔ بہت سے معاملات مین ہندو اور مسلمان لیڈر ہمخیال ہوگئے ہین۔ جو جزوی اختلافات تھے وہ مٹ گئے ہین۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب ہندوستانی تیس سال کے بعد صحیح معنی مین ایک قوم بن گئے ہین لہذا مین بڑے ادب کے ساتھ ہندو اور مسلمان اخبارات سے اگرچہ یہ تفریق بھی فضول ہے کہ فلان اخبار ہندو اور فلان اخبار مسلمان ہے گزارش کرتا ہون کہ اُن باتون سے آیندہ ہمیشہ احتراز کرین جو ان دو عظیم الشان قومون کو بجائے قریب لانے کے دور لے جائین۔ مین یہ نہین کہتا کہ اختلاف رائے نہ رہے۔ اختلاف تو باعث زینت ہے اختلاف تو ہمیشہ رہیگا لیکن مین صرف یہ کہتا ہون کہ مخالفت نہ ہو ضد نہ ہو اس مسئلہ کے متعلق مین خیال کرتا ہون کہ اگر ایک اصول کے ہم سختی سے پابند ہوجائین تو کبھی اُلجھن پیدا نہ ہو اور وہ یہ کہ ایک دوسرے کے گزشتہ اور موجودہ بزرگون کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے۔ ادب کو ہمیشہ ملحوظ رکھین بحث ہوتی رہے مباحثے ہوتے رہین لیکن تہذیب و متانت اور شائستگی کو جو ہماری مشرقی تہذیب کا جزو لاینفک ہے اور جس پر ہم دونون قومونکو بجا طور پر ناز ہے کبھی ہاتھ سے نہ دیا جائے،

پریس بوریو

اُردو پریس کی بہتری کے لئے میرے خیال مین ایک تجویز ہے کہ ایک سررشتہ قائم کیا جائے جس کے ماتحت چند قابل مترجم بھی ہون اور وہ اُردو اخبارات کے مضامین کے خلاصے جو گورنمنٹ کی وفاداری سے مملو ہوتے ہین ہر ہفتہ ترجمہ کرکے ایک رپورٹ ہر صوبہ کی گورنمنٹ اور حکام اضلاع کے پاس بھیجا کرین کیونکہ ہم کو سب سے بڑی دقت پیش ہے کہ اُردو پریس کا صرف تاریک پہلو حکام کے زیر نظر رہتا ہے اور اُنھین معلوم نہین ہوتا کہ اُردو پریس نے کہانتک گورنمنٹ کی خدمت کی ہے۔ اس محکمہ کا یہ بھی کام ہو کہ وہ اخبارات کو بھی وقتاً فوقتاً مشورہ دیتا رہے۔ اور گورنمنٹ جب کسی اخبار سے ضمانت طلب کرے یا منسوخ کرنے کا ارادہ کرے تو پہلے پریس بوریو سے اُن قابل اعتراض مضامین یا فقرات کا ترجمہ بھی کرالیا کرے تاکہ اُردو اخبارات ناکردہ گناہ مجرم نہ قرار دیے جایا کرین۔

اخبارات کی زندگی اور موت

کا سوال اب سامنے آگیا ہے۔ کاغذ کی گرانی نے اہالیان اخبارات کے حوصلے پست کردیے ہین اور اندیشہ بلکہ یقین ہے کہ کاغذ ابھی اور گران ہوگا سیاہی اور دیگر سامان پریس کا نرخ بھی کہانتک پہنچ گیا ہے آپ پر مخفی نہین ہے دوسری طرف اخبارات کی خریداری بہت کم ہوتی جاتی ہے۔ انگلینڈ اور بمبئی کے اخبارات اپنی قیمتین مضاعف کرچکے ہین اور مزید اضافہ قیمت کی فکر مین ہین۔ ان حالات مین اُردو اخبارات اگر باہمی قرارداد سے اپنی قیمتون مین اضافہ نہین کرین گے تو اُن کا زندہ رہنا محال ہے۔ لاہور مین جو اُردو اخبارات کا بڑا مرکز ہے تمام مالکان اخبارات اضافہ قیمت کے سوال پر متفق ہین بجز ایک دو معصرون کے جن کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ باقی تمام اخبارات مرجائین تب وہ تنہا میدان مین رہ جائین گے اور جو نقصان آجکل وہ اٹھارہے ہین اُس سے سب کی کسر پوری کرلین گے،

دوسری اندرونی اصلاح

یہ ہوگی کہ آپ اُردو پریس مین آیندہ کام کرنے والے تیار کرین۔ اس معاملہ مین ایک بڑی تنگ خیالی سے کام لیا گیا ہو۔ خود غرض لوگون نے نوجوانون کی جو اس فیلڈ مین داخل ہونا چاہتے تھے کبھی حوصلہ افزائی نہین کی۔ اس لیے ہر ایک اخبار کے دفتر مین دو دو چار چار گریجوایٹ یا انڈر گریجوایٹ بطور امیدوارون کے رکھے جائین علاوہ ازین جو مراعات اور سرپرستی انگلو انڈین اخبارات کو حاصل ہین۔ اُردو پریس اُن سے محروم ہو۔ مثلاً ہر قسم کی رپورٹین اور سرکلرز اور پریس کمیونیک نیز ہر قسم کے سرکاری اشتہارات اُن کو دیے جاتے ہین لیکن تاہم اُردو اخبارات کو نہین۔ اس لیے ہمین گورنمنٹ سے یہ بھی گزارش کرنی ہو کہ اُردو پریس کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کیا جائے۔ تاکہ انھین جز و لازم کا تجربہ حاصل ہو بلکہ اگر ممکن ہو تو انھین کچھ وظائف بھی دیے جائین کیونکہ سر دست اخبار نویسی کے لیے خاص کالج قائم کرنے مشکل ہین۔

علاوہ ازین جہان تک ممکن ہو اخبارات کو شخصی ملکیت سے نکال کر مشترکہ سرمایہ کی کمپنیون کے زیر اہتمام لایا جائے کیونکہ شخصی انتظام چند شخصون کی زندگی اور تندرستی تک وابستہ رہتے ہین شخصی انتظامات مین ایک بڑا نقص یہ ہو کہ مالکان اخبارات ذاتی منافع کے سامنے دیگر تمام اغراض کو قربان کر دیتے ہین۔ لاہور کے بعض پریسون مین عملہ پریس و اخبارات کی تنخواہ دو دو ماہ تک تقسیم نہین کیجاتی ہین۔ ایک پریس مین یہ دستور ہو کہ تنخواہ ۲۵ تاریخ کو دیجائے لیکن اُسوقت بھی دو پیسہ روپیہ کاٹ لیا جاتا ہے۔ مین نے حساب لگایا ہو کہ یہ کٹوتی ۳۰۰ روپیہ سالانہ فیصدی سود کی شرح تک پہنچتی ہو۔ سوال ہو سکتا ہو کہ جہان اس قسم کی سختیان ہین وہان لوگ کیون کام کرتے ہین بات یہ ہو کہ جو آدمی ایک دفعہ پھنس گئے اُن کا اُس جال سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہو ایک غریب کے لیے مشکل ہو کہ وہ یہ قربانی کر سکے کہ ۲۵ روپیہ کی تنخواہ کا نقصان گوارا کرے۔ نہ اُن کے پاس عدالت دیوانی کے اخراجات اور مہینون تک آخری ڈگری حاصل کرنے کے لیے صبر ہوتا ہو۔ ان حالات مین وہ غلامون کی سی زندگی بسر کرتے رہتے ہین۔ اس لیے صاحبان عملہ اخبار و پریس کے لیے بھی کچھ قواعد بنانے چاہئین۔ ان کی علالت اور ضعیفی اور مرگ مفاجات کی صورت مین ان کے اہل و عیال کی قابل رحم حالت کی بھی کچھ فکر کرنی چاہئیے۔ اگر پراویڈنٹ فنڈ قائم ہو جائے تو اُن کے لواحقین کے لیے ابر رحمت کا کام دے گا۔

یاد رفتگان

آج اس جلسہ مین اُردو پریس کے کئی زبردست کارکن اصحاب ہمین یاد آئے بغیر نہین رہ سکتے۔ آنریبل رائے بہادر گنگا پرشاد صاحب ورما اگر آج زندہ ہوتے تو اُن کی با اثر شخصیت اور اُن کے قیمتی مشورون سے اس جلسہ کو کس قدر تقویت حاصل ہوتی۔ آنریبل رائے بہادر منشی پراگ نرائن صاحب بھارگو مالک اودھ اخبار کی وفات حسرت آیات ایک ایسا تازہ زخم ہو جو ابھی اچھا بھی نہین ہوا۔ اس وقت آپ کا یہان موجود نہ ہونا ہم سب نہایت حسرت کے ساتھ محسوس کر رہے ہین۔

شکریہ

صاحبان! طول کلامی سے خاکسار کو ہمیشہ سے نفرت ہو اس لیے آپ کو مطمئن رہنا چاہیے کہ مین زیادہ عرصہ آپ کی سمع خراشی نکرون گا۔

آپ خیال کرتے ہون گے کہ مین نے ابتک اُس رسم کو ادا نہین کیا جو ہر جلسے کے صدر کا فرض اولین سمجھا گیا ہو۔ اور اُس پر رواج کی مہر لگی ہوئی ہو وہ یہ کہ کرسی صدارت کے لیے اپنی ناقابلیت کا اعتراف اور دوسرے ہی سانس مین عزت افزائی کا شکریہ۔

اُردو اور اُس کی ترقی کی صورت

شائستہ سوسائٹی کی زبان فلسفیانہ، مگر نیم شائستہ کی شاعرانہ ہوتی ہے۔ زبان کی تبدیلی کچھ تو سبب اور کچھ نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ دماغی قوی کے تغیرات کا
(بیکلے)

ڈارون کے مسئلۂ ارتقا نے مملکتِ خیال مین ہونچال کا کام کیا۔ علمی دنیا مین ایک ہلچل سی پڑ گئی۔ حسنِ اعتقاد کی بنائی ہوئی عمارتین زمین پر آرہین۔ اکثر مسائل قدیمہ کی بنیادین تک ہل گئین۔ اسپنسر نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے زبردست قلم نے کیا نفسانیات کیا فلسفۂ اخلاق کیا عمرانیات سب مین بیشتر مسائل کی دیوارین ارتقا کے اینٹ چونے سے اٹھائین۔ فلسفۂ یورپ مین جان سی پڑ گئی۔ ترقی کے راستہ پر جو علوم ٹھٹک گئے تھے آگے قدم ڈالنے لگے۔ قابل دماغ ہر شاخِ علم مین ارتقا کا پانی دینے لگے۔ زبان کا انسان سے چولی دامن کا بلکہ یون کہیے جسم و جان کا ساتھ ہے پس فلسفۂ زبان کا ارتقا کے اثر سے بچنا محال تھا۔ فلسفۂ السنہ نے بھی روپ بدلا اور بہت کچھ ترقی کی آئندہ مفید ہو سکتی ہے۔ مین چاہتا ہون کہ اُردو پر بھی مسئلۂ ارتقا کی روشنی پڑے۔ اُسکی گذشتہ تاریخ نئے اصول پر لکھی جائے اور اُسکی آئندہ ترقی کا بنیادی پتھر نئے مسائل پر رکھا جائے۔ اِس مضمون مین مین صرف سرسری نگاہ تاریخ اُردو پر ڈالون گا اور چند ترقی کی صورتون کی طرف اشارہ کرون گا۔ پوری طرح اِس کام کو انجام دینے کے لیے فرصت اور ضخیم جلدین درکار ہین۔

وسطی ایشیائی اقوام مین اسلامی تہذیب نے روح پھونکدی تھی۔ جوش و خروش کے ساتھ ساتھ لوگون مین بلند نظری اور عالی ہمتی پیدا ہو گئی تھی۔ تہذیب اسلام اس زمانہ مین موزون ترین اور بہترین تھی۔ بس اسلامی قومین اپنے گرد و پیش کی نسبتاً کمزور اقوام پر حاوی ہو جانے کی کوشش کرنے لگین۔ یہ ایک قدرتی بات تھی اور کامیابی ہونی ضروری تھی۔ چنانچہ محمود کی افواج قاہرہ نے ہندوستان کا دروازہ کھول دیا اور زبردست اقوام شمالی کی ہندوستان کی طرف چیونٹیون کی سی رو لگ گئی۔ مگر ان اقوام کی زبان مادری فارسی تھی یا ترکی۔ ہندوستان کے اُس حصہ مین جو اُن کا جولانگاہ رہا، فارسی و ترکی لفظ برج بھاشا مین ملنے لگے۔ اسطرح گویا محمود کے تاریخی حملون نے اُردو کا بیج بویا!

شہاب الدین غوری نے جس دن اسلامی جھنڈا پرانی دہلی مین اُڑایا اُسی دن سے تاریخ اُردو شروع ہوتی ہے۔ فاتح کی زبان جدا مفتوح کی بولی الگ۔ ناممکن تھا کہ مفتوح بالکل ہی اپنی زبان کو چھوڑ دیتے یا فاتح مغلوب کی بولی اختیار کرتے۔ ایسی صورت مین کاروبار چلتے تو کیونکر؟ اظہار و تبادلہ خیالات ہوتا تو کس ذریعہ سے؟ آخرکار لین دین اور بول چال مین رفتہ رفتہ پٹھان بھاشا اور ہندو فارسی کے لفظ ملانے لگے۔

قانونِ انتخاب قدرت نے ایک زبان زمانہ کے ڈول کے مطابق ڈھالنی شروع کی۔ کسی نئی زبان کا بن جانا کچھ کھیل تو ہے نہین برس نکلتے رہے پشتین گزرتی رہین زبان کا پودہ آہستہ آہستہ پھوٹنے لگا۔ ایک نئی زبان محسوس ہونے لگی۔ امیر خسرو نے پہلے پہل اِس پر نظر توجہ کی۔ اُن کے بعد زبان تو ضرور آگے بڑھتی رہی مگر ہندوستان کی آئے دن کی لڑائیون اور اندرونی فسادون نے حسب دلخواہ ترقی نہ ہونے دی۔ اور کوئی ایسا شخص نہ نکلا جس کا اُردو کلام یا تحریر ہم تک پہنچی ہو۔ ہوتے ہوتے سلاطین مغلیہ کا دور دورہ ہوا۔ ملک مین ایک حد تک امن قائم ہوا۔ اوّل اوّل

توفارسی کا بہت زور و شور رہا۔ بادشاہ سے لیکر اکثر سپاہیوں تک کی رگوں میں تازہ ولایتی خون دوڑ رہا تھا۔ گو یہ ناممکن تھا کہ اپنے گرد و پیش کا اثر قبول نہ کرتے۔ کچھ اثر اُن پر ضرور ہوا۔ لیکن اُن کی نسلیں بعد کی آب و ہوا میں پیدا ہوئیں پھلیں پھولیں۔ اُن کے لیے ایران افغانستان اور ترکستان میں وہ اصلی دلچسپی کس طرح ہو سکتی جو اُنکے باپ دادا کو تھی۔ جس آب و ہوا میں پیدا ہوئے ہوش سنبھالا جن صحبتوں میں ہنسے بولے اُن کا اثر قبول کرنا ایک ہونی بات تھی انھیں فارسی سے ویسی دلچسپی نہ رہی، ایران کی میٹھی میٹھی بولی طبقۂ عوام میں اوپری معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ شاہجہان کے زمانہ ہی میں اُردو بازاروں سے شرفا کی ڈیوڑھیوں تک جانے لگی اور کہیں کہیں خانقاہی صحبتوں میں بھی اُسے بار ملنے لگا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور دریائے سندھ کے اُس پار سے آمد و رفت کم ہونے لگی فارسی گھٹنے اور اُردو بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ ایک وہ مبارک دن آیا کہ ولی نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اُردو شاعری کا پودہ لگایا۔ حاتم فغان اور آرزو نے پانی دیا، آب و ہوا راس تھی لوگوں کو قدرتی میلان تھا ہی۔ دہلی کے ہر گلی کوچے سے غزل کی صدا آنے لگی، سودا کی بلند پروازیوں نے فارسی قصیدوں کا چربہ اُتارا، میر کی دلکو لگتی باتوں اور سیدھی سادھی اُردو نے سعدی کی غزل کا ڈول ڈالا درد کی غائر نظر نے اُردو میں تصوف کا رنگ جمایا، میر حسن کی بےنظیر مثنوی نے زبان کو اور وسعت دی۔ اُس زمانہ میں لکھنؤ میں شعر و سخن کی بے انتہا قدر تھی۔ دہلی وہ دہلی نہ رہی تھی شعرا جوق جوق لکھنؤ پہنچنے لگے یہاں تک کہ میر بددماغ نے بھی لکھنؤ کو شرف بخشا۔

نظم اُردو کے اِس تاریخی بیان کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک بات قابلِ غور ہے۔ دورانِ ارتقا میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی ظاہراً رُکی جاتی ہے اور پرانی باتیں تازہ ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔ "علم الحیات" میں اِسکو اصول رجوع الی الاصل سے تعبیر کیا جاتا ہے جسمِ حیوانی کے مدارج ترقی کا سراغ لگانے میں اسکی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اچنبھا سا ہوتا ہے۔ مسٹر ڈارون نے اپنی کتاب "ابتداء الانواع" میں اس بارے میں چند حیرت انگیز امور لکھے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی نوع سے مختلف اقسام کے صورت پذیر ہونے کے دوران میں بعض بچے کئی کئی پشت کے بعد اپنے کسی جدِ اعلیٰ کی آنکھ چونچ رنگ اور پر پرزے نکالتے ہیں۔ افرادِ انسانی میں باپ دادا کا ہم صورت و ہم عادت ہونا محتاجِ ثبوت نہیں۔ قومیں بھی بہ حیثیت مجموعی اِس قانون سے بری نہیں۔ پانچ سو برس اور سلا نے روما میں بادشاہت کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ جولیس سیزر نے تاج نہ قبول کیا لیکن حقیقت میں بادشاہ بن بیٹھا۔ لوگوں نے اُسکی شخصی حکومت محسوس کی اور دفعتاً قدیم جمہوری اُصولوں کی طرف مائل ہوئے اور نئے سرے سے پُرانی طرزِ حکومت قائم ہوئی۔ قدیم باتوں کی طرف عود کرنا چند روزہ ہوتا ہے مگر بہت ہی کارآمد۔ ذرائع ترقی میں کچھ جان سی پڑ جاتی ہے اور صدیوں کی ترقی برسوں میں ہونے لگتی ہے۔ ترقی السنہ پر بھی یہ قانون ٹھیک بیٹھتا ہے۔

تاریخ اُردو کے جس درجہ تک ہم نے اپنا سرسری بیان پہنچایا ہے اُس سے آگے شعرائے اُردو بالکل فارسی کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ جنکو میر اور درد کے کلام اور خیالات کی سادگی و اصلیت کو نظر انداز کر کے شاعروں نے اُن کے سخن کے اُس پہلو کو مدِ نظر رکھا جس میں فارسی کی جھلک تھی۔ مصحفی، آتش، ناسخ، نسیم لکھنؤ میں، شاہ نصیر، ذوق، مومن غالب دہلی میں، فارسی خیالات میں کم و بیش ڈوبے نظر آتے ہیں مرزا نوشہ کا حال تو سب جانتے ہیں کہ فارسی نے انھیں ایسا گرویدہ کیا کہ اُردو کو ننگ سمجھتے رہے اور اپنی بےنظیر و خداداد قابلیت کو ایک غیر زبان میں جس کا ہندوستان میں دوبارہ زندہ ہونا ناممکن تھا صرف

کیا فارسی کی رنگینی بلند پروازی موشگافی اور ترکیبون کی بھرمار سے اُردو اور شستہ و فصیح و بلیغ ہوگئی ہے لفظ اُردو کے قالب مین ڈھل گئے بیسیون پاکیزہ و نفیس محاورے بن گئے۔ نازک سے نازک خیال پوچ گویان ہند اپنی مادری زبان مین انتہائے لطافت و فصاحت سے ادا کرنے لگے۔ ہماری مادری زبان اسطرح شستہ و پاکیزہ ہوکر اُس خلاء اداء دماغ کیلئے تیار ہوئی جو اُس زمانے مین مرثیہ گوئی کی مشق کر رہا تھا اُسکے پاک جذبات اور پاکیزہ خیالات اُسکی جولانی طبع اور نازک خیالی اُس کا مذاق سلیم اور قدرتی ملکہ شاعری اُس کی باریک بین نظر اور اُسکی ستھری منجھی ہوئی زبان نے اُردو کو آسمان پر جا بٹھایا۔ اُردو اُردو ہوگئی اور شاعری مین آج دنیا کی کسی زبان سے ہیٹی نہین میرانیس کا یہ کہنا ہے

مری قدر کر اے زمین سخن　　تجھے بات مین آسمان کر دیا
سُبک ہو چلی تھی ترازوے شعر　　مگر ہم نے پلہ گران کر دیا

نری شاعرانہ تعلّی نہین بلکہ ایک امر واقعی ہے۔ اُردو مین ابتک صرف حسن و عشق کے راگ گائے اور بلبل و گل کے فسانے دہرائے جاتے تھے۔ زلف و جعد کے ستم بیان اور دہن و کمر کے معمے حل کیے جاتے تھے۔ بادشاہون اور امیرون کی بیجا مدحت یا بیہودہ لفاظی و بے نتیجہ موشگافی ہوتی، مثنویون مین شرم کا پردہ اُٹھتا اور دیو پری کا قصہ ہوتا۔ انیس کے مرثیون نے سرشت انسانی کے اُن پاک سوتون کو کھولا جو افضل ترین جذبات اور اعلیٰ ترین خیالات کے منبع ہین۔ سچ تو یون ہے کہ جس طرح فرقہ پیورٹن کے طفیل انگریزی کو ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ ملی اُردو کو مذہب تشیع کی بدولت مراثی میرانیس نصیب ہوے۔ ایک دن زمانہ آنے والا ہے کہ میرانیس کے مراثی شکسپیر کے ناٹکون کی طرح پڑھے جاینگے اور اُنھین پر اتنی ضخیم جلدین لکھی جائینگی جن کے پڑھنے کے لئے عمر طبعی کافی نہ ہوگی۔

انصاف کا خون ہوگا اگر یہان اُس اُستاد یگانہ کا ذکر نہ کیا جائے جس کا نام ہمارے دماغون مین میرانیس کے نام کے ساتھ حافظہ لا کر اکرتا ہے۔ مرزا دبیر اور میرانیس ایک باغ کے دو پودے ہین۔ دونون نے ایک ہی ہوا اور ایک ہی نہر کے پانی سے نشو و نما پائی۔ دونون نے اُردو پر گرانبہا احسانات کیے۔ فرق ہے تو صرف اتنا جتنا کہ شکسپیر اور بن جانسن مین تھا۔ میرانیس جہان اُستاد تو دبیر اُردو کے بڑے شاعر۔ اگر کوئی ایسا جلسہ ہوتا جہان دنیا کے بڑے بڑے شاعر زندہ ہو کر جمع ہون تو وہان ہماری طرف سے یہی دو شخص ہون گے انیس اور دبیر۔ انیس پہلے اور دبیر دوسرے۔

میرانیس کے بعد جو دور شروع ہوا اُس مین شاعر پھر سادگی کی طرف مائل ہوے۔ یہ دور ابھی ختم نہین ہوا۔ داغ اور امیر نے زبان کو اور جلا دی۔ داغ کے کلام نے زبان کو نتھار دیا اور دلون مین چٹکیان لین طبیعتون کو گرمایا۔ امیر نے زبان کو سنجیدہ اور متین بنایا خیالات کو کریدا اور نازک خیالی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ مگر ان دونون سے زیادہ قابل قدر اور نتیجہ خیز کام اُس بابرکت شخص نے کیا جس کے قلم سے "مسدس مد و جزر اسلام" نکلا۔ مولانا حالی نے اُردو شاعری کو حسن و عشق کے تنگ کوچے سے نکال کر اصلیت و واقعیت کی شاہراہ پر ڈالا۔ یہ زمانہ انگریزی کے اُس زمانہ سے مشابہ ہے جبکہ پوپ کے اثر سے انگریزی مین لفاظی اور بناوٹ بے انتہا آگئی تھی۔ ہنوور خاندان کے زہر پر اثر سے شاعری مین ناپاک اور پوچ خیالات کے سوا کچھ نہ تھا۔ کوپر کی نظمون نے اُس دور کا خاتمہ کیا۔ مولانا حالی نے بھی اسی طرح اُردو کا رخ پھیر دیا۔

نثر اُردو کی تاریخ ابھی بہت مختصر ہے۔ یہی وہ میدان ہے جس مین بہت کچھ کرنا ہے اور جس پر زبان کی آئندہ وسعت و ترقی کا دار و مدار ہے مین تاریخ نثر اُردو کو دو دورون پر آسانی کے لیے تقسیم کیے دیتا ہون

پہلے دور کی ابتدا میر امّن دہلوی کی "باغ و بہار" سے ہوئی۔ میر امّن کی سیدھی سادھی ٹھیٹ اردو اور ہیر پھیر سے خالی طرزِ بیان ہمیشہ دلچسپ رہیگا۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن مجید بھی اُسی دور کی یادگار ہے۔ اُردو نثر کے محققوں کو آئندہ اِس ترجمے سے بڑی مدد ملے گی اُسی زمانہ میں خواجہ امان نے بوستانِ خیال کا ترجمہ کیا۔

رقعات غالب پر پہلا دور ختم ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے عجیب خوبی کے ساتھ اُردو کی سادگی میں فارسی کی ترکیبیں ملائیں مگر جو بات اُن کو دوسرے دور سے ملاتی ہے وہ اُن کا بے تکلف مطابق قدرت پیرایۂ ادا ہے۔ تعجب اِس پر آتا ہے کہ نئی طرزِ تحریر کا اُردو میں بانی وہ شخص ہے جو ہمیشہ فارسی کا شیدا اور اُردو کو حقارت سے دیکھنے والا تھا۔ دیکھیں اِس راز کے حل کرنے میں بھی کچھ مسئلۂ ارتقا جس کے اصولوں پر ہم نے اِس مضمون کی بنا ڈالی ہے مدد دیتا ہے یا نہیں۔

ہم اپنے باپ دادا سے صرف گوشت پوست صورت شکل ہی ورثہ میں نہیں پاتے بلکہ بہت سے آبائی دماغی خصائل جذبات و میلان ماں کے پیٹ سے لاتے ہیں۔ مرزا غالب کا غیر معمولی رُجحان فارسی کی طرف اور اُس کا صحیح مذاق میری رائے میں موروثی اثر تھا۔ علاوہ اسکے یہ بھی یاد رہے کہ وہ اُس عہد میں پیدا ہوے جبکہ عموماً لوگ فارسی کی طرف مائل تھے جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ غالب کے موروثی میلان کو زمانہ کے رُخ نے حد کو پہنچا دیا۔ لیکن غدر کے بعد فارسی بہت کم ہوگئی کیونکہ علوم کا وہ چرچا ہی نہ رہا تھا۔ بول چال میں مدت سے اُردو تھی۔ عام خط و کتابت میں کم و بیش اُردو برتی جانے لگی مرزا غالب کا اپنے گرد و نواح کے اثر سے بچا رہنا قانون قدرت کے خلاف تھا۔ انھوں نے بھی خطوں میں اُردو لکھی اور چونکہ لاجواب دل و دماغ لائے تھے اور مذاق صحیح پایا تھا۔ اردو عبارت میں وہ ڈول ڈالا جو نئے زمانہ کے مطابق اور اپنا آپ ہی نظیر تھا۔

دورِ دوم میں مولانا آزاد کو میں پہلے رکھونگا۔ اُنکی طرزِ تحریر میں فارسی کا اثر بہت کچھ باقی ہے۔ اُنھوں نے فارسی کی رنگینی کے ساتھ ساتھ سیدھی سادھی اُردو کو ہاتھ سے نہ دیا۔ ظہوری کی لفاظی اور قافیوں کی تتبع نہ کی مگر نفیس استعاروں اور سُتھری تشبیہوں کو نہ چھوڑا۔ اُن کی نثر اچھی خاصی شاعری ہے۔ آبِ حیات نے نثر اُردو میں لطافت نفاست و فصاحت کا عجیب و غریب نمونہ پیش کیا۔ دربار اکبری میں مولانا آزاد نے اپنی طرزِ تحریر سے واقعاتِ تاریخی کا لطف دوبالا کیا۔ سخندانِ پارس سفلالوجی میں اگر علمی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کی نہ ہو تو بھی اُردو میں تو یقیناً اپنی قسم کی ایک ہے۔

مولانا آزاد کے بعد سر سید کا نمبر ہے۔ میرے خیال میں نثر اُردو میں جو اُن کا رتبہ ہے وہی اُن کی زندگانی جاوید کے لیے کافی ہے جبکہ ہندوستان سے عموماً تصنیف عنقا تھی اور اُردو میں کسی مصنف کا پیدا ہونا جتنا تعجب خیز ہوسکتا ہے قابلِ غور ہے۔ سر سید جن لوگوں میں پیدا ہوے جن رنگوں میں رہے وہ روز بروز بدل رہے تھے۔ معمولی دماغ کا آدمی پرانی سوسائٹی کے آہستہ مگر یقینی زوال کو اُسوقت تک کبھی محسوس نہ کرتا جب تک دفعتاً تہذیب قدیمہ کی عمارت زمین پر نہ آرہتی۔ سر سید کی سی قابلیت کا شخص ناممکن تھا کہ واقعات بیّن کو دیکھتا اور نہ سوچتا۔ پرانی تہذیب کا دن آ لگا تھا اور غدر کے بعد تو مغربی خیالات نے نہایت سرعت سے پڑھنے لکھنے اُٹھنے بیٹھنے کھانے پینے اوڑھنے پہننے چلنے پھرنے غرض ہمارے تمام معاشرتی (سوشیل)، پولیٹکل دماغی اور اخلاقی حالت میں حیرتناک تبدیلی پیدا کر دی۔ کوئی سن رسیدہ بزرگ اس پر گردن ہلا ئیں تو میری اُن سے باادب درخواست ہے کہ اپنے ولایت رفتہ عاجز لڑکے کی زندگی کو اپنی زندگی سے ملائیں اور پھر . . . . . خیر تو سر سید نے تبدلات زمانہ کو سب سے پہلے محسوس کیا اور ساتھ ہی یہ بھی ٹھیک ٹھیک نتیجہ نکالا کہ ہماری بہبودی مغرب کی عاقلانہ تقلید کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں

اس خیال کے پختہ ہونے کی بڑی وجہ مسلمانوں کا ناگفتہ بہ افلاس اور روز افزوں ادبار تھا۔ بزرگ سید کے دل پر امت محمدی کی حالت دیکھکر غم و اندوہ کے نشتر چلنے لگے۔ انھوں نے ٹھان لی کہ کچھ ہی ہو اپنی طرف سے اسلامیوں کی حالت سنوارنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھوں گا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے مغربی تہذیب کو سمجھا اور پرکھا سمجھا مگر صرف سمجھنے سے اصلاح قوم ممکن نہ تھی۔ خیالات کا اظہار ضروری تھا۔ اس کے لیے اردو سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس طرح اردو میں لکچر دینے لگے اور پھر تہذیب اخلاق میں انکے مضامین اور ان اصحاب کے جن پر انکا رنگ جم چلا تھا نکلنے لگے۔ انکی نفیس کتاب خطبات احمدیہ نے اردو داں حضرات کی آنکھیں کھول دیں کہ اردو میں بھی عالمانہ مطالب ادا ہو سکتے ہیں۔ خطبات کا بیان صاف و پرزور زبان ٹھیٹ اور ستھری خیالات محققانہ و تعصب سے بری ہیں۔ خطبات میں سر سید کی نو فکری کی کافی جھلک موجود ہے۔ مگر ان کی جدت طرازی تفسیر میں کماحقہ ظاہر ہوئی۔ للہ آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں تفسیر میں ان کا ہم خیال ہوں ہم خیال ہونا نہ ہونا اور بات ہے میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ سر سید فی الحقیقت معتقد تھے اور انھوں نے جو کچھ سوچا سمجھا اسکو نیک نیتی اور بےباکانہ آزادی کے ساتھ اپنے نرالے پرزور طرز میں ادا کر دیا۔ ان سے جو لغزشیں ہوئیں ہیں یہاں ان سے بحث نہیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ان کی نامکمل تفسیر اردو کی پہلی تصنیف ہے۔ اور سر سید پہلے مصنف ہیں جو مسلمانوں میں دو تین صدی کے بعد پیدا ہوے۔

مولانا حالی کی سادہ شستہ اور رواں تحریر کا بھی بڑا اثر اردو ادب پر ہوا۔ مولانائے موصوف پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں تنقید کی ابتدا کی۔ مقدمہ شاعری اور یادگار غالب کے پاکیزہ محاکمے اردو میں اپنی آپ ہی نظیر ہیں۔ مقدمہ، یادگار غالب اور حیات جاوید اردو ادب کے نہایت قیمتی نمونے ہیں۔ اسی طرح مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان، الغزالی، الکلام وغیرہ نے اردو کو تاریخی معلومات اور عالمانہ تنقید سے مالا مال کیا۔ اردو میں ناول کی جو مٹی پلید کی گئی اور کی جا رہی ہے اس کو وہ خوب سمجھتے ہیں جنھوں نے اسکاٹ، ڈکنس اور اسٹیونسن وغیرہ کے ناول پڑھے ہیں۔ ناول کی اصلیت کو صرف اس شخص نے سمجھا جس کے زبردست مذاق قلم سے ابن الوقت، فسانۂ مبتلا اور ہمارے گھروں کی بولتی چالتی تصویریں یعنی مراۃ العروس اور بنات النعش جیسے ناول نکلے۔ مولانا نذیر احمد کا ترجمہ کلام مجید بھی یادگار رہے گا۔ مولانا سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ لکھکر اردو پر بڑا بھاری احسان کیا اور پہلی عمدہ اور نفیس لغت کا سہرا انکے سر رہا۔ مولوی سید علی بلگرامی نے تمدن عرب کا نہایت پاکیزہ ترجمہ کیا۔ لطف یہ ہے کہ اتنی ضخیم کتاب میں شروع سے آخر تک زبان سادہ و شستہ اور طرز تحریر یکساں چلا گیا۔ سید بلگرامی کا ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اردو کی ایک تصنیف کا دھوکا ہوتا ہے۔

مضمون پھیلتے پھیلتے ایک دفتر ہو گیا اب میں ان وسائل کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جن سے اردو کی ترقی ممکن ہے۔ گزشتہ کے بیان کے خاتمہ پر انصاف مقتضی ہے کہ اردو اخباروں اور رسالوں کی طرف بھی کچھ اشارہ ضرور کیا جائے۔ اخباروں میں اودھ اخبار اور پیسہ اخبار نے اپنی بساط کے موافق اردو کی خاصی خدمت کی اور انکی دیکھا دیکھی تمام ہندوستان میں اچھے برے اخبار شائع ہونے لگے۔ رسالوں میں "مخزن" نے تعلیم یافتہ احباب کے لیے ایک نیا رستہ نکالا اور رسالوں میں طرز جدید کی بنا ڈالی۔ کئی رسالے اِن کے قدم بقدم چلے اور بہت کچھ اردو کی خدمت کی۔

حکمت قدرت کا ایک قانون یہ ہے کہ وہی جاندار ترقی کر سکتے ہیں جو اپنے گرد و پیش کے تغیر پذیر سانچے میں ڈھلتے چلے جائیں۔ انسان حیوانوں سے یوں افضل ہے کہ وہ بے بس بے زبانوں کی طرح صرف

ڈھلتا ہی نہین جاتا بلکہ اپنے آپ کو ڈھالتا جاتا ہو اور تمام تبدیلیون کو سمجھتا اور اپنے گرد و پیش مین خود بھی تغیر پیدا کرتا ہو - اِس ہمہ گیر تغیر مین اگر انسان کی کوئی ضروری اور کار آمد شے نہ بدلے اور نئی حالت کے مطابق نہ ہو تو وہ صرف ایک نقص اور عیب ہی نہ ہوگی بلکہ آئندہ ترقی مین بہت کچھ رکاوٹین پیدا کرے گی - اِس وقت مسلمانون کی حالت کو لیجئے - ہم لوگ خدا خدا کرکے اب اُس نیند سے چونک تو گئے ہین جس مین پڑے ہوئے خواب دیکھ رہے تھے اور نئی حالت نئے اسباب گرد و پیش کے مطابق ہونے کی کچھ کچھ کوشش کر رہے ہین مگر ملاحظہ ہو کہ مسلمان نوجوان کالجون مین مختلف علوم حاصل کرتے ہین انگریزی مین سیکھتے تو دفتر کے دفتر نئے علوم پر لکھ مارین مگر اپنی مادری زبان مین بالکل گونگے اور بے بس ہوتے ہین - اُردو مین سچے علمی مضامین کا مفقود ہونا ہمارے دعوے کا بین ثبوت ہو - ظاہر ہو کہ یہ کتنا بڑا نقص اور ہماری مجموعی ترقی مین کتنی بڑی رکاوٹ ہو - اگر اپنی مادری زبان ہم اُردو ہی رکھنی چاہتے ہین تو ہماری ترقی مکمل اسوقت تک ہرگز نہ ہوگی جب تک موجودہ علوم ہماری زبان مین انگریزی فرنچ یا جرمن کیطرح نہ آجائین اِس مین شک نہین کہ ایک دن اُردو کا علوم سے مالامال ہونا بالکل قرین قیاس ہی اگر اُسے ارتقاے قدرتی کے رحم پر چھوڑ دین اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہین - ایسا ہونا ممکن ہو مگر کب؟ دوسرے یہ کہ ایسی صورت مین ہمنے انسان ہوکر کیا تیر مارا؟ ہمارا فرض ہو کہ اُردو مین نئے علوم کی اصطلاحین گڑھین یا اور زبانون سے مستعار لین الفاظ کے معنی قائم کرین - زبان کے قواعد منضبط کرین اور اِس طرح آئندہ نسلون کی جولانی طبع اور علمی تحقیقات کے لیے رستہ صاف کر دین بس پہلی صورت اُردو کی ترقی کی یہی ہو کہ اُسکو علمی زبان بنا دین. اِسکی ابتدا یون ہو سکتی ہو کہ سینٹفک رسالے شائع کیے جائین - اُنمین مختلف علوم پر مضامین لکھے جائین اور نئی اصطلاحین قائم کی جائین

مولوی محمد علی صاحب ایک سِن رسیدہ قابل قدر شخص حیدر آباد مین اُنھون نے کیمسٹری کی اصطلاحین بنائین اور ایک رسالے کی صورت مین چھپوا دین - ناقدری اور بے توجہی کے باعث وہ رسالہ بکا بھی نہین مجھے کچھ اصطلاحون اور گاسون کے نام یاد ہین - ملاحظہ ہو اور انصاف کیا جائے - آکسیجن = علیون، ہیڈروجن = حیتون، کاربن = اکربون، ہیڈرو کلورک ایسڈ = حسی قلون مین الحاد - ہر ایک کی وجہ تسمیہ بھی اُنھون نے لکھی ہو اور اِس مین شک نہین کہ کمال کیا ہو - سر خورشید جاہ بہادر مرحوم و مغفور نے نیچرل فلاسفی کی ایک کتاب کا ترجمہ اُردو مین کروایا - جو رسالہ شمسیہ کے نام سے چھپا - اِس مین بھی مترجم صاحب نے بہت سی اصطلاحین گڑھی ہین چنانچہ الیکٹرسٹی کے لیے برق اور الیکٹرک بیٹری کے لیے مورچۂ برق فرماتے ہین - مگر یہ شخصی کوششین تھین اگر سب مل کر کمر ہمت باندھ لین تو کامیابی نہ ہونا کیا معنی -

خاتمہ پر صرف اتنا اور عرض کرون گا کہ زمانے کے تیور زبان حال سے کہہ رہے ہین کہ ایک دن ہندوستان مین راس کماری سے ہمالیہ کی چوٹی اور دریاے سندھ سے برہمپتر تک ایک زبان بولی جائے گی - مختلف زبانین اپنے اپنے بچاؤ اور ہندوستان پر چھا جانے کی کوشش کر رہی ہین - جو زبان ہندوستان کی روز افزون سوشل و پولٹیکل اور حالت کے مطابق ترین اپنے کو ثابت کرے - وہی نئے ہندوستان کی مالک بنے گی - اور زبانین خواہ سنسکرت جیسی وسیع اور پختہ یا فارسی جیسی شیرین و دلکش کیون نہ ہون مردہ زبانون مین شمار ہون گی کوئی وجہ نہین کہ ہماری ہونہار زبان اِس ترقی کی دوڑ مین پیچھے رہے - اگر سب محبانِ اُردو یکجہتی اور ایمانداری سے اپنی قابلیتین اُسکی ترقی مین صرف کرین تو قیاس کہتا ہو کہ میر انیس کی جیتی زبان تمام ہندوستان مین اُسیطرح اپنا سکہ جاری کرے گی جسطرح شکسپیر کی پیاری زبان نے برٹانیۂ اعظم [illegible] مین اپنی حکومت کا پھریرا اُڑایا -

یوسف قریشی (علیگ)

العصر

(تقریر)

عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر، ایم اے، بیرسٹرایٹ لا، صدر انجمن استقبالی اُردو کانفرنس لکھنؤ

حضرات وخواتین!

مجلس استقبالی کی صدرنشینی کے اعزاز کو جو میرے واسطے وجہ افتخار ہوا اور میری علمی تہیدستی کے باوجود مجھے دیا گیا ہے میں نے بشکر گذاری قبول کیا تھا اور آج بھی مسرت و نازش کے ساتھ اہلِ لکھنؤ کی جانب سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں علم سے وہ ارادت مندی اور وہ خالص محبت جس نے آپ صاحبوں کو دور دراز فاصلوں سے لاکر یہاں مجتمع کیا۔ بے شبہ ایسا قابل قدر جذبہ ہے کہ زیادہ پُرشکوہ محفلین بھی جس کی محتاج ہین۔ مین امید کرتا ہون کہ یہ جذبہ جو بغیر تفریقِ مذہب و ملت، اہل ہندوستان کی ملکی اور علمی کوششِ اصلاح پر مبنی ہے روز افزون ترقی کرتا رہے گا۔

انجمن ترقی اُردو

قبل اسکے کہ مین کچھ اور عرض کرون مناسب ہے کہ انجمن ترقی اُردو کی نہایت مختصر سرگذشت آپ کے سامنے اعادہ کردی جائے کیونکہ ہر چند یہ مضمون پامال ہو پھر بھی ہمارے سلسلۂ بیان کی ابتدا اُسی سے ہونی چاہیئے۔

یہ انجمن قایم ہوتے ہی یکے بعد دیگرے اپنے تین حامی اہلِ علم و فضل مین مشہور اور محسنین قوم مولانا شبلی مرحوم، مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی اور مولوی عزیز مرزا مرحوم کے آغوش محبت مین پرورش پاتی رہی۔ باایں ہمہ قوم کی بے التفاتی کا اُسے ہمیشہ شکوہ رہا اور جیسا کہ ہمارے لائق سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کی مشرح رپورٹون بابت سنین ۱۹۱۳ و ۱۴ و ۱۵ء کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے تقریباً

دس برس اُنکی حالتِ اُمید و بیم نے سب کو متردد رکھا مگر ان مشکلات مین بھی اُن صاحبون نے جو اِسکے قیام کے بانی تھے ہمّت نہ ہاری اور خصوصاً گذشتہ تین سال مین نہایت سرگرمی اور استقلال کے ساتھ اُسکی بقا اور استحکام کی ہالحے موجودہ سکرٹری اور اُن کے بعض احباب برابر کوشش کرتے رہے۔ اُن کی پُراثر اور دلسوز تحریرون اور تقریرون کا آخر کچھ نہ کچھ ثمرہ بھی مل گیا اور سرکار نظام، ریاستِ بھوپال اور بعض دیگر باثروت حضرات نے اُنکی سرپرستی منظور فرما کر اُسے دوبارہ زندگی عطا کی۔

قومیت کی تعلیم اور زبان یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا مین کوئی قوم نامور اور کامیاب نہین ہوسکتی جب تک کہ اُس کا ہر فرد قومی خودداری کو اپنی جان سے زیادہ عزیز نہ رکھے۔ خودداری کا یہ احساس یا اُسکی حفاظت صرف صحیح تعلیم پر منحصر ہے۔ اور ہم مین یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ اپنی قومی ضروریات کے لحاظ سے جن کو ہم ہی سمجھ سکتے ہین اس تعلیم کے وسائل تلاش کرین۔ اس وقت افسوس ہے کہ جنگ یورپ نے دنیا کو ایسا ہلا رکھا ہے کہ ہم اطمینان کے ساتھ اپنے قومی فوائد کی طرف متوجہ نہین ہو سکتے مگر ہم یہی شکرگزار ہین کہ اس زمانۂ رستخیز مین برطانیۂ عظمیٰ کے طفیل امن و امان سے ہم آج جمع ہین اور اپنے اسباب ترقی پر غور کر رہے ہین۔ اِنہی اسباب مین سب سے اہم شے جس پر ہندو مسلمانون کی دنیوی ترقی کا انحصار ہے، زبان ہے، حکیم ارسطو نے قومیت کی تعریف مین ایک زبان کا ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ قومی اغراض کی تکمیل کے واسطے اگر ایک زبان نہ ہوگی تو یکجائی ایک طرف مبادلۂ خیالات مین بھی سخت دشواریان پیش آئین گی۔ اور جبکہ ہندو مسلمانون کو بہ حیثیت ایک ہی قوم کے حدود ہندوستان مین رہنا ہے تو اُن کے لیے ناگزیر ہے کہ ایکدلی اور یکجہتی کے ساتھ اُن شرائط کی پابندی کرین جو قوم کی تعریف مین داخل ہین یعنی زبان ایک ہو، خیالات ایک ہون، حالات تاریخی مین اتحاد ہو، آئین و قوانین ایک ہون، مذہب ایک ہو وغیرہ وغیرہ۔ اب سوائے مذہب کے اور کسی شرط مین ایسا اختلاف نہین ہے جو اصلاح پذیر نہ ہو سکے۔ گو زبان کے متعلق بعض متنازعون نے بظاہر مسلمانون کو اُردو کا خاص حامی بنا رکھا ہے مگر وہ کون ہندو یا مسلمان ہوگا جو اُردو کے ہندوستانی یا ملکی زبان ہونے سے انکار کرے۔ مسلمان اُسے اپنے قدیم وطن ایران توران یا عرب و عراق سے لے کر نہین آئے تھے۔ وہ ہندوستان ہی مین پیدا ہوئی اور اہل ہند کی، ہندو ہون یا مسلمان، گودون مین اُس نے نشو و نما پایا۔ اور آج ہندوستان کے مختلف حصّون مین اگرچہ دوسری زبانین بولی جاتی ہین مگر اُردو ہی ایسی زبان ہے جو تمام ملک پر حاوی ہے۔ اِس کا جاننے والا ہر حصّۂ ملک مین بآسانی کاروبار اور بود و باش اختیار کر سکتا ہے۔ جہان پنجابی، بنگالی، دکنی غرض ہر صوبے اور علاقے کے آدمی جمع ہون گے وہان سوائے اُردو کے اور کسی ملکی زبان مین مبادلۂ خیالات غیر ممکن ہوگا۔ اسکے علاوہ اپنی بناوٹ اور قواعد کے اعتبار سے تمام ہندوستان مین اُردو ہی ایسی زبان ہے جو بآسانی دوسری زبانون کے الفاظ قبول کر لیتی ہے اور جس مین علمی زبان بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت موجود ہے۔

اس موقع پر مجھسے یہ اظہار تاسف کیے بغیر نہین رہا جاتا کہ گو آجکل قوم پرستی اور وطنیت کا ہنگامہ بڑھ گیا ہے اور ہماری سیاسی مجالس نے آزادی و خودمختاری کے مطالبون کا شور مچا رکھا ہے لیکن ابھی تک اِس مسئلہ پر اُنھون نے کوئی التفات نہین کی کہ اگر ہمین عام اور تمام اہل وطن کو ایک قومی حکومت کے دائرے مین لانا ہوگا تو اس متحدہ قومیت کی تہ بنیاد کون سی زبان ہوگی؟ اور اُس پیچ دہ مگر روز افزون اختلاف کو جو ترقی تعلیم اور دعوی روشن خیالی کے باوجود بدنصیبی سے تعصب نے زبان کے معاملے مین پیدا کر دیا ہے مٹانے کی کیا سبیل نکلے گی؟!

قومی اتحاد کا حقیقی وسیلہ خوشی کی بات ہو کہ اس جلسے مین ہندو مسلمان دونون قومین شریک ہین اور یہ اُن کی بے تعصبی کا نہین بلکہ ملک اور قوم کی سچی بہی خواہی اور راست روی کا ثبوت ہو کیونکہ اگر انصاف و معقولیت سکھانے والی تعلیم پاکر بھی ہم تعصب کی خوفناک بلا سے آزاد نہو سکے یا اُس بے گناہ زبان کی مخالفت کرتے رہے جس نے ملکی اتحاد کے راستے پر چلایا اور ہمین درحقیقت ایک قوم بنانا چاہا تھا، تو میرے خیال مین پھر نیشنل کانگرس ہو یا مُسلم لیگ کسی کی وقعت بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہو گی۔ ایسے ہمدردانِ وطن سے تو کہین زیادہ تاملِ اندیش اور قابل فخر ملک پرست شاید وہ مسلمان تھے، جنھون نے زمانۂ حکومت مین اپنی قومی زبانین عربی، ترکی، فارسی، ترک کردین اور ہندستانی اُردو کو اپنی مادری زبان بنالیا تھا پس حامیانِ لیگ و کانگرس اگر وہ کیماولی کے شاگرد نہین ہین اور بے ثبات پولٹیکل اتحاد کے بجاے واقعی اہل ہند کے دلون کو اِسطرح متحد کرنا چاہتے ہین کہ ارد وطن کے تمام فرزند ہندو ہون یا مسلمان پارسی ہون یا عیسائی، سب مین قومیت کی سچی روح پیدا ہو جائے اور اُن کی ہندوستانیت دنیا مین ممتاز و نمایان ہو کر چمکے ـــــــ تو اُن کو سب سے پہلے اپنی زبان کی بقاو استحکام کی کوشش اور اِس قسم کی جملہ ضروریات جو کسی فرقے سے تعلق نہین رکھتین بلکہ قومِ ہند پر حاوی ہین، اُن کے مہیا کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ مثلاً ایک مرکزی دار العلوم (یونیورسٹی) یا مقامی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ابتدائی درس گاہون کا قیام جن مین تمام علم و فن کی تعلیم ملکی زبان مین ہوا کرے۔ یہ اہم امور جن پر میری رائے مین ہندوستان کی فلاح و بہبود کا انحصار ہو نہایت اطمینان کے ساتھ غور و فکر کے محتاج ہین۔ اور اگرچہ ایسی تجاویز کا عملی صورت مین آنا ابھی تک خواب و خیال معلوم ہوتا ہو لیکن اس وقت ہندوستانی علم ادب کو درجہ کمال پر پہنچانے کی خواہش ہی بذات خود اہل ہند کی بیداری اور بہتر پذیری کی بڑی حوصلہ افزا دلیل روشن ہوگی کیونکہ سب جانتے ہین کہ اِس دَورِ جدید مین قومون کی ساری عظمت و امتیاز کا سرچشمہ اُن کا علم و ادب ہوتا ہو۔

علم ادب کی منزلت دارا و سکندر کی تلوارون کا اور تیموری یلغارون کا زمانہ گذر چکا اب جس قوم کو اعزاز و سربلندی کی آرزو ہو وہ ویدرو کا قلم اور والٹیر کی زبان پیدا کرے کہ اِنھین حقیر و ناز کی آلون نے عالمِ انسانیت مین انقلاب اُٹھائے اور سرزمین یورپ پر وہ ہنگامۂ رستخیز برپا کیا تھا کہ جس مین گردن فرازون کے سر اور بڑے بڑے شہنشاہون کے تاج تِنکون کی طرح اُڑتے پھرے۔ اِس مین خلاف عادت یا جادوگری کی کوئی بات نہ تھی۔ جب تک افعالِ انسانی پر عقل و دماغ کی حکومت رہیگی اور دماغ اُس علم کی جو وہ حاصل کرے اتحتی کرے گا ـــ اور ہمیشہ یہی ہو گا اُسوقت تک کچھ بھی شبہ نہین کہ ہر مصنف کی تحریر ایک ایسے دریا کی مثال ہو گی جس کے دامن مین بجلی کی ہزارون طاقتین پنہان ہون۔

جلسہ کا مقصود مجھے تسلیم ہو کہ اسوقت ملک مین عام بے حسی اور علم سے عبرتناک بدشوقی پھیلی ہوئی ہو اور ایسے ناساعد حالات مین بڑی بڑی امیدین باندھنا یا بار اداہل مغرب کی ولولہ انگیز نظیرین پیش کرنا بظاہر جنگلون مین رہ کر شہرون کے ذکر سے دل بہلانا ہو۔ لیکن گو ہندوستان کی قدیم داستانِ عظمت کو بُھلا دیا جائے تاہم اُس کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہین ہو آج بھی یہ سرزمین وہی سنگ مرمر اُگلتی ہو جس سے دہشت تاج محل بنا تھا۔ اِن کانِ گن صناع اور سب سے زیادہ ضرورت اُس دل کی ہو جو شاہجہان کے سینے مین تھا۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری کانفرنس کا مقصد اگرچہ بنیادی مگر بالکل ابتدائی رکھا گیا ہو اور اِس اِجتماع کا جس کی آپ صاحبون نے عزت بڑھا دی ہو مدعا اسی قدر ہو کہ ملک مین ترقی علم ادب کا سچا شوق اور احساس پیدا کرے کہ اُس کے سہارے

علمی کام کرنے والون کے حوصلے بڑھ جائین اور انجمن ترقی اُردو اپنی کوششون کو جہان تک ممکن ہو زیادہ وسعت دے سکے۔ اب خواہ اس مین ہمین کامیابی ہو یا ناکامی، بے شبہ خود یہ مقصد نہایت امید افزا اور مبارک ہی۔

اس تحریک کے محرک ہمین اسکے لیے اہلِ لکھنؤ اور کلکتے کے بعض وطن دوست حضرات کا ممنون ہونا چاہیے جنھون نے انجمن ترقی اُردو کو اپنی پرانی چار دیواری سے قدم باہر نکالنے پر آمادہ کیا اور موجودہ جلسے کی بنیاد ڈالی۔ تعلیم یافتہ طبقے اور اخبارات نے بھی عام طور پر اِس تحریک کو پسند کیا مگر ہمین یہ فراموش نہ ہونا چاہیے کہ اس تمام احساس گرم جوشی کی تہ مین انجمن ترقی اُردو کے لائق سکرٹری مولوی عبدالحق صاحب کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ شاید کسی صاحب مزاج فلسفی کا قول ہو کہ سب سے بلند آواز کا نام خاموشی ہو۔ مین اپنے فاضل دوست کو دل سے مبارکباد کہتا ہون کہ اس بظاہر جمع ضدین قول کی انھون نے اپنے کام سے عملی تصدیق کر دکھائی۔ چند سال سے جس خلوص و شوق کے ساتھ وہ انجمن ترقی اُردو کا انصرام کر رہے ہین اس سے زیادہ تر اُسی نے ہر خاص و عام اہلِ ملک کو زبان کی طرف متوجہ کیا اور بالواسطہ اِس خیال کو قوت بخشی کہ ترقی اُردو کے حلقے کو بہت زیادہ پھیلانے کی ضرورت اور نیز گنجائش ہو۔ ضرورت کے متعلق تو کسی کو انکار ہو ہی نہین سکتا تھا کہ اگر اپنی زبان کو زمانۂ جدید کے مطابق علمی زبان بنانا منظور ہو تو ابھی اس کے لیے ہر شخص سمجھتا ہو کہ کیسے بڑے ساز و سامان، محنت و اہتمام کی احتیاج ہو۔ اور غریب انجمن ترقی اُردو نے تو گویا اس سفر ہزار منزل کا پہلا مرحلہ بھی طے نہین کیا لیکن ہمیشہ ایک ننھے اور حقیر پودے کو دیکھکر تناور درخت کا تصور ہوتا ہی اور اس اعتبار سے گو کما یہ انجمن کا کام بجائے خود نہایت عمدگی و دانائی سے اُس کا ایک منتظم اور با اصول حالت پر آجانا ہی بڑی بات ہو اور یقیناً اُسی نے ہندوستان کی عام ہوائے بیداری سے تقویت پا کر ہماری امنگ اور ہمارے منصوبون کو یہ تازگی دی ہو۔

اس جلسے کی ضرورت بہرحال موجودہ تحریک جس طرح ہو، عالمِ فکر و قول کی منزل سے گزر آئی اور آج اُس منشا کو پیش نظر رکھ کر جس کا مین نے اوپر ذکر کیا، یہ جلسہ، خدا اُسے برکت و استقامت دے، ہمارا سر آغاز عمل ہو۔ بے شبہ ملکی علم و ادب کے بہی خواہون نے اپنی اپنی جگہ اس کے وسائلِ ترقی پر غور فرمایا ہوگا لیکن ان سب صاحبون کے واسطے مبادلۂ خیالات اور بحث و گفتگو کی ایک مرکزی مجلس کا قیام بجنسہٖ نہایت ضروری اور مفید ہی کیونکہ اس نصب العین کا مجلّا دلون مین ہونا کہ ہمین اپنے علم ادب کو درجۂ کمال پر پہنچانا ہی کسی طرح کافی اور سود مند نہین ہو سکتا خصوصاً اگر ہم جمہور اہلِ وطن کو اپنا شریک خیال بنانا چاہتے ہین تو اس سے بہت کچھ زیادہ کہنا سننا پڑے گا۔ اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی جو جو شرطین ہین وہ سب تفصیل کے ساتھ سمجھنی اور سمجھائی ہون گی تاکہ راستے کی طوالت اور نیز وہ سامان جو ہمین کرنے ہین نگاہ مین آجائین، اہلِ ملک ان سے واقف ہون اور کام کرنے والے اُسی کے مطابق اپنا نصاب عمل تیار کرین۔

ادبِ اُردو کی صحیح حالت سمجھنے مین دشواری کسی علم و ادب کا ذکر درمیان مین آتے ہی خواہ اُسے ترقی دینے کا کوئی منصوبہ زیر بحث ہو یا نہو بالطبع یہ جستجو ہوتی ہی کہ اُسکی موجودہ حالت کیا ہی۔ اس مین کس قسم کا ذخیرہ کافی اور کون سا ناکافی ہی۔ اس مین کیا کوتاہی اور کیا کیا نقص ہین اور اس کے کون سے پہلو قوی یا کمزور ہین؟ کتنی کمی کی بات ہی کہ اُردو کے بارے مین اس سیدھے ہی سوال کا ہم کوئی قابلِ اطمینان جواب نہین دے سکتے۔ زمانے کے اعتبار سے ہمارا علم ادب شاید دنیا مین سب سے کمسن نکلے گا۔ تاہم اس مین جو کچھ کام ہو چکا ہی بُری بھلی جسقدر کتابین مختلف مضامین پر تحریر کی جا چکی ہین اُنکا ہمین

صحت کے ساتھ کوئی اندازہ نہیں۔ مجموعی طور پر ایک یہ بات کہ دنیا کی
ہماری زبان میں جدید علوم مغربی بہت کم آئے ہیں، یا شعر و شاعری
اور علومِ دینی کی کتابیں بہ کثرت لکھی گئی ہیں، کوئی قابلِ تشفی جواب
نہیں ہے۔ اُس میں اضافہ و افزایش ایک طرف، یہ ہمارے علم ادب
کی کیسی کس مپرسی اور پریشان حالی کی دلیل ہے کہ وہ بزرگ تک جو
اپنا مشغلۂ زندگی علم کی خدمت گزاری کو سمجھتے ہیں زبانِ اُردو کی مصنفات
و مطبوعات سے کما حقہٗ واقف نہیں۔ مانا کہ زبانِ اُردو بہت پھیلی
ہوئی زبان ہے اور اس کے مصنفین اور خادم برِ اعظم ہندوستان کے
دور دراز گوشوں میں چھپے پڑے ہیں جہاں دوسری مقامی بولیوں کا
عام رواج اُس طرف ہمارے خیال کو بھی جانے نہیں دیتا، مگر یہ عذر
کسی طرح لائق قبول نہیں بلکہ اُس سے اُلٹی ہماری ایک خاص کمزوری
ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ دعویٰ کرتے وقت تو ہماری چشمِ تصور کے
سامنے کشمیر سے میسور تک اُردو کا پھریرا اُڑتا نظر آتا ہے پر جب زیادہ
ٹٹولا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو یہ زبان ہندوستان کے تمام متمدن مقامات
میں بولی اور سمجھی جاتی ہو مگر اُسے علمی حیثیت پنجاب، صوبہ جات متحدہ
یا ممالک بہار اور حیدرآباد کے علاقوں کے سوا کسی جگہ بھی حاصل نہیں ہے۔
.... لیکن بحث کے اس پہلو پر زیادہ زور دینا غیر مفید ہوگا۔ میرا اصلی
مدعا صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آج جب کہ ہم اُردو کی توسیع و بہتری کی تدبیریں
ڈھونڈھنے پر آمادہ ہوئے ہیں، قدرتی طور پر ہمارا پہلا کام اپنے موجودہ
ذخیرے کی پوری پوری جانچ پڑتال کر لینا ہے اور اس غرض کے لیے
نہایت ضروری بلکہ ناگزیر ہے کہ وسیع پیمانے پر ایک مرکزی کتب خانہ
اُردو قائم کیا جائے۔

مرکزی کتب خانہ کی ناگزیری کتب خانہ کی منزلت اور خصوصاً اس زمانے میں
جو فروغ اُسے ہوا ہے، اُس کا بیان تحصیلِ حاصل ہوگا۔ سب جانتے ہیں
کہ متمدن ممالک میں ترقیِ علم و تہذیب کی سب سے نمایاں علامت عمدہ
کتب خانوں کی کثرت سمجھی جاتی ہے۔ اِن ملکوں کے ساتھ دوڑ میں ہمیں
برابری کا خیال گویا دیسی رتھ کو انگریزی انجن کے ہم رفتار چلانے
کی سعی ہے، لیکن مذکورۂ بالا تحریک سے خاص مقصد تو صرف اتنا ہے کہ
اہلِ تلاش کو آسانی سے اُردو علم ادب کی حالت کا صحیح اندازہ ہو سکے
اور بے شبہ جتنا زیادہ وسیع یہ کتب خانہ ہوگا اُسی قدر ہمارے ادب کے
متعلق ہماری معلومات زیادہ قابلِ اطمینان اور مکمل ہوں گی۔ اِس تحریک
کی جسارت مجھے اس وجہ سے اور ہوئی کہ غریب اُردو ابھی ایسی پُر مایہ
نہیں ہے جس کی تمام کتابیں جمع کرنے میں کوئی بہت بڑا صرف برداشت
کرنا پڑے گا یا جس کے انتظام میں زیادہ دشواریاں پیش آئیں گی۔
ایڈیٹر صاحب البشیر نے محض سعیِ ذاتی کے بھروسے پر اس کام کا بیڑا
اُٹھایا اور غالباً اُردو کتابوں کا معقول ذخیرہ اٹاوے میں فراہم کر چکے
ہیں۔ پس میرے نزدیک صرف چند فیاض محبانِ قوم کی شرکت
مذکورہ تجویز کا عملی سر انجام کر سکتی ہے جس کا فیض ہمیشہ جاری رہے گا
اور جسے عجب نہیں کہ آئندہ الزمانہ اُردو علم ادب کی سب سے بڑی خدمت
تسلیم کرے۔ حکیم ارسطو اور فرانسیسی علمائے قاموسی (فرنچ انسائی
کلوپی ڈسٹس) کی شہرتِ جلیلہ محتاجِ ذکر نہیں۔ بنی نوع انسان کے
ان برگزیدہ محسنوں کا بڑا کارنامہ علوم کی جمع و ترتیب تھا۔ ہمارا
مرکزی کتب خانہ دوسرے پیرائے میں اسی قسم کی ایک کوشش ہوگا۔
اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ وہ زبان جس کی کتابیں یہاں فراہم کی جائیں گی
علمی ترقی کے جدید معیار سے بہت کم رتبہ اور بے بضاعت زبان
ہے۔ البتہ ہمارا مقصودِ اوّلی حاصل ہو جائے گا اور جو کچھ اُردو میں ہو چکا
ہے وہ ہمارے سامنے ہوگا تو آئندہ کام کا نقشہ تیار کرنے میں بہت آسانی
ہوگی اور انفرادی طور پر بھی جب کوئی صاحب کسی مضمون پر قلم
اُٹھائیں گے تو اُس کے متعلق اُردو میں جو کچھ کتابیں ہوں گی اُس سے
انھیں آگاہی ہو جائے گی۔

اُردو کی ضروریات غرض اپنے علم ادب کی راہ میں ہمارا پہلا سامانِ ترقی کتب خانہ کا قیام ہے جس کے بعد دیگر علمی ضروریات زیر بحث آتی ہیں۔ ان ضروریات کا صحیح اندازہ کرنا یقیناً مجھے دشوار ہوتا مگر اصل یہ ہے کہ اور زبانوں کے مقابلے میں ہماری زبان اس درجہ تہی دست و بے سامان ہے کہ ایک ہی نظر میں اُس کے نقص دکھائی دے جاتے ہیں اور جس طرح کسی حبشی کو شکایت تھی کہ اُس کی سیاہ تابی کو لوگ نام دھرتے ہیں اور فراخ پیشانی، کتابی چہرہ، خوبصورت دانتوں کی کوئی داد نہیں دیتا شاید اسی طرح اگر خوبیاں ہیں تو وہ بھی ہماری علم اور زیادہ برائیوں میں چھپ کے غائب ہو گئی ہیں۔ واقعی جسے بیسویں صدی عیسوی کی علمی ترقیوں سے کچھ بھی واقفیت ہے وہ اِس رنج دِہ کمی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو کہ فی الحال جدید علوم طبیعی ہی کے نہ ہونے سے ہماری زبان کے لیے موجبِ شرم و عار ہے۔ تمدن و معاشرت میں نئی نئی سہولتیں قابلِ ذکر سہی، خود انسانی عقل و دماغ کو بند توہم سے جس طاقتِ علمی نے نجات دلائی ہے وہ یہی علوم تو ہیں۔ مگر اِس ملک کے عِلم ادب میں ان کا کیا درجہ ہے؟ اس سوال کے جواب میں بہتر ہے کہ سکوت اختیار کیا جائے۔ کیونکہ اگر اِن معدود اور محدود کوششوں کو پیش بھی کیا گیا جو اِس بارے میں بعض بہی خواہانِ وطن نے کی ہیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے اُلٹا اُن کوششوں کی بے سروپائی کا راز فاش ہو جائے گا۔

یہ عُذر کہ اِن جدید علوم کی ہمارے ملک میں مانگ نہیں، ظاہر کرتا ہے کہ گویا لکھنے والے موجود ہیں پڑھنے والے میسر نہیں آتے۔ مجھے اِس کے ماننے میں تامل ہے۔ اہلِ قلم کی قلت دوسری بات ہے ورنہ مانگ کمی سے پیدا ہوتی ہے اور ہر چند ہمارے ہاں عِلم سے عبرتناک بیگانگی پھیلی ہوئی ہے پھر بھی اِس بات کا موقع ہے کہ بیہودہ ناولوں اور فضول افسانوں کے بجائے ملک میں علمی رسالوں کی بہتات ہو۔ ہاں شرط یہ ہے کہ یہ تحریریں ایسی غیر مانوس اور دقیق نہ بنا دی جائیں کہ جن کے پڑھنے سے دل گھبرا اٹھے۔ مانا کہ یہ علوم ہماری زبان میں نئے ہوں گے مگر باتیں تو وہی ہیں جو ہمارے بھی مشاہدے اور تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ اُن کا باترتیب و مفصل بیان باعثِ وحشت کیوں ہو؟ دل پسند کیوں نہ ہو؟ پنجاب یونیورسٹی کی ابتدائی اُردو کتابوں میں جن میں اب کچھ ترمیم و تبدیلی کر دی گئی ہے حیوانات، نباتات اور جمادات پر اکثر مضمون نہایت مفید و دلچسپ پڑھائے جاتے تھے اسی طرح ان علموں کی اگر سادہ اور ذہن نشین پیرائے میں کتابیں شائع کی جائیں اور مغربیت کے بجائے طرزِ خیال دیسی لباس میں ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ عام طور پر مقبول و مطبوع نہ ہوں۔

علومِ نظری کے میدان میں زمانۂ حال کے مطابق اُردو میں کچھ نہ کچھ کام کیا جا چکا ہے نئی مؤلفات و تراجم میں بعض مشہور اور زیادہ تر کتابیں گمنام بھی ہو گئی ہیں اور ہمارا اس بارے میں ذریعۂ معلومات ایسا نامعتبر ہے کم سے کم میں اُس کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دیتا۔ لیکن دنیا کی اُن چیدہ اور مستند (کلاسکل) قدیم کتابوں کا، جن کے مطالعہ بغیر آدمی کا علم ناقص مانا جاتا ہے، زبانِ اُردو میں موجود نہ ہونا، درحقیقت ایسی کمی اور بدنصیبی ہے کہ اُس پر جتنا تاسف کیا جائے کم ہوگا۔ میں تمام اہلِ علم سے اور خاص کر انجمن ترقی اُردو کے فاضل سکرٹری صاحب سے بمنت درخواست کرتا ہوں کہ وہ جہاں تک ہو سکے اِس نقص کو دور کرنے کی کوشش فرمائیں۔ اگر ملک میں ایسے نامور معلموں کی تعلیم پھیلانے کا کوئی وسیلہ نہ نکلا، تو اہلِ ہند سے جن کے زوال نے پہلے ہی انہیں دنیا کی ایک ذلیل قوم بنا دیا ہے کسی روشن خیالی اور حوصلہ مندی کی توقع نہیں ہو سکتی۔

فروغ و ترقی تو اُس کے بہت بعد کی منزلیں ہیں۔

اُردو جرائد کتابوں سے دوسرے درجہ پر زبان کی اشاعت و خدمت کا

ذریعہ اخبارات و رسائل ہین۔ یہ چیز ہم نے اہلِ مغرب سے لی تھی مگر عجیب بات ہو کہ اِس ملک مین جرائد زیادہ تر اُن لوگون کے قبضے مین رہے جو مغربی تعلیم سے نہ خود مستفیض ہوے نہ جدید تعلیم یافتہ لوگون سے کام لینے کی صلاحیت رکھتے تھے غنیمت ہو کہ پچھلے چند سال مین ایک امید افزا تبدیلی پیدا ہوئی ہو۔ انگریزی تعلیم یافتہ اپنی دیسی زبان مین اخبار نویسی پر ملتفت ہو رہے ہین اور ہمارے اخبارون مین کہین کہین نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہین۔ لیکن ابھی تک یہ کام بہت اصلاح و ترقی کا محتاج ہو اور اگرچہ ہماری تحریک کو سیاسی معاملات سے کوئی علاقہ نہین، تاہم ادبی حیثیت سے ضرور ہو کہ انجمن ترقی اُردو میدانِ ادب کے اِس اہم حصے کو نظر انداز نہ کرے اور جن جن طریقون سے ممکن ہو اعلےٰ رتبہ کی اخبار نویسی، اور ساتھ ہی اخبار بینی کا، ذوقِ صحیح پیدا کرنا، بھی اپنے مقاصد مین داخل سمجھے۔

ترقی اُردو کی شاخین | اسی فضا یعنی اشاعتِ زبان کے متعلق ایک ضروری مسئلہ ملک کے مختلف حصون اور شہرون مین انجمن ترقی اُردو کی شاخون کا قیام ہو بعض بہی خواہانِ اُردو کی توجہ اور نیز مولوی عبدالحق صاحب کی کوشش سے یہ کام شروع ہو گیا ہو۔ لیکن جہان تک مجھ کو معلوم ہو ابھی صرف چند مقامات مین شاخین بنائی جا سکی ہین اور اُن کے فرائض و مقاصد کا بھی کوئی فیصلہ نہین ہوا ہو کہ انھین کس طریق پر اور کیا کیا کام کرنے چاہیئین۔ میرے خیال مین ہر شاخ کا ایک فرض اپنے اپنے مقام پر اُردو تصانیف کو مقبول و متعارف کرنا ہو تاکہ تعلیم یافتہ لوگ ملکی علم ادب کی قدر جانین اور اُسکی سرپرستی پر آمادہ ہون۔ اِس کے علاوہ یہ شاخین عام جلسون کا انتظام کیا کرین جن مین مختلف مضامین پر صاف و سلیس اُردو مین تقریرین کی جائین۔ اور اِس ذریعے سے لوگون مین شائستہ زبان کی اشاعت کے سوا پاکیزہ اور علمی خیالات بھی پھیلائے جا سکین اور تقریر کی تعلیمی حیثیت اہلِ وطن کو فائدہ پہنچائے۔ اِسی طرح مقامی انجمن اگرچہ مستقل مصنف یا ادیب پیدا کرنے کی ذمہ داری نہین لے سکتی، یہ ممکن ہو کہ وہ انعامی مضامین بذریعہ اشتہار لکھواتی رہے اور اُردو انشا پردازی نیز علمی تحریرون کا اپنے اپنے حلقے مین شوق بڑھائے اور آخر مین وہ اہلِ قلم تیار کرنے کا ایک عمدہ وسیلہ ثابت ہو۔

یہ دونون صورتین ایسی ہین جن مین روپے اور وقت کا بہت کم صرف اُٹھانا ہو گا اور اگر زبان کے چند شیدائی مل کر اس کام کو بھی خوبی و استقلال کے ساتھ نہ چلا سکین تو ہمین اپنی کامیابی سے مایوس ہو جانا چاہیئے۔ البتہ کتب خانے قائم کرنے کا سوال ذرا زیادہ غور طلب ہو کیونکہ اُردو زبان کی منتخب کتابین جمع کر لینا خواہ اتنا دشوار نہ ہو، ایک کتب خانے کی خاطر خواہ نگرانی اور مصارف دائمی کا بندوبست اُس وقت تک آسان نہین معلوم ہوتا جب تک کہ بعض صاحبانِ ثروت اس کی اعانت کا ذمہ نہ لے لین۔ بااین ہمہ انجمن ترقی اُردو کو اس معاملے مین برابر اپنی شاخون سے سلسلہ جنبانی رکھنی چاہیئے اور ممکن ہو تو اس کوشش مین اُن کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

یونیورسٹیون مین اُردو کی خبرگیری | اِن مرحلون سے گزر کر اب مین آپ صاحبون کی توجہ دو زیادہ اہم تجاویز کی طرف مبذول کرانی چاہتا ہون جنمین سے پہلی، یونیورسٹیون مین زبانِ اُردو کی خبرگیری ہو۔ اِس وقت تک سرکاری یونیورسٹیون مین ہندوستانی زبانون کو بہت کم رتبہ دیا گیا ہو۔ خصوصاً اُردو جن صوبون کی سرکاری زبان مانی جاتی ہو، وہان بھی مڈل اور حد سے حد انٹرنس مدارس کے آگے اُس کی کوئی پرسش نہین ہوتی۔ دیسی زبانون کے ذریعے تعلیم کا خواب تو خدا معلوم کب ہندوستان مین پورا ہو گا، لیکن اِس وجہ سے اُن کے ساتھ بے اعتنائی سراسر ظلم ہو۔ اور کچھ عجب نہین کہ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت مین اپنی جماعت سے جو ناواقفیت اور بے توجہی پائی جاتی ہو اُس کا ایک بڑا سبب یہی ہو

کہ ہمارے علوم ادب کو تعلیم کے اونچے مدارج مین کوئی جگہ نہین دی
گئی ہے۔ اسکے علاوہ یونیورسٹیون مین جو اُردو کتب نصاب مقرر
ہین اُن مین کہین مضامین کے اعتبار سے کہین انشاپردازی کے
لحاظ سے بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ اب تک یہ نصاب بالعموم
انگریز افسرون کی نگرانی مین منتخب اور جاری کیے جاتے ہین اور یہ
طریقہ اس امر کا سخت محتاج ہے کہ ہماری ادبی انجمن ترقی اُردو افسران
مذکور کی نظر مین اپنا اعتبار قائم کرے اور اپنے صلاح و مشورے سے اُنکے
کام مین ممد و معاون ہو۔ اخباری یا انفرادی نکتہ چینی سے اِس
معاملے مین کوئی نمایان فائدہ نہین ہو سکتا۔ اور یہان بھی کامیابی
کا یقین اتحاد و اجتماع پر مشروط ہے۔ اور اِسی سلسلے مین مجھے اپنی
دوسری تجویز کا خیال آیا جس سے میری مراد اُردو اکیڈمی کا قیام ہے۔

اُردو اکیڈیمی

یہان اکیڈمی سے میرا مدعا ایک ایسی علمی جماعت ہے جو
ملکی تصانیف و مطبوعات پر غیر سرکاری مگر بااثر نگرانی رکھے اور جو
ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی غرض سے اُس فنِ تنقید کی اُردو مین بنا ڈالے
کہ جس سے ہمارا علم ادب قریب قریب بالکل ناآشنا رہا ہے۔ درسی
کتابون کے متعلق یونیورسٹیون سے بحث و مکاتبت بھی اسی جماعت کے
کے تحت مین دی جاسکتی ہے لیکن اس کا خاص کام زبانِ اُردو
کی علمی اور نئی کتابون پر اپنی مستند رائے کا اظہار ہونا چاہیے۔
ابتک ہمارے ہان دستور ہے کہ کسی کتاب کی تقریظ یا قطعۂ تاریخ لکھنے
مین اسکی نہایت ناروا مبالغے کے ساتھ تعریفین کی جاتی ہین۔ دوسری
صورت جسکا آجکل تنقید کے نام سے رواج بڑھتا جاتا ہے یہ ہے کہ یا تو
بغیر دیکھے بھالے کسی کتاب پر چند سطرین لکھ کر اس بوجھ سے سبکدوش
ہوگئے اور یا کسی تصنیف یا خود مصنف سے ناراض ہوئے تو اُسکی
چھوٹی چھوٹی فروگذاشتون کو بھی قبیح غلطیان ثابت کرنے مین
ورق کے ورق سیاہ کر ڈالے۔ ایک اور غلط فہمی جس مین ہماری
زبان کے بعض ہوا خواہ مبتلا ہین یہ ہے کہ کتاب کے مضمون سے کوئی
بحث نہ ہو اور سارا زور تنقیدِ عبارت یعنے الفاظ، محاورات اور
روزمرہ کی خردہ بینی مین صرف کیا جائے اور اگر غریب لکھنے والے
کے قلم سے دو چار ایسے الفاظ نکل گئے ہین جو کسی مشہور اُستاد کے
دیوان مین نہین ملتے تو پھر وہ کتاب اس قابل نہین کہ پڑھی جائے۔
کیونکہ اُس سے زبان خراب ہونے کا مہلک اندیشہ ہے!

غنیمت ہے کہ یہ بیماری اب ملک مین کم ہوتی جاتی ہے اور زبان کے
متعلق بہت سے ناگوار مباحثے بھی اسی گوشۂ تاریکی مین سمٹ رہے
ہین جس کے وہ مستحق ہین۔ مگر ان کلمات سے امید ہے کہ میرے منشا کا
کسی حد تک آپ حضرات کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مین اُس لباس کو
جس مین کوئی مصنف اپنے خیالات پیش کرے زیادہ قابل لحاظ نہین
سمجھتا۔ بلکہ جس قسم کی اکیڈمی تجویز کرنے کی مین نے جسارت کی ہے اُسکا
مقصود اصلی خیالات کی پرکھ ہوگا۔ ہر کتاب کا ایک مجموعی اثر خواہ
مصنف کا وہ منشا ہو یا نہ ہو، پڑھنے والون کے دل پر مرتب ہوتا ہے
اِسی اثر کو سمجھنا اور سمجھانا اور پھر اُس کے عیب و صواب پر رائے زنی
کرنا، صحیح معنون مین تنقید ہے اور اس کا مطلب خود اُن کو کچھ سکھانا
اور مشورہ دینا ہے، جو دنیا کو بذریعہ تصنیف "کچھ سکھانے" کے دعویدار
ہین۔ اُسکی اہل صاحبانِ علم و فضل کی ایک منتخب جماعت ہی ہو سکتی
ہے کہ جو "تعلیم المصنفین" کا یہ مفید و اہم کام اپنے ذمے لے اور اُردو اکیڈیمی
کے نام سے ہمارے علمِ ادب کی مستند اور مستعد رہنما ہو۔ اور گو بعض
مصنفین پر اِس جماعتِ علما کی باوزن رائین بظاہر زیادہ کارگر
نہون گی لیکن کم سے کم آنے والے اہلِ قلم اور آنے والی کتابین
اسکی تعلیم سے مستفید ہوئے بغیر نہین رہ سکتے۔ اور اسی طرح مجھے پورا
یقین ہے کہ چند ہی سال مین آپ کی اکیڈمی مصنفاتِ اُردو کی علمی
حیثیت کو بدرجہا بہتر بنا سکے گی اور ہمارے ملکی علم ادب پر اُس کا

اتنا وسیع اور نمایاں اثر پڑے گا جو شاید کئی کالجوں کی تعلیم سے بھی نہ پڑ سکتا!۔

حضرات۔ اگرچہ مضمون کی منزلت اور ہمہ گیری کا تقاضا تھا کہ اس پر بہت کچھ کہا جائے، مگر اب ہم سب جناب صدر نشین کا پُرمغز ایڈریس سُننے کے مشتاق ہیں۔ لہذا میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں اور استقبالی مجلس کی طرف سے پھر اُس زحمت کا جو آپ نے گوارا فرمائی ہے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فقط

(ہندوؤن کا تعلق اُردو سے)

مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کا وہ مضمون جو اُردو کانفرنس لکھنؤ کے دوسرے اجلاس مین پڑھا گیا

حضرات! - علم الالسنہ یعنی فیلالوجی نے دنیا مین عجیب عجیب کرشمے دکھائے ہین۔ اُس عہد کے واقعات نظر کے سامنے کر دیے جبکہ سلف کو بعد والی نسلونکی اطلاع کے لیے اپنے کارنامون کے زندہ رکھنے کی کوئی تدبیر نہین معلوم تھی۔ نوع انسان کے بچپن کے سفرون اور آغاز شعور انسانی مین آدمیون کی نقل و حرکت اور سیر و سیاحت کے حالات ہین اسی زندگی بخش فن سے معلوم ہوے۔ ہمارے مجہول العہد بزرگون کے نقش قدم جو قدیم الایام کی جلاوطنیون اور صحرانوردیون سے صفحۂ زمین مین جابجا بن گئے تھے اُنھین ہم نے اس جدید علمی عینک کی مدد سے دیکھ لیا۔ اور اُسی کی مدد سے روز بروز بعید سے بعید اور گہرے سے گہرے واقعات کا انکشاف ہوتا جاتا ہی۔

مگر سب سے بڑی برکت و نعمت وہ انکشافات ہین جو اس عینک کے ذریعے سے ہمین خود اپنی زبان کے اندر نظر آ گئے ہین۔ ہماری زبان سچ پوچھیے تو ایشیا کی اُس سراپا عظمت قوم کے تفرق و اتصال کی زندہ تاریخ ہی جس کی شاخین نکلین پھیلین چھوٹین۔ ملین۔ ہٹین۔ بڑھین۔ لڑین۔ ٹکرائین۔ اور پھر ایک ہو گئین۔

اسی علم الالسنہ کے طفیل مین فی الحال یہ ایک طے شدہ تاریخی مسئلہ ہی کہ قدیم الایام مین تمدن انسانی کا سب سے ممتاز اور عظیم الشان درخت جو تاریخ مین آریہ کے نام سے مشہور ہی وسط ایشیا کے ایک مُرخیز خطے مین پھلا پھولا۔ اور جب اُسکی ایک ابتدائی قلم اُس سے کاٹ کے ارض مغرب اور یونان و روم کی سواد مین نصب ہو چکی تو اور زیادہ پھیلا اور اُس کی دو زبردست شاخین اِدھر اُدھر بڑھنے اور پھیلنے لگین۔ یہان تک کہ ایک مشرق کی طرف بڑھ کے ہندوستان پر سایہ افگن ہوئی اور دوسری مغرب مین پھیل کے مملکت عجم کی بہار بن گئی۔ اِن دونون شاخون نے یہان تک فروغ پایا کہ قدیم درخت کا اصلی تنہ فنا ہو کے صفحۂ ہستی سے غائب ہو گیا۔ اور اِن دونون ممتاز و سرسبز شاخون نے ہندوستان و ایران کی زمینون مین اپنے سلیے نئے تنے پیدا کر لیے۔ اب مقامی آب و ہوا کے اثر نے اُن کو ایک دوسرے سے جُدا اور مختلف خصوصیات سے متصف کرنا شروع کیا۔ اور دونون مین جدا جدا خصائص و تشخصات پیدا ہو گئے۔

آریہ قوم کی اِن دو شاخون کے ایک ہونے اور اس کے بعد پھر ملنے کی سچی تاریخ ہماری اُردو زبان ہی۔ مسلمانون کا ہندوستان مین آنا در اصل ہزارہا سال کی مفارقت کے بعد اُن دونون شاخون کا ہم آغوش ہونا تھا۔

کہا جاتا ہی کہ مسلمان عرب سے آئے اور وہ آریہ قوم سے نہین بلکہ

باغ عالم کے ایک دوسرے درخت کی شاخ ہین جو بنی سام کا درخت کہلاتا ہے اور شجر آریہ سے پہلے دنیا مین سرسبز ہو چکا تھا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے تاجران عرب ظہور اسلام سے پہلے بھی جنوبی ہند کے شرقی و غربی سواحل پر آ آ کے بستے رہے۔ اور اُس کے بعد بھی اُنکے آنے اور توطن اختیار کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اِس کے علاوہ جب پہلی صدی ہجری مین مسلمانون نے ملک سندھ کو فتح کر لیا تو کثرت سے عربی خاندان آ آ کے سندھ کچھ کاٹھیاوار اور گجرات مین سکونت پذیر ہو گئے۔ یہ فی الحقیقت عربون اور بنی سام کا آنا تھا۔

لیکن مسلمانون کا وہ آنا جس نے ہندوستان پر گہرا تمدنی اثر ڈالا جس سے ہندوستان کی موجودہ معاشرت بنی اور اُسکی موجودہ زبان پیدا ہوئی اُس کا آغاز سچ پوچھیے تو محمود غزنوی کے حملون سے ہوا۔ یہ عربون کا آنا نہ تھا بلکہ ایرانیون اور فارسیون کا آنا تھا جو دراصل اُسی قدیم آریہ شاخ کے پھل پھول تھے۔ محمود غزنوی خاص عجمی نژاد اور آل ساسان کی نسل سے تھا۔ اور اُس کی فوج مین علی العموم وہی لوگ تھے جو ایرانی تھے یا تورانی جن کو ایرانی اپنا ہم نسب اور ہم جد بتاتے تھے۔ غزنویون کے بعد غوری سلاطین اسلام کا عہد شروع ہوا۔ وہ بھی گو مذہباً مسلمان تھے لیکن بلحاظ انساب تورانی تھے۔ پھر غلامون کا عہد آیا اور وہ بھی تورانی تھے۔ چند روز کے لیے سیدون کا کمزور زمانہ رہا اور پھر حکومت عجمی الاصل خاندانون کے ہاتھ مین آ گئی۔ لودھی، تغلق اور مغل یہ سب تورانی اور اہل عجم کے بنی عم تھے۔ بہرحال ہندوستان مین مسلمانون کا جو متمدن دربار قائم ہوا اور جس نے ہندوستان کی سوسائٹی کو اپنے رنگ مین رنگا وہ سامی نہین آریہ دربار تھا۔ اور اس مین مطلق شک و شبہ نہین کیا جا سکتا کہ اگرچہ یہ لوگ دین اسلام کے پیرو ہونے کی وجہ سے عربون کی عزت کرنے اور عربی معاشرت کے دلدادہ تھے مگر بذات خود آرین تھے اور اُن کا آنا آریہ قوم کی دو شاخون کا باہم ملنا تھا۔

فی الحال کوشش کی جاتی ہے کہ پرانا رشتہ زندہ کر کے یورپ والون کو اہل ہند کا بھائی بند ثابت کیا جائے۔ اور مسلمان ایک غیر قوم بتائے جائین جنکو آریہ قوم سے کوئی لگاؤ نہین حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جن مسلمانون نے ہندوستان پر حکومت کی اور اُس مین اپنا جدید دربار قائم کیا وہ بنی سام نہین آریہ تھے۔ عربی نہین فارسی بولتے ہوے ہندوستان مین آئے تھے۔ اہل ہند سے بمقابل اہل یورپ کے زیادہ قریب کا رشتہ رکھتے تھے۔ اِس کے ماننے مین ہمین عذر نہین کہ ایران کے آریون کو ہندوستان مین آنے سے پہلے عربی اثر نے مغشوش کر دیا تھا لیکن ایرانیون سے زیادہ یورپ کے آریون کو کلٹ ہن، گاتھ، اور تاتاری قومین مغشوش کر چکی تھین۔ بہرحال اس مین ذرا بھی شک نہین کیا جا سکتا کہ اہل یورپ کے بہ نسبت یہ عجمی فاتح ہندوؤن کے زیادہ قریبی رشتہ دار تھے۔

لیکن سامی و آریہ دونون نسلون کے تازہ وارد مسلمانون نے گو کہ پہلون کی زبان عربی اور دوسرون کی فارسی تھی اِس سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہان کی زبان کی طرف غیر معمولی توجہ کی۔ اور اِس ملک کی زبان کو نہایت ہی سرگرمی اور ذوق و شوق سے حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اہل عرب سنہ ۹۳ھ مطابق ۷۱۲ء مین وارد سندھ ہوئے تھے۔ اور پرانا عربی مورخ بلاذری لکھتا ہے کہ اُس کے اٹھائیس ہی سال بعد یعنی خلیفہ یزید بن یزید کے عہد مین اہل سندھ عربی بولنا درکنار اس زبان کی تعلیم مین ترقی کرنے لگے تھے۔ چند ہی روز مین عربی زبان کے سندھی نثر او شعرا نے یہان تک نمود حاصل کر لی کہ اُن کے اشعار بلاد شام و عرب مین مشہور ہوے۔ اور اُن کا نام ارض عرب کی علمی صحبتون مین عزت سے لیا جانے لگا۔ چنانچہ اس عہد کا ایک شاعر لسان عرب جس کا لقب ہی سندھی تھا آج تک مشہور ہے اُس کے ساتھ یہ بھی پتہ لگتا ہے

کہ متوطن سندھ عربون نے بھی سندھی زبان ذوق و شوق سے سیکھنا شروع کر دی تھی۔

اِس کے تھوڑے دنون بعد عربون کا انہماک ہندستان کی زبانون مین یہان تک بڑھا کہ سندھی زبان کے عربی نژاد شاعر پیدا ہونے لگے جن کا کمال یہان کی مہذب صحبتون اور معزز دربارون مین بہت مقبول تھا۔ اِس زمانے کا ایک مشہور سیاح بزرگ بن شہریار ناخدا جس کا سفرنامہ دار السلطنت روس مین چھپا ہی لکھتا ہی کہ ۲۷۰ھ (۸۸۳ء) مین کسی ہندو راجہ نے مسلمان حاکم سندھ کو لکھا "مجھے مسلمانون کے عقائد سے مطلع فرمایئے" سندھ کے فرمانروا نے یہان کے ایک ماہر السنۂ ہند شاعر کو بلا کے حکم دیا کہ آپ عقائد اسلامیہ کو ہندی زبان مین لکھ دین۔ وہ ہندستان کی کئی زبانین جانتا تھا۔ اور سب مین شعر کہتا تھا۔ اُس راجہ کی زبان مین ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ نظم لکھی جسمین شریعت اسلامیہ کے کل اصول و عقائد موزون کر دیے تھے۔ اِس نظم کو سب نے پسند کیا۔ اور جب وہ راجہ کے پاس پہنچی تو شاعر کی قادر الکلامی کی بیحد داد دی۔ اُس کا مشتاق ہوا۔ اور حاکم سندھ کو لکھا اس شاعر کو آپ میرے پاس بھیج دین۔ وہ شاعر گیا جس سے راجہ نے قرآن مجید کا ہندی زبان مین ترجمہ کرایا اور اُسے بہت کچھ انعام و اکرام دے کے رخصت کیا۔

اس کے بعد جب قدیم سیاحان عرب اصطخری ابن حوقل بشاری اور مسعودی وغیرہ سندھ مین آئے ہین اُن کے بیانون سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہی کہ سندھ مین ہندو مسلمانون کا میل جول اِس قدر بڑھ گیا تھا کہ ہندو عربی معاشرت سے اِس قدر متاثر نہین ہوے تھے جس قدر خود عرب ہندوستانی معاشرت سے متاثر ہو گئے تھے عربون نے یہان کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ یہان کی عورتون سے نکاح کر لیے تھے۔ یہان کی زبان بولتے تھے۔ اکثر یہین کے نامون اور لقبون کو اختیار کرتے تھے۔ اور یہین کے رسم و رواج کے پابند تھے۔

لیکن یہ ایک داستان کہن تھی جسے لوگون نے بھلا دیا۔ اور جن لوگون نے تحقیق و تدقیق سے تاریخون کے ورق نہین اُلٹے انھین اِس کا یقین بھی مشکل سے آتا ہی۔ مگر یہ کسی قدر سچ بھی ہی کیونکہ ہماری موجودہ معاشرت کو ہندو مسلمانون کے اُس میل جول سے بہت کم تعلق ہی۔ ہماری معاشرت کی بنیاد اُس وقت پڑی جب کوہ سلیمان کی گھاٹیون سے نکل کے ترکی و ایرانی مسلمان ہندوستان مین آئے۔ اور جب سنسکرت آمیز ہندی اور عربی آلود فارسی زبانین ملین۔ اور گرم و سرد پانیون کے ملنے سے یہ نہایت ہی خوشگوار سمویا ہوا پانی بنا جس سے ہماری اُردو زبان مراد ہی۔

اِن آریہ نسب مسلمانون کے آنے کا آغاز بظاہر محمود غزنوی کے حملون سے نظر آتا ہی مگر دراصل ابوریحان بیرونی کی علمی کوششون سے ہوا جس کے وطن مین اگرچہ بڑا اختلاف ہی مگر میرے خیال مین سندھ کے فنا شدہ شہر بیرون یا نیرون کا رہنے والا اور اُس ہندی آمیز اسلامی تمدن کی آخری یادگار تھا جو حسب بیان متذکرۂ بالا سندھ مین قایم ہو گئی تھی۔ اُس نے عربی و سنسکرت دونون زبانون مین کمال پیدا کیا۔ ہندوستان کے اندرونی شہرون اور ہندوؤن کی قدیم علمی درسگاہون مین طالب علمی کی۔ ہندوؤن کے علوم عربی مین اور عربون کے علوم سنسکرت مین منتقل کیے اور برسون اُن شہرون مین رہ کے جہان اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہان کی مروجہ زبانین سیکھین اور ایک ایسا عجیب و غریب شخص بن گیا کہ آج تک مغرب کی علمی دنیا مین حیرت و ادب کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہی۔

اُسی عہد سے وابستہ فارسی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان ہی جس کی نسبت تذکرۂ مجمع الفصحا مین لکھا ہی "وے را سہ دیوان بود تازی و ہندی و پارسی"۔ مولانا شبلی لکھتے ہین "تمام تذکرے متفق اللفظ ہین کہ ہندی

زبان مین اُس نے ایک دیوان لکھا تھا۔ اُس کا خاندان اگرچہ ملک عجم سے آیا تھا مگر وہ خود لاہور مین پیدا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے زبان ہندی کا اتنا بڑا زبان دان ہو گیا کہ اس کثرت سے وطنی زبان مین شعر کہتا تھا کہ اُن کا ایک مستقل دیوان مدون ہو گیا۔

یہ غزنویون کے عہد اولین کا ایک نامور مسلمان شاعر تھا۔ اس کے چند ہی روز بعد مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم لکھتے ہین کہ شہاب الدین غوری کے عہد مین ہندوستان کے مشہور ہندی شاعر چند کوی نے پرتھی راج راسا لکھی تو اُس کے کلام مین کثرت سے فارسی عربی الفاظ موجود تھے۔

یون تو دو قومون کے ملتے ہی باہم مبادلۂ الفاظ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر اس لین دین کی حقیقی منڈیان دو ہوا کرتی ہین۔ اول بازار جہان ضروری اشیا کے خرید فروخت کے ساتھ لفظون کا سودا بھی ہونے لگتا ہے۔ دوسری نغمہ و سرود کی صحبتین خصوصاً جب ایک قوم کی محفل مین دوسری قوم کے مغنی آئین اور اپنی زبان کے گیت دلکش نغمون مین سنائین۔ عوام پر بازار کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور خواص یعنی امیرون۔ دولت مندون۔ اور معزز لوگون پر عیش و طرب کی صحبتین زیادہ اثر ڈالتی ہین۔ عام مسلمانون کے لیے بازارون مین الفاظ کے لین دین کی تجارت تو اُسی دن کھل گئی تھی جس دن مسلمان ہندوستان مین آئے تھے۔ مگر بزم طرب کی محفلین اُس وقت گرم ہو گئین جب مسلمان فرمانرواؤن نے اپنے دربار مین ہندو مغنیون کو جگہ دی اور ملکی طائفے نوکر رکھے۔ ساتھ ہی مشائخ صوفیہ نے ادھر توجہ کی۔ اور موسیقی کے روکنے کے لیے مسلمانون کے دلون پر جو مذہبی پہرہ تھا وہ اُٹھ گیا۔ علما نے اس سے اختلاف کیا۔ مگر قاضی حمید الدین ناگوری نے سلطان شمس الدین التمش کو اپنی ایک کرامت دکھا کے علما کے فتوون کے خلاف اور محفل سماع کا ایسا گرویدہ کر دیا کہ مشائخ کی محفلون مین طبل و سرود کا نغمہ گونجنے لگا۔

شمس الدین التمش نے عربی و عجمی نژاد مشائخ کا شوق پورا کرنے کے لیے غالباً ایرانی مغنیون کو اپنے دربار مین جگہ دی ہو گی مگر اُس کا بیٹا فیروز شاہ گانے کا ایسا دلدادہ ہوا کہ بڑے بڑے گوئیے دور دور سے آ کے اُس کی محفل نشاط مین جمع ہو گئے۔ اور ہر شہر اور ہر قصبے سے گانے ناچنے والی عورتون نے دہلی مین آ کے بسنا شروع کر دیا۔ جن مین سے بعض چوٹی کے صاحب کمال مطربون اور مغنیون کو اُس کے دربار مین خاص جگہ مل گئی۔ فیروز شاہ کے بعد یہ سلسلہ برابر بڑھنا شروع ہو گیا۔ معز الدین کیقباد و جلال الدین خلجی علاء الدین خلجی و دولت مغلیہ سے پیشتر کے وہ بڑے تاجداران ہند ہین جن کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ اور اُن کے شوق نے دہلی مین خصوصاً اور سارے ہندوستان مین عموماً ہزار ہا مطرب و مغنی پیدا کر دیے۔

ابن بطوطہ کو دہلی اور دولت آباد دونون شہرون مین "طرب آباد" نام کے محلے نظر آئے جن مین صرف ڈوم ڈھاڑیون کی آبادی تھی۔ اور یہی نہین کہ اُن مین فقط ہندو مغنی آباد ہون۔ ہندو مسلمان دونون تھے۔ مسلمان بھی معمولی مسلمان نہین بلکہ دیندار اور پابند شرع گویے جنکی وجہ سے اُن محلون مین مسجدین تھین۔ خوب آباد تھین۔ اُنمین پنج وقتہ نماز ہوتی۔ اور رمضان مین جماعت سے تراویح پڑھی جاتی۔ شاہی دربارون مین عموماً ارباب نشاط کے داروغہ یا چودھری مسلمان تھے۔ جو اکثر ایرانی الاصل ہوتے۔ ان دو عنصرون کے ملنے سے فن موسیقی کے مسائل مین باہمی۔ ردو بدل اور داد و ستد کے اصول کا جاری ہونا یقینی ہے۔ مگر اسی سلسلے مین موسیقی سے زیادہ اس لین دین کے عمل کا الفاظ مین جاری ہو جانا لازمی تھا۔ ہندوستان کے گوئیے مسلمان اُمرا کے خوش کرنے کے لیے فارسی نغمون اور فارسی زبان کے گیتون کو سیکھتے ہون گے۔ اور ساتھ ہی مسلمان سلاطین و اُمرا اُن کی وطنی چیزین

بڑے ذوق و شوق سے سُنتے ہون گے۔ موسیقی کے ذریعے سے زبانون اور راگون کے الفاظ کا یہ رد و بدل شمالی ہند ہی مین نہین جنوب مین بھی بڑی وسعت کے ساتھ اُسی زمانے مین جاری ہو گیا تھا اور ابو ریحان بیرونی اور مسعود سعد سلمان کے ایسے علما و شعرا نے علمی مخلون مین فارس و ہند کے مذاقون کے ملانے کی جو کوشش کی تھی وہ ارباب نشاط کے ذریعے سے اخلاقی و معاشرتی مخلون مین بڑے زور و شور کے ساتھ جاری ہو گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازارون مین عام لوگ دونون جداگانہ تمدنون کے ملانے اور ایک کو دوسرے سے قریب کر کے ایک کر دینے کے لیے جو نئے نئے نمونے پیدا کرتے وہ ارباب نشاط کی معرفت امرا اور دولتمندون کی مہذب مخلون مین پہنچ کے پسند کیے جاتے۔ اور اُسکے بعد جب شعرا و اہلِ علم کی صحبت مین پہنچتے تو انھین سندِ صحت و قبولیت مل جاتی۔

چند ہی روز مین یہ علمی تجارت اور زیادہ ترقی کر گئی۔ کشمیر کے حکمران سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانون مین بھی پورا دخل رکھتا تھا اکثر عربی و فارسی کتابون کا ترجمہ ہندی مین اور بہت سی ہندی کتابون کا ترجمہ فارسی مین کرایا۔ اور سب سے پہلے اُسی کے حکم سے مہابھارت و راج ترنگی (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی مین ہوا۔

اُسی قریب زمانے مین امیر خسرو کے اشعار شہرہ ہوے جنھون نے دہلی مین نشوونما پایا تھا۔ وہ شاعری کے علاوہ موسیقی مین بھی کمال رکھتے تھے۔ اور ہندی نژاد ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی ہر چیز کو پسند کرتے تھے۔ انھین ہندوستان کی زبان، ہندوستان کی معاشرت، ہندوستان کا موسیقی۔ ہندوستان کا مذہب۔ غرض یہان کی ہر چیز پسند تھی۔ اور انھون نے ہر چیز مین باہمی اتحاد اور ربط و ضبط کی کوشش کی۔ یہی نہین کیا کہ فارسی و ہندی دونون زبانون مین کمال پیدا کر کے سخن آفرینی کی۔ بلکہ اُنھون نے دونون جگہ کے علوم و فنون کے ساتھ دونون زبانون کو بھی ملایا۔ اور فارسی و ہندی الفاظ کو باہم مربوط کر کے اس مین نئے نئے جوڑ پیوند لگانا شروع کیے۔ ایک منظوم کتاب مین عربی فارسی اور ہندی کے ہم معنی اور مترادف الفاظ جمع کر دیے۔ جو خالق باری کہلاتی ہے۔ اور اگلے نصاب تعلیم مین داخل تھی۔ اِس کتاب مین مختلف لفظون کو ایک سلسلے مین منظوم کرنا ہی بجائے خود اُن کو باہم ملانا اور جوڑنا تھا۔

اِس کے بعد ہندوون نے فارسی پڑھ کے سلطنت کے دفاتر فارسی مین ملازمت شروع کی۔ اور اُسی کے مقابل بعض سلطنتون نے اپنے دفترون کو خالص ہندوستان کی وطنی زبان مین رکھا۔ اور مسلمان ملازمت کے لیے یہان کی وطنی زبان علمی حیثیت سے سیکھنے لگے۔

یہ تمام باتین صاف طور پر بتا رہی ہین کہ ان دونون مسلمانون اور ہندوون مین یہان میل جول اور ربط و ضبط کس قدر بڑھ گیا تھا۔ اور اِس ربط و ضبط اور اتفاق و یک جہتی کا پھل جو قیامت تک ہمارے گزشتہ اتحاد کو نہ بھولنے دے گا۔ وہ ہماری اُردو زبان ہے۔ اُس کا مٹنا دراصل اُس مبارک عہد کی یادگار کا مٹ جانا ہے جب ہم دونون مین دوستی کے درجے سے بڑھ کے عزیزداری و قرابت کا رشتہ خوب مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گیا تھا۔

ہر چیز کی تولید کے لیے والدین کی ضرورت ہے اور جس شخص یا جس چیز کی اصلیت کا پتہ لگانا ہو تو ہمین اُس کے حقیقی ماں باپ کو ڈھونڈھنا چاہیئے۔ اُردو کے ماں باپ یہی دو شخص ہین کہ بھاشا اور فارسی ہین جو اُس وقت ہندوون اور مسلمانون کی زبانین تھین۔ بھاشا وہ اصلی زمین ہے جس مین یہ پودھا اُگا۔ اور جس کی آب و ہوا مین اُس کا نشوونما ہوا۔ بمقابل اِسکے فارسی کو اِس زبان کی ولادت مین باپ کی حیثیت حاصل ہے

جس نے تخم ریزی کی۔ اور زمین ہند کے بطن مین ایک ننھے بچے کے لیے حیاتی مادہ پیدا کر دیا۔ جن لوگون نے مسئلۂ تولید مین غور کیا ہو وہ بخوبی جانتے ہین کہ ہر بچے مین جس قدر زیادہ اثر ماں کا ہوتا ہو باپ کا نہین ہوتا۔ اُس کا سارا جسم تمام اعضا۔ گوشت پوست رگ پٹھے سب ماں کے ہوتے ہین ایک خاص کی طرح پدری نطفے کے امتزاج سے اُس مین بعض پدری خصائل و عادات مخفی و مستتر رہا کرتے ہین۔ جو اکثر ثبوت دے دیا کرتے ہین کہ کس باپ کا بچہ ہو۔ اور اسی بنا پر مشہور ہے کہ

"الولد سر لابیہ"

یہ دونون اثر اُردو زبان مین صاف نظر آرہے ہین۔ اصلی ڈھانچہ۔ نظام نحوی۔ اصول اشتقاق سب خالص ہندی اور بھاشا کے ہین۔ فارسی و عربی الفاظ عزیز و پسندیدہ مہمانون کی طرح آکے اس طرح مل گئے کہ یک جان دو قالب ہو گئے ہین۔ آخر زمانے مین بہت سی فارسی کی بندشین بھی پوری پوری ترجمہ کر کے زبان مین شامل کر لی گئی تھین بلکہ بعض شعرا نے یہانتک کیا کہ اُن فارسی بندشون کو اُسی فارسی ترکیب سے اُردو مین نقل کر لیا۔ لیکن غور سے دیکھیے تو وہ بندشین بالکل بے ربط ہین۔ اور اسی وجہ سے زبان مین کبھی نہ شامل ہو سکین۔ انشاء اللہ خان۔ اور مظہر جانجانان کی جو گفتگو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آب حیات مین نقل کی ہو اُسے پڑھکر حیرت ہوتی ہو کہ اُن دونون فارسی لفظون کے ساتھ فارسی بندشون کو بھی وہ کس بے احتیاطی سے گفتگو مین شامل کر دیتے تھے۔ سید انشا کہتے ہین "ابتدائے سن صبا سے تا اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن اشتیاق مالا یطاق تقبیل عتبۂ عالیہ بحدے تھا کہ سلک تحریر و تقریر مین منتظم ہو سکے۔" مرزا صاحب جواب دیتے ہین "اپنے تئین کو ان بھی بد طفلی سے تھین ایسے اشخاص کے ساتھ مؤانست اور مجالست رہا کی ہو۔" اس قسم کی چند بندشین مرزا غالب کے بعض شعرا مین بھی ہین لیکن اُن دونون لوگون کی زبان سے ایسی ترکیبین محض اس وجہ سے نکل جاتی تھین کہ درباری زبان فارسی تھی۔ فارسی شعر و سخن اور ایرانی ادب کی مہذب صحبتون مین زیادہ قدر تھی۔ فارسی دانی کا اظہار بات کرنے والے کی علمی قابلیت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگون کو اپنی لیاقت ظاہر کرنے کے شوق مین اِس کا خیال نہ رہتا کہ فارسی کے استعمال مین ہم کہانتک بے احتیاطی کر رہے ہین بعینہ جس طرح آج کل اکثر انگریزی دان حضرات انگریزی لفظون اور جملون کے استعمال مین بے احتیاطی کیا کرتے ہین۔ اسی کا یہ نتیجہ ہو کہ فارسی کا دور ختم ہوتے ہی اس قسم کی تمام بندشین زبان سے نکل گئین۔ اور چھن چھنا کے وہ زبان باقی رہ گئی جس کا آخذ چاہیے کہین سے ہو مگر اب اُردو ہو اور خالص اُردو۔

مین خیال کرتا ہون یہ اصول معلوم ہونے کے بعد کہ اُردو کا اصلی ڈھانچہ ہندوستانی ہو۔ اور اُس مین فارسی و عربی الفاظ کا فقط ضماسن پڑ گیا ہو۔ یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہو کہ اُردو مین ہندی و سنسکرت و فارسی و عربی کو کس حد تک کتنا اور کس قسم کا تصرف کرنے کا حق حاصل ہو۔ اُردو کے ساتھ مذکورۂ بالا زبانون کا رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد یہ مسئلہ بہت با اصول طریقے سے صاف ہو جاتا ہو۔ اس کی بندشون نحوی ترکیبون ترتیب الفاظ۔ افعال کی گردانون صفات و روابط کے استعمال اور ضمائر و صفات سے کام لینے مین دخل دینا خاص سنسکرت اور بھاشا کا حق ہو۔ اُس مین اگر عربی زبان دخل دے تو وہ زبان کو بنائے گی نہین بلکہ بگاڑ دے گی۔ اس لیے کہ اُردو کا اصلی ڈھانچہ بھاشا و سنسکرت سے ماخوذ اور اُنھین کا بنایا ہوا اور بالکل آرین اصول کا ہو۔ فارسی کو اس مین دخل دینے کا کسی قدر حق ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بھی آرین زبان ہو۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اُردو کا اشتقاق اور اُسکی نحوی ترکیبین بالکل بھاشا کے مطابق ہین۔ رہی عربی اُسے تو اُس مین دخل دینے کا مطلق حق

ہی نہین ہو۔ بمقابل اسکے عربی کو ترکیب و اصول نحوی چھوڑ کے صرف یہ حق حاصل ہو کہ اپنے ذخیرۂ الفاظ مین سے اُردو کو نئے نئے الفاظ دے۔ اس لیے کہ تولید زبان مین اُس کا جو پہلا حصہ مین پڑا تھا اُس نے اُردو کی بندشون مین عربی الفاظ کو مہمان عزیز اور مانوس بنا دیا ہو اور جسطرح ہر باپ کو حق ہو کہ اپنے فرزند کو اپنے علمی و ادبی فنون سکھائے اسی طرح عربی کو حق ہو کہ اُردو کے لیے نئی اصطلاحین مہیا کرے اُسکے ذخیرے مین اپنے الفاظ سے وسعت و متانت پیدا کرے۔ اور دنیا کو دکھائے کہ یہ بچہ اگرچہ ہندی مان کے بطن سے پیدا ہوا ہو مگر میرا فرزند ہو۔

آپ ملاحظہ فرماتے ہین کہ اُردو مین زبردستی چاہے جس زبان کے اسم لیلیے جائین مگر ربط نہین کھاتے اِس کے فطری اوزان سے باہر ہتے ہین۔ عربی الفاظ اس مین آتے ہی اُس کے سانچے مین ڈھل جاتے ہین۔ اور یہ امتیاز کرنا دشوار ہوتا ہو کہ وہ خالص اُردو لفظ ہین یا عربی سے لیے ہوے۔ اِس لیے جس طرح عربی و فارسی کے لیے یہ ناجائز ہو کہ اُردو کی نحوی ترکیبون اور بندشون مین دخل دین۔ اسی طرح بھاشا اور سنسکرت کے لیے ناجائز ہو کہ اِس زبان کے ذخیرۂ الفاظ مین نئے غیر مانوس الفاظ داخل کرین جو اُس کے فطری اوزان اور تلفظ و نوعیت کے خلاف ہین۔

لیکن دونون کے حدود مقرر کر دینے کے بعد مین یہ کہنے پر مجبور ہون کہ زبان اُردو کا جو ڈھانچا در اصل سنسکرت اور بھاشا کا بنایا ہوا ہو اس لیے یہ زبان خالص آرین زبان ہو۔ اور عربی و فارسی نے فقط اسے اپنے خوبصورت الفاظ کا زیور و لباس پہنا دیا ہو اس بنا پر مدت دراز سے میری راے ہو کہ جو لوگ اُردو نحو و صرف مرتب کرنے مین عربی قواعد زبان سے مدد لیتے ہین سخت غلطی مین مبتلا ہین۔ عربی کے قواعد ہماری زبان مین ہرگز پورے نہین اُتر سکتے۔

نحو و صرف کی اصلی عمارت افعال کی بحث پر قائم ہوا کرتی ہو۔ عربی اور میرا خیال ہو کہ تمام سامی زبانون مین فعلون کا اشتقاق بغیر کسی دوسرے فعل کے مِلائے فقط ایک حرف کے بڑھانے گھٹانے یا حرکتون کے بدل دینے سے ہو جاتا ہو۔ بخلاف اسکے آریہ زبانون مین بغیر کسی دوسرے فعل یا لفظ کے ملائے پورا اشتقاق نہین ہو سکتا۔ اسی طرح نحو اُردو کے صدہا مسائل ہین جن کے بیان کرنے کا وقت نہین ہو مگر وہ سب ثابت کرتے ہین کہ اُردو آرین زبان ہو۔ سامی نہین۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہو کہ اِس زبان کو جو اُنس اور جیسا اتحاد بھاشا اور سنسکرت سے ہو فارسی و عربی سے نہین۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہو کہ اُردو سے اگرچہ ہندو مسلمان دونون کو قریبی تعلق ہو اور دونون اُس کے پیدا کرنے والے ہین مگر ہندوؤن کا تعلق زیادہ مضبوط اور بہت بڑھا ہوا ہو۔ ساری دنیا جانتی ہو کہ اولاد کے ساتھ جو محبت مان کو ہوتی ہو باپ کو نہین ہو سکتی۔ لہذا بیچ یہ ہو کہ اپنی مان کے اُس فرزند کے ساتھ ہندوؤن کو بمقابل مسلمانون کے زیادہ محبت ہونی چاہیے جو اُسکے علاتی بھائی ہین مگر بخلاف اس کے ہم دیکھتے ہین کہ اکثر ہندو احباب نے اس کی طرف سے بے پروا ہو کے سرد مہری اختیار کر لی ہو۔

اس مین شک نہین کہ اس مین ہمارا بھی قصور ہو جب ہندوؤن نے ہندی کے درست کرنے اور ترقی دینے کی کوشش شروع کی تو ہم نے ہندی کو اُردو کی ایک رقیب زبان خیال کر کے یہ غلط دعوی کیا کہ اُردو ہماری زبان ہو اور ہندوؤن کی نسبت یہ راے قائم کر لی کہ انھین اُردو سے اور اُردو کو اُن سے کوئی تعلق نہین۔ حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ اُردو کا جسقدر حق ہندوؤن پر ہو اور جیسی محبت انھین اِس کے ساتھ ہونی چاہیے وہ بہ نسبت ہمارے تعلقات کے بہت زیادہ ہو۔ لیکن ہمارے اِس غلط دعوے کا یہ نتیجہ ہوا کہ نوجوان ہندوؤن نے اور زیادہ

گرم جوشی سے اُردو کی مخالفت شروع کردی۔ اور یہ مسئلہ متعصبانہ طریقے پر روز بروز زیادہ ناگوار صورت پیدا کرتا گیا۔ مگر مین کبھی اس کو باور نہ کرون گا کہ ذی فہم اور متین و سنجیدہ ہندو حضرات ایک گھڑی کے لیے بھی اِس بات کو جائز رکھتے ہون گے کہ اُردو کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اُنھین اُردو کا درد ہم سے زیادہ ہونا چاہیئے اور یقیناً اِس بات کو وہ کبھی گوارا نہ کرین گے کہ جس زبان نے پنڈت دیاشنکر نسیم اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ایسے صاحب کمال سخن سنج پیدا کیے جسمین ہزارہا نہین لاکھون ہندو شعرا و ادیب سخن آفرینی کے جوہر دکھا چکے ہین۔ اُسے ہمارے ہندو دوست دشمن کی نظر سے دیکھتے ہون گے۔

اب وقت ہو کہ ہندو اور مسلمان اِس اپنی پیدا کی ہوئی زبان کے سر پر اتفاق یک جہتی سے اپنا شفقت کا ہاتھ رکھین۔ اور ہماری حماقتون سے جو غلط فہمیان پیدا ہو گئی ہین اُن کو دور کرین نیز ملکے اِس خوبصورت بچے کی پرورش کرین۔ جو اُنکے اگلے اتحاد کی زندہ برکت ہو اور اُنھین کے آغوش مین کھیل کے ترقی کے درجے کو پہنچا ہو۔

بس اسی تمنا و آرزو پر مین آپ حضرات کی سمع خراشی موقوف کرتا ہون لیکن آخر مین اتنا کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ اگر آپ اُردو زبان کے سچے ہمدرد ہین تو ہندو مسلمانون مین اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کیجیے۔ ورنہ وہی انجام ہوگا جو ماں باپ کی باہمی لڑائی اور جھگڑے فسادسے اُن کے بچون کا ہوا کرتا ہو۔

خیالات پریشان

یادش بخیر، لکھنؤ، ماہ دسمبر مین ایک عشرت کدہ بنا ہوا تھا اسکے چپہ چپہ مین دل کو کھینچ لینے کی جو تاثیر ہمیشہ سے ہے وہ اِس مہینے مین پورے طور پر اپنی کمرانی طاقت کو کام مین لا رہی تھی۔ سارا ہندوستان چارون طرف سے اُمنڈ آیا تھا۔ اور ہر طرف ایک میلا سا لگا نظر آتا تھا۔ اس "کشش" سے متاثر ہونا ہمارے لیے بھی باہر تھا۔ اُدھر احباب کو بھی اصرار کا موقع ہاتھ آیا۔ خطوط اور طلبی کی وہ بھرمار رہی کہ بے لکھنؤ آئے چارہ کار نظر نہ آیا۔ آئے تو تھے کہ کانفرنس وغیرہ کی شرکت کے بہانے بچھڑے ہوے دوستون سے بھی خوب جی کھول کر مل لینگے لیکن آہ! یہ وہ حسرت ہے جو کبھی پوری ہونیوالی نہین۔

ہر حال اس موقعہ پر جہان تک ممکن ہوا دلچسپی سے وقت گزارنے کی کوشش کی گئی برسون اور مدتون کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ دل و دماغ کثرتِ کار کی اُلجھنون اور کشاکش سے فارغ اور ہجوم ترددات و افکار سے آزاد تھا لیلائے کتاب کا دیوانہ جسکو بغیر کتاب دیکھے سونا حرام ہے ہی کچھ اسکی قدر کر سکتا ہے۔ مگر کتاب نا کہان؟ آخر ایک دوست سے کہا کہ بھائی جاڑے کی پہاڑ سی راتین تنہائی و بے شغلی سے کاٹے نہین کٹتین، کوئی کتاب ہی دیکھنے کیلیے دیجیے انھون نے بہت سے نام بتائے خیر ہم نے دریائے لطافت کو لیلیا جو کہنے کو تو میر انشاء اللہ خان و مرزا قتیل کی فارسی زبان مین ہے قواعد صرف نحو کی کتاب ہے مگر علوم معانی و بیان و بدیع اور بہت سی مفید باتین اسمین جمع کی گئی ہین۔ یہ نادر کتاب چھپوا کر انجمن ترقی اُردو نے ملک پر جو احسان کیا ہے وہ بڑے شکریہ کا مستحق ہے۔ بہر حال کتاب کو بڑے شوق سے اول سے آخر تک پڑھا اور

جسقدر کتاب کے وجود مین آنیکی مسرت ہوئی اُسیقدر بعض خیالات سے رنج بھی ہوا۔ افسوس ہی کہ ہماری اس شیرین زبان کی عمر بہت چھوٹی نہین ہی سیکڑون شاعر و ادیب اُسنے پیدا کیے لیکن بد قسمتی ہی کہ جس طریقے اور موضوع پر رسالۂ لطافت تصنیف کی گئی ہی اُس ملک مین اور کوئی ایسی کتاب اُردو کی موجود نہین ہی اور کسی نے آج تک ادھر توجہ کرتا صرف دکن مین البتہ اب سکرٹری صاحب انجمن ترقی اُردو نے ایک بسیط و مفصل کتاب لکھی ہی۔ مگر علم ادب اور نظم و نثر سے جو فنون لطیفہ اور علوم تعلق رکھتے ہین اُن مین کوئی ایسی کتاب نہین لکھی گئی جو مجموعی حیثیت سے انشا پردازی اور علم ادب کی تمام ضرورتون کو پورا کرتی ہو علم بیان و معانی و بدیع پر ضرورت ہی کہ ایک مستقل کتاب نہایت مفصل اور شرح تیار کی جائے جو تمام لوازم کو حاوی ہو۔ ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے تو کئی نظر سے گزرے جن مین اختصار کے ساتھ اِن علوم سے بحث کر دی گئی ہے، مگر وہ بھی فارسی و عربی کی تقلید مین ورنہ اور کچھ بھی نہین۔ فارسی کے قواعد کی کتابون مین بھی مختصراً اِن باتون کا ذکر آجاتا ہی۔ اس وقت تک اِدھر کسی کا خیال نہ گیا اور کسی شاعر و ادیب نے بھی اِس کی ضرورت محسوس کی اور اب جو انجمنین ترقی اُردو کی خدمت کے لیے جا بجا قائم ہو رہی ہین یا ہو چکی ہین اُن سے بھی توقع نہین کہ انگریزی ترجمون سے فرصت ملے۔ یہ صرف ہم لوگون ہی کا کام ہے کہ ایک ضخیم و بسیط کتاب ان علوم پر اُردو مین تیار کرین۔ اس وقت بھی ہندوستان مین اُردو کے ہزارون شاعر اور علم ادب کے نام لیوا موجود ہین لیکن کتنے ایسے ہون گے جو اچھی طرح عروض جانتے ہون، علم قافیہ سے واقف ہون، اور معانی و بیان و بدیع پر اُن کو عبور حاصل ہو، زبان کی فصاحت و بلاغت کو سمجھتے ہون، اُس کا کوئی معیار اُن کے ذہن مین ہو۔ میرے خیال مین مشکل سے صرف چند ایسے لوگ نکل آئین گے ورنہ اکثر موزون طبع ہین۔ قدرت سے ایک طاقت دی گئی ہی اُس کو کام مین لانے کے سوا اور کچھ نہین جانتے۔

کاش! کوئی صاحب ہمت کر کے اس میدان مین قدم رکھین۔ اور بہتر ہوگا کہ یہ کام لکھنؤ مین کیا جائے۔ یہان نسبتہً آسانی رہے گی اول تو یہان ہر علم و فن کی کتابین بکثرت میسر آسکتی اور آتی رہتی ہین پھر اُردو زبان کا یہ ایک صدر مقام و مرکز بھی ہے، اور اس وقت جس قدر شعرا لکھنؤ مین ہین دعویٰ سے کہہ سکتا ہون کہ ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے شہر مین بھی اتنے نہ ہون گے۔

بہر حال عربی، فارسی، اُردو کی موجودہ کتابون کی مدد سے اگر لکھا جائے تو بہت کچھ کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔ اِس مشکل کا آسان ہونا کچھ زیادہ دشوار نہین ہے۔ میرے خیال مین صرف ایک ماہانہ مشاعرہ کر دینا کوئی چیز نہین ہے اور نہ اس قسم کے جلسے تفریح کے سوا کچھ نتیجہ خیز اور مفید عام ہو سکتے ہین۔

اِسی دوران مین ایک اور خیال پیدا ہوا، اور وہ کس قدر دل دُکھانے والا ہی۔ مین نے بچشم خود دیکھا ہے کہ قدیم مطبوعہ اور قلمی نایاب دواوین اور نادر اُردو و فارسی و عربی کتب کا ذخیرہ نخاس مین کوڑیون کے مول فروخت ہوا کرتا ہے۔ اس طرح سیکڑون عمدہ عمدہ کتابین ناپید و منتشر ہو گئین۔ کاش لکھنؤ مین کوئی ایسا کتبخانہ ہوتا جو ان جواہرات گران مایہ کو مٹنے سے بچاتا، اور کم سے کم اساتذہ کے دواوین و تذکرہ جات اور اُردو کی قدیم تصانیف یکجا نظر آتے۔

اب بھی اگر یہ خیال قوت سے فعل مین آجائے تو بہت کچھ کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کا کتب خانہ ہوگا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثل و لاجواب کہا جا سکیگا۔ ورنہ بہت کچھ مٹ چکا ہے اور جو کچھ ہے وہ مٹا جا رہا ہے۔ البتہ یہان یہ کہنا ضروری ہے کہ نولکشور پریس نے جو احسانات اُردو زبان بلکہ علمی دُنیا پر کیے ہین، وہ کبھی فراموش کرنے کے لائق نہین۔ اُن کو بھول جانا کفران نعمت اور ایک ناقابل معافی گناہ ہی۔ سچ تو یہ ہے

کر اگر اپنے تجارتی اغراض سے ایک بڑا کثیر سرمایہ اِس نے نہ لگا یا ہوتا تو ہمارے قدیم اساتذہ کے دیوان اور تصانیف بالکل معدوم ہو چکے ہوتے اور ڈھونڈھے سے کہیں نہ ملتے۔ یہ کیا کم احسان ہی کہ ایک چیز میسر تو آجاتی ہی گو یہ پریس اپنی خراب اور غلط چھپائی مین بھی بدنام ہو گیا ہے، تاہم آپ کلیات میرہی کو لے لیجیے۔ میر کو خدائے سخن آپ کہتے ہین، مگر سچ بتائیے کہ اُس کے لختِ جگر یعنی کلام کی آپ نے کیا قدر کی؟ کیا یہ شرم کی بات نہین کہ نہایت سڑے کاغذ پر غلط سلط اور بدخط چھپا ہے اور آج تک کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ پورا کلیات نہ سہی، اُس کا انتخاب ہی ایک نہایت عمدہ صورت سے پوری صحت کر کے چھپوایا جاتا۔ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی اور یورپ کے مستشرق پریسون سے سبق لینا چاہیے، جو سیکڑون نسخون سے صحت کر کے کس قدر عمدہ طور پر نایاب و نادر عربی، فارسی کتابین ہزارون لاکھون روپیہ صرف کر کے طبع کراتے ہین، اور وہ کتابین بڑی بڑی قیمتون پر ہاتھون ہاتھ بک جاتی ہین۔ لیکن ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ قدیم مصنفین کی کتابون کو ردی کے مول خریدنا اور دیکھنا بھی وبال جان سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہی کہ جس قوم و ملت مین اسلاف پرستی نہین وہ کبھی شاہراہِ ترقی پر نہین آسکتی اور وہ قعرِ فنا کی طرف جا رہی ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم جس طرح یورپ کی اور بہت سی بیہودہ باتون مین تقلید کرتے ہین، اِن مفید و کار آمد باتون مین بھی پیروی کرین، اور علمی دنیا مین اپنے کو للہ نہ ہنسوائین۔ دنیا مین غیرت و حمیت اگر کوئی چیز ہے، اور علم دوستی اگر کچھ اصلیت رکھتی ہے، تو بہتر ہے کہ اب بھی ہم خوابِ غفلت سے چونکین، اور کھیل کود کی باتون کو چھوڑ کر ادھر ہمتین مبذول کرین۔ وقت کی رفتار برق کی رفتار سے کم نہین۔ دن گزرتے جاتے ہین، اور مشکلون مین روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر ہم محنت کرین تو بہت کچھ ذخیرہ نایاب ہاتھ آسکتا ہے۔ افسوس ہم کو یہ خبر نہین کہ قومون کی ذہنی و مادی و روحانی ترقی کا اصلی راز یہی ہے کہ اسلاف کے کارنامون کی قدر کی جائے اور اُن کی یاد زندہ کی جائے۔ ہم دیکھین کہ وہ کیا کر گئے اور کیا کرتے تھے جو دنیا مین اسقدر مقبولیت حاصل کی۔ ہم بھی وہی کام کیون نہ کرین جس سے دوامی عزت حاصل ہو۔ مصر و شام مین جب تک یہ خیال پیدا نہ ہوا عربی کا لاجواب ذخیرۂ علوم و فنون مٹتا چلا گیا۔ ہزارون لاکھون جواہرات خاک گمنامی مین مل گئے۔ بعض کے نام رہ گئے، اور اکثر کے نام بھی معلوم نہین۔ مگر یورپ کی تقلید مین کوشش ہو رہی ہے کہ قدیم تر تصانیف تلاش کر کر کے محنت و صرفِ زر کر کے جس طرح بھی ممکن ہو ملک مین شائع کی جائین۔ مصر و شام پھر بھی پیچھے ہین۔ جرمن اور فرانس نے اس قسم کی مساعی مین سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور اِن دونون سلطنتون نے بڑی بڑی رقمین احیارِ علوم کے لیے صرف کر ڈالی ہین محض علم پروری کے لیے طبقات ابن سعد جو تاریخ کی ایک مشہور و لاجواب کتاب ہے اور دنیا مین مفقود تھی، جرمنی کے ایک مستشرق پروفیسر نے تقریباً بیس سال کی لگاتار محنت سے اُس کو بہم پہنچا کر طبع کرایا اور قیصر جرمنی نے جو اب خون خوار مشہور ہے ایک لاکھ روپیہ صلہ مین دیا۔ اس طرح فرانس اور جرمنی کے علاوہ یورپ کے دیگر مقامات مین بھی بڑے پیمانے پر یہ کام ہو رہے ہین۔ ہالینڈ مین ایک بہت بڑا پریس "بریل" ہے جس نے سیکڑون ہزارون عربی و فارسی کی قدیم و نایاب کتب بہم پہنچا کر اور متعدد نسخون سے صحت کر کے طبع کر ڈالین گیبن موریل سیریز خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے اور جسطرح انگریزی کتابین جلد کی عمدگی اور نفاستِ طبع کے لحاظ سے بھی لائق دید ہوتی ہین ویسے ہی یہ عربی و فارسی کی کتابین بھی ہین۔ بخلاف اِس کے

ہمارے لائق علم دوستوں کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی ایسی نادر کتاب پا بھی جاتے ہیں تو اُس کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتے خواہ اُن کے بعد اُس کا حشر کچھ ہی ہو۔ مصر و بیروت میں اس کا خوب احساس ہوگیا ہے مگر ایشیا میں اور ممالک کی یہ حالت نہیں ہے۔ وہاں علاوہ قدیم علمی و ادبی و تاریخی اور لغت کی تصنیفات کے ایام جاہلیت کے شعراء کے دواوین کس قدر محنت و تلاش کے بعد عمدہ خوبصورت طبع کیے گئے ہیں۔ اُنکی شرحیں لکھی گئیں قدیم مدقق الفاظ جواب تک کیے گئے، اُن کا حل جابجا کیا گیا، اور تمام ملک میں اُن کی قدر کی جاتی ہے۔ لیکن ہماری حالت اس کے بالکل خلاف ہے۔

اگر ہم اُردو کو زندہ رکھنا اور علمی زبان بنانا چاہتے ہیں تو ضرورت ہے کہ ایسے جواہر پاروں کا کھوج لگائیں لیکن افسوس! ہماری حالت یہ ہے کہ پُرانی کتابوں کا پڑھنا بھی بار ہے اور کیونکر نہ ہو۔ ایک کلیات سودا بازار سے لے آئیے، اور پڑھنا شروع کیجیے سیکڑوں اور ہزاروں الفاظ ایسے ملیں گے جن کو اور لوگ تو کیا اہل لکھنؤ و دہلی بھی نہ سمجھ سکیں گے، جن کو اہل زبان ہونے کا بڑا دعویٰ ہے۔ اُن کی شرحیں لکھنا، محنت اور متعدد نسخوں سے اُن کی صحت کرنا اور برسہا برس کی لگاتار محنت کے بعد عمدہ چھپوانا تو ایک ایسا کام ہے جس کا خیال بھی دل میں نہیں پیدا ہوتا۔ پڑھنا اور دیکھنا ہی تضیع اوقات و فعل عبث سمجھا جاتا ہے۔ مگر ایسا سمجھنا نہایت لغویت اور ہماری کوتاہی خرد کی دلیل ہے۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ روزمرہ کی بول چال میں انسان کو جن الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے وہی رہ گئے اور اب الفاظ کا دائرہ روز بروز تنگ ہوتا جاتا ہے۔ ہزاروں نئے عربی، فارسی، انگریزی الفاظ اُن کی جگہ لیتے جاتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جدید علوم کی ترقیوں کی ضرورت نہیں، وضع اصطلاحات کی حاجت نہیں، مگر اس شعبہ سے بے اعتنائی کرنا بھی ہماری بدمذاقی کی دلیل ہے۔ کیا دُنیا کے سب لوگ ایک ہی کام کرتے ہیں۔ یہ بالکل کارخانۂ قدرت کے خلاف ہے کوئی کسان ہے اور کوئی تاجر، ہر ایک فرقہ کی خدمات کی نوعیت جداگانہ ہے۔ پھر ہم کو کیوں نہ اِس اصول سے باخبر ہونا چاہیئے!

یہ داستان ایک دردانگیز داستان ہے۔ کاش کوئی باہمت کھڑا ہو۔ اور ایک جماعت کو اپنا رفیق سفر بنا کر اس دریا میں اپنی کشتی ڈال دے۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ دُنیا کو اب نہیں تو کبھی نہ کبھی ادھر توجہ کرنا پڑے گی مگر اُس وقت کام اور دشوار ہو جائے گا۔ اخلاف ہم اسلاف کی بےحسی پر نفرین کریں گے، اگر درحقیقت اُردو زبان کی قسمت میں عروج اور زندہ زبان بننا ہے تو یہ دن جلد آنے والے ہیں۔ ورنہ ایک نہ ایک دن اسکو فنا ہے۔

آب جاتے ہیں اوس سے پیاس نہیں بجھتی۔ دوسرے تیسرے دن پھر انھیں دوست سے اور کتاب کی فرمائش کی گئی اور بہت سے نام سننے کے بعد خمخانۂ جاوید کو لے لیا۔ یہ ایک جدید تصنیف اور ضخیم تذکرۂ شعراء ہے۔ میں اخبارات میں اس کے ریویو بھی دیکھ چکا تھا اور عرصہ سے اشتیاق تھا۔ دیباچہ سے پڑھنا شروع کردیا۔ تذکرہ کی ضخامت دیکھکر تو خیال ہوا تھا کہ مدتوں سے جو آرزو دل میں دبی تھی وہ آج پوری ہوگئی آب حیات کے بعد یہ تذکرہ اس کا تتمہ ہوا۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی عام زبان اُردو کا یہ اتنا بڑا تذکرہ ہے کہ نہ اس سے بڑا لکھا گیا اور نہ امید ہے کہ آیندہ لکھا جائے۔ مگر افسوس ع

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

اس کے دوران مطالعہ میں جو خیالات پیدا ہوئے اُن کا ذکر بھی کرنا مناسب ہے۔

دُنیا کی ہر ترقی یافتہ و علمی زبان مین شعر و سخن کو ادبیات و علوم کا ایک بڑا جزو قرار دیا گیا ہے۔ اُس کی خدمت کرنا اپنی قومی ہستی کا ایک ضروری فرض سمجھا گیا ہے۔ مگر بدنصیب اُردو کی حالت اس کے خلاف ہے۔ اُس پر ہنسا جاتا ہے اور اُس کی تحقیر کی جاتی ہے۔ اس مین جس قدر تعلیم یافتہ لوگون کی زیادتی ہے اُتنی نہین تو کسی قدر شعراء کی پست خیالی اور بعض دوسری وضعداریون کو بھی دخل ہے۔ مشاعرے کی رفتار بھی اگر زمانہ کی رفتار کے قدم بقدم ہوتی تو ہمین اپنے بھائیون کی گلہ بندی کا اتنا موقع نہ ملتا۔ اب تک بہت سی پرانی باتین بدستور ہین جن کو سنتے سنتے کان تھک گئے اور دل اکتا گیا مگر ہم ہین کہ انھین پر اڑے ہوے ہین۔ دنیا کی رفتار ترقی تو یہ ہے کہ باہم خبر رسانی کے لیے تار اور "لاسلکی" یعنی بے تار کی تار برقی ایجاد ہو چکی، اور رات دن اُس سے کام لیا جاتا ہے۔ سیکڑون کوس سے تھوڑی دیر مین تبادلۂ خیالات کر لینا ایک کھیل ہو گیا ہے مگر ہمارے شاعر ابھی تک کبوترون ہی سے پیغام رسانی کا کام لے رہے ہین اور ہمیشہ جواب مین خون کبوتر یا قاصد کی لاش آتی ہے۔ سواری کے لیے موٹر سائیکل ریلوے ایجاد ہو چکے، دم بھر مین انسان میلون کا سفر کر سکتا ہے، اور رئیسون مین موٹر لینڈو کا ہونا داخل وضعداری ہو گیا ہے۔ مگر ہمارا شاعر جب بیابان کی خاک چھاننے جاتا ہے تو پا برہنہ اور پھر خار مغیلان اُس کے پیرون کو اس قدر چھلنی چھلنی کر دیتے ہین کہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے یا چلتے چلتے چھالے پڑ جاتے ہین کہ قدم اُٹھانا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ بیچارہ قیس جسکو صحرا نوردی کا خاص ذوق ہے اور جس کا فرض زندگی اس کے سوا ہے ہی نہین کبھی سواری پر سفر نہین کرتا۔ یہ دیوانہ سواری کو کیا جانے! بی لیلٰے ان کی چہیتی جب اِن کی خاطر کسی دشت و وادی کی طرف جاتی ہین تو ناقہ محمل ہی سے کام پڑتا ہے۔ خاک اُڑتی جاتی ہے اور بی لیلٰے شتربان کے شتر غمزے اُٹھاتی ہوئی اس کی للو پتو کرتی ہوئی راستہ سے پھیر کر منزل مقصود کی طرف لانے کی کوشش کرتی ہین تاکہ بیابان قیس سے ملاقات ہو جائے۔ اسی طرح یورپ مین سائینس نے حربیات اور فنون جنگ مین حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ بم پھینکنا گیس چھوڑنا مشین گن توپون سے گولے برسانا اور سیکڑون طریقے ہین، جن سے دشمن کو سخت سے سخت نقصان پہنچایا جا سکتا ہے لیکن بیچارے سادہ دل و سادہ مزاج شاعر اور اُس کے معشوق مین عجیب قسم کی لڑائی ہوتی ہے۔ معشوق تیر نظر اور تیغ ابرو اور مژگان کی سنانون سے کام لیتا ہے۔ اپنے حریف کو اسیر کرنے کے لیے زلفون سے شکنین کس لیتا ہے۔ اور سخت سزا دینا مقصود ہوتی ہے تو ناگنون سے ڈسواتا ہے، اور اس قسم کے سیکڑون مفروضہ مظالم ہین جو عاشق زار کی جان ناتوان پر کیے جاتے ہین۔ اور جو اُس کے خرمن جان کے لیے برق خاطف کا کام کرتے ہین۔ اور مزا تو یہ ہے کہ شاعر صاحب مرنے کے بعد بھی چین نہین پاتے قیامت تک فریاد کیا کرتے ہین۔ مگر داور حشر کے یہان بھی ان کی شنوائی نہین ہوتی ہے۔ غرض ایسی بہت سی باتین ہین جن کو مبالغہ کے سوا اور کچھ نہین کہہ سکتے۔

خیر یہ تو مذاق تھا۔ انصاف شرط ہے۔ تیر نظر مین جو بات ہے وہ مشین گن مین کہان۔ زلف کی ناگنون سے ڈسوانا جو مزہ رکھتا ہے وہ امریکہ کی جان سلب کرنے والی برقی مشین سے کب حاصل ہو سکتا ہے محمل کی سواری مین جو لطف میسر ہے وہ موٹر اور ریلوے مین کیونکر میسر آئے۔ اس کا فیصلہ مذاق سلیم پر منحصر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہم کو بھی اصلاح خیالات کی ضرورت ہے۔ بیان مین بھی جدت چاہیے اور مضامین مین بھی ندرت۔ سڑی گلی ہڈیان کب تک جھنجھوڑا کرین گے۔ اِدھر گو غزل جان شاعری ہے مگر نزاکت خیال کا خیال بھی لازمی ہے۔

میرا ایک اور بھی خیال ہے۔ وہ یہ کہ ترتیب دواوین و تذکرہ کا پرانا طریقہ یہ ہے کہ ردیف وار غزلین اور نام ہوتے ہین یہ نہایت فرسودہ طریقہ ہے اور اس کی پابندی فضول ہے زمانہ وار ترتیب ہونا چاہیئے! اس مین بڑی خوبی یہ ہے کہ بلند و پست کلام یکجا نہ ہوگا اور شاعر کی تدریجی ترقی کا حال دیکھنے والے پر کھلتا رہے گا عجب مشکل ہے کہ ردیف وار ہونے کی وجہ سے سنہ ۱۲۹۰ھ اور سنہ ۱۳۲۰ھ کی کہی ہوئی غزلین یکجا ہوجاتی ہین۔ دونون کو پڑھنے سے اس قدر فرق مین نظر آتا ہے کہ قوت فیصلہ کو بھی حیران ہونا پڑتا ہے اور ادھر خیال منتقل ہی نہین ہوتا کہ ایک غزل تیس برس پہلے کی کہی ہوئی ہے ہندوستان ہی مین امیر خسرو کو لیجیئے جن کی شہرت نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ مین بھی ہے انھون نے اپنے دواوین کو زمانہ کے لحاظ سے مرتب فرمایا۔ ایک دیوان ابتدائی ہے، دوسرا شباب کا، تیسرا ادھیڑ عمر کا، اور چوتھا بڑھاپے کا۔ یہ غالباً چار دیوان ہین۔

ایک بڑی خرابی ردیف وار مین یہ ہے کہ خواہ مخواہ ردیف پوری کرنے کے لیے زبردستی غزلین کہنا پڑتی ہین۔ اور وہ اس قدر بے مزہ اور فضول بکواس ہوتی ہے کہ پڑھنا بھی ناگوار ہوتا ہے۔ خود شاعر کا جی نہین چاہتا کہ شامل دیوان کرے مگر رسم کی پابندی مجبور کرتی ہے محض آورد اور بھوٹ ہوتی ہے۔ حالانکہ شاعری بھوٹ کا نام نہین بلکہ حقیقی جذبات کا اظہار بصورت نظم اور اُس کو خوبی سے ادا کرنا شاعری ہے۔ شاعری مرقع جذبات اور تصویر افکار کا نام ہے۔ جب تک اُس مین کوئی بات کوئی اثر نہ ہو (خواہ وہ اثر غم ہو یا اثر مسرت،) اُس وقت تک صحیح معنون مین وہ شعر نہین بلکہ محض کلام موزون ہے حالانکہ ع

شاعری نام ہے جذبات کی موزونی کا!

اب تذکرون کو لیجیئے۔ اُن کی حالت اور زیادہ افسوس ناک و اصلاح طلب ہے۔ میری نظر مین صرف آب حیات ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس کو تذکرہ کہا جا سکے۔ ضرورت ہے کہ ملک مین آب حیات کے اور حصے شائع کیے جائین اور اُسی قابلیت سے لکھے جائین جس طرح کہ آب حیات لکھا گیا ہے۔ صاحب خمخانہ نے بھی محنت کی ہے اور تذکرہ نویسون نے بھی۔ مگر اُس کو تذکرہ کہنا اچھا نہین معلوم ہوتا۔ باوجودیکہ مصنف صاحب ایم۔اے اور تعلیم یافتہ ہین مگر خمخانہ ایک نظم کہنے والون کی فہرست مع نمونۂ کلام ہے۔ دنیا کی ہر زبان مین سیکڑون برائے نام شاعر پیدا ہوتے ہین لیکن وہ اور اُن کا کلام بہت جلد فنا ہو جاتا ہے جس شاعر کا کلام زندہ رہے وہی اصلی شاعر ہے۔ اور صرف ایسے ہی شاعرون کے حالات و تنقید کلام لکھنا تذکرہ نویس کا فرض ہے تخلص اور نام اور ایک دو شعر لکھنا فضول سی بات ہے کسی گلدستہ مین کسی کا کلام دیکھا اور درج تذکرہ کرلیا یہ تذکرہ نویسی نہین ہے۔ اور ردیف وار ہونے کی وجہ سے ایک عجیب خلط ہو گیا ہے کہ سنہ ۱۲۲۰ھ ہجری اور سنہ ۱۳۲۰ھ کے شاعر ایک جا نظر آتے ہین اور کلام مین زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

قدرت کا ایک مقررہ قاعدہ ہے کہ جب تک باہم تناسب نہ ہو حسن و خوبی نہین پیدا ہوتی۔ حسن درحقیقت بالفاظ دیگر تناسب کا نام ہے۔ مگر ہمارے تذکرون اور دواوین مین یہ بات کہان سے آئی؟ خمخانہ پر اعتراض میرا مقصود نہین بلکہ عام مذاق دکھانا ہے اور اُس کا نام تمثیلاً لیا گیا ہے۔ اگر ہم اور ہمارے خیالات مین جدت نہین، تازگی نہین، اور ہمیشہ پُرانی لکیر کے فقیر بنے رہے تو یقیناً ہمارا لٹریچر (علم ادب) بہت جلد فنا ہو جائیگا اور جلد مردہ ہو نیوالا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی بے اعتنائی اور قدیم روش کے بزرگون کی وضعداری، پھر کسی سلطنت کا سرپرست نہ ہونا اور برادران وطن کی مخالفت، یہ ایسی باتین ہین جو بظاہر بے حقیقت معلوم ہوتی ہین

مگر گہری نظر ڈالی جائے تو سارا راز طشت از بام ہو جائے گا: اور جو نظر زیب نقاب پڑی ہوئی ہے وہ اٹھ جانے سے اصل حقیقت منکشف ہو جائیگی۔

اس سلسلہ مین مجکو ایک اور رونا ہے وہ یہ کہ ہمارے شعراء اور مصنفین کی قبرین نہایت کس مپرسی اور بیکسی کی حالت مین ہین اور بے نشان ہوتی چلی جاتی ہین عمر خیام کے مزار کی حالت آپکو معلوم ہوگا اب کیا ہے وہان یورپ کے سیاحون کا ایک میلا سا لگا رہتا ہے۔ بڑے بڑے عالم سیاح آتے اور پھول چڑھا جاتے ہین ہزارون مضمون اس پر نکل چکے۔ اُس کے نام سے متعدد کلب قائم ہین۔ مگر ہمارے اسلاف کی روحین فاتحہ کی بھی محتاج ہین اور اکثر کی قبرین مٹ چکی ہین اور مٹتی جاتی ہین اور ہم ایک آنسو بھی نہین بہاتے۔ کاش ادھر توجہ کرین اور جو رہ گئی ہین اُن کی خبر لین بہت ممکن ہو کہ آگے چلکر اُردو بھی دنیا کی ایک علمی زبان ہو اور اُس کا لٹریچر زندہ قومون مین دلچسپی سے پڑھا جائے۔ جس طرح عمر خیام کی زیارت کو امریکہ و یورپ سے سیاح نیشاپور آتے ہین۔ ممکن ہے کہ اُسی طرح کہین کوئی علم دوست انیس کی قبر کو ڈھونڈھتا لکھنؤ آنکلے، اور غالب کا کمال دہلی کی طرف اُس کو کھینچ لائے۔ ہمارے ان مشاہیر کو بہت زیادہ زمانہ نہین گزرا مگر "وائے بر حال ما" بعض کی قبرون کے نشان بھی نہین رہے اور رہے بھی ہین تو وہ اس قدر دھندلے ہین کہ مٹے ہی سمجھئے!

یہ ہے میرے پراگندہ خیالات کا مجموعہ جس کو مین العصر کے ناظرین کے آگے پیش کر کے ملک سے استدعا کرتا ہون کہ للہ ذرا توجہ کیجئے، خاصکر دہلی و لکھنؤ کے باحمیت و غیرت پسند شعراء و علم دوست اصحاب سے جو اُردو کے حقیقی مگر بے حس و بے شرم اخلاف ہین یہ وہ اخلاف ہین جنکی آنکھین ابتک نہین کھُلین یا ئی روشنی سے چوندھیا کر رہ گئی ہین۔ اور کچھ نہین۔

محوی (لکھنوی)

الہ آباد یونیورسٹی اور اردو زبان

مستند شہادتون سے اس کا ثبوت مل چکا ہو کہ الہ آباد یونیورسٹی کے تمام شعبون مین ہمارے ہندو بھائیون کا کتنا غلبہ ہو؟ اور کس طرح ہمارے برادران وطن کو ان صوبجات کے تعلیمی نظام مین عملی طور پر وہ فوائد بمقابلہ ہمارے بہت بڑی حد تک حاصل ہین جو کاشی جی مین ایک جداگانہ قومی یونیورسٹی کے اجرا کے محرک ہوئے ہین ایسی حالت مین الہ آباد یونیورسٹی کا اُردو کے ساتھ جس کو غلطی سے آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی اور انکے دوسرے پیرون نے صرف مسلمانون کی زبان سمجھ لیا ہو، جو سلوک ہونا چاہیے وہ محتاج بیان نہین ہو مگر جب تک الہ آباد یونیورسٹی اپنے آپ کو ان صوبجات کی ساری آبادی کی تعلیم کا ذمہ دار بنائے ہوئے ہو اور اُسکے ساتھ ہی وہ ایک غیر قومی جماعت کہلاتی ہو۔ اور اپنی اغراض و مقاصد کا تعلق ہندوؤن اور مسلمانون کے ساتھ کاغذ پر یکسان ظاہر کرتی ہو اور سب سے آخری گذارش مین مقدمہ یہ ہو کہ جب تک صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ کو اسکی عام نگرانی کا حق حاصل ہو۔ ہمارا فرض ہو کہ اسکی اصلاح مین کوشش کرین اور اسکو صحیح معنی مین ہندو مسلمان عیسائی تمام فرقون کے لیے یکسان کار آمد بنوائین اور خصوصاً ہز آنر سر جیمس میسٹن کی چانسلری کے زمانہ مین جنھون نے اہل اسلام کی تعلیمی پستی پر توجہ فرمائی ہو یونیورسٹی مین تمام جماعتون کے فوائد کی یکسان حفاظت ہونے پر زور دین۔ ہمین یاد ہو کہ آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے جن کا سا مخلص خادم قوم و ملک کو ملنا بظاہر نہایت دشوار معلوم ہو۔ الہ آباد یونیورسٹی کے متعلق ان صوبجات کی قانونی کونسل مین چند سوالات کیے تھے جن سے یونیورسٹی کے اندرونی معاملات پر مفید روشنی پڑتی تھی اسپر ہمعصر لیڈر الہ آباد نے جو مسلمانون کے ابھرنے کی تمام جائز کوششون کو بدقسمتی سے ہندوؤن کے اثر و اقتدار کو صدمہ پہنچانے والا سمجھتا ہو خواجہ صاحب کی اس طرز عمل پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۰ء کے ایک پرچہ مین لکھا تھا کہ "سمجھ مین نہین آتا کہ بعض معزز ممبران کونسل ان معاملات مین گورنمنٹ سے کیون سوال کرتے ہین۔ یہ سوال کرنے والے ممبر عموماً آزادی اور ترقی کے حامیون مین سے ہین اور ہم خیال کرتے ہین کہ یہ قیاس بجا نہوگا

کہ یہ حضرات اس یونیورسٹی ایکٹ کے مخالف ہین جو یونیورسٹی کو سرکاری اقتدار کے ماتحت رکھنا چاہتا ہو باوجود اسکے جب ان کو یونیورسٹی کے کسی فعل یا فروگذاشت کے متعلق شکایت ہوتی ہو تو فوراً گورنمنٹ کو مداخلت کا مشورہ دینے کے لیے جھپٹ پڑتے ہین۔ بہتر یہ ہو کہ یہ شکایتین یونیورسٹی کی سینٹ مین کی جائین۔ اِن خیالات کی بنا پر ہم آنریبل خواجہ غلام الثقلین سے ہمدردی نہین کرسکتے جنھون نے گذشتہ جلسۂ کونسل مین چند سوالات یونیورسٹی کے اندرونی معاملات کی نسبت کیے۔ یہ سچ ہو کہ یہ حضرات سینٹ کے ممبر نہین ہین مگر اُن مین منتخب ہونے کی صفات موجود ہین لہذا اگر وہ پبلک کاموں کا بار اپنے اوپر زیادہ نہین لینا چاہتے یا شکایات کے دور ہونے کا انتظار نہین کرسکتے۔ تو اپنے دوستون کے ذریعہ سے سینٹ مین سوال کراسکتے ہین۔ "الہ آبادی لیڈر" کے اس طریق استدلال پر تعجب ہونا چاہیے کیونکہ وہ الہ آباد یونیورسٹی مین ہندو عنصر کا ناجائز غلبہ قائم رہنا ضروری سمجھتا ہو اور اس لحاظ سے جو کچھ اُس نے لکھا ہو وہ ایک معنی مین اُن لوگون کی آواز ہو جو یونیورسٹی پر حاوی ہین اور سالہا سال کی حکومت کے معاملات کی باگ اپنے ہاتھ مین رکھنا اسی طرح اپنا حق سمجھنے لگے ہین جسطرح انگلو انڈین اصحاب ہندوستان کے تمام انتظامی صیغون پر اپنا اجارہ قائم رہنا قدرتی سمجھتے ہین۔ اور ملکی باشندون کو ان مین حصہ لینا اپنی حق تلفی سے تعبیر کرتے ہین۔

یہ جتانے کی چندان ضرورت نہین کہ الہ آباد یونیورسٹی کا اقتدار ملک کے جس حصہ پر قایم ہو اُس مین اس رقبہ کا بہت بڑا حصہ شامل ہو۔ جہان اُردو نہ صرف بطور مادری زبان کے بولی جاتی ہو بلکہ وہان کی اُردو ساری دنیا مین مستند سمجھی جاتی ہو۔ لہذا اِس علاقہ مین اُردو کی تعلیم کا سب سے زیادہ انتظام ہونا چاہیے لیکن حیرت ہو کہ جتنا الہ آباد یونیورسٹی مین اُردو کو حقیر سمجھا گیا ہو اتنا کسی دوسری یونیورسٹی مین نہین سمجھا گیا۔ مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیون مین اُردو ایف۔ اے اور بی۔ اے تک عُل فارسی عربی سنسکرت اور لاطینی وغیرہ کے ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتی ہو۔ کلکتہ یونیورسٹی مین ایک دیسی زبان کا لینا لازمی ہو اور گو اُردو اپنی شان کے موافق اہمیت نہین رکھتی تاہم دوسری دیسی زبانون کے ساتھ امتحانات یونیورسٹی مین ضرور شامل ہو جاتی ہو پنجاب یونیورسٹی مین ابھی تک اُردو ایف۔ اے اور بی۔ اے مین شامل نہین تھی لیکن اب لڑکیون کے لیے ایف۔ اے مین اُردو کے سیکھنے کا انتظام کیا گیا ہو اور اُردو مین پروفیشنسی اور ہائی پروفیشنسی کے مستقل امتحانات بھی ہوتے ہین جن مین تمام اشخاص حصہ لے سکتے ہین۔ علاوہ ازین السنۂ شرقیہ کے عام امتحانات سے بھی بالواسطہ اُردو کو کچھ نہ کچھ حصہ پہنچ جاتا ہو اسطرح پنجاب یونیورسٹی اگرچہ ان یونیورسٹیون کے مقابلہ مین تو ضرور قابل الزام ہو جن مین زبان اُردو بی۔ اے تک رائج ہو لیکن یہ شرف الہ آباد یونیورسٹی ہی کو حاصل ہو کہ اُس مین اُردو میٹرکیولیشن کے امتحان پر ختم ہو جاتی ہو اور میٹرک مین بھی انگریزی سے اُردو ترجمہ کا کوئی پرچہ نہین تھا۔ کیا ارکان یونیورسٹی کا یہ خیال ہو کہ میٹرکیولیشن کے امتحان تک اُردو مین ہر طالب علم انتہا کا عالم فاضل ہو جاتا ہو کہ پھر یونیورسٹی کے اعلیٰ درجون مین اُس کو اُردو سیکھنے کی کوئی ضرورت نہین رہتی! حالانکہ امر واقعہ اِس کے سراسر خلاف ہو۔ اور خود ہمدم کے لیے انگریزی سے ترجمے کرانے کے سلسلہ مین ہم کو یہ ناگوار تجربہ ہوا ہو کہ الہ آباد یونیورسٹی کے میٹرک پاس تو کیا ایف۔ اے اور بی۔ اے پاس بھی اُردو ترجمہ کی کافی لیاقت نہین رکھتے۔ اور گو انگریزی کا مطلب سمجھتے ہین مگر اس کو اُردو مین ادا نہین کرسکتے۔ یا نہایت بھونڈے لفظون مین ادا کرتے ہین۔ برخلاف پنجاب یونیورسٹی کے جس کے انٹرنس پاس معمولی انگریزی ترجمہ سلیس اُردو مین بآسانی کرسکتے ہین اور خاصی اُردو لکھتے ہین۔ الہ آباد یونیورسٹی کی انتظامی مجالس مین نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان داخل ہین لیکن جب وہ دیسی زبان کی اعلیٰ اہمیت کو کافی طور پر نہین سمجھ سکتے تو اُن کی مثال اُن لوگون کی ہو جو خود سوتے ہون اور دوسرے سونے والون کو

جگانے کا کام اُن کے سپرد کیا جائے۔ اس لیئے نئی نسل کے دماغوں کی صحیح رہنمائی اور اُن کی علمی پرورش کسی طرح نہین کر سکتے۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہمارے ملک مین نہایت ناقص ہی اور بے حد محنت کے بعد علم کا علمی فائدہ نسبتہً بہت کم ہوتا ہی۔ یہ حالت کافی طور پر ثابت کرتی ہی کہ ابھی تک ہم نے اس بات کو نہین سمجھا کہ ہمین کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہی۔ اور اس کے حصول کے بہترین طریقے کیا ہو سکتے ہین۔ جو طریقے اور اصول یونیورسٹیون کے قائم ہونے کے وقت پیش نظر رکھے گئے تھے وہ اسی طرح چلے آتے ہین اگر فرق ہوا ہی تو صرف یہ کہ طلباء کی مشکلات امتحانات مین پاس ہونے کے متعلق بڑھ گئی ہین اور مصارف مقابلۃً بہت زیادہ ہو گئے ہین۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ ہم وقت کا ساتھ دیتے۔ اپنی ضرورتون کے لحاظ سے اپنے طریقون مین تغیر و تبدل کرتے جاتے اور طلباء کیلئے بجائے مشکلات کے آسانیان پیدا کرتے اور ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ تعلیم کا خرچ گھٹاتے جاتے۔ تاکہ طلباء زیادہ تعداد مین تعلیم سے مستفید ہو سکتے۔ ایک ضروری اصول یہ پیش نظر رہنا چاہیئے تھا کہ جون جون تعلیم ترقی کرتی جاتی۔ یونیورسٹی مین دیسی زبانون کی تعلیم بڑھتی جاتی۔ اگر یہ اصول سامنے رکھا جاتا تو اس وقت ہمارا لٹریچر اتنا مفلس نہوتا۔ اور ہم اکثر علوم و فنون اپنی دیسی زبان کے ذریعہ سے پڑھا سکتے بہرکیف اب بھی اصلاح کے لیے کافی وقت ہی اور اُن یونیورسٹیون کو اُس مین قدم بڑھانا چاہیئے جو ہندوستان کی مشترکہ زبان اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان اُردو کے حلقہ پر حاوی ہین۔ یہ فرض سب سے بڑھ کر الہ آباد یونیورسٹی پر عائد ہوتا ہی۔ اور افسوس ہی کہ اس نے اسکی ادائگی مین بہت ہی سستی و غفلت کا ثبوت دیا ہی۔

کوئی معمولی عقل سے بہرہ ور انسان اس سے انکار نہین کر سکتا کہ دیسی زبان کی تعلیم ہر قوم کے لیے نہایت ضروری ہی اور وہ ملک کی تمدنی اور سیاسی زندگی پر بہت بڑا اثر رکھتی ہی۔ ماہرین کا اس پر اتفاق ہی کہ قوم کی ترقی زبان کی ترقی کے بغیر نہین ہو سکتی جو لوگ یوروپ مین ہندوستان کی یونیورسٹیون کے نظام اور نصاب تعلیم سے واقف ہین۔ وہ دیسی زبانون کی اہمیت پر ہمیشہ زور دیتے ہین۔ سر تھیوڈور ماریسن نے جنکو ہندوستان کے طرز تعلیم کا طویل ذاتی تجربہ ہی کچھ عرصہ قبل انڈیا ہوس مین لکچر دیتے ہوئے اس مسئلہ کی تائید کی تھی۔ کہ ہندوستانی یونیورسٹیون مین تعلیم دیسی زبانون کے ذریعہ سے ہونی چاہیئے۔ آپ نے فرمایا کہ "ہمین ہندوستان مین دیسی یونیورسٹیان بنانی چاہیئین جو دیسی زبانون مین تعلیم دین۔ اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ انگریزی تعلیم ہندوستانیون کے حق مین مفید ثابت ہوئی ہی۔ اور مغربی خیالات نے ہندوستانیون کے دماغ کو ایک مفید راستہ پر لگا دیا ہی لیکن یہ اثر زیادہ مفید اور وسیع ہوتا اگر یہ خیالات مادری زبان کے ذریعہ سے شائع کئے جاتے۔ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے یہ نقصان ہوا ہی کہ ہندوستانیون کے علم اور خیالات سے اگرچہ تمام دنیا فائدہ حاصل کر رہی ہی لیکن خود ہندوستان کی زبانین استعمال کرنیوالے لوگ اس سے بہرہ ور نہین ہو سکتے۔ طالبعلم کے لیے ایک بڑی مشکل ترجمہ کی ہی کیونکہ اکثر الفاظ کے ٹھیک معنی دوسری زبان مین ادا نہین ہو سکتے۔ ہمین یونیورسٹیون مین دیسی زبانون کی توسیع و ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ وہ ہندوستانیون کے خیالات و جذبات کا صحیح ذریعہ بن سکین۔"

اگر ہندوستانی اس معاملہ مین پوری سرگرمی سے کوشش کرتے اور گورنمنٹ ان کو کافی مدد دیتی تو اس وقت تک انگریزی کی صدہا کتابین ترجمہ ہو کر ہمارے لٹریچر کا جز بن گئی ہوتین۔ اور اسی طرح صدہا مفید اور اعلیٰ کتابین اور تخیل تیار ہو گئی ہوتین۔ پنجاب مین کرنل ہالرائڈ صاحب کی زیر سرپرستی مولانا محمد حسین آزاد مغفور اور مولانا حالی مرحوم نے لاہور کے بک ڈپو مین تھوڑے عرصہ مین کیسا عمدہ اور مفید لٹریچر جمع کر دیا۔ اسی طرح ایک صدی قبل کلکتہ مین ڈاکٹر گلکرسٹ صاحب نے ہندوستانی زبان کی تدوین کا کام بکیفیت پرنسپل فورٹ ولیم کالج شروع کیا

اور صرف اس زبان کی گریمر اور ڈکشنری ترتیب دی بلکہ اپنی زیر نگرانی دوسرے قابل مصنفوں سے اُردو اور ہندی نثر میں کتابیں لکھوائیں میر امن صاحب مولف چار درویش، سید محمد حیدر بخش حیدری مصنف طوطا کہانی میر شیر علی افسوس مترجم باغ اُردو، مرزا علی لطف مولف گلشن ہند، منشی اکرام علی مترجم اخوان الصفا، سری للو لال جی مصنف پریم ساگر اسی فورٹ ولیم کے حلقۂ ادب کے برگزیدہ ارکان تھے بمقابلہ اُس زمانہ کے آجکل اس قسم کی ادبی جماعتوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور گورنمنٹ کی سرپرستی میں یہ کام بہت خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام پا سکتا ہے۔ باشندگان ہندوستان کا فرض ہے کہ یہ ضرورت ہر طریقہ سے گورنمنٹ کے ذہن نشین کریں اور قوی امید ہے کہ گورنمنٹ نہایت فیاضی کے ساتھ مدد دینے کو تیار ہوگی۔ اگر ہندوستانی یونیورسٹیاں ڈگریوں کی ٹکسال بننے کے علاوہ کوئی ایسا کام بھی کرنا چاہیں جو ہندوستان کی آئندہ نسلوں کی تاریخ میں واقعی قابل قدر کہلا سکے تو وہ یہی کام ہے کہ وہ دیسی زبانوں کی توسیع و ترقی کو اپنا ایک اہم مقصد قرار دیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک اس نہایت اہم کام کی طرف سے سخت غفلت برتی گئی اور سب سے زیادہ غفلت اس معاملہ میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے الٰہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے ظاہر ہوئی جس نے بجائے سابق غفلت کی تلافی کے حال میں اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ آیندہ بھی اُس غفلت کو جاری رکھنا چاہتی ہے اور اس کو دیسی زبانوں کی اہمیت کا مطلق احساس نہیں ہے۔

بجائے اس کے کہ الٰہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے دیسی زبانوں کی ترویج و توسیع کی تحریک ہوتی خود گورنمنٹ نے چند سال قبل یونیورسٹی سے اس کی تحریک کی۔ کیونکہ گورنمنٹ نہ صرف اس اصول سے واقف ہے کہ صحیح تعلیم صرف مادری زبان میں ہو سکتی ہے بلکہ اپنی رعایا کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے بھی وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ کسی قوم اور ملک کی ترقی کا بڑی حد تک اس کی زبان اور لٹریچر کی توسیع پر انحصار ہے۔ اور گورنمنٹ کو اس میں مدد دینی چاہیے چنانچہ انہوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی کی توجہ اس معاملہ پر منعطف کرائی کہ وہ صوبجات متحدہ کی دیسی زبان کو ترقی دینے کے ذرائع پر غور کرے اور اپنی تجاویز سے گورنمنٹ کو اطلاع دے تاکہ جلد سے جلد عملی کام شروع کیا جا سکے۔ یونیورسٹی نے اس معاملہ میں کچھ عرصہ تک نیم دلچسپی سے چند ریزولیوشن پاس کئے اور آخر میں مسٹر گنگا ناتھ جھا فیلو الٰہ آباد یونیورسٹی کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ ایک اسکیم دیسی زبانوں کی ترویج کے متعلق پیش کریں۔ چنانچہ سینیٹ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کی کارروائی سے اس معاملہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس جلسہ میں نواب حاجی محمد اسمٰعیل خان صاحب فیلو الٰہ آباد یونیورسٹی نے تجویز پیش کی کہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے امتحانات ایف اے اور بی اے میں مثل مدراس یونیورسٹی کے ایک پرچہ اُردو کا بھی ہونا چاہیے۔" آپ نے یہ تجویز پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اُردو سے میری مراد وہ عام زبان ہے جو ان صوبجات کے شہروں میں بولی جاتی ہے میں اُردو اور ہندوستانی میں کوئی خط فاصل کھینچنا نہیں چاہتا میرے ریزولیوشن کے لحاظ سے اُردو اور ہندوستانی ایک ہی چیز ہے میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی ملک اخلاقی یا تمدنی ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنی زبان کو ترقی نہ دے۔ علاوہ ازیں اُردو نہ صرف اس صوبہ کی زبان ہے بلکہ تمام ہندوستان کی زبان ہے۔ ان حالات میں میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ یہ یونیورسٹی اُردو کو ترقی دینے کی کیوں نہ کوشش کرے۔ رہی یہ بات کہ یہ مقصد کس طرح حاصل کیا جائے میں خیال کرتا ہوں کہ جو فاضل اراکین یہاں جمع ہیں وہ مجھ سے بہتر ذرائع سوچ سکتے ہیں میرے خیال میں سب سے بہتر یہ ہوگا کہ ایف اے بی اے اور ایم اے کو جواب مضمون دیا جائے انہیں بعض کتابیں اُردو بھی مقرر کر دی جائیں جن کو طالب علم پڑھیں اور وہ ان کو جواب مضمون لکھنے میں

مدد دیں۔ بہت سے اعلیٰ مصنف ہیں اور میں مندرجۂ ذیل کی سفارش کرتا ہوں۔ مولانا شبلی، آزاد، غالب، کرامت حسین، ابو الحسن وغیرہ"

سوائے اس طریقہ کے جو معزز محرک نے اِس مقصد کے حاصل کرنے کا بیان کیا ہے کہ صرف جواب مضمون کا ایک پرچہ رکھا جائے۔ ہمیں اُن کے لفظ لفظ سے اتفاق ہے لیکن ہم خوش ہیں کہ گورنمنٹ اس معاملہ میں سبقت کر چکی تھی، جیسا کہ وائس چانسلر کے جواب سے معلوم ہوتا ہے۔ وائس چانسلر نے جواب دیا کہ "یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں دیسی زبانوں کو داخل کرنے کے مسئلہ کی طرف کچھ عرصہ ہوا کہ گورنمنٹ نے یونیورسٹی کو توجہ دلائی تھی اور فیکلٹی آف آرٹس (شعبہ فنون) کے سامنے دو ایک سال ہوئے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تھا۔ اس بارہ میں بہت غور و خوض کے بعد سنڈیکیٹ نے اپنے پچھلے جلسہ میں چند تجاویز منظور کی تھیں۔ اب تمام معاملہ ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا کے سپرد کر دیا گیا ہے تاکہ وہ اس کی بابت مناسب تجاویز مرتب کریں۔ جب یہ تجاویز آ جائیں گی تو متعلقہ فیکلٹیاں غور کریں گی اور معمولی طریقہ پر اُن کو پیش کریں گی۔"

ہمارے خیال میں سارا معاملہ ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا صاحب پر چھوڑ دینے کے بجائے بہتر ہوتا کہ ایک سب کمیٹی کے سپرد کیا جاتا جس میں کم از کم ایک مسلمان ممبر بھی ہوتا جو اُردو کے متعلق ضروری تجاویز مرتب کرتا کیونکہ دیسی زبانوں میں جو اہمیت اور مرتبہ اُردو کو حاصل ہے وہ کسی دوسری زبان کو نہیں ہے۔ اور اگر کوئی زبان ہندوستانی کہلانے کی مستحق ہے تو وہ صرف اُردو ہی ہے۔ جو صوبجات متحدہ اور پنجاب کی عام زبان ہے اور دوسرے صوبوں کے ہر شہر میں بولی اور سمجھی جا سکتی ہے۔

دسمبر ۱۹۱۵ء کے بعد کے جلسوں کی روئداد چونکہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی اِس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسٹر گنگا ناتھ جھا نے کیا تجاویز مرتب کیں، اور اُن پر یونیورسٹی میں کیا بحث ہوئی لیکن نتیجہ اس بحث کا ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہو گیا ہے جو نہایت قابل افسوس ہے یعنی دیسی زبانوں کی تعلیم کی تحریک یونیورسٹی نے نامنظور کر دی اور اب گویا یہ مسئلہ ختم ہو گیا۔

اِس صورت میں پبلک اور اخبارات کا فرض ہے کہ گورنمنٹ اور یونیورسٹی کو اس فروگذاشت کی طرف پھر زور سے متوجہ کریں۔ اور یہ بات پورے طور پر ظاہر کر دیں کہ ہم دیسی زبانوں کو یونیورسٹی کے کسی دوسرے مضمون سے کم اہم نہیں سمجھتے۔ اگرچہ الہ آباد یونیورسٹی پر اُردو کا سب سے زیادہ حق ہے لیکن فی الحال یونیورسٹی اُس کو اتنا ہی حصہ عطا کرے جتنا کم و بیش اُس کو دوسری یونیورسٹیوں میں حاصل ہے۔ ہم اِس بحث پر بار بار لکھیں گے اور الہ آباد یونیورسٹی کو اُس کی ناگوار غفلت سے جگانے کے لئے برابر جھنجھوڑتے رہیں گے۔

سید جالب (دہلوی)

ایک ہفتہ بھوپال مین

علیاحضرت جناب نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ تاج انڈیا جی سی ایس-آئی، جی سی آئی ای، ایک ایسی فرمانروا ہین جو بلحاظ اپنی روشن ضمیری اور مدبرانہ فراست کے حکومت و ملک کی نظر مین ایک عدیم المثال عظمت و اقتدار رکھتی ہین اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے علم و فضل مین یگانۂ روزگار ہونے کے علاوہ اصلاح ملک ہمدردی ابنائے جنس مین یکتائے عصر ہین۔ یہ فخر اس لیے اور بھی بڑھ جاتا ہی کہ آپ طبقۂ نسوان کی "فرد بہترین" ہین اور مرد و عورتون کی ہمدردانہ رہنمائیون کی بدولت آپ ایک صائب الرائے لیڈر بھی تسلیم کی جا چکی ہین۔ سچ یہ ہی کہ آپکی ذات ہندوستان کے لیے مایۂ نازش ہی اور آپ کا زمانہ "تاریخ ہند کا ایک زرین ورق"۔

ریاست کے کار ہائے اہم مین مصروف رہنے کے باوجود آپ ایک زبردست مصنف کی حیثیت بھی رکھتی ہین اور اسی سلسلہ مین ہم ایک مرتبہ حضور ممدوحہ کی باریابی کا شرف سوا برس پیشتر حاصل کر چکے ہین مگر حال مین ہمین پھر ایک ہفتہ بھوپال مین قیام کرنیکی ضرورت پیش آئی اور حضور سرکار عالیہ سے فخر ملازمت حاصل ہوا۔ یہ دیکھکر کہ ایک ہی اقتدار رئیسہ ملک اور ایک با اقتدار والیۂ ریاست اپنی تمام تر بلند پایگی اور علو مرتبت کے ساتھ حسن اخلاق کا انتہائی نمونہ اور تواضع و انکسار کی اعلیٰ ترین مثال ہی ہمارے جذبات عقیدت مین ایک غیر معمولی تاثیر پیدا ہو گئی اور ہمان لینا پڑا کہ

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضور ممدوحہ کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہی کہ آپ نے بچون کے لیے لائٹ لٹریچر بہم پہنچانے اور اُسے کتابی صورت مین شائع کرنیکا ہمین حکم دیا ہی اور اپنی کثیر التعداد تصنیفات بھی جو دنیائے ادب مین ایک گرانبہا اضافہ ہین مرحمت فرمائی ہین اور ہماری عزت افزائی کیلیے یہ کام ہمین دیا گیا ہی قدر دانان "العصر" یہ سن کر خوش ہو نگے کہ علیاحضرت اس ناچیز رسالہ کو نہ صرف دلچسپی سے ملاحظہ فرماتی ہین بلکہ اسکی علمی خدمات کی قدر بھی کرتی ہین ہم عنقریب نواب بیگم صاحبہ کی تازہ تصویر اور مختصر حالات سے اوراق العصر کو زینت دینگے جن سے حضور ممدوحہ کے علمی تبحر کا اندازہ ہوگا۔ خدا سرکار عالیہ کی عمر و اقبال مین روز افزون ترقی بخشے۔ آمین!

ناسپاسی ہوگی اگر ہم ڈاکٹر جوہری صاحب کی مہمانداری اور جناب ارشد تھانوی کی احباب نوازی کا شکریہ ادا نکرین جنکی وجہ سے ہمین اس مختصر سفر مین "وطن در غربت" کا لطف ملا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہمارے سچے بھائی اور علیاحضرت کے معتمد ہین اور احمد آباد ڈسپنسری کا چارج اُن کے ہاتھ مین ہی۔ یہ احمد آباد حضور بیگم صاحبہ کی مستقل قیام گاہ ہی جسکو آپنے بمبئی فورٹ کی طرح پر یہین طرز پر آباد کیا ہی بعض معزز افسران ریاست کے بنگلے اور کوٹھیان بھی یہین ہین

منشی رشید احمد صاحب ارشد ہمارے بے تکلف کرم محترم دوست ہین اور عرصۂ دراز سے بسلسلۂ ملازمت آپکا قیام بھوپال مین ہی۔ نظم و نثر مین اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہین۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "حسن تخیل" کے نام سے شائع ہو چکا ہی اردو کے بہترین رسائل مین آپ کے خیالات منظوم باعث تزئین سمجھے جاتے ہین ہمین علیاحضرت کی مردم شناسی سے اُمید ہی کہ انکی تحریری قابلیتون کی قدردانی فرمائی جائیگی جسکے وہ حقیقی مستحق ہین۔ اسی سلسلہ مین مولوی محمد امین صاحب بیری مہتمم تاریخ بھوپال کی عنایات و الطاف کا تذکرہ بھی ضروری ہی جو بحیثیت ایڈیٹر "ظل السلطان" ہمارے قابل فخر ہمعصر ہو ایک غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہین اور ہمکو اپنی متواتر لطف فرمائیون نے بھوپال مین رہین منت بناتے رہے ہین۔ العصر کی توسیع اشاعت مین بھی آپ نے خاص مدد دی اور متعدد خریدار بہم پہنچائے۔

پنڈت اودھ نرائن صاحب بسریا، بی اے چیف سکرٹری ریاست و سید سخاوت حسین صاحب پرائیوٹ سکرٹری ہر ہائنس اور ماسٹر ولی محمد

صاحب بی اے سکرٹری پرنس محمد حمید اللہ خان بہادر کی کرم گستریوں کا بھی خاص احساس ہمارے قلب پر ہے اور سید لیاقت علی صاحب ایم اے ایل ایل بی اسسٹنٹ معین المہام نے بھی اپنے اخلاقِ کریمانہ سے ہمیں شکر گزار بنایا۔

مولوی وہاج الدین حیدر صاحب بیرسٹر ایٹ لا اسسٹنٹ نصیر المہام دنیائے شاعری میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں "ماں بیٹے کی مراسلت" کے عنوان سے آپکی ایک ابتدائی نظم بہت مدت ہوئی شائع ہو کر ملک سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ آپ کے جدید کلام سے بھوپال میں دو تین مرتبہ محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ ناظرین العصر بھی آپ کے افکارِ تازہ سے جلد مسرت اندوز ہوں گے۔ آپکی تپاک آمیز ملاقاتیں بہت ہی مغتنم اور باعثِ دلچسپی تھیں۔

کسی گزشتہ نمبر میں ہم "کفایت شعاری" پر ریویو کر چکے ہیں جو ڈاکٹر سمائلز کی "تھرفٹ" کا اردو میں سب سے پہلا ترجمہ ہے۔ سید محمد مرتضیٰ صاحب سٹی مجسٹریٹ نے عرصہ ہوا اسکو اردو کا لباس پہنایا تھا۔ بھوپال میں جناب موصوف سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ بہتر ہو اگر سید صاحب اپنی ترجمہ کردہ دیگر کتب کا بھی سیکنڈ ایڈیشن شائع کرا دیں کیونکہ ایسی کتابوں کی ملک کو بہت ضرورت ہے۔

ملک حبیب احمد خان صاحب پریسیڈنٹ محکمہ اوقاف ریاست کی ملاقات بہت ہی پرلطف تھی۔ خلوص و اخلاق آپکا حصہ ہے۔ گو آپ شعر نہیں کہتے مگر طبیعت شاعرانہ رکھتے ہیں۔ آپکی تمام تر گفتگو نثر شاعری کا دلکش نمونہ تھی جسکا ذوق ابتک باقی ہے۔

پنڈت کشن سرن صاحب سٹی مجسٹریٹ حوالی شہر بھی نے سرسری ملاقات میں بھی کثرتِ التفات سے ممنون بنایا۔ منشی کاشی ناتھ صاحب کے برادرِ گرامی ہیں جو پنڈت تخلص کرتے تھے۔

مرزا ابو الفضل صاحب مترجم قرآن مجید وغیرہ جو ہمارے دیرینہ کرمفرما ہیں محض حسنِ اتفاق سے سید محمد حسن صاحب بی ایل کنزرویٹر جنگلات کے یہاں غیر متوقع طور پر مل گئے۔ الہ آباد چھوڑنے کے بعد سے آجتک ہمیں اُن سے ملاقات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آپ سے ملکر بیحد خوشی ہوئی۔ آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمائشی شان و شوکت سے قطع نظر کر کے خموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ آپ کسی خاص ضرورت سے بھوپال آئے تھے اور ہماری روانگی سے قبل جا وہاں تشریف لیگئے۔ سرکار عالیہ نے آپکو بھی کچھ تحریری کام سپرد فرمایا ہے۔

غرضکہ یہ سفر ہمارے لئے بہت سی مسرتوں کا باعث ہوا اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ علیا حضرت نواب بیگم صاحبہ دام اقبالہا نے اپنی بیحد نظری اور علم دوستی سے ملک کے چیدہ اور قابل ترین اصحاب کا انتخاب فرما کر ریاست میں مجتمع کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ریاست کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر ہے اور ہر شخص علمی ذوق میں منہمک ہے۔ خدا اس چمنستانِ علم کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے اور بقول جناب ارشد ؎

پاؤں پھیلائے رہا یا چین سے سوتی ہے
علم و دولت کی ترقی ملک میں ہوتی ہے

(ایڈیٹر)

آسام مین اُردو حکومت

مخزن کے جدت طراز سرنامہ نے کلکتہ کو حکومت اُردو کی شرقی سرحد قرار دیا ہی۔ کلکتہ ایجوکیشنل کانفرنس کی اُردو تقریرون نے غالباً سرمایۂ خیال بہم پہنچایا اور فورٹ ولیم کالج کی غیر فانی علمی کوششین اُس کی موید ہوئین ورنہ سب جانتے ہین کہ اُردو ہندو اور مسلم تمدن اُور اُنکے گرو انکسار امتزاجی کے نتیجہ کا نام ہی۔ ورنہ کلکتہ جو حدیث العہد آبادی اور تاریخی لحاظ سے انگریزی شہر ہی وہان اُردو کو نووارد مسافر کی حیثیت سے ڈھونڈھنا چاہیئے۔ خدا بھلا کرے حضرت خیال کا کہ اُنہون نے تاریخ اُردو پر ایسی صاف وشفاف روشنی ڈالی کہ مخزن سبھا کی حدبندی قائم نہ رہ سکی اور کلکتہ سے آگے مرشدآباد تک اُسمین شامل ہوگیا۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہین کہ بنگال کے تمام قدیم شہرون مین اُردو عام زبان ہی اور کل شرفائے بنگال خواہ اُن کا قیام کسی کورہ ہی مین ہو اندر باہر اُردو بولتے ہین اور اُن کی زبان سوائے تانیث وتذکیر کے کثیر الوقوع غلطیون کے روزمرہ یا لب ولہجہ کا فرق بہت کم ہی۔ اور یہان کی زبان سُن کر ایک متبصر زبان کے لیے یہ رائے قائم کرنا نہایت سہل ہوجاتا ہی کہ ان لوگون کے آباواجداد شاہی ہندوستان کے کسی گوشے سے آئے تھے اور کہ دہلی ولکھنؤ مین کسکا اثر یہان کی زبان پر غالب ہی۔

مدت ہوئی مین نے "بنگالیون کی اُردو شاعری" کے عنوان سے ایک مضمون ادیب مرحوم مین شائع کرایا تھا۔ بنگالیون سے مراد بنگالی نژاد ہندو تھے ورنہ اگر یہ احتراز کی قید نہوتی تو العصر کی ضخامت سال بھر کیلیے بھی کافی نہوسکتی۔ میرا ارادہ تھا کہ بنگال کی اُردو کے متعلق وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھتا رہون لیکن ہجوم اشغال کا خدا بھلا کرے کہ اب تک ارادہ ظہور مین نہین آیا۔ اب حضرت خیال کی معرکۃ الآرا اسپیچ نے گدگدی پیدا کی بلکہ سچ پوچھیے تو اُنھین کے اڈریس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ انھون نے حدود اثر اُردو کے متعلق پوری توجہ نہین فرمائی ورنہ یہ ظاہر ہی کہ وہ سرحد بنگال سے کئی قدم آگے نکل جاتے اور لوگون کو معلوم ہوجاتا کہ اُردو نے جبکہ پریس اور انجمنون کا وجود بھی نہ تھا کہان تک اپنا عمل دخل کرلیا تھا۔

ہندوستان کا سرحدی صوبہ آسام جو ایک طرف مشرقی بنگال سے اور دوسری جانب تبت اور برھما سے اپنا ڈانڈا ملاتا ہی وہ بھی جادوے اُردو کا مسحور نظر آتا ہی۔ آسام کے ہر شہر کے دوکاندار جیسی اُردو بولتے ہین اُس کا ذکر نہین بلکہ تعجب ہوتا ہی کہ وہان جادوبیان شعرائے اُردو کی ایک تعداد کثیر نظر آتی ہی اور یہ موجودہ وقت کا ذکر نہین بلکہ آج سے تیس چالیس برس اُدھر کی بات ہی۔ مین چاہتا تھا کہ العصر کے ناظرین کے لیے مختصراً اُن کا تذکرہ لکھون اور ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ اثنا پر اُردو شاعری کا وہان چرچا باقی رہا ہو کہ آج ۲ جزو کا ایک رسالہ "یادگار صحیفہ" نام مری نظر سے گزرا ۱۳۳۲ھ کا مطبوعہ ہے اور مدراس مین چھپا ہی۔ سلہٹ کی مشہور دریادل رئیسہ صحیفہ بانو صاحبہ نے اپنے نفیسہ اُردو اشعار جمع فرماکر شائع کیے ہین مجھکو معلوم ہو کہ بانو صاحبہ ۶۰ برس کی ضعیفہ خاتون ہین اور خدا نے عورت بنا کر تمام مردانہ صفتین

انکو عطا فرمائی ہین تو وہ سارے ہندوستان اور مقامات متبرکہ کی زیارت کر چکی ہین۔ ایک چھوڑ دو بار حج سے بھی مشرّف ہوئی ہین۔ جب کچھ کہتی ہین تو صرف نعت مین کہتی ہین اور بخلاف تمام شعرائے اُردو کے اپنا ذکر بصیغۂ تانیث کرتی ہین، کلام مین سن کیطرح پختگی نہین ہی، اور نہ اسقام شاعرانہ سے کلام پاک ہی لیکن اُردو کا اِس حد تک چرچا کہ مردون سے گزر کر عورتین بھی شعر کہین شیدایان اُردو کے لیے باعث مسرت ہی۔ مین چاہتا ہون کہ سب سے پہلے حضرت صحیفہ کا کچھ کلام نقل کر دون اور پھر تذکرۂ شعرائے آسام شروع ہو گا۔

مین یہ ذکر کر دینا مناسب خیال کرتا ہون کہ آسام سے جتنی اُردو تصنیفین شائع ہوئی ہین اور جو صرف نثر مین ہین اُن کی تعداد بھی بہت ہی اور اُس سے بھی آسام مین حکومت اُردو کا پتہ لگتا ہی لیکن مین صرف شاعرون کا تذکرہ اِس لیے کرون گا کہ جب تک زبان پر پوری قدرت نہو خیالات اور جذبات کا اظہار نہین ہو سکتا۔

صحیفہ کہتی ہین ؎

تیری کنیز ہون مین مالک ہی تو خدایا — تھی مشت خاک تو نے انسان مجھے بنایا
تو رزق دینے والا تو جان دینے والا — تو نے مجھے کھلایا تو نے مجھے جِلایا
تیری حمایتون نے رکھا مجھے بچا کر — تیری عنایتون نے مجھ کو دیا دلایا
واری گئی کرم کر مجھپر کریم ہے تو — غارت نہ جائے سارا میرا کیا کرایا

عاجز صحیفہ ہون مین بے دم ضعیفہ ہون مین
مجھ کو نہ ڈر ہے بگڑے جب تو نے ہی بنایا

داغ ہائے دل ہیں سوزان دیکھیے — بن گیا سینہ گلستان دیکھیے

تو نہ گھبرا اے صحیفہ تجھے رحمت ہو نصیب — مغفرت تجھ کو لپٹ جائے گی جوشش بکر

مقبولِ عام صاحب زر کی ہے بات آج — سچ ہے کہ مفلسون کا طرفدار کون ہے

دردِ دل سے بڑھ کے صحیفہ ہی تیرا شعر
سلہٹ مین آج اِس کا خریدار کون ہے

آشفتہ | حاجی منشی عبد اللہ خلف عبد الحمید باشندۂ سلہٹ حافظ ضیغم[1] کے شاگرد تھے۔ سلہٹ مین حسرت کے بعد اِن کی شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ اُردو فارسی دونون زبانون مین شعر کہتے تھے۔ نساخ مرحوم کے ہم اُستاد اور دوست تھے ؎

دیکھنا اشوقِ شہادت عاشقِ دلگیر کا — کیا تڑپ کر چوم لیتا ہے گلا شمشیر کا
وادیٔ وحشت مین کیا پاؤن پھیلایا ہوا — دیدۂ غولِ بیابان حلقہ ہی زنجیر کا

ہوا نہ حور مین انداز گر بشر کا سا — تو رنج خلد مین ہوگا ہمین سقر کا سا

کھل گیا ہی بیکشی مین جوہر انوار قدس — ہی تماشا گاہ بزم مقدس کی عطر خراب

دیکھے نہ تو پر بت بے پیرہنت آئینہ — ہون مین حیران ہائے یہ توقیر نغمت آئینہ

بیخود | مولوی فرجام علی باشندۂ بنیاچونگ بنگال کے ابتداءً باشاعری مرزا جان طپش دہلوی کے شاگرد اور صاحب دیوان تھے ؎

پوچھے اگر کوئی کہ وہ بیخود کدھر گیا — تو دیکھو جواب کہ کم بخت مر گیا۔

کھائے تو غم ہو پینے کو ہو اشکِ تر مجھے — نکلا ہون گھر سے خوب ہی توشے کے ساتھ

حامد | خاندان مجموعہ داران سلہٹ مین ہمیشہ سے باثر اور متمول خاندان رہا ہی اور علم و ہنر کا چرچا اب تک اس خاندان مین موجود ہے چنانچہ خان بہادر محمد بخت مجموعہ دار اُسوقت بھی آفاقی فیملی اور آسام کونسل کے

---

[1] حافظ اکرام احمد ضیغم رامپوری بہت با برکت شاعر اور شاعر گر تھے۔ نساخ اور آزاد جہانگیر نگری جیسے شاعرون نے اُن کی دایۂ قابلیت سے دودھ پیا تھا بنگال کے دوسرے دور کے اُستاد اور اُنھین کی وجہ سے یہان بزم مشاعرہ کی گرمی تھی ۱۲

ممبر ہین۔ اس خاندان نے سلہٹ مین اُردو کی اچھی خدمت کی اور بہت سے شاعر پیدا کیے۔ الٰہ بخش مجموعہ دار خلف محمد مہدی مجموعہ دار کا تخلص حامد تھا۔ وہ اشرف علی مست کے شاگرد تھے ؎

ٹلنے کا مین نہین کبھی ٹالے کوئی ہزار   مین ہون مری جبین ہے اور آستان دوست
شیرین ہے مثل شکر کیطرح اب نے قلم   لکھتے ہین مدحت لب شکرفشان دوست

حسن | مولوی محمد حسن ولد مفتی محمد سالم۔ خاندان علم و فضل سے تھے۔ مست کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۳۰۰ھ مین انتقال ہوا ؎

ہاتھ اُٹھاؤ مجھ سے اب کیا کام ہے تدبیر کا   نزع کے قابل ہون نہین موقع ہے تکبیر کا

حمید | حاجی حمید بخت خلف حاجی سعید بخت۔ یہ بھی اسی خاندان مجموعہ داران سے تعلق رکھتے ہین۔ حافظ ضیغم کے شاگرد اور ناسخ کے دوست تھے ؎

خواب مین شکل دکھائے گا وہ عیار کبھی   یہ بھروسا مجھے اے طالع بیدار نہ تھا
وہ جو شب میرے گھر آیا تو گیا ہوش حمید
اور جس وقت ہوا ہوش تو پھر یار نہ تھا

خواجہ | مولوی عبدالعزیز۔ اُن کے والد مولوی اظہر علی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منشی تھے۔ اُن کی تعلیم و تربیت کلکتے مین ہوئی۔ مولوی عصمت اللہ شیخ ارشد تلامذۂ ناسخ سے اصلاح لیتے تھے۔ ناسخ اُن کے متعلق لکھتے ہین کہ بہت ہی ذکی و ذہین تھے۔ سنہ ۱۳۰۰ھ مین رحلت کی ؎

دل لیکے جان مانگتے ہین وہ بھی لیجیے   اب میرے آپ کے کوئی جھگڑا نہین رہا
دیر و حرم مین سب مری صورت سے ہین نفور   دل دے کے آپ کو مین کہین کا نہین رہا

سعید | حاجی سعید بخت ولد محمود بخت مجموعہ دار۔ یہ بھی اپنے بیٹے کیطرح حافظ ضیغم کے شاگرد تھے۔ تاریخ گوئی سے اُن کو خاص مناسبت تھی ؎

پتا نہین ہے سرمک لعل گر قرار رنگ   ہر آن مین بدلتی ہین آنکھین ہزار رنگ

سفیر | حاجی جلال بخش خلف حاجی حسین بخش۔ مست کے شاگرد اور ناسخ کے ملاقاتی تھے ؎

سحر آفرین یہ سایۂ زلف سیاہ نہ ہے   بنجائے کیا عجب ترے پھولون کا ہار سانپ

علی احمد | مولوی محمد علی احمد خان نگار سلہٹ کے بہت بڑے زمیندار اور ایک مشہور ذی حوصلہ رئیس تھے۔ داد و دہش مزاج مین بہت تھا۔ مگر شعر بہت کم کرتے تھے اور اپنے اشعار مین ناسخ مرحوم سے اصلاح لیا کرتے تھے ؎

ہوئے جبتک کہ نہ برباد غبار عاشق   دامن پاک صنم تک ہے رسائی مشکل

پہرون ہوتا نہین زانو سے جدا سر اپنا   دھیان آتا ہے جو بیجان ترے زانو کا
چین آتا نہین جو تجھ کو علی احمد آج
یاد مژگان ہے کہ کانٹا ہے ترے پہلو کا

مست | حکیم اشرف علی خلف احمد علی مجموعہ دار تلمیذ حافظ ضیغم۔ شعر و شاعری کا چرچا درحقیقت اُنھین کی وجہ سے سلہٹ مین پیدا ہوا۔ بہت قابل اور ہر دو زبان مین شعر کہتے تھے۔ کتب متعددہ کے مصنف ہین اور اکثر شائع ہو چکی ہین۔ سلہٹ مین اُن کی طبابت کی بڑی گرم بازاری تھی۔ فن کشتی کے بھی بڑے واقف کار تھے۔ چنانچہ اس فن مین بھی اُن کا ایک رسالہ ہے۔ تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے: ترکیب الصلوٰۃ۔ تصویر غم۔ رسالہ سفینۃ الطاعون۔ رسالہ چیچک۔ رسالہ دافع السموم۔ رسالہ کشتی ؎

ہو قلم تیغ غضب سے سر جوان و پیر کا   فاقتلوا جوہر ہے حرف قاتل تری شمشیر کا
عجز نے میرے اُڑایا آپ کے دل کا غبار   خاکساری مین اثر ہے سر تسخیر کا

رات دن یون جو تڑپتا ہے مثال بسمل   کس نے مارا تجھے اے مست کہان پر مارا

آگئی بار عصیان سے گرانبار اس قدر ہون مین
یقین ہے ٹوٹ جائے حشر مین پلہ ترازو کا

ہوا
دکھتے ہیں کھولکر وہ کٹے ہاتھ پاؤں کے   رہتے ہیں وصل میں سرِ بستر ملال چار

ملو گئے جورِ فلکِ پیر سے چھوٹے   ہم آئے تہِ تیغ جو زنجیر سے چھوٹے

شاید کہ اضطراب نے میرے اثر کیا   ہیں ان دنوں تو آپ بھی کچھ بیقرار سے

یٰسین | مولوی عبدالستار۔ شاہ عبدالقادر کے صاحبزادے۔ مولوی وحشت سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ناسخ کے دوست تھے ~

سیلابِ اشک ترسے سمندر کا جوش ہو
گر ہو نہاں نظر سے رخِ خوئے فشانِ دوست

حکیم حبیب الرحمٰن خان

ردِ تحقیق

بہت شور سنتے تھے پہلو مین دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

ایک مشہور و معروف ادبی رسالہ کے ایڈیٹر نے ایک مضمون کے دوران مین ہندوستان کے علمی رسائل کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر کیا ہے :—

"سنہ ۱۸۸۷ء مین پہلے پہل رسالہ دلگداز مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے نکالا تھا اس لیے اولیت کا فخر ممدوح کو ہے ...."

افسوس ہے کہ ہم اس بات کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہین - وجہ یہ کہ ہم اُن علمی کوششون سے بخوبی واقف ہین، جو دلگداز کے ظہور سے پیشتر اردو زبان مین کی جا چکی ہین ۔ سنہ ۱۹۱۰ء مین ہمنے ایک مضمون دکن کے رسالہ زبان مین اُردو رسائل پر ایک سرسری نظر کے عنوان سے لکھا تھا، اُسمین ہم نے اُن پرچون کی ایک فہرست بھی دی تھی جو سنہ ۱۹۰۰ء سے پیشتر خالص علمی مذاق کے لیے شائع ہوئے تھے - ذیل مین ہم اُس فہرست کو نقل کرتے ہین - اس سے ناظرین اندازہ فرما سکین گے کہ دلگداز کے وجود مین آنے سے پیشتر علمی مذاق مفقود نہ تھا :—

نمبر	نام رسالہ	مقام اشاعت	نام ایڈیٹر	سنہ اجراء
۱	مرآۃ العلوم + [لہ]	بنارس	بابو بھیرون پرشاد	سنہ ۱۸۴۶ء
۲	مخزن علوم و فنون	؍؍	منشی نیاز علی	سنہ ۱۸۵۷ء
۳	آب حیاتِ ہند	آگرہ	بابو بنسی دھر	سنہ ۱۸۶۲ء
۴	مخزن العلوم	گوجرانوالہ	منشی گیان چند	سنہ ۱۸۶۶ء
۵	انسٹی ٹیوٹ	مظفر نگر	لالہ نہال چند	سنہ ۱۸۶۷ء
۶	اتالیق پنجاب	لاہور	مولانا آزاد	سنہ ۱۸۷۰ء
۷	مخزن مہابھارت	آگرہ	لالہ جوالا پرشاد	سنہ ۱۸۷۱ء
۸	دہلی سوسائٹی	دہلی	مولوی ذکاء اللہ	سنہ ۱۸۷۲ء
۹	معلم شفیق	حیدرآباد دکن	محب حسین محب	سنہ ۱۸۷۳ء
۱۰	الحمد مذاکر علمیہ	پٹنہ	حاجی سید ولایت علی	سنہ ۱۸۷۳ء
۱۱	مخزن الفوائد	حیدرآباد دکن	مولوی مسیح الزمان	سنہ ۱۸۷۳ء
۱۲	آستانۂ حکمت	آگرہ	حاجی سید الطاف علی	سنہ ۱۸۷۹ء
۱۳	اشاعت السنہ	امرتسر	مولوی محمد حسین	سنہ ۱۸۷۹ء
۱۴	تیرھوین صدی	آگرہ	خواجہ یوسف علی	سنہ ۱۸۸۰ء
۱۵	زمانہ	آگرہ	خواجہ یوسف علی	سنہ ۱۸۸۱ء
۱۶	مفید عام	لاہور	منشی گلاب سنگھ	سنہ ۱۸۸۱ء
۱۷	مظہر الزراعت +	میرٹھ	حکیم مقرب حسین	سنہ ۱۸۸۲ء
۱۸	متھرا سماچار	متھرا	پنڈت اُم اُن بھاگو	سنہ ۱۸۸۲ء
۱۹	والا جاہی	ریاست بھوپال	نواب صدیق حسن خان	سنہ ۱۸۸۳ء
۲۰	علوم و فنون	حیدرآباد دکن	حافظ منصب علی	سنہ ۱۸۸۳ء
۲۱	اشراق	لکھنؤ	مرزا ہادی	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۲	ذخیرۂ تعلیم	حیدرآباد دکن	منشی عزیز الدین	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۳	زراعت	بجنور	پنڈت سری لال	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۴	نور بصر	کلکتہ	مولوی غلام حضرت	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۵	طبیب	لاہور	حافظ فخر الدین	سنہ ۱۸۸۵ء
۲۶	مفید المزارعین	کانپور	خواجہ محمد حسین	سنہ ۱۸۸۵ء

لہ + جن پرچون کے نام کے ساتھ یہ نشان دیا گیا ہے، وہ اردو و ناگری دونون زبانون مین شائع ہوتے تھے :—

نمبر	نام رسالہ	مقام اشاعت	نام ایڈیٹر	سنہ اجراء
۲۷	مراۃ الھند	لکھنؤ	پنڈت کشن لال	سنہ ۱۸۹۵ء
۲۸	افسانۂ ایام	دہلی	مولوی نصرت علیخان	سنہ ۱۸۹۵ء
۲۹	زمیندار	لاہور	منشی محبوب عالم	سنہ ۱۸۹۶ء
۳۰	باغبان	"	"	سنہ ۱۸۹۶ء
۳۱	شمس العلوم	احمد آباد	———	سنہ ۱۸۹۶ء
۳۲	مجمع علوم وفنون	لاہور	مولوی عبداللہ خان	سنہ ۱۸۹۶ء
۳۳	مرچنٹ	انبالہ	پنڈت شیو پرشاد	سنہ ۱۸۹۶ء

ہم نے عمداً اُن رسالون کے نام نظرانداز کردیے ہین جو سنہ ۱۸۹۶ء مین یا اس کے بعد شائع ہوئے ہین۔ اس بات کا بھی دعویٰ نہین کیا جاسکتا کہ یہ فہرست مکمل ہے۔ ممکن ہے، ان کے علاوہ اور بھی علمی مذاق کے پرچے جاری ہوئے ہون۔ بہرحال اب اس بات کو مان لینا چاہیے کہ اولیت کا فخر مولانا شرر کو حاصل نہین ہے۔

ہم ایڈیٹر صاحب موصوف کی اُن معلومات کی ضرور داد دیتے جو آپ کو "تجربات اور تحقیق و تدقیق کے بدولت حاصل ہوگئی ہین"۔ مگر ہمین سخت افسوس ہے کہ اس تاریخی مضمون مین اور بھی چند غلطیان اس قسم کی ہوگئی ہین کہ ہم اُن کی بھی تردید کیے بغیر نہین رہ سکتے۔ مثلاً آپ ادیب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہین:۔

اس نام کے دو رسالے جاری ہوئے تھے... ایک تو حیدرآباد سے نکلتا تھا، اور دوسرا غالباً سنہ ۱۸۹۶ء مین فیروزآباد سے جاری ہوا تھا۔

اس بات کے ظاہر کرنے کی چندان ضرورت نہین کہ حیدرآبادی ادیب ابتک جاری ہے اور کہ فیروزآبادی ادیب سنہ ۱۸۹۶ء مین نہین بلکہ سنہ ۱۸۹۹ء مین جاری ہوا تھا! مگر ہم یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہین کہ لکھنؤ کے ادیب نے کیا قصور کیا جو آپ نے اسکا ذکر نہین فرمایا۔ شاید آپ کو معلوم نہین ہے کہ سنہ ۱۸۹۶ء مین لکھنؤ سے بھی اسی نام کا ایک رسالہ مولوی ہدایت رسول کی ایڈیٹری مین جاری ہوا تھا۔

آگے چل کر آپ فرماتے ہین:۔

ہندوستان مین موجودہ طرز کے رسائل کا پیشرو ادیب (فیروزآباد) ہی تھا، "موجودہ طرز" سے غالباً آپ کا منشا نظم و نثر کے مستقل الحاق سے ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہین کہ معارف مین یہ خوبی موجود تھی، اور یہ ظاہر ہے کہ ادیب (فیروزآباد) معارف کے بعد معرض وجود مین آیا اور معارف کے بند ہونے سے پہلے ہی ختم بھی ہوگیا۔ اور اگر "موجودہ طرز" سے آپ کی مُراد جدید شاعری سے ہے، تو یہ نشانہ بھی خالی گیا۔ سنہ ۱۸۹۲ء مین جب منشی نثار حسین صاحب نثار نے پیام یار جاری کیا تھا تو مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کبھی کبھی اُسمین یورپ اور ایشیا کا رنگ ملاکر نظم لکھتے تھے، اور جب اُنھون نے دلگداز جاری کیا تو اسمین بھی جدید طرز کی نظمین درج کرنے لگے۔ انبالہ سے بھی ایک ماہوار رسالہ جاری ہوا تھا، جسکا نام غنچۂ مراد تھا۔ غزلون کے علاوہ اسمین جدید طرز کی نظمین بھی ہوتی تھین۔ گویا علمی و ادبی مذاق کے علاوہ جدید شاعری کی بنیاد بھی فیروزآبادی ادیب سے بہت پہلے پڑچکی تھی۔

ہم محقق نہین ہین، اور نہ ہمارا "مشاہدہ و تجربہ" وسیع ہے، باوجود اس کے ہم نے جو کچھ لکھا ہے، نہایت تحقیق سے لکھا ہے، اور وہ بھی محض اس غرض سے کہ رسالۂ مذکور کے مضمون زیر بحث کی وجہ سے بعض ناواقف حضرات مغالطہ مین نہ پڑجائین۔ امید ہے کہ ہماری اس نیک نیتی کو مخالفت پر محمول نہ کیا جائے گا۔

مرزا غالب کی ایک غزل

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہین اہل جفا میرے بعد

اس شعر مین معشوق کو جس بانکپن سے یاد فرمایا ہے وہ بس دل ہی خوب جانتا ہے۔ سبحان اللہ۔ اہل جفا، جمع کا صیغہ ایک شخص واحد کے لیے وہ لطف دے رہا ہے کہ "کسی" اور "کوئی" مین بھی یہ لطف نہ ہوگا۔ کیا تیکھا پن ہے، ماشاء اللہ۔ اور پھر اپنی زندگی کے زمانہ مین اپنے اوپر جفا کا ہونا۔ حسن کے ساتھ غمزے کی کند چھری کا چلنا اور پھر اس غمزہ اور جفا کرنے مین معشوق کی تکلیف اور حسن کی پابندی اور بعد فنا حسن کا غمزے کی کشاکش سے آزاد ہونا۔ معشوق کا جو جفا کرتے کرتے تنگ آگیا تھا آرام پانا اور اُس کے لازمی نتائج یعنی صرف انھین کا مورد غمزہ و جفا ہونا اور غیرون پر مہربانی اور لطف کا ہونا (کیونکہ اُن کے مرنے کے بعد جبھی تو معشوق جفا سے اور حسن غمزے کی کشاکش سے چھوٹنے لگا) معشوق کے دراصل نیک اور جفا کے عادی نہ ہونے کا یقین (کیونکہ عادت مین تکلیف نہین ہوتی اور شعر مین غمزے کی کشاکش اور جفا سے چھوٹنے پر آرام آنا اس بات کی دلیل ہین کہ وہ ان کا عادی نہین) یہ تمام باتین جو بالکل نیچرل ہین دو چھوٹے چھوٹے مصرعون مین اس خوبی کے ساتھ جمع کر دی ہین کہ بیان نہین ہو سکتی۔

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

ہے۔ اس شعر میں اپنا شیفتۂ انداز و ادا ہونا جو صرف اُنھیں کے واسطے برتے جاتے تھے اور صرف اُنھیں کا اس منصب شیفتگی انداز و ادا کے قابل ہونا اور اُن کے بعد کسی کا در اصل قابل نہ ہونا خواہ ظاہر کیا جائے اور اس وجہ سے انداز و ادا کی معزولی کمال جامع طور پر بیان ہوئے ہیں۔ ایک خاص خوبی یہ ہے کہ پہلے مصرعہ میں اپنا شیفتہ ہونا اور دوسرے مصرعہ میں انداز و ادا کی معزولی ظاہر کرکے اپنی شیفتگی کو اُنھیں دونوں کے ساتھ مخصوص کرنا ایک خاص لطف رکھتے ہیں۔ یہاں پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ ایک نیچرل بات ہے کہ اگرچہ ایک شخص کے بہت سے عاشق ہوتے ہیں اور سب بجائے خود دل و جان سے اُس پر قربان ہیں مگر ہمیشہ ایک دوسرے کو جھوٹا دعوے دار محبت تصور کرتا ہے اور ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ معشوق کے تمام جور و ستم میرے ہی اوپر ہیں۔ اور غیروں سے بے حد اختلاط ہے اور ہمیشہ اُن کی صحبت میں رہتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے عاشق دشمن اور معشوق میں بھی ایک خاص ادا کے ساتھ بُرے صفات پیدا ہو گئے مگر اس پر بھی یہ اُنھیں جور و ستم کا اُنھیں انداز و ادا کا شیفتہ ہے اور اُسی کو غنیمت سمجھ کر کہتا ہے:۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں کائنات کا وہ اصول بیان فرمایا ہے جس کو کبھی تغیر و تبدل نہیں۔ سائنس والوں نے لاکھ سر ٹپکا اور ہزار کوششیں کیں کہ وہ اصول دوسری شکل اختیار کرے مگر آخر مجبور ہو کر اُن کو بھی ماننا پڑا کہ جب شمع بجھے گی تو دھواں پیدا ہوگا اب دوسری خوبی اس اصول کے بیان میں یہ ہے کہ اپنے مطلوبہ دعوے کے استدلال کے واسطے وہ اصول بیان فرمایا ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اپنی نکتہ رسی اور باریک بینی کا بھی ثبوت دے گئے ہیں۔ یعنی اتنے بڑے دعوے کی دلیل میں وہ بات کہی ہے جس تک ہر شخص کا دماغ نہیں پہنچ سکتا اور یہی استادی اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے

اب قبل کل شعر کا مطلب بیان ہونے کے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شمع ایک روشن شے ہے جس میں حرارت ہے اور دھواں جو قبل گل ہونے کے جسم شمع میں موجود تھا عام طور پر سیاہ ہوتا ہے۔ حرارت کا رنگ سُرخ ہے (مثلاً خون) مسئلہ طبی۔ عشق ایک حرارت قلبی ہے اور اس کا تعلق خاص طور پر قلب سے ہے جو خود مرکز حرارت جسمانی ہے۔ اس لیے عشق کو شعلہ یعنی گرم اور روشن شے سے مثال دی ہے اور خوب دی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عاشق کو حزن و ملال رنج و الم دل مرثیہ جگر سے کام ہے اور لباس ماتمی سیاہ ہوتا ہے اس لیے عشق ہی کو سیاہ پوش مان لیا ہے۔ اب دیکھیے کہ شعلہ کا سیاہ پوش ہونا کتنا ناممکن تھا مگر اس خوبی سے بیان ہوا ہے کہ گویا یہ سیاہی شعلہ میں اُسی طرح مضمر تھی جس طرح شمع میں دھواں۔ اب مطلب شعر کا بالکل آسان ہے۔ یعنی کہ میں ہی ایک یادگار عشق تھا بعد میرے عشق نے ماتمی لباس پہن لیا اور یہ لباس پہن کر شعلۂ عشق جو سیاہ ہو گیا یہ کوئی خلاف نیچر بات نہیں بلکہ جب شمع گل ہوتی ہے تب بھی سیاہ دھواں اُٹھتا ہے۔ گویا ہر روشن شے سیاہ ہو سکتی ہے۔ اب یہ کہنا کہ عشق کا جو ماتمی لباس ہے یہ صرف میری ہی وجہ سے ہے یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے اور بجائے خود یہ بھی ایک خاص لطف رکھتا ہے جو معرض بیان میں بمشکل آسکتا ہے۔ ان تمام گہرے نکات کے علاوہ شعر میں نہ کوئی تعقید ہے نہ اُلجھاؤ۔ سیدھے سادھے روزمرہ میں خدا جانے کیا جادو بھر دیا ہے کہ دل کے جذبات

خواہ مخواہ بڑھ جاتے ہین -

خون ہو دل خاک مین احوالِ بتان پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

اِس شعر مین جو محاورہ باندھا گیا ہو اُس سے کون ناواقف ہے - مگر اتنا ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس محاورہ کے معنی صرف قتل ہونا ہی نہین بلکہ بیچین ہونا بیتاب ہونا بیحال ہونا کامیاب نہ ہونا، ضائع ہونا وغیرہ بھی لیے جاتے ہین - یہان پر یہ محاورہ جس خوبی کے ساتھ باندھا ہو وہ محتاجِ بیان نہین یعنی دل کا خون ہونا اُس عضو کا خون ہونا جو مرکزِ خون کیا خود ہی خون ہو - شعر کا مطلب یہ ہو کہ جب تک مین زندہ رہا تب تک بتون یعنی معشوقانِ جہان کو یا صرف میرے معشوق کو مہندی لگانے کی ضرورت نہین ہوئی کیونکہ میرا خون ہی اُن کے دستِ نازک رنگنے کے واسطے کافی تھا - اب جبکہ مین مرچکا ہون تو کوئی ایسا نہین رہا جس کے خون سے وہ ہاتھ رنگین - پس جب خون نہین تو لامحالہ انھین محتاجِ حنا ہونا پڑا یعنی مہندی لگانے کی ضرورت درپیش آئی، اور اس مہندی لگانے سے میرا دل جس کو خون سے خاص تعلق تھا باوجود خاک مین مل چکنے کے خون ہو رہا ہو یعنی اُس کو قلق ہے بیتاب بیچین اور مضطرب ہو - ظاہر ہو کہ یہ کرب صرف اس وجہ سے ہو کہ مین اُن کے ناخن رنگنے کے قابل نہ رہا - پہلے مصرعہ مین لفظ بتان بہت سے معشوق یا حسین ظاہر کرتا ہو اور اگرچہ بادی النظر مین بہت سے معشوقون کا ہونا بوالہوسی اور بیہودگی ظاہر کرتا ہو مگر دراصل اِس مین ایک اور خوبی ہو اور اس صیغۂ جمع سے جمع اور واحد دونون معنی نکلتے ہین - زبان کا قاعدہ ہو کہ کہین تو کُل کیلیے ایک جُز اور کہین جُز کیلیے کُل کہین ظرف کیلیے مظروف اور کہین اسکے برخلاف استعمال کرتے ہین - مثلاً ہم روزمرہ بولتے ہین یار لوگ وہان ڈٹے ہوئے تھے یعنی صرف ہم - اُستاد داغ فرماتے ہین ؎

غیر نے کی بیوفائی سب کی شامت آگئی
آگ ہوجاتے ہین وہ اہلِ وفا کو دیکھکر

یہان سب سے مراد عاشقِ صادق یعنی صرف ذاتِ خاص اور اہلِ وفا سے بھی مراد صرف "مین" ہی ہے اور کوئی نہین - اسی طرح ہم بجائے چراغ یا لیمپ کے صرف روشنی کہنے پر اکتفا کرتے ہین پس یہان لفظ "بتان" سے مراد صرف ایک مراد معشوق بصیغۂ واحد ہو نہ کہ دُنیا بھر کے بت - اور اگر ہم اس کو جمع کا صیغہ بھی مان لین تب بھی اُس سے یہ مطلب ہو کہ مین حسینانِ جہان کا اتنا بڑا دلدادہ اور ایسا عاشق تھا کہ ہر کسی کی ادا پر جان دینے کو تیار رہتا تھا - الغرض ہر حسین کا سچا عاشق تھا یہ بھی مرنے والے کا کمال ظاہر کرتا ہے - دوسرے مصرعہ مین بجائے ہاتھ یا کفِ دست کے صرف ناخن کا محتاجِ حنا ہونا باندھا ہو - یہ شاعر کی کمال نازک خیالی کی دلیل ہو کیونکہ کسی کے گورے گورے لانبے ہاتھ بجائے اس کے کہ کل ہتھیلی کو مہندی لگائی جائے صرف اُنگلیون کی پورون کو حنا بستہ کرنے سے بدرجہا خوشنما معلوم ہوتے ہین -

درخورِ عرض نہین جوہرِ بیداد کو جا
نگۂ ناز ہے سُرمہ سے خفا میرے بعد

یہ شعر شاعر کے خاص رنگ مین رنگا ہوا ہے اور اگرچہ فارسیت اُردو پر غالب ہو مگر دراصل اُس نے شعر کا لطف دوبالا کر دیا ہے اور شاعر کی قادر الکلامی اور زبان کی لطافت نے وہ لفظ جمع کروئے ہین کہ شعر کو ہزارون دفع پڑھیئے مگر لطف بڑھتا ہی جائے گا - شعر کی خوبی سمجھنے کے لیے صرف عرض اور جوہر کا فرق معلوم کرنا کافی ہوگا - جو شئے کسی ذات مین قدرتاً موجود ہو اور اُس سے جدا نہ پائی جائے وہ جوہر ہے اور جو شئے کمسوبہ ہو یعنی بعد مین داخل یا حائل کر دی گئی ہو یعنی عارض کی گئی ہو وہ عرض ہو

مثلاً کپڑے میں تار و پود جوہر ہیں اور رنگ عرض ہیں۔ اس مصرعہ میں عرض کے معنی ظاہر کرنا، عائد کرنا، پھیلانا وغیرہ ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا صاحب ہی کا ایک شعر عرض ہے:-

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس کے ساتھ ہی ہمیں سرمہ کا بھی ایک جوہر ہونا اور اس کا پھیلنا بھی نظر میں رکھنا چاہیئے۔ جب یہ سب باتیں معلوم ہو گئیں تو صاف ظاہر ہے کہ پہلے مصرعہ کا نتیجہ دوسرے مصرعہ میں اور دوسرے مصرعہ کی وجہ پہلے مصرعہ میں ظاہر فرمائی گئی ہے یعنی خواہ اس طرح کہیئے کہ "چونکہ جوہر بیداد یعنی معشوق کے ظلم و ستم کو جگہ درخور (قابل) عرض نہیں رہی یعنی میرے مرنے کے بعد جب کوئی شخص ایسا باقی نہ رہا جس پر اُس کا جور و ستم ظاہر ہو سکے۔ مطلب یہ کہ بعد میرے جب کوئی عاشق اُس کے ظلم و ستم برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا اس لیے اُس نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا (خفا ہونا بمعنی چھوڑ دینا)"۔ یہاں یہ بھی سوال ہو سکتا ہے کہ سرمہ میں ہی کیا خصوصیت تھی جو بیان کیا گیا۔ اس کی وجہ مذکورۂ بالا رعایتوں اور خوبی بیان کے علاوہ کسی سوز دیدہ نظر کے جرکہ کھائے ہوئے دل سے پوچھئے کہ نگہ سرمہ آلود کیا اندھیر کرتی ہے۔ اُس پر طرہ یہ کہ شاعر نکتہ رس نے ایک اور جرکہ دیا ہے یعنی نگہ ناز اور سرمہ آلود۔

دوسرے معنی اس طرح پر بھی کیے جا سکتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد معشوق نے جو سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی بیداد برداشت کرنے کے قابل کوئی عاشق نہیں رہا۔ اس درخور عرض نہ ہونے سے دو معنی نکلتے ہیں ایک طرف تو غایت بیداد جو بالکل نیچرل طور پر عاشق کو محسوس ہوتی ہے، دوسری طرف اور عاشقوں کی نا قابلیت (یہ خیال بھی نیچرل ہے کہ میرے سوا دوسرے عاشق صادق نہیں ہو سکتے) غرض شعر کیا ہے خوبیوں کا مخزن ہے یا بلاغت کا دفتر۔ واقعی مرزا صاحب نے شعر نہیں کہا بلکہ کرامت کی ہے۔

ہے جنون اہل جنون کے لیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریبان سے جدا میرے بعد

اس شعر میں انتہائے جنون کی حالت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر بیان ہو سکے۔ مطلب یہ ہے کہ "اہل جنون کے لیے جنون آغوش وداع ہے یعنی اہل جنون کو جب دورہ جنون ہوتا ہے تو اپنے آپے سے رخصت ہو جاتے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ چاک اور گریبان ایک ہی پیراہن کا حصہ ہیں اور اس طرح پر وہ ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مگر فرماتے ہیں کہ میرے بعد یعنی میرے آپے سے گزر جانے کے بعد یا دوسرے لفظوں میں مجھ پر جنون کا دورہ ہونے کے بعد چاک اور گریبان میں جدائی ہوتی ہے۔ یعنی چونکہ اہل جنون دورۂ جنون ہوتے ہی آپے سے گزر جاتے ہیں میں نے بھی پیراہن کے ایسے ٹکڑے ٹکڑے اور دھجیاں کر ڈالی ہیں کہ چاک کہیں گیا اور گریبان کہیں"۔ غرض اس طرح پر اُن میں بھی جدائی دکھلائی ہے اور آغوش وداع کو نبھایا ہے۔ نیز دوسرے مصرعہ میں پہلے کا ثبوت اور پہلے میں دوسرے کا نتیجہ اس بلاغت سے بیان فرمایا ہے کہ سبحان اللہ!۔

کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اس غزل کے ہر شعر میں اور بالخصوص اس شعر میں مرزا صاحب نے وہ کمال فن ظاہر فرمایا ہے کہ ماشاء اللہ۔ سارے شعر پر نظر دوڑا جائیے ایک حرف کیا ایک نقطہ بھی ایسا نہیں کہ جو ردو بدل کر دیا جائے

اور پھر اس شعر میں بجائے درستی کے موجودہ خوبیاں بھی باقی رہ جائیں عشق کی مثال مئے مرد افگن سے اتنی عمدگی سے دی گئی ہے کہ بس انھیں کا حصہ تھا۔ کیونکہ جہان تک جی چاہے تشریح کیے جائیے مگر شراب اور عشق میں ذرا بھی فرق نہ آئے گا اور بالخصوص جب وہ مرد افگن کی خاصیت کے ساتھ مخصوص کر دی گئی ہو۔ اس کے بعد پورے مصرعہ کو دیکھیے بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پکار پکار کر دعوت دے رہا ہے۔ دوسرے مصرعہ کے لفظ مکرر نے شعر کی خوبی کو اس اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا ہے جہان معمولی خیال کا گزر نہیں۔ اور اس کے ساتھ ذرا اس پہلو پر بھی نظر رہے جو آپ کے حریف مئے مرد افگن عشق ہونے کا شعر سے نکل رہا ہے کیونکہ ان کے بعد اس صلا کا ہونا اس بات کی قوی دلیل ہے۔ اب شعر کے معنی بالکل صاف ہیں یعنی میرے بعد جب کوئی شراب عشق کا جو مرد افگن ہے مقابلہ کرنے والا یعنی پینے والا نہ رہا یا دوسرے معنی میں عاشق صادق نہ رہا تو لب ساقی (معشوق) پر بار بار یہ صدا ہے کہ "چلو! حریف مئے مرد افگن عشق کون ہوتا ہے چلو!!"۔ اس کے علاوہ لفظ مکرر میں ایک اور خوبی پوشیدہ ہے جو بیحد لطیف ہے اور صرف پڑھنے سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ یعنی "مکرر" اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دو بار آواز لگائی جا رہی ہے۔ ان میں پہلی آواز کے معنی تو وہی ہیں جو بیان ہوئے یعنی دعوت۔ اور دوسری آواز یاس اور نا امیدی کی ہے یعنی پہلے آواز دی اور جب کوئی نہ آیا تو خود ہی کہتا ہے کہ بھلا اب کون ہوتا ہے الخ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ!!۔

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

قاعدہ ہے کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو لوگ اس کے عزیزوں کی تعزیت کرتے ہیں۔ یعنی شریک رنج و الم ہوتے ہیں اور ایسے موقعوں پر اکثر یہ گفتگو ہوتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی مربی انتقال کر گیا ہے تو تعزیت کرنے والے بزرگ اپنے آپ کو اس کی سرپرستی اور خبر گیری کے لئے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح حسب موقع دوستی و ہمدردی وغیرہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "جہان تک میں دیکھتا ہوں میرے بعد مہر و وفا کی تعزیت کرنے والا دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا۔ اور اس غم کے مارے مرا جاتا ہوں" مرنے سے دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔ یعنی ایک تو در اصل مرنا دوسرے غم سے مرنا یعنی بیحد غمگین ہونا یہاں پر یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ عاشق اپنے آپ کو سچا دعویدار محبت اور پکا وفادار سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال شاعرانہ نہیں بلکہ بالکل نیچرل ہے۔ مرزا نے اس مطلب کو کہ تمام دنیا کی مہر و وفا صرف میری ہی ذات میں جمع ہے (کیونکہ جب ہی تو ان کے بعد اس کی تعزیت لازم آئیگی) اور باقی تمام دنیا میں ان کے بعد کوئی مہر و وفا کا نام لیوا بھی نہ رہیگا اور اس طرح اپنے سوا تمام عاشقوں کو ان خوبیوں سے معرا جس عمدہ طرز اور بانکپن کے ساتھ بیان فرمایا ہے یہ کچھ انھیں کا حصہ تھا۔ اور فی الحقیقت نیچرل جذبات کو اس انداز و ادا کے ساتھ بیان کرنا کچھ انھیں استادوں کا کام تھا۔

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

سبحان اللہ مقطع کیا فرمایا ہے کمال کیا ہے۔ صرف دو لفظوں یعنی "میرے بعد" میں تمام یہ مضمون بھر دیا ہے کہ اس وقت میں بلائے عشق میں مبتلا ہوں اور عشق کے سینکڑوں لوازمات کا میں مورد ہوں۔ اول تو عشق ہی کیا کم ہے۔ ہزاروں بلاؤں کی ایک بلا اور ہزاروں مصیبتوں کی ایک مصیبت۔ پھر اس کے ساتھ رنج و الم حزن و ملال ہجر و فراق آہ و زاری بیکسی و بیچارگی غرض ہر طرف سے سیلاب بلا کا زور شور ہے

اور عاشق بیچارہ (یعنی مین) تن تنہا سب کو برداشت کرتا ہو اور ہون نہین کرتا پس فرماتے ہین کہ "اے غالب! اِس وقت تو خیر مین موجود ہون جو عشق اور اُس کے ساتھ اُس کی تمام مصیبتون کو برداشت کر رہا ہون۔ مگر اس کے ساتھ ہی جب مین اس حالت پر غور کرتا ہون کہ میرے بعد یہ عشق بیچارہ مارا مارا پھرے گا اور کہین اس کو جگہ نہ ملے گی تو بے اختیار رونا آتا ہو" ایک معمولی بات تھی کہ میرے بعد کوئی عاشق صادق یا عشق کی مصیبتون کو برداشت کرنے والا نہین رہے گا مگر اس کو اس لطافت اور خوبی کے ساتھ بیان کیا ہو کہ مضمون مین جان ڈال دی ہو۔ بھلا اس سے زیادہ لطف زبان اور جذبات قدرت کا بیان کیا ہوگا ۔

مغربی شاعری کو آج کل عام طور پر نیچرل اور اس در اصل نیچرل شاعری کو مخرب اخلاق ایشیائی شاعری کہتے ہین۔ مگر افسوس کہ ان کہنے والون کی آنکھون پر تعصب کی سیاہ عینک چڑھی ہوئی ہو جو صحیح اور غلط مین فرق نہین بتلاتی یا نئی روشنی کے آتشی شیشون کا تیز لگا ہوا ہو جس کی وجہ سے اُن کی آنکھین چوندھیا گئی ہین اور کچھ نظر ہی نہین آتا۔ ورنہ کبھی ایسی غلطی نہ کرتے اور اب بھی اگر تھوڑی دیر کے لیے اسے اُتار ڈالین اور ذرا انصاف سے دیکھین تو معلوم ہو جائے گا کہ در اصل دونون نیچرل ہین۔ ایک مین (مغربی شاعری مین) وہ باتین ظاہر کی جاتی ہین جن کا ہمارے ظاہری حسون مین سے کسی نہ کسی سے کچھ تعلق ہو اور دوسری (ایشیائی شاعری مین) مین نیچر کے اعلیٰ جذبات اس موثر پیرایہ مین بیان ہوتے ہین جن کو صرف دل و دماغ ہی محسوس کر سکتے ہین ۔

ضیاء عباس (بدایونی)

مزارِ غالب المختصر کہ اس نمبر میں جناب خلیق دہلوی کی ایک نظم درج کی جاتی ہے جس میں مزارِ غالب کی حالتِ زار بیان کر کے پبلک سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اسکو گمنامی کے ہاتھوں سے بچائیں۔ دہلی کے چند خاص حضرات اس کے متعلق خاص کوشش فرما رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ معاونین تصویر بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیں۔ چار برس ہوئے کہ مسٹر محمد علی نے "ہمدرد" میں ایک اپیل شائع کی تھی، اور پبلک نے اس تجویز کو نہایت پسند کیا تھا، چنانچہ ایک معقول رقم جمع بھی ہوئی تھی جس کی رسید "ہمدرد" میں چھپی تھی۔ خود ہم نے بھی ادیب مرحوم میں غالب میموریل فنڈ کھولا تھا اور ایک خاصی رقم اس سلسلہ میں وصول ہوئی تھی۔ جب ہم نے ادیب سے قطع تعلق کیا تو وہ رقم بھی انڈین پریس کے حوالہ کر دی۔ اس کے بعد ہم نے دو تین دفعہ مسٹر محمد علی کو تحریک کی کہ اگر کام شروع کرنے کا ارادہ ہو تو یہ روپیہ منگا لیا جائے مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب چونکہ حکیم محمد اجمل خان اور خواجہ حسن نظامی ایسے افراد اس تحریک میں شریک ہیں لہذا پبلک کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ ان کا عطیہ رائگان نہ جائے گا۔ ادیب کے ذریعہ سے جو رقم فراہم ہوئی تھی وہ اس کام کے لیے انڈین پریس سے ہر وقت مل سکتی ہے۔ نہیں معلوم مسٹر محمد علی کے جمع کردہ چندہ کا کیا حشر ہوا!

جو حضرات اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہیں وہ اپنے عطیات حکیم محمد اجمل خان صاحب کے نامِ نامی پر دہلی کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ (ایڈیٹر)

مزارِ غالب

ہین مہربان میرے خواجہ حسن نظامی جنکی ہو ذاتِ اقدس وحدانیت کی حامی
مضمون نگار ایسے ہین دُور دُور نامی جھڑتے ہین پھول مُنھ سے صحبت ہو خوش بیانی

درگاہ مین ہو رونق فیضِ قدم سے انکے
اوصاف کیا بیان ہون میرے قلم سے انکے

ملنے کا شوق اُنسے، دلمین ہوا زیادہ درگاہِ اولیا کا مین نے کیا ارادہ
صحبت کا لطف آیا، پایا مزاج سادہ تعریف کر رہا تھا ہر ایک پیر زادہ

درگاہ دیکھنے کو بیتاب ہو رہے تھے
سیمابؔ بھی وہین پر سیماب ہو رہے تھے

جب سیر کرنے نکلے دیکھا مزارِ غالب زیرِ زمین نہان تھی فصلِ بہارِ غالب
یاد آرہا تھا سب کو وہ افتخارِ غالب نظرون مین پھر رہا تھا عزّ و وقارِ غالب

حسرت برس رہی تھی روتی تھی خوش بیانی
اُردو، لحد کے اوپر کرتی تھی نوحہ خوانی

سنگِ مزار بالکل ٹوٹا ہوا پرانا چھایا تھا آسمانی تربت پہ شامیانہ
غالب کی صحبتون کا یاد آگیا زمانہ وہ نظمِ عارفانہ، مضمون عاشقانہ

ہر بات مین ظرافت، ہر شعر مین لطافت
پابندِ وضعداری، دلدادۂ شرافت

غالب کی یاد دلمین ہر پھر کے آرہی تھی دُنیا کی بے ثباتی آنکھون مین چھا رہی تھی
حسرت نکل نکل کے آنسو بہا رہی تھی دورِ زمان کی گردش نقشہ مٹا رہی تھی

مٹی کا میرزا کو گھر یاد کر رہا تھا
تربت کا ذرہ ذرہ فریاد کر رہا تھا

افسوس زندگی ہے بے اعتبار کیسی ہر چیز دنیوی ہے ناپائدار کیسی
جاتی ہی بوستان سے فصلِ بہار کیسی شکلین نہان ہوئی ہین زیرِ مزار کیسی

بزمِ سخن کی زینت، روحِ روانِ دہلی
مٹ جائے اِس طرح سے نام و نشانِ دہلی

کہتے تھے جس کو ساقی میخانۂ سخن کا ذرات پینے والا پیمانۂ سخن کا
انداز ہی نیا تھا مستانۂ سخن کا سو جان سے تھا فدائی جانانۂ سخن کا

ہر شعر شمع روشن کاشانۂ سخن مین
اُنکے ہی دم قدم سے رونق تھی انجمن مین

اللہ کیا لبون مین اعجاز بھر رہا تھا نازک خیالیون کا انداز بھر رہا تھا
اُردو کے شاعرون مین آواز بھر رہا تھا سو لطف بھر رہا تھا سو ناز بھر رہا تھا

جذبات کی ہمیشہ تصویر کھینچتا تھا
قربان اِس ادا کے شمشیر کھینچتا تھا

تھی چُلبلی طبیعت شوخی بھری ہوئی تھی طبعِ روان کی جدّت اُڑ کر پری ہوئی تھی
شاخِ سخن چمن مین اُس سے ہری ہوئی تھی حسنِ بیان مین کیا کیا جلوہ گری ہوئی تھی

باغِ کلام مین تھین رنگینیان ہزارون
گلچین کر رہے تھے گلچینیان ہزارون

ارض و سما کے نقشے اُسکے خیال مین تھے حسنِ بیان و معنی نورِ جمال مین تھے
اوجِ فلک کے جلوے اوجِ کمال مین تھے سُن سُن کے ہر غزل کو صوفی بھی حال مین تھے

حُسنِ کلام اُسکا حُسنِ جبین سے بڑھکر
اشعار کی زمینین عرشِ برین سے بڑھکر

افسوس قبر اُسکی ٹوٹی ہوئی پڑی ہے بوسیدہ ہو گئی ہے پھوٹی ہوئی پڑی ہے
دستِ فلک سے بالکل ٹوٹی ہوئی پڑی ہے بے غور ہے نظر سے چھوٹی ہوئی پڑی ہے

مٹنے کو ہو رہی ہے غالب کی یاد ساری
شعر و سخن لحد پر کرتے ہین آہ و زاری

غالب کے قدر دانو اِس قبر کو بنا دو ٹوٹا ہوا پڑا ہے سنگِ لحد جما دو

یہ یادرفنگان ہیں - جو حق نے ہیں دیا - دو پیسہ جو ایک لیگا - دیگا اُسے خدا دو

ہیں ہمزبان میرے خواجہ حسن نظامی

دلسے ہوئے ہیں جالب اسکے خلیق حامی - جالب دہلوی

آہ اے جلوہ فروزِ روے زیباے سخن
تو وہ مجنوں تھا، فدا تھی جس پہ لیلاے سخن
تجھ سے اُردو کا ہوا روشن چراغِ شاعری
آسمان پر تو نے پہنچایا دماغِ شاعری
شاعرانہ کیف سے دیکر عوام الناس کو
تو نے زندہ کر دیا موسیقیِ احساس کو
تو بہارستانِ وجدانی کو لایا جوش میں
اور کی تحریک پیدا فطرتِ خاموش میں
دل میں جذباتِ لطیفہ کا تلاطم کر دیا
روح کو ممنونِ اندازِ تبسم کر دیا
فلسفہ رنگِ تصوف کا عیاں تجھ سے ہوا
عام فیضِ لطفِ ادراکِ نہاں تجھ سے ہوا

ہاں بقولِ خویش ہا کردے دہر را اُمت ہیچ
ورنہ ہر حرفِ غالب چیدۂ میخانہ
(ارشد تھانوی)

موتیوں کی لڑی

(تخمیس بر غزل حضرت غالبِ مغفور)

ملی کیا شے ازل میں؟ ایک قسمت واژگوں بھی
اُسی سے زندگی وابستہ، لیکن بے سکوں وہ بھی
جو کچھ سرمایۂ عمرِ دو روزہ ہے کہوں وہ بھی
بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

محبت گو ہے بیگانہ تصنع سے تکلف سے
مگر جب غیر بھی رہنے لگے کچھ بے تکلف سے
میسر اُن سے اپنے کو کیا ہم نے تکلف سے
رہے آزردہ ہم اُس شوخ سے جب بے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

اجل کے آسرے پر ہم نے چاہا تھا کہ دل ٹھہرے
ٹھہر جاتا جو ہوتے صرف جیتے جی کے یہ صدمے
نہ ہو جب مر کے بھی اُمیدِ آسائش تو پھر کیجیے
خیالِ مرگ کب تسکینِ دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

فغاں سے پیشتر بھی دل تڑپتا تھا مگر کم کم
معاذ اللہ اب تو یہ تپش کا ہو گیا عالم
کہ گویا اک جہانِ بیقراری ہے دلِ پُرغم
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

تغافل دلستانی کا بھی کوئی اندازہ فرماؤ
تکبر دلبری کا ہے کوئی اندازہ؟ فرماؤ
نہ یوں خونِ تمنائے دلِ جانباز فرماؤ
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

شبیہ غالب

"العصر" میں دیکھ کر فی البدیہہ

سامنے آنکھوں کے کس کا پیکرِ تصویر ہے
جس کی خاموشی میں بھی اک لذتِ تقریر ہے
دیکھنے والے پہ طاری ہے ارادت کا وفور
چشمِ نظارہ کو حاصل ہے زیارت کا سرور
آہ یہ ہے غالبِ جنت نشینِ خلد آشیاں
باعثِ اعزازِ دلی نازشِ ہندوستاں
جو نظیر اپنی تھا خود اس عالمِ ایجاد میں
اور اب خوابیدہ ہے خاکِ جہان آباد میں
زندگی بھر جو رہا سرمستِ صہباے سخن
مرتے مرتے بھی نہ چھوٹا جامِ میناے سخن
مر گیا لیکن ہجومِ شوق باقی رہ گیا
مٹ گیا پھر بھی نہ فرطِ ذوق باقی رہ گیا

بسترِ مرگ۔ تو پی کے سوکون

ملے آرام زیرِ چرخ، کیا یہ حوصلہ کیجے — اُمیدِ کامیابی ہو تو عرضِ مدعا کیجے
تعذّر فون سے کیوں بیکار کوئی التجا کیجے — مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

یہ سچ ہے بستے ہیں عاشق کے دل میں سیکڑوں ارماں — کہ مانی کے بقول اُن کا بیاں ہے خارج از امکاں
مگر سن لیجیے دو لفظوں میں شرحِ حسرتِ پنہاں — مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی — مانی (جائسی)

دردِ عشق

اے دردِ عشق! ہے گہرِ آبدار تو
نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو

پنہاں تہِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے
ظاہر پرست محفلِ نو کی نگاہ ہے

آئی نئی ہوا چمنِ ہست و بود میں
اے دردِ عشق! اب نہیں لذت نمود میں

ہاں! خود نمائیوں کی تجھے جستجو نہ ہو
منت پذیر نالۂ بلبل کا تو نہ ہو

خالی تری شراب سے گلشن کا جام ہو
پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو

پروانہ سوئے شمع نہ قسمت کو رو کے آئے
ذوقِ تپش سے بزم میں آزاد ہو کے آئے

پوشیدہ کنجِ دل میں کہیں راز ہو ترا
اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا

گویا زبانِ شاعرِ رنگیں بیاں نہ ہو
آوازِ نے میں شکوۂ فرقت نہاں نہ ہو

یہ دورِ نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ

غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ
جویا نہیں تری نگہِ نارسیدہ دیکھ

اس بزم میں کسی کو نہیں آرزو تری
موتی ہے تو ہٹے نہ کہیں آبرو تری

رہنے دے جستجو میں خیالِ بلند کو
حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو

جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں

یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز
مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز

ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے
کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

محفل یہ مرمٹی ہو شرابِ مجاز پر
اور اک طعنہ زن ہے سرورِ گداز پر

رہبر تو خضرِ فکر ہے اور ذوقِ دید ہے
ہاتھوں میں انجمن کے پرانی کلید ہے

نایاب ہو کے اپنی حقیقت دکھا انھیں
جو عجز میں نہاں ہے وہ رفعت دکھا انھیں

فکرِ بلند غرقِ شرابِ غرور ہے
اس بے خبر کو راہ پہ لانا ضرور ہے

طے کر کے آسمان کو جو بے مدعا پھرے
دیوانہ وار تیرا پتہ پوچھتا پھرے

بیتاب پھر جہان ہو ترے اشتیاق میں
گریاں ہو چشمِ حسن بھی تیرے فراق میں

اقبال

زبان اُردو

کھلے نصیب ہمارے جو لکھنؤ آئے — کہ اِس چمن میں چمن سے بزرگ ہو کے آئے
خلیق قدرشناسِ سخن کے سر پر آئے — ادب سے آئے زبان پر جو گفتگو آئے

یہ شہر وہ ہے جو اہلِ کمال کا گھر ہے
دُرِ سخن کا اِسی شہر میں سمندر ہے

بیان کی شوکت و بیمن جہاں میں ہو مشہور یہ خطہ وہ ہو جو لطفِ بیان میں ہو مشہور
زبان وہ کہ جو اہلِ زبان میں ہو مشہور یہ شہر و قصبہ ہندوستان میں ہو مشہور
یہی زمین تھی انیسؔ و دبیرؔ کا مسکن
یہی جگہ تھی جلالؔ و امیرؔ کا مسکن

زبانِ اردو کی تاریخ کا یہ مدفن ہے مگر لگا ہوا مدفن پہ سبز گلشن ہے
برس رہا ہوا ابرِ کمال ساون ہے بھرا ہوا گلِ مقصد سے سب کا دامن ہے
یہاں اِسی لیے مجلس ہوئی عظیم الشان
کہ لکھنؤ میں ہیں جادو نگارِ سحر بیان

نہ مجھ کو فخر ہے نازک خیال ہونے کا نہ مجھ کو فخر ہے شیرین مقال ہونے کا
نہ مجھ کو فخر ہے اہلِ کمال ہونے کا نہ مجھ کو فخر عدیم المثال ہونے کا
اس انجمن کی شراکت پہ ناز کرتا ہوں
درِ سخن کو بصد عجز باز کرتا ہوں

یہ وہ زبان ہے شیرین کہ سب کو پیاری ہے زبان کاہے کو ہے موجۂ بہاری ہے
سراہیں کیوں نہ اسے یہ زبان ہماری ہے یہ فخر کم ہے کہ ہندوستان میں جاری ہے
اِسے گھمنڈ ہے ملکی زبان ہونے کا
بلند مرتبہ عالی نشان ہونے کا

عجب زبان رنگیلی نئی نویلی ہے جلال قلعہ کی شہزادیوں میں کھیلی ہے
سہیلیوں میں نہیں فارسی اکیلی ہے کہ برج بھاشا بھی اِسکی سگی سہیلی ہے
ہزار ناز سے شاہِ جہان نے پالا ہے
اسی سبب سے زمانے میں بول بالا ہے

سخن کا دودھ پلایا ہے نکتہ دانوں نے کھلا کھلا کے پلایا ہے نکتہ دانوں نے
ہزار بار جلایا ہے نکتہ دانوں نے کہیں کہیں سے ملایا ہے نکتہ دانوں نے
وہ استعاروں کے رنگین لباس پہنائے
کہ جن کو دیکھ کے قوسِ قزح بھی شرمائے

دکھائی اہلِ قلم نے عجب قلمکاری جو ایک بیل ہری ہے تو ایک گلکاری
ہر ایک نظم میں تشبیہ کی طرحداری مزا یہ ہے کہ صنائع کے ساتھ ہے جاری
جو سبز باغ کا کھینچا بنا دیا گلزار
ہر ایک لفظ میں نسرین و نسترن کی بہار

مگر زمانے نے ان پر کیے ستم کیسے کہ قطع ہی نہ رہی گھس گئے قلم کیسے
بچھے ہیں راہِ ترقی میں خارِ غم کیسے کہ راستہ ہے کٹھن چڑھ گئے ہیں دم کیسے
مسافرانِ کمال و ہنر تھکے ہارے
غریب بیٹھ گئے گھر میں بھوک کے مارے

انھیں بتاؤ ترقی کرے تو کون کرے کتب میں جان کھپا کے مرے تو کون مرے
یہ بوجھ پیٹھ کے اوپر دھرے تو کون دھرے قلم بنائے سیاہی بھرے تو کون بھرے
اِسی سبب سے زبان اپنی رہ گئی محدود
کہ قدردان زمانے سے ہو گئے مفقود

اب اہلِ علم کی کوشش ہے شان بنجائے یہ آرزو ہے کہ علمی زبان بن جائے
جہان میں ساری زبانوں کی جان بنجائے زبانِ اردو جواہر کی کان بن جائے
ہر ایک قسم کے اِس کو علوم سے بھر دیں
فلاسفی سے سجا دیں نجوم سے بھر دیں

انہی طریقوں سے ہوگا یہ مدعا حاصل کہ ہر طرح کے ہوں تعلیم یافتہ شامل
فلاسفی کا کرے کوئی ترجمہ قابل جو اتفاق بہم ہو تو کچھ نہیں مشکل
خلیق اردو زبانوں میں انتخاب بنے
یہ بزم اپنے ارادوں میں کامیاب بنے

ضیغم مرحومی

سر سید مرحوم کی یاد

یارب تو ہی ربِ انس و جان ہے انعام ترا جہان جہان ہے
ہے تجھ سے صدف گہر بداماں گل گل زرِ گل سے باغ خنداں
مفتاح سخن زبان ہے تجھ سے تاثیر طلب فغان ہے تجھ سے
دل کھینچ ہی لے ترانہ میرا دم بھرنے لگے زمانہ میرا
خاسر نہ کرے رقم میں خامی پیدا کرے نام نیک نامی

نغمہ یہ اُسی کے ساز کا ہے — نالہ اُسی نے نواز کا ہے
تھا جس کو سرِ ترقیِ قوم — نادان سے تھے جسکے سنگدل ہوم
وہ قوم کا خادم اور مخدوم — تھی جسکے فغان کی ہر طرف دھوم
کوشش کی مگر جب اُس نے کس لی — راحت کسی دن نہ یکنفس لی
نیچری ہوا قوم کے لیے وہ — بے سر ہوا قوم کے لیے وہ
کافر اُسے قوم نے بنایا — غصہ اسے اسپہ بھی نہ آیا
آفت پہ اُٹھائی آفت اُس نے — پھر بھی نہ ہاری ہمت اُس نے
اپنا دیکھا نہ غیر دیکھا — کعبہ دیکھا نہ دیر دیکھا
جلسہ چھوڑا نہ کوئی دربار — صحرا چھوڑا نہ کوئی گلزار
پہنچا نہ کہان کہان وہ نامی — کس کس کا نہ وہ ہوا سلامی
جس بزم مین اُس نے بار پایا — اپنا ہی پہلے راگ گایا
مسجد مین یہی کی سبحہ خوانی — مندر مین یہی کتھا بکھانی
ہو حق یہی خانقاہ مین کی — حجت یہی درسگاہ مین کی
بجنے کو کہین گلے مین ڈالا — پھیری کہین شیوجی کی مالا
ناٹک مین بھی جاکے سانگ لایا — ہر در سے غرض وہ مانگ لایا
فرہاد تھا اپنی دھن کا بیشک — کی کوہ کنی بھی جان کنی تک
جان کھو دیون سے نہ باز آیا — تو قوم کو اپنے ڈھب پہ لایا
کس درجہ بلند حوصلہ تھا — ہر وقت یہ جوش و ولولہ تھا
اللہ رے بوڑھے تیری ہمت — سیّد تجھے ہزار رحمت!

اِس درجہ تھی تجھ کو اُلفتِ قوم
کی زیست تک اپنی خدمتِ قوم

[illegible]

ہماری زبان

اے سحرِ رواں اُردو اے جانِ جہاں اُردو — ہندو کہ مسلماں ہے
اس ہند میں مشرق کی، مغرب کی زباں اُردو — سب پر ترا احساں ہے

کیا جوت لگائی ہے جو کھو ترے ڈیوٹ نے — روشن ہے زمانے پر
اندھیر مچایا ہے آپس کی رکاوٹ نے — ایکا ہے مٹانے پر

کیا پھوٹ میں ایکا ہے ایسا کہیں دیکھا ہے — گو آپ بھی مٹ جائیں
سوچا ہوا یاروں کا بے جا بھی تو برجا ہے — مٹ جائیں باز آئیں

اُردو جو نہیں سب کی ہندی ہو کب اس ڈھب کی — سوچیں تو ذرا اسکو
تمہید یہ مطلب کی اب کی ہے نہ گو جب کی — سمجھائیے کیا کس کو

کیتھی کے دھکنے سے دفتر میں بڑھی دقت — سچ ہے کہ نہیں کہئیے!
شاہد مرے لفظوں پر حرفوں کی ہے خود قلت — بس چپ بھی کہیں رہئیے

اُردو ہی زباں وہ ہے سب جسمیں سما جائیں — پشتو ہو کہ انگریزی
تحریر و تلفظ میں، لہجے میں بھی آ جائیں — اُف! اسکی دلآویزی

چلتی ہوئی گاڑی میں، اٹکاتے ہو کیوں روڑے — آخر ہے زباں کس کا؟
اس عام شکایت سے نالاں ہیں ہمیں تھوڑے — شاکی ہے جہاں اسکا

اُردو ہی زبان وہ ہے کہہ سکتے جسے ملکی — انصاف کہاں لیکن
تھم جائے عدو اس سے دلِ سوختہ بلبل کی — آزادیہ ناممکن

[illegible]

حضرت گورونانک

جامِ توحید سے سرشار گورونانک تھے — بزمِ عرفان کے قدح خوار گورونانک تھے
نورِ وحدت کے طلبگار گورونانک تھے — زاہد و عابد و دیندار گورونانک تھے

آپکے پیش نظر عالم ہُو رہتا تھا
آپکے وردِ زبان واہگورو رہتا تھا

ایک تھے ہندو مسلمان نظر مین اُنکی — وید جھوٹا تھا نہ قران نظر مین اُنکی
ہیچ تھے عیش کے سامان نظر مین اُنکی — تھے پرستان بیابان نظر مین اُنکی

ایک اونکار کا رہتا تھا جلال آنکھوں مین
نور افگن تھا حقیقت کا جمال آنکھوں مین

خوابِ دنیا ہے ہر اک کام ہی جھوٹا اسکا — قول تھا آپکا آرام ہی جھوٹا اس کا
نیست ہر شکل ہے ہر نام ہی جھوٹا اسکا — کفر سچا ہے نہ اسلام ہے جھوٹا اس کا

عمر ہستی کے سمندر مین گذارے ایسے
آب کی سطح پہ ہو پھول کنول کا جیسے

برہم گودھیان رہے ذات وہی ذات رہے — نام کا جاپ کرو گیان کی برسات رہے
او نچون نیچون مین کھلے دل سے ملاقات رہے — روز آپس مین تواضع و مدارات رہے

ایک ہی باپ کے بیٹون مین لڑائی کیون ہو
ایک ہی بحر کے قطرون مین جدائی کیون ہو

ذاتِ حق کچھ حرم و دیر مین محدود نہین — کونسی جا ہے جہان جلوۂ معبود نہین
کونسی شکل ہے جس شکل مین موجود نہین — کونسا بحر ہے جس مین دُرِ مقصود نہین

صاف دل دیکھتے ہین حاضر و ناظر اُسکو
واقفِ سرِ نہان کرتے ہین ظاہر اُسکو

مرحبا پنج گرنتھی کی منوہر بانی — بھر دے گوش کے انمول رتن نورانی
قابلِ داد ہے نظمون کی گہر افشانی — سیکھ لے آپ سے تعلیم کوئی روحانی

صبح صبح مین تصوف کا مزا آتا ہے
بزم وحدت کے تکلف کا مزا آتا ہے

نام مشہور ہوا آپکا یکتائی سے — مرشد و پیر بنے حق کی شناسائی سے
فقر و تسلیم و قناعت سے شکیبائی سے — لاکھ کو ایک کیا طاقتِ گویائی سے

ذات مین محو رہے زندۂ جاوید ہوئے
خاکِ پا آپکے سب زندۂ جاوید ہوئے

پاک بازون سے بھرا آپکا میخانہ تھا — حق تھی شیشے کی صدا دور مین پیمانہ تھا
بالا کرتا تھا چنبیر عشق کا مستانہ تھا — رات دن حمد خدا گانے کو مردانہ تھا

بے بہا آپکی تصویر ہے تصویر نہین
شمع توحید کی تنویر ہے تصویر نہین

معتقد آپکے تھے ہندو مسلمان اکثر — اے خلیق آئی دمِ مرگ کرامات نظر
جسم خاکی نہ رہا رہگئی خالی چادر — ایک نے دفن کیا ایک نے پھونکا جاکر

چادرہ پھاڑ کے تقسیم کیا دونون نے
مرتبہ فقر کا بانٹ لیا دونون نے۔ خلیق (دہلوی)

(امیر مینائی)

اے جگت اُستادِ اقلیمِ سخن کے تاجدار | خاندانِ مصحفی کے جانشین یادگار
تجھ پہ صدقے ہے بلاغت نکتہ سنجی ہے نثار | ناز تجھ پر ہے سخن کو اردو زبان کو افتخار

بادشاہِ کشورِ معنی امیرؔ لکھنوی
تجھ سے روشن ہو گیا نامِ امیرؔ لکھنوی

اے مہِ اوجِ سخن مہرِ درخشانِ سخن | زیبِ ایوانِ سخن شمعِ شبستانِ سخن
دُرِّ غلطانِ سخن لعلِ بدخشانِ سخن | ناظمِ ملکِ سخن روحِ سخن جانِ سخن

سحر ہے تیرا بیان اعجاز گویائی تری
شاعری کو کر گئی زندہ مسیحائی تری

خامۂ جادو رقم تیرا مصورِ باکمال | چہرہ آرائے طلسمِ فکر و نیرنگِ خیال
سامریِ فن ساحرِ افسونگرِ سحرِ حلال | روکشِ بہزاد و مانی نقش بندِ خط و خال

شاہدِ حسنِ معانی کا سراپا دیکھ کر
تیرے آگے دنگ ہے نقاش نقشا دیکھ کر

مثنوی قطعہ رباعی یا قصیدہ یا غزل | خوشنما خوش قطع خوش اسلوب چسپ ہر محل
تازگی برجستگی میں اک سے اک ضرب المثل | بے عدیل و بے مثال و بے نظیر و بے بدل

سارے صناعِ سخن پر قدرتِ کامل تجھے
نکتہ سنجی میں یدِ طولائے فن حاصل تجھے

دلربا دلچسپ دلکش داستانِ حسن و عشق | پُر اثر پُر سوز و درد آگین بیانِ حسن و عشق
دونوں دیوان ہیں ترے روحِ روانِ حسن و عشق | ہر غزل ہر بیت ہر مصرع ہے جانِ حسن و عشق

شعرِ تر جو رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے
ہیں وہ تیرِ نیم کش غالب کے نشتر میر کے

نکتہ ذرہ ذرہ شعرِ خنک گرمِ نمو | نالہائے جانگداز و نغمہ ہائے دلنواز
شوخی و شرم و ادا و غمزہ و ناز و نگاہ | یعنی حسن و عشق کے سامانِ صد راز و نیاز

اک مرقع میں ترے یکجا ہزاروں مہوشین
اک صنمخانے میں تیرے لاکھوں بہاری حسین

تھا الگ دلی سے رنگِ شاعرانِ لکھنؤ | سادگی سے لاتی رنگینی زبانِ لکھنؤ
مانتے ہیں سب کہ آتش کو جانِ لکھنؤ | تجھ کو زیبا ہے کہیں روحِ روانِ لکھنؤ

کون کہتا ہے فقط ہندوستان میں دھوم ہے
اب تری اردو زبان کی اک جہاں میں دھوم ہے

بجھ گیا دہلی میں جب ایوانِ شاہی کا چراغ | شاعری گُل ہونے والی تھی کہ چمکا نامِ داغ
لکھنؤ کو بھی دکھایا بختِ بد نے سبز باغ | طوطی و بلبل ہوئے گویا شکارِ بوم و زاغ

طائرِ خوش لہجہ چہکانے چمن سے جا کے دور
ہو گیا گلزار دربارِ رئیسِ رامپور

تیرے نغموں سے ہوا آباد صحنِ گلستان | رنگ پھر جمنے لگا پھولی پھلی اردو زبان
مرحبا اے ہم صفیرِ بلبلِ ہندوستان | تو نے پایا خلعتِ اُستادیِ خلد آشیان

مل گئے کیا کیا قلمروِ نظم کی جاگیر میں
بج گئے ڈنکے دیارِ مصحفی و میر میں

ساحری ہے شاعری یا ہے عمل تسخیر کا | دل ہے قبضے میں اسی کے ہر جوان و پیر کا
جو ہے قائل جذبِ حسن و عشق کی تاثیر کا | آ کے سینے کو بناتی ہے نشانہ تیر کا

ہے ہوائے ذوق بخود اس کے سوز و ساز پر
نغمۂ جان بخش پر آہنگ خوش انداز پر

کوئی انشا اور سودا کا کوئی دیوانہ ہے | مصحفی کا لب پہ افسون میر کا افسانہ ہے
ذوق و غالب کا کسی کے ہاتھ میں پیمانہ ہے | گرم کیا شعر و سخن کا جلسۂ زمانہ ہے

دورِ آخر میں شفق مدہوش صہبائے سخن
جام مینائی سے ہیں مے نوش مینائے سخن

شفق عمادپوری

(زبانِ اُردو)

ہر جو مشہور زمانے مین زبان اُردو — شکر صد شکر ترقی پہ ہے شانِ اُردو
اسکی تولید ہوئی شاہجہان کے گھر مین — اسطرح کرتی ہے تاریخ بیانِ اُردو
ماجد ہانی ہے شہنشاہ ہونگی دلّی تک — فخر کی بات ہے شاہی ہے زبانِ اُردو
روزمرہ ہے جو دلی کے سخندانون کا — ہے حقیقت مین یہی روح روانِ اُردو
باندیان حل کیا کرتی تھین اِس نحو کی — واقعی لال حویلی ہے مکانِ اُردو
جانچ لیتے ہین پرکھ لیتے ہین جو ہین ماہر — اُنکو معلوم ہے دو شہر ہین کانِ اُردو
میر و غالب تھے یہان آتش و ناسخ تھے وہان — کیون نہ زندہ ہے پھر نام و نشانِ اُردو
چال مین ڈھال مین نک سک مین طرحداری اپنی — لاکھ مین ایک ہے معشوق زبانِ اُردو
تیر کی طرح دل مین چبھتے ہوئے فقرے اسکے — مثلِ ابروئے حسینان ہے کمانِ اُردو
کیا فصاحت و بلاغت کے ہین گل کھلائے اسمین — لوگ کہتے ہین خریدار ہے خزانِ اُردو
گرم بازار ہے گاہک ہین ہزارون اسکے — چلتی رہتی ہے زمانے مین دکانِ اُردو
سب نے بانٹی ہے جو بیجھل مٹھائی اسمین — ذائقہ بخش ہے شیرین ہے زبانِ اُردو
قیصرِ ہند نے لندن مین اسے سیکھا ہے — کیون نہ لہرائے بلندی پہ نشانِ اُردو

شہ - دہلی لکھنؤ ۱۲

اسمیں بچپن ہی سے عادت ہے ملنساری کی — میل رکھتی ہے زبانوں سے زبانِ اُردو

آفریں آفریں کہتے ہیں سخن فہم خلیق — نصیب ہوی

تیری ہر نظم حقیقت میں ہے جانِ اُردو

خیر مقدم انصاری

کسکی آمد کی خوشی آج ہو انسانونکو — کسکے دیدار کا ہے شوق مسلمانون کو
کسکے انوار سے زینت ہوئی کاشانونکو — صاف کرتی ہو صبا کیون چمنستانون کو
"باغ مین گل کھلے جاتے ہین کہ وہ آتے ہین"
"ٹہنیان سر و اُٹھاتے ہین کہ وہ آتے ہین"

اہل اسلام کا ہمدرد کوئی آتا ہے — شیر دل اور جوانمرد کوئی آتا ہے
تجربہ کار جہان گرد کوئی آتا ہے — یون تو لاکھون مین مگر فرد کوئی آتا ہے
ڈاکٹر نام کا اپنے ہے جو مختار احمد
ہو اُسی قوم کے جانباز کی آمد آمد

تمکو معلوم بھی ہو آپ کی عزت کیون ہو — ڈاکٹر اور حکیمون پہ فضیلت کیون ہے
آپ سے قوم کے بچون کو محبت کیون ہو — آپکی دید کی ہر شخص کو حسرت کیون ہے
آبرو پائی ہو ہمت سے جوانمردی سے
قوم ہمدرد بنی آپکی ہمدردی سے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے آپ سے بیٹھا نہ گیا — زخمی ترکونکو تڑپتے ہوے دیکھا نہ گیا
بسمل تیغ ستمگار سے سرکا نہ گیا — آپ ہی اُڑکے سر شمع پہ پروانہ گیا
یعنی ٹرکی مین گئے طبی مشن کو لیکر
ساتھ کچھ اور محبان وطن کو لیکر

ایک سے ایک سوا انمین ہنر رکھتا تھا — بات جو کہنے کی ہوتی تھی وہ کر رکھتا تھا
ہاتھ شافی تھا دوا اُن مین اثر رکھتا تھا — رات دن زخم رسیدون کی خبر رکھتا تھا
ظالمون نے جو دیا توڑ شکستہ دل کو
مومیائی سے دیا جوڑ شکستہ دل کو

آپ ٹرکی مین رہے رشک مسیحا ہوکر — کوئی مردہ بھی اگر تھا رہا زندہ ہوکر
چلنے پھرنے لگا بیمار بھی اچھا ہوکر — چشم اُمید رہی زخم پہ پھاہا ہوکر
سر مین گر درد ہوا سر کو دبانے بیٹھے
آپ بیمار کی تسکین کو سرہانے بیٹھے

ہو کوئی ایسا جوانمرد مسلمانون مین — جو محبت کا نمونہ بنے انسانون مین
جان ڈالے نئی ترکیب سے بیجانون مین — تیر مارا ہی یہی آپ نے میدانون مین
بھولکر بھی نہ لیا ہاتھ مین تلوارون کو
یہ بڑا کام تھا اچھا کیا بیمارون کو

یون بہادر تھے بہت توپ چلانے والے — بڑھکے میدان مین دو ہاتھ دکھانیوالے
ان سے بھی بڑھ گئے ہین ہمت بڑھانیوالے — ہاتھ سے زخم رسیدون کو اُٹھانیوالے
قوم سیکھے گی سبق آپ سے ہمدردی کا
اے خلیق آپ نمونہ ہین جوانمردی کا

خلیق دہلوی

مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو مبارکباد

آج کسکے نام پر ہندوستاں کو فخر ہے   کسکی مضموں آفرینی پر جہاں کو فخر ہے
موج دریا بنگئی طبعِ رواں کو فخر ہے   شاعری کو ناز۔ بنگالی زباں کو فخر ہے

ایشیا تو ایشیا۔ ہے آجکل یورپ میں شور
مستحق نوبل پرائز کے ہوے مسٹر ٹیگور

ہوگئی مشہور دوراں خوش مقالی آپ کی   خوش مقالی بنگئی ہے خوش جمالی آپکی
نیچرل مضمون۔ پاکیزہ خیالی آپکی   اہلِ مغرب مانتے ہیں باکمالی آپ کی

بانکپن میں سادگی ہے سادگی میں بانکپن
آفریں صد آفریں کہتے ہیں سب اہلِ سخن

کیا نرالے ہیں مضامیں کیا اچھوتا ہے کلام   بزم کی آرایشیں ہیں رزم کے ہیں اہتمام
اہلِ عرفاں پی رہے ہیں بادۂ وحدت کے جام   پریمیونکو پریم کا رس آ رہا ہے صبح و شام

باغ سمجھے ہیں عنادل گر رہے ہیں ٹوٹکر
نیچری کہتے ہیں نیچر بھر دیا ہے کوٹ کر

ہر زمینِ شعر وں اُٹھی ہے میں گلزار ہوں   مصرعہ مصرعہ کہہ رہا ہے ابرِ گوہر بار ہوں
لعل و گوہر جھڑ رہے ہیں جوہری بازار ہوں   ہنس کے رہتا ہوں منہ میں موتیوں کا ہار ہوں

روزمرہ ہے سراسر شعر خوانی آپکی
ہے تصنع سے بری معجز بیانی آپ کی

آپ کے دیوان کا ہر شعر ہے رشکِ چمن   ناز کرتی پھر رہی ہے باغ میں بوے سخن
اور پروانے ہیں شاعر تم ہو شمعِ انجمن   فخر کرتی ہے تمھاری ذات پر بزمِ سخن

عشق بازوں کے لیے ہیں عشق کی جانبازیاں
طفلِ مکتب کو سکھائی ہیں ادب موزیاں

واقعی علم ادب میں بوستاں کا باب ہے   مجلسی مضمون میں اخلاق ہے آداب ہے
غیرتِ کانِ جواہر۔ گوہرِ نایاب ہے   دوستوں کی دل لگی ہے محفلِ احباب ہے

بادۂ وحدت سے صوفی جھومتے ہیں وجد میں
شعر پڑھ پڑھکر تمھارے گھومتے ہیں وجد میں

دیش بھگتی کے لیے نازک بیانی ہے کہیں   بُردباری انکساری خاکساری ہے کہیں
مادرِ ہندوستاں کی پاسداری ہے کہیں   جاں نثارانِ وطن کی جاں نثاری ہے کہیں

بھر دیا جذبِ محبت نظم میں تاثیر ہے
سین جو کھینچا ہے جیتی جاگتی تصویر ہے

اہلِ مغرب چونک اُٹھے قدر دانی دیکھکر   مستحق انعام کا ہندوستانی دیکھکر
ہوگئے قائل طبیعت کی روانی دیکھکر   آفریں کہنے لگے معجز بیانی دیکھکر

معدنِ علم و ہنر کے بے بہا الماس ہو
ہند میں تم شیکسپیر اور کالی داس ہو

قدر افزائی سے ہمت بڑھگئی ہے آپکی   علم کی دنیا میں عزت بڑھگئی ہے آپکی
نیکنامی اور شہرت بڑھگئی ہے آپکی   ساتھ دولت کے طبیعت بڑھگئی ہے آپکی

فخر ایسی ذات پر کرتا ہے کُل ہندستاں
دو مبارکباد تم بھی اے خلیقِ شادماں

خلیق دہلوی

مسز سروجنی نائڈو

روشن ہوئے ہیں جس سے علم و ہنر کے اختر — سمجھو اسی کو مرکز دنیا کی روشنی کا
شعر و سخن میں لیکن مغرب کے آسمان پر — چمکا ہوا ہے تارا لیڈی سروجنی کا

ہر ایک معترف ہے پائی ہے وہ طبیعت — تسلیم ہو چکا ہے ماہر ہے اپنے فن کی
قرباں ہو رہی ہے ہر شعر پر فصاحت — ہر نظم بن گئی ہے تصویر انجمن کی

بیخود بنا رہی ہیں تیری نشیلی نظمیں — گویا بھرے ہوئے ہیں صہبائے نو کے پیالے
اشعار تیرے سن کر مدہوش ہو رہے ہیں — میخانہ اپنا بھولے بیٹھے ہیں پینے والے

محفل میں کر رہا ہے گلپاشیاں تکلم — رونق ہے مجلسوں کی حسن بیاں سے تیرے
بتلا رہا ہے اپنی مواجیاں تکلم — اک بحر جوش زن ہے طبع رواں سے تیرے

وہ عندلیب ہے تو جس پر نثار ہیں گل — کیا دلفریب تیری یہ نغمہ سنجیاں ہیں
کہنے کو گو چمن میں یوں تو ہزار ہیں گل — اُنہیں کہاں تجھ پہ ایسی نکہت فشانیاں ہیں

پیش نظر ہوں جس دم ہندوستاں کے منظر — پھر کوئی آ کے دیکھے جولانیاں قلم کی
ہر شعر بن گیا ہے حب وطن کا زیور — ہر نظم پر گماں ہے تصویر ہے ارم کی

یورپ کے شاعروں میں پائی ہے تو نے عزت — سکہ جما ہوا ہے نقد سخن کا تیرے
مغرب کی سرزمیں پر قائم ہے تیری شہرت — سورج چمک رہا ہے گویا علم و فن کا تیرے

وہ نظم ہے اثر زا جو اپنی سادگی سے — جذبات صادقہ کی تصویر بن گئی ہے
دلمیں اتر گئی ہے از بسکہ دلکشی سے — ہر بات تیری منہ کی شمشیر بن گئی ہے

دونی ہو تیری حرمت ہو عمر جاودانی — تو کر رہی ہے خدمت کس شوق سے وطن کی
دائم رہے جہاں میں یہ تیری خوش بیانی — قائم رہیں ہمیشہ شادابیاں سخن کی

قیصر (از بھوپال)

ترجمہ رُباعیاتِ عُمر خیام

گو گوہرِ طاعتت نسفتم ہرگز | گرد گنہ از چہرہ نرُفتم ہرگز
نومید نیم ز بارگاہ کرمت | زانرو کہ یکے را دو نگفتم ہرگز

موتی تری طاعت کا پرویا نہ کبھی | چہرہ عرقِ شرم سے دھویا نہ کبھی
پھر بھی نہیں مایوس کرم تجھ سے کہ مَین | جز تیرے ہوا غیر کا جویا نہ کبھی

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما | کاے رندِ خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ ز مے | زان پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

اِک صبح صدا آئی یہ میخانے سے | اے رندِ خرابات مرے دیوانے
اُٹھ جام بھریں مے سے ابھی جلدی آج | پیمانۂ تن سے یہ جان چھلکے

این کوزہ چو من عاشق زاری بودست | کاندر طلب روئے نگارے بودست
این دستہ کہ در گردن او می بینی | دستیست کہ در گردنِ یارے بودست

یہ کوزہ بھی مجھسا کوئی بسمل ہوگا | یار اس کا کوئی حور شمائل ہوگا
دستہ نہیں کوزے کا یہ ہاتھ اُسکا ہے | جو گردنِ جانان مین حمائل ہوگا

چون عہد نمی کند کسے فردا را | تو حالیا خوش کن دل شیدا را
می نوش بنورِ ماہ اے ماہ کہ ماہ | بسیار بتابد و نیابد ما را

کل تک کا بھروسہ جو نہیں اس دم کو | تو آج ہی خوش کرے دلِ پُر غم کو
پی لے شبِ ماہ مین اے ماہ کہ چاند | ڈھونڈیگا پہ پائے گا کہاں پھر ہمکو

سید ابراہیم محب

کلام نادر

(منشی نادر علی خان صاحب نادر کاکوروی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم)

خوشی سے خوشی کا نہونا ہی اچھا | یہان جان رو رو کے کھونا ہی اچھا
رُلانا ہی اچھا ہے رونا ہی اچھا

تماشے جہاں کے کبھی کم نہون گے | زمانہ رہے گا مگر ہم نہون گے
نہون ہم ہمارا نہونا ہی اچھا

ہے جب گریہ انجامِ یہ زندگانی | حیاتِ دو روزہ پہ ہنسنا ہے فانی
تو پھر ایسے ہنسنے سے رونا ہی اچھا

یہ فرشِ معطّر ہے جب چار دن کا | یہ مخمل کا بستر ہے جب چار دن کا
تو خاکِ لحد کا بچھونا ہی اچھا

بھری غمون سے ہے جب جانِ شیرین | سَم آلودہ ہے جب یہان نانِ شیرین
تو ہاتھ ایسے کھانے سے دھونا ہی اچھا

مخمس

جو ندوۃ العلما کے دار العلوم کی رسم فونڈیشن کے موقع پر ہز آنر سرجان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ واودھ کی حضور مین پڑھنے کے لیے ایک دوست کی فرمائش سے لکھکر لکھنؤ بھیجا گیا تھا مگر کسی مصلحت سے وہان پڑھا نہین گیا اور ابتک شائع بھی نہین ہوا۔

ڈر حادثاتِ دہر کا پھر اس عمارت کو ہے کیا رکھی گئی ہو علم اور اصلاح پر جسکی بنا
ہین راج اور مزدور جسکے اہل علم و اتقا اور مستری جسکا ہے صوبے کا خود فرمانروا
ہیوٹ نے ڈالی تیری نیو اے ندوہ شکرِ خدا

اب شک نہین فضلِ خدا سے تیری آبادان ہونے مین سرجان جو تیرا مربی۔ قوم ہے تیری معین
رک رک کے آخر جھک پڑے ہین تیری جانب اہل دین اے ندوہ یہ سامان بجز تائیدِ ربانی نہین
پھر ڈر ہو اس بیڑے کو کیا جسکا خدا ہو ناخدا

بے گھر تھا تو اے ندوہ تجھکو گھر دیا سرجان نے ویرانہ تھا آباد تجھکو کر دیا سرجان نے
موقع تجھے بہتر سے بہتر دیا سرجان نے خاکہ تھا اک تو رنگ اسمین بھر دیا سرجان نے
اب تو قدم آگے بڑھا۔ خواہش ہو گر بیش سوا

اس ملک کے اہل ملک سمجھو خدا ہے مہربان آزاد ہون مذہب جہان آباد ہون مسجد جہان
ہو سلطنت اس قوم کی جو علم کی ہو قدردان جلسون مین پبلک کے شریک آکر ہون حکام زمان
دین تاکہ اپنے خلقِ شاہانہ سے دل سب کے بڑھا

دین علم کی ترغیب انھین جو علم سے بیزار ہون انکو جگائین نیند غفلت سے جو سرشار ہون
خیر اور بر انکو پڑھائین جو کہ ناہموار ہون دین واجبی حق ہر بشر انکو جو حقدار ہون
جس قوم کو دیکھین گرا دین دوڑ کر اسکو اٹھا

ممکن ہو گو کچھ اس حکومت مین نقصان دین بالکل سے تو خالی حکومت کوئی عالم مین نہین
وہ بادشہ قبضہ مین جسکے آسمان ہو اور زمین اسکی حکومت مین بھی شادی ہو کہین ماتم کہین
باران رحمت ہے کہین زحمت کہین سیلِ بلا

حق یہ ہے جس ملک مین ہر قوم کی حالت جدا ہر قوم کا مقصد الگ ہر قوم کی حاجت جدا
رسمین جدا ہر قوم کی مذہب جدا ملت جدا نقشہ جدا رنگت جدا صورت جدا سیرت جدا
ہو انتظام اس ملک کا بس کام انگلش قوم کا

حالی

مباحثہ گلزار نسیم

گلزار نسیم اُردو زبان کی ایک مشہور و معروف مثنوی ہی جو اپنی نثری اور شعری خوبیون کے لحاظ سے آج بھی باوجود اُن تغیرات کے جو مغربی لٹریچر کے اثر سے ہمارے مذاق علمی مین لازمی طور پر پیدا ہونے چاہیئے تھے، ملک مین اُسیطرح ہر دلعزیز ہی جسطرح کہ قدیم سوسائٹی مین تھی۔ امتداد زمانہ سے اُسمین یہ خرابی ضرور پیدا ہوگئی تھی کہ اُسکا کوئی صحیح نسخہ دستیاب ہونا مشکل ہوگیا تھا۔ عام کتب فروشون کے پاس جو ایڈیشن ملتے تھے اُنمین اسقدر اختلاف تھا کہ کسی ایک کو دوسرے کے مقابلے مین مستند تصور کرنا محال تھا اور انھین اغلاط کی بدولت آجتک اس مثنوی پر بہت سے جا بیجا اعتراضات کی بوچھار ہوتی رہی ہی۔ مسٹر چکبست لکھنوی نے یہ بہت اچھا کیا کہ گلزار نسیم کا صحیح نسخہ بہم پہنچا کر معہ ایک تنقیدی مقدمہ کے چھپوا دیا۔ اسکو شائع ہوئے کئی سال ہوگئے۔ اخبارات و رسائل نے اسپر حوصلہ افزا ریویو کیئے۔ لیکن قاعدہ ہی کہ مذاق کے اختلاف کیوجہ سے رائین بھی مختلف ہوجاتی ہین۔ مولنٰنا عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالہ "دلگداز" مین اِس مثنوی کے نئے ایڈیشن پر اظہار رائے کرتے ہوئے جہان اُسکے محاسن پر روشنی ڈالی وہان معایب کو بھی نظر انداز نہین کیا۔ مولنٰنا شرر کی نکتہ چینی کا جواب مسٹر چکبست نے "اودھ پنچ" مین چھپوایا اور جواب الجواب لکھنے مین شرر کے قلم سے "پنچ" کی شان مین بعض ایسے الفاظ بھی نکل گئے جو متانت اور تہذیب کے درجے سے گرے ہوئے تھے۔ یہ ہوسکتا ہی کہ مولنٰنا شرر نے "اودھ پنچ" کے ظریفانہ انداز کے مضامین کو دیکھکر جنمین جولانی فکر مضمون نگار کو کہین سے کہین پہنچا دیتی ہی اُسے "شہدے" کا لقب دیدیا ہو لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے اور یہ سمجھ لیتے کہ "پنچانہ" انداز کا اقتضا یہی ہی تو خوب ہوتا۔ بہرحال معرکۂ چکبست و شرر کی شان نزول یہ ہی۔ پہلے تو یہ بحث صرف اُس طبقے تک محدود تھی جو "دلگداز" اور "اودھ پنچ" کا قدرشناس کہا جا سکتا ہی لیکن رفتہ رفتہ اسکی دلچسپی کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا اور اکثر اہم مسائل پر کئی نقادان فن کو قلم فرسائی کی ضرورت آپڑی۔ "مباحثۂ گلزار نسیم" مین وہ تمام مضامین جمع کر دیئے گئے ہین جو اس مبحث سے متعلق ہین۔ عام اہل

کردہ شرر کی تائید اور چکبست یا وہ پنچ کی مخالفت مین لکھے گئے ہون یا اسکے برعکس - اور خواہ وہ دلگداز مین شائع ہوئے ہون یا کسی اور خبار یا رسالے مین. خلاصۃ الحکما میرزا محمد شفیع شیرازی ثم الکھنوی نے اس مجموعہ کو ترتیب دیکر گویا اس معرکۃ الآرا علمی مباحثہ کی یادگار قائم کی ہو اور اسمین شبہہ نہین کہ "مباحثہ گلزار نسیم" کے صفحات کو خیالات کی گوناگونی جذبات کی بوقلمونی، اور آرا کی نیرنگی نے ایک نہایت پُرلطف چیز بنا دیا ہو- شروع مین ایک دیباچہ بھی ہو- لیکن میرزا صاحب سے ایک اُصولی لغزش ہو گئی ہو- یعنے آپ لکھتے تو ہین کہ-

اس علمی جنگ مین جناب شرر اور جناب چکبست کے درمیان معرکہ درپیش تھا- اب رہا یہ امر کہ اِن دونون پہلوانانِ سخن مین سے کسکو فتح ہوئی اور کسکو شکست ہوئی اسکا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہین - اسکا فیصلہ جناب احمد علی صاحب شوق، منشی سجاد حسین صاحب، حافظ جلیل حسن صاحب جلیل، و جناب حسرت موہانی و جناب طپش بلگرامی وغیرہ نے کر دیا ہو-

تاہم آپ کے انداز تحریر اور طرز بیان سے یہ ہویدا ہوتا ہو کہ آپ مسٹر چکبست کے طرفدار ہین- فی الحقیقت یہ کوئی قابل گرفت فعل نہین لیکن جب آپ نے تمام مباحث کو ناظرین کے پیش نظر رکھکر فیصلہ اُنھین پر چھوڑ دیا تو شرر کے متعلق یہ لکھنا عبث تھا کہ

آپ کے مضامین سے اکثر مقام پر بے جا غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہو ہمکو مولانا شرر ایسے بزرگ کے قلم سے ایسے الفاظ نکلتے دیکھکر سخت تعجب ہو-

یا یہ الفاظ:-

برعکس اسکے انصاف ہمین یہ کہنے پر مجبور کرتا ہو کہ جناب چکبست کے قلم سے جو مضامین جناب شرر کے اعتراضات کے جواب مین شائع ہوئے ہین اُنمین پوری شانِ تنقید قائم ہو-

اسی قسم کے اور بہت سے اقتباس پیش کیے جا سکتے ہین جن سے آپ مسٹر چکبست کے حامی ثابت ہوتے ہین- اور اگرچہ میرزا صاحب کے ان خیالات سے بہت بڑی حد تک ہم بھی موافقت رکھتے ہین تاہم اگر وہ اپنا عندیہ ظاہر نہ کرتے تو زیادہ مناسب تھا-

اس کتاب مین کم نہ زیادہ پورے ۵۱ مضامین درج ہین- میرزا صاحب نے اس بات کی کوشش کی ہو کہ کوئی مضمون جو اس مباحثہ سے تھوڑا بہت بھی علاقہ رکھتا ہو اس مجموعہ مین شامل ہونے سے رہ نہ جائے- لیکن یاد پڑتا ہو کہ مولوی سید خورشید علی حیدرآبادی کا ایک مضمون اُسی زمانے مین مخزن مین نکلا تھا جو اگرچہ فی نفسہ اس مباحثہ سے بے تعلق تھا لیکن اگر وہ بھی لے لیا جاتا تو مولانا شرر کے اِس اعتراض کا ایک اور پہلو بھی روشن ہو سکتا تھا کہ "گلزار نسیم" دیا شنکر نسیم کی تصنیف نہین ہو "گلزار نسیم" نسیم کی تصنیف ہو یا نہین، ہمین اس سے واسطہ نہین لیکن چونکہ سید خورشید علی کے مضمون سے اسقدر ضرور پتہ چلتا ہو کہ نسیم کے اس چراغ مین تیل بتی ایک دوسرے چراغ سے مستعار لیگئی ہو، اس خیال سے اُس کے لیے اس مجموعہ مین گنجائش نکالنا انصافاً لازمی تھا- سید خورشید علی کا مضمون کیا تھا؟ ایک قلمی مثنوی کے جس کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ غالباً حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ مین ابتک محفوظ ہو، متعدد مقامات کے اقتباسات تھے جو گلزار نسیم کے اقتباسات کے بالمقابل چھپوائے گئے تھے- اُس کے مطالعہ سے یا تو ناممکن توارد شعری کا جو سرقہ کی حد تک پہنچ گیا ہو قائل ہونا پڑتا ہو یا کسی ایک کو دوسرے کا خوشہ چین ماننا پڑتا ہو-

مضامین مندرجہ "مباحثہ" مین چند مضامین ایسے بھی ہین جن کے مطالعہ سے بہت سے علمی و ادبی نکتے ذہن نشین ہو سکتے ہین خصوصاً "جنت کی ڈاک" کا سلسلہ جسکے تحت مین آتش کے

خطوط موسومہ شرر لکھے گئے ہین، جو سب کے سب "اودھ پنچ" مین چھپے تھے۔ مولنا شوق قدوائی کا مضمون بھی یقیناً قول فیصل کا درجہ رکھتا ہی۔ لیکن بعض مبتذل مضامین اسمین ایسے بھی پائے جاتے ہین، جو اگر یہ حالت موجودہ نہوتے تو بہتر تھا۔ مثلاً "ہوا خواہ نسیم" کی ہرزہ سرائی خیالات کی پختگی، تنقید کی قابلیت، توازن کی لیاقت کا تو گویا اسمین ایک سرے سے فاتحہ پڑھا گیا ہی ہان مثنوی سحر البیان کے عیوب گنوانے مین البتہ شاطرانہ کمال سے کام لیا گیا ہی حالانکہ جو اعتراضات بزعم خود کیے گئے ہین وہ نہایت عامیانہ اور خود حضرت معترض کی ناواقفیت اور کم علمی کے شاہد ہین۔

بعض مضامین اور کارٹون اودھ پنچ کے ایسے بھی لئے گئے ہین جنمین ظریفانہ رنگ پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہی۔ جہان تک تفریح طبع کو تعلق ہی یہ دونون خاص دلچسپی کی چیز ہین۔ اور انکو دیکھکر کہنا پڑتا ہی کہ منشی سجاد حسین نے اپنی بے مثل قابلیت کی بدولت "اودھ پنچ" کو جس رتبہ تک پہنچایا تھا وہ اُنھین کا کام تھا۔

مباحثہ گلزار نسیم مین مسٹر چکبست والا ایڈیشن معہ مقدمہ کے شامل ہی جو اس کتاب کے خریدارون کو مثنوی کے جُداگانہ نسخہ کی ضرورت سے مستغنی کر دیتا ہی۔ افسوس ہی کہ کتابت کی غلطیان "مباحثہ" مین اس کثرت سے موجود ہین کہ ہمین حضرت مولف کی توجہ اسطرف خصوصیت سے مبذول کرنا پڑی ہی۔ ضرورت تھی کہ پروف کی صحت کا خیال رکھا جاتا۔ معمولی لاپروائی بھی کتاب کی اصل خوبیون کو خاک مین ملا دیتی ہی۔ کتاب کے ملنے کا پتہ۔ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ قیمت عہ، جو تقریباً پانچسو صفحات کی کتاب کیلئے کچھ زیادہ نہین۔

دیوان خیال جانان علاقہ کاٹھیاوار مین ریاست منگرول ایک مشہور جگہ ہی۔ یہان کے فرمانروائے سابق شیخ محمد حسین میان صاحب بہادر نہایت علم دوست اور بامذاق رئیس گذرے ہین جنکی علمدوستی اور معارف پروری کی بدولت کسی زمانے مین منگرول رامپور کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ میان صاحب بہادر کو شعر و سخن سے نہایت درجہ دلچسپی تھی اور آپ کا دربار کملاء فن سے ہر وقت معمور رہتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ داغ، جلیل، تسلیم، شمشاد، اور احسان ایسے نغز گو شعرا کو رئیس کی علمی قدر شناسی نے وہان کھینچ بلایا تھا۔ قاعدہ ہی کہ حاکم وقت کا رجحان طبیعت جسطرف ہوتا ہی اُسی جانب عوام الناس کی طبائع بھی جھک پڑتی ہین۔ انھین مولوی محمد عمر صاحب جنون شاگرد جلال مرحوم کو خاص امتیاز حاصل ہی۔ "خیال جانان" جسکا دوسرا نام "ریاض فکر" بھی ہی حضرت جنون کے کلام کا مجموعہ ہی جو ہمارے یہان بغرض اظہار رائے موصول ہوا ہی۔ اسکو دیکھکر انصافاً یہ کہنا پڑتا ہی کہ حضرت جنون ایک اچھے شاعر ہین، اور اگر مشق سخن کا سلسلہ قائم رہا تو اُن کے کلام کی پختگی اور نفاست روز افزون رہیگی۔

اِس دیوان مین ایک جدت خصوصیت سے قابل ذکر ہی یعنی حضرت جنون نے اکثر ایسے مضامین قطعی طور پر ترک کر دئیے ہین جو ایشیائی شاعری کا مدت مدید سے جزو لاینفک بنے ہوے چلے آتے ہین لیکن کثرت استعمال سے مبتذل ہو گئے ہین مثلاً کوہ طور اور موسٰی، لیلی مجنون، مصر اور بازار، سکندر و آئینہ اسیطرح بعض متروک الفاظ کے متعلق یہ التزام کیا گیا ہی کہ قصائد وغیرہ مین بھی آنے نہ پائین جیسے پر، تلک، ولے۔ اچھا ہوتا اگر جناب جنون چند اور مبتذل اور مخرب اخلاق مضامین کا استعمال بھی جائز نرکھتے مثلاً شب وصل، تیغ قاتل، بوس و کنار۔

زبان کے اعتبار سے حضرت جنون کا کلام اگرچہ اسوجہ سے مستحق ستائش ہی کہ آپ کا وطن کاٹھیاوار ہی جہان کی زبان ابھی

اسقدر ترقی یافتہ نہین ہو کہ اُسمین اصلاح کی گنجائش نہ سمجھی جائے تاہم آپ نے زبان کی صفائی، بندش کی درستی اور محاورات کے صحیح استعمال کا بہت خوبی سے خیال رکھا ہو مگر خال خال ایسی مثالین نظر آتی ہین جہان کسی محاورے یا لفظ کا استعمال صحت کے ساتھ نہین کیا گیا مثال کیلئے یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

مینوش اُٹھین اپنے قدح کی سنا مین خیر
آمادہ ہو ابر ادھر وہ کہین سے اُٹھا ہوا

"قدح کی خیر سنانا" محاورہ ضرور ہو لیکن اس موقع پر اس کا استعمال غلط ہوا ہو۔

یا یہ شعر ؎

تو بھی آیا نہ اے خیال صنم — رات بھر ہم تجھے پکارے ہین

اسمین "پکارے ہین" آجکل کے رواج کے اعتبار سے غیر فصیح ہو۔

اسیطرح اس شعر مین ؎

شوخ ہو جائینگے کہہ دیتے ہین اُنکے تیور
اول شب جو وہ شرماتے ہین شرمانے دو

"کہہ دیتے ہین" کے عوض "کہے دیتے ہین" ہونا چاہیے۔

ان معمولی فروگذاشتون کے علاوہ حضرت جنون کا کلام داد کا مستحق ہو۔ بعض غزلین خاص طور پر دلچسپ پائی گئی ہین اکثر اشعار تاثیر اور بیساختگی کی گوناگون خوبیون سے مالامال ہین۔ مثلاً

اگرچہ دل سے ہو یاس لیکن آس ہو اتنی — کہ میرا نام شامل ہو ترے امیدوارون مین
رہی کچھ معتبر اب آپکے نزدیک ٹھہرو ہین — گنا کرتے تھے جنکو آپ اپنے اعتبارون مین
نہ سمجھا وقت پر مین ہائے اب سمجھا تو کیا سمجھا — وہ سب کچھ کہہ گئے تھے چھپی چتون کے اشارون مین

وہ پوچھین مرا حال یون ملتفت ہونے — مگر اُن کو دھوکا ہوا ہے کسی کا

والے قسمت اُنسے جب پوچھا تو عجب حسن سے — کہہ دیا مین نے کہ میرا حال کچھ بھی نہین
غیر سے وہ تذکرہ میرا ہی کرتے تھے مگر — مین نے جب پوچھا تو جھنجلا کر کہا کچھ بھی نہین

غزلیات کے ماسوا، قصیدے، سہرے، قطعے اور خمسے بھی ہین اور سب اپنی اپنی جگہ اچھے ہین۔ شروع دیوان مین ایک دیباچہ شامل ہو جسمین مصنف کے سوانحی حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہو لیکن ایک بحث کے درمیان مندرجہ ذیل شعر کو غلطی سے غالب کی تصنیف خیال کر لیا گیا ہو ؎

ڈیڑھ جزبہ بھی تو ہو مطلع و مقطع غالب
غالب آسان نہین صاحب دیوان ہونا

کتاب ملنے کا پتہ:۔ منشی عبدالرحمن محمد محسن صاحب خوشتر مدرسہ اسلامیہ۔ منگرول (کاٹھیاوار) قیمت غالباً ۱ر

پایل اور گھایل (بفتح یای تحتانی)

ان دو لفظون کو شعرائے متقدمین و متاخرین دِل اور قاتِل وغیرہ کے قافیے مین ہمیشہ لاتے اور لاتے ہین۔ غالباً یہی وجہ ہو کہ صاحب نفائس اللغات نے پایل کو بکسر ہمزہ لکھا ہو اور گھایل کا کچھ چہرہ نہین بتایا، اسکی نسبت چاہے جو کچھ اُن کا خیال ہو۔ حضرت جلال لکھنوی نے اپنے لغت "سرمایۂ زبان اُردو" مین دونون کو بکسر ہمزہ تحتانی لکھا ہو حقیقت یہ ہو کہ کسرے کی دُم اُن مین اِس ہمزہ کی بدولت لگی جو تحتانی پر بڑھایا گیا ہو۔ اس دُم کا ڈگڑ ایہی ہمزہ ہو۔ نہ یہ ڈگڑا قدماء بڑھاتے نہ اِنمین کسرے کی دُم پیدا ہوتی۔ واضح ہو کہ یل اُردو مین ایک کلمہ ہو جو کسی لفظ کے ساتھ مل کر کبھی فاعلیت اور کبھی مفعولیت اور کبھی نسبت اور کبھی صاحب کے معنی کا فائدہ دیتا ہو۔ بعض کلمات مین شامل ہونے سے اسکی تحتانی ساکن اور بعض مین مفتوح ہوتی ہو۔ یاد رکھیے کہ اسکے مرکبات مین جن کا جزو اول استعمال مین متحرک الآخر ہو اُن مین اس کی تحتانی ساکن اور جن کا جزو اول ساکن الآخر ہو اُن مین مفتوح ہوتی ہو۔ سوا ان دو صورتون کے تیسری صورت اسکی نہین ہوتی جیسے بھلیل، نکیل، ہٹھیل، بیل، وغیرہ مین ساکن اور اڑیل، بڑیل، سڑیل، کڑیل، مریل، چٹیل، وغیرہ مین مفتوح ہو۔ اسی قبیل سے پایل اور گھایل بھی ہین کہ اول پاؤن اور یل سے اور دوم گھاو اور یل سے

رکب ہی۔ پہلے جزون مین بسبب ثقالت وکثرتِ استعمال تخفیف ہوکر یہ صورت رہ گئی۔ اب کہئے یہ دونون الفاظ بکسرِ ہمزہ کیون مشہور ہوگئے اصل تو یہ ہی کہ بول چال روزمرہ مین کسرِ ہمزہ مشہور ہی نہین بلکہ بفتح یا زبانون پر ہین۔ صرف قافیے مین شعرا کو پرانی تقلید مجبور کردیتی ہی۔ اسکی وجہ یہ ہی کہ زبان اُردو جو پیدا ہوئی تو اُسکی نشو ونما انھین لوگون مین ہوئی جن کی زبان اصل فارسی وعربی تھی۔ اُنھین کے آغوش مین اس نوزائیدہ بچے نے پرورش پائی۔ اس لیے انھون نے اکثر الفاظ اس زبان کے جو صورت یا تلفظ وغیرہ مین فارسی وعربی الفاظ سے ملتے جلتے پائے اُنکی شکل بعینہ ویسی سمجھ لی۔ یہی سبب ہی کہ اکثر اردو الفاظ کے املا مین حروف مخصوصہ تازی بھی پائے جاتے ہین پس پیشتر اُردو کے اگلے شعرا نے پایل اور گھایل کو قایل سایل حایل مایل وغیرہ سے ملتا جلتا دیکھ کر اُنکی تحتانی پر بھی مثل اُنکے ہمزہ لکھ دیا، اور جب ہمزہ لکھا تو از روے قاعدہ اُسکو مکسور کرنے کے لیے مجبور ہوے، کیونکہ ہمزہ جب حروف علت مین سے کسی پر آتا ہی اور اُن حروف کا مابعد ساکن ہوتا ہی تو اُسکی حرکت انھین حروف کے موافق ہوتی ہی۔ مثلاً واؤ مابعد ساکن پر جب آئیگا تو واؤ کی مناسبت سے مضموم ہوگا جیسے طاؤس کاؤس وغیرہ۔ اور الف مابعد ساکن پر جب آئیگا تو الف کی مناسبت سے مفتوح ہوگا جیسے ہیأت جرأت وغیرہ۔ اور یاے مابعد ساکن پر جب آئیگا تو یے کی مناسبت سے مکسور ہوگا جیسے سائل مائل طائر زائر وغیرہ۔ پس اسی آخری صورت نے متقدمین کو پایل اور گھایل کی یے پر ہمزہ لکھ دینے کی وجہ سے دھوکے مین ڈالا، اور انھون نے بلا تامل ہمزہ کو مکسور کرکے قافیے مین باندھ دیا۔ اصل مین ان اردو الفاظ کا چہرہ بگاڑنے کا باعث ہمزہ ہی۔ نہ یہ بڑھتا اور نہ قدما کو اسکے مکسور کرنے کے لیے قاعدہ مجبور کرتا۔ چوک صرف یہی ہوئی کہ ہمزہ لکھ کر یہ الفاظ قائل سائل مائل وغیرہ کے ہمشکل بنالیے گئے۔ جب یہ جڑ پڑ گئی تو متقدمین کی دیکھا دیکھی شعراے مابعد (حضرت ناسخ وآتش وغیرہ) نے بھی انھین کا تتبع کیا۔ مگر یہ تتبع شعرا ہی کے حصے مین آیا اور

وہ بھی صرف قافیہ بندی تک محدود رہا، اس لیے کہ یہ ہمزہ دیکھ کر اُن کو قاعدہ مذکورۂ بالا کے موافق اسے بالکسر ماننا اور نظم مین دل قاتل محمل وغیرہ کے قافیے مین لانا پڑتا تھا۔ جملہ ثقات اہل زبان جو شاعر نہ تھے اور جنھین قافیہ بندی کی ضرورت نہ تھی اُن کا لہجہ برابر بفتح یا رہا اور اب بھی ہی۔ بلکہ بول چال روزمرہ مین شعرا کی زبان پر بھی یون ہی رہا۔ لہٰذا اُستاذی جناب بحر مرحوم نے اس کی اصلاح کی اور اس دھوکے کی ٹٹی (ہمزہ) کو بالکل دور کرکے قاتل باطل وغیرہ کے قافیے مین لانا ترک کردیا اور تحتانی کے فتح کے ساتھ مقتل بادل وغیرہ کے قافیے مین لانا شروع کیا۔ مگر یہ تصرف اُن کا صرف گھایل کے لیے مخصوص ہی۔ چنانچہ فرماتے ہین ؎

یہ دی ہے بیکلی تونے کہ دل مین ہے یہی کل سے
کہ دھو کر زندگی سے ہاتھ پونچھون تیرے آنچل سے

ستم کیا کیا نہ ہوگا اُس قمر طلعت کے کشتے پر
کرے گی چاندنی اب ناز معشوقانہ گھایل سے

باغ میرا ہوا برباد جو بادل آئے
تجھ دن کی ہوئی بوچھار اگر پھل آئے

تیرے دیدار کی حسرت نے چھری پھیری ہی
ین تڑپتے ہوے ہم آنے لگے گھایل آئے

حضرت استاد کے اس تصرف کو اکثر شعرا مثل جلال لکھنوی، امیر مینائی، تسلیم لکھنوی، داغ دہلوی وغیرہ نے مستحسن تسلیم کرکے کم وبیش ان کی تقلید کی۔ ان سب کے کلام مین "گھایل" مائل اور قائل وغیرہ کے ساتھ ہمقافیہ نہین ان مین سے بعض نے تو صرف بکسرِ تحتانی اسکے استعمال سے احتیاط کی مگر بوجہ پرانے اثر اور عادت قدیم کے دھڑکے سے بفتح تحتانی مقتل اور بادل وغیرہ کے قافیے مین لانے کی یکایک جرأت نہ کرسکے اور بعض نے پوری تقلید کی۔ چنانچہ حضرت تسلیم لکھنوی بفتح تحتانی قافیے مین یون فرماتے ہین ؎

گمان کیونکر نہ ہو خلد برین کا صحن مقتل پر
تصدق ہوتی ہین حورین تیرے خنجر کے گھایل پر

حسرت لکھنوی؎
روح نکلی تن سے جب بیکل ہوئی — یوں شبِ فرقت کی مشکل حل ہوئی
دید کی حسرت رہی دل میں مرے — تیغ ابرو سے نظر گھایل ہوئی

دلی لکھنوی؎
تیغ قاتل تری پڑی ہلکی — حسرتیں کیوں نہ رہیں گھایل کی

بعض پورے مقلد ہیں، مگر اسے بفتح یا قافیے میں کہیں لانے کا انھیں اتفاق نہیں ہوا اگر ہو تو ایسا کرنے میں ان کو کوئی تامل نہ ہوگا۔

الحقصر استاد مرحوم کے اس تصرف کا اعتراف جناب ظہیر احسن صاحب شوق نیموی عظیم آبادی نے تقلیداً "ایضاح" میں کیا ہے" اور حضرت جلال لکھنوی نے بھی اپنی لغت "سرمایۂ زبان" اردو میں گھایل کے بیان میں اسکا ذکر کیا ہے اور اس قدر تقلید بھی کی کہ دل اور قاتل وغیرہ کے ساتھ مقافیہ کرنے سے احتیاط کی ہے مگر پرانی لکیر کے فقیر ہونے کا اتنا اثر ضرور باقی رہا کہ آخر میں یہ لکھ دیا کہ

اتفاق جمہور فصحای لکھنؤ کا لغت مذکور میں یای تحتانی کے کسرے ہی پر ہے۔ یعنی مکسور ہی پڑھتے ہیں اور دل و بسمل کے قافیے میں لاتے ہیں۔

اب رہا پایل:۔ اس کی تحقیق کی نسبت محققین کی کوئی تحریر یا تصرف میری نظر سے نہیں گزرا، لیکن اس کے بفتح یاے تحتانی ہونے میں کوئی شک و شبہہ نہیں، اور اگر کہیں قافیے میں باندھنے کی ضرورت پڑے تو میرے نزدیک بلا تامل بیاے مفتوحہ ہی باندھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ جہاں تک تحقیق کی نظر ڈالی جاتی ہے اس کی یے مکسور نہیں ثابت ہوتی اور نہ اس پر ہمزہ کی کچھ اصل ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ پس پایل اور گھایل دونوں بفتح یاے تحتانی بغیر ہمزہ صحیح و فصیح اور بیاے مکسورہ و ازدیاد ہمزہ غلط اور قابل ترک ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خادم الشعرا **محمد محمود احمد** (لکھنوی)

نظم ہاشمی

(ملاحظہ ہو رسالہ "الناظر" لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۹۱۲ء)

لکھنؤ کا مشہور رسالہ "الناظر" جو قدامت الشیوع ہونے کے لحاظ سے ملک کا ایک ہی پرچہ ہے، ہماری نظر سے ہمیشہ گزرتا رہا ہے اور اب بھی ہم اُسے شوق سے دیکھتے ہین مگر افسوس ہے کہ جسقدر وہ اپنی پابندی وقت کے لحاظ سے قابل قدر ہے اُسی قدر اپنی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی پالیسی کے اعتبار سے مضحکہ خیز بھی ہے۔ اُسنے اس پانچ سال کے عرصہ مین یعنی آغاز اجراء سے ابتک سیکڑون پلٹے کھائے اور پچاسون معنوی وظاہری رنگ بدلے۔ شروع مین وہ چالیس صفحہ پر شائع ہوتا تھا۔ بڑھتے بڑھتے اسی صفحون پر پہنچ گیا۔ اور پھر رجعت قہقری اختیار کی تو ۴۸ و ۶ صفحون پر آرہا! یعنی کبھی وہ ایک فقیر کا بھرا پرا کشکول تھا جسمین فلسفیانہ علمی تاریخی ادبی معاشرتی و تعلیم نسوان کے متعلق غرض ایک ایک مضمون ہر قسم کا ہوتا تھا! اور نظمین بھی بکثرت، غزلین بھی معقول تعداد مین۔ مگر اب اس کشکول مین چند مختلف سوکھے ٹکڑون کے سوا کچھ نہین ہوتا۔ نہ نظم کا کوئی شمار ہے اور نہ مضامین کا جو کچھ جس صورت سے پایا بھر دیا۔ اور ایک "دفتر بے معنی" کی صورت بنادی گئی۔

کبھی اُس کے آخر مین ربع عجیب جیسا علمی رسالہ ناتمام ضمیمہ کی طور پر شائع ہوکر رہ گیا، کبھی محاربات صلیبی جیسی تاریخی قابل قدر کتاب شائع ہوئی۔ کبھی علمی وتاریخی ضمیمہ سے گزر کر شکسپیر کے ڈرامے کا ترجمہ چھپا۔ اور اب یہ دُم چھلا بھی اُڑا دیا گیا۔ پہلے ترتیب مضامین اور تھی اب کچھ اور ہے۔ ہمین

ا؎ فقیر کا کشکول مین نے اس وجہ سے کہا کہ اسی جون نمبر مین ایک مضمون چھپا ہے جسمین قابل مضمون نگار نے ظرافت کے رنگ مین ایڈیٹر الناظر اور دیگر رسائل کے ایڈیٹرون پر خوب خوب پھبتیان اُڑائی ہین اور بھیک منگا فقیر بنایا ہے، اور حق یہ ہے کہ بجا طور پر بنایا ہے۔

اعتراف ہے کہ الناظر کے صفحات پر کسی زمانہ میں نثر مضامین اچھے اچھے نکل گئے ہیں اور بعض نظمیں بھی مگر جب سے حضرت شوق نے کنارہ اختیار کیا، اور ایڈیٹر صاحب کی وہ قدر افزائی (جسکا اظہار حضرت شوق کی ایک نظم نیرنگ خیال پر بصورت تنقید کیا گیا تھا) دیکھکر دیگر قلمی معاونین نے بھی رفتہ رفتہ کنارہ کشی اختیار کی اور یہیں سے الناظر کے تنزل کی تاریخ کا پہلا باب شروع ہوتا ہے۔ اب اُس میں دو چار مضمون اور ایک آدھ نظم نظر آجاتی ہے۔ مگر جب اصول فن اور صحت زبان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دونوں حصے قابل اصلاح نظر آتے ہیں جس طرح کہ آج سے چند سال پیشتر تھے۔ بالخصوص حصہ نظم۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ الناظر کے عالی خیال ایڈیٹر نظم سے محض نابلد ہیں مگر کیا ایسی حالت میں کہ اُس کا سب ایڈیٹر خود خوشگو شاعر اور زبان و اصول سے واقف ہے،

الناظر میں ایسی مہمل نظموں کا شائع ہونا افسوسناک نہیں ہے؟ ملک میں یوں تو اکثر ادبی رسالے ناقدری کے ہاتھوں مٹ گئے۔ اب چند ماہ سے الناظر بھی گر رہا ہے اکثر مضامین نگار ٹوٹ گئے۔ مضامین کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ صرف دو چار رطب و یابس مضمون چھپ جاتے ہیں۔ مگر سید ہاشمی صاحب فرید آبادی کی توجہ آجکل الناظر کے حال پر خاص طور پر مبذول معلوم ہوتی ہے۔ سید صاحب کا نام اخباری دنیا میں نیا ترین ہے۔ علی گڈھ کالج سے وہ اپنی خودسری اور شوریدہ خیالی کی بدولت نکالے جانے پر ملک میں کافی شہرت پا چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کالج سے اخراج کے بعد اُن کے ذمہ کوئی کام نہیں رہا ہے۔ اور غریب ایڈیٹر نے بھی اپنی ضرورتوں کو ملحوظ رکھکر اسکو غنیمت جانا۔ ہمارے سید صاحب صرف نثار ہی نہیں بلکہ شاعر بھی ہیں۔ لیکن لکھنؤ سے اُنھیں خاص پرخاش ہے چنانچہ ابھی جون کے الناظر میں سب سے پہلا مضمون جو اردو تحریر اور ترجمے کے عنوان سے ۱۰ صفحوں پر شائع ہوا ہے اس کا اصل موضوع یہی ہے کہ لکھنؤ کے ارباب کمال اور مشاہیر کی تذلیل و تحقیر کی جائے۔

ہم ذیل میں سید صاحب کے چند فقرے درج کرتے ہیں۔ جو ہمارے دعوے کا ثبوت ہیں۔ صفحہ ۲ پر مولانا حالی پانی پتی کی مدح سرائی کے ضمن میں جن کی شاعرانہ قابلیت و واقفیت کی داد مرحوم اودھ پنچ صحیح معنی میں بارہا دے چکا ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ خدا کی دین کہتے ہیں اور ہم اسکی مہربانی سمجھتے ہیں کہ جب دلی کے لوگ اونگھ رہے تھے اور لکھنؤ والے ہذیان بک رہے تھے، شاعری کے دیوتا نے پانی پت میں جنم لیا۔

اب نثر کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۴۔

"درحقیقت یہی چیز جس میں میر حسن کی مثنوی اور نثر میں امیر امن کی چار درویش کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اور اسی توازن کا فقدان ہے جسکی وجہ سے فسانۂ عجائب نہ زیادہ مقبول ہوئی اور نہ قابلیت رکھتی ہے کہ آئندہ مقبول ہو۔"

مگر ہم کہتے ہیں کہ سید صاحب کی یہ خودرائی اور چیز ہے اور زمانہ کا شاہد اور شے۔ آفتاب پر خاک ڈالنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ فسانۂ عجائب جس قدر مقبول و مشہور ہوئی دنیا جانتی ہے سرور سا نئے رنگ کا آجتک بے مثل انشا پرداز مانا جاتا ہے۔ سید صاحب کی اور گلفشانی دیکھئے۔

"ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ اس میں فارسی عربی کا میل کم ہو۔ الفاظ بہم نہیں ہوتے ہم فارسیت و عربیت پر نکتہ چین ہیں۔ فسانۂ عجائب پہلے نقص کی بہترین نظیر ہے۔ اور دوسرا عیب عربیت کا پرانے مولویوں کے ہاں جا بجا ملتا ہے۔"

صفحہ ۱۳ سطر ۲-۳ "غرض حقیقت میں یہ کافی ہے نہ ممکن العمل ہے کہ ہندوستان کے مقامات دور دراز سے لوگ اپنا مذاق سدھارنے دلی آیا کریں، یا لکھنؤ سو اُس سے ہم پہلے ہی سے بے عقیدہ ہیں۔"

لکھنؤ سے سید صاحب کی مخالفت کا راز کھل گیا۔ سچ یہ ہے کہ عقیدت ہی ایک ایسی شے ہے جو بسا اوقات انسان کو بھلے اور برے میں

تمیز کرنے ۔ موقع نہین دیتی۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ آجکل دلّی مین سوا تجارت
کے کچھ نہین رہا ہے۔
زبان مٹ چکی۔ شاعری برباد ہو گئی کہ کوئی اہل سخن باقی نہین رہا
اخلاق کی ہر شخص مین کمی ہے۔ پنجابیت ساری دہلی پر چھا گئی ہے زبان
مین سختی و کرختگی آگئی۔ تشدید کا استعمال تمام الفاظ مین بہت بڑھ گیا
ہے ہم بھی دہلی مین رہے ہین اور یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے غیر اس سے
قطع نظر کر کے ہمنے مانا کہ لکھنؤ بُرا ہے۔ یہان والے بیچارے کیا جائین
نہ چاندنی چوک کی ٹھوکرین کھائین اور نہ جامع مسجد کی سیڑھیون پر گئے
اور نہ قلعے معلےٰ کی زیارت کی۔ مگر سید صاحب جنکو دہلی سے خاصی
عقیدت ہے جنکو دہلی والون کی ہر ادا مین حُسن نظر آتا ہے، اور
جو خود بھی اطراف دہلی کے رہنے والے ہین، انہون نے جو کچھ پایا ہے
دہلی سے اور اس سبب سے انکی ہر بات گویا اہل دہلی کی بات اور
ہر کلام ان کا گویا دہلی کا ٹکسالی کلام ہو۔ اب ذرا انکی خوبیان بھی ملاحظہ کیجئے[1]
اسی جون نمبر مین نالۂ یاس کے عنوان سے جو نظم آپ کی دو مضمون
پر ترکیب بند کی صورت مین شائع ہوئی ہے اور جسپر مئی کے الناظر مین
فاضل ایڈیٹر کا یہ تعریفی نوٹ ایک ماہ پیشتر چھپ چکا ہے:۔
"ہمارے دوست عزیزی سید ہاشمی بھی اس جلسہ مین شریک تھے اور
ہماری طرح خالی ہاتھ نہین آئے تھے، بلکہ ایک لطیف و پر درد نظم اس موقع
کے لئے لکھ کر لائے تھے جنکو ان کے خاص لہجہ و انداز مین سنکر بہت حظ
حاصل ہوا اور اگر دامن ناظر کی تنگ دامنی مانع نہ آتی تو ہم اسی وقت ناظرین
کرام کو اُس سے لذت آشنا بناتے۔ اب جون کے پرچہ کا انتظار کرنا پڑیگا"
یہ نالۂ یاس وہی نظم ہے جس کے لذت آشنا ہونے کا انتظار ایک
ماہ پہلے سے حضور صاحب الناظر کی سفارش پر ناظرین کر رہے تھے، اور

جو برار کانفرنس کے جلسۂ ایلچپور مین پڑھی گئی تھی۔
لکھنؤ والون کا ہذیان بکنا سید صاحب کے قلم سے آپ دیکھ چکے
اب خود بدولت کی خوشگوئی و لطافت بھی دیدنی ہے۔ اول بند کا پہلا شعر
حسرتین اس ملک پر اور عبرتین ہین قوم پر   جسکے جی کے حوصلے اور ولولے سب جائین مر
دوسرے مصرعہ مین "سب جائین مر" کی تعقید سے قطع نظر کر کے جو در اصل
اس جگہ زبان پر نہایت ناگوار و ثقیل ہے۔ "ملک پر حسرتین اور قوم پر
عبرتین" محاورۂ اہل زبان سے منافی ہے۔ اہل زبان اس موقع
پر اظہار افسوس و رنج کرتے ہین اور یہی قاعدہ ہے۔ مصرعہ یون ہونا چاہئے۔
حیف ہے اُس ملک پر افسوس ہے اُس قوم پر۔ دوسرا شعر ؎
ہو چلے معدوم جس کے جوہر انسانیت   جسکی جیرت گران ہے عالم تہذیب پر
جیرت بسکون جیم تحتانی بالکل غلط ہے۔ سید صاحب کو ضرورت شعری
یا شاعرانہ کمزوری نے اتنا مجبور کر دیا کہ مفتوح حرف کو ساکن نظم کر گئے۔
چھٹا شعر ؎
جسکا جینا بار ہے دنیا کو اور مخلوق کو   جسکے افسانے پہ شرماتی ہے تاریخ بشر
پہلے مصرعہ مین دنیا کو کے ہوتے مخلوق کو بالکل حشو و برائے بیت ہے
جس سے شاعر کی کمزوری کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ساتوان شعر ؎
جسکے گھٹنے کی مناہی ہو رہی ہو ملک ملک   پھیل جائے وان مبادا اسکا زہریلا اثر
یہ ثقات لکھنؤ کی زبان نہین اور گھٹنے کی فصاحت سے تو ناظرین الناظر
خود محظوظ ہو گئے ہونگے۔ لکھنؤ کے سوقی آدمی بھی ایسی لفظون سے پرہیز کرتے
ہین۔ ٹیپ کا شعر ؎
کاش یہ ہوتا کہ ایسی قوم نا ہنجار کو   برق خاطف گر کے بیجاتی فنا کے غار کو
پہلے مصرعہ مین یہ ہوتا کہ بالکل برائے بیت اور حشو ناجائز ہے۔ لکھنؤ والون
پر سخت ہذیان اور خود سید صاحب کی یہ خوش سرائی انصاف طلب ہے۔
چھوٹا منہ بڑی بات۔ یا خود را نصیحت و دیگرے را فضیحت، اسی کا نام ہے۔
افسوس صد افسوس اے خدائے خدا کو، اسکی جہلیت کی بھی کوئی حد نہین۔

[1] غالباً سید صاحب گا کر پڑھتے ہون گے جس طرح کہ دہلی کے اور بعض سخنورون کا شیوہ ہے، اور شاید اسی کو ایڈیٹر صاحب خاص لہجہ و انداز سے تعبیر کرتے ہین۔

دوسرے بند کا پہلا شعر ؎

اے میرے دل کا انداز تلاطم ہاشمی کرئی دیکھے میری ایڈسی پہ اسکی برہمی

لفظ ہاشم بکسر شین ہے اور برہم بفتح ہائے حطی - دونون کا قافیہ ہرگز نہین آسکتا سنگ بندی اور چیز ہے اور اصول فن اور شے - علاوہ ازین برہمی کا وجود غصہ کے وقت ہونا چاہئے نہ ایڈسی مین - اس سے بڑھکر سید صاحب کی وسعت معلومات کا گواہ عادل مندرجہ ذیل شعر کا قافیہ ہے ؎

ہے ابھی تک اس مین تابان جلوۂ حسن امید یعنی آتش زیر دامن ہو ابھی سنگ نے مین

برہمی کا قافیہ زمین سراسر ناجائز ہے - البتہ ہاشمی صاحب کے "دیوتا" نے اس قسم کی تُک بندی کی ہے اور شاذ کو ناز کا قافیہ باندھا ہے - غالباً اپنے ممدوح دیوتا کی اندھی تقلید مین ہاشمی صاحب نے یہ جرأت کی ہے - سچ ہے حب الشی یعمی ویصم - ساتوین شعر کا دوسرا مصرع ؎

"پر دماغون مین ابھی ہے بوئے عطر مشتمی" اس مصرعہ مین ابھی کے بعد تک کی ضرورت اسی طرح ہے جس طرح کہ پہلے مصرعہ مین خود ہاشمی صاحب لائے ہین - میرے نزدیک مناسب تھا کہ آپ ان خیالات کو نثر مین ادا فرماتے نظم کرنے کی زحمت بیکار گوارا فرمائی - تیسرے بند کا پہلا مصرعہ "ہوشیار اے بے خردتا کے یہی بدمستیان" غریب ہاشمی کو ضرورت وزن نے پھر محل استعمال سے بے خبر کر دیا "یہ بدمستیان" کا محل اور یہی "درستی وزن کیلئے کہہ جانا کسی صورت سے درست نہین - پانچوان شعر -

یعنی کو انسان بنا ہی نہ تھا کچھ سہل یہ حق ادا اسلام کا کرنا ہو جس سے بھی گران

شعر کی تقطیع کیجیے گرگئی - اول مصرعہ کا آخری ٹکڑا سید صاحب کی اُس فصاحت و لطافت کی مثال ہے جسکی داد قابل ایڈیٹر ایک ماہ پیشتر اپنے ایڈیٹوریل مین دے چکے ہین - آٹھوین شعر کا دوسرا مصرعہ "تب کہین بنتا ہے جا کر ایک دشت بیکران" یہ جا کر کس ضرورت سے لایا گیا ہے ذرا سید صاحب ہی بتا ئین ؛ بحر کی صفت بیکران ہونا چاہئے - اگرچہ معناً خرابی نہین مگر ترکیب مین اجنبیت ضرور ہے - چوتھے بند کا پہلا شعر

اوگر تو اپنی ترقی پر بہت مغرور ہے دور ہے منزل سے او سیلاب کو سول دور ہے

"اوگر تو" کی فصاحت سید صاحب کے حصہ کی چیز - فارسی کی اندھی تقلید اسی کا نام ہے -

پائے بے زنجیر آزادی کا ہو کیونکر نشان دل طلسم عبدیت مین جب ترا مسحور ہے

اس شعر کا مطلب ہاشمی صاحب خود سمجھین یا ان کے مداح و ممدوح ورنہ ہمارے نزدیک المعنی فی بطن الشاعر کا مصداق ہے - چوتھے شعر کا دوسرا مصرعہ ؎ "تیرا قصر آرزو یک حجرۂ بے نور ہے" سید صاحب یہ وہی نقص فارسیت ہے "جسکی بہترین نظیر آپ فسانۂ عجائب کو کہتے ہین اور جس نے آپ کے خیال مین اس نادر کتاب کو نہ مقبول ہونے دیا اور نہ قابل مقبولیت رکھا - ساتوان شعر ؎

وہ محمد مصطفےٰ وہ صاحب ناز جلال ظلمتون مین اسم مطہر جس کا شمع نور ہے

حضرت پیغمبر علیہ السلام کو صاحب ناز کہنا خلاف شان ممدوح ہے اور نام پاک کی جگہ اسم مطہر لانا ایسی بدعت ہے جو کسی صحیح گو شاعر کے کلام مین نہین ملسکتی - مطہر کے معنی پاک کرنے والا، نہ پاک - اس سے سید صاحب کی عربی دانی کا ثبوت ملتا ہے - کیون نہ ہو آخر ہاشمی ہین - آپکی شاعرانہ نوعیت کا ہم پہلے ہی اعتراف کر چکے ہین ورنہ مصرعہ یون ہو سکتا تھا "ظلمتون مین جسکا نام پاک شمع نور ہے" مگر ظلمتون مین نام پاک کا شمع نور ہونا بھی عجیب بے تکی منطق ہے ؎

پیشتر خطرے بہت کچھ تجھ سے تھے اغیار کو کیونکہ وارث مصلح عالم کا تو مشہور ہے

نہین معلوم ہوا کہ وارث مصلح عالم کا سید ہاشمی نے کسے قرار دیا ہے - عالم تو بیشک نبی کا وارث ہو سکتا ہے بفحوائے حدیث نبوی "العلماء ورثۃ الانبیاء" اور اگر یہان محض مسلم کی جانب خطاب ہے تو وارث کا لفظ ٹھیک نہین بلکہ لفظ پیرو یا کوئی اسی کا ہم معنی لفظ لانا چاہئے تھا - حضرت مصطفےٰ کی شان مین ارشاد ہوتا ہے ؎

جسنے بہکایا کہ امت شل اک کنبہ کے ہے یعنی کل کے چین پر ذاتی خوشی محصور ہے

بہکایا غالباً کاتب کی غلطی ہے - تبلایا یا اور کوئی لفظ اس کا ہم معنی

٭ جولائی نمبر مین تصحیح کر دی گئی ہے کہ بہکایا کے بجائے "جھلکایا" ہونا چاہئے - مگر جھلکایا بھی دکھلایا اور تبلایا کے معنی مین استعمال کرنا بالکل غلط ہے !-

ہوگا۔ ورنہ بہکانا حضرت کی شان مین ناقابل معافی گستاخی ہے ؎

تجھ سے ہے ہیہات صد تذلیل دین پاک کی   خندہ زن آج اُسپہ اک اک سفلہ مغرور ہے

اول مصرعہ مین صد تذلیل ہاشمی صاحب کی مخصوص فصاحت ہے جسکو ہم لوگ نقاد فن غرابت کہتے ہین۔ جسنے مصرعہ کو ستیاناس کر دیا ہے۔ مگر ہے تو ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔ آخری بند کا پہلا شعر ؎

تسے بھی دو بول سے صاحبان انجمن   یعنی بھر زمانے پیالون مین صہبائے کہن

سید صاحب کے دو بول صاحبانِ انجمن سے کیا خوب ہین۔ سبحان اللہ دو بول اور تمام حاضرین انجمن سے؟ یہ تو جانورونکی بولی ہے۔ دوسرے مصرعہ مین "پیالون مین" سے آگے "تو ہے" لانا ضروری ہے ورنہ مصرعہ مہمل رہے گا دیکھئے "دی" بھر گئی۔ پیالہ مین اظہار یا ضروری ہے پیالہ غلط ہے۔ دوسرا شعر ؎

وہ مبارک کوششین ہوتی ہین بار آور ضرور   جنکی ہوتی تائید پر اخلاص اور سچی لگن

اس مصرعہ کی فصاحت نظم کی جان ہے اور اس قسم کی فصاحتین سید صاحب کا مخصوص جوہر ہین اس نظم مین کئی جگہ پایئے گا۔ سچی لگن مگر لگاؤ اور دلی تعلق کے معنی مین کہا گیا ہے تو متروک اور مہمل ہے ؎

حوصلہ افزود ہے خود مشکلون کی زیادتی   رکے کے جو دریا بڑھے ہوتا ہے دو نا موجزن

حوصلہ افزائی کی جگہ حوصلہ افزود لانا سید صاحب کی فارسی دانی کو بھی غتبہ کئے دیتا ہے۔ اور پھر زیادتی کی یا اور "اول کا تقطیع سے گرجانا تو ہاشمی صاحب کی شاعرانہ قدرت و واقفیت کا ایسا ثبوت ہے جس پر بت بندی بھی بغیر مضحکہ اڑائے نہین رہ سکتا۔ مگر نہین سید صاحب کو اپنے "دیوتا" کی تقلید مین سب کچھ جائز ہو گیا ہے۔ اس شاعری پر لکھنؤ والون کی شاعری پر تہمت ہذیان "ایک غیرت دار آدمی ہی کر سکتا ہے۔ شاباش ہے آپکی جرات اور دیدہ دلیری کو ؎

اور جو یہ کام یعنی علم اور فن کا رواج   جنکی یہ سب جوت ہے دنیا مین اہلِ وطن

علم و فن کے رواج کی جوت آج سید صاحب ہی کے کلام سے دریافت ہوئی۔ چراغ کی جوت ہوتی ہے۔ مگر علم و فن کی یا اُسکے رواج کی جوت بھی کیا خوب! جو غالباً روشنی کے معنی مین نظم کیا گیا ہے جو غلط در غلط ہے۔ اسی قابلیت کے بھروسہ پر سید صاحب

لکھنؤ والون کے منھ آتے ہین "سبحان تیری قدرت!" ؎

خالصاً للہ وللمخلوق ہو گر یہ سعی   اس سے بڑھکر نہ عبادت نہ کوئی کار حسن

"خالصاً للہ وللمخلوق" کی عربیت جسکو مصرعہ کا لنگر بھی نہین سنبھال سکتا بڑی وزنی ہے حضرت! یہ وہی عیب ہے جسکی نسبت آپ فرما چکے ہین "اور دوسرا عیب عربیت کا پرانے مولویون کے ہان جابجا ملتا ہے۔" مگر اس بیسوین صدی مین اور علیگڑھ کے تعلیم یافتہ، دہلی کے تربیت یافتہ ناظم و ناثر کے کلام مین اُس عیب کا ہونا کسقدر شرم کی بات ہے۔ ایسی حالت مین کہ وہ خود اُسے برا سمجھتا ہے۔ میرے نزدیک اُردو شاعری پر یہ پتھر برسانا ہے۔ اور سعی بسکون "ع" چاہئے۔ لہذا اپنی کمزوری سے اسکو متحرک نظم کرنا ناجائز اور غلط ہے۔ سید صاحب خدا کے لئے شاعری کو چوپٹ نہ کیجئے۔ دوسرے مصرعہ مین فارسی حرف نفی "نہ" نے جو حسن پیدا کر دیا ہے وہ صاحبان مذاق سلیم پر پوشیدہ نہین ہے ؎

پکھ کرو اخلاق میجا مین کہ تم کچھ کر گئے   ورنہ یون تو بیل بھی تک بہت اور مر گئے!!!

دوسرے مصرع کے آگے تین علامات تعجب ہین اور اس مصرعہ پر خط بھی ہے۔ یہ معلوم وہ کیا خصوصیت ظاہر کر رہا ہے۔ یہ نہ کوئی مثل ہے اور نہ ایسا مصرعہ جسکی خاص طور پر داد دیجائے اب چند وہ مصرعے ملاحظہ ہون جنکو فارسی عربی کے کثیر الفاظ نے غرابت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ "جنکی جھریت گران ہے عالمِ تہذیب پر"

یعنی استحصال حق اور انتقام ظلم و شر   یعنی آتش زیر دامن ہو ابھی سنگ نہ مین

گو نوع عشرت کے طوفان فرو ماندہ کی ہے   سطح مین یا سوت سوکھے پڑے ہین کچھ نمی

الغرض گو اب گمان خواب سرشب کا نہین   تیرا قصر آرزو یک حجرۂ بے نور ہے

دین فطرت کے ترفع کے لئے مامور ہے۔ ترفع کی غرابت شکوہ سنج فصاحت ہے "تجھ سے ہے ہیہات صد تذلیل دین پاک کی" ان الجھے ہوئے مصرعونکے علاوہ عبدیت۔ جھریت۔ انسانیت۔ فارسیت عربیت ایسے مصدر ونکی بھرمار بھی منافی فصاحت ہے۔ المختصر یہ نظم ۱۹۱۲ء کی ایک زندہ ادبی یادگار ہے۔ ہاشمی صاحب کا نام انجمن ترقی اردو کے ارکانِ شوریٰ کی فہرست مین بھی شامل ہے اور جب ایسے قابل فرد اس مین شامل ہین تو ترقی معلوم!۔ آخر مین مومن کا یہ شعر پڑھتے ہوئے ہم ناظرین سے تضیع اوقات کی معافی مانگتے ہین ؎

یہ عذر امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا   مین الزام اُنکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

نقادِ سخن

تبصرہ

مشاہیر یونان و روما

انجمن ترقی اُردو نے ابتدائے قیام سے اس وقت تک جس قدر کتابیں ترجمہ و تالیف کرائی ہیں ان میں لحاظ افادت و نفع رسانی کتاب زیب عنوان وہی درجہ رکھتی ہی جو نظام شمسی میں سورج کو حاصل ہی۔ انجمن کے دور جدید میں بہت اور قابل تعریف کام ہوا، اور اُردو میں کئی بلند پایہ کتابیں اضافہ ہوئیں لیکن اگر یہی ایک کتاب یعنی مشاہیر یونان و روما شائع ہوتی تو بھی ہم کو اس اعتراض کا کوئی حق نہ تھا کہ انجمن نے کچھ کام نہ کیا۔ بہت سی کتابوں کا ذخیرہ فراہم کر دینا یا ایک مفید اور کام کی کتاب چھاپنا دونوں قابل ستایش و تحسین کارنامے کہے جا سکتے ہیں لیکن یہ ہر صاحب ذوق سلیم تسلیم کرے گا کہ اول الذکر کارنامے کے مقابلہ میں آخر الذکر کارنامے پر انجمن زیادہ مبارکباد کی مستحق ہی۔

یوں تو ہر کتاب کی نسبت کہا جا سکتا ہی اور ہمارے ریویونگار کہا ہی کرتے ہیں کہ یہ کتاب اُردو میں ایک بیش بہا اضافہ ہی مصنف نے یہ کتاب لکھ کر اُردو کی بہت بڑی کمی پوری کی" وغیرہ وغیرہ لیکن اصل یہ ہی کہ اس قسم کی تعریف و توصیف اسی قسم کی کتابوں پر زیادہ صادق آتی ہی جیسی زیر تبصرہ کتاب ہی۔

یہ کتاب جس پایہ کی ہی اُس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہی کہ یہ بھی منجملہ اُن کتابوں کے ہی جنھوں نے یورپ کی کایا پلٹ کر دی۔ یہ ایک واقعہ ہی اور اس واقعہ کی تصدیق کتاب کے مطالعے سے ہو سکتی ہی جو شخص یہ کتاب پڑھے گا اُس کو اس حقیقت پر یقین آ سکتا ہی کہ ایسا وہ قوتیں کون کون ہیں جن سے ایک ترقی پذیر قوم صحیح راستے پر پڑ سکتی ہی ایک سپہ سالار، ایک مقنن، ایک حکمران، ایک اخلاقی ترقی کا خواہشمند

سب کی یہ کتاب رہنما ہو سکتی ہے، اور مصنفین فن حرب، قانون، سیاست، اخلاق اور علم النفس وغیرہ کے لیے اس کتاب میں کافی مواد موجود ہے غرضکہ تاریخ کے مطالعہ سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اُن کی یہ کتاب تنہا ضامن ہے خود مصنف خوشگوار طریقہ سے اُن علوم کے سبق ہم کو پڑھا دیتا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو جن کے انتخاب اور کوشش سے اس بیش بہا جواہر کا اُردو میں اضافہ ہوا، اور سید ہاشمی صاحب جن کی جانکاہی محنت اور عرق ریزی نے اِسکو اُردو کا لباس پہنایا، دونوں کا شکریہ واجب اور انجمن مبارک باد کی مستحق ہے۔ کاش جس رتبہ کی یہ کتاب ہے اُس کے شایان شان اس کی لکھائی چھپائی میں بھی اہتمام کیا جاتا اور نہایت نفیس کاغذ پر خوشخط اور آب و تاب سے چھاپی جاتی، کتاب کی پہلی قدردانی یہی ہے کہ وہ اعلیٰ پیمانہ پر چھپوائی جائے۔ ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ "مشاہیر یونان و روما" پر معمولی کاغذ پر اور خراب چھپوا کر ظلم کیا گیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اس امر کی ضرورت تھی کہ اس کتاب کا ترجمہ کسی اُردو کے ماہر یا اہلِ زبان کم از کم صحیح اُردو لکھنے والے سے کرایا جاتا۔

انجمن کی طرف سے اس سے پہلے ایک کتاب "مقدمات الطبیعات" شائع ہوئی ہے اُسے دیکھ کر ہم نے خیال کیا تھا کہ یہ ایک اتفاقی امر ہے لیکن اب یہ "مشاہیر یونان و روما" شائع ہوئی ہے۔ اِسے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ انجمن نے کیوں موجودہ صورت سے شائع کرنے کو جائز رکھا۔ اگر انجمن کو کوئی صحیح اُردو لکھنے والا اِس کے ترجمے کے لیے نہ ملا تھا تو یہ اُس کا فرض تھا کہ چھپنے سے پہلے اُس پر نظر ثانی کرتی اور تمام صرفی و نحوی اور روزمرہ، محاورہ کی غلطیاں جن سے اس کتاب کا ہر صفحہ ایک خارستان بنا ہوا ہے درست کر دی جاتیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے قابل قدر مقدمے میں اس ترجمہ کی نسبت لکھا ہے کہ "میری رائے میں یہ اُردو ترجمہ بلحاظ طرز بیان، سلاست، و تسہیل مطالب انگریزی ترجمہ پر فوقیت رکھتا ہے" مولوی صاحب موصوف اُردو کے بہت بڑے انشا پرداز اور بہت بڑے نقاد ہیں، اس لیے مجھے تو یہی شبہ ہے کہ یہ الفاظ اُن کے نہیں ہیں یا تو یہ جملہ الحاقی ہے یا اگر انھیں کی تراوش قلم ہے تو میری رائے میں انھوں نے بلا ترجمہ دیکھے محض مترجم صاحب سے حسن ظن کی بنیاد پر لکھ دیا ہے۔ اس ترجمہ کی یہ حالت ہے کہ کوئی صفحہ تعقید لفظی، یا دو چار قواعد اور محاورہ کی غلطیوں سے خالی نہیں ہے ہم نمونتہً چند غلطیاں لکھتے ہیں اسی سے کل کتاب کا اندازہ ہو سکتا ہے

ع "قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

"طرفین نکل کر میدان میں" طرفین سے تو نکلا کرتے ہیں لیکن خود طرفین کا نکلنا مترجم صاحب کی ایجاد ہے۔

"آپس میں جدی تھے" حرف جدی کوئی نہیں بولتا یک جدی چاہیے!

"چکر اور چک پھیریاں .... لگانے پڑتے ہیں۔

چک پھیریاں مونث ہے۔

"بڑی اونچان پر سے" اونچائی تو سنا تھا اونچان نہ معلوم کیا بلا ہے۔

"سرارادت رگڑتے" سرارادت رگڑنا کہاں کا محاورہ ہے۔

"خارج آئے" خارج ہونا محاورہ ہے۔

"عادی آجانا" یہ بھی بالکل غلط ہے عادی ہونا یا عادی ہو جانا بولتے ہیں۔

"گربائی باقی رہی" گربائی جہلا کی زبان ہے۔

"دماغ لڑائے" دماغ کوئی نہیں لڑایا کرتا عقل لڑائی جاتی ہے۔

"لوگوں کو گھٹنے چھپے دیا گھوڑے تو گھٹنے دوڑ اُٹھاتے ہیں"

لیکن مترجم صاحب نے دوگون کو گمٹ چھوڑ دیا۔

"لگے بندھے سے نہ پیسہ زیادہ اٹھے نہ کم" مترجم صاحب کو محاورات کے استعمال کا بہت شوق ہے لیکن موقع و محل نہیں جانتے اُن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ لگے بندھے کن کو کہتے ہیں اور پیسے لگے بندھے نہیں ہوا کرتے۔

"خلاف تقدیس سمجھا" خلاف تقدس چاہیے۔ عربی الفاظ استعمال کرنے کے لیے تھوڑی سی عربی دانی کی ضرورت ہے۔

"تدبیت کرتا تھا" یہ محاورہ بھی مترجم صاحب کی ایجاد ہے کوئی عربی خواں اس ایجاد کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

"بات ور بڑی" بات در رہی محاورہ ہے۔

"معاملات ہاتھ تلے آگئے" معاملات ہاتھ تلے آنا لغو ہے معاملات کی باگ ہاتھ میں آگئی لکھتے ہیں۔

"بالوں بال بچ گئے" محاورہ تو بال بال بچنا ہے بالوں بال مترجم صاحب کی ایجاد ہے۔

"جب انھیں فی الواقعی بھی علم ہو گیا" اول تو فی الواقعی خود لغو ہے۔ صرف کم سوادی بول سکتے ہیں۔ اور اگر یہاں فی الواقع ہی ہوتا اور ی کا دم چھلا اضافہ نہ کیا جاتا تو بھی اس لفظ کے اس موقع پر استعمال کے لیے عربی دانی کی ضرورت نہ تھی صرف اُردو دانی کافی تھی۔ جب اُن کو اصل واقعہ کی اطلاع ہوئی یا حقیقت واقعہ کا علم ہوا یا اصل حقیقت یا حقیقت واقعی معلوم ہوئی وغیرہ وغیرہ لکھنا چاہیے تھا۔

"بالکلیۃ" یہ بھی ایک ایسی ہی غلطی ہے جیسی فی الواقعی کسی پڑھے لکھے کا کام نہیں کہ وہ کلیۃ کے ساتھ با لگا کر شتر گربہ کرے۔

"دماغوں سے رجوع لانے" رجوع لانا بھی کیا خوب! رجوع کیا جاتا ہے۔

"اس کو گھسنا نہیں ملتا" واہ وا! کیا فصیح اور کیا صحیح زبان ہے!

پھر فرمایئے کہ اس کو گھسنا نہیں ملتا۔

"بند توہمات سے رہائی دلائی" یہ بند اور کھٹکے توہمات کیا باتھے جن سے رہائی دلائی۔

"خواہش اُپچتی ہے" یہ بالکل نیا محاورہ ہے ٹکسال باہر بولا جاتا ہوگا اہل زبان نہیں بول سکتے۔ ہم سمجھے بھی نہیں کہ خواہش اُپچنے کا کیا مطلب ہے۔

"اطلاق نہ پاتا تھا" مترجم صاحب صحیح اُردو لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسی ہی دُر فشانی فرماتے ہیں۔ اطلاق پانا کوئی محاورہ نہیں اطلاق ہونا اور کرنا ہے۔

"بزور زبردستی غلبہ پایا" ایک اُردو اور ایک فارسی لفظ میں واو عطف سے کیا خوب رشتہ جوڑا ہے۔

فارقلیس کے تفویض کر دیے" اس جملے میں کے کیا خوبصورت معلوم ہوتا ہے بیچارے کو نے کیا تصور کیا تھا جو اُس کی جگہ چھین لی گئی اور صحیح اُردو کا خون کیا گیا۔

"اس معاملے میں بڑے ربط و ضبط سے کام لیا اور کسی قسم کی ...... شکایت نہیں کی" اس جملے میں ضبط کے ساتھ ربط کی ضرورت نہ تھی۔

"بطوع خاطر تمام قیدی اُس کے حوالے کر دیے گئے" مترجم صاحب جب لغت میں طوع کے معنی دیکھیں گے یا کسی سے دریافت فرمائیں گے تو اُن کو سخت شرمندگی ہوگی کہ بطیب خاطر میں تصرف کر کے بطوع خاطر کیوں لکھا۔

"دشمنا نگیوں" اس کی کیا ضرورت تھی کہ دشمنوں کو ترک کر کے جاہل عورتوں کی تقلید کی گئی۔

"اور ان کی نوآبادیاں ...... ساحلوں پر پڑی ہوئی تھیں" نوآبادیاں پڑی ہونے کا کیا مطلب ہے؟

"تو تابوں کا ویسا ہی چھتہ بن جانا" مترجم صاحب نے شاید

یونانیون کو شہد کی مکھیان سمجھ لیا جو اُن کے لیے چھتہ بنانے کی ضرورت پڑی۔

"سینچے اپنے دار سے"۔ دار کیا بلا ہی؟ اپنی اپنی باری چاہیئے۔

"شخصی فتوی زدہ" ستمزدہ، مصیبت زدہ وغیرہ وغیرہ الفاظ کہے اور بولے جاتے ہین لیکن فتویٰ زدہ ایجاد بندہ ہی!

"توازن انھین دونون ہاتھون مین تلا رہ سکتا تھا۔ توازن تُلا نہین کرتا قائم رہا کرتا ہی۔

"شاہنشاہیت"۔ مترجم صاحب بتلائین کہ یہ لفظ عربی ہی یا فارسی۔

"اسی وقت سے اُس کا ڈھال شروع ہوتا ہی"۔ مترجم صاحب کو خیال ہی نہ رہا یہ معلوم نہ ہوگا کہ اس موقع پر محاورہ مین "ڈ" دال آتا ہی

"ہر ریاست پر حسب حیثیت سے چندہ ڈالا گیا"۔ چندہ ڈالنا کہان کا محاورہ ہی۔

"جدید تحقیقاتون نے"۔ تحقیقات خود جمع ہی۔

"اُنھی کا پلّہ غالب رہا"۔ پلّہ بھاری رہا چاہیئے۔

"غالون نے متحد ہوکر لڑائی چھیڑی" "ہمین اخیر تک فتح روپیون کے ہی پہلو پر رہی"۔ لڑائی چھیڑی بھی غلط اور فتح پہلو پر رہی بھی مہمل اور کے ہی کیا؟ ہی کے چاہیے۔

"تمام جزیرہ اُن کے ماتحت آگیا"۔ اُن کے تحت مین آگیا یا ماتحت ہوگیا لکھنا چاہیئے تھا۔

"قدرتی حسن وجمال کو اس کی جلادت وصولت دُگنا رہی تھی"۔ جلادت نہ معلوم کیا بلا ہی؟ اور دگنا رہی تھی کیا چیز ہی۔

"ہما بال ..... سیلاب کی طرح ..... اُترا" سیلاب اُترا نہین کرتا۔

"طرح طرح کے شبہے اور اتہام اُٹھانے لگے"۔ شبہے کرنا اور اتہام لگانا محاورہ ہی۔

"مستقل سکونت بنا کر"۔ سکونت بنانا مہمل ہی۔

"فائدہ مند بحث ومباحث مین"۔ محاورہ بحث ومباحثہ ہی۔

"محسن میزبانون پر حکومت چلانے کا حق طلب کرین" حکومت چلانے کی بھی ایک ہی کہی۔

"اور جن عورتون کے شوہر اُتر جاتے وہ اس عرصہ تک برابر بیوگی کا سوگ رکھتی تھی"۔ شوہر اُتر جانے کا کیا مطلب ہی۔

یہ ایسی غلطیان ہین جو کوئی اہل زبان گو وہ معمولی لکھا پڑھا ہی کیون نہو ہرگز نہین کر سکتا۔ اِن غلطیون کے علاوہ مترجم صاحب نے کہین کہین اپنی شان اجتہاد بھی دکھائی ہی۔ اور کچھ نئے الفاظ وضع فرمائے ہین جو اس سے پہلے نہ قدیم اُردو مین دیکھے گئے اور نہ جدید اُردو مین اور نہ شہری اُردو مین سُنے گئے نہ دہاتی اُردو مین۔ مثلاً ایک جگہ آپ جہاز تباہون تحریر فرماتے ہین۔ ایک جگہ چپڑسیان (یعنی چپڑے کی پتلی پتلی پٹیان) لکھا ہی اور ایک جگہ تقریبئے نیا لفظ ایجاد فرمایا ہے۔ ناظرین کو اگر ان جذبات آفرینون کے دیکھنے کا شوق ہو تو "مشاہیر یونان درومہ" ملاحظہ فرمائین یا سطور بالا پر ایک اور نظر ڈال لین اِن مین بہت کچھ جدید محاورے اور الفاظ مترجم صاحب کی قابلیت اجتہاد کی شہادت دین گے۔

ہم نے سرسری طور سے کتاب کی ورق گردانی کرکے غلطیون کے دریا مین سے چند قطرے نمونتاً پیش کیے ہین ورنہ اُردو مین آجتک کوئی کتاب ایسی شائع نہین ہوئی جسمین اسقدر طومار اغلاط موجود ہو جسقدر کہ اس کتاب مین ہی۔ یہ مع مقدمے کے ۵۰۰ صفحے کی کتاب ہی۔ کوئی صفحہ خالی نہین ہی جسمین ایک دو بلکہ اس سے بھی زیادہ غلطیون ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے اہتمام نہ کیا گیا ہو۔ انگریزی مین جسوقت اِس کتاب کا ترجمہ کیا گیا تھا اُس کو بہت کامیاب سمجھا گیا تھا۔ مترجم صاحب

اس کے مستحق ہین کہ ان کو ڈکسین کا خطاب دیا جائے

مترجم صاحب جسطرح نئے الفاظ وضع کرنے مین مشاق ہین اسیطرح آپ کو شاعری مین بھی ید طولیٰ حاصل ہو اور خان قادر الکلامی مین نہایت بلند پرواز ہین۔ انگریزی ترجمہ مین جسقدر نظمین اور اشعار تھے مترجم صاحب کی جدت آفرین طبیعت کو کب گوارا تھا کہ اُن کا ترجمہ نظم ہی مین نہ کیا جائے۔ اس مین بھی آپ کی طبع وقاد نے وہ وہ گل کھلائے ہین جن کو دیکھ کر دنیا کی ہر زبان کے بڑے بڑے شاعرون کی روحین وجد مین آ جائین گی۔ گو اُردو کا کوئی مبتدی ان نظمون کو دیکھ کر ضرور چکرا جائے گا۔ ناظرین کے تفنن طبع کے لیے نمونۃً چند شعر پیش کیے جاتے ہین ؎

کھٹنے نہ دے شراب جلد پیالون کو اے لوگون کے سردار
جب تک کہ تو ایتھنس کو آلیوے ایکبار

اس شعر کا دوسرا مصرعہ اور آلیوے ملاحظہ طلب ہے ؎

ہان نغمہ وتیرہ ہین ہم عنان   قدم زن ہر گلیون مین لفظان دان
بگان انا کے شورے ہین وان   جوانون کی زمین بے پناہ رحیبان
رقص وطرب جشن کا ہے سمان

نشان زدہ الفاظ ناظرین کی خاص توجہ کے مستحق ہین۔ اگر مترجم صاحب بطور خود اس کتاب کو چھپوا کر شائع کرتے تو ہم کو زیادہ اعتراض کا موقع نہ تھا۔ لیکن یہ کتاب انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس کے قواعد وضوابط کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ:۔

اصلاح زبان یعنی اُردو زبان مین جو خرابیان پیدا ہوتی جاتی ہین اُنھین رفع کرنا اور غیر مانوس اجنبی الفاظ ومحاورات جو غیر زبانون کے بلا ضرورت زبان مین داخل ہوتے جاتے ہین اُن سے بچانا اور صحیح وفصیح زبان کو رواج دینے کی کوشش کرنا،،

کیا یہی صحیح وفصیح زبان ہے جس کے رواج دینے کی انجمن کوشش کرتی ہے۔ اگر یہی ہے تو اُردو کی فاتحہ پڑھ لینا چاہیے۔ انجمن کا فرض ہے کہ جو کتاب اُس کی طرف سے شائع ہو اُس کی زبان قابل استناد ہو، اور اگر یہی لیل ونہار ہے تو ہم کو سخت افسوس ہے کہ انجمن اُردو کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچا رہی ہے اور کوئی وجہ سمجھ مین نہین آتی کہ اپنے ضوابط کی پہلی دفعہ کیون پامال کرتی ہے۔ اگر اس کتاب کے بقیہ حصے ترجمہ نہ ہوے ہون تو میری رائے مین کسی دوسرے کو دیدیے جائین، اور اگر بدقسمتی سے وہ بھی ترجمہ ہو گئے ہون تو چھپنے سے قبل اُن پر نظر ثانی کر لی جائے۔ ہم ایک دوستانہ صلاح یہ بھی دیتے ہین کہ آئندہ ترجمہ کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو مولانا شبلی مرحوم کے عہد مین تھا کہ جس کتاب کا ترجمہ منظور ہوتا تھا اُس کا اخبارات ورسائل مین پہلے اعلان کیا جاتا تھا، اور ترجمے کے نمونے طلب کیے جاتے تھے جس کا ترجمہ اچھا ہوتا اُس سے کل کتاب کا ترجمہ کرایا جاتا تھا۔ یہ طریقہ نہایت موزون اور مناسب تھا۔ اگر کسی خاص مصلحت سے اس طریقہ پر عمل کرنا پسند نہ کیا جائے تو برائے خدا ایسے شخص سے ترجمہ کرایا جائے جو صحیح وفصیح اُردو لکھ سکتا ہو، ایسے شخص کو کوئی کتاب ترجمہ کے لیے نہ دی جائے جو اُردو سے بالکل نابلد ہو، لیکن خود کو مجتہد سمجھتا ہو۔

قمر

قیود و تقلید، تجدید و تنقید

کیا یہ خیال صحیح ہے کہ قیود شاعری و تقلید فصحا فطری جذبات دلکش خیالات کے سدِ راہ ہیں؟ کیا ایشیائی مذاق تابع البلد ہو تو اسکے حدود کی چار دیواری بھی دلی کی عمارتوں اور لکھنؤ کے محلوں کی طرح ٹوٹی پھوٹی رہے؟ کیا ردیف و قوافی کا پابند قیود سے آزاد روش والے نومشقوں سے باوصف کہنہ مشقی اچھی نظمیں نہیں لکھ سکتا؟ کیا قافیوں کی دلچسپ نشست، ردیفوں کے خوش نما پہلو اپنے موقع و محل پر دلیل حسنِ سخن نہیں بن سکتے؟ کیا مثنوی سے بڑھ کر آزادی کسی اور صنفِ نظم میں ہے؟ پھر حسنِ سخن کا پیدا ہونا اس صنف میں بھی کیوں مشکل ہے؟ کیا سبب ہے کہ گلزار نسیم و میر حسن کے سوا اور مثنویاں شہرت و قبولیت سے ممتاز نہ ہو سکیں؟ میر انیس چند مخصوص بحروں میں مرثیہ گوئی کرتے رہے اور مسدس کے دائرے سے نہ نکل سکے مگر فردوسی سے پہلوانِ سخن اور وطن سے مرد میدان کا مقابلہ کس نے کیا؟

تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیے

نئی شاعری کے نیچرل شاعر خواجہ حالی کا مسدس سب نظموں سے زیادہ کیوں مشہور و مقبول ہے؟ کیا وہی مسلسل مضامین بلاقید مسدس مختلف بحروں اور متعدد زمینوں میں ہوتے تو انکا پایۂ سخن اپنی جگہ پر اتنا بلند رہتا؟

غزل کے مضامین سرے سے نئے نہیں ہوتے وہی گل و بلبل وہی شمع و پروانہ، وہی ناز و انداز معشوقانہ، وہی سوز و گداز عاشقانہ مگر ردیفوں کے چسپاں، قافیوں کے دست و گریباں ہونے ہی سے ان میں تازگی آجاتی ہے۔

متروکات یعنی الفاظ واجب الترک و مستحسن الترک کی قیود زبان کی فصاحت قائم رکھنے کے لیے ہیں۔ جو الفاظ زبانوں پر گراں گزرتے ہیں اور فصحا کے روزمرہ سے خارج ہو گئے ہیں ہمیں انھیں اپنے اشعار میں داخل کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟ جتنے الفاظ و محاوراتِ قدیمہ متروک فصحا ہو کر زبانوں پر بار اور فصاحت کے لیے ناگوار ہو گئے ہیں ہمیں ان کے اختیار کا کیا اختیار ہے؟ متروک زبان کی تقلید سے کیا ہم مقلد کے بدلے مجدد کہے جا سکتے ہیں؟

اگلے زمانے میں قیود شاعری سے بڑی قید یہ تھی کہ عربی فارسی کی کافی استعداد، عروض و قوافی، معانی و بیان، لغات و محاورات کے بغیر معلومات کوئی قلم اٹھاتا ہی نہ تھا اب یہ قید متروک مرفوع القلم ہو گئی ہے۔ کیا ایسی آزادی قابلِ تحسین ہے؟ کیا ایسی کم سوادی و کم مائگی معراجِ کمال پر پہنچا سکتی ہے؟ کیا الفاظ کے خزانے پاس نہ ہوں تو قافیے مل سکتے ہیں؟ اور مل بھی جائیں تو فنِ قوافی سے ناآشنا رہ کر کیا اپنے محل پر مستعمل ہو سکتے ہیں؟ کیا بغیر علم معانی و بیان اچھے استعارات، پاکیزہ تشبیہات کی خوبیاں ذہن نشیں ہو سکتی ہیں؟ کیا زبان و محاورات سے نابلد رہ کر قدم قدم پر لغزشوں سے سنبھلنے کا کوئی سہارا مل سکتا ہے؟

اردو کا کوئی جامع و بسیط لغت موجود نہیں ہے جو تحقیق و تلاش سے مستغنی کر کے رہنما کا کام دے۔ قید شاگردی کو ننگ و عار سمجھنے والے یہ سمجھ لیں کہ اہل زبان کی اصلاح و تربیت سے مستفید ہوئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

شاعری سے زیادہ تمام علوم و فنون کا جامع کوئی فن نہیں ہے، موسیقی کی نے اسکے ترانوں میں، مصوری کا مرقع بھی اسکے نگار خانوں میں، سحر سامری اسکی تاثیرات، اعجاز عیسوی اسکا قائل کرامات ہے۔ تیزی و شمشیر سے زیادہ شاعری کی نوکِ قلم، تیغ دو دم سے بڑھ کر اسکا مصرع تیز دم ہوتا ہے۔ ایسے فن سے زیادہ کس فن کے لیے استعداد و علم کی ضرورت اور استاد شفیق کی حاجت ہو سکتی ہے۔ آج ہی دیکھ لیجیے پروفیسر اقبال، لسان العصر اکبر، مولنا شوق قدوائی، نظم طباطبائی یا اور چند بزرگ جنھیں انکی ہم نوائی کا فخر حاصل ہے سب کی شہرت و قبولیت کا راز قابلیت میں مضمر ہے۔ جلیل القدر جلیل ہوں یا حضرت ریاض کوئی بھی بغیر استفاضہ و استفادہ معراج کمال پر نہیں پہنچا ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مروجہ قیود شاعری سے آزاد، قید

تحصیل علم و فن سے آزاد، قید شاگردی سے آزاد ہو کر کوئی آزاد خیال کس طرح شاعر نازک خیال و سخنور بے مثال ہو سکتا ہے؟

حضرت قبلہ امیر مینائی کو داغ دہلوی پر ترجیح دینے والے، حضرت داغ کو امیر مینائی سے بڑھانے والے دونوں بالاتفاق ہم زبان ہیں کہ یہ آفتاب و ماہتاب شاعری میں اپنا مثل نہیں چھوڑ گئے۔ فی زمانہ شعرا کے معدودے چند افراد بھی جو اپنی جامعیت و قابلیت میں فرد ہیں اگر اپنا مثل نہیں چھوڑ گئے تو قیود شاعری کیا معنی شاعری ہی سے اُردو زبان آزاد ہو جائے گی۔ ہم افسوس کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ تحقیق فن، جامعیتِ سخن، فراہمی سرمایہ لغات و محاورات، مشق شاعری کے بدلے صرف دو ماوے زور وں پر ہیں۔ ایک تجدید، دوسرے تنقید۔

تجدید والوں کا نعرہ ہے کہ اگلوں کی تقلید چھوڑ دو پرانی لکیر کے فقیر نہ بنو۔ شعر و سخن کو صرف معنی ہی نہیں بلکہ صورت کے اعتبار سے بھی بدل دو کسی کے نقش قدم پر نہ چلو اپنی راہ الگ نکالو۔ سب قیدیں توڑ کر آزاد ہو جاؤ، وہ کر دکھاؤ کہ اگلوں سے اُسکا عشر عشیر نہ ہو سکا ہو۔ مگر ؎ کہنا آسان کر دکھانا مشکل۔ بے تقلید میں کامیاب ہوئے تجدید میں کامل کوئی نہ ہُوا، یورپ والے مسلمانوں کے علوم و فنون کے پہلے پکے مقلد بن گئے پھر مجدد ہوئے۔

تنقید والوں کا شور ہے کہ کھوٹے سے کھرے کو الگ کر دکھاؤ، نکتہ چینی و خردہ گیری میں کسی کے حفظ مراتب کا خیال بھی ذہن میں نہ لاؤ۔ ہزار ہنر میں ایک عیب بھی کسی کا ڈھونڈھ کر ضرور نکالو، تہذیب کے پردے میں پردہ دری ڈھب پڑے تو وہ چادر آوڑھے رکھو۔ تنقید اتنا بڑا ہنر ہے جسکا ہر عیب ہنر میں داخل ہے، اب زمانہ دوسرا ہے دور ہی اور ہے۔ آزادی چھوٹے سے چھوٹے کو بڑے سے بڑے کی عیب جوئی پر آمادہ کر دیتی ہے۔ جہاں کسی کی تنقیص کا خیال آیا تنقیدی عنوان قائم ہوا اور قلم و زبان نے ایک ہی حرف کے پھیر میں حرف گیری کا حق ادا کر دیا۔ کاش تنقیدی آزادی کے پاؤں میں بھی ہلکی ہلکی بیڑیاں ڈال دی جاتیں کہ چل تو سکتی مگر حد سے باہر نہ نکل سکتی۔ تنقید معیار سخن بنکر کھوٹا کھرا پرکھتی ہے اُسکا بھی کوئی معیار ہونا چاہیے۔

قیود شاعری کی طرح تنقیدی اصول و ضوابط بھی منضبط ہو جاتے تو خوب ہوتا۔

میرے ایک معزز ہموطن اپنے عنایت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "پورب والوں نے خواہ مخواہ پچھم والوں کی تقلید کا پٹا گلے میں ڈال لیا ہے۔ اجتہاد کے درجہ پر اُنکا پہنچنا مشکل ہے۔ تقلید کا پٹا گلے میں موتیوں کے ہار سے قیمتی ہوتا اگر پچھم والوں کی ہمزبانی و ہمنوائی کا فخر حاصل ہو جاتا۔ پورب کے درجہ اجتہاد پر پہنچنے والا خواب فراموش ایک مطلع یاد دلاتا ہے: ؎

دعوے زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اتنی ہمت ایسی سعی و محنت والے سو میں ایک دو بھی نظر نہیں آتے جو پورب میں رہ کر باکمال شاعر یا زباندان ہونے کا خاص امتیاز حاصل کر لیں ۔۔ زمانہ گیا جب ہندیوں نے زبان فارسی میں اتنی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ تیغ اصفہاں بھی اُنکا لوہا مان گئی تھی۔ پورب میں بھی جب اُردو کے خسرو و فیضی پیدا ہوں تو پچھم والوں کے مقابلے میں شاید دعوائے اجتہاد کا موقع ملے اور یوں کہنے کو تو ایک قصیدے کی مضمون تعلی میں حسب دستور شاعرانہ راقم سطور نے بھی لاف و گزاف کا حق ادا کیا ہے ؎

وہ عرفی ہوں کہیں سب فیضی ہندوستاں جسکو
وہ خاقانی ہوں سب جسکو کہیں اُردو کا قاآنی

یہ چند سطروں کا معمولی مضمون ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے مگر یہ بھی سن لیجیے کہ لکھا کیوں گیا۔ ایک مہربان نے مجھ سے حسب ذیل سوالات کیے

(۱) اردو شاعری ردائف و قوافی، متروکات، تقلید اہل زبان، شاگردی وغیرہ اتنے قیود سے کیوں محدود ہو گئی کہ حسن سخن کی راہ، وسعت بیان کے راستے سب مسدود ہو گئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

(۲) کیا جسکا زادبوم پورب ہو وہ باوصف کہنہ مشقی، ماہر فن اور کامل فن ہونے کے اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اُس سے استفادہ جائز ہو؟ آپ سے

میرے ایک دوست نے اصلاح چاہی تو پوربی ہونے کا عذر کیوں کیا گیا کیا آپ شاعر نہیں ہیں؟

(۳) میر و مصحفی یا امیر و داغ کا ہم پایہ کوئی شاعر اب موجود ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو پھر مستند قابلِ اتباع کس کا کلام ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں تحریر مذکورۂ بالا کافی ہے۔ دوسرے تیسرے سوال کا جواب مجھ سے نثر میں نہیں بن پڑتا اس لیے ایک قطعہ درج ذیل ہے جو کسی ایسے ہی موقع پر لکھا گیا تھا:-

قطعہ

لکھتے ہیں مجھکو خط میں مرے ایک مہرباں کیا آپ نکتہ سنج نہیں نکتہ داں نہیں؟
کیا آشنا مذاقِ سخن سے نہیں زباں کیا آپ ذوقِ نظم سے رطب اللساں نہیں؟
مینائے میر و غالبِ مے کش کے جام کی دو گھونٹ بھی نصیبِ ارغواں نہیں؟
چلتا نہیں ہے بزم میں کیا دورِ مصحفی کیا اب وہ سلسلہ نہیں یا خاندان نہیں؟
کوئی تو ہوگا بلبلِ خوش لہجۂ سخن مانا کہ داغ بلبلِ ہندوستاں نہیں
زندہ کرے امیر خدائے سخن کا نام ایسا اب ایک شاعرِ جادو بیاں نہیں
میں نے کہا جگہ ہے یہ عجز و نیاز کی بندہ نواز! ناز کا موقع یہاں نہیں
کہتے ہیں شعر کس کو سخن کس کا نام ہے یہ امتیاز بھی مجھے اے مہرباں نہیں
جوہر شناس جسکو جواہر سے تولیں اب وہ متاعِ نظم کا پلہ گراں نہیں
ہیں وہ خم و قدح، نہ وہ پیمانہ و سبو وہ پیرِ مے فروش کی اونچی دکاں نہیں
اُسپر یہ لطف ہے کہ سخنور ہیں سیکڑوں ایسا بھی کوئی شہر ہے شاعر جہاں نہیں
خالی نہیں ہیں نقص سے پورب کے باکمال دامن پہ ہو یہ داغ کہ اہلِ زباں نہیں
پنجاب کے شاعروں کی تو کیا بات ہو مگر سب اک طرح کے فاضل و کامل یہاں نہیں
المختصر جو ماہرِ فن ہو کہیں کا ہو کچھ اُسکے اتباعِ سخن میں زیاں نہیں
کالج کی ڈگریوں پہ کیے ناز کیا شفق
شاعر کے پاس جب سندِ امتحاں نہیں

شفق عمادپوری

(تنقید کُتب)

۱۔ عالم خیال
۲۔ مسدس توحید
۳۔ جذبات محب

مولوی محب حسین صاحب حیدرآبادی اُن شایستہ اہل قلم مین سے ہین جنکی ذات ستودہ اہل ملک کو مختلف عنوان سے معتد بہ فائدہ پہنچ چکا ہے آپ ایک عرصہ تک معلم شفیق کے ایڈیٹر رہے اور اُسکے ذریعہ سے ملک مین اپنی عالمانہ قابلیتون کا سکہ بٹھایا پھر اسی رسالہ کو آپنے "معلم نسوان" کا نام دیکر مستورات کی ضروریات تکمیل پر توجہ کی اور ایک مدت مدید تک ہندوستان کی صنف نازک کی حالت درست کرنے کی سعی مین مصروف رہے۔ غالباً آپ مسلمانون مین پہلے شخص تھے جنھون نے تعلیم نسوان کی ضرورت جتانے کے ساتھ ہی پردہ نسوان کی پُرزور مخالفت کی۔ اس خیال کے صحیح یا غیر صحیح ہونے پر رد و قدح فضول ہے لیکن مولوی محب حسین صاحب نے جس استقلال اور جراءت سے اپنے اس خیال کی اشاعت کی اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ خاص حیدرآباد کیا معنی ہندوستان کے دوسرے انطاع مین بھی لوگونکی توجہ اس مسئلہ کیطرف متوجہ ہوگئی۔

"معلم نسوان" مولوی صاحب کا ذاتی پرچہ تھا اور سالہا سال تک اُنھون نے اُس کی میدیری کی ذمہ دارانہ خدمات نہایت قابلیت سے ادا کین۔ "معلم نسوان" کے بعد "علم و عمل" روزانہ کی ایڈیٹری کا قلمدان بھی آپ ہی کو تفویض ہوا تھا لیکن اس اخبار نے زندگی بہت تھوڑی پائی اور اُسکے قبل از وقت خاتمہ نے غالباً مولوی محب حسین صاحب کی علمی ساعی کا جو مستقل سلسلہ تھا اُسکو شکست کر دیا تاہم مولوی صاحب کے کارنامے ایسے نہین ہین جو اُنکے نام کو بقائے دوام سے محروم رکھین علاوہ نظم کے آپ کے نثر مضامین کا مجموعہ اگر مرتب کیا جائے تو کئی ضخیم کتابون کے برابر ہوگا۔ عالم خیال بظاہر آپ کے محققانہ و مدلل مضامین کا ایک نمونہ کہا جاسکتا ہے جو مختصر ہونے کے باوجود دلچسپی کا بہت کچھ سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس رسالہ مین خیال کی قوت اعمال کے نتائج دلایل و براہین کے ساتھ اسی طرح بتائے گئے ہین کہ عالمانہ طرز استدلال کے ساتھ صوفیانہ مذاق کی جھلک بھی موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کو آخر آخر اس رنگ کا پیرو بننا پڑا ہے کیونکہ دور آخر کی آپ کی تصانیف عموماً اسی رنگ مین رنگی ہوئی ہین مثلاً وصال حق اور مسدس توحید وغیرہ۔ موخر الذکر نظم مصنف نے اپنے "پیر و مرشد قبلۂ سالکین و کعبۂ عارفین شاہ محمد صاحب صدیقی دام ظلہم و فیوضہم" کی تعمیل ارشاد مین لکھکر کتابی صورت مین شائع کی ہے۔ مولوی محب حسین صاحب ایک پختہ کار شاعر ہین۔ اور دقیق اور روکھے مسایل علمی کو جامۂ نظم پہنانے مین انہین فطرتی لگاؤ پایا جاتا ہے۔

مسدس توحید اس بات کا شاہد ہے کہ اس مین مسئلہ توحید کی باریکیان اور وحدت الوجود کے نازک رموز نہایت دلپسند عام فہم طریق پر بیان کئے گئے ہین۔ آغاز نظم سے پہلے چند رباعیان اسی مضمون کے متعلق ہین اور پھر اصل مسدس شروع ہوتا ہے جس کے مندرجہ ذیل دو ایک بند سے پوری نظم کی حقیقت کا اندازہ بر رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

نغمئہ یہ تماشے مین اُسکی قدرت کے ۔۔۔ یہ عکس آئینے مین ہین اسی کی صورت کے
گلون مین ہمکتے ہین پر تو اسی کی نگت کے ۔۔۔ یہ ولولے ہین بلبلون مین اُسی کی اُلفت کے
اُسی کے حُسن سے معمور سارا عالم ہے
اُسی کی مدح سرائی جہان مین پیہم ہے

ذرا تو غور کرو اس باغ پر کبھی نادان ۔۔۔ کہ کون شاخ مین پتون مین گل مین ہے پنہان
یہ کس کا رنگ ہے جس سے ہین بلبلین بیجان ۔۔۔ یہ کس کا حُسن ہے جو ہر درخت سے ہے عیان
ظہور کس کا ہے ہر آن باغ و صحرا مین
وہ ایک ہی تو ہے مشہود چشم بینا مین

بنوز یح کو دیکھ اور یہ سمجھ کہ ہو گیا ۔۔۔ ہر جاندار کہ مردہ ہو یہ ذرہ سا

نہین ہے جان تو کیسے ہوا شجر پیدا   یہ بیج ہی تو ہو خود بڑھ کے اصل او تنا

عیان جو بیج تھا اُسمین درخت پنہان تھا

ہوا درخت جو ظاہر تو بیج ہی جان تھا

اسی طرح سے یہ عالم خدا کے اندر تھا   وجود نور شہود و علم سب مقدر تھا

ہوئی تجلی ثانی تو فرق اظہر تھا   حباب موج سے پھر تو جدا سمندر تھا

حباب و موج و سمندر جدا جدا گر ہین

مگر یہ ذات مین اپنی تو سب برابر ہین

اس کے بعد ایک مولوی صاحب سے مکالمہ شروع ہو جاتا ہی اور اُسکے درمیان اس مسئلہ کے متعلق جو غلط فہمیان جہالت اور تنگ خیالی سے پیدا ہو گئی ہین ظاہر کی گئی ہین اور اُسے اپنی اصلی شان مین دکھایا گیا ہی۔ مسئلہ توحید ایک نازک مسئلہ ہی اور اسکی باریکیون کو مولوی محب حسین صاحب نے عمدگی سے ذہن نشین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہی اور جس بزرگی اور بلند آہنگی سے انھون نے ان باریکیون کو نظم مین سمجھایا ہی اُس سے ان کی قدرتِ شعر گوئی کا پتہ چلتا ہی تاہم مثنوی "توحید" مولوی صاحب کے طرز سخن اور انداز بیان کا ایک سرسری خاکہ ہی اور جو لوگ آپ کے کلام کو اُس کی اصلی شان مین دیکھنا چاہتے ہون انھین جذبات محب کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مولوی صاحب کے ہر قسم کے کلام کا مجموعہ ہی اس کی ترتیب و اشاعت کے لیے افضل النسا خانم صاحبہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھون نے کاوش و محنت سے مولوی صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ ادھر اُدھر سے جمع کر کے ملک کے سامنے اسکو ایک مستقل اور مدون صورت مین پیش کیا ہی۔ "جذبات محب" جسے "کلیات محب" کہنا زیادہ موزون ہوگا تمام اصناف سخن کے بیش قیمت نمونون سے مالا مال ہی غزلیات، قصاید، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعیات، قطعات، سہرے، تہنیتی و تعزیتی نظمین، غرض شکل سے کوئی چیز مصنف کی طبع آزمائی سے بچی ہی اور ہر ایک مین مصنف کا طبعی رنگ صاف طور پر نمایان ہی آپ کا مذاقِ سخن ہندوستان کی عام مروجہ شاعری سے جداگانہ ہی اور اس باب مین آپ مولانا حالی مغفور کے مقلد معلوم ہوتے ہین۔ پھر بھی ان دونون حضرات کا کلام اپنی اپنی جگہ جداگانہ امتیاز رکھتا ہی اور مولوی محب حسین صاحب نے "نسوان" کے متعلق جو کچھ اور جس قدر اور جس انداز مین لکھا ہی وہ ان کی خاص چیز ہی۔ اسکے علاوہ ان کی غزلیات، قطعات اور دوسری چیزین قومی، ملکی، تمدنی، معاشرتی، اخلاقی، تاریخی نکات سے مملو ہین۔ جو رائے زنی انھون نے کسی بحث خاص پر کی ہی ممکن ہی کہ جمہور اس سے متفق نہون لیکن اسمین کسی کو شک کی گنجائش نہین ہوسکتی کہ انھون نے جو کچھ کہا ہی نیک نیتی سے کہا ہی، متانت و تہذیب کا پہلو کہین نظر انداز نہین ہوا، ایک پُر اثر انداز مین کہا گیا ہی تنگ خیالی، ہٹ دھرمی، ضد، کاوش کا اُسمین شائبہ تک نہین ہی۔ اس کے باوجود حیدرآباد مین مولوی صاحب کو جن جن مخالفتون اور مشکلون کا سامنا کرنا پڑا ہی اس کا حال کچھ وہی جانتے ہونگے اور اسکی ادنےٰ مثال یہ ہے کہ اپنا رسالہ "معلم نسوان" آخر انھین مجبور ہو کر بند کر دینا پڑا۔

جہان تک معلوم ہوا ہی مولوی محب حسین صاحب شاعری مین کسیکے شاگرد نہین ہین بلکہ یہ سب کچھ ان کی خداداد قابلیت و فطری جودت کا نتیجہ ہی۔ اس لحاظ سے وہ مبارکباد کے مستحق ہین کہ محض اپنی طبع رسا کے زور سے اُنھون نے فن سخنگوئی مین استادانہ مہارت بہم پہنچائی اور بلا امداد غیر اس کٹھن منزل کو طے کیا۔

اس جگہ مختصراً کچھ نمونے آپ کے کلام کے درج کیے جاتے ہین اُن سے ناظرین اُسکی عظمت و رفعت کا اندازہ کرسکین گے ؎

اُسی کے حسن کا جلوہ ہی چار سو کیا کیا   ہر ایک گل مین اُسی کے ہین رنگ و بو کیا کیا

رموز عاشق و معشوق کوئی کیا جانے   ہزار طرز سے ہوتی ہی گفتگو کیا کیا

کیا ہی جہل و تعصب نے اسقدر تو ذلیل   دکھائے دیکھیے آگے ہماری خو کیا کیا

مری زبان پر آیا جو نام پردہ نشین   تو آئی کان مین آواز قلقل کیا کیا

سنا ہی جب کرینگے وہ اپنے ہاتھ سے قتل   رگون مین دوڑتا پھرتا ہی خود لہو کیا کیا

تیسرے اور چوتھے شعرون مین مصنف کا اصلی رنگ نظر آرہا ہی اور اسکی جھلک اُن کے کلام مین بیشتر پائی جاتی ہی مثلاً یہ چند اشعار دیکھیے :-

عمر بھر حرص و ہوس ہی مین گیا خوار و ذلیل   ہمسے نادان یہ نہ سمجھے کبھی سنبھالے نہ گئے
چاہیے یہ کہ چھٹے قوم سے ہر رسم فضول   رسم جو تھی کی اُٹھی اور یہ چالے نہ گئے
ہم نے چاہا تھا کرین پیش خیالات جدید   بیچ بھولون کے مگر سنگ پہ ڈالے گئے

یون تو بیفائدہ جیتے ہین ہزارون انسان   فائدہ جس سے ہو انسان کو وہ ہستی اچھی
گر نیشن کی ترقی ہو تو ہم باز آئے   اس بلندی سے ہماری ہی یہ پستی اچھی

رفاہ عام کا ہو کام دل کا مدعا نکلے   زبان خلق سے برسون صدائے مرحبا نکلے
یہ تسبیح و مصلے چھوڑ دے وہ کام کر جس سے   دل مخلوق سے صدیون ترے حق مین دعا نکلے
جنون پردہ نسوان نہین جاتا دماغون سے   الٰہی اس مرض کی بھی کوئی اچھی دوا نکلے
حجاب ظاہری سے کیا نگاہین پاک ہوتی ہین   دلون مین شرم پیدا ہو تو مصنوعی حیا نکلے
نہ چھوڑا عمر بھر قید جفا سے بدگمان تو نے   ہوئی تفتیش جب قیدی ترے بے خطا نکلے

پڑھنے کا شوق تون کے تو چرچا ابھی سے ہی   جو ہونے والا ہی وہ ہویدا ابھی سے ہی
بچپن مین لڑکیون کے تو ہین کھیلنے کے دن   پردے مین بیٹھنے کا تقاضا ابھی سے ہی
لائے کو لب پہ ہم ہین جو پردے کی سختیان   مجلس مین کچھ فساد سا برپا ابھی سے ہی

غرض اسی طرح کہین خیالات کی درستی اور رجال کی تعلیم دی گئی ہی کہین کسی ملکی، معاشرتی، یا تمدنی ضرورت کا اظہار کیا گیا ہی کہین کام کرنے کی ترغیب ہی کہین قومی خدمات کی تشویش، کہین علم کی خوبیان، کہین جہالت کی برائیان بیان کی گئی ہین، اور کہین تہذیب جدید کے روشن و تاریک پہلو دکھلانے کی کوشش ہوئی ہی :- مثلاً

جبریہ تعلیم کا قانون نافذ ہو تو کچھ   ہو ازالہ جہل کے اس خوفناک آزار کا
نیصدی جو ان سے نوے بڑھ کے جاہل ہون جہان   کیا اثر اس ملک ناخواندہ پہ ہو دو چار کا

جو دولت چاہتے ہین وہ علوم مغربی سیکھین   تجارت تخت صنعت تاج زیب ہی سلیمان کا

حیف ہے جو مرد جاہل سے ملا   وہ ہوا کامل جو کامل سے ملا

جانین گنوائین مفت کئے خانمان تباہ   اے ناسمجھ یہ دیکھ کہ شہرت نے کیا کیا

گھوڑ دوڑ مین کلب مین علانیہ ہی جوا   تہذیب کا مدار ہی اب تو قمار پر

رسالت چاہتا ہی گر تو کر مخلوق کی خدمت   پیمبر جان دیتے تھے اسی اشرف عبادت پر
خوشی اس زندگی کی کاہلون کو مل نہین سکتی   کہ راحت آدمی کی منحصر ہی شغل محنت پر
محب قوم کو تحسین و نفرین کی نہین پروا   نہ فخر و ناز عزت پر نہ کوئی رنج ذلت پر
غلامی جس سے دائم ہو نا اہلی اور مجبوری   کھو دین کیا اگر کیا یہ ظلم ہی انکی عورت پر
زنا و فحش سے بستیان کیونکر نہون ویران   کہ قائم ہی تمدن گھر پہ گھر قائم ہی عفت پر
انھین چار ستونون پر ہی قائم ملک کی دولت   حکومت پر صناعت پر زراعت پر تجارت پر
مدارس مین فلاحت کی نہین تعلیم حیرت ہی   کہ اہل ہند کی ہی منحصر روزی زراعت پر
گذارے عمر بھر مجرم خطا یہ قید خانے مین   کوئی اس سے بھی بڑھ کر ظلم ہوگا آدمیت پر

"کلام محب" مین تصوف کا بھی خاص حصہ ہی۔ مندرجہ ذیل اشعار نمونۃً درج ہین :—

ہی اصلی مہر چھپائے دل حزین مین چھپا   ہم اپنے آپ سے کرتے ہین یہ ضیا حاصل
خودی کو چھوڑ کر پردہ یہی تو حائل ہی   خودی اٹھی کہ ہوا خود بخود خدا حاصل
جما ہی وہم کہ غیر خدا ابھی ہے موجود   جو یہ خیال فنا ہو تو ہو بقا حاصل

"جذبات محب" کی تصویر عاشقانہ مضامین کی رنگینیون سے مستغنی نہین ہی لیکن انہین بھی تہذیب و متانت کا رنگ و روغن دیکر جلا کی گئی ہی اور فحش کلام سے

بعض قابل گرفت الفاظ یا مضامین مل سکین گے۔

قصاید مین اُس تعلی اور غلو سے کام نہین لیا گیا جو ایشیائی شاعری کو بدنام کرنے والی ہو بلکہ جہان ممدوح کی مدح کی گئی ہو وہان بھی تعریف کرنے کی کوشش کی گئی ہو جو۔

دندان تو جملہ در دہانند ۔۔۔ چشمان تو زیر ابروانند

کی طرح بے نمک نہین بلکہ معنوی لطافت اور ادبی خوبیون سے مالا مال ہو۔

دوسری نظمین بھی قابل تعریف و مستحق ستایش ہین "مُسَدّسِ نسوانی" مین عورتون کی موجودہ قابلِ اصلاح حالت اُن کی جہالت اور ان کی توہم پرستی کا نہایت سچا فوٹو کھینچا گیا ہو "رود موسی" کی طغیانی سے جو نقصاناتِ عظیم بلدہ حیدر آباد کو پہنچا اسکی کیفیت نہایت درد انگیز ہو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کے عدل و انصاف کے تاریخی وقایع غایت درجہ سبق آموز ہین رباعیات اور قطعات مین زیادہ تر اخلاقی نصایح قلمبند کی گئی ہین جنکا اقتباس اور انتخاب مدارس کے کورس مین شامل کیا جائے تو یقیناً نفع بخش ہوگا۔

الغرض مولوی محب حسین صاحب ایک شاعرِ باعمل ہین اور ان کی شاعری خیالی نہین، عملی شاعری ہو اور اس زمانہ مین ایسے ہی شاعرون اور اسی قسم کی شاعری کی ضرورت ہو۔

نکتہ چین نگاہین کلام محب مین بعض الفاظ و محاورات قابل گرفت پا سکتی ہین لیکن اول تو مولوی محب حسین صاحب شعرا کے اُس طبقہ سے تعلق نہین رکھتے جس پر یہ پابندیان عاید کی گئی ہین۔ دوسرے چار سے زاید صفحات کی ضخامت کے اندر اس قسم کی دو چار دس بیس فروگذاشتین کوئی چیز نہین۔

مندرجۂ عنوان تینون کتابین جناب مصنف سے فیل خانہ حیدرآباد دکن کے پتہ پر مل سکتی ہین۔ انکی قیمتین علی الترتیب ۱؍ ۲؍ اور عہ ہین۔

حیات النذیر

مولنا مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم کی ذات والاصفات عجیب اغریب خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ ہندوستان کے اُن تمام مشاہیر میں جنکی خدمات علمی و ادبی نمایاں اعزاز کا استحقاق رکھتی ہیں مرحوم کا درجہ نہایت بلند اور بہ غایت ارفع تھا۔ آپ کے قومی کارنامے اگر ایک طرف آپ کو ملک و قوم کا حقیقی بہی خواہ ثابت کرتے ہیں تو دوسری طرف آپ کی قلمی خدمات اور دماغی کارگزاریاں آپ کو ادب اُردو کا ایک بے لوث، بے غرض، اور بے لاگ سرپرست ظاہر کر رہی ہیں۔ اُردو لٹریچر کی آج سے دس بیس برس پہلے کیا بساط تھی۔ فسانۂ عجائب اور اسی قماش کی چند کتابیں ہمارے خزانۂ ادب کی گویا بیش بہا پونجی سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن دعا دینا چاہیے اُن بابرکت نفوس کو جنھوں نے اُردو کو اپنی مساعی جمیلہ سے اس قابل کیا کہ آج وہ بھی معاصر السنہ سے آنکھ ملانے کا دعوے رکھتی ہے اور بجا رکھتی ہے۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا شمار اُسی مقدس طبقہ میں ہوتا ہے جس کے افراد نے اُردو کو قعرِ ذلت سے نکال کر اوجِ رفعت پر چڑھانے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ اس بابرکت جماعت میں لحاظ اپنے کام کے وہ بہت سوں سے آگے ہیں لیکن پیچھے کسی سے نہیں۔ اُنھوں نے اُردو کی دستگیری اس حالت میں کی کہ اُسکی کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ نونہال اُردو کے پروان چڑھانے کی کوشش آج خواہ کسی صورت میں ہو رہی ہو اور اسکے اطمینان بخش نتائج آگے چلکر خواہ کچھ ہی کیوں نہ نکلیں لیکن اس نونہال کی پرورش جس زمانہ شناس اور علم دوست پارٹی نے ابتداءً کی اُسکا احسان کوئی بھول نہیں سکتا اور بلاشبہہ علمی حیثیت سے مولنا نذیر احمد کو اس پارٹی میں غیر معمولی نام و نمود حاصل تھی۔ ان تمام وجوہ سے اُردو زبان سب سے زیادہ بدقسمت اور اُردو کے موجود الوقت اہل قلم محسن کش سمجھے جانے کے مستحق تھے اگر مولنا کی سوانح عمری خود اسی زبان میں مدون نہ ہوتی جس کی فلاح و اصلاح کی دُھن میں اُنکی ساری زندگی نذر ہوئی تھی۔ یہ مسرت کا مقام ہے کہ مولوی سید افتخار عالم صاحب نے اُردو کو اس بدنصیبی سے اور اہل قلم طبقہ کو اس الزام سے "حیات النذیر" تالیف کرکے صاف بچا لیا ہے۔

حیات النذیر، جیسا کہ نام سے آشکارا ہے، مولنا نذیر احمد مرحوم کی مفصل، مدلل، اور مشرح لائف ہے جسکی تدوین کا امتیازی فخر سید افتخار عالم صاحب کو حاصل ہوا ہے۔ اسکا ملال ضرور ہے کہ باوجودیکہ اسکی ترتیب کا آغاز صاحب سوانح کے حینِ حیات ہو چکا تھا لیکن بعض موانع اُنکی زندگی میں اسکی اشاعت میں ہارج رہے۔ اور مولنا کے انتقال کے تقریباً بارہ مہینے بعد یہ شائع ہوئی ہے۔ اس تعویق کے لیے حضرت مولف خود متاسف و عذرخواہ ہیں اور اُن مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوے جو معمولی سی معمولی کتاب کی تیاری میں بھی بالعموم پیش آیا کرتی ہیں سید افتخار عالم صاحب پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا، جنھوں نے "حیات النذیر" ایسی ضخیم و مطول تالیف کی گراں قدر ذمہ واری اپنے سر لی تھی۔ قدر دانانِ علم و فن کو خوش ہونا چاہیے کہ اُن کے ضیافت اندوز ہونے کا سامان سید صاحب نے نہایت محنت و جانکاہی سے فراہم کیا ہے اور سید صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے اپنی غیر معمولی تلاش و جستجو سے وہ کام لیا ہے جس کی انجام دہی ہر ایک کے احاطۂ امکان سے قطعی خارج ہے جس دلچسپی سے اُنھوں نے یہ فرض ادا کیا ہے اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود مولنا مرحوم سید صاحب کی اس کوشش کو غیر مستحسن سمجھتے تھے اور آپ نے کسی قسم کی بھی امداد دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا لیکن سید صاحب دُھن کے پکے اور خیال کے پورے تھے۔ تمام مشکلات کا مقابلہ جواں مردی سے کیا۔ گل چینی میں کانٹوں کی خلش بخوشی گوارا کی

اور بالآخر "حیات النذیر" کی شکل میں منتشر و پراگندہ پھولوں کو جمع کر کے ایک ایسا گلدستہ تیار کر دیا جسکی دلکشی و دلفریبی دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی صلاحیت بخوبی رکھتی ہے۔

اس مقام پر حیات النذیر کی تقسیم و ترتیب کا اجمالی تذکرہ غالباً خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ شروع میں، فہرست مضامین کے بعد، جناب حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر، اے۔ ڈی۔ سی، فرزند اصغر علیاجناب بیگم صاحبہ بھوپال کی شبیہ ہے جن کے نام نامی پر اس کتاب کو معنون ہونے کا فخر حاصل ہُوا ہے۔ پھر اُس زبردست ہیرو کا عکسی فوٹو ہے جس کے زبردست کارنامے اس ضخیم و حجیم سوانح عمری میں قلمبند کیے گئے ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے سب سے اول مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے کا لکھا ہوا مقدمہ ہے، اور اُسکے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو مقدمہ نگاری کا فی الواقع ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ اسکے بعد مولنا شبلی، خواجہ حالی، اور مفتی انوارالحق وغیرہم کے وہ ریویو شامل کر دیے گئے ہیں جو ان فضلاء نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد تحریر کیے تھے۔ پھر مصنف کا خاص دیباچہ ہے اور پھر اصل کتاب کے مطالب شروع ہو گئے ہیں جن کی تقسیم باعتبار مدارجِ حالات و ترتیب واقعات سات حصوں پر اس طرح کی گئی ہے کہ

حصۂ اول میں پیدایش سے لیکر قبل ملازمت کے واقعات ہیں

حصۂ دوم میں ابتدائے ملازمت سے اُس زمانہ تک کے واقعات ہیں کہ مولنا حیدرآباد نہیں گئے تھے

حصۂ سوم میں حیدرآباد کی ملازمت اور تعلقات کا تذکرہ ہے

حصۂ چہارم میں مولنا کا حلیہ، اخلاق و عادات، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے

حصۂ پنجم میں انکی تصانیف و تالیفات و تراجم پر ایک مبسوط تبصرہ ہے

حصۂ ششم میں اُنکے مذہبی اعتقادات و تنقیدات کا پہلو دکھایا گیا ہے

حصۂ ہفتم میں چند ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کئی اس قابل تھے کہ انھیں اصل متن میں جگہ دیجاتی تو انسب تھا۔

سطور بالا سے سرسری طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ لائق سوانح نگار نے اپنی تصنیف کو مکمل بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ نہ کوئی پہلو جس سے مولنا نذیر احمد کی لائف پر روشنی پڑ سکتی ہو نظرانداز ہونے پایا ہے اور سچ یہ ہے کہ ایسے زبردست شخص کے حالات اسی کے مستحق تھے کہ اسی تفصیل و تکمیل کے ساتھ لکھے جاتے جس کی صدہا "حیات النذیر" کے صفحات میں کھنچی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مولنا نذیر احمد غیر معمولی شخصیت کے بزرگ گزرے ہیں اور اُن کے اوصاف کی گوناگونی انھیں اقران و اماثل میں ممتاز درجہ دلانے کی شدو مد سے سفارش کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کے واقعات زندگی خصوصیت سے دلچسپ و سبق آموز ہیں۔ مولنا کا شمار بجا طور پر دنیا کے اُن مشاہیر میں ہونا چاہیے جنھوں نے نہایت چھوٹی ابتدا سے بالآخر کامیابی کے مدارج طے کیے ہیں اور اس امر خاص میں وہ کسی غیر کے نہیں بلکہ اپنی ہی سعی و جاں فشانی کے رہین منت ہو سکتے ہیں۔ فرینکلن کا مقولہ ہے کہ "اولوالعزم آدمی، خواہ اُسکی حالت بظاہر کتنی ہی پست کیوں نہ ہو، تاہم وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کا راستہ خود اپنی طبیعت سے نکال لیتا ہے۔" مولنا نذیر احمد کے متعلق اگرچہ فی نفسہ اس قول کی تطبیق صحیح نہ ہو، پھر بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک خود ساختہ کامیاب شخص گزرے ہیں۔ اور اُنکے حالات اور طور و طریق کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہر ایک آدمی، جو اس دنیا میں رہ کر شہرت و عظمت کے مراتب طے کرنا چاہتا ہے، کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔

"کامیاب زندگی" سے یہی مراد نہیں ہے کہ انسان فکر معاش سے مستغنی ہو یا اُسکے پاس گنج وافر موجود ہو۔ کیوں کہ عقلاً "کامیابی" کی یہ صورت ہے تو ضرور، لیکن بالکل ادنیٰ اور ابتدائی۔ ہاں وہ شخص البتہ

"کامیاب" کہلانے کا بوجہ احسن مستحق ہے جسکا وقت، جسکا مال، جسکا دل، جسکا دماغ اُس کے بھائیوں، یا دوسرے الفاظ میں، بنی نوع انسان کے فائدہ میں کام آئے۔ ثانی الذکر شق سے قطع نظر، اور ہر ایک پہلو سے مولانا نذیر احمد مرحوم کے کارنامے گویا اس بات کا ثبوت ہیں کہ انکی ذات ملک و اہل ملک کے حق میں سرچشمۂ فیض و برکت تھی۔ سب سے زیادہ قابل ذکر انکی وہ علمی کوششیں تھیں جنھوں نے اُردو کے جسد بے روح میں فی الواقع جان ڈالی۔ اگر مولانا مرحوم کے علمی کارناموں پر مختلف حیثیت سے نظر ڈالی جائے اور پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ ان سے کیا کیا بیش قیمت اور دیرپا نتائج حاصل ہوئے اُسوقت اُنکی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آج کل تعلیم نسواں کی جو ہڑبونگ مچی ہے وہ بلاشبہ ایک طوفان بے تمیزی کی صورت پکڑتی جاتی ہے۔ حامیان تعلیم نسواں، جن میں سے اکثر خالص جوش ہمدردی کی بنا پر صنف نازک کی بہتری و فلاح کے وسائل سوچنے پر آمادہ ہوئے ہیں، اپنی اپنی جگہ کیا کچھ نہیں کر رہے۔ نارمل اسکول کھولنے کی فکریں ہو رہی ہیں، اعلیٰ تعلیم نسواں کے سامان بہم پہنچائے جا رہے ہیں، رسالے جاری کیے جاتے ہیں، نمائشیں ہوتی ہیں اور زنانہ کانفرنس کا خواب بھی دیکھا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن انصاف سے دیکھیے تو جو کام چپ چپاتے مولانا نذیر احمد کر گئے ہیں وہ اپنے علمی نتائج کے اعتبار سے ان تمام نقش برآب کوششوں سے کہیں افضل و اعلیٰ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ تعلیم نسواں کے متعلق مرحوم نے جو کچھ کیا اُسوقت کیا جس وقت کوئی اسکی اہمیت پر غور کرنے والا بھی نہ تھا یار و مددگار ملنا تو دوسری بات ہے۔

مولوی نذیر احمد مرحوم پُرانی روشنی کے بزرگ تھے۔ تعلیم بھی اُنکی پُرانے طرز پر ہوئی تھی، اور وضع قطع اور اکثر امور میں وہ قدامت پسند تھے۔ لیکن کیا عجیب بات ہے کہ "مرأۃ العروس" جسکو آپ کی مستقل اولیں تصنیف ہونے کا فخر حاصل ہے، نہ صرف پُرانے خیال کے لوگوں میں مطبوع و دل پسند ہے بلکہ نئی روشنی والوں کی زبان بھی اسکی تعریف میں ہمیشہ خشک دیکھی گئی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس میں اور نیز اسی قماش کی دوسری کتابوں میں انشا پردازی وغیرہ کی خوبیوں کے علاوہ ہندوستانی طرز معاشرت کا وہ دلآویز اور صحیح فوٹو کھینچا گیا ہے کہ باید و شاید۔ مولوی عبدالحق صاحب مرأۃ العروس کی بابت لکھتے ہیں اور سچ لکھتے ہیں

> مرحوم اگر مرأۃ العروس کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اُردو کے باکمال انشا پرداز مانے جاتے اور ان کی حیات جاودانی کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔

اسی طرح غور کیجیے تو اُنکی تمام تصانیف و تراجم میں بہت سی مشترک و غیر مشترک خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً کتب قانونی کے ترجمہ میں اصطلاحات جس نفاست سے چسپاں کی گئی ہیں اُنکی داد نہیں دی جا سکتی۔ ایسے علم ہیئت کی اصطلاحات جس عمدگی سے وضع اور استعمال ہوئی ہیں وہ مولانا نذیر احمد ہی کا حق سمجھا جا سکتا ہے۔ ترجمۂ قرآن مجید اپنی لسانی خوبیوں کے لحاظ سے نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ آپ کا ترجمہ دیگر تمام تراجم پر حق فوقیت رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ اسوقت بھی کئی خصوصیات میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، لیکن جمہور میں اب جس قدر رواج مولوی نذیر احمد کے ترجمہ کا ہے وہ کسی دوسرے کا نہیں۔

اس مقام پر مولوی صاحب مرحوم کے تمام علمی کارناموں کا تذکرہ غیر ممکن ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ سید افتخار عالم صاحب نے حیات النذیر کے قابل رشک ہیرو کی زندگی کے جہاں اور تمام واقعات پر کافی روشنی ڈالی ہے وہاں اُنکے علمی کارناموں پر بھی ایک مبسوط و مدلل تبصرہ لکھا ہے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ مصنف کی اکثر آرا سے ہر شخص کو اتفاق نہ ہو لیکن اصولاً اُنھوں نے اپنی کوشش

کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

ایک بات جو "حیات النذیر" کے مطالعہ کرنے والوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ سید صاحب نے اکثر مقامات پر اظہار آراء میں مفرط حسن عقیدت سے کام لیا ہے۔ ایک نکتہ سنج دوست کا خیال ہے کہ انھیں اپنے ہیرو کے عادات وخصائل پر رائے زنی کرتے ہوئے کسی قدر زیادہ آزادی سے کام لینا چاہیئے تھا۔ برخلاف اسکے انھوں نے اکثر قابل اعتراض امور کی توجیہ کچھ اس طرح کی ہے جو مذاق سلیم کو ناگوار ہوتی ہے۔ اکثر اس قماش کی تاویلیں، جو قبولیت کا درجہ نہیں پا سکتیں، نہ صرف فضول اور غیر موثر ہوتی ہیں بلکہ اس سے مصنف کی آزادانہ رائے زنی کی قدر بھی گھٹ جاتی ہے۔ حیدرآباد کے اکثر واقعات دوسری روشنی میں دکھائے گئے ہیں اور اس بات کا کہیں تذکرہ نہیں کیا گیا کہ مولنا اور نواب محسن الملک کے تعلقات وہاں ابتداءً کیسے تھے اور بالآخر ان دونوں بزرگوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جانے کے اسباب کیا ہوے۔ وہاں کے اکثر حالات اس انداز سے قلم بند کیے گئے ہیں گویا سید افتخار عالم صاحب نے حیدرآباد میں بیٹھکر انھیں دیکھا یا سنا تھا۔ لیکن غالباً ایسا نہیں ہوا کیونکہ حیدرآبادی پبلک کے مختلف طبقے مولنا نذیر احمد کے متعلق مختلف خیال ظاہر کرتے ہیں۔

اجتماع دولت اور مہماں نوازی کے عنوان سے مصنف نے جو کچھ پیش پا افتادہ تاویلیں کی ہیں اُن میں سے اول الذکر مبحث پر مولوی عبدالحق صاحب نے جو کچھ لکھدیا ہے وہ کافی ہے۔ اگر مولنا نذیر احمد چاہتے تو اپنی دولت کے بہت سے صحیح مصرف سوچ سکتے تھے۔ بقول مولوی عبدالحق صاحب مولنا کرامت حسین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ثانی الذکر عنوان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُسے کم از کم اسلامی تعلیم اور اسلامی روایات کے منافی ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔

"امہات الامۃ" کی بابت ضرور افسوس کیا جا سکتا ہے کہ "مولویوں" نے اُسکے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود سید افتخار عالم صاحب اُسکی طرز ادا پر گستاخی کا الزام لگاتے ہیں اور مولنا مرحوم پیرانہ سالی اور تجربہ کاری کے باوجود اپنی تیز زبانی کے مقر نظر آتے ہیں تو پھر "مولویوں" کو کیوں خالی خطاوار ٹھہرایا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانۂ آزادی میں کسی کتاب کا جلا دینا حد درجہ قابل اعتراض بلکہ لائق نفرین سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سے وجوہ تھے جن کے باعث مولوی نذیر احمد مرحوم اس کتاب کے سارے نسخوں کو حوالۂ نار کر دینے اور تباہ کر دیے جانے پر راضی ہو گئے۔

ایک کمی "حیات النذیر" میں اور محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مولنا کی شاعری پر شرح وبسط سے کوئی بحث نہیں کی گئی۔ لیکن ایسا عمداً کیا گیا ہے۔ سید افتخار عالم صاحب نے مولنا کی نظموں کا ایک جداگانہ مجموعہ "نظم بے نظیر" کے عنوان سے شائع کیا ہے، جسکو ادب اُردو کی ایک بڑی خدمت کہنا چاہیے۔ اِسکے لیے شیدائیانِ لٹریچر کو سید صاحب کی سعی جمیلہ کی داد دینا چاہیے۔

آخر میں "حیات النذیر" کی ایک خوبی قابل تذکرہ ہے۔ یعنے سید افتخار عالم صاحب نے اِس ضخیم ومطول کتاب میں جس انداز اور طرز بیان سے کام لیا ہے وہ نہایت شگفتہ اور سُلجھا ہُوا ہے اور بقول مولنا شبلی اس پر مولنا نذیر احمد کے لٹریچر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ خدا کرے سید صاحب کی یہ کوشش عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہو اور اُن کے رشحاتِ قلم سے اہلِ ملک کو آیندہ بھی مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے۔

"حیات النذیر" کی قیمت تین روپے محاسن ظاہری وباطنی کے اعتبار سے گویا کچھ نہیں۔ شائقین کو دست طلب بڑھانا چاہیے۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب، اول تعلقدار رائچور دکن، یا دفتر رسالۂ العصر لکھنؤ سے یہ کتاب دستیاب ہو سکتی ہے۔

"سید القلم"

اہل اسلام کے علمی احسانات[*]

......وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے اُن کاموں کو
جو یاد رکھنے کے قابل ہیں بھلا دے۔ یا اُنکو نہ جانے۔ (سرسید مرحوم)

حضرات!۔ موجودہ اقوام کے طرز معاشرت پر غور کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر پانچ ہزار برس کی تاریخ عالم پر مسلسل نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ ایک قوم کی تاریخ دوسری قوم کی تاریخ سے وابستہ ہے اور تاریخ تماشاگاہ عالم پر گذشتہ واقعات کو بار بار مشاہدہ کے لیے پیش کرتی ہے۔

اگر تاریخ اسلام میں اُن وجوہ پر غور کیا جائے جنکی بنا پر عرب کی شب تاریک روز روشن میں تبدیل ہوگئی اور آفتاب علم نصف النہار پر پہنچ گیا تو تاریخ بتلائیگی کہ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خلفاء اسلام نے کتب خانوں کی بنیاد ڈالی۔ فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کی۔ یونانی، عبرانی، سریانی، سنسکرت کی تصانیف کے ذخیرے جمع کیے اور اُن تصانیف کا عربی و فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

ابتدا ہی میں مسلمانوں کو اپنی فتوحات کی وجہ سے مختلف اقوام سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور جسقدر یہ تعلقات بڑھتے گئے اُسیقدر اُنکو دوسری قوموں کے علوم و فنون اور خیالات سے زیادہ واقفیت ہوتی گئی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ انہیں وجوہ سے مسلمانوں نے جس سرعت سے روم الکبریٰ کے صوبوں کو تھوڑی سی مدت میں زیر نگین کیا اُسی سرعت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی مملکتوں کو بھی مسخر کر لیا۔

بنی اُمیہ

آغاز تراجم کتب یونانی

خلفاء بنی اُمیہ کے عہد سے تراجم علوم یونانی کی بنیاد پڑی۔ اول جو ترجمے ہوے انکا تعلق صرف علم طب سے تھا۔ پھر فلسفہ اور حکمت وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، اور چونکہ مسلمانوں میں یہودی اور مسیحی اطباء کے سبب سے علوم یونانی کا رواج ہوا تھا اسلیے عہد اسلام میں ان علما اور حکما کی کمال عزت کی جاتی تھی اور اُن کا اقتدار بھی وزرا سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ تمام امورات معاشرت میں مسلمانوں اور غیر اقوام کے حقوق مساوی تھے۔

خالد بن یزید کے زمانہ میں کتب خانہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ جب خلیفہ کو صنعت و حرفت کا خیال آیا تو مصر کے فلاسفروں کو جمع کیا اور علم صنعت کی کتابوں کا جو یونانی زبان میں تھیں عربی زبان میں ترجمہ کرایا۔ ۱۳۲ھ میں سلطنت بنی امیہ کا خاتمہ ہوا، اور بنی عباس نے علم خلافت بلند کیا۔ دار السلطنت دمشق سے بغداد کو منتقل ہوا۔ لیکن علماء نے جو سلسلۂ تراجم و تصانیف کا جاری کر رکھا تھا ویسا ہی ترقی کرتا رہا کہ آئندہ کامیابی کی ایک مستحکم بنیاد بن گئی۔

آغاز تراجم کتب سنسکرت

خلیفہ منصور عباسی نے قیصر روم سے کتب علمیہ کے عربی ترجمے منگائے۔ اسی قدردانی کے سبب دربار خلافت میں علماء و حکما دور دراز ممالک سے آنے شروع ہوئے۔

خالد برمکی وزیر سلطنت نے فارسی النسل ہونے کی وجہ سے خاص کر

---

[*] یہ اس مضمون کا خلاصہ ہے جو مسٹر بی۔ گھوشال ایم۔ اے نے اُردو کانفرنس (منعقدہ لکھنؤ) کے اجلاس دوم میں پڑھا تھا۔ مکمل مضمون کتابی صورت میں شائع ہوگا (ایڈیٹر)

کتب ایرانی کا ترجمہ کرایا۔ اُسی زمانہ سے ہندو علماء بھی بغداد کے دربار مین جمع ہونے شروع ہوئے۔ علاوہ تراجم کتب فلسفہ وطب واخلاق کے علم ریاضی نے بھی عہد منصور مین بہت کچھ ترقی کی۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک مشہور ریاضی دان اور نامور پنڈت نے دربار منصور مین حاضر ہوکر کتاب سدہانت بطور نذر پیش کی جس کا ترجمہ دربار کے ایک عالم محمد بن ابراہیم فرازی نے کیا۔

خلیفہ ہارون الرشید عباسی خلیفہ ہارون الرشید عباسی کو جیسے ارباب کمال میسر ہوئے دوسرے خلفاء کو نصیب نہین ہوئے۔ اس عہد مین سلطنت عباسیہ کمال عروج پر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قیصر وکسریٰ کے بادشاہون کا سامان اسلامی شاہزادیون کے جہیز مین نکالا جاتا تھا۔ مگر ملکی فتوحات سے زیادہ اس عہد مین علمی فتوحات ہوئین۔ اس خلیفہ نے اُس عظیم الشان دار العلم کی بنیاد ڈالی جس کا نام بیت الحکمت تھا جو دو حصون پر منقسم تھا۔ ایک کتب خانہ کے لیے اور دوسرا غیر زبانون کے تراجم کے لیے۔

وزیر یحییٰ برمکی کے کتب خانہ مین مشہور خوش نویسون کی لکھی ہوئی عربی یونانی قبطی کالدی ہندی کتابین عموماً اور فارسی کتابین خصوصاً بکثرت موجود تھین؎۔ اسی نے بڑے بڑے نامی ہندوون اور حکماء کو دربار مین بلا کر کتب سنسکرت کے تراجم پر مامور کیا۔ چنانچہ ایک ہندی نے بھی جو خلیفہ کے دربار کا افسر الاطبا تھا چرک اور شسرت کا ترجمہ کیا۔

فن کاغذ سازی حکومت عباسی کا دور شروع ہونے کے بعد اہل عرب نے کاغذ لکھنا شروع کیا۔ جب فضل بن یحییٰ برمکی نے کاغذ بنانے کا حکم دیا تو مسلمانون نے بغداد مصر شام وغیرہ مین اسکے کارخانے کھولے۔ اسلیے اگر کاغذ بنانے کی صنعت کو فروغ دینے کا مسلمان دعویٰ کرین تو بجا ہے۔

خلیفہ مامون الرشید عباسی خلیفہ مامون الرشید عباسی کے علمی ذوق کی نسبت تاریخ شاہد ہے کہ یہ اسکی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ بغداد اسکے عہد مین مرکز علوم وفنون بن گیا۔ مامون کی والدہ ایرانی نژاد تھین اور اُس کا اتالیق سلطنت عباسیہ کا چشم وچراغ وزیر السلطنت یحییٰ برمکی ایرانی تھا۔ نیز خلیفہ کی عمر کا ایک بڑا حصہ فارس اور خراسان مین گذرا اسلیے اُس نے فارسی کی ہمیشہ قدر کی۔

فن تاریخ اور چونکہ فن تاریخ سے مسلمانون کو زیادہ دلچسپی تھی اسلیے تاریخ اور فارسی لٹریچر کا جسقدر سرمایہ ایران مین دستیاب ہوسکا عربی زبان مین منتقل کیا گیا۔ عربون نے ایرانی طرز معاشرت اختیار کی۔ فارسی شاعری کی نئی بنیاد پڑی۔ اور دنیا جانتی ہے کہ فن تاریخ کو مسلمانون نے کس عروج پر پہنچادیا۔ آج یورپ باوجود ادعائے ہمہ دانی علامہ ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کا متبع ہے۔

جو معاہدہ خلیفہ مامون نے یونانی فرمانروا میکائیل ثالث سے کیا تھا اس مین یہ بھی شرط تھی کہ قسطنطنیہ کا ایک کتب خانہ اُسکے حوالہ کردیا جائے۔ نیز خلیفہ کے کارکن دور دراز ممالک سے نوادر قلمی کتابین جمع کرتے تھے۔ اس طور پر جو علمی خزانے خلیفۃ المامون کے ہاتھ آئے اُن کا ترجمہ بصرف زر کثیر عربی زبان مین کیا گیا۔ علاوہ اسکے بہت سے تراجم متمول اور علم دوست اشخاص کی علمی فیاضیون کے بدولت اُس زمانہ مین مرتب کیے گئے۔ چنانچہ ایک نسطوری طبیب نے اس قسم کا ایک سلسلہ بغداد مین قائم کر رکھا تھا۔ یہ شخص ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور دیگر مشاہیر یونان کی تصانیف کے تراجم شائع کرتا تھا۔

اس زمانہ مین کوئی وزیر کوئی امیر کوئی عالم ایسا نہ تھا جسکے گھر مین کتب خانہ موجود نہ ہو یا کتابون کے مہیا کرنے مین بیدریغ روپیہ صرف نہ کرتا ہو۔

؎ دیکھو کتاب البرامکہ مصنفہ مولوی عبد الرزاق کانپوری۔

مسلمانان سلف مین عموماً علمی ذوق

مسلمانان سلف مین عموماً علمی مذاق کا اندازہ ان تاریخی واقعات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ کہ بڑے بڑے اساتذہ کی مجالس املا مین چالیس بلکہ ستر اور کبھی سوا سوا لاکھ طلبا رکا ہجوم ہوتا تھا۔ خیال فرمانے کی بات ہے کہ جس قوم کے افراد ایک ایک مجلس علمیہ مین سوا سوا لاکھ جمع ہو جائین اُس قوم کے سینے مین ذوق علمی کی آگ کیسی کچھ بھڑک رہی ہو گی؎۱۔

حضرات!۔ یہ اعلےٰ درجہ کا علمی مذاق اُسوقت بھی بدستور قائم رہا جبکہ اختلافات اندرونی کی وجہ سے عربی سلطنت تین جداگانہ حصون مین تقسیم ہو گئی تھی۔ بنی عباس ایشیا مین، بنی فاطمہ مصر مین، اور بنی امیہ اندلس مین، جس طرح ایک دوسرے کے سیاسی رقیب تھے اُسی طرح علم و ادب اور حکمت و انشا، کی سرپرستی مین بھی اُنکی یہی کوشش تھی کہ ایک دوسرے پر فوق لیجائے۔

قاہرہ کے کتب خانہ فاطمیہ مین ایک لاکھ پچاس ہزار نسخے ایسے موجود تھے جن کا خط نہایت پاکیزہ اور جلدین نہایت خوشنما تھین۔ اس کتب خانہ مین ایک شعبہ تراجم کے لیے مخصوص تھا۔

اندلس

خلفاے اندلس کی کتابون کی تعداد رفتہ رفتہ چھ لاکھ ہو گئی، جس کی فہرست ہی چالیس جلدون پر مشتمل تھی۔ اس شاہی کتب خانے کے علاوہ ستر کتب خانہ ایسے تھے جن مین ہر شخص جا کر اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کر سکتا تھا۔ یورپ مین کاغذ بنانے کی صنعت مسلمانان اندلس کی بدولت آئی۔ قرطبہ مین عام دستور تھا کہ ہر امیر ایک جدا کتب خانہ قائم کرتا اور یہ کوشش کرتا تھا کہ اُسکے کتب خانے مین ایسے نادر نسخہ موجود ہون جن کی نظیر دوسرے کتب خانون مین نہ ملے۔ یہی وہ شہر تھا جہان سے علم کی روشنی سارے یورپ مین پھیلی۔

یورپ مین علم جغرافیہ

عرب کا مشہور معروف جغرافی ابو عبداللہ وطن چھوڑکر قرطبہ مین آیا تھا اور اُسی نے وہ بے نظیر جغرافیہ لکھا جس کا لاطینی زبان مین ترجمہ ہو کر علم جغرافیہ یورپ کے ازمنۂ متوسط مین پھیلا اور تین صدیون سے زیادہ تک یورپ نے محض اسی کتاب کی تقلید پر قناعت کی۔

اسپین مین تعلیم نسوان اور مذہب کا ایک اہم پہلو

موجودہ طرز معاشرت مین عورتون کا جاہل رہنا سوسائٹی مین کچھ اچھی نظر سے نہین دیکھا جاتا۔ شہنشاہ نپولین اعظم کا قول ہے کہ کسی قوم کو اعلیٰ درجہ کی ترقی دینے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اُس قوم کی ماؤن کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ فاتح یورپ کے صدیون قبل اسپین و ایشیا۔ کے عہد اسلام کا سب سے شاندار مہذب نظارہ اُس زمانہ کی تعلیم یافتہ عالی دماغ اور بلند حوصلہ خواتین اسلام کا علمی ذوق و شوق ہے۔

حضرات! یہ ایک امر مسلم ہے کہ عورتین تمدن کی بنیاد ہین اور ترقی تمدن کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ عورتون اور مردون کے حقوق برابر قائم کیے جائین۔

سائنس؎۱

حضرات! یورپ کو آجکل سائنس کی علمی و عملی ترقیون پر بڑا فخر ہے۔ ہان، شاید یورپ کی باریک بین نظر نے کسی راز سربستہ کو دریافت کر لیا ہو؟ شائد معماے حیات کے حل و عقد مین یورپ کامیاب ہو گیا ہو۔؟ ممکن ہے کہ ماہیت اشیا، یورپ پر منکشف ہو گئی ہو یا یورپ کی عقل دوربین اور فہم نکتہ رس نے فلکیات کے مسائل کما حقہ دریافت کر لیے ہون۔ کیا ایسے راز پر جس کی نسبت کہا گیا ہے۔

"کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را"

مادی خیالات۔ مادی سائنس اور فلسفہ کے مکاشفات کیا کسی نوع کی روشنی ڈال سکتے ہین؟ ہرگز نہین!۔ بلکہ اس تمام تر کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سائنس نے ایک مدت کی کاہش و سرگردانی سے زمانہ کو

؎۱ دیکھو کتاب "علماے سلف" مولفہ مولوی حبیب الرحمن خان شروانی مطبوعہ علیگڈھ۔

؎۱ دیکھو کتاب "معارج الدین" مصنفہ مولوی نواب علی ایم۔اے پروفیسر بڑودہ کالج

دہریت اور الحاد کے گرداب مین ڈبو کر سمجھایا - اور سمجھایا بھی تو کیا کہ

"معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد"

مسئلۂ ارتقا خود مسئلۂ ارتقا کو لیجیے جو نظام سائنس کا آفتاب بن چکا ہے اور جسے ہم ڈارون کا اکتشاف جدید سمجھتے ہین -

حضرات! اس مسئلہ کی تعلیم مدارس اسلامی مین اُس وقت دیجاتی تھی جب یورپ اُس سے بالکل بیخبر تھا - اور ہم تو پھر بھی اُسکے محدود معنی لیتے ہین وہ ہم سے ایک قدم آگے بڑھے ہوے تھے اور جمادات تک کو اُسکے حیز عمل مین داخل سمجھتے تھے جیسا کہ مولانا روم علیہ الرحمہ نے اس مسئلہ کو صوفیانہ پیرایہ مین منظوم کیا ہے -

آمدہ اول باقلیم جماد ... وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتے عمر کرد ... وز جمادی یاد نا ورد از نبرد
وز نباتی چون بحیوان اوفتاد ... نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہمان میلے کہ دارد سوے آن ... خاصہ در وقت بہار و ضیمران
باز از حیوان سوے انسانیش ... میکشد آن خالقے کہ دانیش
ہمچنین اقلیم تا اقلیم رفت ... تا شد اکنون عاقل و دانا و زفت
عقلہاے اولینش یاد نیست ... ہم ازین عقلش تحول کردنی ست
تا رہد زین عقل پر حرص و طلب ... صد ہزاران عقل بیند بو العجب

اور یہ بات قابل غور ہے کہ باوجود اس خیال کے کہ الحادی اور مادی خیالات سائنس کے لوازمات سمجھے جاتے ہین اسپین کے مسلمانون پر ملحدانہ خیالات کا کوئی اثر نہین پڑا جس سے یورپ کے مصلحان تمدن کو موجودہ طرز معاشرت پر کوئی فخر نہین ہے - کیا یورپ کا یہ اخلاقی اور روحانی تنزل اس بات کی دلیل نہیں کہ علم کا غلط استعمال حجاب اکبر ہو جاتا ہے؟

یورپ مین علم طب مسلمانون نے مسئلہ ارتقا کے علاوہ کیمیا کے بعض نہایت اہم اکتشافات دریافت کیے - مثلاً بارود جس سے یورپ کا فیوڈل سسٹم اڑگیا - گندھک و شورہ کا تیزاب جس سے اُنھون نے مطب مین بھی کام لیا اور معدنیات کے کُشتہ جات یعنی رسائن کی بدولت تو اُنھین یورپ کی اُستادی کا فخر حاصل ہے چنانچہ یورپ کا پہلا طبی مدرسہ عربون نے اطالیہ کے ایک شہر مین قائم کیا اور یورپ نے پندرھوین صدی تک طب مین شیخ بو علی سینا ہی کو مستند جانا -

یورپ مین علم ریاضی علم ریاضی بھی سنسکرت سے ترجمہ ہو کر مسلمانون کی بدولت عربی زبان مین داخل ہوا اور یورپ مین عربون ہی نے حساب کے ہندی طریقہ کو رواج دیا - جبر مقابلہ ہندوستان سے عرب مین گیا اور وہان جابر ایسے ریاضی دانون نے اسے ترقی دی چنانچہ الجبرا کے نام ہی سے اسکے اشاعت کنندہ کا پتہ چلتا ہے -

علم نجوم عربون نے اول اس علم کو ہندوؤن سے حاصل کیا - مابعد یونان سے جو علوم و فنون کا سیلاب آیا اسمین نجوم کا بھی خاص حصہ تھا - پھر خلفاے عباسیہ اور سلاطین عجم کی سرپرستی نے احکام نجوم کو معراج کمال تک پہنچا دیا - قرون وسطیٰ مین سات سو برس تک علم ہیئت بھی یورپ مین مسلمانون ہی کے تحفظ مین رہا - اور پہلی رصدگاہ جو یورپ کو نصیب ہوئی وہی تھی جو خلفاے بنی امیہ کی سرپرستی سے اسپین مین قائم ہوئی -

خیامی اصلاح جدید بارھوین مین جو سنہ مروج ہے جسکو وہ یزدجردی سمجھتے ہین یہ سنہ دراصل حکیم عمر خیام نیشاپوری کا مرتب کیا ہوا ہے جسکو ہم فخریہ خیامی کہہ سکتے ہین - خراسان کے اس دوسرے بو علی سینا کے فضل و کمال کا اسوقت صحیح اندازہ ہو سکتا ہے جب سنہ جلالی کا گریگورین سنہ دول سے مقابلہ کیا جاے - بلکہ بعض علماء کی راے ہے کہ خیام کے سنہ جلالی سے گریگوری نے اپنا قاعدہ بنایا ہے - علماء مشرق و مغرب کا اس پر اتفاق ہے کہ جو نظام خیام نے مقرر کیا وہ اقوام سابقہ کے حساب سے سب پر فائق ہے -

علم جر ثقیل علم جر ثقیل مین انھون نے گرتے ہوئے اجسام کے قوانین دریافت کیے

جسکو ہم نیوٹن کا اکتشاف جدید سمجھتے ہین اور قوت کشش ثقل کی ماہیت سے بھی وہ نابلد نہ تھے - فرانس کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ ہمکو اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت نہین کہ مسلمانون کے عہد مین فن جرثقیل کمال کے کس درجہ تک پہنچ گیا تھا -

فلسفہ جس طرح مسلمانان اسپین یورپ کے علمی علوم کے اُستاد ہین اسیطرح ابن رشد نے علم فلسفہ مین یورپ کو اُسی شاہراہ پر چلایا جس پر اہل چین واہل ہند غرض مشرق کی تمام قومین چل رہی تھین اور اسپین ہی وہ مرکز تھا جہان سے آفتاب فلسفہ کی شعاعین نکل کر یورپ کے علمی وعملی حلقون مین پھیلین - اطالیہ جرمنی انگلستان مین بھی فلسفہ ابن رشد پھیل گیا اور سیمیون کے فرانسسکن فرقہ نے اس فلسفہ کو خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھا - پیرس کی یونیورسٹی کو اسکا مرکز بننے کا فخر حاصل ہوا - یہودیون مین بھی جو اُس زمانہ مین عقل و دانش کی کرسی پر متمکن تھے فلسفہ ابن رشد عام طور سے پھیل گیا تھا - مشہور یہودی فیلسوف موسیٰ بن میمون نے اس فلسفہ کو تسلیم کرلیا تھا اور اُسکے شاگردون نے دنیا کے ہر حصہ مین اس فلسفہ کی اشاعت کا فرض پورا کیا

اُسی زمانہ مین لوگ انگلستان فرانس واٹلی سے اسلامی درسگاہون مین اکتساب علم کے لیے آتے تھے چنانچہ ان مین کا ایک جوہر قابل دار العلم قرطبہ سے نکل کر پاپاے روم کی کرسی پر صدر نشین ہوا - لاطینی عیسویت نے اپنے اصول مین بہت کچھ اسلام کی مطابقت کی - جیساکہ نہ صرف فقہ اگسٹن بلکہ اُس زمانہ کے عیسوی فلسفہ سے بھی جنمین ایک فرقہ ابن رشد کو اور دوسرا فرقہ بوعلی سینا کو مانتا تھا ظاہر ہوتا ہے -

مسلمانان عرب و یورپین لٹریچر مسلمان اور عیسائیون کے میل جول کا یہ ایک ادنیٰ مگر وسیع الکیفیت نتیجہ ہے کہ عربی زبان سے لاطینی زبان نے فائدہ اُٹھایا - چونکہ لاطینی زبان یورپ کی ام السنہ تھی اس لیے ایک طرف جنوبی یورپ کی زبانون نے اس سے خوشہ چینی کی اور دوسری طرف مشرقی اثرات رفتہ رفتہ کوہستان پیرنیز کو عبور کرکے فرانس اور نارمنڈی تک پہنچ گئے - انھین اثرات کا یہ نتیجہ تھا کہ جب نارمن قوم نے انگلستان کو فتح کیا تو وہ لطائف جو عربی زبان و تراجم سے منتقل ہوتے چلے آتے تھے انگریزی زبان مین داخل ہوگئے اور انگلستان کی قدیم زبان جو ایک محدود زبان تھی وسیع اور لطیف بن گئی - لیکن ایسے مشہور اور معتبر مورخ نے انھین علمی اثرات کی بابت لکھا ہے کہ اس وقت تک یورپ کی ذہنی دماغی ترقیون مین جان نہین پڑی جبتک مسلمانون کے سائنس نے علوم و فنون کو یورپ کی خانقاہون سے جدا کرکے دار العلوم مین نہین پہنچادیا -

اگر کسی کو اس امر سے اب بھی اختلاف ہو اور مسلمانون کی شاندار علمی فتوحات اور انکی عظیم الشان سر بفلک عمارتین خدانخواستہ سرزمین یورپ سے نیست و نابود ہوجائین تو آسمان خود گواہی دیگا کہ یورپ کو مہذب بنانے مین مسلمانون نے کس درجہ حصہ لیا - چنانچہ ستارون کے عربی نام بھی انکی شہادت دیتے ہین حضرات! اسی کے ساتھ اگر ہم مشرقی مسلمانون کے علمی مذاق پر تبصرہ کرین تو معلوم ہوگا کہ مشرقی دنیا مین علم و ادب کی اشاعت مین وہ اپنے مغربی معاصرین سے گوے سبقت لیگئے تھے -

دار العلم غزنی

سلاطین غزنویہ مین سلطان محمود کی علم پروری ایک ایسی خصوصیت امتیازی ہے جو علمی دنیا مین ہمیشہ یادگار رہے گی - چار لاکھ دینار سالانہ خزانہ شاہی سے اُسکے زمانہ مین علمار کو دیا جاتا تھا مگر اُس بادشاہ کی فیاضی صرف عالمون ہی تک محدود نہ تھی - اس نے اپنے عہد حکومت مین غزنی کی جامع مسجد کے متصل بہت بڑا دار العلم بھی قائم کیا اور اس مین غیر زبان کی ہزارہا کتابین داخل کین - اس دار العلم مین کتبخانہ کے علاوہ ایک عجائب خانہ بھی شاہی امداد سے قائم تھا - اس عہد کے اساتذہ مین سے عنصری بھی اپنے زمانہ کا مشہور فلاسفر اور بےمثل

شاعر گذرا ہے۔ ایکمرتبہ سلطان نے عنصری کے چند اشعار پر خوش ہوکر شاعر کے منھ کو تین مرتبہ موتی اور جواہرات سے بھروادیا۔ اسدی طوسی کو دنیا جانتی ہے کہ مشہور شاعر فردوسی کا اُستاد تھا۔ سلطان نے کئی بار اسدی سے شاہنامہ لکھنے کی خواہش کی مگر وہ ہمیشہ ضعیفی کا عذر پیش کرتا رہا۔ آخر اُسکے نامور شاگرد نے شاہنامہ لکھکر بقاے دوام کی عزت حاصل کی۔ سلطان محمود کے ساعی جمیلہ سے غزنی شعرا اور فلاسفرون اور علمار سائنس کا مرکز بن گیا۔ اور یہ شہر قرون وسطیٰ کے پلوتنا اور پیڈوا کی طرح مشہور ہوا۔ اُسی زمانہ مین آل سبکتگین کا تذکرہ عتبی نے اپنی تاریخ یمینی مین کیا ہے۔

سلطان مسعود غزنوی سلطان مسعود بھی مثل اپنے باپ کے حکما اور علما کا قدردان تھا اور اُن سے اسقدر مانوس تھا کہ دربار ہمیشہ عالمون سے بھرا رہتا تھا۔ اسکے زمانہ مین انور خان خوارزمی نے علم ہیئت پر کتاب مسعودی لکھکر ایک ہاتھی کے ہموزن چاندی انعام پائی تھی۔ کتاب روضۃ الصفا مین ذکر ہے کہ اس سلطان نے کئی دار العلوم اور اسکول اپنے ملک کے شہرون مین جاری کیے۔ البیرونی کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے مسلمان ہندی علم ہیئت، ریاضی، نجوم، فلسفہ وطب کے بیحد شائق تھے۔ اسی کی کتابین دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ مین سنسکرت کی کتنی کتابون کا ترجمہ کیا گیا۔ خود بیرونی سنسکرت زبان کا بہت بڑا عالم اور پاتنجلی کا مترجم گذرا ہے۔

سلطان بہرام بن مسعود سلطان بہرام بن مسعود غزنوی بہت بڑا تشنۂ علم تاجدار تھا۔ اس بادشاہ نے علمی دنیا مین نئی روح پھونکی۔ مخزن اسرار کا مصنف اسی کے دربار کا وظیفہ خوار تھا اس سلطان نے کئی ہندی کتب کا ترجمہ کرایا۔ کلیلہ دمنہ اسی کے عہد مین ترجمہ ہوئی جس کو مرزا حسین واعظ کاشفی نے بدل کر انوار سہیلی کے نام سے موسوم کیا۔

آل سلجوق[۱]

حضرات! اب اُس خاندان شاہی کا قصہ سُنیے جس نے اپنا ایوان حکومت غزنیون کے کھنڈرات پر قائم کیا۔

جب سلجوق اعظم کرغیز کے کوہستانی میدانون سے اُترکر اپنی قوم کو بخارا مین لایا اور وہان مع اپنے تمام توابع کے مسلمان ہوگیا اُسوقت دنیاے اسلام کی یہ حالت تھی کہ دولت عباسیہ کا چراغ خود جھلملا رہا تھا۔ اسپین اور افریقہ خلافت عباسیہ کے اثر سے آزاد ہوچکے تھے۔ ایسے نازک زمانہ مین اسلام کی مذہبی اور سیاسی کمزوری رفع کرنے کے لیے ایک زبردست طاقت کی ضرورت تھی جو سلجوقیون کے وجود سے پوری ہوئی۔ اسلام قبول کرتے ہی ان خانہ بدوش وحشیون کی زندگی مین ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا۔ اور انکے فتوحات نے مسلمانون کی مٹتی ہوئی شان وشوکت کو ایسا سنبھالا کہ لوگون کو صحابۂ کرام کا زمانہ یاد آگیا۔ سلجوقیون نے مغربی ایشیا کی اسلامی سلطنتون کو ایک سلطنت مین شامل کرلیا۔ رومیون کی پیش قدمی کا انسداد کیا۔ نئی ترکی نسل مین مذہبی جوش پیدا ہوا، اور یہی سبب ہے کہ دولت سلجوقیہ کو تاریخ اسلام مین مہتم بالشان درجہ ملا ہے۔

خواجہ نظام الملک طوسی اور نظامیہ بغداد

خلیفہ مامون الرشید کے زمانہ کو اگر ابو عبد اللہ اور برامکہ پر فخر ہے تو الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کا عہد نظام الملک طوسی اور عمر خیام پر ناز کرسکتا ہے۔ مورخین کا اسپر اتفاق ہے کہ یحییٰ برمکی اور صاحب ابن عباد کے بعد کوئی وزیر فضل وکمال مین خواجہ نظام الملک کا ہمسر نہین ہوا۔ علوم وفنون کی اشاعت مین جس فیاضی سے خواجہ نے کام لیا ہے وہ بھی اُسکا خاص حصہ تھا۔

---

[۱] دیکھو کتاب "نظام الملک طوسی" مولفہ مولوی عبد الرزاق کانپوری۔

نظامیہ بغداد خواجہ کی علمی یادگار دن میں نظامیہ بغداد کا نام تاریخ مین مشہور ہے۔ نظامیہ کی عمارت مین ایک حصہ خزینۃ الکتب کے لیے مخصوص تھا چنانچہ تکمیل عمارت کے بعد خواجہ نے اُسمین ہزارون کی تعداد سے نادر اور بیش قیمت کتابین داخل کر دین۔

نظامیہ پہلا مدرسہ ہے جس نے طلبا کے لیے وظیفہ مقرر کیا اور یہ مدرسہ ۳۰۰ برس تک قائم رہا۔ شیخ سعدیؒ نے اسی مدرسہ کے وظیفہ سے تعلیم پائی تھی۔ محض نظامیہ کی تقلید مین مصر شام و عراق مین بہت سے مدارس قائم ہوے اور علَم علم سارے وسط ایشیا مین بلند ہوا۔

تصانیف عہد سلجوقیہ اس زمانہ مین بھی تصانیف کا سلسلہ بدستور قائم رہا خود نظام الملک ایک بڑا مصنف تھا اور اگر آپ اسکے "قانون سلطنت" کو غور سے مطالعہ فرمائین گے تو معلوم ہوگا کہ زمانۂ حال کا قانون اور ضابطہ بھی سلاطین سابق کے قانون کا خوشہ چین ہے۔

حکیم عمر خیام نیشاپوری خواجہ نظام الملک کے ہمسبق حکیم عمر خیام نیشاپوری نے ملک شاہ سلجوقی کے حکم سے اصلاح رسد کی تھی خیام کی تصانیف اسقدر مشہور ہین کہ ہمارے بیان کی محتاج نہین۔ اور خیام کے باخبر ہونے مین کیا کلام ہو سکتا ہے جب کہ گذشتہ صدی مین شہر لندن مین "عمر خیام کلب" قائم ہو۔ یورپ والے خیام کو مشرق کا والٹیر کہتے ہین۔ فلاسفران یورپ مین شوپن ہار سلسلۂ خیامی مین داخل ہے اور اس کا فلسفہ فی نفسہ کوئی نو ایجاد فلسفہ نہین ہے۔

علم و پیشہ اس عہد مین جسکی یہ تاریخ ہے شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب مسلمان ہوگا جس نے محض علم کو معاش کا آلہ بنایا ہو ورنہ قوم کا ہر فرد پیشہ ور تھا۔ عربون کی تجارتی کوششین اُنکے علوم و فنون کی کوششون سے کچھ کم نہ تھین کئی صدیون تک وہ تمام عالم کا مرکز تجارت بنے رہے اور زمانۂ قدیم مین اُنھون نے وہی کام دیا جو یورپ مین وینیس نے اپنی ترقی کے زمانہ مین دیا تھا۔ اور پھر لطف یہ کہ باوجود اس حیرت انگیز تجارتی ترقی کے عربون نے نہ تو اپنے تمدن کی بنیاد تجارت پر رکھی نہ تجارت کو قومی درازدستی کا آلہ بنایا اور نہ ترقی تجارت کو اپنے علمی مشاغل پر غالب ہونے دیا۔

اسی علمی ذوق و شوق کا یہ نتیجہ تھا کہ ایران کی مردہ شاعری مین جان پڑی۔ شیراز ہمیشہ علمی مرکز بنا رہا۔ بخارا مین دار العلم قائم کیا گیا مشہد کی علمی شان و شوکت قائم ہوئی۔ نیشاپور کو علمی فضیلت ملی۔ تاجدارون نے جدا جدا کتبخانے قائم کیے نوح ابن منصور کا کتب خانہ ایک بے نظیر کتبخانہ تھا۔ عضد الدولہ نے شیراز مین ایک کتبخانہ قائم کیا۔ سیف الدولہ کے کتبخانہ مین فن ادب کا ایک بے مثل ذخیرہ جمع ہوا۔ سہل بن مرزبان صاحب بن عباد، محمد بن الحسین بغدادی کے کتبخانے یادگار زمانہ تھے اور طوس کے بارہ مین کہا گیا کہ:-

ہر دبیر و شاعر و مفتی کہ او طوسی بود ۔ چون نظام الملک و غزالی و فردوسی بود

اور یہی نظامیہ بغداد اور اُسکے ماتحت مدارس تھے جنکی اعلےٰ تعلیم و تربیت نے علم کی روشنی پھیلا کر اُس عہد کے مسلمانون کو ایک زندہ قوم بنا دیا تھا

مسلمانان ہند کا علمی مذاق

حضرات! ہندو مسلمانون کے صدیون کے باہمی تعلقات سے جو اہم نتائج پیدا ہوے اُن کا بیان اس مختصر تقریر مین نہین ہو سکتا لیکن بہ سبیل ایجاز اتنا کہنا کافی ہے کہ جب اہل اسلام ہندوستان مین آئے تو سب سے پہلے معاشرت مین ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ ذات پات کی بندشین جنھون نے ہر طرف سے انسانیت کو جکڑ رکھا تھا کمزور ہوتی گئین اور رفتہ رفتہ ان تعلقات نے ہوشل حالات سے گذر کر علمی اور سیاسی شعبہ ہاے حیات کو بھی متاثر کیا۔ اسلامی مدنیت کی ترقی کو وہ میدان مل گیا جو اس عہد سے پیشتر اُسکو دیگر

ممالک مین مل چکا تھا اور جس مین وہ اپنے انتہائی نتائج ارتقا کو ایک عالم کے پیش نظر کر چکی تھی۔ مسلمانون نے یہان بھی متعدد دار العلوم اور مدارس قائم کیے۔ چونکہ وہ خود لٹریچر کے مالک تھے اور جانتے تھے کہ کسی قوم کو بے زبان کر دینا اُسکی ہستی کو مٹانا ہے اسلیے اُنھون نے نہ صرف سنسکرت پر اپنی توجہ مبذول کی بلکہ اس ملک کی ایک قومی زبان یعنی بنگالی کو بھی ترقی دینا اپنا فرض سمجھا۔ یہ امر واقع ہے جسکی صحت سے انکار نہین ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ عام مورخین بھی اس حقیقت کو ظاہر نہ کر سکے۔ میرے لیے بحیثیت ایک بنگالی ہونے کے یہ امر مایۂ صد افتخار ہے کہ میرے ہموطن کمار نرنید رناتھ لانے "ترقی علوم بزمانۂ شاہان اسلام ہند" نامی مستند کتاب حال مین شائع کر کے اُس فرض کو ادا کیا ہے جو اسلامی علمی کارنامون کی طرف سے بنگالیون پر عائد ہوتا ہے۔

حضرات! اُنھون نے صرف اسی پر اکتفا نہین کیا بلکہ ہمارے اسلامی سلاطین ہند اُن سیاسی رموز سے بھی واقف تھے جس سے مختلف النسل قومین متحد ہو جاتی ہین۔ یہ سلاطین ہندوستان مین آکر ہندی ہو چکے تھے۔ صدیون سے آپس مین ایک نہایت دلکش مفاہمت ہو چکی تھی۔ ملکی رنگ اُن سلاطین اور بزرگان دین پر ایسا چڑھا کہ زبان و مذہب کے اتحاد اور محبت و اخلاص کے برقرار رکھنے مین ایثار کی انتہا کر دی۔ جنگ نہاوند کے بعد پارسیون نے جو نہین کیا تھا وہ کر گذرے اپنی اصلی زبان کو بھی فراموش کر دیا۔ چنانچہ ہندو مسلمانون کے اتحاد و ایثار کی نظیر ایک جانب ہماری پیاری اُردو زبان ہے جو بھاشا کی ترقی یافتہ شکل ہے اور دوسری جانب وہ صوفیانہ خیالات ہین جنمین اور ویدانت کے حقیقی اصول مین کوئی فرق یا تفاوت نہین ہے۔

ہندوستان مین مذہبی اور سیاسی اتحاد اسی وسیع الکیفیت اتحاد کا نتیجہ تھا کہ گرونانک اور کبیر کے پیرو وجود مین آئے اور اب بھی بطور زندہ یادگار موجود مین۔ رہا سیاسی اتحاد سو وہ راجہ اشوک کے بعد ہندوستان مین اُسوقت تک پیدا نہین ہوا جب تک شہنشاہ اکبر نے ہندو اور مسلمانون کو تمدنی طور پر ایک نہ بنا لیا اور یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ ہندوستان کی موجودہ معاشرت مین جہان ساسانیون اور یونانیون کا کچھ حصہ ہے وہان مسلمانون کا بھی بہت بڑا حصہ شامل ہے۔

عرب اور ہندوستان عربون کے تجارتی تعلقات ہندوستان کے ساتھ ابتدائے زمانۂ تاریخی سے شروع ہوے لیکن ظہور اسلام کے کچھ ہی مدت بعد سندھ عربون کے تحت حکومت مین آگیا اور ہندوستان مین عرب پہلے پہل آئے۔ نوین صدی کا تذکرہ ہے کہ سندھ مین ہندو مسلمانون کا میل جول اسقدر بڑھ گیا تھا کہ ہندو عربی معاشرت سے اسقدر متاثر نہین ہوے جسقدر خود عرب ہندوستانی معاشرت سے متاثر ہو گئے تھے اسی صدی مین قرآن شریف کا کسی ہندو راجہ کی تحریک پر ہندی زبان مین ترجمہ کیا گیا۔

عربی دور ختم ہونے کے بعد ایرانی دور شروع ہوا۔

خاندان غزنی

خاندان غزنی کا مختصر بیان ہم اوپر کر آئے ہین۔ یہان صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ سلطان محمود غزنی کے زمانہ کے مسلمان ہندو فلسفہ سے خوب واقف تھے اور غزنیون نے متعدد ہندی کتابون کا ترجمہ کرایا، اور سچ پوچھیے تو اردو زبان کی بنا اسی سلطان کے وقت سے پڑی اور اسی کی تعلیم و تربیت کا یہ اثر تھا کہ سلطان مسعود نے ممالک محروسۂ ہندوستان کی گورنری پر ایک ہندو سردار کو ممتاز کیا۔

خاندانِ غلامان

ان کو غلام نہ کہیے ہمارے ہمخیال صدر جناب نواب نصیر حسین خان صاحب خیال نے کیا خوب فرمایا ہے کہ "یہ غلام شاہون کا دل و دماغ لائے تھے

اور ہندوستان کے ساتھ اُنھون نے شاہانہ سلوک کیے۔ انھین کے وقت مین دلی زبانون کا مرکز اور علوم کا گھر بن کر غزنی اور بغداد پر چشمک زنی کر رہی تھی۔

سلطان ناصرالدین شاہ بلبن سلطان ناصرالدین کے زمانہ مین طبقات ناصری لکھی گئی جب چنگیز خان خراسان کی غارتگری مین مصروف تھا تو شاہ بلبن سریر آرائے دہلی تھا۔ لکھا ہے کہ وسط ایشیا کے پندرہ شاہزادے اسوقت دہلی مین پناہ گزین تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بلبن کے دربار مین متعدد علما وفضلا جمع ہو گئے تھے۔

امیر خسرو امیر خسرو کی شیرین کلامی اسی کے عہد مین مقبول ہوئی۔ خسرو نے خالق باری لکھ کر صرف دو زبانون مین یکسانیت ہی نہین پیدا کی بلکہ دونو ہی قومون کے جذبات وخیالات کا آپس مین ایک رشتہ باندھا۔

سلطان علاءالدین خلجی سلطان علاءالدین خلجی کے بارہ مین صاحب فرشتہ کہتا ہے کہ اس بادشاہ نے بھی متعدد دارالعلوم قائم کیے۔ اور پینتالیس(۴۵) مشہور علما ان مین تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس زمانہ مین دلی مین ایسے ایسے اساتذہ موجود تھے جو اپنے علم وفن مین بخارا سمرقند بغداد قاہرہ دمشق اصفہان تبریز کے مشہور اساتذہ سے بڑھے ہوے تھے۔

ابن بطوطہ عربی مشہور سیاحون مین یہان پر صرف ایک سیاح کا نام آپ صاحبان کے روبرو پیش کرتا ہون۔ ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کے زمانہ مین افریقہ اور ایشیا کی سیاحی کرتا ہوا ہندوستان آیا تھا۔

فیروز شاہ تغلق فیروز شاہ تغلق شاہان ہند مین ایک مشہور بادشاہ گذرا ہے اسی نے شہنشاہ اشوک کے دو پرانے ستونون کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا جب راجہ ناگرکوٹ کو شکست دے کر اسکا ملک اُسے سپرد کیا تو راجہ کے کتبخانہ کی چند کتابون کا فارسی زبان مین ترجمہ کرایا اور ایک کتاب کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا۔ اس سلطان نے بھی متعدد دارالعلوم ہندوستان مین قائم کیے۔ چنانچہ اُن مین سے ایک فیروز آباد مین بنا تھا جسکی عمارت تمام مدارس ہند سے زیادہ خوبصورت وشاندار تھی۔

سکندر لودھی سکندر لودھی کے زمانہ مین ہندوؤن نے فارسی زبان کی تحصیل شروع کی اور اُردو زبان اُسی کے زمانہ سے شروع ہوئی حالانکہ اُسکی بنیاد محمود غزنوی کے عہد حکومت مین پڑ چکی تھی۔ اس زمانہ مین بھی شاہی اعانت وسرپرستی کی بدولت تراجم وتصانیف کا بازار خوب گرم رہا۔ ایک سنسکرت زبان کی کتاب اگر مہابیدک کا ترجمہ کر کے اس کا نام طب سکندری رکھا جس کو ہندوستان کے تمام اطبا نے مستند مانا۔

دکن شاہان دکن مین بہمنی وعادل شاہی بادشاہون کے بارے مین صرف یہ کہنا کافی ہو گا کہ ان مین سے اکثر وبیشتر بجائے خود علم دوست اور ہنر پرور تھے۔ یہی نہین بلکہ ان کے وزرا بھی انھین کی طرح فضل وکمال کے قدردان وماہر علوم وفنون تھے۔ ان بادشاہون نے دکن مین ہزارہا مدارس اور کتبخانے قائم کیے۔ یہی وہ سلاطین تھے جنکی علمی فیاضیون کی بدولت نہ صرف ہندوستان بلکہ ہر ملک ودیار کے علما مستفید ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ ہر سال غیر ممالک کو جہاز بھیج بھیج کر فارس وترکستان سے علما کو طلب کر کے اپنے دربار کی رونق بڑھاتے تھے حافظ شیرازی بھی ایک زمانہ مین یون ہی مدعو کیے گئے تھے۔

گجرات گجرات کے اسلامی بادشاہون نے علم کو بڑی وسعت اور ترقی دی انھون نے بھی عرب وفارس وترکستان سے علما کو طلب کر کے اپنے پایہ تخت مین جگہ دی۔

کشمیر کشمیر مین تو سلطان زین العابدین ہی کے عہد مین اکثر عربی وفارسی کتابون کا ترجمہ ہندی مین اور بہت سی ہندی کتابون کا ترجمہ فارسی مین ہو گیا تھا چنانچہ سب سے پہلے اُسی کے حکم سے مہابھارت اور راج ترنگنی کا ترجمہ فارسی مین ہوا۔

جونپور ابراہیم شرقی کے زمانے مین جونپور علما اور طلبہ کا مرکز بن گیا اور متعدد مدارس ودارالعلوم یہان بھی شاہی امداد سے قائم ہوئے۔

ملتان ملتان شاہان اسلام کے زمانے مین علمی نقطۂ نظر سے گجرات پر تفوق رکھتا تھا۔

بنگال خود بنگالی زبان مین شاہی حکم سے سنسکرت کتابون کے ترجمہ کیے جاتے تھے اور اُنھیں کی بدولت بنگالیون کو اُن کی مادری زبان مین رامائن مہابھارت اور بھاگوت پران میسر ہوئین۔ اس ذریعہ سے یہ زبان رفتہ رفتہ ایک علمی زبان بن گئی۔

یہ ذوق صرف شاہان بنگال تک محدود نہ تھا۔ چنانچہ اسد اللہ [illegible] بیر بھوم کی نسبت لکھا ہے کہ اُس نے اپنی آمدنی کا نصف حصہ اسی مذاق کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔

اسلامی دور مین فرزندان بنگال کو ملک الشعراء بننے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔

خاندان مغلیہ

یہ مشہور بات ہے کہ قیصر ہند اکبر اعظم کو ہندوؤن سے کس قدر اُنس تھا۔ اُسی کے زمانہ مین ہندوؤن کا ربط و ضبط دوستی کے درجے سے گذر کر قرابت و رشتہ داری کی حد تک پہنچ گیا تھا، اور ہندو مسلمانون کی تمدنی زندگی بالکل ایک ہو گئی تھی مسلمانون نے ہندوستان کو اپنا گھر سمجھ کر سنسکرت اور بھاشا مین نمایان ترقی کی۔ اکبر نے اپنے احکام سے بہت سی کتابون کے ترجمے کرائے۔ دیبی براہمن اور ملا عبد القادر بدایونی کی شرکت سے مہابھارت فارسی زبان مین ترجمہ ہو کر رزم نامہ کہلائی۔ اور انھین فضلا نے رامائن کا ترجمہ کیا۔ اتھروید کا ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے اور لیلاوتی کا ترجمہ فیضی نے کیا۔ نل دمن کو بھی مثنوی کا لباس اسی فاضل شاعر نے پہنایا۔ علاوہ ازین عہد اکبری مین بہت سی عربی اور فارسی کتابون کا سنسکرت زبان مین ترجمہ ہوا۔

شہنشاہ جہانگیر جہانگیر نے بھاشا کی اعلےٰ نظمون پر بیش قرار انعام دیکر شاعرون کے حوصلہ بلند کیے۔

صاحبقران شاہجہان شاہجہان کے عہد معدلت مین ہندوستان کی متحدہ ملکی زبان ترقی کر کے اردوے معلےٰ کے خطاب سے ممتاز ہوئی۔

مسلمان اور فنون لطیفہ

اسی ضمن مین اگر یہ بھی کہا جائے تو کچھ نامناسب نہ ہوگا کہ مسلمانون نے اپنی علمی ترقیون کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ مین بھی خاص دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ چنانچہ عہد شاہجہانی کی یادگار اُن کے کمال کا اعلیٰ ترین نمونہ تخت طاؤسی ایک ایسی چیز بنی جسکو دیکھکر تمام دنیا نے اظہار تعجب کیا۔

مسلمانون نے اپنے کمالات صناعی کے ایسے ایسے عدیم المثال نمونے چار دانگ عالم مین چھوڑے جو عجائبات روزگار کہے جاتے ہین۔ خود ہندوستان مین تاج محل جسکو یوروپین سیاحون نے "طلسم حیرت" کہا ہے آج تک ایک عالم کو محو حیرت بنا رہا ہے۔

اسی طرح نادر قلمی تصاویر اور قسم قسم کے اعلےٰ پارچہ جات و اسلحہ و نقش دار ظروف مین جو جو صناعی و دستکاری دکھائی گئی ہے اُنکے رہے سہے نمونے آج بھی ہندوستان اور یورپ کے عجائب خانون کی رونق دوبالا کر رہے ہین۔

شاہزادہ داراشکوہ داراشکوہ نے خود سنسکرت سے ہندوؤن کی مشہور و معروف کتاب بھاگوت گیتا اور جوگ بششٹ رامائن کا ترجمہ کیا۔ اُسی نے اپنشد کے ترجمہ کا نام سرّ الاکبر رکھا۔

شہنشاہ اورنگ زیب اورنگ زیب کے زمانہ مین بھاشا معراج کمال پر پہنچی۔ دہلی کے بعد زباندانی کی ٹکسال شاہان اودھ کی سرپرستی مین لکھنؤ منتقل ہوئی اور سلطنت لکھنؤ کی بساط اُلٹ جانے کے بعد اُردو کا ستارہ بنگال مین چمکا۔ روہیلکھنڈ مین رامپور نے گلشن سخن بننے کی قابلیت پیدا کی۔ وسط ہند مین بھوپال کو اُردوے معلےٰ کی مہمانی کا فخر حاصل ہوا۔ بالآخر حضرت داغ نے اُردو کے گہوارہ کو

دلّی سے لیجا کر شاہ دکن کی امانت مین سپرد کردیا۔

اس طور پر سلاطین اسلام کے آغوش مین ملک کی عام مشترکہ زبان نے تربیت و پرورش پائی اور قدیم ہندوستان کی ایک متحدہ یادگار بنی۔ یہ ہین وہ گرانبار احسانات جو اسلام کے ہندوستان پر ہین جن کو بعض لوگ تجاہل عارفانہ سے بھولے ہوے ہین اور افسوس ہے کہ مٹی ہوئی سلطنت کے ساتھ اس متحدہ یادگار کو بھی مٹانا چاہتے ہین۔

حضرات! جو کچھ آپ نے سنا بظاہر ایک فسانہ معلوم ہوتا ہے مگر یہ کوئی معمولی فسانہ نہین ایک قوم کا ایشیا مین ہندوؤن سے ربط و اتحاد اور یورپ مین مسیحیون اور یہودیون سے ۔۔ گون ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنا، خاص کر جب وہ قوم ایسی ہو کہ قیصر و کسریٰ کے بادشاہون کا سامان اس قوم کی شاہزادیون کے جہیز مین نکالا جائے اور پھر خوبی یہ کہ ملکی فتوحات سے زیادہ علمی فتوحات ہون جو قوم ایسے ایسے شہرون کی بنیاد ڈالے کہ صدیون تک یورپ اور ایشیا مین علوم و فنون و صنعت و حرفت و کمالات انسانی کے ماوا و ملجا بنے رہین جس قوم کے عدل و مساوات و سیاست و حوصلہ مندی کی یہ کیفیت ہو کہ وہ قوم نہ صرف اپنے صنف نازک کو مساوات کا درجہ دے بلکہ تمام امور معاشرت مین غیر اقوام کے حقوق کی بھی محافظ بنے جس کے قانون سلطنت کا یہ عالم ہو کہ زمانۂ حال کا قانون اور ضابطہ اُسکا خوشہ چین ہو جس کی تجارتی کوششین اُسکی علمی کوششون سے کم نہون اور پھر لطف یہ کہ نہ اُس قوم کی بنیاد تجارت پر رکھی جائے، نہ اُسکی تجارتی کوششین اُسکے علمی مشاغل پر غالب ہونے پائین، جس کی ترقی علم و ادب کا یہ حال ہو کہ ایک طرف مغرب مین یورپین لٹریچر اُسکی زبان سے مستفید ہو تو دوسری طرف ایک ملک کی مردہ شاعری مین روح پھونکے اور دوسرے ملک مین نہ صرف مقامی زبانون کو فروغ دے بلکہ اپنے اتحاد و ایثار کی مثال مین وہان کی زبان کو ترقی دے کر ایک نئی اور دلکش زبان بنا ڈالے، جسکے علمی علوم مین یہ خوبی ہو کہ جب سائنس کے خزانون پر وہ دسترس پائے تو بشریت کی انتہائی سرحد یہ قرار دے کہ وہ صفات ملکوتی حاصل کرے نہ یہ کہ الحادی و مادّی خیالات کا قوم پر اثر ڈالے جس قوم کے فلسفۂ تصوف کا یہ کمال ہو کہ ایک جانب لاطینی مسیحیت اور موسویت اور دوسری جانب ہندوؤن کی ویدانت سے شیر و شکر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اُسکے فنون لطیفہ کے بچے کھچے نمونے آج بھی عجائب خانون کی رونق بڑھائین، تو یہ ایسے واقعات نہین ہین جن پر ایک مبصر تنقیدی نظر ڈالے اور اُسکے وسیع الکیفیت نتائج کو حیرت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔

حضرات! مین اگر اس مہتم بالشان علمی تحریک کے جزئیات سے بحث کرون تو میری تقریر بہت طویل ہوجائے گی لہذا مین صرف اس اجمال پر اکتفا کرتا ہون کہ ہر ملک مین اُسکی خصوصیت کے لحاظ سے مسلمانون نے علمی ترقی کے اسباب فراہم کیے۔ ایران مین علاوہ منقولات کے معقولات کو بھی ترقی دی۔ مصر و شام مین فقہ حدیث اسماء الرجال کو فروغ ہوا۔ اسپین مین ادب و شاعری اور تاریخ کا فن کمال کو پہنچ گیا۔ ہندوستان مین الٰہی فلسفہ و طب کو فروغ ہوا۔ بالفاظ دیگر مسلمانون نے ۷۰۰ برس تک تمام اقطاع عالم مین علم کا چراغ روشن رکھا اور عہد قدیم سے علوم و فنون کو لے کر اُن مین قابل قدر اضافہ کرکے بحفاظت تمام عہد جدید کے سپرد کیا جس سے غیر اقوام کی موجودہ تہذیب کی بنا ڈالنے مین معقول مدد ملی۔ صاحبو! جبتک علم و انصاف دنیا مین قائم ہے مشرق و مغرب تمدن عرب کے اُن گران قدر اور ناقابل فراموش احسانات سے کبھی سبکدوش نہین ہوسکتا۔

اس بیان سے آپ لوگون نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ دنیا کی علمی ترقی مسلمانون کی تصانیف وتراجم کی کس درجہ ممنون احسان ہے اور ان تراجم کی بدولت خود مسلمانون کی علم زباندانی مین کس قدر وسعت ہوئی۔ حضرات! موجودہ حالت کو پیش نظر رکھتے ہوے ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ نہایت حریص اور طامع بن کر ان اقوام کے جنھون نے دیکھتے دیکھتے اپنی زبان کو علمی زبان کی حد تک پہنچا دیا ہے غیر زبانون سے مصالح اکٹھا کرکے اپنی زبان کی ترقی مین صرف کیا جائے اور جہان تک جلد ممکن ہو موجودہ ضرورت کے مطابق بنائی جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر سلسلۂ تراجم جاری رکھا گیا تو کچھ ہی دنون مین اُردو زبان بھی دنیا کی وسیع زبانون مین شمار کی جائے گی مین صرف تراجم ہی پر زور نہ دونگا بلکہ اس پیاری زبان کی حمایت مین آپ حضرات سے یہ بھی عرض کرون گا کہ اُردو زبان جبلی طور سے دنیا کی عالمگیر زبانون مین ایک ممتاز زبان بننے کی قابلیت رکھتی ہے اور اگر آپ صاحبان ہمت کرین تو آج بھی اُسکے قالب مین تازہ روح پھونکی جاسکتی ہے۔

حضرات! ہر قوم اپنا ایک مخصوص ماضی رکھتی ہے ایک مخصوص تاریخ ایک مخصوص روایات قومی کا ذخیرہ رکھتی ہے اور مخصوص حالات اور تجربات کی بنا پر اپنے ارتقا کے موجودہ منزل پر پہنچتی ہے اور ہر ملک کا ایک اصلی اور صحیح کیریکٹر ہوا کرتا ہے جس کا خاص تعلق اُس ملک کی زبان سے ہوتا ہے اور جس کا ضائع ہوجانا گویا قوم کا فنا ہونا ہے یاد رکھیے! اُردو زبان ہرگز احسان فراموش نہین ہے۔ آپکی خدمات کے صلہ مین یہ پیاری زبان نہ صرف آپ کے اصلی اور صحیح کیریکٹر کو برقرار رکھے گی بلکہ آپ کو اتحادی ترقی کے اُس انتہائی زینہ پر پہنچائے گی جو آپ کے گذشتہ اور موجودہ لیڈران قوم اور محبان وطن کا نصب العین رہا ہے۔ اور ہے۔ فقط

بی۔ گھوشال

ہندوستان کے قدیم مذاہب

(پروفیسر رومیش چندر دت۔ سی۔ آئی۔ ای آنجہانی کے ایک مضمون کا ترجمہ)

ہندوؤن کے مذہبی اعمال و رسوم، اُن کا قدیم اور سخت نظامِ ذات، اُن کے عجیب و غریب تیوہار، اُن کے شاندار مندر و متبرک مقامات اور اُن کے سالانہ تیرتھ جاترا، اُن کے متعلق اور اُن کی عورات کے اُن خانوشانہ وصابرانہ مذہبی اشغال، اور اُن کے مردون کے اُن خود اختیار کردہ روزون اور کفارون کی نسبت، تنافوقتاً بہت کچھ لکھا گیا ہی جو یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے رسوم و اعمال کی یاد دلاتے ہین۔ مگر ہندو مذہب کے اُن عام پسند و دلچسپ تذکرون مین ہکو فلسفہ کی وہ تہ نہین ملتی ہی جو ہندوستان سے بڑے بر اعظم کے باشندون کو ایک دوسرے سے متعلق اور متحد کیے ہوے ہی جسکی وجہ سے وہ لوگ ہزارہا سال تک یونانیون پارسیون مسلمانون اور مسیحون کے خارجی اثر کا مقابلہ کر سکے۔ اصل حقیقت یہ ہی کہ صرف ہندوستان ہی مین ہم کو زمانۂ سلف کے عقائد و رسوم و اعمال کا سراغ ملتا ہی جنکا سلسلہ ابھی تک جاری ہی اور جن کی نسبت کہنا چاہیے کہ وہ ابھی تک نہ مرے ہین مصر اور بابل کے پرانے عقائد تقویم پارینہ ہو گئے ہین یونان اور روم (اطالیہ) کا قدیم مذہب اب صرف نظم و دستکاری مین رہ گیا۔ قدیم میڈیا اور فارس والون کے عقائد پارسیون کی ایک جماعت مین باقی ہین (جو آجکل ہندوستان مین بستے ہین) چین مین کنفیوشش کے مذہبی اصولون کو بودھ مذہب نے تبدیل کر دیا۔ ہندوؤن ہی مین صرف زمانۂ گزشتہ و زمانۂ حال کے مابین ایک سلسلہ قائم ہی اور گو مذہبی عبادات کے طرق و دستورات مین ایک تغیر عظیم ہو گیا ہی مگر ہندو مذہب کے اصول و اندرونی خیالات آج بھی مروج ہین جو کسی زمانہ مین اُپنشدون اور ویدون مین تھے وہ ہزارہا برس سے مثل ایک ایسے چشمہ کے رواں ہین جو قرب و جوار کی زمین کو تر و تازہ کر کے اسکو لہلہاتے سبزہ زار سے ڈھنک دیتا ہی جس سے اُس مین ایک قسم کی جان پڑ جاتی ہی۔ نظر برآن ایک طالب العلم کو لازم ہی کہ وہ زمانۂ حال کے ہندو مذہب پر نظر غائر ڈالے تاکہ اُسکو اُن اندرونی خیالات کی جھلک معلوم ہو جس سے وہ (ہندو مذہب) آریہ تہذیب کے زمانہ کے ابتدائی رسوم و اعمال سے وابستہ ہی۔ ہندوستان مین عبادت اور پرستش کا ابتدائی طریقہ قدرت کی پرستش کا تھا۔ قدرتی طاقتون (شکتیون) کو قربانیان چڑھائی جاتی تھین، اور انھین کی عبادت کی جاتی تھی۔ آریون کے زمانے کی سب سے قدیم مذہبی کتاب رگ وید ہی اُس مین ایک ہزار اٹھائیس زمزمے ہین جو چار ہزار سال اُدھر ہندو پجاری اپنی عبادتون کے موقع پر گاتے تھے۔ اکاش یعنی خدا کئی نامون سے پکارا جاتا تھا۔ دیو (یعنی روشن آسمان) اندر (مینھ برسانے والا) ورن (آسمان یا اکاش) اندر جنگ کا دیوتا تھا اُس نے آریہ ہندوؤن کو اُن لڑائیون مین مدد دی تھی جو اُن کو سیاہ فام اصلی باشندون سے لڑنا پڑی تھین۔ اُس نے بنی آدم کو ابرِ رحمت پہنچانے کے لیے رعد و برق کے ذریعہ سے بادلون (ورن یا دلو) کو پھاڑا تھا۔

"ہم اُن بہادرانہ کارنامون کا راگ گاتے ہین جو اندر نے سرانجام کیے تھے۔ اُس نے راہ (ایک راکشش کا نام) کو مارا اور زمین پر بارانِ رحمت نازل کیا اور پہاڑی چشمون کے بہنے کے واسطے راستہ بنایا۔ اندر نے راہ کو جو پہاڑون پر تھا قتل کیا تو شتری نے اُسکے واسطے رعد و برق بنائے تھے پانی سمندر کی جانب اسطرح بھاگا جیسے گائین اپنے بچھڑون کے پاس بھاگتی ہین" رگ وید ۱۔۲۔۳۲۔۱۔۲۰۔

زیادہ تر موثر اور زیادہ عالی خیال مناجات وہ ہی جو ایک گنہگار ورن سے کرتا ہی جو ہر چیز کو دیکھتا ہی اور جو گنہگارون کو زنجیرون سے باندھتا ہی اور وہ اُن پر رحم کر کے اُن کو چھوڑ سکتا ہی۔

"سنے ورن! ہم کو اُن گناہوں سے نجات دے جو ہمارے بزرگوں نے کیے ہیں۔ ہمارے وہ گناہ معاف کر جو ہم نے خود کیے ہیں جیسے ایک بچھڑے کو رسی سے اور ایک چور کو قید سے چھوڑ دیا جاتا ہے اسی طرح مجھکو بھی گناہوں سے نجات دے"

"اے ورن! ہم نے اپنی خوشی سے گناہ نہیں کیے ہیں بلکہ غلطی یا شراب یا قمار بازی یا غصے نے ہم کو گمراہ کیا تھا۔ بڑے چھوٹوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اور نیند بھی گناہ کا راستہ بتاتی ہے" رگ وید ۷-۸۶-۵-۶

اسی طرح آفتاب کے بھی کئی نام تھے۔ ساوتری یا سورج یا آدتیہ مختلف مہینوں کے سورج کا نام آگ تھا۔ یہ کل دیوتاؤں کا منھ خیال کی جاتی تھی اور آگ پر جو سوم لتا چڑھایا جاتا تھا اُسکی بھی پرستش کی جاتی تھی۔ ماروت طوفان باد کا نام تھا جو اندر کو بادلوں میں سے پانی نکالنے میں مدد دیتا تھا اور اوشا طلوع آفتاب کی پیاری دیوی ہے جو عام مخلوق کو خواب سے بیدار کرتی ہے۔ اور اُن کی پرورش کرتی ہے اور اُن کو اپنے اپنے کاموں میں بھیجتی ہے۔

"اے آسمان کی خوبصورت لڑکی (اوشا) اپنی شعاع زرنگار کو بلندی پر رکھ ہمکو دولت و ثروت دے اور ہم کو روز روشن عطا کر ہمارے لیے کھانا لا صبح کی کرنیں بھیج اور صبح کی سفید پوش دیوی ہمارے واسطے روشنی لا اور شب کی گہری تاریکی کو دور کر۔ ہمارے بزرگوں نے تیرے جلال کا خیر مقدم کیا ہے اور اے تاباک دیوی ہم بھی تیرا خیر مقدم کرتے ہیں کیونکہ تو اپنا رتھ آسمان پر اُسی طرح لیجاتی ہے جسطرح جہاز پانی میں تیرتا ہوا چلتا ہے اے دیوی اپنے چمکتے ہوے رتھ میں آ اور اپنی فرح بخش روشنی کو دور سے لا اور شل ایک رقیق القلب عورت کے ہماری پرورش کر کیونکہ اب رات چلی گئی ہے جانوروں اور مویشیوں کو ایک اور روز روشن بخش تاکہ وہ خوشی سے بسر کریں۔ عام مخلوقات کو اپنے اپنے کاموں میں لگا اور طیور کو نغمہ سنجی کرنے دے" رگ وید ۱-۴۸-۱-۳-۵ وغیرہ۔

زمانۂ سلف میں قدرت کی طاقتوں کی مناجات کا یہ سادہ اور پرستش کا یہ عام پسند طریقہ تھا لیکن گو بجاری مختلف دیوتاؤں کو مختلف ناموں سے پکارتے تھے مگر ساتھ ہی اسکے وہ اس امر کو نہیں بھولے تھے کہ یہ سب دیوتا ایک وجود مطلق کے مظہر ہیں جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور جو سب کا خالق حقیقی ہے

"خالق مطلق سب سے بڑا ہے وہ سب کو پیدا کرتا ہے اور سب کو قائم رکھتا ہے وہ سب پر قادر ہے مبارک لوگوں کی آرزوئیں آسمان میں پوری ہوتی ہیں جہاں وحدہٗ لاشریک رہتا ہے اور جو ستارہ خرس اکبر کے پرے ہے"

"ہمارا باپ وہ ہے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے جو کل مخلوق و اشیا کو جانتا ہے وہ ایک ہے گو اُسکے نام بہت ہیں اور لوگ اُسکے جاننے کی خواہش کرتے ہیں" رگ وید ۱۰-۸۲-۲-۳ وغیرہ۔

ہندوستان میں وید مذہب کا اندرونی خیال اور اصلی فلسفہ یہ تھا اور گو ہم عام طور سے اس مذہب کی نسبت کہ سکتے ہیں کہ وہ قدرت کی مختلف قوتوں کے مختلف ناموں سے پرستش اور عبادت کی تعلیم کرتا تھا مگر ساتھ ہی اسکے ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُس زمانہ میں بھی ہندو لوگ قدرت کے ظاہری مشاہدات اور مظاہر میں گھس کر اس ایک طاقت (قادر مطلق) کے خیال کو پہنچ گئے تھے جس کی نسبت زمانہ حال کی سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ وہی تمام عالم کو حرکت دینے والی اور اُسکو قائم رکھنے والی ہے۔

اسی وحدانیت کے اصول کو جو تبدیل پذیر مشاہدات قدرت میں مخفی ہے اپنشدون میں جاکر پوری نشو و نما حاصل ہوئی جو وید کی تعلیم کا آخری نتیجہ ہیں وہ ایک حاضر و ناظر روح مطلق ہے جو اپنے آپ کو تمام عالم میں ظاہر کرتی ہے۔ جسمیں تمام عالم شامل ہے اور جسمیں انجام کار تمام عالم غرق ہو جائے گا۔

وہ عقل جس کا جسم روح ہے جس کی شکل روشنی ہے جس کی ماہیت

آکاش (یہ پانچوان عنصر ہی جو ہوا سے بھی زیادہ لطیف ہی) کے مانند ہی جہان سے کل کام کل خواہشین کل خوشبوئین اور ذائقے پیدا ہوتے ہین وہ جس مین یہ سب شامل ہی اور جو نہ کبھی بولتا ہی اور نہ کبھی متحیر ہوتا ہی۔

"وہ دل کے اندر روح ہی جو چاول کے دانے سے بھی چھوٹی ہی۔ جو جو کے دانے سے بھی چھوٹی ہی اور جو دانے کے مغز سے بھی چھوٹی ہی وہ میرے دل مین بھی ہی اور وہ زمین سے بڑی ہی آسمان سے بڑی ہے اور تمام دنیا سے بڑی ہی"

"وہ جس سے تمام کام۔ تمام خواہشین۔ تمام خوشبوئین اور ذائقے پیدا ہوتے ہین۔ وہ جس مین یہ سب شامل ہین وہ جو کبھی نہین بولتا ہی اور کبھی نہین متحیر ہوتا ہی وہ میری روح میرے دل مین ہی جسکا نام برہما ہی۔ جب مین یہان سے کوچ کرون گا تو مجھکو وہ حاصل ہوگا۔ (چھندوگ اُپنشد ۳-۱۴)

اور جب پُرانے زمانون کے غیر معین تصورات و تخیلات سے نکلکر سن عیسوی سے کئی صدی قبل ہندو فلسفہ کو پوری نشو و نما حاصل ہوئی اُس وقت ویدانت کے فلاسفی نے اِس اصول اعظم کو اختیار کیا جو کئی صدی قبل سے چلا آتا تھا اور اس کو مابعد کے ہندو خیالات کا ایک دائمی اصول قائم کیا۔

سمندر ایک ہی وہ اپنے پانی سے مختلف نہین ہی گر لہرین جھاگ قطرے اور اسکے دیگر حصص ایک دوسرے سے مختلف ہین۔ اسی طرح پر کل مخلوق ایک دوسرے سے مختلف ہی گر ان سب کی وجہ تخلیل علت العلل ہی۔ برہم سوتر ۲-۱-۵

"جو شکل آفتاب کے درحقیقت ایک ہی مگر عکس سے بظاہر معلوم ہوتا ہی کہ کئی ہین اور جو شکل سطح کے درحقیقت حصون مین تقسیم نہین ہی حالانکہ ظاہر مین ایسا ہی معلوم ہوتا ہی نور مطلق ایک کامل نور ہی جو منتشر و منقسم نہین ہو سکتا۔ برہم سوتر ۳-۲-۵

مگر اس سے یہ نہین خیال کرنا چاہیے کہ اِس حکیمانہ اصول میں عوام کے عقائد شامل ہین بخلاف اسکے قدرت کی طاقتون کو جنکے مختلف نامون سے بحیثیت مختلف دیوتاؤن کی پرستش کی جاتی تھی قربانی چڑھانے کا پُرانا دستور وید کے زمانے سے (جو حضرت عیسیٰ کے زمانے سے دو ہزار برس قبل تھا) اُن صدیون تک جاری رہا جو سن عیسوی کے ما قبل گزری تھین۔ اسمین شک نہین کہ جو جو صدیان گزرتی گئین یہ قربانیان زیادہ مستحکم اور نمائشی ہوتی گئین اور چونکہ پُجاریون نے اپنی ایک علیحدہ اور موروثی قوم قائم کی لہذا انھون نے بہت سے رسوم اور قواعد بنائے اور اُس زمانہ کی مذہبی کتابون مین زیادہ تر قربانی کے تفصیلی حالات لکھے ہوے ہین۔ ابتدائی وید کے زمانے کے سادہ عقائد کسی قدر ظاہری اور نمائشی رسوم مین تبدیل ہو گئے اور یہ کل متبرک رسوم آریہ ہندوون پر محدود تھے۔ لاکھون غیر آریہ لوگ جنھون نے اپنے آریہ معلمون اور فرمانرواؤن کی تہذیب۔ زبان اور نیز مذہبی عقائد کو اختیار کر لیا تھا متعصبانہ خیال سے وید کے رسوم اور متبرک قواعد مین شریک نہین کئے جاتے تھے۔ اسی طرح قلیل التعداد آریہ ہندوؤن اور کثیر التعداد غیر آریون مین جنھون نے اول الذکر کے طریق اختیار کئے تھے ایک عظیم اور قابل افسوس فرق پیدا ہو گیا اور امتداد زمانہ کے ساتھ وہ مستحکم ہوتا گیا۔ ایک طرف تو آریہ جماعتین اس غرور اور تفریق کی وجہ سے جو زمانۂ سلف اور زمانۂ حال کی مہذب فاتح نسلون مین ہوتا ہی اپنے استحقاق کو غیر آریون کے خلاف محفوظ کرتی تھین دوسری جانب غیر آریہ نسلون نے آریہ تہذیب اور رسم و رواج کا جامہ پہن لیا اور گدھ اور دوسرے صوبجات مین ملکی طاقت حاصل کرکے چاہا کہ وہ بھی اس دلفریب حلقہ (آریون کا حلقہ) مین شامل کئے جائین اِس مشکل کو حل کرنے کی ضرورت ہوئی۔ زمانے کو ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوئی جو حالت معاملات کو ہموار کرے اور اس کام کے واسطے ایک شخص پیدا ہوا جسکا

نام گوتم بودھ تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کے چھ صدی قبل ہندوستان مین بودھ مذہب نے عروج حاصل کیا۔ گوتم بودھ اپنے آپکو کسی جدید مذہب کا بانی نہین خیال کرتا تھا۔ بلکہ اس کا قول تھا کہ وہ اصل ہندو مذہب تلقین کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا ریفارمر تھا جو اپنے اصلاح کردہ مذہب کے دائرہ مین ہر قوم اور ہر نسل کے لوگون کو بخوشی داخل کر لیتا تھا۔ اُس کا مذہب اسقدر تزکیۂ النفس اور صفائے باطن اور تقدس کی تعلیم کرتا ہے جو اگر اُس جنم مین نہ حاصل ہو تو آئندہ جنمون مین حاصل ہو جائے گا۔ دیوتا انسان۔ اور عام مخلوق تقدس کے درجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہین اور اسکے حاصل کرنے کے واسطے بار بار جنم لیتے ہین۔ اِس جنم کا ہر کرم یا فعل دوسرے جنم مین اپنے اصلی نتیجہ کو دکھاتا ہے اور جب بالآخر متواتر تزکیۂ النفس سے وہ تعلق جو ہمکو زندگی کے ساتھ وابستہ کیے ہوے ہے منقطع ہو جاتا ہے تو ہم اُس مبارک حالت تقدس یا اُس نروان کو جو بودھ کی جنت ہے حاصل کر لیتے ہین۔ یہ تمام اصول پُرانے ہندو اُپنشدون سے لیے گئے ہین مگر گوتم بودھ نے اپنے اصول کی تلقین ہر شخص اور ہر قوم کو کی اور اسطرح اُس نے ایک ایسے عالمگیر مذہب کی اشاعت کی جس نے بالآخر سیلون سے لیکر سیبریا تک اور کشمیر سے لیکر چین و جاپان تک ایشیا کی اقوام کو اپنی آغوش مین لے لیا۔

اِس تزکیۂ النفس اور حصول نجات کے مذہب مین خاصکر اخلاقی مواعظ و نصائح بکثرت پائے جاتے ہین اور بلحاظ اخلاقی رفعت و عظمت بودھ سے کوئی فوق نہین لے گیا ہے ہم ذیل مین پند و نصائح کا اقتباس کرتے ہین۔

"۵۰۔ نفرت نفرت سے کبھی نہین دور ہو سکتی۔ نفرت محبت سے دور ہوتی ہے اس کی یہی خاصیت ہے۔"

"۵۱۔ ایک شخص کی عمدہ نصیحت جسپر وہ عمل نہین کرتا ہے ویسی ہی ہے جیسے ایک خوشنما اور خوشرنگ پھول ہے مگر اُس مین خوشبو نہین ہے۔"

"۱۲۹۔ سب لوگ سزا کے نام سے کانپتے ہین سب لوگ موت کے نام سے ڈرتے ہین۔ یاد رکھو کہ تم بھی اُنھین کی طرح ہو پس نہ کسی کو قتل کرو اور نہ کسی کو ایسا کرنے کی ترغیب دو۔"

"۱۳۰۔ سب لوگ سزا کے نام سے کانپتے ہین۔ سب لوگ جان کو عزیز رکھتے ہین۔ یاد رکھو تم بھی انھین کی طرح ہو۔ نہ کسی کو ہلاک کرو اور نہ کسی کو ایسا کرنے کی ترغیب دو۔"

"۱۸۳۔ رشیون اور منیون کی ہدایت ہے کہ گناہ نہ کرو۔ نیکی کرو اور اپنے باطن کو صاف رکھو۔"

"۱۹۷۔ ہم لوگون کو خوشی سے زندگی بسر کرنا چاہیئے جو لوگ ہم سے نفرت کرتے ہین اُن مین ہم کو اسطرح رہنا چاہیئے کہ نفرت ہمارے پاس سے چھو نجائے۔"

"۲۲۳۔ غصہ کو نرمی سے فرو کرنا چاہیئے طامع کو فیاضی سے اور جھوٹے کو سچائی سے فتح کرنا چاہیئے۔"

"۲۵۲۔ دوسرون کی بُرائی تو بہت آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے۔ مگر اپنی بُرائی معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر شخص اپنے ہمسائے کی ذرا ذرا سی بُرائیون کو اُچھالتا ہے مگر اپنی بُرائیون کو اسطرح چھپاتا ہے جسطرح فریبی غلط پانسے کو قمار باز سے پوشیدہ کرتا ہے۔"

"۲۶۰۔ بال سفید ہونے سے انسان بزرگ نہین ہوتا ہے گو اُسکی عمر پوری ہو گئی ہو مگر اُس کو کُہن سال کہنا بیکار ہے۔"

"۲۶۱۔ بزرگ وہ شخص ہے جس مین عقل۔ راستی۔ محبت ضبط اور اعتدال ہو اور جو بُرائیون سے پاک ہو۔"

"۳۹۳۔ کوئی شخص نسب یا خاندان کی وجہ سے برہمن نہین کہا جا سکتا ہے وہی شخص مبارک ہے اور وہی برہمن ہے جس مین سچائی اور راستبازی ہو۔"

۳۹۴۔ اے نادان چکنے بالون یا بکری کی کھال کی پوشاک سے کیا فائدہ؟ تیرا باطن تو خراب ہے اور ظاہری صورت کو صاف بناتا ہے۔ (دھمپد)

اس قسم کے مقولون کی جانب بہت سی اقوام اور انسانوں کے خیالات رجوع ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت سے کئی صدی پہلے بودھ مذہب کے واعظ اور رہبان دور دراز ممالک فلسطین، مصر، یونان تک گئے اور وہان کے لوگون نے اُن کی تعلیمات اور نصیحتون کو بغور سنا اور حضرت مسیح نے پھر ایک مرتبہ اُسی تحمل، سخاوت، عفو اور محبت کے مذہب کی اشاعت کی جسکی اشاعت پانچ سو سال قبل گوتم بودھ نے کی تھی۔ ہندوستان مین آریہ ہنود کا قدیم اور علیحدہ مذہب گوتم کے اصلاح کردہ اور عام مذہب کے ساتھ ہزار سال تک قائم رہا۔ برہمن اور آریہ قومین اپنے قدیم استحقاق پر قائم رہین مگر ہیچ اقوام کے لاکھون اشخاص اُس دروازے مین داخل ہوئے جو اس وسیع ضمیر ریفارمر نے کھولا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے قبل تیسری صدی سے لیکر اُنکے بعد ساتوین صدی تک ہندوستان کے ہر شہر مین ہندوؤن کے متبرک مقامات اور بودھون کی خانقاہین تھین۔ ایک ہی گانون مین ہندو اپنی قربانی کرتے تھے اور بودھ اپنے رسوم و اعمال ادا کرتے تھے۔ ہندو اور بودھ صدیون تک ایک مقام مین امن و امان اور میل جول کے ساتھ رہے۔ ہندوؤن کی بے تعصبی کی ایک قابل غور مثال یہ ہے کہ ہزار سال کے اندر باستثنائے اس امر کے کہ کسی جنگ آزما یا حملہ آور نے اپنی فتوحات مین ظلم کے کام کیے ہون ہمکو مذہبی ایذا رسانی کی کوئی مثال نہین ملتی ہے۔ فرقون کے عقائد اور مذاہب علیحدہ علیحدہ تھے مگر وہ باہم بڑی امن و امان اور میل جول سے رہتے تھے۔

عام طور سے یقین کیا جاتا ہے کہ اب بودھ مذہب ہندوستان سے مفقود ہو گیا ہے کیونکہ اُس کو ہندو مذہب کی مستحکم عمارت کے مسمار کرنے مین ناکامی ہوئی مگر قضیہ بالعکس ہے۔ ہان بودھ مذہب ہندوستان سے مفقود ہو گیا کیونکہ وہ اپنا کام انجام دے چکا تھا۔ ہندو متحد ہو گئے۔ ہندو مذہب نے رسوم و اعمال کو قبول اور اختیار کر لیا ہے۔ اب آریہ اور غیر آریہ کا کوئی فرق باقی نہین رہا۔ پنجاب سے لیکر تراونکور تک (گو وہ بلحاظ پیشون کے مختلف ذاتون مین منقسم ہین) تمام ہندو ایک ہی مذہب کے پیرو ہین اور ایک ہی قسم کے رسوم و اعمال ادا کرتے ہین۔ ویدک زمانے کی قربانیان جن سے غیر آریہ بوجہ تعصب خارج کیے گئے تھے اس علیحدگی کی وجہ سے یا تو بالکل معدوم ہو گئین یا اب وہ صرف شادی یا غمی کے رسوم مین مستعمل ہین جنکو ہر ہندو ادا کر سکتا ہے۔ بودھ مذہب کے رسوم و جاترون کی تقلید کی گئی اور اُن سے زمانۂ حال کے ہندو مذہب کے رسوم و اعمال مستعار لیے گئے اور خود گوتم بودھ زمانۂ حال کے ہندو اوتارون کے طبقے مین داخل ہوے۔ ہندوستان مین بودھ مذہب کی تاریخ کو سمجھنے کے واسطے اُن امور کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ بودھ مذہب ہندوستان سے چلا گیا کیونکہ وہ اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ زمانۂ حال کے ہندو مذہب نے قدیم قربانیون اور آریون کے خاص اعمال و عبادات سے احتراز کیا ہے اور اُس نے آریون اور غیر آریون کو بھی متحد و متفق کر لیا ہے۔ ہندوستان مین گوتم بودھ کی کوشش کے یہ نتائج ہین۔

اس طرح حضرت عیسیٰ کے بعد چھٹی و ساتوین صدی مین ہندوستان مین ہندو مذہب اس جدید طریقے سے شروع ہوا۔ اسکے خاص خاص اصول وہی ہین جو اُپنشدون مین بیان ہوئے ہین۔ وہ ایک وجود مطلق کو مانتا ہے جو حاضر و ناظر ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ کائنات وجود مطلق سے پیدا ہوئی ہے اور بالآخر اُسی مین فنا ہو جائے گی۔ اُس کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اس جنم کے افعال کی سزا و جزا آئندہ جنم مین ملیگی اور نیز یہ کہ کل روحین بالآخر وجود مطلق مین جذب ہو جائین گی۔ اس عقائد کے لحاظ سے آج کا مذہب وہی ہے جو دو تین ہزار سال قبل تھا لیکن بلحاظ رسوم و اعمال و عام عقائد کے زمانۂ حال کا ہندو مذہب ویدک زمانے کے مذہب سے نہایت مختلف ہے۔ ویدک کے

زمانے کے مذہب مین قدرت کی طاقتون کی پرستش پر زور دیا گیا ہی زمانۂ حال کے ہندو مذہب مین قادر مطلق کی تین قدرتون کی تلقین کی گئی ہی جو تثلیث اہل ہنود کے نام سے مشہور ہین۔ اِن قدرتون کے نام برھما، بشن اور مہیش ہین۔ ویدکے بھجنون مین قدرت کے دیوتاؤن کے کامون کی تعریف ہی۔ زمانۂ حال کے ہندو مذہب مین اِن دیوتاؤن کے متعلق کثیر التعداد افسانے و قصے گڑھے گئے ہین۔ وید مذہب کی پرستش کا طریقہ یہ تھا کہ آگ کو قربانی چڑھائی جائے۔ زمانۂ حال کا ہندو مذہب بت پرستی کی تلقین کرتا ہی اور وہ فرحت بخش رسوم و اعمال اور یاترہ گاہون مین جانے سے خوش ہوتا ہی۔

ہنود اور مختلف فرقون کے مذہبی رسوم و اعمال کے بارے مین بہت کچھ لکھا گیا ہی جو ہندوستان مین ایک ہزار برس سے جاری ہین۔ مگر ان عام پسند بیانات مین ہم کو بہر وہ اصل چیز نہین ملتی ہی جو دسو ملین لوگون کو متحد کیے ہوے ہی یعنی ہم کو اِس مذہب کا اصلی جزو نہین معلوم ہوتا جو ابتک آجکل کے ہندوؤن کے دلون مین جاگزین ہی اور جو اُن کو ایک زندہ قوم بنائے ہوے ہی۔ یہ سچ ہی ہندوستان کے باشندے شیوی اور وشنوی فرقون مین منقسم ہو گئے مگر ان مختلف فرقون مین محض نام کی بابت جھگڑا ہی جیسا کہ یورپ مین قرون وسطی مین ہوتا تھا ہر فرقہ اپنے معبود کے نام سے وجود اعظم کی (شخصی خدا) پرستش کرتا ہی جو اپنے مخلوق کی ضروریات رفع کرتا ہی پیروانِ بشن کا اعتقاد ہی کہ خالق حقیقی نے انسان کی نجات اور راستی کے غالب کرنے کے واسطے اس زمین پر رام، کرشن یا بودھ کی شکل مین جنم لیا اور اِس طرح عبد اور معبود کے تعلقات مین قربت ہوئی اور وید کے زمانے کی طرح وہ معبود کو ایک ذاتی، فیاض اور معاون دوست کی طرح خطاب کرنے لگا۔ کیونکہ عام لوگون کو ایک ایسے معبود کی ضرورت تھی جو بہ نسبت اُپنشدون کی روح مطلق کے زیادہ تر نزدیک ہو جسکا تصور صاف ہو سکے اور اِس ضرورت کو کرشن نے رفع کیا جس کو بودھ نے صدیون تک رفع کیا تھا کرشن کے افسانون نے بودھ کی پیدائش قصون اور کہانیون کو مٹا دیا اور بجاے بودھون کے متبرک مقامات کے متھرا۔ بندرابن۔ اور جگناتھ کی جاترا مین قائم ہوئین اور بودھون کی خلوت گزین زندگی کے بجاے اِس قسم کی زندگی کا طریقہ شنو یا کرشن کے مقلدین مین قائم ہوا ہندوؤن کا مذہبی حس کئی صدیون سے ایک سادہ اور عام پسند طریقہ وحدانیت کی جانب کوشش کر رہا ہی۔ اور تنازعات فرقی اور کثیر التعداد بتون کی پرستش کے باوجود لاکھون ہندو پوشیدہ وحدانیت کے طریقۂ پرستش پر قائم رہے ہین یہ ایک ذاتی فیاض اور معاون معبود کا عقیدہ ہی جسکو معمولی پجاری شیو یا بشن کے نام سے پکارتا ہی۔

زمانۂ حال کے ہندو ریفارمرون کے جلیل القدر طبقہ مین اول شخص رامانج تھا۔ وہ گیارھوین صدی مین جنوبی ہندوستان مین پیدا ہوا اُس نے تلقین کی کہ خدا ایک ہی اُس کا نام بشن ہی اُس نے یہ بھی تعلیم کی کہ نجات کا ذریعہ عشق الٰہی ہی فرقون کی مخالفت کی وجہ سے اس کو وطن سے بھاگنا پڑا اور مثل دیگر نبیون کے اُس کی بھی عزت وطن کے باہر ہوئی میسور مین اُس نے بادشاہ اور رعایا کو اپنا پیرو بنا لیا اور مرنے سے پہلے عقیدۂ بشن کے طریقے مین سات سو خانقاہین قائم کین۔

سلسلۂ ریفارمران مین رامانج کے بعد پانچوان نمبر رامانند کا ہی جس نے وحدانیت کے سادہ طریقہ کو شمالی ہند مین پھیلایا اُس نے بنارس کو اپنا صدر مقام قرار دیا تھا مگر وہ اِس مذہب کی تلقین کے واسطے نزدیک و دور ہر مقام کو جاتا تھا۔ بخلاف اپنے پیشرو کے جس نے سنسکرت زبان مین کتابین لکھی تھین اُس نے اپنے زمانے کی زبان مین وعظ دیے اور اُسی زبان مین کتابین بھی لکھین۔ اور شمالی ہند کی ہندی زبان اُس برگزیدہ اور ہر دلعزیز ریفارمر کی آغاز کی ہوئی عظیم مذہبی تحریک

کس طرح قدیم مذاہب کی وجہ سے بہت دولتمند ہوگئی۔

ہندوستان کی مذہبی اصلاح کی تاریخ مین کبیر کی طرح کوئی شخص مشہور نہین ہے۔ رامانند کا مرید تھا اُس نے اپنے مرشد کے آغاز کیے ہوئے کام کو ہاتھ مین لیا اُس کے دل مین یہ دلیر خیال پیدا ہوا تھا کہ ایک خدا کی پرستش مین اہل ہنود اور اہل اسلام دونون کو متحد کر دے۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوؤن کا خدا وہی ہے جو مسلمانون کا ہے خواہ اُس کو رام کہو خواہ اللہ کہو مُحمد و معنے الاہچھیر نے۔ متبرک دریاؤن مین نہانے مندرون مین سجدہ کرنے سے کیا فائدہ ہے اگر مناجات پڑھتے وقت یا جاترا کو جاتے وقت تمھارے دل مین مکر و فریب بُرا ہے۔ اگر اللہ جل شانہ مسجدون مین رہتا ہے تو تمام جہان کس کا مسکن ہے! ہندوؤن کے خدا کا شہر بنارس ہے مسلمانون کے خدا کا شہر مکہ ہے لیکن اپنے دلون مین تلاش کرو اور وہان تم کو ہندو اور مسلمان دونون کا خدا ملے گا۔

کبیر نے جو کچھ وسط ہندوستان مین کرنا چاہا تھا اُسی کے کرنے کی کوشش نانک نے پنجاب مین کی تھی وہ سنہ ۱۴۶۹ء مین ہندوستان مین پیدا ہوا تھا لہذا وہ مارٹن لوتھر کا ہمعصر تھا اُس نے تلقین کی کہ ہندو و مسلمان مل کر ایک خدا کی پرستش اور عبادت کرین سکھون کی بڑی جماعت جس کی بنا اُس نے ڈالی تھی عرصہ دراز تک ایک صلح پسند اور مذہبی جماعت رہی مگر بعد کے بعض واقعات نے اُن کو زمانہ حال کے ہندوستان کی سب سے جنگجو نسل بنا دیا۔

بنگال کا مذہبی ریفارمر چیتن تھا جو سنہ ۱۴۸۶ء مین ندیا مین پیدا ہوا تھا اس نے بھی یہی تلقین کی کہ ہندو اور مسلمان باہم مل کر ایک خدا (وشن) کی پرستش کرین۔ آجکل بنگال کی کل آبادی باستثنائے اعلیٰ اقوام کے وشن کی پرستش کرتی ہے۔ گجرات مین بھی ایک ریفارمر پیدا ہوا جسکا نام دادو تھا اس نے بہت سی متبرک تصانیف چھوڑی ہین جن مین بیس ہزار اشعار ہین۔ ہندوستان کے مذہبی عقائد کا چشمہ ابھی تک خشک نہین ہوا ہے۔ گزشتہ صدی مین عظیم الشان رام موہن رائے اور دیانند سرستی نے ایک مرتبہ پھر اپنے ملک کے لوگون کو ذات واحد کی پرستش کی تلقین کی اور تمام ہندوستان مین اہل الرائے اور سرگرم لوگ زمانہ گزشتہ کی طرف توجہ مبذول کر رہے ہین اور اپنی قدیم مقدس کتابون اور قدیم فلسفہ کے مطابق اپنے مذہب و سوشل رسم و رواج مین اصلاح کرنے کی کوشش کر رہے ہین۔

ہندوستان کی قدامت پر جان دینا غیر لوگون کے واسطے ایک معما ہے تاریخ نسل انسان مین نہایت حیرت انگیز امر ہندوستان کے قدیم مذاہب و رسوم و اعمال کا وہ سلسلہ ہے جو آغاز زمانۂ تاریخ سے لیکر زمانہ حال تک نہ حکومت کی تبدیلیون سے شکست ہوا اور نہ وحشیون یعنی یونانیون یا تورانیون مسلمانون یا عیسائیون کے خارجی اثر سے کوئی اثر پڑا۔ اور اگر ہم اُن پوشیدہ قوتون کے سمجھنے کی کوشش کرین جو قدیم ہندو خیالات مذہب اور فلسفہ کو قائم رکھے ہوئے ہین تو بھی ہمارے ذہن مین یہ امر صاف صاف نہین آئے گا۔

قدیم ہندوؤن کے آلات موسیقی

زمانۂ موجودہ مین جب کہ شادی بیاہ کے جلسون اور محفل رقص و سرود مین انگریزی آلات موسیقی کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے بہت کم لوگون کو معلوم ہوگا کہ زمانۂ قدیم کے ہندوؤن مین اس قسم کے آلات مکمل حیثیت اور مکمل حالت مین موجود پائے جاتے تھے یون تو اسیریا اور بابل کے قدیم باشندون مین بھی بعض آلاتِ موسیقی ایسے موجود تھے جنھین زمانۂ حال کے آرکیسٹرا کا بدل قرار دیا جا سکتا ہے اور قدیم مصری بھی اس فن سے ناواقف نہ تھے تاہم ہندوؤن نے اُن آلات کو جو ترقی دی وہ اُن کی شاندار تہذیب کے ہر طرح متناسب تھی اور یہی باعث ہے کہ اہل مغرب نے اکثر جدید آلات کی تیاری مین اُنھین قدیم باجون سے مدد لی ہے۔ ستار کی قسم کے آلات موسیقی تمام تر اہل ہند کی ایجاد ہین اور یہ بات کہ ایک ہی آلہ مین مختلف تارون پر اُنگلی کا دباؤ ڈال کر مختلف سُر پیدا کیے جا سکتے ہین اہل ہند کے کمالات موسیقی کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

ہندوؤن کی مذہبی کتب کے مطالعہ سے پایا جاتا ہے کہ ان مین یگیہ، میدان جنگ، شاہی جلوس اور نرت و کیرتن (رقص و سرود) کے موقعون کے لیے جدا جدا آلات موسیقی ہوا کرتے تھے۔ ماگھوی بودھ کے مصنف نے ایک سرتی کا حوالہ دیا ہے جس مین مذکور ہے کہ یگیہ کے موقع پر بین (وینا) اور دندھی (ایک قسم کا طبلہ) سے کام لیا جاتا تھا اور ڈھول، بانسری اور سنکھ کے رواج کا پتہ یجربید مین بھی چلتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤن مین مذہبی مراسم کے موقعون پر مختلف آلات موسیقی سے کام لینے کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔

ماہران علم موسیقی نے ہندوؤن کے آلات موسیقی کو چار مختلف اقسام پر منقسم کیا ہے:-

(۱) تتھ یعنی اس قسم کے آلات جن مین تار لگے ہوئے ہون۔

(۲) دندھ۔ ڈھول اور طبلہ کی قسم کے آلات۔

(۳) سشر۔ ہوا کی مدد سے بجنے والے آلات مثلاً بانسری سنکھ وغیرہ۔

(۴) گھن۔ ضرب سے بجنے والے آلات مثلاً جھانجھ۔ گھنٹے وغیرہ۔

افسوس کہ یہ تقسیم زمانۂ مابعد مین قائم نہین رہ سکی کیونکہ زمانۂ حال کا ہارمونیم اگرچہ ایک ایسا آلہ ہے جسکے بجانے مین ہوا سے مدد لیجاتی ہے مگر اسے سشر قسم کے آلات موسیقی مین داخل نہین کیا جا سکتا۔

تار دار آلات موسیقی مین سے بین بہترین قسم کا آلہ ہے ہندوستان مین اسکا استعمال بہت زیادہ ہے۔ نارد رشی کی نسبت مشہور ہے کہ وہ بین کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ سرسوتی کو بھی جو ہندوؤن مین علم کی دیوی ہے بحر موسیقی مین ایک بین پر ہی کھڑا دکھایا گیا ہے جو سطح آب پر تیر رہی ہے۔ اسی سلسلہ مین یہ بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہو گا کہ آنزے ارنیک مین جس بین کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس سے زیادہ ابتدائی قسم کی ہے جو ہندوستان کے زمانۂ عروج مین مستعمل تھی اس بین مین ایک کھوکھلا کدو جھلی سے منڈھا ہوا لگا ہوتا تھا۔ آنزے ارنیک مین اس آلہ کی کیفیت نہایت دلچسپ پیرایہ مین جو استعارات سے پُر ہے بیان کی گئی ہے۔ زمانۂ حال کی سارنگی کو اسی قدیم آلہ کا تتمہ قرار دینا کچھ بیجا نہو گا۔

زمانۂ حال کی بین دو قسم کی ہوتی ہے:-

(۱) سُرتی بین۔

(۲) سود بین۔

ان مین سے اول الذکر ۲۲ سرتیون کی تفہیم کا کام دیتی ہے۔ آخر الذکر کے متعلق کپتان ولرڈ بیان کرتے ہین کہ:-

یہ ایک نہایت مکمل اور موثر آلہ ہی - اگر کوئی عمدہ بین کسی ماہر گوییے کے ہاتھ مین ہو تو بہترین قسم کے پیاو سے کم نہین ہوتی ہی فی الحقیقت ہندوستانی موسیقی کے اُلٹ پھیر کے لیے یہ آلہ بہترین سمجھا جا سکتا ہی - یہ آلہ ایسا مکمل ہوتا ہی کہ کسی تار پر ذرا سا غیر ضروری دباؤ بھی اسکی آواز مین فوراً اختلاف پیدا کر دیتا ہی چونکہ آواز مین ہر قسم کی تبدیلی پیدا کرنا بجانے والے کے اختیار مین ہوتا ہی اسلیے اسکی آواز سامعین کو نہایت خوشگوار محسوس ہوتی ہی ""وائلن کو جو فوقیت باقی آلات موسیقی پر حاصل ہی وہ بھی محض اسی وجہ سے ہی"

بین مین بالعموم سات تار ہوتے ہین - چار اوپر اور تین پہلو مین - موسیقی دانون نے اس آلہ کی مختلف قسمین بیان کی ہین -

(۱) ایک تنتری جس مین صرف ایک تار ہوتی ہی یہ آلہ بتدیون کے لیے مخصوص ہی لیکن عام طور پر گداگر اس پر گا کر بھیک مانگتے پھرا کرتے ہین -

(۲) نکل - اسمین دو تار ہوتے ہین -

(۳) تری تنترکا - اسمین تین تار ہوتے ہین -

(۴) چتر - یہ سات تار والی بین کہلاتی ہی -

(۵) وپنچی - اسمین نو تار ہوتے ہین -

(۶) مت کوکلا - اسمین اکیس تار ہوتے ہین، اور اسکا عام نام سورمنڈل بھی ہی -

ان کے علاوہ ایک قسم اور بھی ہوتی ہی جسے پناکی کہتے ہین اور اسے گز کی مدد سے بجایا جاتا ہی یہ آلہ زمانۂ حال کے انگریزی آلہ وائلن سے مشابہ ہوتا ہی -

ہوا کی مدد سے بجنے والے آلات کی کہ جنھین سُشر کہا جاتا ہی اور جنکی بہترین نظیر زمانۂ حال کی بانسری ہی کئی قسمین ہین جنمین سے بعض کے نام حسب ذیل ہین: وَنس - یو - پوکا - مُرلی - مدھ کری - پنالی - تبوکن چگ - سرنگ - سنکھ وغیرہ - وَنس سے مراد بانسری سے ہی اور اگرچہ عام طور پر وہ لکڑی کی بنی ہوئی ہوتی ہی تاہم زمانۂ قدیم مین بانس، صنوبر کی لکڑی، ہاتھی دانت، فولاد، کانسہ، چاندی اور سونے کی بانسریان بھی بنائی جاتی تھین - بانسری کی بجائے خود بہت سی قسمین بیان کی گئی ہین جنمین سب سے چھوٹی کا نام اُدماتھی اور سب سے بڑی کا اَشٹ دنگل (۱۸ اُنگل) ہی - باقی اقسام کے نام انکی لمبائی وغیرہ کے اعتبار سے تری پرش، چترمکہ، دنج دکتر، شن مکہ، منی، اوماسو، کُدر، آدتیہ وغیرہ ہین

پو شکل و صورت مین ۱۹ انچ لمبی وَنس کی طرح ہوتی تھی مگر اسکے اوپر مَیل منڈھ دیا جاتا تھا - پوکا کی لمبائی ۱۰-۱۲ انچ ہوتی تھی اور اسمین سُرون کے لیے پانچ سوراخ ہوا کرتے تھے - شاید اسکی موجودہ صورت وہ آلہ ہی جسے سپیرے بجایا کرتے ہین اور جسے لوگ غلطی یا غلط فہمی سے بین کہنے لگے ہین - مُرلی کا نام سری کرشن چندر، آنند کند، اور گوپیون کی رس لیلاؤن کی بدولت اسقدر معروف ہو چکا ہی کہ کسی مزید توضیح کی ضرورت نہین - نرسنگا سے مراد نرسنگھے سے ہی جو بیل یا بھینسے کے سینگ کا بنا ہوا ہو - اس سے عام طور پر شاہی جلوسون، مندرون کی پوجا یا تہوارون مین کام لیا جاتا ہی - گڈریے بھی اکثر اسے بجایا کرتے تھے - سنکھ کا رواج آج تک مندرون اور دھرم شالاؤن مین پایا جاتا ہی -

اونندھ قسم کے آلات سے مراد ڈھول اور تاشہ کی مختلف اقسام ہی - ان آلات کی بجائے خود دو قسمین ہوتی ہین - ایک وہ جن پر جھلی منڈھی ہوئی ہو جیسے ڈھولک - طبلہ - نقارہ وغیرہ اور دوسری قسم وہ جو صرف ہاتھ کے بنے ہوے ہون مثلاً جھانج - گھڑیال وغیرہ - نقارہ کا نام پہلے سنسکرت مین پشکر تھا لیکن بعد مین سنگیت رتناگر کے مصنف نے اسکا نام مردنگ، مردال یا رج رکھ دیا - مردنگ کا رواج آجتک کسی نہ کسی صورت مین موجود ہی اور اسکے متعلق کسی قسم کی تفصیلات دینا تحصیل حاصل ہوگا -

ٹپاہ اسی مردنگ کی زیادہ قدیم صورت کا کام ہوا کرتا تھا۔ سنگیت رتناگر کا مصنف بیان کرتا ہی کہ ناٹک کے موقع پر ٹپاہ کے صرف ایک پہلو سے کام لیا جاتا تھا اور اس کے بجانے مین دونون ہاتھ حرکت مین آتے تھے۔ ظن غالب ہے کہ زمانۂ حال کا طبلہ اسی ایجاد کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہی۔ گھٹ سے مراد گڑے سے ہی اور پنجاب مین لوگ ابتک اسے بڑے سُر تال کے ساتھ بجاتے دیکھے جاتے ہین اس کی پُرانی اور نئی وضع میں فرق صرف اسقدر ہی کہ پہلے اسکے مُنھ پر جھلّی منڈھ دی جاتی تھی۔ مگر آج کل ایسا نہیں کیا جاتا۔

نقارہ کی بھی بہت سی قسمین ہوا کرتی تھین۔ گھڑس۔ دھوس۔ دھک۔ منڈی دھک۔ دکوس وغیرہ۔ مگر اب یہ سب قسمین معدوم ہو چکی ہین۔ دندوبی۔ بھیری۔ نسان اور تنبو کی بڑی قسم کے نقارہ کے مختلف نام ہین۔ ان سے زیادہ تر فوجی ضروریات مین کام لیا جاتا تھا اور جب دشمن قریب آرہا ہو یا فوج کو فتح حاصل ہو گئی ہو اُسوقت انھین بجایا جاتا تھا۔

تل سے مراد چھوٹی قسم کے جھانج سے ہی۔ ہندوستان مین اس آلہ کو مجیرا کہتے ہین اور عام طور پر اس سے آج تک رقص و سرود کی محفل مین کام لیا جاتا ہی۔ اسمین بالعموم دھات کی دو چھوٹی چھوٹی محدب یا مقعر پیالیان سی ہوتی ہین جن مین سے ایک کو بائین ہاتھ مین باندھ لیا جاتا ہی اور دوسرے حصہ کو دائین ہاتھ مین لے کر اُس سے بجایا جاتا ہی۔ کپتان سیلوز ٹیلر بیان کرتے ہین کہ ہندوستانی موسیقی مین تال دینے کے لیے اس آلہ سے عام طور پر کام لیا جاتا ہی۔ گو بعض مقامات پر ان سے صرف مذہبی مراسم کی ادائگی مین کام لیا جاتا ہی۔ اور پنجاب کے بعض دیہاتون مین بعض ذاتین ایسی ہین کہ ان مین شادی بیاہ کے موقع پر انگریزی باجا بالکل نہین بجایا جاتا بلکہ کنبہ کا پروہت اسی قسم کا آلہ بجا کر برات کے آگے آگے چلتا ہی۔

اس آلہ کو بجانا پنجاب کا خود ایک خاص فن ہی اور جو لوگ اس مین مہارت تامہ رکھتے ہین وہ اسکے ذریعہ سے نہایت خوشگوار آواز پیدا کر سکتے ہین۔

اس قسم کے آلات موسیقی مین سے ایک گھنٹہ بھی ہی جیسے مندرون اور شوالون مین لگایا جاتا ہی۔ گھنٹہ، گھنٹی کا یا جھر جھر یکار (گھنگھرو) بھی اسی قسم مین شامل ہین جنھین ناچ اور مجرے کے وقت ٹخنوں سے باندھ لیا جاتا ہی۔

گھڑیال کو قدیم زمانہ مین جے گھنٹہ کہا کرتے تھے۔ اس کا رواج آج تک پوجا پاٹ کے موقعون پر پایا جاتا ہی۔

آلات موسیقی کی یہ چند قسمین ہین جو قدیم ہندو موسیقی دانون مین مروج تھین۔ اس مین کلام نہین کہ یہ سب آلات نہایت سادہ ہوا کرتے تھے تاہم ان سے ہندوستانی موسیقی کی اکثر ضروریات بوجہ احسن پوری ہو سکتی تھین۔ اور جس سالے سے انھین تیار کیا جاتا تھا وہ بھی عام طور پر ملک کے اندر مل سکتا تھا۔ قدیم اہل ہند کے نزدیک درختون کی تین قسمین ہوا کرتی تھین۔

(۱) جنگل
(۲) دنل
(۳) سلیشول

جنگل سے مراد ایسے درختون سے ہی جو خشک زمین پر اُگتے ہون دنل سے مراد ایسے درختون سے جنھین بہت کم مقدار مین پانی ملا ہو اور سلیشول سے مراد اُن درختون سے لی جاتی تھی جن کو پانی بافراط ملتا رہا ہو۔

آلات موسیقی کی تیاری مین اول الذکر قسم کے درختون کو بہترین اور آخر الذکر کو بدترین سمجھا جاتا تھا۔ آخری قسم کے درختون مین سے کسی کی لکڑی چاہے کتنی خشک ہو اُسے آلات موسیقی کی تیاری کے لیے غیر موزون تصور کیا جاتا تھا۔ جا بجا ہدایات دی گئی ہین کہ آلات موسیقی ایسے درختون کی لکڑی سے تیار کیے جائین جو خشک

زمین پر اُگتے ہون اور عام طور پر خشک ہی رہتے ہون اگر کسی درخت کو کاٹ لیا گیا ہو اور اُس مین سے بڑے بڑے کوئی اور درخت اُگ آئین تو اُسکی لکڑی آلات موسیقی کی تیاری کے لیے بہترین سمجھی جاتی تھی۔ جابجا اس بات کی ہدایت کی گئی ہی کہ پھلے ہوئے گرہدار یا نازک درخت کی لکڑی سے بالکل کام نہ لیا جائے۔

عام طور پر رکت چندن (سرخ صندل) یا ساگون کی لکڑی سے کام لیا جاتا تھا۔ بانسری عام طور پر بانس کی تیار کیجاتی تھی۔ لیکن صندل اور ساگون کی بنی ہوئی بانسری کا بھی رواج تھا۔ بعض موقعون پر ہاتھی دانت، فولاد، دھات، سونے اور چاندی کی بانسریون کا بھی ذکر آتا ہی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بانس یا لکڑی کی بانسری پر پیتل کی چادر منڈھ لی جاتی تھی۔

نقارون کی تیاری مین جو کھال استعمال کی جاتی تھی اُس مین بہت سی احتیاطون کو ملحوظ رکھا جاتا تھا ہدایت کی گئی ہے کہ اس مطلب کے لیے جو چمڑا استعمال کیا جائے وہ چھُری وغیرہ سے صاف اور آم کی کونپل کے رنگ کا ہو اور اسے ایک رات پانی مین تر رکھا گیا ہو۔ جس چمڑے پر چھُری لگی ہوئی ہو یا کوّے کی ٹھونگون کے نشان ہون یا دیر تک دھوپ مین یا آگ کے سامنے پڑے رہنے کے باعث خراب ہو گیا ہو اُسے کبھی استعمال مین نہ لانا چاہیے بہترین چمڑا وہ سمجھا جاتا تھا جو کسی بڑھے جانور کا ہو اور جو خودبخود مرا ہو۔

مردنگ ایک مخروطی قسم کا آلہ ہوتا تھا۔ مٹی کا بنا ہوا اور اسکے دونون طرف چمڑا لگا ہوا ہوتا تھا۔ بعد مین اسے بیج برکش۔ کھدر۔ یا ساگون کی لکڑی سے تیار کیا جانے لگا۔ اس آلہ سے میدان جنگ مین سپاہ کا حوصلہ بڑھانے مین مدد لی جاتی تھی۔ ڈونڈھی کا استعمال مندرون سے مخصوص تھا اور اسکی تیاری مین آم کی لکڑی برتی جاتی تھی۔

یہ سوال کہ قدیم ہندوون مین آرکیسٹرا کا رواج تھا یا نہین بڑی حد تک بحث طلب ہی۔ یورپ مین سب سے پہلے آرکیسٹرا کا استعمال سولھوین صدی مین فرانس مین ناٹکون کے ساتھ شروع ہوا۔ جسمین بہت جلد نمایان اصلاحات رونما ہونے لگین حقیقت یہ ہی کہ جدید موسیقی کے ارتقا مین آرکیسٹرا کو بہت کچھ دخل ہی۔ لیکن معلوم ہوتا ہی کہ مشرق مین بہت مدت تک اس وجہ سے آرکیسٹرا کا رواج شروع نہ ہو سکا کہ یہان اسکے حسب حال آلات موسیقی موجود نہ تھے باوجود اسکے یہ امر قابل ذکر ہی کہ قدیم ہندو موسیقی دانون نے بہت کم آلات موسیقی رکھتے ہوے بھی آرکیسٹرا تیار کرنے کی کوشش ضرور کی اور اس کوشش مین اُنھین اگر پورے طور پر کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ قدیم ہندوستان مین آلات کی موسیقی کو قدرتی موسیقی سے دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا تھا حقیقت یہ ہی کہ گلا اگر سُریلا اور آواز شیرین ہو تو اسمین آلات موسیقی کے بغیر بھی ایک ناقابل بیان لطف پایا جاتا ہی چنانچہ ایک انگریز مصنف تسلیم کرتا ہی کہ ہمارے تمام آلات موسیقی پیانو فورٹ ارغنون وغیرہ آواز کی موسیقی کے برابر لطف و راحت مہیا نہین کر سکتے کیونکہ اس قدرتی موسیقی سے جب چاہو جس انداز سے چاہو کام لیا جا سکتا ہی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہی۔ قدیم ہندوؤن نے آرکیسٹرا کی تیاری کی کوشش بہر حال کی تھی۔ اس سے ہماری ہرگز یہ مراد نہین کہ اُن کی وہ معمولی کوششین زمانہ موجودہ کے مکمل آرکیسٹرا سے کچھ بھی تناسب رکھتی ہین۔ تاہم اس مین کلام نہین کہ انھون نے جو کچھ کیا اسمین اصول وہی ملحوظ رکھے گئے تھے جو زمانۂ حال کے آرکیسٹرا مین پائے جاتے ہین۔

بھرت نے جس کا نام معاملات موسیقی مین سند تسلیم کیا جاتا ہی قدیم آرکیسٹرا کا نام کتپ رکھا تھا جو بعد مین ورندیا برند ہو گیا

اور کون کہہ سکتا ہی کہ زمانۂ حال کی لفظ Band اور قدیم لفظ برند مین کتنا گہرا تعلق ہی۔ بھرت نے کتب کی تین قسمین مقرر کی ہین ایک تو وہ جس سے ناٹک کے سٹیج پر کام لیا جائے۔ دوسرے آلات موسیقی کا ایک عام مجموعہ اور تیسری قسم کا تعلق ان آلات موسیقی سے ہی جنھین ایک دوسرے سے ضرب دے کر بجایا جائے۔

قدیم ہندوؤن مین ناٹک کے موقع پر آرچسٹرا کی جو تقسیم دیکھنے مین آئی تھی اُسکے متعلق ذیل کی دلچسپ واقفیت یقیناً دلچسپی سے خالی نہوگی۔ مردنگ بجانے والا اسٹیج کے سامنے وسط مین بیٹھتا تھا اور اسکے داہین باہئن مین اور بانسری بجانے والے موجود ہوتے تھے۔

بیان کیا گیا ہی کہ زمانۂ حال کے تھیٹرون مین آرچسٹرا کو اسٹیج کے سامنے رکھنے کا رواج اسی زمانہ سے قائم چلا آتا ہی۔

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہی کہ قدیم ہندوؤن مین ہر قسم کے آلات موسیقی بڑی حد تک درجۂ تکمیل حاصل کر چکے تھے اور گو وہ زمانۂ حال کے ترقی یافتہ آلات کا پورے طور سے مقابلہ نہ کر سکتے ہون تاہم اسمین شک نہین کہ ان مین سے بہتیرے اُن اصلاحات کی تحریک کا موجب ہوے ہین جن کی بدولت مغربی آلات موسیقی کو آج ہر لحاظ سے مکمل ہونے کا امتیاز حاصل ہی۔

تیرتھ رام

العصر

تقویم پارسیہ

فارسیوں کی تقویم کی وجہ تسمیہ بلحاظ اپنے سال اور مہینوں اور دنوں کے اور اُن عیدوں اور جشنوں کے جو وقتاً فوقتاً منائے جاتے ہیں یا منائے جاتے تھے ایسی عجیب اور دلچسپ ہے کہ شاید ہی کسی اور قوم کی تقویم ایسی ہو۔ اِس تقویم سے فارسی قوم کے مذہبی عقائد اور ریت رسم اور توہمات پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل فارس دوزخ بہشت۔ سزا جزا۔ بد اور نیک اعمال کی میزان فرشتوں کی ہستی اور کام وغیرہ پر اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ سورج کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور ماسوائے اسکے اور مزد اور اہرمن نیک اور بد دو بڑی روحوں کو مانتے تھے جو ایک دوسرے کی باہم مخالف ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان امور کے علاوہ اور باتیں بھی اس تقویم سے ظاہر ہوتی ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

فارسی نظام شمسی کا سنہ نہایت ہی قدیم زمانہ میں شروع ہوا ہے۔ فارسی مجوس اور منجمین عموماً بتاتے ہیں کہ اسکا آغاز شاہ جم یا جمشید کے وقت سے ہوا ہے جو ۸۰۰ برس قبل مسیح سے بھی پہلے موجود تھا۔ فارسی سال میں تیس تیس دن کے بارہ مہینے ہیں۔ جن سے سال میں ۳۶۰ دن ہوتے ہیں۔ مگر ۳۶۵ کی تعداد پوری کرنے کے لیے ایک خاص مہینہ میں ۵ دن ایزاد کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک تو ان کے درمیان لوند کا سال نہوا کرتا تھا جسکی وجہ سے انکا نوروز موسم بہار میں آ کر پڑا کرتا تھا جبکہ آفتاب برج حوت میں داخل ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ہر ۱۲۰ سال کے بعد لوند کا ایک مہینہ بڑھا کر سال کے تیرہ مہینے کر دیئے جاتے تھے۔ اور اُسوقت تمام فارسی قلمرو میں بڑے شادیانے اور جشن منائے جاتے تھے۔ یہ مہینہ عرصہ اول کے اختتام پر ماہِ فروردین (مارچ) کے پہلے ہُوا کرتا تھا۔ عرصۂ دوئم میں آردی بہشت (اپریل) کے بعد ہوتا تھا۔ اور عرصہ سوئم میں خُرداد (مئی) کے بعد ہوا کرتا تھا۔ اور وہ پانچ فالتو دن اِسی مہینہ میں شامل ہُوا کرتے تھے۔ یہی سلسلہ سنہ ۶۳۲ء تک جاری رہا جبکہ ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدگرد کو عربوں نے شکست دیکر تخت سے اُتار دیا تھا۔ اور تب فارس خلفاء کی سلطنت کا ایک صوبہ بنگیا تھا۔ اس وقت سے نظام شمسی کے سال کے ان فالتو دنوں کی جانب سے بے پروائی ہو گئی اور محمدی قمری شمار تمام مذہبی اور ملکی معاملات میں داخل ہو گیا۔ یہی حال سنہ ۱۰۷۹ء تک رہا جس وقت فارس کے سلجوقی سلطان ملک شاہ جلال الدین نے جو خلفائے مقتدی کا امیر الامرا تھا اس جنتری

کی اصلاح کی تب سے یہ جنتری اُسی کے نام نامی سے مشہور ہو گئی- اور نوروز برج حوت کے پندرہ درجے سے ہٹا کر برج آذری کے پہلے درجے میں لایا گیا اور نوروز کا دن ہر چوتھے سال بڑھایا جانے لگا- اسی سبب سے اِس چوتھے سال کو کبیسہ یا کبیس کا سال کہتے ہیں- مگر منجم اپنے زائچوں میں وہ فالتو دن اپنے آخری مہینے اسفندارمذ (فروری) میں بڑھاتے ہیں- لیکن عام طور پر یہ ایام ماہ آبان (اکتوبر) میں بڑھائے جاتے تھے- کیونکہ یہ دن یزدگرد بادشاہ کی شکست کے موقع پر کبیس کے سال میں اُس مہینے کے بعد آئے تھے-

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قدیم فارسی مہینہ ہفتوں میں منقسم نہیں ہوا کرتا تھا اس لیے کہ ہر ایک دن اُسی فرشتہ کے نام سے موسوم ہوا کرتا تھا جو اُس دن پر مامور متصور ہوتا ہے اور ایسا ہی ہر ایک مہینہ بھی اُسی فرشتہ کے نام پر ہوا کرتا ہے جو اُس مہینہ پر مامور متصور ہوتا ہے- یہ فرشتہ اُن تمام عرصوں کے افعال پر اپنا حکم اور اثر رکھتا ہے جن کو (یعنی عرصوں کو) خدائے عالم الغیب نے اپنے زیر حکومت رکھدیا ہے- اسی طرح ہر ایک دن کا فرشتہ اُن تمام اعمال پر اپنا قابو اور اثر رکھتا ہے جسپر کہ وہ مامور اور مقرر ہے- یہ فرشتے دو انواع پر منقسم ہیں- جو فرشتے مہینوں پر مامور ہیں وہ اُن فرشتوں کے افسر سمجھے جاتے ہیں جو دنوں پر متعین ہیں- اور دنوں پر مامور فرشتے مہینوں پر مامور فرشتوں کے کارکنان کہلاتے ہیں- ہر بڑے فرشتہ کے لیے اُسکے اپنے مہینہ میں ایک خاص دن مقرر ہوتا ہے جسکا وہ خاص لحاظ رکھتا ہے اور اُسکی خاص توجہ کا مرجع ہوتا ہے- ہر فرشتہ کے لیے خاص خاص دعا مقرر ہے جسکو زمزمہ کہتے ہیں- اور ایک فرشتہ کی زمزمہ خوانی دوسرے فرشتہ کی زمزمہ خوانی سے بہت ہی معزز اور قابل احترام سمجھی جاتی ہے- فارس کے بادشاہ اس بات پر بھروسہ کرتے ہوئے ہر روز نیا طلسم استعمال کیا کرتے تھے اور ہر ایک طلسم پر اُس دن کے فرشتہ کی بابت کچھ نہ کچھ کندہ ہوا کرتا تھا- اسی اعتقاد کے مطابق اُنکے دسترخوانوں پر بھی ہر روز نئی نئی قابیں آیا کرتی تھیں اور وہ ہر روز نئی پوشاک زیب تن کیا کرتے تھے- ہر امر میں ان فرشتوں کی رضامندی لازمی سمجھی جاتی تھی-

اور اسی لیے میلے اور عیدیں مقرر ہوئی تھیں- ان میلوں اور عیدوں میں مذہبی اور پولیٹکل ہر دو عمل کی یادگاری ہوا کرتی تھی- جو دن مہینے کے فرشتوں کی زیر حفاظت سمجھے جاتے تھے وہ عام طور پر نہایت ہی خصوصیت کے ساتھ قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے- قدیم زمانہ سے فارسی سال کا پہلا مہینہ بہاری نقطۂ مساوات لیل و نہار (Equinox) سے شروع ہوا کرتا تھا جیسا کہ مذکور ہوا اور ابتدا میں اسکو آذر یا آدر کہتے تھے- جسکے معنی ہیں آگ یا وہ فرشتہ جو آگ پر مقرر ہے- ان مہینوں کے نام اور اُنکے فرشتوں کے نام اور عیدوں وغیرہ کا پورا بیان حسب ذیل ہے:-

پہلا مہینا فروردین (مارچ) ہے- اور یہی اِس مہینے کے فرشتے کا نام بھی ہے- کہتے ہیں کہ یہ فرشتہ فردوس کا خازن ہے اور فردوس کی پاکیزہ روحوں کی خاص حفاظت اور نگرانی اُسی کو تفویض ہے- اس مہینے کے روز اول پر جسکو نوروز کہتے ہیں ایک خاص میلا ہوا کرتا تھا جو چھ دن تک رہتا تھا اِس جشن کے پہلے دن بادشاہ عوام الناس کی خوشنودی اور بہبودی پر خاص توجہ دیا کرتا تھا- دوسرے دن عالموں اور فال گیروں کو دعوت دیا کرتا تھا- تیسرے دن دین کے ہادیوں اور پجاریوں اور ملک کے مشیروں کی دعوت ہوا کرتی تھی- چوتھے دن شہزادے اور امرا مہمان ہوتے تھے پانچویں دن شاہی بچوں کی ضیافت ہوا کرتی تھی اور چھٹے دن جو بادشاہ کا خاص دن کہلاتا تھا اس میں تمام رعایا اپنی اپنی لیاقت اور مرتبہ کے موافق بادشاہ کے حضور میں نذریں پیش کرتی تھی- نوروز سے پہلے کی شام کو ایک نہایت ہی خوش قطع اور وجیہ اور پاکیزہ نوجوان جو نوروز مجسم و مشخص متصور ہوا کرتا تھا شاہی خواب گاہ کے دروازہ پر متعین کیا جاتا تھا- یہ نوجوان عین اُسوقت بادشاہ کی خوابگاہ میں داخل ہوا کرتا تھا جبکہ آفتاب اپنے افق سے اوپر آجاتا تھا اور بادشاہ فوراً اُس سے مخاطب ہو کر کہتا تھا: "تو کیا ہے؟ تو کہاں سے آتا ہے؟ تو کہاں کو جاتا ہے؟ تیرا کیا نام ہے؟ تو یہاں کیوں آیا ہے؟ اور تو کیا لایا ہے؟" وہ شخص ان سوالوں کا جواب اِس نہج سے

دیا کرتا تھا۔ "میں خوش قسمتی اور مبارک ہوں۔ خدا نے مجھے یہاں بھیجا ہے اور اپنے ساتھ نوروز کو لایا ہوں"۔ جب وہ یہ کہہ کر بیٹھ جاتا تو ایک اور شخص اپنے ہاتھ میں نقرئی قاب لیے ہوئے ظاہر ہوتا تھا۔ اُس قاب میں گیہوں۔ جو۔ مٹر۔ ماش۔ تل۔ اور چاول رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ یعنی ان میں سے ہر ایک اناج کے سات سات خوشے اور نو نو دانے۔ شکر کی یا مصری کی ایک ڈلی۔ اور دو عدد نئے مسکوک سکّے۔ یہ سب اُس قاب میں رکھے ہوئے بادشاہ کو بطور تحفہ یا ہدیے پیش کیے جاتے تھے۔ اسکے بعد وزیرِ اعظم۔ سپہ سالار۔ خزانچی۔ اور محکمۂ جنگ کا سپرنٹنڈنٹ کمرہ میں داخل ہوتے۔ پھر شہر کے شرفاء حسب مراتب کمرہ میں تشریف لاتے تھے۔ تب مذکورۂ بالا اناج کی بنائی ہوئی ایک بڑی سی روٹی بادشاہ کے سامنے پیش کیجاتی تھی۔ بادشاہ تھوڑا سا اُس میں سے لیکر کھا لیتا اور باقی حاضرین کے درمیان تقسیم کر دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ "لو۔ یہ نئے زمانے کے نئے سال کے نئے مہینے کا نیا دن ہے۔ تمام چیزیں جو زمانہ میں شامل ہیں نئی بنائی جائیں"۔ اسکے بعد بادشاہ اپنے اُمرا اور درباریوں کو قیمتی لباسوں سے ملبس کرتا اور برکت دیکر وہ تحفے اُنکے درمیان تقسیم کر دیا کرتا تھا جو وہاں لائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ رسم جمشید بادشاہ نے شروع کی تھی جبکہ اُسوقت اِستخر (یعنی شہرِ پرسیپولس) میں پہلی ہی مرتبہ علانیہ طور پر داخل ہوا تھا۔ اور جس شہر کی تعمیر جمشید نے حال ہی میں کرائی تھی۔ علاوہ دیگر احکام کے ایک حکم اُسنے یہ بھی نافذ کیا تھا کہ فارسی سنہ بھی اُسی روز سے شروع ہونا چاہیے۔ اسی قسم اور اسی موقع کی اور بہت سی متفرق رسمیں آبان اور اسپندارمذ مہینوں کے بیان میں مذکور ہونگی۔ اِس دن کے علاوہ اُنیسویں دن بھی ایک خاص فرشتے کی عید ہوا کرتی تھی اور وہ بھی اسی طرح ضیافتوں اور میلوں سے منائی جاتی تھی۔ لوگ اس عید میں بھی نئے لباسوں سے آراستہ ہوا کرتے تھے اور تمام سلطنت میں کے جھنڈوں اور ریوڑوں اور گلوں کے حالات کا معائنہ ہوا کرتا تھا۔

دوسرا مہینا اردی بہشت (اپریل) کا ہے اور یہی اس مہینے کے فرشتہ کا نام بھی ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس فرشتے کے ہاتھ میں بہشت کی کنجیاں ہیں اور وہ بیماروں اور آگ کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ تیسری تاریخ پر جو اس فرشتے کا دن ہے جنگ کرنا۔ آتش خانہ میں جانا۔ اور بادشاہ کے حضور میں درخواستیں گزراننا اچھا سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس دن کو ان کاموں کے لیے سعد سمجھتے تھے۔

تیسرا مہینا خورداد (مئی) کا ہے۔ اس فرشتے کا اختیار تمام سمندروں دریاؤں اور ہر قسم کے پانیوں پر اور ساتھ ہی ہر قسم کے نباتات اور درختوں پر خیال کیا جاتا ہے۔ اس ماہ کی ۶ تاریخ پر جو اس فرشتے کا دن ہے شادی کرنا اور خدا اور فرشتوں سے دعائیں کرنا تاکہ وہ انکو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھیں اور انکی تمام ضروریات مہیا کریں سعد اور باعث کامیابی تصور کیا جاتا تھا اور خوش قسمتی کا ایک سبب سمجھا جاتا تھا۔ اور ۱۰ تاریخ پر اس لیے خوشی منائی جاتی تھی کہ اُس روز فارس کی سلطنت نے غاصب ضحاک پر فتح حاصل کی تھی۔

چوتھا مہینا تیر (جون) ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فرشتہ خورداد فرشتہ کے ماتحت ہے اور اُس سے کم درجہ پر ہے اور مویشیوں کی نگرانی اور انکی حفاظت اسکی تفویض میں ہے۔ اس ماہ کی ۱۳ تاریخ پر آبریزگان نام ایک عید منائی جاتی ہے۔ جسکی تقریب پر ہر فرقہ کے اشخاص ایک دوسرے پر پانی چھڑکتے ہیں مگر امراء اور ذی مرتبت لوگ پانی کے عوض گلاب یا زعفران کے بجائے لونگ کا عرق یا اور کوئی خوشبودار عرق استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس عید کی بنا بھی ایک خاص تاریخی واقعہ ہے۔ یعنی اس دن فریدوں کے پوتے منوچہر اور تاتاری بادشاہ افراسیاب کے درمیان ایک عہد نامہ ہوا تھا جسکی رو سے ہر دو سلطنتوں کی حدود بندی کے بارے میں یہ امر قرار پائی تھی کہ مشہور و معروف فارسی تیر انداز آرش نامی تیر چلائے اور جہاں اُسکا تیر گرے وہیں دونوں سلطنتوں کی حد قائم ہو جائے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق اُسنے تیر چلایا اور وہ تیر دریائے آمو کے دوسرے پار جا پڑا۔ پس وہی اُسوقت سے اِن دونوں حکومتوں کی حدود چلی آتی ہیں۔ آب ریزی کی یہ رسم اسی عید کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ اور عیدوں میں بھی یہ رسم ادا کیجاتی ہے۔ مثلاً نوروز اور مہرجان کی عیدوں میں

اور نیز ماہ خوردادا اور ماہ بہمن کی ۳۰ ویں تاریخ پر بھی یہ رسم خصوصاً اصفہان میں ادا کی جاتی ہے۔

پانچواں مہینا **مُرداد** (جولائی)۔ یہ فرشتہ درختوں اور دیگر نباتات اور پھلوں اور بیجوں کے مشہور و معروف فرشتوں میں سے ہے۔ اس فرشتے کے دن (۷ ویں تاریخ) پر جشن نیلوفر نامی ایک جشن ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ اس رسم میں نیلوفر کے پودے مستعمل ہوتے ہیں۔ اس موقع پر جس قدر عرضیاں بادشاہ یا عمّالِ حکومت کی خدمت میں پیش ہوتی تھیں وہ عموماً منظور ہو جایا کرتی تھیں اور عرضی دہندگان کی مرادیں بر آیا کرتی تھیں۔ لفظ "مُرداد" کے معنی ہے "موت دینا" اس لیے وہ موت کا فرشتہ خیال کیا جاتا تھا اور اکثر فرشتۂ مرگ کے لقب سے ملقب ہوا کرتا تھا۔

چھٹا مہینا **شہریور** (اگست) کا ہے۔ اس فرشتے کے حوالہ تمام معدنیات تھیں۔ اسکا دن ۴ ویں تاریخ پر پڑتا ہے۔ مگر نہ تو اس دن پر اور نہ دوسرے ہی دن یعنی ۱۰ ویں تاریخ پر کوئی رسم منائی جاتی تھی۔ یہ موخر الذکر تاریخ موسم خزاں میں آکر پڑا کرتی تھی اور اسکو خزان کہا کرتے تھے۔

ساتواں مہینا **مِہر** (ستمبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ تیز فہم مخبر ہوا کرتا۔ آفتاب کا نظم و نسق اُسکے ذمے متصور ہوتا تھا اور محبت و دوستی پر مامور سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ روزِ محشر پر لوگوں کو شمار کرنا اور اُنکو جزا و سزا دینا اِسی کا کام تھا۔ لوگوں کا گمان تھا کہ قیامت کے دن یہ فرشتہ ایک پل پر بیٹھے گا اور جب سروش نامی فرشتہ لوگوں کے اعمال میزان میں وزن کرچکے گا تو اس پُل پر سے اُن تمام روحوں کا گزر ہوگا۔ اگر کسی کے نیک اعمال اُس ترازو میں بال بھر بھی وزن میں زیادہ ہونگے تو بس اُنکے خیال کے مطابق اُس صاحبِ اعمال کے لیے فردوس کا دروازہ کھل جاتا ورنہ اسفل میں اُسکا حصہ مقرر ہو جاتا ہے جہاں پر اُنکے خیال کے مطابق اُنکو فردوس کی خوشیوں کے سات مدارج کے مقابل میں سات مختلف دُکھ بھگتنے پڑتے ہیں۔ ۱۶ ویں تاریخ سے جو اس فرشتے کا دن ہے اُنکی سب سے بڑی عیدوں میں سے ایک عید کا آغاز ہوا کرتا ہے جسکو مہرگان کہتے ہیں۔ یہ عید چھ دن تک ہوتی رہتی ہے۔ اسکی بابت بہت سی روایتیں مشہور ہیں مگر ایک روایت سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ یہ عید موسم خزان کے نقطۂ مساواتِ لیل و نہار کے وقت کی یادگار اور اُن کے سورج دیوتا کی شان میں ہوتی تھی اور ایسا ہی نوروز کے دن پر بھی جبکہ سورج بُرجِ آذری میں داخل ہوتا ہے سولھویں تاریخ پر خصوصیت کے ساتھ عید ہوا کرتی تھی۔ اور روپے پیسے والے آدمی اُسوقت روغنِ بان لگاتے اور اپنے اوپر عرقِ گلاب چھڑکتے اور مختلف قسم کے پھل کھایا کرتے تھے۔ اُنکا خیال تھا کہ اگر ہم اِن رسمیات کو عمل میں لائیں گے تو اُن بلیات سے محفوظ اور مامون رہیں گے جو آئندہ سال بھر آتی رہینگی۔ اس عید کے پہلے دن بادشاہ روغنِ بان سے اپنے آپ کو مسح کرکے اور مختلف الالوان لباسِ فاخرہ زیبِ تن کرکے اور ایک ایسا تاج پہن کر جسکی چوٹی پر ایک عظیم الشان مورت سورج دیوتا کی بنی ہوئی ہوتی تھی آراستہ اور ملبس ہوکر اپنے سریر سلطنت پر رونق افروز ہوا کرتا ہے۔ اُس وقت اُنکا بڑا پجاری ایک نفیس نقرئی طباق لیے ہوے جس میں مصری۔ شفتالو۔ بہی۔ سیب۔ لیموں۔ انار۔ عناب۔ سفید انگوروں کا ایک خوشہ اور سات گونہ بیری قرینہ سے چنی ہوئی ہوتیں اور اُس پر کچھ پڑھتے ہوے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا کرتا تھا۔ بادشاہ اس قاب میں سے کچھ کھالیا کرتا تھا اور اُسکے بعد اُسکے تمام اُمرا اور حکام اپنے اپنے مدارج اور مناصب کے مطابق اُٹھ اُٹھ کر بادشاہ کے حضور میں جاتے اور اس قاب میں سے لیکر تناول کر لیا کرتے تھے۔ من بعد بادشاہ کے توشہ خانہ سے نفیس پوشاکیں اور دیگر قیمتی اور عمدہ اشیا لاکر اُنکے درمیان تقسیم کردی جاتی تھیں۔ اِسدن لوگ اپنے بچوں کا نام رکھنا یا اُنکا دودھ چھڑانا سعد سمجھا کرتے تھے، اور یہ بھی دستور تھا کہ اگر آج کے دن بادشاہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو فوراً وہ سورج دیوتا کا پجاری بنائے جانے کے لیے بڑے جشن کے ساتھ مخصوص کردیا جاتا تھا۔

آٹھواں مہینا **آبان** (اکتوبر) ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ فرشتہ

خورداد کے ماتحت اور لوہے پر مامور ہے۔ اسکا دسواں دن اس فرشتے کے نام پر موسوم اور مخصوص ہوتا تھا اور اُس روز اس ایک خاص تواریخی واقعہ کی یادگار میں سالانہ عید منائی جاتی تھی کہ آج ہی کے دن تاتار یا توران کا بادشاہ افراسیاب جسنے فارسیوں کو بارہ برس تک اپنے قبضہ میں رکھ چھوڑا تھا فارس کے ملک اور سلطنت سے بدر کر دیا گیا تھا۔ اسکے علاوہ اُس بارش کی یادگار بھی ہوا کرتی تھی جو اُنکی روایت کے موافق سات سال کی خشک سالی اور قحط کے بعد ہوئی تھی۔ چونکہ قدیم زمانہ میں یہ سال کا آخری مہینا ہوتا تھا اس لیے اس میں پانچ فالتو یوم ایزاد کیے جاتے تھے۔ اس موقع پر گیارہ دن تک لگاتار عید منائی جایا کرتی تھی۔ جسکا آغاز ۲۶ تاریخ سے اور انجام اگلے مہینے آذر کی یکم پر ہوا کرتا تھا۔ اِس عید میں ماسوائے دیگر رسوم کے ایک یہ رسم بھی ادا کیجاتی تھی کہ مجوسی اونچے اونچے میناروں کی چوٹیوں پر مختلف قسم کے کھانے رکھدیا کرتے تھے تاکہ (جیسا کہ اُنکا اعتقاد ہے) پریاں اور فوت شدگان کی ارواح آکر وہ کھانا کھا جائیں اور اُن سے حظ اُٹھائیں۔ جب تک کہ یہ ضیافت اُنکے مفروضہ مہمان تناول کرتے رہتے تب تک پجاری باجوں اور گیتوں اور ناچ سے (جو ہاتھ میں ہاتھ ملا کر کیا کرتے تھے اور جسکو دست بند یا پنجہ کہتے تھے) اُنکو خوش کرتے رہتے تھے۔ ہر درجہ اور مرتبہ کے لوگ اس جلسہ کی تقریب پر نہایت ہی بے لگام خوشیاں منایا کرتے تھے۔ عمدہ عمدہ لباس پہنا کرتے اور ایک دوسرے کو بے باکانہ دعوتیں دیا کرتے تھے۔ اہل دولت و ثروت سے غریب غربا کو چھوٹے چھوٹے ہدیے جو داشتن کے نام سے موسوم ہوتے دیے جایا کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بادشاہ بھی مع اپنے امراء و شرفاء کے پھولوں کے ہاروں (جنکو تباک کہتے تھے) اور ایک قسم کے گلوبندوں سے (جنکو گریبان کہتے تھے) آراستہ ہو کر عوام الناس کی خوشی میں شریک ہو کر اُنکو مشرف و ممتاز کیا کرتے تھے۔ علی الصبح جلوس سب سے پہلے آتش گاہ میں جاتا اور جب یہاں عبادت ہو چکتی تو لوگ بڑے جوش سے قسم قسم کے باجے بجانے اور خوش الحانی سے گانے اور خوب ناچنے لگ جاتے تھے۔ یہ راگ رنگ اکثر ٹولیاں ٹولیاں ہو کر رچایا کرتے تھے اور ہنسانے والی طرح طرح کی نقلیں ہوا کرتی تھیں جنکے لیے نقالوں اور گانیوالوں کو بڑی بڑی اجرتیں دی جاتی تھیں۔ اس مزدوری کو پاپنج یعنی پانوؤں کی مزدوری کہا کرتے تھے۔

نواں مہینا **آذر** (نومبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ آتش پر مامور تھا اور اس کا نواں دن اسکے نام سے کہلاتا تھا۔ اِس روز تمام فارسی سلطنت میں آگ کے انبار کے انبار روشن کیے جاتے تھے اور زردشت کے حکم کے بموجب ملک کے تمام آتش گاہوں کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر تمام آتش گاہیں بڑی عمدگی اور تزک و احتشام سے آراستہ کیجاتی تھیں اور سب لوگ ناخن کٹواتے اور اپنے تمام بدن کے بال منڈاتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہم ایسا کرنے سے اپنے سال بھر کے تمام گناہ اور قصور اُتار کر پھینک دیتے ہیں۔

دسواں مہینا **دی** (دسمبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ نہ صرف اسی مہینے پر مامور تھا بلکہ اُن تمام دنوں پر بھی اختیار رکھتا تھا جو دی سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً دی بہ آذر، دی بہ مہر، گیارہویں تاریخ بد (جو اس فرشتے کا دن ہوتا ہے) تمام پارسی سلطنت میں آگ کی شان میں ایک بڑا میلا ہوا کرتا تھا۔ اس میلے کے آغاز کی بابت بہت سی مختلف روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی ہی عجیب و غریب ہے کہتے ہیں کہ اس سالانہ موقع پر موسم سرما نے ایک دفعہ دوزخ سے نکل آنے کا ارادہ کیا کیونکہ وہاں اُسکو بہت ہی گرمی لگتی تھی۔ فارسیوں کے آبا و اجداد نے یہ دیکھکر فوراً بڑے بڑے آتشی انبار لگا دیے اور اس سے اُسکو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ قواؤ زیادہ وسعت میں آگیا ہے۔ یہ دیکھکر وہ پھر زمین سے روانہ ہو کر تاریکی کے سایوں میں چلا گیا۔ اس موقع پر شب کی درخشندگی کے عام نظارہ کو دوبالا کرنے کیلیے بادشاہ اور اُسکے اہل دربار جھاڑیوں اور درختوں کی چھوٹی چھوٹی اور پتلی پتلی شاخیں کاٹ کر اور اُنکو ہوا کے پرندوں اور جنگل کے جانوروں اور درندوں کے جسموں کے ساتھ ترکیب سے باندھکر روشن کرکے اُن کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پرندے تو آسمان میں اُڑتے اور جانور جنگلوں میں بھاگتے

جس سے آس پاس کے جنگل جل اُٹھتے تھے۔ اور یوں رات کے وقت روشنی کا شاندار نظارہ نظر آیا کرتا تھا۔ بعض قدیم مشرقی اور یورپ کے محققین اس قسم کی رسومات کا پتہ آج سے چار ہزار برس پیشتر تک لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رسم اُسوقت شروع ہوئی تھی جبکہ فارسیوں کے پہلے بادشاہ کیومرث کے یکصد بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی فارسی بادشاہ ہے جسکو بائبل میں عیلام کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ یہ عید اُسوقت کی یادگار منائی جاتی تھی جبکہ ہیبت ناک اژدھے کو اُسکے پوتے ہوشنگ نے ہلاک کر دیا تھا۔ مگر عام رائے یہ ہے کہ خوشی اس موقع پر کیجاتی تھی کہ اُسوقت آفتاب خط جدی پر داخل ہوتا ہے اور اسی وقت سے دن بڑے اور گرمی زیادہ ہونے لگتی ہے۔ چونکہ اس سخت موسم میں آگ بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے اس لیے اس خوشی کا اظہار طبعی طور پر آگ کے تودے اور انبار لگا کر اور اُنکے سامنے بیٹھکر خوشیاں منانے کے سوا کسی اور طرح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس حالت اور نظارہ سے وہ تمام خیالات اور احساس رفع ہو جاتے ہیں جو تاریکی اور سخت سردی سے پیدا ہوئے تھے۔ اسی زمانہ میں اسی قسم کی رسم انگلستان میں بھی ہوا کرتی تھی جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا کہ اب ہم موسم سرما کو الوداع کہتے ہیں اور موسم بہار کے خیر مقدم کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اس مہینے کی پندرھویں تاریخ ایک مشہور و معروف رسم کے لیے معین اور مخصوص تھی۔ یعنی اُسوقت آٹے یا مٹی کی بہت سی مورتیں اُن فوت شدہ بزرگوں کی بنایا کرتے تھے جو اُنکے خیال میں معزز تھے۔ اور اُن مورتوں کو عام گزرگاہوں میں رکھا کرتے تھے بالخصوص چوراہوں اور چوکوں پر۔ اور انکی بڑی بھاری تعظیم اور تکریم کرنے کے بعد اُنکو جلا دیا کرتے تھے۔ اس موقع پر علی الصبح کچھ بولنے سے پہلے ایک سیب کھا لینا۔ اور ڈھاک کی جڑ کی دھونی لینا بہت اچھا سمجھا جاتا تھا کہ ایسا کرنے سے آئندہ بارہ مہینوں تک کی زندگی بڑے امن سے گزرا کرتی ہے۔ محتاجی اور بھوک رفع ہو جاتی ہے۔ ۲۴ تاریخ پر لسن کی عید ہوا کرتی تھی۔ لوگ لسن کو گوشت اور سبزی کے ساتھ خاص طور پر پکایا کرتے اور سمجھا کرتے تھے کہ اس طلسم سے ہم دیووں کے حملوں سے بچے رہتے ہیں اور بعض خاص منتروں کے ذریعہ سے ہم دیووں کو اپنے مقامات سے نکال دیا کرتے ہیں جہاں اُن دیووں کا باس ہوا کرتا ہے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ اگر یہ طلسم اس طرح پر بنایا جائے تو بہت موثر اور مفید ہوا کرتا ہے۔

گیارہواں مہینا بہمن (جنوری) ہے۔ یہ فرشتہ تمام دیگر فرشتوں سے نور اور تجلی میں افضل ہے۔ سمجھا جاتا تھا کہ یہ فرشتہ تمام مخلوقات پر حکمراں ہے مگر انسان اُسکی حکومت سے باہر ہے۔ کیونکہ انسان اور مزد کی خاص نگرانی میں ہے۔ اور مزد کے معنی ہے عالم کُل۔ وہ تمام غیظ و غضب کا منتفی کرنیوالا اور تمام جھگڑوں کا ثالث متصور ہوتا ہے۔ ۲ تاریخ پر جو اس فرشتہ کا دن ہے اناج یا گوشت کی عید مناتے تھے اور اُس اناج اور گوشت کو سفید یا سرخ بہمن کے ساتھ اُبالا کرتے تھے اور جب رکابی تیار ہو جاتی تو اُس پر دو بہمن اور مصری کوٹ کر اور ملا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ سفید بہمن کو دودھ میں پیس کر مقوی دماغ کے طور پر نوش کیا کرتے تھے۔ اس دن پر گھر کی بنیاد رکھنا، نئے کپڑے کاٹنا یا بنانا یا سینا، ناخن کاٹنا، اور بال منڈانا، طبی جڑی بوٹی تلاش کرنا شبھ سمجھتے تھے اور انکا عرق یا تیل نکال لیا کرتے تھے۔

بارہواں مہینا سپند ارمذ (فروری) ہے۔ اس فرشتے کے سپرد کرہ زمین ہے اور نیک مستورات کا بھی وہی محافظ و نگراں متصور ہوا کرتا تھا۔ اس سبب سے پانچویں تاریخ جو اسکا دن تھا یا وہ شادی کے لیے نہایت موزوں اور شبھ سمجھی جاتی تھی۔ اس دن کے ناموں میں سے ایک نام مرد گیران (یعنی مردوں پر حکومت کرنا یا آدمی لینا) تھا۔ اس عقیدہ کی بنا ایک قدیم رسم پر تھی جسکے ذریعہ سے اس دن پر مستورات کو خاص حکومتانہ اختیارات دیے جاتے تھے۔ اور خاوند اپنی بیویوں کے نہایت ہی زبردست احکام کی تعمیل کیا کرتے تھے۔ اور کنواریاں اس امر کی مجاز تھیں کہ اپنے حسب منشا خاوند منتخب کیا کریں۔

مہینوں کی جو ترتیب اوپر دیکھی گئی ہے وہ وہی ہے جو فارس میں سلطان جلال الدین کی اصلاح کے وقت جاری ہے جسے نہایت قدیم طریق کہنا چاہیے جبکہ درحقیقت اصل میں جمشید نے مرتب کیا تھا جلال کر دیا۔

ی۔ کے۔ ایس

فن تحریر

جس وقت انسان وحشیانہ حالت سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہی اُس کو گویا ایک نئی زندگی ملتی ہی۔ اس تغیر وتبدل کو فلسفے کی اصطلاح مین حیوانیت سے انسانیت مین آنا کہتے ہین۔ اس زمانہ مین عقل آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہی اور عقل کی ترقی سے تہذیب پیدا ہوتی ہی۔ ترقی تہذیب کے لیے غور وخوض اور اظہار خیالات کی ضرورت ہوتی ہی یہی وہ زمانہ ہوتا ہی جبکہ زبان عالم وجود مین آتی ہی اسکے بعد رفتہ رفتہ روحانیات سے تعلق رکھنے والی کتابون کا ظہور ہوتا ہی۔ ایسی کتابین نہایت بیش قیمت خیال کی جاتی ہین کیونکہ ان مین سب سے اول خداوند کریم کی لامحدود صفات کا بیان قلمبند ہوتا ہی۔ ایسی بوکستان کی عزت وتعظیم کا اندازہ ویدون کے مشہور اعزاز واحترام سے کیا جا سکتا ہی ویدون نے ہندوستان کے پنڈتون کو تو اپنی محبت مین والہ وشیدا بنا ہی رکھا تھا لیکن میکسمولر وغیرہ علماے مغرب کو بھی اپنا وارفتہ بنا لیا ہی۔ جب انسان کو روحانی صحائف کا حفظ کرنا محال ہو جاتا ہی اسوقت وہ انھین قلمبند کرنے کی خواہش کرتا ہی علم تحریر کے عالم ظہور مین آتے ہی کتابین قلمبند ہونے لگتی ہین اور آہستہ آہستہ زیادہ تعداد مین کتابین لکھی جانے لگتی ہین یہی سلسلہ ہی جس سے کتابون کے مجموعے اور کتابون کے مجموعون سے کتبخانے ظہور مین آتے ہین۔

ایسی کتابین جو اعلی روحانی جذبات سے مملو ہون دل ودماغ سے پیدا ہوتی ہین۔ ان کو زبانی یاد کرنا پڑتا ہی سنسکرت مین انھین "سمرتی گرنتھ" کہتے ہین۔ ان کے ذریعہ سے محفوظ کردہ خیالات کا اظہار ورواج ہوتا ہی ان مین زمانہ قدیم کے تاریخی قصے، مثالی کہانیان، شعر وسخن، بھجن، اور گیت وغیرہ شامل ہوتے ہین۔ پرانے زمانہ کی مقدس مذہبی کتابین، اندرجال کے منتر اور شعبدے اور نیز عملیات سفلی وغیرہ بھی ایسی ہی کتابون مین لکھے ہوے ملتے ہین۔ ان کی زبان ایک عجیب زبان ہوتی ہی اور اسی قسم کی زبانون سے دنیا کی تمام دلکش زبانین پیدا ہوئی ہین۔ ایسی زبانون کا رواج اور ایسی کتابون کا

علم دادے باپ اور باپ سے بیٹے کو پہونچتا تھا۔ اسطرح پر قوت حافظہ بہت ترقی کرتی تھی، اور یہ اسی حافظہ کا فیض تھا کہ ہمارے بزرگوں نے وید اپنشد، سمرتی وغیرہ مقدس کتابین ہزارہا برس تک محفوظ رکھین۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اس زمانہ کے موجودہ قدیم صحائف کب کے معدوم ہو گئے ہوتے۔ کچھ ہندستان ہی پر موقوف نہین بلکہ زمانۂ قدیم مین عبرانی زبان کی کتابون کا رواج بھی اسی طرح ہوتا تھا۔ یونان کے ملک الشعرا "ہومر" کی قابل قدر تصانیف بھی اسی ذریعہ سے مشہور ہوئین۔ الیڈ اور اوڈیسے نامی مشہور منظوم کتابین جو ملک الشعرا ہومر نے نظم کی تھین، ہومر نابینا ہو گیا تھا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے کلام کو گا گا کر ادھر ادھر سیر و سیاحت کرتا پھرتا تھا۔ ان نظمون کو لوگون نے ہومر ہی کی زبان سے سنکر ازبر کر لیا تھا۔ جاپانیون کی "کوگی" نامی کتاب کا رواج بھی اسی طریقہ سے ہوا تھا۔ ملک چین مین ٹائپ رائٹنگ اور پرنٹنگ مشین کے اجراء سے پہلے وہان کی تاریخین، پولیٹیکل کتابین، پند و نصائح اور مذہبی کتب بھی اسی طریقہ سے مروج ہوئی تھین۔

روحانیات سے تعلق رکھنے والی کتابون کی ترقی ہوتے ہوتے آخر ان کا یاد کرنا مشکل ہو گیا، اور بدین وجہ ان کو تحریر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چونکہ اسوقت کاغذ نہ تھا، لہٰذا پتھرون، سلون، ہڈیون، سینگ، ہاتھی دانت، اور مٹی کے ظروف اور اینٹون پر کتابین تحریر ہونے لگین۔ علم طبقات الارض کے ماہرین کی رائے ہے کہ زمانۂ قدیم مین لوگ ہتھیارون سے پتھرون اور سلون پر کھود کر اپنے دلی خیالات قلمبند کرتے تھے۔ دنیا کی بہت سی پرانی کتابین پتھرون اور سلون وغیرہ پر تصاویر و نقوش کے ذریعہ سے قلمبند کی گئی تھین۔ تصاویر اور نقش و نگار کے ذریعہ سے اظہار خیالات کو فن تحریر کا پہلا زینہ سمجھنا چاہیے۔ مصر مین خط تصویر کا بہت رواج تھا۔ اور اب بھی وہان اسقدر ذخیرہ اس کا موجود ہے کہ اسکو علم کی ایک علحدہ شاخ قرار دیا گیا ہے چنانچہ بیشمار علماء اس فن تحریر کو حاصل کرنے اور زمانۂ قدیم کے قلمبند کردہ خیالات کو پڑھنے کے لیے سالہا سال محنت و مشقت کرتے ہین۔

باشندگان چین نے متذکرہ بالا خط تصویر کو بہت ترقی دی ہے۔ جاپان، کوریا، تبت وغیرہ مین بھی چین سے نزدیکی ہونے کے باعث یہ طرز تحریر موجود تھا۔ جاپان مین اسکے علاوہ اسی کے مشابہ ایک اور طرز تحریر بھی مروج تھا۔ اسکا نام "اردھہ" تھا۔

امریکہ کے قدیم باشندے، جن کو غیر مہذب "انڈین" کہتے ہین اب تک خط تصویر کا استعمال کرتے ہین۔ اینٹون اور پتھرون پر لکھی ہوئی کتابین زیادہ تر ملک مصر مین پائی جاتی ہین یہ سب خط تصویر مین ہین۔ کارناک مین بڑے ستونون پر بیشمار کتبے اب تک موجود ہین، جو حضرت مسیح سے چار سو برس قبل کے ہین۔ اس ملک کی قدیم تاریخ خط تصویر مین اینٹون پر قلمبند ہے۔ اس عجیب و غریب خزانۂ کتب سے معلومات اخذ کرنے کی قابلیت کسی ملک مین نہین ہے۔ اہالیانِ مصر کو تحریر صحائف مین خوب مہارت حاصل تھی۔ ان لوگون کو شوق علم نے اس قدر روارفتہ کر دیا تھا کہ درخت، پتھر، جھاڑ، اینٹ، چمڑا، جو کچھ بھی ان کو میسر ہوا اسب کو وہ بجائے کاغذ استعمال مین لائے۔ انہون نے پہلے تو جانورون اور پرندون وغیرہ کی تصویرین کندہ کر کے اپنے دلی منشاء کو ظاہر کیا، مگر جب زیادہ لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو یہ خط تصویر تکلیف دہ اور وقت طلب معلوم ہونے لگا۔ لہٰذا اس طرز تحریر مین اصلاح و ترمیم کر کے قدرے آسان نشان مقرر کیے۔ بعد ازان کچھ اور زمانہ گزرنے پر حروف قائم کیے۔ مصر والون کی زیادہ تحریرین انھین تین قسم کے خطوط مین رہ پائی جاتی ہین۔

رفتہ رفتہ تحریر کی زیادتی ہونے سے علم ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنون مین روم و یونان وغیرہ ممالک مین تلفظ کے مطابق طرز تحریر کا ظہور ہوا۔ اس زمانہ مین پتھرون اور اینٹون پر لکھنے سے لوگون کو تکلیف ہونے لگی، لہٰذا دیگر ذرائع کی تلاش و جستجو ہوئی۔ نتیجہ ہوا کہ ابتدا لکڑیون کے ورق تختون پر کتابت شروع ہوئی۔ باشندگان چین نے بانس پر لکھنے مین بڑی مہارت پیدا کی تھی۔ ہندستان مین بڑے لوگون

کی بہت سی تحریریں لکڑی کے تختوں پر لکھی ہوئی پائی گئی ہیں اور چین کا تو ذکر ہی کیا جہاں اسی قسم کی بیشمار تحریریں پائی جاتی ہیں۔

لکڑی پر لکھنے کا رواج اب سے کچھ قبل بھی ہندوستان میں تھا۔ چھاپہ کی ایجاد سے پہلے جو دقتیں تحصیل علم کے راستہ میں لاحق ہوتی تھیں، ان کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ طلبا تختوں پر اینٹ کا برادہ ڈال کر بانس کی قلم سے اپنا سبق لکھ کر یاد کرتے تھے۔ گویا سب سے بہترین ذریعۂ تعلیم یہی تھا۔ مارواڑیوں کی دوکانوں میں رنگین تختوں پر رنگ سے لکھنے کا رواج ابتک بہت سے مقامات پر پایا جاتا ہے جبکہ باقاعدہ ذرائع تحریر کی عدم موجودگی کے باعث اب تک یہ کیفیت تھی تو پرانے زمانہ کی تختیوں اور دفتروں کا کیا ذکر۔ لہذا لائق صد آفرین ہیں ہندوستان کے وہ بزرگ علما جنھوں نے بھوج پتر وغیرہ پر بیش بہا کتابیں قلمبند کی تھیں۔ لکڑی پر لکھے ہوئے صحائف روم و یونان وغیرہ ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔

لکڑی اور بھوج پتر کے بعد لوگوں نے درختوں کے پتوں پر بھی لکھنا شروع کیا۔ تاڑ کے پتوں پر ہندوستان میں لاکھوں کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔

جس زمانہ میں دنیا کی تہذیب اس قدر معراج ترقی پر پہنچ گئی تب مضامین کا مجموعہ کتابی صورت اختیار کرنے لگا۔

ایک بات لکھنے سے نظر انداز ہو گئی، وہ یہ کہ بھوج پتر وغیرہ سے بیشتر ہندوستان میں بہت تحریریں تانبہ وغیرہ کے پتروں پر لکھی جاتی تھیں۔ سونے اور تانبہ کے پتروں (چادر) کا رواج ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے تھا۔ چنانچہ ویدوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔ بودھوں کے بھی بیشمار کتبے تانبا اور لوہے کی چادر پر لکھے گئے ہیں۔ اس سے پتا ثابت ہوتا ہے کہ دھات کے پتروں پر لکھنے کا طریقہ اہل ہند کا ایجاد ہے یعنی یہاں ہی سے یہ طریقہ دیگر ممالک میں پہنچا ہے۔ چین، جاپان، وغیرہ ممالک میں بھی دھات کے پتروں پر تحریرات لکھنے کا رواج جاری تھا اور اب بھی جاری ہے۔ مصر، آسٹریا، یونان وغیرہ ممالک میں کسی زمانہ میں دھات کے پتروں پر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ بعض علما کا خیال ہے کہ ہندوستان والوں نے یہ طریقہ بابل والوں سے مستعار لیا تھا لیکن کوئی تاریخی ثبوت اس خیال کی تائید میں پیش نہیں کیا جاتا۔

پتھروں، ہڈیوں اور تانبے اور لوہے کے پتروں پر لوگ اسی سلائیوں اور دیگر اوزاروں سے حروف کھودتے تھے۔ یہ بڑی محنت کا کام تھا۔ بعض لوگ یہی پیشہ کرتے تھے۔ اس میں کافی مہارت ہونے کے باعث وہ لوگ بآسانی اور جلد اس کام کو انجام دیتے تھے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ ہندوستان میں دھات کے پتروں پر تحریرات کندہ کرنے والے کاریگر نمک، شورا، گندھک وغیرہ اشیا کا بھی استعمال کرتے تھے۔ ان اشیا کی وجہ سے حروف کندہ کرنے میں بہت آسانی ہوتی تھی۔

ہندوستان میں زمانہ قدیم سے مصوری کا رواج ہے جس طرح مختلف رنگ کے استعمال سے خوبصورت اور عمدہ تصویریں بنائی جاتی ہیں اسی طرح حروف کندہ کرنے اور لکھنے میں بھی مختلف رنگ کام میں لائے جاتے تھے۔ مصوری میں برش استعمال ہوتا ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ برش بنانا بھی قدیم باشندگان ہند جانتے تھے۔ رفتہ رفتہ لکھنے میں بھی برش کام آنے لگا لیکن برش سے لکھنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ بالآخر قلم ایجاد ہوا۔ حقیقت میں قلم کی ابتدائی صورت برش ہی ہے۔ چین اور جاپان والے اب بھی برش سے لکھتے ہیں۔

جب لوگ بھوج پتر اور تاڑ کے پتوں پر لکھنے لگے تو فن تحریر کا خصوصیت کے ساتھ رواج ہوا۔ بہار کے قرب و جوار میں ہندوستان کے نہایت قدیم بودھوں کے بیشمار صحائف بھوج پتر پر لکھے ہوئے پائے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے بعض بعض حصے پیرس اور سینٹ پیٹرسبرگ میں ابتک رکھے ہیں۔ یہ کتابیں کم از کم پانچسو برس قبل مسیح لکھی گئی ہوں گی۔ یہ کتابیں ایسی عمدہ روشنائی سے لکھی گئی ہیں کہ اس قدر پرانی ہونے کے باوجود نہایت صاف ہیں۔ قدامت کے باعث بھوج پتر اور تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابیں ہندوؤں میں مقدس اور لائق تعظیم سمجھی جاتی ہیں کہ وہ اب بھی اپنی مذہبی سوسا

اور تقویمون مین ان کا استعمال کرتے ہین اور رجسٹر (نقوش) اور دستاویز اکثر انھین پر لکھے جاتے ہین۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ چمڑے پر بھی کتابین لکھی جاتی تھین۔ علماء کی رائے ہے کہ کسی زمانہ مین دنیا کے جملہ قدیم ممالک مین چمڑے پر کتابت ہوتی تھی ہندوستان مین بھی زمانۂ قدیم مین چمڑا ذریعۂ تحریر تھا لیکن "اہنسا پرمودھرمہ" کی تعلیم شروع ہونے کے باعث چمڑے کا استعمال کم ہو گیا تاہم شیر اور ہرن وغیرہ جانورون کا چمڑا مقدس کامون مین اب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ صرف تحریر کتب مین ناپاکی کے خیال سے چمڑے کا استعمال ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ یونیورسٹیون اور کالجون کے اسناد (ڈپلومہ) مین فی زمانناہماری گورنمنٹ بھی چمڑے کا استعمال کرتی ہے اور کتابون کی جلد بندی مین تو چمڑے کا استعمال جملہ ممالک مین یکسان ہوتا ہے۔

مصر مین زمانۂ قدیم سے چمڑا لکھنے کے کام مین آتا تھا۔ چمڑے پر لکھنے کا طریقہ وہان سب سے پہلے پرگامس کے راجہ نے ایجاد کیا۔ اس راجہ کی یادگار مین اُسی زمانے سے چمڑے کے کاغذ کو "پارچمنٹ" کہنے لگے۔ پارچمنٹ کا قصہ بھی کچھ کم دلچسپ نہین۔

ملک سیریا کا بادشاہ سیلیوکس نکیٹر بہت مشہور ہو گذرا ہے۔ اُس کی وفات کے بعد مغربی ایشیا کا "پرگامم" نامی ایک مقام آزاد و خود مختار ہو گیا۔ اُس زمانہ مین وہان ایک بہت بڑی لائبریری اور یونیورسٹی قائم تھی۔ اس لائبریری کو دنیا کی سب سے بڑی لائبریری بنانے کے لیے پرگامم کے راجہ نے بہت کوشش کی۔ لہٰذا اس نے مصر سے "پاپیرس" نامی کاغذ منگانا شروع کیا، لیکن حکام مصر نے کاغذ بھیجنا بند کر دیا۔ یہ دیکھ کر پرگامم کے راجہ نے اپنی تمام کتابین پارچمنٹ (چرمی کاغذ) پر لکھوائین۔ یہ واقعہ حضرت مسیح سے ۲۰۰ برس قبل کا ہے۔ پارچمنٹ "پرگامم" ہی سے مشتق ہے۔

امریکہ کے سُرخ رنگ والے غیر تہذیب یافتہ انڈین لکھنے مین زمانۂ قدیم سے چمڑے کا استعمال کرتے آئے ہین۔ دلچسپ تصاویر کے ذریعہ سے ان کا تحریر کرنا نہایت دلاویز ہے۔ چمڑے پر لکھی ہوئی کتابین نکی عجیب و غریب خط تصویر مین مرقوم ہین عبرانی زبان کی نہایت قدیم کتابین بھی چمڑے ہی پر لکھی ہوئی ہین۔

کاغذ سب سے پہلے اہل چین نے ایجاد کیا۔ سنہ ۱۲۳ء مین چین مین کاغذ سازی شروع ہو چکی تھی۔ علماء کی رائے ہے کہ ہندوستان مین کاغذ چین ہی سے آیا ہے۔ یورپ مین کاغذ کا رواج مصر سے ہوا۔ دریائے گنگا کے کنارے ریاضت و عبادت کرنے والے مہرشیون نے جس طرح ہندوستان مین تہذیب پھیلائی ویسے ہی دریائے نیل کے کنارے سے یورپ مین تہذیب پھیلی۔ اس دریا کے پانی مین پاپیرس نامی ایک نباتات پیدا ہوتی تھی۔ اس سے اہالیان مصر نے کاغذ بنایا۔ مصر کی نہایت قدیم کتابین اسی پاپیرس کاغذ پر ہین۔ ان کی مشہور و معروف تاریخ "مردہ انسانون کی کتاب" پاپیرس ہی پر لکھی ہوئی تھی۔ اس کتاب کو مصریون کی گزرتوریت سمجھنا چاہیے۔ پاپیرس کاغذ مصر ہی مین بنتا تھا۔ جملہ غربی تجارت بھی انھین لوگون کے ہاتھ مین تھی۔ یہی باعث تھا کہ ان کی بلا منظوری پرگامم مین کاغذ نہ پہونچ سکا۔ اس پاپیرس ہی سے انگریزی زبان کا لفظ "پیپر" بنا ہے۔

دنیا کی تہذیب مین کاغذ سیاہی اور قلم نے جس قدر حصہ لیا ہے کسی اور چیز نے نہین لیا۔ اگر لکھنے کے ذرائع نہ ہوتے تو نامعلوم دنیا کی تاریخ آج کیا ہوتی۔

فہم لکھنوی

سحر

علوم قدیمہ مین علم سحر کو دنیا مین شمس تہذیب کی شعاعین پھیلنے سے پہلے بہت زیادہ عظمت و اقتدار حاصل رہا ہی۔ کتب الٰہیہ توراۃ، انجیل اور قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہی کہ اک زمانہ مین سحر کی اہمیت وعظمت دنیا مین اسقدر رہی ہی کہ دنیا کا کوئی کام اُسکے اثر سے خالی نہ تھا۔ مذہب تھا تو اسی پر مبنی تھا اور انسانی زندگی کے امور ضروریہ تھے تو اسی سے وابستہ۔ یہان تک کہ اُس زمانہ کے لوگ دنیا کا قیام و نظام اسی پر منحصر سمجھتے تھے، لیکن تہذیب و تمدن اور علوم الٰہیہ کے نشو و نما پانے سے سحر و طلسمات مین تنزل پیدا ہوا اور مذہب نے تو اسکے افراد و خیالات کے خلاف ایک ایسی زبردست جنگ کی کہ دنیا سے اُسکا اثر تقریباً مٹ ہی گیا۔ مذاہب مین سب سے زیادہ مذہب اسلام نے سحر اور اسی قسم کے دوسرے اُن ظنی علوم کی قوت توڑنے کی کوشش کی جو قدرت و کمالات الٰہی اور شان خداوندی مین ایک حد تک مداخلت کرنے والے تھے۔

اسلام نے اس قسم کے علوم حاصل کرنے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کو حکم الٰہی کے خلاف قرار دیا اور آخر ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیروان اسلام نے علم سحر کو مذہب الٰہی کے خلاف سمجھ کر چھوڑ دیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کا اثر کم ہوتے ہوتے تقریباً بالکل ہی جاتا رہا۔ لیکن تعجب ہی کہ مذہب اسلام کی ان سختیون کے باوجود آج سحر کے متعلق جسقدر معلومات ہمارے پاس ہین اور جتنی کتابین اس علم مین ملتی ہین، اُن مین سے زیادہ حصہ مسلمان محققین کی تحقیقات اور زور قلم کا نتیجہ ہی۔

ہمارا یہ تو دعویٰ نہین ہی کہ متقدمین کی تصنیفات مین سے علم سحر کے متعلق کوئی کتاب اس وقت دنیا مین موجود نہین ہی۔ البتہ یہ ضرور ہی کہ حال کی تحقیقات مین علم سحر کے متعلق جسقدر لکھا گیا ہی وہ عموماً مسلمانون کی تالیفات اور تراجم کی مدد سے، اور ہمارا یہ مضمون بھی مسلمان مورخین اور محققین کی تحقیقات کا نتیجہ ہی جو مختلف عربی تاریخون اور علمی کتابون سے ماخوذ ہی۔

علم سحر اپنے مختلف شعبون کے لحاظ سے بہت سی اقسام پر مشتمل ہی جنمین سے بعض اعمال و اسرار ہین، بعض روحانی اور جسمانی ریاضتین اور بعض ایسے حسابات، ترتیب الفاظ، حروف اور نقوش جن سے ایک خاص صورت و ہیئت حصول ظن کے لیے پیدا ہو جاتی ہی اور ان سب سے مقصود امور غیب اور اسرار و حالات مخفی پر اطلاع حاصل کرنا یا کسی شے اور شخص پر اثر ڈال کر خوق العادت کام لینا وغیرہ ہی۔

سب سے پہلے علم سحر سے بابلیون اور کلدانیون نے کام لیا اُس زمانہ مین اس کا رواج بڑھتے بڑھتے اسقدر ترقی پر پہنچ گیا تھا کہ ایک حد تک جزو مذہب بن گیا۔ انھین سے یہ علم دوسرے ملکون اور شہرون مین پہنچا اور آج بھی جسقدر پایا جاتا ہی انھین کی یادگار ہی بابلیون کے علاوہ فارس اور مصر مین بھی عرصہ تک علم سحر کا اعتقاد رہا اور ہر زمانہ مین معتقدین سحر اسمین بہت سی عجیب و غریب اور نئی باتین پیدا کرتے رہے۔

مورخین کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہی کہ بابلیون، پارسیون اور مصریون نے علم سحر مین جو ترقی حاصل کی اور جس ریاضت و نفرت اور تعجب انگیز عقیدت سے اُسکو حاصل کیا اور اعتقاداً اُسپر عمل کیا دنیا مین اس وقت تک کسی قوم اور ملک کو یہ بات نصیب نہین ہوئی چنانچہ بابل و نینوا اور مصر کی پرانی عمارتین کھنڈرات زمین دوز راستے اور معابد اور جدید دریافت شدہ آثار قدیمہ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہی کہ بابل و مصر وغیرہ کسی زمانہ مین سحر و طلسمات کا مرکز و معدن ہو گئے۔

عرب مین اسلام سے پہلے سحر کی ایک خاص قسم کہانت کا رواج تھا

جس مین عربون نے بہت سی نئی باتین اضافہ کین اور سحر کی اس خاص نوع کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔

ظہور اسلام سے پہلے عرب مین کہانت کا اسقدر چرچا تھا کہ کوئی کام کاہن کے مشورہ بغیر نہین کیا جاتا تھا، لیکن اسلام کے بعد اس کا اثر جاتا رہا اور سحر کی دوسری اقسام کا اہل عرب نے فارس وغیرہ سے حاصل کرکے یا دوسری زبانون کی کتب سے ترجمہ کرکے رواج دیا اور بہت سے رسائل اور ضخیم کتابین سحر وغیرہ علوم پر تالیف و تصنیف کین۔ لیکن اسلام کے بعد اہل عرب نے علوم سحر مین جو کچھ لکھا اُن کا اکثر حصہ محض علمی خدمت پر مبنی تھا اور بہت کم اعتقاد کے خیال سے ترتیب دیا گیا تھا۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہین علم سحر کی بہت سی اقسام ہین جنکا احاطہ اس مختصر مضمون مین دشوار ہے، اس لیے ہم ذیل مین صرف اُن اقسام کا ذکر کرتے ہین جو بہت زیادہ مشہور ہین۔

(۱) سحر و طلسمات

محققین علم سحر کا خیال ہے کہ علوم سحر اُن آثار یا قوت خیال و وہم پر مبنی ہین جو انسانی نفوس مین پائے جاتے ہین، یعنی انسان ان آثار اور قوتون سے عالم عناصر مین تاثیر پیدا کرنے یا اُن کو اپنے اثر سے متاثر کرنے کی قوت رکھتا ہے۔

اس کا ثبوت اُن کے الفاظ مین یہ ہے کہ انسانی نفس مین حالتِ طبعی اور اسبابِ جسمانی کے خلاف کچھ آثار پائے جاتے ہین، جو کبھی روح کی ایک خاص کیفیت سے پیدا ہوتے ہین، جیسے کہ فرحت و سرور مین جسم کا خود بخود گرم ہو جانا، اور کبھی نفسانی تصورات سے، جیسے غلبۂ وہم سے امر موہومہ کا وقوع پذیر ہونا۔ اسکی حقیقت سمجھنے کے لیے یہ مثال کافی ہے کہ کوئی شخص مثلاً پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھ رہا ہو اور اسکا وہم یا خیال اسپر قائم ہو جائے کہ وہ اس چوٹی سے گرنے والا ہے، یقیناً وہ چوٹی سے گر جائے گا۔ اسی طرح جو شخص اپنے خیال کو قائم کرکے کسی ایسی چیز کی مشق حاصل کرے جو بظاہر مشکل اور فوق العادت ہو اور وہم دور ہو جائے جیسے بلند پہاڑ کی ترچھی چٹان پر چڑھنا، تو وہ آسانی سے چٹان پر چڑھ جائے گا اور ہرگز نہ گرے گا۔

یہ دونون صورتین ایسی ہین کہ اس علم کے جاننے والے اس سے بہت کام لیتے ہین۔ بہت دفعہ دیکھنے مین آیا ہے کہ ساحر جسم کو سادہ کر اور قوت خیال و وہم کو قائم کرکے لوہے یا تانبے کے باریک تار پر بے تکلف چلتے ہین، یہان تک کہ سائیکل تک کو خاصی رفتار سے تار پر لیجاتے ہین، اور گرتے نہین۔

ان دلائل سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی قوتین نفس انسانی مین موجود تو ہین لیکن حالت طبعی یا اسباب جسمانی سے اُنھین کسی نوع کا تعلق نہین بلکہ یہ تمام امور یا قوتین عارضی ہوتی ہین جو مختلف طریقون سے حاصل کی جاتی ہین، اور بعض وقت خود بخود پیدا ہو جاتی ہین تو جب بدن انسانی مین اس قسم کی قوتون کا وجود تسلیم ہے تو بدن انسانی کے سوا بھی یہ قوتین دوسرے ابدان و اجسام مین بھی موجود ہونی چاہئین۔ کیونکہ ان کا تعلق جب بدن انسانی مین طبیعت اور اجسام کے اسباب سے نہین ہے، بلکہ اسکے خلاف آثار و قوی ہین تو دوسرے اجسام و ابدان مین بھی اسی نوعیت سے ضرور پائی جانی چاہئین، اسلیے یہ کلیہ صحیح ہے کہ سحر و طلسمات کی قوت تمام اجسام مین پائی جاتی ہے اور وہ یا تو خود یا کسی دوسری قوت کی اعانت سے اُس سے کام لیتے ہین۔

اُن جانورون پر نظر ڈالو جنکے افعال و حرکات فوق العادت نظر آتے ہین، اور جن سے بازیگر، مداری، بھان متی یا ساحر عجیب و غریب کام لیتے ہین۔ ہر چند کہ جانور خود اس قسم کی قوت حاصل کرنے یا اُس سے کام لینے کی عقل نہین رکھتے کیونکہ اُن کو قدرت نے

جزئیات کا ادراک دیا ہی کلیات کا نہین، اسلیے انسان اُن سے اُن کی طبیعت اور اسباب جسمانی کے خلاف کام لیتے اور اُنکو مجری طبعی کے خلاف امور کا خوگر بنا دیتے ہین، اور پھر یہ قوت ان مین مدت العمر باقی رہتی ہی۔

علم سحر کی یہ صنف نہایت جامع اور وسیع ہی اور ضرورت تھی کہ ہم اسکو ذرا وضاحت سے لکھتے لیکن طوالت کے خیال سے ہم نے اسیقدر پر اکتفا مناسب سمجھا۔

سحر اور طلسمات اپنے آثار اور قوتون کے لحاظ سے بظاہر ایک ہی چیز ہین۔ فرق صرف اتنا ہی کہ ساحر اپنے فوق العادت امور پیش کرنے اور حیرت انگیز کام دکھانے مین کسی خارجی چیز کا محتاج نہین ہوتا بلکہ جو کچھ کرتا ہی اپنی ذاتی قوت اور مشق و خیال سے، اور طلسمات البتہ خارجی اعانت کا محتاج ہی۔ ماورائے ازین سحر کے خلاف طلسمات مین اسرار اعداد، روحانیات کواکب، خواص موجودات اور اوضاع افلاک سے بھی مدد لی جاتی ہی جو صاحب طلسمات کے نزدیک عالم عناصر مین موثر ہین بعض کا خیال ہی کہ سحر ایک روح کا دوسری روح سے متحد ہونے کا نام ہی اور طلسمات مین روح کا اتحاد جسم سے ہوتا ہی جسکی توضیح اُن کے خیال کے بموجب یہ ہی کہ طبائع علویہ سماویہ کا طبائع سفلیہ کے ساتھ متحد و مربوط ہونا طلسمات کا اصل اصول ہی اور اسی وجہ سے صاحب طلسمات اپنے کامون مین ستارون کی گردش اور اُن کی ارواح سے کام لیتا اور اُن کے آثار و طبائع سے اپنے کامون کا نتیجہ حاصل کرتا ہی۔

چونکہ سحر کے افعال و حرکات انسانی نفس کی قوت غیر طبیعیہ سے وجود پذیر ہوتے ہین، اور فطرت نوعی اس قسم کی تاثیرات کے خلاف نہین ہوتین، اس لیے وہ افعال اور امور فوق العادت جو خاصان خدا سے ظہور پذیر ہوتے ہین سحر مین داخل نہین ہین۔ کیونکہ ان امور کا تعلق نہ فطرت نوعی سے ہوتا ہی اور نہ نفس انسانی کی قوت غیر طبیعیہ بلکہ ان کا وجود پذیر ہونا قوت الٰہیہ پر موقوف ہی جو برگزیدگان مذہب اور منزل من اللہ لوگون مین خدا کی طرف سے پیدا ہوتی ہی اور جس کے ذریعہ سے دنیا کو فوق العادت امور دکھا کر اپنے دعوے کا ثبوت پیش کیا جاتا ہی۔ اس قسم کے امور کو جو قوت الٰہیہ کی تائید سے ظہور پذیر ہون معجزہ کہتے ہین اور جو امور فطرت نوعی یا نفس انسانی کی قوت غیر طبیعیہ کا نتیجہ ہون اُن کو سحر۔

بعض دفعہ معجزہ اور سحر مین ایک غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہی اور مشکل سے پتہ چلتا ہی کہ یہ معجزہ ہی یا سحر، اور یہ صورت اُس وقت پیش آتی ہی جبکہ ساحر اپنے ملکۂ خاص یا تعلق روحانیات سے کواکب او شیاطین یا ارواح خبیثہ سے امداد حاصل کرنے کی قوت حاصل کر لیتا ہی اور اُن کے ذریعہ سے بعض ایسے فوق العادت امور پیش کرتا ہی جو نفس انسانی کی قوت فطری سے بہت کچھ بلند و برتر ہوتے ہین۔ اسکی شناخت اس طور پر ممکن ہی کہ قوت الٰہیہ کی مدد سے جو معجزہ ظہور پذیر ہوگا وہ عین حقیقت اور واقعہ نفس الامری ہوگا اور سحر اس کے خلاف۔

ابن خلدون مشہور مورخ لکھتا ہی کہ سحر و طلسمات کے تاثیرات نفسانی ہی کے اصناف مین سے ایک اور قسم آنکھ کے ذریعہ سے کسی پر اثر ڈالنا ہی اور یہ ایک خاص مشق و ملکہ ہی جو ساحر حاصل کرتے ہین اور اس قوت یا ملکہ سے معمول پر حیرت انگیز اثر ڈال کر اُس سے عجیب و غریب کام لیتے ہین بعض لوگون کی آنکھون مین فطری طور پر بھی اس قسم کی قوت ہوتی ہی کہ اُن کی نگاہ مقابل یا مخالف یا معمول پر بہت سے فوق العادت اثرات پیدا کرتی ہی۔ فرق صرف اتنا ہی کہ فطری قوت بے اختیار اثر کرتی ہی اور غیر فطری یا کسبی اختیاری ہوتی ہی۔

(۲) سیمیا یا اسرار حروف

حاملان علم سحر کی اصطلاح مین سیمیا اُن تصرفات الٰہیہ کا نام ہی

جو مخصوص حروف اسماء حسنیٰ اور کلمات الٰہیہ کے ماتحت عالمِ طبیعت مین ہوتے ہین یعنی قدرت نے اسماء حسنیٰ اور کلمات مخصوصہ مین کچھ ایسے اسرار و اثرات و دلیعت رکھے ہین کہ عالم کون یا طبیعت پر اُن کا اثر ہوتا ہی اور وہ حروف جو اسرار ربانی اپنے اندر رکھتے ہین عالمِ طبیعت مین تصرف کرتے ہین۔

حروف و کلمات اور اسماء حسنیٰ کے تصرفات مین محققین کا اختلاف ہی بعض لوگ حروف کے مزاج کو فعل تصرف کی حقیقت قرار دیتے ہین اُن کے نزدیک حروف عناصر کی طرح طبیعت رکھتے اور حسبِ ذیل اقسام پر منقسم ہین: آتشی - بادی - آبی - خاکی -

ان چارون طبیعتون کے مخصوص حروف ہین جو بہ قاعدۂ ابجد اس طرح منقسم ہین کہ ابجد کے مسلسل کلمات مین سے پہلا حرف آتشی دوسرا بادی تیسرا آبی اور چوتھا خاکی ہی۔ اسی طرح تمام حروف مسلسل آتشی بادی آبی اور خاکی ہین۔ اس اعتبار سے آتشی حروف سات ہین یعنی ابجد کے مسلسل کلمات مین سات حرف آتشی ہین یعنی ا- ہ-ط-م-ف-ش-ذ- اور سات بادی یعنی ب-و-ی-ن-ض- ت-ظ- اور سات آبی یعنی ج-ز-ک-س-ق-ث-غ- اور سات خاکی یعنی د-ح-ل-ع-ر-خ-س-

اہلِ سیمیا کے نزدیک حروف اپنے مذکورۂ بالا امزجہ کے لحاظ سے موجودات پر مختلف اثر ڈالتے ہین۔ مثلاً آتشی حروف سرد امراض کے دفع کرنے اور قوت حرارت زیادہ کرنے مین خاص طور پر موثر ہین۔ آتشی حروف مین قوت حرارت بڑھانے مین مختلف حالتین ہین بعض اشیاء مین ان کی قوت حسی اعتبار سے اثر کرتی ہی اور بعض چیزون مین حرارت حسی پیدا نہین کرتی بلکہ حرارت کا مفہوم یا حکم پیدا کرتی ہی۔ غیر حسی حرارت کی مثال ستارۂ مریخ کا اثر ہی یعنی جس حرف سے مریخ کو نسبت طبعی ہوگی اُس کا اثر یہ ہوگا کہ جنگی کامون اور قتل و غارت گری مین اُس سے مدد ملے گی۔ اسی طرح آبی حروف گرم امراض (بخار وغیرہ) کے دفع کرنے اور سرد قوتون کو تقویت دینے مین خاص طور پر اثر رکھتے ہین

بعض کے نزدیک حروف کے تصرفات عددی نسبت کے اعتبار سے ہین یعنی حروف کے اعداد احاد عشرات اور مآت وغیرہ مین اگر باہم ایک قسم کی نسبت ہو تو اُن کا اثر قوی ہوگا اور اگر حروف کے اعداد کی نسبت باہم مختلف ہو تو اثر کمزور۔ مثلاً حرف ب کے عدد دو ہین اور کاف کے ۲۰ اور راء کے ۲۰۰ یہ تینون حرف احاد عشرات اور مآت مین باہم دو کی نسبت رکھتے ہین۔ اسی طرح مذکورۂ بالا حروف او دال میم اور تاء مین (کہ باہم چار کی نسبت رکھتے ہین) نصف اور ضعف یعنی آدھے اور دُگنے کی نسبت ہی۔

حروف کے امزجہ، طبائع اور نسبت عددی اور حروف کے ذاتی خواص و آثار چونکہ بظاہر عسیر الفہم ہین اور کسی خاص فن یا علم سے تعلق نہین رکھتے بلکہ ذوق و کشف پر مبنی ہین اس لیے اُن کے متعلق کوئی خاص قاعدہ وضع نہین کیا جا سکتا۔ البتہ حاملانِ علم سحر وغیرہ نے اپنی تحقیقات اور ذوق و کشف سے جو جزئیات پیدا کی اور اُنکے متعلق مخصوص قواعد ضبط کیے ہین اُنھین پر قیاس کرکے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہین۔

(۳) سوالات کے جوابات نکالنا

سحر کی یہ نوع سیمیا کی ایک فرع ہی جسکو اصطلاح سحر مین زائچہ کہتے ہین۔ اس سے مجاہدہ طاعت عبادت محبت اور تعشق وغیرہ امور متعلق ہین اور حروف کے ذریعہ سے سوالات ضمیر وغیرہ بنائے جاتے ہین۔

علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ مین اسکے متعلق ایک طویل بحث کی ہی اور اُسکے قواعد و اصول کو شرح بیان کیا ہی جس کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہی۔

(۴) رمل

سحر کی اقسام مین رمل کو ہر زمانہ مین عظمت و اقتدار حاصل رہا ہی اسکی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہی کہ ابتدا ئً رمل یعنی ریت پر نقوش و خطوط انگلی سے کھینچ کر زائچہ بنایا جاتا تھا۔ لیکن علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ یہ قاعدہ ترک کرنا پڑا اور تختون کاغذون وغیرہ پر خطوط و نقوش بنا کر اشکال حاصل کی گئین اور اب تو اس نے اتنی ترقی حاصل کی ہی کہ پانسہ یا قرعہ پھینک کر اشکال قائم کر لیتے ہین۔

سب سے پہلے اس سے اس طرح کام لیا گیا کہ ایک سانس مین نقطون کی چار سطرین بغیر شمار کے قائم کی گئین اور انکو دو پر تقسیم کرنے کے بعد اگر کچھ نہ بچا تو خط زوج (--) اور اگر ایک نقطہ باقی رہا تو خط فرد (۰) قائم کیا گیا۔ اسی دستور پر چارون سطرون سے ایک شکل چار مرتبہ کی بنائی گئی۔ اسی طرح نقطون کی سوٗلہ سطرون سے چار شکلین بنائی جاتی ہین اور پھر ان چار شکلون سے چار شکلین اور پھر آٹھون کے امتزاج سے چار اور اسی طرح سوٗلہ شکلین حاصل کی جاتی ہین۔ ان سوٗلہ شکلون مین اُن کے خیال کے مطابق بارہ شکلین بارہ بروج کے اعتبار سے اور چار اوتاد فلک کے لحاظ سے۔ کُل سوٗلہ شکلون سے نتیجہ سوال حاصل کیا جاتا ہی جنکی طبیعت مرتب باہمی نسبت اور تعلق بروج و ستارگان سے عالم عناصر و موجودات پر احکام لگائے جاتے ہین۔

علم نجوم رمل ہی کے قاعدون سے مستنبط ہوا ہی۔ فرق دونون مین صرف اسقدر ہی کہ نجوم اوضاع طبیعت سے منسوب ہی اور رمل اتفاقات سے متعلق۔

بعض لوگون کا خیال ہی کہ رمل اسرار نبوت قدمیہ سے ہی جس کو حضرت ادریس اور حضرت دانیال علیہم السلام نے ایجاد کیا یا اس سے زیادہ تر کام لیا۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ یہ نسبت کسی معتبر تاریخی ثبوت اور شہادت سے بالکل خالی اور دلائل عقل سے معرا ہی۔ اسلیے کہ نبوت اس قسم کے علوم سے کام لینے کی محتاج نہین ہی بلکہ نبی قوت الٰہیہ کے ذریعہ سے امور عجیب اور اسرار خفیہ کا اظہار کرتا اور معجز پیش کرتا ہی۔

رمل اور نجوم کے ذریعہ سے امور غیب اور ضمائر انسانی وغیرہ کا حال معلوم کیا جاتا اور مخفی چیزون کا پتہ بتایا جاتا ہی اور بھی ان سے بہت سے کام لیے جاتے ہین۔ یہان تک کہ اطبا متقدمین و متاخرین نے تو امراض کی تشخیص اور ادویات کی تجویز مین بھی ان سے مدد لی ہی۔

(۵) حساب نیم

ارسطو نے اپنی کتاب سیاست مین اس علم کا نہایت تفصیل سے تذکرہ کیا ہی اور اسکو علوم سحر کی اصناف مین قرار دیا ہی۔ اس سے غالب و مغلوب کا حال معلوم کیا جاتا ہی۔ یہ علم نہ روحانیات سے تعلق رکھتا ہی اور نہ تاثیرات نجوم سے اور نہ ظن و تخمینہ سے اسے کسی خاص قسم کی نسبت ہی بلکہ یہ صرف ایک حساب ہی جس سے بادشاہون اور دشمنون کے باہم غالب و مغلوب ہونے کا پتہ چلتا ہی۔ اس سے کام لینے کا قاعدہ یہ ہی کہ بہ قاعدۂ جمل حریفین کے نام کے حروف کے اعداد علٰحدہ علٰحدہ جمع کیے جائین اور انکو علٰحدہ علٰحدہ نو پر تقسیم کر دیا جائے۔ تقسیم کرنے کے بعد اگر دونون نام کے بقیہ اعداد کم و بیش ہین اور دونون بحیثیت زوج یا فرد متحد ہین تو جس کے نام کے اعداد کم ہین وہ غالب رہے گا اور اگر ایک کے بقیہ اعداد زوج ہین اور دوسرے کے فرد تو جس کے اعداد زیادہ ہین وہ غالب ہی اور اگر تقسیم کے بعد دونون عدد برابر ہین اور زوج ہین تو مطلوب غالب اور اگر دونون فرد ہین تو طالب غالب۔

مذکورۂ بالا قاعدۂ تقسیم کے علاوہ اور بھی کچھ شرائط و اقسام ہین جن کا بیشتر حصہ عموماً انھین اقسام مین اضافہ کر لینے کے بعد حاصل ہوا ہی۔

یون تو سحر کے جاننے والے اور اس علم کے عالم کامل ہر زمانہ اور ہر ملک مین رہے ہین لیکن عرب مین اسلام سے پہلے سحر کا بہت زور تھا یہان تک کہ بعض کامل الفن ساحرون نے اپنی قوت سحر کے بھروسہ پر نبوت تک کا دعویٰ کیا ہے جنمین سے افعی کاہن، جذیمۃ الابرش، ابن الصیاد، سواد بن قارب، اسود عنسی، عامر بن عبداللہ، مسیلمہ کذاب، سجاح، طلحہ اسدی وغیرہ بہت مشہور رہین۔ ان مین سے بعضے ظہور اسلام کے بعد بھی موجود تھے۔

مسلمانون مین علم سحر اور کیمیا کے عالمون مین جابر بن حیان بہت بڑا شخص گذرا ہے۔ اس کے بعد مسلمۂ بن احمد مجریطی، امام بونی، ابن علی، احمد بن علی، ابو معشر فلکی، ابو العباس غمری، صلاح الدین صفدی، بسطامی اور جوبری وغیرہ ساتوین صدی ہجری کے بہترین عالمان سحر تھے۔

علوم سحر کی قدیم کتب کا ذخیرہ اب بہت کم ملتا ہے۔ البتہ نایاب قلمی کتاب کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ مصر کے مشہور خدیوی کتبخانہ مین اس وقت تک موجود ہے۔

آغا رفیق (بلند شہری)

العصر

ہندسہ کی تاریخ

علوم و فنون قدیم مین شاید ہندسہ سب سے پُرانا علم ہے۔ یہ کہنا نہایت دشوار ہے کہ اسکی ابتدا کس زمانہ مین، کس ملک مین، اور کس آدمی کے وسیلہ سے ہوئی تھی۔ کسی قسم کے معتبر تاریخی کوائف موجود نہین ہین، جن سے اسکی ابتدائی تاریخ پر روشنی پڑے۔ صاحب فکر اس امر کو تسلیم کرین گے کہ عقل انسانی کی ابتدائی مصروفیتون اور کوششون کا پتہ لگانا ناممکن کے قریب قریب ہے۔ جس وقت انسان صفحہ ہستی پر نمودار ہوا؟ اور اُس نے موجودات ارضی و سماوی پر پہلے پہل نگاہ ڈالی، تو اُس کے دل مین کیسے کیسے خیالات، کیسے کیسے ولولے، اور کیسی کیسی اُمنگین پیدا ہوئی تھیں!، اور اُنھیں اُس نے کس طرح ظاہر کیا تھا؟ آیا حروف میں بند کیا تھا، یا صرف زبانی تحسین اور واہ واہ پر اکتفا کی تھی؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش بالکل بے سود ثابت ہوگی؛ البتہ تصور سے کام لیا جاسکتا ہے۔ جب ہم کسی ایسی شے کو دیکھتے ہین جو ہمارے مشاہدہ مین پہلے کبھی نہ آئی ہو، اور نہ اُسکا کبھی ذکر سنا ہو، اُس وقت جو خیالات ہمارے دل مین اُٹھتے ہین، وہی ابتدائی انسان کے ذہن مین بھی تولد پذیر ہوے ہون گے۔

قدامت ہندسہ کی بابت تاریخی شہادت آثار قدامت سے جو ایشیاے کوچک، ایران، مصر، میکسیکو وغیرہ ملکون کے پُرانے شہرون کے کھنڈرون سے برآمد ہوے ہین، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم بعید مین کئی قومون نے تمدن مین معتدبہ ترقی کی تھی۔ چاہے اُن کی ترقی بیسوین صدی کی ترقیون کے مقابلہ مین پاسنگ بھی نہ ہو، مگر اُن قومون نے اپنی اپنی ہمت کے مطابق علوم و فنون کو ترقی دینے کی کوشش کی تھی اور وہ اُسکے نشان اور ثبوت پیچھے چھوڑ گئے ہین جو آثار قدیمہ کے محققون کی کوششون سے ہم پہنچ رہے ہین۔

اہل مصر ہم صرف تاریخی کوائف کی شہادت پر علم ہندسہ کی ابتدا

اور اسکی ترقی ایک خاص قوم سے منسوب کرینگے، جس سے بعد ازان اور قومون نے سیکھا اور اُن کی دماغی کوششون سے اسے نشوونما حاصل ہوئی۔

ہندوؤن کے تمدن کی قدامت ہنوز ثابت نہین ہوئی ہے جو کچھ ثابت ہوا ہے، اُسکی بنا پر ہم اپنے تئین زمانۂ قدیم کی قدیم ترین قوم نہین قرار دے سکتے۔ مگر مصر و بابل کے پُرانے تاریخی کوائف اور قدیم زمانہ کی یادگارین اُن قومون کے نہایت پُرانے تمدن پر معقول روشنی ڈالتی اور معتبر شہادتین پیش کرتی ہین۔ اس لیے اگر اہل مصر سے علم ہندسہ کی ابتدا منسوب کی جائے، تو غیر مناسب نہوگا۔ منتو قدیم زمانے کا ایک نہایت ہی مشہور مصنف تھا جو مسیح سے تقریباً تین سو سال پیشتر ہو گزرا ہے۔ یہ ہنی طس کے سورج دیوتا کے مندر کا پجاری اور مصری پروہتون کے مہا منڈل کا پردھان تھا۔ یونانی زبان اور دیگر علوم و فنون کا جو اس زمانہ مین مصر یا اُسکے قرب و جوار کے ممالک مین رائج تھے ماہر تھا۔ اُس نے طالمی فلدل فوس ثانی کے حسب فرمائش "تاریخ مصر" قدیم زمانہ سے لے کر اس بادشاہ کے عہد تک مرتب کی تھی۔ اس مین اُس نے اکتیس ۳۱ شاہی خاندانون اور تین سو ستر ۳۷۰ بادشاہون کے حالات قلمبند کیے تھے۔ اسکے بیان کی رو سے پہلا مصری بادشاہ جس کا نام منس تھا ۵۰۰۴ ق م مین تخت نشین ہوا تھا۔ اُس نے بالائی اور نشیبی حصص مصر کو متحد کر کے حکومت کی تھی۔ اسی مورخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اہرام مصر یہ چوتھے خاندان کے ایک بادشاہ نے تعمیر کیے تھے، جس کی تصدیق نیول صاحب کی دریافتون سے ہو گئی ہے۔ یہ چار ہزار سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ پروفیسر فلنڈر پیٹری نے جو انگلستان کے ایک مشہور محقق ہین اور مصری یادگارون اور آثارون کے بھی بڑے ماہر سمجھے جاتے ہین، شاہی مقبرون کو کھودا ہے، اور وہان سے کئی عجیب چیزین نکالی ہین جن کی بنا پر وہ کہتے ہین کہ مصر کے پہلے بادشاہ نے تقریباً ۵۵۰۰[1] ق م مین حکومت کی۔ گیارھوین شاہی خاندان کے بادشاہون کا زمانہ حرفتی ترقیون کے سبب سے بہت ہی مشہور سمجھا جاتا ہے۔ اسکے تیسرے رکن امینم ہات ثالث نے کئی عجیب عمارتین تعمیر کرائی تھین۔ اُس نے صحرا مین ایک مصنوعی جھیل بھی بنوائی تھی جس مین نیل سے کاٹ کر نہرین ڈالی گئی تھین۔ اسکے کنارے پر ایک مربع نمانہایت عالیشان عمارت بنوائی تھی جو بھول بھلیون کا محل تھا۔ پتھر کا تھا۔ قرن الحجر جدید اور قرن الحجر قدیم کی کئی چیزین قاہرہ کے مشرق سے نکلی ہین۔ مثلاً پروفیسر ہینٹز نے چند برس ہوئے قاہرہ کے قرب مین ایک پرانا کارخانہ دریافت کیا تھا جہان قدیم زمانہ مین چقماق وغیرہ کے سنگین اوزار اور ظروف بنتے تھے۔ جبل السلسلہ متصل طیبہ مین جنرل پٹ ریورس اور پروفیسر ہینٹز نے زمین کے چند فٹ اندر سے پتھر کی بنی ہوئی اشیا دوران تحقیقات مین نکالی تھین۔ ان کی نسبت مکبن صاحب جو جنرل پٹ ریورس کے ہمراہ تھے لکھتے ہین "یہ چیزین مصری مندرون اور یادگارون سے بھی پُرانی ہین"۔ یہ آثار و علامات تمدن مصری کی قدامت پر دلالت کرتے ہین جو عالمان آثار قدیمہ کی رائے مین چھ اور بارہ ہزار سال کے مابین ہے۔

اہل بابل | براسوس شہر بابل مین تقریباً پونے تین سو سال قبل از مسیح، بیلس یا بیل دیوتا کے مندر کا پجاری تھا۔ یہ شخص بڑا مشہور فاضل تھا۔ کئی زبانون کا ماہر تھا بابل، اکاد، اسور اور قرب و جوار کے ملکون کی تاریخ اور علوم سے بھی واقف تھا۔

---

[1] بحوالہ سیموئل لینگ، ابتدائی انسان کا ۲۵ تمہیدی ودی جنر صفحہ ۱۷ مصنفہ ایس لینگ۔

اُس نے ڈھائی سو سال قبل مسیح مین ایک تاریخی کتاب مرتب کرکے انطیاکس اول کے نذر کی تھی جس کا نام "چلدکہ" "یعنے ملک کلدیہ" تھا۔ اس مین اُس نے بابل اور نینوہ کی نہایت قدیم زمانہ کی تاریخ بیان کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن دونون ملکون مین ایک بہت قدیم زمانہ مین علوم و فنون کا چرچا تھا اور اُن مین بہت ترقی ہوئی تھی۔ جیسے منظور کے بیانات قدیم زمانہ کی مصری یادگارون اور کتبون اور نیز یونانی مورخون مثلاً ہیرداطوس اور دیودورس سے ہوتی ہے، اسی طرح براسوس کے کوائف کی خط میخی کے کتبون اور خشتی کتابون کے بیانات سے جو بابل اور نینوہ کے کھنڈرون سے برآمد ہوئی ہین، اور نیز قدیمی یادگارون سے، پوری تائید ہوگئی ہے۔

اس بحث سے یہ دکھانا منظور ہے کہ مصر اور کلدیہ و اسوریہ کے کتبون اور یادگارون اور دیگر تاریخی کوائف سے بہت قوی شہادت اس قیاس کو تقویت دینے کے لیے موجود ہے کہ وہان ایک نہایت قدیم زمانہ مین علوم و فنون کو بہت رونق حاصل ہوئی تھی، اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا محال نہین ٹھہر سکتا کہ علم ہندسہ کی مصر مین ابتدا ہوئی تھی۔

کلدانی ہندسہ بعض عالمون کا یہ خیال ہے کہ ابتدا مین جو قوم دریاے دجلہ اور فرات کے کنارون پر آباد تھی اُس نے حساب اور ہیئت مین سب سے پہلے ترقی کی تھی۔ اسوریہ اور بابل کی قدیمی یادگارون کی بناوٹ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہان علم ہندسہ کا کچھ رواج تھا کیونکہ وہ اسکے وسیلہ سے آنے والے واقعات کی پیشین گوئی کیا کرتے تھے۔ وہان کے باشندے رمل کے بڑے شائق تھے۔ وہ زمین پر شکلین بنا کر زائچے وغیرہ تیار کرتے تھے جس سے رفتہ رفتہ خطوط متوازی، مثلث، اور مستطیل بنانے کی طرف مائل ہوئے۔ بعد ازان اُنھون نے زاویہ قائمہ اور دوائر بنائے جن کے محیط چھ حصون مین منقسم کیے اور پھر ایسے تین سو ساٹھ (۳۶۰) ؎ مین بانٹا جس سے اُن کی غرض محیط دائرہ اور قطر کے درمیان تناسب قائم کرنا تھا۔

اہل مصر کا ہندسہ لیکن سب سے زیادہ ضروری امر قابل قدر ترقی اُس قوم کی ہے جو دریاے نیل کے کنارون پر آباد تھی۔ یونانیون نے جو یورپ مین علوم و فنون کے اُستاد سمجھے جاتے ہین، علانیہ اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اُنھون نے علم ہندسہ مصر والون سے سیکھا تھا اور جسے اُنھون نے بعد ازان بہت ترقی دی تھی۔ ہیرداطوس تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل مسیح مین سیاحت مصر کو گیا تھا۔ اس نے اپنے سیاحت نامہ مین لکھا ہے کہ علم ہندسہ کی مصر مین اُس وقت ابتدا ہوئی تھی جب سی سوس طرس نے اپنی سلطنت کی قابل کاشت اراضی اپنی رعایا کے درمیان مساوی حصون مین بانٹنے کا حکم دیا تھا۔ اس بادشاہ کے تاریخی وجود کی نسبت طرح طرح کے شکوک ظاہر کیے جاتے ہین۔ ہیرداطوس اور دیودورس وغیرہ پرانے زمانہ کے مورخ کہتے ہین کہ یہ چکرورتی راجہ تھا۔ اُس زمانہ کی معلوم دنیا اس کے زیر نگین تھی۔ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد اسکی سلطنت سے ملی ہوئی تھی۔ بارھوین شاہی خاندان کا ایک حکمران سنوسرت نامی بھی تھا جس سے یہ بڑے بڑے کارہاے نمایان منسوب کیے جاتے ہین۔ ہیرداطوس یہ بھی کہتا ہے کہ ہر سال دریاے نیل اور اسکے معاونون مین سخت طغیانیان آتی تھین جن سے ملک کا بڑا حصہ تہ آب ہونے کے علاوہ مٹی اور ریت سے ڈھک جاتا تھا۔ دیہات، قصبہ جات، پرگنہ جات اور اضلاع کے حدود مٹ جاتے تھے۔ اس مشکل کو حل کرنے کی غرض

؎ بحوالہ "دریڈ مانسٹ" مطبوعہ اکتوبر ۱۹۱۶ء

اہل مصر نے علم ہندسہ کا مطالعہ شروع کیا - یہ خیال معقول معلوم ہوتا ہے - نیل کے سالانہ سیلابوں سے جو حدود برباد ہو جاتے تھے اُس سے رہائی حاصل کرنے کے لیے مصریوں نے جو بڑے ذہین اور سمجھ والے تھے ضرور کوئی ترکیب نکالی ہوگی' اور شاید یہ ترکیب علم ہندسہ کی ہو -

اِساقرطیس نے سنہ ۲۹۳ ق م میں اپنی ایک کتاب میں لکھا تھا کہ ہندسہ کا مطالعہ ہر ایک مصری نوجوان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے - اسیطرح افلاطون' ارسطالیس' دیودرس' سقولس' ہران (متوطن سکندریہ)' مشہور عالم جغرافیہ استرابو' دماقرطوس بھی اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں - آخر الذکر یونانیوں کے درمیان علم ہندسہ کی مہارت میں خاص شہرت رکھتا تھا -

طالیس یا ثالیس ملطی جو تقریباً پونے پانچ سو برس قبل مسیح میں گذرا ہے' سیاحت کرتا ہوا مصر میں بھی گیا تھا - دیوجانس لائرشس اسکی سوانحعمری میں لکھتا ہے کہ اُس نے مصر کے مشہور شہر ہلیو پولس میں مصری پروہتوں سے علم ہندسہ سیکھا تھا' اور وہان چند ماہ تک رہا تھا' جسکے دوران میں اُس نے کئی مصری فنون سے واقفیت حاصل کی تھی -

ہرودوطس کہتا ہے کہ مصریوں نے عملی مقاصد سے یہ علم نکالا تھا اور اسکا یہ خیال درست ہے - آجکل مصر کے پُرانے شہروں کے کھنڈروں کے نیچے سے کئی بڑی عالیشان عمارتوں کے آثار نکلے ہیں اور بعض جگہ مصنوعی جھیلیں اور بند وغیرہ کے نشانات دیکھے گئے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ انھوں نے خاص عملی مقصد سے یہ علم نکالا تھا - آئسن لوہر (جرمن محقق آثار قدیمہ) نے سنہ ۱۸۷۷ء میں اپنی ایک کتاب میں جس میں اُس نے مصریوں کے ریاضیات پر بحث کی ہے' یہ لکھا تھا کہ ایک مصری مسمی احمس نے ایک چھوٹی کتاب الموسوم بہ "رہنمائے تخمینہ جات" سترھویں صدی قبل مسیح میں تیار کی تھی' جو پیلدگھاس پر لکھی ہوئی کھنڈروں کے نیچے سے برآمد ہوئی ہے - اسمین تخمینہ جات اور حساب کی بابت بہت سی باتین ہین - مگر ہندسہ کی نسبت بہت کم اطلاع ملتی ہے کیونکہ احمس نے اس علم کو ریاضیات کی ایک شاخ نہین قرار دیا ہے بلکہ حساب کا ایک قاعدہ مانا ہے جو تخمینوں مین کام آتا تھا - اس کتاب سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اہلِ مصر مربع کا رقبہ نکالنا جانتے تھے مگر انہین یہ طریقہ معلوم نہ تھا کہ مستطیل' مثلث' اور متوازی الاضلاع کا رقبہ کس طرح دریافت کیا جاتا ہے - سرزمین فراعنہ کے باشندے مربع کے برابر دائرے بنایا کرتے تھے جس کا ایک ضلع قطر کا $\frac{8}{9}$ ہوتا تھا - جو ($\frac{16}{9}$)۲ = ۳٫۱۶۰۴ کے مساوی ہوتا ہے' اور ان کا یہ قاعدہ تقریباً درست تھا - یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کھتوں کا حجم کس قاعدہ سے دریافت کرتے تھے مگر انھون نے ایک خاص طریقہ حساب[1] سے مخروطی میناروں کے حجم کا مسئلہ حل کیا تھا جو ہمارے آجکل کے زاویہ کے خط مماس اور جیب مستوی کے قاعدہ سے مشابہ ہوگا -

اس سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ اہلِ مصر کے ہندسہ کی بابت کوئی معتبر کتاب اور کتبہ نہین ہے جس سے اسکی ماہیت واضح ہو - شاید محققوں کی کوششوں سے پُرانے کھنڈروں اور یادگاروں سے ایسی تحریرین دستیاب ہو جائین جن کی بدولت یہ معلوم ہو کہ مصریوں نے کس حد تک اس علم میں ترقی کی تھی - جو کچھ دریافت ہو سکتا ہے وہ صرف عمارتوں اور انجنیری کاموں' بندوں کی طرز ساخت اور یادگاروں اور کتبوں سے معلوم ہوا ہے جسے علم بالواسطہ کہنا بجا ہوگا -

---

[1] جی ورریا زہ مانسٹ" ترجمہ ڈاکٹر ہاسٹڈ صفحہ ۲۰۰ - ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء

تاریخی کوائف کے اعتبار پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اہل یونان نے بابل اور مصر والون سے علم ہندسہ اور دیگر علوم و فنون حاصل کیے تھے جوان ممالک کے ترقی کرنے والے باشندون نے اختراع کیے اور اُنھین فروغ دیا تھا۔ مگر شاگرد نے اپنی استعدادِ طباعی اور عقلی کوششون سے اُستاد کو نیچا دکھایا۔ یہ بخوبی ظاہر ہے کہ یونانیون نے اسلاف سے علوم حاصل کیے۔ اور ان مین اتنی ترقی کی کہ اُن کی خارجی اصلیت کو بالکل ملیامیٹ کرکے اُنھین خاص اپنی اختراع بنالیا۔

یونان کی سائنس کا مبدا اور "پیشوائے اعظم" طالیس باشندہ ملطیہ تھا۔ یورپ مین پہلے پہل اسی نے علوم و فنون کو جنکا مجموعی نام سائنس ہے رواج دیا تھا۔ اس حکیم اور اسکے شاگردون نے ریاضیات کو بہت تھوڑی ترقی دی تھی مگر اُس نے اور اُسکے مقلدون نے طبعیات اور حقائق الاشیا اور مظاہر طبعی کی دریافت کا ایک نیا طریقہ رائج کیا تھا' اور اپنی توجہ کو اسی تک محدود رکھا۔ اگر طالیس اور اسکے مکتب کو یونانی حکما و علما کی ریاضی ترقیون کا مشعل بردار قرار دیا جائے تو غیر انسب نہ ہوگا۔

طالیس کے بعد فیثاغورث کا زمانہ آیا جو اطالی مکتب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اُسی نے ابتدا مین علم ہندسہ کی تحقیقات اور ترقی کی طرف اپنی تمام تر توجہ مائل کی تھی۔ اُس نے ہندسہ مین استعمال ہونے والے آلات بنائے تھے متناسب کا قاعدہ نکالا تھا' رقبہ معلوم کرنے کا ڈھنگ وضع کیا تھا وغیرہ۔

اسکے بعد اسکے دو نامی شاگردون نے ہندسہ کی تحقیقات کا کام جاری رکھا۔ ایک کا نام بقراط (متوطن خیاس) اور دوسرے کا ارخی طاس (باشندہ ترن توم) تھا اسکے بعد یونان مین جو فلاسفر اور سائنس کے طبقے قائم ہوئے اُنھون نے اس علم سے بے پروائی نہین برتی بلکہ ان مین سے بعض ایسے تھے جو اس کی ترقی کی طرف خصوصیت سے متوجہ رہے۔ زینو' دماقرطیس' انکساغورث' اور ہیپیاس' افلاطون' ارسطو اور کئی حکیم ہندسہ کی طرف متوجہ تھے۔

بہت سے حکیمون اور محققون کی مساعی متفقہ سے ہندسہ کی عمارت کی بنیاد مستحکم ہوگئی اور اسکی تعمیر مین اتنی ترقی ہوگئی کہ بعض نے خیال کیا کہ اسے ایک علم منضبط کی صورت دی جائے اسکے علاوہ تین مشہور زمانہ مسائل کے غور و خوض کی طرف بھی ان کا خیال رجوع رہا۔ ان مین ایک تربیع دائرہ' دوم تضعیف سوم تثلیث زاویہ تھا جنکے وسیلے سے ارخی طاس وغیرہ نے خطوط مسطح اور منحنی دریافت کیے تھے۔ پھر خطوط منحنی کے خواص اور استعمالات معلوم ہوئے جن کا تعلق ارس طیوس کلان سے خاص ہے ہوتے ہوتے ان یونانی عالمون اور محققون نے ریاضیات مین غیر متناہی تسلیم کرلیا جسے ہوتے ہوتے غیر معمولی اہمیت نصیب ہوگئی۔ اسکے ساتھ حقائق ہندسہ کی تفتیش اور تشریح کے طرق بھی بحث مطالعہ رہے۔ بقراط نے طریقہ استخراج وضع کیا۔ افلاطون نے طریقہ تفریق و تشریح نکالا۔ اسی زمانہ مین منطق مین بھی بڑی ترقی ہوئی کیونکہ اسے ریاضیات سے بہت گہرا علاقہ ہے۔ ایک طرف تو سوفسٹ حکما کا گروہ تھا جو عقل سے سب چیزون کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش مین طرح طرح کے مغالطات اور محالات مین پھنس گئے۔ علم مناظرے سے بھی اُسے بہت تقویت پہنچی تھی اور سب سے زیادہ سقراط کی تعلیم سے منطق کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ ہوتے ہوتے ارسطاطالیس نے اسے خاص صورت دی۔ اسکے اصول و قوانین پر فلسفیانہ بحث کی جس سے ایک معرکۃ الآرا

کتاب تیار ہوگئی جو صدیون تک منطق کے امور مین سند تصور ہوتی ہی۔

علم ہندسہ اسوقت کمال پر پہنچا جب سکندریہ کے ہندسین یونانیون کے ساتھ مل کر اُسے ترقی دینے لگے، اور یہ یونانی ہندسہ کا عہد طلائی سمجھا جاتا ہی۔ اس زمانہ کے عالمان و محققان ہندسہ کا مجمل حال لکھنا محال ہی صرف اتنا کہہ دینا کافی ہی کہ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ مین فلسفۂ یونان کو جو شہرت اور عروج نصیب ہوا تھا وہی ہندسہ کو اقلیدس، ارشمیدس اور اپالیانوس کے عہد مین فروغ حاصل ہوا تھا۔ ان ہندسون کی کوششون سے ہندسہ نے ایک نہایت عمدہ اور منضبط علم کی صورت اختیار کی۔ اسکے اصول علوم متعارفہ کے قواعد تصور ہونے لگے اور وہ مہذب دنیا مین سند سمجھے جانے لگے۔ جس کتاب مین حکیم اقلیدس نے اصول ہندسہ کو واضح کیا تھا اُسکے نام سے آج تک مشہور چلی جاتی ہی۔ یہ شخص سکندریہ کا متوطن مگر یونانی الاصل اور بطالمی اول کے زمانہ مین تین سو برس قبل از مسیح گذرا ہی۔ اسکی کتاب جو یونانیون مین "استارخیا" یعنے "عناصر" یا "اصول ہندسہ" کے نام سے مشہور تھی خلفاے ہارون الرشید اور المامون کے زمانہ مین زبان عربی مین ترجمہ ہوئی تھی۔ اسکے بعد ارشمیدس آیا جو اطالی ہندسون کے طبقہ کا بانی سمجھا جاتا ہی۔ اُس نے ہندسہ کی باریکیون پر خوب بحث کی اور اُن مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جو آجکل کیل کلس یعنی شمار ادق کے متعلق سمجھے جاتے ہین۔ یہ شخص اس علم کا اُستاد یکتا سمجھا جاتا ہی۔ ۲۸۷ ق م مین پیدا ہوا اور ۲۱۲ ق م مین انتقال کیا۔ بعض عالمون کی راے مین ارشمیدس زمانۂ قدیم کا سب سے بڑا ریاضی دان تھا مگر بہت سے فاضل اس کے ہمعصر اپالیانوس کو (اشائنر جرمن ماہر ریاضیات سے پیشتر) تمام دنیا مین سب سے بڑا ہندس مانتے ہین۔ اس مین کلام نہین ہی کہ اشائنر کے ایجاد کردہ مسائل ہندسہ بہت ہی نادر اور نہایت ادق سمجھے جاتے ہین بلکہ اس اعتبار سے وہ ارشمیدس سے بھی فائق نظر آتا ہی۔

ان تینون ہندسون، ان کے ہمعصرون، اور مقلدون کی کوششون سے علم ہندسہ زمانۂ قدیم مین ترقی کی انتہا کو پہنچا۔ انکے جانشینون مین قابل ذکر جمنیس قلیس، دیوقلیس، نکامدس، برسیوس، اور زنیودورس ہین۔ سکندریہ مین ہیران اور کلادیوس طالمی دو نہایت نامور ہندس اور ریاضی دان گذرے ہین جنھون نے ہندسہ کے ذخیرۂ حقائق مین اضافہ کرنے مین اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہین کیا۔ اول الذکر نے پیمائش نظری کے مسائل پر علمی اصول سے بحث کی تھی، اور ثانی الذکر نے اُسکے ہیئتی پہلو کو لیا تھا۔ ہیران سب سے پُرانا یونانی ہندس ہی جس نے پیمائش نظری کے فن پر کتاب لکھی اور اپنی تحقیقات کے نتائج مین احمس مصری ہندس کے ساتھ گہرا تعلق ظاہر کیا تھا، مگر اس کی کتاب کا مسودہ بہت خراب ہوگیا تھا، اس لیے صحت کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہی کہ اسکی تفتیش کا میلان کس جانب تھا۔ مگر طالمی کا نسخہ عمدہ حالت مین ہی جو اہل عرب نے برسون تک حفاظت سے رکھ چھوڑا اور اب تک موجود ہی۔ اس نے علم مثلث کو ترقی دینے کی کوشش کی اور اس سے اجرام فلکی کے بعد کی پیمائش مین کام لینے کی بھی سعی کی تھی۔

اسکے بعد کئی اور ہندس اور ریاضی دان بھی پیدا ہوئے مگر اُنھون نے اپنی تمام کوشش اپنے پیشرو اُستادون کی تصنیفات کی تشریح اور ترتیب تک محدود رکھی۔ ان مین سے کئی سکندریہ کے رہنے والے تھے، اور یہ سب یونانی نسل تھے، کیونکہ اس علاقہ مین اُن کی ایک بڑی اور شاداب نوآبادی تھی جیسے

ایشیاے کوچک بحیرۂ روم وغیرہ مین انکی کئی بستیان تھین۔

رومیون کا ہندسہ

اہل روم نے جو لڑائی بھڑائی کے بڑے شائق اور ملک گیری کے فن مین بڑے طاق تھے تمام علوم فنون یونانیون سے حاصل کیے تھے۔ اُنھون نے انھین ترقی دینے کی کوشش نہین کی بلکہ روزانہ کاروبار بھگتانے کے لیے ضروری امور مین معقول دسترس پیدا کرلی۔ ان کا ادبیات اور ان کی نظم و نثر یونانی لٹریچر کا سانچہ یا ٹھپہ سمجھنا چاہیے۔ فن سنگتراشی مین بھی یونانی اُستادون کی تقلید کی۔ موسیقی، مصوری، اور دیگر علوم تمدن یونان سے لیے اگر روم مین جاکر ان کی صورت ہی بگڑ گئی۔ علم ہندسہ اور ریاضیات بھی رومیون نے یونان سے سیکھا۔ اسے ترقی دینا تو درکنار اُلٹا اسے خراب کردیا۔ فلسفہ سے رومیون کو کوئی مس نہ تھا کیونکہ وہ فن سپہ گری اور علم سیاست کا حصول اپنی زندگی کا بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اُنھون نے سائنس کی تحقیقات کی پروا نہیں کی۔ البتہ قانون مین اُنھون نے اپنے اُستاد یونان کو مات دی۔ انکے اصول قوانین آج تک یورپ اور امریکہ کے تمدّنی آئین کی بنیاد ہین۔ اُنھون نے ہندسہ اور ریاضیات صرف ضرورت کے مطابق حاصل کیا تھا اور اس سے روزانہ کاروبار زندگی مین کام لیتے تھے۔ اگر قیصر آگسٹس اپنی سلطنت کے تمام رقبہ کو ناپنے اور نقشہ تیار کرنے کی ہدایت نہ کرتا تو ہندسہ سپرد نسیان ہو جاتا۔ جولیس قیصر بھی اپنے زمانہ مین جو مسیح سے پچاس ساٹھ برس پیشتر گزرا سلطنت روما کی پیمائش کرانے کا خواہشمند تھا۔ علاوہ ازین انھین آئے دن قلعہ بندیون اور مورچہ بنانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ان وجوہ سے ہندسہ اور ریاضیات کا مطالعہ صرف عملی مقاصد سے جاری رہا۔

زمانۂ حال کا ہندسہ

قرون وسطی مین ہندسہ کے مطالعہ سے سخت لاپروائی برتی گئی جیسے اور علوم و فنون سے غفلت کا برتاؤ کیا گیا تھا۔ ۹۹۹ء مین گربرٹ اور اسکے بعد پوپ سلوسٹر ثانی کو ہندسہ کے مطالعہ کا شوق ہوا، مگر اُنھون نے کوئی نیا مسئلہ نہین نکالا بلکہ متقدمین کی تحقیقات کے نتائج پر غور کرتے رہے۔ جب یورپ قرون وسطی مین عقلی رعشہ مین گرفتار تھا اُس وقت عربون کی بیداری کا زمانہ تھا اُنھون نے یونانیون کے تمام علوم کو اپنی زبان مین ترجمہ کیا جس سے بعد ازان اہل یورپ نے حاصل کیا۔ عربون نے ہندسہ کے مطالعہ مین بڑی مستعدی ظاہر کی تھی۔ اس غفلت اور لاپروائی کے زمانہ کا خاتمہ ۱۱۰۰ء مین ہوا، اور پیزہ واقع اٹلی سے ایک مشہور مہندس اور ریاضی دان نکلا جس نے کئی نئے مسائل دریافت کیے۔ یہ شخص الجبرا مین بھی طاق تھا، بلکہ یورپ مین الجبرا کو اسی شخص کے وسیلہ سے رواج حاصل ہوا تھا۔ تقریباً دو سو برس تک اہل اٹلی ہندسہ اور ریاضیات کے اُستاد سمجھے جاتے رہے۔ مہندس پیزہ کا نام لیونارڈ فبوناسی تھا جو ۱۱۸۰ء اور ۱۲۵۰ء کے درمیان گذرا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد (۱۴۴۵ء-۱۵۱۴ء) لکہ پاشیولو پیدا ہوا۔ اسکے ساتھ ہی اہل اٹلی کی علمی ترقیون اور عقلی مصروفیتون کے زمانہ کا آغاز ہوا۔ ٹارٹاگلیا (۱۵۰۰ء-۱۵۵۷ء) کارڈن (۱۵۰۱-۱۵۷۶ء) اور لاڈوویکو فریری (۱۵۲۲-۱۵۶۵ء) نے علم ہندسہ مین بہت اضافہ کیا۔ اُنھون نے بعض بہت مشکل اور اہم مسائل ہندسہ دریافت کیے تھے۔ اسکے بعد اہل فرانس نے ہندسہ کے مطالعہ کی طرف توجہ کی۔ وی اینی نے الجبرا اور ہندسہ مین کمال حاصل کیا تھا۔ یہ شخص ۱۵۴۰ء اور ۱۶۰۳ء کے درمیان گذرا ہے۔ اُس نے ایک دو نئے مسئلے دریافت کیے تھے۔ اسکے بعد ماورلی (۱۵۰۵-۱۵۷۵ء) پاسکل (۱۶۲۳-۱۶۶۲ء) ڈیزارگ (۱۵۹۳-۱۶۶۲ء) وغیرہ پیدا ہوئے جنھون نے زمانۂ جدید کے ہندسہ کے اصول موضوعہ قائم کیے اور نئے طریقے اسکے

مسائل کو سلجھایا۔ یہ سب اپنے اپنے ڈھنگ کے مہندس اور ریاضی دان تھے۔ انھون نے پہلے پہل علم تراش ہائے مخروطی یا علم اشکال مخروطی کے مطالعہ کی طرف توجہ کی، اور اسکے اصول وضع کیے۔ انھون نے ظرف سے عدم انتہا کا تصور معقولیت کے ساتھ ظاہر کیا اور راس سے خواص مکانی کی تفتیش مین کام لینے پر زور دیا۔

جب فرانس ہندسہ مین ترقی کر رہا تھا، اُسوقت انگلستان اور جرمنی مین بھی اسکی طرف توجہ ہو رہی تھی۔ ہنری سیول (۱۵۴۹ء-۱۶۲۲ء) نے آکسفورڈ مین اس علم پر لیکچرون کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ جان کیپلر (۱۵۷۱ء-۱۶۳۰ء) نے ہندسہ مین ترقی کی۔ خط مستقیم کی انتہا کا خیال اُسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اٹھارھوین اور اُنیسوین صدی مین جو ترقی ہوئی ہے اُسکے بیان کی چندان ضرورت نہین، کیونکہ یہ زمانۂ حال سے متعلق ہے، اور اس سے وہ لوگ جو اسکولون اور کالجون کی تعلیم سے مستفید ہوتے ہین کم و بیش واقف ہین۔

(ماخوذ)

مملکت آصفیہ کے فرمانروا خاندان

۸۔ سلطنت عماد شاہی

۱۴۸۹ء/۸۹۵ — ۱۵۷۵ء/۹۸۳

دار الحکومت برار

عماد شاہی سلطنت کا بانی فتح اللہ عماد الملک قوم کا برہمن تھا۔ بیجانگر کی لڑائی مین گرفتار ہوکر دربار بہمنی مین آیا اور اسلام قبول کرکے مقربان شاہی مین شامل ہوگیا۔ بعد ازان اس نے بہت سے مہمات ملکی انجام دیے جس کے صلہ مین خواجہ محمود گاوان نے عماد الملک کا خطاب دلاکر برار کی صوبہ داری تفویض کی۔ محمود شاہ بہمنی کے زمانہ مین جب سلطنت بہمنیہ کو انحطاط شروع ہوا تو اس نے سب سے پہلے علم بغاوت بلند کیا، اور ۱۴۸۹ء/۸۹۵ مین اپنے نام کا خطبہ پڑھوا کر آزادانہ حکومت کرنے لگا۔ اسکے بیٹے علاء الدین نے احمد نگر والون سے بہت سا ملک لے لیا۔ پھر اسکے پوتے برہان عماد شاہ کو اُسکے وزیر تفال خان نے معزول کرکے خود سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ لیکن بیجاپور اور احمد نگر والون نے اتفاق کرکے برار پر یورش کی جس مین تفال خان مارا گیا اور ملک پر نظام شاہی قبضہ ہوگیا۔

شاہان عماد شاہی کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱	فتح اللہ عماد الملک	۱۴۸۹ء/۸۹۵	۱۵۰۴ء/۹۱۰
۲	علاء الدین بن فتح اللہ	۱۵۰۴ء/۹۱۰	۱۵۲۹ء/۹۳۶
۳	دریا عماد شاہ بن علاء الدین	۱۵۲۹ء/۹۳۶	۱۵۶۰ء/۹۶۸
۴	برہان عماد شاہ بن دریا عماد شاہ	۱۵۶۰ء/۹۶۸	۱۵۷۴ء/۹۸۲
۵	تفال خان (غاصب)	۱۵۷۴ء/۹۸۲	۱۵۷۵ء/۹۸۳

۹۔ سلطنت برید شاہی

۱۴۸۷ء/۸۹۳ — ۱۶۲۴ء/۱۰۳۴

دار الحکومت محمد آباد بیدر

اس خاندان کا بانی قاسم برید علاقہ گرجستان کا باشندہ تھا خواجہ شہاب الدین یزدی کے ہمراہ ولایت سے آیا اور محمد شاہ بہمنی کے غلامون مین شامل ہوگیا۔ خواجہ محمود گاوان کے بعد وزیر سلطنت مقرر ہوا، اور محمود شاہ کے عہد مین اسطرح دخیل سلطنت ہوا کہ بہمنی بادشاہ برائے نام بادشاہ رہ گئے اس نے بحیثیت

وزیر ہونے کے شاہان بیجاپور و برار سے کئی بار لڑائیاں کیں ۱۵۰۴ء/۹۱۰ھ
میں جب اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے بیٹے امیر برید نے نہ صرف
سلطنت پر قبضہ کرلیا بلکہ شاہی لقب بھی اختیار کرکے خود مختار بادشاہ
بن بیٹھا۔ امیر برید کے بعد اس خاندان میں سات بادشاہ برسر حکومت
ہوئے امیر برید ثانی کے زمانہ میں جو اس خاندان کا آخری بادشاہ ہے
شاہ بیجاپور نے بیدر پر قبضہ کرلیا۔ ۱۶۲۴ء/۱۰۳۴ھ میں ملک عنبر کے
نظام شاہی لشکر نے اس شہر کو مکرر تاخت و تاراج کرکے اس
خاندان کا استیصال کردیا

شاہان برید شاہی کی فہرست حسب ذیل ہے

۱	قاسم برید	۱۴۸۷ء/۸۹۲ھ	۱۵۰۴ء/۹۱۰ھ
۲	امیر برید اول	۱۵۰۴ء/۹۱۰ھ	۱۵۴۲ء/۹۴۹ھ
۳	علی برید اول	۱۵۴۲ء/۹۴۹ھ	۱۵۷۹ء/۹۸۷ھ
۴	ابراہیم برید	۱۵۷۹ء/۹۸۷ھ	۱۵۸۶ء/۹۹۵ھ
۵	قاسم برید ثانی	۱۵۸۶ء/۹۹۵ھ	۱۵۸۹ء/۹۹۸ھ
۶	علی برید ثانی	۱۵۸۹ء/۹۹۸ھ	۱۶۰۱ء/۱۰۱۰ھ
۷	امیر برید ثانی	۱۶۰۱ء/۱۰۱۰ھ	۱۶۲۴ء/۱۰۳۴ھ

۱۰ سلطنت نظام شاہی

۱۴۹۰ء/۸۹۶ھ — ۱۶۳۲ء/۱۰۴۲ھ

دار الحکومت احمد نگر

اس خاندان کا مورث اعلیٰ نظام الملک حسن بحری قوم کا برہمن اور پاتری کا باشندہ تھا۔ بیجانگر کی لڑائی میں گرفتار ہوکر آیا تو محمد شاہ بہمنی نے اسے مسلمان کرکے اپنے غلاموں میں شریک کرلیا۔ حسن بحری چونکہ لائق آدمی تھا اس لیے بہت جلد منظور نظر ہوگیا۔ عہدہ بہ عہدہ منصب بمنصب ملنے لگے۔ یہاں تک ترقی کی کہ علاقہ مرہٹواڑی کا ناظم مقرر ہوگیا اور قوت بہم پہنچا کر خودسری اختیار کی۔ قرب و جوار کے علاقوں پر

حملے شروع کیے۔ ۱۴۹۱ء/۸۹۶ھ میں بیدر کو فتح کرلیا۔ اس کے بعد بہمنی لشکر کے ساتھ ایک عظیم الشان لڑائی ہوئی جس میں اس کا کام تمام ہوگیا۔ اس کا بیٹا ملک احمد اس وقت جنیر میں تھا۔ جب اس کو باپ کے مارے جانے کا حال معلوم ہوا تو نظام الملک کا خطاب اپنے نام کے ساتھ شامل کرکے کوکن کا علاقہ فتح کرلیا۔ پھر احمد نگر آکر اپنی مستقل حکومت کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۴۹۳ء/۸۹۹ھ میں قلعہ دولت آباد فتح کرلیا اس کے بعد یکے بعد دیگرے تیرہ بادشاہ برسر حکومت ہوئے۔ مرتضےٰ نظام شاہ کی بیجا سختیوں سے سلطنت کو انحطاط ہونے لگا امرا میں ناتفاقی پھیل گئی۔ اسی زمانہ میں مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کیا۔ اس وقت کمسن بیران حسین برسر حکومت تھا۔ احمد نگر والوں نے جب شاہزادہ مراد کا مقابلہ کرنا چاہا تو چاند بی بی کو جو سلطان حسین نظام شاہ کی دختر تھی سلطنت کے تمام کاروبار حوالہ کیے۔ اس لائق و ہوشیار عورت نے بحیثیت نائب السلطنت ہونے کے سارے معاملات بحسن و خوبی انجام دیے اور اس جرأت و دلیری سے مغلوں کا مقابلہ کیا کہ حملہ آوروں کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی اثنا میں بعض نااہل امرا نے سازش کرکے چاند بی بی کو قتل کرڈالا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر خود شہنشاہ اکبر نے احمد نگر پر چڑھائی کردی۔ تھوڑی سی مدت میں شہر فتح ہوگیا اور کم عمر بادشاہ قید کرلیا گیا لیکن اس فتح سے نظام شاہی سلطنت کا استیصال نہ ہوسکا۔ ایک حبشی غلام ملک عنبر نے جو چاند بی بی کے زمانہ میں بہت سے اعلےٰ عہدوں پر ممتاز رہ چکا تھا۔ پرینڈہ میں آکر بقیہ ملک کے سنبھالنے کی کوشش کی اور مرتضےٰ نظام شاہ دوم کو بادشاہ بناکر مغلوں کے ساتھ مدت تک معرکہ آرائی کرتا رہا۔ اس نے جہانگیر کے لشکر کو متعدد بار شکست دی لیکن جب اس کا انتقال ہوگیا تو ۱۶۳۳ء/۱۰۴۲ھ میں شاہ جہان بادشاہ نے بقیہ ملک پر قبضہ کرلیا۔

ان بادشاہون کی فہرست حسب ذیل ہے

۱	احمد نظام الملک	۱۴۹۰ء/۸۹۶	۱۵۰۸ء/۹۱۴
۲	برہان نظام شاہ	۱۵۰۸ء/۹۱۴	۱۵۵۳ء/۹۶۱
۳	حسین نظام شاہ	۱۵۵۳ء/۹۶۱	۱۵۶۵ء/۹۷۲
۴	مرتضیٰ نظام شاہ	۱۵۶۵ء/۹۷۲	۱۵۸۶ء/۹۹۵
۵	میران حسین نظام شاہ	۱۵۸۶ء/۹۹۵	۱۵۸۹ء/۹۹۸
۶	اسمٰعیل نظام شاہ	۱۵۸۹ء/۹۹۸	۱۵۹۰ء/۹۹۹
۷	برہان نظام شاہ دوم	۱۵۹۰ء/۹۹۹	۱۵۹۴ء/۱۰۰۳
۸	ابراہیم نظام شاہ	۱۵۹۴ء/۱۰۰۳	۱۵۹۵ء/۱۰۰۴
۹	احمد نظام شاہ	۱۵۹۵ء/۱۰۰۴	سنہ
۱۰	بہادر نظام شاہ	۱۵۹۵ء/۱۰۰۴	۱۶۰۰ء/۱۰۰۹
۱۱	مرتضیٰ نظام شاہ دوم	۱۶۰۰ء/۱۰۰۹	۱۶۲۵ء/۱۰۳۵
۱۲	برہان نظام شاہ سوم	۱۶۲۵ء/۱۰۳۵	۱۶۳۰ء/۱۰۴۰
۱۳	حسین نظام شاہ سوم	۱۶۳۰ء/۱۰۴۰	۱۶۳۳ء/۱۰۴۳

۱۱ سلطنت عادل شاہی

۱۴۸۹ء/۸۹۵ — ۱۶۸۶ء/۱۰۹۸

دار الحکومت بیجاپور

اس سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ روم کے سلاطین عثمانیہ کی اولاد سے تھا۔ بیجاپور کی مشہور و مستند تاریخ بساتین السلاطین مین لکھا ہے کہ سلطان مراد کے دو بیٹے تھے۔ محمد خان و یوسف خان باپ کے مرنے پر سنہ ۱۴۵۱ء/۸۵۵ میں جب بڑا لڑکا محمد خان فاتح قسطنطنیہ تخت نشین ہوا تو چھوٹے بھائی کے قتل کا حکم دیدیا لیکن ماں نے شاہی افسرون کو کچھ رشوت دے دلا کر لڑکے کی جان بچائی اور خواجہ علاء الدین گرجستانی کے حوالے کیا تاکہ اُسے لے کر کہین بھاگ جائے۔ علاء الدین یوسف خان کو لیکر ترکی دار الحکومت سے نکلا اور ساوہ مین آکر پناہ گزین ہوا۔ یہان سے تجارت کے لیے ہندوستان آیا۔ محمود شاہ بہمنی کے زمانہ مین بیدر پہنچا اور خواجہ محمود گاوان سے یوسف خان کا سارا حال کہہ کر درخواست کی کہ اُسے شاہی غلامون مین شامل کرے۔ چنانچہ خواجہ محمود گاوان نے یوسف خان کا نام شاہی غلامون مین شریک کردیا۔ یوسف خان چونکہ پڑھا لکھا اور ہوشیار لڑکا تھا اس لیے بہت جلد منظور نظر ہوگیا۔ سنہ ۱۴۷۸ء/۸۸۳ میں جنیر کا صوبہدار مقرر ہوا۔ اس کے بعد بیجاپور کا سرلشکر قرار پایا۔ محمود شاہ بہمنی کے زمانہ مین جب سلطنت بہمنیہ تباہی کے قریب آپہنچی تو احمد نظام الملک کی تحریک سے اس نے بھی اپنی مستقل حکومت قائم کرلی اور سنہ ۱۴۸۹ء/۸۹۵ مین بیجاپور کی جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔

یوسف عادل شاہ کے بعد اس کے خاندان مین یکے بعد دیگرے نو بادشاہ برسرِ حکومت ہوے۔ منجملہ اُن کے ابراہیم اول علی عادل شاہ اور اُس کا بیٹا ابراہیم ثانی بڑے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے بادشاہ ہوے ہین۔ دور طوائف الملوکی مین عادل شاہی سلطنت کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ اسکی عملداری یون تو پہلے ہی سے بڑھی ہوئی تھی مگر علی عادل شاہ کے زمانہ مین جب سلطنت بیجانگر تباہ و تاراج ہوگئی تو اُس کو اور بھی وسعت حاصل ہوگئی، اور اُس کے حدود شمال میں دریاے کرشنا سے لیکر جنوب مین تنبھدرا تک پھیل گئے اور اسمیں دھارواڑ کرناٹک میسور و ملیبار کا تمام ملک شامل ہوگیا۔ ابراہیم ثانی شہنشاہ اکبر کا معاصر تھا۔ اُس کی بیٹی شاہزادہ دانیال سے منسوب ہوئی تھی اور اُسی لڑکی کے ہمراہ مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ دربار مغلیہ مین گیا تھا۔ اس بادشاہ کو علمی معاملات سے بے حد دلچسپی تھی اسکی فیاضی اور قدردانی نے بیجاپور کو مرکز علم و فن بنادیا تھا۔ ظہوری

اور ملا ملک قمی جو فارسی کے مشہور و معروف شاعر ہیں اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔ اس کا جانشین محمد عادل شاہ بادشاہی ٹمطراق مین اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ شاہ جہان بادشاہ اپنی خط و کتابت مین اسکو ہمیشہ سلطان لکھا کرتا تھا۔ اس نے اپنے لیے جو مقبرہ بنایا ہے وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ روئے زمین کے عجائبات مین شمار ہوتا ہے۔ اسکی بلندی ٢٠٦ فیٹ اور رقبہ ١٨٣٣٦ مربع فیٹ ہے۔ ایسا بلند اور وسیع گنبد تمام دنیا مین کہین نہین پایا جاتا۔

سیواجی بھوسلہ جو سلطنت مرہٹہ کا بانی ہے ابتداً محمد عادل شاہ کی فوج مین ملازم تھا۔ ترقی کرتا ہوا سپہ سالاری کے درجہ پر پہنچا۔ علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ مین جب عادل شاہی سلطنت پر ضعف آنے لگا تو کوکن اور کرناٹک کے بعض علاقے اس نے داب لیے جس کو اُسکے جانشینون نے جدید فتوحات سے اور بھی وسعت دیدی۔

سکندر عادل شاہ بیجاپور کا اخیر بادشاہ ہے۔ اس کے زمانہ مین اورنگ زیب نے بیجاپور پر حملہ کیا اگرچہ سکندر نے بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا لیکن کچھ بن نہ آیا۔ ١٦٨٦ء / ١٠٩٧ھ مین اورنگ زیب نے ملک پر قبضہ کر لیا اور اسکو نظر بند کر کے اس کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

سلاطین عادل شاہی کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

١	یوسف عادل شاہ	١٤٨٩ء / ٨٩٥ھ	١٥١٠ء / ٩١٦ھ
٢	اسمٰعیل عادل شاہ	١٥١٠ء / ٩١٦ھ	١٥٣٤ء / ٩٤١ھ
٣	ملو عادل شاہ	١٥٣٤ء / ٩٤١ھ	١٥٣٤ء / ٩٤١ھ
٤	ابراہیم عادل شاہ اول	١٥٣٤ء / ٩٤١ھ	١٥٥٧ء / ٩٦٥ھ
٥	علی عادل شاہ اول	١٥٥٧ء / ٩٦٥ھ	١٥٨٠ء / ٩٨٨ھ
٦	ابراہیم عادل شاہ ثانی	١٥٨٠ء / ٩٨٨ھ	١٦٢٦ء / ١٠٣٨ھ
٧	محمد عادل شاہ	١٦٢٦ء / ١٠٣٨ھ	١٦٥٦ء / ١٠٦٧ھ
٨	علی عادل شاہ ثانی	١٦٥٦ء / ١٠٦٧ھ	١٦٧٢ء / ١٠٨٣ھ
٩	سکندر عادل شاہ	١٦٧٢ء / ١٠٨٣ھ	١٦٨٦ء / ١٠٩٨ھ

١٢ سلطنت قطب شاہی

١٥١٢ء / ٩١٨ھ — ١٦٨٧ء / ١٠٩٩ھ

دار الحکومت گولکنڈہ

اس خاندان کا بانی سلطان قلی ترکون کے قبیلہ قراقوینلی سے ہے۔ اولاد چنگیز خان کے تنزل پر آذربائیجان مین اس قبیلہ نے ایک چھوٹی سی حکومت قائم کر لی تھی۔ مگر وہ بہت جلد ٹکڑے ٹکڑے ہوکر اسی قبیلہ کے مختلف سردارون مین تقسیم ہو گئی۔ اس سیاسی انقلاب مین کچھ علاقہ پیر قلی کے ہاتھ آگیا جس پر اُسکا بیٹا اویس قلی بھی کچھ عرصہ کے لیے حکمران رہا۔ اسی اثنا مین ایک اور ترکی قوم آق قوینلی نے دیار بکر مین نشو و نما پانا شروع کیا اور انھین امیر یعقوب بیگ کے زمانہ مین خوب عروج حاصل ہو گیا۔ یعقوب بیگ نے اپنے بھائی قراقوینیون پر سب سے پہلے ہاتھ صاف کیا اور اس قوم کے بہت سے سردار جو مختلف علاقون مین حکمران تھے پکڑ کر قتل کر ڈالے۔ اس طوفان بے تمیزی سے بچانے کے لیے اویس قلی نے اپنے لڑکے سلطان قلی کو دکن روانہ کر دیا، اور وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ہمراہ عراق عرب اور خلیج فارس سے ہوتا ہوا بیدر چلا آیا۔ سلطان محمود شاہ بہمنی نے اسکے ساتھ بہت سی مراعات کین اور سلطانی چیلون مین شامل کر کے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی، اور جب سن رشد کو پہنچا تو مختلف مہمات ملکی تفویض کیے یہان تک کہ ١٤٩٥ء / ٩٠١ھ مین قطب الملک کا خطاب دے کر تلنگانہ کا صوبہ دار بنایا۔ قطب الملک سولہ سال تک سلطنت بہمنی کا مطیع و فرمانبردار رہا۔ لیکن ١٥١٠ء / ٩١٦ھ مین جب محمود شاہ کا انتقال ہو گیا تو دوسرے سردارون کی طرح اس نے بھی اطاعت سے انحراف کر دیا، اور گولکنڈہ کو مستقر حکومت

قرار دے کر قطب شاہی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا۔

قطب الملک نے راجگان ورنگل و بیجا نگر سے متعدد لڑائیاں کین اور اپنی حکومت کو جنوب مشرق مین دریائے گوداوری کے کنارے کنارے بڑی دور تک وسعت دی۔ اسکے بعد بریدشاہیون پر حملہ کر کے قلعہ میدک و کولاس وغیرہ بھی لے لیا۔ اسکے بعد جمشید قلی سبحان قلی ابراہیم قلی پے درپے تخت نشین ہوے۔ ابراہیم کے زمانہ مین جب سلطنت بیجانگر تباہ ہوئی تو قطب شاہی علاقہ خوب وسیع ہوگیا اور دریائے پنار کے اتصال سے جنوب تک اسکے حدود پہنچ گئے۔ ابراہیم کے جانشین محمد قلی اور محمد قطب شاہ بڑی شان و شوکت کے بادشاہ ہوئے ہین۔ محمد قلی نے دکن مین اس کثرت سے عمارتین تعمیر کرائی ہین کہ کسی دوسرے بادشاہ نے کبھی نہین بنوائین اور اسی وجہ سے تاریخ مین یہ دکن کی عمارات کا باوا آدم کہلاتا ہے۔ عبد اللہ قطب شاہ کے زمانہ سے سلطنت کو انحطاط ہونے لگا۔ اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر کئی مرتبہ حملے کیے ۱۶۸۷ء / ۱۰۹۹ھ مین چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد قلعہ فتح ہوگیا اور سلطان ابوالحسن تانا شاہ کو جو اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا قلعہ دولت آباد مین قید کر دیا۔

سلاطین قطب شاہی کی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱	قطب الملک سلطان قلی	۱۵۱۲ء / ۹۱۸ھ	۱۵۴۳ء / ۹۵۰ھ
۲	جمشید قلی	۱۵۴۳ء / ۹۵۰ھ	۱۵۵۰ء / ۹۵۷ھ
۳	سبحان قلی	۱۵۵۰ء / ۹۵۷ھ	سنہ ء
۴	ابوالمظفر ابراہیم قطب شاہ	۱۵۵۰ء / ۹۵۷ھ	۱۵۸۰ء / ۹۸۷ھ
۵	ابوالمظفر محمد قلی	۱۵۸۰ء / ۹۸۷ھ	۱۶۱۲ء / ۱۰۲۱ھ
۶	سلطان محمد قطب شاہ	۱۶۱۲ء / ۱۰۲۱ھ	۱۶۲۶ء / ۱۰۳۶ھ
۷	عبد اللہ قطب شاہ	۱۶۲۶ء / ۱۰۳۶ھ	۱۶۷۲ء / ۱۰۸۳ھ
۸	ابوالحسن تانا شاہ	۱۶۷۲ء / ۱۰۸۳ھ	۱۶۸۷ء / ۱۰۹۹ھ

۱۴۔ دکن پر مغلون کا تسلط

شہنشاہ اکبر نے پہلے پہل ۱۵۹۶ء / ۱۰۰۵ھ مین دکن پر حملہ کیا۔ نظام شاہیون سے مدت تک لڑائی ہوتی رہی اور احمد نگر فتح ہوگیا مگر اس سے سلطنتِ نظام شاہی کا استیصال نہ ہو سکا۔ اسکے بعد سلاطین دکن نے باہم اتفاق کر کے مغلون کا مقابلہ کیا جسکی وجہ سے مغلون کو شکست اٹھا کر واپس ہونا پڑا۔ لیکن اسی زمانہ مین دکن مین خانہ جنگیان شروع ہوگئی تھین جن سے مغلون نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور ملک پر بتدریج تسلط حاصل کر لیا۔

شاہجہان نے دکن کے فتح کرنے مین بڑی کوشش کی اور دس برس کی جنگ و جدل کے بعد نظام شاہیون کا خاتمہ ہوا۔ اسی اثنا مین عادل شاہیون سے ایک لڑائی ہوئی جسمین بیجاپور والے بڑی ہمت اور دلیری سے لڑتے رہے لیکن مغلوب ہو کر انھین صلح کرنی پڑی۔ شاہجہان بادشاہ نے اورنگ زیب کو ۱۶۳۶ء / ۱۰۴۶ھ مین تسخیر دکن پر مامور کیا۔ اس نے سب سے پہلے گولکنڈہ پر چڑھائی کی لیکن ایک سخت لڑائی کے بعد عبد اللہ قطب شاہ نے مصالحت کر لی۔ اورنگ زیب جب واپس ہونے لگا تو بیدر کو فتح کرتا ہوا بیجاپور کی جانب روانہ ہوا۔ اثنائے راہ مین شاہجہان کے بیمار ہونے کی خبر سنی تو اس مہم کو ادھورا چھوڑ کر دار السلطنت کو واپس چلا آیا۔

اس وقت اہل دکن بڑی تباہی مین مبتلا تھے۔ شاہان دکن نے اپنے ملک کو اس غرض سے ویران کر دیا تھا کہ غنیم کو آب و دانہ تک میسر نہ آئے، اور جو کچھ باقی تھا وہ مغلون نے لوٹ لیا تھا۔ اتفاق سے کئی سال تک بارش بھی نہین ہوئی جسکی وجہ سے ایسا تکلیف دہ قحط پڑا کہ لاکھون جانین بھوک

بیاس کے نذر ہو گئیں۔

اورنگ زیب نے اپنے ایام حکومت میں تسخیر دکن کے لیے بہت کچھ جد و جہد کی چنانچہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے میدانوں میں اسکی فوج پچیس سال تک لڑتی رہی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پینسٹھ سال کی عمر میں خود دہلی سے نکلا۔ کئی سال دکن میں رہ کر لڑائی جھگڑے کرتا رہا۔ ۱۶۸۶ء / ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور فتح ہوا۔ اسکے ایک سال بعد اہل گولکنڈہ نے شکست پائی، اور دونوں بادشاہ مغلوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔

ان جدید فتوحات سے سلطنت مغلیہ کو ایسی وسعت حاصل ہوئی کہ اس سے بیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مغلوں نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے علاقوں کو ملا کر ایک صوبہ بنایا اور اُسکے انتظام کے لیے دہلی سے صوبہ دار مقرر ہو کر آنے لگے۔ ۱۷۱۳ء / ۱۱۲۵ھ میں یہ عہدہ نواب نظام الملک آصف جاہ کو ملا جو اُن کی اولاد میں اب تک وراثتاً چلا آتا ہے۔

سلاطین مغلیہ

(۱)	ظہیر الدین بابر شاہ	۱۵۲۶ء / ۹۳۲ھ	۱۵۳۰ء / ۹۳۷ھ
(۲)	نصیر الدین ہمایون	۱۵۳۰ء / ۹۳۷ھ	۱۵۵۶ء / ۹۶۳ھ
(۳)	جلال الدین اکبر	۱۵۵۶ء / ۹۶۳ھ	۱۶۰۵ء / ۱۰۱۴ھ
(۴)	نور الدین جہانگیر	۱۶۰۵ء / ۱۰۱۴ھ	۱۶۲۸ء / ۱۰۳۸ھ
(۵)	شہاب الدین شاہجہان	۱۶۲۷ء / ۱۰۳۷ھ	۱۶۵۸ء / ۱۰۶۸ھ
(۶)	محی الدین اورنگ زیب عالمگیر	۱۶۵۸ء / ۱۰۶۸ھ	۱۷۰۷ء / ۱۱۱۹ھ
(۷)	قطب الدین شاہ عالم بہادر شاہ	۱۷۰۷ء / ۱۱۱۸ھ	۱۷۱۲ء / ۱۱۲۴ھ
(۸)	معز الدین جہاندار شاہ	۱۷۱۲ء / ۱۱۲۴ھ	۳ء
(۹)	فرخ سیر	۱۷۱۲ء / ۱۱۲۴ھ	۱۷۱۹ء / ۱۱۳۱ھ
(۱۰)	شمس الدین رفیع الدرجات	۱۷۱۹ء / ۱۱۳۱ھ	۳ء
(۱۱)	رفیع الدولہ شاہجہان ثانی	۱۷۱۹ء / ۱۱۳۱ھ	۱۷۲۰ء / ۱۱۳۲ھ
(۱۲)	نصیر الدین محمد شاہ	۱۷۲۰ء / ۱۱۳۲ھ	۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ

(۱۳)	احمد شاہ	۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ	۱۷۵۴ء / ۱۱۶۷ھ
(۱۴)	عزیز الدین عالمگیر ثانی	۱۷۵۴ء / ۱۱۶۷ھ	۱۷۵۹ء / ۱۱۷۳ھ
(۱۵)	شاہ عالم ثانی	۱۷۵۹ء / ۱۱۷۳ھ	۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ
(۱۶)	معین الدین محمد اکبر ثانی	۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ	۱۸۳۷ء / ۱۲۵۳ھ
(۱۷)	سراج الدین بہادر شاہ	۱۸۳۷ء / ۱۲۵۳ھ	۱۸۵۷ء / ۱۲۷۵ھ

۱۴- شاہان آصفیہ

۱۷۲۴ء / ۱۱۳۷ھ — تا حال

دار الحکومت حیدرآباد

نواب نظام الملک آصف جاہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد ماوراء النہر کے رہنے والے تھے۔ ۱۶۵۵ء / ۱۰۶۵ھ میں خواجہ عابد خان سمرقند سے آکر شاہجہان بادشاہ کے ملازم ہو گئے۔ ماہانہ پانچ ہزار منصب مقرر ہوا۔ ان کے فرزند نواب غازی الدین خان فیروز جنگ اورنگ زیب کے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے نواب سعد اللہ خان علامی وزیر شاہجہان بادشاہ کی دختر سے عقد کیا جن کے بطن سے نواب آصف جاہ بہادر تولد ہوئے۔ نواب آصف جاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں بیجاپور کے عملدار مقرر ہوئے تھے۔ بعدہٗ شاہ عالم بہادر نے اودھ کا ناظم مقرر کیا۔ پھر فرخ سیر نے دکن کی صوبہ داری عنایت کی۔ محمد شاہ کی بادشاہت میں مالوہ کے صوبہ دار پھر سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم قرار پائے۔ محمد شاہ رنگین مزاج اور عیش پسند بادشاہ تھا۔ امور جہانداری سے اُسکو مطلق دلچسپی نہ تھی جسکی وجہ سے سلطنت کو روز بروز تنزل ہونے لگا۔ آصف جاہ نے اس حالت کو دیکھ کر آئین شاہی مقرر کیا، اور بادشاہ کو انتظام سلطنت کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن جب یہ باتیں بادشاہ کو وبال جان ہو گئیں تو آصف جاہ نے برداشتہ خاطر ہو کر دکن کی صوبہ داری کو وزارت عظمیٰ پر ترجیح دی۔

اور فرمان شاہی حاصل کر کے حیدر آباد چلے آئے۔ ان دنون نواب مبارز خان حیدر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے جائزہ دینے سے انکار کیا۔ فریقین مین بالا گھاٹ کے نیچے لڑائی ہوئی۔ مبارز خان اور اسکے دونون بیٹے مارے گئے۔ دکن کا تمام صوبہ آصف جاہ کے قبضہ مین آگیا۔

آصف جاہ کے بعد نواب ناصر جنگ بر سر حکومت ہوئے لیکن دوسرے بھائیون نے تخت کے لیے شورش برپا کر دی۔ ان دنون دکن مین یورپ کی دو زبردست قومین قوت آزمائی کر رہی تھین۔ انگریز ناصر جنگ کے اور فرانسیسی مظفر جنگ کے طرفدار تھے۔ فرانسیسیون کی سازش سے ناصر جنگ نے شہادت پائی۔ مظفر جنگ بادشاہ بنائے گئے لیکن چند مہینون کے بعد بعض فوجی افسرون نے انھین بھی قتل کر ڈالا۔ ان کے بعد صلابت جنگ تخت نشین ہوئے جنھین نواب نظام علی خان نے قید کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ مین لے لی۔

اس زمانہ مین دکن کی سیاسی حالت بڑی پر آشوب تھی۔ میسور مین ٹیپو سلطان، شمال مغرب مین مرہٹے روز بروز اپنی قوت و اقتدار کو بڑھا رہے تھے۔ کرناٹک مین انگریزون اور فرانسیسیون نے قسمت آزمائی شروع کر دی تھی اور ہر چہار طرف قتل و خونریزی کا بازار گرم تھا۔ نظام علی خان کو اپنے چوالیس سالہ عہد حکومت مین مرہٹون اور ٹیپو سلطان کے ساتھ کئی مرتبہ معرکہ آرائی کا اتفاق ہوا جس کا حال خاندان آصفیہ کی تاریخون مین تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

شاہان آصفیہ

(۱)	نواب میر قمر الدین خان بہادر الملقب بہ نظام الملک آصف جاہ	۱۷۲۴ء / ۱۱۳۷ھ	۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ
(۲)	نواب میر احمد علیخان ناصر جنگ بہادر	۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ	۱۷۵۰ء / ۱۱۶۳ھ
(۳)	نواب مظفر جنگ بہادر	۱۷۵۰ء / ۱۱۶۳ھ	۱۷۵۱ء / ۱۱۶۴ھ
(۴)	نواب میر محمد علیخان صلابت جنگ بہادر	۱۷۵۱ء / ۱۱۶۴ھ	۱۷۶۲ء
(۵)	نواب میر نظام علیخان بہادر نظام الملک آصف جاہ ثانی	۱۷۶۲ء / ۱۱۷۵ھ	۱۸۰۳ء / ۱۲۱۸ھ
(۶)	نواب میر اکبر علیخان بہادر سکندر جاہ آصف جاہ ثالث	۱۸۰۳ء / ۱۲۱۸ھ	۱۸۲۹ء / ۱۲۴۵ھ
(۷)	نواب میر فرخندہ علیخان ناصر الدولہ بہادر	۱۸۲۹ء / ۱۲۴۵ھ	۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ
(۸)	نواب میر تہنیت علیخان افضل الدولہ بہادر	۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ	۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ
(۹)	نواب میر محبوب علی خان بہادر	۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ	۱۹۱۱ء / ۱۳۲۹ھ
(۱۰)	نواب میر عثمان علی خان بہادر	۱۹۱۱ء / ۱۳۲۹ھ	موجود

۱۵- والیان کرناٹک

۱۶۹۲ء / ۱۱۰۳ھ — ۱۸۰۱ء / ۱۲۱۶ھ

(۱) حکومت والیہ ارکاٹ

گولکنڈہ کی فتح کے بعد کرناٹک بھی مغلیہ عملداری مین شامل ہوگیا اور انتظام مملکت کے لیے دربار مغلیہ سے صوبہ دار مقرر ہونے لگے۔ بہادر شاہ اول کے زمانہ مین یہ خدمت سعادت خان کو ملی جس نے کوشش کر کے اسکو اپنے خاندان مین موروثی کر لیا۔ ارکاٹ اس کا دار الحکومت تھا۔ نظام الملک آصف جاہ نے جب دکن مین استقلال حاصل کر لیا تو کرناٹک بھی ان کا باج گذار صوبہ بن گیا لیکن سعادت خان کے جانشینون نے اطاعت سے انحراف کرنا چاہا جسکی بنا پر آصف جاہ نے ان پر چڑھائی کی اور اس ملک کو فتح کر کے اپنے ایک تجربہ کار سوار محمد انور الدین خان کو یہان کا گورنر مقرر کر دیا۔ آصف جاہ کی وفات کے بعد انور الدین خان نے بیحد قوت حاصل کر لی اور جب مرنے لگا تو اپنے اختیار سے اپنے فرزند محمد علیخان کو اپنا جانشین قرار دیا۔

کرناٹک مین مدت سے فرانسیسی اور انگریز قوت آزمائی کر رہے تھے والیانِ کرناٹک کو مرہٹون اور ٹیپو سلطان کی لڑائیون مین ان سے مجبوراً مدد لینا پڑی جسکی وجہ سے ان کو اس علاقہ مین بیحد اقتدار حاصل ہوگیا۔ سنہ ۱۷۶۰؁ء/۱۱۷۴؁ھ مین انگریزون نے کوشش کرکے فرانسیسون کو کرناٹک سے بیدخل کردیا اور والیان کرناٹک انگریزون کے ماتحت ہوگئے۔ سنہ ۱۸۰۱؁ء مین محمد علی خان کے بیٹے عمدۃ الامرانے تمام ملک انگریزون کے حوالہ کردیا اور اپنی پرورش کے لیے پنشن منظور کرلی جو اُس کی اولاد مین ابتک جاری ہے۔

والیان کرناٹک

(۱) ذوالفقار علی خان	سنہ ۱۶۹۲؁ء / ۱۱۰۴؁ھ	سنہ ۱۷۰۳؁ء / ۱۱۱۵؁ھ
(۲) داؤد خان	سنہ ۱۷۰۳؁ء / ۱۱۱۵؁ھ	سنہ ۱۷۱۰؁ء / ۱۱۲۲؁ھ
(۳) سعادت خان	سنہ ۱۷۱۰؁ء / ۱۱۲۲؁ھ	سنہ ۱۷۳۲؁ء / ۱۱۴۵؁ھ
(۴) باقر علی خان	سنہ ۱۷۳۲؁ء / ۱۱۴۵؁ھ	—
(۵) علی دوست خان	سنہ ۱۷۳۲؁ء / ۱۱۴۵؁ھ	سنہ ۱۷۴۰؁ء / ۱۱۵۳؁ھ
(۶) صفدر علی خان	سنہ ۱۷۴۰؁ء / ۱۱۵۳؁ھ	سنہ ۱۷۴۲؁ء / ۱۱۵۵؁ھ
(۷) محمد سعید سعادت اللہ خان	سنہ ۱۷۴۲؁ء / ۱۱۵۵؁ھ	سنہ ۱۷۴۴؁ء / ۱۱۵۷؁ھ
(۸) محمد انور الدین خان شجاع الدولہ	سنہ ۱۷۴۴؁ء / ۱۱۵۷؁ھ	سنہ ۱۷۴۹؁ء / ۱۱۶۳؁ھ
(۹) محمد علی خان	سنہ ۱۷۴۹؁ء / ۱۱۶۳؁ھ	سنہ ۱۷۹۵؁ء
(۱۰) عمدۃ الامراء (جسنے ملک انگریزون کے حوالہ کردیا)	سنہ ۱۷۹۵؁ء / ۱۲۱۰؁ھ	سنہ ۱۸۰۱؁ء / ۱۲۱۶؁ھ

شاہزادگان کرناٹک

جو پرنس آف ارکاٹ کے لقب سے مشہور ہین اور گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے پنشن پاتے رہے ہیں۔

(۱) عظیم الامراء	سنہ ۱۸۰۱؁ء / ۱۲۱۶؁ھ	سنہ ۱۸۱۹؁ء / ۱۲۳۴؁ھ
(۲) اعظم جاہ	سنہ ۱۸۱۹؁ء / ۱۲۳۵؁ھ	سنہ ۱۸۲۵؁ء / ۱۲۴۱؁ھ
(۳) عظیم جاہ	سنہ ۱۸۲۵؁ء / ۱۲۴۱؁ھ	سنہ ۱۸۴۲؁ء / ۱۲۵۸؁ھ
(۴) محمد غلام غوث خان اعظم الامراء	سنہ ۱۸۴۲؁ء / ۱۲۵۸؁ھ	سنہ ۱۸۵۵؁ء / ۱۲۷۲؁ھ
عظیم جاہ (کرسٹینت پرنس آف ارکاٹ)	سنہ ۱۸۶۷؁ء / ۱۲۸۴؁ھ	سنہ ۱۸۷۴؁ء / ۱۲۹۱؁ھ
(۵) ظہیر الدولہ	سنہ ۱۸۷۴؁ء / ۱۲۹۱؁ھ	سنہ ۱۸۷۹؁ء / ۱۲۹۶؁ھ
(۶) انتظام الملک	سنہ ۱۸۷۹؁ء / ۱۲۹۶؁ھ	سنہ ء
(۷) عمدۃ الامراء	سنہ ۱۸۷۹؁ء / ۱۲۹۰؁ھ	سنہ ۱۹۰۱؁ء / ۱۲۹۹؁ھ

مملکت آصفیہ کے مشہور واقعات

دکن پر رام نے یورش کی	سنہ ۲۰۰ ق م
راجہ اشوک برسرِ حکومت ہوا	سنہ ۲۳۶ ق م
اندھرا خاندان کا عروج (تلنگانہ مین)	سنہ ۲۲۰ ق م
اندھرا قوم نے مگدھ پر حملہ کیا	سنہ ۲۶۰ ق م
پلاوا خاندان کرناٹک مین برسرِ حکومت ہوا	سنہ ۳۰۰ء
چلوکیا خاندان (مغربی شاخ) برسرِ حکومت ہوا	سنہ ۴۰۰ء
چلوکیا خاندان (مشرقی شاخ) برسرِ حکومت ہوا	سنہ ۴۱۵ء
اندھرا قوم کو پلاوا خاندان نے تباہ کیا	سنہ ۴۲۶ء
راشٹر کوٹا قوم نے چلوکیا خاندان کی مغربی شاخ پر غلبہ حاصل کیا۔	سنہ ۷۵۷؁ء / ۱۴۰؁ھ
چلوکیا خاندان کی مغربی شاخ پھر بحال ہوئی	سنہ ۹۷۳؁ء / ۳۶۲؁ھ
چلوکیا خاندان کی مشرقی شاخ کو چولا قوم نے تباہ کیا	سنہ ۱۰۲۲؁ء / ۴۱۳؁ھ
یادو خاندان برسرِ حکومت ہوا	سنہ ۱۱۰۰؁ء / ۴۹۴؁ھ
گھنپتی خاندان جسکو کاکیتیا خاندان بھی کہتے ہین ورنگل مین برسرِ حکومت ہوا	سنہ ۱۱۰۰ء
جلمانے دیوگیری بسایا اور یادو خاندان کو خودمختار بنایا	سنہ ۱۱۸۷؁ء / ۵۸۲؁ھ
چلوکیا خاندان کی مغربی شاخ کو یادو قوم نے تباہ کیا	سنہ ۱۱۹۰؁ء / ۵۸۵؁ھ
خاندان خلجی برسرِ حکومت ہوا	سنہ ۱۲۹۰؁ء / ۶۸۹؁ھ
دکن پر مسلمانون نے پہلی مرتبہ حملہ کیا	سنہ ۱۲۹۴؁ء / ۶۹۳؁ھ

دکن پر ملک کافور نے حملہ کیا	۱۲۹۷ / ۶۹۷ء	بہمنی نام کے بادشاہون کا خاتمہ ہوا	۱۵۲۶ / ۹۳۳ء
دیوگڈھ کو مسلمانون نے فتح کیا	۱۳۰۶ / ۷۰۶ء	تالیکوٹہ کی عظیم الشان لڑائی جسمین سلطنت بیجانگر کا خاتمہ ہوا	۱۵۶۵ / ۹۷۲ء
ورنگل کو مسلمانون نے فتح کیا	۱۳۰۹ / ۷۰۸ء	عماد شاہی سلطنت کو نظام شاہیون نے تباہ کیا	۱۵۷۵ / ۹۸۳ء
کرناٹک کو مسلمانون نے فتح کیا۔	۱۳۱۰ / ۷۱۰ء	شہنشاہ اکبر نے دکن پر حملہ کیا	۱۵۹۶ / ۹۹۵ء
یادوا خاندان تباہ ہوا	۱۳۱۸ / ۷۱۸ء	محمد قلی نے شہر حیدرآباد کی بنیاد ڈالی	۱۵۸۹ / ۹۹۸ء
خلجی خاندان تباہ ہوا۔	۱۳۲۰ / ۷۲۰ء	مغلون نے احمدنگر فتح کرلیا	۱۶۰۰ / ۱۰۰۹ء
خاندان تغلق برسرحکومت ہوا	۱۳۲۱ / ۷۲۱ء	اہل بیجانگر کا چندراگری مین آباد ہونا	۱۶۱۴ / ۱۰۲۳ء
سلطان محمد بن تغلق برسرحکومت ہوا	۱۳۲۶ / ۷۲۷ء	ملک عنبر نے بریدشاہی سلطنت کو تباہ کیا	۱۶۲۴ / ۱۰۳۳ء
سلطنت بیجانگر قائم ہوئی اور شہر بیجانگر آباد ہوا	۱۳۳۶ / ۷۳۷ء	چندراگری کے راجہ نے انگریزون کو مدراس کا علاقہ دیا	۱۶۳۹ / ۱۰۴۹ء
امرائے دکن نے بغاوت کی	۱۳۴۷ / ۷۴۸ء	شاہجہان نے نظام شاہی سلطنت پر قبضہ کیا	۱۶۳۲ / ۱۰۴۲ء
سلطنت بہمنیہ قائم ہوئی	۱۳۴۸ / ۷۴۹ء	اورنگ زیب نے بیجاپور فتح کیا	۱۶۸۶ / ۱۰۹۸ء
بہمنیون نے گولکنڈہ کو فتح کیا۔	۱۳۶۴ / ۷۶۴ء	اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو فتح کیا	۱۶۸۷ / ۱۰۹۹ء
خاندان تغلق تباہ ہوا	۱۳۹۹ / ۸۰۲ء	سعادت اللہ خان والی کرناٹک مقرر ہوا	۱۷۱۰ / ۱۱۲۲ء
عماد شاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۴۸۵ / ۸۹۰ء	نواب آصف جاہ دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے	۱۷۱۳ / ۱۱۲۵ء
عادل شاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۴۸۴ / ۸۹۵ء	نواب آصف جاہ نے کرناٹک فتح کیا	۱۷۴۴ / ۱۱۵۷ء
نظام شاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۴۹۰ / ۸۹۶ء	انورالدین خان والی کرناٹک مقرر ہوا	۱۷۴۴ / ۱۱۵۷ء
بریدشاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۴۹۱ / ۸۹۷ء	انگریزون نے فرانسیسیون کو کرناٹک سے بیدخل کردیا	۱۷۶۰ / ۱۱۷۴ء
دکن میں پرتگیز آئے	۱۴۹۸ / ۹۰۴ء	عمدۃ الامرا نے کرناٹک انگریزون کے حوالہ کیا	۱۸۰۱ / ۱۲۱۶ء
قطب شاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۵۱۲ / ۹۱۸ء		

حکیم سید شمس اللہ قادری

آگرہ کی دو پُرانی یادگارین

بادشاہ جہانگیر کا تخت سنگ موسیٰ

یہ تخت آگرہ کے قلعہ مین شاہ جہان کے محل کے بالاخانے پر دریا کے رُخ کٹہرے کے پاس خندق کے اوپر رکھا ہوا ہے جسکا طول (۱۰) فٹ (۷ ½) انچہ عرض (۹) فٹ (۱۰) انچہ دبازت چھ انچہ۔ بلندی ایک فٹ (۴) انچہ۔ پتھر کی ساخت مین لوہے کی آمیزش کی وجہ سے ایک جگہ سُرخی جھلکتی ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس مقام سے دو مرتبہ خون روان ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ تخت کے اطراف مین اُبھرے حروف کا یہ کتبہ ہے:-

سریر حضرت سلطان سلیم اکبر شاہ　　ہمیشہ باد مزین بنور مہر آلہ
بادشاہے کہ تیغ او سازد　　چون دو پیکر سر عدو دو نیم
باشد این تختگاہ فرخندہ　　تکیہ گاہ خدایگان کریم
محک خسروان بپاے ملک　　مہر و مہ را عیار بر زر و سیم
مسند باصفا ز نور و ضیا　　گوہر بے بہا چو دُرِّ یتیم
پے تاریخ او بفکر شدم　　مژدہ جستم از خداے کریم
تا فلک تختگاہ خورشید ست　　گفت ماند سریر شاہ سلیم

۱۰۱۱ھ

تخت کے پایون پر یہ دو شعر کندہ ہین:-

چون شاہ سلیم وارث تخت و نگین　　بر تخت نشست بسعادت گیتی آئین
شد اسم مبارکش جہانگیر چو ذات　　وز نور عدالت لقبش نور الدین

ذیل کی عبارت خط خفی مین مشرق کی طرف جو حصہ [illegible] ہے کھدی ہوئی ہے چونکہ یہ عبارت اندر وار کھدی ہے اور باریک ہے لہذا اب نظر [illegible] ہے:-

"ہم ایام پیش از جلوس شاہ سلیم بعد آن نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی"۔

بلند مرتبہ باد از فلک چو حکم آرد　　سریر شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ

الہ وردی خان کا حمام

شہر آگرہ کے محلہ چھیپی ٹولے کی گلی مین بائین ہاتھ کو جہان وہ کوچہ قلعے کے مغربی حصے سے جا ملتا ہے اُس سے ذرا اسطرف سنگ سُرخ کا ایک بڑا شاندار دروازہ کھڑا ہے جو جہانگیر بادشاہ کا بنوایا ہوا ہے۔ اس دروازے مین داخل ہونے کے بعد ہم اُس بڑے مربع قطع اراضی مین داخل ہوتے ہین جو الہ وردی خان کے حمام کے نام سے مشہور ہے۔ اب حمام کی حیثیت باقی نہین۔ فی زماننا اِس مکان سے سرائے کا کام لیا جاتا ہے۔ معلوم نہین ہوتا کہ الہ وردی خان بانی اس عمارت کا کون شخص تھا۔ سیل چند کی کتاب "تفریح العمارات" مین اس کا ذکر نہین ہے لیکن راجہ رام نے "تعمیرات آگرہ" مین صرف اسقدر لکھا ہے کہ شاہجہان کے عہد مین یہ حمام الہ وردی خان نے بنوایا تھا۔ اس عمارت کا طول (۱۳۲) فٹ اور عرض (۷۵) فٹ ہے۔ اسکے اوپر یہ کتبہ ہے:-

در ایام شہنشاہ جہانگیر　　کہ می زیبد باو عالم پناہی
بشہر آگرہ دار الخلافت　　کہ باشد پایہ تخت بادشاہی
بخیر الہ وردی خان بنا کرد　　چنین پاکیزہ حمامے کہ خواہی
صفائش روبرو بارُخ خورشید　　فضائش با فلک در بارگاہی
زموج آب و عکس قرص گلجام　　ہمیشہ حوض او پُر ماہ و ماہی
پے تاریخ بنیادش دلم را　　بفضل فکر شستم از سیاہی
گرفتن دامن پاکان و گفتم　　بناے خیر حمام مباہی

بشیر الدین احمد (دہلوی)

(جھانسی کی رانی)

جھانسی (وسط ہند (بندیلکھنڈ) میں واقع ہے جہاں زمانۂ قدیم میں بندیلا راجپوتوں کی حکومت کا جھنڈا لہرا رہا تھا مگر زمانۂ مغلیہ میں ان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

مدتوں یہاں گوساوی راجاؤں نے حکومت کی ہو مگر ان کی حالت کمزور ہو جانے پر بوندیلا راجہ بیر سنگھ جو زبردست تھا گوساوئیوں پر غالب آگیا اور سلطنت پر اپنا قبضہ کر لیا۔ یہ بیر سنگھ وہی ہے جس نے شہزادہ سلیم کی تحریک سے ابو الفضل کا خون کیا تھا۔ مگر جب اکبر نے اس کی گرفتاری کا حکم نافذ فرمایا تو یہ شخص اس طرح فرار ہو گیا کہ کسی کو پتہ بھی نہ لگا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان اور جب تک کہ اکبر کا دور حکومت رہا بیر سنگھ اُس محفوظ قیام سے باہر نہ نکلا جہاں اُس نے بھاگ کر پناہ لی تھی۔ مگر جہانگیر کے تخت نشین ہوتے ہی اُس نے پھر دوسرا جنم لیا اور جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی دردانگیز مصیبت کی داستان سنائی۔ کیونکہ یہ ساری آفتیں بیر سنگھ نے جہانگیر ہی کے لیے جھیلی تھیں بادشاہ نے اُسکے حسن خدمات کا اندازہ کرکے پھر اُسے اُس کا راج واپس دیدیا۔ مگر شاہ جہان کا زمانہ اسے راس نہ آیا اور یکایک ایسا انقلاب ہوا کہ اسکا راج پھر چھین لیا گیا اور ۱۷۰۷ء تک جھانسی مغلیہ سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہی رہا۔

جب بہادر شاہ کے ہاتھ میں عنان حکومت آئی تو اُس نے جھانسی اپنے ایک خدمتگار یا جان نثار راجہ چتر سال کو بطور جاگیر بخش دی۔ چتر سال نے جب تک مغلیہ سلطنت کا زوال شروع نہ ہوا تھا آرام سے راج کیا لیکن اِدھر مغلیہ حکومت کا آفتاب غروب ہونے لگا اور اُدھر سرکشوں نے چتر سال کا ناکوں دم کر دیا خصوصاً مالوہ کا مسلمان سردار اور الٰہ آباد کے نواب نے تو اسے سونا تک حرام کر دیا تھا۔ چتر سال سخت پریشانی کی حالت میں مبتلا تھا آخر مجبوراً اسے باجی راؤ پیشوا سے امداد طلب کرنا پڑی۔ مرہٹہ فوج نے چتر سال کے دشمنوں کا کھلے میدانوں میں مقابلہ کیا اور اس طرح چتر سال کو آرام نصیب ہوا۔

چتر سال کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اور بدقسمتی سے اُسکے کوئی اولاد بھی نہ تھی لہٰذا اُس نے اپنے مربی اور محسن باجی راؤ پیشوا ہی کو تخت کا

وارث قرار دیا۔ اس طرح سے جھانسی مرہٹہ حکومت میں داخل ہو گئی اور یہاں اُس وقت سے ایک مرہٹہ حاکم مقرر ہونے لگا۔

جھانسی کے پرانے حقدار گوساوی راجہ یہ دیکھ کر جل گئے اور ہر طرف سے مرہٹہ حاکم کو ستانا شروع کیا مگر باجی راؤ پیشوا نے ان کی سرکوبی کے لیے ایک زبردست لشکر رگھوناتھ راؤ نیبھلکر کے زیر کمان روانہ کیا جس نے غنیم کو جھانسی کی حدود سے بھگا دیا۔ یہ کامیابی اور فتح دیکھ کر باجی راؤ اپنے لائق اور جان نثار افسر رگھوناتھ راؤ نیبھلکر سے از حد خوش ہوا اور قدردانی کے طور سے اسے یہیں کی حکومت بطور خاندانی حقوق کے عطا فرمائی۔ جب رگھوناتھ راؤ بھی ضعیف ہو گیا تو اسکے بھی کوئی اولاد نہ تھی آخر اُس نے اپنے بھائی شیو راؤ بھاؤ کو یہاں کی صوبہ داری مرحمت کی۔

باجی راؤ کی کمزور طبیعت اور پست حوصلوں کی وجہ سے جو اُس کی سلطنت کا حال ہوا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے کیونکہ اُسکے کل ماتحت حاکموں نے علم بغاوت بلند کر کے آزادی کا جھنڈا لہرانا شروع کر دیا تھا جنمیں ایک شیو راؤ بھاؤ بھی تھا۔

انگریزی جنرل ویلزلی اور لیک نے پیشوائی کشتی کو ڈوبتے بچایا کیونکہ سندھیہ، ہولکر اور ناگپور کا راجہ مرہٹہ سلطنت کی بنیاد کو اُکھیڑ ڈالنا چاہتے تھے مگر انگریزوں کی وجہ سے اُن کو یہ موقع نہ نصیب ہوا۔ شیو راؤ بھاؤ انگریزوں کے ساتھ تھا۔ اور اُس نے اپنی حیثیت کے موافق اچھی خاصی انگریزوں کو مدد دی۔

شیو راؤ کی بھی عمر زیادہ ہو جانے سے اُس نے زمام سلطنت اپنے نواسے رامچند راؤ کے ہاتھ میں دیدی اور آپ اپنی عمر کے آخری حصہ برہمہ ورت کی پاک زمین یعنے ٹھٹور میں گذارنے کے لیے چلا گیا۔

سنہ ۱۸۱۷ء میں انگریز اور رام چند راؤ میں ایک معاہدہ ہوا جسمیں انگریزوں نے رام چند راؤ کو جھانسی کا خاندانی حاکم قبول کیا اور یہ بھی قرار پایا کہ بوقت ضرورت رام چند راؤ انگریزوں کا ساتھ دے سنہ ۱۸۳۲ء میں رام چند راؤ کو راجہ کا خطاب دیا گیا اور اس نے اپنی خوشی سے نشان "یونین جیک" جھانسی کے قلعہ پر لگا دیا۔

رام چند راؤ کی وفات کے بعد اُس کی بیوہ بیوی نے اپنے بھانجے کرشنا راؤ کو جھانسی کا راج دیا کیونکہ رام چند راؤ بھی لاولد تھا۔ مگر انگریزی حکومت نے اسے قبول نہ کیا کیونکہ کرشنا راؤ کا گدی پر کوئی حق ہی نہ پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ رام چند راؤ کے چچیرے بھائی رگھوناتھ راؤ سوم کو انگریزوں نے گدی پر بٹھایا مگر یہ انتخاب اچھا نہ تھا۔ چند ہی روز میں اِس گدی نشین نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے عیش پسندی اور فضول خرچیوں نے ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ نوبت باینجا رسید کہ ریاست کے جواہرات اور قیمتی چیزیں بھی رہن رکھی جانے لگیں اور مہاجنوں سے قرض بھی لیا جانے لگا۔

ریاست کی یہ نازک حالت دیکھ کر برٹش گورنمنٹ نے اُسے اپنے ہاتھ میں لیا اور راجہ کے لیے ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ اسی حالت میں راجہ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اُن کے بعد بہت سے اور حقدار گدی کے لیے کھڑے ہو گئے مگر انمیں گنگادھر راؤ ابن شیو راؤ کو جو اُسی خاندان کا ایک رکن تھا سرکار انگریزی نے گدی کے لیے تجویز کیا۔ کیونکہ گنگادھر راؤ کا حق سب سے زیادہ پایا گیا۔ مگر گدی پر بٹھاتے وقت سرکار نے یہ وعدہ لے لیا کہ جب تک ریاست قرض کے بوجھ سے سبکدوش نہ ہوگی عنان ریاست انگریز سرکار ہی کے ہاتھ میں رہیگی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۴۲ء تک ایک انگریزی افسر اس کام کے لیے مقرر کیا گیا جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ریاست کو اس بار گراں سے سبکدوش کروا دیا اور محاصل وغیرہ بھی برابر ہو گئے۔ مگر ۲۲،۴۳۵ روپے سالانہ انگریزی محافظ فوج کے خرچ کے لیے دینے تک گنگادھر راؤ کو پورے اختیارات نہ دیے گئے چنانچہ مذکورہ بالا رقم کا اُس نے سالانہ

انتظام کر دیا اور گنگا دھر راؤ اب جھانسی کا باختیار راجہ بن گیا جو ہمارے مضمون کی "ہیروئن" کا شوہر ہے۔

پونہ کے جنوب میں کوئی پچیس کوس پر کرشنا ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں وائی نامی واقع ہے۔ یہاں کرشنا راؤ نامی ایک کرھاڑا برہمن پیشوائی سرکار کا وظیفہ خوار معاملت دار و تحصیلدار رہا کرتا تھا۔ اسکا ایک بڑا ہی منچلا لڑکا تھا جس کا نام بلونت تھا۔ اس کو سیرین منت پیشوا نے اپنے محافظین میں رکھا تھا۔ بلونت کے بھی دو لڑکے موروپنت اور سداسیو نامی تھے۔ موروپنت تو اپنے باپ کے پاس پونہ ہی میں رہا کرتا تھا اور دوسرا یعنی سداسیو چماجی آپا باجی راؤ دوم کے بھائی کا منظور نظر تھا یعنی چیتا نوکر بن گیا تھا۔

۱۸۱۸ء میں جب باجی راؤ دوم آخری پیشوا نے اپنا راج انگریزوں کے ہاتھ میں دیدیا اور آپ بٹھور کو آٹھ لاکھ روپے کا سالانہ وظیفہ لیکر آ رہے تو اسوقت آپا صاحب جنوبی ملک میں اقامت گزین تھا۔ پونہ کے انگریزی رزیڈنٹ نے آپا صاحب کو سالانہ تین لاکھ کے محصول کا ملک بھی دینے کو کہا۔ اس شرط پر کہ آپا صاحب پونہ کی جاگیر کا خود انتظام کریں مگر آپا صاحب نے قبول نہ کیا اور سرکار انگریزی سے درخواست کی کہ میں اپنی زندگی کا بقیہ حصہ خدا کی یاد میں گزارنا چاہتا ہوں لہذا مجھے کاشی باش ہونے کی اجازت دی جائے۔ سرکار انگریزی نے یہ درخواست منظور کی۔ کوئی چھ مہینے بعد باجی راؤ دوم بھی یہیں رہنے آ گیا مگر کچھ دنوں کے بعد بٹھور چلا گیا اور وہیں رہنے لگا۔ موروپنت بھی مع اہل و عیال اسکے ہمراہ چلا آیا اور پچاس روپے ماہوار پر آپا صاحب کا دیوان مقرر ہوا جس وقت موروپنت کاشی میں تھا تو بھاگرتھی دیوی یعنی موروپنت کی بیوی کے ایک لڑکی ۱۰ نومبر ۱۸۳۵ء کو پیدا ہوئی جس کا نام لکشمی بائی رکھا گیا مگر بچپن کا پیارا نام منوبائی تھا اور یہی حسن کی دیوی آخر میں جھانسی کی مشہور بہادر اور دلیر رانی ہونے والی تھی۔

منوبائی کی عمر ابھی چار سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے سر سے اسکی مہربان اور شفیق ماں کا سایہ اُٹھ گیا۔ اُس کے بعد آپا صاحب کا بھی انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے منوبائی کے والد موروپنت کو کاشی چھوڑ کر بٹھور آنا پڑا۔ باجی راؤ پیشوا نے اس کی حالت پر ترس کھا کر اپنے ہی پاس رکھ لیا اور اپنے مکان کے قریب ہی ایک مکان رہنے کو عنایت کیا۔ مکان کا سارا کام کاج موروپنت ہی کے سر پڑ گیا اور منوبائی کو بھی اپنے بچپن کا زمانہ مردوں ہی میں گزارنا پڑا۔ منوبائی کی باتوں نے پیشوا کے تمام گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ یہ بچی ہمیشہ میرے ہی پاس رہے۔ منوبائی کو پیار سے ہر شخص چھبیلی کہکر پکارا کرتا تھا۔ باجی راؤ پیشوا کے کمسن گود لیے لڑکے بھی تھے جن کے ساتھ منوبائی کھیلا کرتی بلکہ اپنے ہمسن بچوں سے مار پیٹ میں بھی وہ کبھی نہیں جھجکتی تھی۔

منوبائی کی سوتیلی ماں چیما بائی کہتی ہے کہ منوبائی جب بالکل کمسن تھی تو لڑکوں کے دیکھا دیکھی پتنگ بھی اُڑایا کرتی تھی۔ ہمیشہ اگر لڑکیوں میں کھیلنے لگے تو خود رانی بن جائے۔ کچھ لڑکیوں کو اپنی خادمہ بنائے انصاف بھی کیا کرے اور سزا بھی دیا کرے۔ الغرض وہ ساری باتیں کیا کرتی تھی جو کہ بہادر رانی کے شایان شان ہو سکتے ہیں۔

جب کبھی منوبائی کے وقت پیشوا کے لڑکوں کا اتالیق آ جاتا تو یہ لڑکی بھی جا بیٹھتی اور پڑھنے میں شریک ہو جاتی بلکہ بعض اوقات تو سواری تلوار کی مشق وغیرہ میں بھی حصہ لیا کرتی تھی اور دیکھنے والے خوش بھی ہوتے اور لڑکوں سے اسے بازی لیجاتے ہوئے دیکھ کر حیرت زدہ ہوتے تھے۔

الغرض منوبائی نے پیشوا کے لڑکوں کے ساتھ رہ کر لکھنا پڑھنا، سواری، نیزہ بازی، تیر اندازی اور تلوار کی مشق خوب اچھی طرح سیکھ لی۔

مونو بائی کی عمر جب شادی کے قابل ہوگئی تو اس کے باپ موروپنت کو فکر ہوئی کہ اب کیا کیا جائے۔ اِس لڑکی کو کہاں بیاہوں اور کوئی اچھا سا بَر اُس کے لیے ڈھونڈھنے لگا۔

حسنِ اتفاق سے ایک روز پیشوا کے پاس تاتیا دکشت مشہور نجومی ملاقات کے لیے آیا تو موقع پا کر موروپنت نے بھی اپنی لڑکی کی جنم پتری دکھلائی اور آئندہ کے لیے کچھ سوالات کیے۔ نجومی نے جب مونو بائی کا زائچہ دیکھا تو ششدر سا رہ گیا اور موروپنت سے کہنے لگا کہ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ مونو بائی رانی کے لقب سے یاد کی جائے گی۔ مگر نجومیوں کی یہ مقررہ باتیں ہوا کرتی ہیں وہ سُن کر خاموش ہو رہا اور اپنے دنیاوی کام کاج میں مشغول ہو گیا مگر شب و روز کسی طرح چین نہ پڑتی تھی کیونکہ برہمنوں کی قوم میں یہ بھی ایک دستور ہے کہ لڑکی سنِ بلوغ سے پیشتر بیاہی جائے۔ اور اس طور سے موروپنت کی فکر بھی بجا تھی۔ خیر۔

تاتیا دکشت نے مونو بائی کے رانی ہونے کی پیشینگوئی تو کر دی مگر لڑکی کا خداداد حُسن اور خداداد لیاقت دیکھ کر خود بھی متعجب ہو گیا۔ اب مونو بائی کی قسمت تو دیکھیے! اتفاق سے راجہ جھانسی کی بی بی کا انتقال ہو چکا تھا اور دِکشت کی وہاں تک رسائی بھی تھی جس وقت دِکشت غنیمت گنگا دھر راؤ راجہ جھانسی کے پاس گیا ہے تو اِس نجومی نے مونو بائی کے حُسن خداداد اور اُسکے لیاقت وغیرہ کی اتنی تعریف کی کہ راجہ بھی سُن کے متحیر سا ہو گیا۔ مگر یقین کیسے آوے۔ اپنے آدمی ٹھور کو بھیجدیے کہ مونو بائی کو دیکھ آئیں۔ جب گنگا دھر راؤ کے آدمی مونو بائی کو اچھی طرح دیکھ کر جھانسی کو واپس آ گئے اور مونو بائی کی خداداد لیاقت اور حسن خوبصورتی کی سچی تعریف کی ہے تو راجہ جھانسی بھی دل جان سے شادی کرنے کے لیے راضی ہو گیا۔

مونو بائی جھانسی لائی گئی اور شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ شادی ہو گئی اور رانی لکشمی بائی کے لقب سے پکاری جانے لگی۔

شادی کے سال بھر کے بعد نخلِ امید بھی باردار ہوا مگر تین مہینہ کے بعد بادِ سموم کے جھونکوں سے یہ پھول مُرجھا کر والدین کے دلوں پر داغِ مفارقت دے گیا جس کی وجہ سے رانی لکشمی اور راجہ گنگا دھر راؤ بہت ہی مغموم رہنے لگے۔ اپنے لختِ جگر کے غم میں راجہ سخت بیمار رہا۔ راجہ کے کوئی اور لڑکا تو تھا ہی نہیں لہذا اپنے ایک قریبی رشتہ دار واسودیو نیوالکر نامی کا لڑکا آنند راؤ گود لیا۔ اور تخت و تاج کا وارث مقرر کیا۔ رسوم ولیعہدی بڑی دھوم دھام کے ساتھ ادا ہوئے اور دامودھر راؤ گنگا دھر راؤ نام رکھا گیا۔ معمول کے موافق راجہ نے بندیلکھنڈ کے پولیٹکل ایجنٹ کے ذریعہ سے اس کارروائی کی سرکارِ ہند کو خبر بھی کر دی اور آپ کوئی دس سال کی حکومت کے بعد راہیِ ملکِ بقا ہوا۔

اب یہاں سے جھانسی کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ راجہ کے مرنے کے بعد ایجنٹ کو متبنّی مقرر کرنے کے بارے میں شکوک پیدا ہو گئے اور سارا کچا چٹھا سرکارِ ہند یعنی وائسرائے کو شملہ لکھ بھیجا اور اپنی رائے بھی ظاہر کی کہ سرکارِ ہند کو اب اختیار ہے کہ جھانسی کی حکومت میں اپنا انتظام کرے۔ اور رانی کو ماہانہ پانچ ہزار روپیے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ چونکہ لارڈ ڈلہوزی وائسرائے ہند دورے پر تھے لہذا جواب آنے میں چھ مہینے کی دیر ہوئی اِس عرصہ میں رانی لکشمی بائی نے یہ سمجھ لیا کہ گورنمنٹ ہند نے اِس گدی نشینی کو منظور کر لیا اور امورِ مملکت میں بھی کسی قسم کی دقت واقع نہ ہوئی۔

سنہ ۱۸۵۴ء میں جب لارڈ ڈلہوزی اپنے دورے سے واپس آئے تو فارن سکریٹری نے سارے کاغذات پیش کر دیے اور جھانسی کو حکومت سرکار میں داخل کر لینے کے وجوہ بھی دکھائے۔ اس پر حضور وائسرائے نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ ریاست جھانسی کوئی آزاد سلطنت نہ تھی بلکہ انگریزی سرکار کی ماتحت تھی راجہ کو بغیر مشورہ حکومتِ اعلیٰ متبنّی لینے کا کوئی اختیار نہ تھا لہذا ریاست جھانسی حکومت انگلیشیہ میں داخل کی جاتی ہے کیونکہ

راجہ کے کوئی وارث بھی نہیں ہے (۱۸۵۳ء)

مذکورہ بالا فیصلہ پر بعض مورخین خلاف ہے اور گے ناراض ہیں کیونکہ ان دونوں کا قول ہے کہ انگلشیہ سرکار کو جھانسی کی حکومت چھیننی نہ چاہیے تھی۔ مگر اس وقت اس سے ہمیں بحث نہیں۔

میجر ایلس وائسرائے کا فرمان لیکر رانی کے محل میں پہنچے اور رانی کو پردہ کے پیچھے بٹھا کر وائسرائے کا فرمان سُنایا گیا کہ جھانسی حکومت انگلشیہ میں داخل کر لی گئی اور اُن کو معقول وظیفہ ملنے کے علاوہ اُنکی پوری پوری عزت بھی برقرار رہے گی۔ مگر یہ شاہی فرمان سنتے ہی رانی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ دنیا آنکھوں تلے اندھیر ہوگئی آنکھوں سے آنسو کا دریا اُمڈ آیا میجر ایلس نے رانی کی بہت کچھ تسلی وتشفی کی لیکن رانی مارے غم وغصہ کے آپے سے باہر تھی کیا کیا جائے عقل کچھ کام نہ کرتی تھی آخر میجر مذکور رخصت ہونے لگا تو رانی کے مُنہ سے اتنا تو ضرور نکل گیا کہ "میں تو اپنی جھانسی نہ دوں گی"

جھانسی کے الحاق کے بعد پولیٹیکل ایجنٹ بندیلکھنڈ مسٹر جان مالکم نے رانی کے لیے چند باتوں کی سفارش سرکار ہند سے کی جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) رانی کو تادم زیست پانچ ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جائے۔

(۲) شاہی محل جسمیں رانی رہا کرتی ہے وہ اسکا خاص سمجھا جائے۔

(۳) راجہ گنگا دھر راؤ کی رائے سے ریاست کے کل جواہرات اور تحویل رانی کو مرحمت کیے جائیں اور رانی کے متعلقین وغیرہ کو وظیفہ دیا جائے انکی ایک فہرست بنائی جائے۔

مذکورہ بالا دونوں باتیں لارڈ ڈلہاوزی نے فوراً منظور کرلیں مگر تیسری بات ریاست کے جواہرات وغیرہ کی منظوری نہ دی کیونکہ راجہ کا اُن پر کوئی حق ہی نہ پہنچ سکتا تھا لہذا مسٹر مالکم نے کل جواہرات اور تحویل کا نقد روپیہ رانی کے حوالہ کردیا۔

مذکورہ بالا وظیفہ پر رانی راضی نہوئی اور اپنی حکومت حاصل کرنیکی کوشش کرنے لگی انگلنڈ کو اپنے وکیل بھی روانہ کیے کہ کورٹ آف ڈائرکٹر کے سامنے ساری حقیقت بیان کریں مگر آخر کو کچھ حاصل نہوا کیونکہ عرضی جو اس معاملہ کے لیے لکھی گئی تھی وہ اسقدر بیہودہ اور واہیات الفاظ سے پُر تھی کہ کورٹ نے بھی سرکار ہند کے فیصلہ سے اتفاق کیا۔ عرضی کا مضمون یہ تھا "ریاست جھانسی کچھ انگریزوں نے نہیں دی تھی۔ پیشوائی حکومت میں ہمارے بزرگوں کو اُن کی حق خدمت کے صلے میں ملی تھی۔ انگریزوں کو جھانسی کو اپنی حکومت میں الحاق کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" وغیرہ الغرض ہزارہا روپیہ برباد کیا گیا مگر نتیجہ کچھ بھی نہوا اور رانی کو مجبوراً وظیفہ قبول کرنے پر راضی ہونا پڑا۔

کچھ دنوں کے بعد اپنے گود لیے لڑکے کی رسم "اپنین" یعنی رسم جنیو پوشی بڑی دھوم دھام سے ادا کی تقریباً ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا یہ روپیہ سرکار ہند کی اجازت سے اُسی فنڈ سے لیا گیا جو دامودھر راؤ کے لیے بلوغت کو پہنچنے تک رکھا گیا تھا۔ رانی کو اس شرط پر لاکھ روپیہ دیا گیا کہ راجہ کے اپنی عمر بلوغت کو پہنچنے کے آگے واپس کردیا جائے جس کے لیے دو چار معزز اشخاص بھی بطور ضمانت لیے گئے۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں غدر شروع ہوگیا اور اُس کے شعلے سارے شمالی اور درمیانی ہند میں پھیل گئے پلٹنوں کی پلٹنیں انگریزوں سے باغی ہوگئیں اور بازار قتل وخون گرم ہوگیا باغیوں نے دہلی آکر بہادر شاہ خاندان مغلیہ کے آخری فرمانروا کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔

کانپور میں نانا صاحب باجی راؤ دوم کے متبنی بیٹے نے بھی علم بغاوت بلند کرنا شروع کیا اور بٹھور میں یکم جولائی ۱۸۵۷ء کو پیشوا بن بیٹھا اصل میں بغاوت کے بانی نانا صاحب اور اُس کا چچیرہ بھائی تانتیا توپی ہی تھے جو ظلم انھوں نے کیا ہے اُسکے لکھنے سے قلم قاصر ہے لکھنؤ میں باغیوں کے ہاتھوں برجیس قدر جو واجد علی شاہ کا لڑکا تھا نواب اودھ بنایا گیا اور یہ شعلے

بھڑکتے بھڑکتے جھانسی تک بھی پہنچے!

کپتان الگزانڈر اسکین کمشنر جھانسی کو یقین تھا کہ یہان کی سپاہ ہرگز ایسی حرکت بیہودہ نہ کریگی چنانچہ ابتدائے غدر سے ۴ جون ۱۸۵۷ء تک کپتان مذکور کا یہی خیال تھا۔ مگر دوسرے ہی روز جب انگریزون کے بنگلون کو آگ لگا دی گئی تو بحضرت کے کان کھڑے ہوے اور آنکھین کھلین چنانچہ یہان پر بھی کھلم کھلا بغاوت شروع ہو گئی۔ یہ دیکھ کر فوراً سارے انگریز قلعہ مین جا کر پناہ گزین ہو گئے!

کپتان ڈنلپ اور دوسرے انگریز افسرون نے حتی الامکان فساد روکنے کی کوشش کی مگر اب کیا ہو سکتا تھا یہان تو اور بھی دوسری آگ بھڑک گئی جو مدتون سے دبی ہوئی تھی۔ ساری سپاہ اور باشندے انگریزون کے خلاف ہو گئے۔ الغرض یہان کے بھی انگریزون کا وہی حال ہوا جو اور جگہون کے انگریزون کا ہوا ہے۔ باغیون کی جیت ہوئی اور اُن کا پورا قبضہ ہو گیا۔

اب باغیون کو اپنا ایک حاکم یا سردار مقرر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مسلمان نواب حسین قلی خان کو حاکم مقرر کرنا چاہتے اور ہندو کسی ہندو کو یہ عہدہ دینا چاہتے تھے۔ دونون مین خوب بجا بجنی ہوئی چونکہ ہندوٗن کی تعداد زیادہ تھی لہٰذا یہ قرار پایا کہ رانی لکشمی بائی کو اپنا سردار بنایا جائے ساری فوج اور باغی محل کو گئے اور رانی صاحبہ سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ رانی صاحبہ یہ سُن کر ازحد متعجب ہوئین کہ ہند مین بغاوت پھیل چکی ہے یہ تو اپنے محل مین تنہا اپنے بھگوان کی یاد مین پڑی رہتی تھی نہ دنیا سے کچھ کام تھا اور نہ اہل دنیا سے کسی طرح کا تعلق تھا۔ رانی لکشمی بائی کے لیے یہ بڑا ہی نازک وقت تھا کیونکہ رانی سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر آپ نے منظور نہ کیا تو ہم نے سداسیو راؤ کو راجہ بنانے کے لیے جھانسی بلایا ہے یہی اور مشکل آن پڑی کیونکہ سداسیو راؤ کا آنا رانی لکشمی بائی کے لیے گویا موت کا پیغام تھا۔ اگر کہین وہ آ جاتا تو یا رانی یہان سے نکالدی جاتی یا قتل کی جاتی لہٰذا مجبوراً رانی نے سرداری قبول کر لی۔

ساری سپاہ نے حلفاً اقرار کیا کہ جب تک دم مین دم ہے ہم رانی کے ساتھ رہین گے اور انگریزون کو ملک سے نکال کے دم لین گے۔ اس سے رانی کی اور بھی ہمت افزائی ہوئی اور ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو منادی کر دی گئی کہ "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور راج رانی لکشمی بائی کا"

جھانسی کی حکومت پاتے ہی رانی صاحبہ نے امورات سلطنت کیطرف خیال رجوع کیا۔ ہر ایک محکمہ کے لیے عہدہ دار مقرر کیے۔ فوج کی آراستگی کا انتظام کیا۔ شہر کی خاص مورچہ بندی کی اور ڈھونڈو پنت نانا صاحب کی طرف کمک کے لیے آدمی روانہ کیے۔ چونکہ شمال مغرب کی طرف سے انگریزون کے حملہ کا خوف لگا ہوا تھا لہٰذا رانی نے اپنی مورچہ بندی کا خاص انتظام کر لیا اور مقام کالپی مین ایک فوج رکھدی مگر ایک ماہ تک کوئی حملہ نہونے سے ساری فوج جھانسی آ گئی۔

جھانسی کے نکل جانے اور رانی کے تخت پر بیٹھنے سے انگریزون مین ایک کھلبلی سی پڑ گئی تھی مگر کیا کرتے مجبور تھے۔ فوج اتنی کافی نہ تھی جو مقابلہ کرتے۔ سارے ہندوستان کی ہوا بگڑ چکی تھی۔ مگر اس مین کچھ شک نہین کہ یہ ہمت کے بڑے پکے ہین۔ الغرض مارچ ۱۸۵۸ء تک انگریزون نے اپنی بگڑی ہوئی طاقت کو سنبھالا اور کچھ فوج جمع کر لی۔

ماہ مذکور کے ابتدا ہی مین خبر مشہور ہو گئی کہ جنرل سرہیو روز ایک زبردست فوج لیکر جھانسی کو پھر فتح کرنے آ رہا ہے مگر رانی مطلق نہ گھبرائی بلکہ اپنی بہادر اور جان نثار سہیلی رانی گنگا بائی دیوہ راجہ گنگا دھر راؤ کے ساتھ ملکر اپنی مختصرہ فوج کو جمع کیا اور شہر کی سخت مورچہ بندی وغیرہ کی۔

رانی لکشمی بائی یہ جانتی تھی کہ یہ بیل کبھی منڈھے نہین چڑھے گی ایک نہ ایک روز شکست فاش کا منحوس مُنہ دیکھنا ہی پڑے گا مگر کیا کرتی ہو آخر عورت ذات سارا ملک باغی ہو چکا تھا اور لوگ بالکل ہاتھون مین نہ تھے۔

لیکن اس پر بھی رانی صاحبہ نے بہت سے با رسوخ باغیوں کو لینا کر کے انگریزوں سے صلح کرنے پر راضی کر لیا چنانچہ کچھ ہوشیار آدمیوں کی ایک جماعت صلح کی شرطوں کے ساتھ جنرل سر ہیو روز کی طرف روانہ بھی ہو گئی مگر بد قسمتی تو دیکھیے! ابھی رانی کے وکیل جنرل موصوف کے پاس پہنچے بھی نہ تھے کہ سر ہیو روز بٹیوا ندی پر آن پہنچے اور چاندیری پر انگریزی حملہ ہو چکا۔ چونکہ یہاں رانی کی کافی فوج نہ تھی لہذا انگریزوں کو فتح ہوئی اور رانی کی فوج بھاگ آئی۔

چاندیری ایک مشہور مقام اکبری عہد میں تھا۔ یہاں کی عمارات اور دوسری چیزیں از حد مشہور تھیں۔ مغلیہ دور میں خصوصاً اکبر کے زمانہ میں تو ایک ضرب المثل ہو گئی تھی کہ "اگر کسی شہر میں محل ہی محل دیکھنا ہوں تو چاندیری دیکھو"۔ چنانچہ یہاں پر رانی کی فوج تھی مگر ناکافی اور یہی وجہ تھی جو یہ پہلی شکست رانی کو ہوئی۔

رانی کے بھیجے ہوئے وکیل جب انگریزی لشکر میں سر ہیو روز کے رو برو صلح کے لیے گئے ہیں تو انھیں جاسوس سمجھ کر فوراً قتل کر دیا گیا اور کچھ بھی دریافت نہ کیا کہ یہ کیوں آئے تھے۔

۲۳ مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوج کے ہراول کے بڑے حصہ نے جھانسی پر حملہ کیا جس میں فوراً قلب فوج کا حصہ بھی آملا۔ تیرہ روز تک سخت جنگ رہی۔ اس جنگ میں رانی لکشمی بائی اور اس کی بہادر سہیلی گنگا بائی نے جو ایک حساب سے اس کی بہو بھی ہوتی تھی خوب داد جوانمردی اور بہادری کے جوہر دکھائے اپنے سپاہیوں کا خوب دل بڑھایا خوب ہی حوصلے دلا دلا کر آگے کیا اور اپنا بھی شہر کا بچاؤ کیا کہ دیکھنے والوں کے چھکے چھوٹ گئے!

ایک مورخ (مسٹر ڈے) لکھتا ہے کہ "رانی لکشمی بائی اور رانی گنگا بائی کی ہمت دیکھ کر قلعہ کی دوسری عورتوں کو بھی ہمت آ گئی اور انھوں نے سپاہیوں کو کارتوس وغیرہ لا لا کر دینا شروع کیا اور ہر گز گولیوں کی گھبراہٹ نہ کی

پروانہ کی۔

جب تانتیا ٹوپی نے سنا کہ جھانسی پر انگریزوں نے حملہ کر دیا ہے تو فوراً اپنی فوج کے ساتھ جھانسی کی طرف کوچ کیا۔ اس کے ساتھ راجہ بانپور بھی شامل ہو گیا۔ تانتیا ٹوپی کے آنے کی خبر سن کر جنرل ہیو روز کو البتہ ذرا پریشانی ہوئی کیونکہ اس کے پاس اس وقت سب سے زیادہ زبردست جو آئی تھی فوج جمع ہو چکی تھی لہذا جنرل موصوف نے ایک منتخب سپاہیوں کی جماعت بٹیوا ندی کی طرف روانہ کی کہ تانتیا ٹوپی اور راجہ بانپور کو روکے کیونکہ رانی کے ساتھ ان دونوں کا ملنا انگریزوں کے لیے اچھا نہ تھا۔

تانتیا ٹوپی جس وقت ندی کنارے پہنچا ہے تو اس نے اپنی آمد کی خبر دینے کے لیے کئی سو مشعلیں اپنی فوج میں روشن کر دیں جن کو دیکھ کر جھانسی کی رانی کی فوج کی جان میں جان آ گئی اور مارے خوشی کے بندوقیں سر کرنی شروع کیں۔ اس سے انگریزی فوج واقعی پست ہمت ہو گئی اور ایک سخت پریشانی کی حالت میں تھی کہ اب کیا کیا جائے۔ مگر سر ہیو روز کی دور اندیشی اور ہمت نے دلشکستہ فوج کو سنبھالا اور فوج کا کچھ اور حصہ تانتیا ٹوپی کو روکنے کے لیے روانہ کیا گیا۔

اگرچہ تانتیا ٹوپی کو رانی لکشمی بائی نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کے آنے سے رانی کو ذرا ہمت سی آ گئی اور قدم جم گئے۔ دوسری طرف ندی کنارے تانتیا اور انگریزوں میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ کوئی معمولی جنگ نہ تھی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے مگر تانتیا کا طرز جنگ وہی پرانے طرز کا تھا جو سر ہیو روز کے آگے چل نہ سکا اور زیادہ نقصان ہونے سے سپاہ بھی دلشکستہ ہونے لگی اور سپاہ دل ہار کر بھاگنے لگی۔ اگرچہ تانتیا نے جہاں تک ہو سکا اپنی سپاہ کو روکا اور دل بڑھا بڑھا کر آگے کرنے کی سخت کوشش کی مگر انگریزی باقاعدہ فوج کے سامنے نہ ٹھہر سکی!

تانتیا کے آنے سے واقعی رانی اور ساری جھانسی کو ایک قسم کی

خوشی حاصل ہوگئی تھی مگر اب جبکہ اُن کے کانون مین تاملتیا کی شکست کی خبر پہنچی تو البتہ رانی اور فوج شکستہ تو ہوگئی مگر اپنے کام مین ویسی ہی ثابت قدمی سے جمی رہی جیسی کہ پیشتر تھی اور جہانتک ممکن تھا اپنے بچاؤ کا رانی نے پورا انتظام کرلیا۔

سر ہیوروز ۲۲ مارچ سے ۵ اپریل تک رانی سے لڑتے رہے مگر اتنی مدت مین بھی شہر مین داخل ہونے کا موقع نہ ملا۔ رانی کی بہادری اور جنگی لیاقت دیکھ کر سر ہیوروز از حد متعجب تھا بلکہ کہتا بھی تھا کہ "ایک عورت نے کیا کون دم کر دکھایا ہے۔ ایسی بہادر عورت مین نے کبھی نہین دیکھی" آخر جنرل ہیوروز نے ایک زبردست جماعت کوئی سو سے زیادہ بہادر اور تجربہ کار سپاہیون کی بنائی اور شہر کی مغربی سمت سے حملہ کرنے کی تاکید کردی اس وقت افسوس ہے کہ رانی حاضر نہ تھی - وہ پوجا مین مصروف تھی۔ اس طرف ساری فوج اُمنڈ پڑی اور دوسری طرف سر ہیوروز نے سخت گولہ باری شروع کرکے کچھ بہادر انگریزی سوبجرون کو سیڑھیون کے ذریعہ سے شمالی دیوار کی طرف سے شہر مین اُتار دیا اور اب جنگ کا کچھ نیا ہی رنگ ہوگیا۔ کیونکہ انگریزون کے حملے اب دو طرف سے ہو رہے تھے۔ اور باقاعدہ فوج کی گولہ باری اہلِ جھانسی کے لیے کچھ اچھی نہ تھی۔

رانی لکشمی بائی انگریزون کے شہر مین داخل ہونے کی خبر سنتے ہی مع اپنی مددگار رانی گنگا بائی کے فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل آئی اور جنگ مین شریک ہوگئی دن بھر جنگ ہوتی رہی اور شام کو انگریزی سپاہ محل تک پہنچ گئی رات بھر بھی رانی نے اپنے سپاہیون کو بڑی بہادری اور لیاقت کے ساتھ لڑایا مگر انگریزی فوج کا زور زیادہ ہونے سے رانی کو پیچھے ہٹنا ہی پڑا یہان تک کہ انگریز محل کے اصطبل تک پہنچ گئے۔ یہان پر بھی ۴ اپریل کو دن بھر جنگ رہی اور رانی کی سپاہ نے اپنا خوب ہی بچاؤ کیا۔ رانی کا زور کم دیکھ کر رانی کے باپ نے رائے دی کہ اب یہان ٹھہرنا اچھا نہین بلکہ کہین نکل جانا چاہیے مگر رانی نے اسے قبول نہ کیا لیکن آخر گنگا بائی کی تحریک سے اپنے کچھ سپاہی ساتھ لیے اور کچھ محل کی حفاظت یا بچاؤ کے لیے چھوڑ کر رات کے وقت کالپی کی طرف نکل گئی تا کہ تانتیا ٹوپی سے مل کر کوئی دوسرا انتظام کرے۔

۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو جنرل سر ہیوروز نے قلعہ جھانسی پر اپنا قبضہ کرلیا۔ جھانسی اور بیٹوا کی لڑائیون مین انگریزون کے ایک سو پینتالیس سپاہی کام آئے جن مین چھتیس افسر تھے۔ اہل جھانسی کا کوئی پانچ ہزار کا نقصان بتلایا جاتا ہے صرف جھانسی مین کوئی ہزار آدمی جلائے یا گاڑے گئے۔

دوسرے دن یعنی ۶ اپریل کو رانی لکشمی بائی اپنے ہمراہیون کے ساتھ کالپی پہنچی جہان تانتیا ٹوپی نانا صاحب کے چچازاد بھائی کا مقام تھا۔ یہان پر تانتیا کا زبردست توپ خانہ اور کل جنگی اشیاء کا ذخیرہ تھا۔ رانی لکشمی بائی کے لیے یہ پہلا ہی وقت تھا جو تانتیا ٹوپی سے ملاقات ہوئی۔ رانی کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ رانی گنگا بائی کا باپ نارائن ترمبک شاستری بھی یہان موجود تھا جو تانتیا کا رہنما اور صلاح کار تھا۔ ترمبک شاستری سرکار انگلیشیہ کا ملازم تھا اور اب وظیفہ خوار تھا۔

۶ سے ۱۴ اپریل تک رانی تانتیا ٹوپی کے ساتھ صلاح و مشورہ کرتی رہی کہ کیونکر پھر انگریزون پر حملہ کیا جائے اس میعاد مین انگریزون نے جھانسی کی اینٹ سے اینٹ بجادی جتنے لڑائی لے تہ تیغ کیے اسی مین رانی لکشمی بائی کا بوڑھا باپ بھی تلوارون کی نذر ہوا۔ الغرض خوب کشت و خون ہوا جیسا کہ مسٹر مارٹن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کم از کم پانچ ہزار آدمی فقط جھانسی مین مارے گئے۔

کانچ پر تانتیا نے حملہ کیا اور یہان بھی سر ہیوروز سے اچھی جنگ ہوئی مگر ہفتون کی جنگ کے بعد دونون طرف کچھ خاموشی سی چھا گئی۔ جو قدرتی بات ہے کیونکہ ایک تو گرمی قیامت کی پڑ رہی تھی جو انگریزی فوجون

پریشان کر رہی تھی اور ہندی سپاہ کو کئی ہفتون تک آرام نہین ملا کالپی کے بچاؤ کے لیے تانتیا نے رانی لکشمی بائی کو پیچھے سے چھوڑا اور خود فوج جمع کرنے کے لیے گوالیار چلا گیا۔ لکشمی بائی کانچ سے کالپی چلی آئی جو کوئی چار کوس کے فاصلہ پر تھا۔ رانی لکشمی بائی یہان ۲۰ مئی سے ۲۳ مئی تک رہی چنانچہ آخری روز یعنی ۲۳ مئی کو جنگ شروع ہوئی اور پھر بازار موت گرم ہو گیا۔

بد قسمتی سے راجہ بانپور تانتیا ٹوپی اور رانی لکشمی کے سپاہیون مین ناچاقی ہو گئی۔ اگر یہ ناچاقی نہ ہوتی تو یقیناً جنگ کا رنگ بدل جاتا۔ یہ ہم نے مانا کہ سر ہیو روز کی فوج کتنی ہی بڑھ چڑھ کر تھی مگر رانی لکشمی ضرور کچھ اپنی جوانمردی کے جوہر دکھلاتی مگر یہ خدا ہی کو منظور نہ تھا چنانچہ آخری دن یعنی ۲۳ مئی کو رانی کی فوج انگریزی رسالے اور توپ خانہ سے مغلوب ہو گئی اور ایک سراسیمگی کی حالت مین بھاگنے لگی یہان تک کہ رانی کو بھی اسی حالت مین اپنی فوج کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ اور جب رات کو راستہ پر مقام ہوا ہے تو رانی لکشمی بائی کو ایک درخت کے نیچے بستر کے بغیر سونا پڑا!

اس جنگ کا حال ڈاکٹر لو نے جو اس وقت حاضر تھا لکھا ہے کہ "ایک سخت جنگ کے بعد کہ جس مین دشمنون پر فتح ہوئی جنکا نمبر ہم سے دس گنا زیادہ تھا"

رانی لکشمی بائی گوالیار کیطرف اپنی فوج لیکر بھاگ گئی۔ چونکہ اب جنگ کی امید نہ رہی تھی لہذا سر ہیو روز نے طبیعت علیل ہو جانے کی وجہ سے سرکار ہند سے رخصت مانگی اور یہ بھی لکھا کہ چونکہ گرمی شدت سے پڑ رہی ہے لہذا گوردن کو اپنے اپنے صدر مقامون کو روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جنرل صاحب کو حسب منشاء رخصت مل گئی اور گوردن کے لیے بھی ویسا ہی حکم ہو گیا جیسا کہ جنرل نے لکھ دیا تھا۔

مگر جنرل موصوف نے ذرا سمجھنے مین غلطی کی کیونکہ رانی لکشمی بائی کا یہ پختہ ارادہ ہو چکا تھا کہ جب تک دم مین دم ہے ماردن گی یا مرون گی چنانچہ رانی گوالیار کی طرف چلی گئی تاکہ اپنی فوج کو انگریزون کے مقابل لڑنے کے قابل بنائے اور تانتیا جو رنگروٹ وغیرہ لانے گیا تھا وہ سب مکمل کرے

سندھیہ اور ہولکر یہ دونون مرہٹہ سردار ایام بغاوت مین انگریزون کے ساتھ رہے تھے اور انھون نے بالکل باغیون کا ساتھ نہ دیا تھا۔ اب یہ کوئی تعجب کی بات نہین ہے کہ جس وقت رانی لکشمی بائی حدود سندھیہ مین داخل ہوئی ہے تو سندھیہ کے سپاہیون نے اس پر حملے کرنے شروع کیے اور آپ بھی اپنی فوج کے ساتھ تھا

جس وقت رانی نے سندھیہ کی خبر سنی فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی اور اپنی جان نثار اور بہادر ساتھی گنگا بائی کو ہمراہ لیکر سندھیہ کی ملاقات کو آگے بڑھی مگر انکی یہ دلیرانہ ہمت اور بے دھڑک اپنی فوج مین آتے دیکھ کر تو سندھیہ بالکل ہی متعجب ہو گیا۔ حملہ کرنے کو تو نہین کہا اگر ان دونون عورتون کو گرفتار کرنے کے لیے حکم دیا مگر تعجب ہے کہ سندھیہ کے سپاہیون نے رانی لکشمی بائی اور گنگا بائی کو گرفتار کرنیکی ہمت نہ کی اور لکشمی بائی نے ایک حقارت آمیز اور تمسخرانہ لہجہ مین کہا کہ مہاراج! جب مین آپ تابع نہین ہو سکتی ہون تو پھر مجھے کون تابع کر سکتا ہے!! مین آپکو اپنا لباس نذر کرنے آئی ہون جو آپ جیسے اور اندوری امیر پہنا کرتے ہین لہذا آپ اپنا لباس مجھے عنایت کیجیے اور میرا لباس و زیور آپ پہن لین!!!

یہ سن کر سندھیہ از حد شرمندہ ہوا اور رانی لکشمی بائی کے سامنے ایک منٹ بھی نہ ٹھہر سکا بلکہ پیچھے سے اپنے پایۂ تخت کو چلا گیا اور پھر وہان سے خدا جانے کیون آگرہ کو بھاگ گیا۔

مہاراجہ سندھیہ کے نکل جاتے ہی رانی لکشمی بائی داخل گوالیار ہوئی اور پھول باغ محل مین رہنے لگی۔ نانا صاحب پیشوا بنایا گیا اور اس کا لڑکا حاکم گوالیار۔ سندھیہ کے خزانہ مین جو کچھ روپیہ ملا اسے رانی لکشمی بائی

نے اپنے سپاہیون مین تقسیم کردادیا اور رام راؤ گوبند کو وزیر اعظم مقرر کیا چار مرہٹہ سردار جن کو سندھیہ نے بغاوت کے جرم پر مقید کر رکھا تھا رہا کیے گئے اور انھین خلعت وغیرہ دیکر نئے سپاہی بھرتی کرنے کے لیے روانہ کردیا گیا کیونکہ یقین تھا کہ انگریز بہت جلد چمبل کے پار آجائین گے شہر کے باہر کی فوج کی کمانڈ رانی لکشمی بائی کو دی گئی۔ شہر کے اندر کی فوج کی سرداری تانتیا توپی کو مرحمت ہوئی اور کل باغی راجاؤن کو خصوصاً راجہ بانپور اور شاہ گڈھ کو خطوط روانہ کر دیے گئے کہ گوالیار کی نئی حکومت مین آکر شامل ہو جائین۔

مگر جب گورنر جنرل کو یہ خبر ملی کہ رانی لکشمی بائی نے گوالیار مین نئی حکومت قائم کی ہے تو فوراً جنرل سر ہیو روز کو حکم دیا کہ جہان تک جلد ممکن ہو اپنے سپاہیون کے ساتھ جاؤ اور رانی کا مقابلہ کرو۔ چنانچہ ۱۰؍ جون کو جنرل موصوف ایک لشکر جرار کے ساتھ گوالیار پہنچے اور جاتے ہی ایک زبردست حملہ کر دیا جس سے باغیون کے پاؤن اکھڑ گئے مرار مین بھی جنگ ہوئی مگر جنرل ہی فتحمند رہا۔ بھاگتے ہوے باغیون کا پیچھا ذرا سختی سے کیا گیا جس سے باغیون کا از حد نقصان ہوا۔

سر ہیو روز کے حکم سے برگیڈیر اسمتھ ۱۱؍ جون کو انتری سے کوچ کرکے ۱۷؍ جون کو کوٹہ کی سرائے مین پہنچا جو گوالیار سے کوئی پانچ کوس پر واقع ہے۔ یہان پر جنگ ہوئی اور اسمتھ نے اپنے رسالہ کو باغیون پر حملہ کرنے کا حکم دیا جس مین رانی بھی پھنس گئی اور گھوڑے کو ایسی ٹھوکر لگی کہ آپ بھی زمین پر آرہی۔ اتنے مین ایک انگریز سوار نے رانی پر حملہ کر کے اُسے مار ڈالا۔

رانی کے مارے جانے کی ایک اور بھی روایت بیان کی جاتی ہے کہ ۱۷؍ جون ۱۸۵۸ء کو رانی دوپہر کے وقت گنگا بائی کے ہمراہ پھول باغ سے باہر آرہی تھی۔ ہزار رسالہ کی ایک جماعت جھاڑیون مین چھپی بیٹھی تھی اُن کو آتے دیکھ کر بندوقون کی بوچھاڑ برسانی شروع کی جس سے رانی لکشمی بائی اور گنگا بائی کے سینے چھلنی ہو گئے۔

رانی کے محافظین نے اِس خیال سے کہ شاید کہین رانی کی لاش انگریزون کے ہاتھ نہ آجائے اِس لیے نارائن ترنبک شاستری کے ذریعہ پھول باغ ہی مین جلادی۔

رانی کے یہ حالات بتلا رہے ہین کہ رانی کا کوئی بُرا ارادہ نہ تھا اور نہ اُس کی خواہش تھی کہ انگریزون کے خلاف کوئی بغاوت کرے۔ اِس مین کوئی شک نہین کہ اُسے انگریزون سے اور خصوصاً گورنر جنرل سے ایک قسم کا غصہ تھا جو کہ فطرتاً ہونا چاہیے تھا کیونکہ بیٹھے بٹھائے اُس کا راج لے لیا گیا تھا۔ جس وقت جھانسی مین باغیون نے اِسے آکر اپنا سردار بننے کے لیے کہا ہے تو اس کا ارادہ صاف انکار کردینے کا تھا مگر وہ مصلحت نہ تھی کیونکہ اگر رانی ایسا کرتی تو سداشیوراؤ جھانسی کا مالک بننے ہی پر تھا جسکو یہ پسند نہ کرتی تھی۔ اگر رانی باغی بھی ہوئی ہے تو صرف مجبوراً۔ اگر ایسے وقت وہ باغیون کا ساتھ نہ دیتی تو یہ اتنے روز جینے بھی نہ پاتی۔

بارہا رانی کا ارادہ ہوا کہ انگریزون سے صلح کرلے مگر اپنے جاہل ساتھیون کی وجہ سے بیچاری ایسا نہ کر سکی اور خواہ مخواہ جنگ وجدل کرنا ہی پڑا۔ رانی یہ جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن ناکامی اور شکست کا منحوس منھ مجھے دیکھنا پڑے گا مگر افسوس ہے کہ وہ بالکل مجبور تھی۔

یہ حالات صرف رانی کے ذاتی اوصاف بتلانے کے لیے لکھے گئے ہین کہ ایک عورت نے کس خوبی اور جوانمردی سے مشہور تجربہ کار جنرل کا مقابلہ کیا اور کس خوبی سے اپنی سپاہ کو لڑایا مبارک ہے وہ زمین جس مین ایسی عورتین پیدا ہون اور خوش قسمت ہین وہ والدین جو ایسے باہمت اور بہادر بچے پیدا کرین۔ جبتک ہندوستان کی تاریخ کے صفحے دنیا مین ناموافق ہوا کے تھپیڑون سے محفوظ ہین اُسوقت تک رانی درگاوتی ملکہ رضیہ بیگم اور چاند سلطانہ کے نامون کیطرح رانی لکشمی بائی کا نام بھی صفحۂ دنیا پر ایک قابل قدر یادگار رہیگا۔

قطب الدین خان راقی

نیک ارادہ

نیک ارادہ صرف اس وجہ سے اچھا نہین کہ اُسکے ذریعہ سے کوئی اچھا اور مفید کام ہوتا یا ہونے کی اُمید کی جاسکتی ہی، یا وہ کوئی اچھا اثر ڈالتا ہی یا کسی اہم مدعا کے لیے کوئی مناسبت اور موزونیت رکھتا ہی بلکہ اُسے صرف اس وجہ سے اچھا کہا جاتا ہی کہ وہ فی نفسہ اچھا ہی اور اُسکے ذاتی تکمدہ اور موازنہ سے اُس کی قدر و منزلت اور اہمیت و قیمت اور بھی اعلیٰ اور بالاتر معلوم ہوتی ہی اور وہ اپنی ذاتی خوبی اور عمدگی کی وجہ سے اُن تمام میلانات و رجحانات اور جذبات پر غالب آتا ہی جو انسان کے دل و دماغ مین مختلف محرکات کی وجہ سے وقتاً فوقتاً موجزن ہوتے رہتے ہین۔

اگر کبھی ایسا اتفاق ہوجائے کہ بدبختی وقت یا کسی مسکانہ تحریک کی وجہ سے ارادہ نیک اپنی جبلی خوبی اور اصلی طاقت کھو بیٹھے اور باوجود لگاتار کوششون اور جد و جہد کے اُس سے کچھ بن نہ سکے اور صرف ایک نیک ارادہ ہی رہ جائے تو بھی وہ اُس موتی کی طرح ہو جو کسی قدردان کے ہاتھون مین جانے کا موقع حاصل نہین کرسکتا اپنی جبلی ضیا کی وجہ سے ہمیشہ تابان اور درخشان رہے گا، اور اُسکی ذاتی قیمت باوجود اسکے کہ وہ کسی اچھے صرف مین نہین لایا گیا وہی رہیگی۔

ہر شے کی تین طرح سے قیمت پڑتی ہی۔

(۱) باعتبار جبلی یا ذاتی امتیازات اور خوبیون کے۔

(۲) باعتبار ذاتی اور اضافی خوبیون کے۔

(۳) باعتبار محض اضافی یا تماشی خوبیون کے۔

دنیا مین بہت سی ایسی اشیا بھی ہین جنکی قدر و قیمت محض اُنکی ذاتی خوبی اور ذاتی وجاہت کی وجہ سے ہوتی ہی۔ یعنی خود اُن کی ذات ہی اُن کی قیمت کا فیصلا کرتی ہی۔ ایسی اشیا کا مفید اور منشہ ہونا نہ اُن کی قیمت بڑھا سکتا ہی اور نہ گھٹا سکتا ہی۔ ایسی اشیا خود اپنی ذات مین ہی ایک ایسا جوہر فرد رکھتی ہین جو بغیر توسل عرضیات کے اُن کی قیمت کا فیصلا کرسکتا ہی۔ ایسی اشیا یا ایسے عنصر اور ایسی طاقت کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ہمین نہ کسی صراف کی ضرورت ہی اور نہ کسی نقاد اور محک کی۔ وہ اپنے مُنھ سے ہی اپنی قیمت بتاتی اور اپنا فیصلا کرتی ہی۔ دوسرے الفاظ مین یہ کہ وہ خود ایک قیمت بلکہ ایک فیصلا شدہ قیمت ہی ہوتی ہی۔ قیمت کی قیمت ڈالنا صحیح نہین۔ وہی شے نقاد اور صراف کی محتاج رہتی ہی جو مشکوک ہو یا اُسے کوئی مشکوک ظاہر کرے جو چیز اپنے اندر کھوٹ نہین رکھتی وہ اپنی آپ نقاد ہی۔ دوسرے نقاد خود اُسکی نقد قیمت اور نقد خوبی کا احساس کرکے یہ فیصلا کرسکتے ہین کہ اُسکی قیمت کا نرخ کہانتک پہنچ سکتا ہی ع نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

ارادہ کی قیمت مطلق

محض ارادہ کی قیمتِ مطلق کی بحث مین جبکہ کسی قسم کے فائدہ کو بھی مدِنظر نہین رکھا جاتا بعض وقت یہ گمان پیدا ہوتا ہی کہ غالباً یہ بلند پروازیٔ تخیل کا نتیجہ ہو یا یہ کہ ہمین ارادہ پر عقل کو حاکم بنانے مین منشاے قدرت اور محرکات کے سمجھنے مین کوئی غلطی ہوئی ہو یا خود عقل کے فیصلا مین ہی کوئی کمی اور کوئی لغزش ہو۔

اس قسم کے شبہات اور شکوک پیدا ہونے کے وقت عام عقل انسانی مزاحم ہوتی ہی۔ لیکن ہم اکثر ایسی بحثون مین پڑکر اس نقطۂ نگاہ سے ارادہ کی قیمت لگانے یا معلوم کرنے کے عادی ہین۔ یہ ایک غلطی اور بدخیالی ہی کہ ہم اکثر ارادہ کی قیمت اُس صورت مین اعلیٰ قرار دینے کی کوشش کرتے ہین جب کہ اُس کا نتیجہ ہمیشہ مفاد ہی ہو۔ اس صورت مین ہم ارادہ کی ذاتی خوبی اور جبلی قیمت کم کرتے ہین۔

ارادہ میں دوسری قوتوں کے ساتھ بطور ایک اہم قوت کے دیا گیا ہے اس کی ضرورت دوسری قوتوں کے مقابلہ میں کم نہیں ہے عقل و فراست کے مقابلہ میں ارادہ کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ بعض دفعہ عقل و فراست کے ماتحت ہی ارادہ کو چلنا پڑتا ہے، یا ارادہ عقل ہی سے بعض دفعہ مشورت لیتا ہے اور یہ ضروری بھی ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی عنصر کے کنبے یا ایک ہی قوائی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کے کاموں اور تصرفات میں ایک بڑی حد تک وابستگی اور نسبت بھی ہے لیکن پھر بھی ارادہ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بے شک بعض دفعہ ارادہ کا طریق عمل جابرانہ اور قادرانہ بھی ہوتا ہے اور عقل کے مقابلہ میں اسکے عمل میں ایک قسم کا تحکم بھی پایا جاتا ہے گو پھر بھی ان دونوں میں ایک نسبت اور وابستگی ہے تم دیکھ سکتے ہو کہ جب کبھی ہم کوئی ارادہ کرتے ہیں تو ہمارے اندرون میں ہی سے ایک شے یا ایک طاقت کبھی اس کی مزاحم ہوتی ہے اور کبھی اُس کی تائید میں ہو کر اُسکا پہلو لیتی ہے۔ ایسی مزاحمت کے وقت ارادہ کبھی قابو میں آ جاتا ہے اور کبھی قابو سے نکل جاتا ہے کبھی اسکی تائید سے اپنے جنون میں لگا رہتا ہے اور کبھی تائید کی کچھ پروا نہیں کرتا اپنی ہی دُھن مقدم رکھتا ہے۔ اگرچہ عقل و فراست باعتبار اپنے اجتہادات اور دلائل کے ایک بڑی موثر اور زبردست قوت ہے لیکن ارادہ کی قوت اور جبروت سے اسکی قوت اور اسکی جبروت نہیں مل سکتی۔ ارادہ باد ہے اور عقل ساکن۔ عقل بتدریج اور بے تامل چلتی ہے اور ارادہ کی رفتار بسا اوقات اپنے اندر ایک خاص قسم کی تیزی رکھتی ہے۔ عقل کبھی بھی فہم اور غور سے باہر قدم نہیں رکھتی یا نہیں رکھنا چاہتی۔ لیکن ارادہ بہت دفعہ حدود فہم اور غور سے باہر ہو جاتا ہے۔ ارادہ اپنے زور سے آگے بڑھتا اور ایک دُھن میں ایک فعل پورا کرنا چاہتا ہے بخلاف اسکے عقل و فراست حکمت اور تامل سے کام لیتی ہے۔ عقل و فراست کبھی اندھی اور خود رو نہیں ہوتی بلکہ واقعات متصلہ اسباب حاصلہ کیفیات موارد اور نتائج متیقنہ تجربہ اور تیقنہ کے مطابق چلتی ہے۔ مگر ارادہ جوش میں اندھا بھی ہو جاتا ہے۔ ارادہ کی دو آنکھیں ہیں۔ کبھی کبھی دونوں آنکھیں جب کھلی ہوتی ہیں تو وہ مزید غور سے کام لیتا ہے لیکن جب کبھی ایک آنکھ بند ہو جاتی ہے تو وہ ایک طرف کے واقعات چھوڑ کر اور اُن کی کچھ پروا نہ کر کے مصروف کار ہو جاتا ہے۔

ارادہ اور وقوف

ارادہ بھی ایک وقوف رکھتا ہے اور اُسے بھی ایک شعور حاصل ہے یہ کہنا کہ ارادہ کوئی وقوف یا کوئی شعور نہیں رکھتا غلطی ہے وہ ایک قوت ہے اور ہر قوت امتیازی پہلو سے ایک وقوف یا ایک حس ذاتیہ رکھتی ہے۔ گو ہم اُسے وقوف اور شعور کے نام سے موسوم نہ کریں مگر وہ ایک وقوف ہی ہوتا ہے۔ وقوف میں ایک احساس ہوتا ہے اور ہر قوت ایک احساس رکھتی ہے ورنہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ہم ایک ارادہ کرتے یا کر سکتے ہیں۔ ارادہ کرنے میں ایک شے خود ارادہ میں ایسی بھی ہونی چاہیئے یا ہوتی ہے جو ہمیں دوسری طرف یا اپنی طرف توجہ دلاتی ہے۔ وہ کیا شے اور کون سی طاقت ہے جو ہمیں اسطرف کشاں کشاں لیے جاتی ہے۔ وہ صرف کوئی اور محرک نہیں ہوتا بلکہ اسکے ساتھ خود ارادہ یا اس کا احساس یا قوت احساس ہے جو اُسے اُس طرف توجہ دلاتی اور تحریک کرتی ہے۔ عقل و فراست کی ہدایات اور رشد سے جب ارادہ نکل کر اپنی دُھن میں لگ جاتا ہے تو وہ کسی ایسے محرک کے قابو میں ہو کر جاتا ہے جو خود اس پر بھی غالب ہے۔ وہی شے ارادہ کا احساس یا قوت احساس اور وقوف ہے یا یوں کہیئے کہ ارادہ بجائے خود ایک پُر زور احساس اور وقوف کا نام ہے۔

ہر ذی اعضاء کی ہستی کی بناوٹ میں یعنی ایک ایسی ہستی میں

جو اغراض زندگی اور مقاصد حیات کی خاطر متناسب اور موزون بنائی گئی ہی ہم ہمیشہ بطور ایک بنیادی اصول کے فرض کر لیتے ہین کہ اس مین کوئی ایسا عضو اور ایسی قوت یا ایسا جذبہ نہین ملے گا جو اُس غرض اور اُس مطلب کے واسطے موزون اور مناسب نہو جو اُس خلقت سے مقصود اور مزعوم تھا اگرچہ ہم ایسا فرض کرنے مین کسی مہلک اور غیر متوقع غلطی کے مرتکب نہین ہوتے لیکن جب ہم عملی رنگ مین مشاہدہ کرتے ہین تو ہم پر اپنی غلطی اور اپنا سقم کھل جاتا ہی کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہین کہ ہمارے اعضا اور قوی مین بعض عضو اور بعض قوتین اور بعض جذبات ایسے کامون کے واسطے ہی خاص کر دیے جاتے ہین جو قدرتی اغراض اور قدرت منشا کے ایک بڑی حد تک منافی ہوتے ہین۔ یہ صورت یا تو بدین وجہ صورت پذیر ہوتی ہی کہ ہم اکثر اوقات فطری مقاصد کے اندازہ سے گر جاتے ہین یا اس لیے کہ ہم اُن امور اور اُن مصالح سے دور جا پڑتے ہین جو اس شعبہ مین لازمی ہین۔

ہم جو اکثر قوتون اور جذبات سے بجاے فوائد کے نقصان اُٹھاتے ہین اُس کی وجہ یہی ہوا کرتی ہی کہ ہم قوتون اور جذبات کے اندازہ خواص اور افعال سے بے خبر رہتے ہین۔ ہمین قدرت نے بالمقابل دو قوتین **عقل** اور **ارادہ** ودیعت کر رکھی ہین اور ان دونون سے کوئی فرد بشر بھی حد امکان تک معرا اور خالی نہین۔ یہ جدا بات ہی کہ پیمانہ اور وسعت اذہان مین کچھ فرق ہو۔

ہم یہ بات بآسانی سمجھ سکتے ہین کہ قدرت کی جانب سے بغیر کسی معقول معاوضہ کے ان دونون قوتون کا ہمین ودیعت کیا جانا فضول نہین ہی۔ ارادہ بجاے خود کارآمد اور ضروری ہی اور عقل بجاے خود۔ اگرچہ ان دونون کے مقتضیات اور ان کے اغراض و افعال مین بہت کچھ فرق ہی لیکن ان کی اہمیت ضرورت اور باہمی اقتران سے انکار بھی نہین کیا جا سکتا۔ جو ہماری زندگی کے بڑے بڑے اور اہم واقعات مین ظاہر ہوتا ہی۔

قدرت کا صحیح مُدعا ان قوتون کے عطا کرنے سے ہماری حفاظت بہبود و مسرت اور کامیابی کا تھا۔ اس مُدعا کو پورا کرنے کے واسطے اُن دونون قوتون کے ودیعت اور انتخاب سے ہماری انسانی نگاہون مین قدرت نے ایک بڑا مسلک اور فریب دہ تجویز اختیار کی ہی۔ وہ تمام کام جو مخلوق انسانی اور حیوانی اس مدعا کے پورا کرنے کے لیے کرتی ہی اور جسکے طرز عمل کا تمام قاعدہ یقینی طور پر فطری تمیز کا تجویز کردہ ہوتا ہی عقل و فراست اور ارادہ کے مقابلہ مین بعض دفعہ ہمین ایک پیچیدگی مین ڈالے بغیر نہین رہتا۔ دوسری تمیز اگر اکثر دفعہ ہمین صحیح مسلک کا نشان دیتی ہی تو بعض غیر بیرونی اغلاط کی وجہ سے غلط نشان بھی دے جاتی ہی ہم یہان پہنچکر یہ کہنے یا اس استدلال کے مجاز ہین کہ فطری تمیز عقل اور ارادہ سے بھی ایک جداگانہ شے یا جداگانہ طاقت ہی۔ اگرچہ عقل و فراست اور فطری تمیز مین تمیز کرنا ایک پیچیدار اور مشکل کام ہی مگر ہمین اپنے افعال اور اپنے خیالات کی تنقید سے کسی حد تک یہ معلوم کرنے کا موقع مل سکتا ہی کہ ہمین ایک فطری تمیز بھی حاصل ہی چاہے اُسے ایک مستقل قدرت کہا جائے یا عقل و فراست کا ایک دوسرا پہلو۔

فطری تمیز اور عقلی فراست مین کسی حد تک چونکہ امتیاز ایک مشکل امر ہی اس واسطے بالفاظ دیگر ہمین یہ کہنا چاہیے کہ با اکثر حالات ہمارے واسطے صرف ایک عقل ہی رہبر ہوتی ہی اور ہم عموماً اسی پر بہت کچھ مدار رکھتے ہین اور اسکے ذریعہ سے ہم اُس مدعا اور اس بات کی تلاش مین سرگردان رہتے ہین جو ہماری زندگی کا اعلیٰ مقصد شمار ہوتی ہی۔ چونکہ عقل و فراست اور فطری تمیز کی حقیقت نیک واقعہ ہوتی ہی اس واسطے جب ہم کوئی نیک ارادہ کرتے ہین تو عقل و فراست اور فطری تمیز بھی خوشی سے اس پر صاد کرتی ہی۔ ارادہ کی صحت اور غلطی کی نقاد عقل و فراست ہی ہے۔ اور عقل و فراست مین ایسی تنقید کا مادہ اُس صورت مین پیدا ہو سکتا ہی جب وہ بعض خارجی عوارض اور بعض فریب دہ اسباب سے پاک صاف ہو۔

ایسا اثر کیہ سولے اسکے نہیں ہو سکتا کہ انسان مشاہداتی اور تجربی رنگ میں علمی اور عملی پہلو سے اُن کا عابر اور مشاہر ہو۔

یہ تمام باتیں اُس وقت حاصل ہوتی ہیں جب تربیت اور تربیت کا اسکول اچھا ہو اور سیرت و کریکٹر کی تربیت مقدم رکھی گئی ہو۔

حضرت سلیمان فرماتے ہیں :-

خداوند کا خوف دانش کی ابتدا ہے لیکن احمق دانائی اور تربیت کو حقیر جانتے ہیں۔

اے میرے بیٹے اپنے باپ کی تربیت کا شنوا ہو۔ اور اپنی ماں کی تاکید کو مت ترک کر۔

تربیت گھر ہی کی چار دیواریوں سے شروع ہوتی ہے اور گھر ہی تربیت کا ایک ابتدائی اسکول ہے۔

انسان کی ساری مہمات کا مدار ارادہ پر ہے اور ارادہ وہی اچھا ہے جو صحیح اور نیک ہو۔ ارادہ کی صحت اور سعادت تربیت پر موقوف ہے۔ تربیت صحیح مشاہدہ اور کامل تجربہ کی محتاج ہے۔ یہ دونوں اُسوقت حاصل ہو سکتی ہیں جب سلسلۂ تعلیم صحیح اصول پر مبنی ہو۔ کوئی قوم اُسوقت تک ترقی نہیں کر سکتی جبتک اُس میں قلبی عصبیت پائی جائے اور اسکا انحصار صحیح تربیت پر ہے۔

صحیح تربیت قوتوں اور جذبات کی مزکی ہے

تزکیہ قوی اور تزکیہ جذبات موجب ہے صحیح اور نیک ارادہ کا۔

نیک ارادہ شروع ہے تمام کامیابیوں اور تمام سعادتوں کا۔

سلطان احمد

دوست

اہا! اس چار حرفی لفظ مین کیسے کیسے راز مخفی ہین جس کے اثرات مقناطیسی کشش سے دلون کو اپنی طرف کھینچتے ہین۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر حرف مین جداجدا شان اور خوبیان معلوم ہونگی۔ لفظ "دوست" کا "د" دو دلون کے ایک ہو جانے کی دلیل کرتا ہی اور "و" وفاداری کی تصدیق کرتا ہی اور "س" سازگاری کا دندان شکنی سے ثبوت دیتی ہی اور "ت" ترقی کی تائید و ترغیب دلاتی ہی۔ اگر ہر دوست اس چار حرفی لفظ کو بخوبی سمجھ لے اور اسی کو اصول دوستی مان لے تو زندگی بھر ایک دوسرے مین نفاق نہ پیدا ہو۔

یہ لفظ کس قدر پیارا اور شیرین ہی! مگر یہ پیارا اور شیرین لفظ کس کو زیبا اور کس کو شایان ہی اور اس بے بہا اسم کا کون مستحق اور کون غیر مستحق ہی؟ اس کے دریافت کرنے اور اُس سے پورے طور سے آگاہی حاصل کرنے کی ہر فرد بشر کے لیے ضرورت ہی۔ کیونکہ جس طرح ہر شاہ کو ایک زکی و ذہین وزیر کی سخت ضرورت رہتی ہی اسی طرح ہر شخص کو امیر ہو یا غریب ایک وفادار اور غمخوار دوست کی ضرورت ہی دنیا مین یہی سب سے بڑا اور بھاری رشتہ ہی۔ ہماری اچھی اور بُری زندگی کا تمام دار و مدار اور ہماری آئندہ ترقی و تنزلی اسی پر منحصر ہی۔ بُرے وقت مین اسی سے امداد طلب کر سکتے ہین اور اسی سے رنج و راحت نصیب ہوتی ہی۔ آفت و مصیبت مین اسی سے غمخواری کی امید کر سکتے ہین اور اسی سے ہماری امید و حسرت نفع و قطع ہوتی ہین اور یہی ہمارے رنج و غم مین حصّہ لیتے ہین۔ انھین کے آگے ہم اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہین اور یہی ہمارے سوز و گداز اور راز و نیاز سے آگاہ ہوتے ہین انھین سے ہمارے ارادے اور حوصلے پست اور استوار ہوتے ہین۔ ہماری دلی تمنائین انھین سے وابستہ اور منقطع ہوتی ہین ہمارے دلی جذبات کا پورا ہونا نہ ہونا انھین پر موقوف۔ بلندی و پستی انھین کے

ذریعہ سے یہی رہبر وہی رہزن یہی خیرخواہ یہی بدظن۔ غرضیکہ ہماری بھلی اور بُری زندگی کا تمام دار و مدار دوست ہی پر منحصر ہو۔ اگر دوست وفادار اور صادق ملا تو ہمارا رشتۂ الفت تاعمر پختہ اور مضبوط رہے گا اور ہم براحت اپنی زندگی بسر کرین گے برخلاف اس کے اگر دوست خودغرض اور بے وفا ملا تو ہماری زندگی بالکل بے لطف اور برباد ہو جائے گی۔

یون تو دنیا مین ہر شخص کے ہزارون شناسا اور جان پہچان والے ہوتے ہین اور لاکھون سے واقفیت اور باہمی تعلقات ہوتے ہین، مگر کیا یہ تمام دوست ہی کہے جائین گے۔ ہرگز نہین۔ ہان اسمین شک نہین کہ کل مومن اخوان ہین مگر یہ تمام اُن مین سے نہین جنھین ہم دوست کے پیارے نام سے یاد کرتے ہین اور جو آپس مین سنہری تار سے ایک دوسرے کے دلون کو پیوست کرتے ہین، باہم مصیبت مین ایک دوسرے کی امداد کرتے ہین، اور جو ہمخیال اور یکدل ہو جاتے ہین۔

دنیا کے تمام باہمی تعلقات اور رشتون پر رشتۂ دوستی قابل ترجیح اور فوقیت دینے کے لائق ہو بادی النظر مین تو یہ بات کسی قدر ناموزون اور نازیبا معلوم ہوتی ہو مگر بنظر تعمق دیکھا جائے تو بہت زیبا بہت راست اور بہت مناسب معلوم ہوگی اور وہ لوگ جن کو اس کا تجربہ پورے طور سے حاصل اور اس کی خوبیون سے کماحقہٗ واقف اور اس کی صفات سے بخوبی آگاہ اور اُس کے فوائد سے اچھی طرح بہرہ ور ہین وہی کچھ اُس کی عظمت و منزلت اور سود و زیان جانتے ہین اور انھین کے دلون مین اُسکی حرمت و سطوت موجود ہو۔ کیونکہ یہ لوگ اچھی طرح جان گئے ہین کہ خود ہماری ذاتی ترقی و تنزلی اسی پر منحصر ہو۔"

دوستی کیا ہو؟ دو شخصون کا آپس مین ہمخیال ہونا اور ایک دوسرے کی صحبت کا اثر حاصل کرنا۔ دوستی ہی کیا بلکہ زندگی مین یہی سب سے بڑی اور گران مایہ چیز ہو۔ ہماری اصلاح اور درستی اسی سے ہو اور جہالت و بربادی بھی اسی سے ہو۔ ہم اسی کے ذریعے سے اپنی بُری زندگی کو بھلی اور بھلی کو بُری بنا سکتے ہین۔ ہم اسی کے ذریعہ سے اعلیٰ ہو کر اسفل اور اسفل ہو کر اعلیٰ اور عالم ہو کر جاہل اور جاہل ہو کر عالم غنی ہو کر مفلس اور مفلس ہو کر غنی بن سکتے ہین۔ کیونکہ صحبت کا اثر دل پر بہت جلد پڑتا ہو۔ لہٰذا چاہیے کہ جس کی صحبت مین زندگی بسر کرنی ہو اُسکے طبائع و خصائل سے پورے طور سے آگاہ ہو جائین اور اُس کے حرکات و سکنات کی نہایت غور و فکر اور پوری طاقت تخیلہ سے جانچ کرین کہ آیا اُس کی صحبت سود مند ثابت ہوگی یا مضر۔

کسی شخص سے دوستی کرنے مین عجلت سے کام نہ لینا چاہیے کیونکہ بے سوچے سمجھے کی دوستی کا انجام بہت بُرا ہوتا ہو جس پر بعد مین پشیمانی حاصل ہوتی ہو جس طرح دوستی کرنے مین عجلت نہ کرنی چاہیے اُسی طرح دشمنی کرنے مین بھی جلدی نہ کرنی چاہیے۔ تم نے اُس کو اپنا وفادار دوست جان کر جتنے دلی راز تھے اُس پر افشا کر دیے مگر اب کیا یہ ممکن ہو کہ وہ ہمارے راز کو اپنے سینہ مین مقفل اور مخفی رکھے گا اور اُس کی کنجی اپنی زبان کے حوالے نہ کرے گا۔ غیر ممکن ہو۔ لہٰذا ہمین جس سے دوستی کرنی منظور ہو تو پہلے نہایت ہی اطمینان سے اُسکو محبت کی کسوٹی پر جانچ اور پرکھ لینا چاہیے کیونکہ دوستی کے بعد دوستی کا جاتا رہنا نہایت ہی خوفناک اور پُرخطر ہو۔

دوستی کا نباہنا بھی ایک مشکل کام ہو۔ کیونکہ کبھی کبھی کوئی ایسی بات ہو جاتی ہو جس سے دلشکنی ہو جاتی ہو۔ دلشکنی کا پہلا زینہ مذاق ہو جب آپس مین گہری دوستی ہو جاتی ہو تو باہم یکدیگر مذاق کا بھی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ باوجودیکہ ایک دوسرے کو کامل یقین اور پورا بھروسہ ہوتا ہو کہ وہ میری ایسی باتون سے برہم نہ ہوگا لیکن مذاق چیز ہی ایسی ہو کہ کبھی نہ کبھی ایک دوسرے کو بُرا معلوم ہو ہی جاتا ہو میرے نزدیک تو یہی بہتر ہو کہ رسم مذاق دوستون سے اور صرف دوستون ہی پر منحصر نہین بلکہ کسی سے بھی نہ جاری رکھی جائے کیونکہ بعض اوقات مذاق بجائے شغل ذہنی کے نفاق

پیدا کر دینے والا ہوتا ہو جس سے آپس مین پھوٹ پڑ جاتی ہو اور جانی دوست جانی دشمن بن جاتے ہین کبھی کبھی یا اتفاقاً سہواً ہم سے ایسی غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہو جو خلاف اصول دوستی ہوتی ہو اور جس مین دوست کی دلشکنی ہوتی ہو ایسے وقت مین جبکہ وہ ہماری خطا سے برانگیختہ ہو گیا ہو فوراً عفو خطا کا خواستگار ہو کر اُس کے دل کی کدورت کو دور کر دینا چاہیئے ہم اپنے ایسے ناکردہ فعل سے پشیمان اور نادم تو رہتے ہین کہ اچھا نہ کیا لیکن ہمین اُس سے معافی طلب کرنے مین ندامت اور پشیمانی مانع ہوتی ہو جب واقعہ کو دو چار روز کا عرصہ گذر جاتا ہو تو پھر وہ اس زعم مین رہتا ہو کہ ابھی وہ اپنے نازیبا حرکت کی معافی طلب کرنے آئے گا اور ہمین یہ کہ ابھی وہ مجھ سے بات کرنے آئے گا اور میری اس خطا کی معافی بخشنے کا مگر نہ یہ ہوتا ہو نہ وہ نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ ایک تو اپنا بنا بنایا وفادار دوست ہاتھ سے نکل جاتا ہو اور دشمنون کی تعداد مین ایک اور بڑھتا ہو اور دوسرے جگ ہنسائی ہوتی ہو۔ لہذا ایسے نازک وقت مین ایک دوسرے کو ندامت سے خموش ہو کر نہ بیٹھ رہنا چاہیئے بلکہ بغیر کسی کو اطلاع کیے اس بات کا آپس مین معافی کے ذریعہ سے بہت جلد فیصلہ کر لینا چاہیئے کیونکہ جون جون وقت گذرتا جاتا ہو رشتۂ الفت مین رخنہ پڑتا جاتا ہو، اور جب رشتۂ الفت ٹوٹ گیا تو وہ کسی طرح سالم نہین ہو سکتا۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہمین کن کن لوگون کو اپنی دوستی کے لیے انتخاب کرنا چاہیئے اور دوستی کو نباہنے کے لیے کن ذرائع کو کام مین لانا چاہیئے۔

۱۔ دوستی اُس شخص سے کرنی چاہیئے جو بغیر کسی غرض و مطلب کے خلوص دل سے ملتا ہو اور جس کا ظاہر و باطن پاک و صاف و یکسان ہو اور بجز دوست کو فائدہ پہنچانے اور نقصان سے بچانے کے کوئی غرض نہ رکھتا ہو۔ لارڈ ایوبری کا قول ہو کہ دوستی دو شخصون کے درمیان ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے اور خوشی بڑھانے کی طرف اٹھی سیلان کا نام ہو۔

۲۔ اُس سے جو ہم سے علم و فضل مین بڑھ کر ہو تا کہ اُس کی صحبت سے ہمارے علم و فضل مین ترقی ہو اور ہم اُس کے اوصاف حمیدہ سے فیضیاب ہون۔

۳۔ اُس سے جو اپنے دلی خیالات دوست سے پوشیدہ اور دوست کے عیوب دوست سے مخفی نہ رکھتا ہو حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہین "مین اُسی کو اپنا دوست صادق سمجھتا ہون جو میرے عیوب سے مجھے آگاہ و متنبہ کرے"۔

۴۔ اُس سے جو دوست کی خوشی پر اپنی خوشی نثار کرتا ہو اور اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم و مستحکم رہتا ہو، اور جو ایام مصیبت مین طوطا چشم نہ ہو جائے۔

۵۔ اُس سے جو خوشامد و چاپلوسی کے پرخطر عیب سے بری اور مستثنیٰ ہو اور جو دوست کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان سمجھتا ہو۔

۶۔ اُس سے بچنا چاہیئے جو دوست نما دشمن ہو یعنی دوستی کے پردے مین دشمنی کا شکار کھیلتا ہو جو بظاہر تو دوستی کا دم بھرتا ہو اور در پردہ مار آستین ہو۔

۷۔ اُس سے بچا گو جو ہم سے جاہ و ثروت مین بڑھ کر ہو۔ رئیسون اور امیرون کی دوستی نہایت مخدوش اور خطرناک ہوتی ہو کیونکہ اُن کے نزدیک اپنی برسون کی وفاداری اور جان نثاری ایک آن مین نقش بر آب ہو جاتی ہو حکیم سولون کا قول ہو کہ شاہ کے مقربا اور دوست کی شطرنج کی مہرون کی سی مثال ہو جس طرح وہ چاہے اُن سے کھیل سکتا ہو کسی اور صاحب کا قول ہو کہ شاہ ایک دریائے بے پایان کے مصداق ہو جب یہ لہر و موج مین ہوتا ہو تو دامن امید گوہر مقصد سے بھر دیتا ہو اور جب قہر و طغیانی مین ہوتا ہو تو نہایت ہی بے رحمی سے بیڑا کی کشتی پر پانی پھیر دیتا ہو۔ بالفرض اگر کسی کو اُن سے دوستی ہو بھی تو اس کو نہایت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھنا اور بہت ہی سنبھل سنبھل کر چلنا چاہیئے، اور اُس کی

رضا پر رضامند اور اُنکی خوشی پر خورسند رہنا چاہیے کیونکہ یہ لوگ فرائض آشنائی اور حق دوستی سے مطلق بے بہرہ اور بالکل ناآشنا ہوتے ہین۔ اُن کے داغون مین یہی دھن سمائی ہوئی ہوتی ہو کہ ہم اس سے ہر طرح بڑھے چڑھے ہین۔ انھین ہماری عزت کرنی چاہیئے جن کے داغون مین ایسی بے جا دھن سمائی ہوئی ہو وہ مطلق لائق دوستی اور سزاوار آشنائی نہین۔

۸۔ نادان کی دوستی سے بچو! کیونکہ یہ کسی مصرف کے نہین۔ یا اگر اپنی بہتری بھی کرین گے تو مضر ثابت ہوگی۔ کسی نے خوب کہا ہو

"نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہو"

۹۔ بیکار شخص کی دوستی سے پرہیز کرو۔ اس سے مراد یہ نہین کہ اپنا دوست اگر کسی وجہ سے ملازمت سے برطرف یا نقصان کی وجہ سے اپنے پیشے سے بیکار ہوگیا ہو تو تم اُس سے دست بردار ہو جاؤ۔ نہین میرا روئے سخن ان لوگون کی طرف ہے جو اکل حلال اور محنت و مشقت کی کمائی سے پرہیز کرتے ہون۔ اُن کی صحبت کا اثر ہم پر جلد پڑے گا۔ لہذا اُن سے پرہیز کرنا چاہیئے

۱۰۔ مسافر کی دوستی نہ کرو۔ ہان اُن سے ایسا میل جول پیدا کر لو کہ اگر اتفاقیہ اُس کے شہر مین جانا ہو تو وہ بھی تم سے خوش اسلوبی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے مگر اُن سے بالکل ہی گہری دوستی نہ کر لو کہ اُس کے چلے جانے بعد اُس کی مفارقت کا تیر سینے مین کھٹکے۔

دوستی کے چند احکام

۱۔ دوستی ہم عمر اور ہم مذہب ہی سے بہتر ہو۔

۲۔ دوست صادق کی کبھی آزمائش نہ کرو۔

۳۔ دوستون سے قرض لو نہ انھین قرض دو۔

۴۔ دوست پر کوئی ایسا کام نہ ڈالو جو اُس کی حیثیت سے باہر ہو۔

۵۔ دوست کی پسند کی کوئی چیز تم خود نہ طلب کرو تاوقتیکہ وہ اپنی رضی سے نہ دے۔

۶۔ مجمع احباب مین ایک کو دوسرے پر ہرگز ترجیح اور فوقیت نہ دو۔

۷۔ بجز خانہ داری اور رشتہ داری کے کوئی راز دوست سے پوشیدہ نہ رکھو۔

۸۔ اگر کسی آفت مین مبتلا ہو جاؤ تو دوست کی صلاح لو۔

۹۔ دوست اگر اپنی رائے کے خلاف ہو تو بُرا نہ مانو بلکہ آپس مین اُسکا تصفیہ کر لو۔

۱۰۔ اپنے شکوک بہت جلد رفع اور خطا کی بہت جلد معافی چاہو۔

۱۱۔ دوست کی بھلی بُری بات کا بُرا نہ مانو اور اُسے آزردہ نہونے دو۔

۱۲۔ دوست کے کام مین کبھی مخل نہو۔

۱۳۔ اپنے احسان کا کبھی اظہار نہ کرو اور حرف شکایت لب تک آنے دو۔

۱۴۔ غیر مذہب دوست سے کبھی مذہبی بحث نہ کرو۔

۱۵۔ اپنے دوست کی نسبت اگر کوئی ایسی بات سُنائے جس سے نفاق پیدا ہو جانے کا خوف ہو تو اُس کی بات کا بغیر آنکھ سے دیکھے اور کان سے سُنے اعتبار نہ کرو۔

خوشتر (منگرولی)

تعلیم پر چند خیالات

علاوہ اُن تمام فوائد کے جو اِس بیسوین صدی مین ہمکو حاصل ہین، سب سے افضل و کارآمد حصول تعلیم کی سہولتین ہین۔ ہم ایک ایسے عہد مین زندگی بسر کر رہے ہین جسمین کتابین ارزان، کتبخانے مُفت مدرسے لاتعداد اور اخبارات دلخوش کن اور مسرت افزا ہین۔ اسمین کوئی شک نہین کہ تعلیم سے انسان کو بہت بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن اکثر لوگ جو اِس بات کو غلط تصور کرتے ہین اُن کا یہ خیال لغو اور مہمل ہے ضرور اسمین صداقت ہے، کیونکہ تعلیم محض سکھانے پڑھانے کا نام نہین، جس سے لازمی طور پر انسان گھبرا کر تھک جاتا ہے بلکہ یہ ایک نہایت اشرف اعلیٰ شے ہے جو تزکیۂ نفس و روح کرتی ہے اور بنی نوع انسان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی اور فضیلت بخشتی ہے۔ "علم ایک بہت بڑی طاقت ہے" نہ صرف طاقت بلکہ ایک ارفع و اعلیٰ طاقت، لیکن سوال یہ باقی رہتا ہے کہ اُس اعلیٰ طاقت تک کسطرح رسائی ہو سکتی ہے؟ اِس کا جواب انگریزی زبان کے ملک الشعرا ٹینی سن اسطرح دیتا ہے "خودی، خودشناسی، اور نفس کُشی، صرف یہ تین چیزین ہماری زندگی کو اُس اعلیٰ طاقت کیطرف رہنمائی کرتی ہین"۔

تعلیم سے انسان کے مختلف قویٰ کی نشوونما، اور علم الانسان سے واقفیت حاصل کرنا مقصود ہے۔ ہمین اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لیے اس کو تین عنوانات مین تقسیم کر دینا چاہیئے:-

(۱) دماغی تعلیم

(۲) اخلاقی تعلیم

(۳) جسمانی تعلیم۔

جبتک ان تینون پہلوؤن پر پورے طور سے توجہ نہ کی جائے گی اُس وقت تک تعلیم ہنوز اپنی ابتدائی حالت مین ہوگی، اور پھر تعلیم کا جو نصب العین ہو اُس تک پہنچنا بہت دشوار ہوگا۔

(۱)

تعلیم ایک قسم کی دل و دماغ، اور جسم و روح کی تربیت ہو ہمارے دماغون کی تربیت کے لیے ہمین اشیاء کا جیسی کہ وہ ہمارے گرد و پیش نظر آرہی ہین، مطالعہ کرنا چاہیئے، اور چاہیئے کہ اُس پر سے ہم اپنے زمانہ کی حرکات کا ایک صحیح خاکہ قائم کرین۔ صرف تحصیل علم سے تعلیم مراد نہین، اور نہ اس سے دماغ کو علم سے پُر کردینا مقصود ہو، کیونکہ "وہ عالم جو علم سے بھرے ہوے دماغ کے ساتھ کچھ غور و فکر، اور درک و فہم نہین رکھتا اُس گدھے کے مانند ہو جس کی پشت پر کتابین لدی ہون" اِس لیے چاہیئے کہ ہم غور و فکر کی عادت ڈالین اور ہر بات مین تفکر و تدبر سے کام لین، اور جب یہ عادت ہم مین پیدا ہوگئی تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہماری نصف تعلیم مکمل ہوچکی۔

غلطی سے مدارس کے ساتھ ہی تعلیم کا اختتام سمجھا جاتا ہو حالانکہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے ساتھ ختم ہونیوالی ہو کیونکہ زندگی مراد ہے کثرت ایام سے، اور ہر یوم تحصیل علم کا ایک مخزن ہو پس تعلیم کو زندگی بھر جاری رکھنے کے لیے علم کا ایسا شوق پیدا کرنا چاہیئے جو کبھی اِس دنیا مین پورا ہی نہو، اور ہمین اُس کی تکمیل پر مطمئن نہ بنا دے، تعلیم کو کسی وجہ سے خود غرضانہ عیش و تنعم کا ذریعہ نہ بنانا چاہیئے، گو عیش و تنعم قابل رشک چیز ہو، کیونکہ یہ خدائی جلال و عظمت کا ایک زرین سرمدی خزانہ اور شربت بخش حیات ہو۔

تعلیم کا مقصد خشک صوفیون، مہمل فلسفیون، اور طامع و حریص اقتصادیون کا پیدا کرنا نہین ہو بلکہ ایک ایسے نیک شہریون کی نسل کا جو خالق و مخلوق کی نسبت اپنے فرائض سے باخبر ہون، جو دنیا مین صداقت و راستی سے چلنا چاہتے ہون، اور جو اپنے اوقات کا صحیح استعمال کرتے ہون۔ لیکن مدارس کی تعلیم اس اعلیٰ سطح نظر تک پہنچانے مین قاصر رہتی ہو کیونکہ "مدارس و دار العلوم، جیسا کہ لاگ کا خیال ہو، ہم کو بہ نسبت دنیوی امورات کا اہل بننے کے یونیورسٹی کا اہل بنا دیتے ہین" ہم صرف یہ چاہتے ہین کہ ہمارے طلباء نقد و بحث کرنا سیکھین اور آزادانہ طور پر اپنے خیالات و آراء کو منتظم کرین لہذا مدارس کو "ٹکسال" نہ بنا دینا چاہیئے جہان سے بطور سکہ جات ہزارون طلباء بلا طوع و رغبت، اور طبعی ذوق و شوق کے تیار ہو جاتے ہین ہر دار العلوم (اکیڈمی) کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ نفوس کی تربیت کرے اور اُن کو معلومات کے ایک معقول ذخیرہ سے مالامال کردے، جو ایسی بنا پر مبنی ہون جس پر اُن کی آئندہ زندگی کی عمارت تعمیر کی جاسکے!

زمانہ قدیم کا ایک فلسفی کہتا ہو: "اُن تمام باتون کے علاوہ جو تو نے حاصل کی ہین درک و فہم حاصل کر" فی الواقع بغیر قوت ادراک اور صحیح عقل و فہم کے تعلیم اِس کمرہ کی طرح ہو جو بغیر فرنیچر و سامان آرائش ہو کے ہو عموماً لوگ عقل و بصیرت کی قدر و قیمت نہین جانتے اُن کا شعار صرف کتابین پڑھ لینا ہو۔ پس وہ محض سطحی اور ناپائدار زمین پر قدم فرسائی کر رہے ہین۔ وہ اپنی قوت حافظہ کو زور دے کر دماغ کے قوائے لطیفہ کی خرابی اور بربادی کر رہے ہین اور آخر کار بجائے صحیح معنون مین طالب علم ہونے کے صرف پیشہ ور متعلم بنجاتے ہین۔ اُن کے نزدیک صرف اُن چیزون کی تحصیل ضروری ہے جو زندگی مین اُن کے لیے عملی طور پر بکار آمد ہون۔ حالانکہ وہ اُس عظیم الشان ذخیرۂ علوم سے کچھ فائدہ نہین اُٹھاتے جس کو اُنھون نے بغیر اپنی دماغی ضروریات کی مناسبت کے اسطرح بے دردی سے جمع

کرلیا ہے، اور یہی سبب ہے کہ سلسلۂ تعلیم کو مکمل کرچکنے کے بعد حصول علم میں اُن کے لیے کوئی مزید دلچسپی باقی نہین رہتی۔

ہر علم و فن مین سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اگرچہ کسی علم و فن کی بجائے خود تحصیل نہایت مفید نتائج اپنے اندر رکھتی ہے علی ہذا تعلیم مین پورے طور سے کامیاب ہونے کے لیے ہمین ایک عالمِ دماغی کی آب و ہوا Intellectual atmosphere مین رہنا چاہیے وہان اُس مسرت و نشاط کا بخوبی لطف اُٹھایا جاسکتا ہے جو تبادلۂ خیالات کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جہان پر مغز علمی بحث و مباحث سے ہم مستفیض ہوتے ہین، وہ بحث و مباحث جو مختلف اقسام علوم کے ماہر اور مدینۃ العلم کے دہقانون کے سرگرم اور مستعد رہرو کیا کرتے ہین۔

(۲)

کسی قسم کی تعلیم فی زمانِنا یا زمانۂ آیندہ مین، بغیر اعلیٰ وصف اخلاق کے ذریعۂ مسرت و کامرانی نہین ہوسکتی۔ ہر مذہب کا ماحصل "اخلاق" کی تعلیم دینا اور صداقت و اُلفت کی دعوت کرنا ہے اور شاید یہ کہنا کہ "انسان بغیر مذہب کے ایک جسم ہے جسمین روح نہ ہو" مبالغہ سے خالی نہ ہوگا، تاہم اس مین صداقت کی ایک جھلک ضرور پائی جاتی ہے، کیونکہ انتہائی درجہ پر مذہب کی پیروی انسان کو الوہیت تک پہنچا دیتی ہے، مذہب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ صبر و تاب کی تلقین کرتا اور ہمارے خیالات کو وسعت دیتا ہے۔ یہ ہمکو اِس دنیا کے علاوہ ایک دوسری دنیا کے لیے فکر کرنا سکھاتا ہے مذہب ہمارے سامنے خدا کا ایک مقدس خیال پیش کرتا ہے جو تمام حکمتون کا سرچشمہ اور تمام علمون کا منبع ہے!

ایک تعلیم یافتہ آدمی بغیر عمدہ اخلاقی کیرکٹر کے، اپنی خود فروشانہ حرص و طمع مین مبتلا رہتا ہے۔ بس صرف کتابین پڑھ لینے سے لفظ تعلیم اپنے صحیح مفہوم مین نہین ادا ہوسکتا، اس لیے کہ اخلاق تعلیم کا جزو اعظم ہے جس کے بغیر وہ ہرگز مکمل نہین کہی جاسکتی ہر شہر و ملک اور ہر عہد کے تمام ادبیات مین "اچھی تربیت" سب آدمیون کے نزدیک، خواہ وہ ادنیٰ ہون یا اعلیٰ قابل تعریف رہی ہے۔ شریفانہ ضبط و تحمل اور خصائل محمودہ ہر سوسائٹی کی مابہ الامتیاز خصوصیتین رہی ہین اور شخصیتون کا بہت بڑا زیور سمجھی گئی ہین۔ لیکن وہ نسلِ انسانی کا درخشان ستارہ، باوجود حکمت کے عظیم الشان ذخیرہ اور علم کے زبردست خزانے کے اس موزون اور عمدہ ترین لقب، "Ideally educated man" کا مستحق نہین ہوسکتا محض اس لیے کہ اُس کا اخلاقی پہلو بالکل تاریک اور ناتربیت یافتہ تھا! اور تاریخ کے پارینہ اوراق کو اُلٹتے وقت ہماری نظر بہت سے مشہور فلاسفر، ادبا، مورخین، مقررین، سیاست دان اور مقننین کی مثالون پر پڑتی ہے جو صرف اپنے دامن اخلاق پر دھبہ ہونے کی وجہ سے صحیح طور تربیت یافتہ لوگون کی صف مین کھڑے ہونے کے مجاز نہین ہین، گو یہ اُن کے لیے ایک بہت بڑی بد قسمتی ہے، تاہم احتیاجِ تعلیم صحیح کے اعتبار سے کوئی بیجا اور نامناسب نہین۔

سچ پوچھیے تو تعلیم گھر ہی سے شروع ہوتی ہے، جہان عورت یا بعورت دیگر ان، ہی معلمہ ہوتی ہے۔ بس اگر ہم اپنی تعلیم کو آئیڈیل بنانا چاہتے ہین تو ہم کو علم و ادب کی تمام شاخون مین اپنی سوسائٹی کی نصف بہتر کو ضرور تعلیم دینا چاہیے۔

(۳)

ایک حکیمانہ مقولہ ہے:۔ "وہ لوگ جو جسمانی ورزش کرنے کے لیے وقت نہین پاتے وہ بیمار ہوجانے کا وقت بہت جلد پا لیتے ہین۔" مقتضائے فطرت انسانی کوئی شخص بھی بیماری کی تکالیف برداشت کرنا پسند نہ کرے گا۔ لہذا جسمانی تکالیف و آلام سے محفوظ رہنے کے لئے ہم کو اپنے وقت کا ایک خاص حصہ جسمانی ورزش کے لیے وقف

کردینا چاہیے۔

اِس مشہور و معروف ضرب المثل "تندرست جسم مین صحیح دماغ" کا مصداق ہونا اُس وقت ممکن ہو جبکہ ہم راحت و طرب اور مسرت و اطمینان وغیرہ مفرحاتِ قلب و دماغ سے صحیح طور پر حظ اُٹھا سکین، جو ایک بہت بڑے پیمانہ پر تربیتِ جسمانی کا نتیجہ ہین یہ ہمارے اعصاب کو قوت بخشتی اور ہمارے قواء کو مضبوط و مستحکم بناتی ہو لہٰذا ہم کو کافی ورزش کرنی چاہیے جس سے ہم ہر کام آسانی سے کرسکین یہی ورزش اور کثرت ہمارے تخیلات پر ایک پُر صحت اثر پیدا کرتی ہو لیکن کس قدر افسوس کی بات ہو کہ مدارس مین طلبا کھیلون کی کچھ قدر نہین کرتے۔

مختصر یہ کہ ہماری تعلیم آزادانہ ہونی چاہیے، تعلیم کا آئیڈیل ہماری سوسائٹی مین نیک افراد پیدا کرنا ہونا چاہیے، جو خوفِ خدا بھی رکھین اور بنی نوعِ انسان کی تعظیم و تکریم کرین علاوہ ازین ہم کو اپنے پہلو مین ایک محبت بھرا ہوا دل رکھنا چاہیے تاکہ ہم تمام نسلِ انسانی کو مشفق کرنے اور مدد کرنیکے قابل ہوسکین۔ الغرض تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے ہمارے ابناء جنس کے ساتھ اتفاق و یگانگت اور ہمدردی کا احساس ہمارے دلمین جگہ پکڑلے، اور تمام علوم و فنون اس غرض سے سکھائے جائین کہ ہم مین بڑے بڑے دانشمند عقلا، اور محبانِ وطن پیدا ہون جو نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود مین سرگرم رہین۔

اختر جناگڑھی

اخلاقی اور تمدنی رنگ مین جزیات

بمصر حسن ہر جا یوسفے ہست — غلام روے زیباے تو باشد

اب یہ تھیوری بڑی بڑی فلسفی درسگاہون مین بھی مانی گئی ہے کہ جس کائنات مین ہم رہتے ہین اور جس مین ہم خود بھی شامل ہین ذرات سے مرتب اور مرکب ہے۔ اگرچہ مختلف اجسام اُس وقت بڑے بڑے نظر آتے ہین لیکن اگر اُن کا بنیادی سلسلہ دیکھا جائے تو وہی ذرات ہین جو بوجہ اجسام سے چھوٹے اور اُن کے جزیات ہین۔

یہ کپڑا جو انسان پہنتا ہے اور بہ مصداق "الناس باللباس" جس پر تہذیب اور شعائر تہذیب کا بہت کچھ مدار ہے یا جس پر انسانیت کے شعائر کا ایک حد تک انحصار ہے شروع مین چند مختلف اور منتشر تار اور اجزا ہی تھا۔ رشتہ برشتہ پیوستہ ہو کر کپڑا بنتا ہے۔ یہ قیمتی غلے اور لذیذ پھل جن پر انسانی زندگی کا بہت کچھ مدار ہے اُن بیجون کے ذرات ہین جو دیکھنے مین بہت ہی چھوٹے ہوتے ہین۔

یہ پیپل اور بڑ کا بیج کیسا چھوٹا ہوتا ہے لیکن اسکے مقابلہ مین دیکھو پیپل اور بڑ کا درخت کس قدر بڑا اور سایہ دار ہوتا ہے۔ بظاہر کون خیال کر سکتا ہے کہ اس قدر خفیف اور چھوٹے سے بیج سے اس قدر بڑے بڑے درخت پیدا ہو سکتے ہین کہ اُن کے سایہ مین صدہا لوگ آرام پا سکین۔ یہ دیودار کا درخت کس قدر لمبا ہوتا ہے اور اس سے انسان کس قدر کام لیتا ہے! اسکا تخم بھی بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔

آگ کی چنگاری کی ہستی ہی کیا ہے؟ لیکن ہزارون مکان اور صدہا سامان کے جلانے اور خاک سیاہ کرنے کے واسطے وہی کافی ہے۔ پانی کے قطرہ قطرہ سے دریا اور سمندر بن جاتے ہین۔ بارش کے بھی قطرات اور بوندین ہی ہوتی ہین۔ دیکھو آخیر مین ان ہی منتشر قطرات اور متفرق بوندون سے بڑے بڑے دریا اور بڑی بڑی نہرین بن جاتی ہین۔ انسان کی پیدائش بھی ایک قطرہ یا چند قطرات ہی سے ہوتی ہے۔ وہ ایک قطرہ سے نشو و نما پاتا ہوا کس قدر قامت اختیار کرتا ہے اور اپنے اندر کس قدر جذبات اور کس قدر قوتین رکھتا ہے۔

یہ انواع و اقسام کی کتابین، رسائل، اخبارات، سائر سیاسی و تمدنی و شرعی چند حروف اور چند نقاط ہی کا مجموعہ ہوتے ہین۔ دیکھو ایک ایک حرف کے ملانے اور جوڑنے سے کس طرح یا کس خوبی سے الفاظ، جملے، کلمات، فقرات، سطرین اور صفحات بن جاتے ہین۔

یہ سانس اور دم جس پر انسان کی زندگی کا شروع اور خاتمہ ہے ایک منتشر سلسلہ ہی تو ہوتا ہے۔ اس منتشر سلسلہ کی گنتی بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ جزیات ہی تو ہین۔ دیکھو انھی جزیات کے تحت کس خوبصورتی سے نظام حیات انسانی قائم ہے۔

اس قسم کی متفرق مثالون سے یہ ثابت ہے کہ تمام کلیات، تمام مجامع، تمام اکابر کا وجود اور ہستی جزیات اور اصاغر ہی سے ترتیب اور ترکیب پاتی ہو۔ اگر اصاغر، ذرات اور جزیات نہ ہون تو یہ کلیات اور اکابر بھی نہون دیکھو بادشاہ کوئی کوئی ہی ہوتا ہو لیکن اُس کا علما اور سپاہ بے شمار ہوتی ہو اور یہ علما، فضلا اور سپاہ افراد اور جزیات ہی سے ترتیب پاتی ہو۔ اور بادشاہ بھی بجائے خود ایک جزا اور ایک فرد ہی ہوتا ہو۔

دنیا مین جزیات ہی سے زیادہ تر کام لیا جاتا ہو اور کلیات کی بنیاد جزیات ہی مین۔ اجسام ذرات سے ترکیب پاتے ہین۔ ذرات اور جزیات ہی ہمارا شروع ہین۔ ایک گاؤن یا ایک شہر کب بنتا ہو؟ جب اُس مین مختلف قسم کے لوگ آباد اور جمع ہون۔ جہان صرف ایک ہی آدمی رہتا ہو اُسے گاؤن اور شہر نہین کہتے۔ جزیات، اصاغر، افعال عامہ اور اخلاق عامہ کی نہ صرف چند ترکیبی اور ترتیبی صورتون ہی مین ضرورت ہوتی ہو، بلکہ تمدنی اور سوشل مراحل مین بھی ضرورت پڑتی ہو جب انسان جزیات، افعال عامہ اور ترک افعال عامہ سے بے خبر اور لاپروا ہو جاتا ہو تو سلسلۂ تمدن، اقتصادیات اور اخلاقیات کی نہ عظمت و شہرت اور نہ احساسِ ضرورت باقی نہین رہتا جسکی انسانی حیات کے واسطے ایک لازمی ضرورت ہو۔

جیسے اجسام مختلف ذرات سے ترکیب پاتے مین ایسے ہی تمدنی، اقتصادی، اخلاقی، سیاسی اور سوشل سلسلے اور اجسام بھی جزیات خیر و شر سے اچھی یا بری ترتیب اور ترکیب پاتے ہین۔ بہت سے لوگ کسی معمولی، عامہ یا جزوی فعل یا ترک فعل کے وقت یہ کہا کرتے ہین:

مجھ سے کوئی خون تو نہین ہو گیا۔

کوئی آدمی تو نہین مار دیا!

کوئی چوری تو نہین کی!

کوئی ڈاکہ تو نہین مارا!

کوئی قانون تو نہین توڑا!

ایسا کہنے والا یہ خیال خود یہ سمجھے ہوئے ہو کہ جب تک خون نہ کیا جائے، ڈاکہ نہ مارا جائے، اسوقت تک کوئی فعل یا ترک فعل کچھ اثر، نتیجہ نہین رکھتا، اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہو کہ اس پر اعتراض کرے یا ٹوکے۔

اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہو:-

مین بھلا کیا احسان کر سکتا ہون!

مین کیا بضاعت رکھتا ہون!

میری کیا طاقت!

کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ!

پیر آپ ہی درماندہ شفاعت کس کی!

دونون صورتون مین مطلب یہ ہوتا ہو کہ معمولی باتون کا سرزد ہو جانا یا فروگذاشتین اور معمولی غلطیان اور معمولی نیکیان اور معمولی مروتین کوئی اور کوئی قیمت اور کوئی خوبی نہین رکھتی ہین۔ غلطی تو وہ ہو سکتی ہو جو بڑی ہو اور نیکی بھی وہ ہو جو بہت بڑی ہو۔

ایسا سمجھنا اور ایسا قیاس کرنا وہ غلطی اور وہ فروگذاشت ہی جو ہمارے کیرکٹر، ہماری سیرت اور ہمارے تمدن کے واسطے ایک سخت نقصان اور تکلیف دہ فعل ہو یہی وہ باتین ہین جن کی بدولت کوئی قوم دولت تمدن اور دولتِ سعادت سے محروم اور بے بہرہ رہ سکتی ہو۔ جس قوم کے افراد کے ایسے خیالات ہون وہ قوم ترقی یافتہ اقوام مین جگہ نہین لے سکتی۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہین کہ دنیا مین جس قدر کام ہوتے ہین وہ سب طاقتون کی وجہ سے ہوتے ہین جنکو بڑی بڑی طاقتین کہا جاتا ہو یہ درست نہین۔ اس کائنات اور بالخصوص انسانی کائنات مین، طاقتین بڑے بڑے کام کر رہی ہین جو چھوٹی چھوٹی ہین۔ ذرات ہی اجسام ترکیب پاتے ہین۔ اجزا ہی سے کلیات کی نوبت آتی ہو۔ اگر دنیا مین سعادت اور نیکی کا کوئی مجسمہ ہو تو وہ مختلف اور چھوٹی چھوٹی نیکیون سے بنا ہو جس طرح ایک بڑا عالی شان محل یا مکان پتھر کے مختلف ٹکڑون سے

ون سے تعمیر ہوتا ہے اسی طرح دنیا میں مختلف نیکیاں مختلف لوگوں ہی کی بدولت وقوع پذیر ہوتی ہیں اور ان کا اکثر حصہ جزوی رنگ رکھتا ہے۔ یہ "پبلک" کا مہذب ملکوں اور مہذب قوموں میں بہت کچھ زور اور چرچا ہوتا ہے افراد و جزئیات ہی کا تو مجموعہ ہوتا ہے۔ خواص اور اکابر سے تو "پبلک" بنتی چھوٹی چھوٹی اور منتشر ہستیوں کا نام ہی پبلک ہے۔

اگر ہم چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچ سکتے تو ہمارا فرض اولین ہے کہ ہم ان سے محفوظ رہیں کیونکہ ان چھوٹی چھوٹی بوں ہی سے بڑے بڑے منصوبوں اور گناہوں کی بنیاد پڑتی اور ت آتی ہے۔ ایک قاتل یا ایک ڈاکو شروع ہی میں قتل اور غارتگری نہیں کرتا۔ بلکہ اسکی برائیوں کا شروع معمولی فروگذاشتوں اور معمولی غلطیوں سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ڈاکو اپنی چہل مرغی ہی سے کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس کا ہاتھ بڑے بڑے جرائم پر بھی دراز ہونے لگتا ہے۔

اگر تم بڑے بڑے گناہوں اور غلطیوں سے بچنا چاہتے ہو تو تمھیں یے کہ معمولی اور چھوٹے چھوٹے گناہوں اور فروگذاشتوں سے بچو ع
سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل۔ جو شخص شروع میں ایک روپیہ یا ایک
رشوت لینا ایک معمولی بات سمجھتا ہے وہ رفتہ رفتہ بڑی بڑی رقوم لینے سے بھی شرم نہیں کرتا۔

اطفال کی تعلیم و تربیت کا یہ اہم جزو ہے کہ انھیں شروع ہی میں چھوٹے چھوٹے ...پر بھی ٹوکا جائے اور جزوی خیر و شر میں انکی نگرانی کیجائے۔ جو بچہ اپنے قمیص ماکر تھکنے سے کراہیت نہیں کرتا وہ کسی دن دشمن کے منھ پر تھوکے گا۔

ہندوستان میں بہ مقابلہ دنیا کے دیگر ممالک کے دشنام دہی کا خبط ہے اس کا شروع سب سے اول اپنی ماں کی گود یا اپنے گھر ہی سے ہے گالی میں یہ طاقت ہے کہ وہ پیچ در پیچ الفاظ میں مختلف رنگ پیدا کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ایسی مشق اور عادت ہو جاتی ہے کہ رک نہیں سکتی جو لڑکا چاقو سے اپنا ہاتھ زخمی کر لیتا ہے اس کے واسطے دوسروں کو زخمی کر دینا کیا مشکل ہے۔

اب نیکیوں کا خیال فرمائیے۔ بہت سے لوگ صرف اس واسطے نیکیوں سے محروم رہتے ہیں کہ ان کے خیال میں نیکی کرنا ان کی طاقت سے باہر ہے یا وہ نیکی کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ہذا باطل۔ اگر بڑی بڑی نیکیاں ہیں تو اُن کے مقابلہ میں چھوٹی چھوٹی نیکیاں بھی ہیں چھوٹی چھوٹی نیکیوں ہی سے بڑی بڑی نیکیوں کی بنیاد پڑتی ہے اگر ہم بڑی نیکی کرنے کے قابل نہیں یا ایسی ہمت نہیں رکھتے تو کیا چھوٹی نیکی بھی نہیں کر سکتے؟ کوئی شخص ایسا نہیں جو کچھ نہ کچھ نیکی نہ کر سکے!

کسی بزرگ ملت سے ایک شخص نے پوچھا میں نیکی کی ہمت نہیں رکھتا بزرگ ملت نے کہا نیکی کرنے کے لیے کسی بڑے زر اور بڑی ہمت کی ضرورت نہیں، کوئی شرط اور کوئی قید نہیں، ہر شخص بہ مقدور خود نیکی کر سکتا ہے۔ نیکی ہر مقدور اور ہر ہمت کے موافق ہوتی ہے۔ راہ میں سے ایک تنکا اُٹھانا بھی ایک نیکی ہے۔ کسی رہرو کو خوش اخلاقی سے راہ بتانا بھی ایک نیکی ہے۔ کسی کے ساتھ خوش خلقی سے بات کرنا بھی ایک نیکی ہے۔ اگر کسی نیک کام میں ایک روپیہ دینا نیکی ہے تو اپنی ہمت کے مطابق ایک پیسہ دینا اس سے بھی زیادہ نیکی ہے ایک روٹی میں سے جو اپنے کھانے کے واسطے ہے نصف روٹی کسی بھوکے کو کھلا دینا صدہا روٹیوں کے کھلانے سے زیادہ ثواب رکھتی ہے اپنا پیٹ خالی رکھ کر اپنی جیب کاٹ کر دینا یا ابنائے جنس کی مدد کرنا ایک ایسی نیکی ہے جو بہت قیمت رکھتی ہے جو لوگ لاکھوں روپیہ نہیں دے سکتے جو سرائیں، عبادت خانے، چاہ، مدارس نہیں بنا سکتے، جو لوگ یونیورسٹیوں میں ہزارہا روپیہ دینے کا مقدور نہیں رکھتے اُن کا اپنی ہمت اپنے حوصلہ اور اپنی بضاعت کے مطابق ایک روپیہ یا ایک پیسہ بھی دینا ایک اجر عظیم رکھتا ہے کسی بیوہ سے ہمدردی کرنا اور حسن سلوک اُس سے پیش آنا امیروں اور مخیروں کی بڑی بڑی دادودہش اور جود و کرم سے بھی زیادہ ہے کچھ بھی نہ ہو صرف صادق ہمدردی مخلصانہ

سلوک بھی سو نیکیون کی ایک نیکی ہی۔

اس کائنات مین ابنائے جنس اور دیگر انواع کو بڑی بڑی نیکیون اور بڑے بڑے کارنامون کی تو کبھی کبھی ہی ضرورت پڑتی ہی عام طور پر تو چھوٹی چھوٹی باتون ہی کی ضرورت ہوتی ہی اور ان ہی پر دنیا کی بہبود کا زیادہ تر مدار بھی ہوتا ہی۔ غربا عام طور پر خوش خلقی کے بھوکے ہوتے ہین انھین خطابات اور القاب کی کم ضرورت ہوتی یا کم احساس ہوتا ہی اُن کے ساتھ سلوک سے پیش آنا ایک بڑا اثر اور ایک بڑی قیمت رکھتا ہی۔

اگر ہم اپنی بضاعت کے مطابق چند غریب لڑکون کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہین تو ہمین اعلےٰ تعلیم کی ہمت اور وقت کا انتظار نہین کرنا چاہئے کیونکہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے تو خال خال ہی جا سکتے ہین اور ابتدائی تعلیم کی عموماً ضرورت ہے۔ اگر کوئی جج اور کوئی مجسٹریٹ صرف کشت و خون کے مقدمات ہی مین انصاف کرنے کا خواہشمند ہو تو وہ غلطی مین ہی قتل کے مقدمات کبھی کبھی دایر ہوتے ہین معمولی مقدمات کثرت سے ہوتے ہین۔ ان مین انصاف کی کوشش کرنا اور انصاف کرنا ہزارون کے حق مین ایک منصفانہ امداد ہی بعض وقت لوگ یہ خیال کرتے ہین کہ جب تک اُن سے ہر قسم کی نیکی نہو سکے ایک آدھ نیکی سے کیا حاصل ہی۔ یہ اُن کی غلطی ہی جس قدر نیکی ہو سکتی ہی وہ کی جائے! جو شخص کسی رفیق کی ایک معمولی رفاقت کی قدر نہین کرتا اور اس کی داد نہین دیتا وہ کسی بڑی رفاقت کی بھی قدر و منزلت نہین کر سکتا! ایک چھوٹی سی خوبی بھی قیمت رکھتی ہی ایک چھوٹا سا احسان بھی شکریہ چاہتا ہی جزئیات پر نظر نہ کرنے کی وجہ سے بعض واقعات وہ باتین کس مپرسی مین رہجاتی ہین جو کسی وقت بڑے بڑے اہم واقعات بن سکتی ہین۔ جو کاتب کتابت مین حرکات اور نقاط کا چھوڑ دینا جائز سمجھتا ہی اور بعض حروف چھوڑتا جاتا ہی وہ الفاظ اور فقرات کا خون کرتا ہی اور عبارت کو بے ربط اور مخدوش بناتا ہی۔ اسی طرح جو ہستیان چھوٹی چھوٹی نیکیون سے منھ پھیرتی ہین وہ بڑی بڑی نیکیون کی راہین بند کرتی ہین۔ جو شخص باوجود ہمت اور باوجود احساس کے کسی بڑی نیکی کے انتظار مین رہتا ہی وہ چھوٹے چھوٹے موقعون کو ایک بے رحمی کے ساتھ جان بوجھ کر رائیگان جانے دیتا ہی اور جو وقت اُسے میسّر ہی اُسے کام مین نہین لاتا۔

اس طریق عمل سے صدہا نیکیون کا خون ہوتا ہی اور صدہا روشن واقعات تاریکی مین رہ جاتے ہین۔ ایک عام یا کوئی گمنام آدمی کسی غرق ہونے والے کو دریا مین سے نکالتا ہی لوگ اُس کی کوئی قدر و منزلت نہین کرتے کوئی نوٹس نہین لیتے۔ ایک غریب جان لڑا کر ایک نیک کام کرتا ہی اور اُس مین وہ کوئی خود غرضی بھی نہین رکھتا، لوگ اس طرف توجہ ہی نہین دیتے اور نہ اُس کا اعتراف کیا جاتا ہی لوگ ہمیشہ نسبتی معیار کے ماتحت خوبیون کی قدر کرنے کے عادی ہین۔ اگر ایک امیر ایک مقتدر شخص کوئی تھوڑی سی نیکی اور مروّت بھی کرے تو لوگ اُسکے اعتراف اور اُسکے احترام مین دیر نہین لگاتے۔ مبالغہ سے اُس کی قدر بڑھاتے ہین لیکن اگر کوئی ایسا ہی کام کوئی غریب کرے تو اُس پر توجہ بھی نہین کی جاتی!

ایک غریب کوئی غلطی کرے تو شور پڑ جاتا ہی لیکن اگر کوئی مقتدر شخص ایسا کام کرے تو اُسے ایک تفریح یا ایک قابل معافی غلطی سمجھا جاتا ہی حالانکہ دنیا مین غربا اور مساکین ہی کی بدولت اور اُن ہی کی ہمتون اور خوبیون کے ماتحت کام چل رہا ہی۔ چھوٹی چھوٹی ہستیان ہی اس کائنات کی رونق کا موجب ہین! لوگ چاہتے ہین کہ ہمیشہ اُن کے سامنے بڑے بڑے واقعات ہی لائے جائین۔ یہ ایک فریب دہ مغالطہ ہی جو قومین ترقی یافتہ ہین جن کا عروج اور جن کی تہذیب چوٹی پر اور ٹکسالی ہی اُن کی تمام قسم کی ترقیات اور معارج کی بڑی بھاری وجہ اور مدار چھوٹی چھوٹی باتون پر ہی رہا ہی چھوٹے چھوٹے واقعات ہی سے اُنھین یہ درجہ نصیب ہوا ہی۔ اُن مین سے جب ایک ادنیٰ فرد بھی کوئی خوبی رکھتا اور کوئی ہمت اور نیکی کا کام کرتا ہی تو دوسری صبح یا دوسری شام ہی کو اُس کا اعتراف کیا جاتا ہی۔ ملک بھر کے اخبارات مین تعریفی نوٹ نکل جاتے ہین۔ لوگ ایک شوق کے ساتھ اُنھین پڑھتے ہین

رف پڑھتے ہی نہین بلکہ مختلف طریقون سے اُنکی ہمّت افزائی بھی کرتے
ن - اگر ملک مین کوئی رسالہ یا کوئی اخبار خوبی کے ساتھ نکلتا ہو اور ملک
وم کی خدمت کرتا ہو تو اُسکی امداد اور ہمّت افزائی لازمی سمجھی
اتی ہو -

قوم کے افراد صغیرہ شوق اور ہمت دکھاتے ہین اور قوم کے نمو رفتہ رفتہ
رہا ہو -- لوگ اُن کی ہمّت بڑھاتے اور ہمّت افزائی کرتے ہین - جو قومین
بار زدہ ہین یا ادبار مین گھر چکی ہین اُن کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا ہو - افراد صغیرہ
ہمتین پست ہو جاتی ہین - اور بوجہ پستی کے اُن کی باری ہی نہین آتی
وئی کام کر کے دکھائین اور اپنی لیاقت اور ذہانت کا ثبوت دین اور اگر
ی اُن کی جانب سے ذہانت کا کوئی علمی ثبوت دیا بھی جاتا ہو تو اُس کی
ر نہین کی جاتی - بخلاف اسکے خود ابنائے جنس ہی دل شکنی پر آمادہ
جاتے ہین - ایسے حاسد یہ نہین چاہتے کہ کوئی دوسری یا عام ہستی بھی
ن کی موجودگی مین کوئی کام کرنے کا حق رکھتی ہو - اور کسی اور کے حصہ بخرہ
ن بھی شہرت آئے - ع

اے بستہ کمر شکست ما را برہم زدہ بند و بست ما را

دنیا مین وہی قوم ترقّی کرتی ہو جس کے افراد صغیرہ اور عوام اغراض
شترکہ مین علمی حصہ لیتے ہین - اس وقت دنیا کے ہر حصہ مین جس قدر کلین
مشینین ایجادات اور مصنوعات پائی جاتی ہین اُن سب کے موجد مخترع
ور بانی عام لوگ ہی ہوئے ہین - یہ ریل ، تار ، ہیلوگراف اور گراموفون وغیرہ
غیرہ اُن ہی افراد کی ذہانت کا نتیجہ ہین جو عوام مین سے تھے - بہت کم
ل ان مین سے بی اے ایم اے یا اعلٰے تعلیم یافتہ تھے - وہ معمولی تعلیم
فتہ تھے - اگر یہ لوگ انسانی کائنات کے اجزاے صغیرہ یا ارکانِ عامہ
ونے کی وجہ سے اپنی خداداد ذہانت سے یون کام نہ لیتے تو دنیا مین یہ
جوبات اور یہ حکمتین بھی نہ ہوتین -
یہ سُننے مین نہین آیا کہ کبھی کسی امیر بادشاہ اور راجہ نواب نے

بھی کوئی مشین ایجاد کی ہو یا اور کوئی اختراع کی - ایسے لوگون کی طبیعت اس
قابل ہی نہین ہوتی کہ ایسے کام کر سکین - یہ کام تو وہی لوگ کرتے ہین جو
اصاغر اور عوام الناس مین شمار ہوتے ہین - طور جا انسانی کائنات کے
جزیات کا شبہ ہین جس طرح یہ ساری کائنات مختلف ذرات سے مرتب اور
مرکب ہو اُسی طرح دنیا کے بڑے بڑے کام بھی جزیات کی بدولت انصرام
پاتے ہین - فوج اُسی وقت مبنی ہو جب اُس مین صد ہا فرد شامل ہون -
صرف ایک کمان افسر کی شمولیت اور ذات سے فوج نہین بن سکتی -

جس طرح ہم چھوٹی چھوٹی نیکیان کثرت سے کر سکتے ہین اُسی طرح ہم
نہایت خوبی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گناہون سے بھی بچ سکتے ہین اور
اس طرح سے گناہون اور برائیون کا نمبر بہت کچھ کم کر سکتے ہین ایک غریب شخص دو
دو تین پیسے کسی نیک کام مین دے سکتا ہو اور ایک دو بیمارون کی خبر
بھی لے سکتا ہو لیکن بڑے سے بڑا آدمی بھی ہر روز ۲۰۰ - ۳۰۰ دو دو سو روپیہ کسی
کام مین نہین دے سکتا -

چھوٹے سے چھوٹا گناہ اور برائی ترک کرنے مین پیش قدمی کرو اور
اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اگر ہو سکتی ہو تو اُسمین تامل نہ کرو - یہ تمھارا
فرض نہین کہ تم بڑے بڑے کامون کے انتظار مین چھوٹے چھوٹے کام بھی
نہ کرو - جن برائیون کو تم چھوڑ سکتے ہو چھوڑ دو خواہ وہ کیسی ہی چھوٹی ہون
اور جو نیکی تم کر سکتے ہو کر و چاہے وہ کیسی ہی خفیف ہو - چھوٹی برائیون کو ترک
کرنے اور چھوٹی خوبیان ہاتھ مین لانے ہی سے انسان بڑے بڑے گناہ چھوڑ سکتا
اور بڑے بڑے نیک کام کر سکتا ہو - یاد رکھو جس طرح چھوٹے کلاس کے دوست ہمیشہ
وفادار ثابت ہوتے ہین اور اُن سے بہت کچھ کام نکلتا ہو اسی طرح چھوٹی
چھوٹی باتون ہی سے بڑی بڑی باتون اور بڑے بڑے واقعات کی بنیاد
پڑتی ہو - عام نیکیون اور عام خوبیون کے بانی اور وارث ہمیشہ افراد صغیرہ
ہی ہوتے ہین اور افراد صغیرہ پر ہی ہماری دنیا کی خوبی اور ہمارے تمدن
اور رونق کا بہت کچھ مدار ہو - چھوٹی چھوٹی باتون پر دھیان دو اور اُن کا

خیال رکھو تا کہ انسانی تمدن اور انسانی اخلاق کی سرسبزی ہو۔ اگر تم چھوٹا کام شروع مین نہین کروگے تو کوئی بڑا کام کس طرح کر سکوگے؟ بچے بنو تا کہ تم جوان ہو کر بڑھے ہو: ابجد شروع کرو تا کہ تم خود فقرات اور جملے بنانے لگ جاؤ۔ جب تک الف ب ت نہین پڑھوگے فقرہ اور جملہ نہین پڑھ سکتے۔ بڑی باتین بڑے بڑے لوگون کے واسطے رہنے دو۔ جو تم کر سکتے ہو کرو۔ تم بھی دنیا کی بہتری کا ایک جزو اور اس مشین کا ایک پرزہ ہو۔ کل کی ہستی تم ہی تو ہو۔

ترا کہ گفت کہ اہل دبستان باش
بنوش یکے وسہ جلبے و خود گلستان باش

سلطان احمد

خدا کی تعریف

اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا گیت جو خدا کی تعریف مین گایا جا سکتا ہے وہ ایک پاکیزہ اور مصروف زندگی ہے۔ خدا کی سچی محبت کسی خیال کا نام نہین ہے بلکہ وہ ایک مضبوط اور عمدہ اصول ہے جو نہ صرف دل کو اُس کی یاد مین مصروف رکھتا ہے بلکہ کیرکٹر اور چال چلن پر بھی اپنا اثر ڈالتا ہے۔ سچی محبت اپنے آپ کو صرف جذبات ہی مین ظاہر نہین کرتی بلکہ وہ اپنی سچائی کو ایک پاکیزہ اور پارسا زندگی کی صورت مین پیش کرتی ہے۔ وہ تعلقات جو انسانی روح کو خدا سے وابستہ کرتے ہین قبل الذکر کو نیکی اور تقدس کی طرف لیجاتے ہین۔ اس لیے اگر ہمین خدائے بزرگ سے سچی محبت ہے تو ہمارے افعال نیکی کے سانچے مین ڈھلے ہوئے ہون گے۔ بلکہ ہمارے خیالات اور ہمارے جذبات بھی خداوند کی مرضی کے مطابق ہونگے۔ اور اگر ایسا ہو تو ہماری زندگی سرتاپا خدا کی تعریف مین ہوگی۔ مثلاً جس طرح سے کہ ایک بیجان چیز کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے مقصد کو پورا کرنے مین خدائے جلیل کی حمد کرتا ہے اور آسمانون کے ان بھی تمام سیارون کا یہی ایک گیت ہے[1]۔ اسی طرح سے اگر انسانی زندگی بھی جبکہ وہ بالکل پاک ہو خدا کی مرضی کے مطابق عمل کرے تو گویا وہ اُس کی تعریف مین ایک مجسم گیت ہے۔ لیکن خدا کی محبت زبان کو خاموش نہین کر سکتی۔ زبان کو خود بخود اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہین کہ "خدا کا شکر کرنا اور اسکی بے ہمتا شان مین بھجن گانا ایسا ہی اچھا ہے جیسا کہ اُس کی سچی مہربانی اور برکات کا صبح کے وقت اظہار کرنا۔ اور اُس کی محافظت کا رات کو۔"

علی الصباح حمد کی آواز خداوند جل وعلا کے تخت پر پہنچائی جاتی ہے لہذا اُسکی منظوری حاصل کرتی ہے اسیطرح اُس بھجن کو بھی پسند فرماتا ہے جو اُس وقت گایا جائے جب سورج کی روشنی مدھم پڑ رہی ہو۔ دوپہر کی نماز سے بھی وہ اپنے کانون کو پرے نہین ہٹاتا یعنی وہ صبح اور عصر کی نمازون کے مانند ظہر کی نماز بھی قبول فرماتا ہے اس لیے آؤ اور رات کو شکر اور تعریف کا گیت اُس کی شان مین گائین۔

ایپکٹیٹس پہلے تو خدا کی اُن رحمتون اور برکتون کا ذکر کرتا ہے جن سے کہ انسانی زندگی پُر ہے اور پھر خود ہی سوال کرتا ہے اور کہتا ہے "کیا خدا کے احسان بندے پر صرف اتنے ہی ہین؟ نہین نہین وہ بیشمار ہین۔ اور زبان مین اتنی بھی یاری

[1] بعض قدیم حکما کا خیال تھا کہ سیارے جن پر ساری کائنات مشتمل ہے گردش کرتے وقت ایک قسم کا گیت گاتے ہین۔ اس خیال کی ابتدا حکیم فیثاغورث سے جو موسیقی کا عاشق تھا شروع ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ ساتون سیارے (زحل۔ زہرہ۔ مشتری۔ عطارد۔ مریخ۔ قمر۔ شمس) موسیقی کے سات سُرون کی طرح حرکت کرتے وقت ایک سُریلی آواز پیدا کرتے ہین جن کو مین سُن سکتا ہون۔ یہی گویا خدا کی حمد ہے جو تمام سیارے آسمانون مین گاتے ہین۔ زحل جو زمین سے دراز فاصلہ پر ہے گہری اور بڑی زوردار آواز پیدا کرتا ہے اور چاند جو زمین سے نہایت نزدیک ہے پتلی اور تیز چیخ کی آواز نکالتا ہے (مترجم)

نہین کر دہ ٹھیک طور پر بیان کر سکے اور اُن کا شکر ادا کر سکے کیونکہ کاش اگر ہم مین عقل سلیم ہوتی تو اسوقت بھی یہی فرض ہم پر زیادہ ضروری ہوتا کہ ہم جلوت و خلوت غرض ہر جگہ خدا کے مقدس نام کی تسبیح کرین اسی کے نام سے برکت چاہین، اور اسکے برکات دیکھ کر اُسکی حمد و ثنا کرین۔ کیا ہمین اُسکا بھجن نہین گانا چاہیئے۔ اسوقت جبکہ ہم زمین کو کھودین اُسمین ہل چلائین یا جب کبھی ہم دسترخوان پر بیٹھین یہ سمجھکر کہ خدا بزرگ ہی کیونکہ اُس نے ہمین اُن آلات سے مہیا کیا ہی جن کی مدد سے ہم زمین مین کاشت کرتے ہین۔ خدا بزرگ ہی، کیونکہ اُس نے ہمین اپنے برکات کی قدر کرنے اور اُنکو استعمال کرنے کی طاقت عنایت کی ہی۔ اس لیے جبکہ ہم تم مین سے اکثرون کو دنیاوی مشغولیت نے اندھا کر دیا ہی۔ کیا کوئی شخص ایسا نہین ہونا چاہیئے جو تمھارے بجائے اُس خدمت کو اپنے ذمے لے، اور تمھاری سب کی طرف سے خدا کی شان مین حمد و ثنا کے ترانے گائے۔ اور مین جو کہ لنگڑا اور بوڑھا ہون اسکے علاوہ اور کیا کر سکتا ہون کہ خدا کی حمد کیے جاؤن۔ اگر مین ایک بُلبُل ہوتا تو یقیناً مین بلبل کی طرح گیت گاتا۔ اور اگر قمری ہوتا تو قمری کیطرح چہچہاتا لیکن اب ایک عقلمند آدمی ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہی کہ مین خدا کی حمد و ثنا کے بھجن گاؤن۔ یہی میرا کام ہی یہی میری زندگی کا مقصد ہی اور اُسے ہی مین پورا کرنا چاہتا ہون۔ مین حتی الامکان اس کام سے کنارہ کشی نہین کرون گا۔ اور تم سے بھی مین بمنت اس کام کے کرنے کی استدعا کرتا ہون"۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہین کہ ساری تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہی ہر ایک سانس جو اندر جاتا ہی زندگی کو بڑھاتا ہی اور جب باہر آتا ہی تو جسم کیلیے فرحت بخش ثابت ہوتا ہی۔ اس لیے ہر ایک سانس مین دو نعمتین موجود ہین اور ہر ایک نعمت کے لیے علحدہ شکر واجب ہی ؎

از دست و زبان کہ برآید کز عہدۂ شکرش بدر آید

مندرجۂ ذیل الفاظ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے صبح کے بھجن سے لئے گئے ہین جس کو ملٹن اپنی کتاب PARADISE LOST کی پانچوین جلد مین لکھتا ہی کہ علی الصباح جبکہ وہ دونون باغ کی طرف جا رہے تھے، اُن کی نظر پو پھٹنے اور سورج کے نکلنے پر پڑی تو بیساختہ وہ عاجزی کے ساتھ جھکے اور خدا کی تعریف مین یون رطب اللسان ہوے:۔

"اے نیکی کے مالک! یہ تیرے ہی شاہکار کام ہین۔ اے قادر مطلق! یہ ساری کائنات جو انسان کو حیرت مین ڈال دیتی ہی تیری ہی ہے۔ جب تیری کائنات کا یہ حال ہی تو تیری خبر نہین تو کیسا ہے۔ تیری ذات و صفات ناقابل بیان ہی تو آسمانون پر ہی۔ اگرچہ تو ہمین اپنے معمولی معمولی کامون مین نہین دکھائی دیتا۔ لیکن یہ تمام چیزین تیری اُس نیکی اور اُس خدائی طاقت کو ظاہر کرتی ہین جو احاطۂ خیال سے باہر ہی۔ اے روشنی کے بیٹو! تمھین کچھ کہو۔ اے فرشتو! بولو، کیونکہ تم اُس ذات بے ہمتا کو دیکھتے ہو اور اعلیٰ روحانی گیت گا کر اُس کے تخت کے اردگرد حلقہ باندھے بشاش کھڑے ہو۔ اے آسمان اور زمین کے رہنے والو آؤ! اور ہمارے ساتھ اُس کی نہ ختم ہونے والی حمد مین شریک ہو جاؤ۔

"اے سب سے روشن ستارے! تو یقیناً صبح کا ہراول ہی۔ کیونکہ تو اپنے چمکدار اور خوبصورت ہالا کی وجہ سے صبح کے سر پر گویا تاج ہی۔ جب صبح نمودار ہو تو تو اپنے حلقہ مین اس لاثانی ذات کی تسبیح و تقدیس کر۔

"اے سورج! اگرچہ تو اس دنیا کے لیے بمنزلہ آنکھ اور روح کے ہی۔ لیکن اُس لاثانی ذات کو اپنے سے بزرگ جان اپنی گردش کے چکر مین ہر وقت جبکہ تو خط سرطان ہو یا خط جدی پر اُس کی حمد کا نقارہ بجا۔

"اے چاند! تو اگرچہ اب سورج کے قریب ہو جاتا ہی۔ لیکن اس کے نکلنے پر ستارون سمیت نظر سے غائب ہو جائے گا۔ اے پانچ گشت کرنے والے آگ کے پتلو! تم ایک مستانہ ناچ مین تغیر گاتے حرکت کر رہے ہو۔ تم کو چاہیئے کہ اُس کی حمد کے ترانے گاؤ۔ جس کی قدرت نے تاریکی مین روشنی پیدا کر دی ہی۔

۱۲ اے ہوا! اور اے عناصر! تم قدرت کے سب سے بڑے بچے ہو تم جو چار چار کے اجزا میں ہمیشگی کا چکر کھاتے رہتے ہو اور چیزوں سے مل کر ان کی پرورش کرتے ہو آؤ! اور اپنے خالق کی شان میں نئے انداز سے حمد کے گیت گاؤ۔

۱۳ اے بخارات! تم جو کسی پہاڑی یا جھیل سے اُٹھتے ہو، اور جبتک کہ سورج کی کرنیں تمھیں سنہری رنگ سے نہ رنگ دیں سیاہ خاکی رہتے ہو دنیا کے بڑے خالق کی شان میں اٹھو خواہ بلند ہو کر تم صاف آسمان کو بادلوں سے آراستہ کر دو یا گر کر پیاسی زمین کی پیاس کو بارش کی بوچھار سے بجھاؤ، غرض بلند ہو کر یا گر کر جس طرح سے تمھاری جی چاہے اُس کی تعریف کرو۔

۱۴ اے ہوا تو دنیا کے چاروں کونوں میں آہستگی یا زور سے چلتی رہتی ہو اُس کی تعریف کر۔ اے صنوبر کے درختو! تم دوسرے درختوں کے ساتھ مل کر عبادت کے طور پر حرکت کرو!

۱۵ اے چشمو! تم سب بہنے کی حالت میں ایک دل خوش کن گیت گاتے ہو۔ اب سب اکٹھا ہو کر اُس کی تعریف کرو۔

۱۶ اے تمام زندہ روحو! اُس کی تعریف میں ہم آہنگ ہو جاؤ۔ اے پرندو! تم گاتے گاتے آسمان پر چڑھ جاتے ہو۔ اپنے پروں اور دلچسپ نغموں میں اُس کی تعریف اوپر لیجاؤ۔ اے آبی باشندو! اور اے زمین میں بسنے والو! میری گواہی دے دینا۔ اگر میں پہاڑیوں، وادیوں، چشموں اور سایہ دار جگہوں کو جن کو میں نے اپنے گانے کی طاقت سے گویا بنا دیا ہو، مخاطب نہ کروں!

۱۷ ہمیشہ رہنے والے خدا کی تعریف کرو۔ اے خدا ہمیں مہربان ہو اور اپنی نیکی میں سے ہمیں حصہ دار بنا۔ اور اگر کبھی رات کچھ شر یا برائی اپنی آغوش میں جمع کر لے تو تو اُسے اُسی طرح سے ہٹا دے جس طرح سے کہ روشنی تاریکی کو ہٹا دیتی ہے۔

۱۸ اے محبت! مجھے اپنے سنہری پروں پر بٹھا کر اس نکمی دنیا سے اپنی روحانی بلندی پر لیجا تاکہ میں اُن قابل تعریف چیزوں کو دیکھ سکوں جن کو تو اپنے شہنشاہ کی طاقت کے زور میں انجام دے رہی ہے۔ اے محبت! مجھے اِس جسمانی منظر کی وسعت سے دور لیجا تاکہ میں محبت کے خدا کی تعریف میں جو آسمانوں کا خدا ہے روحانی گیت گاؤں!

(ترجمہ) ضیاء الدین احمد برنی

معاد

...معاد کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہو کہ معاد جسمانی و روحانی ہوگا۔ انسان حقیقت مین صرف نفس ناطقہ کا نام ہو۔ وہی مکلف ہو، وہی عاصی اور مطیع ہو اسی پر ثواب و عذاب ہوتا ہو اور بدن تو بجائے ایک آلے کے کام دیتا ہو جسم خراب ہو جاتا ہو پھر بھی نفس باقی رہتا ہو پس جب خدا قیامت کے دن مخلوقات کو اٹھانا چاہیگا۔ تو ہر ایک روح معہ اپنے جسم قسمہ کے اٹھے گی۔

اس مسئلہ کی حقیقت بخوبی ذہن نشین کرنے کے لیے روح اور نسمہ کی حقیقت کا بیان کرنا ضروری ہو پس پہلے ہم اسی طرف متوجہ ہوتے ہین۔

(۱)

اول روح کیا ہو؟ جوہر ہو یا عرض ہو؟ اس امر کی تنقیح کہ روح کا وجود ہو یا نہین۔ اسکے متعلق ہمکو اولاً اجسام موجودہ فی العالم پر نظر کرنا چاہیے۔ پس جب ہم ان پر غور کرتے ہین تو ابتدا نظر مین ان کو دو قسم کا پاتے ہین ایک بطور ٹھوس کے کہ جہان وہ ہین وہین ہین اپنی جگہ سے حرکت نہین کرسکتے اس قسم کے اجسام صرف چھوٹے چھوٹے متشابہ اجزا سے بنے ہوے ہین اور اس کے ہر ایک جز مین وہی اوصاف ہین جو اسکے کل مین ہین جیسے پتھر اور لوہا۔ اگر ان مین سے کوئی ٹکڑا توڑ ڈالین تو اس مین بھی وہی اوصاف

ہون گے جو کل مین ہین اور جبکہ وہ بالکل خالص ہو تو اسمین ایک ہی طرح کے پرت ہونگے۔ دوسری قسم کے اجسام ایسے ہین کہ ان کا جسم باختلاف ان کی انواع کے ایک معین حد تک بڑا ہوتا ہی اور اسکے اجزاء غیر متشابہ اور مختلف الالوان ہوتے ہین اور ان مین باریک رگین اندر سے خالی مثل نلی کے ہوتی ہین جن مین بہنے والا مادہ بھرتا رہتا ہی اور اسی طرح الگ الگ پردے بھی ہوتے ہین جنکے بیچ مین خالی جگہ ہوتی ہی اور پھر کہین اکٹھے ہو جاتے ہین۔

پہلی قسم کے اجسام کو اجسام غیر عضویہ اور دوسری قسم کے اجسام کو اجسام عضویہ کہتے ہین۔ اجسام عضویہ مین پرت نہین ہوتے اور اس کا نمو اسی قسم کی دوسری چیزون سے ہوتا ہی اور جب وہ جوان ہو جاتا ہی تو اس مین مختلف طرح کا بیج پیدا ہوتا ہی۔

غیر عضویہ جسم دفعتاً جس وقت اسکا مادہ جمع ہو جاے پیدا ہو جاتا ہی اور عضوی رفتہ رفتہ نمو پاتا ہی اور جب اسکے بیج کو بوؤ تو وہی جسم اُس سے پیدا ہوتا ہی جس کا بیج ہی۔ بونے والا جب بیج زمین مین ڈالتا ہی تو جانتا ہی کہ وہ کب پھوٹے گا اور کب اس مین مادہ چوسنے کی طاقت آ جائیگی۔ اسکے پتے اور ٹہنیان ہوا مین سے غذا بھی لیتی رہتی ہین جس کے سبب ان کا قد بڑھتا اور رنگ بدلتا جاتا ہی۔ ایک اور فرق ان دونون جسمون مین یہ ہی کہ جسم عضویہ مین غذا ان کے اعضاء کے اندر جاتی ہی اور اندر والی غذا سے بیرونی جسم بڑھتا ہی اور جب تک یہ قوت رہتی ہی نمو ہوتا رہتا ہی۔ ایک زمانہ کے بعد اسمین ضعف آ جاتا ہی۔ غذا کم ہو جاتی ہی اور نمو نہین ہوتا اور آخرکار مر جاتا ہی۔ عضوی جسم کی حالتین علانیہ بدلتی رہتی ہین۔ وہ پیدا ہوتا ہی، پھر بڑھتا ہی، پھر اس کا بڑھنا موقوف ہو جاتا ہی، پھر بڑھاپے کے سبب گھٹنے لگتا ہی پھر مر جاتا ہی۔ جسم غیر عضوی اجتماع مادہ سے پیدا ہوتا ہی اور اس طرح بڑھتا ہی کہ اسی قسم کے اور اجزاء مادی اسکی اوپر کی سطح پر آکر چڑھتے جاتے ہین۔ اجسام عضویہ کا نمو اندر سے ہوتا ہی اور جسم غیر عضوی کا حجم اگر کوئی امر مانع نہو تو بے انتہا بڑھ سکتا ہی لیکن جسم عضوی کا حجم ایک مقدار معین سے زیادہ نہین بڑھ سکتا۔ جسم عضوی اور غیر عضوی مین یہ فرق بھی ہی کہ پہلے جسم مین مختلف قسم کا مادہ ہوتا ہی اور دوسری قسم کے جسم مین صرف ایک قسم کا اگرچہ اور بھی اختلاف ہین مگر مختصر طور پر ہم خاص اختلافات کو ذیل مین بیان کرتے ہین۔

(۱) اجسام عضوی کا وجود تناسل سے ہوتا ہی اور غیر عضوی کا جذب واتحاد سے۔

(۲) بقا اجسام عضوی کا محدود ہی اور غیر عضوی کا محدود نہین۔

(۳) اجسام عضوی کے اجزا کروی شکل پر ہوتے ہین اور غیر عضوی کے زاویہ کے طور پر۔

(۴) نمو اجسام عضوی کا منحصر ہی غذا کے اندر جانے پر اور وہ نمو اندر سے باہر کی طرف ہوتا ہی اور غیر عضوی کا اسکے برخلاف ہی اسکا حجم باہر سے اجزا مل جانے سے بڑا ہو جاتا ہی۔

(۵) جسم عضوی کی بناوٹ مختلف اجزا سے ہوتی ہی اور جسم غیر عضوی کی اجزاء متحد الوصف سے۔

(۶) جسم عضوی کی ترکیب اجزاء متضاعفہ متحرکہ سے ہوتی ہی اور غیر عضوی کی بسیط سے۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہی کہ اجسام غیر عضوی مین تمام معدنیات مثل نمک اور پتھر اور مٹی وغیرہ داخل ہین اور اجسام عضویہ مین نباتات اور حیوانات داخل ہین۔

مگر نباتات اور حیوانات مین جو فرق ہی وہ ظاہر ہی۔ حیوانات کی بناوٹ مین نباتات کی بناوٹ سے تضاعفات بہت زیادہ ہین۔ حیوان متحرک ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتا ہی وہ مدرک ہی ذی اختیار ہی کہ جس کام کو چاہے کرے اور جس کو چاہے نکرے۔ اس مین حواس مخصوص ہین کہ انکے سبب آواز کو، بو کو، چکھنے کو، چھونے کو جانتا ہی اور غذا اسکے پیٹ مین

جاتی ہی اور بالتخصیص اسکے پیٹ مین ایک ایسی ہنڈیا ہی جو غذا کو اسطرح پکا دیتی ہی کہ اعضاء کے تغذیہ اور نمو کے لائق ہو جاتی ہی۔

نباتات کی کیفیت دوسری ہی۔ وہ جہان ہی وہان سے دوسری جگہ منتقل نہین ہو سکتی۔ اس مین حرکت کرنے کی قوت نہین ہی اور نہ اسمین اختیار ہی۔ وہ اپنی جڑون کے ذریعہ سے جو زمین مین ہین اور ٹہنیون اور پتون کے ذریعہ سے جو ہوا مین ہین غذا کو جذب کرتے ہین۔ اس مین کوئی ہنڈیا غذا پکانے کی نہین ہی بلکہ جو غذا اس مین جاتی ہی اسی وقت غذا کے قابل ہوتی ہی۔

نباتات اور حیوانات مین بہت بڑا اختلاف یہ ہی کہ حیوان مین پٹھون کا بھی ایک سلسلہ ہی اور نباتات مین نہین ہی۔ یہ اعصاب حیوانات مین ایک مرکز سے تعلق رکھتے ہین۔ اس سبب سے حیوانات مین قابلیت احساس ہوتی ہی۔ یہ بات نباتات مین نہین پائی جاتی۔ علاوہ اسکے حیوانات مین اور بھی جھلیان اور پردے اور پٹھے اور عضلے اس قسم کے ہوتے ہین جو نباتات مین نہین ہوتے۔ ایک عمدہ فرق دونون مین یہ ہی کہ حیوانات کی غذا اجسام عضوی سے ہوتی ہی اور نباتات کی اجسام غیر عضوی سے جیسے پانی اور ہوا اور نمک۔ نباتات کے بننے کا مادہ دراصل ایک کیلا مادہ ہوتا ہی اور تحلیل کیمیاوی سے ثابت ہوتا ہی کہ وہ مرکب ہی کاربن، ہیڈروجن، اور آکسیجن سے؛ اور یہ تینون ایک ہوائی سیال جسم ہی اگر کسی جگہ صرف نائٹروجن بھری ہو اور وہان آدمی جائے تو فوراً مر جاتا ہی مثلاً غلہ کے کھتے مین یا کسی پرانے اندھے کنوئین مین دفعتاً اترنے سے آدمی مر جاتے ہین۔ یہ امور جو ہم نے بیان کیے ہین امور محققہ مین سے ہین۔ جو علم الحیوانات اور علم کیمیا سے بخوبی ثابت ہین۔ مگر جو فرق جسم نباتی اور حیوانی مین اوپر بیان ہوا ہی اس پر ہم زیادہ غور کرنا چاہتے ہین۔

ہم کو بالتخصیص اسباب پر غور کرنا چاہیے کہ حیوانات مین جو حرکت ارادہ اور اختیار اور ادراک اور خیال اور ایک قوۃ نتیجہ نکالنے کی ہی اسکا کیا سبب ہی؟ یہ ہم تسلیم کرتے ہین کہ نباتات کے جسم کے مادے مین تین عنصر ہین کاربن آکسیجن ہیڈروجن اور حیوانات کے جسم کے مادے مین ایک چوتھا عنصر نائٹروجن بھی ہی۔ مگر یہ تمام عنصر ان کے جسم کی بناوٹ کا مادہ ہین۔ اس سے یہ ثابت نہین ہوتا کہ وہ اُن افعال کے بھی باعث ہین جو حیوانات سے بالتخصیص علاقہ رکھتے ہین۔ اور جن کو ہم زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھنا چاہتے ہین۔ علم کیمیا سے ثابت ہی کہ نائٹروجن مین کچھ کیمیاوی قوت نہین ہی اور نہ وہ معاون زندگی ہی۔ صرف اتنی بات ہی کہ جانورون کے گوشت کے ریشون مین پائی جاتی ہی۔ یہ سچ ہی کہ حیوانات کے اعضا مین ایک ایسا عضو ہوتا ہی جو غذا کو اسطرح پکا دیتا ہی کہ وہ اعضا کے تغذیہ اور نمو کے لائق ہو جاتی ہی۔

نباتات مین کوئی ایسا عضو نہین ہی اور اسکی وجہ ظاہر ہی کہ نباتات اپنی جڑ کے ریشون سے اور اسکے پتے اور ٹہنیان ہوا سے وہی مادہ جذب کرتی ہین جو غذا کے نمو کے لائق ہی اور اس لیے ان مین کسی ایسے عضو کے ہونے کی ضرورت نہین۔ برخلاف حیوانات کے کہ وہ ایسی غذا کھاتے ہین جسمین علاوہ مادہ تغذی و نمو کے اور فضول مادہ بھی شامل ہوتا ہی اسلیے ایک ایسا عضو بنایا گیا جو مادہ تغذی و نمو کو فضول مادہ سے جدا کرے۔ مگر اسکے جدا ہونے کے بعد حیوان کی وہی حالت ہوتی ہی جو نباتات کی شروع تغذیہ مین تھی۔ اور اس لیے یہ تصور نہین ہو سکتا کہ حیوان مین اس عضو کا ہونا ان افعال کا باعث ہی جو بالتخصیص حیوانات سے علاقہ رکھتے ہین۔

حیوانات کے جسم کی بناوٹ مین ایک بہت بڑا جال اعصاب کا ہی جسکا مرجع ایک مرکز عام یعنی دماغ کی طرف ہی اور تمام افعال اسی کیطرف منسوب کیے جاتے ہین۔ لیکن یہ افعال ان سے بحیثیت ان کے اعضاء ہونے کے منسوب نہین ہو سکتے اور نہ بحیثیت ان کے مادہ ہونے کے کیونکہ تمام جسم حیوانات مین یہی عناصر موجود ہین مگر مختلف ترکیب پانے سے مختلف مادہ

او ر صورت پیدا ہوتی ہے پس صرف بحیثیت مادہ جو اختلاط عناصر سے پیدا ہوتے ہین یہ افعال سے منسوب نہین ہو سکتے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ عناصر کاربن آکسیجن ہیڈروجن نائٹروجن کی ترکیب سے کیا حالت پیدا ہو سکتی ہے عناصر آپس مین ایک دوسرے سے ملکر ایک دوسری صورت کا جسم پیدا کر لیتے ہین، مثلاً آکسیجن اور ہیڈروجن بمقدار معینہ سے باہم مل جائین تو ایک دوسری صورت کا جسم رقیق سیال پیدا ہو جاتا ہے جس کو پانی کہتے ہین، مگر اسمین کوئی ایسی صفت جو مادے کی حیثیت سے بڑھ کر ہو پیدا نہین ہوتی۔

عناصر کی پانچ ترکیبین ہین پہلی ترکیب سے ایک جسم غیر مین یا اسی جسم مین جو ان عناصر سے بنا ہے حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور جب تک کہ وہ ترکیب قائم رہے وہ حرارت بھی قایم رہتی ہے۔ دوسری ترکیب سے جسم مین ایک خاص قسم کے مادہ کی یا دوسری جسم کے جذب کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے تیسری ترکیب سے ایک ایسا جسم پیدا ہوتا جاتا ہے جو جوش مین یعنی متحرک رہے یعنی خود اسی کے اجزا حرکت مین رہین جب تک وہ ترکیب اس مین باقی رہے، جیسے کہ تیزابون کے ساتھ دوسری چیزین ملانے سے پیدا ہوتی ہے چوتھی ترکیب سے ایک قوۃ مخفیہ جو اجسام مین ظاہر ہو جاتی ہے اور دیگر اجسام کو جذب کر کے ایک جگہ لے آتی ہے جیسے کہ برقی عمل سے ظہور اور اجتماع برق کا ہوتا ہے پانچوین ترکیب سے یا اُن اجسام کی ترکیب سے جو عناصر سے بنے ہین ایک جسم ہوائی سیال پیدا ہوتا ہے جو دکھائی بھی دیتا ہے اور کبھی ایسا لطیف ہوتا ہے جو دکھائی بھی نہین دیتا۔

اکثر اطبّا اور حکمار کا یہ خیال ہے کہ جسم حیوانی مین جو ترکیب عناصر سے بنا ہے اور جسمین مختلف قسم کے اعضا ہین اس ترکیب کے سبب ایک جسم ہوائی پیدا ہوتا ہے جو باعث تنفّس ہے جو سبب ہے حیوانات مین ارادہ پیدا ہونے کا اور ترکیب اعضا سے حرکت کے ظہور مین آنے کا اور یہی جسم سیال ہوائی باعث ہے انسان کی زندگی کا اور اسی کو بعضون نے مطلق روح اور بعضون نے نسمہ سے تعبیر کیا ہے اور نتیجہ اسکا یہ سمجھا ہے کہ جب ترکیب جسم حیوانی کی اس جسم سیال کے قائم رہنے کے قابل نہین رہتی تو وہ حالت موت سے تعبیر کی جاتی ہے اور اسکا صریح نتیجہ یہ ہے کہ جسم کے معدوم ہونے یا اسکی حالت قابل قایم رکھنے اس جسم سیال کے معدوم ہونے کے ساتھ وہ جسم سیال بھی معدوم ہو جاتا ہے یعنی وہ روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ مگر ہم کو اسمین کلام ہے کہ تمام آثار جو ترکیب عناصر سے پیدا ہوتے ہین۔ وہ سب یکسان ہون، مثلاً مقناطیس کہ اسمین بسبب ترکیب عناصر کے لوہے کے جذب کی قدرت پیدا ہوئی ہے، تو اب یہ نہین ہو سکتا کہ کبھی وہ اسکو جذب کرے اور کبھی جذب نہ کرے یا جب ہم نے ایسے عناصر کو یا اجسام مرکبہ عناصر کو آپسمین ترکیب دیا جو برق کے مہیج ہین تو یہ نہین ہو سکتا کہ کبھی برق مہیج ہو اور کبھی نہو۔ یا اجسام نباتی جبکہ وہ اپنی ٹھیک حالت مین ہین ان سے یہ نہین ہو سکتا کہ وہ مادہ غذائی کو اپنی جڑون اور ٹہنون اور پتون سے جب چاہین جذب کرین اور جب چاہین نکرین غرضکہ جو آثار جس جسم مین بوجہ ترکیب عناصر پیدا ہوتے ہین وہ آثار اس جسم سے کبھی منفک نہین ہو سکتے اور اس جسم کے اختیار مین یہ بات نہین ہوتی کہ جب چاہے ان آثار کو ظاہر ہونے دے اور جب چاہے ان کو ظاہر نہونے دے۔

اس کا ثبوت زیادہ تر تو اس قسم کے نباتات پر غور کرنے سے بخوبی حاصل ہوتا ہے جن کو جاندار نباتات خیال کیا جاتا ہے۔ ایک درخت جو چھوئی موئی یا لجالو کے نام سے مشہور ہے صرف چھونے ہی سے اُسکے پتے سکڑ جاتے ہین اور ٹہنی گر پڑتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر پتے بدستور ہو جاتے ہین اور ٹہنی بھی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔ امریکہ مین ایک اور درخت پایا گیا ہے جس کو ذنبہ کہتے ہین اُسکے پھول کی پنکھڑیون پر جب مکھی یا کوئی کیڑا آکر بیٹھتا ہے تو پنکھڑیان بند ہو جاتی ہین اور اس جانور کو پکڑ لیتی ہین یہانتک

کہ وہ مرجاتا ہی۔ مگر یہ کبھی نہین ہو سکتا کہ اُس کے خلاف اُن سے ظاہر ہو۔ بعض پانی کی نباتات ایسی معلوم ہوئی ہین جن پر شبہ حرکت ارادی کا پیدا ہوتا ہی۔ چنانچہ ایک قسم کی نباتات تاگے کے مانند ہی۔ وہ ایک دوسرے سے ملنے کو حرکت کرتی ہی تاکہ ان کے ملنے سے ان کی نسل بڑھے مگر یہ کیفیت صرف قوت جاذبہ سے بھی پیدا ہوتی ہی۔ اسپر حرکت ارادی کا اطلاق نہایت مشتبہ ہی خصوصاً جبکہ وہ پانی پر تیرتی ہین پانی مین پیدا ہونے والی ایک اور نباتات ہی جب وہ اس نباتات سے جس سے پیدا ہوتی ہی علٰحدہ ہوتی ہی تو اور نباتات کے پیدا کرنے پر مستعد اور متحرک رہتی ہی اور جب اسمین سے تو وہ حرکت مسدود جاتی رہتی ہی تو اس مین سے اسی قسم کی نباتات پیدا ہوتی ہی۔ مگر نہایت مشتبہ ہی کہ اس حرکت کو حرکت ارادی سمجھا جاے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا اجتماع اور ترکیب عناصر سے حرکت پیدا ہوتا ہی اور جبکہ وہ جسم پانی پر ہو تو اس کی تحریک اسکو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لیجا سکتی ہی مگر اس پر حرکت ارادی کا اطلاق یقینی طور پر نہین ہو سکتا۔

حیوان کے بعض افعال ایسے ہین جو صرف ترکیب عناصر کا نتیجہ نہین ہو سکتے۔ مثلاً ارادہ اور اختیار کہ جس کام کو چاہے کرے اور جس کام کو چاہے نہ کرے۔ اگر کسی کام کے کرنے کا ارادہ صرف عناصر کا نتیجہ ہوتا ہی تو اس کا کرنا طبعی امر ہوتا اور اس لیے اس کا نہ کرنا امر خلاف طبع ہوتا جس کا محال ہونا بدیہی ہی علاوہ اسکے حیوانات مین بہت سے ایسے انکشافات ہین جنکا صرف ترکیب عناصر سے ہونا ناممکن ہی۔ مثلاً حیوانات کی آنکھ کا ترکیب عناصر سے اور ترتیب طبقات سے بنا اور اس مین اُن چیزون کی صورت کا جو اسکے سامنے ہون شعاع کے سبب منقش ہونا یقینی امر ہی۔ مگر اُس کا اُن اشیاء کو پہچاننا اور دوست دشمن مین تمیز کرنا صرف ترکیب عناصر سے ناممکن ہی

بلاشبہ صانع نے ان کامون کے لیے جدا جدا اعضا بنائے ہین جو عناصر کی ترکیب کیمیاوی سے بنے ہین مگر کوئی دلیل نہین کہ صرف وہی علت تمام ان امور کی ہو۔ غرضکہ یہ سب امور جن کو ہم ایک مختصر لفظ تعقل سے تعبیر کرتے ہین صرف کیمیاوی عناصر کا نتیجہ نہین ہی۔ ہم عناصر مین فرداً فرداً کوئی آثار نہین پاتے جس سے یہ امر ثابت ہو کہ عناصر مین تعقل اور تخیل ہی اور جب ان مین یہ صفت حالت انفراد مین نہین ہی تو حالت ترکیب مین بھی وہ صفت ان سے پیدا نہین ہو سکتی کیونکہ اختیار اور عدم اختیار دو مخالف صفتین ہین اور جو صفت اجزا مین نہین ہی وہ ان کے مرکب مین بھی نہین ہو سکتی۔ جب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہین کہ بہت سے افعال حیوانات کے ہین جو عناصر معلومہ کی ترکیب کا نتیجہ نہین ہین تو ہم کو ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہی کہ حیوان مین کوئی ایسی شے ہی جو تعقل کا باعث ہی اور اس نتیجے پر ہم لازمی طور پر یقین کرتے ہین۔ اُسی شے کو ہم روح کہتے ہین۔

اب سوال یہ ہی کہ وہ کیا چیز ہی؟ مگر اس سوال کا جواب فطرت انسانی سے باہر ہی۔ انسان کی فطرت اسقدر ہی کہ وہ اشیاء کے وجود کو ثابت کر سکتا ہی خواہ وہ اشیاء محسوس ہون یا غیر محسوس مگر ان کی حقیقت جاننا اسکی فطرت سے خارج ہی۔ مثلاً پانی۔ انسان یہ ثابت کر سکتا ہی کہ پانی موجود ہی مگر اسکی حقیقت نہین بتا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہی کہ اسکے اجزا کی اگر اسمین ہون تشریح کر سکتا ہی مگر پھر ان اجزا کی حقیقت نہین بیان کر سکتا۔ وہ کہہ سکتا ہی کہ پانی مین آکسیجن اور ہیڈروجن ہی۔ جب پوچھو کہ آکسیجن اور ہیڈروجن کیا چیز ہی تو اسکی حقیقت نہین بتا سکتا۔ پس جبکہ انسان ان چیزون کی حقیقت نہین جان سکتا جو اس قدر عام ہین تو اگر وہ روح کی ماہیت بھی باوجود اسکے کہ اسکے وجود کو ثابت کر چکا ہی نہین بیان کر سکتا تو کوئی تعجب کی بات نہین ہی۔ جو چیز ہمارے تجربے سے خارج ہی جیسے کہ روح اسکی نسبت بجز اسکے کہ دلیل یا قیاس سے حسب مقتضاء فطرت کوئی بحث چھیڑین، اور کچھ نہین کہہ سکتے۔ مگر جب ہم کو اسکا وجود حیوانات مین ثابت ہوا ہی اور وہ ایسا وجود ہی جس سے تمام افعال جو حیوانی افعال ہین اور اعلیٰ ترین افعال جو

مخصوص بالحیوانات ہین اسی کے سبب سے ہین تو ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہو کہ وہ ضرور ایک شئی لطیف اور جوہر قایم بالذات ہو۔ اسی لیے ہم روح کو ایک جسم لطیف جوہر قایم بالذات تسلیم کرتے ہین کیونکہ ہم کو یہ بات ثابت نہین ہوئی ہو کہ کوئی اور جسم بطور جوہر کے موجود ہو اور یہ اسکے ساتھ قایم ہو بلکہ ہم کو صرف روح کا وجود ثابت ہوا ہو جو بغیر کسی دوسرے وجود کے ہو اور اس لیے لازم ہو کہ اسکو جوہر تسلیم کیا جاے نہ کہ عرض۔

مذہب اسلام نے روح کا موجود ہونا بیان کیا مگر اسکی حقیقت بیان نہین کی۔ خداے تعالی کے اس قول کی نسبت کہ قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی علمائے دو طریقے سے بیان کیا ہو۔ بعض کی راے ہو کہ حقیقت روح سے بحث کرنا جائز نہین رکھا گیا ہو اور بعض کی یہ راے ہو کہ روح قدیم یا حادث یعنی مخلوق ہونے کی نسبت جو مباحثہ تھا اس کا جواب ہو۔ بہر حال اس سے کوئی مطلب سمجھا جاے مگر جو تفصیل ہم نے اوپر بیان کی ہو اُس سے ظاہر ہوتا ہو کہ حقیقت روح کا جاننا بلکہ ہر شی کی حقیقت کا جاننا فطرت انسانی سے خارج ہو۔ قرآن مجید تمام اُن چیزون کے حقیقت کے بیان سے جن کا جاننا فطرت انسانی سے خارج ہو انکار کرتا ہو۔ اسی طرح حقیقت روح کو بھی بیان نہین کیا۔ عام چیزون کی نسبت کثرت استعمال و مشاہدے کے باعث لوگون کا خیال کمتر رجوع ہوتا ہو حالانکہ وہ ان تمام چیزون کی حقیقت کچھ نہین جانتے۔ اگر وہ لوگ جنھون نے روح کی نسبت سوال کیا تھا پانی اور مٹی کی نسبت سوال کرتے تو خداے تعالی یہی فرماتا کہ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَاۗءِ وَالطِّیْنِ قُلِ الْمَاۗءُ وَالطِّیْنُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ غرضکہ ماہیت اشیاء کا جاننا فطرت انسانی سے خارج ہو جب ہم روح کو ایک جوہر تسلیم کرتے ہین تو اسکے مادی یا غیر مادی ہونے پر بحث پیش آتی ہو۔ مگر جب ہم کو اسکی ماہیت کا جاننا ناممکن ہو تو درحقیقت یہ قرار دینا بھی کہ وہ مادی ہو یا غیر مادی ناممکن ہو۔ دنیا مین بہت سی چیزین موجود ہین جو باوجود اسکے کہ وہ محسوس بھی ہوتی ہین اُنکے مادی غیر مادی ہونے کی نسبت فیصلہ نہین ہو سکتا۔ مثلاً ہم شیشے کے پہیئے کے ذریعہ سے الکٹریسٹی یعنی بجلی پیدا کرتے ہین اور وہ محسوس ہوتی ہو اور ٹھوس اجسام مین سرایت کر جاتی ہو۔ انسان کے بدن سے گذر جاتی ہو۔ بعض ترکیبون سے ایک تیل یا انسان کے بدن مین محسوس ہو جاتی ہو۔ بعض ٹھوس اجسام ایسے ہین جن مین نفوذ نہین کر سکتی مگر اسکی ماہیت کا اور نیز اس بات کا کہ وہ فی الحقیقت مادی ہو یا غیر مادی تصفیہ نہین ہو سکتا۔ طرفین کی دلیلین شبہ سے خالی نہین۔ یہی حال روح کے مادی یا غیر مادی قرار دینے کا ہو۔ لیکن اگر وہ کسی قسم کے مادے کی ہو یا ہم اس کو کسی قسم کی مادی تسلیم کرین تو کوئی نقصان یا مشکل پیش نہین آتی۔ البتہ اسقدر ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ جن اقسام کے مادون سے ہم واقف ہین اس کا مادہ ان اقسام کے مادون سے نہین ہو کیونکہ ان سے منفرداً یا مجموعاً ان افعال کا صادر ہونا ثابت نہین ہوتا ہو جو افعال روح سے صادر ہوتے ہین۔ فاضل اجل شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے جو کچھ روح اور نسمہ کی بابت لکھا ہو اس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہو کہ اخلاط کی ترکیب سے جو بخار پیدا ہوتی ہو اور جسکو نسمہ کہتے ہین روح اُس سے علیحدہ ہو۔ غرضکہ جسقدر غور کیا جاے حیوان مین علاوہ عناصر مرکبہ کے اور جو نتیجہ اس ترکیب سے ہوتا ہو ایک اور شئی بھی پائی جاتی ہو جس سے ارادہ تعقل اور ایجاد اور ترقی مراتب تعقل مین صادر ہوتا ہو اور ایسی شئی کو ہم روح کہتے ہین۔

(۲)

سلہ شاہ صاحب نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یون تحریر فرمایا ہو کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہو کہ بدن میں ایک لطیف بخار ہو جو اخلاط کے خلاصہ سے پیدا ہوتی ہو اور اسمین حس کرنے اور حرکت کرنے کی وہ سب قوتین ہوتی ہین جو تدبیر غذا کے متعلق ہین اور طبیب جس کو طب کا بڑا فن ہو وہ اس بخار کے غلیظ اور رقیق ہونے صاف اور مکدر ہونے کا بڑا اثر بنی نوع ان اور ان افعال پر جو اُن قوتون سے پیدا ہوتی ہین پڑتا ہو اگر اس عضو پر اس بخار کے پیدا ہونے پر جسکو اس عضو سے تعلق ہو کوئی آفت پہنچتی ہو تو وہ بخار بگڑ جاتی ہو اور اس

انسان اور کل حیوانات مین جو روح ہے وہ جنس واحد سے ہے یعنی ایک ہی سی روح ہے۔ انسان مین بسبب ترکیب اخلاط کے ایک قسم کی روح حیوانی پیدا ہوتی ہے جسکو نسمہ سے تعبیر کیا ہے اور روح حقیقی جو انکے فیہ ہے اُس سے متعلق ہوتی ہے اسیطرح تمام حیوانات مین بھی ترکیب اخلاط سے روح حیوانی پیدا ہوتی ہے ہم حیوانات مین بھی تعقل اور ارادہ پاتے ہین پس کوئی وجہ نہین ہے کہ ہم ان مین بھی روح کا ہونا تسلیم نہ کرین اور کوئی دلیل ہمارے پاس ایسی نہین ہے جس سے ہم انسان کی روح کو اور جنس سے اور حیوانات کی روح کو اور جنس سے قرار دے سکین۔ اس لیے ہم انسان مین اور حیوانات مین ایک ہی روح ہونا تسلیم کرتے ہین۔

(۳)

کیون تمام حیوانات سے وہی افعال صادر نہین ہوتے جو انسان سے صادر ہوتے ہین؟ اور کس لیے انسان مکلف ہے اور حیوانات غیر مکلف ہین؟

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۶۸) عضو کے کام مختل اور پریشان ہو جاتے ہین اس بخار کی موجودگی سے زندگی باقی رہتی اور اسکے تحلیل ہو جانے سے بیماری واقع ہو جاتی ہے۔ بادی النظر مین روح اسی بخار کا نام ہے لیکن اگر بنظر تدقیق دیکھا جائے تو یہ اس روح کا ادنی طبقہ ہے اس روح کی مثال جس کا ہم ذکر کرتے ہین بدن مین اسطرح ہے جیسے پھولون مین بو کوئلہ مین آگ۔ پھر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ روح روح حقیقی کا مرکب ہے اور روح حقیقی کے بدن سے متعلق ہونے کا مادہ ہے ہم بچے کو دیکھتے ہین کہ وہ جوان ہوتا ہے بوڑھا ہوتا ہے اسکے بدنی اخلاط مین تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور جو روح ان اخلاط سے پیدا ہوتی ہے وہ پہلے کی نسبت بدرجہا بڑھتی جاتی ہے کسی حالت مین وہ لڑکا صغیر سن ہوتا ہے پھر بڑا ہوتا ہے کبھی اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے کبھی گورا کبھی وہ جاہل ہوتا ہے پھر عالم ہو جاتا ہے علاوہ بر آن اسکے اوصاف مین ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن اس کی ذات مین کوئی تغیر نہین ہوتا۔ وہ وہی رہتا ہے جو پہلے تھا اور اگر ان اوصاف کے تبدیل اور عدم تبدیل مین بحث کی جائے اور ہم ان تبدیلات کو فرضی طور پر تسلیم کرتے ہین تو اُس وقت بھی لڑکا وہی رہے گا جو پہلے تھا یا ہم یہ کہین گے کہ ہم ان صفات کو اپنے حال پر باقی رہنے کا یقین نہین کرتے اور لڑکے کے بجنسہ باقی رہنے کا یقین کرتے ہین اس لیے لڑکے کی ذات اُن اوصاف کے علاوہ ہے۔ اب ہم کہتے ہین کہ وہ چیز جس کی وجہ سے وہ لڑکا بعینہ وہی لڑکا باقی رہا یہ روح بخاری نہین ہو سکتی اور نہ بدن مین وہ چیزین ہو سکتی ہین جو اُس کے شخص ہونے کی باعث ہین اور بظاہر نظر مین دیکھی جاتی ہین بلکہ حقیقی روح ایک جداگانہ چیز ہے۔ وہ ایک نورانی نقطہ ہے۔ ان تمام تغیرات سے جنمین سے بعض جوہر ہین بعض عرض اُس کا ڈھنگ نرالا ہے۔ وہ بچہ ہونے کی حالت مین بھی ویسا ہے جیسے بڑے ہونے کی حالت مین۔ جیسے وہ سیہ رنگی کی حالت مین ہے ویسے ہی سپید رنگی کی حالت مین ہے۔ ایسے ہی وہ تمام اضداد کی حالت مین یکسان ہے اس کو ابتداءً روح ہوائی سے تعلق اور ثانیاً بدن سے۔ اس لیے کہ بدن روح ہوائی سے مرکب ہے وہ عالم قدس کا ایک روزن ہے۔ جب روح ہوائی مین قابلیت اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے تو اُس روح سماوی کا اس پر نزول ہوتا ہے جن امورات مین کہ پیدا ہوتا ہے وہ زمین کی مختلف استعدادون کے وجہ سے ہے جیسے کہ دھوپ کپڑے کو سفید کر دیتی ہے اور دھوبی کو سیاہ ہم کو وجدان صحیح سے معلوم ہو گیا ہے کہ موت روح حیوانی کا بدن سے جدا ہونے کا نام ہے موت روح ہوائی سے روح قدسی کے جدا ہونے کا نام نہین جب بضعف امراض سے روح ہوائی تحلیل ہو جاتی ہے تو حکمت الٰہی کا مقتضی ہے کہ روح ہوائی اس قدر باقی رہ جائے کہ روح کا تعلق اس سے رہ سکے جیسے کہ ہم ہوا کو چوس لیتے ہین حتی الامکان اس مین تخلخل پیدا ہو جاتا ہے پھر ہم اُس کے بعد ہوا نکال نہین سکتے۔ یہانتک کہ آخیر مین شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ صرف اس راز کی وجہ سے ہے جو خدا نے ہوا کی طبیعت اور سرشت مین رکھا ہے۔ ایسے ہی روح ہوائی ایک راز اور اندازہ ہے کہ اس سے تجاوز نہین ہو سکتا۔ انتہی۔

ماخوذ از ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ۔

جبکہ ہم نے روح کو سبب تعقل وارادہ تسلیم کر لیا ہو تو اس سے ضرور لازم آتا ہے کہ روح فی نفسہٖ عاقل و ذی ارادہ و مصدر افعال ہو مگر یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ جب وہ نسمہ سے مجرد ہو اور نسمہ جسم سے مجرد ہو تب بھی اُس سے افعال صادر ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی درخت کے تخم کو خیال کریں کہ اس میں بلاشبہ شگوفون اور پتوں اور پھولوں کا مادہ موجود ہے مگر حالت موجودہ میں اس سے کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح روح میں تعقل وارادہ موجود ہے اِلّا جبتک کہ اسکا تعلق نسمہ سے اور نسمہ کا تعلق بدن سے نہو اس سے وہ افعال صادر نہیں ہو سکتے۔ صدور افعال کے لیے جسم کی ضرورت ہے پس اُس جسم کی جس قسم کی بناوٹ ہوگی اسی قسم کے افعال اس سے صادر ہوں گے۔ اسکی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے بھاپ اور دُخانی کل کی۔ دُخانی کل کے تمام پرزون کو حرکت دینے والی صرف ایک چیز ہے یعنی بھاپ مگر جس قسم کے پرزے بنائے گئے ہیں اسی قسم کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ اسیطرح گو انسان اور حیوان میں ایک ہی جنس کی روح ہے مگر ہر ایک سے بمقتضاے اسکی صورت نوعیہ کے افعال صادر ہوتے ہیں۔ انسان کے اعضا کی بناوٹ میں بھی ایک دوسرے سے کچھ فرق ہے اور یہی سبب ہے کہ بعض انسانوں سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو دوسرے سے ناممکن ہیں۔ ایک کی آواز نہایت دلکش ہے دوسرے کی نہایت مہیب۔ نہ وہ اپنی آواز کو مہیب کر سکتا ہے نہ یہ اپنی آواز کو دلکش بنا سکتا ہے۔ ایک کے دماغ کی بناوٹ علوم دقیقہ کے ایجاد کرنے کے لائق ہے دوسرے کے دماغ کی بناوٹ عام باتوں کے سمجھنے کے بھی قابل نہیں۔ پس روح افعال مطابق بناوٹ اُس جسم کے صادر ہوتے ہیں جس سے وہ متعلق ہے اور یہی سبب ہے کہ جو کچھ انسان کر سکتا ہے وہ حیوان نہیں کر سکتے بلکہ بہت سے امور ایسے ہیں کہ ایک انسان کر سکتا ہے دوسرا انسان نہیں کر سکتا اور جو حیوان کر سکتا ہے وہ انسان نہیں کر سکتا۔ یہ تفاوت ان آلات کا ہے جن کے وسیلہ سے روح کے افعال صادر ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانات کی بناوٹ اس قسم کی ہے کہ اس سے نہایت محدود افعال صادر ہو سکتے ہیں اور وہ بھی اکثر ایسے ہیں جو انکی زندگی کے لئے ضرور ہیں اور تمام نوع کے ایک ہی قسم کے افعال ہوتے ہیں اور تقریباً وہ سب افعال ایسے ہوتے ہیں کہ بلا تعلیم و اکتساب اُن کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ نہ اُن سے کوئی ایسے افعال صادر نہیں ہو سکتے جس سے روح کی ترقی و تنزل کو کچھ تعلق ہو۔ اُن سے روح کو اکتساب سعادت یا شقاوت حاصل ہو اور اسی سبب سے وہ مکلف نہیں ہیں۔ برخلاف انسان کے کہ اُس کی بناوٹ ایسی ہے جس سے افعال غیر محدود صادر ہو سکتے ہیں۔ ان میں ترقی ہو سکتی ہے ان میں تنزل آجاتا ہے۔ ایک انسان سے کسی قسم کے افعال صادر ہوتے ہیں وہ علوم عقلیہ اور الٰہیہ کا انکشاف کر سکتا ہے اُسکے ادراکات اور انکشافات کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو روح کے لیے باعث اکتساب سعادت یا شقاوت ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ مکلف ہے۔

(باقی آئندہ)

حکیم سید شاہ ولی الدین چشتی

معاد

(۴)

کیا روح اکتساب سعادت و شقاوت کرتی ہی؟ یہ مسئلہ بلاشبہ نہایت دقیق ہی۔ اس کے ثبوت کے لیے اگرچہ عینی دلیل کا ہونا قانون قدرت کے خلاف ہی مگر ایسے قیاسی دلائل موجود ہین جو اسبات پر یقین دلا سکتے ہین کہ روح سعادت یا شقاوت کا اکتساب کرتی ہے۔ یہ امر تسلیم ہو چکا ہی کہ تعقل اور ارادہ روح کا خاصہ ہی۔ اب ہم دیکھتے ہین کہ انسان ان چیزون کو اکتساب کرتا ہی جو اُسمین پہلے نہ تھین۔ وہ جاہل ہوتا ہی پھر علوم کا اکتساب کر کے عالم ہو جاتا ہی۔ وہ خالق اشیا کو جہان تک اُن کا جاننا قانون قدرت کی رو سے ممکن ہی نہین جانتا ہی پھر تجربے اور تحقیقات سے اُن کا اکتساب کر لیتا ہی۔ جب وہ پیدا ہوا تھا اُس کے خیالات بالکل سادے حیوان کی مانند تھے رفتہ رفتہ وہ مختلف باتون کو اکتساب کرتا جاتا ہی جس سوسائٹی مین پرورش پاتا ہی اُسکی تمام مادی و غیر مادی عادتین اور خیالات کو اکتساب کر لیتا ہی۔ بعض دفعہ انسان نہایت نجس اور ناپاک میلے کچیلے سور کی طرح زندگی کے دن کاٹتا ہی اور کبھی نہایت صفائی ستھرائی اور اُجلے پن سے زندگی بسر کرتا ہی۔ یہ بھی دیکھتے ہین کہ کبھی وہ نہایت سفاکی اور بے رحمی کا خوگر ہو کر مردم آزاری کرتا ہی تمام قوائے بہیمیہ اُسپر ایسا غلبہ کرتے ہین کہ وہ ایک حیوان درندہ بصورت انسان نظر آتا ہی کبھی اُسمین ایسی صلاحیت اور نیکی رحم تواضع بردباری اور سب کے ساتھ محبت و ہمدردی پیدا ہوتی ہی کہ ایک فرشتہ بصورت انسان دکھائی دیتا ہی۔ ان تمام فضائل و رذائل کو وہی شے اکتساب کرتی ہی جس کا خاصہ تعقل و ارادہ ہی یعنی "روح"، کیونکہ انسان کا جسم اور تمام اعضا اندرونی تو برابر تبدیل ہوتے رہتے ہین۔ اس لیے یہ نہین کہا جا سکتا کہ وہ تعقل و ارادہ ان اعضا کا خاصہ تھا۔ یہ ایسی واضح دلیل ہی جس سے ثابت ہوتا ہی کہ روح سعادت و شقاوت کا اکتساب کرتی ہی اور اُسکی حالت بمناسب اُسکے جس کا اُس نے اکتساب کیا ہی تبدیل ہو جاتی ہی۔

(۵)

انسان کے لیے بیشک موت ہی۔ پس حقیقت موت کی کیا ہی؟ روح کے لیے بعد مفارقت بدن بقا ہی۔ امید ہی کہ ہم اور معزز ناظرین ایک دن اُسکی واقعی حقیقت سے واقف ہون گے۔ مگر اس زندگی مین جسقدر موت کا حال معلوم ہو سکتا ہی وہ یہ ہی کہ اخلاط کا تغیر یا کسی ایسے عضو مین نقصان پہنچنے کے سبب سے جس سے اُن بخارات کی تولید یا بقا کو زیادہ تعلق ہی جو ترکیب اخلاط سے پیدا ہوتے ہین اور جنکو نسمہ سے تعبیر کیا جاتا ہی ان کی تولید موقوف ہو جاتی ہی اور اعضا مضمحل ہو جاتے ہین اس وقت انسان یا حیوان مرجاتا ہی اور روح جسکو جسم سے تعلق اسی نسمہ کے سبب سے تھا جسم سے علحدہ ہو جاتی ہی۔ مگر غور طلب بات یہ ہی کہ جب تک روح کی نسمہ سے مصاحبت رہتی ہی اس سے کچھ تاثر روح مین ہوتا ہی یا نہین اور اگر ہوتا ہی تو بعد مفارقت جسم وہ تاثر اس مین باقی رہتا ہی یا نہین۔ ہم دنیا مین دیکھتے ہین کہ تمام اجسام لطیف جب آپس مین ملتے ہین تو ایک اور قسم کا جسم حاصل کر لیتے ہین۔ اگر کیمیاوی ترکیب پر خیال کیا جائے تو تمام سخت سے سخت اور ثقیل سے ثقیل اجسام کی ترکیب صرف اجسام لطیفہ ہوائی سے ہوئی ہی جن کو علم کیمیا مین گیس یا بخارات سے تعبیر کیا جاتا ہی پھر کوئی وجہ نہین پائی جاتی کہ روح پر نسمہ کے ساتھ ملنے سے اثر نہوا ہو اور اُس نے کوئی جسم جو اسکے پہلے جسم سے کسی امر مین مختلف ہو حاصل نہ کیا ہو۔ تسلیم کرنے کے بعد کوئی وجہ نہین پائی جاتی کہ بدن سے مفارقت کرنے کے بعد پھر فی الفور روح کا وہ جسم بھی جو اُس نے نسمہ کی مصاحبت سے حاصل کیا تھا تحلیل ہو جائے۔ نتیجہ اس تقریر کا یہ ہی کہ روح نسمہ کی مصاحبت سے ایک اور جسم لطیف حاصل کرتی ہی اور وہ جسم روح اور نسمہ سے ترکیب پایا ہوا ہوتا ہی اور بدن سے مفارقت کرنے کے بعد بھی

وہ جسم علیٰ حالہ باقی رہتا ہے گو بعد کو روح کا کسی وقت نسمہ سے علیحدہ ہونا بھی ممکن ہے کیونکہ جن اسباب سے وہ جسم لطیف آپس میں ملکر ایک نیا جسم پیدا کرتے ہیں وہ دیگر اسباب سے تحلیل بھی ہو جاتے ہیں یعنی ایک دوسرے سے علیحدہ بھی ہو جاتے ہیں۔ پس یہی حال روح و نسمہ کا ہوتا ہے ہوا میں پھولوں کے اجزائے لطیف ملنے سے تمام ہوا میں ایک قسم کی لطیف خوشبو پیدا ہو جاتی ہے اور غلیظ چیزوں کے اجزا و ان میں ملنے سے ایک قسم کی خراب بو پھیلتی ہے اور پھر وہ اجزا تحلیل ہو جاتے ہیں اور علیٰ حالہ ہوا صاف رہجاتی ہے۔ اسی طرح وہ اجسام جو ترکیب کیمیاوی سے مرکب ہیں دیگر اسباب و تاثرات سے تحلیل ہو جاتے ہیں پس روح نسمہ میں ترکیب کیمیاوی ہو یا غیر کیمیائی اس کا تحلیل ہونا ممکن ہے جب روح کو ایک جسم لطیف جوہر مستقل بالذات تسلیم کیا جائے تو اس کا فنا ہونا محالات سے ہے۔ تمام چیزیں جو دنیا میں موجود ہیں کوئی بھی ان میں سے معدوم نہیں ہوتی صرف تبدیل صورت ہوتی ہے پانی آگ سے یا دھوپ کی تیزی سے خشک ہو جاتا ہے مگر معدوم نہیں ہوتا صرف صورت تبدیل ہوتی ہے۔ آکسیجن اور ہیڈروجن علیحدہ علیحدہ ہو جاتی ہیں۔ آکسیجن آکسیجن میں اور ہیڈروجن ہیڈروجن میں ملجاتی ہیں ایک ذرہ بھر بھی کوئی چیز معدوم نہیں ہوتی۔ پس روح کے معدوم ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نہایت ما فی الباب یہ ہے کہ جب تمام اشیا موجودہ میں تبدیل صورت ہوتی رہتی ہے تو روح میں بھی تبدیل صورت ہوتی ہوگی۔ اسکے امتناع پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے مگر اسکے تسلیم کرنے سے کوئی خلل مذہب اسلام میں پیش نہیں آتی غرضکہ روح کے وجود کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہی اسکے بقا کا تسلیم کرنا بھی لازمی ہے۔

(۶)

اگر ہم روح کے بقا کو تسلیم کریں تو پھر حقیقت بعث و حشر و نشر کی کیا ہے؟ میرے خیال میں جب روح نسمہ سے مل جاتی ہے تو خود ایک جسم پیدا کر لیتی ہے اور جب انسان مرتا ہے اور روح اس سے علیحدہ ہوتی ہے تو خود ایک جسم رکھتی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے پس حشر میں کوئی نئی زندگی نہیں ہے بلکہ پہلی ہی زندگی کا تتمہ ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی یہی قول ہے جیسا کہ انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں کہا ہے کہ جسموں کا اٹھنا اور روحوں کا ان میں پھر آنا یہ کوئی نئی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ اسی پہلی زندگی کا تتمہ ہے۔ مگر اس جسم کی نسبت جو دنیا میں قبل الموت تھا اسکے دوبارہ اٹھنے اور اس میں روح آنے کے شاہ ولی اللہ صاحب بھی قائل نہیں ہیں اور صاحب تفسیر کبیر نے سورۂ قیامہ کی تفسیر میں جو تقریر لکھی ہے اس سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے۔

جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ انسان تو یہی موجودہ بدن ہے پھر جب انسان مرگیا تو بدن کے اجزا متفرق ہو گئے اور مٹی میں مل کر مشرق سے مغرب تک اور مغرب سے مشرق تک پھیل گئی اب ان اجزاء کا دوسری مٹی کے اجزا سے ممتاز ہونا ناممکن ہے تو قیامت بھی ناممکن ہو گی تو یہ اعتراض دو طور سے مندفع ہوتا ہے (۱) ہمکو یہ تسلیم نہیں ہے کہ انسان اس بدن کا نام ہے بلکہ ہے کہ وہ ایک ایسی چیز ہو جو اس بدن کی مدبر ہو اور جب بدن خراب ہو جائے تو وہ اپنی حالت پر زندہ رہے (۲) خدا کو اس بات پر قدرت ہے کہ اس کو کوئی اور بدن عطا کرے چنانچہ اس آیۃ میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ خدا نے پہلے تو نفس لوامہ کی قسم کھائی پھر فرمایا کہ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اسکی ہڈیاں نہ اکٹھی کریں گے۔ اس سے صاف پیدا ہوتا ہے کہ نفس اور بدن دو چیزیں ہیں۔

قرآن مجید سے بھی موجودہ جسم کا دوبارہ اٹھنا نہیں پایا جاتا بلکہ ایک اور ہی جسم ثابت ہوتا ہے مثلاً ۔ نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

ل ترجمہ ہم نے تم کو پیدا کیا پھر کیوں نہیں تم مانتے پھر کیا تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ

آیت ۵۷ سورهٔ واقعه۔

اس آیت مین لفظ امثال کا جمع ہی لفظ مثل بفتح المیم والثاء کی اور تمام آیات ماسبق و مالحق سے جو اس تذکرہ مین ہین صاف ظاہر ہی کہ حالات حشر اُنمین مذکور ہین۔ خداے تعالی فرماتا ہی کہ ہم نے موت کو تم مین مقدر کیا اور ہم اسبات سے عاجز نہین ہین کہ جو اس زندگی مین تمھارے اوصاف ہین ان کو بدل دین اور ایسے اوصاف پیدا کرین جنکو تم نہین جانتے۔ لفظ پیدا کرنے سے صاف پایا جاتا ہی کہ موجودہ اوصاف کے معدوم ہونے کے بعد پیدا کرنا مراد ہی۔ جو لوگ روح کے قائل نہین تھے وہی حیات بعد الموت کے بھی قائل نہ تھے اور وہی لوگ ان آیتون مین مخاطب ہین۔ اسی بدن کو جو انسان اس دنیا مین رکھتا ہی انسان کے اوصاف سمجھتے تھے "طویل القامت بادی البشرة عریض الاطفار ناشی علی قدمیه وغیر ذالک" اب خدا تعالی نے فرمایا ہی کہ ان اوصاف یعنی اس جسم کے فنا ہونے کے بعد ہم اسبات سے عاجز نہین ہین کہ ان اوصاف کو بدل کر تم کو اور اوصاف یعنی دوسری قسم کے جسم مین جسکو تم نہین جانتے پیدا کرین۔ پس یہ آیت صاف دلیل اسبات کی ہی کہ حیات بعد الممات مین روح کے لیے جو جسم دنیا مین ہی وہ نہوگا بلکہ ایک اور قسم کا جسم ہوگا۔

اب ہم قرآن مجید کی اور آیتون کو جو اس مضمون سے زیادہ تعلق رکھتی ہین اس مقام پر لکھتے ہین اور بتلاتے ہین کہ جب باممعان نظر دیکھا جاوے اور منکرین روح کے عقائد کو بھی مدنظر رکھا جاوے تو ان مین اس جسم کا جو دنیا مین ہی دوبارہ اٹھنا ثابت نہین ہوتا۔ وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا (سورهٔ نوح آیات ۱۶ و ۱۷)

هُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (سورهٔ اعراف آیت ۵۵)

وَاللّٰهُ الَّذِىْۤ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (سورهٔ ملائکه آیت ۱۰)

پہلی آیت مین ظاہر ہی کہ انسان زمین سے مثل نباتات کے نہین اُگا اور نہ مثل نباتات کے دوبارہ زمین سے نکلے گا۔ پس اس تشبیه صرف معدوم ہونے کے بعد پھر پیدا ہونے کی ہی نہ اسبات کی کہ انسان بعد مرنے کے مثل نباتات کے پھر زمین سے نکلین گے۔ دوسری آیت مین بھی صرف بعد معدوم ہونے کے پھر موجود ہونے کا بیان ہوا ہی زیادہ اور کسی چیز کا بیان نہین ہی۔ پھر تیسری آیت مین "نخرج" کا لفظ استعمال نہین ہوا بلکہ نشر کا لفظ استعمال ہوا ہی اور اس لفظ کے معنی قاموس مین احیا لکھے ہین جس سے صاف ظاہر ہوتا ہی کہ صرف مُردون کے پھر موجود ہونے کی تشبیه ہی نہ اس جسم کے قبر مین سے نکلنے کی جو دنیا مین موجود تھا۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى (سورهٔ طٰه آیت ۵۷)

انسانون کو خدا نے زمین سے نہین پیدا کیا ماں کے پیٹ سے پیدا کیا ہی پس اُسکا زمین سے پیدا کرنا مجازاً "بادنی ملابست" بولا گیا ہی اصطلاح اُسکے مقابلہ مین زمین سے دوسری دفعہ نکلنا بھی مجازاً "بادنی ملابست" بولا گیا پس اس سے یہ ثابت نہین ہوتا کہ یہی جسم جو دنیا مین موجود تھا پھر دوبارہ

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۷۹) عورتون کے رحم مین ڈالتے ہو کیا تم اُس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہین ہم نے مقدر کی ہی تم مین موت اور ہم اسبات سے پیچھے نہین رہے یعنی عاجز نہین ہین کہ ہم بدل دیوین اوصاف تمھارے اور ہم تمکو پیدا کرین اس صفت مین جسکو تم نہین جانتے ۔ انتہی (آیات ۵۷ سورهٔ واقعه)

ترجمه ۱ اور خدا نے اُٹھایا تمکو زمین سے ایک قسم کا اُگانا پھر تمکو پھیر کیجاوے گا اُسمین اور نکالے گا تمکو ایک طرح کا نکالنا ۲ (سورهٔ نوح آیات ۱۶ و ۱۷)

ترجمه ۲ یہ وہ ہی جو بھیجتا ہی ہواؤن کو خوشخبری دینے والیان اپنی رحمت کے آنے کی۔ یہان تک کہ جب اُٹھاتی ہین بوجھل بادل کو تو ہم اُن کو ہانک لیجاتے ہین مرے ہوے شہر کو

زمین سے نکلے گا۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ (سورۂ ق آیات ۴۰ و ۴۳ و ۴۴)

اس یوم تشقق الارض سے یوم قیامت مراد ہو نتیجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن سب روحین اکٹھی ہوں گی۔ اس آیت کو اُن اجسام سے جو دنیا میں تھے دوبارہ اُٹھنے سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُم بِالسَّاهِرَةِ (سورۂ النازعات آیات ۱۰ و ۱۲)

منکرین حشر کے یہ الفاظ "أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً" اس آیت میں اور مثل اسکے اور آیتوں میں آئے ہیں جیسے "أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا" اور مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ اور أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ۔ اسی خیال پر مبنی ہیں کہ وہ انسان کو بجز اس جسم موجود کے اور کچھ نہیں جانتے تھے یعنی روح کے وجود کے قائل نہ تھے اور اسی سبب سے وہ تعجب کرتے تھے کہ اس جسم کے گل جانے اور معدوم ہو جانے کے بعد وہ پھر کیونکر اُٹھے گا اور اسی استبعاد کے سبب وہ اس قسم کے شبہات کرتے تھے۔ روح کی حقیقت وہ نہیں سمجھ سکتے تھے بلکہ اس کی ماہیت مثل دیگر اشیاء کی ماہیت کے انسان کی سمجھ سے خارج تھی۔ اور خدا تعالی طرح طرح سے ان کے استبعاد کو دور کرتا تھا اور حشر کے ہونے پر یقین دلاتا تھا۔ کبھی تمثیل میں اور کبھی اپنے قادر مطلق ہونے میں۔ پس اُن الفاظ سے جو منکرین روح استبعاد رکھتے تھے اور اُن کے جواب تمثیلی یا اُس کے مقابلے میں اظہار قدرت کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس جسم کا جو دنیا میں رکھتے تھے اور جس کا گل جانا اور معدوم ہو جانا کہتے تھے اسی جسم کو خدا تعالی پھر اُٹھائے گا۔ سورۂ مومنون سورۂ صافات اور سورۂ واقعہ میں بالفاظ متحدہ اللہ تعالی نے یہ فرمایا ہے قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ؎

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۷۹) پھر اس سے برساتے ہیں پانی پھر ہم اس سے نکالتے ہیں ہر طرح کے میوے اسیطرح ہم نکالیں گے مردوں کو ۱۲۔

ترجمہ اور اللہ وہ ہے جس نے بھیجا ہوا دن کو پھر اُٹھاتی ہیں بادلوں کو پھر ہم اُس کو ہانک لیجاتے ہیں مرے ہوئے شہر کیطرف پھر اس سے زندہ کرتے ہیں زمین کو اسکے مرجانے کے بعد اسی طرح مردوں کا زندہ ہونا ہے۔ (سورۂ ملائکہ آیت ۱۰) ۱۲

ترجمہ۔ ہم نے تمکو زمین سے پیدا کیا اور اسی میں پھر لیجاوین گے اور اسی سے تمکو دوسری دفعہ نکالیں گے۔ (سورۂ طٰہٰ آیت ۵۷)

ترجمہ۔ اور سن ایک دن پکارے گا پکارنے والا پاس کے مقام سے۔ ایک دن سنیں گے زور کی آواز۔ یہ ہی دن نکلنے کا (یعنی اپنی اپنی جگہوں سے) دن کے نکلنے کا معہ ان کے اجسام کے جو مفارقت بدن کے وقت اُن کو حاصل ہوے تھے اور ایک جگہ جمع ہونے کا نہ یہ کہ ان اجسام کا جو دنیا میں موجود تھے دوبارہ پیدا ہو کر نکلنے کا) ترجمہ بیشک ہم زندہ کرتے ہیں اور ہم مار ڈالتے ہیں اور ہماری طرف پھر آنا ہے جلدی کرتے ہوے اُسدن پھٹ جاویگی ان سے زمین پھر اکٹھا کرنا ہم پر آسان ہے۔ (سورۂ ق آیات ۴۰ و ۴۳)

ترجمہ کہتے ہیں کہ کیا ہم لوٹائے جائیں گے اُلٹے قدموں کیا جب ہوں گے ہم ہڈیاں گلی ہوئی کہتے ہیں کہ یہ (لوٹنا) اسوقت پھر آنا ہے نقصان کا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک سخت آواز ہے پھر یکایک وہ ایک میدان میں ہوں گے جس میں نیند نہ آتی ہو۔ (سورۂ النازعات آیت ۱۰ تا ۱۲)۔

ترجمہ۔ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مرجاوین گے اور ہو جاوین گے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم اٹھائے جاوین گے۔

وَكَانُوا يَقُولُونَ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ۔ قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَعْلُومٍ (سورۂ واقعہ آیت ۴۶ و ۵۰)

اُس آیت میں سوال تھا کہ کیا ہم اور ہمارے باپ دادا اُٹھائے جائیں گے؟ اس کا جواب یہ ملا کہ بیشک اکٹھے کیے جائیں گے۔ اُس سے صاف ظاہر ہو کہ جہان جہان قرآن مجید میں بعث کا لفظ آیا ہو اُس سے جمع کرنا مراد ہو نہ اس جسم کو جو ہم دنیا میں رکھتے ہیں بعد معدوم ہو جانے کے پھر نیا بنا کر اُٹھانا۔ بعث کا اطلاق اکثر اُن معنوں میں آتا ہو جب اُن کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا جاتا ہو۔ اس آیت میں خود خدائے تعالیٰ نے بعث کے معنوں کی تشریح کر دی ہو اور اس لیے اسکے کوئی دوسرے معنی نہیں لیے جا سکتے

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ (سورۂ حج آیات ۵ و ۶ و ۷)

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا ۜ هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ (سورۂ یٰسین آیات ۵۱ و ۵۳)

اگرچہ اِن آیات میں خدائے تعالیٰ نے ان لوگوں کا قبروں میں سے اُٹھنا اُنکو جو بعث کے بسبب نہ یقین کرنے روح کے منکر محض تھے زیادہ تر یقین دلانے کو من فی القبور اور من الاجداث کے بیان فرمایا ہو یعنی جن کو تم قبروں میں گڑا ہوا اور گلا سڑا خاک میں ملا سمجھتے ہو وہی قبروں میں سے اُٹھیں گے، مگر درحقیقت مقصود اور موضوع کلام پاک کا یہ نہیں ہو کہ وہ کہاں سے اُٹھیں گے کیونکہ بہت سے ایسے ہیں جو قبروں میں نہیں ہیں آگ میں جلا دیے گئے ہیں، جانور کھا گئے ہیں، بلکہ مقصود مُردوں کا یعنی جنکو ہم مرا ہوا سمجھتے ہیں اور جن پر مرنے کا اطلاق ہوتا ہو قیامت میں اُن کا موجود ہونا ہو لیکن اگر ہم کچھ غور کریں اور یہی سمجھیں کہ جو لوگ قبروں میں دفن ہوے ہیں وہی اُٹھیں گے تو بھی ان آیات سے یہ بات کہ اُن کا یہی جسم ہوگا جو دنیا میں رکھتے تھے کسی طرح سے پایا نہیں جاتا قرآن مجید میں دو اور عجیب آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہو کہ قیامت کے دن نہ کسی معدوم جسم کا دوبارہ نیا بنا کر اُٹھایا جائے گا نہ کوئی جدید جسم اُن کو ملے گا بلکہ وہی جسم ہوگا جو روح و نسمہ کے اختلاط سے روح نے حاصل کیا تھا اور بعد مفارقت بدن روح نے مع اُس جسم کے مفارقت کی تھی پس جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا کہ نشاء آخرت تکملہ

ترجمہ — اور وہ کہتے تھے کہ کیا ہم مر جاویں گے اور ہم ہو جائیں گے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم اُٹھائے جائیں گے کیا ہمارے باپ دادا بھی اُٹھائے جائیں گے کہدے کہ بیشک اگلے اور پچھلے ضرور اکٹھے کیے جاویں گے وقت دن معین میں ۔ (سورۂ واقعہ آیات ۴۶ و ۵۰)

ترجمہ — اور تو دیکھتا ہو کہ زمین خشک ہو گئی پھر جب ہم برساتے ہیں اُس پر پانی تو پھولتی ہے اور بڑھتی ہے اور اُگاتی ہو ہر قسم کی خوش آیند چیزیں۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ وہی برحق ہے اور یہ کہ وہی زندہ کرتا ہو مردوں کو اور یہ کہ وہ ہر شئے پر قادر ہے اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے اُس میں کچھ شک نہیں اور یہ کہ اللہ اُٹھا دے گا اُن کو جو قبروں میں ہیں (سورۂ حج آیات ۵ و ۶ و ۷)

ترجمہ — اور پھونکا جاوے گا صور پس یکایک وہ قبروں میں سے اپنے پروردگار کے پاس دوڑیں گے کہیں گے ہائے ہماری کس نے اُٹھایا ہمکو ہمارے مرقد سے یہ وہ ہو جسکا وعدہ کیا تھا خدا نے اور سچ کہا تھا پیغمبروں نے یہ نہیں تھا مگر ایک شور ناگاہ آواز پس ناگہاں وہ سب ہمارے پاس حاضر ہونے والے ہیں۔ (سورۂ یٰسین آیات ۵۱ و ۵۳)

ایسی حیات کا ہوگا۔ خلق جدید بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہو۔

وَقَالُوا أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ۝ أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا (سورہ والاسریٰ آیات ۵۲ و ۵۳)

وَقَالُوا أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ بَلْ هُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ ۝ قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۝ (سورہ سجدہ آیات ۹ و ۱۰)

مندرجہ بالا دونوں آیتوں میں باوجودیکہ سوال خلق جدید سے تھا مگر خدا تعالیٰ نے اس کو قابل جواب نہیں سمجھا کیونکہ خود سوال ہی باطل تھا کہ خلق جدید خلق سابق کے اعمال کی جزا و سزا کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ ایک جگہ تو یہ فرمایا کہ تم کو پھر وہی حشر میں لائے گا جس نے تم کو اول مرتبہ پیدا کیا تھا اور لانے کی کچھ تفصیل نہیں بتلائی اور دوسری آیت میں فرمایا کہ ان کی یہ باتیں اس بنا پر ہیں کہ پروردگار کے پاس جاؤ گے ہرچند کہ ان آیتوں سے بھی اس جسم کا جو دنیا میں ہو دوبارہ پتلا بنکر اٹھنا ثابت نہیں ہوتا۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ - سورہ یٰسین آیات (۵۸ و ۵۹)

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ ۝ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ ۝ سورہ قیامہ آیات (۳ و ۴)

قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ - سورہ جاثیہ آیت (۲۵)

ان تین آیتوں میں سے پہلی دو آیتیں ایسی ہیں جن پر متکلمین نافیین نفس ناطقہ استدلال کر سکتے ہیں جیسا کہ شرح مواقف میں مذہب اول بیان کیا گیا ہو اور کہہ سکتے ہیں کہ جب انھیں گلی ہوئی ہڈیوں کے زندہ کرنے کا بیان ہوا ہو اور انگلیوں کے پوروں تک کا بنا دینا فرمایا ہو تو اس سے اسی جسم کا جو دنیا میں ہو پتلا بنکر اٹھنا پایا جاتا ہو مگر یہ خیال دو طرح غلط ہو۔ ایک اس لیے کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ کسی سوال کے جواب میں صرف اظہار قدرت سے اس بات کا ثبوت لازم نہیں آتا کہ یہی جسم جو دنیا میں ہو دوبارہ پتلا بنا کر اٹھایا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اسی کے ساتھ بیان ہوا ہو کہ ہو بکل خلق علیم

ترجمہ سلہ - اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور سڑے ہوے ہو جاویں گے تو کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گے نئے پیدا ہو کر۔ کہدے کہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا اس قسم کی جو پیدائش جو تمہارے دل کو بڑی مستحکم لگتی ہو تب بھی تم کہوگے کہ کون ہم کو لوٹا دے گا۔ کہدے وہ جس نے پیدا کیا تم کو پہلی دفعہ پھر جھکا دیں گے اپنے سروں کو تیری طرف اور کہنے لگیں گے وہ کب ہوگا؟ کہدے کہ شاید ہوئے قریب (سورہ والاسریٰ آیات ۵۲ و ۵۳)

ترجمہ عہ - اور انھوں نے کہا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے (یعنی گل گلا کر مٹی ہو کر اسمیں مل جاویں گے) تو کیا ہم ایک نئی پیدائش میں آویں گے بلکہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے کے منکر ہیں کہدے کہ تمکو ملک الموت مارے گا جو تم پر تعین ہو پھر اپنے پروردگار کے پاس پھر جاؤ گے (سورہ سجدہ آیات ۹ و ۱۰)

ترجمہ سہ - ہمارے لیے یہ مثال لاتے ہیں کہ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو اور وہ تو گل گئی ہوں گی اور اپنے پیدا ہونے کو بھول جاتے ہیں کہدے کہ ان کو زندہ کریگا وہ جس نے تم کو پیدا کیا پہلی دفعہ اور وہ ہر قسم کی آفرینش کو جانتا ہو (سورہ یٰسین آیات ۵۸ و ۵۹)

ترجمہ عہ - کیا انسان گمان کرتا ہو کہ ہم ہڈیوں کو اکٹھا نہ کریں گے یہ بات نہیں ہو بلکہ اس پر قادر ہیں کہ انگلیوں کی پوریوں کو بھی درست کریں (سورہ قیامۃ آیات ۳ و ۴)

ترجمہ فہ - کہدے کہ اللہ تمکو جلاتا ہو پھر تمکو مار ڈالے گا پھر تمکو قیامت کے دن اکٹھا کرے گا (سورہ جاثیہ آیت ۲۵)

یعنی وہ ہر قسم کے پیدا کرنے کو جانتا ہو کہ گلی ہوئی ہڈیوں کی زندگی کیا چیز ہو اور وہ کیونکر ہوتی ہو پھر اس سے یہ سمجھنا کہ وہ گلی ہوئی ہڈیاں دوبارہ ایسی ہی ہو جائینگی جیسے کہ اب اس زندگی میں ہین ایک صریح غلطی ہو ایک آیت کے معنی دوسری آیت سے حل ہوتے ہین۔ سورۂ جاثیہ مین صاف لفظون مین خدائے تعالیٰ نے فرمادیا ہو کہ اللہ تم کو جلاتا ہو۔ پھر تم کو مارتا ہے پھر تمکو قیامت کے دن اکٹھا کریگا بس یہ آیت نہایت صاف ہو اور اسی آیت کے سیاق سے تمام آیتون کے معنی حل ہو جاتے ہین فقط۔

(اقتباس) حکیم سید شاہ ولی الدین چشتی

دُعا کی عظمت

(۱)

(الف) ایک آنکھ ایسی ہو جو رات کی تاریکی مین بھی جاگتی رہتی ہو اور ایک کان ایسا ہو جو روشنی کی شعاعون کے غروب ہونے پر بھی سننے کیلئے ہمیشہ کھلا رہتا ہو

(ب) ایک ہاتھ ایسا ہو کہ جب انسان کی طاقت کوئی کام کاج کرنے کے قابل نہین رہتی تو اُسوقت بھی وہ کبھی نہین رکتا۔ اور ایک محبت ایسی ہو جو اُسوقت بھی قائم رہتی ہو جبکہ تمام دنیاوی محبتین زائل ہو جاتی ہین۔

(ج) جس آنکھ پر نیند کا غلبہ نہین ہوتا اُسکے سامنے فرشتون کی صفین کھڑی رہتی ہین اور وہ کان جو ہمیشہ دعاؤن کے سننے کیلئے کھلا رہتا ہو فرشتون کے گیت سنا کرتا ہو اور وہ ہاتھ جس سے تھکن کوسون دور رہتی ہو آسمان پر سے ہی دنیا کو سنبھالے ہوئے ہو اور جو محبت کہ لازوال ہو اُسکا تخت آسمان سے کہین اونچے ہو۔

(د) لیکن اُس آنکھ اُس ہاتھ اُس محبت اور اُس سننے والے کان تک باریابی حاصل کرنیکے کے لیے ایک ایسی قوت موجود ہو جسکو انسان ہر وقت کام مین لاسکتا ہو جبکہ دنیاوی مدد بے سود ثابت ہو چکی ہو وہ طاقت **دعا** ہو جسکی پرواز بہت اونچی ہو اور جو آسمان کی تسکین اور خوشی پر گذارہ کرتی ہو۔

(۲)

(الف) تھمے ہوئے سورج اور خاموش سمندر آسمان و زمین پر دعا کی عظمت و طاقت کا اظہار کرتے ہین۔ دعا ہی ایک ایسی چیز ہو جو مایوس کو امید دلاتی ہو اسی سے کمزور لوگ طاقت حاصل کرتے ہین۔ دعا ہی تیر رفتار کو پیچھے چھوڑ جاتی ہو اور طاقتور ونکو بھگا دیتی ہو دعا ہی دن کے وقت تیر کو نقصان پہنچانے سے باز رکھتی ہو اور وہی انسانون کو وبا کے اثر سے جو رات کو پھیل جاتی ہو بچاتی ہو۔

(ب) دعا کی طاقت کے سامنے تمام طاقتین ہیچ ہین۔ اسکی وسعت غیر محدود ہو وہ ہر جگہ موجود ہو اور کائنات کی کل چیزین اسی کے ماتحت ہین۔ وہ کسی خاص طبقہ یا خاص مجمع سے تعلق نہین رکھتی اُس کا کام تو یہ ہو کہ وہ انسان کو تمام بنی نوع انسان کے ساتھ باہم ملا دے۔ اور ایک دل سے دوسرے دل کا رشتہ تعلق قائم کرادے لیکن ایسا رشتہ جسکی بنیاد محبت اور صفائی قلب پر قائم ہو۔

(ج) اس لیے جن مومنون نے ابتک دعا نہین مانگی ہو انکو چاہیے کہ اب دعا مانگنی شروع کردین کیونکہ دعا کا مانگنا یا نہ مانگنا، گناہ کا کرنا یا نہ کرنا خود ہماری ہی مرضی پر منحصر ہو ہر ایک سفلی خواہش اور ہر ایک نفسانی ضرورت جسکے پہچاننے یا سمجھنے مین ہم بسا اوقات غلطی کرتے ہین نہایت ہی ارذل چیز ہو لیکن ایسا کونسا دلیر شخص ہو جو خدا تعالیٰ سے اُس چیز کے حاصل کرنیکی دعا مانگے جو دراصل اچھی نہین ہو۔

(د) ہماری دعائین نہ صرف خدا تعالیٰ کو کسی چیز کے دینے کے لیے زیادہ تیار کردیتی ہین بلکہ انکا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ ہم خود اُن برکتون کے لینے کیلئے زیادہ قابل ہو جاتے ہین۔ آسمانی خزانے مین دولت لاانتہا ہو اور وہان ہر کس و ناکس کے آزادانہ طور پر جانے کی اجازت ہو۔ لیکن جو شخص کہ کبھی دعا نہین مانگتا وہ گویا دراصل اس سنہری کنجی کے لینے سے انکاری ہو۔

(۳)

اتنی ڈھیل چھوڑنا کہ کہین میٹھی نیند تم پر غلبہ پاکر تمھین غفلت کے حوالہ کردے تاوقتیکہ تم اچھی طرح اپنے تمام کامون پر جو تم نے دن مین انجام دیے ہین تنقیدانہ نظر نہ ڈال لو مثلاً تم اپنے دل سے پوچھو کہ تو دن بھر کیا کرتا رہا ہو اور تجھنے ایسا کون سا اچھا کام کیا ہو جو تیری شان کے زیادہ مناسب تھا، اور کونسا اچھا کام تجھ سے رہ گیا ہو؟ اور جب تم اس طرح سے تمام دن کا حساب لے چکو تو برائی کے دھبون کو خدا کے فضل پر بھروسہ کرکے پشیمانی کے آنسون سے دھو ڈالو، اور جو اچھے کام تم نے دن بھر مین کئے ہین ان پر اظہار خوشی کرو۔

(ترجمہ) ضیاءالدین احمد برنی

مایا کی فلاسفی

مغرب کے بڑے سے بڑے محقق اگر ہندو فلسفہ کے رموز و اسرار کو سمجھنے سے قاصر رہے ہین تو اسکی وجہ یہ سمجھنی چاہیئے کہ اول الذکر کی قابلیت مین کچھ کلام یا آخر الذکر کی فضلیت مین کسیطرح کا شک ہے۔ اس کا باعث اگر کچھ قرار دیا جا سکتا ہو تو یہ کہ دونون قومون کی تہذیب کے بنیادی اُصول مین بعد المشرقین ہو۔ دُنیا کے ہر حصے مین ہر زمانہ کے اندر ہشیار و ہنرمند و متمدن اقوام ہو گذری ہین لیکن شاید یہ کہنا بیجا نہو گا کہ ان سب مین صرف ہندوؤن ہی نے حقیقت کا معیار ذہنی قائم کرنے اور معیار ذہنی کے مطابق اُمور کو حقیقت مین لانے کی کوشش کی ہو۔ ہندوؤن کی تہذیب لازمی طور پر ایک روحانی تہذیب تھی اور اس اعتبار سے ان اقوام کی تہذیب سے جو اس کے مقابلے مین جوان کھلا سکتی ہین بدرجہا آگے بڑھی ہوئی تھی۔ بس یہی وجہ ہو کہ لوگ اسکے اسرار کو سمجھنے سے قاصر و معذور ہین۔

بڑے بڑے راجاؤن کا ذرا سی بات پر راج پاٹ چھوڑ کر فقیر ہو جانا، اعلیٰ قابلیت اور افضل لیاقت کے آدمیونکا سنیاس اختیار کرکے جنگلون اور بنون مین رہنا، ہزارون کی تعداد رکھنے والی فوج کے مقابلے مین مٹھی بھر جوانون کا محض اپنی آن کو بچانے اور تلوار ہاتھ سے نہ دینے کے لیے لڑ کر کٹ مرنا، سینکڑون عورتون کا بڑے استقلال اور ثابت قدمی سے پروانہ دار آگ کے شعلون مین جل کر بھسم ہو جانا یہ اور اسی قسم کے بیسیون عجیب و ناقابل فہم ظہورات ہندو تہذیب کی واحد خصوصیات ہین۔

غرض یہ کہ اس تہذیب کا منشا سب سے بڑھکر انسان کو تیاگ اور روحانیت کے لیے مادیت سے دست بردار ہونے کا سبق سکھانا ہے۔

اُپنشد مین آیا ہے:۔

غیر فنائیت کام سے، نہ اولاد سے، نہ دولت سے، بلکہ صرف تیاگ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ایک اور موقعہ پر مذکور ہے:۔

وہ چیز جو کبھی تبدیل ہونے والی نہین، قابل تبدیل چیزون کے ذریعے حاصل نہین ہو سکتی۔

بس یہی ہندوؤن کے تیاگ کا راز ہو۔ فنائیت یا روحانی زندگی کی تکمیل ان دُنیاوی اسباب کے ذریعے سے حاصل نہین ہو سکتی جو لازم طور پر بدلنے والے اور غیر حقیقی ہین۔ ایک انگریزی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:۔

ترجمہ۔ صرف ایک باقی رہتا ہو۔ کثیر التعداد چیزین جو نظر آرہی ہین تبدیل ہوتی اور گذر جاتی ہین۔ آسمان کی روشنی ہمیشہ چمکتی ہو۔ زمین کے سائے تیزی سے گذرتے جارہے ہین۔ زندگی بہت سے رنگون والے شیشہ کے گنبد کی مانند بقا کی سفید روشنی کو داغدار بناتی ہے

ہان صرف ایک ہی باقی رہتا ہو۔ کثیر التعداد چیزین تبدیل ہوتی اور گذرتی جاتی ہین۔ وہ اس حقیقت کے محض سائے ہین۔ تم اگر حقیقت کے خواہشمند ہو تو ان سایون کی طرف دلبستگی کی نظر سے نہ دیکھو۔ دوسرے لفظون مین دُنیا جو نظر آرہی ہو حقیقت کے نقطۂ نظر سے محض ایک نظری دھوکا یا مایا ہو۔ اسی لیے تیاگ کی فوقیت ہے

ہندوؤن کی تمام مجلسی ساخت کا دار و مدار صرف اسی بات پر ہو کہ انسان ان چیزونکو جو محض نمائشی ہین تیاگ کر اس چیز کے حصول کے لیے جو بقا کی حقیقت رکھتی ہو کوشش کرے۔ اُنھون نے زندگی کو چار منازل پر تقسیم کیا جن مین سے ہر ایک مین یہی راز مخفی ہو۔ طالب علم (ودیارتھی) یا برہمچاری کا کام ریاضت اور حظوظ نفسانی کو ترک کرنا ہو جب وقت طلب علم کا زمانہ گذر چکے تو اسوقت وہ گرہست آشرم مین داخل ہوتا ہو۔ اسوقت اسکا فرض ہے کہ

وہ تحصیل علم و دولت میں اس طرح منہمک رہے گویا کبھی بوڑھا نہ ہوگا اور نہ مریگا اور دھرم پر اس خیال کو مدنظر رکھ کر عمل کرے کہ گویا موت نے اسے بالوں سے پکڑ رکھا ہے۔

گرہست کا زمانہ صد درجہ کی محنت کا زمانہ قرار دیا گیا ہے جس میں انسان کو کامل ایثار اور بے غرضی سے کام لینا چاہیے۔ گویا ایک طرح پر اس زمانہ میں اسے آنے والے زمانہ بان پرستھ اور سنیاس کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

چونکہ روحانی تکمیل کو مدعائے زندگی قرار دیا گیا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ نفسانی زندگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ اسی اعتبار سے بیوہ عورت کو اس کا عمدہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ حظوظ نفسانی کو خیرباد کہکر تجرد کی زندگی بسر کرے، خدا کی یاد میں اپنی ذات کو بھلا دینا اسکا فرض ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی زندگی کو پورے طور سے روحانی بنانیکی کوشش کرے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوؤں کا مذہب کبھی عقد بیوگان کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اسے قطعاً ممنوع قرار دیتا ہے۔ بیوگان کی شادی کے خلاف یہ ایک قسم کا غیر تحریری حکم ہے۔ برہمن کیلئے جو مجلسی طور پر تمام ہندوؤں میں اعلیٰ درجہ رکھتا ہے لازم ہے کہ وہ سادہ زندگی بسر کرنے اور اعلیٰ خیالات سوچنے کی ایک شاندار مثال ہو۔ ہر چند کہ علم و اثر اس کے اختیار میں ہیں تاہم ضروری ہے کہ وہ دنیاوی جاہ و حشم کے معاملے میں غریب ہو۔ روحانی پاکیزگی اور نفاست کے لیے ضروری ہے کہ وہ افلاس ہی کی حالت میں قانع رہے۔ جو شخص دولت کا خواہشمند ہو اسکے اندر صداقت کیونکر موجود رہ سکتی ہے؟ اور علم کے لیے تو سب سے بڑھ کر ضروری ہے کہ وہ صداقت کا پرستار ہو۔ اسی ضمن میں ہارورڈ کے پروفیسر جیمز کے مندرجہ ذیل خیالات قابل ملاحظہ معلوم ہوتے ہیں:-

درحقیقت افلاس ہی جدوجہد کی زندگی ہے۔ وہ افلاس جس میں باجے کی آواز، شاندار وردی، پرجوش افتادہ خوشنودی، یا جھوٹ یا فریب کو دخل نہ ہو۔ جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ دولت کمانے کی دھن کس طرح ہماری موجودہ نسلوں کی ہڈیوں کے عرق تک میں اپنا اثر قائم کر چکی ہے تو یہ سوچکر تعجب ہوتا ہے کہ آیا اس اعتقاد کی از سر نو اشاعت کہ افلاس ایک مستحسن مذہبی وسیلہ نجات ہے اس روحانی اصلاح کے لیے ضروری سمجھی جا سکتی ہے جس کی ہمیں بے حد ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خصوصیت سے ہم لوگوں میں جو انگریزی زبان بولنے والے ہیں سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ افلاس کی تعریف میں پھر ایک بار راگ گائے جائیں۔ ہم ایک طرح پر افلاس سے خوف کھانے لگ گئے ہیں۔ جو شخص اپنی زندگی کو سادگی سے بسر کرنے یا اپنی اندرونی زندگی کو بچانے کے لیے غریب رہنا پسند کرتا ہے ہم اسے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص عوام میں ملکر روپیہ پیدا کرنیکی جد و جہد میں شریک نہ ہو تو ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ بے حوصلہ اور ہر قسم کی خواہشات سے عاری ہے۔ ہم اب اس بات کا اندازہ ذہنی طور پر بھی نہیں کر سکتے کہ زمانہ قدیم میں افلاس کا جو معیار مقرر تھا اسکے معنی کیا ہو سکتے ہیں، اور نہ ان فوائد کو سمجھ سکتے ہیں جن کا اس معیار سے لازمی طور پر تعلق ہے یعنی مادی تعلقات سے آزادی، روحانی پاکیزگی، سفلی باتوں کی حرص مردانہ وار عدم توجہی کا اظہار، زندگی کا سیلاب دولت کے بجائے کاموں کے ذریعے سے کام کرنا، غیر ذمہ دارانہ طریق پر اپنی زندگی کو جس وقت جی میں آئے خیرباد کہہ دینا، اور وہ تمام اخلاقی آزادیاں جو اس سے تعلق رکھتی ہیں۔

لیکن ہر معاملہ کے لازمی طور پر دو رُخ ہوتے ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس دوسرے رُخ کو بھی شروع ہی میں پیش کر دیں۔

ہندوؤں میں دو جداگانہ طبقے موجود ہیں جو ان کی تہذیب کے دو مختلف پہلوؤں کے نمائندے سمجھے جا سکتے ہیں۔ انھیں عام طور پر اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں ان کے اندر اختلاف

صرف تعلیم کا ہو۔ قدیم موروثی تہذیب دونوں مین موجود ہو۔ فرق اگر ہو تو محض اتنا کہ تعلیم یافتہ فریق مین اسکا اثر محلول ہو کر پورے طور سے بس چکا ہو لیکن غیر تعلیم یافتہ لوگون کے کثیر التعداد گروہ مین اسکا اثر صرف خارجی ہو گو اسکا وجود دونون صورتون مین پایا جاتا ہے۔

تہذیب کا خود بخود پیدا ہونا اسکی جان ہو۔ جو باتین لوگون پر محض رواجاً عائد کی جائین وہ ایسی ہی ہین جیسے اصلی پھول کے بجائے کاغذی پھول لگا دیا جائے یعنی محض اس قسم کی جن سے دیکھنے والون کو یقین پیدا ہو سکے۔ اس صداقت کی کیفیت ہندوستان کے اندر ہماری نظرون سے گذری ہو۔ ہر چند کہ ہندو دیت نے صدیون کے عرصے مین اس زبردست آلہ رواج کے ذریعہ سے اپنی تہذیب کو عوام کے اندر داخل کرنے کی کوشش کی، اور گو اس تہذیب کا اثر لوگون کی ہڈیون تک مین بس چکا ہو، تاہم اس سے ان کا دلی جوش اب تک متاثر نہین ہوا۔ کثیر التعداد ہندوستانیون مین تہذیب موجود تو ہے لیکن وہ جسی نہین رواجی ہو۔ دوسرے لفظون مین یون کہا جا سکتا ہو کہ وہ خود رو نہین آٹومیٹک ہے۔

اسکی تشریح اِسطرح پر ہو سکتی ہو کہ کیا باعث ہو باوجودیکہ ایک ہی خمیر کے سارے آٹے مین موجود ہونے کے اسکا اثر صرف جزوی ہوا ہو؟ جو حصہ اِس خمیر سے اثر پذیر ہوا، وہی ہو جو تعلیم کی برقی چکی مین سے گذر چکا ہو۔ اِس حصہ کی نسبت مختصر الفاظ مین کہا جا سکتا ہو کہ وہ رکاوٹ پیدا کرنیوالے مادہ سے پاک آزاد، ذمہ دار اور ترقی یافتہ ہے۔ دوسرا حصہ روایت کی دقیانوسی پن چکی کے نیچے دبا ہوا ہو۔ قرنہا قرن سے عوام کو اس تعلیم سے محروم رکھا گیا ہو جو انکے اندر روشنی کا باب کھول سکتی تھی۔ بس یہی فرق ہو اور اسی نے ہندو قوم کو ایک قوم کی حیثیت مین کسی قابل بننے نہین دیا۔

اس قدر جملہ معترضانہ کے بعد اب ہم پھر نفس مضمون کی طرف رجوع کرتے ہین۔ مایا کے عجیب و غریب مسئلہ کی ابتدا کے متعلق لوگون کے خیالات مختلف ہین کوئی اسے "شیطانی تعلیم" سے منسوب کرتا ہے، کوئی "آب و ہوا کے اثر" سے۔ غرض لوگون کے اندر اسی قسم کے متضاد خیالات اس کے متعلق پھیلے ہوئے ہین۔ ممالک غیر کے نکتہ چینون مین سے بعض نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ ہندوؤن کی ہر بات کو اندیشہ کی نظر سے دیکھنے کے مسئلہ کا انتہائی پہلو ہے۔ ایک انگریزی شاعر کہ گیا ہے :-

نقابت کا فخر، طاقت کا غرور، اور دولت اور حسن کا ناز، یہ سب باتین
یکسان طور پر اس اٹل گھنٹہ کی منتظر ہین۔ فتح اور شان و شوکت کے
راستے بھی آخرکار قبرستان ہی کو جاتے ہین۔

ان غیر ملکی نکتہ چینون کا خیال ہو کہ جس بات کو مد نظر رکھکر شاعر نے یہ الفاظ لکھے ہین انہی کو بدرجہ اتم بڑھا کر ان کی فلسفیانہ صورت کا نام "مایا" رکھ لیا گیا ہے۔

بعض یہ کہتے ہین کہ انسان نے زندگی کی عارضی نمائش کو دیکھکر اپنی ذات کو اس کے مطابق بنانے کے لیے اس مسئلہ کو اختراع کیا ہے۔ دوسری طرف بعض کا خیال یہ ہو کہ جس وقت ہندو فلاسفر زندگی کی مختلف حالتون کی غیر یکسانیت کو نظر انداز کرنے سے قاصر رہے تو انھون نے اپنے خیالات مین بہت بڑی رنگ آمیزی کر کے اس مسئلہ کو وضع کر لیا۔ ان لوگون کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو اختراع کرنے والون کی مایوسی پہلے کی اس مایوسی کے مانند تھی جس سے مجبور ہو کر انسے لکھا تھا :-

اگر یہ سچ ہو کہ اضافۂ تعلیم قدرت پر ایک وسیع قبضہ جو اسکا لازم نتیجہ ہے
اور حصول دولت جو اسکے قدم بقدم چلتی ہو عوام کی حاجتمندی در انکے
ضروری لوازم طبعی اور اخلاقی تنزل مین کسی قسم کا اختلاف پیدا نہین

کر سکتے تو مین اسبات کو بڑی خوشی کی نظر سے دیکھون گا کہ کوئی مہربان ُمدار تارہ زمین سے ٹکرا کر اسکی ہر چیز کی صفائی کر جائے۔

مایا کی ابتدا کے متعلق یہ اور اسی قسم کے اور خیالات جن کا اظہار وقتاً فوقتاً لوگون کی طرف سے ہوتا ہو اس کو ثابت کرتے ہین کہ جس چیز کو دل محسوس کرنے کے قابل نہین ہوتا دماغ اسکی بُری بھلی تشریح کر کے اس سے پیچھا چھڑانے کا کسقدر آرزومند ہوتا ہے۔

لیکن امر واقعہ یہ ہو کہ مایا کا خیال نہ تو ہندؤن کی ہر چیز کو اندیشہ کی نظر سے دیکھنے کے باعث پیدا ہوا اور نہ ان کے اس چیز سے اپنے آپ کو چھپانے کی فکر سے جس کی تشریح ان کے لیے ناممکن تھی۔ ویدانت مین مایا کا جو ذکر آیا ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض جہالت کا نام ہو۔ نہ تو اسکا کوئی خاص وجود ہو اور نہ یہ بالکل ہی عدم ہے۔ یہ ایک طاقت ہو جو اپنے وجود کے لیے دُنیا کی نمائش پر منحصر ہے۔ یعنی وہ طاقت جو ان صورتون کے نمودار ہونے کی ذمہ دار ہے جنھین نامعلوم مقام سے تعلق رکھنے والے فن اور مادہ کہتے ہین۔ مایا ہی وہ چیز ہو جس کی وجہ سے ہم آتما کے بجائے برہمانڈ کو دیکھتے ہین ہم اسکے طریق وضع کو سمجھنے مین اس لیے قاصر ہین کہ ہم خود اسکی پیداوار ہین اور نتیجہ کبھی اپنے باعث سے فوق الاثر نہین ہو سکتا۔ تاریخ بتاتی ہو کہ مایا کو دور کرنے کے لیے علم 'برہم گیان' اور وجود حقیقی کی واقفیت کی ضرورت ہو۔ اسکے دور ہونیکے معنی یہ ہین کہ انسان روشنی کے اس اعلیٰ ترین درجے کو حاصل کرے جو اس کے دائرہ مین موجود ہو یعنی یہ کہ وہ اپنی پوری طاقت تک پہنچ جائے۔ اسکا مطلب یہ ہو کہ انسان اس معراج کو حاصل کرے جس مین تلون اپنی جگہ توحد کو دیتا ہو۔ یعنی یہ کہ اس پر حقیقی علم کے دروازے کُھل جائین اسکی غلطی کا پردہ آنکھون کے آگے سے اُٹھ جائے، اور اسکا غم ہمیشہ کیلئے تلف ہو جائے۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ انسان مایا کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ اس خیال سے کہ ناظرین اتنا پڑھکر گھبرا نہ جائین اور گھبراہٹ مین ادھر سے اپنی توجہ ہٹا لین ہم اسکے ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دینا چاہتے ہین کہ انسان اسے سمجھنے مین صرف اسی درجے تک قاصر ہو جیسے کہ وہ تمام "بنیادی خیالات" کو سمجھنے کے معاملے مین ہوتا ہو۔ اسکی مزید توضیح کے لیے ذیل کی عبارت انگریزی کی کتاب "عجیب و غریب صدی" مین سے "مادہ کے گردابی مسئلہ" کے متعلق ترجمہ کر کے درج کی جاتی ہے:۔

اس مسئلہ کی رو سے ایتھر کو ایک اس قسم کی رقیق چیز تصور کیا جاتا ہو جو نہ تو دباؤ مین آسکتا ہو اور نہ اسمین رگڑ پیدا ہوتی ہو۔ سارے برہمانڈ مین ایک اور صرف وہی ایک چیز ہو۔ وہ چیز جسے مادہ کہتے ہین درحقیقت ایتھر کی حرکت کی ایک صورت ہو۔ سالمات درحقیقت نہایت چھوٹے چھوٹے گرداب یا ایتھر کی تیزی سے گردش کرنے والے اجزا ہین اور یہ اجزا اس قسم کے ہین کہ جب ایک بار اس رگڑ سے خالی رقیق چیز مین ان کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہو تو وہ دوامی اور ناقابل اتلاف ثابت ہوتے ہین۔ خیال ہو کہ ان گردابون کی ایک کافی (قریب قریب بے انتہا) تعداد جن مین سے ہر ایک کی جسامت مختلف ہوتی ہو جو مختلف تیزی سے حرکت کرتے ہین اور گیس کے ذرات کے مانند ہر ممکن سمت مین پھیلتے ہین جسامت اور حرکت کی مشابہت کے اعتبار سے مختلف مجموعون کی صورت اختیار کرتے ہین۔ اس اجتماع کے عمل سے عناصر پیدا ہوتے ہین اور جب یہ عناصر کیمیائی ترکیب سے ایک دوسرے سے ملتے ہین تو اس سے مادہ کی مختلف صورتین پیدا ہوتی ہین۔ لیکن ان سالمات اور ان کے مجموعات کی مسلسل حرکات غیر مرئی ایتھر کے اندر حرارت اور بجلی کی خاص جنبشین پیدا کرتی ہین جس کا اثر دوبارہ مادہ پر پڑتا ہو تو ان باہم پیوست شدہ تبدیلیون کا ظہور ہوتا ہو جنھین قوانین و ظہورات فطرت خیال کرتے ہین۔ یہ امر مشتبہ ہو کہ آیا کشش اس ابتدائی حرکت سے پیدا ہوتی ہو جو ایتھر مین لائی جاتی ہو یا نہین۔

بہر نوع لارڈ کیلون جو انگلستان میں اس گردابی حصہ کے سب سے بڑے شارح ہیں انکی اِس تھیوری کو زیر نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ برہمانڈ کی ابتدا کی دریافت کے متعلق جسقدر کوششیں کیگئی ہیں ان سب میں یہ نہایت اہم ہے۔ لیکن تمام "بنیادی خیالات" کی طرح یہ مسئلہ بھی اس قسم کا ہے کہ ذہن انسانی بمشکل اسے قبول کر سکتا ہے۔ دباؤ میں نہ آنے اور نہ رگڑ کھانیوالی رقیق شے جو سارے برہمانڈ پر حاوی اور محیط ہے سالماتی گردابی حرکات کے سلسلۂ نامتناہی کی ابتدا، قبول حرکات، اجتماعات کا نہ ختم ہونیوالا سلسلہ، کیمیائی حرکات کی پیچیدگی، ایتھر کی مختلف قسم کی جنبشوں اور کشش کی طاقت کا پیدا ہونا یہ سب باتیں فہم انسانی میں نہیں آسکتیں۔ اگر آبھی جائیں تو سب سے بڑی ناقابل فہم بات یہ رہ جاتی ہے کہ ایتھر کے ان گردابی حلقوں کے اِس طرح آپسمیں ٹکراتے رہنے کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ میں سے زندگی بیداری، محبت اور ذہانت کیونکر پیدا ہو گئی۔

ممکن ہے کہ ناظرین میں سے بعض یہ اعتراض کریں کہ ایک سائنٹفک طور پر مستند ناقابل فہم مثال پیش کر دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی اور ناقابل فہم بات تسلیم کر لی جائے۔ ہم ان کے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہیں سچ پوچھو تو مایا کا مسئلہ بجائے خود ایک مستحکم بنیاد پر قائم ہے۔ ہم نے ڈاکٹر والیس کی کتاب کا مندرجۂ بالا اقتباس محض اس لیے پیش کیا کہ دکھایا جائے گو بعض باتیں ہمارے فہم و قیاس سے بعید ہیں تاہم اس وجہ سے ہم انھیں ناممکن نہیں قرار دے سکتے۔

مایا کے مسئلہ کو مختلف نقاط نظر سے مختلف دلائل کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے ذیل میں ایک پہلو کو لیکر اسکے متعلق وہ دلائل جو فروری سنہ ۱۹۰۲ء کے رسالہ "پربدھ بھارت" میں پیش کیے گئے تھے درج کیے جاتے ہیں:-

اگر خدا اپنی دُنیا میں نہیں ہے تو ہمیں اسے کسی دوسری جگہ تلاش کرنیکی ضرورت نہیں۔ فی الحقیقت اور کوئی جگہ ہی نہیں جہاں اسے تلاش کیا جائے۔

اس مسئلہ سے اِس خیال کی تشریح ہوتی ہے کہ خدا کا وجود برہمانڈ سے باہر ہے اگر وہ برہمانڈ سے باہر ہے تو وہ لامحدود نہیں اس لیے خدا نہیں۔

اگر خدا سیارے کے اندر موجود ہے تو ضروری ہے کہ وہ ذرہ میں بھی ہو اگر نہیں تو اسکی اس صفت میں فرق آتا ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ یہاں پر ایک نہایت دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ذرہ خدا سے کسیقدر کم یا اس سے زیادہ درجہ رکھتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ کیا ذرہ ایک غیر ترقی یافتہ خدا ہے یا مرکب یعنی خدا یا کچھ اور چیز؟

اگر ذرہ غیر ترقی یافتہ خدا ہے تو وہ خدا کا جزو ہے کیونکہ وہ سالم خدا نہیں ہو سکتا۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ترقی کے مختلف مدارج کے اجزا سے مرکب ہے۔ اگر اس اُصول کو مان لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے وجود میں ترمیم اور اسکی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

اگر ذرہ خدا سے مختلف کچھ چیز ہے جس پر خدا کا وجود محیط اور اسکے اندر جان ڈالتا ہے تو اسکے لا انتہا اور ہر جگہ موجود ہونیکی صفت میں فرق آتا ہے ذرہ کا خدا سے مختلف ہونا اسے محدود کرتا ہے۔ خدا چونکہ ذرہ میں موجود نہیں اسلئے وہ اِن اجزا میں بھی موجود نہیں جن سے ذرہ مرکب ہے۔ اگر وہ ہوتا تو ذرے سے بھی جُدا نہوتا۔

غرض یہ کہ معاملہ کی دونوں صورتیں ناقابل تسلیم ہیں۔ اگر ہم خدا کو ترقی کن یا محدود سمجھیں تو اسکی خدائی صفات میں فرق آتا ہے۔

ایک فرقہ اِن سائنس دانوں اور مسئلہ ارتقا کے مویدوں کا پیدا ہو گیا ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا وہ نامعلوم کامل وحدانیت ہے جسکے دو پہلو مادی اور روحانی عالم ہیں۔

اگر ہم ان دونوں عالموں کا اِس نامعلوم کامل وحدانیت کے ساتھ اس قسم کا تعلق تسلیم کریں جیسا اس میں بتایا گیا ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس میں بھی یقیناً تبدیلی واقع ہوتی ہے اور اس سے خواہ کچھ اور ثابت ہوتا ہو مگر خدا کی صفت "خدائی" ثابت نہیں ہوتی۔

اسکی وجہ یہ ہو کہ سبب کی صورت اختیار کرتے ہوئے اس ذات نامعلوم کو وہ بننا پڑا جو وہ پہلے نہ تھی یعنی اس مین تبدیلی واقع ہوئی۔ تبدیلی ایک نتیجہ ہو جو واقعات کے شروع ہو کر ختم نہ ہونے والے سلسلہ مین ظہور پذیر ہوتا ہو جس نتیجہ نے اس ذات نامعلوم کو سبب بنایا اُسکا خود کوئی سبب موجود تھا اور بجائے خود نتیجہ رہ چکا ہوگا۔ علی ہذا القیاس اس سلسلہ کو لا انتہائی تک پہنچایا جا سکتا ہو۔ اس طرح پر اگر اس ذات نامعلوم مین کسی تبدیلی کا وقوعہ تسلیم کر لیا جائے تو وہ ایک اثر یا نتیجہ ثابت ہوتی ہو۔ گویا اسکی حالت متبدل ماننی پڑتی ہو جو واقعات کے شروع ہو کر ختم نہ ہونے والے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس صورت مین پھر اس ذریعہ کو جس نے اِس ذات نامعلوم مین تبدیلی پیدا کی جس کے باعث آخر الذکر نے نتیجہ کا درجہ حاصل کیا ایک ایسی صفت ماننا پڑتا ہو جیا تو اِس ذات نامعلوم کے اندر موجود تھی یا باہر۔ اگر اندر موجود تھی تو تبدیلی کا باعث اس ذات نامعلوم کی کوئی اندرونی ضرورت ہوگی۔ اگر خارجی تھی تو وہ ذات نامعلوم یقیناً کسی پر انحصار رکھتی ہوگی اور اسپر کسی قسم کا اثر یا دباؤ پڑ سکتا ہوگا۔ لیکن جسمین ضرورت کی وجہ سے یا دباؤ کے باعث کوئی تبدیلی ہو سکتی ہو وہ خدا نہین ہو سکتا۔

پس ہمین دو مین سے ایک بات ماننا پڑتی ہو یعنی یا تو مادیت یا مایا کا مسئلہ جس کا منشا یہ ہو کہ جو کچھ نظر آتا ہو یہ محض نظری دھوکا ہو اِس مسئلہ کو تسلیم کرنے والے اعتراف کرتے ہین کہ ہم برہمانڈ کی ابتدا کے متعلق کچھ نہین جانتے کیونکہ ہماری عقل ہمین یہ بتانے سے قاصر ہو کہ کیونکر اس کامل طور پر نامعلوم ذات نے روحانی اور مادی عالم پیدا کر دیے اور خود اِس عمل مین تلف نہ ہوئی۔ ہمین دو مین سے ایک کے حق مین فیصلہ دینا ہوگا۔ اگر ہم اول الذکر کے حق مین فیصلہ دین تو بھی ماننا پڑے گا کہ یہ برہمانڈ کا ظہور محض دھوکا ہے۔

ہم اِس بات کو تسلیم کرتے ہین کہ جہلا کے ہاتھون پڑنے کی وجہ سے اس مسئلہ نے بہت سی خرابیان پیدا کی ہین جہلا کے ہاتھ سے جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے۔

مایا کا مسئلہ ہمین سکھاتا ہو کہ جو کچھ ظہور مین آ رہا ہو اسمین سے کچھ بھی کامل طور سے حقیقی نہین لیکن ساتھ ہی کوئی بھی چیز نسبتاً غیر حقیقی نہین ہو۔ ہر ایک حالت یا ہر ایک چیز محض ظاہری ہو صرف اسکا وجود حقیقی ہو۔ لیکن ظاہرات کا عالم ہی قانون کا عالم ہو جب تک کوئی شخص کامل پاکیزگی، نیکی، ضبط، وخودداری کے ذریعے سے اندرونی روشنی کو جاگزین و جو نہ پہچان لے تب تک وہ طبقۂ ظاہرات سے باہر قدم نہین رکھ سکتا اور نہ کرم کے زبردست اور غلطی نہ کرنے والے قانون سے بچ سکتا ہو پس ظاہر ہو کہ اِن حالتون مین صرف جاہل لوگ ہی اپنی کمزوریون کے لیے مایا کی پناہ ڈھونڈ سکتے ہین۔

ہم دکھا چکے ہین کہ تیاگ جو ہندو تہذیب کا اُصول ہو براہ راست مایا کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہو اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر ہم بعض ادہام نتائج کا جو اس سے پیدا ہوتے ہین ذکر کرنا ضرور سمجھتے ہین۔

زندگی مین کوئی بات کامل طور پر بُری یا جزوی طور پر اچھی نہین ہو کیونکہ تمام چیزون کے عنصر حقیقی کے علاوہ جو لا محدود اور ناقابل بیان ہو اور کچھ کامل طور پر حقیقی نہین ہو۔ ہر ایک ظہور کو اگر اسکی حقیقی قدر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اسکے ہمیشہ بدلتے رہنے والے نظر فریب لباس سے قطع نظر وہ حقیقت مین وجود لا محدود ہو۔ اس اعتبار سے اس نہ ختم ہونے والے برہمانڈ مین کوئی چیز ایسی نہین جس کا اپنے باعثِ وجود سے برکت حاصل کرنا یقینی نہ ہو۔ لامحدود اُمید نہ ختم ہونے والی طاقت، خارج از حدود تکمیل، سب کا قدرتی استحقاق ہو، اور اس استحقاق کو سب تک پہنچانا ہی مسئلہ ارتقا کی جان ہو۔

مایا کا سوال اخلاق کے بنیادی اُصول کو قائم کرتا ہو۔ کیونکہ وہ

تفریق اور ظہور پرستے حقیقت کا احساس ہٹا کر اسے اس ناقابل تقسیم ذات پر ڈالتا ہو جو سب کے اندر ایک ہے۔ اخلاق سے عاری ہونے کا امکان اس تفریق کو تسلیم کرنے پر منحصر رکھتا ہو کہ کسی دوسرے شخص پ کو ضرر پہنچاتا ہو کیونکہ وہ جانتا ہو کہ وہ اس طرح اپنے آپ کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ مایا کے مسئلہ کی روسے یہ تفریق محض ظاہری ہو حقیقی نہیں۔ ظاہری پہلو پر زور دیکر وہ حقیقی سے جُدا ہو جاتا اور اس طرح اپنے آپ کو ضرر پہنچاتا ہے۔

کیا وجہ ہو کہ ایک شخص اپنے ہمسایہ سے اپنے برابر محبت کرے؟ اسلیے کہ اِسکی اور اُسکی حقیقت دراصل ایک ہی ہے۔

یہ مسئلہ دوسرون کو نجات دلانے، کسی قوم کے شاہی اختیارات تسلیم کرنے، یا ایک کو دوسرے سے برتر و بہتر سمجھنے کے اُصول کو سختی سے رد کرتا ہو۔ اسکی روشنی مین جو کام کیا جائے وہ صرف ایک ہی معنی رکھتا ہو یعنی یہ کہ انسان خدمت کر رہا ہے، اس ذات واحد کی خدمت جو لا انتہا صورتون مین موجود ہے۔ مایا کو ماننے والا کسی کی شخصی فضیلت، خدائی اوصاف، دوسرون کو حقیر و گنہگار تسلیم کرنا ان باتون کا مطلق قائل نہین۔ وہ تو فطرت انسانی کی نیکی پر بے انتہا اعتقاد رکھتا ہے اور کل بنی نوع کے لیے لامحدود خیرات کا معترف ہے۔

تیرتھ رام

ذات کی اصلیت و ماہیت

جملہ اقوام ایک قسم کی سوسائٹی مین منقسم ہین کوئی سوسائٹی بڑے پیمانے کی ہو اور کوئی چھوٹے پیمانے کی سوسائٹیان بہت کم ایسی ہونگی جن پر "ذات" کا لفظ اچھے یا بُرے معنون مین عائد نہ کیا گیا ہو۔ پرتگالی زبان مین یہ لفظ محض "خاندان" کے معنی مین مستعمل تھا۔ موجودہ یورپین زبانون مین استعمال کیئے جانے سے پہلے اس لفظ سے طبقات کی وہ تقسیم مراد تھی جو ہندو سوسائٹی مین پائی جاتی تھی۔ زبانِ سنسکرت مین اِس لفظ کا مترادف ورن یا برن ہے۔ برن سے مراد رنگ ہے۔ الفاظ جات، کل، پروار، کرن وغیرہ الفاظ کا بھی کم و بیش یہی مطلب ہے۔ چنانچہ اس مضمون مین جہان کہین کوئی ایسا امر نظر آیا جس سے ہندو "ذات" کے کسی حصہ کا خیال پیدا ہو وہان بلا خیال عمر، قوم، مقام، یا تمدنی مراسم کے لفظ ذات ہی مستعمل ہوا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہی رلطائے ہے کہ کاریگرونکے وہ طبقے جنکی نسبت کتبون سے ظاہر ہوتا ہے کہ روم کے زمانہ مین برطانیہ مین موجود تھے عملاً ایک قسم کی ذات ہی تھے کیونکہ تھوڈوسین قانون کے مطابق لڑکا اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرنے کے لیئے مجبور تھا اور جس خاندان مین شادی ہوتی تھی اُس خاندان کا پیشہ اختیار کرنا لازمی بات تھی۔ لیکن کاریگرون کے یہ طبقے اِن اختیاری جماعتون کے پیشرو تھے جو حرفت اور تجارت کے باضابطہ انتظام و ترتیب کے لیئے قائم ہوئی تھین۔ بعد کو یہ جماعتین "گِلڈ" اور "کرافٹ گلڈ" کے نام سے موسوم ہوئین جنمین کاریگرون کے لڑکون کو بطور شاگرد شریک ہونے مین زیادہ آسانیان اور فوائد تھے۔ لیکن انمین لائق اجنبی بھی داخل کر لیئے جاتے تھے، اور اس تمدنی آمیزش کی وجہ سے انمین باہمی مناکحت بھی ہوتی تھی۔ پیشہ ور جماعتون کی ساخت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دراصل اسلیئے قائم کیگئی تھین کہ غیر لوگونکی شرکت کا سدِ باب کرین۔

لیکن سیکسن زمانہ مین ذات کے ٹھیک معنون مین ذات کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ جس کاشتکار کے پاس ایک بیگہ زمین ہوگئی وہی زمیندار ہو جاتا تھا۔ جون جون اسکی ثروت بڑھتی تھی اسکا اقتدار اور زمہ داریان بھی بڑھتی جاتی تھین۔ اہلِ ثروت کی نوعیت کی

کوئی تعریف یا توضیح نہ تھی۔ جہانتک رسم و دستور سے تعلق ہی اہل ثروت سے مراد وہ شخص تھا جو خواہ ترکہ خواہ جاگیر سے بڑھا ہو۔ چنانچہ ایک سرسبز اور کامیاب سوداگر "ارل" کے درجہ تک پہنچ سکتا تھا۔

بیان کیا جاتا ہی کہ اس بارے مین جرمنی کی ابتدائی تاریخ تاریخ انگلشیہ کی متضاد تھی۔ جرمنون کی اُن فوجی جماعتون مین جو "ڈمینسٹ مینن" کے قدیم طبقہ سے پیدا ہوئین اصلی ذاتین موجود تھین۔ ان مین خواص جنٹلمین یا سپاہی ہونے کے لئے یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ وہ کسی بہادر کی اولاد مین ہے۔ غیر جنگجو آبادی "لورنس مینڈ" کے نام سے موسوم تھی تجارت پیشہ گروہ کی ایک خاص ذات تھی جو "برگر شینڈ" کہلاتی تھی۔ اسمین شک نہین کہ کسی نہ کسی وقت اکثر ممالک مین پیشہ موروثی سمجھا جاتا تھا پر سکاٹ صاحب فرماتے ہین کہ پیرو مین ہر چند عام قاعدہ یہ تھا کہ ہر شخص کو اپنے تئین مختلف فنون سے ماہر کرنا چاہیے لیکن بعض اشخاص کو بڑی احتیاط کے ساتھ صرف ان پیشونکی تعلیم دیجاتی تھی جو زیادہ متمول گروہ کی خدمت کرتے تھے۔ پیرو مین یہ پیشے دیگر پیشون اور عہدون کیطرح ہمیشہ موروثی ہوتے تھے۔ اس خاص معاملے مین ذات کی تقسیم ٹھیک ویسی ہی تھی، جیسی ہندوستان یا مصر مین پائی جاتی تھی۔ زورٹیا بیان کرتا ہی کہ میکسیکو مین کوئی شخص اسوقت تک تجارت نہین کرسکتا تھا تاوقتیکہ اُسے وراثتاً یہ حق نہ پہنچا ہو، یا پبلک نے اجازت نہ دی ہو۔ فجی کے نجاران کی ایک جداگانہ ذات ہی، اور جزائر ٹونگا مین تمام پیشے سوائے گودنا گودنے والون اور حجامون کے موروثی ہوتے تھے مختلف طبقے یا گروہ ماتابولی، موما، توعا کے نام سے مشہور تھے۔ اگر تعلیم عامہ کا کوئی باقاعدہ انتظام نہو تو یہ ایک قدرتی بات ہی کہ باپ اپنے بیٹے کو اپنا پیشہ سکھاتا ہے۔ اس سے باپ کو کم خرچ کرنا پڑتا ہی، اور لڑکے کو معاش حاصل کرنے مین آسانی ہوتی ہی اور لڑکا کاریگر کے باپ کا نام یا شہرت ترکہ مین حاصل کرتا ہی۔ معمولی پیشون مین مستقل فنون کی عظمت بہت بڑی تھی، اور جو دستور کسی زمانہ مین بالعموم تمام جماعتون مین جاری تھا وہ ان جماعتون کے گروہون مین اب بھی موجود ہی لیکن جبتک یہ طریقہ قدرتی طور سے قائم ہی۔ اسمین کوئی شک نہین کہ یہ گروہ ایک قسم کی ذاتین ہین۔ کیونکہ ذات کا مقصود یہ ہی کہ نیا پیشہ اختیار کرنا نہ صرف خلاف دستور ہی بلکہ غلط اور قابل تعزیر ہی۔ ذات کا لفظ مذہبی جماعتون پر بھی عائد ہوتا ہی۔ ایک خاندان یا ایک طبقہ ایک خاص معبد یا ایک خاص دیوتا کے کل معبدون کی خدمت کے لیے وقف ہوتا ہی۔ اس فرقہ سے پروہتون یا بارڈون یا بھاٹون کی قسم کا ایک نیم مقدس گروہ قائم ہوا ہی، اور شاید یہ چند خاص خاص ممتاز پیشے موروثی ہوتے ہین باقی پیشے آزاد رہتے ہین۔ مثلاً پیرو مین کزکو کے سورج کا پجاری اپنا عہدہ اپنے بیٹے کو دے جاتا تھا۔ اسیطرح پبلک رجسٹرارون، عالمون، اور رگوئیون کا پیشہ موروثی ہوتا تھا۔ بنجمین کانسٹنٹ صاحب بیان فرماتے ہین کہ جوڈیا اور میکسیکو کیطرح جنوب مین اس قسم کے پیشے موروثی ہوتے تھے، لیکن شمال و مغرب مین عام انتخاب سے پیشے یا عہدے دیے جاتے تھے۔ بہت سے ممالک مین پولٹیکل وجوہ یا قومی تفرق کے باعث مختلف گروہون مین باہمی مناکحت کی ممانعت تھی۔ روم اور اسپارٹا مین شرفا رذیل فرقون سے شادی نہین کرسکتے تھے۔ گوئٹلا مین یہ قانون تھا کہ اگر کوئی شریف مرد کسی رذیل عورت سے شادی کرے تو وہ "مزیکول" یعنی نیچ ذات مین شمار کیا جاے۔ ایسے شخص کو وہ ٹیکس دینے اور وہ خدمات انجام دینی پڑتی تھین جو اُس گروہ کے لیے مقرر تھین، اور اُسکی جائداد کا بیشتر حصہ شاہی ضبطی مین آجاتا تھا۔ مالاگیسی کے باشندے چار درجون مین منقسم تھے یعنی (۱) شریف (۲) سپاہی (۳) سوداگر (۴) رذیل۔ انمین باہمی مناکحت کی سخت ممانعت تھی۔ کسی زمانہ مین تمام اقوام غیر ملک والون سے شادی بیاہ کرنے کی مخالف تھین جن کو وہ عموماً دشمنون کے نام سے پکارتے تھے۔ اور جملہ اقوام نے اُن تمام اقوام کو ستایا ہی جن پر انھون نے قبضہ پایا۔ ایک لحاظ سے غلامی سب سے ارذل ذات ہی کیونکہ بسا اوقات

اپنی اصلی صورتون مین وہ غلامون کو چند خفیف رسمی حقوق دلاتی ہے۔ ایک دوسرے بجاظسے ایک ملکہ کی بیٹی کے ساتھ ایک معمولی شخص کی شادی ذات کے قواعد کی خلاف ورزی قرار دی جاسکتی ہے۔

ذات کی صورتون کے علاوہ بہت سی متفرق جاعتین ہین جو اس لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہ ہین کہ ان کے ممبر متواتر آپس ہی مین شادی کرتے ہین اور بالعموم ایک خاص پیشہ یا کام کرتے ہین۔ مناکحت کا یہ دستور ابتدائی معاشرتی نظام کی خصوصیات مین داخل تھا، اور اسوجہ سے یورپ اور ایشیا کی رسمی سوسائٹیون کے موجودہ نمونون مین کوئی اعلیٰ قسم کی تہذیب نہین پائی جاتی ہے۔

منجملہ ایسی بہت سی سوسائٹیون کے مندرجۂ ذیل سوسائٹیان قابلِ بیان ہین۔ "بونٹی" باغیون کی اولاد جو جزیرہ پٹکرن مین اب بھی مقیم ہے ہوا تون کی ایک جماعت جو کوہ ننگر پر سوراجیا کے متصل رہتی ہے۔ اسکی تعداد بارہ سو ہے جو تقریباً چالیس مواضعات مین تقسیم ہے اور اب بھی قدیم ہندو مذہب کی پیروی کرتی ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کے مختلف ماہی گیر مواضعات اور فرانس مین بھی اسی قسم کی جاعتین پائی جاتی ہین۔ جہانتک باہمی مناکحت سے تعلق ہے باشندگان آئسلینڈ اور مرفہ الحال یہودی ذات کے لقب سے موسوم کیے جاسکتے ہین۔ اس سے یہ نہین سمجھنا چاہیے کہ اس قسم کی مناکحت کا تمدنی ترقی کی ایک خاص حد کا عام خاصہ ہے۔ "ایکسوگیمی" یعنی اس قسم کی مناکحت کا دستور جسکی رو سے ایک اجنبی کے ساتھ قطعاً یا چند خاص صورتون مین شادی ہوسکتی ہے حال کے گروہون مین بالخصوص ایشیا مین بہت وسعت کے ساتھ اب بھی مانا جاتا ہے اور ان دونون صورتون کہ قبل وہ ابتدائی حالت تھی جسمین اجناس کے تعلقات خلط ملط تھے۔ کوہ سینٹ الیاس سے دریائے ناس تک سواحل اور جزائر مین تھلنکیٹون اور کولسیچون کی ایک قوم آباد ہے جسمین باقاعدہ غلامی کا طریقہ جاری ہے اور جن کا سردار بذریعہ انتخاب مقرر ہوتا ہے۔ اس عجیب و غریب قوم کی دو ذاتین ہین جو گرگ اور زاغ (رود لف ایلڈ ریون) کے نام سے مشہور ہین انکی شناخت یہ ہے کہ ان کے مکانات، کشتیون، کپڑون، ڈھال وغیرہ پر یہ علامتین تحریر یا منقوش ہوتی ہین۔ ذات گرگ کئی شکمی ذاتون یعنی ریچھ، عقاب، ماہی آدم، شارک اور رالکا مین منقسم ہے۔ زاغ کی ذات مین مینڈک، ہنس، دریائی شیر، اُلّو اور سالمن مچھلی شامل ہین۔ ایک ذات اپنی ذات والے سے شادی نہین کرسکتی چنانچہ یہ لازمی بات ہے کہ گرگ زاغ سے شادی کرے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آج زاغ ذات کی لڑکی سے گرگ ذات کے لڑکے کی شادی قرار پائی ہے اور کل داماد اپنے خسر سے کسی سوروپیہ کے قرض پر کھچ وصول کر رہا ہے۔

ہندوستان مین مسئلہ ذات تاریخی دلچسپی سے بڑھا ہوا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے گورنمنٹ اور مصلحون کے راستہ مین دشواریان پیدا ہوتی ہین۔ لیکن رابرٹسن صاحب اور ڈوبائے صاحب اور ان کے دیگر ہمخیال صاحبان ذات کے سلسلہ کو تمدنی امن کا بہت بڑا محافظ سمجھتے ہین اور اسوجہ سے ذات بعض اُن علوم و فنون اور پیشونکی ترقی کے لیے ازحد ضروری ہے جو درحقیقت ہندوؤن نے کی ہے۔ مگر بعض اہل الرائے (مثلاً جیمس مل صاحب) اسکو بُرا قرار دیتے ہین۔ ان کی رائے مین سلسلہ ذات بہت بڑی پولٹیکل غلطی ہے جو آزادانہ مقابلہ اور منفردہ راحت کی دشمن ہے۔

مسٹر کولبرگ جو معاملات ہند پر ایک مستند شخص سمجھے جاتے ہین، اس خیال کی تردید کرتے ہین۔ سنہ ۱۸۹۷ء مین آپ نے یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ جو شخص اپنے پیشہ سے معیشت حاصل نہین کرسکتا، وہ ایک کمتر یا افضل پیشہ اختیار کرسکتا ہے، تحریر فرماتے ہین کہ "روزمرہ یہ امر مشاہدہ مین آتا ہے کہ برہمن تک شودرون کا ذلیل پیشہ کرتے ہین۔ ہم سب واقف ہین کہ تمام قومین کلبون، سوسائٹیون یا گروہون مین منقسم ہین، جنمین اسی ذات کے مختلف لوگ ایک محدود دائرہ

ہیں رہتے ہیں۔ اور یہ کلب یا آلاج مختص قواعد یا دستورات یا ضمنی قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ چند مستثنیات کے علاوہ تمام پیشے ہر قسم کے آدمیوں کے لیئے کھلے ہوتے ہیں، اور مذہبی وجوہ سے جو رُکاوٹیں پائی جاتی ہیں، وہ اُن رُکاوٹوں سے زیادہ سخت نہیں ہیں جو برطانیہ عظمٰی میں قوانین یونیورسل اور کارپوریشن کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں۔ بنگال میں جو لوگ کسی خاص پیشہ میں داخل ہونے کے لیئے درحقیقت تیار ہیں وہ ہر چیز کی ساخت کی غیر محدود توسیع کے لیئے کافی ہے۔" اس امر کی الفنسٹن صاحب بھی تائید کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں: "اگرچہ مجھے ہندوستان کا ایک طولانی اور بسیط تجربہ ہے، لیکن میں نے کبھی نہیں سُنا کہ کوئی شخص اپنے پیشہ کے باعث ذات سے گرا دیا گیا ہو۔ اِس امر کی توضیح برٹش فوج کے تجربہ سے ہوتی ہے جسمیں تمام ذاتوں کے لوگ بھرتی ہیں۔ موجودہ ذات کی نسبت عام خیال یہ ہے کہ اسمیں شادی بیاہ، پیشہ اور تمدنی مراسم خصوصاً اکل و شرب کے متعلق چند قیود اور رُکاوٹیں ہیں۔ لیکن یہ امر کہ کہاں تک باہمی مناکحت کی اجازت ہے؟ اور اِس شادی کا جسکی اجازت ہے لیکن بیقاعدہ سمجھی جاتی ہے کیا اثر پڑتا ہے؟ اور ممنوعہ شادی کی کیا سزائیں ہیں؟ آیا جو قواعد حرفت و تجارت کے محافظ ہیں وہ اپنے اثر میں ایک قسم کے اتحاد کیلئے ہیں یا کسی اور غرض سے؟ کن وجوہ سے ذات جاتی رہتی ہے؟ اور کن صورتوں میں پھر حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ سب ایسے سوالات ہیں جنکی نسبت بہت کم صاف اور اصل واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔" یہ امر قابل بیان ہے کہ وید و نیز چند برہمی عقائد اور اخلاق کی وسیع عمارت کھڑی ہے۔ ذات کے آئندہ قواعد کی بابت کچھ ذکر نہیں۔ ایک فقرہ جو اِس باب میں وارد ہوا ہے "پرس سکت" ۹۰ بھجن، دسویں اسکندھ، رگوید سنتھیا میں درج ہے: "جب اُنھوں نے آدمی کو تقسیم کیا تو اُسے کتنے بنائے؟ اُس کا مُنہ کیا تھا؟ اُس کے بازو کیا تھے؟ رانوں اور پیرون کو کیا کہتے ہیں؟ برہمن اُسکا مُنہ تھا۔ راجہ اُس کے بازو سے بنائے گئے، ویش اُسکی ران سے اور شودر اُن کے پیروں سے پیدا ہوا۔"

ہگ صاحب اِس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "برہمن معلّم تھے اور چھتری سپاہی تھے۔ لیکن یہ بات وید کے بھجنوں کی صاف اور سیدھی سادی زبان اور نیز اِس امر کے خلاف ہے کہ تخلیقِ عالم کے حالات میں آدمیوں کے گروہوں کے علاوہ بہت سی چیزوں کی پیدائش اسی خیالی طریقے سے جسم الٰہی کے حصّوں سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ امر پُرانوں اور منوجی کے "دھرم شاستر" ہی میں پایا جاتا ہے جو بداہتاً الہامی ہونے کا ادعا نہیں کرتے"۔ جہان وہ وید کے الفاظ کے مخالف ہے، اور جس کی عبارت سے وہ کل باتیں جو ذات میں قابلِ اعتراض ہیں، درج ہیں۔ لیکن خود وشنو پران میں ذات کی روایت میں چار گروہوں کا ذکر ہے جو ابتدا میں مذہبی عقیدے کی رو سے قائم ہوئے تھے "جبتک کل انسانی نسل قعرِ گناہ میں نہیں گری تھی، اُسوقت تک گروہوں کے جُداگانہ تمدنی فرائض مقرر نہیں کیئے گئے تھے۔ اِس بھجن میں برہماجی کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، اور لکھا ہے کہ ست (حق) اُن کے مُنہ سے پیدا ہوا۔ رج اُن کے سینے سے، تم (تاریکی) ان کی رانوں سے، اور "باقی" کو اُنھوں نے اپنے پیروں سے پیدا کیا۔ ان میں سے ہر ایک گن (وصف) کے لیئے ایک ہزار جوڑے مذکر اور مؤنث پیدا کیئے گئے، جن کو مختلف لوگ معراج پر اچیتی، اندر، ماروت، اور گندھرپ سپرد کیئے گئے۔ گن سے متعلق یگ یعنی قرن ہیں۔ اول کرت ہے جس سے راستی اور پاکیزگی کا تابناک زمانہ مراد ہے۔ دوم تریتا یعنی دانشمندی کا زمانہ۔ سوم دوا پر یعنی تاریکی کا زمانہ۔ نبسن صاحب کا خیال ہے کہ "اِس روایت میں کہ تریتا یگ (جگ) کے فاتحِ اعظم پرورا نے ذاتیں قائم کیں تاریخی عنصر نہیں پایا جاتا ہے۔ یگ مشکل تاریخی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ وایو پران میں صاف لکھا ہے کہ ذاتیں تریتا جگ میں قائم ہوئیں۔ اوّل جگ کے کامل لوگ جنمیں بعض خاموش، بعض غصہ ور، بعض چست و چالاک اور بعض مضمحل اور پریشان تھے تریتا جگ میں برہمنوں وغیرہ کی طرح

اپنی سابقہ پیدائش کے نیک و بد اعمال کے مطابق پھر پیدا ہوئے۔" اِسی مجھن میں سمجھایا گیا ہے کہ اُسوقت انتظام اچھا نہ تھا۔ لہذا دوسرا انتظام کیا گیا جسکی رو سے زور، مجرمون کا انصاف، اور جنگ کی خدمات چھتریون کے سپرد کیگئیں۔ رسوم کی بجاآوری متبرک کتب کا مطالعہ، اور قبول نذر کا کام برہمنون کے سپرد کیا گیا۔ تجارت، مویشی، اور زراعت کے کام ویشیون کے سپرد کیے گئے۔ کارگری کا کام اور ادنیٰ خدمات شودرون کے حوالے کی گئیں۔

رامائن کے اشلوکون سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ چار بڑے جگون مین ذاتین علی الترتیب دھرم کی حالت کو پہنچتی ہین۔ مثلاً جو زمانہ دشیون کی نجات کے لئے موزون ہے اُسمین ایک شودر ہزار نفس کشی سے بھی پاکباز (دھرم والا) نہین ہو سکتا۔

برہما سے چارگانہ پیدائش کے قصے کے بالکل خلاف، یہ روایت ہے کہ ذاتین خود منوجی سے پیدا ہوئین جو برہما سے بہت سے دیوتاؤن اور اوتارون کی کئی پشتون کے بعد پیدا ہوے تھے۔

سانتی پران مین بھی یہی بیان ہے کہ دُنیا مین شروع شروع مین سب برہمن تھے۔ صرف انسان کے اعمالِ بد سے ذاتون مین تقسیم کر دیئے گئے۔ چند نیک اور بد اعمال کی مزاولت کا نام ذات ہے۔ منی (یعنی وہ لوگ جو بلا امتیاز پیدا ہوئے ہین) اکثر ترقی کر کے برہمن ہو جاتے ہین، اور برہمنون کی اولاد کمتر در برہمن ہو جاتی ہے۔ اِس کے متعلق ایک قول یہ بھی ہے کہ "اگر تم انسان کو محض اسکے اعمال کی وجہ سے برہمن تصور کرتے ہو تو اصل و نسل بیکار ہے، تاوقتیکہ اُس کے عمل سے ظاہر نہ ہو کہ وہ برہمن تھے" لیکن ذات کا یہ تغیر صرف دوسرے جنم سے ہوتا ہے نہ کہ اُس زندگی مین جو وہ نیک اعمالی مین بسر کر رہا ہے۔ ذات کی اصلیت کے متعلق ایک دوسرا شاعرانہ خیال ہری بنس مین ظاہر کیا گیا ہے۔ "برہمن ایک ناقابلِ زوال عنصر (اکشر) سے پیدا کیے گئے۔ چھتری ایک قابلِ زوال عنصر (کشر) سے پیدا کیے گئے۔ ویش انقلاب سے، اور شودر دھوئین سے۔"

مندرجۂ بالا تمام باتون کا مطلب یہ ہے کہ ذات کی اصلیت و ماہیت کے بارے مین بہت متضاد بیانات ہین اور انہین سے اکثر صاف طور سے سمجھ مین نہین آتے۔ تخلیقِ عالم کے قصے مین ذات بہت دن بعد کی ایک داستان ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ مختلف دیوتاؤن کے مختلف اعضا سے پیدا ہوئی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ منوجی سے کوئی کہتا ہے اصل سے۔ کوئی کہتا ہے نیستی سے ہست مین لائی گئی۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ذات بھی انسان کی پیدائش کے ساتھ وجود مین آئی، جو کرت جگ مین بحالتِ کمال موجود تھی، لیکن بعد کو زوال مین آگئی۔ یہ بھی بیان ہوا ہے کہ پہلے صرف برہمن تھے، دوسرے لوگ بعد کو ہوئے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جب وید مدون ہوئے تھے تو بہت سے آدمی جو برہمن نہ تھے پجاریون کے طور پر کام کرتے تھے، اور ریاضت کیش عابد اپنی تپشیا کے ذریعہ سے ادنیٰ درجے سے برہمنون کے درجہ کو پہنچ جاتے تھے۔ ابتداءً جماعت کے تمام گروہ اپنی عبادت اور ریاضت سے خدا تک پہنچ سکتے تھے۔

جون جون برہمنون کے ملکی اختیارات بڑھے، اُنھون نے مذہب کو ایک جُداگانہ اور مقدس کام بنا دیا۔ ہم ان کو وراثتِ تخت کے مسائل حل کرتے اور اپنے فیصلون کا نفاذ کراتے دیکھتے ہین۔ قدیم لٹریچر مین بہت سی مثالین پائی جاتی ہین جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ برہمن چھتریون سے تعلیم پاتے تھے۔ لیکن پرانون اور منو شاستر مین اُن چھتریون کے لیے جو برہمنون کی اطاعت نکرین موت کی سزا لکھی ہے۔ چنانچہ بہ استر جو ذات کے چھتری تھے برہمنون کی اطاعت و تعظیم کے صلے مین در اصل برہمن کر دیئے گئے۔ یہ یقینی امر ہے کہ بہت سی قدیم روایات برہمنون نے اِس لیے گڑھ لی ہین کہ اصالت اور حصولِ نجات کے معاملہ مین چھتریون پر اُن کی فضیلت قائم رہے۔ اب ہم اُن قیاسات کا اندازہ کر سکتے ہین جو برہمنون کی ذات کی اصلیت

کے بارے مین قائم کیے گئے اور منو شاستر مین درج ہین۔ جیمس مل صاحب ہو سائٹی کی قدیم حالت کے اثر کو ہمیشہ کم وقعتی کی نگاہ سے دیکھا کیے۔ لکھتے ہین "ذاتون کی تقسیم کسی الہامی شخص یا واضع قانون یا مصلح قوم کا کام تھا، جو اُن فوائد سے آگاہ تھا جو محنت کی باقاعدہ تقسیم سے مرتب ہوتے ہین۔ ذاتون کی محکومی کو وہ اُس راسخ الاعتقادانہ تخویف اور قوت پر منسوب کرتے ہین جو مذہبی گروہ کی قدرت اور عظمت قائم رکھنے کیلئے اکثر کام مین لائی گئی۔ بلائے آسمانی کے بعد لوگ جنگ کی خونریزیون سے بالطبع ڈرتے تھے۔ چنانچہ برہمنون کے بعد فوجی گروہ نے جگہ پائی۔"

ہیرن اور کلیر تھ وغیرہ صاحبان کی رائے ہو کہ ذات کی تقسیم نسل کے اصلی اختلاف پر مبنی ہو اور اعلیٰ درجہ کے لوگ نہایت خوبصورت ہوتے ہین۔ برہمنون کا صاف نقشہ اور سڈول چہرہ شودرون سے اُسی طرح ممیز کیا جا سکتا ہو جسطرح اسپین کے سرپولی اہل پیرو سے ممیز ہو سکتے ہین۔ برہمنون اور دیگر ہمجنس اقوام کی اونچی پیشانی، قوی جسم، ہلکا مسی رنگ نیچ ذاتون کی قدرے پست اور چوڑی کھوپڑیون دبیے بن اور سیاہ تانبے کے رنگ سے بالکل جداگانہ ہوتا ہو۔ یہ بیان ظفرمندی کی اُس روایت سے منطبق ہو، جو اونچی ذات والون نے نیچ ذات والون پر حاصل کی۔ اسمین شک نہین ہو کہ ہلکے رنگ کی تین ذاتون (زری دار رنگ) مین سفید رنگ کے برہمنون، سُرخ چہرے والے چھتریون اور زرد چہرے والے ویشون کا قدیم ہجون اور برہمنون مین آریون کے طور پر ذکر ہوا ہو۔ سنسکرت دان فاتح سیاہ رنگ کے تورانی اصلی باشندون داسون سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ اصل مین آریہ جس کے معنی نجیب شریف کے ہین سنسکرت مادہ "آر" سے نکلا ہو جس کا مطلب خانہ دار (گرہست) ہو اور سب سے بڑی قوم یعنی ویشون کا اصلی نام یہی تھا۔ راجحہ صاحب اپنی تصنیف "برہما اور برہمن" مین فرماتے ہین کہ "ویدک لوگ اپنے وطن پنجاب سے آگے اور اصلی باشندونکو پہاڑون پر بھگا کر اس ملک پر قبضہ کر لیا جو گنگا جمنا اور کوہستان وندھیا کے مابین واقع تھا۔ اس ابتری اور پیچیدگی کی حالت مین اُن لوگون کے ہاتھ مین قدرتی طور پر قوت آ گئی جن کو کوئی صریح اختیار نہ تھا یعنی مختلف راجاؤن کے خانگی پجاری مالک ہو بیٹھے۔ اُنھون نے شودرون کو بطور مفتوح قوم کے تصور کیا جو شاید اُس آرین خاندان کی ایک شاخ تھے جو اُن سے بھی پہلے ترکِ وطن کر کے ہندوستان کو آیا تھا۔ آخر الذکر قیاس اس امر کے خلاف ہو کہ شودرون کو وید کی تین بڑی قربانیون مین شرکت کی اجازت نہ تھی۔ بھگت پران مین صاف طور پر اُنھین اجازت ہو کہ وہ منترون کے بغیر قربانی کر سکتے ہین۔ اسمین شودرون کے فرائض لکھے ہین جن کا تعلق برہمنون اور گاؤن سے ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اگر وہ غیر خون والے کی قوم کے ہوتے تو اُن کو یہ اجازت نہ ملتی۔"

مگر جب تک یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ فاتح قوم مین پیشتر سے بڑائی چھوٹائی کے درجے قائم تھے یہ بات سمجھ مین نہین آتی کہ جنگجو فرقے نے جسکو فتوحات کا مالک کہنا چاہیئے، برہمنون کے درجہ سے کمتر درجہ کیونکر قبول کیا۔ شودرون کی حالت و حیثیت سے یہ خیال ہوتا ہو کہ وہ مفتوح تھے۔ لیکن اس تفریق کے قوی تاریخی وجوہ ہین کہ برہمن اور شودر مختلف اقوام سے تعلق رکھتے تھے یا دونون مین سے کوئی ایک قوم پر محدود تھے۔ میزس صاحب نے اس تفریق مین خفیف تبدیلی پیدا کی ہو۔ وہ فرض کرتے ہین کہ "بجائے ایک فتحمندی کے متواتر دو تارک الوطنیان ہوئین۔ اول تارک الوطنون کو دوسرے تارک الوطنون نے زیر کیا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے فاتحون اور اصلی باشندون کے درمیان ایک متوسط درجہ مین قائم ہوئے یا اگر اصلی باشندے نہ تھے تو دو تارک الوطن قومون کے میل سے ایک درمیانی درجہ قائم ہو گیا۔" اسیطرح مسٹر ٹالبوائز وہیلر کی رائے ہو کہ شاید شودر اُس قوم کے اصلی فاتح تھے جو اب پاریا کے نام سے مشہور رہے۔ اِن سب بیانات سے ظاہر ہوتا ہو کہ ذات کا موجودہ نظام کس طور سے ایک مین سے

دوسری زمین کو اور ایک وطن سے نوآبادیوں کو منتقل ہوا" اور اسکی کئی صورتوں میں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ حالانکہ جنگی فتحمندی سے اکثر غلامی رائج ہوجاتی ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ پجاریوں کا رتبہ بلند ہوجائے۔ بڑے بڑے تاریخی واقعات یا بڑے قومی حالات یا نظامِ تمدن کے کسی کارساز کی موجودگی تسلیم کرنا اصولِ سائنس کے خلاف ہے۔

نجمن کا فسٹنٹ صاحب کا قول ہو کہ "ذات کا نظام دو چیزوں پر مبنی ہو۔ ایک یہ مذہبی خیال کہ بعض لوگوں پر وہ داغ لگا ہوا ہو جو مٹ نہیں سکتا اور دوسرا وہ تمدنی خیال کہ بعض کام صرف بعض فرقے ہی کرسکتے ہیں۔" شرع موسوی میں جسمانی طہارت کے خیال کو بڑی وقعت دیگئی ہو چنانچہ ایسنس کے خانگی قواعد جو چار درجوں میں منقسم تھے اور برہمنوں کی فضول قاعدوں سے بالکل متشابہ ہیں۔ چونکہ تجارت و صنعت پیشہ لوگوں کے روزانہ اختلاطات سے ایسے بیشمار مواقع پیدا ہوتے ہیں جبکہ اصلی یا فرضی نجاست کا دھبہ لگنا ممکن ہو اسلئے مذہبی گروہ کی قوت خواہ مخواہ نہایت وسیع ہوجاتی ہو کیونکہ وہی لوگ طہارت کے قواعد اور ان کے انحراف کی سزائیں تجویز اور نافذ کرتے ہیں۔

مکلیوڈ صاحب نے بھی دو مفید باتیں بیان کی ہیں جو ذات میں داخل ہوتی ہیں "اول دنیا میں جو جگہ متعین کیگئی ہو وہ خدا کے حکم سے ملی ہو دوم دنیا میں آرام اور باہمی راحت حاصل کرنے کے لیے ہمدردانہ شرکت اور امداد کی اشد ضرورت ہو" اسمیں شک نہیں کہ ہندو طبائع نہایت ہی مذہبی ہیں اور اسوجہ سے وہ بالطبع پروہتی کیلئے تیار رہتی ہیں۔ ان کو اپنے قومی بھجنوں سے سرگرمانہ گرویدگی تھی جنمیں سے بعض کی وجہ سے ان کو فتحمندیاں حاصل ہوئیں۔ بعض بھجن قدرتی سودمند موثرات سے متعلق تھے۔ صرف پجاری ان بھجنوں کو پڑھ سکتے ہیں اور یہ یقین کیا جاتا تھا کہ تلفظ کی ذراسی بھی غلطی دیوتاؤں کی ناراضگی کا باعث ہوتی ہو لیکن روحانی حکومت کی شرائط خواہ کیسی ہی آسان اور مفید ہوں مگر برہمنوں نے محض قدرتی ذریعہ سے فضیلت حاصل نہیں کی بلکہ سخت مجادلہ و مقاتلہ کو کام میں لاکر عروج پایا۔ بیان کیا جاتا ہو کہ پرسرام نے جو برہمنوں کے بڑے نامی سورما تھے تین مرتبہ چھتریوں سے ساری گنی ذات کو دنیا سے نیست و نابود کیا اور سمونا کی پانچ بڑی جھیلوں کو ان سے خون سے بھر دیا۔

مسٹر وھیلر کا خیال ہو کہ برہمنوں نے پولیٹیکل عظمت قائم کرنے کیلئے جنگی دعوتوں میں غلہ اور گھی کے بجائے خونی قربانی اور سوم شراب کی نذر اختیار کی تھی۔ بس تاریخ ہند کے اس برہمنی دور تک جو چھ سو برس قبل ولادتِ مسیح شاکیہ منی گوتم بدھ کی آمد پر ختم ہوتا ہو منوجی کا قائم کردہ معیارِ ذات کوئی امر واقع نہیں مانا جاتا تھا۔ وہ معیار حسبِ ذیل تھا:۔ "برہما جی نے برہمنوں کے یہ فرائض مقرر کیے، وید پڑھنا اور وید پڑھانا، جگ کرنا اور جگ کرانا، دان لینا اور دان دینا۔ چھتریوں کے فرائض یہ ہیں کہ رعایا کی محافظت کرنا، دان دینا، جگ کرنا، وید پڑھنا اور حظوظ نفسانی سے بچنا۔ ویش کے فرائض یہ ہیں مویشی کی حفاظت کرنا، دان دینا، جگ کرنا، وید پڑھنا، تجارت کرنا، سود پر روپیہ چلانا، زمین کی کاشت کرنا۔ یہ تینوں ذاتیں (دوجنمی) جنیو پہنتی ہیں۔ شودر کا محض یہ کام ہو کہ وہ بلا اکراہ مندرجہ بالا ذاتوں کی خدمت کرے۔"

اس استحقاق کی وجہ سے کہ برہمن سب سے پہلے پیدا ہوا "اس کا حق تمام کائنات پر ہو اپنے شکار کے سوا وہ کسی اور کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ اسکی پوشاک بھی جداگانہ ہو۔ تکلیف و مصیبت کے وقت اس کا فرض ہو کہ فوجی اور تجارت پیشہ لوگوں کی مدد کرے۔ وہ شودر کا مال و متاع اور جو کچھ اس نے محنت و مشقت یا ایک حدِ مقررہ کے علاوہ ترکہ میں حاصل کیا ہو غصب کرسکتا ہو۔ شودر کا کام دوجنموں کی خدمت کرنا ہو اور اگرچہ آزاد بھی کردیا جائے لیکن وہ پھر بھی شودر رہیگا۔ وہ وید نہیں پڑھ سکتا اور نہ جگ یا قربانیوں میں بتبرک ویدوں سے کام لے سکتا ہے۔

جو شودر مصیبت مین ہو وہ کاریگر ہو سکتا ہے' اور انھین حالتون مین ویش بھی خدمت کا کام کر سکتا ہے۔ برہمن خواہ کیسا ہی جرم کرے مگر اُسکی جان دیا اُس کے جسم پر ہاتھ نہین اُٹھایا جا سکتا، بلکہ جو شخص گھاس کے ایک دانہ سے برہمن کو مارتا ہے وہ ۲۱ جنم تک چوپایہ رہتا ہے۔ ریاستی کامون مین برہمن جملہ شیرون کا افسر سمجھا جاتا تھا۔ وہ راجہ کا پروہت ہوتا تھا۔ ٹیکس سے مستثنیٰ تھا۔ رسوم عامہ ادا کرتا تھا۔ منوشاستر کا مفسر تھا' اور اس کے ساتھ ہی جسمانی و روحانی حکیم تھا۔ کم متبرک لوگونکی بہ نسبت اسکے خراب (ناپاک) ہونے کا زیادہ احتمال ہے' اور اسوجہ سے اُسکو زیادہ طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر چھتری برہمن کو بُرا کہے تو اسکی سزا ایکسو پن (ایک سکہ) ہے اگر ویش بُرا بھلا کہے تو اُسکی سزا دوسو پن' اور اگر ایک شودر برہمن کو بُرا بھلا کہے تو اُسکی سزا تازیانہ ہے۔ اگر برہمن انھین سے کسی کو بُرا بھلا کہے تو اسکو پچاس پچیس' اور بارہ پن علی الترتیب دینا پڑتا ہے۔ حلف دیتے وقت برہمن کو صرف اسکی سچائی کی قسم دی جاتی ہے چھتری کو اُس کے ہتھیار گھوڑا ور ہاتھی کی۔ ویش کو گئے' غلہ یا اسباب کی' اور شودر کو خراب سے خراب قسمین دی جاتی ہین۔ ہندو طبائع قسمون سے مالامال ہین۔ عدالت کے مجمع مین کبھی تو دھرم کی قسم دی جاتی ہے کبھی برہمن کے پیر کی کبھی کسی دیوتا یا ورپا کی اور کبھی بیل یا تیر کی۔ ذاتون کی پہچان شادی کے طریقون سے بھی ہوتی ہے جو چار ہین برہمنون سے مخصوص ہین' وہ یہ ہین:۔

برادر کنیا کو کپڑا اور زیور دیکر بر کو بلا کر کنیا سپرد کرے۔ یہ برہم ودواہ (بیاہ) کہلاتا ہے۔

یگیہ مین رتوج کو النکار سمیت کنیا دے' وہ دیو ودواہ کہلاتا ہے۔

ایک یا دو گئو اور بیل بر سے لیکر کنیا دے' وہ آرش ودواہ کہلاتا ہے۔

کنیا اور کنیا کی ذات والون کو دولت دیکر کنیا لینا آسر ودواہ کہلاتا ہے۔

مار پیٹ ہنسند کرکے روتی پکارتی ہوئی کنیا کو گھر سے لے آنا راکشش ودواہ کہلاتا ہے۔

چھتری کی کنیا تیر کو گرہن کرے' اور ویش کی کنیا آلۂ ستورانی کو اور شودر کی کنیا کپڑے کے کونے کو پکڑے جبکہ اُس کا وِواہ بڑی ذات کے پُرش سے ہوتا ہو۔

منوجی کا مقرر کیا ہوا قاعدہ ہندوستان کی موجودہ ذاتون پر بہت کم عائد ہوتا ہے' چنانچہ (۱) منوجی نے کاریگرون کی کسی ذات کا ذکر نہین کیا ہے (۲) دوسری ذات کے ساتھ کھانا کھانا یا دوسری ذات کا پکایا ہوا کھانا پورے طور سے جائز تھا' لیکن فی زماننا اگر ایسا کیا جائے تو ذات جاتی رہیگی۔

بودھ مذہب کی تلقین سے اِس نظام مین بہت بڑی اصلاح پیدا ہوئی۔ "جسطرح چارون دریا جو گنگا مین گرتے ہین' اِس متبرک دریا کے پانی مین ملکر ان کا کوئی نام نہین رہتا' اُسی طرح جو لوگ بُدھ کا مذہب رکھتے ہین وہ برہمن' چھتری' ویش اور شودر کے نام سے کوئی سروکار نہین رکھتے۔"

مہاتما بدھ کے بعد شودرونکی نسل نے ہندوستان کے بہت سے حصون مین حکومت کی ہے' اور سلطنتِ مغلیہ کے زمانہ مین کائستھ جو شودرون کی ایک ذات ہے[1] تمام پبلک دفاتر کا اجارہ لیے ہوئے تھی۔ لیکن بدھ نے ذات کو خارج کرنا نہین چاہا۔ مثلاً بیان ہے کہ ایک برہمن پنڈت جسنے بودھ مت اختیار کر لیا تھا' اگر راجہ اُسکو چھو لیتا تھا' تو اُسکو سر سے پانون تک غسل کرنا لازمی ہوتا تھا' اسکندر اعظم نے پنجاب مین کوئی ذات نہین پائی' لیکن میگاستھنیز نے کاشتکارون اور سوداگرون' فوجی اقوام' اور صوفیون کا حال قلمبند کیا ہے جن کو اُسنے گنگا کے ملک مین پایا۔ اس کے لفظ "صوفی" کے استعمال سے گمان غالب ہے' کہ میگاستھنیز نے برہمنون کو گوشہ نشینون یا فقیرون سے خلط ملط کر دیا اور اسی سے اُس کے اِس بیان کی توضیح ہوتی ہے کہ ہر ہندو برہمن ہو سکتا تھا۔

---

[1] پدم پُران وغیرہ کی رو سے کائستھ شودر نہین ہین (مترجم)

میگاستھینز نے کچھ زمانہ سیلیوکس نکٹر کے دربار میں گذارا تھا۔ بعد کے یونانی مورخ اس کے بیان کی پیروی کرتے ہیں، اور ہندوستان برہمنون کی سات ذاتین گناتے ہین یعنی (۱) صوفی (۲) کاشتکار (۳) چرواہے (۴) کاریگر (۵) سپاہی (۶) محتسب (انسپکٹر) (۷) مشیر جب برہمن از سر نو برسر اختیار ہوئے تو معلوم ہوا کہ دوسری اور تیسری ذات غائب تھی، اور اب برہمن شودر اور کئی مخلوط اقوام جو ابتدائی بارہ فرقوں سے پیدا ہوئی تھین میدان پر قابض تھین۔ خود منوجی نے ان رذیل ذاتون کی فہرست لکھی ہو، اور آئین اکبری مین بھی صاف بیان ہو کہ اُس زمانے مین چھتری کے نام سے پانچسو فرقے یا قبیلے تھے اور اصلی ذات مفقود تھی۔ ان شکمی فرقون مین بہت سے دراصل تجارتی گروہ تھے جنمین سے بہت سے گانون مین رہتے تھے اور ایک اونچی ذات سے اپنا سلسلۂ قرابت بتاتے تھے۔ مثلاً بنگال مین ویدیا بیدون کا ایک فرقہ ہو جسکی ابتدا منوجی نے اسطرح بیان کی ہو کہ ان کا باپ برہمن اور ماں ویش تھی۔ میجر بگل صاحب لکھتے ہین کہ صرف جیسور مین ۱۰۰ ذاتین ہین۔ جیساکہ کونبرگ صاحب فرماتے ہین برہمن اور شودر تمام پیشے کرتے ہین، لیکن برہمن (جو اپنی مذہبی کتب سے بیحد ناواقف ہین) اب بھی ویدک علم کا گویا ٹھیکہ لیئے ہوئے ہین حالانکہ ان کو پُرانون اور منو شاستر مین بہت معمولی دخل ہو۔ اگرچہ برہمن اور ذاتون کو مذہبی کامون سے خارج کرنے مین کامیاب ہو گئے لیکن اُن کا صرف ایک مختصر حصہ مذہبی فرائض کے ادا کرنے مین تعلیم حاصل کرنے مین، حتی کہ دان لینے مین مصروف ہو۔ بہت سے برہمن افواج مین سپاہی ہین بہت سے پانی پلاتے ہین بہت سے خانگی ملازم ہین۔ دوسری ذاتون کی طرح انکی بھی کئی ذاتین ہین جو قریبی تعلق اور باہمی مناکحت کی مانع ہین۔ اصل برہمنون کا اب پتہ نہین ہو۔ بجائے ایک ایسے پجاری کے "جس کے سر اور ڈاڑھی کے بال کترے ہوئے ہون جس کے جذبات مغلوب ہون جسکی قبا سفید ہو، جس کا بدن صاف ہو جس کے کانون مین سونے کی بالیان ہون" ایک ذلیل خود غرض میلا کچیلا شخص جسکی باقی ماندہ قوت بے ایمانی سے زبردستی روپیہ وصول کرنے مین مصروف ہو نظر آتا ہو۔ لیکن ذات کا جو اثر ہندو طبائع پر پڑا ہوا ہو وہ اب بھی ہویدا ہے۔

اب بھی عام طور پر عمدہ شادی وہی سمجھی جاتی ہو جسمین جانبین ایک ہی ذات کے ہون، لیکن ان مین آپس مین کوئی خاندانی تعلق نہو۔ اسمین شک نہین کہ تین اونچی ذاتین اپنے سے نیچی ذات مین ہمیشہ شادی بیاہ کر سکتی تھین، اور ان سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی کمتر درجہ مین داخل ہوتی تھی۔ یا بعض اوقات ایک نئے درجہ مین داخل ہوتی تھی۔ شودر کے لیئے یہ ضروری بات نہ تھی کہ وہ اپنی ہی ذات یا گروہ مین شادی کرے۔ سنہ ۱۸۰۸ع مین پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی نے ایک فیصلہ کیا ہو جسمین ملاوار قوم شودرون کی ایک شکمی ذات کے زمیندار کی شادی شودرون کے دلالہ قوم کی عورت سے جائز رکھی ہو۔ یہ بھی ایک عام بات ہو کہ ایک عورت اپنی ذات سے نیچے والے سے شادی نہین کر سکتی، لیکن مرد چاہے تو ذلیل سے ذلیل ذات کی عورت سے شادی کر سکتا ہو کیونکہ منوجی کے دھرم شاستر مین لکھا ہو کہ برہمن اور شودر سے جو اولاد پیدا ہو وہ ساتوین نسل مین اعلیٰ ترین ذات مین شمار ہو سکتی ہو۔ مرد اور عورت مین ایک کی ذات جاتے رہنے سے دونون کے تعلقات شکست ہو جاتے ہین۔ اگر ذات سے خارج شدہ عورت بے اولاد ہو تو وہ مردہ تصور کی جاتی ہو، اور اُس کے لیئے تجہیز و تکفین کی رسم ادا کی جاتی ہو۔ اگر اس کے لڑکا موجود ہو تو اُسکا فرض ہو کہ اُسے گنگا جل دے۔ یہ امر قابل بیان ہو کہ ایک کسبی کی ذات مین فرق نہین آتا بشرطیکہ اُس کا تعلق اُسی کے ہم قوم شخص سے ہو۔ اِس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہو کہ خواہ ذات سے کیسا ہی کام نکلے وہ عوام کے اخلاق کی محفوظ اور قابل اعتبار محافظ نہین ہو۔ شادی کی امتناعات سابق مین بہت سخت

نہین مگر اب انمین آسانیان ہو گئی ہین ۱۹۵۶ء کے ایک قانون سے بیوہ عورتین دوسری شادی کر سکتی ہین، بشرطیکہ وہ متوفی شوہر کی جائداد سے دست بردار ہون، لیکن اس صورت مین کہ متوفی شوہر نے عقد ثانی کی اجازت دیدی ہو، وہ جائداد پر بھی قابض رہ سکتی ہین۔ بہت سی صورتون مین شودر ان قیود سے بری ہین جو اونچی ذات والون کے لئے مقرر ہین مثلاً شودر اپنی لڑکی یا بہن کے بیٹے کو تبنی کر سکتا ہے، حالانکہ یہ اس عام قاعدے کے خلاف ہے کہ تبنی کرنیوالا وہ شخص ہونا چاہئیے جو تبنی کی ماں سے شادی کر سکتا ہو۔ شودرون مین یہ بھی قید نہین کہ جسکو گود بٹھایا جائے وہ اسی ذات، گوتر، یا خاندان کا ہو جس ذات کا گود بٹھلانے والا ہو۔ اصل مین شودر کسی شادی شدہ کو گود نہین بٹھا سکتا۔ بلحاظ وراثت کے شودر دوسری ذاتون کے مقابلہ مین کامیاب نہین ہے "مختلف قبیلون مین برہمن کے بیٹون کے چار مین دو اور ایک حصہ ہے؛ چھتری کے بیٹون کے تین دو اور ایک حصہ؛ ویشون کی اولاد کے دو حصے یا ایک حصہ ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ برہمن شاستر کے مطابق چار مختلف ذات والون سے شادی کر سکتا ہے؛ چھتری تین مختلف ذات والون سے اور ویش دو مختلف ذات والون سے۔ لیکن ان سے کمتر ذات کے لوگون کے بیٹے اس جائداد سے محروم رہتے ہین جو ان کے باپ کو ترکہ مین ملی ہو۔ شودر کا بیٹا اس زمین سے بھی محروم ہے جو خریداری سے حاصل کیگئی ہو۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ ۱۸۵۰ء کے قانون سے ذات ٹوٹنے، ورثہ حاصل کرنے یا متبنی ہونے کے حق مین کوئی اثر نہین پڑتا۔ اُن وراثت کی حالتون مین جہان متوفی لاوارث مرے ہون، اور کوئی گرو، یا شاگرد یا ہم سبق نہو (جن کو شاستر نے رشتہ دارون کے بعد وارث قرار دیا ہے) تو ایک پجاری یا کوئی برہمن جائداد کا وارث ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شودر برہمن کا اکلوتہ بیٹا ہو تو سپنڈ ترکہ کا دو تہائی حصہ لے گا۔ یا اگر وہ کسی دوجنمے باپ کا اکلوتہ بیٹا ہو تو سپنڈ نصف جائداد پائے گا

گمان غالب ہے کہ ہم ذات بیٹون مین مساوی تقسیم کا قاعدہ شروع شروع مین برہمنون مین جاری نہ تھا، بلکہ خدا کے فرزندان اکبر ہونے کے لحاظ سے اپنی ذات کے سب سے بڑے بیٹے کو وارث قرار دینے کے دستور پر چلتے تھے۔ برعکس اسکے ۱۸۶۹ء مین جوڈیشل کمیٹی نے صدر عدالت کے پنڈتون کی مجموعی رائے کے خلاف یہ قرار دیا کہ جائز اولاد نہونے کی حالت مین شودر کی ناجائز اولاد اپنے باپ کی وارث ہوگی، اور اگر جائز اولاد بھی ہو تو وہ اسکی جائداد سے صرف گزارہ پائیگی۔ اس سے پہلے ۱۸۵۸ء مین سر اڈورڈ رائن نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ راجپوت کے ناجائز بچے یا کسی اعلیٰ ذات کے کسی دوسرے ممبر کو وصیت کی حالت مین بھی وراثت کا کوئی حق نہین اور وہ صرف گزارے کے مستحق ہین، بشرطیکہ بچے تربیت پذیر و قابل تعلیم ہون۔

ایران کے بارے مین زنداوستا مین بیان ہے کہ وہان کے قدیم باشندے چار طبقون مین منقسم تھے، پجاری، سپاہی، کاشتکار اور کاریگر۔ ایک ہفت گانہ تقسیم کا بھی ذکر ہے۔ یہ تقسیم زرتشت کی ایجاد نہ تھی، بلکہ جمشید کے زمانہ ست جگ سے روایتاً چلی آتی ہے۔ ہیجی (مغان) پجاریون کی ذات شاگرد (ہیربد) اُستاد (موبد) اور اُستاد کامل (دستور موبد) تین حرفون مین تقسیم تھی صرف آخر الذکر اہورمزد کے احکام پڑھنے کے مستحق تھے۔ یہی لوگ آئندہ کی پیشینگوئی کرتے تھے، اور متبرک زنار زم اور خوشہ کاہ رکھتے ہین۔ زندمین خوشہ کاہ کو "برسم" کہتے ہین۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس لفظ کو برہم سے تعلق ہے جسکی علامت کشا گھاس کا ایک خوشہ ہے۔ ایرانی اور ہندو مذاہب مین ایک مزید تعلق اس رسم سے ہے جسکو سنسکرت مین "ہوم" اور ایران مین ہوما کہتے ہین۔

ہاگ صاحب نے اپنی تصنیف "اورجن آف برہمنزم" مین لکھا ہے کہ زنداوستا مین پیروان اہورمزد کی تقسیم اتھروا، رتھیشتو، واستریوش ہندوون کی اعلیٰ ذاتون سے مطابق ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہین کہ صرف

اتھر دیجاریون کی اولادین پجاری ہو سکتی ہین - یہ قاعدہ پارسیون مین اَب بھی جاری ہے -

بائبل مین دانیال نبی کی کتاب یہ خیال رجوع کراتی ہو کہ مجی ایک جماعت تھی جو منتخب کیجاتی تھی، اور باقی ذاتونمین موروثی کام یا مذہبی کمتری کی کوئی علامت نہین ہو - دبستان مین ایک فاتح اعظم مہ آباد کی نسبت روایت ہو کہ اس نے جنشیون کو معمولی چار ذاتون مین تقسیم کیا تھا - اسٹرابو بھی ابریون مین بعینہٖ اسی قسم کی ایک تقسیم کا ذکر کرتا ہو جسکی نسبت وہ لکھتا ہو کہ راجاؤن، پجاریون، سپاہیون، کاشتکارون، اور دستکارون مین منقسم ہین -

کسی زمانہ مین یہ ایک عام رائے تھی کہ مصر مین کم از کم دو بڑی ذاتین (پجاری اور سپاہی) تھین جن کے کام باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتے تھے، چھوٹے پیشے بڑی ذاتون مین داخل ہوتے تھے اور وہ بھی موروثی ہوتے تھے - بعد کو بعض صاحبان نے اسکی تردید کی ہو اور لکھا ہو کہ مصری سوسائٹی کی تقسیم محض ویسی ہی تھی جیسی تمدنی ترقی کے بعض درجون مین شریف اور رذیل پیشون مین بالعموم پائی جاتی ہو مختلف مصری فرقون کی یادگاری تصاویر مین رنگ نقشہ وغیرہ مین کوئی فرق نہین پایا جاتا - بیشمار قبرون اور لوحون سے متوفیون کے نام اور پیشے ظاہر ہوتے ہین -

(ترجمہ از انسائکلوپیڈیا برٹانکہ)

ہادیانِ چین

اور اُن کی حکیمانہ و اخلاقی تعلیمات

تمام باشندگانِ چین (مسلمانوں کو چھوڑ کر) تقریباً تین مذاہب کے پیرو ہیں (۱) مذہب کنفیوشش (۲) مذہب لاؤ ٹزی (۳) مذہب بودھ - اِن تینوں مذاہب کی اصل جداگانہ ہے، عقائد اور مذہبی رسوم مختلف ہیں، اور ہر ایک کے فلسفیانہ نقطۂ خیال میں بُعدِ عظیم ہے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ تینوں مذاہب کے بانی ہم عصر ہیں، کنفیوشش، لاؤ ٹزی اور بدھ تینوں نے اپنے اپنے مذہب کی اشاعت چھٹی صدی قبل از مسیح یا اس سے قریب زمانہ میں کی - طرفہ یہ ہے کہ تینوں معاصر ملل ایک ہی ملک میں مروّج ہیں، اور سب سے بڑھ کر حیرتناک امر یہ ہے کہ ان تینوں مذاہب کے پیروؤں میں ہمیشہ نہایت یگانگت، مساوات اور رواداری کا برتاؤ قائم رہا ہے جسکی نظیر دیگر ممالک کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے - اہلِ چین، باوجود تین (بلکہ اس سے بھی زائد) مذہب کے پابند ہونے کے ایک قوم کہلاتے ہیں، اور فی الحقیقت ایک قوم ہیں - مذہبی تعصب تنفر، اور ناروا داری سے انکے دل پاک و صاف ہیں، اور کسی ایک مذہب کی پابندی انکی دوسرے مذاہب سے بے اعتنائی یا نفرت کا باعث نہیں ہوتی - آپس میں اس درجہ میل جول ہے کہ مشہور ہے کہ ایک چینی مختلف لحاظ سے تینوں مذاہب کا پیرو ہو سکتا ہے ع۵ -

ہر چند کہ محققین مذاہب و ملل اس مسئلہ کے جواب میں کہ مذہب و اخلاق کا کیا تعلق ہے، آیا وہ ہمیشہ یکجا پائے گئے ہیں، اور ایک کا وجود بغیر دوسرے کے یا دوسرے کا بغیر پہلے کے ممکن ہے یا نہیں، نہ ہم آہنگ ہیں اور نہ آیندہ کبھی ہونے کی امید ہے، لیکن اسپر سب اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں، جو اسوقت موجود ہیں یا جو تاریخی شہرت رکھتے ہیں، تعلیم اخلاق مذہب سے وابستہ پائی جاتی ہے - چاہے ان میں اعتقادات اور رسوم مذہبی کا کیسا ہی اختلاف کیوں نہو، بہرحال اخلاق کی تعلیم جزو مشترک پائی جائے گی - عیب جوئی اور نکتہ چینی کسے نہیں آتی اور وہ کون شے ہے جسکی مخالفت میں آج تک کسی نے زبان نہ کھولی ہو؟ - جس آدمی کا مرکوز خاطر صرف تلاش معائب و نقائص ہو، یہ یقینی امر ہے کہ اُسے اپنے سوا کسی میں کوئی بھلائی نظر نہ آئیگی، اور نہ دنیا کی کسی چیز سے وہ متمتع و منتفع ہو سکے گا - مبارک ہیں

ع۵ چینیوں کے اس اتحاد اور یک رنگی کا حال دیکھنا ہو تو ڈاکٹر جوزف ایڈکنس کی کتاب "چین میں مذہب کی حالت" یا سر الفرڈ لائل کی کتاب "ایشیاٹک اسٹڈیز" ملاحظہ ہو -

وہ لوگ جو بہرحال جویائے محاسن ہیں اور ہمیشہ نفع رسانی خلائق کو مدِ نظر رکھتے ہیں یا آدمی جا ہے جس مذہب و ملت کا پابند ہو اور اُسکے خیال میں کوئی ایک مذہب سچا ہو، لیکن جب فراخدلی اور بے تعصبی سے دوسرے مذاہب کا مطالعہ کریگا اُسے بکثرت ہر جگہ ایسی باتیں دستیاب ہونگی جنکا تعلق کسی ملک، زمانہ اور قوم سے نہیں ہے، بلکہ جن کی عام سچائی قید تخصیص سے آزاد ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مذاہب عالم کا مطالعہ اس نقطۂ خیال سے نہ کیا جائے کہ اُن میں وہ کون سی باتیں ہیں جو بہرحال غیر فانی حصہ سمجھی جا سکتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے، اور اسکی سچائی سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ کہ کسی مذہب کی خلاقی تعلیم سے آگاہ ہونا یا اُسکی حکیمانہ پند و نصائح سے متاثر ہونا کسی کے دین اور ایمان میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہہ یہ مذاہب کی مستقل عظمت ہے کہ وہ انسان کو اُنکے فرائض زندگانی سے جن کا دوسرا نام اخلاق ہے، مختلف طریقوں سے مطلع اور متنبہ کرتے ہیں۔ اس کلیہ سے کوئی مذہب مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ چین کے مذکورۂ بالا تینوں مذاہب باحسن الوجوہ اخلاقِ حمیدہ اور اعمالِ پسندیدہ کی رہبری کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب بودھ تو ہماری پاک سرزمین کا مولود ہے۔ اُسکا مخلبند مہاتما شاکی منی گوتم بدھ مادر ہند ہی کا سپوت تھا۔ باقی دونوں مذہبوں کے بانی کنفیوشش اور لاؤ تزی چین ہی کے رہنے والے تھے۔ بہ نسبت بدھ کے یہاں کے لوگ ان دنیا کے دو بڑے معلموں کے حالات اور اخلاقی تعلیمات سے بہت کچھ ناواقف ہیں۔ لہٰذا ذیل میں ان مذاہب کا تذکرہ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ نہایت ضروری ابتدائی حالات کے بعد ان میں سے ہر ایک کی خلاقی تعلیمات کو مقصود اصلی سمجھا گیا ہے نکتہ چینی اور عیب جوئی سے کہیں کام نہیں لیا گیا۔ امید ہے کہ یہ تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۱) مذہب کنفیوشش

کنفیوشس مسیح کی پیدائش سے تقریباً ۵۵۱ سال پہلے پیدا ہوا۔ اسکے زمانہ میں چین کی حالت نہایت ابتر تھی، جا بجا چھوٹی بڑی خود مختار ریاستیں اور بادشاہتیں قائم تھیں جن میں آئے دن معرکۂ جدال و قتال گرم رہتا تھا، قدیم تہذیب و تمدن کو ظالم حاکموں اور فرمان رواؤں کے ظلم و تعدی سے بہت کچھ صدمہ پہنچ رہا تھا، انصاف معدوم تھا، عوام الناس کے حقوق پامال کیے جاتے تھے اور سیاسی و مدنی حقوق کا کوئی خبر گیر اور محافظ نہ تھا۔ کنفیوشش نے ایسی خراب و خستہ حالت دیکھ کر اپنی زندگی کا یہ نصب العین قرار دے لیا کہ اہل ملک کو قعر مذلت سے نکال کر اُنکی اخلاقی، سیاسی، اور مدنی حالت درست کرے۔ اُس نے اپنی ساری زندگی ہم وطنوں کے اخلاق و اطوار سدھارنے کی کوشش میں صرف کی۔ لیکن اپنی محنتوں کا ثمرہ اپنی زندگی میں اسے دیکھنا میسر نہ ہوا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اُسکی عمر بھر کی تندہی اور درد مندی بالکل ضائع گئی، اس لیے کہ چند قوم نے اُسکی پند و نصیحت پر توجہ نہ کی۔ وہ ایک امیر کے دربار سے دوسرے کے دربار میں جاتا تھا، اور جاتا اسی لیے تھا کہ کہیں تو اُسکی شنوائی ہو۔ اُس نے بہت سی ملازمتیں کیں، کہیں وزیر رہا، کہیں مشیر، کہیں منصف، کہیں مفتی، لیکن کہیں اُسکی قدردانی نہیں ہوئی۔ اُسے اپنی قابلیت اور سعی پر بڑا بھروسا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے موقع دیا جائے تو تباہ سے تباہ حکومت کی بارہ ماہ میں نمایاں اصلاح کر سکتا ہوں، اور تین سال کے اندر ایسا انتظام کر کے دکھا سکتا ہوں کہ ہر قسم کے جرائم مسدود ہو جائیں۔ اُسکی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی اور اُسکے بد قسمت ملک نے اُسے کبھی اتنا موقع نہ دیا۔ کنفیوشش نقارخانہ کی طوطی کی طرح تھا جسکی آواز کوئی نہ سنتا تھا۔ ہاں چند رفقا اور تلامذہ اسکا اخیر دم تک ساتھ دیتے رہے۔ ۴۷۹ قبل از ولادت مسیح اُس نے نہایت غلاکت و محن کی حالت میں انتقال کیا۔

کنفیوشس کی تعلیم کو حکمت عملی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کا منشا اہل ملک کے اخلاق اور افعال کی اصلاح تھی۔ وہ واجب الوجود اور عالم روحانی کا قائل تھا لیکن بجائے تعلیم آخرت کے اُس نے صرف دنیاوی اصلاح کی جانب اس وجہ سے توجہ کی کہ اُسکے اہل وطن سیاسی، مدنی، اور اخلاقی حالت میں بہت زوال کر رہے تھے۔ گو اُس نے مردہ آبا و اجداد کی پرستش اور دیگر مراسم مروجہ کو اپنی تعلیم میں مصلحتاً برقرار رکھا مگر اُسکی تعلیم کا منتہائے مقاصد

اس دنیا میں عملی اخلاقی زندگی بسر کرنے کے طریقوں سے آگاہ کرتا تھا۔

کنفیوشس کی ادبی خدمات تو صرف یہ تھیں کہ اُس نے تواریخ، نظم اور اخلاق کی قدیم کتابیں بڑی تلاش اور جستجو سے بہم پہنچائیں اور انھیں خود ایڈٹ کیا۔ ان قدیم کتب کے اسماء یہ ہیں:۔

(۱) یی کنگ (ی ی ک ن گ)۔ "مقدس کتاب تغیرات"
(۲) شُو کِنگ (ش وُ کِ ن گ)۔ "کتاب تاریخ"
(۳) شِی کِنگ (ش ی کِ ن گ)۔ "کتاب اشعار"
(۴) لی کی (ل ی ک ی)۔ "کتاب مراسم"

شوکنگ میں جو عہد مابعد کے واقعات موجود نہ تھے انھیں اُس نے خود تحریر کیا اور اس اپنی تصنیف کا نام "سوانح بہار و خریف" رکھا۔ اخلاقی تعلیم زبانی دیتا تھا۔ اُسکے شاگردوں نے اسکے اقوال و نصائح کو تین مختصر جلدوں میں فراہم کر لیا جو کنفیوشسی مذہب کی چار کتب مقدسہ میں شامل ہیں۔ ان چاروں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) تا ہیو (ٹ ا۔ ہِ یُ و) "علم بیکراں"
(۲) چنگ ینگ (چ ن گ۔ ی ن گ) "حکمت اوسطہ"
(۳) لن یُو (لَ ن یُ و) "متفرقات"
(۴) منگ تزی (م ن گ۔ ٹ زِ ی) "تصانیف منشس"

کنفیوشس نے اپنی تعلیم میں اسلاف کی تعظیم و توقیر اور والدین کی اطاعت اور خدمت گزاری پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ایک پورا حصہ جسکا نام ہساو کنگ (ہ سَ او۔ کِ ن گ) یعنی "کتاب متعلق فرماں برداری والدین" ہے اسی بحث کے لیے مخصوص ہے۔ حسب ذیل اقتباسات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں:

۱۔ ہمارے اجساد ہمیں اپنے والدین سے ورثہ ملے ہیں؛ لہٰذا ہمیں اپنے والدین کو صدمہ پہنچانے یا مضرت دینے کا کبھی قصد نہ کرنا چاہیے۔ یہ اطاعتِ والدین کا پہلا سبق ہے۔ پھر جب ہم نے اسکے ساتھ اپنے اخلاق درست کر لیے، اور آنیوالی نسلوں کے لیے نام نیک چھوڑا، تو گویا ہم نے حقوق والدین کی آخری منزل طے کر لی۔ اسکی ابتدا والدین کی فرماں برداری سے ہے۔ انتہا بادشاہ کی اطاعت سے اور اسکی تکمیل نیک عادات کی تحصیل سے۔ (ب)

۲۔ والدین کے ساتھ عام برتاؤ میں اولاد کو حد درجے کے ادب اور لحاظ کا اظہار کرنا چاہیے۔ جب اُنکی خدمت کرے تو پیش نظر رہے کہ انھیں حد درجے کا آرام پہنچے؛ اُن کی بیماری سے دل مضطرب اور بیقرار ہو جائے؛ جب وہ مر جائیں اُنکے غم میں حد انہماک ہو؛ جب اُنکے نام کی قربانی کیجائے تو نہایت عقیدت مندی کا اظہار کیا جائے۔ (ب)

کنفیوشس نے جہاں اطاعت والدین پر اس قدر زور دیا ہے، والدین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کے حقوق کی ادائگی کی بھی شدید تاکید کی ہے۔ ایک مرتبہ جب ایک باپ نے اپنے بیٹے کی نالایقی کی شکایت کی تو کنفیوشس نے باپ اور بیٹے دونوں کو قید میں ڈالدیا۔ جب باپ کی طرف سے اپیل دائر ہوئی تو کنفیوشس نے یہ فیصلہ صادر کیا:

کیا مجھے ایک ایسے شخص کو اپنے باپ کے ساتھ نافرمانی سے پیش آنے کی سزا دینی چاہیے، جسے اُسکے باپ نے ایسی تربیت ہی نہ دی ہو کہ اس باپ کی اطاعت اسکے جان گزیں ہو جائے! انسان فطری طور پر جرائم پیشہ نہیں ہے؛ ایسے باپ خاندان کے اندر اور حکومتیں ملک میں اُن خطاؤں کے ذمہ دار ہیں جو اُنکے مقابلہ میں بیٹے یا اہل ملک سے سرزد ہوں۔ اگر بادشاہ اشاعت قانون میں بے پروا ہے اور رعایا کو احکام قانون کی خلاف ورزی کی سزا دیتا ہے تو وہ دھوکہ باز ہے؛ اگر وہ خراج رعایا کو بغیر اطلاع دیے وصول کرتا ہے، تو وہ ظالم ہے؛ اگر وہ لوگوں کو بغیر تعلیم و تربیت دیے قتل کرتا ہے تو وہ ستم پیشہ ہے۔

یہ بھی صاف طور سے بتلا دیا ہے کہ تمام حالتوں میں اولاد کے اوپر اطاعتِ والدین فرض نہیں!

جب کوئی معاملہ باپ کی بدکرداری کا پیش آئے تو بیٹے کو شکایت کرنے کا ویسا ہی حق ہے؛ جس طرح وزیر کو اپنے بادشاہ سے۔ چونکہ لڑکا باپ کی بد اطواری کی وجہ سے دکھ اٹھاتا ہے، اس لیے محض باپ کے احکام کی اطاعت کو کس طرح فرماں برداری والدین کے زمرے میں شمار کر سکتے ہیں؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرائض اور حقوق کی بنا بہرحال راست کرداری پر رکھی گئی ہے۔

چاہے وہ ماں باپ کا معاملہ ہو یا حاکم و محکوم کا۔

کنفیوشس انسان کی فطری نیکی پر بڑا بھروسا رکھتا تھا، اور نمونہ اور مثال پر بہت زور دیتا تھا۔ اسکا قول تھا کہ جس طرح سونے کی خاصیت سختی، اور آگ کی گرمی ہے اسی طرح انسان کی فطری خاصیت نیکی، راست بازی، عقل اور دیانت ہے۔ گرد و پیش اُسے بدکردار لوگ نظر آتے تھے مگر وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ طبعاً انسان درحقیقت نیک ہی ہے۔

انسانی فطرت اور اُسکی استعداد و قدرت کی بابت جو خیالات کنفیوشس نے ظاہر کیے ہیں وہ تحیر خیز ہیں۔ اُسکی تعلیم ہے کہ

انسان اپنی قسمت کا آپ مالک ہے؛ یہی نہیں بلکہ وہ ارض و سما کے برابر ہے اور قدرت پر عمل کر سکتا ہے۔ کامل خلوص سے وہ اپنی فطرت اور سرشت کی بدرجۂ اتم تکمیل کر سکتا ہے جب ایسا کرے تو وہ دوسروں کی جبلت کی بھی اسی طرح اصلاح کر سکتا ہے۔ انسانی طبائع کی درستی کے بعد وہ حیوانات اور تمام اشیا کو مکمل کر سکتا ہے۔ حیوانات اور دیگر اشیاء کی تکمیل طبائع کے بعد وہ زمین و آسمان کی قوتوں کے تغیر و تبدل اور تربیت میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ ارض و سما کا شریک ثالث ہو سکتا ہے۔ تب وہ ارض و سما کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور جب ایسا ہو جائے تو امن و امان اور عیش و راحت کا راج ہو جائے، اور تمام چیزیں مکمل ہو جائیں۔ یہ ہے انسان کا منصب عالم میں۔ انسان کامل کی جبلت بھی کامل ہوتی ہے۔ تمام انسان فطری صالح ہیں؛ اور انکے اندر وہ مخفی اوصاف مستتر ہیں جن سے وہ اپنی طبائع کو کامل بنا سکتے ہیں۔ جو چیز انسان کے اندر مورث ہے وہ نیکی ہے اور جب وہ درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ اسکی فطرت ہو جاتی ہے[عہ]۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ خیال کہ انسان اپنی سرشت سے حقیقتاً نیک ہے اس خیال سے بدرجہا افضل ہے کہ وہ فطری بد ہے۔

ایک مرتبہ کنفیوشس سے کسی نے دریافت کیا کہ وہ کون سا لفظ ہے جس میں تمام اعمال زندگی کی نیکی کا راز مخفی ہے۔ کنفیوشس نے جواب دیا "کیا وہ لفظ معاوضہ نہیں ہے۔ آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں پسند۔" اسی مقولہ کو کسی دوسرے موقع پر اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

اعلیٰ انسان میں یہ چار خوبیاں، جو میں اپنے میں کسی طرح جمع نہیں کر سکا، ہوتی ہیں: اپنے باپ کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے بیٹے سے اپنے لیے چاہتا ہوں، اپنے بادشاہ کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے ماتحت وزیر سے چاہتا ہوں، اپنے بڑے بھائی کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے لیے اپنے چھوٹے بھائی سے چاہتا ہوں، اور دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک پہلے آپ کرنا جیسا میں اپنے دوستوں سے اپنے واسطے توقع رکھتا ہوں۔

(چنگ ینگ باب ۱۳)

مذہب کنفیوشس کی رو سے نیکی کی پانچ قسمیں ہیں (۱) کرم (۲) صدق (۳) علم (۴) وفا شعاری و تدین (۵) شائستگی اطوار (یا حسن معاشرت) ان میں سے پہلی نیکی تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ بلکہ منشس نے جو کنفیوشس کا سب سے بڑا شاگرد ہے یہاں تک لکھا ہے کہ "کرم ہی انسان ہے"۔ گو انگ ہزبی نے جو لاؤزی کا شاگرد رشید ہے لکھا ہے کہ کنفیوشس نے کرم کی تعریف اس طرح کی تھی کہ "کرم یہ ہے کہ انسان نہایت خلوص باطن کے ساتھ تمام موجودات سے گہری ہمدردی رکھتا ہو، تمام آدمیوں سے محبت کرتا ہو اور خود غرضانہ خیالات اُسکے دل میں جگہ نہ پاتے ہوں"۔ الغرض کرم سے کنفیوشس کی مراد محض "خیرات" نہیں ہے بلکہ وہ نیکی ہے جو تمام تعلقات زندگانی پر حاوی ہے۔ وہ ایک دوسرے موقع پر کہتا ہے:-

نیکوکار کا کرم محض اپنے اعزا و اقربا تک محدود نہیں بلکہ اُسکے دائرہ میں حاکم و محکوم کے تعلقات بھی شامل ہیں۔ نیز اُسی کا قول ہے کہ "کرم تمام بنی نوع سے محبت کا نام ہے"۔

دیانت کو کنفیوشس انسانی عادات کا سنگ بنیاد قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے

۱۔ دیانت کو اصل الاصول سمجھو (۲) میری سمجھ میں نہیں آتا کس طرح کوئی بغیر دیانت کے زندگی بسر کر سکتا ہے۔

کسی دوسرے موقع پر کنفیوشس نے انسانی نیکیوں کا یہ لب لباب نکالا ہے:-

وہ شخص جو یہ پانچ چیزیں کر سکتا ہے نیک انسان ہے: اپنی اور دوسروں کی عزت کرنا۔ سخاوت، راستبازی، خلوص، نیک کاموں میں چستی اور تمام انسانوں سے محبت کرنا۔

عدل و انصاف اور رواداری کی تعلیم اس طرح دی ہے:-

عہ یہ حوالہ ہیوز صاحب کی کتاب "کنفیوشزم" سے ہے۔ مصنف

۱- افضل انسان زندگی کے تمام حالات میں تعصب اور عناد سے مبرا رہتا ہے - صرف انصاف اسکا رہنما ہوتا ہے، اور اسکی تمام قوتیں عدل و انصاف اور نیکی خواہی ہی کی بنا پر صرف ہوتی ہیں -

۲- افضل انسان وہ ہے جو سب کے ساتھ مساوی نیک خواہی کا برتاؤ کرے، جو خود غرضی اور جانب داری سے پاک و صاف ہو -

۳- بیہودہ آدمی جو صرف خودغرضی کے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دے اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے کا خیال اپنے دل میں نہ رکھتا ہو -

برتر انسان یا انسان کامل کون ہے؟ اسکے جواب میں اس حکیم کے خیالات حسب ذیل ہیں :-

۱- برتر انسان وہ ہے، جس کی روح میں ہمواری و مساوات کے صفات ہوں - رذیل کا دل ہمیشہ پریشان اور متفکر رہتا ہے -

۲- برتر انسان ہمیشہ ذہن اور قوت عمل میں ترقی کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے - نالائق آدمی روز بروز جہالت اور بدکاری کی راہ میں بڑھتا ہے -

۳- افضل انسان کے دل میں عدل و انصاف کا خیال رہتا ہے، کمینہ کے دل پر طمع غالب رہتی ہے -

۴- اعلیٰ انسان عدل و مساوات کو تمام چیزوں سے بالا جانتا ہے -

۵- برتر انسان اپنی لیاقت سے زیادہ نفع کا خواہاں نہیں - وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اسکی قابلیت اسکے نفع سے بڑھی ہوئی ہو -

۶- افضل انسان منہ سے الفاظ نکالنے سے پہلے یہ سوچ لیتا ہے کہ آیا یہ الفاظ منہ سے نکالنے کے قابل بھی ہیں یا نہیں - وہ پہلے سوچ لیتا ہے کہ آیا یہ کام مفید ہے یا مضر، تب وہ اس کام پر ہاتھ ڈالتا ہے - وہ ایسا نیک اور راست باز ہوتا ہے کہ لوگ اسکی عزت کرتے ہیں - جس کام کو وہ ہاتھ لگاتا ہے اور پورا کرتا ہے، وہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے اسے نظیر کے طور پر سمجھتے ہیں - اسکے چال چلن کو دیکھکر لوگ سدھرتے ہیں - اسکے تمام حرکات و سکنات صحیح قوانین کے موافق ہوتے ہیں - اس طرح وہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے - لوگ اسکی عزت کرتے ہیں، اسے محبوب رکھتے ہیں، اسکی پیروی کرتے ہیں اور اس جیسے ہو جاتے ہیں -

۷- افضل انسان یہ نہیں چاہتا کہ سارا نفع اپنی ہی ذات کے لیے ہو بلکہ وہ دوسروں کو بھی متمتع اور مستفیض ہونے کا موقع دیتا ہے -

۸- برتر انسان سب کا منظور نظر اور محبوب دل ہے یا آسمان کی طرح وسیع، سرچشمۂ آب کی طرح عمیق، اور متحرک ہے وہ مثل بحر ہے، جہاں جہاز پہنچ سکتے ہیں، جہاں انسانی قوت کی رسائی ہے، جہاں آسمان کا سایہ اور زمین کا فرش ہے، جہاں آفتاب و ماہتاب درخشاں ہیں، جہاں کہرا اور شبنم پڑتی ہے - تمام ذی روح اور تمام متنفس اسکی عزت کرتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں[1] - (لی-کی ب ۲۸)

۹- افضل انسان جب لوگوں کی زبانی اپنی تعریف سنتا ہے تو صرف اس سے وہ خوش نہیں ہوتا - جب وہ ایسے شخصوں کا حال دریافت کرتا ہے جو سردی سے تکلیف اٹھا رہے ہوں تو وہ انھیں لباس دیتا ہے بھوکوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلاتا ہے - (لی-کی ب ۹)

۱۰- برتر انسان خفیہ طور سے اپنے باطن کا معائنہ کرتا ہے کہ مبادا کوئی بدی وہاں جاگزیں ہو - یا کوئی سرچشمۂ احتیاج کا ہو -

۱۱- برتر انسان بننے کی یہ ترکیب ہے کہ اپنے دلی جذبات کو نکوئی اور راستی کی جانب مائل کیا جائے، مطالعۂ کتب سے محبت کیجائے، مطالعۂ کتب علم اور نیکی کا سرچشمہ ہے جسکی ثانی کوئی دوسری چیز نہیں - جب صدق و خلوص کے ساتھ عمل کیا جائے اور دل خود غرضی سے منزہ ہو تو قلب درست ہو جاتا ہے -

۱۲- برتر انسان کے الفاظ اور اعمال میں مطابقت ہوتی ہے - کیا برتر انسان کی یہ صفت نہیں کہ وہ نہایت با اخلاص ہوتا ہے؟ (لی-کی ب ۲۸)

۱۳- جب برتر انسان اپنے درجے کے موافق لباس زیب تن کرتا ہے تو اسکی آرائش افضل انسان کے اطوار و طرق سے کرتا ہے - اطوار و طرق کی زیبائش بڑے آدمیوں کے سے کلام سے کرتا ہے - زبان کی آراستگی برتر انسان کے نیک اعمال سے کرتا ہے اسلئے وہ اس سے شرمسار ہوتا ہے کہ لباس تو برتر لوگوں کا پہنے اور ان کے سے طور و طریق نہ ہوں -

---

[1] کہا جاتا ہے کہ یہ عبارت چین کی کتب مقدسہ میں نہایت فصیح و بلیغ ہے -

یا ان کے مطابق طریق بھی مداہنت کا شکار نہ ہو۔ یا نیکیاں تو ہوں لیکن وہ عملاً ظاہر نہ ہوں (ل۔ی)

مندرجہ ذیل نصائح کا منشا بھی تزکیۂ نفس اور تہذیبِ نفس ہی ہے:۔

جب تم کسی عقل مند کو دیکھو تو اپنے دل میں غور کرو کہ تم میں بھی اسکی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جب کسی بدکار کو دیکھو تو اپنے اوپر نظر ڈالو اور اپنے حال کی جانچ پڑتال کرو۔

کاش خود بینی کی عادت نہ ہو، دوسروں کا اپنے سے مقابلہ اور انکے ساتھ ایسا برتاؤ کرو، جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کریں۔ یہ انسانیت کی تعلیم ہے، اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

دوسری نصیحت کا جزوِ اخیر اُسی حکمت کا اعادہ ہے جسے اُسنے لفظ "معاوضہ" میں مضمر بتایا تھا۔ نیک و بد کی صحبت سے پند آموز ہونے کا کیا اچھا طریقہ بتایا ہے:

اگر ہم سفر کرنیوالے تین آدمی ہیں تو مجھے بہرحال دو استاد (اپنے ساتھیوں میں) مل جائینگے نیک آدمی کو میں تقلید کی نیت سے منتخب کرونگا اور بدکار کو دیکھ کر اپنی ذات کی اصلاح کروں گا۔

کنفیوشس دنیا کے اُن چند لوگوں میں سے تھا جن کے قول اور فعل میں مخالفت نہیں ہونے پاتی۔ وہ منکسر المزاجی میں مشہور خلائق تھا۔ تعصب اور ہٹ دھرمی، خود غرضی اور خود فریبی کا جن سے بچنے کی وہ دوسروں کو نصیحت کرتا تھا، اُسکے عادات میں نام و نشان نہ تھا۔ لیکن پاک بازی اور نیکدلی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے مطمئن نہ رہے۔ کنفیوشس ایسا پاک نفس اور صاف باطن تھا لیکن اپنی بابت جو رائے رکھتا تھا، اُسے دیکھ کر ہر شخص پتہ لگا سکتا ہے کہ محاسبۂ قلب میں جیسی تاکید دوسروں کو کی ہے اُسے اپنے اوپر بھی ویسا ہی اہم فرض سمجھتا تھا:۔

میں ایسا نیک نہیں ہوں کہ خواہشات پر غالب آ جاؤں، نہ اتنا عقل مند ہوں کہ اپنے آپ کو چند مصائب و آلام سے رہا کر لوں، نہ اتنا بہادر ہوں کہ خوف و دہشت سے میرا دل کبھی ہراساں نہ ہو۔ (لن یو ۔ آیت ۲۵)

ایک اور موقع پر کہتا ہے:

اگر میں ایک ایسے شخص کا تصور کروں جس کی ذات میں "اتقا اور انسانیت" مجتمع ہوں تو بھلا میں اپنا موازنہ اُس سے کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان نیکیوں پر بغیر ہمت ہارے عمل کرنے اور بغیر مایوس ہوئے دوسروں کو تعلیم دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

جھوٹی باتیں بنانیوالوں اور چکنی چپڑی باتوں سے لوگوں کو دھوکا دینے والوں کو اس طرح متنبہ کیا ہے:۔

نامبوری اور مصیبت میں مبتلا ہوگا وہ آدمی، جس کے دل جلنے والے اقوال کا اپنا افعال مطابقت سے نہ ہو۔ (ل۔ی۔ ب ۲۳)

ہمدردیٔ بنی نوع، جو اُسکی تعلیم کا جزوِ اعظم ہے، اور جسکی بابت ادبیٔ نصائح میں بھی جا بجا ذکر آیا ہے اُسکی بابت ذیل کا فقرہ کیسا دلپذیر ہے:۔

جہاں گہری ہمدردی کا مادہ ہے وہاں انسانیت کا اظہار دوسروں کے ساتھ محبت کرنے سے ہوتا ہے۔ (ل۔ی۔ ب ۲۹)

شاید ہی کوئی شخص، جو فلسفۂ اخلاق سے واقف ہو، کنفیوشس کے اس بیش قیمت قول سے اختلاف کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ "نیکی کی محبت ایسی ہونی چاہیے جیسی حُسن کی محبت ہوتی ہے"۔

اس سے یہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ جس طرح حُسن کی محبت صرف حُسن کے واسطے ہوتی ہے، اُسی طرح نیکی کی محبت محض نیکی کے واسطے ہو۔ یعنی کسی معاوضہ یا منفعت کی توقع امورِ خیر میں نہیں کرنا چاہیے ورنہ بحالتِ توقعِ نفع، نیکی حقیقی نہ ہوگی۔ دوسرے جس طرح حُسن کی محبت کا تعلق دل سے ہوتا ہے، اور دل حُسن سے بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا اُسی طرح نیکی کا تعلق دل سے ہونا چاہیے اور انسان کے دل میں ایسی صلاحیت موجود ہونا چاہیے کہ امورِ خیر سے بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکے۔ سبحان اللہ کیا پاک تعلیم ہے جسے ہر ذی ہوش کو اپنے دل میں جگہ دینا چاہیے۔

ایک جگہ تربیتِ حُسنِ معاشرت کے بعد وہ کہتا ہے:۔

تربیتِ نفس اور دل اپنے گرد و پیش کے لوگوں پر اثر ڈالتی ہے اور صرف تربیت یافتہ شخص ہی

ہر شخص کو اپنے الفاظ کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اپنے اطوار کی حفاظت کرنا چاہیے۔ اخلاقِ ذمیمہ کو اپنے دل سے نکال کر پھینک دینا چاہیے اور نیکی کو اپنا محل، کرم کو اپنا راستہ، شائستگی و حسنِ لیاقت کو اپنا لباس، عقل کو اپنا چراغ اور دیانت کو اپنا جادو قرار دینا چاہیے۔ متانت، ادب، اور وفاداری تربیت یافتہ آدمی کی خصلتیں ہیں۔ متانت اُسے عوام الناس سے ممتاز کرتی ہے؛ مرزا ہو کر وہ محبوب خلائق ہوتا ہے؛ مطیع ہو کر وہ مطاعِ عالم ہوتا ہے؛ باوفا ہو کر وہ متدیّن ہوتا ہے۔

نیز اُسی کا قول ہے کہ "خوش خلقی لیاقت کے قریب ہے؛ کفایت شعاری انسانیت کے قریب ہے؛ اور ایمانداری سچائی کے قریب ہے" ہر حالت میں سچائی پر قائم رہنے کی ان الفاظ میں اُس نے تاکید کی ہے کہ "تم شمال یا جنوب کے وحشیوں کے مُلک میں بھی رہتے ہو تو بھی تمہارے اطوار خطا و قصور سے پاک ہونے چاہییں"۔ وہ لوگ اس نصیحت کو بالخصوص سُن رکھیں جو اپنے جرائم کو جھوٹی سچی مجبوریوں کا نام لے کر چھپانا چاہتے ہیں۔

اسی طرح بادشاہوں کو ذیل کی نصیحت کس قدر عاقلانہ ہے:۔

بادشاہ کو اپنے وزراء کے انتخاب میں اپنے وجدان کے موافق سارے الناس کے نفع کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ اُسے اپنے فرائض کی تکمیل کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور ادائے فرائض کا قانون کو انسانی نیکی میں، جو تمام انسانوں کی محبت کا سرچشمہ ہے، تلاش کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کے لیے بھی سوائے اسکے چارہ نہیں ہے کہ اپنی ذات کی اصلاح کرے اور تکمیل فرائض میں ہمیشہ سرگرم رہے۔

کنفیوشس بعض مصلحین کی طرح دولت کو نظر حقارت سے نہیں دیکھتا تھا بلکہ وہ اسکی قوت سے بخوبی واقف تھا، لیکن وہ اسکی برائیوں سے بھی ویسا ہی آگاہ تھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نصیحت ہمارے زمانہ میں جبکہ حصولِ دولت کا سودا عالمگیر ہے خصوصیت کے ساتھ نفع بخش ثابت ہوگی:۔

دولت اور عزت انسان کے مطلوب ہیں۔ اگر جائز طریقوں سے وہ میسر نہ ہوں تو اُنکے حصول کی خواہش دل سے نکال دینا چاہیے۔ غریبی اور بے توقیری وہ چیزیں ہیں جو انسان کو مرغوب نہیں۔ اگر انسان درست کرداری کے ذریعہ سے ان سے بچ نہ سکے، بالکل حاصل نہیں کر سکتا تو انکو مردانگی سے برداشت کرنا چاہیے۔

ایک مرتبہ کسی نے کنفیوشس سے دریافت کیا کہ عوام کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ اُس نے جواب دیا "انھیں فارغ البال اور متمول بنانا چاہیے"۔ دوبارہ پوچھا گیا کہ اس سے زیادہ کیا کیا جائے؟ تو اُس نے کہا "انھیں تعلیم دینا چاہیے"۔

کنفیوشس نے علم کی جو تعریف کی ہے اور اُسکی تحصیل کا جو طریق بتایا ہے وہ اس قابل ہے کہ دنیا کے تمام طالب علم اپنے لوحِ دل پر اسے نقش کر رکھیں:

جب تم کسی چیز کو جانتے ہو تو یہ کہنا کہ تم اُسے جانتے ہو، اور جب نہیں جانتے تو یہ تسلیم کرنا کہ تم اُسے نہیں جانتے، یہی علم ہے۔

مطالعہ بغیر غور و خوض کے تضیعِ محنت ہے؛ ذاتی غور و خوض کے بغیر مطالعہ خطرناک ہے۔

کنفیوشس سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ موت کیا چیز ہے؟ اُس نے جو عاقلانہ جواب اس سوال کا دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہر شخص اُسے اخیر فیصلہ مان کر شاعرانہ قیاسات سے باز آجائے:۔

جب انسان کو یہی نہیں معلوم کہ زندگی کیا چیز ہے تو موت کا اُسے کیا حال کُھل سکتا ہے۔

کنفیوشس نے اعتدال پر بہت زور دیا ہے اور "خیر الاُمور اوسطہا" کی جابجا تعلیم دی ہے۔ اخلاقی جرأت، جس کا وجود معدودے چند لوگوں میں پایا جاتا ہے، اُسکا سبق بھی جابجا سکھایا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

دریا میں جاکر پانی کے درندوں اور خوفناک جانوروں کا مقابلہ کرنا ماہی گیروں کی بہادری ہے؛ زمین پر شکار کرنا، شیر اور گینڈے کو مارنا شکاری کی بہادری ہے؛ میدانِ جنگ میں تیر و تفنگ کا مقابلہ کرنا اور موت کو حیات تصور کرنا سپاہی کی بہادری ہے؛ لیکن یہ معلوم کرنا کہ غریبی آسمانی حکم ہے، اور انسانی معاملاتِ زندگی مد و جزر کے ماتحت ہیں اور مصائب سے کسی طرح خائف نہ ہونا عقلمند کی بہادری ہے۔

عادات کس طرح سنورتی ہیں:۔

علم کا شوق علم کی نزدیکی ہے؛ استقلال نیکی کا قرب ہے؛ نجات اور شرمساری سعادتمندی کی جسامگی ہے۔ جو شخص ان تینوں باتوں سے آگاہ ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ عادات

کس طرح سنورتی ہیں۔ (ٹی۔ کی)

ذیل میں چین کی کتب مقدسہ سے چین کے حکمائے متقدمین کے چند پند و نصائح کی گل چینی کرکے ناظرین کی خدمت میں ایک گلدستہ پیش کیا جاتا ہے، جس کے ہر پھول کی رنگت و بو مشام دماغ کو معطر اور چشم بصارت کو منور کرتی ہے چونکہ ان کتابوں کا مدیر کنفیوشس ہے اس لیے ممکن ہے کہ بعض خیالات جو دیگر حکمائے متقدمین کی طرف منسوب کیے ہیں خود اُسی کے خیالات کا پرتو ہوں۔

(ا) شاہنشاہ گُوہ، جس کا عہد سلطنت مسیح کی ولادت سے ۲۲۳۵ سال پیشتر تھا، کہتا تھا کہ

تمام انسانوں کی محبت سے بڑھ کر کوئی دوسری نیکی نہیں ہے اور مہمات سلطنت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی کام اہم نہیں ہے کہ تمام آدمیوں کو نفع پہنچایا جائے۔

اس قول کی بزرگی اور قدامت ہمیں حیرت میں ڈالتی ہے۔

(ب) ایک مرتبہ شہنشاہ شُن نے (جس کا عہد سلطنت مسیح کی ولادت سے دو ہزار سال سے بھی پیشتر تھا) اپنے وزیر سے دریافت کیا کہ نُو اخلاق حمیدہ کون سے ہیں۔ اُس وزیر نے جواب دیا:۔

(۱) خوش خلقی خودداری کے ساتھ (۲) نرمی استقلال کے ساتھ (۳) صاف گوئی ادب و تعظیم کے ساتھ (۴) امور سلطنت میں چستی توقیر کے ساتھ (۵) انکسار تہور کے ساتھ (۶) راست بازی مہربانی کے ساتھ (۷) اطمینان عاقبت بینی اور دقیقہ شناسی کے ساتھ (۸) ہمت خلوص باطن کے ساتھ (۹) شجاعت اتقا کے ساتھ۔ (شو کنگ)

(ج) متقدمین میں سے ایک حکیم نے جسکا نام یُوئے ہے ایک بادشاہ کو مہمات سلطنت کی بابت اس طرح نصیحت کی ہے:۔

ہوشیار رہ۔ قوانین اور آئین کی بجا آوری میں تساہل نہ کر۔ آرام طلبی میں جادۂ اعتدال سے مت ہٹ۔ لائق لوگوں کو ملازم رکھنے میں اپنے اور اُنکے درمیان کسی واسطے سے کام نہ لے۔ بُرائی کو بلا تامل اپنے سے جدا کر دے۔ ایسی تدابیر پر عمل نہ کر جنکی خوبی کی نسبت تجھے خود شبہ ہو۔ مطالعہ کیا کر تاکہ تیری اغراض عقل و حکمت کے مطابق ہوں۔ لوگوں کی مدح و ثنا کی طمع میں راست بازی کے خلاف کوئی کام نہ کر۔ لوگوں کے مقاصد کی مخالفت ذاتی منفعت کے خیال سے ہرگز نہ کر۔ (شو کنگ جلد اول)

(د) ایک وزیر نے جس کا زمانۂ حیات مسیح کی پیدائش سے اٹھارہ صدی پیشتر تھا، حسب ذیل تحیر خیز خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

۱۔ نیکی کا کوئی یکساں معیار نہیں ہے۔ نیکی کی نسبت اعلیٰ خیال ہی اپنی آپ مثال ہے۔ نیکی کی کوئی مستقل اور یکساں صفت نہیں ہے جس کی بابت اعلیٰ خیال کیا جائے وہ صفت اُس جگہ پائی جاتی ہے جہاں وجدان علم سے موافقت و مطابقت ہو (ایضاً)

۲۔ کبھی بجز خلوص قلب کے مت رہو۔ اگر تم نہایت سختی سے اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کی حفاظت نہیں کرتے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑے بڑے کاموں میں تمھاری نیکی کو صدمہ پہنچے گا۔ (ایضاً)

۳۔ کم عقل کا خیال ہوتا ہے کہ نیکی کے چھوٹے چھوٹے کام غیر مفید ہیں اور ایسے وہ اُنھیں نہیں کرتا۔ نیز وہ خیال کرتا ہے کہ بدی کے چھوٹے چھوٹے کام بے ضرر ہیں اس لیے اُن سے پرہیز نہیں کرتا۔ (یی کنگ)

۴۔ قابلیت کم عہدہ بڑا، عقل تھوڑی تدبیر یا لمبی چوڑی، طاقت کم اور بوجھ بھاری، جہاں کہیں یہ اسباب جمع ہو جائیں شاذ ہی ایسا ہوگا کہ انکا انجام بد نہو (ایضاً)

۵۔ تکبر کو بڑھنے دینا نہ چاہیے۔ خواہشات نفسانی کو پورا نہ کرنا چاہیے۔ اپنی ہی رائے کی ہمیشہ تقلید نہ کرنی چاہیے۔ آرام و راحت میں کثرت سے کام نہ لینا چاہیے (لی کی)

مندرجۂ بالا حصۂ مضمون کے مطالعہ سے ثابت ہو گیا ہوگا کہ کنفیوشس کی تعلیمات میں پند و حکمت کے کیسے کیسے جواہر آبدار موجود ہیں۔ اُنکی تعلیمات سے ہم یہ ماحصل نکالتے ہیں کہ وہ ایک عالمگیر اتحاد اور یکجہتی کا خواہشگار اور ساعی تھا جس کے رو سے اُن لوگوں کی عزت کیجائے جو اُسکے واقعی مستحق ہوں۔ راحت، غصہ، رنج اور خوشی کے جذبات کو انکے جائز حدود کے اندر رکھا جائے۔ انانیت کو مغلوب اور خواہشات نفسانی کو مطیع کیا جائے متانت، صدق، خلوص باطن، لطف و مدارات، خوش خلقی اور خوش لیاقتی کی صفات اپنے اندر پیدا کیجائیں اور تقویٰ کے ساتھ حسن معاشرت کو لازمی سمجھا جائے اسلیے کہ انمیں سے کسی ایک کی عدم موجودگی انسان کو "انسانِ کامل" کے پایہ سے گرا دیتی ہے۔

(۲) مذہب لاؤ ٹزی
(تاؤ مذہب)

لاؤ ٹزی اپنی عمر کے اخیر حصہ میں کنفیوشس کا ہمعصر تھا۔ اُسکا سال پیدائش ۶۰۴ قبل مسیح ہے، یعنی کنفیوشس سے پچاس سال وہ بڑا تھا۔ سال وفات تحقیق نہیں، اتنا ثابت ہے کہ اُس نے بہت بڑی عمر پائی۔ چنانچہ جب لاؤ ٹزی کی کنفیوشس سے پہلی ملاقات ہوئی تو اُسوقت کنفیوشس کی اکاون سال کی عمر تھی۔ اُسوقت بھی لاؤ ٹزی ایک ریاست میں عہدہ دار تھا جس سے بعد میں دست کش ہو کر ایک عرصہ تک سیر و سیاحت کرتا رہا اور پھر گوشہ نشین رہا۔ لاؤ ٹزی بہت ذہین اور طباع شخص تھا۔ کنفیوشس کے برخلاف اُسے رسم و رواج کی پابندی اور شائستگی اطوار کے بجائے سادگی پسند تھی۔ نیز لاؤ ٹزی ابنائے وطن کی اصلاح کی جانب سے مایوس تھا اور کنفیوشس کی کوششوں کا اُسے کوئی نتیجہ نکلتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ شاہنشاہ چاؤ کے دربار میں جب کنفیوشس سے اُسکی ملاقات ہوئی تو معمر اور تجربہ کار لاؤ ٹزی نے کنفیوشس کی زبانی اُسکی ناکامیوں کا حال سُنکر مایوسی ظاہر کی اور مدد خواہی کا جواب نفی میں دیا۔

گو لاؤ ٹزی کنفیوشس کی طرح انسان کی فطری نیکی کا قائل تھا اور بعض دیگر تعلیمات بھی اول الذکر کے خیالات سے ملتی تھیں، اُسکی اور کنفیوشس کی تعلیمات میں بہت بڑا اصولی اختلاف ہے۔ لاؤ ٹزی رسوم اور ظاہری پابندیوں کا حامی نہ تھا بلکہ انکا مخالف تھا۔ اُسکی تعلیمات میں روحانیت اور فلسفہ کو زیادہ دخل ہے۔ اُسکے مذہب کا منشا تزکیۂ باطن اور تربیت نفس تھا۔ کنفیوشس یہ چاہتا تھا کہ لوگ اپنے آبا و اجداد کے مراسم و اطوار کا تحفظ اور اُنکی پیروی کریں۔ لاؤ ٹزی یہ کہتا تھا کہ لوگ اُس ابتدائی حالت کی طرف رجوع ہوں جب انسان قیود رسوم سے آزاد تھا۔ ہر چند کہ لاؤ ٹزی خیالات یاس رکھتا تھا کنفیوشس کی طرح وہ بھی ریفارمر تھا اور اُسکا مطمح نظر بھی لوگوں کی اخلاقی، سیاسی اور مدنی حالت سدھارنا تھا۔

پابند و حامی تکلفات ظاہری کو مخاطب کر کے وہ کہتا ہے:۔

اپنی عقل و دانش کو چھوڑ دو، اپنی خیر سگالی و کمال ازقیمی کو دور پھینک دو، پھر دیکھو لوگ سو گنا اچھے ہو جائیں گے، اپنی ہمدردی کو اٹھا کر طاق میں رکھ دو، اپنی منفعت پسندی کو پس پشت ڈالدو، تب لوگ مطیع والدین اور بہی خواہ وطن ہوں گے، اپنی ہوشیاری کو برطرف کردو اور طلب منفعت کا خیال دل سے نکال دو...... اور اپنی فطری سادہ حالت میں ظاہر ہو، عفت و عصمت کی حفاظت کرو، خود غرضی کو مٹاؤ اور اپنی خواہشوں اور امنگوں کو مغلوب کرو۔ (تاؤ تہ کنگ ۱۹)

تین روحانی اوصاف کا وہ اس طرح تذکرہ کرتا ہے:۔

میرے پاس تین قیمتی چیزیں ہیں جنکو میں ہمیشہ عزیز رکھتا ہوں اور جنکی میں ہمیشہ قدر کرتا ہوں۔ اوّل رحم، دوسرے کفایت شعاری، تیسرے انکسار۔ رحمدل ہو کر میں بہادر ہو سکتا ہوں، کفایت شعار ہو کر میں سخی ہو سکتا ہوں، منکسر ہو کر میں بزرگ خلائق ہو سکتا ہوں۔ اس زمانہ میں لوگ رحمدلی کو چھوڑ دیتے ہیں اور صرف بہادر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کفایت شعاری کو چھوڑ دیتے ہیں اور سخی بننے کا خیال رکھتے ہیں اور آخر جگہ چھوڑ کر اول جگہ تلاش کرتے ہیں۔ یہی اُنکی موت ہے۔ رحمدل وہ ہے جو حملہ میں فتحمند اور مدافعت میں محکم ہوتا ہے۔ جسکا خدا حامی ہے اُسے آغوش رحمدلی میں جگہ دیتا ہے۔

لاؤ ٹزی کے بعض سیاسی اصول اُسکی نہایت روشن دماغی کا پتہ دیتے ہیں چنانچہ یہ خیال کہ "سب کچھ سائر الناس کے لیے اور سب کچھ سائر الناس کی رائے اور منظوری سے" جو فی زمانا جمہوریت کا منتہائے خیال سمجھا جاتا ہے اُسکی سیاسی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ نیز اُسکے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسکی بے نظیر ذہانت یہ معلوم کر چکی تھی کہ "قوم جاندار چیز کی طرح نشو و نما پاتی ہے اور بے جان چیز کی طرح مصنوعی نہیں ہے" وہ قتال و جدال بلکہ سزائے موت تک کا مخالف تھا۔ اُسکا قول تھا کہ اگر حکومت کا انتظام معقول ہو تو سزائے موت کا کیا ذکر کسی قسم کی سزا کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اگر لوگوں کو سادگی اور صفائے قلب کی تعلیم دیجائے تو باہمی فساد حرام ہو جائے۔ یہ دولت، منصب اور علم کی طمع ہے، جو لوگوں کے دلوں کو پریشان کرتی ہے، اُن کے جذبات کو مشتعل کرتی اور موت کو اُنکے لیے معمولی چیز بنا دیتی ہے..... جو لوگ عیش و طرب کے پیچھے پڑے ہیں یا جنکا مقصود حیات خود غرضانہ خیالات ہیں وہ موت پر آمادہ

ہو جاتے ہیں، جب کسی نہ کسی وجہ سے انکے مقاصد حاصل نہیں ہوتے اور انکی چالاکیاں
تدابیر خاک میں مل جاتی ہیں۔ جب کوئی قوم اس خطرناک منزل پر آجاتی ہے تو کسی قسم
کی سزا انھیں معاصی سے باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جب لوگ موت سے نہ ڈریں تو بتاؤ موت سے انھیں کیسے مغلوب کیا جا سکتا ہے؟ اگر
کوئی شخص موت کا مستحق ہے تو وہ بڑا مارنے والا تو موجود ہے جس کے ہاتھ میں موت
اور زندگی کی باگ ہے۔۔۔۔۔۔

لہذا جو شخص قاتل کا کام کرے وہ صانع عالم کے ہاتھوں سے اُسکا کام چھیننا
چاہتا ہے، اور جو صانع عالم کا اختیار چھیننے کا خیال رکھتا ہے وہ خود اپنے ہاتھ
کاٹتا ہے۔ عہ

اخوت اور رواداری کا سبق اس طرح دیتا ہے:۔

اپنے بھائیوں کی عیب جوئی نہ کرو۔ اپنا حال جان لینے پر قناعت کرو۔ خود پاک اور
باعصمت رہو، لیکن دوسروں کو تنبیہ نہ کرو۔ اپنے آپ راست باز رہو لیکن دوسروں
کو ایسے ایذا نہ دو۔ بد قسمت کو بد معاشی کی تہمت نہ لگاؤ۔ ایک شخص مر جائے اور دوسرا
زندہ رہے تو یہ مت سمجھو کہ ان میں سے ایک پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ جو واقعی نیک
ہے وہ تمام انسانوں سے محبت کرتا ہے اور کسی کی تردید نہیں کرتا، وہ سب کی عزت کرتا
ہے اور کسی کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ نیک لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور انکی صحبت سے
مستفید ہوتا ہے، لیکن بد آدمیوں کی اصلاح اُسکا کام ہوتا ہے اور لوگوں کو تاؤ
(خدا) کی جانب متوجہ کرنا اُسکی زندگی کا مقصود۔

لاؤ تزی خود ضبطی، ترکِ انانیت اور محاسبۂ باطن پر بہت زور دیتا تھا۔

۱۔ جو شخص خود بیں ہے وہ کبھی فروغ نہیں پا سکتا۔ جو خود پسند ہے وہ معزز نہیں
ہو سکتا۔ جو خود ستا ہے وہ لائق نہیں ہو سکتا۔ جو تعلی پسند ہے وہ عالی مرتبت نہیں ہو سکتا

۲۔ ترکِ نفس پروری کا ایک فعل خود رائی کے ایک لاکھ کاموں سے افضل ہے۔

نیک آدمی کی مندرجۂ ذیل تصویر کیسی حسن موہنی اور قبول صورت ہی۔
وہ کج راہ پر کبھی نہ چلے گا۔ وہ کبھی اپنے نفس کو دھوکے میں نہ ڈالے گا۔ وہ نیکی
کا ذخیرہ فراہم کریگا اور نیک کام جمع کریگا۔ وہ تمام مخلوقات کے ساتھ رحم سے پیش آئیگا
وہ اپنے چھوٹے بھائیوں پر شفقت کرے گا اور بڑوں کی اطاعت فرزندانہ کریگا۔ وہ کیڑوں
پر رحم کھائے گا اور بیواؤں کی غم گساری کرے گا۔ وہ اپنی اصلاح کریگا اور اسی طرح
دوسروں کی اصلاح کریگا۔ کیڑوں، گھاس اور درختوں اور کسی چیز کو اُسکے ہاتھ سے
آزار نہ پہنچے گا۔ اُسے دوسروں کی بد خصلتوں پر نظرِ افسوس و ترحم ڈالنا چاہیے۔
لوگوں کی نیک عادتوں سے اُسے خوش ہونا چاہیے۔ ان کی مصائب و آلام میں دستگیری
کرنا چاہیے۔ انھیں خطرہ سے نجات دلانا چاہیے۔ انکے منافع کو اپنا نفع سمجھنا چاہیے
اور انکے نقصان کو اپنا نقصان۔ اُنکے معائب کو شائع نہ کرنا چاہیے اور نہ اپنی خوبیاں
اُچھالنا چاہییں۔ بدی کا خاتمہ کر دینا چاہیے اور نیکی کا اظہار کرنا چاہیے۔ دوسروں
کو اپنی ذات سے نفع کثیر پہنچانا چاہیے، اور اپنی ذات کے لیے تھوڑے پر قناعت کرنا چاہیے
تحقیر و توہین کو بلا خیال انتقام قبول کرنا چاہیے اور عزت کو بلا اندیشہ خوف۔ بھلائی
کرنا چاہیے بلا امید معاوضہ، اور دوسروں کو دینا چاہیے بلا شائبۂ تاسف۔ یہ ہے وہ
جسے "مرد صالح" کہتے ہیں۔ (تھائی شنگ۔ یعنی سزائے اعمال و مکافات)

دنیا کی کسی دوسری مذہبی کتاب میں اتنی جگہ میں شاید اس سے بڑھکر اخلاقی تعلیم
نہ پائی جائے گی۔

مسیح کا قول ہو کہ "بدی کے بدلے نیکی کرو" اسی تعلیم کو مسیح سے چھ سو سال
پہلے لاؤ تزی نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

جو میرے ساتھ نیکی کرتا ہے میں اُسکے ساتھ نیکی کرتا ہوں، اور جو میرے ساتھ نیکی نہیں
کرتا، اُسکے ساتھ بھی میں نیکی کرتا ہوں (تاؤ تہ کنگ)

نصائح کے یہ گہر آبدار بھی لاؤ تزی کے بحرِ دماغ کے آغوش پروردہ ہیں:۔

۱۔ دوسروں کو جاننا عقل مندی ہے، لیکن جو اپنے آپ کو جان لے وہ روشن دماغ
ہے۔ جو دوسروں پر ظفریاب ہوتا ہے وہ قوی ہے، لیکن جو اپنے اوپر فتح پائے وہ جباروں
کا جبار ہے۔ جس کے پہلو میں قانع دل ہے وہ متمول ہے۔ جو مستعدی سے کام کرے
با عزم و الزام ہوتا ہے۔ جو اپنی فطرت کے خلاف نہیں کرتا وہ بہت عرصہ تک زندہ رہتا ہے،
لیکن جو مر جاتا ہے اور زندہ رہتا ہے وہ ابدی خوشیوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ (ایضاً)

عہ ملاحظہ ہو گلکس صاحب کی کتاب کنفوشیسزم اور تاؤازم صفحہ ۱۹۲

۲۔ جو شخص جلدی سے وعدہ کر بیٹھتا ہے وہ اُسے پورا کرنے میں بہت کم کامیاب ہوتا ہے۔ جو شخص آسان چیزوں کا متلاشی ہے اُسے تمام چیزیں مشکل معلوم ہونگی (ایضاً ب ۶۳)

۳۔ انتظام بے انتظامی سے پہلے ہونا چاہیے، اور تیاری ضرورت کی وضاحت سے پیشتر (ایضاً ب ۶۴)

یہ اخلاقی تعلیمات "مجلد الطہارت" سے جو تاؤ مذہب کی کتب مقدسہ میں سے ہے، مقتبس ہیں:۔

انسانی روح کا میل جانبِ طہارت ہے، لیکن اُسکا دل اُس میں خلل انداز ہوتا ہے۔ انسان کا باطن خوشی پسند ہے، لیکن خواہشات مُخل ہوتی ہیں۔ اگر انسان اپنے دل سے خواہشیں نکال کر پھینکدے تو اُسکے قلب کو خود بخود سکون حاصل ہو جائے۔ دل صاف ہونا چاہیے پھر روح خود منزّہ ہو جائے گی۔ (کِنگ کانگ کنگ ب ۳)

لاؤزی جن متقدمین کی فطری سادگی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا تھا وہ عہد قدیم کے پاکباز لوگ، زندگی کی محبت اور موت کی نفرت سے ناآشنا تھے۔ نہ اِس دنیا میں آنا اُنکی مسرت کا باعث ہوتا تھا اور نہ یہاں سے چلا جانا اُنکے دل کو مشوش کرتا تھا۔ مطمئن روح کے ساتھ وہ یہاں آتے تھے اور یہاں سے جاتے ہیں (مقالات کِنگ تزی ب ۶)

ایسے لوگ کہاں جاتے تھے؟ تاؤ میں جو غیر محدود ہے۔ یعنی محدود غیر محدود میں واصل ہوتا ہے، اور فنا کے بعد بقا میں شامل ہوتا ہے۔ یہ تعلیم بدھ مذہب کے مسئلۂ نِروان سے مشابہ ہے۔

تاؤ کیا ہے؟:۔

تاؤ خلا ہے۔ فعل و عمل میں انتھک ہے۔ عمیق ہے وہ تمام اشیا کے مستقبل پر حاوی ہے۔ وہ نوک دار زاویوں کو ہموار کرتا ہے۔ وہ بد نظمی کو دُور کرتا ہے۔ وہ چکاچوند کو ناپسند کرتا ہے۔

تاؤ کی صفات کا خلاصہ یہ ہے:۔

مثل پیار کرنے والے باپ کے وہ تمام مخلوقات پر نظرِ شفقت رکھتا ہے۔ تمام مخلوقات اُسکے دروازہ سے عالمِ حیات میں آتی ہیں، اور ہستی کے تمام و کمال تغیرات و تبدلات میں وہ مدام اُنکے راست و چپ رہتا ہے۔ اور محبت سے نشوونما دیتا ہے۔ سب کو زندگی عطا فرماتا ہے اور کسی چیز کے دینے سے انکار نہیں کرتا۔ گو سب کے سامنے، سب کے اوپر، اور سب کے اندر ہے، وہ دخل نہیں دیتا۔ گو تمام اشیا اُسکے تابع ہیں وہ اپنے آپ کو اُنکا آقا نہیں سمجھتا۔ وہ انسان کے ساتھ سعی نہیں کرتا۔ وہ ہر فرد واحد کی زندگی کے اندر رہتا ہے۔ اُسکا نفوذ ایسی اشیا میں ہے جنکے اندر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ وہ پیدا کرتا ہے، نشوونما دیتا ہے، بڑھاتا ہے، کھلاتا ہے، پورا کرتا ہے، پکاتا ہے، قوت بخشتا ہے، اور تمام چیزوں کو ڈھکتا ہے۔ وہ نیک آدمی کی شوکت اور بد آدمی کی اُمید ہے۔ وہ اُن لوگوں کو جو دوسروں کی حاجت روائی کرتے ہیں، دُگنا دیتا ہے۔ وہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ وہ ملکوت سے ملکن چھوٹی مقدار ہے اور پھر بھی کُل ہے۔ وہ عالم کی وحدت ہے اور امداد کرتا ہے، قوت بخشتا ہے اور تمام کائنات کو نشوونما دیتا ہے۔

مذہب تاؤ کی کتب مقدسہ میں دو چھوٹی سی کتابیں ہیں جن میں سے ایک کا نام کَن ینگ پِین یعنی کتاب جزا و سزا ہے۔ ذیل کے گوہر لے آبدار اُسی سے ہاتھ لگے ہیں:۔

(۱) جانوروں کے ساتھ رحم سے پیش آ (۲) راست بازی اور اطاعتِ والدین کی عادت ڈالو۔ اپنے چھوٹے بھائیوں سے محبت اور بڑے بھائیوں کا ادب کرو۔ (۳) اپنا تزکیۂ باطن کر اور دوسروں کو نیک بنا (۴) بیواؤں اور یتیموں پر رحم کھا۔ (۵) دوسروں کی واژگونی بخت کو دیکھ کر ساکم ہو (۶) دوسروں کی خوش حالی سے مسرور ہو (۷) دردخواہوں کی مدد کر (۸) مبتلائے آلام کو مصائب سے نجات دلا۔ (۹) دوسروں کے عیوب فاش نہ کر (۱۰) اپنی فضیلت کا اظہار نہ کر (۱۱) بدی کو روک اور نیکی کو ترقی دے (۱۲) بہت ترک کر اور کم لے (۱۳) نیکی کر اور معاوضہ کی توقع نہ رکھ۔ (۱۴) نیکی کو بدی یا بدی کو نیکی مت سمجھ (۱۵) خطا کو جرم خیال نہ کر (۱۶) جب اپنی کوئی خطا تمھیں معلوم ہو جائے تو اُسکی اصلاح کر دو (۱۷) جس بات کو حق جانتے ہو اُسے ضرور کرو (۱۸) ربا نفع دوسروں کو نقصان دیکر حاصل مت کر (۱۹) دوسروں کا دل نہ مت چاٹو (۲۰) دوسروں کے محاسن پر پردہ نہ ڈالو (۲۱) عیش و طرب کے بندے نہ ہو

(۲۲) کبھی ایسی بات نہ کہو جو تمہارے دلی منشا کے خلاف ہو۔

دوسری کتاب کا نام "بن چیہ وان" یعنے کتاب راز نعمات ہے۔ یہ بہت چھوٹی کتاب ہے کہ کل الفاظ کی تعداد صرف ۱۴۱۵ ہے۔ لیکن پند و حکمت کے جواہر سے یہ بھی مالا مال ہے۔ مندرجۂ بالا نصائح کے اعادہ کے علاوہ چند چند سو مند اس میں ایسی ہیں جنہیں بغیر لکھے ہم نہیں رہ سکتے:۔

صحیح اوزان اور پیمانے استعمال کرو اور لوگوں سے زیادہ دام نہ لو۔ بیماروں کی تیمارداری کرو اور پیاسے کو پانی پلاؤ۔ اپنے ہمسایہ کی برائیوں کو پوشیدہ رکھو اپنے تمام افعال میں خدا کے قوانین کی پابندی کرو اور تمام اقوال میں صدق باطنی کا اظہار کرو۔ تمام سلف صالحین کو اپنے پیش نظر رکھ کر اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو۔ وہ کون سی نعمات ہیں جو ایسے شخص کو میسر نہیں ہو سکتیں جو خفیہ طور پر کارہائے خیر کرتا ہے؟

سید حسن برنی (علیگ)

مذہب و سائنس

۱۔ سائنس کی بنیاد

خدا کی عالیشان مملکت کو حل کرنے میں سائنس نے کہاں تک ترقی کی ہے؟

منطق کا یہ ایک نہایت ضروری اصول ہے کہ قدرت اپنے تمام امور میں ایک ہی سیدھے راستہ پر چلتی ہے۔ جان اسٹوارٹ مل صاحب اپنی کتاب سسٹم آف لاجک کے صفحہ ۲۰۲ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

قدرت کا غیر مبدل روش پر چلنا ہی کل نتائج استقرائیہ کے لیے آخری مقدمہ کبریٰ ہے۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ تمام استدلال اسی اصول پر دلالت کرتے ہیں کہ قدرت کے قوانین غیر مبدل ہیں۔ جس صورت میں وہ ازل سے چلے آتے ہیں، ابد تک ویسے ہی رہیں گے۔ اگر دو اور دو کو جمع کیا جائے تو اس کا حاصل عدد چار ہوگا۔ کشش اجسام یا کشش ثقل بدستور ہمیشہ قائم رہے گی۔ ایک قسم کا سبب ایک ہی قسم کا نتیجہ پیدا کریگا۔ تمام قوانین قدرت ایک دوسرے کے معاون و موافق ہیں۔ کوئی قانون کسی دوسرے قانون کا نقیض و مخالف نہیں۔

قوانین قدرت کے غیر مبدل ہونے کا یہ اصول کسی اور دلیل یا ثبوت کا محتاج نہیں۔ اسمیں اُس رفعت و جلال کی جھلک نظر آتی ہے جو ایک حکیم و منصف ہستی کے شایانِ شان ہے۔ اگرچہ یہ بیان کہ قوانین قدرت ایک دوسرے سے ارتباط و مطابقت رکھتے ہیں، کسی قدر صراحت کا محتاج ہے، لیکن اسمیں شک نہیں کہ موثر اور دلنشین ضرور ہے۔

اب ہم یہ دریافت کیا چاہتے ہیں کہ قدرت کے اس ربط و تناسب کے دلائل کیا ہیں؟ اور وہ کیا چیز ہے جس کو ہم اس عظیم الشان موافقت و یگانگت کی کنجی کہہ سکتے ہیں۔

سوال لازم آتا ہے کہ قدرت کا وہ کونسا سیدھا راستہ، عمل، یا قانون ہے، جس پر اُس کے تمام شعبوں کا اتحاد و ارتباط مبنی ہے؟ اور یہ کہ اس کا اصل اصول کیا ہے؟

علمِ منطق کے ماہرین اس اصل اصول کو اپنی اصطلاح میں ایک غیر مبدل سلسلہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مسٹر مل اپنی اُسی متذکرہ کتاب کے صفحہ ۲۱۳ میں لکھتے ہیں:۔

یہ غیر مبدل سلسلہ، ازروے مشاہدہ، قدرت کے ہر موجودہ و مستقبل واقعہ کے درمیان پایا جاتا ہے..... ماقبل کے واقعہ کو ہم اصطلاح میں سبب یا علت اور اُس کے نتیجہ کو معلول کہیں گے

ماہرین علم منطق کے نزدیک قدرت کے ارتباط و مطابقت کی یہی علت و معلول کا سلسلہ ہے۔ اس سلسلہ سے یہ مراد ہے کہ قدرت کے تمام کاموں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے، یعنی سبب سے نتیجہ پیدا ہوتا ہے، اور وہ نتیجہ بالکل اپنے سبب کے مطابق ہوتا ہے اُس کی مثال یہ ہے کہ سیب پھول کا نتیجہ ہے، پھول درخت سے نکلا، اور درخت بیج سے پیدا ہوا۔ یہ ایسی صاف بات ہے کہ کوئی شخص اس سے ناواقف نہوگا۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ ٹھیک اسباب ہی کے مطابق اُن کے نتائج و مشاہدات بھی ہوتے ہیں۔

آؤ! اب ہم اس اصول کا، انسان کے معمولی کاروبار سے شروع کر کے مختلف صیغوں کے مشاہدات و تجربات میں سراغ لگائیں۔

(۱)۔ روزمرہ کے تجربات

جب کوئی شخص دیاسلائی کو ڈبیہ پر رگڑتا ہے، غسل بناتا ہے، پانی اُبالنے کے لیے برتن کو چولھے پر رکھتا ہے، یا دیوار کی مرمت کرتا ہے، تو وہ نتائج کو مد نظر رکھتا ہے۔ میں اپنے دل میں کہتا ہوں

کرکیا مین اپنا کوٹ بدل لون؟ کیا چا کا ایک اور پیالہ پیون؟ یا پاپیادہ چلون کہ گھوڑے پر سوار ہون؟ تو ہر سوال کا جواب ٹھیک اُسی تخمینہ کے مطابق ہوگا، جو نتیجہ کی نسبت مین اپنے دل مین قائم کرچکا ہون۔ جب ہم زمین مین تخم بوتے ہین، کوئی گلاب کی قلم یا باغ لگاتے ہین، تو ہمارے دل مین اس بات کی امید ہوتی ہی کہ ہم اس کا پھل پائین گے۔ بعینہٖ اسی قسم کی امیدین ہمارے دل مین اس وقت بھی ہوتی ہین جبکہ ہم کسی کتاب کا مطالعہ کرتے، مکان کی چھت کو مرمت کرتے، یا سڑک بناتے ہین۔

"افسوس" کس چیز کا نام ہی؟ بالعموم یہ نتائج کے متعلق ہماری غفلت یا ہمارے غلط اندازہ کی یاددہانی ہی۔ حالانکہ پچھتاوا اور صلاح کا خیال اس امر کی بدیہی دلیل ہی کہ ہم نتائج سے باخبر ہوگئے ہین۔ ہماری دلچسپی و حیرت، ہمارے تفکرات و خطرات، ہماری امیدون و آرزوون، سب کا انحصار نتائج پر ہوتا ہی۔ جب نتائج کی نسبت ہمارے دل مین شبہات پیدا ہوجاتے ہین، تو ہم کسی سے مشورہ و نصیحت کے طالب ہوتے ہین۔ نصیحتین اور تمثیلین نتائج کی وضاحت کے لیے نہایت ضروری ہین۔ ہماری محنت و آرام، کھانا اور پینا، تجویز و تدبیر، جمع و خرچ یہ سب نتائج کے لیے ہین۔ ہماری نفس پرستی یا ایثار نفسی نتائج سے کبھی خالی نہین ہوتی سسرو نے دس لاکھ انسانون کو محض اپنی عارضی خوشی کے لیے جلا کر خاک کرڈالا، سینٹ سیمن اشائلیس نے ابدی فائدہ کی غرض سے اپنے آپ کو طرح طرح کی اذیتین پہونچائین۔

وہ دل نہایت روشن دل ہی، جو ہر بات کے نتیجہ کی نسبت نہایت مکمل و صحیح اندازہ کرسکتا ہی۔ برخلاف اس کے وہ بڑے درجے کے بیوقوف اور کوتاہ عقل ہین جو نتائج سے غافل اور بے خبر ہین۔ ہم جو کچھ علم منشیات و مسکرات، مقویات، تریاق، حفظان صحت، جراحی، کیمیا، زراعت، جرثقیل، تجارت، پیداوار کے متعلق رکھتے ہین، وہ سب تجربہ و مشاہدہ کے وسیلہ سے حاصل ہوا ہی۔ بہترین اُسترا، بل، اسکول، طریق حفظ صحت، اعلیٰ ترین تدبیر ترقی تمدن و اخلاق وہی ہی جس سے بہترین نتائج پیدا ہون۔ تجارت کے اعلیٰ سے اعلیٰ اقوال صرف مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ سے مستنبط ہوئے۔ نظام تمدن و معاشرت کے اصول ملکیت، اراضی محاصل، مال و تجارت کے مختلف امور انتظامیہ کے عیوب و نقائص یا فضائل کو ممتاز طور پر ظاہر کرتے ہین۔ جہانبانی کے آئین بتاتے ہین کہ رعایا کے لیے کونسا قانون بہتر اور کونسا رواج مناسب ہوگا یہی حالت انسان کے تمام کاروبار اور روزمرہ کے تجربات و مشاہدات مین پائی جاتی ہے۔ علم ہمیشہ اسی کھوج مین لگا رہتا ہی کہ عمدہ نتائج پیدا کرنے والے امور کو، ان امور سے جدا کرے جو برے نتائج پیدا کرنے والے ہین۔

(۲)۔ تدلیل و استدلال

ہم پیشتر بیان کرچکے ہین کہ علم منطق کا دارومدار اس اصول پر ہی کہ نتائج ہمیشہ اسباب کے مطابق ہوتے ہین۔ روزمرہ کے نہایت سادہ نتائج اور نہایت باریک نکات کا انحصار بھی اسی اصول پر ہی۔

استدلال دو قسم کا ہی۔

اول لمّی؛ وہ برہان جس مین علت سے معلول پر دلیل لائین۔

دوم انّی؛ جس مین معلول سے علت پر دلیل لائین۔

قضیہ منطقی، منطق کی وہ شکل ہی جسکی امداد سے ہم حالات و واقعات مستقبل کو سامنے رکھ کر کوئی خاص نتیجہ اخذ کرین۔ نتیجہ صحیح انجام، خاتمہ، ماحصل، تخمینہ، اندازہ، یہ اسباب و علل کے نتائج کی مختلف شکلین ہین۔

استدلال استقرائی کے ذریعے سے ہم حالات مشین سے نتیجہ تک پہونچ سکتے ہین، اور استدلال استخراجی کی رو سے ایک عام اصول سے جو تجربی و حسی مقدمات کی بنا پر قائم ہو، ایک نتیجہ اخذ کر سکتے ہین۔ جب مشین کے حالات یا تجربات معلوم نہین ہوتے تو ہم تخیل و تشبیہ سے کام لیتے ہین، اور سمجھتے ہین کہ ہمارے مفید مطلب اسباب کا مشاہدہ ہوگا۔ مثلاً اگر ریاستہائے متحدہ (امریکہ) کے باشندگان کوئی نوآبادی قائم کیا چاہتے ہین، جسکا انھین پہلے کچھ تجربہ نہین، تو آبادی قائم کرنے سے پہلے یہ لازم ہوگا کہ وہ انگلستان، ہسپانیہ، فرانس، اور دیگر ممالک کے استعماری نتائج (Colonial Policy) پر غور کرین۔

ہم تحلیل کیمیادی مین کل کو جاننے کے لیے تمام اجزا کی جانچ کرتے ہین۔ اگر پانی مین کوئی مضر جزو شامل ہو، تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ پانی خراب ہے۔ اگر پانی مین کوئی ایسا جزو شامل نہین ہے جو مضر یا ناقص ہو، تو ہم پانی کو خالص اور عمدہ سمجھتے ہین۔

کان یا آنکھ کی مدد سے کسی چیز پر استدلال کرنے کے لیے بھی ہمین تجربہ اور مشاہدہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ فرض کرو، گاڑی مین میرے سامنے والی نشست پر چند اجنبی مسافر بیٹھے ہین۔ از روے تجربہ مین جانتا ہون کہ یہ سب کے سب آدمی ہین۔ ان مین سے ایک کو مین دیکھتا ہون کہ ضعیف ہے، کیونکہ بڑھاپے کی وجہ سے اُس کے بال سفید ہو گئے ہین، اور چہرہ پر جھریان پڑ گئی ہین، ایک اور شخص کے ہاتھون پر محنت و مشقت کے آثار نمایان دیکھ کر مین یہ نتیجہ نکالتا ہون کہ وہ مزدور ہے۔ ایک اور شخص ہے جو عینک لگائے ہوئے ہے، جس سے اسکی بینائی کی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح تجربہ مجھے بتا رہا ہے کہ فلان شخص شرابی ہے، فلان مصیبت زدہ؛ اس ساتھ والے آدمی کی آواز سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تربیت یافتہ و مہذب ہے، اور اُس دوسرے کی آواز سے اس کا جاہل اور غیر مہذب ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

اگر مین ملک کے کسی ایسے حصے مین جا نکلون، جہان کے حالات سے مین واقف نہین، تو وہان کے اِردگِرد کے مناظر سے مجھے وہان کے لوگون کے طریق بود و باش اور طرز معاشرت وغیرہ کا حال بخوبی معلوم ہو جائے گا۔ ایک مقام پر کھیت اور عمارات کی حالت سے کسان کے محنتی اور جفاکش ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ دوسرے مقام پر کچھ اور ہی کیفیت نظر آئے گی۔ کسان کے گھوڑے کی حالت سے مین کسان کے چال چلن کا بخوبی اندازہ لگا لون گا۔ دیگر علامات سے مجھ پر یہ بھی ظاہر ہو جائے گا، کہ یہان کفایت شعاری سے کام ہو رہا ہے، وہان غربت و افلاس کا سکہ جما ہوا ہے؛ یہان خودداری، اور وہان غلاظت و بدسلیقگی ہے۔

واقعات، اقوال، خیالات، اصولات وغیرہ کے اسباب اور نتائج ایسے ہی بدیہی اور صریح ہین جسطرح عام محسوسات کے۔ کسی کل (مشین)، گائے، یا اور جانور کی قیمت کا اندازہ ہم اُن کے پھل یا پیداوار سے کرتے ہین۔ ایک تصویر، منظر، کھیل، تماشا، شعر، گیت، کتاب، یا خیال کی اچھائی اور بُرائی کا اندازہ ہم اُس کی خوشنمائی اور خوش اسلوبی اور عمدگی سے کرتے ہین۔ کسی عقیدہ، تدبیر، پالیسی (حکمت عملی)، رواج، فلسفہ وغیرہ کی خوبی کا اندازہ بغیر اُن کے موجودہ یا آیندہ نتائج کے ناممکن ہے۔

کسی قوم کی بُرائیون یا خصلتون کا اندازہ کرنے کے لیے ہمین اُس قوم کی تاریخ یا گذشتہ واقعات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ آیندہ واقعات کا اندازہ بھی واقعات ماقبل پر مبنی ہے۔ اگر ہم یہ دریافت کیا چاہین کہ آیندہ کیا ہوگا، تو بیشتر ہمین زمانۂ ماضی پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔ ہم عمدہ تخم اور مضر جراثیم دونون کی تلاش مین یکسان رہتے ہین، تاکہ ایک کو ترقی دکر

پھیلاسکین، اور دوسرے کو تباہ و برباد کرنے مین کامیاب ہون۔

فرض کرو، تمھارے پاس ایک بیج ہی، لیکن تم یہ نہین جانتے ہو کہ یہ بیج کس درخت یا پودے کا ہی۔ اسکی واقفیت کے لیے تم اُسے زمین مین بو کر دیکھو گے۔ کسی جرم کے مشکلات کو حل کرنے کے لیے اُس واقعہ کے حالات پیشین کا دریافت کرنا ضروری ہی۔ نہایت مختصر امور پر استدلال کرتے وقت بھی اسی اصول کو مد نظر رکھنا پڑیگا۔ کسان ہو یا سیاح، مدبر ہو یا مزدور، فلاسفر ہو یا سراغرسان سب کے سب ایک ہی اصول پر چلتے ہین، یعنی نتائج سے واقعات ماقبل کا سراغ لگانا یا گزشتہ حالات سے نتائج اخذ کرنا۔ حقیقی امر یہ ہی کہ ہم ہرگز یہ نہین کہ سکتے کہ سبب کچھ اور ہی اور نتیجہ کچھ اور، یعنی یہ بالکل ناممکن ہی کہ سیب کے درخت مین آڑو پیدا ہون، یا شاہ بلوط کے درخت مین آلو لگین۔

(۳)۔ فلسفۂ اخلاق

اخلاق کے اُن شعبون کی تہ مین، جو ایک دوسرے کے نقیض ہین، ایک خاص مطابقت پائی جاتی ہی، جس کا یہ منشا ہی کہ افعال انسانی کو اُن کے نتائج سے اندازہ کرنا چاہیے۔ ارسطو ,,اعتدال،، پر زور دیتا ہی، کہ میانہ روی سے بہترین نتائج پیدا ہوتے ہین۔ فرقۂ کلابیۃ (سینک) کے پیرو یہ خیال کرتے ہین کہ گوشہ نشینی کی سادہ زندگی بسر کرنے سے ہراس و بیم اور حسرت و یاس پاس نہین آنے پاتے ہیڈونسٹ اور نیز اپی کیورین (لذیۃ) بھی اُن کامون کو برتر قرار دیتے ہین، جن سے فرحت حاصل ہو۔ رواقیہ (اسٹوئک) کے نزدیک سب سے برھی شجاعت و دلیری یہ ہی کہ غصہ، رنج، اور خوف کے جذبات کو ضبط کیا جائے۔ یوٹلی ٹیرین کی دانست مین سب سے اچھے کام وہ ہین جن کے ذریعہ سے عوام کی بے انتہا بھلائی مقصود ہو۔ منڈیول اور ہلوٹیس کی راے مین ,,خود غرضی،، بہت عمدہ شئے ہی، کیونکہ کسی ایک شخص کے حق مین اُس سے بہت عمدہ نتائج پیدا ہوتے ہین۔ بڑے بڑے فلسفہ دان اس امر پر متفق الراے ہین کہ اخلاق انسانی میل جول کا نتیجہ ہی۔ اس کا یہ مطلب ہی کہ انسان اپنے تجربہ اور مشاہدے سے معلوم کر چکا ہی کہ جماعت (سوسائیٹی) کے لیے کون سی چیز مفید ہی۔ الٰہیات بتلاتے ہین کہ انسان کا سب سے بڑا فرض یہ ہی کہ وہ الٰہی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرے، کیونکہ اطاعت و فرمان برداری سے ابدی راحت اور سرکشی و غرور سے دائمی عذاب حاصل ہوتا ہی۔

علم اخلاق کا کوئی بھی مسئلہ ایسا نہین، جو افعال انسانی کے نتائج و مشاہدات پر مبنی نہو۔ وہ کونسا معیار ہی جسکی رو سے ہم یہ سمجھتے ہین کہ دروغ کے مقابلہ مین راستی بہترین صفت ہی؟ جب ہم سچ بولتے ہین تو ہمین ایک قسم کی راحت محسوس ہوتی ہی، حالانکہ جب جھوٹ کہا جاتا ہی تو یہ بات نہین ہوتی۔ یہ بات صاف طور پر ظاہر ہی کہ باہمی ربط و ضبط کے لیے راستی نہایت ضروری شے ہی جب ہم کسی کو دروغ گوئی کا غلام پاتے ہین، تو ہمارا دل اُس سے نفرت کرنے لگتا ہی۔ کیون؟ اسلیے کہ یہ بُری عادت ابتری، بے یقینی، دشمنی اور دیگر بُرے نتائج کا پیش خیمہ ہی۔ اسی طرح ہمارا تجربہ وفاداری و بیوفائی اور نمک حلالی و دغابازی، رحمدلی و بے رحمی اور دیانتداری و بددیانتی کے اثر سے بخوبی آگاہ ہی۔

ہم خوب جانتے ہین کہ فلان فعل بُرا ہی اور فلان اچھا۔ ہمین اس بات کا بھی علم ہی کہ غذا کے لیے روٹی مفید ہی اور گھاس مضر۔ اس بات کو بھی ہم مانتے ہین کہ غلاظت کے مقابلہ مین صفائی بدرجہا اچھی ہی۔ یہ اصول بھی عام ہی کہ انسان کو ہمیشہ آگے بڑھنا چاہیے نہ کہ پیچھے ہٹنا، اور اسی طرح خوشی کو رنج کے مقابلہ مین زیادہ مسرت انگیز سمجھا جاتا ہی۔

جس طرح کسی کَل (مشین) کی قدر و قیمت کا اندازہ اُس کے

پرزون کی عمدگی اور تیز رفتاری سے کیا جاتا ہی، یا جس طرح درخت اپنے پھلون سے پہچانا جاتا ہی، ٹھیک اُسی طرح ہمارے افعال کی خوبی یا عیب کا اظہار بھی نتائج سے ہوتا ہی۔

(۴) - علم ہندسہ

علمِ ریاضی مین ۲+۲ جزو ہین، جن کا حاصلِ جمع ۴ ہی؛ اسی طرح ۹ - ۷ جزو ہین، جن کا حاصل تفریق ۲ ہی- ریاضی کے سادہ سے سادہ سوال سے لیکر طبعی ریاضی یا اصولِ ارتقام کے نہایت پیچیدہ و مشکل مسائل تک غور کر جاؤ، ہر جگہ یہی اصول کام کرتا ہوا نظر آئے گا کہ علت و معلول کا باہمی تعلق صحیح و درست ہو۔

ریاضی کے ہر قسم کے سوالات کو حل کرنے کے لیے اس بات کی سخت ضرورت ہی کہ جمع، ضرب، تفریق اور اُن کے حاصل کے درمیان پورا اور درست فرق ہو۔ اس علم کے تمام اہم قاعدون اور اصولون کی بھی یہی حالت ہی۔

(۵) - طبعیات

اگر علم سائنس اور علمِ فلسفہ صحیح ہین، تو اس دنیا مین جسمین ہمارا قیام ہی، کوئی ایسی جگہ اور کوئی ایسی چیز نہین ہی، جسمین دائمی حرکت نہ پائی جاتی ہو۔ سنگ خارا کے پہاڑ مین جو ازلی حرکت موجود ہی، ویسی ہی دائمی حرکت جسم انسانی کے ہر رگ و پے مین پنہان ہی- کہین یہ حرکت ظاہر ہی اور کہین پوشیدہ، اور کسی مقام پر ایسی سختی سی محسوس ہوتی ہی کہ اسکا نتیجہ ہر طرف تباہی اور بربادی ہوتا ہی، اور کہین اسکا اثر شفقت آمیز ہوتا ہی۔

زمین اپنے دائمی دورہ مین آفتاب کے گرد اٹھارہ میل فی سکنڈ یا ایک ہزار اسّی میل فی منٹ کے حساب سے گردش کرتی ہی- یہ رفتار بہت تیز ہی- یون سمجھو کہ اگر انسان کے پر لگ جائین تو وہ نیویارک سے یانکرس تک ایک سکنڈ مین، البنی تک دس سکنڈ مین، بفیلو تک تیس سکنڈ مین، شکاگو تک ایک منٹ مین، اور سان فرانسسکو تک تین منٹ مین پہونچ سکتا ہی- یعنی اس حساب کے مطابق انسان ایک بہت تیز رفتار اکسپرس ٹرین سے ایک ہزار گنا زیادہ اور بندوق کی گولی سے پچاس گنا زیادہ تیزی کے ساتھ سان فرانسسکو مین داخل ہو سکتا ہی- کبھی کبھی ہم اپنے چھوٹے چھوٹے منصوبون یا ایجاد و اختراع کے نتائج سے ششدر رہ جاتے ہین، مگر یہ کبھی خیال نہین کیا کہ یہ عالی شان کُرۂ ارض اپنی اس حیرتناک رفتار مین ہمین کوئی صدمہ یا ضرر پہونچا سکتا ہی- حقیقت یہ ہی کہ زمین کی رفتار ایسی پوشیدہ اور غیر محسوس ہی کہ اگر ہیئت دان اس راز کا انکشاف نہ کرتے تو ہمین ہرگز اسکی حرکت کا احساس نہوتا- یہ بات ثابت ہو چکی ہی کہ ہیئت دان اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر متفق الرای ہین کہ (۱) اجسام فلکی کی حرکات مین باقاعدگی اور پابندی پائی جاتی ہی، اُن کی پیشین گوئیان اِن حرکات کے باب مین اعتبار کے قابل ہین، اور (۲) قدرت اپنے جلیل القدر مظاہر مین ترتیب و تناسب کی تابع ہی- اس باقاعدگی و ترتیب کی کنجی کیا ہی؟ نیوٹن صاحب اپنے "اصول حرکت" کی تیسری دفعہ مین عالمگیر حرکت کی نسبت، جسکو علم طبعیات کا نہایت ضروری اصول مانا گیا ہی، تحریر فرماتے ہین کہ ہر عمل کے لیے ایک عمل معکوس ہی! ڈگبی صاحب کہتے ہین کہ اگر آگ اپنی تپش سے پانی کو گرم کرتی ہی، تو پانی بھی آگ کے جوش کو سرد کر دیتا ہی۔

جب سپاہی اپنے تھیلے کو اُٹھاتا ہی، تو تھیلے کے وزن کے برابر ہی اُسے اپنی قوت صرف کرنی پڑتی ہی- اگر دستانہ پہن کر دیوار مین مُکا مارین تو دیوار بھی اسکا جواب دستانہ پہن کر دیگی، لیکن اگر تم بغیر دستانہ کے (ننگے ہاتھ) دیوار پر گھونسا مارو، تو تم جان لوگے، کہ قدرت نے بے جان اشیاء کو بھی اپنے بچاؤ کی، بلکہ اظہار ناراضی کی بھی، قوت عطا کی ہی- اگر کوئی شخص کسی حادثہ سے اتفاقاً سنگین دیوار پر

گر پڑے تو اُس وقت بھی دیوار برابر کی قوت سے اسکا جواب دیگی گویا قوانین قدرت ایسے مکمل ہین جس پر یہ کہاوت صادق آتی ہو کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

ہربرٹ اسپنسر کا قول ہو کہ:۔

> اِس مسئلہ، کہ عمل اور عمل معکوس باہم برابر طاقتین ہین، کی عدم موجودگی مین علم ہیئت کے ذریعہ سے کبھی قابل وثوق پیشین گوئیان نہین کی جاسکتین۔

جس طرح علم ہیئت کے وسیلہ سے نہایت دور دراز حصص مین اور نیز نہایت ہولناک مظاہر قدرت مین کہ جہانتک انسانی خیال کی رسائی ہوسکتی ہو، عمل اور عمل معکوس کے درمیانی واسطے دریافت ہوتے ہین، اسیطرح کیمسٹری (کیمیا) کائنات کے اُن نفیس ترین اجزا کا جن کا انسان کو علم ہوچکا ہو، باہمی ٹھیک ترتیب و تناسب کا پتہ لگاتی ہو۔ اس کی مثال یہ ہو کہ کیمیا ساز کیمیائی عمل کو ہمیشہ ایک مساوات سے لکھتے ہین، یعنی وہ کیمیائی نسخہ کو مرتب کرتے ہوے ہمیشہ دو مختلف چیزون کو اس تناسب سے جمع کرتے ہین کہ مطلوبہ نتیجہ ان سے حاصل ہوجاتا ہو۔

فعل معکوس فعل اصلی کا، اثر سبب کا، اور حاصل مطلب واقعات ماقبل کا نتیجہ ہو۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہین کہ عمل معکوس، اثر، حاصل مطلب سب ایک ہی اصول کی مختلف صورتین ہین جسکو عام طور سے قانون علت و معلول کہا جاتا ہو۔ لیکن میرے خیال مین اگر اس اصول کو "قانون موازنہ" نام دیا جاتا تو زیادہ موزون ہوتا کیونکہ اس اصول کا اصل مطلب یہی ہو کہ سبب و نتیجہ اور علت و معلول باہم مساوی اور ایک دوسرے کا بدل ہوتے ہین۔ یون بھی کہہ سکتے ہین کہ سبب اور نتیجہ ایک ہی ترازو کے دو پلڑے ہین، جو لازمی طور پر ایک دوسرے کے برابر ہی ہون گے۔ رہے نتائج سو وہ عین اسباب کے مطابق اور تابع ہوتے ہین۔

ہم پیشتر ذکر کرچکے ہین کہ ہر جگہ اور ہر مقام مین عالمگیر حرکت موجود ہو۔ یہ ازلی حرکت، جو کل کائنات عالم مین جلوہ گر ہو اسباب اور نتائج کے باہم مساوی، ایک دوسرے کا عوض، یا بدل ہونے کے باعث باقاعدہ اور باترتیب ہوئی ہو۔ اگر کائنات عالم پر غور کی نظر ڈالوگے، تو تمھین معلوم ہوجائے گا کہ حرکت معکوس ہمیشہ اصلی حرکت کے مطابق، نتیجہ ہمیشہ سبب کے مطابق، اور معلول ہمیشہ علت کے مطابق ہوتا ہو۔ اس مطابقت و موافقت سے عالم کی باقاعدگی تناسب، اور ترتیب بخوبی ظاہر ہوتی ہو۔

(۶) - صداقت کی ہم آہنگی

سچائی، خواہ وہ کیسی معمولی کیون نہو، دوسری سچائیون کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہو۔ نظام عالم کے متعلق کوئی بھی ایسا حقیقی یا مسلمہ امر نہین، جو قدرت کے باقی تمام اصولون سے پوری پوری مطابقت نہ رکھتا ہو، یا اپنے تعلقات کی وجہ سے خود ان اصولون پر مشتمل نہو۔

علم سائنس اس امر کو تسلیم کرتا ہو کہ گردش سیارگان کے متعلق جو کیپلر کے تین اصول ہین، وہ بالکل نیوٹن کے "اصول حرکت" کے مشابہ ہین، یعنی گردش سیارگان انھین قوانین پر مبنی ہو جن پر تمام کائنات کی حرکت کا دارومدار ہو۔ اسمین بھی کسی کو کلام نہین ہوسکتا کہ نیوٹن کے "اصول حرکت" کے تینون قاعدے صرف ایک اہم اصول کے ماتحت ہین۔

اسکا پہلا اصول یہ ہو کہ

> ایک جسم کی حرکت مین کچھ تیزی یا تبدیلی پیدا نہین ہوسکتی تاوقتیکہ اسے قوت ایسا کرنے پر مجبور نہ کرے۔

اس کا یہ مطلب ہو کہ حرکت مین صرف اسی وقت تبدیلی پیدا ہوسکتی ہو جبکہ اسکا کوئی سبب موجود ہو۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ

حرکت کی رفتار کا تغیر اُس قوت کے مطابق ہوتا ہے جو اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے صرف کی جائے۔ یہ تغیر ٹھیک اُسی سمت کو واقع ہوگا جس طرف قوت کا عمل ہوا ہے۔

اس سے یہ مراد ہے کہ کسی قوت کے عمل مین لانے کا نتیجہ عین اپنی علت کے مطابق ہوگا۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ

ہر فعل یا ہر حرکت کے لیے ایک حرکت معکوس ہوتی ہے۔

اسکا مقصد بھی یہی ہے کہ ہر فعل کا نتیجہ اپنے سبب یا علت کے مطابق ہوتا ہے۔

نیوٹن کے یہ ہر سہ قواعد حرکت اسکی اصطلاح مین اس اصول کے تابع ہین کہ نتائج ہمیشہ اسباب کے مطابق ہوتے ہین۔

(۷) - مسئلہ ارتقاء

ڈارون صاحب کی رائے کے مطابق مسئلہ ارتقاء کا تعلق زیادہ تر انتخاب طبعی (NATURAL SELECTION) کے ساتھ ہے۔

اسکی لغوی تعریف یہ ہوگی:-

اس مسئلہ سے یہ مراد ہے کہ جو حیوانات یا نباتات اپنے اردگرد کے حالات کے ساتھ سب سے زیادہ مناسبت رکھتے ہین، وہ زندگی کی جد وجہد مین اُن حیوانات وغیرہ سے سبقت لیجاتے ہین جن کے تعلقات خارجی اسباب سے نسبتہً کم ہوتے ہین۔

مسئلہ ارتقاء کے لحاظ سے اِن خارجی اسباب کی لغوی تشریح حسب ذیل ہوگی:-

اُن وسائل و اثرات کا مجموعہ جو ایک جاندار شے پر باہر سے اثر ڈالتے ہین۔

یعنی وہ خارجی اسباب کا ایک مجموعہ ہے جو باہر سے ذی روح اشیاء پر اثر ڈالتا ہے۔

ذی روح اشیاء دو قسم کے اثر کا حاصل ہین۔ یعنی ایک مجموعہ اُن خارجی اسباب کا ہے جو اُس پر باہر سے اثر ڈالتے ہین، اور دوسرا مجموعہ فطرت کا ہے، جو قدرت نے ورثہ کے طور پر عطا کی ہے۔ اسی کو دیگر الفاظ مین یون کہہ سکتے ہین کہ ذی روح اشیاء حالات پیشین یا واقعاتِ ماقبل کا کامل نتیجہ ہین۔ ذی روح اشیاء زندگی کی جد وجہد مین خواہ کسی حالت مین دوسرون سے سبقت لیجائین مگر ان کا سبقت لیجانا اُنھین اسباب کا نتیجہ ہوگا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ حیوانات کی ہلاکت و موت بھی ایک یا زیادہ اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔

دُنیا کی تمام چیزین، چھوٹی ہون یا بڑی، مثلاً بیج، مچھلی فرد واحد، گورنمنٹ، نسل، تہذیب سب کی سب اُن واقعات ماقبل کا نتیجہ ہین جو اُن کے پیدا ہونے یا اُن پر اثر ڈالنے کا باعث ہوئے ہین۔ دراصل مسئلہ ارتقاء کا دارومدار صرف اسی ایک اصول پر ہے کہ نتائج اسباب کے تابع ہوتے ہین۔

(۸) - دیگر اہم و جدید مسائل

سوال لازم آتا ہے کہ مادہ کے غیر فانی ہونے اور قوت کے ہر وقت موجود ہونے کے جدید مسائل کا اس اصول سے کیا تعلق ہے کہ نتائج اسباب کے تابع ہوتے ہین؟ جدید مسائل سے یہ مراد نہین ہے کہ وہ زمانۂ حال کے ایجاد ہین، بلکہ اس لیے کہ اس زمانے مین انھین عام قبولیت حاصل ہوئی ہے۔

قوت کے غیر فانی ہونے کا اصول ان الفاظ مین ادا کیا جا سکتا ہے کہ "جب قوت کی ایک شکل غائب ہو جاتی ہے، تو وہ قوت بالکل اُسی مقدار مین کسی دوسری شکل مین ظاہر ہو جاتی ہے"۔ مادہ کے غیر فانی ہونے کو بھی ہم انھین الفاظ مین ادا کر سکتے ہین یعنی، جب

مادہ کی ایک شکل غائب ہوجاتی ہے، تو وہ ٹھیک اُسی مقدار میں دوسری شکل میں نمودار ہوجاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قوت کے ہر حالت میں موجود رہنے، اور مادہ کے غیر فانی ہونے کے مسئلے حقیقت میں دو مختلف مسائل نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔

قوت اور مادہ غیر فانی ہیں! اس جملے سے یہ مراد ہے کہ مادہ اور قوت خواہ لاکھ صورت و شکل بدلیں، مگر اُن میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہیئت کی تبدیلی سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے، وہ مادہ یا قوت کی پہلی حالت یا صورت کے مساوی ہوتا ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ نتائج اسباب کے مطابق ہوتے ہیں۔

حرکت کے مسلسل موجود ہونے سے یہ مراد ہے کہ قدرت ہر وقت قلب ہیئت و تبدیل صورت میں مصروف ہے، اور اُسمیں کسی طرح کی رکاوٹ یا خلل واقع نہیں ہوتا۔ علت اور معلول کا باہمی رشتہ کبھی نہیں ٹوٹے گا، اور نہ کوئی ایسا وقت آئے گا جبکہ سبب نتیجہ پیدا نہ کرسکے۔

(۹) - کیا قدرت معاوضہ دیتی ہے؟

کیا یہ درست ہے کہ مسلسل حرکت یا تبدیل صورت کے پردے میں جو نتائج یا واقعات ظاہر ہوتے رہتے ہیں، وہ بطور معاوضہ ہوتے ہیں؟ بے شک! ایک ہی قسم کے سبب سے جو ایک ہی قسم کا مساوی نتیجہ پیدا ہوتا ہے، وہ ہمارے اُس کام کا جسکو ہم کرتے ہیں، پورا معاوضہ ہوتا ہے۔ حرارت اُس ایندھن کا معاوضہ ہے جس سے وہ پیدا ہوتی ہے۔ بجلی اُس قوت کا معاوضہ ہے جو تبدیل صورت کے بعد اُسمیں آموجود ہوتی ہے۔ پانی کا چھوٹے سے چھوٹا قطرہ ہیڈروجن کے دو اور آکسیجن کے ایک جزو لایتجزیٰ کا معاوضہ (یا مجموعہ) ہے۔ مادہ یا قوت کی ایک خاص مقدار ایک جگہ سے غائب ہو کر ٹھیک اُسی وزن و مقدار میں دوسری صورت میں موجود ہوجاتی ہے۔ جو چیز بادی النظر میں، ہمارے سامنے سے غائب ہوجاتی ہے، اور وہ چیز جو غائب ہوجانے والی کی جگہ اختیار کرتی ہے، پہلی شئے کا معاوضہ ہوتی ہے۔ ایندھن سے گرمی پیدا ہوتی ہے، لہذا گرمی ایندھن کا معاوضہ ہے ہر حالت میں حساب برابر ہے۔ قدرت کے محکمہ میں نفع و نقصان کا حساب نہیں۔ اُدھار اور قرض سے اُسے سخت نفرت ہے۔ وہ معاوضہ دینے میں تساہلی سے کام نہیں لیتی۔

یہ خیال کرلینا کہ کوئی شئے بغیر ٹھیک سبب یا معاوضہ کے طبعی دنیا میں وجود پزیر ہوسکتی ہے، سائنس اور عقل دونوں کے لحاظ سے قابل نفرت ہے۔ واشنگٹن کا پیٹنٹ آفس ایسے ایجادات کو پیٹنٹ کرنے سے صاف انکار کردیتا ہے جو ازلی حرکت پیدا کرنے کے لیے کیے گئے ہوں، کیونکہ سبب کے بغیر نتیجہ اور طاقت بغیر قیمت کے ناممکن ہے۔

(۱۰) - اہم اصول

قوانین قدرت کے باہمی ارتباط و تناسب کے اصول کی جانچ کرتے ہوئے ہم نے اس امر کا مشاہدہ کرلیا ہے کہ نتائج ہمیشہ اسباب کے مطابق ہوتے ہیں۔ منطق و استدلال کا اصل اصول یہی ہے۔ ہم یہ بھی دریافت کرچکے ہیں کہ اخلاق، ریاضیات، طبعیات، اور نیز مسئلہ ارتقاء کی تہ میں بھی یہی اصول کام کررہا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ روزمرہ کے انسانی کاروبار سے لیکر علم کے اعلیٰ درجوں تک یہی اصول صداقت و راستی کا معیار ہے۔ یہ بھی ہم پر ظاہر ہوگیا کہ یہی اصول مادہ اور قوت کے غیر فانی ہونے کے مسئلہ کا مبدا ہے کہ نتائج اسباب کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس کا یہ منشا ہے کہ نتائج ہمیشہ اسباب کا معاوضہ یا قیمت ہوتے ہیں۔ یہ بھی روشن ہوگیا کہ حرکت کے دائمی ہونے کا مسئلہ بھی اسی اصول کی ایک صورت ہے، کیونکہ علت اور نتیجہ کا

تبدیل نہونے والا باہمی تعلق کبھی شکست نہیں ہوتا۔

اب ان مشاہدات کا نتیجہ صاف صاف نظر آرہا ہے کہ نظام عالم کا سلسلہ ایک قانون کے ماتحت چل رہا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ نتائج اسباب کے مطابق دائمی اور صلہ بخش ہوتے ہیں۔ میرا اعتقاد ہے کہ یہ قدرت کا نہایت اہم اعلیٰ، اور واحد اصول ہے، جو قدرت کے تمام دیگر قوانین و مظاہر کا مرجع و مرکز ہے۔

(باقی آیندہ)

مذہب و سائنس

مذہب کی بُنیاد

مذہب کا خیال بہت قدیم اور عالمگیر ہے۔ مسٹر ایڈورڈ بی ٹیلر بھی جو "مُنہ قدیم کے مذاہب و اعتقادات کے مستند محقق ہیں اس کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ اس خیال کی تحقیقات کرتے ہوے کہ دنیا میں ایسی ادنیٰ قومیں بھی موجود ہوں گی جو مذہب سے نا آشنا ہوں، محقق موصوف تحریر فرماتے ہیں :-

..... یہ امر ان اقوام کی حالت سے بہت کچھ مشابہ ہے جن کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کی کوئی زبان ہی نہیں، یا جن کو آگ کے استعمال سے نا واقف سمجھا جاتا ہے، اگرچہ ایسا ہونا ممکنات سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی اقوام دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ خیال بھی کہ زمانۂ قدیم میں چند ادنیٰ درجہ کی لامذہب اقوام موجود تھیں، اگرچہ قیاساً ممکن ہے اور شاید واقع میں صحیح ہو لیکن اس بارے میں کافی ثبوت نہیں ملتے۔ یعنی وہ ثبوت جو اس قسم کی عجیب روایات پر یقین کرنے کے لیے ہم طلب کرنے کے مستحق ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب میں جو اعتقادی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اُس کے متعلق ٹیلر صاحب فرماتے ہیں :-

ایسا مذہب ایک بھی نہیں ہے، جو اپنے اعتقادات کے لحاظ سے دیگر مذاہب سے بالکل مختلف ہو۔ چنانچہ مسیحیت کے موجودہ اصول و خیالات اُن ذہنی و عقلی نشانات سے وابستہ ہیں جن کا سلسلہ مسیحیت سے بہت پہلے انسانی تہذیب و شائستگی کی بُنیاد تک، بلکہ شاید انسانی ہستی کے آغاز تک چلا جاتا ہے۔

مسٹر ہربرٹ اسپنسر تحریر فرماتے ہیں :-

مذہب کے بارے میں ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ باوجود اپنی بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے اُس نے ایک برتر سچائی کا اظہار اور اُس کی اشاعت کی ہے۔ اس اعلیٰ سچائی کو پہچاننا، گو نامکمل اور ناقص طور پر ہی سہی، ابتدائے عالم ہی سے مذہب کا ایک ضروری مقصد رہا ہے۔ اور مذہب نے اپنے مختلف نقائص کی وجہ سے جو کسی وقت بیشمار تھے لیکن رفتہ رفتہ کم ہوتے رہے ہیں، اُس برتر سچائی کا مکمل و صحیح اندازہ کرنے میں بے حد زکیں اُٹھائی ہیں، حتیٰ کہ مذہب مشکل سے اُس کے ایک حصہ کو پہچان سکا ہے۔ "نیکی" ہمیشہ مذہب کا حقیقی مذہبی عنصر رہی ہے، اور غیر مذہبی عنصر وہ ہے جو بلحاظ عقائد "منا یا ٹمار" اور بلحاظ افعال و اعمال "بے عیب" ثابت ہوا ہے۔ اور مذہب نے ہمیشہ اس عنصر سے پاک رہنے کی کوشش کی ہے۔

دنیا کے نظام کو حل کرنے میں مذہب نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے؟ وہ بیج کہاں ہے جو اس عالمگیر اور ترقی پذیر درخت کے پھلنے، پھولنے اور بڑھنے کا

باعث ہوا ہی؟ اُس "برتر سچائی" کا مسکن کہاں ہی جس کی طرف اسپنسر نے اشارہ کیا ہی؟ اور مذاہب کے اعتقادات کی وہ "ہم آہنگی" کہاں نظر آسکتی ہی جس کو ٹیلر نے بیان کیا ہی؟

ان سوالات کا جواب دینے سے قبل اِس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ کیا مذہب سے کوئی خاص مذہب مراد ہی؟ نہین! بلکہ مذہب سے وہی مذہب مراد ہی جس کا اطلاق اُس لفظ "مذہب" پر ہی جو ساری دنیا مین مشترک ہی، یعنی وہ فطرت جو بنی نوع انسان کو مشترکہ طور پر قدرت کی طرف سے بخشی گئی ہی۔

یہ ناممکن ہی کہ مذہب کی نسبت ساری دنیا کا خیال یکسان ہو۔ اسلاف نے اِس مبحث پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہی۔ کسی نے مذہب سے نفرت ظاہر کی، اور کسی نے اس کو صداقت و راستی پر مبنی قرار دیا، کسی نے مذہب کے خیال کو اچھا کہا، اور کسی نے بُرا۔ ہماری یہ آرزو بھی نہین بر آسکتی کہ ہم دنیا کے تمام مذاہب کے درمیان کوئی خاص تعلق یا ہم آہنگی پاسکین، ممکن ہی کہ کوئی فرقہ یا گروہ جو مذہب کا پابند ہونے کا دعوی کرتا ہی حقیقت مین اُسکے اصول بے دینی پر مبنی ہون!

خاص مذاہب یا خاص فرقون کو جانے دیجئے، ہمین مذہب کے "معانی" اُن عام اصولون مین تلاش کرنا چاہئے، جن کے آگے دنیا والون کی ایک بڑی تعداد نے مختلف زمانون مین سر تسلیم خم کیا ہی۔ یا اُن معانی کو خیالِ مذہب کے مستقل مظاہر اور اُن اعتقادات مین ڈھونڈھنا چاہیئے جو کرۂ زمین کے نہایت قدیم باشندگان مین کسی تعلیم و ہدایت کے بغیر یعنی خود بخود پیدا ہوئے اور اب تک زمانۂ موجودہ کے مہذب و شائستہ گروہون مین زیادہ پختہ اور مکمل صورت مین پائے جاتے ہین، اور سب کے آخر مین ہمین اِن کو موجودہ بڑے بڑے مذاہب کے متفقہ و مشترک عقائد مین دیکھنا چاہیئے، کیونکہ موجودہ مذاہب مین قدرتی طور پر صرف وہی مذہبی عقائد موجود ہون گے جو دیگر اعتقادات کے مقابلہ مین موجود رہنے کے زیادہ قابل ثابت ہوے ہین

(۱) معاد اور سزا و جزائے روح

حکیم سقراط کا قول ہی کہ "مجھے کامل یقین ہی کہ مرنے کے بعد انسان پر ضرور کوئی نہ کوئی حالت گذرتی ہی، اور یہ حالت بمقابلہ بدون کی حالت کے نیک لوگون کے لئیے بدرجہا بہتر ہوگی"

مرنے کے بعد سزا و جزا کا خیال بہت قدیم خیال ہی۔ انسان اپنے افعال کی سزا و جزا یا موت کے بعد "کسی خوفناک شئے" سے بحید مؤثر ہوا ہی۔ وہ اس سے بچنے کی ہمیشہ ایسی ہی کوشش کرتا رہا ہی، جیسی کہ خونخوار جنگلی حیوانات طوفان یا آگ سے محفوظ رہنے کے لیے کرتے ہین۔ اِس "کامل یقین" کی وجہ موجبہ کیا ہی؟ علم ہمیشہ محسوسات و مشاہدات سے پیدا ہوتا اور جاری رہتا ہی۔ دنیا کے قدیم باشندون نے بھی مشاہدات ہی کے ذریعے سے علم حاصل کیا، مشاہدات ہی کے ذریعہ سے اُنھون نے یہ دریافت کیا کہ پانی سے پیاس بجھتی ہی، فلان فلان حالتون مین شکار ملتا ہی، غار پناہ دیتا ہی، دو چیزون کے رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہی، آفتاب روشنی اور گرمی کا سرچشمہ ہی، بعض پودے زہر آلود ہین، جاڑے کی شدت پژمردہ کردیتی ہی، بجلی ہلاک کرتی ہی!

شیر خوار بچہ بھی جب اپنا پہلا سبق سیکھتا ہی تو وہ محسوسات کا ہوتا ہی۔ وہ سمجھتا ہی کہ "ماں" خوراک، حفاظت، اور مہربانی کا منبع ہی۔ تھوڑے دن بعد اُسے معلوم ہوتا ہی کہ کوشش کرنے سے وہ چل پھر سکتا ہی۔ پھر یہ معلوم ہوتا ہی کہ بعض اشیا ضرر رسان اور بعض فائدہ مند ہین، بعض تلخ اور بعض شیرین، یہ گرم اور وہ سرد، بعض ہلکی اور بعض وزنی۔ پھر یہ دریافت ہوتا ہی کہ بعض کامون کا نتیجہ اچھا ہی، اور دوبارہ اُن کے کرنے مین کوئی ہرج نہین، فلان کام نقصان دہ ہی، اس لیے اُس سے پرہیز لازم ہی۔ فائدہ بخش کامون کو وہ اچھا سمجھتا ہی، اور نقصان رسان کامون کو بُرا۔ زبان سے پہلا لفظ نکالنے سے پہلے اس کو یقین ہو جاتا ہی کہ فلان اسباب سے فلان نتائج پیدا ہوتے

ہین، یعنی نتائج ہمیشہ اسباب کے مطابق ہوتے ہین!

یقیناً سب سے پہلا مذہبی خیال سزا و جزا کا خیال تھا جو انسان کے دل مین پیدا ہوا، اور کچھ شک نہین کہ اس خیال کی بُنیاد سلسلۂ علل و نتائج پر رکھی گئی تھی، اور اب تک اسی پر قائم ہے۔ یہ ایک ایسا مناسب اصول ہے جو ہر کہ و مہ پر روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ دنیا کے قدیم باشندون نے سب سے پہلے یہی معلوم کیا کہ فلان کام کا نتیجہ اچھا ہے، اور فلان کام کا بُرا۔ اِس علم اور یقین کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اُنھون نے علت و معلول مین ایک خاص تعلق دریافت کر لیا۔

عِلّت و معلول یعنی سزا و جزا کا خیال یا احساس انسان کی سرشت مین داخل ہے۔ جب اُس نے اپنے اُن تعلقات کو معلوم کر لیا جو بیرونی دنیا اور سلسلۂ قدرت سے ہین؛ اور اِن تعلقات کی بنا پر اُس نے ایک ”برتر ہستی“ کا اعتراف کیا، تو یہ فطرتی احساس خود بخود پیدا ہو گیا۔ قدرت کے انسانی تعلقات دو ضروری احکام کے پابند ہین، اور اُس نے زبانِ حال سے قدیم انسان کو یہی پکار کر کہا کہ ”یہ کر“ اور ”وہ نہ کر!“ بالاتر قوتون کی موجودگی مین، جن مین سے بعض خوفناک اور بعض مہربان ہین، انسان کو اُس کی تابعداری کے مادہ نے اِس بات کو یقین کرنے پر مجبور کیا کہ اُس پر ایک صاحبِ اختیار طاقت حکمران ہے، جو زبردست ہے؛ وہ گناہون کی سزا اور نیکیون کا اجر دیتی ہے؛ نیک و بد افعال کا ثمرہ بخشتی ہے۔ جیسے جیسے اسکے فہم و ادراک مین ترقی ہوتی گئی، اُس کی ذمے داری کا دائرہ زیادہ وسیع ہوتا گیا؛ حتیٰ کہ اُس کا خیال اِس دنیوی زندگی سے گذر کر حیات بعد الممات کی طرف رجوع ہونے لگا۔ یہ امر اُس کے دلنشین ہو گیا کہ وہ آئندہ زندگی بہ نسبت بُرے آدمیون کے اچھون کے لیے بہتر ہوگی۔

برنٹن کا خیال ہے کہ ”انسان کے افعال محض فوری فائدہ کے خیال سے نہین ہوتے بلکہ جو فرائض اُس کے ذمے عائد کیے گئے ہین اُن کی غائت بہت ارفع و اعلیٰ ہے، اور کوئی ”برتر ہستی“ اُن کی مقرر کرنے والی ہے“، اِس نظریہ کو قدیم ادنیٰ اقوام نے بہت کم سمجھا، لیکن زمانۂ مابعد کے مذاہب نے رفتہ رفتہ اس کو مکمل طور پر تسلیم کیا۔ دنیا مین اب کوئی بھی ایسا مذہب نہین ہے جو اپنے پیرون کو کسی نہ کسی بالاتر قوت یا قوتون کی کامل اطاعت و ذمہ داری کی تاکید و تلقین نہ کرتا ہو۔

جملہ مذاہب کا سنگ بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ انسان کے اعمال و افعال میزانِ عدل مین تولے جائین گے۔ اس عقیدہ کا اثر نہ صرف موجودہ زندگی مین محسوس ہوتا ہے، بلکہ یہ آئندہ زندگی مین بھی جاری رہتا ہے۔ یہی عقیدہ پرستش و رضا جوئی کا باعث ہے اور یہی تمام مذہبی مسائلِ سزا و جزا، آخرت، نجات، ابدی عذاب، اور بہشت و دوزخ کی بنیاد ہے۔

(۲) بقائے روح کا اعتقاد

مسٹر اڈورڈ ٹیلر فرماتے ہین کہ ”مذہب کی ادنیٰ تعریف روحانی ہستیون کا اعتقاد ہے، جو اُن تمام ادنیٰ اقوام مین بھی پایا جاتا ہے جن سے ہم نے گہرے تعلقات پیدا کیے ہین“، اگر روحانی ہستیون کے اس اعتقاد کو کمال تک پہنچایا جائے اور اُس کے معانی کو زیادہ وسعت دی جائے تو ٹیلر صاحب کے قول کے مطابق اُس کی تشریح ”روحانیات کو ماننا اور حیات بعد الممات کا اعتقاد“ رکھنا ہوگی۔

بقول مسٹر ٹیلر فلسفۂ مذہب کا سنگ بنیاد یہی اعتقاد ہے، جس پر وحشی سے لیکر ترقی یافتہ انسان تک سب یقین رکھتے ہین؛ اور یہی اعتقاد ایک قدیم و عالمگیر فلاسفی قرار دیا گیا ہے۔

گرانٹ ایلن کے خیال کے مطابق ”ایک یا متعدد معبودون پر یقین رکھنے بلکہ نذر و نیاز کے ذریعہ سے جبیثِ ارواح اور دیوتاؤن کی پرستش و رضا جوئی حاصل کرنے کی رسم سے بھی زیادہ اور ضروری ایک اور عنصر ہے، جو مذہب اپنے دیگر عناصر کے ساتھ اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ عنصر ”حیات بعد الممات“ کا خیال ہے۔ آئندہ زندگی کے یقین ہی پر مذہب کی بنیاد قائم ہے“۔

برٹن لکھتا ہے:- "مین تھین کئی ایسے ادنیٰ اور بودے مذاہب کا پتہ دے سکتا ہون جن کا کوئی معبد یا قربان گاہ نہین جو مذہبی رسوم اور عبادت سے محض معرا ہین۔ لیکن کسی ایسے مذہب کا پتہ دینا میرے لیے امکان سے باہر ہے جو روحانی قوتون اور انسان کے باہمی میل جول اور بات چیت پر اعتقاد رکھنے کی تعلیم نہ دیتا ہو"

ٹی الویلا لکھتا ہے:- "گذشتہ بیس سال کی دریافتون نے جو بالخصوص فرانس و بلجیم کے غارون مین کی گئی ہین یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا دیا ہے کہ نہایت ہی قدیم زمانہ کے انسان بھی جنازہ کی رسم ادا کرتے تھے، "آئندہ زندگی" کے قائل تھے، اور دیوتاؤن اور بتون کی پرستش بھی کرتے تھے"

ہکسلے لکھتا ہے:- "بہت سی دیسی وحشی اقوام موجود ہین جو مطلق خدا کی ہستی سے بیخبر ہین، لیکن کوئی قوم ایسی نہین جو خبیثہ ارواح کی قائل نہ ہو"

ہربرٹ اسپنسر کے قول کے مطابق "فنائے جسم کے بعد بقائے روح کا خیال مع اپنے ان لاانتہا اور پیچیدہ قیاسات کے جو اس سے پیدا ہوتے ہین..... دنیا کے تمام حصون مین...... اور ہر جگہ برابر پایا جاتا ہے۔ خیال اُن اقوام مین بھی جو صورت و شکل مین ایک دوسرے سے متنافر ہین اسقدر صفائی کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ ماہرین فن کو مجبوراً یہ رائے قائم کرنا پڑی ہے کہ یہ قومین بحر و بر کی موجودہ تقسیم سے بہت پہلے ہر چہار اطراف عالم مین پھیل گئی تھین حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ ہر نوع کے انسان مین موجود ہے اور ہم اس اعتقاد کو غیر مہذب، نیم مہذب، اور مہذب غرض جملہ اقوام مین یکسان پاتے ہین"

کوئی مذہب بقائے روح کے اعتقاد سے معرا نہین۔ البتہ قدیم عبرانیون کا ضرور یہ عقیدہ تھا کہ فنائے جسم کے بعد روح ایک ایسی مہمل زمینی حالت مین چلی جاتی ہے جس کو کسی صورت مین "زندگی" کے نام سے منسوب نہین کیا جاسکتا۔ گر زمانہ حال کے عبرانیون نے قدیم یہودیون کی مادیت یعنی انکار روح کی تردید کردی ہے۔ چھ سو برس سے زائد مدت تک یہودیون کا ایک فرقہ حشر موتی کا معتقد رہا ہے۔

اہالیان چین نے بھی کنفیوشس کی تعلیم کو غلط قرار دیکر ایک حد تک اسکو رد کردیا ہے۔ کیونکہ کنفیوشس کا عقیدہ روحانیت سے معرا و مبرا تھا، اور چینی مذاہب سراسر روحانیت سے پر ہین۔ کیا یہ تعجب کی بات نہین ہے کہ چینیون کا ایسا واجب التعظیم فلاسفر کنفیوشس اور نہ عہد عتیق کے اور مصنف ہی اپنے پیرون کو "آئندہ زندگی" پر یقین رکھنے سے مستقل طور پر باز رکھ سکے۔

عالمگیر اور پائدار مذہب اُسی کو کہا جاسکتا ہے جو انسان کی حیات بعد الممات پر کوئی حد قائم نہ کرے بعض ایسے معلم بھی گذرے ہین جن کا یہ دعویٰ ہے کہ صرف مستورات یا نااہل لوگ، یا بزرگ و برتر اشخاص ہی اس طبیعی موت کے بعد زندہ رہین گے۔ اور بعض معلمون نے تو یہ فتویٰ بھی دیدیا ہے۔ حیات بعد الممات کوئی چیز ہی نہین لیکن ظاہر ہے کہ ان تعلیمات نے کوئی خاص یا مستقل اثر انسان کے دل پر نہین کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام موجودہ مذاہب فنائے جسم کے بعد بقائے روح کے قائل ہین یعنی وہ یہ قرار دیتے ہین کہ انسان کا سلسلۂ حیات فنائے جسم کے ساتھ منقطع نہین ہوجاتا بلکہ یہ سلسلہ آئندہ بھی برابر جاری رہتا ہے۔

(۴) ایک صاحب اختیار اور اعلیٰ طاقت کا اعتقاد

جہانتک ہمارا علم رہبری کرتا ہے ہم کہ سکتے ہین کہ انسانی ہستی سے بالاتر طاقتون اور قوتون کا اعتقاد ساری دنیا مین پھیلا ہوا ہے۔ ہر مذہب و مشرب کا آدمی ان طاقتون کا قائل ہے حتیٰ کہ دہریئے اور ناستک بھی ان طاقتون کے مقر ہین۔ وہ تسلیم کرتے ہین کہ کوئی ایسی اعلیٰ اور زبردست طاقت موجود ہے جسکو ہم نہین جان سکتے۔

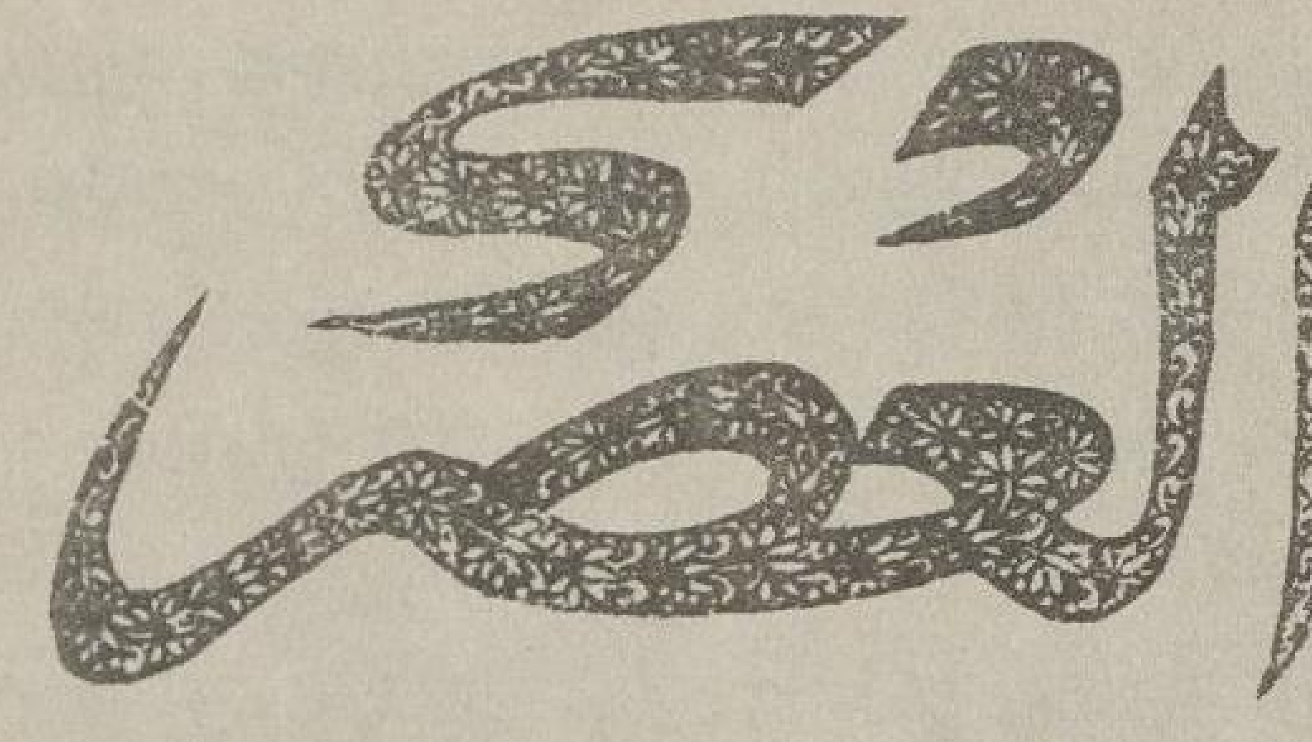
مشہور ہے کہ بودھ مذہب خدا کا قائل نہین، اور اس بنیاد پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مذہب کے لیئے خدا کا یقین لازمی نہین ہے لیکن ہے کہ کسی اعلیٰ

و برتر ہستی (خدا) کا قائل نہو۔ لیکن یہ بات بالکل غلط ہی کہ وہ کسی اعلیٰ منصف طاقت کو تسلیم نہین کرتا۔ بودھ مذہب سے زیادہ کسی اور مذہب مین سزا و جزا کے ابدی اثرات تسلیم نہین کئے گئے جیسا کہ "کرم" کی تعلیم سے ظاہر ہی۔ قدیم انسانون کا خیال کسی صاحبِ اختیار ہستی کی نسبت بہت ہی دُھندلا اور ناممکل تھا۔ وہ اس ہستی کو نہ صرف پہاڑون، چٹانون سورج، چاند، ستارون اور اپنے بزرگون مین پرتو فگن پاتے تھے بلکہ حیوانات مچھلیون، اور رینگنے والے جانورون مین بھی اس کا ظہور پاتے تھے۔ بہرکیف خواہ وہ کسی صورت مین اس برتر ہستی کو تسلیم کرتے ہون، مگر اسمین کلام نہین کہ وہ قوت ان کے لیے ایک منصف اور صاحبِ اختیار ہستی تھی، جس کے آگے ان کا سرِ طاعت خم ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ یعنی انسانی تہذیب و ترقی کے ساتھ ساتھ اِس عظیم الشان طاقت کے متعلق علم بھی وسیع ہوتا گیا۔ پُرانے اور ادنیٰ خیالات کی جگہ نئے اور اعلیٰ خیالات پیدا ہونے لگے۔ توہم پرستی کی جگہ بُت پرستی نے لے لی۔ پھر بہت سے معبودون کی پرستش شروع ہوئی، جو آخرکار "ایک" معبود کی عبادت مین تبدیل ہوگئی۔

قدیم انسان کے تنگ و محدود عقائد کے مقابلہ مین ترقی یافتہ قومون نے اُس سب سے بڑے حاکم اور منتظمِ حقیقی کی طرف نہایت اعلیٰ اور شاندار صفات منسوب کی ہین۔ قدیم آریہ اپنے بڑے دیوتا "ورن" مین؛ ہندو اپنے پرمیشور "برہما" مین؛ عبرانی اور مسیحی اپنے قادرِ مطلق "یہوواہ" مین؛ اہلِ ڈنمارک اپنے مطلق باپ "اودن" مین؛ یونانی اپنے سب سے بڑے دیوتا "زیوس" مین؛ رومی اپنے خدائے عظیم "مشتری" مین؛ اور مسلمان اپنے وحدہٗ لاشریک "اللہ" مین شانِ الوہیت و معبودیت تسلیم کرتے ہین۔ اُس برتر و اعلیٰ ہستی کی قدرت و فضل کے اظہار کے لئے نہایت موزون و مناسب الفاظ اختیار کئے گئے، مثلاً پروردگارِ عالم، الٰہی، حی القیوم، قادرِ مطلق، حاضر و ناظر، زمین و آسمان کا مالک، حاکمون کا حاکم وغیرہ۔ یہ وہ الفاظ ہین جو بالعموم خدا کی طرف منسوب کیے جاتے ہین۔ بہرحال خدا سے مراد وہی خدا ہی، جو نیکون کو جزا اور بدون کو سزا دیتا ہی؛ جو ہمین ہمارے اعمال و افعال کا بدلہ دینے والا، اور ایک صاحبِ اختیار اور منصف حقیقی ہے۔

(باقی)



فلسفہ

اُردو رسالوں مین اِس سے پہلے اس بحث پر جس قدر مضامین راقم کی نظر سے گذرے وہ کچھ ایسے تھے کہ اُن سے فلسفہ کے مفہوم اور ماہیت پر گہری روشنی نہیں پڑتی۔ اس لیے ارادہ ہے کہ اس کی ابتدا اور نوعیت' اور حقیقی معانی پر شرح و بسط سے بحث کر کے اُسے بالکل صاف کر دیا جائے' تاکہ جو لوگ بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کی ہمت نہیں رکھتے یا اُنھیں فرصت نہین ہے' وہ فلسفہ کے معانی اور مفہوم پر بآسانی عبور حاصل کر کے مستفید ہون۔

فلسفہ یونانی الاصل ہے' جو عربی مِیں داخل ہو کر پہلے فارسی اور پھر اُردو مین بھی آ دھمکا۔ اسکے مترادف علم حکمت' علم موجودات حقائق الاشیا' گیان بگیان' ات جوگ وغیرہ وغیرہ ہین۔ فلسفہ کا یونانی ماخذ "فلوس" (PHILOS) اور "سوفیہ" (SOPHIA) ہے جس کے لغوی معنی "شیدائے حکمت" ہین "فلوس" بمعنی شائق اور "سوفیہ" بمعنی دانائی یا حکمت۔ لفظ "فلوسوفیہ" (Philosophia) کو پہلے پہل مشہور یونانی حکیم فیثا غورس نے استعمال کیا تھا۔ دیوجانس لارشیس دبی زبان مین اس اصطلاح کا اسے کو مخترع قرار دیتا ہے۔ مشہور یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس' اور نیز ایک اور یونانی مورخ طسی ڈیس (۴۶۰ ق م) نے لفظ "فلوسوفین" (Philosophein) استعمال کیا ہے جس کے معنی "تجسس علم" یا "تلاش حق" ہیں۔ مگر "شیدائے حکمت" "فلوسوفوس" (Philosophos) سے دراصل جو مراد ہے اُس کا امتیاز پہلی مرتبہ افلاطون کی کتابون مین ملتا ہے۔ اس خیال کی رو سے "فلاسفر" وہ آدمی ہے جو "حقائق الاشیا' یا ہیولائے اول کی ماہیت معلوم کرنے کی جستجو کرتا ہے۔" اسکے خلاف وہ آدمی ہے جو محض موجودات کی علت صوری یا ظاہری صورت کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا ہے۔ حکیم سے مراد بقول افلاطون وہ شخص ہے جو ازلی و ابدی اور غیر متغیر ہستی کی حقیقت سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہے' اور واجب الوجود کی فطرت جاننے کے درپے رہتا ہے۔ مگر افلاطون دینی اور اخلاقی معنی مین لفظ فلسفہ استعمال کرتا ہے۔ اسلیے اُس سے فلسفہ کی یہ تشریح پیدا ہوتی ہے

حقائق الاشیا کی ماہیت سمجھنے کی سعی کا نام حکمت ہے۔" مگر ہم موجودات کی اصل الاصل کس طرح جان سکتے ہیں، اور واجب الوجود کی اصلیت جاننے کے لیے کن طریقون سے کام لینا چاہیے۔ اس کی بابت افلاطون خاموش ہے۔ اُس نے منطق، اخلاقیات، طبیعیات، نفسانیات، نظریۂ علم، مابعد الطبیعیات وغیرہ کو نیم مذہبی ترکیب مین خلط ملط کر دیا ہے مگر ارسطو نے جو زمانۂ سلف کا سب سے بڑا ماہر فن مولا حکیم یعنی قاموسِ متحرک تھا ماہیت اشیا کی تحقیقات کے طریقے وضع کیے اور ایسے طور پر تفریق کی کہ زمانۂ حال تک تسلیم ہوتی رہی۔ ارسطو کے بیان کے مطابق قدیم زمانہ کے فلاسفر علم موجودات (Cosmology) کے شائق تھے۔ اُن کی یہ کوشش تھی کہ مظاہر کے پس پشت موجود فی الذات کی حقیقت کو جانین۔ سقراط اور افلاطون اس مسئلہ کا حل انسان کی اخلاقی اور ذہنی حالت سے بہم پہنچانے کی کوشش کرتے تھے جس کی وجہ سے اول الذکر نیکی علم اور آخر الذکر منطق اور اخلاقیات مین تفریق نہین کرتا، مگر ارسطو نے اپنے اُستادون کے طریقہ سے انحراف اختیار کر کے منطق نفسانیات، اخلاقیات، اور حسنات کو مختلف علوم قرار دیا۔ ہستی کی علت آخری ان سوالات کا الساق قرار پایا۔ اُس کے خیال کی رو سے ریاضی اور طبعی مسائل کی تحقیقات فلسفہ کے زیر اثر ہے۔ اس عالم اور اس کے خالق کے تعلقات فیمابین کی بحث بھی اُنھی کے سپرد ہوئی اور اُس کا نام علم موجودات عقولیہ قرار پایا۔ مگر بعد ازان اُسے مابعد الطبیعیات کے احاطہ مین مقید کر دیا گیا پھر خاص علوم مین قطع و برید ہوئی اور "فلسفہ" اصول اولیہ کے نام سے مشہور ہوا اور علم ہستی (Ontology) کی صورت مین منتقل ہو گیا۔ اس کی تین شاخین نفسانیات، علم موجودات الطبیعیات، اور الٰہیات فطرت ہین جن کا بڑا موضوع روح۔ دنیا اور خدا ہے۔

فیثاغورس نے فلسفہ کی تشریح یون کی ہے: "موجودات باعتبار موجودات کے علم کا نام حکمت ہے۔ چاہیے یہ مسائل انسان کی ہستی سے تعلق رکھتے ہون یا خدا سے، ان کا علم حاصل کرنا فلسفہ کا کام ہے"۔ افلاطون کہتا ہے کہ "خدا اور انسان کی درمیانی مشابہت کو جہان تک ہو سکے جاننے کی کوشش فلسفہ کا کام ہے"۔ ارسطو کی رائے یہ ہے کہ "فنون کا فن اور علوم کا علم حکمت ہے"۔

سر ولیم ہملٹن، اسکاٹ لینڈ کے مشہور فلاسفر کی رائے یہ ہے کہ زمانۂ قدیم اور جدید مین فلسفہ کی تشریح کی بہت کوشش کی گئی ہے۔ مگر تمام تشریحین غیر معین اور بہت مبہم ہین۔ اصل یہ ہے کہ فلسفہ کی تشریح قریب قریب ناممکن ہے۔ اس وجہ سے یہان پر اُس نہایت پرانی اصطلاح کی جامع و مانع تشریح پیش کرنا دشوار ہے۔ یہان صرف بڑے بڑے علمار کے خیالات پیش کیے جاتے ہین جن سے فلسفہ کی اصلیت اور معانی کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

قدیم فلاسفرون کے سوانحی حالات کی کتاب مین دیوجانس لائرشس لکھتا ہے کہ "بعض کہتے ہین کہ فلسفی تحقیقات کی اختراع باربری قومون مین ہوئی تھی۔ ایرانیون مین مجوسی (آتش پرست پروہت) تھے؛ اور بابل اور اسوریہ مین کلدانی تھے (جو اجرام فلکی کی پوجا کرتے تھے اور نجوم کے ماہر تھے)، ہندوستان مین سنیاسی اور جنگلون مین رہنے والے رشی تھے۔ کیلٹ اور گال قوم مین ڈرُوڈ لوگ تھے، فنشیا مین اوکس، اور تھریشیا مین زمول کس اور لبیہ مین اطلس تھا۔

ماخوذ از "مابعد الطبیعیات" حصۂ دوم لیکچر ۳ مرتبہ ولیم ہملٹن۔

اس لفظ سے مراد شمالی افریقہ کے لوگ ہین۔ یونانی اپنے آپ کو سب سے افضل اور برتر سمجھتے تھے۔ اس لیے باقی تمام اقوام کو باربرس کہتے تھے۔ جس کے معنے وہ آدمی جس کی بولی سمجھ مین نہ آئے۔" لاطینی اور انگریزی مین اس سے مراد جنگلی اور غیر مہذب ہے۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹانکہ گیارھوان ایڈیشن جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۰

اہل مصر کے خیال کے رو سے نیلس کا بیٹا ولکن فلسفہ کا موجد تھا کیونکہ اس دیوتا کے پجاری وغیرہ "فلاسفر کہلاتے تھے۔" آگے جا کر وہی مصنف لکھتا ہے کہ "فلسفہ کے تین حصے ہین۔ طبیعیات، اخلاقیات، اور منطق یا علم مناظرہ۔ فلسفۂ فطرت دنیا اور محسوسات ما فیہا سے بحث کرتا ہے، اور فلسفۂ اخلاق انسان کی زندگی اور اُسکے تعلقات سے سروکار رکھتا ہے۔ علم مناظرہ فلسفۂ فطرت اور فلسفۂ اخلاق کے مسائل کی صحت ثابت کرنے کے دلائل اور طریقے بیان کرتا ہے۔ فلسفۂ فطرت کا ارخلاس کے زمانہ تک زور رہا۔ فلسفۂ اخلاق سقراط کے زمانہ مین زور ون پر تھا اور زینو کے بعد ایلیاطکی فرقہ کے حکما پیدا ہوے جو مناظرہ کے اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ اسلاف نے علوم کے ہر شعبہ مین اتنی ترقی نہین کی تھی اور نہ وہ ہندی کی جہندی کرنے کے طریقون سے واقف تھے جیسا اس زمانہ کے عالم ہین۔ اس وجہ سے وہ تشریح کرنے کے طریقے سے بخوبی واقف ہی نہ تھے۔ ارسطو نے اوّل مرتبہ منطقیانہ تشریحات کو رائج کیا تھا۔ اس لیے اب اس زمانہ کے مشہور عالمون اور فلاسفرون کی آرا نقل کرنا مناسب ہے۔ جارج ایچ لُومِس مشہور مصنف تھا۔ اُس نے تاریخ فلسفہ لکھ کر اچھا نام پیدا کیا ہے۔ وہ فلسفہ کی بابت لکھتا ہے کہ "جو تصورات سائنس اور الٰہیات بہم پہنچاتی ہے ان کے انضباط اور تنظیم کے عمل کا نام فلسفہ ہے۔ جیسے جزئیات کے وسیلہ سے حاصل کی ہوئی کلیات کو منضبط کرنے کے عمل کا نام سائنس ہے اسی طرح کلیات کی کلیات کے انضباط کا نام فلسفہ ہے۔ دوسرے لفظون مین اس کے معنی یہ ہین کہ سائنس تو علم بہم پہنچاتا ہے اور فلسفہ اُس کے اصول مرتب کرتا ہے ہر علم کا جداگانہ کام ہے۔ ریاضیات فقط مقدار سے بحث کرتی ہے۔ طبیعیات اور کیمیات کا تعلق بے جان مادہ کے تغیرات سے ہے جاندار اشیاء کے تبدلات کی غور و پرداخت علم الحیوٰۃ (بیالوجی) کا فرض ہے۔ اور سوشیالوجی (علم المعاشرت) کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ بنی آدم کے تعلقات باہمدگر اور نیز اُن کے تعلقات ماضی و مستقبل کی تحقیقات کرے۔ مگر فلسفہ کا کوئی خاص شعبہ علم نہین ہے۔ بلکہ تمام عالم تخیل اُس کے زیر نگین ہے۔ دیگر علوم کا فلسفہ سے وہی علاقہ ہے جو جغرافیہ کا ٹاپوگرافی (تذکرۂ طول البلد) سے ہے۔ تمام علوم اس کے نوکر ہین، اور اس کی خدمات انجام دیتے ہین بلکہ اُس کی غذا اور زیست کا کام دیتے ہین۔ فلسفہ علوم کی کمائی کو ضابطہ مین ڈھالتا اور ان کے حقائق کو اصول کے قالب مین ترتیب دیتا ہے۔ تھیالوجی تصورات دینیہ اور سائنس نظام عالم کے خیالات بہم پہنچاتا ہے۔ مگر فلسفہ ان دونون کے تصورات کو ایک دوسرے سے جدا کرتا اور ایک اصول بہم پہنچاتا ہے جس سے دنیا کی ابتدا اور انسان کی ہستی کے مقصد کی تشریح و توضیح ہوتی ہے۔

ٹامس ہابس کی راے مین فلسفہ "تعلقات علتی کے علم کا نام ہے۔ دے کارٹ کے نزدیک "ممکن الادراک اشیا کے کامل علم" کا نام فلسفہ ہے، اور اس مقصد سے اُس نے ایک سب سے اعلےٰ اور آخری اصول معلوم کرنے کی ضرورت ظاہر کی جس سے علم کا ہر جز معقولیات سے استخراج ہو سکے۔ جرمن فلاسفر ولف کے خیال مین فلسفہ "ممکنات کے علم" کا نام ہے۔ کانٹ نے فلسفہ کی تشریح یہ کی ہے کہ تصورات سے استدلال کر کے جو علم حاصل کیا جائے۔ فِکٹ کے نزدیک فلسفہ "علم العلم" ہے۔ ہیگل نے فلسفہ کی تشریح کرتے ہوئے اُسے "قادر علی الاطلاق کا علم" قرار دیا ہے۔ ہربارٹ کہتا ہے کہ "تصورات کی ترتیب اور تشریح کا نام فلسفہ ہے۔ پاؤل زن لکھتا ہے کہ "سائنسی علوم کا لب لباب" فلسفہ ہے۔ بینگ اور لیبیں کے خیال مین تجربات معنوی کے سائنس کا نام فلسفہ ہے۔ وونٹ کہتا ہے کہ "خاص علوم کے وسیلہ سے جو ہر قسم کے معلومات

لہ "مقدمہ ملاحظہ ہو۔"

حاصل کیے جاتے ہین۔ انھین ایک اصول اعظم کے تابع کرنے کے عمل کا نام فلسفہ ہے۔ جرمن فلاسفر یورَیب ویگ نے جو تشریح کی ہے وہ آجکل کے خیال کی مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فلسفہ اصولیات کا علم ہے۔ جرمن پروفیسر ویبر لکھتا ہے کہ کائنات کے جامع خیال کی جستجو اور تجسس یعنی موجودات کی جامع ومانع توضیح کی کوشش کا نام فلسفہ ہے۔ یہ علوم کا فقط خلاصہ ہی نہین۔ بلکہ ان کا اختتام اور تکمیل بھی ہے یہ علم اعظم اور خصوصیت فن ہے جو سائنس خاص سے متفرق ہے ...... علوم بغیر فلسفہ جسم بغیر روح کے ہے۔" پروفیسر چارلس ڈبرے لکھتے ہیں کہ "لفظ فلسفہ کا اطلاق محسوسات کے اصول اعلےٰ کے علم پر ہوتا ہے۔" آنریبل پروفیسر ہربرٹ اینڈ لکھتے ہین کہ فلسفہ کا مقصد اولی علم ہے، اور یہ وہ علم ہے جس سے علوم اتحاد و یگانگت قبول کرکے ایک ضابطہ کی صورت مین حبابؔ ہوتے ہین۔" "دنیا کی حقیقی ماہیت کی باقاعدہ تحقیقات کا نام فلسفہ ہے۔" ہربرٹ اسپنسر کی رائے نہایت وقعت کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "کلیات کے اعلیٰ ترین علم کا نام فلسفہ ہے۔ .... فلسفہ کامل منضبط علم کا نام ہے۔" پروفیسر ولیم جیمز جو اس زمانہ کے نہایت مشہور فلاسفر سمجھے جاتے ہین لکھتے ہین کہ لفظ فلسفہ زیادہ تر عالمگیر وسعت کے خیالات پر عائد ہوتا ہے۔ موجودات کے پس پشت کیا اصول ہین جس سے ان کی تشریح کی جاتی ہے؟ انسان، حیوان، اور پتھر کے عناصر مشترکہ کیا ہین؟ کائنات کے اندر انقلابات کیسے ہوتے ہین! اور ان کا کیا حشر ہوگا؟ ہمین اشیاء کا علم کس طرح ہوتا ہے؟ اور انسان کے کردار کے بڑے بڑے اصول کیا ہین؟ یہ سب فلسفہ کے خاص مسائل سمجھے جاتے ہین۔" "موجودات کا علم علل آخری کے وسیلہ سے جہان تک عقل کی دسترس ہے حاصل کرنے کا نام فلسفہ ہے۔" اب سب کے اخیر مین فرانس کے مشہور فلاسفر "وکٹر کوزان" کے خیالات کا اقتباس بھی ضروری ہے جس سے ہمارا مفہوم بخوبی ظاہر ہو جائیگا۔ "فلسفہ قوت متفکرہ کی کامل نمود ہے فلسفہ تصورات کی پوجا ہے۔ یہ تخیل کے ہر غیر خارجی عنصر اور صورت کی آخری فتح ہے۔ اور یہ ذہانت اور آزادی کی اعلےٰ ترین صورت ہے فلسفہ تخیل کی سب سے بڑی ترقی اور سب سے بڑا استحقاق ہے۔ فلسفہ نور الانوار اور تمام سندون مین سب سے بڑی سند ہے۔ الغرض فلسفہ موجودات کے ادراک اور توضیح کے عمل کا نام ہے۔" پھر فٹ نوٹ ذیلی حاشیہ مین موسیو کوزان کہتا ہے کہ "کوئی ایسا فلاسفر نہین ہے جس نے فلسفہ کی یہ تشریح نہ کی ہو کہ وہ سب سے بڑی سند اور نورون کا نور ہے۔ افلاطون اسے شاہی علم" قرار دیتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ "فلاسفر سے وہ آدمی مراد ہے جو سب باتون سے واقف ہو اور سب مشکل مسائل کو سمجھتا ہو۔ علوم فلسفہ سے زیادہ ضروری تو ہین مگر اسکے برابر عمدہ نہین ہین۔ فلسفہ جملہ علوم کا سرتاج ہے، سب پر حکمران ہے، اور ہر واقعہ کی علت کی بحث کرتا ہے۔ فلسفہ سب علوم سے بڑھ کر آزاد ہے یعنی کسی کا محتاج نہین ہے۔ یہ اپنا مقصد آپ ہی ہے۔"

امید ہے کہ ان مختلف فلسفی اقتباسات سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ فلسفہ کیا ہے؟ اور اسکی ماہیت اور حقیقت کیا ہے؟ فلسفہ کی ایسی جامع تشریح پیش کرنا جیسے اقلیدس یا ریاضیات کے کسی مسئلہ کی ہوسکتی ہے بہت مشکل ہے۔ ہر فلاسفر اپنے خیال کے مطابق اسکا مفہوم ادا کرتا ہے۔ عامیانہ معنے مین فلسفے

---

۵۱ یہ تمام تشریحات کولپ کی "تمہید فلسفہ" (صفحہ ۱۰۰۹-۱۲۰۱۱) سے ماخوذ ہین

۵۲ "تاریخ فلسفہ" صفحہ ۲-۱ ۔ ۵۳ "مسائل فلسفہ" صفحہ ۱۳۹

۵۴ "تاریخ فلسفہ" پروفیسر ویب صفحہ ۱۰

۵۵ "فرسٹ پرنسپلز" صفحہ ۱۰۲-۱۰۴

۵۶ "مسائل فلسفہ"

۵۷ "ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی" صفحہ ۲۳-۲۵۰۲۴ پہلی جلد

مراد دنیاوی معاملات کی معقول واقفیت ہے۔ نظر غائر سے کسی معاملہ کو دیکھنا بھی اسی کے تحت مین آتا ہے فلسفہ لغوی طور پر یونان مین شروع ہوا جو ابتدا مین وہان پر مشاہدۂ فطرت، تغیرات موجودات، اور انکی علت غائی کی تحقیقات سے وابستہ تھا۔ کچھ عرصہ تک طبیعیات اور طبعی مظاہر کی تفتیش اسکا بڑا مقصد رہا۔ پھر انسان اور اسکے تعلقات زمانی اور مکانی اور روزانہ زندگی کے کاروبار فلسفیانہ تجسس کا اہم مبحث بنے ارسطو نے اسکی کھال اُتاری اور اسکے اجزا الگ الگ کرکے مظاہر قدرت کو مظاہر فطرت انسانی سے بالکل جدا قرار دیا اور ان ہر دو قسم کے مظاہر کی علت العلل، کائنات کے پسِ پشت ہستی یعنی ارض وسما کے خالق اور یہ کہ اسکے تعلقات انسان اور دنیا کے ساتھ کیا ہین؟ اُن کی تحقیقات مابعد الطبیعیات کے سپرد کی۔ بعد کے زمانون مین جو علمی ترقیان ہوئین وہ اسی قاعدہ کی پابندی کے ساتھ ہوتی رہین۔ زمانۂ حال کے محققون نے قُدما کے راستہ پر چلنے سے انکار کیا اور فلسفہ اور سائنس کا دائرۂ عمل الگ الگ کردیا۔ لیکن جب اس لفظ سے مراد انسان کی عقلی قوت کا اپنے اردگرد اور اوپر نیچے کے واقعات اور اسباب کی طرف خصوصیت سے رجوع ہونا لیا جائے تو فلسفہ کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب انسان کے اندر سوچنے کی طاقت پیدا ہوئی۔ جب یہ کیفیت ہے تو انسان کی توجہ سب سے پہلے قدرتی واقعات کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پھر اُن کے اسباب کی تحقیقات کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ فلان قدرتی واقعہ کس وجہ سے ہوے؟ دونون کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ پھر ان دیدنی مظاہر قدرت کے سلسلہ کا غیر دیدنی اسباب سے کیا علاقہ ہے؟ پھر ان سب کا آخری سبب کیا ہے؟ اور عالم کے اندر جو مختلف انقلابات دیکھے جاتے ہین یہ کیون ہوتے ہین؟ اور ان کا محرک اصلی کون قوت یا ہستی ہے؟ اسکے ساتھ میرا کیا واسطہ ہے؟ موجودات اور میرے درمیان کیا نسبت ہے؟ پھر ہم دونوں کا غیر وجود مطلق کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اور ان تینون کے باہم دگر کیا تعلقات ہین؟ رفتہ رفتہ یہ سب سوالات فلسفہ کے موضوع قرار پائے۔ اسلیے تمام اسباب پر نظر ڈال کر فلسفہ کی مختصر تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ "وجود مطلق اور اسکے تعلقاتِ عالم وانسان اور پھر ان تینون کے تعلقات باہدگر کی تحقیقات اور عالمِ اسباب کے مظاہر مرئی اور ان کے غیر مرئی محرکات کا علم حاصل کرنے کا نام حکمت یا فلسفہ ہے۔ اسکے ساتھ ہی اس علم کا طریقۂ تحقیقات اور عقل انسانی کی قوت مدرکہ اور ہمارے حاصل کردہ علم کی صحت اور کمالیت کا مسئلہ بھی اُسی سے وابستہ ہے جو فلسفہ مین شامل ہے"۔

فلسفہ کے مسائل کیا ہین اور انھین وہ کس طریقہ سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے؟ یہ بھی دلچسپ بحث ہے جس پر اس اہم بحث کو الوداع کہنے سے پیشتر بحث کرنا مناسب ہے۔ فلسفہ بعض خاص آدمیون کا خواب نہین ہے بلکہ فطرت انسانی کی ابتدائی ضرورت کی لازمی نمو ہے۔ تخیل انسان اور حیوان کے درمیان سب سے بڑا مابہ الامتیاز ہے۔ فلسفہ کا مبدأ انسان کی قوت متفکرہ ہے۔ دوسرے لفظون مین اسکے یہ معنی ہین کہ فلسفہ کے مسائل وہ تصورات ہین۔ جو انسان کی زندگی پر حکمران ہین۔ بقول کوزان "فلسفہ عقل کا بیٹا ہے"۔ فطرت انسانی کی ضروریات یعنی بڑے بڑے تصورات (۱) سودمندی اور استفادہ کا خیال جو ریاضیات طبیعیات۔ صنعت وتجارت اور اقتصادات کے متعلق کوششون سے ظاہر ہے۔ (۲) عدل کا خیال جس کے سبب سے حکومت وجود مین آتی ہے تاکہ خود غرضون کو راہ انصاف پر چلنے کو مجبور کرے۔ اسی سے علم اخلاق پیدا ہوا ہے۔ (۳) حسن کا خیال، انسان خوبصورت

چیزون کا طبعاً شیدا ہے۔ اس سے علم حُسن وجود مین آیا۔ (۴) خدا کا عقیدہ جو ہر ایک دل مین فطرتی ہے۔ یہ الٰہیات کا بانی ہوا ہے۔ اور (۵) ان خیالات مین سب سے اعلےٰ و بالا سچائی (سچ) کا خیال ہے جسے دوسرے لفظون مین ہستی و نیستی کا مسئلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ حق کیا ہے؟ وہ کونسی چیز ہے جسے زوال نہین اور جو ہمیشہ جون کی تون رہے گی؟ اس سے مابعد الطبیعیات کی عقل کو حیران کرنے والی اشیاء معرض ہستی مین آئی ہین یا ان تصورات کو فلسفی طریقہ مین یون کہنا مناسب ہوگا کہ (۱) سب سے مقدم نظریۂ عالم کا جامع تصور ہے۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ علوم موجودہ کے جتنے مختلف پہلو ہین اُن سب کو مدِ نظر رکھا جائے یعنی عالم کی بابت کتنے قسم کے خیالات ہین؟ کن کن علوم کے سربراہون نے انھین قائم کیا ہے؟ اگرچہ اس سے اُن خیالات کی صحت کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ عالم کی بابت وسیع سے وسیع خیال قائم کیا جائے۔ اسکے علمی اور عملی دو پہلو ہین۔ کیونکہ تصور عالم ہماری زندگی پر ایک حد تک حکمران ہے۔ (۲) فلسفہ سائنس کے مقدمات کی حقیقت کا بھی کھوج لگاتا ہے۔ اس سے ظرف، زمان، سببیت وغیرہ کے تصورات اور نیز سائنس کی تحقیقات کا طریقہ اور اُسکی مختلف صورتون پر بھی بحث لازم آتی ہے فلسفہ تمام علوم کے واقعات جیسے کیمیات، علم الحیوٰۃ، تشریحات، افعال الاعضا، جغرافیات، ارضیات، فلکیات، طبیعیات، اقتصادات، ملکیات، (پالیٹکس)، علم المعاشرت، دینیات، تاریخ، لسانیات وغیرہ پر آزادانہ نظر ثانی کرکے اُنکی صحت اور معقولیت کی بابت اپنا فیصلہ صادر کرے۔ (۳) طبقہ مین فلسفہ کا یہ کام ہے کہ خاص اور نئے علوم اور خاص تحقیقی علم کے لیے رستہ تیار کرے۔ مابعد الطبیعیات ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے علوم کے تسلسل مین بہت جگہ رخنے ہین جنھین موقوف کرنا ضروری ہے۔ فلسفۂ تاریخ مین اس قسم کی کوتاہیان نہین ہین سائنس کے کئی شعبون مین ابھی تحقیقات کی بڑی گنجائش ہے اس وجہ سے فلسفہ کی تنقید سے یہ خامیان دور ہوکر علوم کا سلسلہ برابر قائم رہیگا۔

اس حصۂ مضمون پر قدرے وضاحت سے بحث کرنے کی ضرورت ہے فلسفہ کے پُرانے مسائل کی تفصیل یہ ہے۔ (۱) حقائق کی تحقیقات محسوسات یا عالم پر گہری نظر۔ (۲) اس سے کاسمولاجی (موجودات اور آفرینش) بیالوجی (علم الحیوٰۃ) یعنی جاندارون کی نسبت تحقیقات سائیکالوجی (علم النفس) یعنی انسان کی ذہنی اور اخلاقی کیفیتون کی غور پرداخت اور تھیالوجی (الٰہیات) یعنی خدا کو دنیا کا سبب اولین قرار دے کر اُسکی نسبت سوچ بچار کے مطالعہ اور تجسس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ (۲) حقائق کے علاوہ ذہنی یا تخیلات کی تحقیقات بھی لازم آتی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان اصولون پر غور کرنا ضروری ہے جن کی پابندی سے انسان کسی مسئلہ پر استدلال کرتا ہے۔ اس سے منطق اور علم الحسنات (ایس تھیٹکس) جس سے پسندیدہ چیزون کے حصول کے آدرش ظاہر پاتے ہین، اور اخلاقیات کی تحقیقات جس سے اخلاقی قواعد کے مطابق ہماری کردار ہدایت پاتی ہے ضرور ٹھہرتی ہے۔ (۳) حقائق اور تخیلات کے درمیان ایک اور علم حائل ہے جو ایسٹمالوجی کہلاتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ ہمارے خیالات کس حد تک حقائق کی اصلیت سے مطابقت کھاتے ہین۔ اس سے ظاہر ہوا کہ فلسفہ کے دو بڑے عالم ہین جنکی موجودات سے اسکا سروکار ہے۔ اول عالم محسوسات جو عالم اور انسان پر حاوی ہے۔ خدا کا اُن دونون سے کیا تعلق ہے؟ اسکے بعد علم اور حقیقت (معلومہ) کے تعلق درمیانی کا علم (Epistemology) ہے (دوم) عالم خیال۔ جس مین (۱) تخیل۔ (ب) اظہار منتہائے کمال اور (ج) کردار انسان ہے۔

چونکہ انسان ہی ان تمام مسائل کے حل کرنے کے درپے رہتا ہے اس وجہ سے اسی سے شروع کرنا چاہیے یعنی سب سے پہلے یہ مسئلہ ہے کہ انسان کو موجودات کا علم کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اس وجہ سے تعلم و تحسیس اور تفصیل سے بحث لازم آتی ہے۔ بعدازان ان تینون عمل کے قواعد پر غور کرنا مناسب ہے۔ علم کی قدر و قیمت پر بحث کرنے کے بعد ہم عالم انسان اور خدا کی ہستی پر غور کرنے کے قابل ہو جاتے ہین۔ اس لیے فلسفہ کے مسائل چار گروہون مین منقسم ہونے چاہئین۔

اول۔ ذات یا من ([illegible]) کی مختلف حالتون کی تحقیقات ہے۔ اس سے سائیکالوجی کی ضرورت ہے۔ اور یہ تین بڑی کیفیتین ہین۔ (ا) شعور ادراکیہ۔ (ب) شعور جذباتیہ (ج) شعور فعلیہ۔

دوم۔ اصولیات یا علوم قانونیہ۔ (ا) قانون تخیل، منطق (ب) علم حسنات۔ (ج) کردار اور ارادت (اخلاقیات)

سوم۔ عمل ادراکیہ کا معلومات سے کیا تعلق ہے؟ یہ اپس ٹمالوجی یعنے عالم اور معلوم کے متعلق باہمدگر کا مسئلہ ہے۔

چہارم۔ فلسفیانہ تحقیقات یا مابعد الطبیعیات۔ اسکے تحت مین تین وجودون کی ماہیت کے متعلق مسائل آئے ہین۔ (ا) دنیا۔ (۲) انسان۔ (۳) خدا۔

قصہ کوتاہ سائیکالوجی، منطق، حسنات، اخلاقیات، اپس ٹمالوجی، مابعد الطبیعیات، کاسمولوجی، فلسفہ ذہن، اور الہیات کے مسائل فلسفہ کے دائرۂ عمل مین آتے ہین۔ ان کی جداگانہ صورتون کو سوا نفقت دینے اور اتحاد و انضباط کے شکنجے مین کسنے والا یہی فلسفہ ہے۔

فلسفہ کی ابتدا کی بابت افلاطون اور ارسطو کا یہ خیال ہے کہ تعجب یا حیرت سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ جب کوئی امر پیش آتا ہے جبتک اس کی توجیہ نہو جائے ذہن پریشان رہتا ہے اور ان اسباب اور اصولیات کی تفتیش کرنے مین مصروف رہتا ہے جو ایک واقعہ کے محرک اور موجب ہوتے ہین۔ غور و فکر اور تحقیقات حکمت کی ہستی کے بڑے رکن ہین۔ اور انسان کی قوت مدرکہ اور طاقت متفکرہ پر اس کا دارومدار ہے۔ منطقیانہ قاعدہ سے استدلال کرنا جس مین طریقۂ استقرا اور استخراج دونون شامل ہین۔ فلسفہ کا دستور العمل ہے جس سے وہ نہایت مشکل مسائل پر بحث کر کے معقول حل بہم پہنچاتا ہے۔

سردست اس مقام پر اسی بحث سے رخصت لی جاتی ہے۔ بشرط فرصت آئندہ فلسفہ کے عظیم مسائل پر بحث ہوگی۔ اس مضمون کا مقصد شائقین کو پیچیدہ بحثون کے لیے تیار کرنا ہے اسی وجہ سے قدرے تفصیل سے کام لیا گیا۔ کہ آئندہ کے لیے راستہ صاف ہو جائے۔

جے۔ آر۔ راے

العصر (۱)

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

عصر، زمانہ، دور، دوران، گردون، دہر، وقت، روزگار، وغیرہ ایک ہی قسم کے الفاظ ہین اور عموماً ایک ہی معنی مین استعمال ہوتے ہین عصر یا زمانہ کی بابت مختلف رنگ مین بحث کی جاتی ہے ۔ مذہب اور دین بھی اس بحث مین حصہ لیتا ہے اور فلسفہ بھی اس کوچہ سے گزرتا ہے ریاضی بھی اس سے ایک حد تک مانوس ہے ۔ ان تمام بحثون مین اگر بعض امور مین اتفاق ہے تو بعض مین اختلاف بھی ہے ۔ بعض وقت بحث کی طنابین یہان تک کھنچ جاتی ہین کہ

(الف) ایک فریق اس کا اعتراف کرتا ہے

(ب) اور دوسرا اختلاف ۔

شروع ہی مین یہ بحث کی جاتی ہے کہ زمانہ کا وجود خارج مین پایا جاتا ہی یا نہین ؟ اور یہ کہ زمانہ درحقیقت ہے کیا ؟ ۔

جو لوگ زمانہ کی ہستی کے منکر ہین وہ یہ کہتے ہین (۱) کہ اگر زمانہ موجود ہے تو تین حال سے خالی نہین

(الف) ماضی

(ب) حال

(ج) مستقبل

(۲) ظاہر ہے کہ ماضی او مستقبل موجود نہین ۔ اس حالت مین لامحالہ زمانۂ حال موجود ہونا چاہئے ۔ اگر زمانہ حال بھی موجود نہین تو پھر سرے سے زمانہ کا وجود ہی کالعدم ہوگا کیونکہ ماضی اس کا نام ہے جو گزر چکا ہو اور مستقبل وہ ہے جو آیندہ آنے والا ہے ۔

اگر حال کی ہستی ہی نہین ہے تو پھر زمانہ کی ہستی بھی نہین ہے اور دوسری طرف ہم زمانہ کو موجود مان چکے ہین ۔

(۳) لامحالہ زمانہ حال موجود ہوگا اور یہ محال ہے کیونکہ اگر موجود ہے تو منقسم ہوگا یا غیر منقسم ۔ پہلی صورت باطل ہے کیونکہ عندالاقسام وہ قار[1] ہوگا یا غیر قار اور یہ امر بالبداہت ثابت ہے کہ قار نہین ہے ۔ اگر غیر قار ہے تو موجود یعنی زمانہ حال کے بعض اجزا گزر چکے ہون گے ۔ اس صورت مین وہ حاضر یا موجود نہین رہے گا ۔

(۴) اگر منقسم نہین ہے تو جزو ثنائی کی بابت بحث باقی رہے گی اس صورت مین زمانہ کی ترکیب آنات[2] متتالیہ سے ہوگی ۔

آنات حرکت پر مترتب ہین اور حرکت مسافت پر ۔ اس صورت مین جسم کا ترکب اجزاے غیر متجزیہ سے لازم آئے گا اور وہ باطل ہے ثابت ہوا کہ زمانہ کا موجود فی الخارج ہونا باطل ہے ۔

جب یہ بحث کی جاتی ہے کہ زمانہ ہے کیا تو کوئی کہتا ہے کہ وہ فلک اعظم ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ اسکی حرکت کا نام ہے ۔ کوئی اس امر کا قائل ہے کہ اس سے مراد نفس حرکت ہے ۔ کسی کا خیال ہے کہ جوہر مجرد واجب لذاتہ ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ زمانہ کم متصل غیر قار مقدار الحرکت کا نام ہے ۔

---

[1] قار سے مراد قرار گیرندہ ہے یعنی بصورت تقسیم کے ایک وجود کی نسبت یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ بہ حد ذاتہ مستقر ہے ۔

[2] آنات سے مراد اوقات اور متتالیہ سے مراد متواتر یا پے در پے رونده کے ہین ۔

یہ اصطلاحی اور موجزہ الفاظ ہین ۔ علمی مباحث مین ایسے الفاظ لاتالابدی ہے کیونکہ اصطلاحات اور بحث علمی مین ایجازی تراکیب سے کام لینا ہی ایک صنعت ہے ۔

اس تعریف کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ہم دو ایسی حرکتین فرض کرتے ہین جو سرعت اور بطوءمہ مین مختلف ہین اور ایک ہی ساتھ شروع ہوتی ہین اور ایک ہی ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہین۔ یا یہ کہ شروع کے ساتھ ہی خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حرکت سریعہ نے بمقابلہ حرکت بطی کے زیادہ مسافت طے کی ہوگی اور اس صورت مین لامحالہ دونون حرکتون کی ابتدا اور انتہا کے درمیان کوئی ایسی چیز ہوگی جس سے دونون حرکتون کا اندازہ ہو سکے اور وہ دونون مین برابر ہوگی۔ ان حالات مین وہ چیز نفس مساوات تو نہین ہے کیونکہ دونون مختلف ہین اور نہ دونون متحرک کیونکہ یہی آپس مین مختلف ہین، اور یہ بات ظاہر ہے کہ مابہ الاشتراک مابہ الاختلاف کے علاوہ کوئی چیز ہے کہ علاوہ متحرک حرکت مسافت کے ایک دوسری چیز ہے اور اس کا نام زمانہ ہے یا اُسے دوسرے الفاظ مین زمانہ کہتے ہین۔

ان دونون اہم سوالات یا دونون بحثون کی بابت جن مسلسل اور جن براہین کا ذخیرہ مہیا کیا گیا ہے وہ ظاہر ہین۔ اگرچہ الفاظ کے مفاہیم کے اغلاق کی وجہ سے بہت ہی وقیع ثابت ہو لیکن اس کا بہت ساحصہ محض الفاظ کی بھرتی ہی ہوگی جو موصل علی المقصود بہت مشکل سے ہو سکتے ہین اور علمی رنگ مین باعتبار فلسفی عظمت کے اُن سے ایسا فائدہ متصور نہین جس کا خصوصیت کے ساتھ اعتراف کیا جا سکے۔

اس قسم کی مغلق اور پیچیدہ بحثین اُس حالت مین پیدا ہوئی یا پیدا ہوتی ہین کہ دہر یا زمانہ یا گردون کی تعریف ایسے الفاظ مین کی جاتی ہے جو بجائے خود مشکل مین ڈالنے والے ہین۔ فلسفۂ عامہ جو کامن سنس اور طبعی اجتہادات کے ماتحت ہے ایسی بحثون سے گریز کرتا ہے۔ اس مین وہ راہین تلاش کی جاتی ہین۔

عملی رنگ مین مفید ہون۔

طبعی اجتہاد کے ماتحت ہون۔

زیادہ تر طبعی استدلال کا پہلو رکھتی ہون۔

طبعی اجتہاد یا طبعی استدلال ہمیشہ دقتون اور مشکلات سے ایک بڑی حد تک محفوظ ہوتا ہے اور اُس مین اُس سیر کی جھلک اور اُس سہولت کی جھلک پائی جاتی ہے جو قانون وہبی کے ماتحت ہوتی ہے یا اُسکا ظن بہت سے فلسفی مسائل دراصل مغلق اور پیچیدہ نہین ہین لیکن انھین دیدہ دانستہ پیچیدہ اور مغلق بنایا گیا ہے۔

العصر یا زمانہ کی بحث جو اسقدر پیچیدہ ہوگئی ہے اور دہر کے جھگڑے جو اس قدر مغلق ہوتے جاتے ہین اُس کی یہ وجہ نہین کہ دراصل زمانہ اور العصر یا دہر بجائے خود بھی ان دقتون کا موجب ہو رہا ہے بلکہ یہ کہ ہم خود ہی یہ مشکلات پیدا کر رہے ہین۔ حکیم سنیکا نے سچ کہا ہے کہ فلسفہ محض الفاظ ہی مین متدایر نہین رہ سکتا۔ اس کے اور پہلو بھی قابل بحث ہین۔ اگر سادہ طور پر زمانہ یا روزگار کی تعریف یا بحث کی جائے تو سننے والون کے دلون مین وہ الجھنین نہین پیدا ہو سکتین جو اس وقت مغلق بحثون سے پیدا ہوتی ہین۔ ہر شخص اپنے اپنے رنگ مین زمانہ اور وقت کی بابت غور اور خوض کر رہا ہے۔ اگر کسی سے سادہ طور پر پوچھا جائے کہ تم زمانہ سے کیا مراد لیتے ہو تو یقیناً اس کا جواب اگر اورون کے لئے چندان طمانیت بخش نہین ہوگا تو خود اس کے واسطے تو ایک حد تک تسلی بخش ہوگا۔ نہ تو اُس سادہ جواب مین قار اور غیر قار کی بحث ہوگی اور نہ آنات اور متتالیہ کی بھرمار۔ سیدھے سادھے الفاظ مین وہ سب کہدیا جائیگا۔

کچھ شک نہین کہ علمی بحثین عام اطلاقات سے جدا اور نرالی ہوتی ہین لیکن نہ اسقدر کہ اُن سے حقیقت ہی گم ہو جائے۔ ہم اپنی زندگی مین شات حالتین یا سات کیفیتین پاتے ہین :-

(الف) اپنی ذات یا اپنی حالت۔

(ب) دوسرون کی ذات یا دوسرون کی حالت۔

(ج) اپنا احساس۔

(د) دوسرون کا احساس۔

(ر) وہ حالت یا وہ سمان جس مین یہ سب حالتین یا کیفیتین منقسم ہوتی یا پائی جاتی ہین۔

(د) وہ حالت یا وہ کیفیت جو ان سب سے الگ ہے۔

(ز) وہ حالت یا وہ کیفیت جو ان سب پر حاوی ہے۔

یہ سات کیفیتین یا سات حالتین کل موجودات پر محیط ہین یا سب موجودات ان کے تحت مین ہے۔ زندگی، وجود، عدم، وقت، روزگار، عصر، دہر وغیرہ ان ہی سات حالتون یا سات کیفیتون مین متداثر ہین۔ چاہے ان مین سے کوئی حالت یا کوئی کیفیت ہمارے احاطہ ادراک اور دائرۂ احساس سے باہر ہو اور چاہے اندر، چاہے ہماری وہان تک رسائی ہو یا نہ ہو، ہم اُس سے آشنا ہون یا نہون ان کی ہستی اور اُن کے وجود سے ہم کسی صورت مین انکار نہین کرسکتے اور نہ ہمارا انکار اُنکی ہستی کے مقابلہ مین کوئی قیمت یا کوئی وقعت اور صداقت رکھتا ہے۔

ہم اور دیگر موجودات جس کو ہم نباتات، جمادات، اور حیوانات سے تعبیر کرتے ہین وہ ایک ایسے - مین رہتی ہے جسے ہم رات اور دن سے تعبیر کرتے ہین یا ایک ایسے فرضی خلا یا واقعی خلا سے جو کل موجودات کے واسطے بمنزلہ ایک عالیشان شامیانہ کے ہے عامیانہ یا عرفی اصطلاح یا الفاظ مین اس شامیانہ کا دوسرا نام زمین و آسمان یا وہ موجودات اور کیفیات ہین جو اس شامیانہ کے اندر یا باہر تحت فوق پائی جاتی ہین۔ اس عالیشان شامیانہ کا تحت اور فوق کیسی ہی گہرائی اور بلندی رکھتا ہو لیکن ہم اس کے اندر یا اُسکے فرضی اور واقعی خلا مین رہتے اور زندگی کے دن پورے کرتے ہین اگر ہم چاہین کہ اس خوشنما آرام دہ شامیانہ سے نکل کر کہین اور بسیرا کرین تو زندگی کی قید مین یہ ناممکن ہے۔ جہان جائین گے وہین یہ شامیانہ ہمارے سر پر ہوگا۔ اور پاؤن کے نیچے وہی نہ بدلنے والا فرش جسے ہم زمین سے تعبیر کرتے ہین۔

باوجودیکہ ہم اس شامیانہ مین رہتے اور زندگی کے دن پورے کرتے ہین پھر بھی اُسے جدا اور اپنے تئین جدا سمجھتے ہین اور یہ خیال کرتے ہین کہ اسکی ہستی اور ہماری ہستی مین ایسا ہی فرق ہے جیسے زمین اور آسمان مین ہے۔ اور اُس مین اور ہم مین کوئی نسبت نہین جب ہم اس دار القرار یا دار الاقامت کی اپنے روزمرہ الفاظ مین تعبیر کرتے ہین تو یون کہتے ہین:۔

جس زمانہ مین ہم رہتے ہین۔

جس بحر عصر مین ہماری زندگی کی ناؤ چل رہی ہے

جو زمانہ ہمارا ہمعصر ہے۔

جو زمانہ ہم نے پایا ہے۔

جو زمانہ ہم نے دیکھا ہے۔

جو وقت ہمارے حصہ مین آیا ہے۔

جس دہر مین ہم وجود پذیر ہوئے ہین۔

ایسے تمام اطلاقات سے یہ سمجھا جاتا یا سمجھا جاسکتا ہے کہ عصر، زمانہ، دہر، روزگار، گردون، وقت، دور دوران، ہمارے خیال یا باعتبارات ہماری تعبیرات کے ایک جداگانہ منزل یا مکان کی حیثیت اور کیفیت رکھتا ہے اور ایک ایسی حالت اور ایسی کیفیت جو ہمارے لئے بہ منزلہ ایک منزل، مکان، دائرہ اور احاطہ کے ہے، ایسا دائرہ، ایسا احاطہ، ایسی منزل، جو ہماری آسائش، سہولت طمانیت، اور بہبود کی ضامن اور ہماری تکلیف رنج و درد کی ہی موجب ہے یا یہ کہ اس مین رہ کر ہمین ہر ایک قسم کی خوشی اور تکلیف سے آشنا ہونا پڑتا ہے جس مین کچھ احساس کچھ ادراک اور بعض جذبات بھی پائے جاتے ہین ان ہی خیالات کا اثر ہے کہ ہم کبھی کبھی یہ بھی

کہہ اُٹھتے ہین :-

زمانہ بھی ایک طاقت ہے۔

زمانہ بھی ایک زبردست کشش رکھتا ہے۔

زمانہ گردش کرتا ہے۔

زمانہ کی گردش سے خدا کی پناہ !-

زمانہ کسی کا دوست نہین۔

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز۔

زمانہ کی مخالفت اور موافقت کا کوئی امتیاز نہین۔

زمانہ کا کیا بھروسہ۔

زمانہ کی زد کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے۔

زمانہ بدل گیا۔

اس قسم کے تمام جملون اور اطلاقات سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمانہ ایک قسم کی زندگی رکھتا ہے۔ زمانہ صاحب ارادہ ہے۔ زمانہ تصرف کرتا ہے۔ زمانہ کی زندگی ایک زبردست زندگی ہے۔ زمانہ کو فنا بھی ہے زمانہ بدلتا بھی ہے۔ زمانہ بدلا بھی لیتا ہے۔ اندرین حالات ثابت ہو کہ زمانہ ایک زندہ طاقت اور زبردست متصرف ہے اور اس مین بھی ویسے ہی احساسات اور تصرفات ہین جیسے اور زندہ مخلوق اور صاحب ارادہ ہستیون مین ہوتے ہین۔

ان تاویلات کے اعتبار سے زمانہ گویا ایک ایسی جامع طاقت ہے جو کل دیگر موجودات پر ایک ترتیب اور ایک ضابطہ کے ساتھ حکومت کر رہی ہے اور کوئی موجودات سوائے اُس اعلےٰ ذات کے جو زمانہ کی مجموعی طاقت یا مجموعیت پر حاوی ہے اُسکی زد اور اُس کے ضابطہ سے باہر اور آزاد نہین۔

اب اصلی سوال یہ ہوگا کہ "زمانہ کیا ہے؟ زمانہ کا وجود خارج مین پایا جاتا ہے یا نہین؟"

پہلے سوال کا جواب سادہ الفاظ مین یہ ہے کہ جس احاطہ یا جس شامیانہ مین ہم رہتے ہین یا جس مین کل موجودات اپنے اپنے رنگ مین بود و باش رکھتی ہین جسے عام الفاظ مین ہم دنیا، ایام زندگی، رات دن، وقت، اور دہر یا روزگار کہتے ہین، یا دور اور دوران سے تعبیر کرتے ہین وہ زمانہ ہے یا زمانہ کا مفہوم رکھتا ہے صبح سے لے کر شام تک اور شام سے تا صبح جو کیفیت ہمارے اردگرد یا ہمارے تحت و فوق پر محتوی رہتی ہے اور جس کا ہم مختلف رنگون اور مختلف کیفیات مین احساس اور ادراک کرتے ہین وہ زمانہ ہے۔

جو طاقت ہماری زندگیون کے واسطے ایک آنے والی یا گزرنے والی کیفیت یا موثر اور متصرف طاقت کی صورت مین عمل کر رہی ہے، وہ ایک عصر، دہر، اور زمانہ، ہے۔ آفتاب، ماہتاب، سیارے اور ستارے اور دیگر اجزاے سماوی اور کیفیات وحقائق ارضی زمانہ کے اجزا اور زمانہ کی مختلف طاقتین اور کیفیتین ہین، ظلمت، روشنی، برق، کشش، شعاع، تموّج، ہر چہار یا زائد از ہر چہار عناصر وغیرہ زمانہ کی ایسی چیزین ہین جن کے بغیر زمانہ کا وجود ہی باقی نہین رہتا یا نہین رہ سکتا یا یون کہا جاے کہ در اصل زمانہ ان ہی اجزا، ان ہی ارکان ان ہی موثرات، اور ان ہی متصرفات کا نام ہے اور یہی قانون قدرت اور سامان قدرت جس مین ہم خود بھی شامل ہین زمانہ دہر اور عصر ہے۔

علم ہیئت فن ریاضی علم جیالوجی وغیرہ زمانہ کی ایک صحیح تفسیر یا صحیح عکس اور صحیح نمونہ ہین۔ ان تمام علوم اور فنون کے پڑھنے اور جاننے سے آپ معلوم کر سکتے ہین کہ اگرچہ اجزائے نفیسہ جو ان علوم اور ان فنون مین زیر بحث یا جزو اعظم نہ ہون تو زمانہ کی کمیت کیفیت اور حقیقت مین بہت کچھ کمی ہو جائے گی۔ فرض کرو کہ آفتاب نہو، یا ماہتاب نہو دیگر اجزا سماوی اور ارضی نہ ہون، ہوا نہو۔ پانی نہ ہو۔ آگ نہ ہو، خاک نہو،

نظام شمسی نظام ارضی بالکل بند ہوجائے اور ان دونون کے موثرات اور تصرفات مین فرق آجائے یا یہ کہ اُن کا کوئی حصہ یا نشان ہی باقی نہ رہے تو اُس حالت مین ہم یا ہماری ہستی جو زمانہ شناس ، اور دہر پرست اور عصر بین ہے کہان ہوگی اور اسکی کیفیت کا کن الفاظ مین بیان ہوسکے گا اور جس شامیانہ مین اور جس فرش زمین پر ہم بود و باش رکھتے ہین جو ہمارا مسکن اور ہماری زندگیون کا محور ہے اور جس کا ہم مختلف رنگون مین احساس اور ادراک کرتے اور اُس سے کام لے رہے ہین اُسکی ہستی اور اس کے وجود کی کیا کیفیت ہوگی ۔ کیا اِن حالات مین ہم یہ کہہ سکین گے کہ کوئی زمانہ ، روزگار ، دور ، دوران ، وقت عصر اور دہر بھی ہے ، اور اس کا بھی کوئی وجود اور ہستی ہے اور ساتھ ہی اس کے ہم اپنی نسبت بھی یہ فیصلہ کرسکین گے کہ ہم بھی کوئی وجود کوئی شے ، کوئی عادت کوئی ذات ہین ؟

اس سے معلوم ہوا کہ عصر ، زمانہ ، روزگار ، وقت ، گردون ، دہر ، دور ، دوران ، اسی واسطے کہتے ہین کہ اس کے اجزاے کثیرہ مین ایک قسم کی گردش اور دَور ساری ہوتا ہے ۔ سیارون مین بھی ایک قسم کی حرکت اور زمین بھی متحرک ، تحت بھی حرکت ، فوق بھی حرکت ۔ یمین بھی حرکت ، یسار بھی حرکت ۔ شاعرون نے جو گردش کا رونا رویا اور اُسے کوسا ہے وہ کیون ؟ صرف اس واسطے کہ اس کے اجزاے کثیرہ مین ایک قسم کی گردش اور تموج ہے ۔ یہ جاڑا اور گرمی برودت اور حرارت کیون ہے ؟ یہی کہا جائے گا کہ صرف ان ہی موثرات اور تصرفات عظیمہ کی وجہ سے اگر یہ موثرات اور تصرفات نہ ہون تو یہ کیفیات اور موسم وغیرہ بھی نہ ہون ۔ بعض سائنس دانون کی رائے مین حرارت کا مخزن یا مصدر آفتاب ہے ۔ سرولیم ٹامسن صاحب نے سنہ ۱۸۵۴ء مین اسی تھیوری پر زور دیا تھا اور اکثر سائنس دانون نے یہ معلوم کرلیا ہے کہ مختلف ذرات اِدھر اُدھر حرکت کرتے رہتے ہین اور انکی حرکت مختلف پیمانہ اور مختلف رفتار کی ہوتی ہے اور وہ آپس مین ٹکراتے بھی رہتے ہین مثلاً انکی راے مین ہیڈروجن گیس کے ذرات ہماری ہوا کے معمولی دباؤ اور ٹیمپریچر مین فی سیکنڈ ۶۲۲۵ حرکت کرتے ہین اور ایک ذرہ اتنے ذرات سے ٹکراتا ہے کہ اُسے ایک سیکنڈ مین پلٹا کھانے سے ایک ارب ستر کروڑ میل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے ۔ سرولیم ٹامسن صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ہیڈروجن کے ذرون کو برابر ایک قطار مین رکھا جائے تو ایک انچ کے فاصلہ مین ۵ کروڑ ذرات سما جائین گے ۔

سائنس کے ان تمام زندہ تجربات سے ظاہر ہے کہ کل کائنات اور موجودات کے سوائے جو ان اجزاے زمانہ سے جدا ہو یہ اجزاے کثیرہ ایک خاص موجودات کے رنگ مین اُن تمام واقعات کیفیات وقت دہر اور دور وعصر کا باعث یا محرک ہین جو ہمارے ارد گرد پایا جاتا ہے اور اگرچہ ہم بھی اس مین شامل یا اُسکا جزو ہین اور اس سے ہماری ہستی بھی وابستہ ہے اور اس کے موثرات اور تصرفات و ضابطہ کے ماتحت ہین اور اُس وقت تک ہم اس ضابطہ سے الگ اور آزاد نہین ہوسکتے جب تک کہ ہم اس دنیا مین ہین ۔ لیکن یہ اپنی بہیئت مجموعی اُسکی گرفت و تصرف ہم سے کہین اعلیٰ ہے ۔ اسکی رفتار ہماری رفتار سے کہین ارفع واقعہ ہوئی ہے ۔ ہم سواے اس کے اسکی نسبت کچھ نہین جان سکتے کہ وہ لگاتار گردشون تصرفات موثرات اور تغیرات کا ایک مجموعہ کبیرہ ہے اور اس کی گردشون اور تغیرات کی وجہ ہی سے اُسے دور ، دوران ، العصر ، دہر اور زمانہ کہا جاتا ہے اور اسکی صحیح تعریف یہی ہے کہ وہ ایک مجموعہ ادوار اور سلسلہ تغیرات ہے اور اس مجموعہ کبیرہ مین ہم خود بھی شامل ہین اور شامل ہی نہین بلکہ اس کا ایک جزو اعظم اور ناطق عنصر مدرک حصہ اور بصر فوع نہین ان اعتبارات سے وہ تمام سلسلہ اور انواع جو ان مختلف قسم کی

گردشون تصرفات، موثرات، محرکات اور تغیرات کا موجب ہین، دہر عصر، یا زمانہ ہے - یا یہ کہ ان تمام تصرفات سے جو کچھ کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ العصر اور زمانہ ہے جس کا ہم بھی ایک جزو ہین -

اب ہمین سوچنا چاہیئے کہ ان تصرفات گردشون ادوار تغیرات و موثرات سے عملی رنگ مین نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اور کون سی خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے؟ رات دن ظلمت اور روشنی کا جھگڑا چھوڑ کر صحیح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان سب تصرفات ادوار گردشون و تغیرات صغیرہ و کبیرہ کی وجہ سے وقتاً فوقتاً وقت کے لباس اور روپ مین مختلف صورتین اور کیفیات پیدا ہو ہو کر ہمارے احساس اور ادراک مین آتی ہین - ہماری زندگی کا ہر سانحہ اور ہر واقعہ کسی نہ کسی وقت سے وابستہ اور منضم ہے - وہ کبھی رات کے لباس مین ظلمت افزا ہوتا ہے اور کبھی دن کے روپ مین جلوہ کنان - اگرچہ بظاہر وہ ہم سے الگ ہے اور بہت دور فاصلہ پر نظر آتا ہے لیکن دراصل ہم اُس مین ہین اور وہ ہم مین ہے - گو ہم ایک دوسرے سے جدا جدا ہین لیکن دراصل ایک ہی تنہ کی سر سبز شاخین ہین - نام جدا جدا ہین اور ہین ایک ہی روپ - ہمارا ظہور بھی اس کا ظہور ہے اور اسکا ظہور ہمارا - سے

عاشق و رندم و میخوارہ بآواز بلند   این ہمہ منصب از ان شوخ پری وش دارم

دنیا تعبیرات کا مخزن ہے - اعتبارات پر بہت کچھ مدار ہے - ایک طرف ہم ایک مجموعہ ہین اور دوسری طرف انواع اور اجزا - ہم ایک بھی ہین اور لاکھون کروڑون بھی - کثرت وحدت کا ثبوت دیتی ہے اور وحدت کثرت کا - ہم ہی مجموعہ ہین اور ہم ہی فرد - مجموعہ فرد کا شاہد ہے اور فرد مجموعہ کا - دونون مین ایک نسبت ہے اور یہ نسبت وحدت کاملہ سے نسبت رکھتی ہے - سے

ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار و چہ مست
ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

دہر، زمانہ، العصر، دور، دوران، روزگار، گردون، ہوئے حساب سے رات اور دن کے لباس مین سفر کرتا ہے اور رات اور دن کو ہم وقت کے نام سے موسوم کرتے ہین - اگرچہ مختلف دنیا کے حصون مین رات دن یا وقت مین گونہ امتیاز اور فرق بھی ہوتا ہے اور ایک حد تک موسمی کمی و بیشی ہے لیکن پھر بھی یہ کہا جائے گا کہ جو وقت دنیا کے مختلف حصون مین سے گزرتا اور متصرف ہوتا ہے وہ ہمیشہ ایک طرف سے آتا اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے - اگرچہ قدرتاً اُسکا پیمانہ کچھ ہی ہو لیکن خود ہم نے جو اُس کا پیمانہ امتیازی مقرر کر رکھا ہے وہ ہمین یہ کہنے کی اجازت دیتا ہے کہ اسقدر وقت یا زمانہ گزر گیا اور اسقدر باقی ہے - اگرچہ ہم یہ نہین کہہ سکتے کہ وقت یا جو زمانہ آگے آنے والا ہے وہ کیسا ہوگا؟ اور اُسکی رفتار کی اُفتاد کیا ہوگی؟ لیکن یہ کہہ سکتے ہین کہ اگر کوئی زمانہ یا وقت آنے والا ہے تو اُسکی ہستی ضرور ہوگی کیونکہ ہر ایک حصۂ وقت یا جزو زمان کی کچھ ہستی اور مقدار ہوتی ہے چونکہ ہم بھی زمانہ یا دہر اور وقت کا ایک جزو اعظم ہین اسواسطے ہم خود ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہین کہ ہماری کوئی یا کچھ ہستی ہے یا نہین؟ -

ہم کوئی یا کچھ ہستی رکھتے ہین یا نہین؟ -

اگر ہم اپنی ہستی کا ایک حد تک احساس اور ادراک کرتے اور کر سکتے ہین تو یہ ثابت ہے کہ دوسرے اجزا کا بھی احساس اور ادراک کیا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ ہر ہستی اپنے اپنے رنگ مین علی قدر مراتب اپنا احساس کرتی ہے اور ہر ہستی ایک قسم کی زندگی رکھتی ہے - یہ جدا بات ہے کہ اُس کے احساسی طریقہ کا ہمین علم ہو یا نہو - وہ ہماری حدود علم اور ادراک کے اندر ہو یا باہر -

اور یہ بھی ہم نہین کہہ سکتے کہ موجودات کے دوسرے اجزائے صغیرہ و کبیرہ باستثنائے چند ہمارا احساس کرتے ہین یا نہین - اور اگر

کرتے ہین تو کس طرح؟ اور کس مقدار سے؟ اگرچہ وہ بھی ہماری طرح ہی اجزائے مجموعۂ کبیر ہین اور اس دور یا زمانہ مین اُن کی ہستیان بھی پائی جاتی ہین مگر جس طرح ہم ایک حد تک ہی چل سکتے ہین اسی طرح ان کی رفتار بھی ہو گی۔

اگر ہم کما حقہ ادراک کی کوشش بھی کرین تو اس مین گو کہ ایک بڑی حد تک ہمین کامیابی بھی ہوتی ہے مگر جب ہم ایک بڑی کامیابی کے حد و دین بھی نیچے جاتے ہین تو ہمین افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری دوڑ ہمین بہت دور فاصلہ پر بھی لے جانے کے باوجود ناکافی ثابت ہوتی ہے اور ہنوز روز اوّل ہی نظر آتا ہے ؎

نشانِ یار سفر کردہ از کہ پرسم باز
کہ ہرچہ گفت برید صبا پریشان گفت

سُلطان احمد

العصر (۲)

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو العصر جلد ۳ نمبر ۲)

یہ سوال بھی قابل بحث ہے کہ
(الف) وقت یا عصر زمانہ اور عہد اپنا احساس خود کراتا ہی
(ب) یا ہم اُسکا احساس کرتے ہین۔

چونکہ ہم بھی جزو دہر یا حصۂ زمانہ ہین اس واسطے دہر یا زمانہ بھی ہمین اپنا احساس کراتا ہی اور ہم خود بھی محسوس کرتے ہین۔ دہر وقت اور زمانہ یا العصر کے موجبات اگر ادوار اور گردشین تہون تو وقت پیدا ہی نہ ہو (وہ کیفیت جسے ہم اپنی اصطلاح مین وقت سے تعبیر کرتے ہین) اگر وقت نہ ہو تو ہم احساس کیا کر سکتے ہین کیونکہ احساس کے واسطے ضروری ہی کہ ایک وجود ہو خواہ وہ وجود کوئی سی بھی نوعیت رکھتا ہو اور اگر خود ہماری ذات مین بھی ایسے احساس کا مادہ نہ ہو تو پھر بھی احساس وجود پذیر نہ ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمانہ فی الخارج موجود ہے۔ اور ہم اُس کا احساس کرتے ہین اور وہ بھی اپنا احساس خود کراتا ہی اور ہم ایک بصیرت کے ساتھ اس واسطے اُس کا احساس کرتے ہین کہ ہم بھی اس مین شامل ہین یا اُس کا ایک جزو ہین یا یہ کہ ہم خود بھی دہر یا زمانہ ہین۔

زمانہ کو اپنے اجزاے مدورہ کی وجہ سے ایک مستقر بھی حاصل ہے جس مین ہمارا مستقر بھی شامل ہی۔ زمانہ کے ہر قسم کے اجزا کا کوئی نہ کوئی مستقر ہوتا ہی اور پھر اُن سب قسم کے مستقرون کا ایک مجموعی مستقر بھی ہوتا ہی جسے مختلف اعتبارات مین دہر العصر اور زمانہ کی نام سے تعبیر کیا جاتا ہی۔ باوجود اس مستقر مجموعی اور نوعی ہونے کے زمانہ متغیر بھی ہی اور ان تغیرات سے اُس کے ماتحتی یا صغیرہ اجزا جنھین کائنات اور موجودات کے نام سے تعبیر کرتے ہین بہ تسلسل متاثر ہوتے رہتے ہین اور ان ہی ماتحتی اجزاے صغیرہ مین ایک گروہ ناطقیہ موسوم بہ انسان اور دوسرا گروہ زندہ موسوم بہ دیگر حیوانات اور تیسرا گروہ جامدیہ موسوم بہ نباتات۔ جمادات وغیرہ بھی داخل ہی اور یہی مجموعہ زمانہ یا دہر ہی۔ گروہ جامدیہ بھی ایک قسم کی زندگی رکھتا ہی جو ہماری زندگیون سے کچھ اور کیفیت رکھتی ہے اور اس سلسلہ کو بھی ان تمام اجزاے صغیرہ یا الموجودات

ہرسہ قسم مجموعی یا نوعی کے تغیرات کا احساس اور علم ہوتا رہتا ہی یا یہ کہ ایسے موجودات اُن سے متاثر ہوتے رہتے ہین - اُس وقت تک جب تک وہ اس چکر یا اس چکر مین موجود ہی - جب وہ اس حیز عظیم مین سے نکل جائے گی، تو اُس کے واسطے موجودہ صورت مین زمانہ کا وجود یا زمانہ کا حیز باقی نہین رہے گا - اگرچہ کسی اور رنگ مین باقی رہے - مثلاً اگر نباتات کی موجودات طبقہ دنیا سے بالکل اُٹھ جائے تو یہ کہا جائیگا کہ اُس کے مقابلہ مین دہر کا وجود باقی نہین رہا یا ایسی موجودات زمانہ مین باقی نہین رہی - اسی طرح یہ بھی کہا جائیگا کہ اگر زمانہ کے اجزائے گردشیہ باقی نہ رہین تو خود زمانہ بھی باقی نہ رہے گا - یہ جدا بات ہی کہ اس فنا کے بعد کوئی اور صورت یا کسی اور قسم کا زمانہ وجود پذیر ہو کر عامل ہو -

جب تک کہ زمانہ کی مجموعی حرکت یا دور دُور نہ ہو تب تک زمانہ کی ہستی اور وجود تسلیم کیا جائے گا - البتہ جب اُس کا کوئی جزو بھی باقی نہ رہے اُس وقت یہ کہا جائے گا کہ زمانہ باقی نہین رہا - جو لوگ وجود زمانہ سے منکر ہین یا یہ کہتے ہین کہ اِس کا وجود فی الخارج نہین ہے وہ یہ سوچین کہ دراصل زمانہ ہم سے یا اس کائنات اور موجودات سے کوئی جدا شئے نہین ہی - ہم ہی زمانہ ہین اور دیگر موجودات بھی زمانہ ہی - نوعی رنگ مین ہمارا نام کچھ اور ہے اور مجموعی رنگ مین ہمین زمانہ یا دہر سے تعبیر کیا جاتا ہی یا یہ کہ موجودات کی مجموعی اور نوعی گردشون اور تصرفات کا نام دہر یا زمانہ ہے -

جب یہ کہا جاتا ہی کہ زمانہ بدل گیا تو اُسکا مفہوم یہ ہوتا ہی کہ ہم خود بدل گئے اور اسی طرح دیگر موجودات بھی بدل گئی - جس طرح زمین کی حرکت کا ہم سوائے علمی استدلال کے احساس نہین کر سکتے اسی طرح ہمین زمانہ کی مجموعی گردشون اور حرکات کا علم نہین ہوتا - ہان نوعی رنگ مین ایک حد تک ہم ایسی گردشون اور ادوار کا احساس کرتے یا کر سکتے ہین -

ہم وقت اور دور کے قائل ہین اور اپنے رنگ مین ایک بڑی حد تک اُسکا اعتراف بھی کرتے اور اُسپر بہت کچھ انحصار بھی رکھتے ہین اور اپنی ضروریات کے اعتبار سے اُس کی تقسیم بھی کر رکھی ہی - ہمارے خیال اور ہمارے عمل کے مطابق وقت یا دور کے تین حصے ہو سکتے ہین:

(الف) ماضی جو گذر جائے -

(ب) حال جو موجود ہے -

(ج) مستقبل جو آگے آتا ہے -

دن چڑھتا اور رات پڑتی ہی - جو عرصہ گذرتا جاتا یا گذر چکا ہے وہ ماضی ہی - جو گذر رہا ہی وہ حال ہی - جو حصہ حال کا گذرتا جاتا ہی وہ ساتھ کے ساتھ ہی ماضی کا روپ اختیار کرتا جاتا ہی - جو زمانہ ابھی آیا نہین وہ مستقبل ہی - ان حالات مین یہ کہا جائیگا کہ زمانہ کا صرف وہی حصہ باقی یا موجود ہوتا ہی جسے حال سے تعبیر کرتے ہین - جو گذر جاتا ہی وہ بھی معدوم ہو جاتا ہی اور جو آنے والا ہی وہ بھی موجود نہین ہوتا - اور حال کی حالت اور قیام بھی ایک صورت مین خیال ہی خیال ہی کیونکہ جون ہی کوئی جزو اُس کا گذرتا ہی وہ ماضی ہوتا جاتا ہی - گذرنے والے حصہ اور موجودہ حصہ مین تمیز کرنا بہت ہی مشکل ہی - یہ گتھی یون سُلجھائی جا سکتی ہی کہ وقت اور دور اُن اجزائے گردشیہ کا ایک نتیجہ ہی جو قانون قدرت کے ماتحت ایک ضابطہ سے عمل پذیر ہین اور ان ہی اجزائے گردشیہ اور عناصر مذورہ کا نام دوسرے الفاظ مین زمانہ اور العصر ہے - جب تک وہ اجزائے گردشیہ موجود ہین جب تک اُن کی نفی نہین ہوتی تب تک زمانہ موجود رہتا ہی - جو وقت ادوار کے ماتحت گذر گیا اور جو وقت گزر رہا ہی وہ اپنی باری کا کام کر چکا یا کر رہا ہی لیکن وہ طاقت باقی ہی جس سے وہ پیدا ہوا تھا - جو وقت

یا جو دور ابھی آنے والا ہے اُس کے موجبات اور سامان بھی موجود ہین - پس ہر ایک حالت مین زمانہ موجود رہتا ہی تاوقتی کہ اُسکی ساری طاقت اور سارے عناصر خرچ نہ ہو لین -

جو جزو برق اور جو روشنی اپنے مستقر سے خارج ہوتی ہی وہ اگرچہ اپنے مستقر سے جدا ہوکر خارج ہو جاتی ہی لیکن اُس کا مخزن اور مستقر باقی اور قائم رہتا ہی - جو روشنی اور جو شعاعین لیمپ سے نکلتی ہین وہ اگرچہ ادھر اُدھر پھیلتی اور منتشر ہو جاتی ہین لیکن جب تک کہ گیس برق اور تیل باقی ہے یہ نہین کہا جا سکتا کہ مواد روشنی نہین ہی یا روشنی نہین ہو سکتی - یہی کیفیت زمانہ کی بھی ہے - زمانہ کے اجزاے گردشیہ اور افراد دوریہ جب تک باقی ہین تب تک زمانہ باقی ہی اور کہا جائے گا کہ مختلف رنگون مین اُس کی ہستی موجود ہی اور اس بات سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ جن اجزاے کثیرہ اور عناصر مدورہ سے زمانہ مرکب ہی وہ اُس عرصہ تک باقی رہین گے جس کا ہمین علم نہین دیا گیا - یہ خدشہ کہ بصورت زمانہ کے موجود ماننے سے اُس کا منقسم ہونا لازم آتا ہے اور اُس کا منقسم ہونا اُس کے قار ہونے کا مستلزم ہی اور یہ باطل ہی بالکل درست و صحیح نہین - یہ خدشہ اُس صورت مین عائد ہو سکتا ہے جب ہم زمانہ کا وجود بغیر اجزاے گردشیہ کے تسلیم کرین ہم تو یہ کہتے ہین کہ سواے ان ہر ایک قسم کے اجزاے گردشیہ کے زمانہ اور کوئی شے نہین ہی - کیونکہ یہ تمام اجزاے گردشیہ پہلے ہی سے تقسیم شدہ ہین اور اُن کی مختلف کیفیتین ایک مجموعہ مین شامل ہوکر ایک جداگانہ مستقر رکھتی ہین ان حالات مین اس امر کے ماننے سے کوئی استحالہ لازم نہین آتا کہ زمانہ اپنے ہی مجموعہ کے اندر نوعیتون کے اعتبارات سے تقسیم شدہ بھی ہی -

یہ خدشہ کہ زمانہ کی ترکیب آنات متتالیہ سے ماننی پڑیگی درست نہین کیونکہ جب ہم زمانہ کی تعریف اُن الفاظ مین نہین کرتے جو ان تمام خدشات کا موجب ہو سکتے ہین تو پھر ایسے خدشات کس طرح عائد ہو سکتے ہین - یہ کہنا کہ اس صورت مین حرکت اور مسافت کا سوال عائد ہوتا ہی بجاے خود باطل ہی کیونکہ ہم نے اجزاے زمانہ کی خصوصیت ہی حرکت قرار دی ہی اور ہماری راے مین دوسرے الفاظ مین حرکت نام ہی زمانہ کا ہی - اگر حرکت نہ ہو تو زمانہ بھی نہ ہو - وقت اور دور کیا ہی ایک حرکت ہی تو ہی - اجزاے غیر متجزیہ کا خدشہ بھی عائد نہین ہو سکتا کیونکہ جب ہم زمانہ کے اصلی اجزا کی ترکیب ہی مختلف ذرات سے ثابت کرتے ہین اور تمام ذرات کی حرکت ثابت ہی اور دوسری طرف اُن کا تجزیہ بھی تو پھر یہ کس طرح کہا جاے گا کہ یہ خدشہ یا یہ اعتراض کوئی صداقت رکھتا ہی -

اجزاے گردشیہ کی حرکت اور دور مسلسل اور لگاتار ہے - یہ حرکت اور یہ دور کبھی بند ہونے مین نہین آتا - اس دور کی قیام کا باقی رہنا ہی زمانہ کی ہستی کا ثبوت ہی - جس وقت یہ دور اور یہ حرکت باقی نہین رہے گی اُس وقت نہ تو زمانہ ہوگا اور نہ زمانیات نہ دہر اور نہ امتیازات دہر ے

گوہر مخزن اسرار ہمانست کہ بود ۔۔۔ حقہ مہر بدان مُہر و نشانست کہ بود

زمین کی گردش اور چاند کی گردش اور وہ تمام دورے جو ایک دوسرے کے بعد گزرتے جاتے ہین ایک نسبتی وقفہ پیدا کرتے ہین اور اُن تمام وقفون مین اگرچہ ایک نسبت وحدت موجود ہوتی ہی لیکن پھر بھی وہ ایک بڑی حد تک امتیازی اشکال سے متشکل ہوتے ہین - اسی طرح جب آفتاب زمین اور دیگر سیارون کو اپنے ساتھ اُس مقام کی طرف لے جاتا ہی جدھر اُس کی کشش طبعاً مائل ہوتی ہی تو اُس کی رفتار مین بھی جو وقفے پیدا ہوتے اور جو مسافتین یکے بعد دیگرے طے ہوتی ہین اُن مین جو امتیاز ادبجو فاصلہ ہوتا ہی

وہی دوسرے الفاظ مین زمانہ ہے ۔
فرض کرو کہ ان گردشی اجسام کی گردشون مین کوئی امتیاز اور کوئی وقفہ نہ ہو تو اُس صورت مین رات اور دن مین کیا تمیز ہو سکے گی ۔ اور ان امتیازات کے مقابلہ مین کیا کوئی دور وجود پذیر ہوگا ۔ ہرگز نہین ۔ اس سے ثابت ہی کہ زمانہ صرف مختلف اجسام کی گردشون یا کیفیات کا نام ہی ۔ یا دوسرے الفاظ مین یون کہنا چاہیے کہ زمانہ صرف ایسی گردشون کی امتیازی حالتون یا کیفیتون کا نام ہے یا زمانہ صرف اُن حرکات تبدلات اور تغیرات کا نام ہی جو اجسام سماوی اجسام ارضی اور مختلف نوعون کے ماتحت سرزد اور واقع ہوتے رہتے ہین اور جن کا وقوع ایسا مسلسل اور ایسا لگاتار ہوتا ہی جو ہر شخص کے احساس اور ادراک مین بآسانی آسکتا ہی ۔

زمانہ کی موجودگی جب ہم موجود ہین تو یہ کہا جاے گا کہ ہماری موجودگی زمانہ کی موجودگی کو مستلزم ہی اور جب زمانہ موجود ہے تو اُسکی موجودگی اجزاے زمانہ اور زمانیات کی موجودگی کی مستلزم ہی اور جب زمانیات اور ایسے اجزا موجود ہین تو اُن کی ہستی بجاے خود ثابت ہی جو مستلزم ہی ۔ گردش اور دور کو جب گردش اور دور موجود ہی تو اُن کی موجودگی مستلزم ہی حرکت کو جب حرکت ثابت ہی تو وقت کا وجود لازمی ہی جب وقت موجود ہی تو بلحاظ ضروریات و تصرفات انسانی اُسکی تقسیم اور تفریق لازمی ہی ۔ جب وقت کی تقسیم اور تفریق کی جاسکتی ہی تو زمانہ کے اجزاے کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق سے انکار نہین کیا جاسکتا ۔ اس سے ثابت ہی کہ ہم زمانہ سے کام لے رہے ہین یا زمانہ ہمین مختلف رنگون مین کام دے رہا ہی ۔ وہ موثر ہے اور ہم متاثر ہین ۔ ہم موثر ہین اور وہ متاثر ۔ ان حالات مین ہم اور وہ ایک طاقت ہین اور ہم بہیئت مجموعی اور نیز نوعی حیثیت سے مختلف جذبات اور ایک قسم کا مادہ تصرفات رکھتے ہین جب بہیئت مجموعی زمانہ ایک اثر اور ایک جذبہ رکھتا ہی تو اُس مین ایک جامع متصرفانہ مادہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا جو سب دیگر تصرفات اور تاثرات و جذبات سے فائق اور اعلیٰ ہی ۔ انھین وجوہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ

زمانہ کے تغیرات سے ڈرو ۔
زمانہ کی چال پر چلو ۔
زمانہ سے موافقت رکھو ۔
زمانہ بڑا مدبر اور منتظم ہے ۔
زمانہ ایک طاقت ہے ۔

یہی امور اور یہی خیالات ہین جو زمانہ کا وجود عملی رنگ مین ثابت کرتے ہین اور یہی دلائل ہین جو زمانہ کی ہستی فلسفی تمدنی سیاسی اور اخلاقی رنگ مین ایک لابدی ہستی قرار دیتے ہین اور انھین وجوہ سے یہ کہا جاتا ہی کہ زمانہ اپنے تئین بمنت نہین منواتا بلکہ بزور زبان حال سے یہ اعلان کرتا ہے کہ

"جو شخص اُس کا ساتھ دیتا ہی وہ اُسکی تائید مین ہو جاتا ہی ۔
"جو شخص اُس کا ساتھ نہین دیتا ۔ وہ اُسکی تائید نہین کرتا"

تصرفات و جذبات زمانہ چونکہ مجموعی اور نوعی حیثیت سے زمانہ کی ذات یا ہستی کے ساتھ موجودات کو انواع و اقسام کی وابستگیان اور روابط حاصل ہین اس واسطے مختلف طریقون سے زمانہ کے تصرفات تاثرات اور جذبات کا اعتراف کیا جاتا ہے ۔ دنیا کا کوئی طبقہ بھی ایسا نہین ہی جو ان اعترافی خیالات سے خالی ہو ۔ فلاسفرون حکیمون سائنس دانون اہل سیاست کے گروہون مین بھی یہ خیالات متموج ہین اور اُن حصون مین بھی جہان وحشت اور جہالت کی حکومت ہی شام اور عرب جو انبیا علیہم السلام کی مقدس بستی تھی ہندوستان جو رشیون اور اوتارون کی دھرتی

تھی یونان جو اصنام اور حکیمون کا مرکز تھا روم جو عیش پرستی اور اعلیٰ مقاصد کا مرجع تھا مصر جو عجائبات کا مخزن تھا یورپ جو آجکل تمدنی ترقیات اور سیاسی معارج کا مامن ہے زمانہ کی وابستگیون اور دہر کی شگفتگیون سے خالی اور الگ نہ رہا۔ نہ تو مذاہب ان وابستگیون پر غالب آسکے اور نہ فلسفہ اور سیاست ان سے بازی لے جاسکے اگر کسی نوع نے کچھ حاصل کیا تو انھین سے۔ اگر کوئی نوع غالب آئی تو انھین کی بدولت۔ اگر کسی نے شکست کھائی تو انھین کی وجہ سے۔ باوجود انواع واقسام کی کامیابیون اور فتوحات کے وہ طاقتین جو اولیات زمانہ کہلاتی تھین وہ نوعین جو زمانہ کا جزو اعظم شمار ہوتی تھین اخیر پر زمانہ کی مجموعی طاقت یا دور اعظم کی نذر ہو کر نیست ونابود ہو گئین۔ اگرچہ اُن کی جگہ اور زمانیات اور ہستیان موجود ہو گئین لیکن اُن کی ہستی کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہا کسی نے یہ بھی نہ جانا کہ منزل مقصود کیا تھی اور اُن کا حشر کس منزل پر ہوا ہر شخص اور ہر ہستی کسی نہ کسی نقش قدم پر سالک ہوئی اور ساتھ کے ساتھ اپنا نقش قدم مٹاتی گئی ؎

کس نہ دانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست   این قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

زمانہ کی مجموعی طاقت اور نوعی طاقت ہر ہستی اور ہر شخصیت ہر نوع پر محتوی اور متصرف ہے باوجود اس کے کہ اجزاے زمانہ اور نوعین ایسے تاثرات او تصرفات سے بچتی ہین پھر بھی کوئی ہستی اور کوئی نوعیت متاثر ہوے بغیر نہین رہین۔

اجرام سماوی اجرام ارضی اور دیگر مختلف نوعی اجرام کے تاثیرات تصرفات اور جذبات کل کائنات کو بہ اشکال مختلف محتوی ہین۔ کوئی کسی رنگ مین اور کوئی کسی رنگ مین۔ ستارون کی گردشین ثوابت کے تاثرات و تصرفات زمین کی گردش دیگر مخلوقات انسانی حیوانی نباتاتی اور جماداتی کے عملیات مجموعی اور نوعی رنگ مین ایک دوسرے پر متصرف و موثر ہین اور کوئی حصہ کائنات ان تصرفات اور تاثرات سے بچا ہوا اور محفوظ نہین ہے۔ بجاے خود ہر جزو زمانہ ایک مستقل دور یا مستقل زمانہ ہے۔ یہ سب ادوار مل ملا کر ایک مجموعی زمانہ کے نام سے تعبیر ہوتے ہین۔ مجموعی اور نوعی یا جزوی تاثرات تصرفات اور گردشون سے طبائع اشیاء مین بھی ایک دور اور ایک گردش پیدا ہوتی اور مختلف تغیرات اور تبدلات کی محرک ہوتی ہے۔ اس تحرک اور تبدل و تغیر سے جمود سیال اور سیال جمود کی ہستی قبول کرتا ہے۔ یہ کائنات اور جزو کائنات کی حالتین اور کیفیتین رفتہ رفتہ متاثر ہو کر نابود ہوتی اور نئی اشکال قبول کرتی جاتی ہین۔ سمندر دریا بحور طیور بخارات ہوائین عناصر ہر ایک قسم کی موجودات زمانہ کے اجزا ہین اُن کی بدولت اقطاعِ دنیا مین مختلف قسم کے تغیرات اور تبدلات ظہور پذیر ہو کر مختلف دل چسپیان اور کیفیات ظہور مین آتی ہین۔ ایک قوم دوسری قوم اور ایک ملک دوسرے ملک کے مقابلہ مین زندگی کی رفتار مین جد وجہد کرتا ہوا تخیلات مین دوڑ دھوپ کر کے ترقی اور عروج کے میدان مین آتا ہے اور مختلف قسم کے تغیرات اور تبدلات سے آشنا ہو کر زندگی کی رفتار اور تخیلات مین ایک معتد بہ تغیر اور تبدل کا باعث ہوتا ہے۔

مختلف تغیرات اور تبدلات سے ایک تیسری صورت یا تیسری کیفیت پیدا ہوتی اور ایک جدید منزل کی راہ کھلتی ہے اور رفتہ رفتہ وہی تیسری صورت ایک کلیہ یا ایک مسلمہ بن جاتی ہے اور اُس صورت مین یہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ کی تاثیر اور زمانہ کے تصرفات اور جذبات کیسے جامع اور زور آور

ہین اور اجزاے صغیرہ وکبیرہ کس وسعت سے موثر و متاثر ہوتے ہین اسی طرح آب وہوا ظلمت و روشنی وغیرہ آثار کا اثر اور تصرف موجودات پر مختلف رنگون مین ہوتا رہتا ہی اور اُس سے موجودات مین تغیرات اور تبدلات پیدا ہو کر ایک حالت یا ایک کیفیت دوسری حالت اور دوسری کیفیت سے تبدیل پذیر ہوتی ہے۔ جب موجودات یا زمانہ کے اجزاے صغیرہ اور کبیرہ ایسے تاثرات وتصرفات کی مخالفت کرتے ہین تو تقویم زندگی یا تقویم کائنات پارہ پارہ ہو جاتی ہی اور یہ کہا جاتا ہی کہ چونکہ زمانہ سے سازش نہین کی گئی اسی واسطے خرابیون نے منہ دکھایا ہی۔

سازش زمانہ کا مفہوم جب کبھی یہ کہا جاتا ہی کہ زمانہ سے موافقت کرو بمصداق زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز تو اُس کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہی کہ شاید زمانہ یا زمانہ کی طاقت اس دائرہ دنیا یا احاطہ موجودات سے باہر ہی یہ درست نہین۔ زمانہ ہم سے دور یا غیر نہین ہے۔ زمانہ کی ناموافقت بہت کچھ یہی ہے کہ ہم اپنے ماحول سے موافقت نہین کرتے یا ماحول کے کوائف سے ناآشنا ہوتے ہین اور دوسری طرف اپنی نوع کے مجموعی قانون کے خلاف چلتے ہین۔ یہ مجموعی قانون کبھی تمدن ہوتا ہی اور کبھی سوسائٹی کا ضابطہ اور کبھی مذہب اور کبھی ضابطہ سیاست اور ضابطہ اخلاق جب ہم زمانہ سے ساز باز نہین رکھتے تو دوسرے الفاظ مین یہ کہنا چاہیے کہ ہم اپنے آپ ہی سے ساز باز نہین رکھتے۔ اپنے ہی قوانین مسلمہ کو توڑتے اور اُن سے انحراف کرتے ہین۔ اور جب انحراف کیا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خرابیان پیدا ہوتی ہین اور اپنی خوش فہمی سے زمانہ کو بدنام کیا جاتا ہی اور یہ کہا جاتا ہی کہ زمانہ کے زبردست ہاتھون سے یہ حالت ہوتی ہی اور زمانہ کے دست برد سے کوئی نہین بچ سکتا۔

زمانہ کا ایک دوسرا مفہوم کبھی زمانہ سے نہ صرف ادوار سماوی اور گردشہاے ارضی مراد ہوتی ہین بلکہ ان ادوار اور ان گردشون کے سوا جو ادوار اور جو گردشین خود مجموعی موجودات اور نوعی موجودات کے تصرفات سے وجود پذیر ہوتی ہین مراد لی جاتی ہین اور اس حالت مین یہ مفہوم لیا جاے گا کہ خود بعض حصص موجودات مثلاً انسانی جماعتین یا کوئی دوسری نوعی موجودات جزو اعظم زمانہ ہی یا زمانہ کی قائم مقام جیسے کسی سوسائٹی کی حکومت کسی جماعت اور اُسکے طور وطریق طرز وروش پر ایک واحد فرد یا چند افراد کا نہ چلنا اور اس وجہ سے اُس سوسائٹی اُس حکومت اُس جماعت سے پیچھے رہ جانا یا اُس کا مخالف خیال کیا جانا یہی زمانہ کی مخالفت ہی اور اس وجہ سے مشکلات مین پڑنا اور بایں حالات یہ کہنا کہ یہ نتیجہ زمانہ کی مخالفت کا ہی۔ یہ اثر زمانہ کی ناسازش کا ہی۔ یہ مطلب رکھتا ہے کہ اپنی ہی مخالفت زمانہ کی مخالفت ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہی کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" تو اُس وقت اس فقرہ کا یہی مفہوم ہوتا ہی کہ جس طرف موجودات اور باتمیز یا باشعور نوعون کی رہ جاتی ہے کہ اُدھر ہی جانا لازمی ہے کیونکہ وہی زمانہ کی رفتار ہے۔ اگر موجودات کا اکثر حصہ یا ساری موجودات اور ساری جماعت ایک فرد یا چند افراد سے سازش اور اتفاق نہین کرتی تو اُس ایک فرد یا اُن چند افراد کا یہ فرض ہے کہ اُن متفقہ افراد یا جماعت سے ملت اور سازش کرین۔ بے شک بعض اوقات ایک کثیر گروہ کی تحقیقات اور رفتار مین نقص اور لغزش بھی ہوتی ہی۔ لیکن جب ہوا کا رخ ہی ایسا ہو تو لازمی ہی کہ ہم مزید بصیرت کے ساتھ وہی رخ لین اور ہماری مزید بصیرت کسی وقت ایسے نقصان اور ایسی لغزش کی اصلاح مین بھی من جہت مفید ہو سکتی ہی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جاے کہ غلطی اور

لغزش کی صورت مین بھی ایسی روش اختیار کرنا لازمی ہو۔ یہ مطلب نہین بلکہ یہ کہ عموماً جب موجودات کے افراد کا حصہ کثیر یا کل جماعتین ایک عرصہ کے بعد کوئی تبدیلی اختیار کرتی ہین تو اُس مین بہت کم غلطیاں ہوا کرتی ہین مثلاً ایک جنگ جو قوم مین بجائے دقیانوسی پُرانی بندوقون کے جدید ساختون کی بندوقین رواج پا جائین تو دوسری بالمقابل فوج کا یہ فرض ہو کہ وہ بھی اپنے تئین اس قسم کے آلات سے مسلح کرنے کی کوشش کرے کیونکہ وہ اُسی حالت مین اُس قوم کے مقابلہ مین آ سکتی ہو جب اُسی قسم کے آلات سے مسلح اور آراستہ ہو۔ اسی طرح اگر ایک قوم تعلیمی آلات سے کام لے رہی ہو تو دوسری ہمسایہ قوم کا بھی یہ فرض ہو کہ وہ بھی اُس راستہ پر چلے کیونکہ آلات جہالت تعلیمی آلات کے مقابلہ مین محض کند ثابت ہون گے۔ اگر جدید وسائل اور جدید آلات سے کام نہ لیا جائے تو رفتہ رفتہ کام لینے کا مادہ ہی سلب ہو جائے گا اور پیچھے رہنے والی قومین یا جماعتین آگے جانے والی قومون یا جماعتون کا کسی صورت مین بھی مقابلہ نہین کر سکین گی۔ اگرچہ ایسے تغیرات کا احساس رفتہ رفتہ ہی ہوتا ہو مگر ہوتا ضرور ہو۔ ایسے احساس کے وقت لوگ یہ کہنے کے عادی ہین ـــ کہ زمانہ بدل گیا۔ زمانہ مین نقص آ گیا۔ زمانہ موافق نہین رہا۔

ان کلمات کے ساتھ ہی یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ زمانہ نے کیا بدلا تھا خود اپنے ہی حالات اپنے ہی ابنائے جنس اور دیگر نوعی موجودات مین رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ زمانہ نے ایسے اجزا کو اُٹھا اور مواد کو مختلف رنگون مین جگایا اور بلایا اگر وہ خواب غفلت ہی مین رہے۔ بعض جماعتین جاگ کر آگے نکل گئین اور وہ نیند ہی مین رہے بہ مصداق لکل امت اجل۔ ہر ایک گروہ کی کوئی نہ کوئی عمر ہوتی ہو۔ ہر گروہ کی باری آتی ہے۔ موسم کے بدلنے پر کچھ ہمین موسم کا ساتھ دینا لازمی ہو ورنہ موسم کے تصرفات ہمین بہ مختلف الحیل یا تو اپنے ساتھ بلانے کی کوشش مین کامیاب ہون گے اور یا ہماری بربادی کے سامان مہیا کر کے رہین گے۔

زمانہ کا ہاتھ ایک بہت بڑا بلند اور مضبوط ہاتھ ہے۔ وہ کسی کے روکنے سے رُک نہین سکتا اور نہ اُس کی گرفت کم ہوتی ہے۔ وہ یا تو اپنے ساتھ کر لیتا ہے اور یا ایک ہی زد سے جو سب سے اجبر ہوتی ہے اُس منزل پر پہنچا دیتا ہے جو نیستی کی منزل ہے۔

سلطان احمد

العصر (۳)

زمانہ کی میعاد

زمانہ کی میعاد کا ایک ایسا سوال ہی جس پر بہت کچھ بحث کی جا سکتی ہی۔ جو لوگ زمانہ سے مراد ہیئت مجموعی یہ عالم مراد لیتے ہین اُن کی بھی مختلف رائین ہین۔

(الف) بعض کے خیال مین اس کا خاتمہ ہی نہین۔ یون ہی چلا جائے گا۔

(ب) بعض کے خیال مین اس کا جیسے شروع ہی ویسے ہی خاتمہ بھی ہی۔

جو لوگ شق اول کے حامی ہین وہ باوجود لا متناہی ماننے کے بھی یہ تسلیم کرتے یا تسلیم کرنے پر مجبور کیئے جا سکتے ہین کہ جسقدر اجزائے صغیرہ اور کبیرہ گذرتے جاتے ہین وہ معدوم ہوتے جاتے ہین اور اُن کا کوئی نشان باقی نہین رہتا ہی اور جب کل عناصر اور اجزائے عناصر کا خاتمہ ہو گیا تو ان کے اثر اور کیفیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر بعض اجزا ختم ہو سکتے ہین اور اُنھین ہم کسی نہ کسی رنگ مین معدوم مانتے ہین تو کوئی وجہ نہین کہ کل کی فنا اور عدم کے قائل نہ ہون۔ مثلاً آفتاب کی حدت روز بروز کم ہوتی جاتی ہی اور جو اجزا اُس کے ختم ہوتے جاتے ہین اُن کی باری پھر کبھی نہین آئے گی۔ رفتہ رفتہ جب کل طاقت اور حدت ختم ہو جائے گی تو آفتاب کا زمانہ یا دَور بھی ختم ہو کر رہے گا اور اس صورت مین کہا جائیگا کہ زمانہ کا ایک جزو کبیر یا صغیر ختم ہو گیا۔ یہ دوسری بات ہی کہ اِس جزو کے خاتمہ پر کوئی اور صورت یا نقش پیدا ہو جو موجودہ صورت یا موجودہ کیفیت کے قریب قریب ہو یا کوئی اور ہی صورت اور سمان کسی اور رنگ مین وجود پذیر ہو۔ کیونکہ ہم اسوقت جس زمانہ کی اپنے ماحول کے مطابق بحث کرتے ہین وہ صورت اور وہ کیفیت وہی ہی جو ہمسے متقارب اور متناسب ہی یا جس ماحول مین ہم رہتے اور بود و باش رکھتے ہین۔

امتداد زمانہ کی نسبت نہین کہا جا سکتا کہ وہ کب تک اسی روش اور اسی رفتار سے چلا جائے گا، اور جو حصّہ اُس کا بہ صورت مستقبل ہی وہ کہان تک لمبا اور عریض ہی، اور اُس کے اجزا کے گزرنے کی میعاد اور مدت کس قدر ہی۔ جن لوگون اور جس موجودات نے اپنے زمانہ کا شروع دیکھا تھا اگر وہ اُسکے امتداد کا خیال کرتے تو یقیناً ہماری طرح وہ بھی اُسکا احساس نہ کر سکتے اور نہ یہ جان سکتے کہ زمانہ کی طنابین کہانتک

بانین گی اور اُن کا خاتمہ کہان جاکر ہوتا ہی یہی مرحلہ ہر ضمنی نوع کے لیے بھی پیش ہی۔ ہم یہ بھی نہین جان سکتے کہ یہ امتداد کسقدر میعاد اور عرصہ رکھتا ہی۔ لیکن ہم یہ قیاس کر سکتے ہین کہ اِس امتداد کا کبھی نہ کبھی خاتمہ یا اخیر اور تغیر بھی ہی۔ کیونکہ ہم یہی دیکھتے ہین کہ زمانہ کے اجزا کا ہمیشہ ایک شروع اور ایک خاتمہ بھی ہوتا ہی۔ اگرچہ اُس خاتمہ کے بعد ایک اور سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہی لیکن پہلے اجزا کا خاتمہ اور اخیر ضرور ہوتا ہی۔ یہ روش ثابت کرتی ہی کہ جو حرکت شروع ہی اُسکا کبھی نہ کبھی اور کہین نہ کہین خاتمہ بھی ضرور ہوگا۔ زمانہ بھی برنگ مجموعی اور من جہت نوعی ایک حرکت ہی اور ہر حرکت کا کوئی نہ کوئی شروع اور خاتمہ ہوتا ہی۔ اِس جہت سے زمانہ کا بہت کچھ خاتمہ ہو چکا ہی اور جو باقی ہی وہ کسی نہ کسی وقت اپنے پہلے اجزاے منقضیہ کیطرح ختم ہونے والا ہی۔ یہ کہنا کہ ہم جب زمانہ کے شروع سے یقینی واقف نہین ہین تو یہ کسطرح یقین کر سکتے ہین کہ کبھی اُس کا خاتمہ بھی ہونیوالا ہی درست نہین کیونکہ جب ہم زمانہ کے اجزاے صغیرہ اور کبیرہ مین شروع اور خاتمہ پاتے ہین تو اُس کے ایک دوسرے حصے کے شروع اور خاتمہ پر استدلال خلاف عقل اور خلاف فراست نہین ہو سکتا۔

زمانہ کے اجزاے صغیرہ (جن مین ہم خود بھی شامل ہین) جب اپنے محیط اور کل سے جدا ہو کر گزرتے جاتے ہین تو ہم اِس سے یہ قیاس کر سکتے ہین کہ جو باقی اجزا اُسکے رہتے ہین وہ بھی گزرنے والے ہین۔ یہ سوال کہ جو حصص زمانہ گزرتے جاتے ہین اُن کا حشر کیا ہوتا ہی؟ آیا وہ بالکل ہی معدوم ہو جاتے ہین یا وہ کسی اور رنگ مین ہستی قبول کرتے ہین؟ ایک ایسی بحث ہے جسکے کئی پہلو ہین۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ کوئی ہستی اور کوئی چیز معدوم ہو کر معدوم اور فنا نہین ہوتی تو یہ کہا جائے گا کہ وہ کسی اور رنگ مین متبدل ہو کر وجود پذیر ہوتی ہی یا علمی رنگ مین، با این ہمہ اُسکا کوئی وجود نہین ہوتا اور اگر یہ مان لیا جائے کہ جو اجزا معدوم ہو جاتے ہین وہ محض عدم ہو کر رہجاتے ہین تو اس صورت مین یہ بحث ختم ہو جاتی ہی۔ افسوس ہی کہ اِس بحث پر اب تک علمی رنگ مین روشنی نہین ڈالی گئی ہی۔ ممکن ہی کہ کسی آئندہ زمانہ مین علمی رنگ مین یہ بحث زیادہ تر واضح ہو سکے۔ اب تک یہی قیاس کیا جاتا ہی کہ جو وقت گزر جاتا ہی وہ معدوم ہو جاتا ہی اور اُس کا کوئی نشان سوائے تاریخی یادداشتون کے باقی نہین رہتا۔

زمانہ مادّی ہے یا مجرّد

زمانہ کی تقسیم حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

(الف) زمانہ مادی بلحاظ اجسام۔

(ب) زمانہ مجرّد باعتبار آثار

(ج) زمانہ مجرّد باعتبار تخیلات

(د) زمانہ مجرّد باعتبار اجسام۔

(ہ) زمانہ مجرّد باعتبار تصرفات۔

چونکہ ہمنے زمانہ کو موجودات سے کوئی علیحدہ طاقت یا وجود نہین مانا ہی اس واسطے ہم ایک صورت مین تو یہ کہین گے کہ زمانہ مادی ہی کیونکہ موجودات کا بہت سا حصہ مادّی ہی اور دوسری طرف ہم باعتبار اُن تاثرات کے جو ان مادیات سے ظاہر اور مترتب ہوتے رہتے ہین، یہ استدلال اور قیاس کرنے کے مجاز ہین کہ زمانہ مجردات کی صورت بھی رکھتا ہی کیونکہ زمانہ کے ایسے آثار مترتبہ کا بہت سا حصہ خیالی اور ذہنی ہی ہوتا ہی تمام مادّی تصرفات کا اثر اور نتیجہ اکثر صورتون مین محض خیالی یا روحانی اور ذہنی ہوتا ہی ہم پر مجموعی زمانہ یا نوعی اور جزوی زمانہ کا جو کچھ اثر اور تصرف ہوتا ہی وہ اکثر ہمارے قلوب ضمائر اور دماغون پر موثر ہوتا ہی۔ اِس حیثیت سے زمانہ مجردات کی صورت بھی رکھتا ہی اور اِس جہت سے ایسا اثر اور تصرف ذہنیات پر زد کرتا ہی مادی بھی ہی۔ کوئی ایسی مادی کیفیت نہین ہی جو اپنی ذات مین مجرداتی جزو نہ رکھتی ہو۔

ہم جو زمانہ کا ایک جزو عظم ہین اور دیگر سب جزا سے ہماری ذات نسبت

اور رسائی ایک اعلیٰ پیمانہ پر ہی دو ہی قسم کا وجود رکھتے ہین یعنی ایک طرف مادی اور دوسری جانب روحانی۔ ہماری روحانی اور مجردانہ زندگی کے سامان اور تصرفات مادی زندگی سے کسی صورت مین کم نہین ہین۔ اور حقیقت تو یہ ہی کہ ہماری روحانی زندگی بمقابلہ مادی زندگی اور مادی تصرفات کے زیادہ تر با اثر اور وقیع اور وسیع الظرف ہی۔ ہماری اکثر ترقیات کا مدار ہماری روحانی زندگی ہی پر ہی۔ ہمارے ہاتھ پاؤن آنکھ ناک وغیرہ اعضائے شریفہ ہماری روحانی مشین ہی کے سہارے چلتے ہین اور ہماری روحانی مشین ہی انکی اکثر ترقیات اور کامیابی کا موجب ہی۔ ہمارا ہاتھ اسوقت گرفت کرتا ہی جب ہمارے اندرونہ سے حکم ہوتا ہے۔ اگر اندرونہ حکم نہ دے تو ہاتھ کوئی کام نہین کر سکتا۔ عقل اور فراست کیا ہی؟ ایک روحانی اور مجرداتی آلہ۔

زمانہ کی معدومیت اور اسکا عود

جب یہ کہا جاتا ہی کہ وقت گزر گیا یا گزر رہا ہی، تو اُسکا مطلب یہ نہین ہوتا کہ اب اُسکے بعد کوئی اور وقت یا زمانہ آے گا ہی نہین۔ اگرچہ یہ کہا جائے گا کہ جو ہمارا وقت اور زمانہ ہی یا جو ہمارے زمانہ کا طرز اور روش ہی وہ پھر نہ ہو۔

لیکن یہ نہین کہا جا سکتا کہ کسی دوسرے رنگ مین بھی کوئی زمانہ نہ آئے۔ جن اجزا سے زمانہ ایک خاص وقت مین مرکب ہوتا ہی اور جو گردشین اور جو واقعات و کوائف اُس مین پائے جاتے ہین وہ توفی الواقعہ باقی نہین رہتے۔ لیکن ایک نئی صورت مین اُس کے بعد ایک اور زمانہ آجاتا ہی جو اپنے اجزا اور تصرفات اور واقعات کے اعتبار سے گزشتہ زمانہ سے متضاد ہوتا ہی۔ اُسکی گردشین اور اُسکے ادوار کوئی اور ہی صورت اور نقش رکھتے ہین۔ اُسکی گردشون اُس کے تاثرات واقعات اور اُس کے تصرفات کسی اور ہی رنگ مین متاثر اور عائد ہوتے ہین۔ زمانہ بھی بہیئت مجموعی اور من جہت نوعی اپنے وسائل کی بدولت ایک طاقت رکھتا ہی، جسے روح کہنا چاہیے اور روح بھی ایسی جو موت یا فنا کے بعد بھی باقی رہتی ہی۔ جب روح باقی رہتی ہی تو اُس کے واسطے حشر ثانی لازمی ہی۔ چونکہ روح مجردات سے ہی اسواسطے وہ حدود فنا سے بالاتر ہی اور ساتھ ہی لاتبدیل بھی ہی۔ روح کی طاقت جسم یا جسمانیات سے کہین زیادہ ہی۔ روح مین قدرت نے ایک ایسی طاقت بخش رکھی ہی جو جسم کے فنا ہونے پر بھی خود کو قائم رکھ سکتی ہی، اور قائم رہنے کی صورت مین کسی دوسرے رنگ مین اُسکا مکرر ظہور ہو سکتا ہی۔ مذہبی فلسفہ مین انہی وجوہ پر حشر ثانی کا اعتراف کیا گیا ہی۔ مذہبی فلسفہ ہی مین نہین بلکہ فلسفۂ عامہ مین بھی اِس حشر ثانی کی تائید کی گئی ہی۔ سقراط نے اپنے مرنے سے پہلے نہ صرف اس امر کا اعتراف ہی کیا بلکہ تلقین بھی کی تھی کہ مرنے کے بعد روحین "ہادیس" مین جائینگی اور ایک دوسرے سے ملاقی بھی ہونگی۔ ایطرح اور فلاسفرون نے بھی اسکی تائید کی ہی۔

زمانہ کو بعض حکمائے دہر نے عقلِ اعظم یا روحِ اعظم سے بھی تعبیر کیا ہی، اُن کے مذہب کے بموجب بھی ہم کہہ سکتے ہین کہ بہ حیثیت ایک روح یا قوتِ عظیمہ کے زمانہ بھی بعد از فنا دوسری زندگی حاصل کرے گا اور اُسکی زندگی ثانی کا طرز اور روش کچھ اور ہی رنگ رکھے گی۔

ہر چیز جو موجودات مین پائی جاتی ہی وہ کسی نہ کسی قسم کی زندگی رکھتی ہی اور اُسکی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہی، اور ہر زندگی مین ایک خاص قسم کی قوت اور روح ہوتی ہی اور چونکہ ایسی ہر قوت یا ہر روح عارضی فنا یا عارضی عدم کے بعد مستقل طور پر وجود ثانی قبول کرنے کی اہلیت رکھتی ہے، ؎

یارب مٹے نہ دل سے کبھی داغ آرزو
ٹھنڈا نہ ہو چراغ شبِ انتظار کا

مشیّت اعلیٰ اور زمانہ

برہمن کعبہ نشین شیخ حرم بندۂ بت
مصلحت ہی جو مشیّت ہی الٰہی تیری

یہ کہنا کہ زمانہ یا زمانہ کے اجزائے صغیرہ اور کبیرہ یا موجودات اور کائنات کا چرخہ بغیر کسی چلانے والے کے چل رہا ہو ایک خیال باطل اور سودائے خام ہو۔ سب موجودات اور سب اجزائے زمانہ ایک ترتیب اور ترکیب رکھتے ہین جو مستلزم ہو اس کی کہ کوئی مرتب اور مرکب بھی ہو۔ جو مرتب اور مرکب اعلیٰ ہو وہی ایک اعلیٰ مشیت ہو۔ وہ باقی ہو اور دائم ہو اور اُس کے سوا سب حادث اور فانی ہین جب اُسے فنا نہین تو اُس کی قدرت بھی فانی نہین۔ جیسے پہلے تھی ویسی ہی اخیر پر بھی ہو گی۔ تمام واقعات ادوار اور گردشون کی چابی اُسی کے زبردست ہاتھ مین ہو۔ کوئی ہستی اور کوئی چیز اُس کے ید قدرت سے باہر نہین خیال کی جا سکتی۔ ذات صمدی کو فنا اور زوال نہین، جو مستلزم اس امر کا ہو کہ اُسکی قدرتون اور مشیت کو بھی فنا اور زوال نہین اُسکی مرضی اور اُسکا ارادہ جیسے ازلی ہو ویسے ہی ابدی بھی ہو۔ یہ ازلیت اور ابدیت متقاضی اس امر کی ہو کہ جو کچھ گزر گیا اور گزر رہا ہو یہ پھر کسی اور عالم مین متشکل ہو کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہین کہ موجودہ دور یا موجودہ زمانہ مین بھی جو کچھ گزر جاتا ہو اُس کے بجائے ایک اور دور یا زمانہ آجاتا ہو۔ ایک خاتمہ دوسرے دور کا شروع ہوتا ہو۔ جبکہ تمام ادوار اور چکر ختم ہو جائین گے تو ایک اور دور اور چکر شروع ہو گا۔ جسطرح ہم آنیوالے دور کی بابت نہین کہ سکتے کہ وہ کیسا ہو گا ایسے ہی یہ بھی نہین کہا جا سکتا کہ حشر ثانی یا زندگی ثانی کیسی ہو گی' البتہ یہ کہ سکتے ہین کہ وہ موجودہ رنگ مین نہین ہو گی نہ اس قسم کی دُنیا ہو گی اور نہ موجودات نہ یہ آفتاب اور ماہتاب' نہ یہ سیارے نہ ستارے' کچھ اور ہی نقشہ ہو گا جن کی نسبت ہم یہ نہین کہ سکتے کہ کیسا اور کس قسم کا ہو گا۔ ہم ایک اعلیٰ طاقت اعلیٰ مشیت کو کسی نہ کسی رنگ مین مانتے ہین' اور یہ بھی مانتے ہین کہ وہ طاقت اور وہ مشیت موجودات کے افعال اور اعمال و تصرفات سے اعلیٰ اور قوی ہو لہذا جس ترتیب سے ہم موجود ہین وہ ترتیب ایک بڑی حد تک ہماری عقل و فراست کا نتیجہ اور اثر نہین ہو۔ اس صورت مین یہ خدشہ پیش آنا کہ اس موجودات اور زمانہ کی کُلّی فنا کے بعد جو تدریج ہو رہی ہو حشر ثانی یا دورِ ثانی نہین ہو گا ایک فریب وہ حجت ہو جب ایک طرف وہ اعلیٰ مشیت باقی اور حی و قائم ہو' اور دوسری طرف اُسکا ارادہ اور تیسرے یہ مشاہدہ کہ ایک جزوی خاتمہ کے بعد ایک اور سمان یا زمانہ وجود پذیر ہوتا ہو تو پھر ہم یہ کسطرح کہ سکتے ہین کہ فنا کلی کے بعد پھر کوئی دور ثانی شروع نہین ہو گا یا نہین ہو سکتا۔ یہ کہنا کہ باوجود فنا کے بھی یہی دور اور یہی سلسلہ شروع رہیگا درست نہین' کیونکہ اسکا فانی ہونا ثابت ہو چکا ہو۔ جب کل کے بعض اجزا فنا پذیر ہین تو کل بھی فنا پذیر ہو گا اور کلی فنا پر ایک اور زندگی کے رنگ مین موجودات وجود پذیر ہو گی۔ سائنس والے تسلیم کرتے ہین کہ کوئی چیز فنا نہین ہوتی۔ اسکا یہی مطلب ہو کہ عارضی یا فنا اولیہ کے بعد دوسری زندگی نصیب ہوتی ہو۔ چاہے وہ کسی رنگ یا کسی روپ مین ہو سائنس والے ہی نہین فلاسفر اور تقریباً جملہ مذاہب بھی اسکی تائید مین ہین عارضی فنا حشر اصغر ہو جو اجزائے مختلفہ کی صورت مین صورت پذیر ہوتا ہو جب کلی فنا کے بعد حشر ثانی ہو گا تو اُسے حشر اکبر کہا جائے گا۔ جب ہم حشر اصغر کے مقرب ہین تو حشر اکبر کا اعتراف لازمی ہو۔ ہم دیکھتے ہین کہ ایک مادہ کی تکسیر صغیرہ ہو کر ایک دوسری صورت کسی دوسرے رنگ مین ہمارے سامنے لائی جاتی ہو۔ کوئی وجہ نہین کہ یہ صورت تکسیر کبیر کوئی دوسری صورت وجود پذیر نہ ہو۔

جب یہ کہا جاتا ہو کہ نیست سے ہست و بود نہین ہو سکتی تو اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہونا چاہئے کہ ہست سے نیست نہین ہوتا۔ کیونکہ جیسے نیست بذاتہ ثابت ہے' ویسے ہی ہست بھی ایک مثبتہ کیفیت ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہین کہ ہست بود سے صورت نیست صورت پذیر ہوتی ہو گو وہ کسی اور رنگ مین بدل جائے گر موجودہ نقش ہست قائم نہین رہتا۔ جب موجودہ نقش ہست قائم نہ رہ کر ایک دوسرا نقش قائم ہو سکتا ہو تو یہ کہنا ہوگا کہ نیست سے ہست کا نقش ہر قسم ہو سکتا ہو اور یہ دونون صورتین حشر

صغرا اور حشر اکبر کی ہین۔ نقیض سے نقیض پیدا ہوتی ہی۔ زندگی سے موت اور موت سے زندگی۔ جب دوسری مرتبہ زندگی ملے گی تو پھر فنا نہین ہوگی۔ کیونکہ موت کے بعد موت اور عدم کے بعد عدم نہین ہوتا۔ اور زندگی ثانی چونکہ ایک نئی قسم کی زندگی ہوگی اسواسطے لازمی ہی کہ وہ دائرۂ فنا سے دور تر ہو۔ مشیت زندہ ہی۔ ضروری ہی کہ کسی وقت اُسکے آثار بھی یہ کیفیت حاصل کرین۔ ہماری موجودہ زندگی در اصل زندگی نہین ہی بلکہ موت اور دوسری زندگی کا پیش خیمہ۔ موجودات کی زندگی ایک سفر ہی۔ اِس سفر کے بعد اُسے وہ زندگی ملے گی جو اِس زندگی سے ممتاز ہوگی۔ اگرچہ بعض کا یہ خیال نہ ہو۔

زندگی ثانی کی ضرورت

یہ ایک بڑا اہم سوال ہی کہ زندگی ثانی کی کیا ضرورت ہی اور کیون اسکا اعتراف کیا جائے؟

مذاہب کے اعتبار سے تو یہ سوال چندان پیچیدہ نہین کیونکہ ہندمین وہ مذہب بھی زندگی ثانی کے منکر نہین ہین۔ ہر مذہب اپنے اپنے رنگ مین اسکا ایک بڑی حد تک اعتراف کرتا ہی۔ فلاسفرون اور حکیمون سے بھی اکثر فلاسفر ایسے ہین اور دلائل کے ساتھ اِس تھیوری اور اِس مذہب کے معترف اور موید ہین۔

زندگی ثانی اُس نسبت اور اُس جہت سے ہونی چاہیئے جو اس موجودات مین ہر خلقت کو حاصل ہی۔ ہم دیکھتے ہین کہ اِس موجودات کی زندگیان ایک ہی قسم کی نہین ہین۔ نباتات جمادات کی زندگی حیوانات و انسانون کی زندگیون سے بہت کچھ فرق اور امتیاز رکھتی ہی۔ اِس امتیاز کے ساتھ ہی اُن کی تربیت اور عظمت مین بھی فرق ہی۔ کل موجودات مین سے انسان اور انسانی زندگیان ممتاز اور اشرف ہین۔ قدرت نے جو کچھ انسان کو عطا کیا اور بخشا ہی کسی دوسری خلقت کے حصہ بخرہ مین نہین آیا ہی۔ ایک صورت مین انسان دیگر کل موجودات کا ایک مجموعی نمونہ ہی یا ایسی معجون مرکب جس مین ہر قسم کا عنصر اور جزو پایا جاتا ہی۔ انسان کی ذہنی طاقتین اور دماغی کمالات ضمیری عجائبات اِس قسم کے نہین ہین کہ انھین معمولی سمجھا جائے۔ انسان ترقی کرتے کرتے جن اقصائے مطالب اور ممتاز مقاصد تک پہنچتا ہی وہ کسی دوسرے حصۂ موجودات کے حصہ مین نہین آئے ہین۔ ہرچند کہ دوسرے حصۂ موجودات مین بھی بہت سی خلقتین ممتاز اور اشرف ہین لیکن انسان کے مقابلے مین اخیر تک کامیاب نہین ہوئی ہین اور نہ ہو سکتی ہین۔ کیا قدرت نے یہ کمالات انسان کو صرف اسواسطے عطا کیے تھے کہ چند روز کے بعد فنا ہو جائین اور اُنکی رفتار مرنے کے بعد رُک جائے؟ ایسا کہنا اور ایسا اعتراف قدرت اور انسان دونون کی تحقیر کرنا اور اسکے فضل و شرف کو ایک شرمناک بٹہ لگانا ہی۔ انسان کو جو قوتین عطا کی گئی ہین وہ رُکنے کی نہین ہین۔ جیسے وہ زندگی مین ترقی کرتی ہین ایسے ہی مرنے کے بعد بھی لازمی ہی کہ وہ لگاتار ترقی کرتی جائین اور اُنکی رفتار اُس منزل پر جا کر رُکے جو اُس کے واسطے ایک آخری منزل ہی۔

صانع اور مصنوع مین ایک لاینفک نسبت کا ہونا لازمی ہی۔ انسان اور خدا مین کئی ایک نسبتین ہین۔ اگر خدا دائمی زندگی رکھتا ہی تو انسان اِس عالم صغیر مین ایک عارضی زندگی رکھتا ہی۔ اگر خدا ایک کامل صانع ہی تو انسان ایک ناقص صانع ہی۔ اگر خدا کل موجودات سے اشرف اور افضل ہی تو انسان اس موجودات مین سے یقیناً اشرف اور افضل ہی۔ اگر خدا کامل ارادہ رکھتا ہی تو انسان بھی ناقص ارادون کا بانی ہے۔ یہ یا اِسی قسم کی اور تمام نسبتین انسان ہی کی ذات مین ایک حد تک پائی جاتی ہین کوئی دوسری موجودات ان سے انسان کی طرح موصوف نہین ہی۔ یہ دلیل اس بات کی ہی۔ انسان کی پوزیشن اور درجۂ شرف و فضل تمام دیگر موجودات سے ممتاز اور اعلیٰ ہی۔ اور اِس بارے مین کوئی موجودات اُسکا مقابلہ نہین کر سکتی ہے۔

جب انسان یہ درجہ اور یہ فضل و شرف رکھتا ہی تو اُس کے مرنے کے بعد محض نیست و نابود ہو جانا عقل سلیم قبول نہین کرتی۔ یہ تمامی ایسی

نہین کہ محض نیست و نابود ہو کر رہ جائے اور اُسکی تمام صفتین اور کمالات گاؤخورد ہو جائین۔ خدا کے بعد بھی خلقت ہی۔ اس کا محض نیست و نابود ہو جانا خدا کی عظمت و حکمت کے خلاف ہی۔ بے شک بمصداق "کل من علیہا فان" ہر خلقت فانی ہی، اور انسان بھی فانی ہی، لیکن اس فنا کا یہ اثر نہین کہ مر کر پھر جینا نہ ہو۔ چونکہ صانع اور مصنوع مین ایک نسبت ہی اور بالخصوص انسان اور خدا مین تو ایک بڑی حد تک نسبت پائی جاتی ہی اسواسطے سب سے بڑھ کر دوسری زندگی یا دائمی زندگی کا مستحق انسان ہی ہی تاکہ اس شرف سے یہ کہنے کا موقع ملے کہ انسان کا رتبہ اس درجہ تک ہی۔ یہ بحث کہ زندگی ثانی ناممکن ہی مذہبی خیال سے تو کوئی وقعت نہین رکھتی کیونکہ کوئی مذہب بھی اس نقطہ خیال سے نہین ہٹتا۔ ہم جب خدا کو قادر مطلق مانتے ہین تو وہ ہر صورت مین زندگی جدید یا زندگی ثانی بخش سکتا ہی۔ کیونکہ وہ ہمارے مقابلہ مین ہر وقت قادر مطلق اور حی و قائم ہی۔ اُسکی قدرت کا محدود کر دینا اور انسانی شرائط سے اُس کا مشروط کرنا درست نہین ہی۔ اگر سائنس اسکی مخالفت کرتا ہی تو اُسکی مخالفت اس وجہ سے بھی کہ ابھی ہماری سائنس مکمل ہی نہین ہوئی ہی قابل وقعت نہین ہی اور جبکہ خود سائنس بھی اس عقیدت کا موئید اور مثبت ہی کہ فنا دائمی کسی ہستی کو نہین ہوتی ہی تو کس صورت مین ہم اس زندگی ثانی سے انکار کر سکتے ہین۔ مذاہب حشر ثانی اور زندگی ثانی کی کیسی اور نہج پر تعبیر کرتے ہین اور سائنس کسی اور جہت پر۔ ہم کہتے ہین کہ دوسری زندگی یا حشر ثانی بھی خدا ہی کی قدرت کاملہ کے ماتحت ہوگا، اور ایک جدید رنگ مین موجودات وجود پذیر ہوگی، بالخصوص حضرت انسان بوجہ اپنے فضل و شرف کے مرنے کے بعد ضائع نہین ہو سکتا۔ یہ سوال کہ ایسی جدید موجودات کیونکر ظہور پذیر ہوگی، ایک ایسا سوال ہی جس کا قطعی طور پر حل کرنا موجودہ انسانی طاقت اور حرکات سے باہر ہی اور کچھ ضرورت بھی نہین کہ اس پر مستقل بحث کی جائے۔ فلسفہ مذاہب مین اس سوال پر بہت کچھ روشنی ڈالی گئی ہی۔ وہ خود طلب ہی۔ اگر اُس سے ہی طمانیت نہین ہو سکتی تو پھر مزید بحث کی ضرورت نہین ہی۔ کسی وقت خود بخود ہی یہ سوال حل ہو کر رہیگا۔

ہان اتنا کہا جائے گا کہ فلسفہ مذاہب مین جو کچھ بیان کیا گیا ہی اگرچہ اسکے بعض حصے قابل بحث ہون، لیکن اگر اُن کی تطبیق فلاسفرون کے اقوال سے کیجائے تو ماننا پڑیگا کہ فلسفہ مذاہب کی تائید مین مشاہیر حکمائے دہر کے اقوال بھی ہین۔ فلسفہ مذاہب کو محض اسواسطے نظر انداز کر دینا کہ وہ مذہبی دُنیا سے تعلق رکھتا ہی ایک فرسودہ روش ہی۔ مذہبی فلسفہ بہت کچھ قابل احترام ہی اور اس فلسفہ کے مشاہیر کی متبرک اور مقدس زندگیان بہت کچھ وقعت اور عظمت رکھتی ہین، اور دیگر فلسفہ کے مقابلے مین یہ فلسفہ ایک اعلیٰ طاقت سے وابستہ ہی، اور اُس مین ایسی صداقت ہی جو دُنیا کی تمام دیگر صداقتون سے ممتاز اور اشرف ہی، اور اسکی طاقت اور جذبات سے کوئی دوسرا فلسفہ بڑھکر نہین کہا سکتا۔

ماحصل

یہ تمام ساعات تمام آفاق تمام اقران تمام اوقات تمام عہود تمام لیل و نہار تمام طلوع و غروب تمام نزول و صعود تمام اجرام سماوی و ارضی تمام ادوار تمام گردشین تمام واقعات تمام سانحات تمام حقائق تمام کیفیات تمام عدم و وجود تمام حیات و ممات تمام گفت و شنود تمام تاثرات تمام تصرفات تمام جذبات تمام خیالات تمام اجتہادات تمام قیاسات تمام اختراعات تمام مصنوعات تمام حرکات تمام سکنات تمام لوازمات تمام عوارضات تمام جواہر تمام مخفیات تمام طبعیات تمام حیات تمام ادراکات تمام احساسات تمام طیور تمام عقلا و وحوش تمام حیوانات تمام نباتات تمام جمادات تمام آثار تمام عناصر تمام شرفا تمام خواتم تمام ظواہر تمام بواطن تمام ترقیات تمام تنزلات تمام تبدلات تمام تغیرات تمام یمین و یسار تمام ماثور تمام اثیار تمام فوق تمام تحت تمام انسان اور انسانی ذریات تمام حیوانی ذریات تمام احوال تمام موجودات تمام مناظر تمام معقولات تمام منقولات تمام مشروعات تمام مسموعات تمام مشمومات تمام ملموسات تمام ماکولات تمام محسوسات تمام جسمانیات تمام روحانیات تمام

تصورات تمام تصدیقات تمام دینیات تمام کون و فساد وہ یہ ہم اور تم وغیرہ وغیرہ سب کے سب اپنے اپنے رنگ مین زمانہ اور اجزائے زمانہ ہین زمانہ ہم سے علیحدہ نہین اور ہم زمانہ سے جُدا نہین اُسکی موجودگی ہماری موجودگی اُسکا گزرنا ہمارا گزرنا اُسکا بدلنا ہمارا بدلنا اور ہمارا بدلنا اُسکا بدلنا ہے۔

اور یہ سب کچھ اُس اعلیٰ طاقت کے مضبوط اور قادر ہاتھون مین ہی جو اِس دُنیا اور تمام سامان دُنیا کا خالق و صانع ہی۔ اگرچہ بعض جلد باز روحین اِس ذات سے انکار کرتی اور اُسپر مصر ہوتی ہین لیکن آخر مین اُنکا دل بھی شاہد ہوتا ہی کہ اُنکا اجتہاد اور خیال درست نہ تھا۔

ہم موجودات مین سے صرف کسی ایک ہستی، ایک کیفیت، ایک چیز ایک معترف کو زمانہ نہین کہہ سکتے۔ سب موجودات مل ملا کر، زمانہ کا مفہوم پیدا کرتی ہی۔ جب ہم کہتے ہین کہ

زمانہ بدل گیا یا

وہ زمانہ نہین رہا

تو دوسرے الفاظ مین مفہوم یہ ہوتا ہی کہ جو واقعات جو کیفیات جو حادثات جو سانحات جو عوارض جو لوازم جو ساعات جو اوقات جو محسوسات جو مدرکات جو تصرفات جو تاثرات جو جذبات جو محرکات جو موجودات اور جو کائنات ایک وقت مین بہ قید ہستی تھی وہ موجود نہین رہی، اُسکی جگہ اور ہستیون کے حصہ مین آچکی ہی۔ میری رائے مین یہ کہنا صحیح اور درست نہین کہ علاوہ متحرک حرکت اور مسافت کے ایک دوسری کیفیت زمانہ ہی۔ یہ سب اجزائے زمانہ ہین۔ بعض صغیرہ بعض کبیرہ بعض ساکن بعض متحرک بعض قار بعض غیر قار بعض سماوی بعض ارضی بعض جسمانی بعض روحانی بعض مرئی بعض غیر مرئی بعض ظاہری بعض باطنی بعض منقسم بعض غیر منقسم بعض ارادی بعض غیر ارادی بعض حیوانی بعض انسانی بعض نباتاتی بعض جماداتی وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب اجزا منفردةً و نیز مجموعتاً زمانہ یا مجموعہ زمانہ ہین۔ کسی خاص صورت، حقیقت اور کیفیت کو زمانہ کہنا زمانہ کی وسعت کو کم کرنا اور اسکے اصل مفہوم کی کچھ اور تعبیر کرنا ہی۔ وہ ارادہ جو سب ارادون وہ تدبیر جو سب تدبیرون، وہ قدرت جو سب قدرتون، وہ ہاتھ جو سب ہاتھون وہ تصرف جو سب تصرفات، وہ جذبہ جو سب جذبات، وہ حکمت جو سب حکمتون سے اعلیٰ اور افضل ہی جو خالق اور صانع کے مقدس نام سے موسوم ہوتی اور تعبیر پاتی ہی، اِس سب کارخانہ کی منفردةً اور مجموعتاً چلانے والی ہی، اور اُسکی حکمت بالغہ ہر رنگ مین کام کر رہی ہی وہی لائق پرستش و شکریہ ہے۔

تعظیم تو بر جان و خرد واجب و لازم
انعام تو بر کون و مکان فائض و شامل

سلطان احمد

اثبات واجب الوجود

خدا کی ہستی قدیم الایام سے ہر ملک، ہر صدی، اور ہر قوم مین مسلّم چلی آتی ہے۔ مہذب اور غیر مہذب، جاہل اور شائستہ، سب اقوام کم وبیش ایک ایسے وجود کی قائل چلی آتی ہین جو عالم و مافی العالم کا خالق، بانی، اور محرک کہا جاتا ہے۔ جن وحشی قومون کے درمیان ایک سے زائد معبود مانے جاتے ہین، وہ بھی ایک دیوتا کو سب سے بڑا اور سب چیزون کا خالق مانتی ہین۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس مضمون مین واجب الوجود کی نسبت خیالات سے بحث کی جائے اور بتایا جائے کہ علمائے مغرب خدا کی ہستی کو کس طرح ثابت کرتے ہین اسکے ساتھ ہی اس امر پر بھی بحث ہوگی کہ یہ غلط فہمی جو پیدا ہوگئی ہے کہ سائنس کی ترقی سے اہل یورپ اور امریکہ خدا سے منکر ہوگئے ہین اس مین کتنی حقیقت اور کتنا مبالغہ ہے۔ بعد ازان ہم یہ دکھائینگے کہ ہندو دھرما تما و دوان اور مسلمان علما خدا کی ہستی کو کس طرح ثابت کرتے ہین۔ ضمناً بعض یونانی حکما کے خیالات اور استدلال کا بھی ذکر ہوگا۔

خدا کی ہستی کی نسبت علمائے مغرب کے دلائل

خدا کی ہستی کو سبھی مانتے ہین بلکہ یون کہنا بجا ہوگا کہ تمام مذاہب (بعض شاذ مستثنیات کے) عالم کے خالق اور موجودات کے مالک کے وجود کو مانتے ہین۔ ہر ایک آستک مذہب کا سب سے مقدم اصول خدا کی ہستی ہے۔ بودھ اور جین مت ہی تمام دنیا مین صرف دو ایسے مذہب ہین جو کھلم کھلا خدا کی ہستی کے منکر ہین۔ خدا کی ہستی کے قائل ہونے کے ساتھ ہی ہر بڑے مذہب کے مقلدون نے اسکی ذات، صفات، حکمت، دانائی کو جو کائنات مین نمایان ہے دیکھکر چند اصول اور مسلمات وضع کئے ہین جو اس مذہب کے الہیات کی جان ہین۔ منکر تو ہر ملک اور قوم اور ہر زمانہ مین پیدا ہوتے رہے ہین جو بات بات مین شک لاتے اور مذہب کے مسلمات کو بچون کا کھیل قرار دیکر اس سے صاف انکار کرتے چلے آئے ہین۔ مگر ایسے آدمیون کا شمار بہت قلیل اور بالکل محدود ہوتا ہے۔ تاہم علمائے دین اور اہل مذہب انکی دلائل در بارہ انکار خدا کی تردید اور اپنے معبود اولیٰ کے وجود کو معقول اور قابل تسلیم قرار دینے کے لئے دنیاوی علوم سے کام لیتے اور انکی بنا پر استدلال کرتے ہین۔ اسی طرح مغرب کے عالمان دین نے بھی خدا کی ہستی کے ثبوت بہم پہنچائے ہین۔ یہ گذارش کر دینا بھی مناسب ہے کہ مغرب کے عالمون مین بھی ایک سے زیادہ فریق ہین سب سے اول تو مسیحی مذہب کے عالم؛ دوسرے گروہ مین وہ لوگ شامل ہین جو مسیحی مذہب کو تمام وکمال تو قبول نہین کرتے مگر خدا اور مذہب کے قائل ہین؛ تیسرا گروہ ایسے عالمون کا ہے جو اول الذکر دو گروہون کے عقائد در بارہ خدا کو معقولیات کے پہلو سے ماننے کو تیار نہین ہے جو AGNOSTIC یعنی لا ادری کہلاتا ہے۔ اس گروہ کے لیڈرون مین سب سے اول ہربرٹ اسپنسر اور ہکسلے دوسرے درجہ پر آتا ہے۔

خدا کی ہستی کے دلائل

سب سے پہلے ہم مغرب کے عالمان دین کی بڑی بڑی دلائل کا ذکر کرنا چاہتے ہین جو وہ خدا کی ہستی کے ثبوت مین پیش کرتے ہین۔ واضح ہو کہ اثبات واجب الوجود پر بڑے بڑے عالمون نے معرکۃ الآرا کتابین تصنیف کی ہین جنکا ذکر اس مختصر مضمون مین قریب قریب ناممکن ہے۔ اس لئے معذرت کے ساتھ اختصار پر اکتفا کرنا پڑتی ہے۔ اگر اہل فکر اور علما کی اس بحث سے تشفی نہو تو وہ

ازراہ نوازش راقم کو معاف فرمائین کیونکہ ایسے رسالہ مین اس سے زیادہ بحث محال ہے۔

خدا کی ہستی کے ثبوت مین مغربی عالم اور حامیان دین حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہین، جو مذہب فطری کے اصول وارکان ہین (۱) تاریخی دلیل شاید اسے دلیل تواتر کہنا بجا ہوگا۔ روما کے مشہور فلاسفر سسرو اور سنیکا اسے ECONSENSU GENTIUM کے نام سے پکارتے ہین۔ بالفاظ دیگر اس کا یہ مفہوم ہے کہ تمام بنی آدم خدایا واجب الوجود کے قائل چلے آتے ہین۔ یعنی بنی نوع انسان کے متفقہ ایمان کی دلیل (۲) علت العلل یا علت اولی استدلال زرد (۳) حسن نظام عالم (۴) علت غائی اور تجویز (۵) شعور اخلاقی (۶) حاسۂ روحانی اور ذکاوت فطری۔

علاوہ ازین اور بھی کئی دلائل پیش کی جاتی ہین۔ مگر یہ سب سے زیادہ مشہور ہین۔ قدیم اور جدید فلاسفران مین سے کئی کئی دلائل کو خدا کی ہستی ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہین لیکن ہمارے موجودہ مطلب کے لئے یہی کافی ہین۔ اب مناسب ہے کہ ان دلائل پر قدرے تفصیل سے بحث کی جاے اور ان کا مفہوم واضح کیا جاے۔

(۱) بنی آدم کا ایمان خدا

تمام بنی آدم جہانتک معتبر تاریخ پتہ دیتی ہے، ایک مافوق العادت اور قادر مطلق ہستی کے قائل چلے آتے ہین۔ کوئی زمانہ کوئی قوم اور کوئی ملک اس عام ایمان سے کبھی بیگانہ اور محروم نہین رہا۔ اس کے متعلق دو باتین ذہن نشین کرلینا مناسب ہے (۱) پرانے زمانہ کے مذاہب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خدا کے قائل تھے، اور یہ کہ وہ اسے مادی دنیا سے اعلے وبالا سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسے ماورا الدہر اور محیط عالم بھی خیال کرتے تھے خدا کی ذات کا یہ تصور مذہب کا ایک ابتدائی اور بنیادی اصول تھا۔ (۲) موجودہ عقاید اور وحشی اقوام کے دینی خیالات کی جتنی چھان بین کی جائے اتنا ہی یہ امر زیادہ واضح ہوتا ہے، بلکہ اسے بہت تقویت پہنچتی ہے کہ ایک ماورا الدہر وجود ہے جس سے تمام موجودات کی خلقت اور صنعت منسوب کی جاتی ہے۔

ویدون کا مذہب بہت پرانا سمجھا جاتا ہے، اور اس سے دوسرے درجہ پر زرتشتی مذہب ہے اور ان دونون کے مطالعہ سے عالمون نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان مین ایک وجود اولی اور قادر مطلق کی صاف تعلیم دی گئی ہے جو موجودات کا صانع اور کائنات کا خالق ہے۔ عالم دمافی العالم ایک مافوق العادت الہی وجود کی قدرت اور حکمت سے وجود پذیر مانی جاتی ہین۔ نہ صرف یہی مانا جاتا ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ موجودات کا مبدا حقیقی ہے۔ گو عالم کی آفرینش کا خیال ایسا واضح اور صاف نہین ہے۔ تاہم سارے بیان پر غور کرنے کے بعد سب چیزون کو معرض ہستی مین لانیوالا اور مسبب الاسباب خدا ثابت ہوتا ہے۔

زرتشتی مذہب کی رو سے اہرمزد موجودات کا خالق بیان کیا گیا ہے وہ رب العالمین سمجھا جاتا ہے، اور اس کے مقابلہ مین اہرمن ہے جو ہر وقت اس سے برسر پرخاش رہتا ہے، اور خداوند ظلمات کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن دونون اصولون کے پس پشت ایک قادر مطلق غیر محدود وجود ہے جس کے اشارہ سے اہرمزد اور اہرمن پیدا ہوئے تھے۔

اب ان دونون مذہبون کو چھوڑ کر اگر قدیم مصر، بابل، نینوا وغیرہ کے لوگون کے عقاید اور علم الاصنام پر غور کیا جاے تو گو ہم وہان پر ایک دو نہین درجنون مختلف دیوتاؤن سے دوچار ہوتے ہین جنکی پرستش مین ایک قسم کی زبردست رقابت نظر آتی ہے مگر تو بھی دھندلا سا اشارہ اس مضمون کا ملتا ہے کہ وہ ایک ایسے دیوتا کے قائل تھے جسنے زمین و آسمان کو ہستی بخشی اور وہ کائنات کی پرورشت

قرار دیا جاسکتا ہے۔

یونان کے لٹریچر سے ظاہر ہے کہ شاعرون نے بہت سے دیوتاؤن کا ذکر کیا ہے۔ بعد کے زمانہ کے شعرا نے ایسے وجود فرض کئے جو دیوتاؤن سے کسی طرح کم نہ تھے۔ مگر ان دیوتاؤن اور وجود کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہے کہ وہ ایک وجود نادیدنی کے قائل تھے جو سب موجودات پر حاوی ہے۔ افلاطون کہتا ہے "آسمان اور زمین اسی کے وسیلہ سے معلق ہین"۔ گورمیون کے ہان بہت سے دیوی دیوتا مانے جاتے تھے مگر جوپی ٹر سب سے بڑا، حاضر وناظر اور قادر مطلق دیوتا تھا۔ باقی دیوتا اس کے مظاہر اور نشان تھے

قدیم زمانہ کے ملک خالدیہ مین گو سینکڑون دیوی دیوتا تھے، مگر لنسن کہتا ہے کہ "ا" سب دیوتاؤن کا مصدر اور سرچشمۂ خدائی تھا۔ چین کا بڑا گرو کنفوشس تھا۔ اس کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ اُسنے خدا کی بابت کچھ نہین کہا مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ موجودات اور مظاہرات کے پس پشت ایک ناقابل فہم اور غیر مرئی قوت کا قایل تھا اور اسسے دعا کرتا تھا۔ وہ اُسے آسمان یا آکاش کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ مگر اس وجود کی اصلیت کی بابت اس کا کوئی خاص خیال نہ تھا۔ بلکہ "شی کنگ" (مجموعہ کلیات) مین وہ ایک صاحب شخصیت اور ذی ارادہ خدا کو مخاطب کرتا ہے۔ چین کا دوسرا گرو تاؤ بھی خدا کا قایل تھا۔ پرانے زمانہ کی کسی مہذب قوم کو لے لو۔ کم وبیش خدا کا خیال اس کے ہان موجود تھا۔ بعض کے ہان صاف خیال تھا، اور بعض کے ہان صرف دھندلا سا۔ آریہ، اور تورانی، اور سامی اقوام کے عقائد خدائے واحد، قادر علے الاطلاق، خالق ارض وسما مالک ہر دوجہان کی ہستی پر شاہد ہین۔

موجودہ جاہل اقوام جو امر پرانے زمانہ کی مہذب اقوام کے عقیدہ پر صادق آتا ہے وہ موجودہ زمانہ کی جاہل اور وحشی قومون پر بھی عاید ہوتا ہے۔ افریقہ، امریکہ، اوشنیا وغیرہ مین جو وحشی اور ابتدائی قومین آباد ہین وہ کم وبیش ایک وجود مطلق کو مانتی ہین۔ گو اُن کا یہ عقیدہ بہت واضح نہین ہے اس لئے کہ عقلی طاقتین ابتدائی مرحلۂ نمو مین ہین علاوہ ازین وہ بہت سے دیوتاؤن کو بھی پوجتی ہین۔ باوجود اس کے وہ ایک سب سے بڑے دیوتا کو مانتی ہین۔ گو سر جان لبک (لارڈ اوبری مرحوم) اور سان ہلیئر فرنچ محقق کا یہ خیال ہے کہ کئی جاہل قبائل خدا کے اعتقاد سے بیگانہ ہین مگر فرانس کا ایک اور بہت ہی مشہور محقق مونسیور کاترفاژ بیان کرتا ہے کہ "میری تحقیقات اور تجسس کا نتیجہ سر جان لبک اور سان ہلیئر کے نتائج کی نقیض ہے۔ تمام بنی آدم کے حالات دریافت کئے اور ایمان خدا کا عدم وجود ادنی ترین اور اعلے ترین قومون کے درمیان تلاش کیا مگر سوائے بعض افراد یا فرقہ کے کہین نہ ملا۔ یہ شخص خود اگناسٹک یعنی لاادری فرقہ کا ہے۔

(۲) علت العلل

دلیل تواتر پر قدرے طوالت کے ساتھ بحث کرنے کے بعد اب ہم دوسری دلیل کا ذکر کرنا چاہتے ہین جو علت العلل کہلاتی ہے۔ انگریزی اصطلاح مین اس کا نام AETIOLOGICAL ARGUMENT ہے۔ یعنی اسباب ونتائج کے سلسلہ پر غور اور اسکی ابتدا کا کھوج کرتے ہوئے ہم ایک علت آخری سے دوچار ہوتے ہین، جو تمام مظاہر وموجودات عالم کا سبب آخری اور مبدا ثابت ہوتی ہے۔ اسباب ونتائج کے سلسلہ کی تمام کڑیان اس پر ختم ہوجاتی ہین۔ یون سمجھنا چاہئے کہ اس سلسلہ کی اول کڑی وہی ہے باقی کڑیان اسکی شاخین ہین۔

تواتر سے غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ ہر زمانہ، ہر قوم، ہر ملک کے مہذب اور غیر مہذب، جاہل اور عالم کا ایمان

ایک ہستی اولی پر زمانہ مقدم التاریخ سے چلا آتا ہے جو عالم وما فی العالم کا خالق اور مبدا اولی ہے۔ تمام چیزین اپنی ہستی کے لئے اسکی قدرت وحکمت کی محتاج ہین وہ اس عالم کا حاکم اور مالک ہے۔

اب اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ موجودات کو دیکھنے اور عالم کی کیفیت مشاہدہ کرنے سے اس عقیدہ کی تائید ہوتی ہے یا نہین؟ اسکے متعلق حسب ذیل امور قابل غور ہین۔

عالم کے اندر مادیات کی یکسانیت ویکرنگی زمانہ حال کے سائنسی انکشافات اور تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عالم مادیات مین فطری اور جبلی یکسانیت اور یکرنگی پائی جاتی ہے۔ جتنی قوتین عالم کے اندر کام کرتی معلوم ہوتی ہین وہ سب کی سب ایک قوت اولی (PRIMAL FORCE) کی مختلف شکلین ہین۔ جتنی اشیاء کائنات مین ہین وہ سب کی سب ایک اصل اور ایک مبدا، عالم کی گوناگون صورتین ہین۔ مادیات مین اصول ثنیہ (DUALITY) نہین، اور نہ مبدا کی کثرت (PLURALITY) ہے۔ بلکہ وحدت (MORISM) ظاہر ہے۔ گو عالم کے اندر خامیان اور کوتاہیان پائی جاتی ہین، مگر وہ بھی ابتدائی علت غائی کے اجزا ہین۔ اور ایک نامعلوم مقصد پورا کرنے کو روا رکھی گئی ہین۔ مفردات مادہ کو لو، یا حاضر و ناظر قوا کی تبدیل ہیئت کو لو یکسانیت اور وحدت ہر جگہ موجود ہے۔

کرہ ارض کی ابتدا حقایق الاشیاء اور موجودات سے قطع نظر کرہ ارض کی ابتدا پر غور کرو۔ سائنس والون کو اسکی ابتدا کا اب بہت معقول علم حاصل ہوگیا ہے۔ اسکی عمر کا تخمینہ بھی ہو گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس نے بنایا؟ کون اسے نیستی سے ہستی مین لایا؟ اسباب وواقعات پر غور کرکے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ضرور کسی ذی عقل اور صاحب قدرت ہستی نے تحریک دی۔ آپ سے آپ پیدا ہونیوالی قوت عالم مین نہین پائی جاتی۔ پروفیسر جونکر اپنی شہرہ آفاق کتاب "پرنسپلز آف سائنس" مین لکھتے ہین: "مسئلہ حرارت سے ہم ایک معمہ سے دوچار ہوتے ہین۔ یا تو آفرینش عالم ایک زمانہ مقررہ کے اندر واقع ہوئی یا یہ ماننا پڑے گا کہ ابتدا مین قوانین کے عمل مین کوئی ناقابل تشریح انقلاب واقع ہوا" (صفحہ ۴۳۹)۔ اور بہت سے سائنس دان بھی اس امر پر متفق ہین۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسکی علت فاعلی کیا تھی؟ اگر فلکی نظریہ سحاب کو مان لیا جائے اور یہ بھی باور کر لیا جائے کہ سحاب آسمانی مین فعل ارتقا پیدا ہونے سے عالم وجود مین آئے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس نے اسے ابتدا مین حرکت دی؟ زیادہ ادق مسائل کو چھیڑے بغیر ہم یہ مان لیتے ہین کہ کوئی ذی ادراک ہستی تھی جسے قائم بالذات انقلابات سے بالاتر موجودات کا مبدا اولے مانا جاتا ہے۔

زندگی کی ابتدا عالم کا کوئی حصہ زندگی سے خالی نہین عالم نباتات اور اقلیم حیوانات اس سے لبریز ہین۔ مگر زندگی کیا ہے؟ یہ سوال بڑا مشکل ہے۔ زندگی کی مختصر تشریح یہ ہے "اندرونی تعلقات کا خارجی تعلقات سے متواتر ربط وضبط اور موافقت واتحاد رکھنے کے مسلسل عمل کا نام ہے" (فرسٹ پرنسپلز صفحہ ۹۱ و ۹۳) یہ معمہ اب تک حل نہین ہوا کہ بے جان مادہ کا جان سے کیا تعلق ہے، اور دونون کے درمیان جو مغائرت ہے اُسے کس طرح رفع کیا جائے اور اسکی تشریح کس اصول سے ممکن العمل ہے؟ عالمان افعال الاعضاء (PHYSIOLOGY) پروٹوپلازم (PROTOPLOSM) کی طرف اشارہ کرتے ہین جو زندگی کا اصول مادی قرار دیا جاتا ہے پروفیسر آل مین نے کچھ عرصہ ہوا برٹش ایسوسی ایشن مین ایڈریس دیتے ہوے فرمایا تھا کہ "ہر جاندار کی ذی جان ساختون کا جزو لاینفک پروٹوپلازم ہے"۔

ہکسلے نے انسائیکلو پیڈیا برٹانکہ مین "بیالوجی" کے عنوان پر مضمون لکھتے ہوئے کہا تھا "جاندار مادہ کی ابتدا کن اسباب سے ہوئی ہم کچھ نہین جانتے"

ڈاکٹر سر ایڈورڈ شیفر نے ۱۹۱۲ء مین ابرڈین کی برٹش ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ مین زندگی کی ابتدا سے بحث کی اور اسے کیمیائی طریقہ سے پیدا کرنے کی توقع ظاہر کی تھی۔ مگر یہ انکی شخصی راے ہے۔ اس کے متعلق یورپ اور امریکہ کے اخبارات مین بڑی لے دے ہوئی عالمون نے اتفاق سے بیان کیا کہ زندگی پیدا کرنا سائنس کے امکان سے بعید ہے۔ مسئلہ ارتقا والے کہین گے کہ بے جان مادہ سے عمل ارتقا کے وسیلہ سے جاندار عنصر پیدا ہوا مگر یہ صرف گمان ہی گمان ہے۔

(۴) **من کی ابتدا** زندگی کی ابتدا کی طرح عقل و ذہانت کی ابتدا کا معمہ بھی لاینحل اور ادق ہے۔ من اور شعور کیسے وجود مین آیا؟ اسکی علت فاعلی کیا ہے؟ اگر ہیکل کی طرح اسے مادہ کی لطیف صورت اور اسکی غیر مرئی حرکات کا نتیجہ تخیل مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہون گے کہ تمام فلسفہ اور بالخصوص فلسفۂ ذہنی کے جملہ اصول الٹ پلٹ ہوجائین گے اور فلاسفرون کے صدیون کے غور و فکر کے نتائج دریا برد کرنے پڑین گے۔ یہ قرین قیاس نہین ہے کہ محض خیال کے لئے ایک ہستی نے دنیا کو بنا دیا جو خود تخیل کی قوت سے بے بہرہ تھی۔ بقول لوٹس جائے عقلی کی یکسانیت اور اتحاد جس کے بغیر ہم اپنی ذہنی اور معنوی کیفیتون سے واقف نہین ہو سکتے اور نہ شعور ذاتی ذات کے مشاہدہ کا حصہ بن سکتی ہے ہمین مجبور کرتا ہے کہ ایک مافوق الحواس ہستی کے وجود پر ایمان لائین جو شہودات کا موضوع فطری بنتا ہے۔

قصہ کوتاہ عالم نہ صرف قائم ہے بلکہ قائم رکھا اور سنبھالا جاتا ہے۔ اس کے اجزا کے بے حد پیچیدہ اور الجھے ہوئے تعلقات ایک دوسرے سے اس طور پر متعلق ہین کہ نظام عالم مستقل اور غیر مبدل صورت مین قایم چلا آتا ہے۔ موجودات عالم توازن و مساوات آخری کی طرف مائل رہتی ہین۔ اب اگر کوئی قوت اولی اسکی ترمیم و ہدایت نہ کرے تو چارون طرف حرکت کی جگہ سکون نظر آئے اور یہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

مل اور دیگر حکما کہتے ہین کہ علل فاعلی کا پورا علم ہماری عقلی طاقتون کی بساط سے باہر ہے۔ انکی ماہیت کا صحیح اندازہ ہم اپنے موجودہ علم سے نہین کر سکتے بلکہ ہماری عقل کی پرواز طبعی اسباب ہی تک محدود رہتی ہے۔ فاعلیت (EFFICIENCY) سے قطع نظر ہمین بسبب ہی تک محدود رہنا پڑتا ہے۔

ان مسائل پر غور کرنے کے بعد ہمین ایک فاعل حقیقی عالم کے خالق اور موجودات کے مالک کی ہستی کی طرف رجوع ہو کر پروفیسر آل مین کے ساتھ ہمنوا ہونا پڑتا ہے کہ "تخیل اور مادہ کی مظاہر فطری کے درمیان نہ صرف کوئی مشابہت ہی نہین ہے بلکہ دونون کے درمیان کسی قسم کی بھی نسبت اور مشابہت نہین پائی جاتی"

(۳) حسن نظام عالم

یہ مضمون بڑا ادق اور طویل ہے۔ ہمنے گو پچھلی دو دلیلون پر بہت اختصار سے بحث کی تاہم بہت سی جگہ پر ہو گئی۔ اس لئے اب ہم اور بھی اختصار سے کام لینے کی کوشش کرین گے۔

موجودات قدرت پر نظر غائر ڈالنے کے بعد جو امر ہمارے ذہن پر گہرا اثر ڈالتا ہے وہ نظام عالم کی ترتیب اور قرینہ ہے۔ اصطلاح مین یہ دلیل (COSMOLOGICAL ARGUMENT) کہلاتی ہے۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو تو ہر جگہ شان اور قاعدہ دکھلائی دیتا ہے۔ اگر نیچے زمین کے تختے پر نظر دوڑاؤ تو بھی حسن و خوبی ہر جگہ عیان ہے کہ دل اسے دیکھ کر عش عش کرتا ہے۔ پھر دنیا کی چیزون کو لو۔ ایک ایک شیے کی ساخت پر غور کرو کیسی باقاعدہ اور مزین ہے۔ پھر تغیرات کو

کو دیکھو۔ سب اشیا ان کے تابع ہین اور نیک فرمانبردار لڑکون کی طرح ان نامعلوم غیر مرئی اصولون کے مطابق عمل کرتی ہین۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی دیکھنے مین آتی ہے کہ موجودات مین باہمدگر تنازع اور جھگڑا نہین پایا جاتا۔ قانون اولے سے اتر کر درجہ دوم کے قوانین ہین جو ہر جگہ اپنے کام مین مصروف رہتے ہین۔

جو اتحاد و موافقت عالم مادیات مین پائی جاتی ہے اس کے مترادف علت غائی (ADOPTATION) عالم حیات مین نظر آتی ہے عالم نباتات اور اقلیم حیوانات دونون اس سے بہرہ یاب ہین۔ اس سے یہ مفہوم ہے کہ عضو ایک خاص کام انجام دینے کو بنایا گیا ہے۔ کسی جانور کے جسم کو لو، یا اور کسی پودہ کی ترکیب پر غور کرو اس سے یہ صاف عیان ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص غرض کے لئے بنا ہے۔ اسکی تشریح کی چندان ضرورت نہین۔

مگر جب عالم مرئیات مین ترتیب، قانون، موافقت، ترقی، مقصد آخری اور علت غائی پاتے ہین تو فوراً اس سوال سے دوچار ہوتے ہین کہ کیا یہ سب آپ سے آپ معرض ہستی مین آئے؟ کیا ان کا محرک اصلی کوئی نہین ہے؟ بنئے کی دوکان پر ہر چیز قرینہ اور ترتیب سے موجود رہتی ہے۔ مگر بندر کے گھر مین یہ ترتیب اور سلیقہ عنقا ہے جس سے یہ ثابت ہے کہ ترتیب عقل کا خاصۂ فطری ہے۔ عقل شخصیت پر دال ہے۔ اور شخصیت کے لئے ارادت لازمی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام عالم ایک ذی عقل صاحب ارادت وجود مطلق کی ہستی کی طرف اشارہ کرتا ہے جسنے ایسے طور پر قاعدے وضع کئے کہ موجودات انکے مطابق اپنی حیات مستعار کے ایام مقررہ بسر کرتی ہین۔

(۴) علت غائی اور تجویز

چوتھی دلیل علت غائی اور تجویز سے ہے جسے اصطلاح مین TELEOLOGICAL ARGUMENT کہتے ہین۔ ڈاکٹر پیلے اسے ڈیزائن (DESIGN) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ عالم اسباب کی تمام موجودات اور قدرت کے تمام ظہورات وغیرہ بلا وجہ واقع نہین ہوتے۔ انکا ایک خاص مقصد ہے اور اسے پورا کرنے کو وہ معرض ہستی مین آتے ہین۔ یہ علت غائی تمام عالم مین پائی جاتی ہے۔ کوئی حادثہ بلا وجہ نہین ہوتا۔ اسکی تہ مین ایک غایت پنہان ہے جو ذرہ ذرہ مین پائی جاتی ہے اور اس سے خدا کی ہستی کا ثبوت ملتا ہے۔ فرض کرو ایک سیاح ہمالیہ کے جنگلون مین ہفتون تک کسی آدم زاد یا انسانی بستی سے دوچار نہوا اور پھر یکایک کسی پہاڑی کے دامن مین اسے کوئی غار یا چٹان مین کاٹا ہوا مکان نظر آئے اور وہ اسے اندر باہر سے خوب دیکھے تو فوراً اسے گمان گذریگا کہ یہ انسان کی صنعت ہے۔ اگر آگ وغیرہ اور گھر کا مختصر سامان بھی ہو تو اسے وہان پر انسان کی ہستی کا فوراً یقین ہو جائے گا وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ انسان کی حکمت اور قدرت کے تمام نشانات وہان پر موجود ہین۔ پھر وہ کیون اس کے وجود سے منکر ہو سکتا ہے۔ یا اگر کسی تباہ جہاز کے پسماندہ تختے پر بہتے بہتے کسی ویران اور غیر آباد جزیرہ مین جا نکلین اور وہان پر انسانی بستی کا کھوج لگاتے ہوئے وہ کسی مکان کو دیکھین تو فوراً کہین گے یہ انسان کی کاریگری ہے۔ اسی طرح عالم موجودات کی ساخت اور ماہیت پر نگاہ ڈالنے سے وہ اس کے بنانے والے صاحب قدرت و حکمت خالق کا ثبوت ملتا ہے۔ تقریباً ایک صدی ہوئی کہ ڈاکٹر ولیم پیلے نے انسان اور حیوان کے اعضا کی ساخت اور ترکیب بغور دیکھکر یہ استدلال قایم کیا تھا کہ یہ اپنی ساخت مین کامل اور اپنے مقررہ فرایض کی انجام دہی مین وفادار اور ایک خاص اعلےٰ مقصد سے بنے ہین۔ یہ محض اتفاق سے نہین بلکہ انسان اور حیوان کے پیدا کرنے والے کی علت غائی ہے۔ قدرت کے اندر وسائل اور مقاصد

ہین جو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہین اور یہ سب خدا کی ہستی پر شاہد ہین۔

(۵) شعور اخلاقی

پہلی چار ون دلیلون کا تعلق عالم اسباب سے ہے اسکی حالت اور ماہیت پر غور کرکے یہ نتائج اخذ کئے جاتے ہین اور وہ سب خدا کی ہستی پر دال ہین۔ اب انسان کی حالت ملاحظہ ہو یہ دلیل MORAL ARGUMENT کہلاتی ہے۔ ہماری اخلاقی فطرت خدا کی ہستی پر گواہی دیتی ہے ہم جب کوئی کام کرتے ہین تو ان ایک قسم کی کشاکش ہونے لگتی ہے ہم اپنے جنون کے افعال کی کبھی تعریف کرتے ہین، اور کبھی انھین قابل الزام ٹھراتے ہین۔ یہ نیک و بد کی تمیز، نور ایمان، ضمیر ہے، جو ہمارے فعل کے حسن و خوبی قباحت و مذمت کی نسبت فیصلہ صادر کرتا ہے۔ علاوہ ازین ایک فطری احساس اسبات کا ہے کہ نیک اور مستحسن کام کرنا ہی انسانی فرض اولے ہے نیکی و بدی کا ایک معیار ہے، جسے مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ بلکہ قدرۃً ہم اپنے اعمال کا اس سے اندازہ کرتے ہین۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حاسۂ اخلاقی کہان سے پیدا ہوا؟ اس کے ساتھ مجھ پر حق اعلیٰ کا سوال وابستہ ہے۔ مجھے اسکی فرمانبرداری کرنا واجب ہے جو راستی و نیکی کا مصدر ہے۔ میری اخلاقی فطرت بھی اپنے اصلی مبدا ار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سلسلہ لازم و ملزوم سے نیکی کا احساس ہمین ایک منبع ابدی سے منسوب کرنا پڑتا ہے

(۶) حاسۂ روحانی و ذکاوت طبعی

سب سے اخیر مین سب سے زبردست دلیل دی جاتی ہے جو وہبی یا ذکاوت طبعی یا حاسۂ روحانی کے نام سے مشہور ہے۔ ذکاوت فطری یا وہبی وہ خداداد قوت ہے، جس کے بغیر ہم کسی شے کی حقیقت کو نہین پہچان سکتے جب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا کی ہستی کا علم ہماری فطرت مین ودیعت ہوا ہے تو اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ اکتسابی علم نہین جو مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ فطرۃً ہماری روحانی فطرت مین موجود و مرکوز ہے۔ ہم بلا استدلال اس سے آگاہ ہین۔ کئی عالم اس باطنی شہادت کو کافی سے زیادہ قاطع و ساطع سمجھتے ہین۔ باقی دلائل اس کے سامنے ہیچ ہین۔ ہر انسان کا دل خدا کی ہستی کا قائل اور اسکی موجودگی پر شہادت دیتا ہے اگر یہ باطنی گواہی نہو تو باقی تمام استدلال اور فلسفہ محض بیکار ہے۔ اس خداداد اعلے طاقت کے بغیر ہمارا اکتسابی علم بھی فضول ہے۔ ہمین اسکی معقولیت اور صحت کا یقین بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ طاقت ذکاوت طبعی یا ہدایت کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ قوت ہر قسم کے علم کی صحت اور ثبوت کی اصل اور بنیاد و مانی جاتی ہے۔ اس کے بغیر عقلی اور اخلاقی زندگی محال ہے۔ اس قوت کی شہادت یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ ہر انسان کے دل مین جبلی و فطری ہے۔ دل مین اس کا احساس ہے

آیندہ ہم ہندو مسلمانون کا طریقۂ استدلال دربارہ اثبات واجب الوجود پیش کرین گے اور پھر جدید سائنس کی روشنی مین خدا کی ہستی پر بحث کرکے بہت سی غلط فہمیون کو دور کرین گے، جو نادانون کے دلون مین پیدا ہو رہی ہین کہ سائنس دان خدا کے منکر ہین۔

جے۔ آر راے (اجرلسٹ۔ لاہور)

العصر

سائنس

سائنس سے کیا فائدہ! یہ امر مسلّم ہے کہ ہمارا دینی اور دنیوی فائدہ تین قسم کی ترقیون پر منحصر ہے - دماغی، اخلاقی، اور جسمانی یہ دونون ایک دوسرے کے ساتھ کسی حد تک لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہین - اگر کسی نے دماغی کو لیا اور جسمانی حفاظت کو چھوڑ دیا، یا جسمانی کو لیا اور اخلاقی کی زیادہ پروا نہ کی تو اسکی زندگی کا مقصد اصلی کبھی پورا نہین ہو سکتا؛ اور بحیثیت ایک اشرف المخلوقات ہونے کے اپنے فرایض کو اُسنے ادھورا اور ناکمل چھوڑ دیا - تاریخ اور سوانحات ہمین بتاتے ہین کہ جتنی پاکیزہ اور بابرکت روحین یا جتنے جلیل القدر اور عالی ہمت لوگ گزرے ہین، جن کے وجود نے اور جن کے کارنامون نے مخلوق عالم کو فائدہ پہنچایا ہے انہین یہ تینون صفات ایک حد تک قدرتی طور سے موجود تھے اور ان کی ترقی اور حصول پر انہون نے اپنے تمام کامون کا انحصار سمجھا ہے اور ایک حد تک یعنی جہانتک ان کے ذرایع، گرد و پیش کے اسباب، اور اتفاقات نے اجازت دی ہے، وہ پورے طور سے بہرہ مند ہوئے ہین اور اسی لئے اپنی کوششون مین بھی کامیاب رہے ہین -

اب ہم ترقی کے ان تینون ذرائع کو یکے بعد دیگرے لیکر بتائین گے کہ سائنس کی تعلیم ہمین انکے اکتساب مین کہان تک مدد دے سکتی ہے -

دماغی ترقی دماغی ترقی کے لئے واقفیت مفید کا اچھی طرح ذخیرہ ہو تاکہ بلند پروازی، خوش نظری، باریک بینی، اور شستگی ہمارے خیالات مین پیدا ہو؛ اور غور و فکر مین ایسی جلا ہو جائے کہ درست طریقون سے سوچنے سمجھنے اور اُن سے صحیح نتائج نکالنے کا مادّہ ہم مین پیدا ہو جائے، اور قوت تمیزہ اور قوت فیصلہ مین کسی قسم کی کمزوری باقی نہ رہے - سچی تعلیم سے یہی مقاصد مقصود ہین اور اگر یہ نہین حاصل ہوے تو وہ تعلیم بالکل فضول اور ناکارہ سمجھی جائے گی - لٹریچر، تواریخ، ریاضی، اور فلسفہ وغیرہ کی طرف ہم اسی لئے متوجہ ہوتے ہین کہ ہمین ان دماغی ترقیون کے حصول مین مدد دین -

پروفیسر ہکسلے اور دیگر عالمان سائنس کو یقین کلّی ہے کہ یہ سب باتین محض سائنس ہی کی تعلیم سے ہمین حاصل ہو سکتی ہین، اور اگر ہم سوائے سائنس کے اور کسی مذکورۂ بالا علم کی طرف توجہ بھی نہ کرین تب بھی ہم اُن کل صفات سے بہرہ مند ہو سکتے ہین؛ بلکہ سائنس علاوہ ان کے اور ایسے صفات کا

پیدا کرنے والا ہے جو سوائے اُس کے اور کسی علم سے حاصل نہین ہو سکتے۔

لٹریچر اور سائنس کا مقابلہ لٹریچر سے میرا مطلب شاعری ہے اور وہ حصۂ نثر کا ہے جو ناول، ڈراما، قصہ کہانی وغیرہ کے پیرائے مین ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جس طرح تہذیب و تمدن بڑھتا جاتا ہے، یعنی جسقدر زیادہ سائنس اور سائنٹفک خیالات کی حکمرانی دنیا پر ہوتی جاتی ہے اُسی طرح شاعری مین کمزوری اور تنزل ہوتا جاتا ہے۔ یہی حالت آجکل ممالک یورپ کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تخیلات اور توہمات کسی طرح عقل و بینش پر غلبہ نہین پا سکتے، اور اگر بقاے انسب کا مسئلہ اس کارگاہ عالم مین ٹھیک ہے جیسا کہ وہ برابر ٹھیک چلا آرہا ہے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک نہ ایک دن یہ قانون قدرت سائنس اور شاعری پر صادق نہ آتا۔ اس لئے ہم اندیشہ کرتے ہین کہ تنازع البقا سے مغلوب ہو کر ایک نہ ایک دن وہ بالکل ہی نیست و نابود نہ ہو جائے۔

اس مین شک نہین کہ شاعری نے نازک خیالیون اور بلند پروازیون مین بہت وسعت پیدا کر دی ہے، اور اس مین بھی شک نہین کہ لبا اوقات اس نے قومی جوش اور ہمدردیون کو ہیجان مین لا کر چند کارنمایان بھی کئے ہین۔ لیکن یہ سب فروعی باتین تھین۔ حقیقت مین اسکی ترقی تمدن اور تہذیب کا کبھی باعث نہین ہوئی ہے اور نہ اسنے صداقت اور اصلیت کو اپنا شعار گردانا ہے۔ اور یہی حال ڈرامے اور بقیہ تمام لٹریچر کا بھی ہے یہ اپنے دلکش حالات و واقعات سے ہمارے تجربے اور زندگی کے معلومات مین گو ایک گونہ زیادتی کرین، اور ہمارے تخیل کو بھی بہت خوشی اور مسرت بخشین لیکن لبا اوقات توہمات اور بطالت کے دریا مین ہمین لیجا کر ڈال دیتے ہین اور بہت سی بے اصل باتون پر خیالات قایم کر کے باطل پرست اور فضول پسند بنا دیتے ہین اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دماغ اُس راہ راست سے دور بھٹک جاتے ہین جس پر سچائی اور اسباب و علل کے راہنما کھڑے ہین اور تماشا گاہِ قدرت کے فلسفے سے بے خبر اور جاہل رہ کر ہم سے اصلیت اور حقیقت کی جستجو اور اسکی پسند کا مادہ بالکل سلب ہو جاتا ہے۔

سائنس کا مقابلہ لٹریچر سے صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک ہمارے تخیل کو خوش کر کے اسکو عارضی تندرستی بخشتا ہے اور دوسرا وہ ہے جسکی تندرستی دائمی ہے اور اس کا علم ضروری اور ناگزیر ہے۔ میرا مطلب اس سے یہ نہین کہ لٹریچر کو سائنس کے مقابلہ مین آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہئے میرے نزدیک ضروری اور غیر ضروری کا فرق مدنظر رہنا چاہئے اور سائنس کی دوسرے علوم کے مقابلہ مین وہ حیثیت ہونا چاہئے جو ہمارے لباس کی ضروریات یعنی کرتے اور پاپجامے کو اسکی غیر ضروری چیزون یعنی عبا اور قبا سے ہے جو صرف زیب و زینت اور خوشی کے لئے ہین اور زاید از ضرورت ہین۔ اُس شخص کو آپ کیا کہئے گا جو پاپجامے اور کرتے کو فضول سمجھکر صرف زرین عبا و قبا سے ملبوس ہو جائے؟

تاریخ اور سائنس کا مقابلہ ہماری واقفیت اور معلومات دو قسم کی ہونی چاہئے اوّل اُن اشیاء کا علم جنکو ہم روز دیکھتے، چھوتے، اور سونگھتے، اور اُن سے لطف اُٹھاتے ہین؛ ان کی تعریف کرتے ہین؛ اُن کے اثر سے اثر پذیر ہوتے ہین، اور بالکل انھین مین اپنے کو گھرا ہوا پاتے ہین، یہ کل ہماری زندگی کے ساتھی ہین اور اس کا ایک جزوِ خاص بن گئی ہین۔ ہماری ہستی کے لئے انکا ہونا ایک امر ناگزیر ہے اور ہماری ذات کو بلا انکی مدد اور واقفیت کے کسی صورت سے مفر نہین ہو سکتا۔ اب دوسری قسم مین وہ باتین ہین، وہ لوگ ہین، وہ واقعات ہین، جو زمانہ ماضیہ مین گذر چکے ہین۔ انکا نتیجہ ہمارا موجودہ تمدن اور طرز معاشرت ہے۔ اور وہ تمام قوانین و آئین ہین جن پر آجکل سوسائٹیون کا دار و مدار ہے۔ اس حد تک ضرور وہ ہمارے لئے کارآمد ہین لیکن ان واقعات کے تفصیلی حالات جو تواریخ اور سوانح کے نام سے عام طور سے یاد کئے جاتے ہین کسی طرح ہمارے لئے ایسے مفید نہین ہو سکتے جیسا قسم اوّل کی اشیاء کا علم ہو سکتا ہے اور نہ ہم اس طرح سے براہ راست اثر پذیر ہو سکتے ہین۔

ہمارا فرض اوّل یہ ہے کہ پہلے اپنی ذات سے متعلقہ باتون کا علم حاصل کرین اور بعد ازان دوسرے درجہ پر سوانح اور تواریخ کو دیکھین تو زیادہ حرج نہین۔ اس لئے یہان بھی سائنس اور تواریخ کا مقابلہ کرتے ہوے بلحاظ ضرورت اوّل و دوم کا حکم دونون پر عاید ہوتا ہے۔

سائنس اور فلسفہ ان دونون مین بہت ہی کم فرق ہے۔ لفظ فلسفہ کے جو معنی عام طور سے سمجھے جاتے ہین اُنسے عموماً کتابی فلسفے کے اصول و فروع مراد لئے جاتے ہین۔ سائنس بھی تمام فلسفہ ہے۔ وہ فلسفۂ قدرت ہے، وہ کارگاہ ہستی کی ایک جیتی جاگتی فلاسفی ہے، کیونکہ وہ صرف لکھے ہوئے کتابی اصولون ہی کے بحث و مباحثات سے تعلق نہین رکھتا اور نہ محض مسائل کے قیاسات اور خیالات کی وسعت پر اکتفا کرتا ہے۔ بلکہ ان سب کے ساتھ مشاہدے، تجربے، عمل، اور یقین کی مضبوط رسیون سے اپنے علم کو استوار کرتا ہے۔ اور اُسکی روشنی مین سچائی اور صداقت کو ڈھونڈھ کر نکالنا چاہتا ہے۔

اخلاقی ترقی اس مین شک نہین کہ مذہبی اثر اخلاقی درستی کے لئے ایک جزو اعظم ہے! تعجب ہے کہ بعض لوگ سائنس کو مذہب کا دشمن سمجھتے ہین اور ہیئت دان یا طبعیات وغیرہ کے جاننے والون کا شمار بدعقیدہ لوگون اور مرتدون مین کیا جاتا ہے۔ اس خیال کی بنیاد بالکل بے دلیل ہے اور اُس کے پیرو محض اپنی تنگ خیالی اور ذاتی تعصبات کو راہ دے کر ایسے گمان قائم کر لیتے ہین۔ وہ کہتے ہین کہ سائنس دان "آزاد خیال" ہین اور قدرت کی ہر بات مین دلیل اور وجہ نکالنا چاہتے ہین۔ اور اپنی عقل کو بڑا رہنما سمجھتے ہین تاکہ خدا کی کائنات کو سمجھ جائین۔ حالانکہ اُسنے اسے اپنے بندون پر راز سربستہ کر کے اتارا ہے اور اس لئے اسکے کامون مین اپنی عقل کو دخل دینا کفر سے بھی بدتر ہے۔ مین اس "آزاد خیالی" کے الزام کو قبول کرتا ہون اور مانتا ہون کہ بے شک سائنس دان اس حد تک ضرور آزاد خیال ہین کہ وہ کارگاہ ہستی کے کسی کرشمے کو فوق العادات یا راز سربستہ نہین سمجھتے۔ ان کا اس مسئلے پر بالکل اعتقاد نہین کہ خدا کی کائنات سمجھنے ہی کے قابل نہین ہے۔ بلکہ جو کچھ معلوم نہین ہو سکا ہے اسکو وہ اپنی کم مایگی پر محمول کر کے پورا بھروسہ رکھتے ہین کہ علوم مین جس طرح ترقی ہوتی جائے گی اور جس طرح ذرائع وسیع ہوتے جائین گے اسی طرح وہ باتین بھی جو ابھی بالکل راز بستہ ہین کھلتی اور سلجھتی جائین گی۔ وہ اس امر سے بالکل انکار کرتے ہین کہ خدا کی مخلوق سمجھنے کے قابل نہین ہے۔ بلکہ اس خیال ہی کو وہ بنی آدم کے لئے قابل ملامت اور لایق مذمت سمجھتے ہین کیونکہ قادر مطلق نے جتنی چیزین ہمارے گرد و پیش بنائی ہین اُن مین اُسکی قدرت کے صدہا کرشمے جلوہ گر ہین۔ اسی لئے اُسنے عقل دی تاکہ اُنکے سمجھنے کی کوشش کرے۔ آنکھین اور کان دیکھنے اور سننے کے لئے عطا فرمائے۔ اب اگر اپنی تنگ خیالی کو راہ دے کر ہم اسکی گوناگون صناعیون کی طرف سے آنکھین پھیر لین اور اس کے چمنستانِ قدرت کے صدہا راگون کے سننے سے کان بند کر لین اور عقل کو معذور جانکر اُنکے سمجھنے بوجھنے کی کوشش نہ کرین تو فی الواقع یہ ایسا کفران نعمت ہے جسکی مثال ملنا مشکل ہے۔ فرض کرو کہ ایک بے مثل صناع نے ایک نہایت ہی لاجواب عمارت بنا کر کھڑی کر دی ہے اور دیکھنے والا صرف باہر سے اُسکا نظارہ کر رہا ہے مگر اُسکی اندرونی خوبیون سے بالکل بے خبر ہے۔ نہین جانتا کہ کیا کیا عجائب و غرایب صفتین اس کے اندر مخفی ہین اور کیا کیا دل آویز خوبیان اس مین موجود ہین۔ پھر بھلا وہ اپنے اِس سرسری مشاہدے سے اِس عالی قدر صناع کی دستکاریون کی کیا قدر کر سکے گا اور اس کے بے مثل تماشاگاہ قدرت کی کیا داد دے سکے گا؟ مگر سائنس دان اسکو اپنا فرض سمجھکر ان باتون کو پورے طور سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکی آنکھون کے سامنے ہر شجر، حجر، پھول، پتے، ذرے ذرے مین، اور کیڑے مکوڑون تک مین خدا کی حکمتون کے دفتر کے دفتر لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہین سعدی صاحب فرما گئے ہین ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار   ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اُن سے نیچر کی تمام چیزین باقاعدہ، با اصول، اور باترتیب معلوم ہوتی ہین۔ وہ خدا کی چھوٹی سی چھوٹی مخلوق مین بھی وہی تناسب، وہی ترتیب اور وہی تسلسل پاکر حیران رہ جاتا ہے اور قوانین قدرت کے بے شمار مصالح مین ایسی تکمیل اور موزونیت پاتا ہے کہ خدا کی عظمت اور قدرت کا نقش کبھی اُس کے دل سے دور نہین ہوسکتا۔ مذہب بھی ہمین راستی سکھاتا ہے اور سائنس بھی ہمین صداقت اور سچائی کی راہ کی طرف لے جاتا ہے۔ پروفیسر ہکسلے کا قول ہے کہ

علم کیمسٹری کا یہ بڑا قانون ہے کہ جب چند اجزا ایک دوسرے پر عمل کرکے نئے مرکبات ظہور مین لاتے ہین تو اُنکی ترتیب مین نہ کوئی ذرہ ضائع ہوتا ہے نہ زائد ہوتا ہے بلکہ ہمارے گردوپیش زمین پر جسقدر کیمیائی انقلابات ہورہے ہین ان مین وہی اجزا صدہا مختلف صورتین قبول کررہے ہین مگر کبھی کسی حالت مین ایک ایٹم بھی کسی کا ضائع نہین ہونے پاتا اور نہ بڑھنے پاتا ہے۔ ایک تناور درخت جو سوکھ کر گر پڑا ہے اور بادی النظر مین بالکل برباد ہوگیا ہے، کبھی برباد نہین ہوا بلکہ اس کے مرکبات اپنی ابتدائی اور اجزائی حالت مین آگئے ہین اور زمین مین ایک ایک ایٹم انکا محفوظ ہے۔ جب چھوٹا سا پودا اُگے گا تو زمین اُسکی پرورش کے لئے انھین اجزا کے مرکبات کو پھر واپس کردے گی۔ علیٰ ہذا جسم انسانی کا بھی مرنے کے بعد کبھی کوئی جزو یعنی ایٹم برباد نہین جاتا بلکہ وہ ہوا مین یا زمین مین محفوظ رہتا ہے اور نئے نئے مرکبات ظہور مین لاتا ہے جو بہت ممکن ہے کہ پھر دوبارہ کسی دوسرے جسم انسانی کی پرورش کا باعث ہوکر اس کے جزو ہوجائین۔

خدا کی حکمت کاملہ کا یہ قانون قدرت ایسا بڑا ثبوت ہے اور اسکا اثر دلون پر اس قدر گہرا پڑتا ہے کہ واعظون کے وعظ کی کوئی حقیقت نہین۔ غرضکہ اسی طرح ہم جتنی چیزون پر نظر ڈالتے ہین وہ سبھی اُنکی قدرت کا زبانِ حال سے وعظ کہتی ہوئی معلوم ہوتی اور گویا زبان حال سے یہ کہتی ہین :-

اپنے قادر مطلق کی بے شمار حکمتون کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو ہم سے آکر سبق حاصل کرو۔ موجودات کے ہر جزو اور حصے مین ترتیب و اصول کو دیکھو اور ان کی حقیقت کے اسباب و علل کو دریافت کرتے جاؤ کیونکہ جتنا تم اس کے رازہائے سربستہ کو وا کرتے جاؤ گے اُتنا ہی تمھین اس کی بے شمار حکمتون سے خبر ہوتی جائے گی۔ اور یہی اُسکی عبادت کا خاص منشا اور مقصد ہے۔

سائنس کی تعلیم انسان کی اخلاقی درستی کے لئے بھی نہایت موزون ہے۔ وہ اسکو صداقت شعار، راستی پرست، اور پاکباز بنادیتی ہے۔ لارڈ روزبری نے اپنے ایک مضمون مین لکھا ہے کہ ہماری قوم کی اخلاقی اصلاح کے لئے بہت بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے دلون مین سائنس کی تعلیم کا ایک شوق پیدا کیا جائے؛ کیونکہ اکثر لوگ جنھین مین دیکھتا ہون کہ بے کاری کے اوقات مے خانون، کلبون یا تھیٹرون مین گزارتے ہین اور ہزارون گناہون کے مرتکب ہوتے ہین، اگر موجودات نیچر کی دلفریبیون سے آگاہ ہوتے تو اپنے مشاغل کو ایسا گندہ اور فضول نہ بناتے، اور اوقات کی ایسی بے قدری نہ کرتے۔ بلکہ بے کاری کے وقت اُنکے خالی دماغون کو متوجہ کرلینے کے لئے جس طرف نظر اٹھاکر دیکھتے کوئی نہ کوئی شے موجود ہوتی۔ یا تو انکے اوقات کسی باغ کے خاموش گوشے مین کٹتے جہان کسی چشمے کے کنارے شیشہ اور چاقو ہاتھ مین لئے ہوئے بڑے شوق سے وہ کسی پھول یا پودے کے نادر نمونے کو ڈھونڈھتے پھرتے اور کسی پتّی یا پھل کے عجیب وغریب ساخت پر گھنٹون بیٹھے ہوئے غور کیا کرتے؛ یا کسی سبزہ زار میدان مین سایہ دار درخت کے نیچے لیٹے ہوئے اپنے سائنٹفک خیالات کے مزے لیتے ہوتے؛ ہر نئے پھول کو انکی متجسس آنکھین بڑے شوق سے دیکھتین

اور اپنے مشاہدات سے وہ نئی نئی باتین اخذ کرتے، اسطرح کہ یہ نباتات کے کس خاندان کا ہے؟ یہ کس فائدے کا ہے؟ اسکا کیا نام ہے؟ اس کے مختلف حصّون کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے؟ غرض اس قسم کے سینکڑون سوال صرف ایک پھول پیدا کرتا۔ یا اگر کسی پتھر کا کوئی عجیب ٹکڑا ہاتھ آگیا ہے تو اُسی جگہ بیٹھ گئے ہین اور سوچ رہے کہ یہ کس معدن سے نکلا ہوگا؟ اس کے اجزا کیا ہونگے؟ اسکی ظاہری علامات زمین کی کن حالتون پر دلالت کرتی ہین؟ یا اگر حیوانات سے شوق ہے تو وہ چھوٹے چھوٹے کیڑون کو اپنی خردبین کے ذریعے سے دیکھ رہا ہے۔ ان کے اعضا کے افعال کے سمجھنے مین سرگردان ہے، اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس مین دل و دماغ، ہاضمہ دوران خون سانس وغیرہ کے افعال کیونکر جاری ہین؟ اور انکا حیوانات کے کس خاندان یا کس قوم سے سلسلہ ملتا ہے؟ یا اگر کوئی ہڈی یا کھوپڑی پڑی ہوئی ملگئی ہے تو اُسپر غور کر رہا ہے کہ یہ کس جانور کی ہوگی؟ وہ جانور حیوانات کے کس گروہ سے ہوگا؟ چرند، پرند، چوپایہ، انسان، یا کیا ہوگا؟ یا چھوٹی چھوٹی چیونٹیون اور شہد کی مکھیون کو جمع کرکے پرورش کر رہا ہے اور انکی حیرت انگیز عادات و خواص کو دن رات نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھکر نئی نئی باتین نکال رہا ہے۔ یا اپنی لیبوریٹری (کیمسٹری کے عملی امتحانات کرنے کی جگہ) مین بیٹھا ہوا مرکبات اور مفردات کی تحقیقات مین مشغول ہے۔ یا گرم موسم کی تبدیلی ہوئی ہے تو وہ اپنا تھرمامیٹر اور بیرامیٹر لئے ہوئے اس کے اسباب و علتون کے سمجھنے مین محو ہے اور اگر کوئی فوق العادت انقلاب واقع ہوا ہے تو جب تک وہ اسکی سمجھ مین نہ آجائے گا اُسے ایک سخت بے چینی دامنگیر رہیگی۔ رصدگاہ پر بیٹھا ہوا، وہ سائنس کا فدائی، اجرام فلکی کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ رات رات بھر اُسے دوربین آنکھون سے لگائے گذر جاتا ہے۔ وہ اپنے عیش و آرام سبکو بالائے طاق رکھدیتا ہے۔ افلاک کے عجائبات پر غور کرتے اُسے مہینے اور سال گذر جاتے ہین۔ اور جب کوئی تحقیقات کرلیتا ہے، تو پھر اسکی مسرتون کا ٹھکانا نہین جسطرح بچے خوش ہوتے ہین، وہ اپنی فتحمندی پر پھولا نہین سماتا۔ اسکو کہتے ہین سچی بہادری، ایثار نفس، اور سچا استقلال۔ اسی کا نام ہے سچی خوشی اور اصلی عظمت و عزت۔ اگر وہ کسی غیر ملک مین جا کر اُترا ہے تو اسکی دلچسپیان بے شمار ہونگی۔ اس جگہ کے ہر نئے پودے، ہر نئے جانور اور وہان کی مٹی تک اسکی دلفریبی کے سامان پیدا کردے گی۔ وہ انکے حالات جمع کرکے علوم کے خزانہ مین زیادتی کرے گا اور وہان کے جمادات، حیوانات، اور نباتات کے علم سے اپنے ملک کو صدہا فائدے پہنچائیگا۔

سائنس کے سوا اور کسی دوسرے علم سے ہمین ایسی سچی اور دائمی خوشی کی امید نہ رکھنا چاہئے۔ اس کے مقابلے مین ہمین کوئی دوسرا علم ایسی وطن دوستی، استقلال، بے غرضی، اور بے تعصبی کا سبق نہین پڑھا سکتا۔

سائنس دان ایک سچا ہیرو ہے جسکی تمام عمر نیک مشاغل مین بسر ہوگئی ہے۔ اپنے ابنائے جنس کی بے غرضانہ خدمت کے لئے اُسنے اپنی مدت العمر وقف کردی ہے اور زندگی کا یہ منشا کہ "اطلبوا العلم من المهد الی اللحد" (یعنی بچپن سے مرتے دم تک حصول علم مین رہو) ایک بڑے فائدہ بخش اثر کے ساتھ پورا ہوا ہے۔

جسمانی ترقی ہماری صحت جسمانی کا دارومدار دو خاص باتون پر موقوف ہے، اوّل ہماری اخلاقی درستی پر؛ دوم قوانین صحت کی واقفیت اور انکی پابندی پر۔ ان دونون کا عمل بے کم وکاست ہر وقت اور ہر زمانے مین ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ حالت صحت مین اگر ان قوانین صحت پر ہمین وقوف نہین بھی ہے تب بھی ایک قدرتی خیال انکی پابندی کی طرف لگا رہتا ہے۔ مگر جہان انسان اپنی نادانی کی وجہ سے اُنسے بے خبر ہوکر ذرا بھی متجاوز ہوجاتا ہے تو بس طرح طرح کی صعوبتون مین اپنے کو مبتلا پاتا ہے۔

اسی بہت سی مثالین ملین گی کہ ذرا سی اخلاقی لغزش نے کل زندگی بیکار کردی اور ایسے مہلک امراض نے گھیر لیا جن سے چھٹکارا پانا دشوار ہوگیا اسی طرح قوانین صحت کے نہ جاننے سے جو خلاف ورزیان ہوتی رہتی ہین انکی ہمیشہ یقینی سزائین ملتی رہتی ہین اور کتنے ایسے لوگ ہین جو حفظ صحت سے ناواقفیت کی وجہ سے قبل از وقت لقمۂ اجل ہوگئے ہین۔ اگر وہ اپنے اعضا کے افعال وخواص اور مختلف اشیا اور عادات کی مضرت رسان تاثیرون سے واقف ہوتے تو یقیناً ان کی زندگی زیادہ آرام، زیادہ چین، اور زیادہ خوشی کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ سائنس کی وہ شاخ جو اعضا کے افعال و خواص، بیماریون کی شناخت اور حفظان صحت کے طریقون کا ذکر کرتی ہے، اسکا علم کم وبیش ہر شخص پر فرض ہے جس طرح مغربی تہذیب وتمدن بڑھتا جاتا ہے اسیطرح لوگون کو اپنے حالات سے زیادہ خبر ہوتی جاتی ہے اور وہ صحت جسمانی کے اصولون کو سمجھتے اور عمل کرتے جاتے ہین اسلئے ان کی دماغی حالتون، خانگی اور ملکی مسرتون مین نمایان ترقی ہوتی جاتی ہے۔ صدہا بیماریان اور عوارض اب یورپ سے ناپید ہوگئے اور لوگون کی جانین اور انکی زندگی کو زیادہ قایم رکھنے کی ہزارون تدبیرین عمل مین لائی جاتی ہین جن کے نتایج بخوبی اپنا عمدہ اثر پیدا کرتے ہین۔ یہ تمام باتین سائنس کی بدولت ہین اور اسی کے بابرکت نتایج ہین۔
سائنس کی تعلیم پر تمام موجودہ تہذیب وتمدن کا دارومدار ہے کیونکہ تجارت، صنعت وحرفت، دولت، فارغ البالی، فلاح اور قومی عروج سب اسکی ذات سے وابستہ ہین۔ مین اسکو بالتفصیل بیان کرنا چاہتا ہون۔

علم کیمسٹری صنعت وحرفت مین بلا اس کے جانے ہوئے عمدہ ترقی نہین ہوسکتی ایک مشہور شخص کا قول ہے کہ ملکون کی دولت کا اندازہ صرف یہی دیکھکر ہوسکتا ہے کہ ان مین گندھک کا تیزاب کس قدر بنتا ہے اور اس کا کس قدر خرچ ہے کیونکہ قریب قریب ہر صنعت وحرفت مین اسکی ضرورت ہے۔

علم طبیعیات ریلوے، تار، کلین، انجن، چکیان، جہاز وغیرہ سب اسی کے اصولون پر چل رہے ہین۔ ظاہر ہے کہ جو قوم اس سے بے بہرہ ہوگی وہ کس قدر پست حالت مین ہوگی کیونکہ بلا انکی مدد کے نہ دولت مین، نہ تجارت مین، نہ خوشحالی مین، کوئی ترقی ہوسکتی ہے۔

علم نباتات زراعت اور باغبانی کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے۔ مزید بران ادویات کی شناخت اور انکی تجارت سے منفعت حاصل کرنے کے لئے اس کا علم ضروری ہے۔

علم الارض معدنیات وجمادات مختلف پتھرون کی شناخت، مختلف معدنون کا پتہ لگانا، ہیرے اور دیگر جواہرات کے معدن کی جستجو کرنا اور سب سے زیادہ کوئلے، لوہے، چاندی، اور دیگر معدنیات سے فائدہ اٹھانا اور اپنے ملک سے انکو ڈھونڈھ نکالنا، یہ تمام باتین ملکی دولتمندی اور خوشحالی کو بہت بڑھانے والی اور اس کی ترقیون کے لئے جزو اعظم ہین۔ اسی طرح تمام سائنس کی ہر ایک شاخ کے صدہا ملکی اور ذاتی فوائد بیان ہوسکتے ہین جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسکے علم حاصل کرنے کو اب ایک امر ناگزیر سمجھنا چاہئے کیونکہ اسی پر کل تمدن اور انسانی بہبودی کا دارومدار ہے۔

سائنس کو کس طرح سیکھنا چاہئے ہندوستان مین سائنس کی بے قدری اور اس کے حصول کے ذرائع نہایت محدود اور ناکافی ہونے پر جب ہم خیال کرتے ہین تو سخت مایوسی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی جب ہندوستانیون کی بدشوقی پر خیال کیا جاتا ہے اور انکو دوسری قومون کے مقابلے مین نہایت ہی پست حالت مین پاتے ہین تو ہماری مایوسی پر رنج وافسوس کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ اہل ہند کو تعلیم سائنس کی اشد ضرورت ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ اس کے ذریعے سے اپنی قومی تہذیب اور فلاح مین ترقی کرین گے بلکہ اسلئے

بھی کہ وہ بلا اُن علوم مغربی کے سیکھنے کے اپنے دماغون سے کسی طرح اُس کثافت کو دور نہین کر سکتے جسمین چند گزشتہ صدیون نے تعصب، توہمات اور باطل پرستیون کا خمیر ملا دیا ہے۔ انکے دلون مین قوانین قدرت کے مظاہر سے، ان کے اسباب وعلل سے، اور ہر ایسے صحیح غور سے جسمین عقلی دلائل کا تسلسل ہو، ایسی بد اعتقادی اور اجنبیت ظاہر ہوتی ہے کہ ایک زمانہ چاہیے جب جاکر کوئی سخت اصلاح انکے دلون مین علوم کے انس پیدا کرنے کے قابل ہو سکے گی۔ مین دیکھتا ہون کہ کتنی ایسی جدت پسند طبیعتین اور اعلیٰ قابلیتین فضول اور غیر ضروری مشاغل سے شوق کر کے اپنے جوہر ذاتی کو ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہین جس سے انکی ذات سے کوئی مفید نتیجہ نہین حاصل ہوتا۔ کتنے ایسے لوگ ہونگے جن کے دماغ نہایت سائنٹفک واقع ہوئے تھے لیکن اپنی اس خداداد قابلیت کو کبھی انھون نے سیدھے راستے پر نہین لگایا اس لئے اُنکے شوق مردہ پڑ گئے اور اگر کچھ شمہ باقی بھی رہا تو اسکو طرزِ تعلیم کے غیر موزون اور نامناسب ہونے نے بالکل ہی مٹا دیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم کو ان تمام خرابیون کا ملزم گرداننا چاہیے۔ یورپ و امریکا مین علوم وفنون کی اس لئے روز افزون ترقی ہے کہ وہان سائنس کی تعلیم ایک نہایت ضروری مضمون سمجھکر نصاب مین داخل کی گئی ہے اور قومی وملکی ہمدردی ہمیشہ اسکی ترقیون کی حامی ومددگار رہتی ہین۔ مگر ہندوستان کی حالت بالکل ہی جدا ہے۔ یہان کے کل کالجون مین نہ تو کافی سرمایہ ہے کہ یورپ سے لایق پروفیسر بلا سکین اور پورے طور سے اس کے لوازمات بہم کر سکین اور نہ یہان ملکی اور قومی ہمدردی ہے کہ سائنس کی تعلیم عام کرنے کی کوشش کیجائے اور اسکے بڑھانے اور سکھانے مین آسانیان پیدا کی جائین۔ سائنس کی تعلیم بلا مشاہدے اور تجربے کے کسی طرح نہین ہو سکتی۔ کتابی باتین جب تک عملی طور پر نہ دیکھی جائین گی تب تک نہ وہ باتین ذہن مین قائم رہین گی، نہ اُن سے کوئی دلچسپی پیدا ہوگی۔ اصولی اور تجربی حالات کی عمل اور بدیہات سے تشفی ہونی چاہیے ورنہ سائنس کی تعلیم سے نصف بھی فائدہ نہین حاصل ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک مین ایسے کالج کسقدر کم ہین اور جو ہین انکی کم مائگی قابل اعتراض ہے۔

سائنس کی تعلیم کب حاصل کرنا چاہیے

سب سے عمدہ زمانہ آغاز عمر ہے کہ بچپن ہی سے دماغ اُنکی پرورش پر لگائے جائین اور ہم اپنے بچون کو سائنس کی آسان آسان باتین اس دلچسپی کے ساتھ بتائین کہ کبھی وہ ان کے دل سے محو نہ ہون اور انکا شوق بڑھتا رہے۔ اس کے لئے یا تو اسکول چاہئین یا مائین تعلیم یافتہ ہون۔ لیکن ابھی ان دونون باتون کی عملی حیثیت سے کوئی قوی امید نہین ہو سکتی۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم اسکو کسی آیندہ زمانے کے لئے چھوڑ دین۔ موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانون کو تعلیم سائنس کی ضرورت بالکل مد نظر رکھنا چاہیے اور زمانہ کی روش کو دیکھکر کہ ہر طرف سائنس کی پکار ہے، اپنے اوقات عزیز کو بھی سائنس کے مقابلے مین دیگر علوم کی تحصیل مین رائگان نہ کرنا چاہیے۔ مگر جو حضرات اب زندگی کے جھگڑون مین ایسے پھنس گئے ہین کہ باضابطہ علم حاصل نہین کر سکتے اُنکے لئے مین آخر مین صرف اسیقدر عرض کرنا مناسب سمجھتا ہون کہ اگر وہ خاص طور پر اسے حاصل کرنے سے معذور ہین تو اپنے اوقات غیر ضروری مین ہر قسم کی کتب مبنی بر نیچر کی واقفیت کو ترجیح وفوقیت دین۔

لطافت حسین خان

العصر

انتہائے سائنس

گذشتہ صدی عیسوی کی ابتدا سے سائنس نے اس قدر حیرت انگیز ترقی کی ہو اور حقائق قدرت اِس برق رفتاری سے سائنس کی جادو نما تحقیق کے سامنے حضرت انسان کو منکشف ہو رہے ہین کہ بادی النظر مین خیال پیدا ہوتا ہو کہ سائنس اپنے معراج کمال کی انتہائی منازل کو عنقریب پہنچ جائیگی۔ ہمارا مقصد اس مضمون کی اشاعت سے اِس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہو۔ سائنس نے فی الواقع انسانی علم کو بے انتہا وسعت دی ہو لیکن بعض مسائل ابھی تک بالکل سائنس کی دسترس سے باہر ہین اور جب تک سائنس اِن مسائل کو طے نکرلے ہم ہرگز سائنس کو مکمل مجموعۂ معلومات کہنے کے مستحق نہین ہین۔ جو لوگ جانتے ہین کہ سائنس نے کن کن مسائل پر روشنی ڈالی ہو انکو خوب معلوم ہو کہ ابھی بہت سے مسائل سائنس کے حدود مین بھی نہین آئے۔ آپ ترکیب مادہ ہی کو بغور سوچئے۔ بہتماً کتب یوروپی زبانون مین اِس بحث پر شائع ہو چکی ہین لیکن سب کا ماحصل یہ ہو کہ مادہ کے متعلق کسی اصلی بات کا پتہ نہین لگایا جا سکتا۔ مادہ کی ترکیب صرف ادھورے طور پر بیان کی جا سکتی ہو۔ چونکہ اِس مضمون پر حال ہی مین جدید انکشافات نے بہت سی نئی روشنی ڈالی ہے ہم چاہتے ہین کہ ناظرین کو اس اجمال کی تفصیل سے آگاہ کردین۔

قاعدہ کی بات ہو کہ انسان ان باتونکے متعلق جو اسکے روزمرہ کے مشاہدہ مین آتی ہین اور جن سے اکثر اُسے واسطہ پڑتا ہو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تحقیق اور تفتیش کرتا ہو۔ مختلف اشیا کو اپنے گرد و پیش دیکھکر شروع ہی شروع مین انسان کو جستجو پیدا ہوئی کہ مادہ کی خواصیات عامہ کی کسی معقول پیرایہ مین تشریح ہو سکے۔ سب سے اول یہ خیال پیدا ہوا کہ مادی اشیا نہایت ہی چھوٹے ذرات سے مرکب ہین اِس خیال کا موجد دیما قطرِس تھا جو آج سے ڈھائی ہزار برس قبل انہی سخت ذرات کی توصیف بیان کرچکا ہو۔ اِس کا خیال تھا کہ یہ ذرے اور چھوٹے ذرات مین منقسم نہین ہو سکتے اِس لئے ذرات دیما قطریسیہ کو بعد ازان اجزائے لا یتجزی کہا گیا۔ نمک پانی مین ڈالئے دونو اشیا مل کر ایک جسم ہو جاتے ہین اور حجم مین بالکل

اضافہ نہین ہوتا سخت سے سخت جسم مین بھی نوکدار میخ ٹھونکی جاسکتی ہے اِس قسم کے مختلف مشاہدات اور تجارب سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہو کہ ذرات کے درمیان خالی جگہین بھی ہوتی ہین - فلارنس کے فلسفیون نے زمانہ قدیم مین اِس امر کے متعلق اپنا اطمینان اسطرح کیا تھا کہ اُنھون نے سونے کا ایک مجوف کرہ بنایا اور اس مین پانی بند کرکے کرہ کی حجامت کو نہایت زبردست دباؤ سے کم کرنا چاہا - فی الاصل ان فلسفیون کا منشا اِس بات کی تحقیق کرنا تھا کہ پانی دباؤ سے حجم مین کم ہوسکتا ہو یا نہین؛ لیکن تجربہ کا طریقہ غلط ہونے کی وجہ سے انھین یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ سونا جس کو سب اشیاء سے زیادہ ٹھوس اور سخت سمجھا جاتا تھا وہ بھی مسامدار ہو - لیکن اِس کے ذرات کے درمیان خالی جگھین ہین - گیسون کی حالت مین یہ تجربہ نہایت آسان ہو - اگر ایک بند منھ والے بہت بڑے برتن مین جس مین سے آلۂ مخراج الھوا سے ہوا خارج کر دیگئی ہو کوئی گیس مثلاً ہائیڈروجن یا کلورین تھوڑی سی مقدار مین بھی داخل کر دی جائے تو وہ قلیل مقدار گیس کی برتن کے سب حصون مین یکسان پھیل جاتی ہو - اگر اجسام ذرات سے مرکب ہین اور انکے ذرات کے درمیان کوئی خالی جگھ نہین تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہو کہ قلیل مقدار گیس ایک بہت بڑی جگھ مین پھیل جاے -

حاصل کلام - دیما قطریس سے لیکر انیسوین صدی عیسوی تک یہ مسئلہ سالمات یعنی ایٹامک تھیوری سائنس مین ایک مسلمہ تھیوری تھی - بیسوین صدی کے شروع مین ریڈیم کی دریافت کے بعد اور برقی رو (Electric Current) کے خواص کے مطالعہ سے جبکہ برقی رو انانیب[1] خلائی مین گذاری جاتی ہو بہت سی ایسی باتین ثابت ہوئین جنکی تسلی وہ تشریح مسئلہ سالمات کی بنا پر کرنی ناممکن تھی - اب سائنس دان اِس امر پر مجبور ہین کہ ذرات کو غیر منقسم نہ مانین بلکہ تازہ ترین قیاس جو کہ نظریہ برقیہ (Electron Theory) کی شکل مین ظاہر ہوا ہو یہ ہو کہ مادی ذرات (Atoms) برق سالبہ یعنی Negative Electricity کے نہایت ہی چھوٹے اور ننھے ننھے ذرات سے مرکب ہین - اگر مین آپ کو بتاؤن کہ ایک پانی کے قطرے مین اربہا مادی ذرات ہوتے ہین اور ایک مادی ذرہ بھی ہزارہا برقی ذرات سے مرکب ہوتا ہو اور پھر آپ کو یہ بھی بتاؤن کہ موجودہ سائنس نے اس قدر حیرت انگیز ترقی کی ہو کہ ہر ایک برقی ذرہ اور مادی ذرہ کا حجم اور وزن ہم کو معلوم ہو تو آپ ضرور شروع مین میری بات کا یقین نہ کرینگے لیکن اگر مین آپ کو ایک مثال سے ان ذرات کا صحیح اندازہ کرا دون تو شاید آپ کا تعجب اور بھی زیادہ ہوجائیگا - لارڈ کیلون ایک نہایت قابل اور زبردست سائنس دان ہو گزرا ہو - اُسنے ایک دفعہ تقریر کرتے ہوے سامعین کو مادی ذرات کا حجم اور وزن سمجھانے کیلئے یہ مثال دی تھی - فرض کرو کہ پانی کا ایک قطرہ زمین کے برابر بڑا کیا جاتا ہو[2] - اور اس قطرہ کے ذرات اِس تناسب سے حجم مین بڑھتے ہین، تو اس زمین کے برابر بڑے قطرے پانی مین ذرات یعنی مالیکیول Molecules ٹینس بال کے برابر دکھائی دینگے -

یہان یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ اگر سائنس نے یہان تک ترقی کی ہو کہ مادے کے چھوٹے سے چھوٹے ذرات تک کی ترکیب کا مطالعہ صحیح طور پر کرلیا ہو تو پھر مادہ فی الاصل کن اشیاء کا مرکب ہو، مانا کہ مادی ذرات برقی ذرات (Electrons) کا مجموعہ ہین لیکن یہ نہین معلوم کہ برقی ذرات یا وہ نامعلوم الہیئت طاقت جسے ہم لوگ عرف عام مین بجلی کے نام سے تعبیر کرتے ہین کیا ہو - بعض سائنس دان اس سے بھی آگے ایک قدم بڑھتے ہین - ان کا دعوی ہو کہ بجلی اس ایتھر سے پیدا ہوئی ہو جو فضائے بسیط مین پھیلا ہوا ہو - یہ تشریح اصلی مسئلہ پر بہت کم روشنی

---

[1] Vacuum Tubes جن کو بعض اوقات Giesslar's Tubes بھی کہا جاتا ہو -

[2] یاد رہے کہ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہوتا ہو اور پانی کے قطرہ کا قطر زیادہ سے زیادہ انچ کا بارھوان حصہ ہوسکتا ہو -

ڈال سکتی ہو اسواسطے کہ خود ایتھر کے متعلق ہماری معلومات نفی کے برابر ہین۔ نہ ہم اسے تول سکتے ہین نہ چھو سکتے ہین، نہ سونگھ سکتے ہین کسی حس سے اسکا پتہ نہین لگا سکتے اور نہ ہی کوئی اور سیدھا ذریعہ اس کے خواص کو مطالعہ کرنے کا ہمین معلوم ہو۔ ہم چونکہ یہ بات مانتے ہین کہ نور (Light) ایک طرح کا تموج ہو اور تموج کے لیے ضرور کوئی ایسی چیز ہونی چاہیئے جس مین تموّج پیدا ہوسکے۔ اس لیے اس شرط کو مان کر ہمنے نوری تموج کے میڈیم کو ایتھر کے نام سے ملقب کیا ہو۔ اب صرف یہ کہنے سے کہ بجلی ایتھر مین ایک طرح کی مڑوڑ (Strain) پیدا ہونے سے حاصل ہوتی ہو بجلی یا مادہ کے متعلق ہماری معلومات مین ایک ماشہ بھر بھی اضافہ نہین ہوا۔ ہان ایک لمحہ کے لیے اگر یہ بھی مانا جائے کہ بجلی ایتھر پر مخصوص طریقون سے عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہو تو بھی سوال یہ باقی رہتا ہو کہ ایتھر کیا ہو؟ کیسے حاصل ہوتا ہو؟ اور کس چیز سے بنا ہو؟

اس لمبی بحث سے ہمین چند ایک مفید مطلب نتائج حاصل ہوتے ہین۔ سائنس دان کا کام صرف یہ ہو کہ اشیاء اور حوادثات کو ایک خاص حد تک لفظون مین بیان کرے۔ وہ ہرگز اصلی اور حقیقی اسباب کی تحقیق نہین کرسکتا۔ اس کا دریافت کردہ سلسلہ علت معلول کبھی ختم نہین ہو سکتا پس ہماری رسائی صرف ثانوی اسباب یعنی Secondary Causes تک ہوسکتی ہو اصلی اسباب Primary Causes ہماری عقل وفہم سے بالاتر ہین۔ ہم چیزون کے متعلق کیون کا جواب دینے کی طاقت نہین رکھتے۔ ہم یہ نہین بتا سکتے کہ مادہ مین یہ خواص کیون ہین؟ ہم صرف اتنا بتا سکتے ہین کہ یہ خواص اس طرح پر ہین زیادہ سے زیادہ ہم ایک نظریہ (Theory) قائم کرتے ہین اور کہتے ہین کہ چونکہ یہ خواص اس نظریہ کی رُو سے صحیح طور پر سمجھ مین آسکتے ہین اس لیے یہ نظریہ صحیح ہو۔ باوجود اپنی تمام کوششون کے سائنس دان نہین جانتے کہ مادہ کا ایک ذرہ کس طرح بنا ہو؟ اور یہ مشکل ایسی ہو کہ باوجود اتنی ترقی کے سائنس دان اعتراف کرتے ہین کہ سردست یہ خیال بھی ان کے دماغ مین نہین آسکتا کہ مادہ کا ایک ذرہ کیسے بنا ہو چہ جائیکہ یہ دعویٰ ہو کہ ہم مادہ کا ذرہ بنا سکین۔ جب یہ حالت ہو تو آفرینش عالم کے متعلق ہزار قیاس دوڑائے جائین سب کے سب محدود وغیر مکتفی ثابت ہون گے۔ ڈارون کا مسئلہ ارتقا بتاتا ہو کہ دُنیا کی ترقی کس طرح ہوئی ہو۔ کس طرح چند سادہ قسم کے حیوانات سے ترقی کرتے کرتے موجودہ زمانے کے بیشمار مختلف الانواع چرند پرند وغیرہ مخلوقات پیدا ہوئے ہین۔ لیکن یہ بتانا اصعب ترین اور ناممکن ہو کہ کس طرح سب سے اول "چند سادہ قسم کے حیوانات" پیدا ہوے۔

اس مقام پر پہنچ کر یہ بتا دینا لطف سے خالی نہ ہوگا کہ گذشتہ سال انگلستان کے سائنس دانون مین اس امر کی ہل چل تھی کہ ایک صاحب مسئلہ حیات پر روشنی ڈالنے والے تھے جس طرح ہم نے مادہ کے متعلق بتایا ہو کہ وہ برقی ذرات وغیرہ نامعلوم الہیئت اجزا سے مرکب ہے اسی طرح سائنس نے زندگی کے مسئلہ کے متعلق بھی بہت کچھ اختصار کی کوشش کی ہو۔ مثلاً کتلۃ الاولی (Protoplasm) اور سیلون (Cells) کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہو لیکن ابتک مسئلہ حیات اور روح کے اصلی حل کے متعلق ہنوز روز اول کا معاملہ ہے اور نہ ہی سائنس کو اُمید ہو کہ صدیون کے بعد بھی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کیڑا پیدا کر سکے۔

یہی مسئلہ ارتقا نظام عالم کے مختلف افراد کی خلقت کے متعلق بھی بحث کرتا ہو۔ کہا جاتا ہو کہ اجرام سماوی مثلاً ستارے سیارے آفتاب وغیرہ اجسام شروع مین گیسی (Gaseous) یا ابخرونی کی حالت مین تھے۔ صدیون کے انجماد سے موجودہ حالت پر آئے ہین ہمارے نظام شمسی کے متعلق یہ قیاس ہو کہ تمام سیارے فی الاصل

۱؎ انگریزی اصطلاح مین ایسے جسم کو Medium کہتے ہین اردو مین ہمین کوئی اصطلاح اسکے مترادف نہین ملتی۔

آفتاب کے حصے تھے جو کسی وجہ سے علیحدہ ہو گئے اور جسطرح کہ لوہے کا ایک گرم گیند ہوا مین پڑے رہنے سے ٹھنڈا ہو جاتا ہو اُسی طرح یہ سیال کرے ٹھنڈے ہو کر منجمد ہو گئے ہین۔ لیکن چونکہ آفتاب بہت بڑا ہو اسلیئے ابھی تک اس کی حرارت بغیر کسی قسم کی نمایان تبدیلی کے اسی درجۂ حرارت پر قائم ہو۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ آفتاب مین کونسی ایسی چیز ہو جس کی بدولت یہ آگ سے زیادہ گرم رہتا ہو۔ پیشتر اس کے کہ مین حرارتِ شمسی کے مسئلۂ بقا پر چند خیالات ظاہر کرون مناسب معلوم ہوتا ہو کہ یہان حرارتِ شمسی کے متعلق چند اعداد بتا دون۔

مختلف دلائل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہو کہ آفتاب ٹھوس نہین ہو بلکہ اس کا اندرونی حصہ مائع اور سیال ہو اور بیرونی حصہ پر جلتی ہوئی گیسون اور معدنی انجرون کے بادل ہین جو سورج کے گرد بمنزلہ زمین کے کرۂ ہوائی کے ہین۔ بہت سے تجارب کی بناء پر یہ اندازہ کیا گیا ہو کہ سورج کی گرمی ۶۰۰۰ سنٹی گریڈ درجۂ حرارت کی ہو جس سے مراد یہ ہو کہ اگر برف اور بھاپ کی گرمی کے درمیان ۱۰۰ درجے سنٹی گریڈ کا فرق سمجھا جائے تو آفتاب کی گرمی اتنی تیز ہو کہ اُسے ۶۰۰۰ سے تعبیر کرین گے۔ اگر آپ کو مختلف معدنی اور غیر معدنی اجسام کے پگھلنے اور کھولنے کے درجہ ہائے حرارت کا اندازہ معلوم ہو تو آپ دیکھین گے کہ سورج کی گرمی مین سب ٹھوس جسم مائع اور ہوائی حالت مین ہین۔ سورج کی گرمی کا اندازہ ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہو مختلف آلات کی مدد سے (جن کو مقیاس حرارت الشمس کہتے ہین) اس بات کا اندازہ لگانا کہ ایک مربع فٹ سطح زمین پر فی منٹ کس قدر حرارت پڑتی ہو چندان مشکل نہین ہو۔ لیکن ایک بڑی مشکل یہ ہو کہ ہمارے اور سورج کی گرمی کے درمیان ہوا کی ایک کثیف تہ ہو جو اس گرمی کا بہت بڑا حصہ یا تو جذب کر لیتی ہو یا فضائے بسیط مین منعکس کر دیتی ہو۔ بہر کیف یہ مشکل بھی حل ہو سکتی ہو اور پھر ہم صحیح طور پر اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہین کہ ۹ کروڑ ۲۴ لاکھ میل کی مسافت کے بعد ایک مربع فٹ پر کس قدر گرمی کی بارش ہوتی ہو۔ اب خیال فرمائیے کہ کرۂ زمین کی سطح کے ہر ایک مربع فٹ پر یکسان مقدار مین گرمی کی بارش ہوتی ہو اور پھر خیال فرمائیے کہ سورج زمین کا خاص طور پر لحاظ نہین کرتا کہ زمین کی جانب زیادہ گرمی بھیجے اور باقی اطراف مین کم بلکہ امر واقع یہ ہو کہ گرمی کی بارش سورج کی سطح سے تمام اطراف و جوانب مین یکسان ہو رہی ہو گویا سورج کو مرکز مان کر ایک وسیع دائرہ کے اوپر جسکا نصف قطر ۹ کروڑ ۲۴ لاکھ میل ہو، ہر منٹ مین اسی حساب سے گرمی پڑتی ہو جس حساب سے کہ سطح زمین کے ایک مربع فٹ پر پڑتی ہو۔ اس سے پوری مقدار گرمی کی جو سورج کی سطح سے باہر کی طرف آتی ہو معلوم ہو جاتی ہو۔ اب اگر اس مقدار کو سورج کی سطح سے تقسیم کر دیا جائے تو فی مربع فٹ سورج کی سطح سے جتنی گرمی فی منٹ نکلتی ہو اُس کا اندازہ ہو سکتا ہو۔

صحیح تجربون سے نتیجہ نکالا گیا ہو کہ فی منٹ سطح زمین کے فاصلے پر تین کیلوری[لہ] گرمی پڑتی ہو۔ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہو اس دائرہ کا رقبہ جس پر اسی حساب سے گرمی پڑتی ہو (۲۲/۷ × ۹۲۴۰۰۰۰۰)۲ مربع میل ہو اور سورج کی سطح کا رقبہ (۲۲/۷ × ۴۳۰۰۰۰)۲ مربع میل ہو گویا کہ فی مربع فٹ سورج کی سطح فی منٹ ۳ × (۹۲۴۰۰۰۰۰/۴۳۰۰۰۰)۲ = ۳ × ۴۶۰۰۰ کیلوری نکلتی ہو۔ لارڈ کیلون نے اندازہ کیا ہو کہ اگر سوا مربع گز سطح سورج پر ایک برتن رکھا جائے اور اُس مین پانی کھولنے کے لیے ڈالا جائے تو فی منٹ جس قدر بھاپ اس برتن مین پیدا ہوگی اُس سے ۷۰ ہزار گھوڑون کی طاقت کے برابر کام لیا جا سکتا ہو۔ اب اگر اسی حساب سے تمام سطح

لہ ایک سیر پانی کو ایک درجۂ حرارت گرم کرنے کے لیے جتنی حرارت درکار ہوتی ہو اس مقدار کو کیلوری کہتین۔ انگریزی زبان مین ایک اور کیلوری بھی مروج ہے جسے چھوٹی کیلوری کہتے ہین اور وہ کیلوری کا ہزاروان حصہ ہوتی ہو۔ ایک سیر پانی کو درجۂ حرارت سے بھاپ کے درجۂ حرارت تک گرم کرنے کے لیے سو کیلوری کی ضرورت ہوگی۔

سورج کی گرمی کی طاقت کا اندازہ لگایا جائے تو عقل کو سخت حیرت ہوتی ہے۔ بعض سائنس دانون نے حساب لگایا ہو کہ اگر سورج محض کوئلہ بنا ہوا ہو اور یہ کوئلہ آکسیجن گیس کی مدد سے پورے طور پر جلایا جائے تب بھی جس حساب سے سورج مین سے گرمی خارج ہو رہی ہو اس حساب سے یہ کوئلہ کی آگ بہت تھوڑے عرصے مین جو چند ہزار سالون سے زیادہ نہ ہوگا ختم ہو جائے گی۔ سائنس کے ذریعہ سے ہم کو معلوم ہو کہ سورج کی گرمی اسی طرح لاکھون برس سے اسی حساب سے خارج ہو رہی ہو لہذا یہان وہ نہایت اہم اور مہتم بالشان مسائل حل طلب پیدا ہوتے ہین (۱) سورج کی گرمی کے ذخیرے کی بقا کن وجوہات پر مبنی ہو (۲) فی الاصل شروع مین یہ نہ ختم ہونیوالا گرمی کا ذخیرہ کس طرح پیدا ہوا تھا۔ سائنس کی ترقی ملاحظہ ہو کہ ایسے ادق مسائل کا جواب بہم پہنچاتی ہو، وہ مسائل جو کہ قطعًا انسانی دسترس سے باہر ہین۔ کہان سورج اور کہان چھوٹا سا انسان! لیکن خداداد دماغ کے کارنامے دیکھیے یوروپ والون نے ایک بہت بڑی حد تک ان سوالات کا جواب بھی خاطر خواہ طور پر دیدیا ہو۔ اس تحقیقات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ایک چھوٹے سے مضمون مین ممکن نہین ہو۔ ہم یہان صرف اشارات کے طور پر اس تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہین۔

کسی زمانے مین پہلے یہ نظریہ قائم ہوا تھا کہ بیرونی اجسام کے گرنے سے اور ان کی رگڑ سے سورج کی گرمی بڑھتی رہتی ہو۔ آپ نے دیکھا ہوگا شہاب ثاقب جب زمین کے کرۂ ہوائی مین پہنچتے ہین تو ہوا کی رگڑ سے جل اُٹھتے ہین اور ریزہ ریزہ ہوکر فنا ہو جاتے ہین۔ اگر اسی طرح بیرونی اجسام کافی مقدار مین سورج کی سطح پر گرتے ہون تو سورج کی گرمی کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہو۔ لیکن مشاہدات سے ثابت ہوتا ہو کہ نظام شمسی مین اسقدر وافر مقدار مین ایسے مادی اجسام نہین ہین جو سورج کی گرمی کو اپنے صدمون سے قائم رکھ سکین کیونکہ حرارت شمسی کے سالانہ خرچ پورا کرنے کے لیے اتنے مادی اجسام کافی تیزی کے ساتھ سورج کی طرف گرنے چاہئین کہ ان کی مجموعی مقدار چاند کے برابر ہو جائے۔

اِس کے علاوہ اور بہت سی تشریحات شمسی حرارت کے بقاء کے متعلق پیش کیگئی ہین لیکن وہ سب کی سب فی زمانناً متروک ہین۔ لہذا ہم اِن سے قطع نظر کرکے موجودہ زمانہ کے آخری اور اغلب قیاس کو جسے سب سائنس دان تسلیم کرتے ہین بیان کرتے ہین۔ ایک جرمن سائنس دان ہیلم ہولٹز کے دماغ مین کیا ہی عمدہ خیال آیا۔ زمین کی کشش کی وجہ سے تمام چیزین جو زمین کی سطح پر ہین زمین کے مرکز کی طرف اِس رفتار سے گرتی ہین کہ ہر ثانیہ مین انکی رفتار مین ۳۲ منٹ کا اضافہ ہو جاتا ہو گویا ایک غیر متحرک جسم پہلے ثانیہ مین ۳۲ فٹ گرے گا۔ اسی طرح سورج کی کشش سے تمام جسم سورج کی سطح پر اس سے ۲۷ گنا زیادہ رفتار سے یعنی پہلے ثانیہ مین ۸۶۴ فٹ گرین گے۔ اس مقام پر ایک اور مسئلہ کا مختصر سا ذکر لازم آتا ہو۔ مالیکیولر تھیوری (نظریۂ اتصالی) کے مطابق اجسام کے ذرے ہمیشہ متحرک ہوتے ہین اور ان کی حرکت کا نام حرارت ہو گویا جتنی تیزی کیساتھ جسم کے ذرے ہلتے ہون اسی قدر زیادہ بڑھا ہوا اس جسم کا درجۂ حرارت ہوتا ہو۔ اب خیال فرمائیے۔ گرمی کے اخراج یعنی شمسی حرارت کے سالانہ خرچ سے سورج کے مادہ کے ذرات کم تیزی سے حرکت کرتے ہین لیکن سورج کی کشش کی وجہ سے یہ کمی پوری ہو رہی ہو۔ یہ اجمال بہت لوگون کی سمجھ مین نہین آئیگا۔ اس کی توضیح اسطرح بھی ہو سکتی ہو کہ اگر ایک جسم ایک خاص فاصلے سے نیچے گرے تو اسکے صدمہ سے جو اسکی حرکت کے رکنے سے پیدا ہوتا ہو خاص مقدار گرمی کی پیدا ہوتی ہو۔ سورج چونکہ مائع اور ہوائی گرم اجسام سے بنا ہو، اندازہ لگایا گیا ہو کہ اگر ہر سال ٹھنڈا ہونے سے حجم مین جو کمی واقع ہوتی ہو اس سے سورج کا قطر صرف سوا دو سو فٹ چھوٹا ہو تو جو اجسام بیرونی سطح پر واقع ہین انکے مرکز کی طرف گرنے سے اتنی گرمی پیدا ہو سکتی ہو کہ سالانہ خرچ کو پورا کر سکے۔ یہ سوا دو سو فٹ سالانہ قطر کی کمی اتنی قلیل مقدار ہو کہ

سورج جیسے بڑے جسم مین صدیون کے بعد بھی اس گھٹاؤ کا اثر ہمکو ہماری زبردست سے زبردست دوربینون کے ذریعہ سے بھی معلوم نہین ہوسکتا۔ اس لیے اس قیاس کی براہ راست تصدیق ہونا مشکل ہو لیکن چونکہ جو دلائل اس قیاس کے ثبوت مین پیش کی گئی ہین سب نقص سے مبرا ہین اس لیے کسی اور بہتر قیاس کے ہونے کی حالت مین اسے عام طور پر علمی دُنیا مین صحیح مانا جاتا ہو۔

اب ہمنے یہ تو ثابت کردکھایا ہو کہ سورج کی گرمی باوجود اس قدر اصراف کے بھی کم ہونے سے محفوظ ہو۔ لیکن دوسرا سوال باقی رہجاتا ہو کہ شروع مین یہ گرمی کیسے پیدا ہوئی؟ اسکے متعلق زیادہ رائے زنی ابھی تک نہین ہوئی لیکن قیاس کیا جاتا ہو کہ اگر کُرہ زمین سے نصف قطر کے زمین کے مانند دو ٹھوس کرے ۱۹ کروڑ میل کے فاصلے پر واقع ہون اور بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے وہ ایک دوسرے کے مرکز کیطرف کھنچ آئین تو گو شروع مین ان کی حرکت بہت سست ہوگی لیکن چھ ماہ کے بعد وہ اسقدر زور کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائینگے کہ حرارت جو اس خوفناک صدمہ سے پیدا ہوگی سورج کی حرارت کے برابر ہوگی اور جو جسم صدمہ کے بعد ان دونون کے اجتماع سے پیدا ہوگا وہ حرارت کی شدت سے سورج کے برابر ہوگا اور اس کی گرمی کئی کروڑ سال کے لیے سورج کی طرح کافی ہوگی اسطرح بعض سائنس دانون کا خیال ہو کہ ہمارے سورج کی بھی ابتدا ہوئی ہوگی کیونکہ آئے دن کے مشاہدات ثابت کرتے ہین کہ ستارون کی دُنیا مین نئے نئے سورج پیدا ہو رہے ہین جن کے یک لخت ظہور کی وجہ اسی طرح بیان کی جاسکتی ہو۔

یہ ہین حضرت انسان کے مزاج کی جولانیان لیکن سائنس ترقی کے باوجود یہ نہین بتا سکتی کہ وہ دو کُرّے جن سے سورج پیدا ہوسکتا ہو ان مین کا ایک ذرہ بھی کسطرح پیدا ہوا؟ سائنس روح اور مادہ اور خلق عالم کے متعلق آج اسی طرح عاجز ہو جس طرح صدیون پہلے عاجز تھی۔ کیونکہ جواب سے سائنس آج اتنی ہی دور ہو جتنی ہمیشہ رہی ہو۔ گویا سائنس ان انتہائی مسائل پر کبھی روشنی نہین ڈال سکی اور ہمارا یہ خیال ہو کہ کبھی بھی ان پر روشنی نہین ڈال سکے گی اور اسی طرح ابدالاباد تک غیر مکمل رہیگی۔ البتہ سطحی معلومات بہم پہنچاتی رہیگی۔ ہمارے بعض ناظرین شاید اس مضمون کے مطالعہ سے ہماری ان یاس آمیز توقعات سے اختلاف کرین۔

فیروز الدین مراد

علم النجابت [۱]

چارلس ڈارون نے اپنی عمر بھر کی تحقیقات سے انسان کے جسمانی قوا کے نمو و ارتقا کے تمام قوانین کو واضح کردیا ہو، اور اپنی وسیع اور کہنہ سال تحقیقات کے جملہ نتائج کو دو کتابون مین ظاہر کیا ہو جنمین ایک تو "آغاز الانواع" ہو اور دوسری "انسان کی ابتدا کس طرح ہوئی"

---

[۱] یہ لفظ یوجنکس (Eugenics) کا ترجمہ ہو۔ یوجنکس یونانی زبان کی اصطلاح ہو جو "یوجنے" سے نکلی ہو جس کے معنی "شریف زادہ اور نہایت شائستہ" ہین۔ ڈاکٹر فرانسیس ڈالٹن نے ۱۸۸۳ء مین پہلے پہل اس کو استعمال کیا۔ اس کے ذریعہ سے اُنھون نے علم المعاشرت کے ایک جدید شعبہ کی بنیاد ڈالی، اور اس کو ایک جُداگانہ شعبہ علم سے موسوم کیا۔ اس کا مقصد اُن اسباب و اثرات کی تحقیقات کرنا ہو جن کے طفیل سے بنی آدم کی جبلی خوبیون کی نمو درجۂ کمال تک ہوسکتی ہو۔ یا بالفاظ دیگر یون کہیے کہ نسل انسانی کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی، جسمانی، اور ذہنی تربیت و ترقی اس نوزائیدہ علم کا مقصود اولی ہو۔ اگرچہ علم النجابت کے حامیون مین کلی اتفاق نہین ہو کہ اس کے بنیادی اُصول کیا ہون، مگر عام طور پر قانونِ توارث اور جدی اثرات اسکی اصل ہین۔

جسمین انسان کے پیٹ مین پڑنے اور مضغہ کے پرورش پانے اور پھر عالم موجودات مین ظہور پذیر ہوکر رفتہ رفتہ بڑھنے کا ذکر پایا جاتا ہی۔ اِن دونون کتابون کی اشاعت سے انسان کے علوم کی تاریخ مین ایک جدید دور کا آغاز ہوا اور بالکل نئے خیالات معرض وجود مین آئے۔ ارتقا کے دو مشہور اور معرکۃ الآرا اصولون کی اختراع بھی ڈارون کے نام سے ہمیشہ وابستہ رہیگی۔ ایک مشہور قانون نیچرل سیلکشن یعنی انتخاب طبعی یا فطری تحفظ ملیت کا ہی جسکا مطلب یہ ہی کہ قدرت نے جن جانذارون کو زیست کے واسطے منتخب کیا ہی انھین اُسنے سامان بھی ویسے ہی دیئے ہین اور جنھین وہ زندہ اور قائم نہین رکھنا چاہتی انھین اسنے محروم کردیا ہی اور وہ تھوڑے ہی عرصے مین نابود ہوجاتے ہین۔ مگر وہ کسطرح ہلاک ہوجاتے ہین؟ یہ عمل کیفیات یعنی اردگرد کے حالات اور اسباب کے ذریعے سے ہوتا رہتا ہے، اور یہ قانون نباتات اور جانذارون پر یکسان عائد ہوتا ہی کشاکش لبست یا جہد الحیوٰۃ کی طبعی صلاحیت جن جانذارون مین موجود نہین ہی وہ اسباب کا شکار ہوجاتے ہین دوسرا قاعدہ انتخاب زناشوئی (Sexual Selection) ہی یعنی جاندار اپنے حسب منشا اپنے واسطے نر اور مادہ منتخب کرتے ہین اور اس سے نوع یعنی اولاد کی جسمانی خوبیون مین تغیر اور ترقی ہوتی ہی۔ انھین دونون اُصولون کی بدولت بن مانس اپنی حالت بدلتے بدلتے آخرکار انسان بنگیا، جو اشرف المخلوقات اور خداوندِ خلقت کہلاتا ہی۔

اب سوال یہ ہی کہ کیا اِن ہر دو قدرتی اصولون کے عمل مین رخنہ اندازی کرنا مناسب ہی؟ اسکا جواب بہم پہنچانے سے پیشتر اسلاف کی تاریخ پر غور کرنا واجب معلوم ہوتا ہی۔ اُنھون نے اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا تھا اور اُن کے ہان افراد قوم کی جسمانی اور ذہنی تربیت اور ترقی کے لیے کیا انتظام تھا۔ تاریخ کے ابتدائی زمانہ مین ملک اسپارٹہ نے اپنی تمدنی ترقی اور ملک گیری کے لیے خاص شہرت حاصل کر رکھی تھی۔ اہل اسپارٹہ کا طرز معاشرت اور ملکی انتظام نہایت اعلیٰ سمجھا گیا تھا۔ وہان لائگرگس نامے ایک نہایت مقتدر مقنن اور نہایت مشہور مدبر تھا۔ وہ سیاسیات کا ماہر اور موجد خیال کیا جاتا ہی۔ اس نے تربیت جسمانی کا ایک طریقہ وضع کیا تھا جسکی رُو سے مان باپ اپنے کمزور اور ناتوان بچّون کو جنگلون اور پہاڑون مین پھینکنے پر مجبور تھے تاکہ وہ بھوک پیاس سردی اور گرمی کی شدت سے ہلاک ہوجائین۔ اسکا مقصود یہ تھا کہ قوم کے درمیان دائم المریض اور ناتندرست افراد نہ رہنے پائین جو اسکی قومی ملکی اور عام حالت کے زوال کے موجب ہوسکتے ہین۔ لائگرگس کے قانون کے مطابق پیدا ہوتے ہی بچہ شہریونکی ذیل مین تصور ہوتا تھا۔ سرکار کی طرف سے اسکی نگرانی اور پرورش ہوتی جب جوان ہوجاتا تو اسکی جسمانی قابلیت اور طاقت کا امتحان ہوتا۔ اِس غرض سے اسے ارتمس دیوی کے مندر مین لیجاتے اور کوڑے مار مار کر اسکی پیٹھ ادھیڑ دیتے۔ بہتیرے مرجاتے مگر اُف تک نہ کرتے اور اس آزمائش مین پورے اُترنے والے "مشاہیر کے زمرہ" مین شامل ہوجاتے۔ اسکی روزانہ زندگی سخت قواعد کے تابع رہتی اور جب پورا جوان ہوجاتا اور شادی کرلیتا تو اسے خاص قانون کی پابندی کرنی پڑتی۔ لائگرگس نے سب سے زیادہ زور تربیت جسمانی پر دیا تھا اور اسکا انجام یہ ہوا کہ وہان نہایت قوی ہیکل اور توانا آدمیون کی قوم پیدا ہوگئی۔ مگر انکی عقلی اور اخلاقی تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا جسکی وجہ سے وہ نرے جفاکش دلاور سپاہی رہے اور ملک گیری مین نام پیدا کیا مگر اپنے ہمسائے یونانیون کیطرح علوم و فنون اور تمدنی لوازم کی ترقیون مین غیر فانی شہرت حاصل نہین کی اور نہ اپنا اثر اپنے اردگرد کی قومون پر ڈالا۔ مگر جب ازرق سیس (Xerxes) نے یونان پر بیشمار فوج کے ساتھ حملہ کیا تو لیونیداس شاہ اسپارٹہ نے درہ طرامپلی مین صرف تین سو سپاہیون کے ساتھ اس بیقیاس لشکر کا مقابلہ کیا اور اسے ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیا۔ ہان جب ایک بے ایمان غدار ملک کی غداری سے ایرانی لشکر دوسرے رستے سے گزرا اور اس جوان

مرد شہی بھر دستہ کے عقب پر جا پڑا تو ملک یونان کے ایک حصتہ پر اُسکا تسلط ہو گیا۔

طب کے وسیلے سے بنی آدم کو بیحد فائدہ پہنچا ہی۔ سیکڑون امراض کی اصلیت ظاہر ہو چکی ہی اور انکے مختلف علاج بھی معلوم ہو گئے ہین۔ اسکے وسیلے سے انسان کو بہت آرام و آسائش پہنچ رہی ہی مگر یوجنکس یعنی علم النجابت کے وسیلے سے اس سے بھی زیادہ فیض پہنچنے والا ہی جن بیماریون سے بنی آدم کو تکلیف پہنچتی ہی اسکے ذریعے سے انکا استیصال ہو جائیگا۔ اہل سپارٹہ نے تربیت جسمانی کے وسیلہ سے اس گتھی کو سلجھایا تھا۔ مگر اس کا ایک بڑا نقص یہ تھا کہ اسکے رُو سے جن کمزور بچون کو جنگل مین پھینکدیا جاتا تھا انمین کئی ایسے بھی ضرور ہونگے جو اگر زندہ رہتے تو انکی غیر معمولی لیاقت اور دانائی نہ صرف اپنی قوم ہی کے لیے مفید ہوتی، بلکہ بنی آدم بھی مستقل فائدہ حاصل کرتے کیونکہ غیر معمولی ذہانت والے ہمیشہ توانا اور قوی ہیکل آدمی نہین ہوتے۔

اب علم النجابت کے مسائل کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔ کس وسیلے سے انسان کی عقلی اور جسمانی قوتون مین ترقی ہو سکتی ہی؟ مرد و عورت کے تعلقات کیسے ہونے چاہئین؟ کیا مختلف نسلون کے مرد و عورت کی شادی اس مقصد مین معاون ثابت ہو سکتی ہی؟ تمدنی معاملات مین حکومت کو کس حد تک دست انداز ہونا چاہیئے؟ اور اس مقصود کی کامیابی کا معیار کیا ہی جس سے معلوم ہو کہ اس وسیلے سے ایک جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا ہی؟ ان سوالات پر یکے بعد دیگرے بحث کی جائے گی۔

شادی شادی کا دستور نہایت پُرانا اور واجب الاحترام ہی۔ اسے کچھ ایسے ادب کی نظر سے دیکھا جاتا ہی کہ بڑے سے بڑا رند بھی اسے ناپاک کرنے کی جرأت نہین کر سکتا۔ گھر کے اندر جو راحت و آرام انسان کو حاصل ہوتا ہی اسے وہ روے زمین پر کسی دوسری جگہ یا کسی دوسری حالت مین ہرگز حاصل نہین ہو سکتا۔ گھر اسکے خیالات کا مرجع اور اُسکے جذبات کا مرکز ہی۔ دُنیا کے دکھون اور تکلیفون سے بچنے کی پناہ یہی گھر ہی۔ یہان اسے کیسے کیسے تجربے حاصل ہوتے ہین جن سے وہ کسی، اور جگہہ دوچار نہین ہوتا ہی۔ ہر زمانے کے شاعر اور فلاسفر گھر کی خوشیون کا چرچا کرتے رہے ہین۔ جا بجا میان بیوی اور ماں باپ اور اولاد کے نازک اور خوشگوار تعلقات کی تعریف کیگئی ہی، اور یہ مضمون ہمیشہ تازہ اور پُر لطف رہتا ہی، مگر زمانۂ حال کے تمدن کی ضروریات اور نمود و نمائش کی وجہ سے رہنے سہنے کے اخراجات کچھ ایسے بڑھ گئے ہین کہ شادی صرف امیرون کیلئے مخصوص ہو رہی ہی۔ معمولی لوگون مین یہ مقدرت کہان کہ وہ اس سے حظ اور خوشی حاصل کرین اور آرام و آسائش کی زندگی گزارین۔ نر و مادہ کے درمیان جو کشش باہمی موجود ہی وہ قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہی، اور یہی کشش نسل بڑھانے اور قائم رکھنے کی موجب ہوتی ہی۔ اگر یہ نہو تو تمام جاندار حیوان اور انسان نابود ہو جائین۔ زناشوئی کے جذبات قدرت کے عطیہ ہین جنھین اگر ناجائز طریقے سے پورا کیا جائے تو انسان کو اسکا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہی اور قدرت کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہی۔

نہایت ابتدائی زمانے مین جب بنی آدم تمدن کے نہایت ابتدائی مراحل مین تھے تو عورت کو زبردستی پکڑ کر بیوی بنا لیا جاتا تھا۔ یہ کام صرف شہزور اور بہادر آدمی انجام دے سکتا تھا اور وہی اس سے مستفید ہوتا تھا۔ مگر جب اسنے شائستگی مین ترقی کر لی، تو اسکے خیالات مین تبدیلی واقع ہوئی۔ تمدنی طریق مین بھی نمایان انقلاب ہوا۔ عورت کو پکڑنے کے بجائے انتخاب اور باہمی رضامندی سے باقاعدہ بیاہ ہونے لگا اور یہ ایک دستور قرار پا گیا۔ ماں باپ کو اپنے لڑکے لڑکیون کے بیاہنے کا خاص اختیار مل گیا۔ اور انکی رضامندی اس معاملے مین ضروری قرار پائی۔ پروہت نے اپنی پروہتی کا اسمین بھی دخل دیا اور اسے ایک مقدس رسم مین منتقل کر دیا۔ اسنے یہان تک اقتدار حاصل کر لیا کہ جسمین وہ شریک نہوتا وہ کام واجب اور درست نہ سمجھا جاتا۔ مسلمانون اور مسیحیون مین قانون کے وسیلے سے شادی فسخ ہو سکتی ہی

درمیان بیوی کے تعلقات منقطع ہو سکتے ہین مگر ہندوؤن مین یہ نہین ہی۔ لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ شادی کو اُسکی مذہبی اہمیت سے خارج کرنے اور اسے بالکل ایک معاہدہ بنانے کا خیال پیدا ہو گیا ہی۔ لیکن وہ زمانہ دور ہی جب مرد و عورت تھوڑے عرصے کیلئے ایک دوسرے سے تعلق پیدا کیا کرینگے۔ لیکن جب کبھی ایسا دستور رائج ہوگا اسوقت نظام تمدن مین عظیم تغیر واقع ہوگا۔ اسکی موجودہ صورت بالکل قائم نہ رہیگی۔ یہ گھر گھر نہ رہیگا بلکہ ایک قسم کا کلب ہوگا۔ تعلقات زناشوئی بالکل کمزور ہو نگے۔ مان باپ اور اولاد کے تعلق ہی برائے نام ہونگے۔ مرد کے بجائے عورت کا درجہ ترقی پکڑیگا۔ جسطرح اَب عورت مرد سے ڈرتی رہتی ہی اُسوقت مرد خوف کھایا کریگا۔ عورت کا جب جی چاہیگا کسی اور مرد سے تعلق پیدا کریگی اور مرد کو دوسری جگہ جانا پڑیگا۔ زندگی کا کاروبار مرد کریگا۔ عورت گھر کی ملکہ ہوگی اور وہ جیسا چاہیگی حکومت کرے گی۔ جو عورتین مان بننے کے ناقابل ہونگی وہ اپنی اور مرد کی خوشنودی طبع کے واسطے زندگی بسر کرینگی۔ افلاس عورتون کو اُس رشتے سے باز نہ رکھے گا۔ ویلز کہتا ہی "بچے جننا حکومت کی خدمت کرنا" اور زندہ رہنے کا جائز استحقاق ثابت کرنا ہی۔ جو عورت مان ہی یا جو مان بننے والی ہی، وہ مشاہرہ، عزت، آزادی، اور پرورش کی ویسی ہی مستحق ہی جیسا پولیس کا کانسٹبل"۔ مگر یہ ایسا خیال ہی جو صدیون کے بعد پورا ہوگا۔

مختلف نسل کے لوگون کا ناطہ رشتہ۔ کیا دو مختلف نسلون کے مرد و عورت کی شادی مصلحت آمیز ہی؟ اسکی بابت عالمون کے خیالات مختلف ہین۔ ایک جاپانی مدبر نے چند برس ہوئے ہربرٹ اسپنسر سے یہ مشورہ طلب کیا تھا کہ ہم جاپانیون کی نسل بڑھانے کے لیے یورپین قومون سے شادیان کرنیکے خواہشمند ہین۔ آپ کی کیا رائے ہی؟ اسپنسر نے اس تجویز سے اختلاف کیا تھا۔ یوروپ والے غیر نسلون سے شادیان کرنے کو تیار نہین ہین اور اسکی وجہ محض قومی گھمنڈ ہی۔ وہ خود کو دوسرون سے برتر سمجھتے ہین اور اسلئے انسے شادی کرنے کے خلاف ہین۔ آریہ قوم مین بھی یہ گھمنڈ تھا۔ جب وہ وسط ایشیا سے نقل مکان کر کے جنوبی ملکون کو آئے اصل باشندون سے انہین نفرت تھی اور آج کے دن تک یہی بات پائی جاتی ہی۔ مگر تاریخ سے یہ ظاہر نہین ہوتا کہ دو مختلف نسل کے مرد و عورت کی شادی سے بُرے نتائج نکلتے ہین۔ انگریز تمدنی ترقیون مین سب قومون سے بڑھے ہوے ہین حالانکہ وہ کئی مختلف نسلون کا مجموعہ ہین صدیون کے اختلاط سے یہ قوم وجود مین آئی ہی لیکن نتائج خلاف توقع نہین نکلے۔ اونچی ذاتون کے ہندوستانیون اور انگریزون کی رشتہ داریون سے کوئی برا نتیجہ برآمد نہین ہوا ہی۔ مہذب آدمیون کو خواہ وہ کسی ملک اور نسل کے ہون ایک نمونہ اور ایک ڈھنگ کا ہونا چاہیے۔ مناسب نہین ہی کہ آرین، منگولین، ٹیوٹانی، اور سمیا قیطی نسلین ایک دوسرے سے جُدا جُدا رہین مگر بعض قومین اپنے کو دوسرون سے افضل تر اور انکی حکمران سمجھتی ہین اسلئے وہ سب سے الگ رہنا پسند کرتی ہین لیکن جب ملک گیری کا خیال بالکل کمزور ہو جائیگا اور لشکر کشیان بند تو البتہ شاہ پرستی اور حکومت کے گھمنڈ کا خیال بھی مٹ جائیگا۔ اسوقت ایسے لوگون کی ایک عظیم قوم ہوگی جو معمولی نسلی تعلقات سے پاک اور نہایت شاندار ہوگی۔ وہ گھمنڈ اور غرور سے بیگانہ ہوگی۔ خون کے رشتہ کی اتنی قدردان نہین ہوگی جتنی فوائد کے اشتراک کی۔ ویلز مشہور ناول نویس اِس حالت کو کمالی تمدنی حالت قرار دیتا ہی۔

قرابت کی شادیان اگر اولاد مین کوئی خاص قسم کی خصوصیات پیدا کرنا چاہو، تو بہت قریبی رشتہ کے لڑکے لڑکی کی شادی کرنا چاہیئے لیکن اگر اس اُصول کے عملدرآمد مین حد اعتدال سے تجاوز کیا جائے تو نسل بگڑ جاتی ہی۔ بلکہ اسکے غائب ہو جانیکا اندیشہ ہی۔ مسلمانون مین چچیرے بھائی بہنون کی شادی جائز ہی۔ مگر اس سے جو نتیجہ نکلا ہی وہ بہت حوصلہ افزا نہین ہی۔ قوی ہیکل اور قدر آور افغانون کی اولاد چھوٹے قد کی ہوتی ہے

بعد بونون مین تبدیل ہوگئی ہی۔ گو اس امر کو بھی مد نظر رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کی آب و ہوا کا جسم پر مضر اثر ہوتا ہی لیکن مسلمانون کے ماسوا اور قومین بھی تو ہین جن کی قوت جسمانی اور دماغی جون کی تون ہے۔ آب و ہوا کے ناگوار اثر سے ان مین کوئی انقلاب واقع نہین ہوا۔ ایسے چند اور بھی اسباب ہین جنھون نے افغانون کی نسل کو بگاڑ دیا ہی اور انمین سب سے بڑا چچیرے بھائی بہنونکی آپس کی شادی ہی۔ خالہ، ماموں، پھوپی کی بیٹی سے بھی شادی روا سمجھی جاتی ہی اور اسکا فریا جبکل اثر نسلی زوال ہی۔

تمدنی معاملات مین حکومت کی دست اندازی جون جون تہذیب ترقی کرتی ہی انسان کی آزادی پر نئی پابندیان عائد ہوتی جاتی ہین جس سے مقصود فلاح عامہ ہی۔ مہذب حکومت کے زیر اثر رہنے والے آدمی بخوشی اپنی کردار کی آزادی اسکے سپرد کردیتے ہین اور اسکے قوانین و احکام کی بے چون وچرا متابعت کرتے ہین۔ مگر تمدنی معاملات مین ریاست کی دست اندازی مناسب نہین تاکہ افراد بطور خود اپنی آنیوالی نسل مین جیسی خصوصیات چاہین اپنے حسب منشا پیدا کرلین مگر حفظان صحت کے قواعد پر عمل پیرا ہونا تمام وفادار شہریونکا فرض ہی، جو حکومت انکے فائدے کیلئے وضع کرتی ہی۔ اور جب موجودہ نظام تمدن برہم ہو جائیگا تو حکومت کو نئے قواعد وضع کرکے حق ملکیت، ورثہ، ماں باپ کی آمدنی مین اولاد کے حصّے کے متعلق نافذ کرنے پڑینگے۔ حکومت کیلئے مناسب ہوگا اگر وہ شادی کی نسبت خاص قواعد جاری کردے تاکہ مرد و عورت قومی بہتری کی خاطر خاص مقصد سے شادی کرین۔ مگر گھر کے انتظام اور تعلقات زناشوئی مین حکومت کو کوئی دخل نہین دینا چاہیئے۔ سردست یہ کہنا دشوار ہی کہ آئندہ زمانہ مین نظام مجلس کیا ہوگا۔ مگر رخ زمانہ سے اسکی نسبت کچھ خیال ہوسکتا ہی۔

مرد و عورت کے تعلقات آنے والے زمانے کے نظام تمدن مین مرد غالباً زیادہ محنت اور مشقت کے کام کرینگے جیسے انتظام ملک، انجنیری، ریل کا انتظام، سپاہ بحر و بر وغیرہ۔ معلمی اور ڈاکٹری، فنون لطیفہ، پوشاک تیار کرنا اور اسی قسم کے ہلکے کام عورتونکے سپرد ہونگے۔ زندگی کے تمام کاروبار مردون اور عورتون مین مساوی منقسم ہونگے گو اس سے یہ مراد نہین ہی کہ کوئی خاص کام مردون یا عورتون کے لیئے مخصوص ہوگا۔ اس کا یہ انجام ہوگا کہ سوسائٹی کے تمام کام باحسن الوجوہ انجام پذیر ہونگے۔ انتظام بہت عمدہ ہوگا کیونکہ مرد و عورت آپس مین ایسے کام بانٹ لین گے جن کے انجام دینے کی ان مین طبعی قابلیت اور میلان ہوگا۔

آنے والے زمانے کے آدمی دور افتادہ مستقبل مین کیسے آدمی ہونگے؟ انکی عقلی اور جسمانی حالت کیسی ہوگی؟ اسپر غور کرتے وقت دماغ چکّر مین آجاتا ہی۔ وہ شہزوری مین اسفندیار، اور وجاہت مین یوسف، اور عقل مین خدا کی مانند ہونگے۔ اس سے کسی کو انکار نہین ہوسکتا۔ وہ پانی پر چلے گا۔ ہوا مین اُڑیگا۔ منگل اور سکر کے لوگون سے نامہ و پیام جاری کریگا۔ عالم ایتھر کی سیر کرے گا۔ کائنات کے اسرار مخفی کو افشا کرے گا، اور آب حیات ڈھونڈھ نکالے گا۔ سنگ پارس بھی بنالے گا۔ الغرض ایسے ایسے کام کریگا جو اسوقت وہم و گمان سے بعید معلوم ہوتے ہین۔ اُسوقت علم کے حدود نہایت وسیع ہونگے۔ ٹینی سن کہتا ہی "عورت کا جس بات سے بھلا ہوتا ہی اُس سے مرد کا بھی بھلا ہوگا۔ وہ دونون ایک ساتھ آسمان شہرت پر چڑھین گے یا قعر ضلالت مین گرین گے"۔ اُس زمانے کے انقلاب مین عورت کو بڑا دخل ہوگا۔ اسکے توسط سے بڑے بڑے کام ہون گے وہ حسن مین ماہتاب سے بھی بڑھ جائیگی۔ وہ اپنے شوہر کے لیئے دیوی اور آنے والی پود کی ماں، اور عیش پسند لوگون کے لیے پری ہوگی وہ اپنی موجودگی سے زندگی کے تاریک حصّون کو روشن اور زحمتون کو رحمتون مین منتقل کرے گی۔ وہ "زندگی کا تاج" اور "دُنیا کا نور" ہوگی۔

کامیابی کا معیار اہل استفادہ کہتے ہین کہ زندگی کا مقصد سب سے زیادہ

فیض پہنچانا اور حاصل کرنا ہو مگر قدرت اسکی قائل نہین ہو۔ وہ کیفیات اور گرد و پیش کے حالات کے مطابق انواع تیار کر لیتی ہو۔ وہ ایک خاص نمونہ قائم رکھنے کے لیے سیکڑون جانون کو قربان کر دیتی ہو جیسے روزمرہ کمزور بچون کے مرنے سے ظاہر ہوتا ہو۔ مگر جنھین وہ زندہ رکھنا چاہتی ہو، انھین لسنے جہد الحیواۃ کیلئے ویسے ہی سامان بھی عطا کر رکھے ہین، اور اسی طرح وہ ترقی کرتے ہین۔ موجودات ایک منزل کی طرف بڑھ رہے ہین، جہان وہ سب ایک نئی صورت اور ڈھنگ مین ظاہر ہونگے، اور وہ کائنات اس سے بہت مختلف ہو گی۔

شمس الہدیٰ

نظامِ شمسی

کائنات کے اندر جتنی عجیب و غریب اشیا ہین ان مین شائد آسمانی درخشان کرہ سب سے زیادہ عجیب ہے، جسمین بعض وقت گول چکردار بادل دکھائی دیتے ہین جو "چکردار سحاب" کے نام سے مشہور ہین جب انسان انکے ہولناک حجم اور انکی ماہیت پر غور کرتا ہو تو عقل چکر مین آجاتی ہو۔ علما کہتے ہین کہ اجرام فلکی شروع مین اسی درخشان بادل سے ماخوذ ہوئے تھے اور

افلاک کا مبدا درخشان سحابیے آئندہ زمانے کے سورجون اور عالمون کی ہستی بھی اسی نورانی مادہ مین مضمر ہو۔ یہ خیال بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہو لیکن جب اصلیت پر نگاہ ڈالی جائے تو اسکی معقولیت عیان ہو جاتی ہو جب ریاضیات اور طبیعیات کے اصول سے کام لیکر مشاہدہ فلکی کرتے ہین تو یہ امر بہت معقول معلوم ہونے لگتا ہو کہ اس سحاب مین نظام ہائے شمسی اور عالم ستارگان پنہان ہین۔ مسٹر ولیم سدرلینڈ نے حال ہی مین مشاہدونکی بنا پر استدلال کرکے یہ ظاہر کر دیا ہو کہ شروع مین ہمارے نظام شمسی کا مادہ بھی ایک اسی قسم کا سحاب تھا جسکے دو بازو تھے۔ وہ اندرونی حرکت کے سبب سے رفتہ رفتہ سرد ہو گئے اور اسکے حصے الگ ہو کر خلا مین ادھر اُدھر پھیل گئے جیسے بدھ جو نظام شمسی مین سب سے چھوٹا ہو، اور جسکی کثافت آٹھ نیلم تن اور برہسپت جو عظیم ترین ہو، اسکی کثافت اس سے بھی کہین زیادہ ہو اور آفتاب جو مرکز مین ان کو سنبھالے ہوے ہو ان سب سے لاکھون گنا زیادہ کثیف ہو اور یہ سب اجرام اسی عظیم الوسعت سحاب سے بنے ہین۔ یہ خیال مسئلہ سحاب کی تازہ ترین صورت ہو۔ اس سے فرانسیسی فلکی لاپ لیس کے نظریہ کی تردید ہوتی ہو جسنے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آفتاب اور اسکے توابع گول قرص ایسی شکل کے سحاب سے پیدا ہوئے تھے، جو سورج کے کرہ کے ارگرد پھیلا ہوا تھا مگر رفتہ رفتہ سرد ہو کر سکڑتا گیا اور اس سے اجرام فلکی بنتے چلے گئے، اور کئی قسم کے خیالات بھی اجرام فلکی کی ابتدا کی نسبت مشہور ہین جو "ارتقائے سیارگان" مین مذکور ہو۔ مگر یہان پر انکے تذکرہ کی چندان ضرورت نہین ہو، البتہ سیارون کا ذکر بہت ضروری ہو۔

نظام شمسی کے چار گروہ سورج کے قریب مختلف فاصلون پر چار سیارے ہین۔ منگل (مریخ) ان چارون مین آفتاب سے بہت دور ہو، یعنی چودہ کروڑ دس لاکھ میل، اور بدھ قریب ترین ہو یعنی تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل پر واقع ہو۔ گو یہ چارون سیارے جسامت مین ایک دوسرے سے بہت مختلف ہین مگر یہ ایک جداگانہ طبقہ سے متعلق اور ایک دوسرے سے مشابہ ہین۔ یہ ارکین نظام شمسی کا اول گروہ ہو۔ دوسرا طبقہ اس سے چونتیس کروڑ میل پر واقع ہو اور یہ فاصلہ بہت وسیع ہو۔ اس دوسرے طبقے مین چار سیارے ہین۔ برہسپت۔ سنیچر۔ یورے نس اور نپ چون۔ برہسپت کرۂ ارض سے تیرہ سو گنا بڑا ہو۔ باقی سیارے اس سے بہت چھوٹے ہین مگر سب کے سب بہت دور دور ہین یعنی آفتاب سے تین ارب میل کے درمیان گردش کرتے ہین۔ گو یہ سیارے اس دُنیا کے پیمانہ کے مطابق ایسے ہولناک فاصلہ پر

واقع ہین لیکن اگر ان کے ناپنے کے لیے آسمانی پیمانہ سے کام لیا جائے تو یہ فاصلہ ایسا ہی جیسا دس پندرہ گھنٹے کا تیز رو ریل گاڑی کا سفر، کیونکہ دوسرا نظام شمسی (الفا سنٹاور) ہمارے آفتاب سے دو پدم ساٹھ کھرب میل کے فاصلے پر واقع ہی اور اس سے ادھر اور کوئی آفتاب نہین ہی برہسپت نپ چون سے پندرہ سو گنا بڑا ہی، اور سنیچر سے صرف دو چند یون کہنا بجا ہوگا کہ برہسپت (مشتری) سورج کو چھوڑ کر باقی تمام اراکین نظام شمسی سے چھ سو گنا بڑا ہی اور آفتاب ان سب سے سیکڑون گنا بڑھکر ہے۔

ان دونون قسم کے سیارون مین جنکا ذکر ہوا ہی، نہ صرف جسامت ہی کا فرق ہی بلکہ انکی طبعی حالت بھی بہت مختلف ہی یعنی چھوٹے سیارے بہت وزنی اور ٹھوس ہین اور بڑے سیارے اپنے حجم کے مقابلے مین ہلکے ہین۔ یا یون کہیے کہ سیارگان صغیر کثافت مین بڑے بڑے سیارون سے بڑھکر ہین۔ مثلاً اگر کوئی ایسا عظیم الحجم تالاب ہو جسکا طول و عرض لاکھون میل کا ہو اور اسمین سنیچر کو ڈالا جائے تو وہ تیرتا رہیگا، اور مشتری آہستہ آہستہ ڈوب جائے گا۔

ان دونون طبقون کے درمیان جو فاصلہ ہی اسمین چھ سو کے قریب اور چھوٹے چھوٹے سیارے ہین۔ انمین جو سب سے بڑا ہی اسکا قطر پانچ سو میل اور خوردترین کا دس میل ہی۔ یہ اسٹرائڈ (Asteriods) کہلاتے ہین۔ یہ متعلقین آفتاب کا تیسرا گروہ ہی جو کئی باتون مین دوسرے طبقون سے مختلف ہی یہ ننھے ننھے سیارے ایک دوسرے کے مرجع آپ ہی بنے ہوے ہین۔ چوتھا طبقہ متعلقین شمسی کا دمدار ستارے ہین جنکی سفید سفید چوٹیان گاہے بگاہے ہزارون لاکھون میلون تک پھیلی ہوئی نظر آیا کرتی ہین۔

آفتاب عالم تاب آفتاب کا درجہ نظام شمسی مین وہی ہی جو ایک خاندان مین باپ کا ہی جیسے باپ کے بغیر اولاد ناممکن ہی اسطرح اراکین نظام شمسی کا وجود و قیام سورج کے بغیر محال ہی۔ اسکا حجم دیگر سیارون کے مجموعی حجم سے آٹھ سو گنا زیادہ ہی، اور کرۂ ارض سے تین لاکھ تیس ہزار گنا بھاری ہی۔ اسکی جسامت سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ نظام شمسی کے ارتقا مین آفتاب نے ایک نہایت شاندار اور ضروری حصہ لیا ہی عالمون کا یہ خیال ہی کہ سورج کا انقباض ہنوز جاری ہی اور ابتک بالکل دخانی حالت مین ہی اور اسکی جو قوت انتشار حرارت سے ضائع ہوتی ہی اسکی کمی اسکے عمل انقباض سے پوری ہوتی رہتی ہی۔ اسکی موجودہ کثافت پانی سے ۱½ گنا ہی۔ عالم کہتے ہین کہ انتشار حرارت کا خسارہ عمل انقباض سے اسی صورت مین پورا ہو سکتا ہی کہ ڈھائی سو فٹ قطر ہر سال سکڑتا رہے چونکہ آفتاب کا قطر آٹھ لاکھ ساٹھ ہزار میل ہی، اسلیے اسکے انقباض کا اثر دس ہزار سال تک ہمارے آلات پر ظاہر نہین ہو سکتا۔

یہان پر یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ اگر اسی طرح آفتاب سکڑتا چلا جائے تو کتنے ہزار سال بعد اسکا منبع حرارت ختم ہو جائیگا۔ اگر حرارت موجودہ شرح سے خارج ہوتی رہی ہو تو حساب سے یہ ظاہر ہوگا کہ ڈھائی کروڑ سال سے یہ عمل جاری ہی اور اگر آئندہ بھی اسکا سلسلہ اسی طرح جاری رہے تو پچاس اور ستر لاکھ سال کے مابین اسکا قطر سکڑ کر نصف رہ جائیگا انقباض کے ساتھ اسکی کثافت اب سے آٹھ گنا ہوگی اور درجۂ حرارت اتنا بڑھ جائیگا کہ اراکین نظام شمسی تک اتنی حرارت نہین پہنچے گی کہ وہ آبادی کے قابل ہون۔ عالمان ارضیات کا یہ خیال ہی کہ کرۂ ارض دس کروڑ سال سے جاندارون کی زندگی کی پرورش اور قیام کے قابل چلی آتی ہی۔ اس تضاد کے رفع دفع کے لیے فلکیون نے خیال قائم کیا ہی کہ سورج کی حرارت اگلے زمانون مین اسی شرح سے خارج نہ ہوتی تھی، جس سے آج کل ہو رہی ہی۔ حال ہی مین عالمون نے سورج کی معزول قوت کی بہم رسانی کی بابت یہ قیاس لگایا ہی کہ اس کے اندر ریڈیم ہی جسکی بدولت اسکا وجود لاکھون اور کروڑون برس تک قائم رہے گا۔

تھوڑے عرصے سے بعض عالمون نے یہ اندازہ لگایا ہو کہ سورج کی حرارت زمین پر یکسان نہین پہنچتی بلکہ اسمین بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہو، اور یہ تفاوت دس فیصدی ہوتی ہو۔ یہی حال باقی ارا کین شمسی کا بھی ہو یعنے سورج کی گرمی ان کے ہان بھی اسی حساب سے نہین پہنچتی۔ اسکی ایک وجدہ داغ ہین جو کبھی کبھی سطح آفتاب پر ظاہر ہوتے رہتے ہین اور کبھی کبھی عجیب قسم کی گیسین پھوٹ نکلتی ہین، جیسے آتشخیز پہاڑ سے آگ اور دھوان نکلتا ہو۔ اس سے سورج تغیر پذیر ستارہ معلوم ہوتا ہو مگر یہ تبدیلیان آسانی سے نہین پہچانی جاتی ہین یہ تبدیلیان آئندہ بھی ہوتی رہین گی لیکن وہ کیسی ہونگی؟ اسکا جواب دینا محال ہو لیکن عالمون نے حال مین یہ دیکھا ہو کہ تارہ مائرہ سیٹی (Miraceti) کے تبدلات سورج کے نسبت ہزارون گنا زیادہ وسیع دیکھے گئے ہین اور وہ اپنی نوعیت مین شمسی انقلابات کے بہت مشابہ پائے گئے ہین۔

ستارۂ عطارد عطارد (بدھ) سب سیارون مین چھوٹا ہو۔ بظاہر وہ آفتاب کے کچے بچون مین سب سے چھوٹا معلوم ہوتا ہو۔ مگر اسکو سن رسیدہ بونہ کہنا چاہیئے۔ اسکی حرکت کی تیزی کا سبب اسکی قربت آفتابی ہو۔ اسکا دائرہ گردش بے ٹھکانے ہو۔ اسلیئے چھ ہفتون کے اندر اسکی رفتار تیتیس اور پینتیس میل فی سکنڈ کے درمیان رہتی ہو اور اس اثنا مین جو حرارت اور گرمی آفتاب سے نکل کر اسکے ہان جاتی ہو وہ کبھی دوچند اور کبھی نصف ہو جاتی ہو۔ بدھ کرۂ ہوا سے محروم ہو اسلیئے وہان پانی کا وجود عنقا سمجھا جاتا ہو۔ اسکی کثافت سیسہ اور پارہ کے برابر سمجھی جاتی ہو۔ یہ اپنے محور پر ایسی تیزی سے نہین گھوم سکتا جس سے دن اور رات پیدا ہوتے ہین چونکہ سورج کے بہت قریب ہو اسلیئے اسکی سطح سخت اور خشک ہو گئی ہو۔ ان باتون سے فلکیون نے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ بدھ ارتقا کے آخری مرحلہ مین ہو۔ مگر اس سے یہ نہین مفہوم ہو سکتا کہ بدھ آفتابی خاندان مین پہلوٹا ہو۔ بلکہ اسکا اصل سبب یہ ہو کہ اسکا حجم بہت چھوٹا ہو اسلیئے بہت جلد سحابی بخارات اڑ گئے اور یہ ٹھوس ہو گیا۔ اسکا قطر تین ہزار میل اور اسکا سال اٹھاسی دن کا ہوتا ہو۔

زہرہ کی سرگزشت زہرہ (شکر) آفتاب اور چاند کے سوا سب سے زیادہ درخشان ہو۔ صبح یا شام کو نظر آتا ہو۔ کرۂ ارض سے دوسرے درجے پر اگر کوئی سیارہ جانداروں کے رہنے کے لیے موزون ہو تو وہ شکر ہو اسکا قطر سات ہزار سات سو میل ہو۔ گویا یہ کرۂ ارض کا توام بھائی ہو۔ اسکی کثافت زمین سے کچھ کم ہو یعنی اگر ہم مین سے کوئی آدمی سطح زہرہ پر جا سکے تو اسکا وزن یہان سے قدرے زیادہ ہوگا۔ یہ سیارہ سورج سے پونے سات کروڑ میل ہو۔ وہان پر سورج کی حرارت اور روشنی زمین کی نسبت دوچند پہونچتی ہو۔ چونکہ اسکا دائرۂ گردش سب سیارون سے زیادہ مدور ہو اسلیئے سالانہ تبدیلیان بہت کم ہوتی ہین۔ علاوہ ازین اسکا کرۂ ہوا بہت وسیع ہو جسکی بدولت وہ آفتاب کی تیزی سے بچ سکتا ہو۔ اسکی سطح دور بین سے دکھائی نہین دیتی اسلیئے اس کے جغرافیہ سے ہم ناواقف ہین۔ پروفیسر ریپی ول لوئل کا یہ خیال ہو کہ یہ سیارہ اپنی محوری قوت سے اتنا محروم ہو گیا ہو کہ وہ آفتاب کے گرد صرف ایک مرتبہ چکر لگاتا ہو جسکی وجہ سے اسکے ایک حصہ پر دائمی رات اور دوسرے پر استمراری دن رہتا ہو۔ مگر اور عالم اس خیال کو تسلیم نہین کرتے۔ بوپلسکی روسی فلکی نے اپنے مشاہدون سے یہ امر ظاہر کیا ہو کہ شکر کا دن ساڑھے چونتیس گھنٹے کا ہوتا ہو۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہو کہ وہان ہم سے زیادہ ذہین ہستیان رہ سکتی ہین جب شکر زمین اور آفتاب کے درمیان سے گزرتا ہو تو اسکا فاصلہ ہمسے صرف دو کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہوتا ہو۔ اس سے نزدیک تر کوئی سیارہ نہین آتا ہو۔ اس سے بعض دل چلے عالمون کے دل مین یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ ایتھر تار برقی کے ذریعے سے شکر کے باشندون سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کرنا چاہیئے۔ مگر سائنس ایسی باتون کا قائل نہین ہو

مریخ کا قصہ مریخ (منگل) اول طبقہ مین سب سے دور اُفتادہ اور بُدھ کے سوا سب سے چھوٹا ہی۔ اسکا قطر بیالیس سو میل ہی اور اسکی مساحت کرۂ ارض کے ۲۸ء۰ کے برابر ہی۔ اسکی کثافت زمین کی کثافت کے ۷۲ء۰ مساوی ہی یعنی پانی سے چار گنا زیادہ اور کشش کا تناسب ۳۸ اور ۰۰ اکا ہی جسکے معنی یہ ہین کہ اگر کوئی جانور سطح مریخ پر چلا جائے تو اسکا وزن دو تہائی کم ہو جائیگا۔ اس امر کو مد نظر رکھکر یہ خیال کیا گیا ہی کہ منگل مین انسان کا قد بارہ تیرہ فٹ ہوتا ہی مگر اس سے اسکی چستی و چالاکی مین کوئی فرق واقع نہین ہوتا۔ اسی بنا پر یہ گمان کیا گیا ہی کہ منگل مین دیو رہتے ہین جنھون نے عظیم الشان نہرین تیار کی ہین۔ مگر دانشمند فلکی ایسی قیاسی باتون کو چندان اہمیت نہین دیتے۔ اصل یہ ہی کہ منگل کی حالت جانداروں کے قیام و وجود کے متناقض ہی۔ منگل مین کرۂ ارض سے آدھی شمسی روشنی اور گرمی جاتی ہی۔ اسپکٹروسکوپ اور دوربین سے ظاہر ہوتا ہی کہ مریخ کی ہوا بہت لطیف ہی اور وہان کی سردی و گرمی کا درجہ صفر سے بھی نیچے ہوگا۔

عالم یہ تسلیم کرتے ہین کہ منگل کے ڈھانچے مین کوئی ایسی خاص چیز ہی جس سے مظاہر طبعی یعنی فطری انقلابات وقوع مین آتے رہتے ہین۔ ایک تو یہ امر خاص توجہ کے قابل ہی کہ وہان قطبین مین برف پڑتی ہی جو موسم گرما مین گھل جاتی ہی جیسا کہ ہمارے ہان شمالی اور جنوبی قطبون مین دیکھا جاتا ہی۔ وہان برف ضرور جمتی ہی اگر یہ نہو تو کہرہ ہوگا۔ دوم سطح مریخ پر زمین کے ایسے قطعات نظر آتے ہین جیسے ہمارے ہان ہین جنکے رنگ مختلف ہوتے بعض نیلگون جس سے سمندرون اور جھیلون کا گمان ہوتا ہی اور بعض زرد گویا یہ بنجر خطے اور ممالک ہین اور وہان روئیدگی بھی دکھائی دیتی ہی۔ نہرون کا جال انہی لال پیلے خطون مین نظر آتا ہی۔ لوئل اور دیگر اسکے ہم خیال کہتے ہین کہ بحیرے تو خشک ہو چکے ہین مگر اتنی رطوبت باقی ہی جس سے قطبون مین یخ پیدا ہوتی ہی اور سبزی کے قیام کی موجب ہوتی ہی جس سے جانورون کی زندگی قائم ہی بشرطیکہ وہ وہان پر ہون۔ اس نظریہ کے رو سے جب برف پگھلتی ہی تو پہلے پانی ایک حصہ مین اور پھر دوسرے مین جمع ہوتا ہی۔ اور پھر "نہرون" کے وسیلے سے "مریخی باشندے" "شہرون" اور "کھیتون" مین لیجاتے اور سیراب کرتے ہین۔ یہ کھیت سیاہ دھاریون کی صورت مین دوربین مین نظر آتے ہین جسکی بنا پر اہل مریخ کرۂ ارض کے باشندون سے زیادہ ذہین اور عقلمند سمجھے جاتے ہین۔ نہرون کی بناوٹ سے انکی عجیب و غریب انجنیرانہ عقلمندی اور قوا طبعی سے کام لینے کی بے مثال دانائی اور علم عیان ہوتا ہی۔ مگر یہ محض قیاس ہی مریخی سال ۶۸۷ دن کا ہوتا ہی اور موسمی تبدیلیان ہمارے ہان کے موسمی تبدلات سے مشابہ ہوتی ہین۔ اسکا دن چوبیس گھنٹے ۳۷ منٹ کا ہوتا ہی یہی وجہ ہی کہ مریخ کی سطح بہت اچھی طرح نظر آتی ہی۔

سیارگان صغیرہ آفتاب کے لواحقین کے گروہون مین ایک طبقہ سیارگان صغیرہ کا ہی جو تیسرے طبقہ مین ہین۔ انکا شمار کئی سو ہی اور ہر سال انمین اضافہ ہوتا رہتا ہی۔ انمین بڑے بڑے چار ہین۔ سیرس اسکا قطر ۴۸۰ میل؛ پلاس اسکا قطر ۳۰۴ میل؛ وسٹا کا قطر ۲۳۹ میل اور جونو کا ۱۲۰ میل ہی اور باقی کا قطر بیس میل بھی نہین۔ گویا وسیع خلا مین یہ ننھے ننھے مونگے کے جزیرے ہین۔ انکی شکل و صورت بیقاعدہ ہی۔ جرمن عالم آلبرکی رائے مین یہ سیارے کسی بڑے سیارے کے پھٹنے سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے گرد کے دوائر بہت غیر معین ہین۔ یہ سب کے سب مریخ کے دائرۂ گردش کی سرحد سے لیکر مشتری کے گھومنے کے خط کے مابین واقع ہین۔ خیال کیا جاتا ہی کہ مشتری کے چاند بھی انہی صغیر سیارون مین سے ہین جو اسکی کشش سے کھنچکر اسکے قریب چلے گئے اور گھومنا شروع کر دیا۔ اسی طبقہ مین اروس نامی چھوٹا سیارہ ہی جو گردش کرتا ہوا زمین کے پاس ایک کروڑ چالیس لاکھ میل پر پہنچ جاتا ہی۔

مشتری کا حال مشتری (برہسپت) سیارگان نظام شمسی مین عظیم ترین ہی۔

سورج سے اسکا فاصلہ اڑتالیس کروڑ تینتیس لاکھ میل ہی۔ زمین سے یہ تیرہ سو گنا بڑا ہی مگر اسکی کثافت زمین کا چوتھا حصہ ہی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہی کہ اسکا وزن زمین سے صرف ۳۱۶ گنا ہی۔ اسکی حرکت محوری بہت تیز ہی یعنی دس گھنٹے مین گھومتا ہی۔ قطبون کے پاس چپٹا اور خط استوا کے قریب باہر کو ابھرا ہوا ہی۔ اسکی گردش محوری اسکے مختلف حصون مین مختلف ہوتی ہی۔ سورج کی بھی یہی کیفیت ہی جو اس امر پر دال ہی کہ وہ انکا ہی۔ گیسون کی نہایت کثرت ہی جسکی وجہ سے گردش کی تیزی سے اسکی سطح پر پٹکے یا چھلے نمودار ہو جاتے ہین۔ مگر قطبون کے پاس دھاریان ظاہر نہین ہوتی ہین۔ عالم خیال کرتے ہین کہ مشتری ہنوز ارتقا کے تمام مراحل طے کرنے مین کامیاب نہین ہوا ہی۔ چونتیس سال کا عرصہ گزرا کہ مشتری کے جنوبی پٹکے کے پاس ایک سُرخ داغ نمودار ہوا تھا جسکا طول تیس ہزار میل تھا۔ فلکیون نے اسکی ہر چند تحقیقات کی مگر اسکی نوعیت معلوم نہو سکی اور آج کے دن تک وہ ایک راز سربستہ ہی۔ یہ عظیم داغ مختلف قسم کی تبدیلیون سے بھی دوچار ہو چکا ہی۔

مشتری کے حصہ مین آفتابی حرارت اور روشنی کرۂ ارض کے مقابلے مین صرف پچیسوان حصہ آتی ہی اگر کچھ عرصہ کے بعد وہ سخت ہو جائے تو وہان کسی جاندار کا زندہ رہنا محالات سے ہوگا، کیونکہ سردی کی کثرت سے وہ اینٹھ کر مر جائیگا۔ مشتری کے چار بڑے اور چار چھوٹے چاند ہین۔

عجیب غریب سیارہ زحل | مشتری سے دوسرے درجہ پر جسامت مین زحل (سنیچر) ہی جو سب سیارون مین عجیب و غریب ہی۔ اسکے کرہ کے اردگرد کئی درخشان حلقے اور چھلّے ہین جو مسلسل ایک دوسرے کے اندر واقع ہین۔ اسکا قطر ۷۵ ہزار میل ہی۔ اگر درخشان چھلّون کو بھی کرہ کے ساتھ شامل کر لیا جائے تو قطر کا کل طول ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار میل ہو جاتا ہی۔ اندرونی چھلّا زحل کے استوا کے پاس دس ہزار میل پہنچتا ہی اور اسکا بیرونی کنارا ساڑھے سولہ ہزار میل چوڑے چھلے مین ملجاتا ہی۔ گویہ حلقے دور بین مین سخت نظر آتے ہین، مگر دراصل گیس کے بنے ہوئے ہین جو کرۂ زحل کے اردگرد گردش کرتے رہتے ہین۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ جب زحل کے مرکز کا سحاب سکڑ گیا تو یہ حلقے اس سے باہر رہ گئے۔ اسکے کرہ پر بھی ویسے پٹکے نظر آتے ہین جیسے مشتری کے قرص پر دکھائی دیتے ہین۔ زحل کی کثافت پانی کی کثافت سے ۳/۱ حصہ کم ہی۔ زحل کے اردگرد دس چاند گردش کرتے ہین۔ انکا حجم ایک دوسرے سے مختلف ہی اور یہ مختلف فاصلون پر واقع ہین۔ اسکا فاصلہ آفتاب سے اٹھاسی کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہی۔

یورے نس اور نپ چون | یورے نس اور نپ چون نظام شمسی کے بچھڑے ہوئے بھائی ہین۔ تھوڑے ہی عرصے سے انکے وجود کا پتہ عالمون کو لگا ہی۔ اول الذکر کا فاصلہ سورج سے ایک ارب ۸ کروڑ بیس لاکھ میل اور دوسرے کا دو ارب ۹ کروڑ بیس لاکھ میل ہی۔ یہ دونون سیارے اُس عظیم الجثم سحاب کے بیرونی حصون سے بنے ہین جس سے نظام شمسی کے باقی ارکین وجود مین آئے تھے۔ اسکی کثافت پانی سے بھی کم ہی۔ یورے نس کا قطر تیس ہزار اور نپ چون کا چھتیس ہزار میل ہی۔ اول الذکر کے چار اور موخر الذکر کا صرف ایک چاند ہی۔ نپ چون کے وجود کا پتہ اسکے اُس اثر سے چلا تھا جو یورے نس کی حرکت پر نمایان ہوتا تھا۔ انکے چاندون کی گردش سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ انکی حرکت محوری اسی سمت مین نہین ہوتی ہی جسمین باقی سیارونکی ہوتی ہی۔ نپ چون کی گردش مشرق سے مغرب کی جانب اور یورے نس کی قائم الزاویہ کے رُخ پر ہوتی ہی۔

یہ ہی مختصر داستان متعلقین آفتاب کی۔ مفصل کیفیت تو بڑی بڑی علمی کتابون ہی مین ملسکتی ہی لیکن ناظرین العصر کی معلومات مین اس سے خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہی اور فلکیات کی کل باتون کا لطف اِس خلاصہ سے حاصل کر سکتے ہین۔

جے۔ آر۔ رائے

نُور یا روشنی

نور کی اہمیت اور ضرورت اُن ضروریات میں سے جو انسانی زندگی کے لیے لابُدی بلکہ اجزاء لا یتجزیٰ ہیں نُور یا روشنی بھی ایک ہے۔ اگر سچ پوچھو تو انسانی زندگی کے تمام حظوظ اور دیگر اقسام کے کاروبار نُور کے بغیر بیکار ہیں۔ زندگی کے اگر تمام کاروبار پر اور جو تعلق اُن سے انسان کو ہے اُسپر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل حق ثابت ہوتی ہے کہ "آنکھ گئی تو جہان گیا" دوسرے الفاظ میں بدن کا چراغ (یا نور) آنکھ ہے اگر انسان کے جسم سے یہ نُور جاتا رہا تو اُسکا تعلق بیرونی دُنیا سے ایک گونہ بالکل قطع ہو گیا۔ انسان نُور کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ ذرا اس کے وقت ہی پر غور کیجیے۔ انسان کے جسم میں تندرستی، خوبصورتی، طاقت، لیاقت، علمیت سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ گھر میں تمام اسباب راحت و انبساط کافی بلکہ بافراط مہیا ہوتا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب اپنے گرد و پیش بیٹھے ہوتے ہیں، مگر "دمڑی کے لعل"

بغیر ساری چیزیں بے مصرف ہوتی ہیں۔ اُسوقت یہ انسان ضعیف البنیان باوجود اپنی کامل صحت اور طاقت و خوب صورتی کے، شل بُت کے ایک جگہ مقید بیٹھا رہتا ہی۔ وہ اُسوقت نور کا کیسا محتاج نظر آتا ہے۔ ہر شئے کی قدر و قیمت اُسکی ضد کی موجودگی سے پہچانی جاتی ہے، اسی طرح نور کی اہمیت و ضرورت تاریکی سے امتیاز ہوتی ہے۔ نور کے بغیر انسان تمام بہجت افزا و مسرت بخش اشیا سے کچھ بھی فائدہ اور حظ اُٹھا نہیں سکتا۔ پیاروں کے خوب صورت چہرے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور دل اُنکی نادید سے بیقرار ہوتا ہے۔ غرضیکہ انسان کا کوئی کام ہو، سب کے سب نور کے بغیر بے لطف ہوتے ہیں۔ نور انسان کے لیے نہایت ہی ضروری مفید اور دلکش ہے۔

نور جس طرح انسان کے لیے لابُدی اور فیض رساں ہے اُسی طرح حیوانات نباتات اور جمادات کے لیے بھی لازمی ہے۔ اُنکی زندگی اور روئیدگی اور بالیدگی سب کا انحصار نور ہی پر ہے۔ عالم کی پیدایش، پرورش، اور نشو و نما اور تمام خوبصورتیاں نور ہی سے ہیں۔ اسی لیے توریت شریف میں حضرت موسیٰ نے بتایا ہے کہ خداے تعالیٰ نے آفرینش عالم کی ابتدا میں سب سے اول نور پیدا کیا۔ اور اسی نہج سے سائنس نے بھی بتایا ہے کہ موجودہ صورت میں منجمد ہونے سے پیشتر آفتاب اور سیارے روشن ہیولے کی صورت میں موجود تھے۔ یہی ہیولے وہ نور یا اُجالا ہے جس کو خداوند عالم نے سب سے پہلے خلق کیا۔ نور ہر شئے کے اندر مخفی و مستتر تھا جسکو خالق نے ظاہر کیا۔ اور اب بھی ہر شئے میں موجود ہی جو رگڑ یا کسی اور کیمیاوی ترکیب سے پردۂ کتم سے منصۂ ظہور پر آجاتا ہے۔ اگر نور کو کُل اشیا کا ست یا روح کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

نور کی اہمیت اور قدر و منزلت اس طرح پر بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت ہر مذہب اور ملت میں بیان ہوا ہے کہ وہ نور ہے اور نور میں رہتا ہے، وہ اور اُسکے فرشتے سب نوری ہیں۔ وہی ذات الٰہی نور اور نور کا مخرج ہے سارے انوار اُسی سے ضیا پاتے ہیں۔ اُس میں تاریکی کا سایہ تک نہیں ہے۔ اگر اس پہلو سے غور کیا جائے تو نور ازلی اور ابدی ہے۔ جب سے خدا ہے تب سے نور ہے۔ اگر نور نہ ہوتا تو اس عالم کا ظہور بھی نہ ہوتا۔

نور اگرچہ ایک ہے تو بھی اپنے طبعی اخلاقی اور روحانی معنی کے لحاظ سے مختلف اقسام کے کہلاتے ہیں۔ ہمارا مقصد اس جگہ نور طبعی پر غور کرنے کا ہی۔

نور کی بابت قیاسات

نور کی تحقیقات میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نور کیا ہے؟ نور کے بیان میں متفرق قیاسات ہیں۔ مگر سب سے زیادہ مشہور اور مروج دو قیاس ہیں۔ پہلا قیاس یہ ہے کہ روشن اجسام ہر سمت میں ایک مادہ اپنے اندر سے نکالتے رہتے ہیں اُس میں غایت درجے کے لطیف ذرات مشتمل ہیں۔ یہ ذرات نہایت ہی سرعت کے ساتھ سیدھی سطروں میں برابر پھیلتے رہتے ہیں اور آنکھوں کے اندر جاکر "ریٹینا" پر اپنا اثر کرتے ہیں اور اُس اثر سے ہم میں وہ احساس پیدا ہوتا ہے جس سے نظر بنتی ہے۔ اِس قیاس کو قیاس شعاع نور کہتے ہیں۔ اس قیاس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ روشنی کے ذرات منور اجسام سے ایسے طور پر متواتر اور نہایت عجلت کے ساتھ ناشکستہ سلسلے میں لگاتار نکلتے رہتے ہیں۔ اس قیاس کا رواج سر آئزک نیوٹن صاحب کی زبردست تائید کی وجہ سے مدت دراز تک سائنٹیفک عالم میں جاری رہا اور اب بھی ایک بڑا زبردست فرقہ سائنس دانوں کا ایسا موجود ہے جو اِس قیاس کا بڑا حامی ہے۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ تمام اجسام اور خلا، سماوی نہایت ہی درجہ کے لطیف اور لچکدار مادہ سے مملو ہیں جسکو روشن ایتھر کہتے ہیں۔ اور اجسام اس لیے منور ہوتے ہیں کہ اُنکے ذرات خلا میں انتہائی درجہ کی سُرعت اور تیزی کے ساتھ تھرتھراتے رہتے ہیں، اور جب وہ ایتھر میں مل جاتے ہیں، تو دائرہ نما لہروں کی شکل میں ہر سمت پھیلتے رہتے ہیں اور یہ تھرتھراہٹ ریٹینا پر پڑکر احساس نظر پیدا کرتی ہے۔ اِس قیاس کو قیاس تموج نور کہتے ہیں۔ یہ تھرتھراہٹ خط مستقیم میں رواں نہیں ہوتی بلکہ ایسے طور پر چلتی ہے کہ قائمے زاویے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تھرتھراہٹ اُس روانی کے مشابہ ہے جو اُس وقت رسی میں ہوتی ہے جب رسی کو ایک سرے سے پکڑکر آہستہ آہستہ گردش دی جاتی ہے۔ اس قیاسی تموج میں ذرات کی کسی حرکت کا

تصور مشتمل نہیں ہے بلکہ ذرات کی بے قراری کی ایک حالت ہوتی ہے جو جسم منور سے ظہور میں آتی ہے۔ اسکی مثال عین پانی کی لہروں کی سی ہے۔ قیاس تموج نور کا سب سے پہلا محقق ہوجنس ہے اور اُسکے بعد یولرنے اس قیاس کی بڑی حمایت کی اور اسکو رواج دیا۔ اسکے بعد ڈاکٹر ینگ اور فرنزل اسکے بڑے حامی گزرے ہیں۔ قیاس تموج سے نہ صرف ظہوراتِ نورانی کی توضیح ہو جاتی ہے بلکہ اس سے وہ علاقہ بھی منکشف ہوجاتا ہے جو روشنی اور حرارت کے ظہورات کے درمیان نہایت قرب میں واقع ہے، اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ظہوراتِ نور اور ظہوراتِ صدا میں کیسی پوری مشابہت موجود ہے۔

نور کے مخارج نور کے سلسلۂ بیان میں دوسری بات اُسکے مخارج کا بیان ہے۔ اگرچہ نور دُنیا میں کثرت سے موجود ہے، خواہ ظاہر ہو یا باطن، تاہم نور کا اصل منبع سائنس دانوں کی نظر تحقیقات سے مخفی ہے۔ ظاہر طور پر جہاں تک عام مشاہدہ اور سائنسی تجربات ومشاہدات کی رسائی ہوئی ہے وہاں تک یہی نتیجہ نکالا اور بتایا گیا ہے کہ نور یا روشنی سورج، ستاروں، حرارت، کیمیاوی ترکیب، بجلی، شہابوں اور اُن اشیاء سے نکلتی ہے جن میں فاسفورس ہوتا ہے۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ انکے اندر نور کہاں سے آیا جو بروقت کسی نہ کسی ترکیب یا ذریعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے؟ تو سائنس اسکا جواب دینے سے عاری ہے۔ البتہ موسیٰ نے پیدائش کی کتاب کے شروع میں اشارۃً ظاہر کر دیا ہے۔ وہ بیان قرین عقل اور قابل تسلیم بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حرارت و روشنی کا نہایت ہی قریبی اور لابدی تعلق ہے۔ جہاں حرارت ہے وہاں نور۔ یہ بات اور ہے کہ کیا نور ہمیشہ ظاہر ہی رہتا ہے یا باطن، مگر تجربہ اور مشاہدہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ حرارت میں نور ہے۔ خدائے تعالیٰ نے عین ابتدائے پیدائش عالم میں سب سے پہلے مادّہ کے اندر حرارت ڈالی۔ اور اس حرارت کے ساتھ ہی جو "خدا کی روح" کے "پانیوں پر جنبش کرنے" سے خارج ہو کر مادّہ کے اندر گئی نور بھی اُسکے ساتھ ہی مادّہ کے اندر پہنچا، اور جب خدا نے فرمایا کہ "اُجالا ہو" تو فوراً ہی مادّہ زور کے ساتھ متحرک ہوا۔ اور اس حرکت سے آپس میں رگڑ اور نور کا ظہور ہوا۔ نور کا یہ ظہور سب سے پہلے نبولے کی صورت میں ہُوا۔ ڈاکٹر کینیس نور کی پیدایش کا بیان یوں کرتے ہیں اور موسیٰ کی رؤیا میں نور کے ظہور کا نظارہ اس طرح پر دکھاتے ہیں کہ جب موسیٰ کوہ طور پر حق تعالیٰ کے روبرو عالم رویا میں اس دُنیا کی پیدایش کا سارا واقعہ مسلسل طور پر دیکھ رہا تھا تو اُس نے "اپنی آنکھیں اوپر اُٹھا کر اُن بادلوں کو دیکھا جو اُسکے گرداگرد گھوم رہے تھے (وہ کیا دیکھتا ہے کہ) فوراً ایک کالا بادل اُسکے سر پر چھایا ہُوا ہے۔ اور جبکہ وہ اس نظارہ کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتا اور غور کر رہا تھا کہ اسکے کیا معنی ہیں تو اُس نے خدا کی وہی آواز سُنی کہ "اُجالا ہو جا" اور فوراً ہی سارا خلا ہر قسم کی شکلوں کے نورانی نبولوں سے معمور ہو گیا۔ وہ حیرت کی نگاہوں سے تاکتا ہے۔ اور وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ یہ نبولے منجمد ہو گئے اور آسمان کے کل سائبان میں سُورج (بصیغۂ جمع) اور ستارے جگمگا اُٹھے" (موزس اینڈ جیالوجی صفحہ ۱۹۰) اور پھر لکھتے ہیں (صفحہ ۲۰۲) "اگرچہ فی الحال ہم نہیں بتا سکتے کہ کن قوانین سے نبولے بنے اور انکو یہ روشن خاصیتیں عطا ہوئیں تاہم یہ ایک بدیہی امر ہے کہ نور بلا کسی معلومہ مرکزی منبع اشعاع کے موجود تھا۔ پس موسیٰ کا بیان بالکل درست ہے کہ آفتاب سے پیشتر روشنی موجود تھی"۔ موسیٰ کے بیان اور سائنس کے ساتھ اسکا مقابلہ کرنے سے بخوبی پتہ لگتا ہے کہ اصل منبع اور مخرجِ نور کا وہی قادر متعال بے چون و بے مثال ہے۔ پانی پر اُسکی روح کے جنبش کرنے سے مادّہ میں حرارت و نور داخل ہوئے۔ اُسکے فرمانے سے مادّہ بڑے زور کے ساتھ متحرک ہُوا۔ اور قسم قسم کی شکلوں کے روشن اور گرم نبولے (سحاب) متشکّل ہو گئے اور نور فضا میں پھیل گیا۔ پھر یہ نبولے رفتہ رفتہ منجمد ہوتے گئے اور انھوں نے سورجوں اور ستاروں کی شکلیں اختیار کریں جو نور کے مخارج ثانی ہیں۔

سُورج ایک منجمد نبولا ہے جو بذاتہ روشن ہے اور چاند کی طرح کسی غیر فلکی جرم سے روشنی حاصل نہیں کرتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سائنس کی تحقیقات کے مطابق اُس میں اُن بے شمار جلتے ہوئے شہابوں

سے بھی روشنی پیدا ہوتی ہے جو حرکت کرتے ہوئے سورج کے اندر آپڑتے ہیں۔ "کیونکہ تمام لاتعداد شہابی گولے جب مدار آفتاب میں آجاتے ہیں تو وہ ہر ایک ممکن زاویہ پر آکر ایک دوسرے کا تقاطع کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان میں سے بعض شہاب آگے جاتے اور بعض پیچھے ہٹتے ہیں اس لیے وہ بالضرور آپس میں لگاتار ٹکراتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں اجسام ناگہاں ٹھہر جاتے ہیں، اور اُن سے غایت درجہ کی حرارت اور روشنی پیدا ہوتی ہے اور وہ آفتابی گولے میں آگرتے ہیں، اور اس طرح اُس میں متواتر نئی نئی حرارت اور روشنی پہنچاتے ہیں" (ایضاً ۳۵ صفحہ) یہ سورج کی روشنی کا حال ہے۔

حرارت سے جو روشنی پیدا ہوتی ہے وہ اُس وقت نظر آتی ہے جب اشیا (بلیٹ صاحب کے بیان کے مطابق) ۵۰۰ سے ۶۰۰ درجے تک گرم ہوتی ہیں اور اس درجے سے آگے جوں جوں حرارت کی مقدار بڑھتی جاتی ہے روشنی بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

فاسفورس ایک ایسی شئے ہے جو اکثر اقسام کی چیزوں میں موجود ہے اور جب وہ چیزیں کسی خاص حالت میں رکھی جاتی ہیں تو خود بخود روشن ہو جاتی ہیں۔ اور بعض نباتات اور حیوانات میں بھی یہ خاصہ پایا جاتا ہے مثلاً یہ نور شب چراغ (جگنو) میں بہت تیز ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشنی اُنکی مرضی کے مطابق ظاہر اور پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ سمندروں میں بھی بہت سی ایسی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو راس السرطان اور جدی میں ہیں اُنکے بدن سے روشنی برابر نکلتی اور سمندر کو روشن کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی اشیا ہیں جن سے روشنی نکلتی ہے اور انسان و حیوان اُنسے اکتساب نور کرتے ہیں۔ اور وہ نور میں اپنے سارے کام کرتے اور خوش ہوتے ہیں۔ یہاں تو انسان مخارج ثانی سے نور حاصل کرتا ہے مگر موت کے بعد جب آرام اور خوشی کی حالت میں جائیگا تو اصل منبع سے نُور اور خوشی حاصل کریگا۔

نور کی تیز رفتاری | یوں تو نور کا ہر ایک پہلو قابل ذکر اور اُسکا بیان نہایت مفید اور دلکش ہے مگر ہم طوالت کے خوف سے صرف نُور کی تیز رفتاری کا ذکر کرینگے۔ جو نہایت دلچسپ اور حیرت میں ڈالنے والا مگر سریع الفہم ہے۔ روشنی اس قدر سرعت اور تیزی کے ساتھ چلتی ہے کہ عام مشاہدہ کے مطابق سطح زمین پر کسی نورانی ظہور اور آنکھ کے احساس کے درمیان کوئی قابل قدر فاصلہ نہیں ہوتا۔

یہ سرعت رفتاری سب سے پہلے علم نجوم کے مشاہدات کے ذریعہ سے معلوم کی گئی ہے۔ سب سے پہلے رومر نامے ایک ڈنمارک کے منجم نے ۱۶۷۵ء میں جوپیٹر کے پہلے خادم ستارہ کے گہن کے مشاہدہ سے روشنی کی تیز رفتاری دریافت کی تھی۔ نتیجہ اسکے تجربہ اور مشاہدہ کا یہ ہے کہ روشنی ایک سکنڈ میں ۱۹۰۰۰۰ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ ایک اور بیان کے مطابق روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل سافت میں دَوڑ جاتی ہے۔

نور کی ترکیب | ایک عجیب بات یہ ہے کہ روشنی کے اندر سات رنگ پائے جاتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ نُور سات رنگوں سے بنا ہے۔ سُرخ۔ نارنجی۔ زرد۔ سبز۔ نیلا۔ زعفرانی۔ بنفشی۔ اِن میں سے سُرخ بہت ہی مدھم ہے اور بنفشی نہایت ہی انتشار پذیر ہے۔ یہ سر آئزک نیوٹن کے تجربہ کا نتیجہ ہے، مگر ڈاکٹر ینگ اور فریزنل نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر ایک رنگ مسلسل تموج یا لہروں سے پیدا ہوتا ہے، اور اُن موجوں یا لہروں کی لمبائی کا بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک انچہ سُرخ روشنی میں ۳۹۴۰۰ لہریں ہوتی ہیں، اور چونکہ روشنی تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل ایک سکنڈ میں طے کرتی ہے لہذا جب ہم سُرخ گلاب کے پھول کیجانب دیکھیں گے تو ہماری آنکھ کا ریٹینیا ایک سکنڈ میں ....۳۱۴ بار تھرائیگا۔ بنفشی کرنوں میں یہ لہریں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ یعنی ایک انچہ روشنی میں ۶۰۰۴۰ لہریں۔ پس جب ہم بنفشی رنگ کے گچھے کی جانب دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھ کی ریٹینیا کی تھرتھراہٹ ....۷۵۰ دفعہ ہوتی ہے۔

نُور کے بیان سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ نور انسان کے لیے کس قدر ضروری چیز ہے کہ بغیر اسکے انسان کسی قسم کا فائدہ یا حظ کبھی نہیں اُٹھا سکتا۔ اور یہ بات بھی روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ

خدا نے نور کی ترکیب میں کیسی اعلیٰ اور کامل دانائی اور حکمت رکھی ہے کہ اُس سے دل اور دماغ کو تازگی اور روح کو فرحت ملتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ نور کا منبع اور مخرج خود ہی خدائے ذوالجلال ہے سورج اور ستاروں وغیرہ کے انوار اور لوامع اُسی پروردگار کے ذاتی انوار کے پرتو ہیں۔ یہ نور ہی ہے جو ہمکو اُس لایزال نور کا اندرونی احساس دلاتا ہے اور اُس نور کی تحصیل کا ذوق و شوق ہم میں پیدا کرتا ہے اے خدا! تو جو نور ہے اور نور میں رہتا ہے، جس طرح تو نے ہمیں اس دُنیاوی نور سے منور کیا اُسی طرح اپنی تجلی کے نور سے ہمارے باطن کو منور کر اور ہماری موت کے بعد اپنے چہرے کے ذاتی نور کی تجلی سے سرفراز فرما! - آمین ثم آمین۔

پی۔ کیول سنگھ

مسئلۂ انتشارِ قوت اور عالم کی بربادی

مسئلۂ انتشار قوت (**Dissipation of Energy**) طبعیات میں ایک نہایت عجیب غریب اور نہایت مشہور مسئلہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اجسام کی قوت عمل طبعی سے رفتہ رفتہ خارج ہو رہی ہے، اور آخرکار وہ اخراجِ قوت سے مُردہ اور بے کار ہو جائیں گے یہ عالم کہیر عمل ہے۔

لارڈ کیلون کی رائے لارڈ کیلون اسکے مخترع تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "عالم محسوسات کے اندر عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قوتِ میکینکہ اجسام کے اندر سے نکل نکل کر خارج ہو رہی ہے۔ جو بے جان مادی عمل جاری ہیں انکے وسیلہ سے اس اخراجِ قوت کی تلافی نہیں ہوتی۔ ذرّوں کے اجتماع اور ارتباط سے بھی (قوت ضائع ہونے کا) یہ خسارہ پورا نہیں ہوتا۔ چاہے یہ عملِ اجتماع نباتی زندگی سے بہرہ یاب ہو یا کسی جان دار کی مرضی کے تابع ہو۔" جس کے معنی یہ ہیں کہ خواہ نباتات کے اندر قدرتی عمل جاری ہو یا خوراک وغیرہ کے وسیلہ سے ہم کام کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کریں مگر عمل انتشار سے جو قوت برباد ہو جاتی ہے وہ پوری نہیں ہو سکتی۔ آخرکار ہم مرجاتے ہیں۔ انجن رات دن چلتا رہتا ہے اور کچھ مدت کے بعد اتنا فرسودہ اور بے کار ہو جاتا ہے کہ مرمت سے بھی کام نہیں دیتا۔ نباتات بھی کچھ عرصہ کے بعد مرجھا جاتی اور سوکھ جاتی ہیں۔

اگلے وہ زمانہ تھا کہ کرۂ ارض انسان کے رہنے کے قابل نہ تھی۔ ایک زمانہ آیندہ ایسا آئیگا کہ وہ جان داروں کی بود و باش کے قابل نہ رہیگی تاوقتیکہ انسان کا موجودہ ڈھچر اور قوائے جسمانی، دماغی، اور روحانی بدل نہ جائیں یا قوانین میں تغیر عظیم واقع نہ ہو۔ جو اس وقت عالم کے اندر موجود ہیں۔"

ہربرٹ اسپنسر کی رائے عالم کی آخری حالت کی بابت ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے "جو عمل ہر جگہ ہو رہے ہیں اُنکا یہ انجام ہوگا کہ ہر جگہ شہر خموشاں کی سی خاموشی چھا جائے گی۔ سب کام معطل ہو جائیں گے۔ ہم سب ہلاکت کے اُس گڑھے میں جا گریں گے جو مُنھ کھولے ہڑپ کرنے کو تیار ہے۔" (فرسٹ پرنسپلز صفحہ ۵۰۰)

مشہور عالم فلکیات رچرڈ پراکٹر لکھتا ہے: "سورج سے دس لاکھ کا کیا حرارت خارج ہوتی ہے جس کا صرف ۲۲۷ واں حصہ سیاروں کے حصہ میں آتا ہے باقی خلا میں جا کر غائب ہو جاتا ہے۔"

سر آلیور لاج کی رائے آپ طبعیات کے نہایت ہی مشہور عالم، مانچسٹر یونیورسٹی کے پرنسپل، کئی کتابوں کے مصنف، خدا کے قائل، دین دار اور نیک آدمی ہیں۔ آپ کو ڈاکٹر والس کی طرح روحانیات سے دلچسپی ہے۔ آپ کی رائے ناطق سمجھی جاتی ہے۔ آپ انتشار قوت کی بابت لکھتے ہیں: "وہ قوت جسے قابو کرکے ہم ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کر سکتے ہیں اور اُس سے خاص کام لے سکتے ہیں، وہ کارآمد قوت کہلاتی ہے کیونکہ اُس سے اپنے حسب منشا کام لیا جا سکتا ہے، گو انتقال سے قوت کی مقدار کم نہیں ہوتی مگر بار بار منتقل ہونے سے اُسکے کارآمد ہونے میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس عمل میں اُسکا کچھ حصہ زائل ہو جاتا ہے۔ اور ذراتی حرکت (حرارت) بنجاتی ہے اور اس طرح وہ ہمارے قبضۂ اختیار سے باہر ہو جانے سے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہ بظاہر ناگزیر عمل ہے جو آپ سے آپ ہوتا رہتا ہے۔ اسی کا نام انتشار قوت ہے۔ تمام بے جان عملوں سے انتشار لاحق ہو جاتا ہے اور یہ عمل سب جگہ اور چیزوں میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ جاندار ہستیاں اسکے عمل کی ہدایت کر سکتی ہیں۔"

پروفیسر صاحبان ٹیٹ و اسٹوارٹ کی رائے مشہور و معروف عالمان طبعیات پروفیسر جی پی ٹیٹ اور بالفور اسٹوارٹ نے اپنی مشہور کتاب "دی ان سین یونیورس" (**The Unseen Universe**) میں حرارت کے اخراج سے عالموں کی بربادی کی بابت حسب ذیل تحریر کیا ہے: "حرارت کا میلان عام مساوات ہے۔ سچ پوچھو تو حرارت اس عالم کے اندر مساوات

کا درجہ قائم کرنے والی اور عدم مساوات کی دشمن ہے۔ اس سے اس عالم کا بلاشبہہ خاتمہ ہو جائیگا۔ اس عالم کو ایک عظیم الشان انجن ہا ؤس سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جابجا ہمنے انجنوں کی مثالوں سے کام لیا ہے۔ ہماری دنیا بلکہ تمام نظام شمسی کی حرارت کا سرچشمہ آفتاب ہے جس طرح آسمان کے دیگر ستارے دیگر نظامہائے شمسی کی گرمی کا مصدر ہیں۔ جو قوت ہماری ہستی کے لیے لازمی و لابدی ہے وہ اُس حرارت سے حاصل ہوتی ہے جو سورج سے خارج ہو کر آتی ہے۔ اور وہ قوت اس گرمی کا ایک نہایت ادنی جزو ہے۔ گو سورج ہمیں قوت بہم پہنچاتا ہے مگر وہ خود سرد ہوتا جاتا ہے۔ آخرکار ایک ایسا وقت آئے گا جب کہ اخراجِ حرارت سے جو خلا میں ہوتی رہتی ہے سورج زندگی کو سہارا دینے والی اُس قوت سے محروم ہو جائے گا جو اس وقت اُسکے پاس موجود ہے۔ یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ سورج کے سرد ہونے کے ساتھ ایتھر کی رگڑ سے ہمارا کرۂ ارض اور دیگر سیارے گھومتے گھومتے آفتاب کی طرف کھنچ جائینگے اور آخرکار اُسکی سطح پہ جاکر برباد ہو جائیں گے۔ اس سے قدرۃً ایک قسم کا تصادم ہوگا جس سے حرارت اور قوت پیدا ہوگی اور کچھ عرصہ کے لیے سورج کی قوت بحال ہو جائے گی مگر بالآخر یہ بھی ختم ہو جائے گی اور آفتاب حرارت و روشنی سے بالکل محروم ہو جائے گا۔ تاوقتیکہ اپنے کسی ہمسایہ سے ایتھر کی رگڑ سے ٹکرا کر اسکی ہستی تحس نحس نہ ہو جائے۔

اس بحث پر زیادہ بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مگر زندگی جہاں تک اس کا تعلق طبعی حالات اور قواء سے ہے قوت کی تنسیخ او نئی صورتیں اختیار کرنے پر موقوف ہے۔ یہ امر بھی یقینی ہے کہ زمانہ بزمانہ اس قسم کے تغیرات کا امکان کم ہوتا جاتا ہے اور جو کچھ ہمیں عالم کے قوانین اور قواکے عمل کی کیفیت معلوم ہے اسکی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عالم کی آخری صورت یہ ہوگی کہ قوتِ بارز کے زائل ہونے اور قوت مخفی کے علاً بیکار ہو جانے سے تمام مادہ ایک ہولناک انبار بنجائیگا اور اس مجموعہ کا درجۂ حرارت و برودت مساوی ہوگا۔

مگر نظامِ شمسی کی قوت مخفی اتنی وسیع ہے جسے ہم اپنی لاچاری کی وجہ سے غیر متناہی قرار دیتے ہیں کہ وہ بے انتہا صدیوں تک زندگی کی طبعی ضروریات کو پورا کرتی رہے گی۔ اگر سیرئیس (Sirius) اور آفتاب آپس میں ٹکرا جائیں تو اس سے تیس گنا زیادہ حرارت پیدا ہوگی اگر قوانین قدرت موجودہ صورت میں جاری رہے تو بے شمار زمانوں کے بعد مردہ آفتابوں کے ہمارے آفتاب سے ٹکرانے کا سخت احتمال ہے ان کے جسموں کا بڑا حصہ باریک خاک میں تبدیل ہو جائے گا اور اسکے وسیلہ سے بڑے بڑے سیارے اور آفتاب نئے سرے سے بنیں گے۔ الغرض موجودہ نظامِ شمسی سے زیادہ شان دار اور وسیع نظامِ شمسی قائم ہو جائے گا۔ مگر شمار میں ارکین شمسی کم ہوں گے۔ اس طرح کچھ مدت کے بعد قوت ختم ہو جائے گی۔ اسکے ساتھ حرکت بھی بند ہو جائیگی اور عالم کے چاروں طرف دائمی سکون اور خاموشی ہوگی۔ جیسے سیاروں کی آیندہ حالت ہوگی ویسے ہی وہ کچھ زمانہ پیشتر بھی تھے۔ انکا ہیولیٰ سفید خاک ایسا تھا جو گردش کر رہا تھا مگر اسکے اندر قوت مخفی تھی۔ خلا میں مادہ سفید بادلوں کی طرح گردش کر رہا تھا آخرکار اس میں انقلاب پیدا ہوا اور سرد ہو کر کرے اور سیارے بنتے گئے۔ موجودہ عالم کی ابتدا ہوئی تھی تو انتہا بھی ہوگی اسے ہمیشگی اور استمرار نصیب نہیں۔ اسے فنا سے بالا سمجھنا غلطی ہے۔ جے۔ آر۔ ڈا

سادگی

مجھے بارہا اس خیال سے سخت تعجب ہوا ہے کہ "سادگی" کا حاصل کرنا اور اسکی صحیح تعریف کرنا کتنا مشکل ہے۔ بادی النظر میں اسکے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ جو معنی ہم لفظ "سادہ" کے لیتے ہیں وہ محدود ہیں۔ کیونکہ یہ زیادہ تر ایک ایسے اثبات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نفی کے معنی دیتا ہے۔ گو یہ بات تعجب انگیز

مفہوم ہو مگر ہمارے قبول کردہ استعمال میں ایسا ہی ہے۔ ہم عام طور پر "سادہ طریقہ" اور "ایک سیدھی سادی بات" کے الفاظ کا استعمال کیا کرتے ہیں اور ان الفاظ سے ہمارا یہ مفہوم ہوتا ہے ایک ایسا "طریقہ" یا "بات" جس کے کرنے کے لیے ہمکو زیادہ ہوشیاری اور تیز فہمی سے کام نہ لینا پڑے۔ پھر ہم کہا کرتے ہیں "سیدھا سادہ آدمی" جس کا مطلب ایک ایسے شخص سے ہوتا ہے جو چالاک اور ہوشیار نہ ہو۔ بعض اوقات ہم اس سے بھی بڑھکر کہا کرتے ہیں کہ "اوہ! یہ تو مجسم سادگی ہے"۔ جسکا مطلب اُس سے بہت زیادہ ہوتا ہے جس قدر سمجھا جاتا ہے۔ اسکے اصلی معنی سے نہ کہنے والا آگاہ ہوتا ہے نہ سُننے والا۔ یہ لوگ قابل افسوس ہیں۔ استعمال اور عادت نے خیال کی حدبندی کر دی ہے۔ سادگی کے معنی میں ذیل کی باتیں شامل کر لینا مناسب ہوگا :۔

(۱) لطافتِ مزاج بے ریاکاری۔

(۲) فطرت کامل جو تبدیلی اور شکست سے مبرا ہو۔

(۳) آزاد معصومیت جو سب کے ساتھ یکساں ہو۔

(۴) عادات کی صفائی جو اندرونہ کا سچا انعکاس ہو نہ کہ رسوم کی مصنوعی نمود۔ یہ خیال کہ "یہ باتیں خیال ہی خیال ہیں" قابلِ اعتراض ہے۔ "سادگی" کی تعریف کیوں کرتے ہو؟ درخت سے گھاس کیوں مُراد نہیں لیتے حالانکہ اُسکے بھی تنہ اور پتے ہوتے ہیں؟۔

پس یہ محدود نفی کا پہلو ہے جو ایک اثباتی لفظ کے کہنے اور سُننے والے کو پیش آتا ہے۔ "جو کچھ ہے" یہ "جو کچھ نہیں ہے" کے بعد آتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک دوسرا پہلو ہے جو اسکے اثباتی معنوں کی اہمیت سے انکار کرتا ہے اور یہی ہمارا نہایت اہم اور دوسرا سبب ہے۔

ہماری سویلزیشن (تہذیب) خاص طور پر ہمکو ہر صاف اور سادہ چیز کے لیے اندھا بنا دینے کی ذمہ دار ہے۔ سادگی نیچر پر حکومت کرتی ہے اور تکلف (Complexity) ترقی پر۔

دن، رات، بہار، موسمِ گرما، خزاں اور موسمِ سرما ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے ہیں صرف زمین کی ایک سادہ حرکت سے انسان کا عجیب و غریب ڈھانچ قائم ہے صرف سادہ طور پر سانس لینے اور نکالنے سے۔ بےشک "سادگی" نہایت تحیر انگیز ہے! اس سرزمین کی ہر چیز کو آزماؤ مگر کوئی بھی سادگی کے احاطہ سے باہر نہ پائی جائے گی۔

اب تھوڑی دیر کے لیے اس "خالق اصغر" یعنی انسانِ عظیم کا خیال کرو اسکا سب سے بڑا کام سویلائیزیشن ہے۔ اسپر کون حکومت کرتا ہے؟ مذہب، فلسفہ، علم، سیاست، سائنس، جنگ، صلح، صناعی، تجارت، زر، آزادی، دست کاری، انصاف اور سخاوت وغیرہ وغیرہ۔ جو الفاظ ملتے جائیں سب ان کے ساتھ ملاتے جاؤ یہاں تک کہ کوئی نام باقی نہ رہے۔ لیکن "اس پر کون حکومت کرتا ہے؟" یہ سوال پھر بھی حل طلب رہ جاتا ہے جب تک ہم یہ نہیں کہ "انسان سویلزیشن پر حکومت کرتا ہے اور سویلزیشن انسان پر"۔ اسکا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہر نسل اور ہر صدی اپنے "مہذب ترین" ہونے کا دعوی کرتی ہے اور اپنے سے کچھ ہی پہلے زمانہ کو "زمانۂ تاریک" (Dark Age) کا خطاب عطا فرماتی ہے۔ سنہ عیسوی کی ابتدا ہوئی اور اس سے پہلے زمانہ کو مایوسی کے ساتھ "تاریک" کہا گیا۔ تہذیب نے ایک دوسرا نام وضع کیا اور گذشتہ چودہویں صدی کو "زمانۂ وسطی" کہکر پکارا گیا۔ ہم بیسویں صدی کے اشخاص بھی ان روایتی خطابات میں حصہ لیں گے اور تیسویں یا چالیسویں صدی کے لوگ ہماری پہچان کے لیے کوئی نیا نشان ایجاد کریں گے۔ چھوٹے چھوٹے زمانوں پر "اولڈفیشن" کا لیبل لگایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے ایک تازہ نام حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ "انسان عظیم" درحقیقت انسان عظیم ہے!

یہ ہے انسان کی ساختہ سویلزیشن کا خاکہ۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اسکی پیدائش کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمکو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ "سادگی" سے نظرپوشی کی گئی ہے۔ بے شک تخیل پر بھی کچھ الزام رکھا جاتا ہے مگر نتیجۂ کوشش عام طور پر قبول شدہ ہے۔ ہر شخص کو قریب قریب معلوم ہے کہ انسان پیشتر کس طرح پھلوں، گوشت اور چشموں کے پانی پر گزارا

کیا کرتا تھا۔ حضرت انسان غاروں یا درختوں کے سایہ میں رہا کرتے تھے۔ ہر طرف نیچر کی حکومت تھی۔ یہ میدانی زندگی صحت بخش، طاقت ور، اور بے لوث تھی۔ فکر، رنج، گناہ اور خجالت کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ نہ بیماریاں ہوتی تھیں، نہ قحط پڑتے تھے، نہ بغاوتیں ہوتی تھیں نہ آزادی کے لیے کوششیں۔ صرف آزادی اور سادگی ہر طرف بے کھٹکے اور بے پوچھے گچھے حکومت کرتی تھیں۔ خیالات سادہ تھے مگر وسیع او متفق۔ خیالات نہ تو ہزاروں جانب منقسم تھے اور نہ فضولیات میں اُلجھے ہوئے۔ اس کے بعد آگ نے رواج پایا جس نے ہمارے تعلقات کو نیچر سے کامل طور پر جُدا کر دیا۔ اُس چور کو جس نے آسمان سے آگ چُرائی تھی، دیوتاؤں نے کافی سزا دی۔ یہ سزا انسان کو دی گئی اور نظیر سابقہ قائم ہو گئی۔ ہم اب بھی دیوتاؤں کے انصاف کو بُرا کہتے ہیں۔ اسی آگ کے معلوم ہونے کے دن سے سویلزیشن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی وقت سے ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور انکے پورا کرنے کے ذرائع بہت کم دستیاب ہوتے گئے۔ گھڑی نے تختہ ساعت نما کو شکست دی اور تب ہی سے زمانہ موجودہ ماڈرن ازم (Modernism) کا آغاز ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضروریات بے حد بڑھ گئیں اور برکاتِ اولیں غائب ہو گئیں۔ مجوسیوں کا یہ کہنا بجا تھا کہ "شیطان سویلزیشن کا باپ ہے۔ اس نے خوشی، صفائی اور معصومیت یا بالفاظ دیگر "سادگی" کے چلے جانے کے بعد اچھائی اور برائی دونوں نازل کیں۔"

"انسان مظہرِ خالق ہے" یہ اب ہماری پیدائیش اور خلقت کا ایک متروک الاستعمال مقولہ رہ گیا ہے۔ جو مقولہ موجودہ "تہذب" صدیوں پر صادق آتا ہے وہ یہ ہے کہ "انسان اچھائی اور برائی کا غیر منفکہ مجموعہ ہے۔" شیطان کے الہام کا کیا ہی عمدہ نتیجہ ہے! اسی سے تمام نشست کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ ہماری تمام خلقت مخلوط (Complex) ہو گئی ہے۔ ہمارا دماغ ایک گہرے اختلاط میں کام کرتا ہے اور کبھی کبھی اس خلط کو اور بھی زیادہ مخلوط کر دیتا ہے۔ ہم اخلاق کے قواعد بناتے ہیں یہ فرض کر کے کہ علم الاخلاق ایک نہایت پیچیدہ چیز ہے ورنہ قواعد کی کیا ضرورت لیکن ہم خود نہیں جانتے کہ جسکا ہم اعلان کرتے ہیں وہ یہی اصل چیز ہے۔ "جان کے بدلے جان" ہم کہا کرتے ہیں لیکن کبھی ان الفاظ کا میدان جنگ میں بھی خیال رکھا جاتا ہے؟ اگر فاتح بعض شاہنشاہ کے ساتھ "قتل قتل قتل۔ قتل۔ قتل۔ قتل کی ہم نوائی کرو تو یقیناً اخبارات میں تمہاری بے حد تعریف کی جائے گی۔ تمہارا قاتلانہ اور لعنتی فن سپاہ گری تاریخوں میں تحریر کیا جائے گا اور اسکے معاوضہ میں تمہارے نام کے ساتھ چند الفاظ بڑھا دیے جائیں گے۔ "ہر ایک سے محبت کرو یہاں تک کہ اپنے دشمنوں سے بھی" یہ ہمارے کرہ کی ایک سادہ ترین آواز نے اعلان کیا تھا۔ "بے شک لیکن بلحاظ تفریق رنگ کے" اسپر سیاسی با اخلاق شخص ایزاد کرتا ہے اور پھر بھی ہزاروں جبر، وعدوں اور دروغ گوئیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

اسی طرح تمام انسانی شاخوں میں کوئی ایسا قاعدہ کبھی نہیں بنایا گیا جسکے ساتھ اُسکا "باطل ساز" استثنا نہ لگا ہو۔

ہم نے اپنے واسطے ایک نئی بادشاہت قائم کی ہے جسکا اصول فرمانروائی سادگی نہیں بلکہ تکلف ہے۔ اچھائی، سادگی، اور صفائی سے یکساں جدائی ہمارا کام رہ گیا ہے۔ ہمارے مقاصد بھی ایسے ہی ہیں یعنی کسی چیز کو جس حالت میں پائیں اُسے اُسکے برخلاف بنا دیں۔ بعض اوقات میں گھنٹوں اس بات پر غور کیا کرتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کی ایجاد کردہ ایسی سائنس بھی ہے جسکی بنیاد سادگی پر رکھی گئی ہو؟

میں پہلے مذہب کو لیتا ہوں، جو دنیا میں ہمارا مقصد خاص ہے۔ اسکی بنیاد خلاقِ عالم کے سادہ ایمان پر ہے۔ لیکن بعض آدمی ہمکو بے حد پیچیدہ مباحث میں ڈالتے ہیں جن سے ہماری عقل گم ہو جاتی ہے اور ہم تعجب کرنے لگتے ہیں کہ آیا ہم زیادہ عقلمند ہیں یا زیادہ بے وقوف۔ بعض آدمی ریاضت کی تعلیم دیتے ہیں جسکو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ تمیز اگر وہ تارک الدنیا ہونے کی

صلاح دیتا ہے۔ دوسرے یہ بتاتے ہیں کہ "جو یہاں ہے سو وہاں ہے" ایک گروہ کہتا ہے کہ جب تم دنیا میں تناسخ کے پھیر سے نکل جاوگے تو کچھ حاصل ہوگا۔ اور جب اس "کچھ" کی تشریح پوچھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ "یہ کچھ نہیں" سے بھی بد تر ہے۔ اسی کے ساتھ عظیم الشان مہذب اور نیٹنگ پرستش No-ism کی ہے۔ یہ لوگ ہر چیز سے انکار کرتے ہیں۔ انسان اِن رسومات، عقائد، رواجات، اقوال اور انکارات وغیرہ کے اخلاط کے سامنے حواس باختہ ہوجاتا ہے۔ "سادہ غیبی آواز" پر لوگ کم توجہ کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ مثل ایک شفیق باپ کے اپنے بچوں سے کہتا ہے "میری طرف آؤ"، لیکن جب ہم اُسکی طرف جاتے ہیں تو اس طرح جاتے ہیں جیسے کوئی سراغ رساں کسی کے اسرار دریافت کرنے جاتا ہے یا جس طرح کوئی ترجمان جو اپنے کو بہ نسبت اُس شخص کے جسکی وہ ترجمانی کرتا ہے، زیادہ ظاہر کیا کرتا ہے۔ اسکے بعد ہم ان اسرار کو امتحانی نلی میں ڈالتے ہیں۔ گرمی پہنچاتے ہیں۔ رنگ دیکھتے ہیں، نتیجہ نکالتے ہیں اور آخر کار اپنی حماقت کا اظہار کرتے ہیں۔

غریب "مہذب آدمی" اپنے ایک انچ بھر کے دماغ سے ہر چیز کا امتحان کرنا چاہتا ہے جسکے لیے وہ ہرگز قابل نہیں ہے۔

اب میں اپنے مشاغل تفریح کو لیتا ہوں۔ یہ بھی قابلِ اطمینان نہیں۔ ہر بچہ روتا اور چلاتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ اسکے بعد ہم رونے سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ زندگی بھر ہمارا یہی مشغلہ رہتا ہے کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کریں جو کبھی کسی نے نہ بنائی ہو۔ ہماری پیدائش کے ساتھ ہی ہنسنا اور مسکرانا بھی آتا ہے جو ہمارے قلبی انبساط کا بیرونی انعکاس ہوتا ہے۔ نیچر نے یہی چیزیں ہماری تفریح کے لیے دی ہیں۔ اسکی اشکال مختلف ہوتی ہیں لیکن اسکا رجحان یکساں رہتا ہے۔ زمانۂ خوشی پانچ سال تک رہتا ہے۔ اسکے بعد ہر چیز اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ خاک، گھاس، درخت، پتے، پھول اور عالم کا ہر نظارہ اور آواز ایسی معلوم ہوتی ہے گویا یہ چیزیں خاص ہمارے ہی لیے بنائی گئی ہیں۔ ہم ایسا کہنے میں انکے ساتھ کافی انصاف کرتے ہیں۔ تم نے اکثر بچوں کو سڑک کے کنارے خاک میں لوٹتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ وہ اس میں بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ اتنا زیادہ جتنا کہ تم اپنے تازہ خرید ریشمی لباس میں بھی نہیں ہوئے۔ تمہاری تہذیب انھیں "گندہ" کہتی ہے مگر ابھی فیصلہ باقی رہتا ہے کہ آیا تم زیادہ ناپاک ہو یا وہ۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے بچہ انسانی تہذیب میں گرفتار ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے گذشتہ مشاغل تفریح کو طفل مزاجی پر محمول کرنے لگتا ہے۔ صاف اور سادہ خوشی جو ہمارے ارد گرد کی چیزوں سے دل میں پیدا ہوتی تھی کم ہونے لگتی ہے اور مثل تھیٹر، راگ، رقص، دعوت، دوڑ، شطرنج اور دوسرے تہذیبی ناقابل بیان دکلفانہ مشاغل تفریح میں خوشی پانے لگتے ہیں۔ جب تک ہماری رگوں میں سرخ خون دوڑتا رہتا ہے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی انکا پیچھا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ ضعیفی آجاتی ہے، گرمی نکل جاتی ہے اور ہم تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ چند مختصر دعاؤں سے کر کے گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھتے ہیں اس امید میں کہ ہمیں دوسرے عالم میں بھی ویسی خوشیاں نصیب ہوں جیسی ہم نے یہاں دیکھی ہیں۔

سب کے سب اندھے راحت طلب ہیں! کیا ہم کبھی اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے انجام پر بھی نظر ڈالتے ہیں جو صرف اس وجہ سے دل خوش کُن ہیں کہ وہ ہمارے جسم کی بعض حس کو گدگداتی ہیں۔ یہ لوگ چندھیانے لگتے ہیں، متعجب ہوتے ہیں، گھبرا جاتے ہیں، پژمردہ ہوجاتے ہیں، اُکتا جاتے ہیں، مگر انھیں کبھی سچا اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ نہ کبھی انکی سچی خوشی کی رگ حرکت میں آتی ہے نہ وہ ہم کو اُبھا سکتے ہیں نہ ہمارے اخلاق درست کرسکتے ہیں۔

"اُٹھتی ہوئی لہروں کی طرف بڑھنا کبھی آرام دہ نہیں ہوسکتا"۔ دماغ پر خواہ مخواہ اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ اُن تمام قدرتی مناظر کے لیے بیکار ہوجاتا ہے جو درحقیقت خوبصورت ہیں، سادہ ہیں، اور خصوصاً ہمارے خوش کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ کس نے ہماری آنکھیں صبح، طلوع آفتاب، دوپہر کی خاموشی، خاموش دریا کے کناروں، میدانوں، درختوں اور انکے کھیتوں، بادِ نسیم، شفق، اور شبِ ماہ کے نظاروں کی طرف سے بند کر دی ہیں، ہوسوئیزر نشین

اور اسکے موجد نے۔ یہ جواب ہے۔ ہم ان پیارے نظاروں کے وقت سوتے رہتے ہیں اور باقی کو "غیر دلچسپ" کہکر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمارا ہندوستان کبھی ورڈسورتھ کی قدر و منزلت نہیں جان سکتا۔ باوجود اس امر کے کہ ہمارے پاس خوبصورت سے خوبصورت سینریوں اور عمدہ سے عمدہ مناظر کی کمی نہیں، پھر بھی ہمارے خیالات شاذونادر اپنی اندرونی جگہ کو چھوڑ کر ان قدرتی مناظر کے دیکھنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو گاڑیاں اور گھوڑے رکھتے ہیں نشست گاہوں اور پارکوں میں جاکر اپنی ضرورت فیشن پوری کر لیتے ہیں۔ اس سے اُنکا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خود عورتوں اور مردوں کو دیکھیں اور دکھائیں۔ انکے پاس درختوں یا گھاس کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کا دل فریب نظارہ دیکھنے کے لیے بہت تھوڑا وقت ہوتا ہے۔ اُنکو نیز جو قسمت یا زحمت کے ذرا بیٹھے ہیں، خوشی کا دروازہ بالکل بند ہوتا ہے۔ انکے پاس ایسی چیزوں کا خیال کرنے کے لیے وقت کم اور قابلیت معدوم ہوتی ہے۔ انکے لیے آفتاب کا طلوع ہونا گویا روزانہ کام کے لیے بلاوا ہے اور شام دن بھر کی مزدوری کے بعد آرام کرنے کے لیے۔ اگر کچھ وقت ملتا بھی ہے تو وہ حقہ وغیرہ پینے اور فضول گفتگو میں ضائع کر دیتے ہیں۔ بعض وقت میں خیال کیا کرتا ہوں کہ آیا ان لوگوں کے دماغ بھی ہے۔ اوقاتِ فرصت بھی ان لوگوں کے لیے راحت و انبساط ہیں جو ذرا سا بھی دماغ رکھتے ہیں۔ اب طالب علموں کو لو۔ ان پر کم از کم نیچر کے کچھ حقوق ہیں کیونکہ وہ اس کی بابت انگریزی کتب کا مطالعہ کرتے وقت کچھ سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ طلبا نیچر سے عجیب بے پروائی اور بے خبری کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک انٹرنس کے طالب علم سے پوچھو کہ "قدرتی سینری سے کیا مطلب ہے؟" اُسنے سینری یا سین کا نام تو یونائیٹڈ الفریڈ کمپنی یا کسی اور تھیٹر میں سنا ہوگا مگر "قدرتی سینری" اُنکے لیے ایک بالکل عجیب بات ہے۔ لفظی معنی تو وہ جانتا ہے لیکن ہزار طالب علموں میں سے ایک بھی اُسکو ادراک نہیں کرتا۔ اُس سے حظ اُٹھانا تو ایک بڑی بات ہے یہی حالت اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو ورڈسورتھ، کولرج، شیلی، کیٹس، براؤننگ اور ٹینی سن کی کتب کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں۔ مطلب سمجھ لیا جاتا ہے اور اسکی ایک تصویر دماغ میں اُتاری جاتی ہے مگر اسکی اصلی تعریف کرنا ایک ہندوستانی طالب علم کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ آنکھیں ہیں لیکن دیکھتی نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ اُنکی ذہانت عجب طور سے اخلاط کے چکر میں گردش کرتی رہتی ہے۔ مثال کے لیے میں اپنے ایک ہم جماعت کا قصہ بیان کرتا ہوں۔ کالرج کی کتاب پڑھتے وقت جب ہم اُن چند اشعار پر پہنچے جو سر پیٹرک اسپنس (**Sir Patrick Spens**) کی زبان سے بیان کیے گئے ہیں:-

"کل میں نے نئے چاند کو دیکھا جو پرانے چاند کے ساتھ ہم آغوش تھا۔" تو اسکا مطلب میرے دوست کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے لیے ہر چاند کی پہلی تاریخ کو یہ ایک عام نظارہ تھا۔ میرے دوست نے جب پروفیسر سے اسکا مطلب دریافت کیا تو اُس نے جواب دیا "یہ کسی شام کو دیکھ لینا"۔ ایسی ایسی عام چیزوں کے مشاہدہ کی کمی ہندوستانی طلبا میں عام ہے۔ وہ اپنے مطالعہ، کھیل اور ہنسی مذاق میں اتنے مستغرق رہتے ہیں کہ انکو اس قسم کی "بیہودگیوں" کے لیے وقت بھی نہیں ملتا۔ سادہ اور عمدہ ترین قسم کی خوشیاں اُن میں معدوم ہیں۔ تنہائی سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ میدان اور دوسرے غیر آباد مقام اُنکے لیے ناقابل برداشت اور بالکل غیر خوش کُن ہیں۔ ان میں سے ایک بھی گنجان درختوں کے نقاب میں سے طلوع ہوتے ہوئے رُخِ آفتاب کا نظارہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، اور نہ کوئی غروب آفتاب کی خوش نظارگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پارک درحقیقت نصف النہار اور چاندنی رات میں نصف شب کے وقت نہایت خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ شہر کے بکثرت آباد حصص بھی رات میں دو تین بجے کے وقت جبکہ ماہتاب کی روشنی پھیکی پڑنی شروع ہو جاتی ہے، قابل دید ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ میرے بیان کرنے پر کہ مختلف پرندوں کے پروں کے نشانات ایک علیحدہ رہنے پر بے حد خوش نما نظر آتے ہیں، احباب نے تحقیر آمیز قہقہہ لگایا تھا۔ ایک دوسری مرتبہ میرے دوست مجھپر افسوس کرنے لگے جب میں نے بیان کیا کہ رات کو میں

اراد تاً میدان میں اس لیے ٹھہر گیا تھا کہ اپنے چاروں طرف گیدڑوں کا شور وغل سنوں۔ تنہا ایک وسیع تاریک میدان میں جانا جس پر ماہ ستمبر کی لانبی لانبی گھاس بچھی ہو، اور وہاں شکار کی تلاش میں کسی درندہ کا دہاڑنا جس سے تمام میدان گونج اٹھے، اسکے بعد ایک گہری خاموشی کا ہر طرف چھا جانا اور کسی ایسی ہی مہیب آواز کے خوف سے گھر کو واپس چلا آنا، ایک طلسمی راحت وانبساط رکھتا ہے۔ دن کے وقت بھی ایسے مقامات میں جانے سے مجکو خوف ہے کہ لوگ نظر حقارت سے دیکھیں گے، لیکن میرے نزدیک یہ خطرات اور ہیبت ناک آوازیں بہ نسبت کسی قومی رفارمر کی آوازوں، یا کسی نئی راہ کے لیے پولیٹیکل چیخ پکار کرنے والوں سے زیادہ بے لوث اور پاک و صاف ہیں۔

اسی طرح اور روزانہ امور میں بھی سادگی صرف اپنے فقدان کی وجہ سے سرفراز ہے۔ ہر امر پر جداگانہ بالتفصیل بحث کرنا طول اور مشکل ہے۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ ان سب پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

لباس میں جتنے زیادہ اور پر تکلف کپڑے، تم استعمال کرو، اتنے ہی زیادہ اپ ٹو ڈیٹ خیال کیے جاؤ گے۔ محض فیشن تمھارے واسطے کافی نہیں یعنی بغیر تکلف اور فیشن کے مجموعہ کے کام نہیں چل سکتا۔

کھانے کا طریقہ اتنا قدیم، صنعتی اور تکلفانہ ہے کہ لفظ صفت "سادہ" اس کے کسی حصہ کے لیے استعمال کیا جانا موجب شرمندگی ہے۔ ہمنے کھانا پکانے کی ایک خود نما فلاسفی بنالی ہے۔

گفتگو کرنا زمانۂ موجودہ کا ایک مشکل ترین ہنر ہے۔ اگر تم کم گفتگو کرو، تو ڈرپوک، عجیب اور ناقابل شمار کیے جاتے ہو۔ اگر زیادہ گفتگو کرتے ہو تو "باتوں کی مشین" "بے لطف"، اور "کتابی" کے خطابات کی عزت حاصل کرتے ہو۔ سادہ گفتگو معیوب سمجھی جاتی ہے۔ جتنا زیادہ تم تخیل کی مدد سے اپنی گفتگو میں نمک مرچ ملا سکو اور جتنے دروغ آمیز فقرے تم شامل کرسکو، اتنے ہی زیادہ پختہ کار اور خوش مزاج مانے جاؤ گے۔

سادے اور سیدھے راستے اب پر خطر ہیں۔ اس طرح رہو کہ ہر آدمی تمھاری نسبت اپنی ایک رائے قائم کرسکے لیکن ان میں ایک بھی درست نہ ہو اسی طرح اگر ہماری عادات سادہ ہیں تو وہ محض مخلوط سمجھے جانیکے قابل ہیں۔

ہمنے "سادگی" کو اپنے پاس سے اتنا دور پھینکدیا ہے جتنا ممکن تھا۔ لیکن ہمیں یہاں بھی اطمینان نہیں۔ بعض اوقات ہم اس سے برے معنی نکالتے ہیں۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ "سادہ لوح" کے کیا معنی ہیں۔

سویلیزیشن نے سادگی کو یہ جگہ دی ہے۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ کیونکر واقع ہوا۔ جوں جوں دنیا یا انسان ترقی کرتا جاتا ہے سادگی تکلف میں مخلوط ہوتی جاتی ہے۔ کچھ بھی ہو مگر میں تو یہی کہوں گا کہ یہ ناروا اور نادرست ہے۔ ہمارے دماغوں کی کشادگی مفقود ہوگئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ روزمرہ کی باتیں دماغ پر اپنا اثر نہیں چھوڑتیں۔ میں آج کل کے آدمیوں کو خیال کرتا ہوں گویا وہ دو بڑے پیمانوں کے سامنے کھڑے ہیں اور محنت سے بنائی ہوئی مہذب ضروریات زندگی کا پلہ برابر کرنا چاہتے ہیں جس کا برابر اور کم کرنا ان کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ اوزان جانتے ہیں جن کو کبھی ادھر کبھی ادھر رکھتے ہیں، ڈنڈی کو دیکھتے ہیں، مگر اطمینان نہیں ہوتا۔ بے فائدہ چاروں طرف نظر ڈالتے ہیں، خود کو ترازو کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں، پھر بھی وزن برابر نہیں ہوتا۔ اگر میں کسی ایسے کام پر مقرر کیا جاتا تو میں بجائے بٹوں کے پودے، گھاس، پتے، پانی اور دوسری بہت سی سادہ چیزیں ڈالتا اور مثل مشہور شہنشاہ روم کے ایک باغ کی ناچیز پیداوار کو بادشاہی پر ترجیح دیتا۔

دنیا میں تم سادگی کے ساتھ رہو تو آدھی دنیا پر غالب آجاؤ گے۔ سادہ عادات، سادہ خیالات، سادہ مشاغل تفریح، سادہ تلذذات سادہ ضروریات، سادہ عقائد رکھو۔ دنیا مع اپنے زریں تکلف کے تم پر کچھ اثر نہ ڈال سکے گی۔ ایک مرتبہ اور یاد رکھو کہ "سادگی نیچر پر حکومت کرتی ہے اور تکلف ترقی پر"۔ اب اس بات کا فیصلہ تمھارے اوپر ہے کہ تم کس کے مقلد بننا پسند کرتے ہو۔ مترجمہ محمد ابراہیم خاں تجلی

العصر

زمین کی حرکتِ محوری کے بعض اہم نتائج

سائنس نے مدت ہائے دراز تک "قدرت" کے حضور مین جبین نیاز رگڑنے کے بعد آخر یہ حق حاصل کر لیا کہ اب اس کے نام لیوا "قدرت" کے عالیشان مظاہر کے قدیم اور سربستہ راز ایک محوِ حیرت عالم کے سامنے وثوق کے ساتھ بیان کر سکتے ہین۔ سائنس کی دوربینی واقعات ماضی کے علل اور اسباب کی گتھی سُلجھانے مین جس حد تک کامیاب ہو چکی ہو ہم اُمید کرتے ہین کہ ہمارے ناظرین اُس کا کسی قدر اندازہ موجودہ مضمون کے مطالعے سے فرما سکین گے ؎

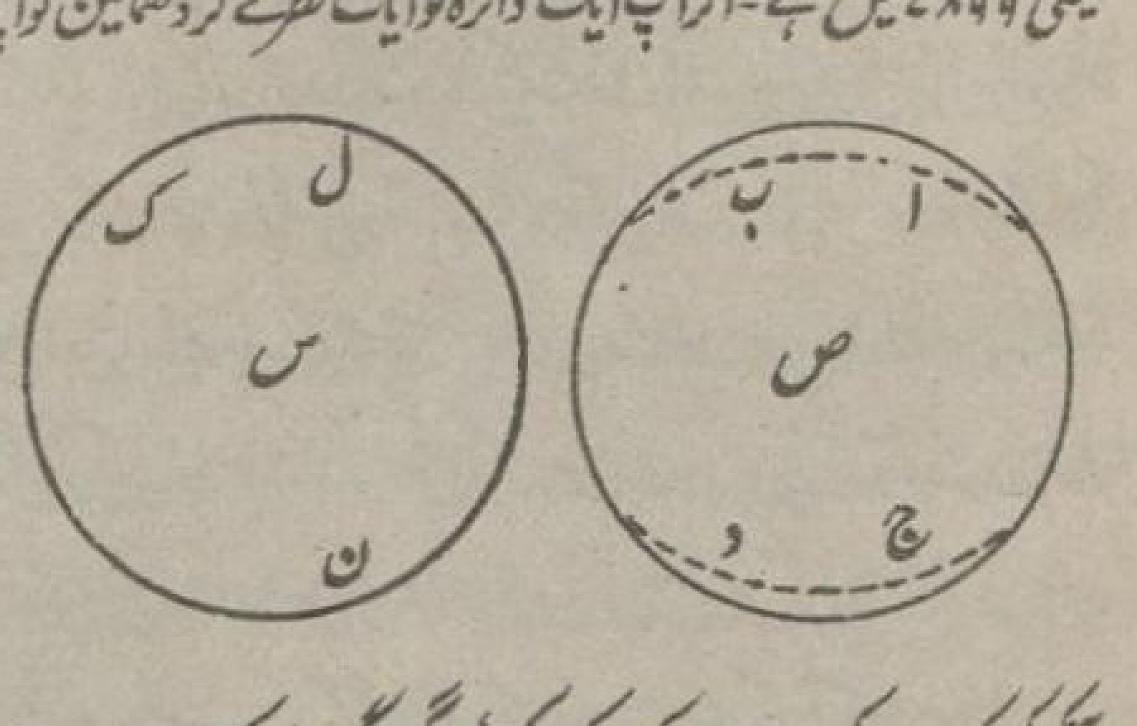
خدا دے دوربینی اور اِس چشمِ تصور کو
کہ لاکھون کام اِس سے دور کے بے دوربین نکلے

زمین کی محوری حرکت کے متعلق ہم اپنے گذشتہ دو مضامین مین شرح و بسط کے ساتھ بحث کر چکے ہین۔ پہلے مضمون مین ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ زمین کی حرکت اور دیگر تمام اجرام فلکی کی حرکت فقط ایک عالمگیر قانون کے تابع ہو اور دوسرے مضمون مین ہم نے زمین کی محوری حرکت کے ثبوت ہونے کو تین مختلف دلائل سے ثابت کیا تھا۔ موجودہ مضمون اس سلسلہ کا آخری اور سب سے ضروری حصہ ہے پہلے دو مضمون ایک حد تک اس کا دیباچہ تھے۔

اگر ہم زمین کی محوری حرکت کے جملہ نتائج محض ایک فہرست کی شکل مین یہان درج کر دین تو شاید بعض سطحی نگاہ والے اِس طرزِ عمل سے بہت محظوظ ہون گے لیکن علمی نقطۂ خیال سے یہ کوئی احسن طریقہ نہ ہوگا۔ سائنس سے واقفیت پیدا کرنا صرف معلومات مین اضافہ کرنے کا نام نہین ہے بلکہ اصلی اور حقیقی مقصد سائنس کی تعلیم کا دلون مین ایک علمی صلاحیت پیدا کرنا ہو۔ سائنس کا اولین خاصہ یہ ہے کہ اس مین کوئی بات تحکم سے نہین قبول کرائی جاتی بلکہ ہر بیان کے لیے ایسی معقول و قابل پذیرائی دلائل پیش کی جاتی ہین جن کے حسن و قبح پر بحث کرنا ہر سمجھ دار کا فرض ہونا چاہیے۔ علمی تحقیقات کا کوئی شعبہ کسی خاص جماعت کے لیے مختص نہین ہو بلکہ جو کوئی اپنے آپ کو انہی حالات مین رکھ سکے جن مین دوسرے سائنس دانون نے اپنے تئین رکھا ہو اس پر وہی حقائق منکشف ہو سکتے ہین جو دوسرون پر منکشف ہو چکے ہین۔ اگر ایک خاص تجربہ یا مشاہدہ

ایک آدمی کرسکتا ہی تو ادنی سے ادنی آدمی بھی اس کے کرنے پر قادر ہو سکتا ہی۔سائنس مین استثنائی حالتین شاذ کا حکم رکھتی ہین۔

مختلف دلائل اور مشاہدات کی بنا پر یہ بات یقینی طور پر مانی جاتی ہی کہ مرکز سے زمین کی سطح کا فاصلہ مختلف مقامات پر مختلف ہی۔ہمارا اشارہ یہان سمندر اور پہاڑون کے نشیب و فراز کی طرف نہین بلکہ اس تدریجی اختلاف کی طرف ہی جسکی بدولت زمین کا نصف قطر خط استوا سے شروع ہوکر قطبین کی طرف کم ہوتا جاتا ہی[1]۔دوسرے الفاظ مین اس اختلاف کو یون بیان کرسکتے ہین کہ زمین کی شکل ایک کرہ (Sphere) کی سی نہین ہی جسکی سطح کا فاصلہ مرکز سے ہر جگہ برابر ہوتا ہی بلکہ اسکی شکل "شبہ کرہ" یعنی سفیرائڈ (Spheroid) کی سی ہی جو کرہ کو کسی قطر کے سرون پر نیچے کی طرف دبا دینے سے پیدا ہوتی ہی۔زمین قطبین پر چپٹی ہی اور خط استوا پر سے اُبھری ہوئی ہی۔قطبین کا فاصلہ مرکز سے بہ نسبت خط استوا کے تقریباً۱۴ میل کم ہی۔استوائی قطر ۷۹۲۶ میل لمبا ہی اور قطبی قطر اس سے ۲۷ میل کم یعنی ۷۸۹۹ میل ہے۔اگر آپ ایک دائرہ کو ایک قطر کے گرد گھمائین تو آپکو



آنکھ کی کمزوری کی وجہ سے ایک کرہ دکھائی دیگی۔اگر دائرہ کو اب اور ج د کیطرح ذرا سیدھا کر دین اور پھر گھمائین تو شبہ کرہ کی سی شکل دکھائی دے گی۔یہ ثابت کرنا کہ فی الاصل قطبی اور استوائی قطر مین ۲۸ میل کا فرق ہی ہمارے مبحث سے خارج ہی لیکن ہم یہان چند اُمور کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہین جن سے اس امر کا پتہ چلتا ہی کہ قطبی قطر استوائی قطر سے کم لمبا ہی یا یہ کہ زمین سنگترے کیطرح وسط مین اُبھری ہوئی ہی اور شمالی جنوبی سرون پر چپٹی ہی۔قانون تجاذب مادی کے مطابق زمین کی کشش کسی مقام پر اسی تناسب سے کم ہوتی ہی جس تناسب سے اس مقام کے مرکزی بعد کا فاصلہ بڑھتا ہی۔لہذا اگر اس کشش کا اندازہ سطح زمین کے اوپر جگہ بہ جگہ استوا سے لیکر قطبین تک کیا جائے تو زمین کی شکل کے متعلق مفید مطلب معلومات بہم پہنچ سکتے ہین۔اس کشش کا اندازہ ہم تین طریقون سے کرسکتے ہین

(۱) زمین کی کشش ایک گرنے والے جسم مین تقریباً ۳۲ فٹ یا ۹۸۱ سنٹی میٹر[2] فی ثانیہ فی ثانیہ کا اسراع[3] پیدا کرتی ہی۔اس اسراع کا معیار کئی طریقون سے ہو سکتا ہی۔متعدد مقامات پر تجربات کا نتیجہ یہ ہی کہ اسراع کی مقدار سب جگہ یکسان نہین ہی بلکہ خط استوا پر ۹۷۸ اور قطبین کے قریب ۹۸۱ سنٹی میٹر فی ثانیہ فی ثانیہ ہے۔

(۲) اسراع کا اندازہ پنڈولم (Pendulum)[4] کے ذریعے سے بھی ہو سکتا ہی۔اگر ایک پنڈولم کی لمبائی مین کوئی تبدیلی نہ کی جائے تو اسکے اِدھر سے اُدھر تک ایک دفعہ حرکت کرنے کا وقت اسی تناسب سے گھٹتا بڑھتا ہی جس تناسب سے زمین کی کشش کے اسراع کا وقت بڑھتا گھٹتا ہی۔اگر کسی مقام پر ایک خاص لمبائی کے پنڈولم کا نوبتی وقت (Period of Vibration یا Periodic Time)

---

[1] ہم کسی دوسری جگہ ذکر کرآئے ہین کہ زمین کے محور کے شمالی اور جنوبی سرون کو قطبین کہتے ہین اور ان کے عین وسط مین زمین کے گرد ایک محیط خط کا نام خط استوا ہے۔

[2] فرانس اور یورپ مین لمبائی کا پیمانہ میٹر (Metre) ہی۔ایک میٹر مین سو سنٹی میٹر (Centimetre) ہوتے ہین۔ایک انچ $2\frac{1}{2}$ سنٹی میٹر یا زیادہ صحیح طور پر ۲٫۵۴ سنٹی میٹر کے برابر ہوتا ہی۔[3] اسراع کے متعلق "حرکت کا پہلا قانون" دیکھیے جو العصر بابت ماہ جون سنہ ۱۹۱۳ء مین شائع ہوا ہی۔[4] اگر ایک بھاری جسم کو ایک تار دھاگے کے کنارے پر باندھ کر کسی مضبوط جگہ لٹکادین تو رسّی اور بھاری جسم کے مجموعہ کو پنڈولم کہتے ہین۔پنڈولم کی لمبائی بھاری جسم کے مرکز ثقل سے لیکر اس نقطہ تک ہوتی ہے جہان رسی باندھی جاتی ہے۔

فرض کیجیے کہ دو ثانیہ ہی تو کسی دوسرے مقام پر جہان زمینی کشش کا اسراع کم ہی وہان نوبتی وقت دو ثانیہ سے زائد ہوگا جس کا اندازہ دونون مقامات پر سو یا ہزار نوبتی حرکتون کا وقت معلوم کرنیسے نہایت درستی کے ساتھ ہو سکتا ہی۔ سطح زمین کے اوپر استوا سے قطبین کے قریب تک پنڈولم کے ساتھ زمین کی پیمائش اب کی جا چکی ہی اور تمام تحقیقات کا نتیجہ یہ ہی کہ تدریجی طور پر ع کی مقدار استوا سے قطبین تک بڑھتی چلی جاتی ہی۔ اب جیسا کہ ہم شق اول مین ذکر کر چکے ہین اس کا سبب مرکز سے سطح زمین کے بعد کا اختلاف ہی عملی طور پر پنڈولم پر مرکز کے قرب و بعد کا اثر بڑی گھڑیون کی حالت مین خوب نمایان ہوتا ہی۔ اگر ایک گھڑی استوا پر ٹھیک وقت دیتی ہی تو قطبین کی طرف لیجانیسے وہ تیز ہو جائیگی یعنی اس گھڑی کے مطابق ایک ثانیہ دو دفعہ ٹک ٹک کی میعاد کم ہو جائیگی اور اس لیے ایک دن رات مین اس گھڑی کے مطابق ۶۰×۶۰×۲۴ ثانیہ سے زیادہ دفعہ ٹک ٹک ہوگی۔ اسطرح جو گھڑی استوا شمال یا جنوب مین صحیح وقت دیتی ہی وہ استوا کی طرف لیجانیسے سست ہو جاتی ہی۔

(۳) مختلف اجسام مین مادہ کی مقدار ایک چیز ہی اور ان کا وزن دوسری چیز۔ مادہ کی مقدار مین سطح زمین سے مرکز کے قریب یا بعید ہونیکا کوئی اثر نہین پڑتا لیکن بوجھ پر اثر پڑتا ہی۔ بوجھ فی الاصل اس طاقت کا نام ہے جس طاقت سے زمین اس جسم کو اپنی طرف کھینچتی ہی۔ ہم دیکھ چکے ہین کہ زمین کی کشش پر فاصلہ کا اثر ہوتا ہی اس لیے اگر ہم ایک بھاری بوجھ کو ایک اسپرنگ بیلنس (Spring Balance) کے کہنے سے لٹکا کر استوا سے قطبین کی طرف لیجائین تو چونکہ زمین کی کشش بڑھتی جائیگی اس لیے اس جسم کا وزن بھی بڑھتا جائیگا۔ بوجھ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے آپ فرض کیجیے کہ وہ جسم چاند کی سطح پر واقع ہی۔ چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا ہی اس لیے اس کی کشش بھی زمین سے بہت کم ہی۔ نتیجہ یہ ہی کہ چاند کی سطح پر چیزون کا بوجھ زمین کی نسبت کئی درجہ کم ہی حالانکہ مقدار مادہ دونون جگہ ایک ہی۔ زمین اور چاند کے درمیان فضا مین ایک ایسا مقام ہی جہان چاند کی کشش زمین کی کشش کے برابر ہی۔ اس مقام پر زمین کے بھاری سے بھاری جسم کا بوجھ کچھ نہین ہوگا۔ اگر ایک بچہ وہان پہنچ سکے تو وہ بھی اسے بآسانی اُٹھا سکے گا برعکس اس کے آفتاب کی سطح پر چیزون کا بوجھ اس کی کشش کی افزونی کی بدولت اس قدر زیادہ ہی کہ وہان ہماری طاقت کے انسانون سے بوجھ کے مارے اپنے اعضا بھی نہین ہلائے جا سکین گے۔

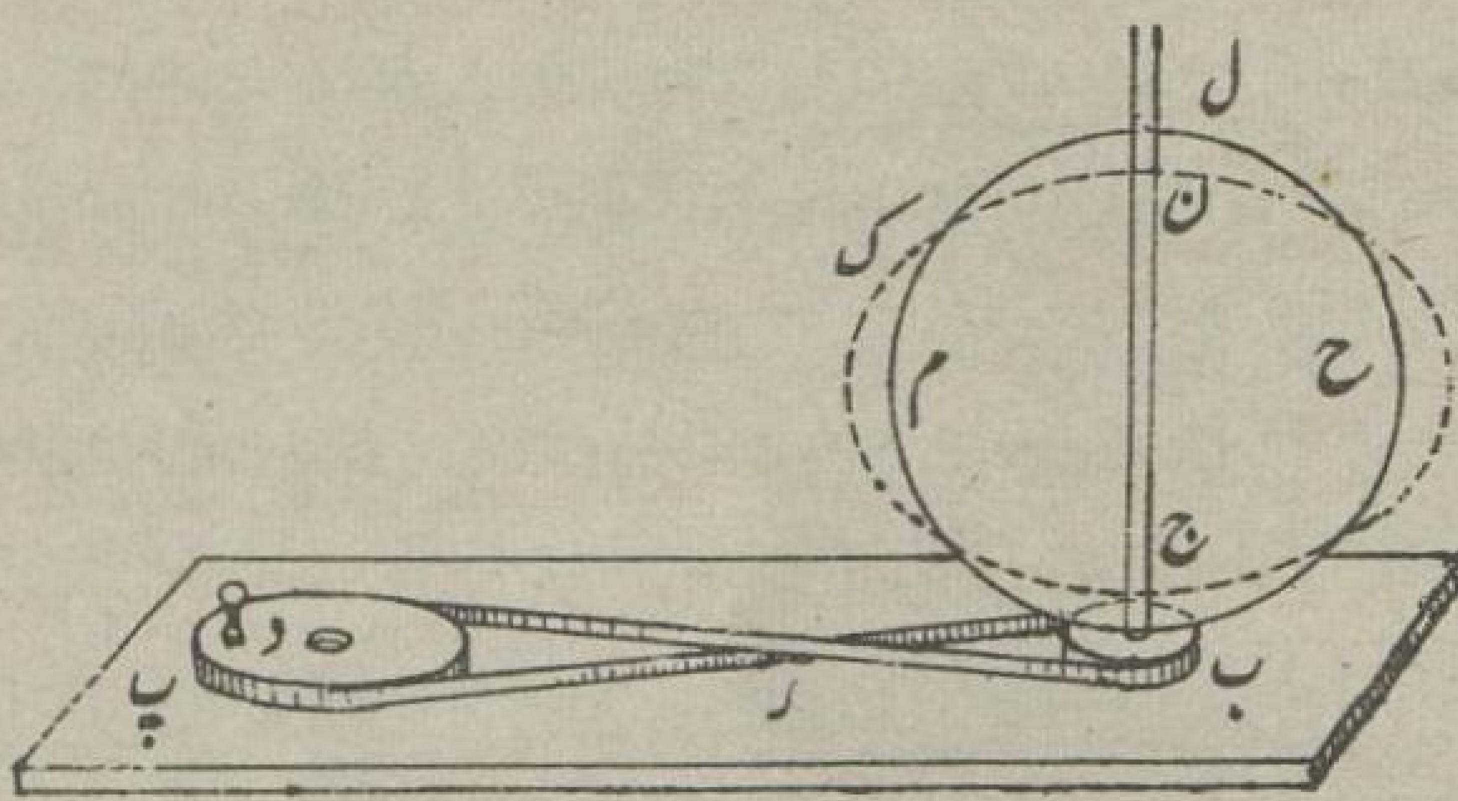
اس استدلال سے یہ امر بوضاحت ثابت ہوتا ہی کہ زمین کا استوائی محیط قطبی محیط کی بہ نسبت بڑا ہی یعنی زمین کی شکل سنگترے کی طرح ایک اُبلیٹ سفرائیڈ[2] کی سی ہی۔ زمین کی اس مخصوص شکل اور محوری حرکت کے درمیان کسی قسم کا واسطہ دریافت کرنے کے لیے دو آسان تجربے بہت مدد دینگے۔ اگر آپ ربڑ کے ایک باریک مجوف کرہ مثلاً ایک فٹ بال مین کوئی سیال مادہ مثلاً پانی بھر کر اسکے مُنھ کو لمبی رسّی سے باندھ کر ہاتھ سے گھمائین تو وہ کرہ لیمون کی طرح لمبوترا سا ہو جائے گا جسے اصطلاح مین پرولیٹ سفرائیڈ[3] کہتے ہین۔ بالفاظ دیگر اگر ایک نرم کرہ کا گردشی مرکز اس کے باہر واقع ہو تو وہ کرہ ایک ایسا شبہ کرہ بن جاتا ہی جس کی لمبائی لیمون کی طرح اس کی چوڑائی سے زیادہ ہوتی ہی، برعکس اسکے اگر گردشی مرکز اس جسم کے مرکز ثقل سے علیحدہ نہ ہو تو وہ جسم گردش کرتے ہوئے سنگترہ کی طرح طول مین چپٹا ہو جاتا ہی تیل کے چند قطرے پانی مین ڈال کر انھین گردش دیجیے۔ آپ دیکھین گے کہ وہ جس محور کے گرد گھوم رہے ہونگے اس کی سمت مین سکڑ جائین گے اور اس کے

---

[1] پنڈولم کی حرکت کے کل قوانین الجبری طریقہ تحریر کے مطابق اسطرح ظاہر کیے جا سکتے ہین۔ اگر نوبتی وقت ت ثانیہ ہو لمبائی ل انچ ہو اور زمینی کشش کا اسراع ع انچ فی ثانیہ ہو تو نتیجہ ت = ۲۲ $\sqrt{ل/ع}$ ہوگا۔ اس مساوات مین ۲۲ ایک یونانی لفظ پائی π دائرہ کے محیط اور قطر کے تناسب کے لیے اشارہ ہی۔ ۲۲ کی مقدار بالکل صحیح طور پر معلوم کر لینا ناممکنات مین سے ہی لیکن تخمیناً ۲۲/۷ یا زیادہ صحیح طور پر ۳.۱۴۱۶ کے برابر ہے۔

[2] ایک ایسا شبہ کرہ جو لمبائی مین چوڑائی سے کم ہو۔ [3] ایک ایسا شبہ کرہ جس کی لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہو۔

مقابل کی سمت مین زیادہ لمبے ہو جائین گے۔ تجربۃً ہم ایک سیدھے سادے آلہ کے ساتھ محوری حرکت اور قطبی کھنچاؤ کے تعلق کا مطالعہ اسطرح کر سکتے ہین کہ ایک رسی ر کے ذریعے سے ایک چھوٹا سا پہیہ ب ایک بڑے پہیہ پ کے دستی د کو پکڑ کر ہلانے سے نہایت تیزی کے ساتھ گھمایا جاسکتا ہے۔



ایک عمودی محور ل ن ج کے گرد تارون کا بنا ہوا ایک کرہ ل م ح ہو۔ اَب اگر بڑے پہیہ کے ہلانے سے اس زم کرہ کو گردش دیجائے تو کرہ کی شکل چپٹی یعنی شکل گ ن ک کیطرح ہو جاتی ہو۔ جتنا تیز اس کرہ کو گھمایا جائیگا اُتنا ہی زیادہ یہ کرہ چپٹا ہوتا جائیگا۔ لیکن یاد رہے کہ ہر ایک جسم ایک خاص مقدار سے زیادہ تیز حرکت کے ساتھ نہین گھمایا جا سکتا اگر ایسا کیا جاے تو وہ ٹوٹ جاتا ہو۔ اگر کمہار اپنے مٹی کے چاک کو زیادہ تیزی سے گھمائے تو چاک ریزہ ریزہ ہو جاتا ہو۔ اِن تجارب کی بناء پر یعنی زمین کے چپٹا ہونے اور نیز زمین کی حرکت محوری سے ہم ایک نئے نتیجے پر پہنچتے ہین کہ قدیم زمانے مین زمین زم تھی یعنی زمانۂ حال کیطرح ٹھوس اور سخت نہین تھی لیکن پیشتر اسکے کہ ہم گذشتہ زمانے مین زمین کے زم ہونے کو دلائل سے ثابت کرین یہ دیکھنا چاہیئے کہ موجودہ زمانے مین زمین کی محوری حرکت کا اثر سطح زمین کے اوپر کیا ہو رہا ہو۔

مذکورۂ بالا تجربہ مین آپ نے دیکھا ہو کہ کرہ ل م ح کی شکل محوری گردش کی وجہ سے گ ن ک کی سی ہو گئی ہو۔ اَب فرض کیجیے کہ یہ کرہ چھوٹے پیمانہ پر زمین کے بالکل مشابہ ہو یعنی اسکی سطح پر کسی طرح سے پانی کی ایک گہری تہ ہو۔ حرکت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پانی قطبین سے دوڑ کر استوار کے قریب زیادہ مقدار مین جمع ہو جائیگا پہلے تمام کرہ کے گرد پانی کی یکسان گہری تہ تھی مگر اَب قطبین کے اوپر کم پانی رہ گیا ہو اور پانی کا زیادہ حصہ شمال او جنوب کی سمت سے حرکت کی بدولت استوائی محیط پر جمع ہو گیا ہو۔ پانی کی حرکت زیادہ تیز ہوتی ہو لیکن اگر اس کرہ کے اوپر خاک مٹی بھی رکھی ہو تو وہ آہستہ آہستہ قطبین سے استوار کی طرف منتقل ہو جائیگی گو یا کہ محوری حرکت کا ایک نتیجہ یہ ہو کہ پانی اور مٹی قطبین سے استوار کی طرف منتقل ہو گئے ہین۔ بعینہ یہی حال ہماری زمین کا ہو۔ اگر اس وقت کسی وجہ سے زمین کی محوری حرکت یک لخت بند ہو جائے تو ایک تحریک منعکس فوراً شروع ہو جائے گی۔ جس طرح پانی اور مٹی کے انبار قطبین سے استوار کی طرف منتقل ہوے تھے اِسی طرح استوار سے قطبین کی طرف منتقل ہو جائین۔ کرہ زمین کے شمالی او رجنوبی حصو نمین پانی کا ایک عظیم الشان سیلاب آے۔ جنوبی امریکہ، سائبیریا، اور یورپ، پانی کے نیچے غرق ہو جائین، اور استوائی حصون مین سمندر کا بہت سا حصہ خشک زمین بن جائے۔ وسط امریکہ اور لنکا سمندر کی سطح سے، میل اونچی سطح مرتفع کی طرح اوپر نکل آئین اور خلیج بنگال کا بہت سا حصہ بالکل خشک ہو جائے۔ لیکن اس انتہائی مثال کو چھوڑ کر ہم یہان محوری حرکت کی ذرا سی کمی بیشی کے نتائج پر غور کرتے ہین۔ ہم نے اپنے ایک مضمون مین یہ ثابت کیا ہو کہ زمین کی حرکت فی الواقع سُست ہو رہی ہو گو یا پہلے زمانون مین دن رات چوبیس گھنٹہ لمبا

ہونے کے بجائے ۲۴ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی کم لمبے ہونگے اور آیندہ زمانون مین ۲۵ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی زیادہ لمبے ہونگے۔

آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ مختلف پہاڑون مین کیا فرق ہے؟ زمین کی سطح پر کی جھڑیون کا نام پہاڑ ہے لیکن ان جھڑیون کا آغاز کیسے ہوا۔ دو وجوہ بیان کی جاتی ہین۔ پہلی وجہ کا بیان زمین کی اندرونی حرارت کے ذکر مین آجائیگا، لیکن اگر محوری حرکت کے سُست ہونے کو مدنظر رکھا جائے تو دوسری وجہ سمجھ مین آسکتی ہے۔ عالمانِ ارضیات کا قیاس ہے کہ بندھیاچل پہاڑ کوہ ہمالیہ کے سلسلے سے زیادہ پُرانا ہے۔ اس پر تعجب نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ان پہاڑون کی ساخت دو جُداگانہ طریقون سے ہوئی ہے جن مین سے ایک کا عمل دوسرے سے بہت پیچھے شروع ہوا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آج سے تیس کروڑ برس پہلے زمین کی ایک گردش ۲۴ کے بجائے ۲۳ گھنٹہ مین ختم ہوتی تھی۔ آپ اوپر کے تجربون مین دیکھ چکے ہین کہ گردش کی تیزی کے ساتھ قطبی اور استوائی قطر کا فرق بڑھتا جاتا ہے جس کا مطلب زمین کی حالت مین یہ ہے کہ استوار کے گرد پانی کی تہ قطبین کی نسبت گہری ہوتی جاتی ہے جب زمین کی گردش ۲۳ گھنٹہ مین ہوتی تھی تو پانی کی سطح استوار کے گرد اتنی اونچی تھی کہ بندھیاچل کا بہت سا حصہ پانی کے نیچے غرق تھا۔ آج سے تیس کروڑ برس پہلے کوئی بندھیاچل نہین تھا، اس لیے بندھیاچل کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس کروڑ برس ہے اور ہمالیہ وغیرہ کی اس سے بھی کم ہے۔ زمین کی محوری حرکت مین نہ صرف ایک گھنٹہ کی کمی سے بلکہ ایک منٹ اور اس سے بھی کم مقدار کی کمی سے ایسے حیرت انگیز نتائج مرتب ہوتے ہین کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آج سے تقریباً سو صدی پہلے زمین کی ایک گردش ۲۳ گھنٹہ ۵۹ منٹ مین ختم ہوتی تھی۔ اُس وقت کلکتہ سطح سمندر کے نیچے تھا اور اس سے پہلے جبکہ ایک گردش ۲۳ گھنٹہ ۵۰ منٹ مین ختم ہوتی تھی الہ آباد ساحل سمندر پر واقع تھا۔

دُنیا مین ہم دو قسم کی تبدیلیان دیکھتے ہین۔ ایک تو نوبتی جو ایک عرصہ تک ایک سمت مین بڑھ کر پھر اُتنے ہی عرصہ تک گھٹتی ہین اور جب پہلے کی سی حالت دوبارہ ہوتی ہے تو پھر ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ موسمون کی تبدیلی ایک نوبتی تبدیلی ہے۔ اسی طرح زمین کے محور کی سمت بدلتی رہتی ہے لیکن یہ تبدیلی ہمیشہ ایک ہی سمت مین نہین ہوتی بلکہ ۲۶ ہزار برس کے بعد زمین کے محور کی سمت پھر وہی ہو جاتی ہے اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی تبدیلیان وہ ہین جو ہمیشہ بغیر کسی قسم کے انقطاع کے قدیم سے لیکر آج تک ایک ہی سمت مین بڑھتی یا گھٹتی چلی آئی ہین اور جو آئندہ بھی اسی نہج پر جاری رہین گی۔ ایسی تبدیلیون کے نتائج نہایت ہی اعلیٰ درجے کے مہتم بالشان ہوتے ہین۔ ان کی دو مثالین ہمارے مضمون کی جان ہین جنمین سے ایک محوری حرکت کا سُست ہونا ہے۔ جہانتک آپ کا خیال زمانہ ماضی مین پیچھے کی طرف جا سکتا ہے، اسے دوڑایئے اور چشمِ تصور سے دیکھے کہ نہ صرف زمین کی ایک گردش آج سے ۳۰ کروڑ برس پہلے ۲۳ گھنٹہ مین ختم ہوتی تھی بلکہ اس سے بہت پہلے ایک زمانہ ہوگا جب کہ زمین نہایت تیزی کے ساتھ چھ پانچ چار گھنٹون مین ایک گردش ختم کرتی ہوگی، لیکن زمین اتنی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہے تو ہمین ایک دوسرے امر کی طرف متوجہ ہونا لازم ہے۔ زمین بے انتہا تیزی کے ساتھ نہین گھوم سکتی تھی اس لیے کہ اگر ایک مخصوص حد سے تجاوز کرتی تو یہ ریزہ ریزہ ہو جاتی یا کم از کم دو برابر حصون مین منقسم ہو جاتی۔ لہذا ہم اپنے چشمِ تصور کی حد نگاہ وہ قدیم زمانہ[۱] مقرر کرتے ہین جب کہ

---

[۱] زمانہ ماضی کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس مضمون مین کروڑون برس کا ذکر اس طرح کرتے رہے ہین جس طرح روزمرہ کی زندگی مین دنون اور مہینون کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ انسان جس کی عمر ساٹھ برس سے زائد نہین ہوتی اتنے لمبے عرصے کا اندازہ آسانی سے نہین لگا سکتا بلکہ شروع مین سرے سے ان کا انکار کر دیتا ہے۔ میزانِ ہستی مین ادنیٰ ترین جانور جن کی حیات مستعار گھنٹون اور دنون سے تجاوز نہین ہوتی ان کے لیے انسانی زندگی اسی تناسب سے بڑی ہے جس تناسب سے ارضیات کے طبقات انسان کے لیے بڑے ہین جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ زمین کا بعد سورج سے ۹ کروڑ میل ہے تو انسانی عقل اس فاصلے کے

زمین اپنی انتہائی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہوگی۔ اسوقت سطح زمین کی حالت کیا تھی؛ چاند کہان تھا؟ اِن سوالات کا جواب ہم تھوڑی کے بعد دین گے۔ سردست ہم زمین کی اندرونی حرارت کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرین گے۔

ہم ذکر کر رہے تھے کہ اِن تبدیلیون مین سے جن مین واقعات ہمیشہ ایک ہی طرح پر ہوتے چلے جاتے ہین دو ہمارے مضمون کی جان ہین۔ محوری حرکت کے سُست ہونے کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہین۔ دوسری تبدیلی گرم اجسام کے ٹھنڈا ہونے کے متعلق ہی یعنی زمین کی ذاتی حرارت کا تدریجی لیکن غیر متناہی نقصان۔ آپ لوہے کا ایک گرم گولہ ہوا مین رکھین۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا درجۂ حرارت اردگرد کی ہوا کے برابر ہو جاتا ہی تو گویا اسکی گرمی گرد و پیش کی چیزون مین منتقل ہو گئی ہی۔ حرارت کے اس طریقۂ انتقال کو اصطلاح مین شعاع کہتے ہین جس سے مراد یہ ہی کہ گرمی کی شعاعین گرم بدن سے نکلتے رہنے کی وجہ سے گرم بدن کی گرمی ضائع ہو جاتی ہی۔ اگر آپ لوہے کے گرم گولے کے گرد فلالین کا ٹکڑا یا کوئی اور چیز لپیٹ دین جیسا عام طور پر چاء کی کیتلی پر لپیٹ دیا جاتا ہی تو اس کا درجہ حرارت آہستہ آہستہ کم ہوگا۔ لیکن قابل غور صرف یہ بات ہی کہ نقصان آہستہ ہو یا جلدی آخر شعاع کا اثر ظاہر ہو کے رہتا ہی۔ بے شمار مشاہدات کی بنا پر یہ امر اب مسلمہ ہی کہ زمین بھی آہستہ آہستہ شعاع کے عمل سے ٹھنڈی ہو رہی ہی۔ میرا مطلب اس گرمی کی طرف نہین ہی جو ہمین سورج ہر لمحہ پہنچاتا رہتا ہی بلکہ ہم یہان زمین کی ذاتی گرمی کا ذکر کر رہے ہین۔ یہ سچ ہی کہ اگر آج سورج کی گرمی ہم سے چھین لیجائے تو سطح زمین کا درجہ حرارت وہی ہوگا جو فضائے بسیط کا ہی یعنی پانی کے درجۂ انجماد سے تقریبًا تین سو درجہ نیچے الیکن سطح زمین کے نیچے زمین کا درجہ حرارت جون جون دور چلے جائین بڑھتا چلا جاتا ہی۔ بعض مقامات پر سوا سو فٹ کی گہرائی کے لیے ایک درجۂ فارن ہیٹ کی زیادتی ہوتی ہی لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہین جہان ایک درجۂ فارن ہیٹ کی زیادتی صرف ۳۰ یا ۴۰ فٹ کی گہرائی تک ہو جاتی ہی۔ زمین کی اندرونی حرارت کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہی کہ فی الحال جن جن مقامات پر جو مشاہدات زمینی حرارت کے متعلق کیئے گئے ہین وہان زیادہ سے زیادہ گہرائی تک حرارت کی زیادتی کا پتہ چلتا ہی۔ سطح کے نزدیک سورج کی گرمی زمین کی ذاتی گرمی کے اثر کو ایک حد تک چھپا دیتی ہی کیونکہ دن کے وقت گرمی کی ایک لہر سطح سے نیچے کی طرف جاتی ہی اور رات کو اِس گرمی کا بہت سا حصہ شعاع کے عمل سے زائل ہو جاتا ہی۔ اسی طرح روزانہ لہر کے علاوہ گرمی کی ایک سالانہ لہر زمین کے اندر سرایت کرتی ہی کیونکہ موسم گرما مین دن رات سے بڑے ہوتے ہین اور سردیون مین اس کے برعکس گرمی کی روزانہ لہر کا اثر ۳ یا ۴ فٹ سے زیادہ گہرائی تک نہین ہوتا اسی طرح سالانہ لہر کا اثر تقریبًا ۵۰ فٹ تک ہوتا ہی چنانچہ مقیاس الحرارت

(حاشیہ بقیہ صفحۂ گذشتہ) اندازہ سے عاجز رہ جاتی ہی لیکن اس سے بھی زیادہ جسوقت ہم دریافت کرتے ہین کہ نظام شمسی سے قریب ترین ستارہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہی کہ نور کی لہرین باوجود اتنی تیز رفتاری کے (نور کی رفتار فی ثانیہ تقریبًا ایک لاکھ پچاس ہزار میل ہی) اس ستارے سے ہمارے پاس تین چار سال مین پہنچتی ہی تو یہ فاصلہ جس کے ظاہر کرنے سے ہماری گنتی بالکل قاصر ہی براہ راست کسی طرح ذہن نشین نہین ہو سکتا۔ لیکن اگر آپ ایک ایسے انسان کا تصور کرین جس کا قد معمولی انسانون کے قد سے اُتنا ہی بڑا ہو جتنا ہمارا قد ان چھوٹے چھوٹے کیڑون سے بڑا ہوتا ہے جن کے باعث مختلف بیماریان شروع ہوتی ہین اور جو ہمین بشکل خوردبین کی مدد سے دکھائی دیسکتے ہین تو اس انسان کے لیے یہ فاصلہ چندان تعجب کا موجب نہ ہوگا۔ نظام شمسی کے مختلف افراد کا دورہ اس کے لیے گھنٹون اور دنون کی سیر و سیاحت سے زیادہ وقعت نہ رکھے گا۔ ہمارا مطلب اِس مثال کے بیان سے صرف یہ ہی کہ جب قدیم زمانے کے بہت ہی پہلے کے طبقات کا ذکر کیا جائے تو اُسے اپنی عمر سے مقابلہ کر کے ناممکن خیال نہین کرنا چاہئیے۔ ایک اور بات جس کی طرف ناظرین کی توجہ دلانا یہان ضروری معلوم ہوتا وہ یہ ہی کہ جب اتنی طویل مدت کا ذکر ہوتا ہی جسکی اکائی کروڑون برس ہو تو اس مین اندازہ ہمیشہ تخمینہ کے طور پر لگایا جاتا ہی۔

کے ذریعے سے دیکھا جاتا ہے کہ ۳-۴ فٹ تک زمین کے درجۂ حرارت مین روزانہ تبدیلی ہوتی ہے اور ۵۰-۶۰ فٹ تک سالانہ تبدیلی ہوتی ہے لیکن ۶۰ فٹ کے فاصلے سے پرے زمین کا درجۂ حرارت بالکل یکسان ہوتا ہے۔ ہم ان اُمور کا یہان اس لیے ذکر کرتے ہین کہ ان کے مقابلے سے زمین کے اندر سے باہر آنے والی گرمی کی لہرون کے متعلق کچھ رائے زنی کی جا سکے۔

سورج کی سخت سے سخت گرمی کو روکنے کے لیے زمین کی ایک چھوٹی سی تہ کافی ہے۔ سطح زمین کی اندرونی حرارت نہایت قلیل مقدار مین سطح پر پہنچتی ہے اور شعاع کے عمل سے فضائے بسیط مین ضائع ہو جاتی ہے۔ لارڈ کیلون نے زمین کے موجودہ نقصان حرارت کے معیار سے زمین کی عمر کا اندازہ لگایا ہے۔ اس کا طرزِ عمل گہرائی کے ساتھ درجۂ حرارت کی زیادتی کو معلوم کرنے پر مبنی تھا۔ اگر ایک پتھر کی سل جسکی موٹائی اور رقبہ ہمین معلوم ہو کھولتے ہوئے پانی کے برتن کے منھ پر رکھ دیجائے تو بیرونی ہوا کا درجۂ حرارت جاننے کے بعد ہم حرارت کی کل مقدار جو فی ثانیہ اس سل مین سے باہر کی طرف گذرتی ہے معلوم کر لین گے۔ اسی طرح سطح زمین سے حرارت کے مجموعی سالانہ نقصان کا اندازہ اندر اور باہر کے درجۂ حرارت کی تدریجی تبدیلی معلوم کرنے کے بعد لگایا گیا ہے اور اس اندازہ کی بنا پر اور دیگر معلومات کی مدد سے لارڈ کیلون نے یہ بات ثابت کی ہے کہ زمین کی عمر ۲۰ کروڑ سال سے زائد نہین ہے۔ زمین کی عمر سے مُراد اُس زمانہ کا بعد ہے جبکہ زمین کی سطح پر ایک ٹھوس تہ بننی شروع ہو گئی تھی۔ عالمان ارضیات کا اندازہ زمین کی عمر کے متعلق لارڈ کیلون کے اندازہ سے بہت بڑا ہے لیکن اس موضوع پر مفصل بحث کرنا ہمارے مضمون سے خارج ہے۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انسان نے زمین کے اندر کی حالت کا وسیع مطالعہ نہین کیا۔ زیادہ سے زیادہ تین میل کی گہرائی تک ہماری رسائی ہوئی ہے اور یہ گہرائی ۴۰۰۰ میل کے مقابلے مین صفر کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن اس اعتراض کا جواب قدرت خود دیتی ہے۔ زمین کے اندر سے آتش فشان مادہ کا اخراج خود اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ زمین کی اندرونی حرارت کا درجہ اسقدر بڑھا ہوا ہے کہ وہان سطح زمین پر کی متمرد ٹھوس چیزین بھی مائع اور سیال حالت مین ہین۔ سطح زمین کے تزلزل کا باعث زمین کی اندرونی حرارت ہے اور جون جون اندر کی گرمی کم ہوتی جاتی ہے زمین کی آتش فشانی بھی کم ہوتی جاتی ہے[1]۔ ۲۷ اگست ۱۸۸۳ء کو کراکٹو مین ایک غضب کی آتش فشانی ہوئی تھی جس سے ۳۶ ہزار نفوس سمندر مین بہ گئے تھے اور کئی دن تک سمندر مین اور کرۂ ہوائی مین تلاطم رہا تھا چھوٹے چھوٹے زلزلے آئے دن آتے رہتے ہین۔ اِن سب باتون سے ہم صرف ایک ہی نتیجہ نکال سکتے ہین یعنی یہ کہ زمین کے اندر شدت کی گرمی ہے۔

اب آپ عمل شعاع کے غیر متناہی نتائج پر غور کرین۔ یہ ہو نہین سکتا کہ زمین کے ٹھنڈا ہونے کے متعلق وہ قوانین صحیح نہون جو باقی تمام ٹھنڈا ہونیوالے اجسام پر صادق آتے ہین۔ ہم مانتے ہین کہ فی زماننا زمین کی اندرونی حرارت کا درجہ نہایت آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے یعنی اتنا آہستہ کہ ہم ایک دو صدیون مین اس کا صحیح اندازہ بھی نہین لگا سکتے لیکن اس یقینی امر سے انکار بھی نہین ہو سکتا کہ سطح زمین سے متواتر زمین کی اندرونی حرارت ضائع ہو رہی ہے۔ اگر آپ یہ امر مدِ نظر رکھین کہ سخت سے سخت گرم آگ کی بھٹی کی حرارت ایک دو فٹ موٹی دیوار روک لیتی ہے تو آپ کو زمین کی اندرونی حرارت اور اس کے نہایت آہستہ تدریجی نقصان کا اندازہ اس بات سے

---

[1] خیال کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے مین چاند کی سطح پر حد درجے کی شدید آتش فشانی ہوتی تھی اور اس قیاس کے ثبوت مین سطح چاند پر آتش فشان پہاڑون کے بڑے بڑے منھ (کریٹر Crater) پیش کیے جاتے ہین لیکن چاند کی حرارت بوجہ زمین سے چھوٹا ہونے کے بہت جلدی ضائع ہو گئی ہے اور اب آتش فشانی بھی بند ہے۔ زمین کی اندرونی حرارت کے کم ہونے کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ زمین کا اندرونی حجم کم ہوتا ہے (ایک عام قانون ہے اجسام ٹھنڈا ہونے سے سکڑتے ہین) اور بیرونی سطح مین جُھریان پڑ جاتی ہین کیونکہ چھلکے کا حجم پہ ڈھیلا رہجاتا ہے۔ بہت سے پہاڑون کی جھری دار بناوٹ اِس قیاس کی مصدق ہے۔

ہوجائیگا کہ زمین کی اندرونی حرارت کے روکنے کے لیے اس طبقہ مین ایک بہت موٹی ٹھوس تہ مٹی اور چٹانون کی ہو۔ بہرکیف حرارت ضائع ہو رہی ہو خواہ ہم اسکا صحیح اندازہ نہ لگا سکین لیکن یہ یقینی ہو کہ آج حرارت کی مقدار کل سے کم ہو اور کل پرسون سے کم تھی۔ فرض کیجیے کہ فی سال حرارت کا نقصان صرف اسقدر ہوتا ہو کہ زمین کا اندرونی درجۂ حرارت ایک سال مین ایک سنٹی گریڈ کا دس ہزاروان حصہ کم ہوجاتا ہو۔ اگرچہ ایسا خفیف فرق ہمارے نازک سے نازک آلات کا مُنھ موڑ دیگا لیکن جب نقصان ہزارون لاکھون برس اسی نہج پر ہوتا رہتا ہو تو اسکا اثر محسوس ہونے لگتا ہو۔ آج سے دس ہزار برس قبل زمین کا درجۂ حرارت ایک درجہ سنٹی گریڈ زیادہ ہوگا اور ایک کروڑ برس پہلے اسی حساب سے آج سے ہزار درجہ سنٹی گریڈ زیادہ ہوگا۔ اگر خیال کو وسعت دیجائے تو قدیم زمانہ مین زمین کا درجۂ حرارت اسقدر زیادہ تھا کہ اِس کی سطح پر کی چیزین بھی سب پگھلی ہوئی حالت مین تھین اُسوقت سمندر کا نام و نشان بھی نہ تھا کیونکہ تمام پانی بخارات کی شکل مین تھا۔ پھر ہم اُن طبقات کا خیال کر سکتے ہین جب کہ زمین کے جسم کی تمام اشیا مائع اور سیال ہونے کے بجائے درجۂ حرارت کی زیادتی کی وجہ سے بخارات اور گیس کی حالت مین تھین۔ لیکن یہان ہمارے خیال کی وسعت کو روکنے والی ایک دوسری دلیل موجود ہو۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہین کہ جون جون ہم وقت کے سمندر مین پیچھے ہٹتے جاتے ہین زمین کی محوری حرکت تیز ہوتی جاتی ہو اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہین کہ اگر اس کی رفتار ایک خاص مقدار سے متجاوز ہوجائے تو زمین کی کشش اپنے اجزا کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوستگی کی حالت مین نہین رکھ سکتی۔ لہذا اِن دونون استدلالات کی تطبیق سے ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ جب زمین کی محوری حرکت اتنی تیز تھی کہ دن رات صرف ۳ یا ۴ گھنٹہ کے تھے تو زمین ایک سیال کرہ تھی جس کی سطح پر اُبلتے ہوئے اور پگھلے ہوئے معدنیات اور چٹانین تھین۔

ہمین اس سوال کا حل مل گیا کہ زمین کا قطبی قطر استوائی قطر سے کیون چھوٹا ہو۔ اگر زمین کسی قدیم زمانہ مین سیال نہ ہوتی بلکہ ہمیشہ سے آج کیطرح ٹھوس ہوتی تو اسکی شکل کروی ہوتی۔ نظام شمسی مین زمین کی شکل کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت مشتری (Jupiter) کو ہو جو زمین سے تیرہ سو (۱۳۰۰) گنا بڑا ہو لیکن تعجب کی بات ہو کہ اسکی محوری گردش صرف دس گھنٹہ مین پوری ہوتی ہو۔ اگر بڑی دوربین مین دیکھا جائے تو مشتری صاف طور پر ایک شبہ کرہ کے مشابہ معلوم ہوتا ہو کیونکہ اسکے قطبی اور استوائی قطرون مین بہت نمایان فرق ہو۔ مشتری کی سطح ابھی ٹھوس نہین بلکہ سیال ہو اور یہ ایک مزید تصدیق اس امر کی ہو کہ زمین بھی کسی زمانے مین مشتری کی موجودہ حالت مین تھی۔ چونکہ مشتری بہت بڑا ہو اِس لیے اسکی اندرونی حرارت ابھی ضائع نہین ہوئی۔ گویا ہم زمین کی گذشتہ تاریخ مشتری کی سطح کے مطالعہ سے معلوم کر سکتے ہین۔

اِس سے پہلے مضمون مین زمین کی حرکت کے سُست ہونے کے اسباب بیان کرتے ہوئے ہم نے مدوجزر پر تفصیلی بحث کی تھی۔ ہم نے بتایا تھا کہ نظامِ ارض و قمر مین مدوجزر کی کیا اہمیت ہو۔ مدوجزر کے وسیع علمی مطالعہ سے ایک حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ زمین کے دن، رات اور مہینے بڑھ رہے ہین۔ ہم اِس موضوع پر مفصل بحث نہین کر سکتے لیکن جن حضرات کو مزید معلومات بہم پہنچانے کی خواہش ہو اُن کے لیے سر رابرٹ بال کی چھوٹی سی کتاب ٹائم اینڈ ٹائیڈ (TIME & TIDE) بہتر معاون ہوگی۔ یہ کتاب اِس قابل ہو کہ اس کا ترجمہ اُردو زبان مین کیا جائے لیکن اگر ترجمہ نہ ہوسکے تو کم از کم اس کے اوپر ایک بسیط تبصرہ لکھنے کی اشد ضرورت ہو۔ ہم نے مذکورۂ بالا مضمون مین صرف دن رات بڑھنے کے متعلق بحث کی تھی اور مہینے کے بڑھنے کی بحث کو پس انداز کردیا تھا۔ ہم اِس مضمون مین بھی اِس سے زیادہ اور کچھ لکھنا نہین چاہتے کہ اس طویل بحث کے لیے ایک جداگانہ مفصل مضمون درکار ہو اور اس لیے اب ہم زمین کی محوری حرکت کے رفتہ رفتہ کم ہونے کے نتائج پر غور کرتے ہین۔

اگر دن رات کے ساتھ مہینہ بھی بڑھ رہا ہی تو اس سے چاند کے بُعد کے متعلق یہ حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہی کہ چاند رفتہ رفتہ زمین سے دور ہٹ رہا ہی یعنی اگر موجودہ زمانہ مین چاند کا فاصلہ ۲ لاکھ ۴۰ ہزار میل ہی تو کسی گزشتہ زمانہ مین دو لاکھ ہوگا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ وہی مد وجزر کی طاقت جو زمین کی محوری حرکت سست کر رہی ہی، چاند کی حرکت بھی سست کر رہی ہی۔ چاند زمین کے گرد گھومتا ہی۔ اگر زمین اسے اپنی طرف نہ کھینچتی تو حرکت کے پہلے قانون کے مطابق یہ ایک خط مستقیم مین حرکت کرتا چلا جاتا لیکن ہر لحظہ زمین کی کشش اسے اپنے مرکز کی طرف کھینچ رہی ہی اور اس لیے چاند ایک بین بین راستے پر چل رہا ہی[1]۔ اگر یہ اس راستے سے ہٹ کر زمین کے نزدیک آجائے تو اسکی دوری حرکت کی استقامت کے لیے لازمی ہی کہ اسکی رفتار تیز ہو جائے کیونکہ جتنا تیز یہ چلے گا اتنی ہی کم زمین کی کشش اس پر غالب آئیگی۔ جون جون چاند زمین سے دور ہوتا جاتا ہی مہینے کی لمبائی دو وجوہ سے بڑھتی ہی۔ ایک تو راستے کی زیادتی اور دوسرے رفتار کی سستی۔ مختصر نتیجہ یہ ہی کہ ہر بعد کے لیے چاند ایک خاص رفتار کے ساتھ زمین کے گرد گھومتا ہی جب چاند زمین سے صرف اسی ہزار میل کے فاصلے پر ہوگا تو اُسوقت سمندر کا مد وجزر نہایت شدت سے ہوتا ہوگا۔ چڑھاؤ کے وقت سمندر کی سطح ۱۰۰۰ فٹ اونچی ہوتی ہوگی حالانکہ زمانۂ موجودہ مین اسکی بلندی ۲۰-۳۰ فٹ سے زیادہ ہے۔ جزائر انگلستان سمندر سے صرف ۵۰۰ فٹ بلند ہین۔ اِس حالت مین یہ تمام خطۂ زمین پانی مین غرق رہتا ہوگا۔ اور پھر یہ خیال کیجیے کہ اس زمانے مین دن رات بھی چھوٹے تھے اسلیے پانی کا اُتار چڑھاؤ اور بھی جلدی جلدی ہوتا ہوگا۔ ان تمام مقدمات کا موازنہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ اُسوقت مد وجزر کا اثر زمین کی محوری حرکت کے سست کرنے مین اب سے بہت زیادہ ہوگا۔

اب اگر اس دوربینی کو اور بھی زیادہ وسعت دین تو اُس زمانہ مین جبکہ دن رات صرف ۳-۴ گھنٹہ کا ہوگا چاند زمین کے بہت ہی قریب ہوگا اور مہینہ تقریباً دن کے برابر ہوگا۔ جون جون ہم زمانۂ قدیم مین اور دور چلے جاتے ہین تو مہینہ چھوٹا ہوتا جاتا ہی حتی کہ وہ صرف تین گھنٹہ کا رہ جاتا ہی یعنی چاند زمین کے گرد اتنی حرکت کرتا ہی کہ گردش ۳ گھنٹہ مین پوری ہو جاتی ہی۔ صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہی کہ ایسی حالت مین چاند کی رفتار کیا ہوگی۔ آخر مین ہم اس حیرت انگیز نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ چاند بالکل زمین سے لگا ہوا تھا اور دونون ایک ہی رفتار کے ساتھ حرکت کرتے تھے یعنی چاند فی الاصل زمین کا ایک حصہ تھا اور جب کہ زمین کی محوری حرکت اتنی تیز تھی کہ دن رات تین گھنٹہ کے ہوتے تھے تو زمین کا ایک حصہ کسی حادثہ کی وجہ سے زمین سے علیحدہ ہو گیا اور ہمارا چاند کہلایا۔

شروع مین جب چاند زمین سے علیحدہ ہوا تو چاند اور زمین دونون سیال اور آگ سے زیادہ گرم تھے۔ چاند کی علیحدگی کے بعد فی الفور مد وجزر کا وہ لمبا سلسلہ شروع ہوا جس سے رفتہ رفتہ چاند زمین سے دور اور دن رات لمبے ہوتے گئے۔ جب چاند زمین سے بالکل قریب تھا اور زمین کی تمام سطح سیال ادون کی تلاطم گاہ بنی ہوئی تھی اُسوقت مد وجزر نہایت شد و مد سے ہوتے ہونگے اور ان کا اثر بھی اسی تناسب سے زیادہ ہوتا ہوگا۔ مد وجزر کا اثر چاند پر یہ ہوا کہ چاند کی محوری گردش کا نوبتی وقت یعنی چاند کا دن چاند کی دوری گردش کے نوبتی وقت کے برابر ہو گیا ہی اور اب ہم صرف چاند کا ایک رُخ دیکھتے ہین لیکن چاند متواتر اپنی کشش سے زمین کی محوری حرکت سست کر رہا ہی۔ اور اگر ہم گذشتہ سے آئندہ کروڑون برس گذرنے کے بعد کا منظر اپنی آنکھون کے سامنے لاسکین تو ہم زمین کا دن اور مہینہ برابر یکسان مدت کا پائینگے۔ جب یہ دن آئیگا ہمارا دن ۱۴۰۰ گھنٹہ یعنی اسوقت کے ۵۸ دن کے برابر لمبا ہوگا اور مہینہ بھی اسی تناسب سے لمبا ہوگا۔ اُسوقت چاند کی طرح زمین بھی چاند کی طرف ہمیشہ ایک ہی رُخ کرے گی اور دونون

[1] اگر چاند کی خط مستقیمی حرکت بند ہو جائے تو یہ فوراً زمین کی طرف گرنا شروع ہو جائے اور اپنے موجودہ فاصلہ سے ۴-۵ دن مین زمین سے ٹکرا جائے۔

اسطرح حرکت کریگے جسطرح دو جسم ایک لکڑی کے دونون سرون پر باندھ کر گھمائے جاتے ہین۔ لیکن یہ بھی آخری منزل نہ ہوگی۔

ہم ذکر کر چکے ہین کہ سورج کی کشش سے بھی مد و جزر پیدا ہوتے ہین لیکن ان کی مقدار چاند کے مد و جزر سے نصف کے قریب کم ہوتی ہی۔ لیکن یہ شمسی مد و جزر خواہ کتنے ہی کم ہون ان کا اثر ہمیشہ ایک ہی سمت مین عمل کرتا ہی پس نتیجہ یہ ہوگا کہ دن بڑھتے بڑھتے سال کے برابر ہوتا جائیگا یعنی دن مہینے سے لمبا ہو جائیگا۔ بالفاظ دیگر چاند ایک دن رات مین ایک سے زیادہ دفعہ طلوع کیا کریگا اور ایک ہی دن رات مین ہلال سے بدر بنکر پھر ہلال کی شکل مین نمودار ہوگا۔ آخری حالت نہایت خطرناک ہوگی۔ چاند رفتہ رفتہ جس طرح زمین سے دور ہٹتا گیا تھا اسی طرح زمین کیطرف چکر کاٹتا ہوا آئے گا (دیکھو شکل[۱]) اور بالآخر نہایت زور کے ساتھ زمین کے اوپر گر پڑیگا اور اگر اس سے پہلے کسی اور طریقہ سے زمین کا خاتمہ نہ ہو چکا ہو تو شاید دُنیا کی موت اسی طریقے سے ہو۔ گویا زمین کا بچہ جس سے اب زمین متمتع ہو رہی ہی انجام کار زمین کی تباہی کا باعث ہوگا۔



جو مختصر سا خاکہ ہم نے زمین کی گذشتہ اور آئندہ تاریخ کا ناظرین کے سامنے پیش کیا ہی وہ اس قدر نادر اور عجیب ہی کہ طبیعت اس کے ماننے سے گریزان ہوتی ہی لیکن نظام شمسی ہی مین یہ آخری نظارہ مریخ (Mars) کیحالت مین ہمارے پیش نظر ہی۔ مریخ کے پانچ چاند دریافت ہو چکے مین لیکن اس کا ایک چاند اس قدر عجیب و غریب حرکتین کرتا ہی کہ اگر مذکورۂ بالا نتائج ہمارے پیش نظر نہ ہون تو شاید ہم اُنکی تشریح نہ کر سکتے۔ مریخ کی محوری گردش تقریباً ۲۴ گھنٹہ مین ختم ہوتی ہے لیکن یہ چاند ایک دن رات مین مریخ کے گرد تین گردشین ختم کرتا ہی گویا مریخ کا مہینہ صرف ۷½ گھنٹہ کا ہی۔ چاند کا فاصلہ آہستہ آہستہ مریخ کی سطح سے کم ہو رہا ہی اور اب صرف ۴ ہزار میل باقی رہ گیا ہی۔ مریخ کا یہ چاند ہمارے چاند کے مقابلہ مین بالکل چھوٹا سا جسم ہی۔ اسکا قطر ۲۰-۳۰ میل ہی اور اس کا وزن صرف ۴۰ بلین ٹن ہی لیکن جب یہ مریخ کی سطح سے ٹکرائے گا تو اس کی رفتار ۲ ہزار میل فی گھنٹہ ہوگی۔ اور جو عظیم الشان نتائج اس تصادم کا نتیجہ ہونگے وہ تشریح کے محتاج نہین ہین۔ فی الحال اس حادثہ کے وقت کی تعین نہین کی گئی۔

جو نظریہ ہم نے نظام ارض و قمر کی مثال لیکر یہان بیان کیا ہے وہ تمام کائنات کے متعلق صحیح ہی۔ اس کا مختصر اصطلاحی نام ارتقاے مد و جزری (Tidal Evolution) ہے۔

زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج ایسے ہین جن کا ذکر ہم اس مضمون مین نہین کر سکتے۔ مثلاً خط استوائی کے گرد مادہ کی زائد مقدار اهتزاز محور الارض (Precession & Notation of the Earth's axis) کی ذمہ دار ہے۔ چاند اور سورج کی کشش زمین کی اس بے قاعدہ مقدار مادہ کو کھینچ کر زمین کے محور کی سمت بدلتی ہی۔

زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج جن پر ہم نے اس مضمون مین بحث کی ہی مختصر الفاظ مین یہ ہین :- محوری حرکت کا یہ نتیجہ ہی کہ فی الحال دن اور مہینہ دونون بڑھ رہے ہین۔ چاند زمین سے دور ہٹ رہا ہی اور زمین کا استوائی قطر قطبی قطر سے ۲۷ میل زیادہ لمبا ہی۔ جب یہ محوری حرکت ایک منٹ فی دن بھی سُست ہو جائے گی تو شمالی اور جنوبی حصہ زمین مین بہت سی خشک زمین پانی کے نیچے آجائیگی اور منطقہ حارہ مین خشکی کا حصہ بڑھ جائے گا۔

ہم زمین کی اندرونی حرارت کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ کسی زمانے مین زمین سیال مادہ کا ایک کرہ تھی اور اسی زمانے مین چاند زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

فیروز الدین مُراد

---

[۱] شکل ہذا مین دکھایا گیا ہو کہ کس طرح چاند زمین سے دور ہٹ کر پھر نزدیک آتا جائے گا۔ ایسی حرکت کو حرکت منزلی یعنی اسپارل موشن Spiral Motion کہتے ہین۔

العصر

کیا زمین کی حرکت سُست ہو رہی ہی؟

جدید علمی تحقیقات کے حیرت انگیز انکشافات مین سے ایک وہ ہی جس سے ہمارے عنوان کے سوال کا جواب اثبات مین ملتا ہی۔ علمی دُنیا مین یہ بات عام طور پر مانی جاتی ہی کہ ہمارے دن رات آہستہ آہستہ لیکن متواتر لمبے ہوتے ہین یا بالفاظ دیگر یون کہیے کہ آج کا دن گذشتہ دن سے کسی قدر زیادہ لمبا ہی اور آئندہ سے کسی قدر کم۔ اسکا امکان اُسی وقت ہو سکتا ہی جب کہ زمین کی محوری حرکت جس کے باعث دزات کی گردش ہوتی ہی سُست ہو رہی ہو اور ایک گردش کی تکمیل مین دن بدن زیادہ وقفہ درکار ہوتا ہو۔ ایک شبانہ روز کی لمبائی کلیۃً زمین کی محوری حرکت پر منحصر ہی اور جہان تک سائنس نے آج تک ترقی کی ہی زمین کی محوری حرکت کا اسکی سالانہ حرکت کے ساتھ کوئی تعلق نہین ہی۔ سال مین ایک دفعہ کرۂ زمین سورج کے گرد پورا چکر کاٹتا ہی اور یہی سالانہ گردش موسمون کی تبدیلی وغیرہ کی ذمہ وار ہی۔ سردست ہمارا شمسی سال تین سو سوا پینسٹھ دن سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا ہی لیکن جب تک زمین اور سورج کے بُعد اور ان دونون کی علیحدہ علیحدہ مقدار مادہ مین کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو سال کی میعاد ایک معین میعاد ہو جسے دن رات کی لمبائی سے براہ راست کچھ تعلق نہین۔ اگر ہماری زمین اپنے محور کے گرد ۲۴ گھنٹہ مین ایک چکر کاٹتی تو ہمارا سال ہمارے جدید دن رات کی میعاد کے مطابق سات سو ساڑھے تیس دن سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا۔ لہذا زمین کی محوری حرکت کے سُست ہونے کے دو نتایج ہین۔ ایک طرف تو دن رات بڑے ہو رہے ہین اور دوسری طرف سال چھوٹا ہو رہا ہی۔ سال کے چھوٹا ہونے سے مراد یہ ہی کہ آئندہ سال مین موجودہ سال کی نسبت سورج کا طلوع و غروب کم دفعہ ہوگا۔ وگرنہ فی الاصل جیسا ہم ابھی ذکر کر چکے ہین سال کی اصلی میعاد کا زمین کی محوری حرکت سے کوئی تعلق نہین۔ اور اس لیے جس وقفہ کا نام بہ نظر سہولت ہم نے ایک سال رکھا ہی اس مین بذاتہ کوئی کمی بیشی نہ ہوگی۔ فرق صرف تناسب مین ہوگا۔ اگر اکائی بڑھ جائے تو باقی اعداد اسی تناسب سے گھٹ جائینگے۔ جو فاصلہ انچون مین ۳۶ عدد کہلاتا ہی وہی فاصلہ فٹون مین ۳ کہلاتا ہی۔ فاصلہ تو وہی ہی لیکن اکائی یا یونٹ (Unit) کی تبدیلی سے اس کے معیار مین تبدیلی ہوتی ہی۔ اسطرح

موجودہ حالات مین ہم موجودہ دن رات کے وقفہ کو اکائی مان کر سال کے وقفہ کو ایک خاص عدد سے تعبیر کرتے ہین گویا اس خاص عدد اور موجودہ دن رات کے وقفہ کا حاصل ضرب سال کا وقفہ ہے۔ اب اگر حاصل ضرب مین کمی بیشی نہ ہو اور ضرب شدہ اعداد مین سے ایک بڑھ جائے تو دوسرا لامحالہ کم ہوگا۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ اگر دن رات کا وقفہ بڑھ رہا ہے تو سال کے وقفہ کا معیار (دن رات کے بڑھتے ہوئے وقفہ کو اکائی مانکر) گھٹ رہا ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ زمین کی حرکت فی الواقع سُست ہو رہی ہے تین مختلف طریقون سے دیا جا سکتا ہے جن مین سے ہر ثبوت اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے۔ دلائل کی پختگی اور استدلال کی نفاست کے لحاظ سے یہ بحث ہمین بہت سے مفید مطلب سبق سکھا سکتی ہے۔ ہم بہ نظر اختصار ان تینون ثبوتون کو موجودہ مضمون مین محدود کرنیکی کوشش کرین گے۔

زمین ایک گول کرہ ہے جو فضائے بسیط مین معلق ہے اور اپنے محور کے گرد تقریبًا ۲۴ گھنٹہ مین ایک دفعہ گھومتی ہے۔ زمین کا محور زمین کے مرکز مین سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس کے انتہائی سرون کو قطبین یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی کہتے ہین۔ محور محض ایک سمت کا نام ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو محور سے مراد کوئی ٹھوس مضبوط سلاخ نہین ہوتی بلکہ اُس خط مستقیم کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو زمین کے مرکز سے گذرتا ہوا شمالی جنوبی سمت مین واقع ہے۔ آپنے بازارون مین شعبدہ بازون کو دیکھا ہوگا جو ایک تھالی کو چھڑی کے اوپر تول کر زور کی گردش کے بعد ہوا مین اُچھال دیتے ہین جہان تھوڑی دیر کے لیے ہوا مین معلق رہکر تھالی ایک محور کے گرد گھومتی رہتی ہے جس کی سمت حرکت دہندہ چھڑی کی لمبائی ہوتی ہے۔ اسیطرح افریقہ کے حبشی چابک کی ضربون سے گول لٹو ہوا مین گھماتے ہین۔ جتنی دیر لٹو کی حرکت کافی تیز رہتی ہے لٹو ایک محور کے گرد ہوا مین گھومتا رہتا ہے۔ کرۂ زمین کی محوری حرکت کی مثال ایک اور طریقہ سے بھی دیجا سکتی ہے۔ کمہار کا بھاری چاک جب وہ اُسے لکڑی کے ساتھ تیز حرکت دینے کے بعد چھوڑ دیتا ہے ایک حد تک زمین کے مشابہ ہوتا ہے۔ دونون کی حرکت مین فرق صرف یہ ہے کہ چاک ہوا کی مزاحمت کی وجہ سے تھوڑی دیر گھومنے کے بعد ساکن ہوجاتا ہے لیکن زمین کے اردگرد ہوا کے بجائے ایک ایسا رقیق جسم (ایتھر) ہے کہ قرنون مین بھی اسکی رگڑ اور مزاحمت کا اثر محسوس نہین ہوتا۔ زیادہ تر فرق شکل مین ہے۔ اگر ہم چاک کے بجائے ایک مدور کرہ فرض کرین جسے پہیہ کی طرح گھما کر چھوڑ دیا جائے تو وہ بجنسہ زمین کے مشابہ ہوگا لیکن زمین کی حرکت اس کے مقابلے مین نہایت سُست ہوگی اس لیے کہ دونون کے حجم مین بہت بڑا فرق ہے۔ زمین کا قطر تقریبًا آٹھ ہزار میل ہے حالانکہ ہمارے مثالی کرہ کا حجم گز بھر سے زیادہ نہین ہوتا۔ اب اگر آپ نے یہ فرق صحیح طور پر سمجھ لیا ہے تو زمین کی حرکت کے کم ہونے کا پہلا ثبوت بآسانی ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کمہار چاک کو یکسان طاقت کے ساتھ گھما رہا ہے یعنی ہوا کی مزاحمت سے چاک کی رفتار مین جو کمی[1] تعویق پیدا ہوتی ہے اس کی تلافی کرتا جاتا ہے یہ بھی فرض کر لیجیے کہ کمہار اپنی طاقت اس یکسان تناسب کے ساتھ دیر تک صرف کر سکتا ہے۔ اب اگر آپ چاک کے اوپر آہستہ آہستہ خاک پھینکتے جائین تو اُس کو چونکہ اپنی گردش مین مادہ کی زیادہ مقدار اُٹھانا پڑتی ہے اس کی رفتار سُست ہوجائے گی تاوقتیکہ کمہار جون جون چاک پر مادہ کی مقدار زیادہ ہوتی جاتی ہے زیادہ طاقت نہ صرف کرے۔ بعینہ یہی حالت کرۂ زمین کی گردش کی ہے۔ آسمانی خاک اور ٹوٹنے والے ستارون کے ریزے ہر لحظہ زمین کی سطح پر گر رہے ہین

[1] زمین کی حرکت کے متعلق مفصل معلومات ہمنے اپنے سابقہ مضمون "حرکت کا پہلا قانون" مین حرکت کے پہلے قانون کی تشریح کرتے ہوے بہم پہنچاے ہین۔ ان اصطلاحات اور مطلب کی تفہیم کے لیے اس مضمون کا مطالعہ لابدی ہے۔

اور جون جون زمین اپنی سالانہ گردش کرتی ہوئی نئے نئے مقامات پر سے گذرتی ہی آسمانی خاک کی نہ ختم ہونیوالی بارش اس کے حجم اور وزن کو بڑہاتی رہتی ہی۔ اندازہ لگایا گیا ہی کہ ہر سال باہر سے زمین پر ایک کروڑ ٹن یعنی تقریباً ۲۴ کروڑ من خاک گرتی ہی۔ گویا ہر سال زمین کا وزن ۲۴ کروڑ من بڑہ رہا ہے جیسا ہم نے اوپر ذکر کیا اگر ہم چاہتے ہین کہ ہمارے مثالی چاک کی رفتار یکسان رہے تو جون جون اسکا وزن زیادہ ہو کمہار کو زیادہ طاقت لگانی چاہیئے لیکن اگر کمہار صرف ہوا کی مزاحمت اور محور کی رگڑ وغیرہ کی تلافی پورا کرنے کے لیے کافی طاقت صرف کرے تو لحظہ بہ لحظہ چکر کی رفتار سست ہوتی جائیگی۔ زمین کی حالت مین کوئی بیرونی طاقت اسکی حرکت کے قیام کے لیے درکار نہین ہی لیکن جو زائد مادہ اس کے بوجھ مین اضافہ کر رہا ہی اسکی وجہ سے حرکت مین جو کمی واقع ہو رہی ہی اسکی تلافی بھی کوئی طاقت نہین کر رہی۔ نتیجہ یہ ہی کہ زمین کی حرکت سست ہو رہی ہی یہان اس امر کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہی کہ چونکہ زمین کا مجموعی وزن ارہا کروڑ من[1] ہی اور اس عظیم الشان بوجھ کے مقابلے مین ۲۴ کروڑ من کی زیادتی بالکل ہیچ ہی لہذا کسی قلیل عرصہ مین محض اسی سبب سے زمین کی گردش مین بہت تھوڑی کمی واقع ہونے کا امکان ہی۔ اتنی تھوڑی کمی کہ اس کا اندازہ لگانا بھی انسانی طاقت سے باہر ہی۔ لیکن اس مقام پر ایک نہایت غور طلب مسئلہ یہ ہی کہ اگر یہی حالت مدت دراز تک رہے تو فی سال ۲۴ کروڑ من کا اضافہ آخر الامر اپنا اثر دکھائے بغیر نہین رہیگا۔ اُس وقت تک زمین کی حرکت مین ضرور ایک نمایان تبدیلی ہو گئی ہو گی۔

دوسرا سبب ایسا ہی کہ اس کا اثر پہلے سبب کے اثر سے کہین زیادہ ہی اور ان دونون اسباب کے مجموعی اثر کی نظری بحث کے بعد ہم تیسرے ثبوت کا یعنی حرکت کی کمی کی عملی تصدیق کا ذکر کرینگے جس سے یہ امر بوضاحت ثابت ہو جاتا ہی کہ پہلے دو اسباب مین جو دلائل اور طریقۂ استدلال اختیار کیا گیا ہی وہ بالکل صحیح اور درست ہی۔

چاند کی کشش سے سمندر کا پانی مد و جزر کی شکل مین کھینچا جاتا ہی۔ پانی کا مد و جزر جو سطح زمین کے اوپر ہوتا ہی زمین کی محوری حرکت کو روکتا ہی یون سمجھیے کہ جس طرح چلتی گاڑی کو بریک باندھنے سے روک کیا جاتا ہی اسی طرح جوار بھاٹا کا عمل زمین کی محوری حرکت کے لئے ایک کمزور بریک کا حکم رکھتا ہی جس کا تدریجی قلیل اثر اگر سالون مین نہین تو ہزارہا صدیون مین ضرور نمایان طور پر ظاہر ہو جاتا ہی۔ اس اجمال کی تفصیل ہم کسی دوسرے مضمون کے لیے اٹھا رکھتے ہین۔ یہان مختصراً مد و جزر کے متعلق چند ایک اُمور بطور اشارات تحریر کرتے ہین۔

سب سے پہلے اس امر کو ثابت کرنے کی ضرورت ہی کہ مد و جزر کا چاند کے ساتھ کیا تعلق ہی اور یہ تعلق کیسے دریافت ہوا جن لوگون کو ساحل سمندر پر جانے یا بحری سفر کا اتفاق نہین ہوا ان کے لیے مد و جزر ایک نئی چیز ہی لیکن سمندر کے قریب رہنے والون کے لیے مد و جزر ویسی ہی معمولی چیز ہی جیسے خشکی پر رہنے والون کے لیے چاند کا گھٹنا بڑھنا۔ غالباً سب سے پہلے یہ امر مشاہدہ مین آیا ہو گا کہ نئے چاند اور بدر کے موقع پر مد و جزر نہایت شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور پہلے ربع اور تیسرے ربع کے موقع پر نہایت کمزور ہوتا ہی لیکن اس سے زیادہ مضبوط تعلق یہ معلوم ہوا ہو گا کہ ایک شبانہ روز کے دو متواتر جوار بھاٹون کا درمیانی وقفہ بجائے ۱۲ گھنٹہ کے ایک شمسی دن رات ہونے کے ۲۴ گھنٹہ ۵۰ منٹ کا ایک قمری دن ہوتا ہی۔ چاند بوجہ اپنی ماہواری گردش کے ایک دن رات مین سورج

---

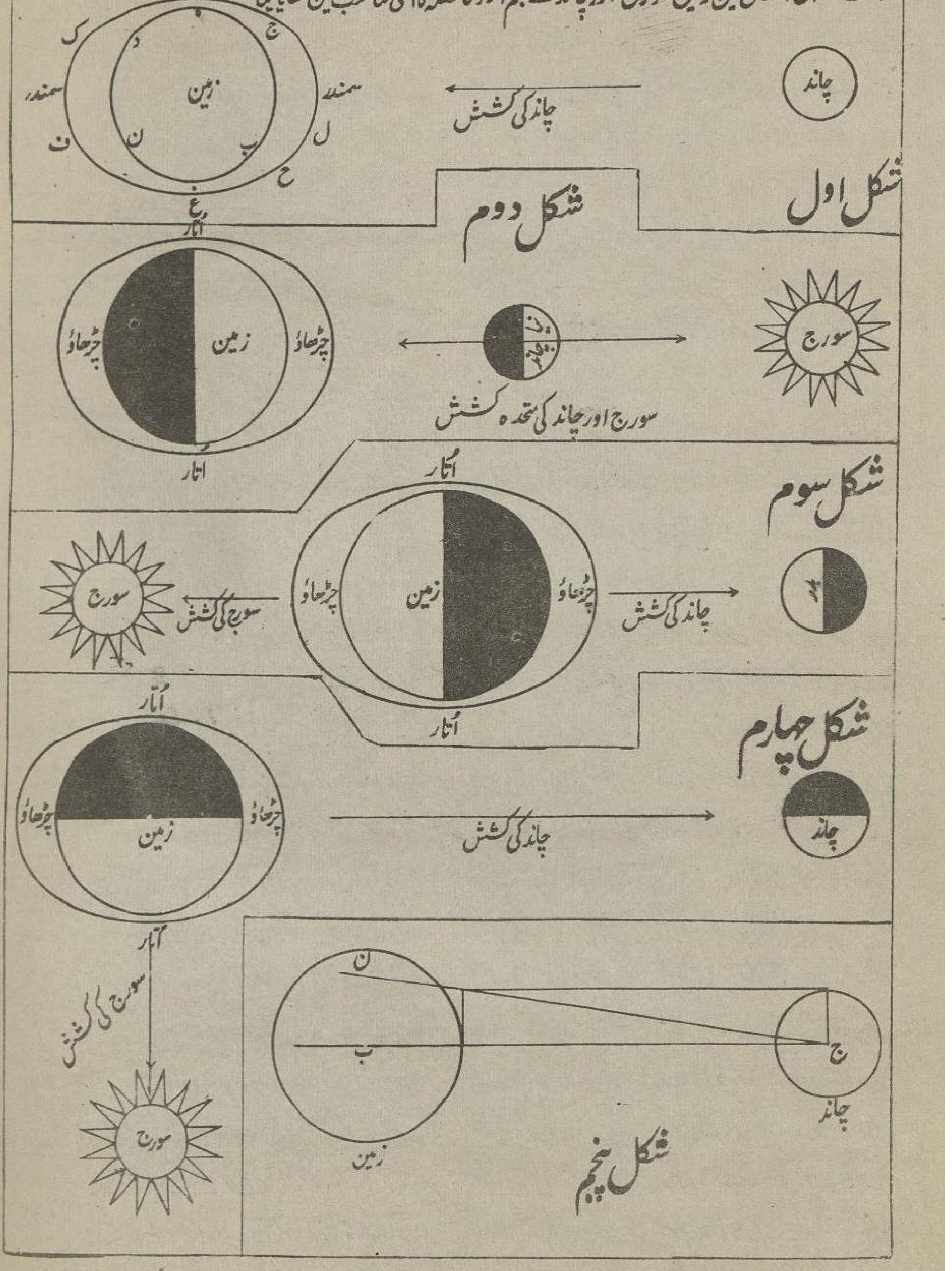
[1] ہم نے اپنے ایک سابقہ مضمون "کرۂ ہوائی کے متعلق دلچسپ معلومات" مین کرۂ ہوائی کا مجموعی وزن دریافت کرنے کے لیے زمین کا وزن مختصراً یون دریافت کیا تھا۔ زمین کا نصف قطر تقریباً ۴۰۰۰ میل ہی لہذا اسکا حجم $\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times (4000)^3$ مکعب میل ہی چونکہ زمین کی کثافت اضافی بمقابلہ پانی کے $5\frac{1}{2}$ ہی اس لیے زمین کا وزن [illegible] مکعب میل پانی کے وزن کے برابر ہی ایک مکعب میل پانی کا وزن [illegible] من ہی اس لیے زمین کا کل وزن [illegible] من ہی

سے اکاون منٹ پیچھے رہ جاتا ہی اور مدوجزر بھی اسی مقدار وقت کے ساتھ لگاتار شمسی دن سے پیچھے ہٹتا جاتا ہی۔ سمندر کے پانی مین مدوجزر کے متعلق ایک دلچسپ لیکن شروع مین پریشان کرنیوالی بات یہ بھی ہی کہ ہر بندرگاہ مین ایک قمری دن مین ایک دفعہ پانی اُترنے چڑھنے کے بجائے دو دفعہ اُترتا چڑھتا ہی گویا ۲۴ گھنٹہ اکاون منٹ مین دو دفعہ سمندر مین پانی کی سطح معمول سے زیادہ اونچی اور دو دفعہ معمول سے زیادہ نیچی ہوتی ہی۔ اگر ہم سہولت کے خیال سے یہ مان لین کہ تمام کرۂ زمین کے گرد یکسان گہرائی کی پانی کی ایک تہ ہی تو یہ بات بادی النظر مین زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہی کہ اگر چاند کی کشش سے (دیکھو شکل نمبر ۱) سمندر کے اس حصۂ ل ح کا پانی جو چاند کے قریب ہی چاند کی طرف کھنچا جاتا ہی تو دور کے حصۂ ک ف مین چاہیئے کہ پانی کم رہجانے کی وجہ سے پانی کا غیر معمولی اُتار ہوتا اور اسطرح سے ہر قمری دن مین صرف ایک دفعہ کسی مقام پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور ایک دفعہ اُتار۔ لیکن جیسا کہ شکل اول مین دکھایا گیا ہی حالات واقعی اس نقطۂ خیال سے ایک معمہ کی سی صورت پیش کرتے ہین۔ اگر بامعان نظر غور کی جائے تو چاند کے نیچے سطح زمین پر دو بالمقابل مقامات پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور چاند کی سمت سے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دو مقامات پر پانی کا اُتار ہونا فوراً ایک معقول پیرایہ سے سمجھا جا سکتا ہی۔ جسطرح سمندر کے حصۂ ل ح کا پانی زمین کی نسبت چاند سے زیادہ قریب ہونے کی بدولت زمین سے زیادہ چاند کی طرف کھنچ جاتا ہی اور وہان چڑھاؤ کی حالت ہوتی ہے اسی طرح زمین کا قریب حصہ ب ج بعید حصۂ د ن کی نسبت چاند سے آٹھ ہزار میل کے قرب کی وجہ سے سمندر کے پانی ک ف سے پرے ہٹ جاتا ہی اور وہان بھی پانی کا چڑھاؤ ہوتا ہی اور اس لیے سمندر کے اِن دو حصون مین جو ع غ کی جگہ ہین اُتار کی حالت ہوتی ہی۔ اس تشریح سے ہر قمری دن مین دو دفعہ اُتار چڑھاؤ ہونا بآسانی سمجھ مین آ سکتا ہی۔ اب صرف یہ امر محتاج تشریح ہی کہ کیون نئے چاند اور بدر کی حالت مین اُتار چڑھاؤ معمول سے زیادہ ہوتا ہی اور کیون پہلے اور تیسرے ربع پر معمول سے کم۔ جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ زمین کی سالانہ گردش کا ذکر کرتے ہوئے بیان کر آئے ہین، زمین سورج سے بہت چھوٹی ہی اور اسی وجہ سے سورج کی کشش اس پر غالب ہی کہ یہ سورج کے گرد گھومتی ہی۔ لیکن گو سورج بہت بڑا ہی تاہم بوجہ اپنے بُعد کے اِس کی جوار بھاٹا پیدا کرنے کی طاقت چاند کی نسبت نصف سے بھی کم ہے۔

شکل اول کی تشریح کو مدنظر رکھکر شکل دوم اور سوم سے بخوبی واضح ہوتا ہی کہ کیون نئے اور پورے چاند کی تاریخون پر اُتار چڑھاؤ معمول سے زیادہ ہوتا ہی۔ ان دونون حالتون مین چاند اور سورج کی کشش مل کر کام کرتی ہی اور نتیجہ اسی تناسب سے بڑا ہوتا ہی۔ پہلے اور تیسرے ربع کی حالت شکل چہارم سے واضح ہوتی ہی۔ اِس حالت مین سورج کی کشش چاند کی کشش کے خلاف عمل کرتی ہی۔ جن مقامات پر چاند کی کشش محض سے اُتار ہونا چاہیئے وہان سورج کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہی۔ اور برعکس اس کے جہان چاند کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہی وہان سورج کی کشش سے اُتار ہوتا ہی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اُتار چڑھاؤ معمول سے کم ہوتے ہین اس لیئے کہ سورج کی کشش چاند کے اثر کو نصف سے کچھ کم زائل کر دیتی ہی۔

ہم یہان مدوجزر کے وسیع نظریہ کے متعلق کچھ نہین لکھنا چاہتے۔ ہمین یہان صرف یہ دکھانا مقصود ہی کہ پانی کے اُتار چڑھاؤ کا اثر زمین کی حرکت کو کم کرتا ہی بعینہ اُسی طرح جس طرح کہ ایک کمزور بریک کسی تیزی سے حرکت کرنے والے جسم کی حرکت کو کم کرتی ہی۔ اوّل چار شکلون سے یہ غلط نتیجہ نکالا جا سکتا ہی کہ ہر مقام پر پانی کا زیادہ سے زیادہ چڑھاؤ دن مین ایک دفعہ اُسوقت ہوتا ہی جب کہ چاند اس مقام کے اوپر سب سے زیادہ بلندی پر ہو اور دوسری دفعہ اس سے بارہ گھنٹہ اور ۲۵ منٹ بعد لیکن واقعی مشاہدات اِس سادہ حالت کے بالکل خلاف ہین۔ مختلف بندرگاہون مین پانی کے چڑھاؤ کا وقت، چاند کے سب سے زیادہ

نوٹ - ان اشکال مین زمین سورج اور چاند کے حجم اور فاصلہ کا اصلی تناسب نہین دکھایا گیا



بلندی پر ہونے کے وقت کے بعد (مختلف وقفون کے بعد) ہوتا ہی بعض مین ایک گھنٹہ کا فرق ہی بعض مین پانچ گھنٹہ کا وغیرہ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ چاند کے پیچھے پیچھے سمندر کا پانی دوڑتا پھرتا ہی اور چونکہ پانی کی یہ حرکت زمین کی محوری حرکت کے خلاف ہوتی ہی اس لیے چاند کی کشش سے زمین کی حرکت ضائع ہوتی رہتی ہی۔

سمندر کے پانی کا چاند کی کشش کی سمت سے پیچھے رہنے کا باعث زمین کے خلاف پانی کی رگڑ ہے اور کچھ حد تک پانی کی اندرونی رگڑ بھی۔ ہم اس نتیجہ کو شکل نمبر کی مدد سے بآسانی سمجھ سکتے ہین۔ اگر کسی قسم کی رگڑ نہ ہوتی تو چاند کی کشش کا اثر زمین کے مرکز ب کی سمت مین ظاہر ہوتا، لیکن رگڑ کی وجہ سے کشش کا اثر اس کے بجائے سمت ج ن مین ہوتا ہی جو زمین کے مرکز مین سے نہین گذرتی۔ سمت ج ن مین عمل کرنے والی طاقت دو سمتون مین منقسم کیجا سکتی ہی۔ ایک جز عمودی سمت مین اور ایک اُفقی مین۔ ان مین سے ایک جز زمین کی حرکت کم کرتا ہی اور دوسرا چونکہ زمین کے مرکز مین سے گذرتا ہی لہذا اس کا اثر زمین کی حرکت پر کچھ نہین ہوتا۔

طوالت کے خوف سے ہم اس دلچسپ بحث کو نہین چھوڑ دیتے ہین۔ لیکن اس بات کا ایک عملی ثبوت کہ مدوجزر کی رگڑ فی الواقع کسی جسم کی حرکت روکنے لے لیئے کافی ہو سکتی ہے، ہمین چاند کی حالت مین ملتا ہی چونکہ زمین چاند سے بہت بڑی ہی اس لیے جب چاند زمانہ سابقہ مین سیال حالت مین تھا تو زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر نہایت شدت کے ساتھ اُتار چڑھاؤ ہوتا تھا۔ آپ نے بارہا سُنا ہوگا کہ چاند ہمیشہ اپنا ایک ہی رُخ زمین کو دکھاتا ہی۔ کسی انسانی آنکھ نے چاند کا دوسرا رُخ نہین دیکھا۔ صرف کبھی کبھی اس رُخ کے چھوٹے سے حصہ کی ایک جھلک نظر آتی ہی۔ دوسرے لفظون مین نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ چاند اپنے محور کے گرد اسی عرصہ مین ایک کامل گردش پوری کرتا ہی جتنے عرصے مین وہ زمین کے گرد ایک دفعہ گھومتا ہی۔ گویا چاند کا دن اور مہینہ ایک برابر ہین۔ یہ کیون ہین؟ محض اس لئے کہ زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر جو مدوجزر ہوتے تھے ان کی بدولت چاند کی محوری حرکت بمقابلہ زمین کے بند ہو گئی۔ یہی حالت زمین کی حرکت کی آج سے بہت عرصے کے بعد ہو گی تب ہمارا دن اور قمری مہینے برابر ہونگے اور چاند والے زمین کا صرف ایک ہی رُخ دیکھ سکین گے۔

ہم نے اس مضمون کے شروع مین کہا تھا کہ علاوہ ان دو نظری دلائل کے جو ہم ابھی ختم کر چکے ہین زمین کی رفتار کے کم ہونے کی ایک عملی تصدیق بھی موجود ہی۔ زمانۂ حال اور ماضی کے مشاہداتِ فلکی کا موازنہ کرنے سے ہم دن رات کی لمبائی معلوم کر سکتے ہین۔ لارڈ کیلون نے اس حصۂ مضمون کو نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہی۔ ہم یہان اس کی مثال پر اکتفا کرین گے۔ ۱۹۔ مارچ سنہ ۷۲۱ء قبل از مسیح یعنی آج سے ۲۶۳۴ سال پہلے قدیم بابل (Babylon) مین چاند گرہن ہوا تھا۔ بابل کا ایک ہیئت دان اپنی تحریر چھوڑ مرا ہی کہ اس نے "گرہن کو شروع ہوتے پہلی دفعہ جس وقت دیکھا اس وقت چاند کے طلوع کے بعد کامل ایک گھنٹہ گذر چکا تھا"۔ ہم شکل سوم اور چہارم کے متعلق ایک نوٹ مین جتا چکے ہین کہ چاند گرہن ہمیشہ بدر کی حالت مین ہوتا ہی۔ علاوہ ازین چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا وقت زمین کی محوری گردش پر منحصر ہی۔

چاند گرہن کے متعلق یہ ایک دلچسپ معلومات ہی کہ ہر ۱۹ سال اور ۱۱ دن (۶۵۸۵ دن) یا زیادہ صحیح طور پر ہر ۶۵۸۵ دن اور ۸ گھنٹہ کے وقفہ کے بعد چاند گرہنون کا ایک جدید دور شروع ہوتا ہی۔ مثلاً اگر آج سے ۱۹ سال اور ۱۱ دن تک کے تمام چاند گرہنون کا وقت اور کیفیت درج کر لیجائے تو آج سے پہلے اور بعد کے کل چاند گرہن اُسی وقت اور کیفیت کے مطابق ہونگے۔ اسی قاعدہ کی مدد سے قدیم ہیئت دان پہلے سے چاند گرہن کے اوقات دُنیا کے سامنے شائع کر دیتے تھے حالانکہ اُن

زمانہ مین چاند کی حرکت کا مطالعہ کامل طور پر نہین کیا گیا تھا۔ اب ہم اگر یہ مان لین کہ زمین اس تمام عرصہ مین یکسان رفتار کے ساتھ حرکت کرتی رہی ہو تو ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہین کہ بابل مین چاند گرہن ۱۹ مارچ کو ۷۲۱ صدی پہلے کس وقت شروع ہوا ہوگا۔ اس اندازہ سے معلوم ہوتا ہو کہ چاند گرہن کے شروع ہونے مین تقریباً ۵ گھنٹہ کی غلطی ہو یعنی اگر زمین کی رفتار کو یکسان مانا جائے تو ہیئت دان کی تحریر مین پانچ گھنٹہ کی غلطی پائی جائیگی کیونکہ حسابی اندازہ سے چاند گرہن ۵ گھنٹہ پہلے شروع ہونا چاہیے۔ اس لیے زمین ان ۲۶۳۴ برس مین مجموعی طور پر ۵ گھنٹے پیچھے ہو گئی ہو اور بیسوین صدی عیسوی مین زمین کی حرکت اتنی سُست ہو گئی ہو کہ آٹھوین صدی قبل از مسیح کی نسبت ۳۶۵ یومیہ گردشین کرنے مین یہ ۱۳ ثانیہ زائد دیر کرتی ہو گویا آجکل ہر ایک دن عہد بابل کے دنون سے ایک ثانیہ کا اٹھائیسوان حصہ زیادہ بڑا ہو اور ہمارا سال عہد بابل کے سال سے ۱۳ ثانیہ بڑا ہوتا ہو۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالون سے اندازہ لگایا گیا ہو کہ زمین کی رفتار ہر صدی مین نصف ثانیہ فی سال کم ہو رہی ہو یعنی ۱۹۱۳ء مین ۳۶۵ محوری گردشون کے لیے ۱۸۱۳ء کی نسبت نصف ثانیہ زیادہ درکار ہی۔ یہان اس امر کی توضیح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہو کہ زمین کی رفتار کی تبدیلی زمانہ ماضی اور زمانہ حال کے وقت کے مجموعی فرق سے بالکل جُدا ہو۔ فی سال زمین کی رفتار ۱/۲۰۰ ثانیہ سُست ہوتی ہو۔ اسطرح ہر ایک دن گزشتہ دن کی نسبت ثانیہ کا سات ہزاروان حصہ لمبا ہوتا ہو اور آنے والے دن سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہو۔ فی صدی زمین کی رفتار ۱/۲ ثانیہ سُست ہوتی ہو اسطرح ساٹھ صدیون کے بعد دن رات حال سے نصف منٹ لمبا ہو جائیگا۔ یہ اعداد بالکل خفیف اور بے بضاعت معلوم ہوتے ہین لیکن جسوقت ہم قرنہائے دراز مین اپنی نظر کو وسعت دیتے ہین اور زمین کی پوری تاریخ ابتدا سے انتہا تک معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہین تو حرکت محوری مین یہ قلیل کمی عالیشان نتائج کا پیش خیمہ بن جاتی ہو۔ ہم اس موضوع پر آئندہ ایک جُداگانہ مضمون مین (بعنوان زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج) بحث کرینگے اور دکھائین گے کہ کس طرح ہم زمانہ ماضی مین دوربین نظر کے ساتھ چاند کو زمین سے علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہین۔

بہت سے صاحب شاید اس امر کو آسانی سے نہ سمجھ سکین کہ اگر زمین کی رفتار فی صدی نصف ثانیہ کی قلیل مقدار سے کم ہو رہی ہو تو کس طرح ۲۶۳۴ سال کے عرصے مین زمین نے تقریباً ۵ گھنٹے ضائع کر دیئے مین جیسا کہ ہم نے بابل والے چاند گرہن کی مثال مین ذکر کیا ہو۔ اس بات کو آسانی سے ذہن نشین کرنے کے لیے فرض کیجیے کہ آج سے ۲۶۳۴ سال پہلے بابل مین ایک صحیح گھڑی قائم کی گئی تھی جو آج تک بالکل صحیح طور پر چل رہی ہو۔ سوال صرف یہ ہو کہ بمقابلہ اس صحیح گھڑی کی زمین کتنے گھنٹے پیچھے رہ گئی ہو۔ ہماری مثال کے مطابق اگر وہ قدیم گھڑی عین نصف النہار کے وقت چلائی گئی تھی یعنی شروع مین دوپہر کے وقت اس گھڑی مین ٹھیک بارہ بجے تھے تو موجودہ صدی مین دوپہر کے وقت اُس صحیح گھڑی مین بجاے ۱۲ کے سہ پہر کے ۵ بجے ہونگے اگر ہم مشاہدہ کے بجائے گذشتہ ۲۶۳۴ سال کے ہر ایک سال کی کمی جمع کرتے جائین تو اسی نتیجہ پر پہنچین گے۔ مثلاً پہلی صدی کے پہلے سال مین زمین نے ۱/۲۰۰ ثانیہ کھوئے دوسرے سال مین ۲/۲۰۰ ثانیہ ۔۔۔۔ پچاس سال مین ۵۰/۲۰۰ ثانیہ اور سوین سال مین ۱۰۰/۲۰۰ ثانیہ ان اعداد کے جمع[1] کرنے سے معلوم

---

[1] جمع کرنے کا ایک آسان قاعدہ یون حاصل ہو سکتا ہو۔ پہلے ۴ عدد کی جمع ۱۰ برابر ہو ۱/۲ × ۴ × (۴+۱) = ۱ + ۲ + ۳ + ۴ ۔ پہلے پانچ اعداد کی جمع ۱۵ ہو یعنی ۱/۲ (۵ × ۱۰) + ۵ = ۱/۲ + ۲ + ۶ + ۵ = ۱۵ کے برابر ہو۔ عام قاعدہ جس کا آسان الجبری ثبوت دیا جا سکتا ہو یہ ہو کہ جتنے اعداد کانی کے بعد جمع کیے جائین۔ ان کی تعداد مین ایک بڑھا کر دو سے تقسیم کرو اور حاصل تقسیم کو آخری عدد سے ضرب دیدو۔ پہلی صدی مین وقت کا مجموعی نقصان اس قاعدہ سے $\frac{100 + 101 + \frac{1}{2}}{200}$ یعنی ۱۰۱/۴ = ۲۵ ۱/۴ ثانیہ ہوتا ہو اسطرح دو صدیون کا مجموعی نقصان $\frac{200 + 201 + \frac{1}{2}}{200}$ = ۱۰۰ ۱/۲ ثانیہ ہو اور ۲۷ صدیون کا مجموعی نقصان ۲۷۰۱ کو ضرب تقسیم کی سہولت کے لیے ۲۷۰۰ یعنی ۲۷۰۰ + ۱ مان لیا جائے تو $\frac{2700 + 2701 + \frac{1}{2}}{200}$ = ۱۸۲۵ + ۲۷ + ۲۷ ثانیہ ہوتا ہو۔

ہوتا ہو کہ پہلی صدی مین زمین گھڑی سے ۲۵ ثانیہ پیچھے رہ گئی اسیطرح دوسری صدی کے پہلے سال مین زمین نے نصف ثانیہ کھویا۔ دوسرے سال مین $\frac{۱۰۱}{۲۰۰}$ ثانیہ اور سوین سال مین پورا ایک ثانیہ۔ گویا صرف دوسری صدی مین گھڑی سے ۷۵ ثانیہ پیچھے رہ گئی اور اسیطرح دوسری صدی کے اختتام پر زمین گھڑی سے ۱۰۰ ثانیہ پیچھے ہو گئی۔ اس طرح ہر صدی مین زمین گھڑی سے زیادہ زیادہ پیچھے ہوتی گئی۔ ستائیسوین صدی کے شروع سال مین زمین نے ۱۳ ثانیہ ضائع کئے۔ دوسرے سال مین $۱۳\frac{۱}{۲۰۰}$ ثانیہ علی ہذالقیاس۔ ساری صدی مین ۱۳۲۵ ثانیہ ضائع گئے۔ اب اگر ہر صدی کے نقصان کو جمع کرین تو مجموعی نقصان کا پتہ چل جائیگا یعنی یہ معلوم ہوگا کہ آج زمین گھڑی سے کسقدر پیچھے ہو گئی ہے۔ حاصل جمع یون ملے گی:۔

(۲۵+۷۵+۱۲۵+۱۷۵+ ۔۔۔۔ ۱۳۲۵) ثانیہ

= ۲۵(۱+۳+۵+۷+ ۔۔۔۔ ۵۳) ثانیہ

= ۲۵×۵۴×$\frac{۲۷}{۲}$ ∴ ۲۵×۲۷×۲۷ ثانیہ = ۵ گھنٹہ ۳ منٹ ۴۵ ثانیہ

فیروزالدین مراد

العصر

حرکت کا پہلا قانون

زمین کی محوری حرکت بند ہو گئی ہے! کل صبح آفتاب عالمتاب افق شرقی سے طلوع نہین ہو گا بلکہ صبح کی نورانی سفیدی کبھی آشکارا نہین ہو گی!! جہاں دن ہے وہاں دن رہیگا اور جہاں رات ہے وہاں رات کی ابدی تاریکی صفحۂ زمین کو انسان کی آخری نسلوں کا ایک عالمگیر قبرستان بنا دیگی!!!

انسانی طبائع کا صحیح مطالعہ کرنا مقصود ہو تو کسی طریقہ سے اس سنسنی خیز خبر کو عارضی شہرت دیدیجیے پھر دیکھیے جہالت کی نیند کے متوالوں کی آنکھیں کس طرح کھُلتی ہیں۔ مارکونی گرام[1] اور تار برقیاں کس عجلت اور شوق کے ساتھ پڑھی اور سُنی جاتی ہیں۔ کیسی مستعدی کے ساتھ اجرامِ فلکی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور خواہش ظاہر کی جاتی ہے کہ اگر ایک دفعہ پھر زمین کی باقاعدہ اور مسلسل حرکت شروع ہو جائے تو اُسکا وسیع مطالعہ کرینگے۔ لیکن جب ایک گرانبہا نعمت ہمیں عطا کی گئی ہے اور ہم ہر لحہ اُس نعمت کے جان بخش فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں ہماری غفلت شعاری اور کوتاہ اندیشی ہمین اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ان آسان لیکن مہتم بالشان مسائل پر کماحقہ غور کرین اور زمین کی محوری حرکت کے علل اور نتائج پر عبور حاصل کرنے کے بعد اُس کے مسلسل اور باقاعدہ قیام کے متعلق جہاں تک انسانی سمجھ اور علم کام آسکتا ہو غایت درجہ کے متیقن ہو جائیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف انسانوں کے میل ملاپ میں بلکہ مظاہر قدرت کے متعلق بھی حضرت انسان کا یہی معمول ہے کہ بے تکلفی اور روزمرہ کی ملاقات کا نتیجہ اگر نفرت نہین تو لاپروائی ضرور ہوتا ہے۔ اس اصول کی تشریح مذکورۂ بالا عسیر الحصول اور مرگ افزا مثال سے اگر کافی طور پر نہ ہوتی ہو تو

[1] مارکونی گرام (Marconigram) جو پیغام برقی رو کی مدد سے تاروں کے بغیر ایتھر کے تموج اور برقی لہروں کے ذریعہ سے ایک مقام سے دوسرے مقام پر وصول کیے جاتے ہیں ان کو بغیر تار کی برقی پیغام رسانی کے ایک اطالوی موجد یعنی مارکونی (Marconi) کے نام پر مارکونی گرام کہتے ہیں۔

اپنی زندگی کے جس شعبہ پر چاہو نظر ڈالکر اپنی تسلی کر لو جب یورپ مین بغیر تار کے برقی پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر شخص اسکے سمجھنے کے لیے حد سے زیادہ خواہشمند نظر آتا تھا اور علمی ترقی کے میدان مین پیچھے رہ جانے ممالک کے سرتاج نیم وحشی نیم مہذب ملک ہندوستان مین تو آج تک یہی حالت ہو کہ وہ لوگ بھی جو علمی نقطۂ خیال سے مردوں کا حکم رکھتے ہیں اور علمی دنیا سے تمامتر بیخبر ہین "بلا تار برقی" کے نئے نام سے چونک اُٹھتے ہیں- علمی زندگانی کی ایک عارضی لہر انکے مُردہ دلوں کو جلا دیتی ہو اور اس عجوبہ دریافت کے سمجھنے کے متمنی نظر آتے ہیں حالانکہ یہی وہ لوگ ہین جنکو معمولی تار برقی پیغام رسانی کے متعلق ذرہ برابر ادراک نہیں ہو اور نہ ہی اسکے سمجھنے کی خواہش ہے - فرق دونوں حالتوں میں صرف یہ ہے کہ "معمولی تار برقی" ایک روزمرہ کی چیز ہے جب سے ہمنے ہوش سنبھالا ہے معمولی تار برقی کا نام سنتے آئے ہیں- نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اگر نفرت نہیں تو لاپروائی اس کے متعلق ضرور پیدا ہو گئی ہے - برعکس اس کے "بلا تار برقی" ایک انوکھی چیز ہے اگر اس کے متعلق تھوڑی بہت گفت و شنید کرتے ہیں تو ہماری فطری جدت پسندی کی تسکین ہو جاتی ہے - وگرنہ علمی نقطۂ خیال سے معمولی تار برقی اس امر کی زیادہ مستحق ہے کہ اسے بلا تار برقی سے پہلے سمجھا جائے مَیں خیال کرتا ہوں کہ اگر دنیا میں قدیم سے یہی رواج ہوتا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھوکھلی نلیوں کے ذریعہ سے باتیں کرتے یعنی آواز کی مَوجوں کو کھُلی ہَوا میں گزارنے کی بجائے نلیوں میں سے گزارتے تو شاید نلیوں کی مدد سے باتیں کرنا ایک ویسی ہی معمولی بات سمجھی جاتی جیسی کہ تار کے ذریعہ سے برقی رو کا گزارنا سمجھا جاتا ہے - اور نلیوں کی وساطت کے بغیر براہ راست کھُلی ہوا کے ذریعہ سے باتیں کرنا ویسا ہی عجوبہ متصور ہوتا جیسا بغیر تار کے برقی پیغام رسانی کا سلسلہ فی زمانا سمجھا جاتا ہے حالانکہ بغیر نلی کے باتین کرنا جیسا کہ ہم ہمیشہ بغیر سوچے سمجھے کرتے ہیں ویسا ہی ہے جیسا کہ بغیر تار کے برقی رو کا ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجنا- ایسا ہی چیزوں کے بوجھ کا مسئلہ اور اُن کا زمین کی طرف گرنا ایک ایسا عام مشاہدہ ہے کہ محض عمومیت کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اس کی اہمیت باقی نہین رہی - جہاں معمولی سے معمولی سمجھ کا آدمی یہ سوال کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ یہ امر کیوں ہوا ؟ اور وہ امر کیوں ہوا ؟ اس کے دل میں اس خیال کا خیال بھی نہیں آتا کہ زمین چیزوں کو کیوں کھینچتی ہے ؟

مندرجۂ بالا اصول کسی مفصل تصدیق کا محتاج نہیں ہے اور نہ اسکے ثبوت کا بہم پہنچانا ہمارے مبحث میں داخل ہے - ہمارا منشا موجودہ سلسلۂ مضامین کے لکھنے سے برادران وطن میں ایک علمی تحریک پیدا کرنا ہے- اس مقصد کے حصول کے لیے ہمنے ایسے مضامین انتخاب کیے ہیں جن سے ناظرین میں اپنے مشاہدات اور عام علمی استعداد بڑھانے کی خواہش پیدا ہو- مضمون زیر بحث یعنی حرکت کے پہلے قانون کے ضمن میں زمین کی روزانہ اور سالانہ گردش کے متعلق چند نہایت ضروری سوالات یہ ہیں کہ زمین کیوں اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی ہے ؟ ہم کس طرح اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ یہ ہمیشہ اسی رفتار کے ساتھ اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی رہیگی ؟ ہمارے پاس اس یقین کے لیے نظری اور علمی ثبوت کیا ہیں ؟ اِن سوالات کا مفصل تسلی بخش جواب ہمیں اپنی جگہ پر اس مضمون کے دوران میں آجائے گا -

نظام بطلیموسی[1] کے مطابق زمین ساکن متصور کی جاتی تھی اور اسے عالم کا مرکز مانا جاتا تھا - گردش لیل و نہار یعنی طلوع و غروب آفتاب کے متعلق متقدمین کے عجیب عجیب خیالات تھے - قاعدہ کی بات ہو کہ انسان اپنے گرد و پیش کے واقعات کی توجیہ کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی وجہ بنا لیتا ہو جس سے ایک حد تک اس کے دل کی تسلی ہو جاتی ہو- یہ دوسری بات ہو کہ اسکے دریافت کردہ اسباب صحیح نکلیں یا غلط - لیکن یہ ضرور ہوتا ہو کہ

---

[1] بطلیموس (Ptolemy) زمانۂ قدیم مین ایک قابل ہندس ہو گزرا ہو جسنے پہلی صدی عیسوی میں فروغ پایا تھا-

ان اسباب کی حقانیت کا اعتبار اس زمانہ کی معلومات کے مطابق ہوتا ہے آج جن باتوں پر مدرسہ کے طلباء کو ہنسی آتی ہے وہی باتیں اپنے اپنے وقت میں لاانتہا دماغ سوزی کا نتیجہ ہونے کی وجہ سے مقبول خاص و عام تھیں۔ ہم لکھ رہے تھے کہ طلوع و غروب آفتاب کے متعلق متقدمین کے عجیب و غریب خیالات تھے۔ شروع شروع میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج ایک دیوتا کا مظہر ہے جو اپنے رتھ میں بیٹھ کر ہر روز مشرق سے مغرب کی طرف سیر کرتا ہے۔ یاد رہے کہ یونان میں ہندوستان کی طرح ہر قدرتی طاقت کا کم از کم ایک دیوتا ضرور ہوتا تھا۔ لہذا سب سے پہلے اُنھوں نے سورج کے دیوتا کی سواری سے سورج کے طلوع اور غروب ہونے کو تعبیر کیا۔ ازاں بعد متقدمین میں یہ خیال رائج ہوا کہ سورج دیوتا نہیں ہوسکتا اس لیے کہ کبھی کبھی (گرہن کے موقع پر) اسکی روشنی میں نقص واقع ہوتا تھا لہذا اُنھوں نے سوچا کہ ولکن[۱] ہر روز جلتی ہوئی آگ کا ایک بہت بڑا گولا بنا کر مشرق کی سمت سے نہایت زور کے ساتھ اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ چونکہ گرمیوں میں سردیوں کی نسبت سورج آسمان پر زیادہ مسافت طے کرتا نظر آتا ہے اس لیے اُنھوں نے خیال کیا کہ ولکن سورج کو مختلف موسموں میں کم و بیش زور کے ساتھ اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ شام کے وقت ان کا خیال تھا کہ سورج بحر ظلمات میں گر کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ساری رات ولکن ایک نیا سورج بنانے میں مصروف رہتا ہے اور علی الصبح اُسے ختم کر کے پھر اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ اس کی توجیہ کے خلاف خود ہی اُن کے دل میں دو اعتراضات گذرے۔ ایک تو یہ کہ ہر روز ایک نئے سورج کا بنانا ولکن کے لیے بھی باوجود اس کی دیوتائی طاقتوں کے زحمت سے خالی نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ جہاں سورج بحر ظلمات میں گرتا ہوگا وہاں اسکے گرنے اور سرد ہونے سے بہت شور ہوتا ہوگا اور پانی میں ایک طوفان اُٹھتا ہوگا اس لیے اُنھوں نے ایک اور وجہ سوچی جو اِن دونوں نقائص سے بری تھی۔ اس نئی تجویز کے مطابق ولکن علی الصبح سورج کے پھینکنے کے بعد ایک سنہری کشتی میں بیٹھ کر مغرب کی جانب جلدی جلدی پہنچ جاتا ہے اور شام کے وقت سورج کو سمندر میں گرنے سے بچا لیتا ہے۔ اس تجویز کے مطابق نہ تو ہر روز ایک سورج کا نقصان ہوتا ہے اور نہ سمندر میں طوفان ہی برپا ہوتا ہے۔ ساری رات ولکن سورج کو کشتی میں لیے ہوئے مشرق کی طرف چلا آتا ہے اور صبح ہونے پر پھر وہی پہلے دن کا سا حساب ہوتا ہے۔

بطلیموس کا نظام اور یہ لچر پوچ توہمات یورپ میں ازمنۂ مظلمہ میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک مقبول خاص و عام رہے ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس (Copernicus) نے جو ۱۴۷۳ء میں پولینڈ میں پیدا ہوا تھا اور نیوٹن اعظم کی پیدایش سے پوری ایک صدی پہلے ۱۵۴۲ء میں مرا تھا بطلیموسی نظام اور ان قدیم توہمات اور دیو پری کی قصہ کہانیوں کا قلع قمع کیا۔ اس نے ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور یہ کہ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے نہ کہ زمین! لیکن کوپرنیکی نظام باوجودیکہ پہلے نظاموں سے بدرجہا اعلیٰ اور بہتر تھا اور آج تک صحیح مانا جاتا ہے لیکن اُس وقت یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ زمین کیوں سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے لیے ابھی ایک اور صدی کی علمی تحقیقات اور علم دوستوں کی تین پشتوں کی ضرورت تھی۔ کیپلر (Kepler) نے ۱۵۷۱ء سے ۱۶۳۰ء تک اور (Galileo) گے لی لیو نے ۱۵۶۴ء سے ۱۶۴۲ء تک اور سب سے زیادہ سر آئزک نیوٹن نے ۱۶۴۲ء سے ۱۷۲۷ء تک اپنی قیمتی عمر کی لگاتار محنت کے بعد بیشمار دوسرے ہیئت دانوں کی عمر بھر کی محنتوں کا فائدہ اُٹھا کر نظام شمسی کے مختلف افراد کی حرکتوں کو قوانینِ حرکت سے منضبط کیا۔ سب سے زیادہ قابل قدر کام جو انکی وسیع تحقیقات نے سر انجام کیا

[۱] ولکن ایک دیوتا کا نام ہے۔

وہ حرکت کے پہلے قانون کو صحیح طور پر سمجھا تھا - کیپلر نے سیارگان نظام شمسی کی حرکت کے انضباط کے لیے تین قوانین وضع کیے جو قوانین کیپلر کے نام سے موسوم ہیں لیکن وہ بھی اس عقدہ کو کہ سیارے ایک ہی مرکز کے گرد کیوں گھومتے رہتے ہیں حل نہ کرسکا - یورپ کے ایام جہالت کے توہم پرستوں کی طرح اُس نے بھی ہر سیارے کا محرک (حرکت دہندہ) ایک چابک سوار دیوتا یا روح مقرر کیا جو اپنی اَن تھک طاقت سے سیاروں کو ان کی گردشوں میں سست نہیں ہونے دیتا تھا - سب سے بڑی بات جو انسانی دماغ میں موجزن تھی وہ سیاروں کی گردش کے متعلق تھی - سیارے کیوں متحرک ہیں؟ اُس زمانہ میں عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ ہر متحرک چیز کی حرکت قائم رکھنے کے لیے ایک لگاتار کام کرنیوالی طاقت کی ضرورت ہے - یہی ایک خیال تھا جس کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا تھا -

گیلیلیو کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کوپرنیکی نظام کا ثبوت اور زمین کی حرکت کا سبب بیان کرنا ہے - لیکن پیشتر اس کے کہ ہم گیلیلیو کے طریقۂ ثبوت پر نظر ڈالیں ہم چاہتے ہیں کہ اس جلیل القدر عالِم کی پُرآشوب زندگی سے ناظرین کو مختصر الفاظ میں واقف کرادیں - گیلیلیو فلارنس کے ایک معزز گھرانے میں ۱۸ فروری ۱۵۶۴ء کو پیدا ہوا تھا - ۱۷ برس کی عمر میں پیزا ([illegible]) کی یونیورسٹی میں طب کی تعلیم کے لیے داخل ہوا - طالب علمی کے زمانہ ہی میں گیلیلیو نے اپنی خداداد ذہانت کا ثبوت اس طرح دیا کہ اپنے معلموں کو گرنے والے اجسام کے متعلق انکی غلطی سے متنبہ کیا - گے لی لیو کے زمانہ تک ارسطاطالیس یعنی ارسطو کی متابعت میں تمام یورپ اس بات کا قائل تھا کہ ایک ہی بلندی سے گرنے کا وقت مختلف وزن کی چیزوں کے لیے مختلف ہے - دنیا میں اگر بڑے نام نے صدیوں تک بنی نوع انسان کو گمراہ کیا ہے تو وہ ارسطو کا نام ہے - ارسطو کا معمول تھا کہ ناکافی مشاہدات کی بنا پر غلط نتائج جلدی سے مترتب کرلیتا تھا - ہم کسی دوسرے موقع پر ارسطو کی غلطیوں کے متعلق بحث کرینگے - یہاں صرف یہ دکھانا مطلوب ہے کہ علمی حوصلہ نام سے نہیں ڈرتا - بلکہ رعب میں آنے کے بجائے تجربہ کی طرف راجع ہوتا ہے - گے لی لیو نہ تو اپنے اُستادوں کے غلط ادعا سے متأثر ہوا اور نہ ارسطو کے باسطوت نام سے مرعوب ہوا - ایک دن علی الصبح شہر پیزا کے مینار لرزاں کے اوپر دو پتھر لے کر چڑھ گیا - ایک کا وزن ۵۰ سیر کے قریب تھا اور دوسرے کا نصف سیر - ارسطو کے قانون کے مطابق چاہیے تھا کہ اگر ۵۰ سیر وزنی پتھر زمین پر ۵ ثانیہ میں گرے تو نصف سیر وزنی پتھر اس وقت سے سوگنا زیادہ وقت میں گرے یعنی ۵۰۰ ثانیہ میں - گے لی لیو نے نہایت شدومد سے اس غلط فلسفہ کی تردید کی اور عملی طور پر دکھا دیا کہ دونوں پتھر اگرچہ ان کے وزن میں بہت فرق تھا ایک ہی وقت میں گرتے ہیں - اُس نے مینار کے کنارہ پر دونوں پتھروں کو رکھدیا اور پھر ایک ساتھ نیچے گرادیا - دونوں ایک ساتھ گرے اور ایک ساتھ ہی سطح زمین سے ٹکرائے - یہ صحیح ہے کہ ہلکے اجسام مثلاً کاغذ کے ٹکڑے وغیرہ ہوا کی وجہ سے آہستہ گرتے ہیں لیکن یہ فرق ذاتی نہیں ہے بلکہ ہوا کی رکاوٹ کی وجہ سے ہے - اگر کسی جسم مین سے ہوا نکال لیجائے اور دو مختلف چیزیں ایک ہلکی اور ایک بھاری ایک ساتھ گرائی جائیں تو وہ یکساں رفتار کے ساتھ اس خلا میں گرتی ہیں - اسی امر کی توضیح کے لیے ایک عام تجربہ Guinea and Feather Experiment گنی اور پر کے نام سے مشہور ہے - چونکہ گے لی لیو نے ایک مقبول عام خیال کی تردید کی اس لیے پیزا میں اسکی ہردلعزیزی میں فرق آگیا اور بہت سے فلسفیوں کو اس سے کینہ ہوگیا - لہذا ۱۵۹۲ء میں اس نے پاڈوا کی یونیورسٹی میں پروفیسری قبول کرلی -

دوسرا بڑا کارنامہ جو گے لی لیو نے اپنی زندگی مین کیا وہ دُوربین کی تکمیل ہے - ہم گے لی لیو کو دُوربین کا موجد نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس

حیرت انگیز ایجاد کا فخر سنہ ۱۶۰۸ء میں ایک عینک ساز مڈل برگ کے رہنے والے ہنس لیپر شے (Hans Lippershey) کے شاگرد پیشہ لڑکے کے حصہ میں آیا ہی۔ لڑکے نے دو عینک کے شیشوں کو کھیل کے طور پر ایک دوسرے کے آگے رکھ کر دیکھا تو نزدیک کے گرجا کی چوٹی اُلٹی اور بہت نزدیک نظر آئی۔ افواہ ہی کہ جرمنی کے ایک امیر آدمی نے لڑکے سے اُس کھلونے کو خرید لیا اور ایک شہزادہ کو بطور نذر پیش کیا لیکن ہمارے لیے جو ضروری بات ہی وہ یہ ہی کہ اس واقعہ کی خبر کسی نہ کسی طرح بقیہ سے گے لی لیو تک پہنچ گئی۔ خبر سنتے ہی اُس نے اس کے متعلق تحقیقات شروع کر دی۔ وہ تمام رات جاگا اور بالآخر سنہ ۱۶۰۹ء ہی میں اس نے دوربین کے نظریہ کو عملی طور پر ایک کمال تک پہنچا دیا کہ مشتری (جوپی ٹر Jupiter) کے چاند دریافت کیے۔ زہرہ اور عطارد کو دیکھا کہ وہ چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے اور ہلال اور بدر کی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ زحل کے حلقے دیکھے اور اس طرح کوپرنیکی نظام کو دوربین کی مدد سے ایک مضبوط بنیاد پر کھڑا کر دیا۔ آخری حصۂ عمر میں گے لی لیو گرنیوالے اجسام کے مطالعہ سے حرکت کے قوانین کی بنیاد ڈالتا رہا۔ آخر عمر میں اس نے ایک کتاب شائع کی جس میں بطلیموسی نظام اور کوپرنیکی نظام کے متعلق چار مکالمات درج ہیں۔ روما کے پوپ کا حکم صادر ہوا تھا کہ زمین چپٹی ہی ساکن ہی اور عالم کا مرکز ہے۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنا کفر تھا ستر برس کی عمر میں گے لی لیو کو کفر کے الزام سے روما میں طلب کیا گیا وہاں قید اور تکالیف شدیدہ[1] کے بعد بوڑھے آدمی نے تنگ آکر گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ باندھ کر زمین کے گول اور متحرک ہونے سے انکار کیا باوجود ان تمام سزاؤں کے بقیہ عمر کے لیے گے لی لیو سرکاری طور پر قید رہا۔ اسکی توبہ کے بعد فی الفور زمین کی حرکت سے انکار اور اسکے چپٹا ہونے کا بیان تمام یونیورسٹیوں میں بھیجا گیا تاکہ پروفیسر اپنی اپنی جماعتوں میں طلبا کو پڑھ کر سنائیں۔ ملٹن کی طرح گے لی لیو کی زندگی کے آخری ایام نورانی اندھیرے میں کٹے۔ وہ جس نے دوسروں کو علم کی روشنی دکھائی اور آسمانوں کی سیر کرائی تھی خود اندھا ہو کر اپنے آس پاس کی چیزوں کے دیکھنے سے عاجز ہو گیا۔ علم کی بڑھتی ہوئی روشنی کے رومائی دشمنوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ گے لی لیو کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے ساتھ اُس کے کام کا بھی خاتمہ ہو جائے لیکن انسانی کوششیں کبھی ایسے نمایاں طریقہ سے ناکام نہیں ہوئی تھیں جس طرح رومائی کوششیں علم کی روشنی کے مٹانے میں ناکامیاب ہوئیں۔ جس سال گیلیلیو مرا اُسی سال نیوٹن پیدا ہوا اور جو کام گے لی لیو نے شروع کیا تھا نیوٹن نے اُسے پایۂ کمال تک پہنچایا۔

رومائی کوششوں سے گے لی لیو کی تقریباً ساری کتابیں جلا دی گئی تھیں خود اسکے بیٹے نے اپنے باپ کے بہت سے مسودے آگ کے سپرد کر دیے تھے لیکن اسکی ایک تصنیف حرکت اور مشینوں کے متعلق موسوم میکانیک (میکینکس Mechanics) خوش قسمتی سے اسکے ایک شاگرد رشید کی وساطت سے بچ گئی تھی۔ شاگرد موصوف گے لی لیو کو اُسکی موت سے دو تین سال قبل ملنے آیا تھا اور حسن اتفاق سے یہ کتاب اپنے ساتھ لیجانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ازاں بعد اُس نے اِسکو ہالینڈ میں شائع کر دیا۔ گے لی لیو نے مدت العمر کی محنت سے اجسام کی حرکت کے متعلق اپنی جملہ معلومات کو چند قوانین کی شکل میں بیان کیا تھا۔ نیوٹن نے بعد ازاں اُنھیں قوانین کو نہایت قابلیت کے ساتھ مختصر الفاظ میں رکھا۔ آج زمانہ میں نیوٹن کی بڑھی ہوئی شہرت کے غلبہ سے حرکت کے تین قوانین نیوٹن کے قوانین حرکت کہلاتے ہیں۔

حرکت کا پہلا قانون نیوٹن کے الفاظ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہی

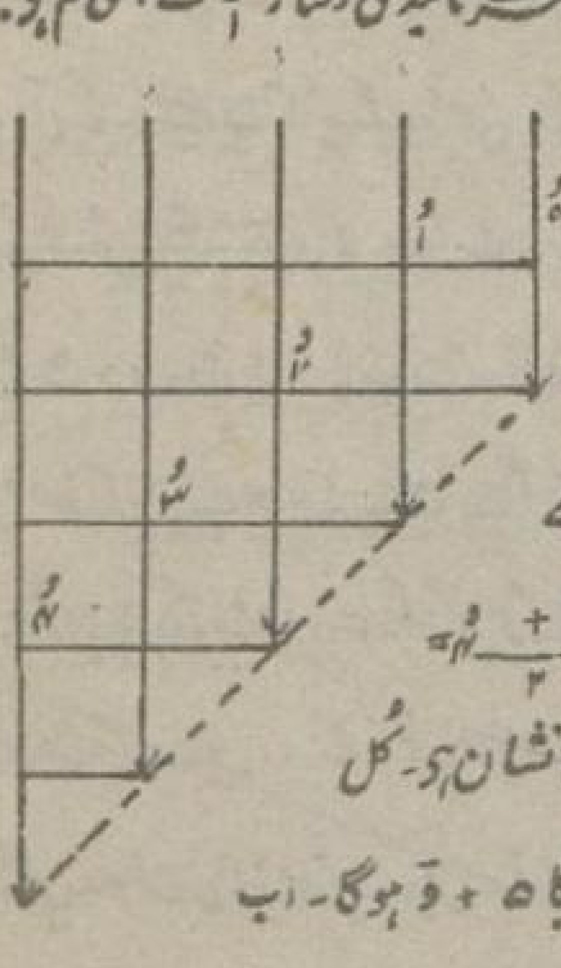
---

[1] روما میں کافروں کی تادیب کے لیے ایک ظالمانہ عدالت بنام انکویزیشن (Inquisition) قائم تھی جس کا ادنی کارنامہ یہ ہی کہ علم اور حق کی حمایت کی پاداش میں سیکڑوں آدمی چتا پر جلا دیے گئے اور ہزاروں شکنجہ کی مصائب میں مبتلا کیے گئے۔

"ہر ایک جسم تا وقتیکہ اُس پر کوئی طاقت عمل نہ کرے اپنے سکون یا حرکت کی حالت پر قائم رہتا ہے" یا بالفاظ دیگر "اگر کوئی طاقت ایک متحرک جسم پر عمل نہ کرے تو وہ ایکساں رفتار کے ساتھ متحرک رہتا ہے"

اس زبردست قانون کے متعلق چند باتیں قابل غور ہیں - اگر ایک جسم ساکن ہو تو وہ خود بخود متحرک نہیں ہو سکتا - ایک ساکن جسم میں حرکت جبھی پیدا ہوتی ہو جب کوئی طاقت اُس پر عمل کرے - اگر وہ جسم متحرک ہے تو وہ اپنے آپ یکساں رفتار[۱] کے ساتھ حرکت کرتا رہیگا - اس کی حرکت میں کمی بیشی[۲] یا کجی جبھی واقع ہوگی جب کوئی طاقت اُسپر عمل کرے ایک متحرک جسم کی حرکت قائم رکھنے کے لیے کسی طاقت کی ضرورت نہیں - طاقت کی ضرورت صرف اُسکی حرکت میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے - حرکت میں تبدیلی دو طرح پر ہو سکتی ہو - یا تو رفتار میں کمی بیشی یعنی اسراع اور تعویق ہو یا سمت بدلی جائے - نیوٹن اور گیلیلیو کے اس حصۂ کام کی زیادہ وقعت اس لیے ہے کہ ان مقدمات کی مدد سے عالم میں ستاروں وغیرہ اجرام فلکی کی حرکات بالعموم اور نظام شمسی کے افراد کی حرکات بالخصوص بنی نوع انسان کو ایسے طریقہ پر سمجھ میں آگئی ہیں کہ اب ان میں شک وشبہ یا اور کسی طرح کے ردوبدل کا امکان نہیں ہو - موجودہ سائنس یہ کہنے سے عاجز ہے کہ سب سے پہلے اجرام فلکی کی حرکت کس طرح شروع ہوئی - لیکن اگر یہ سوال خارج از بحث کر دیا جائے تو باقی مسئلہ تمامہ سائنس نے کماحقہ سمجھ لیا ہو - اگر یہ مان لیا جائے کہ مشیتِ ایزدی سے اجرام فلکی متحرک ہو گئے تو اور کسی بیرونی طاقت کی ضرورت باقی نہیں رہتی - تشریح کے لیے ہم زمین ہی کی مثال لیتے ہیں - جب یہ ایک دفعہ اپنے محور کے گرد گھومنی شروع ہو گئی تو حرکت کے پہلے قانون کے مطابق اب کسی طاقت کی ضرورت اِس محوری حرکت کے قیام کے لیے باقی نہیں رہتی - متقدمین کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ ان کے

[۱و۲] حرکت کے متعلق چند اصطلاحات ضروریہ کی تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے - اگر ایک جسم کبھی ایک مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر ہو تو اُس جسم کو متحرک کہتے ہیں گویا حرکت نقلِ مکانی کا دوسرا نام ہو - جتنا فاصلہ ایک متحرک جسم ایک ثانیہ میں طے کرتا ہو اُسے رفتار کہتے ہیں - مثلاً ایک متحرک جسم ایک منٹ میں بیس گز چلتا ہو تو اسکی رفتار (Velocity) ۲۰ گز فی منٹ یا ایک فٹ فی ثانیہ ہوگی - جس رفتار میں کمی بیشی نہ ہو یعنی مختلف اوقات پر برابر عرصہ میں برابر فاصلے طے ہوں اُسے یکساں رفتار یا حرکت یعنی (Non-accelerated Motion or Uniform Velocity) کہتے ہیں - جس کی رفتار میں کمی بیشی ہوئے وری ایبل ویلاسٹی (Variable Velocity) کہتے ہیں - ایک ثانیہ میں رفتار جس قدر بڑھتی یا گھٹتی ہو اُسے اسراع (Acceleration) یا تعویق (Retardation) کہتے ہیں - مثلاً ایک ریل گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہونے کے بعد پہلے پانچ منٹ میں دو میل اور دوسرے پانچ منٹ میں ۳ میل فاصلہ طے کرے تو اُسکی اسراع ۱/۵ میل فی منٹ ہوگی - اگر ایک جسم کو بلندی ۳ پر سے نیچے کی طرف پھینکا جائے تو زمین کی کشش سے اسکی رفتار لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جائیگی چونکہ کشش زمین ایک نہ بدلنے والی طاقت ہو - ہر لحظہ اسراع برابر مقدار سے ہوگی - فرض کیجیے کہ ایک متحرک جسم کی رفتار یکساں اسراع کے ساتھ بڑھ رہی ہے یعنی پہلے ثانیہ میں رفتار و۰ دوسرے ثانیہ کی رفتار و۱ سے اتنی کم ہو جتنی کہ و۱ تیسرے ثانیہ کی رفتار و۲ سے کم ہے وعلی ہذا القیاس و۳ اور و۴ جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے -



اوسط رفتار اِن پانچ ثانیہ میں ایسے یکساں اسراع والے متحرک جسم کی (و۰ + و۴)/۲ = وَ ہوگی یہاں وَ اوسط رفتار کا نشان ہو - کُل فاصلہ جو یہ جسم ۵ ثانیہ میں طے کریگا ۵ × وَ ہوگا - اب اگر اسراع کو و۱ - و۰ = و۲ - و۱ = و۳ - و۲ = و۴ - و۳ کو ب کہا جائے تو پہلے ثانیہ میں رفتار کی زیادتی ب ہو (باقی بر صفحہ آیندہ)

(باقی بر صفحہ آیندہ)

نزدیک حرکت جاری رکھنے کے لیے ایک مستقل طاقت کی ضرورت تھی اُور اسی لیے انھیں اتنی دور از کار تاویلیں کرنا پڑتی تھیں۔ ایک آدمی جو **بائیسکل پر بیٹھا "بائیسکل چلا رہا ہے"** فی الاصل اپنی طاقت بائیسکل کو حرکت دینے میں صرف نہیں کرتا بلکہ اُس مزاحمت کے اثر کو رفع کرنے کے لیے طاقت صرف کرتا ہے جو بوجہ راستہ کی رگڑ اور ہوا کی رُکاوٹ کے بائیسکل کی رفتار میں تعویق پیدا کرتی ہے۔ اگر راستہ بالکل صاف اُور بغیر رگڑ (Friction) کے ہو تو صرف ہوا کی رُکاوٹ باقی رہجاتی ہے اور اس حالت میں بائی سکل کی رفتار یکساں رکھنے کے لیے کم طاقت صرف کرنا پڑتی ہے ازاں بعد رفتار کی کمی جو رگڑ اور ہوا کی مزاحمت سے پیدا ہوتی ہے طاقت کے صرف سے پوری کیجاتی ہے۔ اگر یہ نہو تو بائیسکل ابد الآباد تک ایک سیدھی لکیر میں یکساں رفتار کے ساتھ چلتی رہے بعینہ یہی مثال اجرام فلکی کی حرکت کے لیے مفید ہوسکتی ہے۔ اجرام فلکی ایک دفعہ متحرک کیے گئے ہیں۔ ان کے رستہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو حرکت کی مزاحم ہوسکتی ہے۔ اس لیے اب ابد الآباد دائمی حرکت یکساں حالت میں جاری رہیگی۔ راستہ کی رگڑ وغیرہ کے علاوہ اور بھی اسباب حرکت کے مانع ہوسکتے ہیں۔ مثلاً اگر بائی سکل کے بریک باندھ دیے جائیں تو بائیسکل کی رفتار کم ہو جائیگی۔ اسی طرح زمین کی محوری حرکت کی حالت میں جہاں تک سائنس کی معلومات کام کرسکتی ہیں کوئی ایسی طاقت از قسم راستہ کی رگڑ وغیرہ نہیں ہے۔ اس لیے سائنس داں امید کرتے ہیں کہ اگر کوئی اُور ایسی طاقت جس کا اُنھیں فی الحال علم نہیں ہے زمین کی محوری حرکت بند یا سست[1] نہ کردے تو زمین ہمیشہ یکساں رفتار کے ساتھ اپنے محور کے گرد حرکت کرتی رہیگی اور گردش لیل و نہار کبھی منقطع نہ ہوگی۔

زمین کی سالانہ حرکت جس میں سورج کے گرد یہ گھومتی ہے اسی طرح نقص یا زیادتی سے آزاد خیال کیجاتی ہے۔ حرکت کے پہلے قانون کے مطابق زمین کو ایک خط مستقیم میں حرکت کرنا چاہیے لیکن یہاں ہمیں ایک اور مستقل مرکزی طاقت سے واسطہ پڑتا ہے۔ سورج چونکہ زمین سے بہت بڑا ہے اس لیے تجاذب مادی کے عالمگیر قانون کے مطابق زمین سورج کے مرکز کی طرف کھینچی جاتی ہے۔ پس یہاں دو طاقتوں کا مقابلہ ہے۔ ایک تو وہ طاقت جس نے ہمیشہ کے لیے زمین کو ایک خط مستقیم پر چلا دیا ہے اور دوسری سورج کی کشش جو ہر لحظہ عمل کر رہی ہے۔ ان دونوں قوتوں کی مثال آسانی سے یوں دیجاسکتی ہے۔ ایک پتھر کو کسی رسی کے ایک سرے سے باندھیے۔ دوسرے سرے کو پکڑ کر پتھر کو زور سے گھمائیے۔ آپ محسوس کرینگے کہ پتھر کی Centrifugal Porce (یعنی وہ طاقت جس کی وجہ سے پتھر مرکز سے دور بھاگنا چاہتا ہے) کی وجہ سے رسی آپ کے ہاتھ سے چھوٹ جانا چاہتی ہے لیکن آپ کے ہاتھ کی Centripetal Force (یعنی وہ طاقت جو پتھر کو مرکز کی طرف کھینچتی ہے) پتھر کو ایک دائرہ میں گھماتی ہے۔ جتنے زور سے آپ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) دوسرے میں ۲ × ب۔ تیسرے میں ۳ × ب وغیرہ وغیرہ۔ ت ثانیہ میں رفتار کی زیادتی = ت × ب آخری ثانیہ کی رفتار برابر ہوتی ہے حاصل جمع رفتار کی زیادتی کے۔ اسلیے ت ثانیہ کے بعد قطعی رفتار = ق + ت × ب = لہٰذا اوسط رفتار و = (ق + ق + ت × ب) / ۲ = ق + ½ ت × ب اور کل فاصلہ جو اس اثنا میں طے ہوا = ت × و = ت ق + ½ ب ت² = اگر ایک جسم سکون کی حالت سے شروع ہو تو چونکہ ق صفر کے برابر ہے د = ½ ب ت² = اگر ایک جسم ساکن زمین کی طرف سکون کی حالت سے گرایا جائے تو مشاہدہ سے دیکھا گیا ہے کہ پہلے ثانیہ میں ۱۶ فٹ گرتا ہے دوسرے ثانیہ میں ۴۸ فٹ تیسرے میں ۸۰ فٹ وعلیٰ ہذا القیاس۔ گویا پہلے ثانیہ میں رفتار ۱۶ فٹ فی ثانیہ دوسرے میں ۴۸ فٹ فی ثانیہ اور تیسرے میں ۸۰ فٹ فی ثانیہ ہوتی ہے۔ لہٰذا زمین کی کشش کا اسراع ۳۲ فٹ فی ثانیہ ہے۔ کل فاصلہ جو یہ جسم ایک ثانیہ میں طے کرتا ہے ۱۶ فٹ ہے۔ دو میں ۶۴ فٹ تین ثانیہ میں ۱۴۴ فٹ وعلیٰ ہذا القیاس۔

[1] ہمنے ایک جداگانہ مضمون میں جس کا عنوان "کیا زمین کی حرکت فی الواقع سست ہو رہی ہے" ہے اس موضوع پر مفصل بحث لکھی ہے۔

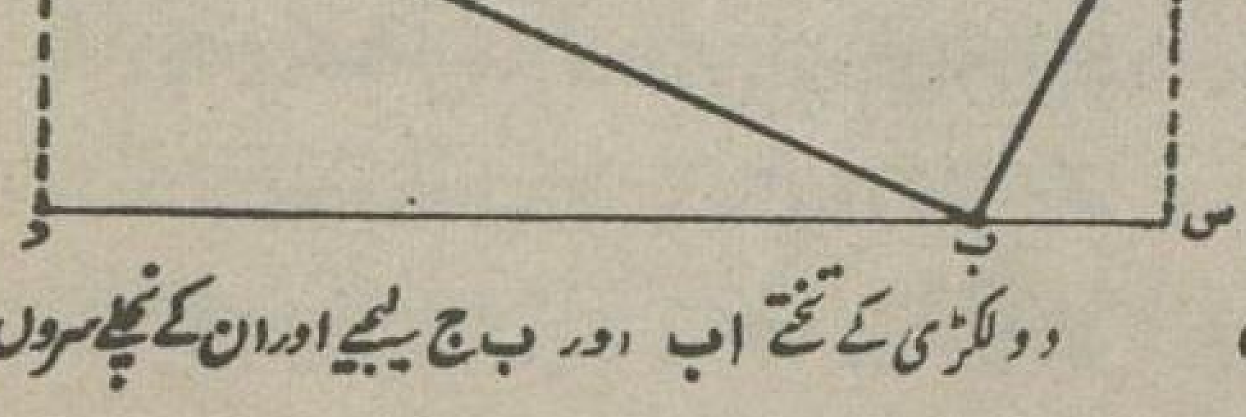
پتھر کو گھمائیں گے اُتنے ہی زور سے آپ کو مضبوطی کے ساتھ رسی پکڑنی ہو گی اور جتنی رسی لمبی ہو گی اُتنا ہی زیادہ وقت ایک دائرہ کی تکمیل کے لیے درکار ہوگا- اگر آپ رسی کو ہاتھ سے چھوڑ دیں تو پتھر سیدھا ایک سمت میں جائیگا اُسی سمت میں جس میں وہ اُس وقت حرکت کر رہا تھا جب آپ نے ہاتھ سے رسی چھوڑی- بالکل یہی حالت سورج اور زمین کے درمیان ہی- رسی کے بجائے یہاں تجاذبِ مادی کی باہمی کشش ہی جسکے لیے کسی مادی میڈیم (Medium) (اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ یا جس کے بیچ میں سے گزر کر کوئی اثر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہو) کی ضرورت نہیں ہی- جب تک سورج کی کشش میں کوئی فرق نہیں آئیگا زمین اپنی سالانہ گردش میں متواتر مصروف رہیگی-

پس ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت کے تجربہ خانہ (معمل - لےبارےٹری Laboratory) میں حرکت کے پہلے قانون کا ثبوت ہمارے مشاہدہ میں ایک عظیم الشان پیمانہ پر آتا ہی- ہمارا نظریہ ہی کہ فضای بسیط کے ایتھر میں یہ خاصہ ہی کہ اجرام فلکی اس میں بغیر رگڑ کے حرکت کرتے ہیں لہذا چونکہ حرکت کی کمی کے لیے کسی طاقت کی ضرورت ہی اور اجرام فلکی کی حرکت کم کرنیوالی کوئی طاقت نظر نہیں آتی امید ہی کہ یہ حرکت ہمیشہ کے لیے قائم رہیگی یہاں تک کہ کوئی غیر متوقع حادثہ جو سردست ہمارے ادراک سے باہر ہی نظام عالم کا خاتمہ نہ کرے-

ہم زمین پر حرکت کے پہلے قانون کا ثبوت صرف ایک نامکمل طریقہ سے دے سکتے ہیں- اس لیے کہ رگڑ وغیرہ حرکت کی کم کرنیوالی طاقتیں ہم کبھی معدوم نہیں کر سکتے ہاں ان کو ایک خاص حد تک جتنا چاہیں کم کر سکتے ہیں اور اس حد تک اپنے مشاہدات کو وسیع کر سکتے ہیں- گزشتہ صدی کے ایک نہایت ہی قابل سائنس داں کلارک میکسویل (Clerk Maxwell) نے حرکت کے پہلے قانون کو اس طرح ثابت کیا تھا کہ اُس نے مخراج الہوا کے ذریعہ سے ایک برتن میں سے جہاں تک اس سے ہو سکا تمام ہوا نکال لی اور پھر اپنا بنایا ہوا ایک بہت بڑا لٹو (Top) اُسکے اندر گھمایا تو گھنٹوں تک اُسکی حرکت بند نہیں ہوتی تھی- حالانکہ کھلی ہوا میں بہت جلدی اُسکی گردش جاتی رہتی تھی- اسی طرح صاف زمین پر ایک گول پتھر بہت دور تک لڑھکتا ہوا چلا جاتا ہی اور اگر برف کی صاف سطح میسر ہو تو پتھر کی حرکت بہت سا فاصلہ طے کرنے کے بعد ضائع ہوتی ہی- رگڑ کے کم کرنے کے لیے کلوں کے پرزوں کو تیل (جس کو اصطلاح میں لُبری کنٹ Lubricants کہتے ہیں) لگایا جاتا ہی- گریفائٹ (Graphite) جس سے غلط طور پر مشہور سیسہ کی پنسلیں بنتی ہیں رگڑ کم کرنے کے لیے کئی تیلوں سے بہتر ہی- لیکن کیسا ہی عمدہ سے عمدہ لُبری کنٹ کیوں نہ ہو تھوڑی بہت رگڑ ضرور باقی رہتی ہی- لہذا یہ تمام تجارب جن میں ایک ٹھوس جسم کی حرکت دوسرے ٹھوس جسم کے مقابلہ میں دیکھی جاتی ہی- ذیل کے تجربہ سے افضل نہیں ہیں-

ایک باریک دھاگا یا تار کو کسی اونچی جگہ باندھیے اور نچلے سرے کے ساتھ ایک بھاری جسم لٹکا کر اسے ہلا دیجیے- آپ دیکھیں گے کہ کہ وہ بھاری جسم بہت دیر تک ادھر سے اُدھر تک حرکت کرتا رہیگا اور اگر یہی تجربہ خلا میں کیا جائے تو اور بھی زیادہ کامیاب ہو گا-

گےلی لیو کا اصلی تجربہ جس کی بنا پر حرکت کا پہلا قانون وضع ہوا ہوا تھا اس قابل ہی کہ اسے غور کے ساتھ سمجھا جائے-



دو لکڑی کے تختے اب اور ب ج لیجیے اور ان کے نچلے سروں

کو ملا کر ڈھلوان رکھ دیجیے اس طرح کہ خطِ مستقیم س ب د سے ان کے اوپر کے سروں کا عمودی فاصلہ برابر ہو۔ گے لی لیو نے مشاہدہ کیا کہ اگر ایک جسم ایک تختہ کی چوٹی پر رکھ کر چھوڑ دیا جائے تو اُس میں اتنی حرکت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسرے تختہ کی چوٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر دونوں تختے کافی صاف ہوں اور رگڑ بہت کم ہو تو دوسرے تختہ کی لمبائی خواہ کتنی زیادہ ہو لڑھکتا ہوا جسم اُسکی چوٹی تک پہنچ جائیگا بشرطیکہ اسکی عمودی بلندی پہلے تختہ کی عمودی بلندی کے برابر ہو۔ بہ الفاظ دیگر رفتار کی کمی اگر رگڑ نہ ہو تو صرف عمودی بلندی سے واقع ہوتی ہے پس انتہائی حالت میں اگر دوسرا تختہ بالکل افقی ہو اور اس میں رگڑ نہ ہو تو حرکت و رفتار میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی یعنی متحرک جسم ابد الآباد تک ایک افقی خطِ مستقیم میں یکساں رفتار کے ساتھ حرکت کرتا رہے گا۔

حرکت کے پہلے قانون کا یہ نظری ثبوت اس قابل ہے کہ اسکے متعلق مفصل بحث کی جائے لیکن ہم طوالت کے خوف سے اسی اجمال پر اکتفا کرتے ہیں۔

فیروز الدین مراد

تحصیل سائنس کی اہمیت

انگلستان کے مشہور فلاسفر فرانسس بیکن نے ایک کتاب نیو اٹلانٹس (New Atlantis) کے عنوان سے لکھی تھی جس میں کامل سوسائٹی اور قابل نمونہ انتظام ریاست سے بحث کی ہے۔ وہ ایک جگہ "سلیمان کے مکان" کی بابت کہتا ہے :-

> اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ موجودات کی مخفی حرکات، انقلابات اور اسباب کا علم حاصل کریں، اور بنی آدم کی سلطنت کی حدود کو وسیع کریں تاکہ وہ سب چیزوں پر حاوی ہو جائے۔

اس سے بیکن نے علم سائنس کا منتہائے کمال ظاہر کر دیا ہے جس کی غایت نہ صرف کائنات کے اندرونی تغیرات و تبدلات کے اسباب و نتائج کا کھوج لگانا بلکہ انسانی علوم کو اتنا وسیع کرنا ہے کہ کوئی شے زمین و آسمان میں ان کے احاطہ سے باہر نہ رہنے پائے۔

تجربی علم کی ضرورت

لوگ پوچھتے ہیں کہ سائنس کے کیا فائدے ہیں؟ کیوں اپنے لڑکوں کو طبیعات کیمسٹری وغیرہ پڑھائی جائے؟ اس سے تو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہم ایسے غیر مفید علموں کی تحصیل میں کیوں اپنا وقت، اپنی دماغی محنت، اور روپیہ صرف کریں؟ جو لوگ زندگی کو بنیا گری کے اصول پر بسر کرنا چاہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی بنیے بقالوں کی طرح ہر معاملہ میں نفع و نقصان کو مدنظر رکھتے ہیں انھیں جیالوجی، فلکیات، باٹنی، زوآلوجی، بیالوجی، کے مطالعہ کے استفادہ سے خبر نہیں لیکن سائنس کی کائنات اسی جگہ ختم نہیں ہوتی۔ وسیع ترین معنی میں اس کا اطلاق تمام اُن علوم و فنون پر ہوتا ہے جو انسان نے صدیوں کی دماغی محنتِ شاقہ اور ذہنی کاوش سے حاصل کیے ہیں اور نیز اس سے مراد ایسا علم بھی ہے جس کی صحت کی تجربہ سے تائید و تصدیق ہو سکتی ہے ایسا علم حاصل کرنا ہر ایسے انسان کے لیے لازمی ہے جو کشاکش زیست میں اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں عہدہ برآ ہونا اور مہذب و متمدن اقوام کے افراد کے ساتھ مساویانہ رابطہ کرنے کا آرزومند ہے۔ تحصیل سائنس کے فوائد کا پوچھنا گویا علم کی ضرورت اور اہمیت پر شک کرنا ہے۔

سائنسی اختراعات کی خدمات

سائنس کے فوائد پر مطول بحث کرنا لاحاصل ہے۔ ہم اسکے بعض اکتشافات اور فتوحات کا مختصر ذکر کیے دیتے ہیں جس سے اس کی فیض رسانی آپ پر

منکشف ہو جاتی ہے۔ یہ تار جو تھوڑی سی دیر میں ایک روپیہ کے صرفہ سے آپ کے عزیز کو آپ کا پیام بمبئی میں پہنچا دیتا ہے سائنس کی اختراع ہے۔ ریل گاڑی کا انجن جو ہزاروں من بوجھ ایک دن میں سیکڑوں میلوں پر لیجا کر ڈال دیتا ہے سائنس کے توسط سے وجود میں آیا تھا۔ دیا سلائی کی ڈبیا جس سے آپ کئی ہفتوں تک کام لیتے ہیں سائنس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اسی طرح آٹا پیسنے، کپڑے بُننے، سُوت کاتنے، کپڑے سینے کی کلیں، گاڑیاں، موٹر کار اور سیکڑوں آلات جو ہماری جسمانی راحتوں کے ضروری ستون ہیں سائنس ہی کے معجزے ہیں۔ یورپ کیوں تمام دنیا پر حکمران ہے؟ سائنس کے زور سے جاپان نے کیوں روس ایسی زبردست سلطنت کو جس سے بڑی بڑی سلطنت خائف رہتی تھیں تھوڑے ہی عرصہ میں تمام دنیا میں ذلیل و خوار کیا اور اب ترقی یافتہ اقوام کی اگلی قطار میں کھڑا ہے؟ سائنس کی بدولت۔ الغرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ سائنس کے اکتشافات کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

سائنس کا مقصد

سائنس کا اصل مقصود یہ ہے کہ اشیا کے انقلابات کا مشاہدہ کرے۔ اشیا اور ان کے تغیرات کے درمیان جو تعلق ہے اُسے دیکھے۔ اور نیز یہ دریافت کرے کہ اشیا یعنی اسباب و نتائج کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا لگاؤ ہے اور جو شخص موجودات کے مشاہدہ اور اپنے مشاہدہ کے صحیح صحیح حالات قلم بند کرنے یا کائنات کے اندر کوئی بڑا قانون معلوم کرنے کی دُھن میں مستغرق رہتا ہے وہ سائنس کے فوائد کی داستان سننے کی چنداں پروا نہیں کرتا۔ کئی اعتبار سے سائنس صناعی کی طرح ایک ہنر بنجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صناع قلم اور برش سے مختلف رنگ ملا کر ایک صورت پیدا کر دیتا ہے مگر سائنس داں اپنے قلم سے اشیا کا ایسا چشم دید اور واضح بیان لکھتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے ایک لفظی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ سائنس ایک ہنر یا پیشہ ہے جو انسان کی ذہنی راحت اور اخلاقی مسرت کا موجب ہوتا ہے۔ بیکن کہتا ہے:۔

اور جتنی خوشیاں ہیں ان میں ایک یہ بات عجیب ہے کہ ان سے طبیعت بہت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ جب طبیعت کو ایک دفعہ حظ حاصل ہو گیا تو وہ بعد ازاں بدمزہ اور پھیکی ہونے لگتی ہے۔ مگر علم کی خوشی کی یہ کیفیت ہے کہ طبیعت بھرتی ہی نہیں۔ جی اُکتاتا نہیں بلکہ جتنا حاصل کرو اور لطف اُٹھاؤ اتنا ہی اشتہا تیز ہوتی ہے۔ اس لیے تحصیل علم کی خوشی مستقل، اعلیٰ، اور پاک ہے۔

اس امر پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ خوشی اور شادمانی اخلاقی، روحانی، ذہنی اور جسمانی زندگی کے لیے کتنی ضروری اور مفید ہے۔ سو غذاؤں کی ایک غذا خوشی اور شادمانی ہے۔ اگر آپ کا دل مغموم اور کبیدہ ہے تو آپ کوئی کام انجام نہیں دے سکتے اگر طبیعت پر ظلم کر کے کیا بھی تو وہ خوبی اور کمالیت کبھی نہیں پیدا ہو سکتی جو شاداں و خوش دل سے ممکن ہے۔ اس واسطے سائنس کے مطالعہ اور نئی نئی باتوں کی ٹوہ میں رہنے سے راحت قلبی اور لطف عقلی حاصل ہوتا ہے جو زندگی کے جھگڑے کے پہیوں کے لیے بمنزلہ تیل کے ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو شور و غل پیدا ہوتا اور رفتار دھیمی رہتی ہے۔

سائنس اور روزانہ زندگی

تحصیل سائنس کے لیے ضروری نہیں کہ آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی بڑی یونیورسٹی میں داخل ہوں اور وہاں اسکے مختلف شعبوں کا بڑے بڑے محققوں اور عالموں کے زیر نگرانی مطالعہ کریں۔ نہیں نہیں۔ آپ سائنس کے مسائل سے روزمرہ کے کاروبار میں دوچار ہوتے ہیں اور جس ڈھنگ سے مختلف ملکوں اور صدیوں میں روزانہ ضروریات زندگی کو بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی اس سے سائنس کو ترقی نصیب ہوئی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اگر آپ سائنس کے مسائل کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے گا تو یہ امر بخوبی ثابت ہو جائیگا۔ آپ علم نباتات کو لیجیے۔ باغوں کے پودوں، ان کے خواص و فوائد، کھیتوں کی جڑی بوٹیوں کی معمولی واقفیت سے اسکی ابتدا ہوئی۔ یہی حال طب کا ہے۔ جڑی بوٹیوں کے خواص اور فوائد کے علم کی وسعت سے اس علم کی بنیاد پڑی۔ جو علم الحیوٰۃ (بیالوجی) کی ایک شاخ ہے۔ پھر پودوں کو پھل پھول کی خاطر لگانے اور ان سے عمدہ اور بکثرت پھل

حاصل کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ اس لیے خاص طریقہ وضع کیے جاتے ہیں جو سب کے سب علم نباتات کے تحت میں آتے ہیں۔ یہی کیفیت علم حیوانات (زوآلوجی) کی ہے جو خانگی جانوروں یعنی کتے، بلی، گائے، بھینس، گھوڑے، خچر، بھیڑ، بکری، مرغ، کبوتر، تیتر، بٹیرسے شروع ہوتا ہے۔ پھر اس کا تصرف علاقہ کے جانوروں پر ہوا۔ بعد ازاں ضلع پھر صوبہ پھر ملک اور اخیر میں تمام دنیا کے چرند و پرند اسی کے ماتحت نظر آتے ہیں۔ گویا سائنس ہمارے گھروں میں وجود قبول کرتا ہے اور ہماری خدمت گزاری کے لیے ہے جسے اگر وفادار خانہ زاد کے نام سے پکارا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا۔

روزمرہ ضروریات زندگی سے سائنس پیدا ہوا

پروفیسر ایپی نس کا یہ مقولہ ہے کہ "عمل خیال پر مقدم رہتا ہے" یعنی ہم عملاً سائنس کی بہت سی باتیں سیکھ لیتے ہیں۔ تجربے کرتے رہتے ہیں لیکن نظریہ یا مسئلہ بعد ازاں بنتا ہے جبکہ ہم اپنے علم کو معقول اصول اور طریقہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اب آپ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ سائنس کا ہماری عملی زندگی سے کتنا اہم اور قریبی تعلق ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ نامعقول اور سائنس کے متضاد نہیں جیسا کہ سائنس کی چند کتابیں پڑھ کر بعض لوگ اپنے کو منتہی تصور کرنے لگتے ہیں اور بعض مروجہ دستوروں اور رایوں کو دقیانوسی، فرسودہ، ناموافق زمانہ، ٹھہرانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ تمام علوم، سائیکالوجی اور سوشیالوجی کے ماسوا، قوم کے روزانہ کاروبار اور تجربہ سے وجود قبول کرتے ہیں۔ ریاضیات مجرد علم سے سمجھا جاتا ہے لیکن اسکی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ تجربہ اور روزانہ کاروبار کے درمیان اسکی ولادت ہوئی تھی۔ پروفیسر ٹی۔ کیس صاحب لکھتے ہیں :-

حساب کی ابتدا ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کی گنتی سے ہوئی تھی اور مساحت نے ہاتھ پاؤں اور بازوؤں کی لمبائی چوڑائی سے وجود حاصل کیا تھا۔ مدت تک ہاتھ اور بازو کی لمبائی اجسام کے طول و عرض کی پیمائش کا پیمانہ تسلیم ہوتی رہی۔ مساحت کی معنی زمین کا پیمانہ ہے۔ مصریوں کی سب سے پہلی اور پرانی کتاب اس فن پر ۱۷۰۰ ق م میں تصنیف ہوئی تھی جس میں سطح سقوف، مخروطی مینار، کھلیان، اور دیگر چیزوں کی پیمائش کا ذکر ملتا ہے۔ الغرض ریاضیات کا آغاز محسوسات سے ہوا اور رفتہ رفتہ مجردات کی بحث میں غائب ہوگیا۔

سائنس کا دھرم پتا

یہ امر قابل غور ہے کہ سائنس نے ہمارے معمولی پیشوں اور ہنروں کے جگھٹے میں جنم لیا تھا مگر یہ ایک اہم اخلاقی پہلو بھی لیے ہوئے ہے۔ مسٹر براؤن فرڈ لکھتے ہیں :-

ہم اپنے بزرگوں کی یاد کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جیسے محقق طبعیات لوہار ہے اسی طرح ماہر نباتات کسان۔ اور عالم حیوانات شکاری۔ جغرافیہ داں ملاح، مورخ بافروش ڈاکٹر جادوگر، اور قانون داں مُلّا ہے۔ رہا ریاضی داں، اس کا علم بہت سے پیشوں اور ہنروں سے ماخوذ ہوا ہے اور سب سے پرانا ہے۔ اگر وہ اپنے علم کی ابتدا اور اسکی عہد بہ عہد ترقیوں پر غور کرے تو وہ اپنے کو تمام زمانوں اور قرنوں کے پیشہ وروں کا وارث پائیگا۔ پھر اسے ہمارے تمام دھندوں سے بہت ہمدردی پیدا ہوجانی چاہیے۔ اس اہم امر کو کبھی مت بھولو کہ تمام علم اور علمی مسائل اور علوم کے شعبے ابتدائً اس تجربہ سے وجود پذیر ہوئے جو انسان نے مختلف ہنروں سے حاصل کیا تھا۔ یہ مت سمجھو کہ سائنس کوئی جانور ہے جو آسمان میں اُڑتا پھرتا ہے۔ اور اسے ہمارے دنیا کے روزانہ مخمصوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے اور کسی نامعلوم طریقہ سے ترقی کرتا رہتا ہے... سائنس شروع شروع میں اُن کوششوں اور خواہشوں سے پیدا ہوا تھا اور پیدا ہو رہا ہے جو اسکے دل میں موجودات کے انقلابات اور باہمی راہ و رسم کی تہ میں ابتدائی اصول دریافت کر کے اپنے پیشوں میں کمال حاصل کرنے کے متعلق پیدا ہوئی تھی۔

مختلف علوم کی گوناگوں خدمات

سائنس کے فوائد اور اس سے انسان جو خدمات حاصل کر رہا ہے انکا ذکر قدرے وضاحت سے کرنا چاہیے۔ بسنہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں مسٹر ہنکس نے ایک کتاب فلکیات پر لکھی تھی اور ایک جگہ اُسکے عملی فوائد کا ذکر کیا ہے جسے ہم نقل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

جہازرانی فلکیات ہی کے وسیلہ سے ہوتی ہو۔ زمین کی پیمائش کرنے اور نقشے مرتب کرنے والے اسی علم کی بدولت روٹی کھاتے ہیں۔ وہ دنیا کو صحیح وقت بتاتے ہیں۔ سمندر میں جو جہاز چلتے ہیں فلکی انھیں پیام بے تار کے وسیلہ سے دن اور وقت بتاتے رہتے ہیں۔ کیمسٹری کے معرض وجود میں آنے سے پہلے یوزہ کشی، صابون سازی اور رنگسازی کا رواج تھا لیکن علم کیمیا کی بدولت کتنی دست کاریاں اور فن پھیل رہے ہیں ان کا بیان کرنا ہی دشوار ہی۔ خام سونے چاندی اور دیگر دھاتوں کو اسی علم کے وسیلہ سے صاف اور خالص کیا جاتا ہو۔ کول تار سے بنزوئن بنتی ہو اور اس سے اسکے اور بہت سے مرکبات طیار ہوتے ہیں۔ مصنوعی رنگ جیسے نیل کیمیا ہی کے وسیلہ سے تیار ہوتا ہو۔ فولاد کو بہتر بنایا جاتا ہو۔ برقی قوت کے وسیلہ سے جو چیزیں تیار ہوتی ہیں وہ کیسی اعلیٰ ہوتی ہیں۔ زمین کو زرخیز بنانے کے لیے نائٹروجن سے کام لیا جاتا ہو۔ یہ سب کیمسٹری کے کرشمے ہیں۔ طبعیات کی بدولت تار، ٹیلیفون، بے تار برقی، برقی انجن، اور اڑنے کی کلیں تیار ہوگئی ہیں۔ جمادات اور علوم ارضیہ کی بدولت لوہا، سیسہ، تانبا، اور دیگر فلزات، کوئلہ وغیرہ صدہا چیزیں انسان کے فائدہ کے لیے دستیاب ہو رہی ہیں۔ دبے خزانے شکم زمین سے برآمد ہوگئے ہیں اور ہو رہے ہیں سمندر سے مچھلیاں نکل رہی ہیں اور علم حوادث ارض وسما سے جانیں بچ جاتی ہیں اور فصلوں کی بابت پہلے ہی سے کچھ علم ہوجاتا ہی کہ کیسا موسم ہوگا اور اس سے کس قسم کی فصلیں ہونے کی امید ہو۔ اس علم سے موسموں کے تیز متبدل اور اسکے وسیلہ سے زرعی پیداواروں کی آیندہ کیفیت معلوم ہوجاتی ہے۔ بیکٹریا (Bacterica) جراثیم کے انکشافات سے فن جراحی، حفظان صحت اور زراعت پر نہایت عمدہ اثر پڑا ہو اور اس سے اشیائے خوردنی بھی دیر تک محفوظ رہ سکتی ہیں فزیالوجی کے انکشافات سے افعال اعضا کے عیب معلوم ہوگئے ہیں۔ منڈل کے معلوم کردہ قانون توارث (Law of Heredity) سے ہم گھریلو جانوروں کی نسل عمدہ بنا سکتے ہیں اور اس سے کام لیکر پودوں کی قدرتی حالت کو بدل سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے تیرہ اختراعات

ڈاکٹر والس نے ایک کتاب لکھی ہو جس میں انیسویں صدی کی اختراعات کا ذکر کیا ہو۔ وہ لکھتے ہیں گذشتہ صدی میں تیرہ اختراعات سے روزانہ کاروبار میں کام لیا گیا اور انکی بدولت ہمارے طرز معاشرت میں مستقل انقلاب پیدا ہوگیا ہو۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ ریلوے، اسٹیم انجن کے وسیلہ سے جہازرانی تار برقی، ٹیلیفون، دیاسلائی، گیس کی روشنی، برقی روشنی، فوٹوگرافی، فونوگراف، ایکسرے، اسپکٹروسکوپ کے ذریعہ سے تاروں کے اجزائے ترکیبی معلوم کرنے کا طریقہ، مخدرات (Anaesthetics) کا استعمال اور اپریشن کے بعد زخم کو ایسے طریقہ سے باندھنے کا ڈھنگ جس سے مفرح جراثیم اسے خراب نہ کرسکیں۔ اس سے پیشتر کی صدیوں کی نہایت مفید اختراعات دوربین، چھاپہ، قطب نمائے بحری، اعداد، اور رسم الخط ہیں۔ اور انکے ساتھ مقیاس الہوا اور اسٹیم انجن بھی شامل ہوسکتا ہو۔ علم تراشہائے مخروطی اور علم ہندسہ سے جہازوں، قلعوں، عمارتوں وغیرہ کے بنانے میں ہمیں کس قدر فائدہ حاصل ہو رہا ہے بیسویں کلیں اقلیدس کے قاعدوں سے بنتی اور چلتی ہیں جس سے ہمارے سیکڑوں کام انجام پذیر ہوتے ہیں اور ہمیں بیحد نفع پہنچ رہا ہو۔ فرانس کے مشہور محقق پاسٹر (Pasteur) کی تحقیقات سے بنی آدم کو کتنا عظیم نفع پہنچ رہا ہو اسکے مسئلہ جراثیم کے انکشافات سے کیمیائی حرفتوں میں انقلاب پیدا ہوگیا۔ اب سگ گزیدگی کا خاطر خواہ علاج ہوتا ہو۔ مرغوں مرغیوں اور مویشیوں کی وبا کا انسداد ہوسکتا ہو۔ اسکی دریافت سے جوزف لسٹر نے جراحی میں کام لیا اور اس طرح کا خاطر خواہ انتظام کرلیا کہ اپریشن کے بعد زخم سڑنے نہ پائے۔ الغرض کہاں تک بیان کیا جائے کہ سائنس انسان کی خدمت کس طرح کر رہا ہو۔ ہربرٹ اسپنسر نے اسکا فیصلہ کردیا ہو۔ وہ کہتا ہے "سائنس زندگی کے لیے ہو اور زندگی سائنس کے واسطے"۔ پروفیسر آرتھر جے ٹامسن کہتے ہیں:۔

بیشک سائنس زندگی کے راحت و آرام کے لیے ہو۔ مگر "زندگی" کی نسبت کوئی تنگ خیال نہ ہونا چاہیے۔ کیا زندگی کھانے پینے سے زیادہ نہیں ہو اور کیا لباس جسم سے زیادہ نہیں ہو؟ آج کل کی مہذب قوموں کے نوجوانوں کی زندگی کا کچھ

حصہ سائنس کی تحقیقات کے لیے بھی ہونا چاہیے ورنہ وہ تہذیب کے تمام لوازم سے بہرہ یاب نہیں ہوں گے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ سائنس ہی مہذب آدمی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے بشرطیکہ اُسے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

سائنسی مطالعۂ فطرت کا اثر اخلاق ذہن اور روح پر

سائنس ہماری تمدنی راحت و آرام میں اضافۂ کثیر کرنے کے علاوہ ہمارے ذہن کی تربیت کرتا ہے۔ ہمیں صحیح صحیح مشاہدہ کرنے کی تلقین دیتا ہے۔ ہمارا دماغ سوچنے اور غور کرنے کے قابل بنتا ہے۔ ہماری قوتِ ممیزہ شستہ اور قوتِ استدلال صائب اور قوی بنتی ہے۔ سائنس سے موجودات اور اپنے اردگرد کی اشیا کا بغور ملاحظہ ضروری ہے۔ اس سے ہم ان کے درمیان مشابہت یا اختلاف، اتحاد نوعی یا تفرقِ جنسی دیکھتے ہیں جس سے رفتہ رفتہ ذہن بال کی کھال اُتارنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیالات اور آرا پختگی، اصابت، اور معقولیت حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا علم حقیقی اور صحیح علم بنتا ہے۔ کتابی علم مردہ ہوتا ہے۔ سائنس ہمارے اخلاق کو بھی سدھارتا ہے۔ ہم کائنات کی خوبصورتی کی قدر کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم مناظرِ طبعی سے حظ حاصل کرتے ہیں۔ زمین و آسمان کی اشیا ہمارے مشاہدے کے لیے ہیں اور ہم ان سے لطف اٹھانے کے مجاز ہیں اور سب کے اخیر میں سائنس حاسۂ مذہب اور ایمان قادر علی الاطلاق کو قوی اور اعلیٰ بناتا ہے۔ ہم کائنات کے اندر ہزاروں عجائبات دیکھتے ہیں اور جب اُن کی بناوٹ اور ماہیت پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو صانع حقیقی کی صنعت کاریوں اور اُسکی حکمت و دانش کی بےحد تعریف کرتے ہیں بلکہ عقل حیران ہو جاتی ہے اور اُسکی قدرتِ لایزال اور ہستیِ لازوال کی بےاختیار داد دیتے ہیں۔ ہم اپنی طبعی کمزوری اور خامی سے واقف ہو کر اُس ہستی کی طرف رجوع ہوتے ہیں جو دانائی اور حکمت کی مصدر، زمین اور آسمان کی خالق و مالک ہے۔

تاروں بھری رات میں ذرا مکان کی چھت پر چڑھ کر کہکشاں اور دیگر تاروں کو دیکھو۔ اُنکی ماہیت پر غور کرو۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سوچتے سوچتے عقل آپ سے آپ ان روشن بلوروں اور نامعلوم عالموں کے بنانیوالے کی طرف مائل ہو گی اور اپنی لاچاری اور مجبوری سے ہو کر خداوند قادرِ مطلق کے سامنے جھک جائیگی اور اُسکی ثناخوانی میں محو ہو جائے گی۔ اس وجہ سے مطالعہ سائنس روحانیت پیدا کرتا ہے حاسۂ مذہب کو بیدار کر کے اُسے استحکام بخشتا ہے۔ کیونکہ اس سے خدا کی حکمتوں اور صنعتوں کے راز ہم پر آشکارا ہوتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے ہمارا ایمان زور پکڑتا اور کفر و الحاد دُم دبا کر چل دیتا ہے۔ سائنس کے فوائد پر کتاب لکھی جا سکتی ہے مگر ہمارے مطلب کے لیے یہی کافی ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کے دلوں میں اس کے استفادے کا علم پیدا ہو گا اور وہ بلوغ خود سوچنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

جے۔ آر۔ رائے

انسانی دماغ کی ماہیت

دُنیا مین سب سے عجیب، بلکہ سب سے قیمتی، مادہ وہ ہی جس سے دماغ تیار ہوتا ہی۔ اگر ہم اس مادہ کو بخوبی سمجھ سکتے اور اس کے اجزا کی پہچان ہمین حاصل ہو سکتی، تو انسان کی ہستی کے متعلق ہمین بہت سے راز معلوم ہو جاتے۔"

(سر جیمس کرکٹن براؤن)

وہ سفید مادہ جسکو عرفِ عام مین دماغ کے نام سے پکارا جاتا ہی، ساخت کے لحاظ سے مختلف حیوانات ہی مین مختلف نہین ہوتا بلکہ ایک ہی انسانی دماغ کے مختلف حصونمین ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہی جن عناصر سے وہ مرکب ہی اُنکی تعداد، صورت، انتظام اور تعلق کے اعتبار سے دو انسانی دماغون کا مادہ کبھی یکسان نہین ہوتا۔ نہ آج تک کبھی یکسان دیکھا گیا، اور نہ آئندہ دیکھا جا سکتا ہی۔ کیونکہ اسکا تعلق ہی انفرادی شخصیت سے ہی۔ لیکن کیمیائی ترکیب کی رو سے دیکھو تو دماغی مادہ قریب قریب ہر حالت مین یکسان ہی پایا جاتا ہی۔ ایک امتحانی نلی مین کسی بیوقوف اور دوسری مین کسی فیلسوف کے دماغی ٹکڑے کو رکھکر ان کا تجربہ اور ان تجربات کا مقابلہ کرو تو دونون مین ذرہ برابر فرق نہ معلوم کر سکوگے۔ باوجود اس کے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہی کہ دونون صورتون مین کیمیائی اختلافات ضرور موجود ہوتے ہین۔ قصور اگر ہی تو صرف ہماری نظر یا سمجھ کا ہی۔

دماغ کی خاص خاص مریضانہ حالتون مین عصبی ریشون اور اس رقیق مادہ کے اندر جو دماغ اور ریڑھ سے تعلق رکھنے والی ہڈی اور گنبد کو چکنا کیئے رکھتا ہی کیمیائی تبدیلیان دیکھی گئی ہین اور یہ قرین قیاس ہی کہ دماغی مرکبات اور اجزا مین فرق واقع ہونے سے انسان کے مزاج اور اس کے عادات مین بھی فرق آجاتا ہی۔

وہ تمام عجیب وغریب باتین اور حیرت خیز عقلی ونقلی دلائل جو انسان کو سوجھتے ہین درحقیقت اِس دماغی مادہ کی مضبوطی اور عمدگی سے تعلق رکھتے ہین۔ یہی وجہ ہی کہ ہر حالت مین دماغ کی مناسب غذائیت کو نہایت اہم معاملہ سمجھا جاتا ہی۔ اگر تم دماغ سے کام لینا چاہتے ہو تو ضروری ہی کہ اسے مناسب غذا بہم پہنچاؤ۔ لیکن سوال یہ ہی کہ وہ کونسی غذا ہی جو دماغی تقویت کے لیے بہترین سمجھی جاسکتی ہی۔ یہ ایک نہایت دلچسپ سوال ہی اور ہم چاہتے ہین کہ ان سطور مین اس پر کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کیجائے۔

حکما متفق ہین کہ جسم کے باقی حصون کیطرح دماغ کو بھی باقاعدہ غذا ملتی رہنی چاہیئے جس حالت مین انسان کے خون کا دوران باقاعدگی سے ہوتا ہی تو جسم دماغ کے روبرو متعدد اغذیہ پیش کرتا ہی۔ انہین سے جو چیزین اس کے مطلب کی ہوتی ہین دماغ انہین منتخب کرلیتا ہی۔ لیکن بدقسمتی سے خون اور اسکا دوران ہمیشہ باقاعدہ نہین ہوتا۔ بعض اوقات خون کمزور ہوتا ہی۔ اس صورت مین دماغ کو اسکی پوری غذا حاصل نہین ہوتی اور اسکی طاقت کم ہونے لگتی ہی بعض اوقات خون غلیظ ہوجاتا ہی، اس وقت دماغ کو ضرورت سے زیادہ چیزین ملتی ہین اور وہ بھی اسکے لیے خرابی کا باعث ثابت ہوتی ہین۔ اِن دونون حالتون کے علاوہ بعض صورتون مین خون کے ساتھ خراب اجزا دماغ تک پہنچ جاتے ہین جن سے اسکے اندر زہریلا مادہ پیدا ہوجاتا ہی۔

سچ پوچھو تو کوئی چیز خصوصیت کے ساتھ ایسی نہین جسے دماغی غذا قرار دیا جاسکے۔ لیکن خوراک کے بعض اجزا اس قسم کے ہین جو دماغ کی غذائیت کے لیے ضروری تصور کیئے جاتے ہین۔ اور ان مین سے جس کو سب سے بڑا رتبہ دیا گیا ہی وہ فاسفورس ہی۔ بکنر کا قول ہی کہ "فاسفورس کے بغیر انسان مین سوچنے کی طاقت نہین آسکتی"۔ لیکن یہ بیان ایک قسم کے مبالغہ پر مبنی ہی جسکی بنا اس اصول کو قرار دیا جاسکتا ہی کہ ایک خاص فاسفورس دار چربی دماغی اجزا کی ساخت مین موجود پائی جاتی ہی۔ مبالغہ اس لیے ہی کہ اگر ہم کہین "گندھک یا لوہے کے بغیر انسان مین سوچنے کی طاقت نہین ہوتی" تو وہ بھی کچھ کم درست نہین ہی۔

جب سے (۱۶۶۹ء) فاسفورس دریافت ہوا ہی اسے دماغی تکمیل کے لیے جزو لازم سمجھا جاتا رہا ہی۔ گو یہ خیال سائنٹفک تحقیقات پر اسقدر مبنی نہین جتنا بعض لوگونکا خیال ہی۔ باوجود اس کے جدید تجربات اور دریافتون نے اِس امر کی تصدیق کی ہی کہ اس سے دماغی ترقی عمل مین آتی ہی جن حالتون مین دماغی ترقی زیادہ تیز دیکھی گئی اسکی وجہ فاسفورس کا مقدار کثیر مین موجود ہونا ہی پایا گیا ہی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہی کہ جس وقت دماغ اور ہڈیان بالیدگی کے عمل مین ہون تو انہین فاسفورس کی کافی مقدار درکار ہوتی ہی۔

اِن باتونکو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہی کہ بچون اور کمزور دماغ والونکو فاسفورس کا معقول جزو بذریعۂ خوراک بہم پہنچایا جائے اور ہرچند کہ غذا مین فاسفورس کی مقدار کم ہوجانیسے کوئی بدیہی مریضانہ علامات نمودار نہین ہوتین تاہم ہمارا اس نتیجے پر پہنچنا کچھ بے جا نہوگا کہ جس طرح غذا مین چونے کا جزو کم ہونیسے جسم کی ہڈیان نرم ہوجاتی ہین اسیطرح فاسفورس کی مقدار کا کم ہونا دماغ کو سست کرتا اور اسکی بالیدگی مین مانع آتا ہی۔

لیکن باوجود اسکے کہ فاسفورس دماغی ترقی اور برقراری صحت کیلیے اسقدر ضروری سمجھا جاتا ہی اس کا استعمال فاسفیٹ کی قسم کے مرکبات کی صورت مین چندان ضروری نہین کیونکہ ضرورت کے اعتبار سے اسکی کافی مقدار معمولی ملے جلے کھانے مین پائی جاتی ہی۔ فی الحقیقت یہ بات ثابت ہوچکی ہی کہ آخر الذکر صورت مین استعمال کیا ہوا فاسفورس اول الذکر صورت کی نسبت زیادہ مفید ثابت ہوتا ہی اس لیے مناسب ہی کہ جسم کو جس قسم کا فاسفورس مہیا کیا جائے وہ الکلی یا مٹی ملے ہوے فاسفیٹ کی صورت مین نہ ہو بلکہ معمولی کھانون ہی کی صورت مین دیا جائے۔

مختلف کھانون مین فاسفورس کی مقدار کا تناسب مختلف ہوتا ہی، اور اسلیئے ضروری ہی کہ نوجوانون کے لیے جو کھانے منتخب کیئے جائین وہ ایسے ہون کہ انمین فاسفورس کی مقدار نسبتاً زیادہ ہو۔

اگر سبزی خورونکے عقیدے کے مطابق چند بچون کی پرورش صرف بقولات پر کیجائے تو کچھ عرصہ گذرنے پر ان کا دماغ یقیناً کمزور پایا جائیگا۔ اگر کسی بچے کو محض گاجرین اور شلغم کھلا کر بالغ کیا جائے جن مین علی الترتیب ۰ء۰۳۶ اور ۰ء۰۵۸ فیصدی فاسفورک ایسڈ ہوتا ہی تو اول تو انکا بالغ ہونا ہی مشکل ہی اور اگر ہون بھی تو دماغی اعتبار سے اس بچے کے مقابلے مین بہت کمزور رہون گے جس کی پرورش انڈون اور بھیڑ کے گوشت پر کیگئی ہو جن مین علی الترتیب ۰ء۲۳۷ اور ۰ء۵۲۴ فیصدی فاسفورک ایسڈ پایا جاتا ہی۔

تمام معمولی کھانون مین پنیر کے اندر فاسفورس کی مقدار بہت زیادہ پائی گئی ہی۔ اسکے اندر فاسفورس پنٹ اکسائڈ (فاسفورس ایک حصہ اور آکسیجن ۵ حصہ) کی مقدار ۱ء۸۱ فیصدی پائی جاتی ہی۔ بجالیکہ معمولی سبزیون مین صرف ۰ء۱۸ ہوتی ہی چونکہ پنیر مین فاسفورس کے علاوہ وہ تمام اجزا جو اعصاب و عضلات کو تیار کرنے مین مدد دیتے ہین، بہت بڑی مقدار مین موجود ہوتے ہین یہان تک کہ ایک پونڈ بہترین پنیر مین اسقدر روغنیت اور مادہ کیسین پایا جاتا ہی جتنا کہ ایک گیلن دودھ مین ہوتا ہی اسلیئے نوجوانون کے لیے یہ بہترین غذا خیال کی جاتی ہی۔ اس مین اگر کوئی نقص ہی تو صرف یہ ہی کہ کمزور معدے اسے ہضم نہین کر سکتے اور ظاہر ہی کہ نوجوان معدے بالغ معدون کے مقابلے مین کمزور ہوتے ہین۔

بعض لوگ پنیر سے طبعاً متنفر ہوتے ہین لیکن اکثر اسے اسلیئے استعمال نہین کرتے کہ وہ دیر مین ہضم ہوتا ہی اور اس دیر مین ہضم ہونیکی بڑی وجہ یہ ہی کہ لوگ اسے بخوبی چبا کر نہین کھاتے، یا پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد اسے زیادہ مقدار مین کھالیتے ہین، یا اسوقت کھاتے ہین جبکہ وہ خشک اور سخت ہوگیا ہو۔ اگر پنیر عمدہ قسم کا ہو اور عمدہ طور پر کھایا جاے تو یہ ایسی چیز ہی کہ بھوک لگاتی غذائیت بہم پہنچاتی، اور طبیعت کو فرحت دیتی ہی۔ گوشت کے مقابلے مین یہ نہ صرف ارزان غذا ہی بلکہ فائدہ مین بھی بہتر ہی اور جو لوگ گوشت نہین کھاتے اُن کے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھی جا سکتی ہی۔

اِن صفات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور نیز اس خیال سے بھی کہ اس مین گوشت اور دماغی مادہ پیدا کرنے والے اجزا موجود ہوتے ہین اور یہ مادہ ٹاکسن سے جو نقرس پیدا کرتا ہی بری ہوتا ہی امید کیجا سکتی ہی کہ زمانہ آئندہ مین بچون اور کمزور دماغ والون کی غذا مین پنیر کا جزو کافی رکھا جایا کرے گا۔

فاسفورس کے دماغی غذا تسلیم کیئے جانے کے سلسلہ مین بہت سے لوگ جنھین دماغی محنت کا کام پڑتا ہی اس خیال سے مچھلی کا استعمال بکثرت کر رہے ہین کہ اس مین اسکا جزو غالب ہوتا ہی۔

لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا ہی کہ یہ خیال ایک بڑی حد تک غلط ہی اور اسکا رواج ڈوما نامی ایک مشہور کیمیا دان کے ایک سرسری بیان پر مبنی ہی۔ جو لوگ مچھلی کے گوشت سے فاسفورس حاصل کرنا چاہتے ہین انھین اس تلاش مین یقیناً مایوسی حاصل ہوگی۔ باوجود اس کے اِن لوگون کے لیے جنھین بیٹھک کا اور دماغی کام کرنا پڑتا ہی مچھلی ایک عمدہ غذا ہی۔ کم از کم اس قسم کی مچھلیان جو زیادہ موٹی نہین ہوتین اور جنکے اندر اجزائے پروٹیڈ کا تناسب کم ہوتا ہی۔ اِن نوجوانون کے لیے جن کا نظام عصبی اشتعلال پذیر ہو اور بہت جلد اسمین فتور واقع ہو سکتا ہو گوشت کے بجائے مچھلی بہتر غذا تسلیم کی جاتی ہی۔

ایک زمانہ مین لوگون نے اسی فاسفورس کی تلاش مین اس خیال سے کہ یکسان چیزین ایک دوسرے کو غذائیت بہم پہنچا سکتی ہین حیوانات کا مغز بطور خوراک استعمال کرنا شروع کر دیا تھا لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہی کہ گو اس قسم کی خوراک کا خواہ کوئی اور فائدہ ہو لیکن اِس سے انسانی دماغ پر کچھ مفید اثر نہین ہو سکتا۔

بعض حیوانات کے غدود یا ان غدود کے اندر سے حاصل کیے ہوے لعاب کے استعمال سے چند صورتون مین جو تعجب خیز اثرات دیکھنے مین آئے ہین انکی وجہ سے لوگونکے دل مین اُمید پیدا ہو گئی ہی کہ اگر جانورونکا مغز یا اُن کے مغز کا جوہر حاصل کر کے اسے بطور خوراک استعمال کیا جاے تو اس سے خون کو اِس قسم کی قابل تحلیل غذا حاصل ہو سکتی ہی جو دماغ کو تقویت دیتی ہی۔ جو لوگ سائنس کے مختلف شعبونمین دلچسپی لیتے ہین اِن سے یہ بات پوشیدہ نہوگی کہ تجربات سے معلوم ہو چکا ہی کہ دماغی کمزوری کے ایسے مریضون کے اندر جن کی حالت حد درجہ افسوسناک تھی (یعنی جو قد کے بونے دل کے کمزور صورت مین مینڈک کے ایسے نظر آتے تھے) بھیڑون کے غدود سے ایک قسم کا مرکب تیار کر کے پہنچایا گیا تو نہ صرف اِن کا قد بقدر ایک ہاتھ کے زیادہ ہو گیا بلکہ شکل و صورت بھی عمدہ نکل آئی جسکی وجہ محض یہ تھی کہ جو مادہ خود اِن کے اندر موجود نہ تھا وہ دوسری جگہ سے حاصل کر کے اِن کے اندر پہنچا دیا گیا۔ ایسے لوگون کی مثالین موجود ہین جو پہلے بالکل فاتر العقل تھے لیکن اس عمل سے ذہین اور سمجھدار ہو گئے۔

ان تجربات مین کامیابی حاصل ہونے کی وجہ سے بہت سے حیوانی غدود و اجسام پر بھی عمل کیا گیا تاکہ غذائیت کی کمی یا دماغی کمزوری کے مختلف مدارج معلوم کیے جا سکین لیکن بعد عرصۂ دراز کی محنتون کے اِس بارے مین کوئی نمایان کامیابی حاصل نہین ہو سکی۔ اس قسم کے جوہر کا اثر بدن پر کچھ پڑتا ضرور ہی مگر دماغی امراض مین اِس سے اطمینان بخش فائدہ حاصل نہین ہو سکا۔ اِس صورت مین ممکن ہی کہ لوگ حیوانات کے مغز کو ایک لذیذ اور زود ہضم غذا سمجھکر استعمال کرتے ہین لیکن یہ ناممکن ہی کہ اِس سے انسانی دماغ کو وزندار یا مضبوط بنانے مین کوئی خاص مدد مل سکے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہی دماغ کے لیے کوئی خاص غذا تجویز نہین کی جا سکتی۔ زندگی کی تمام منازل مین کفایت شعاری اور فضول خرچی دونون کے انتہائی پہلوؤن کو چھوڑ کر اگر مناسب اور عمدہ کھانا کھایا جائے تو دماغ خود بخود اِن مین سے اپنے مطلب کی غذا چن لیتا ہی۔

بچپن مین جبکہ بچہ شیر خوار ہوتا ہی ماں کا دودھ ہی اسکے لیے بہترین دماغی غذا ہی۔ ماں کے دودھ مین جو تاثیر ہی وہ نہ تو انّا کے دودھ مین ہو سکتی ہی نہ گائے یا بکری کے، اور نہ اسکے

مقابلہ مین کوئی پیٹنٹ فوڈ یا بوتل مین دودھ پلانے کا طریقہ مفید قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہت سی ننھی جانین محض اسی لیے ضائع ہو جاتی ہین کہ انھین وہ غذا نہین دیجاتی جسکی وہ قدرتی طور پر حقدار ہین اور اس طرح پر شیر خواری کے ایام مین نامناسب غذائین دے دے کر انکے دماغ کی بالیدگی مین رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے۔

ایام شیر خواری کے بعد زندگی کے تمام مدارج مین غذا کو عام اصول کے مطابق باقاعدہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس بات کی ضرورت بالکل نہین کہ دماغ کی تقویت کے لیے کوئی خاص غذا استعمال کیجائے۔ اسمین شک نہین کہ ہر عمر مین خوراک کی بہت سی غلطیون سے بچنا اور اسمین خاص ترامیم کرنا ضروری ہے لیکن ان سب کی تفصیل اس جگہ ناممکن ہے۔

ضروری ہے کہ زندگی کے ہر حصہ مین انسان کو مادہ پروٹیڈ کافی مقدار مین ملتا رہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو جسمانی ریشون کو تیار کرتی ہے اور اسی کا دماغ سازی پر مفید اثر پڑتا ہے۔ جون جون انسان کی عمر زیادہ ہوتی جاے اسے لازم ہے کہ حیوانی غذا کا استعمال بھی بڑہا دے کیونکہ مادہ پروٹیڈ قابل انہضام صورت اور کثیر مقدار مین اسی چیز کے اندر موجود پایا گیا ہے۔

انسان کی زندگی مین ایک خاص وقت ایسا ہوتا ہے جب دماغ کی مناسب غذائیت کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے، یعنی اسوقت جبکہ وہ بچپن سے نکلکر جوانی مین قدم رکھنے لگا ہو۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی خوراک کی خواہش مین بھی ایک نمایان تبدیلی واقع ہوا کرتی ہے۔

جس وقت عقل ڈاڑھ نکلتی ہے تو اسوقت کھانونکی رغبت مین بھی فرق واقع ہوتا ہے۔ لڑکے اس زمانے مین پھلون اور مٹھائی کو زیادہ پسند نہین کرتے بلکہ حیوانی غذا اور اسی قسم کی دوسری لذیذ چیزون کے خواہشمند پائے جاتے ہین۔ بخلاف اس کے لڑکیان مٹھائی کی زیادہ خواہشمند ہو جاتی ہین۔ بعض صورتون مین اس تبدیلی کے ایام مین وہ مٹی کھریا مٹی، یا کچے چاول کھانے لگ جاتی ہین۔ ان چیزون کا استعمال سخت مضر ہے اور اس قسم کی عادات کو فی الفور ترک کر دینا لازم ہے غرضکہ اس تبدیلی کے ایام مین اور اس کے بعد ایک عرصہ تک اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ انسان خراب یا کم غذا کھانے لگے اور اسے قلت خون کا مرض لاحق ہو جائے، اس لیے ضروری ہے کہ سن بلوغ کی نسبت ان دنون مین غذا نہ صرف زیادہ بلکہ مقوی دیجائے اگر ایسا نہ کیا گیا تو عصبی کمزوری اور بے چینی پیدا ہو جائے گی۔ جس کے بعد ممکن ہے کہ مسکرات کے استعمال کی خواہش پیدا ہو جائے۔ درحقیقت یہی وہ زمانہ ہے جبکہ شراب پینے کی تباہ کن عادت اختیار کر لی جاتی ہے۔ پس لازم ہے کہ غذا کی طرف پوری توجہ دیکر الکحل کو بکلی تمام صورتون مین دور رکھا جائے۔ سرجیمز کرکٹن براؤن کا خیال ہے کہ "بعض لوگ جو مذہبی خیال سے یا کسی اور وجہ سے خاص خاص کھانون بالخصوص گوشت کا استعمال ترک کر دیتے ہین یہ بہت برا ہے جہان تک ہو سکے لوگون کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

ایک چیز البتہ ایسی ہے جو دماغ کے لیے خاص طور پر مفید سمجھی جا سکتی ہے اور جس کا بچپن اور اس کے بعد شباب سے پیشتر کے زمانے مین استعمال واجب ہے وہ چیز جو یا جئی کا آٹا (Oat-Meal) ہے۔ درحقیقت یہ تمام کھانون مین سب سے زیادہ غذائیت بخش چیز ہے اور اسمین چربی فاسفورس اور دیگر مقویات کے اجزا بافراط پائے جاتے ہین۔

اسمین کچھ شک نہین کہ سفید گیہون ہم ہندوستانیون

کی عام غذا ہی اور اسمین قابل تحلیل پروٹینڈ کی بہت سی مقدار
پائی جاتی ہی کیمے مین غذائیت اور چربی پیدا کرنیوالے مادے
بہت پائے جاتے ہین، چاول بسبب زیادہ نشاستہ رکھنے کے بعض
اقوام مثلاً کشمیریون یا بنگالیون مین زیادہ استعمال ہوتے ہین،
اور جو مین معدنی مادے زیادہ پائے جاتے ہین، تاہم ان سب
باتون کو زیر نظر رکھتے ہوئے یہی تسلیم کرنا پڑتا ہی کہ جئی مین جو صفات
موجود ہین وہ انمین سے کسی چیز مین بھی نہین پائی جاتین۔

اگر تم کسی شخص سے اسکا ذکر کرو تو وہ یہی کہے گا کہ جئی تو
گھوڑون کی خوراک ہی۔ یورپ مین بھی سوائے باشندگان اسکاٹ
لینڈ کے بہت کم اقوام اسے استعمال کرتی ہین۔ حال مین ایک
فرانسیسی نے لکھا تھا کہ "جئی کی روٹی موٹی اور کھردری ہوتی ہی
اور اسے صرف غریب ملکون مین کھایا جاتا ہی" لیکن کچھ عرصے سے
اسکا رواج انگلستان مین زیادہ ہونے لگا ہی۔ بدقسمتی سے
وہان بھی مزدور پیشہ جماعتین اسے اب کم استعمال کرتی ہین۔
نتیجہ یہ ہی کہ اس طبقہ کے لوگ اب ویسی مضبوط کاٹھی اور جسمانی
تحریک نہین رکھتے جیسی ان کے پیشرؤون مین پائی جاتی تھی۔

جب سے جدید تہذیب نے ترقی حاصل کرنی شروع کی ہی لوگ ان سادہ
کھانون کو چھوڑ کر چاء، بسکٹ، وغیرہ استعمال کرنے لگ گئے ہین۔
ایک مشہور اہل الرائے کا قول ہی کہ "جئی کا آٹا دودھ مین ملا کر
استعمال کیا جائے تو لاکھ چائین اور قہوے اس پر سے قربان
کر دیے جا سکتے ہین کیونکہ یہ مرد، عورت، بچہ، سب کے لیے
بہترین غذا ہی"۔

حال کی بعض علمی تحقیقات سے اس بارے مین مزید روشنی حاصل
ہوئی ہی کہ جئی کے آٹے کا اثر جسم پر کیا پڑتا ہی۔ تجربوں سے ثابت ہوا ہی
کہ ۸ ہفتہ تک جن چوہون کی پرورش جئی کے آٹے اور پانی پر کی گئی
انمین وہ غدود جسے اصطلاح مین (Thyroid Gland)
کہتے ہین ان چوہون کے غدود کی نسبت جن کو دودھ اور روٹی
کھلائی گئی تھی دوگنے تھے۔ جیسا کہ قبل ازین بیان کیا جا چکا ہی
اس غدود کا لعاب جسم کے ہر حصہ مین غذائیت کا اثر پیدا کرتا ہی شاید
یہی وجہ ہی کہ شمالی انگلستان کے باشندے بچپن مین جئی کے استعمال
کے باعث مضبوط اور تنومند ہوتے ہین۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہی کہ جئی کا آٹا
اس غدود پر اثر ڈالکر دماغ سازی کے عمل مین بہت مدد دیتا ہی۔ پیٹر رام

العصر

سائنٹفک اعداد اور اکائیان

از شیخ فیروز الدین مراد صاحب بی اے، ایم ایس سی، پروفیسر علوم طبیعات ایم اے او کالج، علی گڈہ

(۱)

تمہید | انسانی علم کی وسعت و ترقی کے لوازمات مین سے ایک ضروری شرط مختلف چیزون کی مقدار کی صحیح پیمائش ہی جب تک کسی چیز یا مقدار کے متعلق ہمین کامل طور پر اسکی کمی کا علم نہو، ہمارا علم اس چیز یا مقدار کے متعلق ناقص اور ادھورا ہوتا ہی لیکن کسی چیز یا مقدار کے اندازہ یا پیمائش کے لئے ضروری ہی کہ ہمارے ذہن مین اندازہ یا پیمائش کرنے کے لئے اکائی کا مفہوم واضح ہو۔

پیمائش کی تشریح | ہر چیز کے تعینِ مقدار کے لئے دو امور کا ذکر ضروری ہوتا ہی، ان کے بغیر تعین مقدار ناممکن ہے، ان دو اجزا مین ایک تو اسی قسم کی ایک خاص مقدار کا نام ہوتا ہی کہ جس قسم کی مقدار کا تعین مقصود ہوتا ہی اس خاص مقدار کو حوالہ دینے کے لیے اصل مانا جاتا ہی۔ دوسرا جزو اس بات کا اظہار ہوتا ہی کہ وہ خاص مقدار کتنی دفعہ مل کر اس پیش کردہ مقدار کے برابر ہوتی ہی۔ پہلے جز کا اصطلاحی نام اکائی ہی، دوسرے جز کو اُس مقدار کی ہندسی قیمت کہتے ہین۔

اندازہ صفتی اور اندازہ پیمائشی | سائنس کی ترقی کے دو مدارج ہین پہلے حصہ مین جو وقت کے لحاظ سے انسانی تاریخ مین پہلے آتا ہی، ہم صرف مظاہر قدرت کے مطالعہ مین یا دیگر مشاہدات مین صرف اس منظر یا مشاہدہ کی نوعیت کی تعیین کافی سمجھتے ہین۔ دوسرے حصہ مین نہ صرف نوعیت کے سطحی اور ادھورے مطالعہ پر اکتفا کیا جاتا ہی بلکہ مقدار کی صحیح پیمائش کی جاتی ہی پہلے درجہ کو "اندازہ صفتی" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہی اور دوسرے ترقی یافتہ حصہ کا نام "اندازہ پیمائشی" ہی۔

تمثیلات | ان تمہیدی کلیات کی تفہیم کے لیے علمی مثالون اور روزمرہ کی زندگی کے واقعات سے بہت مدد ملتی ہی۔

تعمیرات کی مثال | ایک کمسن بچہ یا قاصر العقل شخص کے ذہن مین تعمیر کے اخراجات کا کوئی صحیح اندازہ نہین ہوتا۔ اس حالت مین یہ کہا جائے گا کہ بچے کی

عقل کا درجہ سن شعور سے سن تمیز تک نہین پہنچا۔ لیکن جب بچہ کی سمجھ مین یہ بات آجاتی ہو کہ ایک ہی قسم کے دو مکانات بنانے مین ایک مکان ہی تعمیر سے دو گنا خرچ ہوتا ہو۔ تو اس کا علم اندازۂ صفتی کے درجہ تک پہنچ جاتا ہو۔ اس سے آگے جب بڑے ہو کر اسی بچہ کو خود مکان بنوانا پڑتا ہو تو اسے مکان کی تعمیر کی اصلی لاگت کے صحیح اعداد و شمار مین اندازۂ پیمائشی حاصل ہوتا ہو۔

علم ہیئت کی مثال | علی ہذا القیاس قدیم ہیئت دان سیارگان نظام شمسی کے متعلق یہ امر دریافت کر چکے تھے کہ سورج سے زہرہ اور عطارد کا فاصلہ زمین کے بُعد سے کم ہے اور مشتری مریخ زحل وغیرہ کا بُعد زمین سے زیادہ ہے۔ لیکن اُنھون نے اعداد و شمار مین تفاوتِ بُعد کا اندازہ نہین کیا تھا۔ زمانۂ حال مین علم ہیئت کی ترقی کے ساتھ یہ دوسرا مرحلہ بھی طے ہو چکا ہو۔

حرارت کی مثال | یہ امر عام طور پر معلوم ہو کہ حرارت کی کمی یا بیشی سے مختلف اجسام سکڑتے یا پھیلتے ہین۔ اس سے زیادہ بعض یہ بھی جانتے ہین کہ مختلف اجسام کم و بیش سکڑتے اور پھیلتے ہین لیکن صرف سائنس دان یہ ضروری علم رکھتے ہین کہ ایک درجہ حرارت کی کمی بیشی سے اجسام کے طول رقبہ یا حجم مین کس قدر فرق واقع ہوتا ہو۔

برقی رَو کی مثال | اگر ایک زبردست برقی رَو انسانی جسم مین سے گذرے تو اس بات کا عام طور پر عوام الناس کو بھی علم حاصل ہو کہ انسان مرجاتا ہو یا کم از کم اس کو صدمہ پہنچتا ہو۔ لیکن ایک برقی انجینیر صحیح طور پر جانتا ہو کہ برقی رَو کی طاقت کا مقابلہ کس حد تک کیا جانا ممکن ہو اور کن ذرائع سے ؟

اگر آپ تھوڑی دیر بھی غور کرین گے تو آپ کو خود اسی قسم کی بہت سی مثالین ملین گی جن سے یہ امر صاف طور پر عیان ہو جاتا ہو کہ کسی چیز[1] یا مقدار[2] کے متعلق صحیح علم حاصل کرنے کے لیے ہمین نہ صرف اندازۂ صفتی بلکہ اندازۂ پیمائشی کی بھی اطلاع ہونی چاہیئے اور یہ سب تمثیلات اس امر کی شاہد ہین کہ علم انسانی کی انتہائی منزل اندازۂ پیمائشی پر مختتم ہوتی ہو۔ ہم اس سادہ مسئلہ کی مزید تشریح کو بخیال طوالت تصور کر کے نظر انداز کرتے ہین۔

اکائی کا مفہوم | شروع مضمون مین ہم نے کہا تھا کہ پیمائش کے لیے اکائی کی ضرورت ہوتی ہو۔ آپ بازار سے کپڑا خریدنے جاتے ہین بزاز مین روپیہ فی گز نرخ بتاتا ہو۔ گویا کپڑے کی پیمائش کی اکائی گز ہو اور کپڑے کی قیمت کی اکائی روپیہ ہو۔ عام طور پر کپڑا صرف طول سے ناپا جاتا ہو عرض کا لحاظ نہین کیا جاتا۔ اس لیے آپ کہین گے کہ گز طول کی اکائی ہو۔ فرشی کپڑا مثلاً دری جاجم مربع گز کے حساب سے بکتا ہو جسے دوکاندار یون بتاتے ہین ایک گز اس طرف سے اور ایک گز اس طرف سے یہان کپڑے کے طول کا خیال اس کے رقبہ سے کم کیا جاتا ہو۔ شیشم کی لکڑی کے تختے بھی بکتے ہین لیکن زیادہ مقدار کے خریدار تختون کے بجائے شہتیر اور شہتیریان خریدتے ہین اور نرخ فی مکعب فٹ کہا جاتا ہو یعنی لکڑی کا ٹکڑا جس کا طول عرض موٹائی سب ایک ایک فٹ ہون (اصطلاح مین اُسے ایک مکعب کہتے ہین) حجم کی اکائی ہو۔ علی ہذا القیاس ہماری زندگی مین بے شمار مثالین آپ کے پیش نظر ہون گی جن سے پیمائش کے اصول واضح کئے جا سکتے ہین۔

تین اصلی اکائیان | امثلۂ بالا سے علاوہ اور ضروری نتائج کے ایک اہم نتیجہ یہ

چیز اور مقدار کی تشریح [1] ”چیز“ سے مراد تمام وہ خارجی ہستیان ہین جو عرف عام مین قائم بالذات تسلیم کی جاتی ہین یعنی جنکا وجود یا عدم وجود ہمارے حواس کی شہادت کیفیات نفسی یا قوائے عقلیہ پر منحصر نہین ہو۔ مثلاً مادہ اور تمام مادی اجسام اشیا ہین۔ علی ہذا القیاس قوت اور اسکے مختلف مظاہر چیز کی تعریف مین شامل ہین۔ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہو۔ ہم ایک علحدہ مضمون ”مادہ کی اصلیت“ مین اس کے متعلق مختلف آرا اور مذاہب پر روشنی ڈالین گے۔

[2] ”مقدار“ کو دراصل کسی چیز کی ”مقدار“ کا اختصار سمجھنا چاہیئے لیکن سہولت کے لئے علمی دنیا مین اسی لفظ واحد (مقدار) کو چیز کا مرادف قرار دیا جاتا ہو اور صیغۂ واحد کی طرح جمع ”مقادیر“ بالعموم ”مختلف چیزون کی مقدار“ کے لیے استعمال کرنا جائز سمجھا جاتا ہو۔ مزید تشریح متن سے ہو جائے گی۔

نکلتا ہو کہ مختلف چیزون کی پیمائش یعنی ان کی مقدار کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے چند ایک "اعداد اساسی" کی ضرورت ہو۔ سائنس دانانِ عالم کے اتفاق رائے سے تین مستقل اساسی چیزین چن لی گئی ہین اور اگر آپ غور کرین گے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ تمام چیزون کا تعیین صرف تین چیزون کے ذریعہ سے ہو سکتا ہو۔ یہ تین اساسی چیزین مفصلہ ذیل ہین :-

(۱) طول (۲) مقدار مادہ جسے انگریزی مین ماس کہتے ہین اور (۳) وقت۔

تین اشیاء اساسی | گویا کہ وقت مادہ اور فضا اساسی مقدارین ہین اور باقی تمام مقدارین ان کی وساطت سے پیمائش کی جا سکتی ہین۔ مثلاً کپڑے کی خرید مین صرف دو چیزون کی ضرورت ہو طول اور مقدار مادہ کی یعنی چاندی یا سونے کے تبادلے سے اتنا کپڑا خریدا جا سکتا ہو۔ رقبہ کی پیمائش کے لیے صرف طول کی ضرورت ہی حجم کے لیے بھی علیٰ ہذا القیاس صرف ایک قسم کی پیمائش کی ضرورت ہی۔ رفتار کے لیے وقت اور فضا کی پیمائش درکار ہو۔ آپ کہتے ہین کہ ریل گاڑی ایک گھنٹہ مین تیس میل چلتی ہو جسے تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تعبیر کیا جاتا ہو۔ اسی طرح جیسا کہ بقیہ مضمون مین دکھایا جائے گا، دنیا مین علمی کام چلانے کے لیے تین چیزون کی پیمائش کی حقیقی طور پر ضرورت ہو۔ ان تین چیزون کو ہم آئندہ "اشیاء اساسی" کے نام سے یاد کرین گے۔ لہٰذا اشیاء اساسی یہ تین چیزین ہین۔ (۱) طول یعنی مقدار فضا (۲) ماس یعنی مقدار مادہ (۳) وقت یعنی مقدار وقفہ شعوری۔

اکائی کی تعریف | پیمائش کا طریقہ اس قدر آسان ہو کہ ہمین تشریح کرنے کی ضرورت معلوم نہین ہوتی کسی چیز کی ایک خاص مقدار کو ایک مستقل حیثیت دی جاتی ہو اور بعد ازان اس چیز کی پیمائش اس خاص اندازہ سے کی جاتی ہو۔ اس خاص مقدار کو اس چیز کی "اکائی" کہتے ہین بالفاظ دیگر کسی چیز کی اکائی اس چیز کی ایک خاص مستقل مقدار کا نام ہو جسکی وساطت سے بعد ازان اس چیز کی مختلف مقدارون کا تعیین کیا جاتا ہو۔ یا اسے یون خیال فرما لیجیے کہ کسی چیز کی مقدار کا اندازہ وہ ہندسی تناسب ہو جو اس چیز کی مجموعی مقدار اور اکائی کے درمیان پایا جاتا ہے۔

پیمائش کا مفہوم | مثلاً آپ ایک سڑک کی لمبائی ناپنا چاہتے ہین۔ لوہے کی ایک زنجیر لیتے ہین اور اُسے سڑک کے اوپر پھیلا کر دیکھتے ہین کہ کتنی دفعہ وہ زنجیر سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلائی جا سکتی ہو اور پھر کہتے ہین کہ فلان سڑک سو جریب لمبی ہو۔ زنجیر کی لمبائی لفظ کو جریب سے تعبیر کیا گیا ہو۔ اسی طرح ایک کپڑے کا ٹکڑا لوہے کے ایک ٹکڑے یا فیتہ سے ناپا جاتا ہو۔ اگر لوہے کے ٹکڑے یا فیتہ کی لمبائی آپ کی اکائی ہو جس کا نام گز ہے تو آپ کہتے ہین کہ کپڑا چھ گز یا نصف گز لمبا ہو جیسی بھی حالت ہو۔

ہندسی قیمت | یہ صاف ظاہر ہو کہ اکائی کی تبدیلی سے مجموعی مقدار کی ہندسی قیمت بدلتی ہو مثلاً کپڑے کا ایک ہی ٹکڑا آٹھ گرہ ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ انچ لمبا ہوتا ہو لیکن چونکہ ان سب کا مطلب ایک ہی ٹکڑے کی لمبائی کا تعین ہو اس لیے ظاہر ہو کہ باوجود اختلاف کے یہ سب اندازے بالکل ایک دوسرے کے برابر ہین گو اٹھارہ آٹھ سے اور آٹھ ڈیڑھ سے بہت مختلف ہو[۱]۔ حاصل یہ کہ کسی مقدار کے تعین کے لیے کم از کم دو چیزون کی ضرورت ہو اولاً اکائی اور دوم

اکائی اور انسانی آراء | [۱] اکائی کا اختلاف ایک دلچسپ پیرایہ مین یون بھی بیان کیا جا سکتا ہو کہ ایک ہی قوم مختلف اشخاص کے نزدیک مختلف اہمیت رکھتا ہو جس طرح یہ ہوتی ہو کہ اہمیت کی اکائی مین اختلاف ہوتا ہو۔ ایک بازاری آدمی کے نزدیک جس قدر بازاری زندگانی کا عادی ہوتا ہو، اس بے حرمتی کی اہمیت بہ نسبت ایک شریف آدمی کے بہت کم ہوتی ہے شریف کے نزدیک ایک سخت سست لفظ ایک بڑی بات ہوتی ہو مگر رذیل کے لیے معمولی اور خفیف بات ہوتی ہو۔ فجر کی نماز خواب غفلت کے متوالون پہ گران گذرتی ہو لیکن ایک خدا ترس فرض شناس کیلیے باعث لذت و خوشی ہوتی ہو حقیقت یہ ہو کہ دنیا مین ہر انسان ہر ایک معاملہ کو اپنے گز سے ناپتا ہے اور بعض کا گز بڑا ہوتا ہے بعض کا چھوٹا۔ اگر کپڑے کے ناپنے والے گز کی طرح سب کا نقطہ نگاہ ایک ہو تو آراء کا اختلاف کم از کم معاملات ضروریہ مین بہت کم ہو۔ اللہ تعالےٰ کے کلام پاک مین آیا ہو۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس کی صحیح تفسیر مشقت اور ریاضت کے وہ مختلف مدارج ہین جو انسان ایک بڑی حد تک خود وضع کرتا ہے۔ چھوٹی اکائی رکھنے سے چھوٹی چیز بھی بڑی معلوم ہوتی ہین اور بڑی اکائی رکھنے سے بڑی چیز بھی ہیچ معلوم ہوتی ہو۔

تناسب ہندسی اگو دنیا کے کاروبار مین بسا اوقات اکائی محذوف لکھی جاتی ہی برین خیال کہ متکلم اور سننے والا دونون کے ذہن مین ایک ہی خاص اکائی ہوتی ہی اور بطور اختصار صرف تناسب ہندسی کے ذکر پر کفایت کیجاتی ہی۔

(۲)

ایک مشترک پیمانہ کی ضرورت اور احاد اساسی

علمی کام کے لیے ازبس ضروری ہی کہ تمام کام کرنے والے کے نتائج مین یکسانیت ہو۔ یہ غرض اس وقت تک حاصل ہونی ناممکن ہی جب تک کہ ایک مشترک پیمانہ احاد اساسی کے متعلق قرار نہ دیا جاے۔ اگر آپ کی اصلی اکائیان یعنی وقت، مادہ اور طول کی اکائیان ایسی ہین جو دوسرے سائنس دانون کے نزدیک مسلمہ ہین تو آپ کے نتائج انکے نتائج سے براہ راست منطبق ہو جائین گے، ورنہ باہمی تطبیق کے لیے دونون کی اکائیون کا تناسب معلوم ہونا چاہیے۔ مثلاً آپ دریافت کرتے ہین کہ ایک گز لمبی لوہے کی سلاخ ایک درجہ حرارت سنٹی گریڈ کے اختلاف سے گرہ کا اتنا حصہ بڑھتی یا گھٹتی ہی اور ایک دوسرا آدمی اسی تجربہ کے نتائج ان الفاظ مین دیتا ہی کہ ایک فٹ لمبی لوہے کی سلاخ ایک درجہ حرارت فارن ہائیٹ (ہم ان ہر دو نظامون کی تشریح درجہ حرارت کی پیمائش کے بیان مین کرینگے) کے اختلاف سے انچ کا اتنا حصہ بڑھتی گھٹتی ہی۔ اب اگرچہ دونون کے نتائج بالکل صحیح ہون گے لیکن بظاہر فرق معلوم ہوگا اس آسان حالت مین تطبیق آسانی کے ساتھ مستعمل اکائیون کے باہمی تناسب ہندسی جاننے سے ہو سکتی ہی۔ لیکن مشکل واقع یہ ہوتی ہی کہ زیادہ پیچیدہ اور ادق مسائل مین اس سطحی اختلاف سے بہت گڑبڑ لاحق ہوتی ہی بالخصوص اس وقت جب کہ کثرت استعمال کے سبب سے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہی اکائیان صحیح طور پر بیان نہین کی جاتین۔ مثال بالا مین اگر طول کے پیمانے سب یکسان مان کر ہر دو بیانات مین صرف ایک درجہ حرارت مذکور ہو اور سنٹی گریڈ فارن ہائیٹ نہ لکھا جائے تو آخری نتیجہ پہلی حالت مین بہ نسبت دوسرے نتیجہ کے ۹/۵ گنا بڑا ہوگا۔

جس اشکال کا نہایت ادھورا بیان ہم نے کیا ہی "احاد تبعی" کی حالت مین نہایت اہم ہو جاتی ہی۔

احاد تبعی

احاد تبعی سے مراد ان مقدارون کی اکائیان ہین جو تین اساسی مقدارون کے اوپر مبنی ہوتی ہین۔ مثلاً رفتار کی مقدار کے لیے کوئی خاص اکائی مقرر نہین ہی۔ اس اکائی کا انحصار وقت اور طول کی اکائی پر ہوگا اور ایک ہی رفتار کا ہندسی اندازہ مختلف ہو سکتا ہی۔ اگر احاد اساسی کا تعیین ٹھیک طور پر نہ کیا جائے۔ رفتار کی اکائی میل فی گھنٹہ، منزل فی یوم، میل فی منٹ، میل فی ثانیہ، فٹ فی ثانیہ، سنٹی میٹر فی ثانیہ وغیرہ وغیرہ کئی مختلف طریقون سے ظاہر کی جا سکتی ہی۔ لیکن اگر احاد اساسی مقرر ہون تو پھر رفتار کی اکائی صرف ایک ہی ہو سکے گی۔ علم البرق اور مقناطیس کی اکائیون مین شروع شروع مین "احاد اساسی" کے تعیین نہ ہونے سے بہت ہی زیادہ گڑبڑ تھی اور کئی نظام مروج تھے۔ سادگی کا اقتضا یہی ہی کہ یگانگت پیدا ہو جائے۔ آپ ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ مین چلے جائین یا ایک مہذب ملک سے دوسرے ملک مین چلے جائین بے فائدہ طور پر احاد کے اختلاف سے ضروری مقدارون کے اندازہ مین وقت ضائع نہ ہو بعینہٖ جسطرح تمام ملک مین ایک ملکی اور عالمگیر زبان اردو یا اسپرانٹو وغیرہ کی ضرورت ہے اسیطرح یہ بھی ضروری ہی کہ مختلف حصص ملک اور اس سے بڑھ کر مختلف تہذیب یافتہ ممالک علمی حیثیت سے ایک مشترک نظام احاد کے سلسلہ مین منسلک ہو جائین تا کہ ایک جگہ کا سائنٹفک یا تجارتی کام دوسری جگہ کے سائنٹفک یا تجارتی کام سے خواہ مخواہ نہ ٹکرائے۔

صرف ہندوستان مین یہ کمی باقی ہی، باقی تمام مہذب ممالک نے کم و بیش اس یکسانیت کو محسوس کر لیا ہی اور موجودہ تہذیب کے کرشمون مین ایک نمایان بات ساری دنیا کے علما و فضلا کا علمی کامون کے لیے اعداد و شمار اور اکائیون پر اتفاق رائے کرنا ہی۔ گویا کہ مساعی پراگندہ کی بجائے اب مختلف ممالک کے سائنٹفک تحقیقات کرنے والے عالم اس طور سے کام کرتے ہین کہ گویا

ایک کے علمی نتائج یا نظری قیاسات دوسرے کی سمجھ مین آسکتے ہین۔ بلکہ اگر اُس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہو تو ہم بتائین گے کہ یورپ مین تمام علمی کتب اور رسالجات کی تقطیع بیرونی شکل اور حجم یکسان کرنے کی تجاویزین ہو رہی تھین کہ موجودہ خونریزی نے تمام کوششون کو شل کر دیا۔)

فرانسیسی نظام احاد سائنٹیفک اکائیون کا نظام جو کہ تمام علمی دنیا مین مروج ہے وہ ہیجان انقلاب فرانسیسی کی ایک نہ رہین یادگار ہے اور اگرچہ علمی دنیا مین اسکا نام کچھ اور ہے لیکن بعض اوقات اسے اکائیون کا نظام فرانسیسی بھی کہتے ہین۔

سنٹی میٹر یعنی طول کی اکائی اس نظام کے مطابق طول کی اکائی کو سنٹی میٹر کہتے ہین ایک انچ مین تقریباً ۲½ سنٹی میٹر ہوتے ہین سنٹی میٹر کے معنی میٹر کا ایک سوان حصہ ۱/۱۰۰ ہے گویا کہ ایک سو سنٹی میٹر ایک میٹر کے برابر ہوتے ہین۔

میٹر کی تعریف ایک میٹر کی لمبائی فی الاصل کرۂ زمین کے اس رُبع محیط کے (جس مین پیرس واقع ہے) قطب سے لیکر خط استوا تک چھوٹی سے چھوٹی لمبائی کے ایک کروڑوین حصہ کے برابر مقصود کی گئی تھی اور کوشش اس امر کی کی گئی تھی، کہ انسانی پیمائش مین طول کی اکائی کو مستقل طور پر زمین کی نہ بدلنے والی پیمائش سے وابستہ کر دیا جائے اور اسطرح سے میٹر کو ایک ارفع و اعلیٰ حیثیت کے ساتھ ممتاز کر دیا جائے لیکن محیط زمین کی بعد ازان کی پیمائش نے ثابت کر دیا ہے کہ فرانسیسی علماء کا یہ خیال خام ہے کیونکہ اب میٹر کی لمبائی اس کی اصلی تعریف سے ذرا مختلف ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میٹر کی لمبائی کو بعد کی زیادہ صحیح پیمائش کے مطابق قرار دیدیا جاتا لیکن اس سے سابقہ نتائج مین ایک وسیع تبدیلی کرنی پڑتی تھی اور پھر یہ امر بھی ملحوظ خاطر ہونا چاہیے کہ یہ تعریف ایک حد تک سائنٹفک تعریف نہین ہے۔ موجودہ میٹر کی تعریف یہ ہے کہ میٹر پلاٹی نم کی اُس سلاخ کے اوپر (جب اُس سلاخ کا درجہ حرارت صفر ہو جاتا ہے) دو خطون کے درمیانی فاصلہ کا نام ہے جو پیرس مین بورو ڈے آرچے BUREAU DESARCHI (ایک عمارت اور محکمہ کا نام ہے) مین محفوظ ہے۔

حرارت کا اثر میٹر کی اس تعریف مین دو باتین قابل غور ہین۔ چونکہ حرارت سے اجسام پھیلتے ہین اس لیے طول کے تعیین کے لیے درجہ حرارت کی تخصیص اشد ضروری ہے۔ گرمیون مین تمام گز اصلی گز سے لمبے ہو جاتے ہین اور سردیون مین بھی چونکہ درجہ حرارت صفر سے اوپر ہی رہتا ہے تھوڑے سے لمبے ہوتے ہین لیکن یہ تبدیلی اتنی خفیف ہوتی ہے کہ تجارتی کاروبار مین اسے نظر انداز کیا جاتا ہے اور گز کی سرکاری سند مین بھی اس امر کا خیال نہین رکھا جاتا

مستقل پیمانون کی دو قسمین البتہ علمی کامون مین یہ خفیف تبدیلی بھی نہایت اہم ہے۔ دوم فاصلہ کے تعیین کے دو طریقے ہین ایک تو وہی معمولی طریقہ جس کی بنا صحت کی نسبت سہولت پر زیادہ ہے۔ اس کے مطابق گز کی سلاخ کی لمبائی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پوری ایک گز ہوتی ہے۔ اس طریقہ مین نقص یہ ہے کہ کثرت استعمال سے گھسکر لمبائی مین فرق آجاتا ہے لیکن معمولی کاروبار مین یہ فرق سالہا سال تک غیر محسوس رہتا ہے اسلیے طول کے پیمانے اس قاعدہ کے مطابق بنائے جاتے ہین۔ البتہ علمی کامون کے لیے اس نقص کا دفعیہ یون کیا جاتا ہے کہ سلاخ کے سرون کے قریب دونون طرف دو خط کھینچ دیے جاتے ہین اور ان کے مابین فاصلہ ناپا جاتا ہے۔ تاکہ یہ خطوط گھسنے سے ناقص نہ ہو جائین احتیاطاً یہ کی جاتی ہے کہ ان خطون کو چھوٹے چھوٹے سوراخون کے وسط مین سطح سے نیچے کندہ کیا جاتا ہے۔ اصلی میٹر اور اس کی مستند نقلون مین یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے لیکن چونکہ عام کامون کے لیے یہ طریقہ عمل باعث تکلیف ہے اس لیے معمولی علمی کامون کے لیے ایسا نہین کیا جاتا۔

اب آپ نے سمجھ لیا کہ طول کی اکائی کس طرح محفوظ ہے اور نیز کس طرح تمام دنیا مین ایک ہی اکائی کا رواج ہے۔ میٹر کے جتنے صحیح پیمانے مروج ہین ان کا اصلی میٹر کی مستند نقلون کے ساتھ مقابلہ کر لیا جاتا ہے اور ہر ایک علمی کام مین لمبائی کا اندازہ سنٹی میٹرون مین کیا جاتا ہے۔

گرام یعنی مقدار مادہ کی اکائی علیٰ ہذا القیاس مقدار مادہ کی اکائی کو گرام کہتے ہین اور گرام کی تعریف پلاٹنم کے اسکے ٹکڑے کے مقدار مادہ کا ہزاروان حصہ (۱/۱۰۰۰) ہے جس کو مستند کلو گرام (یعنی ہزار گرام) کہتے ہین اور جو پیرس کے محکمہ اوزان پیمائش مین محفوظ ہے اور جس کا وزن ۴ درجہ حرارت سنٹی گریڈ والے ایک لٹر پانی (یعنی ہزار مکعب سنٹی میٹر پانی) کے وزن کے برابر ہے۔ علمی دنیا مین وزن کے جسقدر پیمانے استعمال ہوتے ہین وہ گرام سے مشتق ہوتے ہین اور جسطرح میٹر کی مستند نقلین تمام ممالک مین استعمال کی جاتی ہین اسی طرح گرام اور کلو گرام کی مستند نقلین مستعمل ہین۔

پانی کے حجم پر حرارت کا اثر پانی اپنے درجہ انجماد کے قریب بے قاعدہ طور پر اپنا حجم بدلتا ہے۔ برف پانی سے ہلکی ہوتی ہے اور پانی پر تیرتی ہے جب برف گھلتی ہے تو پانی کا حجم برف کے حجم سے کم ہوتا ہے پھر جب صفر درجہ حرارت سے اوپر یہ پانی گرم کیا جاتا ہے تو عام قاعدہ کے خلاف پھیلنے کی بجائے سکڑتا ہے یعنی اس کا حجم کم ہوجاتا ہے۔ حجم کی یہ کمی ۴ درجہ حرارت سنٹی گریڈ تک بڑھتی جاتی ہے اور اسکے بعد پانی عام قاعدہ کے مطابق پھیلتا ہے۔ بالفاظ دیگر پانی کی ایک خاص مقدار (مثلاً ایک سیر) کا حجم ۴ درجہ حرارت س پر کم سے کم ہوتا ہے اور چونکہ کسی چیز کی کثافت وزن کو حجم سے تقسیم کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے باقی تمام درجہ حرارت کی نسبت ۴ درجہ س پر پانی کی کثافت زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے اس لیے اس درجہ حرارت کو پانی کے لیے مستند قرار دیا جاتا ہے ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ ایک مکعب سنٹی میٹر پانی کا وزن اسکے زیادہ سے زیادہ کثافت والے درجہ حرارت پر ایک گرام ہوتا ہے جس سے تمام حسابی اندازون مین پانی کی کثافت ایک ہونے سے ایک عمدہ سہولت اور سادگی پیدا ہوجاتی ہے۔

ثانیہ کی تعریف تیسری اساسی اکائی کا نام سیکنڈ (ثانیہ) ہے جسکی تعریف ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کے وقفہ کا ۱/۸۶۴۰۰ حصہ ہے جب سورج کسی مقام پر سب سے اونچا نظر آتا ہے یا بالفاظ دیگر وہان کی اشیاء کا سایہ چھوٹے سے چھوٹا دکھائی دیتا ہے تو اس وقت اس مقام کی دوپہر ہوتی ہے۔ ایک شبانہ روز مین ۸۶۴۰۰ ثانیے ہوتے ہین۔

(۳)

اشیاء اساسی کے انتخاب کے پانچ شرائط اب ہم بالتفصیل یہ بتانا چاہتے ہین کہ تین اشیاء اساسی کے انتخاب مین بالخصوص وقت، مقدار مادہ اور طول کو کیون چُنا گیا ہے اور ان کے علاوہ اور تین چیزون کو بطور اساسی اشیاء کے کیون نہین تسلیم کیا گیا۔

احاد اساسی کے انتخاب مین مفصلہ ذیل باتین بالخصوص ملحوظ ہونی چاہئین:—

(۱) یہ ایسی مقدارین ہونی چاہئین کہ اسی قسم کی دیگر مقدارون کے ساتھ ان کا مقابلہ نہایت درجہ کی صحت کے ساتھ ہو سکے۔

(۲) ایسا مقابلہ ہمیشہ ممکن ہونا چاہیئے۔ اس لیے اصلی پیمانون کو دیرپا ہونا چاہیئے جو کہ مرورِ وقت کے ساتھ نہ تو اپنی وسعت کو بدلین اور نہ تلف ہوجائین۔

(۳) ایسا مقابلہ ہر جگہ ممکن ہونا چاہیئے اس لیے اصلی پیمانے ایسے ہون کہ جگہ بہ جگہ لیجانے سے ان مین کوئی تبدیلی واقع نہو۔

(۴) ایسا مقابلہ آسان اور براہ راست ہونا چاہیئے۔

مقدار مادہ اور وزن کسی جسم کے مقدار مادہ اور وزن مین عام طور پر کوئی امتیاز نہین کیا جاتا کیونکہ مقدار مادہ براہ راست وزن کے متناسب ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر دو چیزون کا وزن برابر ہے تو ان مین مادہ کی مقدار بھی برابر ہے۔ ایک سیر روئی اور ایک سیر لوہا وزن اور مادہ کے لحاظ سے برابر ہین اختلاف صرف ان کی کثافت اضافی یا وزن مخصوص (وزن اور حجم کے تناسب کو کثافت کہتے ہین) مین ہوتا ہے۔ اس بحث کے متعلق مزید معلومات زمین کے وزن والے مضمون مین ملین گی۔

(۵) احاد اساسی ایسے ہونی چاہئین کہ احاد تبعی کی وسعت نہ بہت بڑی ہو اور نہ بہت چھوٹی، اور علاوہ اسکے احاد تبعی کی تعریف احاد اساسی کی مدد سے بآسانی ہو سکے۔

اگر ہم سنٹی میٹر گرام، اور ثانیہ، کی تعریفون کو اس محک پر پرکھین اور ساتھ ہی دیگر چیزون کی اکائیون کو بھی اس محک پر پرکھین تو مقابلتاً معلوم ہوگا کہ طول مقدار مادہ اور وقت سے بہتر اور زیادہ موزون اور کوئی چیز اساسی مقدار کہلانے کی مستحق نہیں ہین۔

علمی نظام احاد یا س گ ث نظام احاد فرانسیسی نظامِ احاد جس کو علمی دنیا سی جی ایس نظام احاد کہتی ہی، اُردو مین "علمی نظام احاد" کے نام سے مشہور ہونا چاہیئے۔ اس لیے کہ گو انگلستان اور ریاست ہاے متحدہ امریکہ مین اکائیون کا ایک اور نظام مروج ہی، جسے انگریزی نظام احاد بھی کہتے ہین لیکن عام طور پر علمی دنیا مین اب ایک ہی نظام مانا گیا ہی جس نظام کی ہم ابھی تشریح کر رہے تھے اس کو سی جی ایس نظام احاد مختلف اکائیون کے پہلے حروف تہجی کی مناسبت سے کیا گیا ہی اُردو مین اس کا مرادف س۔ گ۔ ث نظام احاد ہوگا۔ یعنی اکائیون کا وہ نظام جس مین سنٹی میٹر گرام اور ثانیہ طول، مقدار مادہ، اور وقت کی اکائیان ہین۔ اور گو انگریزی قاعدہ کے تتبع سے بعض اصحاب اُردو زبان کے لیے "علمی نظام احاد" کی نسبت س۔ گ۔ ث۔ نظام احاد کو مرجح سمجھین لیکن ہم سمجھتے ہین کہ یہ تقلید قابل تحسین نہین ہی۔ انگریزی زبان مین چونکہ ایک دوسرا نظام بھی مروج ہی اس لیے دونون کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کی خاطر سی۔ جی۔ ایس۔ نام رکھ لیا گیا تھا ہمارے ہان چونکہ ایسے کوئی نظام مروج نہین اس لیے ہم جب ایک باقاعدہ علمی نظام اختیار کرتے ہین تو کیون نہ اس کا تشریحی نام اختیار کرین۔

علمی نظام احاد کی خصوصیات علمی نظام احاد کی ممتاز خصوصیات یہ ہین۔

(۱) فی زماننا یہ نظام تمام علمی دنیا مین رائج ہی۔ اور کوئی دوسرا نظام اسکی عالمگیر مقبولیت کا مقابلہ نہین کر سکتا۔

(۲) اس نظام کے مطابق اجسام کے اوزان مخصوصہ اور کثافت اضافی دونون برابر ہو جاتے ہین۔

کسی چیز کی کثافت ہم اوپر بتلا چکے ہین کہ اس چیز کے وزن اور حجم کی حاصل تقسیم ہوتی ہی۔ یا بالفاظ دیگر ایک مکعب سنٹی میٹر چیز کا وزن اُس چیز کی کثافت یا وزن مخصوص کہلاتا ہی۔

کثافت یا وزن مخصوص کی تعریف اسے اور زیادہ عمومیت کے ساتھ کہنے کا ایک طریقہ یہ ہی کہ کثافت وزن حجم یا فی اکائی حجم کے وزن کو کہتے ہین۔

کثافت اضافی کسی چیز کی کثافت اور پانی کی کثافت کے تناسب کو اس چیز کی کثافت اضافی کہتے ہین۔

علمی نظامِ احاد کی دوسری خوبی یہ ہی کہ اس کے مطابق چیزون کی کثافت اور کثافت اضافی دونون کا اندازہ ایک ہی ہندسہ سے ہو جاتا ہی اس لیے کہ اس نظام کے مطابق چار درجہ حرارت مین کیونکہ ایک مکعب سنٹی میٹر پانی کا وزن ایک گرام ہوتا ہی اس لیے پانی کی کثافت بھی ایک ہوئی اور باقی چیزون کی کثافت ان کی کثافت اضافی کے برابر ہو گئی کثافت اضافی سے یہ پتہ چلتا ہی کہ کوئی چیز پانی سے کس قدر بھاری ہی لفظ بھاری

بھاری اور ہلکے اجسام کا صحیح مفہوم اور ہلکا روزمرہ کی زبان مین غلط معانی مین استعمال ہوتے ہین۔ مثلاً کہا جاتا ہی کہ ریت کے ذرے ہلکے ہین اس لیے وہ ہوا مین اڑتے ہین۔ اور بمقابلہ ان کے لکڑی کو بھاری کہا جاتا ہی۔ اس قسم کا مقابلہ چونکہ کسی خاص شرط کا پابند نہین ہوتا اس لیے اسے غیر علمی قرار دیا جاتا ہی۔ علمی نقطۂ خیال سے جو کہ فی الاصل حقیقت حال کے مطابق ہی۔ ریت لکڑی سے بھاری ہی کیونکہ ریت کا وزنِ مخصوص لکڑی کے وزن مخصوص سے زیادہ ہے یا دوسرے لفظون مین اگر دونون چیزون کے برابر حجم لیکر ان کا وزن نکالا جائے تو ریت کا وزن لکڑی کے وزن سے زیادہ ہوگا۔

نکتہ - ایک مبتدی کے دل مین قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ سنٹی میٹر کو میٹر کے بجائے کیون طول کی اکائی مانا گیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ انتخاب کی پانچ شرائط کے لحاظ سے گرام کلوگرام سے مرجح ہے۔ اس لیے کہ کلوگرام ایک بہت بھاری وزن ہے اور علمی معمل مین جو نازک اور صحیح (کیمیائی) ترازو استعمال کیے جاتے ہین ان کے لیے کلوگرام فی الحقیقت بہت زیادہ وزن ہے۔ زیادہ وزن تولنے کے لیے صحیح ترازو بنائے جا سکتے ہین لیکن ان کی قیمت بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اور دوسرے

ترازو کی حسّیت کی تعریف ترازو کی حسّیت وزن کی زیادتی سے کم ہوتی جاتی ہے۔ حسّیت کا مفہوم یون سمجھا جا سکتا ہے کہ بازاری ترازو کے ایک پلڑے مین اگر ایک رتّی ڈال دی جائے تو ڈنڈی بمشکل ٹیڑھی ہوگی لیکن کیمیائی ترازو یا جوہری کے ترازو مین ایک رتّی سے بہت فرق ہوتا ہے۔ ترازو کی حسّیت سے مراد وہ کم از کم وزن ہے جو ہم صحت کے ساتھ تول سکتے ہین۔ باین وجوہ کلوگرام بحیثیت اکائی کے ناکارہ ہے اور گرام عین مناسب ہے۔ اب اگر گرام کے ساتھ طول کی اکائی میٹر ہوتی تو میٹر کے خلاف علاوہ اور اعتراضات کے یہ اعتراض آتا ہے کہ گرام اور میٹر کو اکائیان ماننے سے پانی کی کثافت دس لاکھ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایک مکعب میٹر مین ۱۰۰ × ۱۰۰ × ۱۰۰ یعنی دس لاکھ مکعب سنٹی میٹر ہوتے ہین۔ اس سے یہ قباحت پیدا ہوتی ہے کہ چیزون کی کثافت ان کی کثافت اضافی سے دس لاکھ گنا ہو جاتی ہے۔ گرام اور سنٹی میٹر کو اکائیان ماننے سے یہ نقص بالکل رفع ہو جاتا ہے۔

(۳) علمی نظام اعاد کی ایک بڑی ممتاز خصوصیت ان کے ذریعہ حسابی اندازہ کی سہولت ہے۔ تمام اکائیون (اساسی اور تبعی دونون) کے حصے بڑے یا چھوٹے سب کے سب صحیح طور پر دس سے منقسم ہو جاتے ہین۔

(۴)

دس کی خصوصیت حضرتِ انسان نے ایک بڑی حد تک علوم کی ترقی مین بھی اپنا جسمانی عنصر نہین بھلایا۔ دونون ہاتھون اور دونون پاؤن کی دس انگلیان ہونے سے دس کے عدد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور حساب مین اگر کوئی ہندسہ متبرک کہا جا سکتا ہے تو فی الحقیقت دس ہے۔

کسرون کی تحریر کا ایک بہتر طریقہ عام طور پر کسرین ۲/۱ و ۴/۳ و ۹/۵ و ۱۲/۱ لکھی جاتی ہین۔ اعداد کے لیے تو کسور اعشاریہ جن کا مختصر ذکر ہم بھی کرین گے بالکل کافی ہین۔ اس لیے ہندسی کسرین علمی کامون مین مفقود ہوتی جاتی ہین۔ لیکن تناسب کے نشان یعنی - کی اہمیت ہمین نظرانداز نہین کرنی چاہیے۔ یہ نشان ایک طرح کی اعلیٰ مختصر نویسی ہے لیکن بجائے اس کے کہ ہم $\frac{\text{وزن}}{\text{حجم}}$ لکھین جو چھپائی مین سطرون کی یکسانیت کے منافی ہے اور جو ایسی مثالون مین جہان ایک سے زیادہ تناسب ہوتے ہین چھپائی مین بالکل نہین آ سکتا۔ مثلاً اسراع کی تعریف $\frac{\text{رفتار}}{\text{وقت}}$ ہے اور رفتار کی تعریف $\frac{\text{فاصلہ}}{\text{وقت}}$ اس لیے اسراع کو یون لکھنا ہوگا۔ $\frac{\text{فاصلہ}/\text{وقت}}{\text{وقت}}$ جو کہ صاف طور پر برا معلوم ہوتا ہے)، ہمین تناسب کے نشان کو متوازی لکھنے کے بجائے آڑا لکھنا چاہیے یعنی وزن / حجم یا اسراع۔ فاصلہ / وقت / وقت۔ اس طرز تحریر کے فوائد اور سہولت عیان ہین۔

کسور اعشاریہ ہندسی کسرون کے لیے کسور اعشاریہ جن کا مجموعی نام نظام اعشاریہ ہے زیادہ مناسب ہین۔ مثلاً ۲/۵ - ۴/۱۰ - ۴ر۰ اور ۹/۶ - ۱۲ر۶۶ کسور اعشاریہ نہ صرف چھپائی کے لیے زیادہ موزون ہین بلکہ تمام ہندسی عمل ان کے ذریعے زیادہ آسانی کے ساتھ حل ہو سکتے ہین۔

اعداد اساسی کے علمی نظام اعاد بھی اس خصوصیت کی وجہ سے کہ اس کے بڑے چھوٹے حصے مین اکائیون کے حصے سب دس کی ضرب یا تقسیم سے حاصل ہوتے ہین، نظام اعشاریہ کے بالکل مطابق ہے اور اسلیے سائینٹفک شمارات مین بہت سہولت رہتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سنٹی میٹر میٹر کا ۱/۱۰۰ حصہ ہے اگر ہم اس قاعدہ کو اختیار کرین کہ اختصار کے لیے کسی اکائی کا پورا نام لکھنے کے بجائے اس کا پہلا حرف ہجی لکھ دیا جائے تو ایس ۰۱ر۰ م -

باقی حصے سب کے سب اسی قاعدے کے ماتحت ہین۔ میٹر کے دس، سو اور ہزار گنے حصون کے مختص نام ڈیکا میٹر ہیکومیٹر اور کِلومیٹر ہین ان مین سے صرف کِلومیٹر مروج ہے باقی دونون شاذ و نادر استعمال مین آتے ہین۔ اسی طرح گرام کے دس، سو اور ہزار گُنے حصون کے مختص نام ڈیکا گرام ہیکوگرام اور کِلوگرام ہین جن مین سے صرف کِلوگرام مروج ہے باقی شاذ و نادر ہی استعمال مین آتے ہین۔ میٹر اور گرام کے چھوٹے حصے دسوان، سوان اور ہزاروان حصے ہین جن کے لیے یہ اصطلاحات مستعمل ہین۔ ڈیسی، سنٹی اور مِلی۔

ہم ان نامون کو ایک جدول مین درج کرتے ہین:—

(۱) طول کا پیمانہ

مِلی میٹر =	۱/۱۰۰۰م =	۰۰۱ء۰م –
سنٹی میٹر =	۱/۱۰۰م =	۰۱ء۰م –
میٹر =	۱/۱م =	۰ء۱م –
کِلومیٹر =	۱۰۰۰/۱م =	۰ء۱۰۰۰م

(۲) وزن کا پیمانہ

مِلی گرام –	۱/۱۰۰۰گ =	۰۰۱ء۰گ
گرام –	۱گ =	۰ء۱گ
کِلوگرام –	۱۰۰۰گ =	۰ء۱۰۰۰گ

کسی چیز کی لمبائی یون ظاہر کی جاتی ہے ۵ء۴۴ و ۱۶۷ سنٹی میٹر اور اسکا وزن اسطرح ۴۵ء۰۰۷ وگرام یعنی ۷ وگرام اور ۵ء۴۴ مِلی گرام۔

اردو کی مرادف اصطلاحات بطور جملہ معترضہ کے ہم یہان اس امر کا اظہار ضروری سمجھتے ہین کہ زبان اُردو مین بھی کم از کم مِلی سنٹی اور کِلو یعنی ہزاروین اور سووین حصہ اور ہزار گنے حصہ کے لیے مرادف الفاظ وضع کئے جانے چاہئین ہم خود علمی اصطلاحات کے متعلق ایک جداگانہ مضمون مین اپنے خیالات ظاہر کرین گے علاوہ ان تین ضروری اسمار کے لاکھ گُنا اور لاکھوین حصہ کے لئے انگریزی مین دو نہایت مختصر نام مروج ہین میگا اور مائکرو جنکا ترجمہ بھی ضروری

معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً برقی رَو کو کسی جسم مین سے گذرتے ہوے جو مزاحمت پیش آتی ہے اس مزاحمت کی عملی اکائی کو "اوہم" کہتے ہین اور چونکہ بعض اجسام کی جن مین سے عام طور پر بجلی گذرنے نہین پاتی، اور جو عرف عام مین غیر موصل اجسام کہلاتے ہین برقی مزاحمت بہت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ایک خاص اکائی جس کا معیار دس لاکھ اُوہم ہے۔ میگا اوہم کے نام سے مروج ہے۔ علی ہذا القیاس اگر ایک چیز مِلی میٹر کا ایک ہزار وان حصہ لمبی ہو تو اس کی لمبائی کو ایک مائکران کہتے ہین، مائکران میٹر کا دس لاکھوان حصہ ہوتا ہے۔ روشنی کی لہرون کی لمبائی مائکران سے بھی کم ہوتی ہے بعض اوقات مائکرو غلطی سے ہزاروین حصہ کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ لیکن ایسا استعمال حکم شاذ رکھتا ہے، اور قابل تقلید نہین ہے۔

انسانی اور قدرتی پیمانے ایک اور ضروری بات قابل غور یہ ہے کہ جملہ اوزان اور پیمانے سب کے سب انسان کے وضع کردہ ہین اور اس لیے کسی قدرتی اٹل قانون کے تابع نہین ہین۔ مثلاً طول کے پیمانہ مین سنٹی میٹر کو اکائی قرار دیا گیا ہے حالانکہ پلاٹی نم کی اصلی سلاخ کی لمبائی ایک میٹر ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس چیز کو ہم میٹر کہتے ہین اسے سنٹی میٹر کیون نہین کہتے؟ اسکا جواب نہایت آسان اور سادہ ہے اور وہی ہے جو عام طور پر دنیا کے نامون کے متعلق دیا جا سکتا ہے اور جس کا فلسفہ قرآن شریف مین بھی یون بیان کیا گیا ہے کہ نامون کی علت غائی یہ ہے کہ تم آپس مین ایک دوسرے کو (اور علی ہذا القیاس گرد و پیش کی چیزون کو) پہچان سکو۔ بیشک ہم سنٹی میٹر کو موجودہ میٹر کے برابر لمبا بنا تے ہین، اور میٹر کو اس سے سوگنا بڑا لیکن ایسا کرنے کے بعد بھی شکل ویسی کی ویسی رہتی ہے یعنی کیا وجہ ہے کہ ایک خاص لمبائی کو سنٹی میٹر کا نام دیا گیا ہے اور کسی دوسری لمبائی کو یہ نام نہین دیا گیا؟ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ آخر کسی نہ کسی لمبائی کو کوئی ایک نام دینا ضروری تھا۔ اس لیے کسی ایک لمبائی کو ایک خاص نام دیدیا گیا۔ اور بعد ازان تمام آدمیون نے باہمگر اتفاق رائے کر لیا کہ آئندہ ہمیشہ اُس خاص لمبائی کو اُس خاص

نام سے پکارتے ہین اور اس طرح سے ایک آدمی کا مطلب دوسرا آدمی سمجھ جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر نام ایک طرح کا معاہدہ (خفی یا جلی اس سے بحث نہین ہی) ہوتے ہین مابین متفرق اشخاص کے اس امر کے متعلق کہ ہر چیز کو ایک خاص طریقہ سے یاد کیا جائے گا، اور جب تک اسکی حیثیت نہ بدلے یہ طریقہ یعنی اسکا نام نہ بدلا جائے گا۔ دوسرا سوال یہ کیا جا سکتا ہی کہ میٹر کے معین حصہ کو دوسرے حصے سے ترجیح دیکر کیون طول کی اکائی قرار دیا گیا ہی؟ اس کا جواب بھی سہولت اور انسانی اختیار ہی۔ لیکن ایک دفعہ اختیار کر لینے کے بعد رد و بدل شیوۂ عقل نہین سمجھا جاتا۔

علمی اکائیان معینہ زندگی مین علمی پیمائش اور روزمرہ کی زندگی کے کامون مین ایک فرق یہ ہی کہ سائنٹفک اندازون مین خواہ کوئی لمبائی بڑی ہو یا چھوٹی اس کو ہم سنٹی میٹر ہی سے ظاہر کرتے ہین، گو ناپتے وقت، پیمائش سنٹی میٹر سے نہین کیجاتی لیکن نتیجہ ہمیشہ اتنے سنٹی میٹر کہا جاتا ہی خواہ وہ نتیجہ سنٹی میٹر سے کتنا ہی بڑا یا کتنا ہی چھوٹا کیون نہ ہو۔ مثلاً روشنی کی رفتار فی ثانیہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل یا فی دقیقہ (منٹ) ایک کروڑ میل ہی۔ علمی اصطلاح مین روشنی کی رفتار ۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۳۰ تیس ارب سنٹی میٹر ہی۔ اتنی بڑی رقوم کے اظہار کا ایک مختصر طریقہ اسی مضمون کے آخر مین تشریح کیا گیا ہی۔ اگر میٹر کو اکائی مانا جائے تو روشنی کی رفتار ۳۰ کروڑ فی ثانیہ ہوتی ہے اور اگر کلومیٹر کو اکائی مانا جائے تو وہی رفتار ۳ لاکھ کلومیٹر فی ثانیہ رہجاتی ہی۔

جس سمجھوتے اور باہمی اتفاق رائے کا ہم نے ذکر کیا ہی اسکی مثال نہ صرف علمی دنیا مین پائی جاتی ہی بلکہ تجارتی دنیا بھی ایسے ہی سمجھوتون پر چلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہی کہ علمی دنیا کی اکائیان جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہین اب مسلمہ طور پر تمام مہذب ممالک مین رائج ہین تجارتی دنیا کی اکائیان ملک بہ ملک مختلف ہوتی ہین۔ انگلستان کا سکہ اور ہی جرمنی کا اور ہی اور فرانس کا ان دونون سے مختلف ہی لیکن ان سب کے علمی سکے یعنی سائنٹفک اکائیان اب ایک ہی ہین۔

(۵)

انگلستان کی سائنٹفک کمیٹی علمی اکائیون کے وضع کرنے کیلیے ۱۸۷۳ء سے پہلے بالعموم انگلستان مین سی جی۔ ایس نظام احاد مروج نہین تھا لیکن اسی سال انگلستان کے سربرآوردہ علمائے سائنس کی ایک کمیٹی نے اپنے متعدد اجلاس مین غور و خوض کے بعد ملک سے سفارش کی کہ سنٹی میٹر گرام اور ثانیہ کو اختیار کر لیا جائے۔ اس کمیٹی مین لارڈ کیلون، کلارک میکسویل، وغیرہم بڑے بڑے جلیل القدر سائنس دان شامل تھے، اور ہم اس تذکرہ سے اس بات پر زور دینا چاہتے ہین کہ مناسب اکائیون کے انتخاب کا مسئلہ بالخصوص علمی کامون کے لیے کوئی معمولی یا غیر ضروری فضول کام نہین ہی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کا ترجمہ اگر اردو خوان اصحاب کے سامنے پیش کیا جائے تو ان کو معلوم ہوگا کہ س۔ گ۔ ث۔ نظام احاد ان تمام خوبیون سے متصف ہے جو کہ ایک علمی نظام احاد مین موجود ہونی چاہئیین اس رپورٹ مین قابل شرکائے کمیٹی نے شرح و بسط کے ساتھ تمام میکانیکی اور برقی تبعی اکائیون کے متعلق بھی اپنی رائے ظاہر کی ہی اور ان کے مخصوص نامون سے بحث کی ہی۔ چونکہ ابھی تک اردو زبان مین کوئی مستند کتاب علوم طبیعات کے متعلق موجود نہین ہی اور بالعموم اردو دان اصحاب علوم طبیعات سے ناواقف ہین اسلیے اس رپورٹ کا ترجمہ یا اس پر تبصرہ لکھنا سر دست فضول ہوگا۔ علمی ترقی کے ساتھ آئندہ خود بخود اس کمی کے پورا کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی اور یہ کام ہو جائے گا۔

س گ ث تبعی اکائیان تمام تبعی اکائیان جن کا ماخذ علمی نظام احاد کی تین اساسی اکائیان ہین س گ ث اکائیان کہلاتی ہین۔ ہم یہان ان تبعی اکائیون مین سے چند کا مختصر تذکرہ کرنا ضروری خیال کرتے ہین۔ تبعی اکائیون مین سے بعض ایسی ہین جن کا انحصار صرف ایک ہی اساسی اکائی پر ہی۔ مثلاً رقبہ کی اکائی کہ یہ سنٹی میٹر ضرب سنٹی میٹر کے برابر ہوتی ہی اس لیے رقبہ کی اکائی ایک مربع سنٹی میٹر ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس حجم کی اکائی مکعب سنٹی میٹر ہوگی نیز

قسم کی تبعی اکائیان وہ ہین جو ایک سے زیادہ اساسی اکائیون پر منحصر ہین مثلاً رفتار کہ اس کا تعلق طول مین طے شدہ مسافت اور وقت دونون سے ہے۔ اس لیے رفتار کا تعین اتنے سنٹی میٹر فی ثانیہ سے ہوگا۔ پھر بعض تبعی اکائیان ایسی ہین کہ ان کے لیے کوئی خاص نام نہین وضع کیا گیا مثلاً کثافت، رفتار یا اسراع۔ اور بعض ایسی ہین کہ ان کے لیے بوجہ کثرت استعمال یا یون ہی مختصر نام وضع کیے گئے ہین۔ مثلاً طاقت کی اکائی کہ اسے علمی نظام اعداد کے مطابق ڈائن کہتے ہین یا کام کی اکائی کہ اسے ارگ کہتے ہین وغیرہ وغیرہ۔ طاقت اور کام ڈائن اور ارگ کے متعلق ان کی علمی اہمیت کے لحاظ سے چند سطور بے محل نہ ہون گی۔

علمی اکائیان

مادی اجسام نہ خود بخود حرکت کرتے ہین اور نہ خود بخود ساکن ہو جاتے ہین اور نہ اپنی حرکت کی رفتار بغیر کسی بیرونی اثر کے بدلتے ہین یہ صفت مادی اجسام کی ممتاز خصوصیت مانی جاتی ہے اسے مختصر علمی اصطلاح مین انرشیا یا جمود کہتے ہین

انرشیا یا جمود

اور یہ جمود مادہ کی مادیت کا معیار سمجھا جاتا ہے یعنی جس چیز مین یہ صفت ہو اسے مادی چیز کہین گے۔ ہم اس مضمون پر مفصل بحث اپنے ایک عام فہم مضمون "حرکت کا پہلا قانون" مطبوعہ العصر جون سنہ ۱۹۱۳ء مین کر چکے ہین۔ یہان صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ طاقت کی تعریف اسی جمود پر مبنی ہے۔ طاقت وہ ہے جو کسی جسم کی حالت متحرکہ یا حالت سکون کو بدل سکتی ہے۔ جو طاقت ایک ثانیہ عمل کرنے کے بعد ایک گرام مین ایک سنٹی میٹر فی ثانیہ کی رفتار پیدا کر دے اس کو طاقت کی اکائی یا ڈائن کہتے ہین۔ جب کسی طاقت کا نقطہ عمل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے تو وہ طاقت کچھ نہ کچھ کام کرتی ہے اور کام کا معیار طاقت اور فاصلہ کا حاصل ضرب ہے۔ اس لیے ارگ یعنی کام کی اکائی کام کی وہ مقدار ہے جو ایک ڈائن طاقت کے ایک سنٹی میٹر حرکت کرنے سے منتج ہوتا ہے۔ کام کر سکنے کی قابلیت کا نام اصطلاح مین قوت ہے اور اس لحاظ سے علمی طور پر قوت اور طاقت ممتاز اور جداگانہ ہستیان ہین گو معمولی محاورہ مین ان کو سہولت کے لیے ہم معنی قرار دیا جاتا ہے۔

قوت اور طاقت

زمین کی کشش کی طاقت بہت زبردست ہے۔ ایک گرام مین جس قدر مقدار مادہ ہوتی ہے اسکو زمین کی کشش تقریباً ۹۸۱ ڈائن کی طاقت سے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس لیے اگر آپ ایک گرام کو ایک سنٹی میٹر عمودی فاصلہ اوپر اٹھائین تو آپ ۹۸۱ ڈائن کی طاقت کا مقابلہ ایک سنٹی میٹر کے فاصلہ مین کرتے ہین۔ لہذا آپ ایک گرام کے اٹھانے مین ۹۸۱ ارگ کام کرتے ہین اور دو گرام کے اٹھانے مین ۲ × ۹۸۱ یعنی ۱۹۶۲ ارگ۔ اسی طرح ایک گرام کو ۲ سنٹی میٹر اٹھانے مین بھی ۲ × ۹۸۱ ارگ کام کیا جائے گا۔ ارگون مین وزن فاصلہ عمودی اور ۹۸۱ کی حاصل ضرب ہوتا ہے جبکہ وزن اور فاصلہ کا اظہار گرام اور سنٹی میٹر کے ذریعہ سے کیا گیا ہو۔

طاقت اور کام کی یہ علمی تشریح بظاہر دق معلوم ہوتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم اپنی روزانہ زندگی مین اپنے خیال کی تحلیل کیے بغیر اجمالی طور پر ان امور کو بخوبی سمجھتے ہین۔

کام کی ایک عام فہم مثال

مثلاً جس آدمی نے کنوئین مین سے کبھی پانی بذریعہ ڈول نکالا ہوگا وہ جانتا ہے کہ کام پانی کی مقدار کے متناسب ہوتا ہے۔ پانی کے دو ڈول نکالنے مین دوگنا کام کرنا پڑتا ہے یا یون بھی کہا جاتا ہے کہ دوگنا پانی نکالنے مین دوگنی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ اسطرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر ایک کنوان دوسرے سے دوگنا گہرا ہو تو دوگنا کام کرنا پڑتا ہے اور اس حالت مین دو ڈول کھینچنے کے لیے پہلے کی بہ نسبت چارگنی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ علی ہذا القیاس یہ بھی عام طور پر معلوم ہے کہ اگر پانی کے بجائے کنوئین مین سے ریت کے ڈول بھر بھر کر نکالے جائین تو کام کی مقدار پہلے سے بڑھ جاتی ہے اور زیادہ زور لگانا پڑتا ہے۔ اب اگر ان سب خیالات کو یکجا جمع کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ کام کی مقدار متناسب ہے وزن کے اور اس بلندی کے جس مین سے وہ وزن اٹھایا جاتا ہے۔ یہان انسانی عنصر [illegible] دکھلاتا ہے [illegible] اور عضلات کی طاقت کی مناسبت سے کام کی تعریف بالعموم طاقت اور فاصلہ کی حاصل ضرب قرار دی گئی ہے۔ اگر ایک پونڈ وزن کو ایک فٹ

اوپر اُٹھایا جائے تو کام کی مقدار ایک فٹ پونڈ کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک سیر کو ایک فٹ اوپر اُٹھانے میں ایک فٹ سیر کام کیا جائے گا۔ کام کی ایک بڑی اکائی جسے اصطلاح میں "ایک گھوڑے کی طاقت" کہتے ہیں علمی اکائیوں کے زمانہ سے پہلے کی مروج ہے اور تقریباً تینتیس ہزار فٹ پونڈ فی منٹ کے برابر ہوتی ہے۔ آج کل اس اصطلاح کا استعمال زیادہ تر متروک ہے۔ ایک فٹ پونڈ = ۱۰×۱ء۳۶ ارگ۔

مقدار حرارت کی اکائی | ایک ضروری تبعی اکائی علم الحرارت میں مقدار حرارت کی اکائی ہے۔ جتنی حرارت ایک گرام پانی کے درجہ حرارت کو ایک درجہ سنٹی گریڈ بلند کرنے کے لئے درکار ہوتی ہے اُسے مقدار حرارت کی اکائی یا کیلوری کہتے ہیں۔

حرارت پیمائی کے لیے مختلف پیمانے مقرر ہیں جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔

مقیاس الحرارت | سنٹی گریڈ پیمانے جس کے مطابق پگھلتی ہوئی برف کا درجہ حرارت صفر کہلاتا ہے اور کھولتے ہوئے پانی کا ایک سو۔ درمیانی درجہ ہائے حرارت اس وقفہ کو برابر کے سو حصوں میں تقسیم کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ بالعموم یہی پیمانہ مقیاس الحرارت علمی دنیا میں مروج ہے اس لیے کہ یہ کسور اعشاریہ کے تابع ہے۔ دوسرا پیمانہ فارن ہائیٹ کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق برف کے درجہ حرارت کو ۳۲ اور کھولتے ہوئے پانی کے درجہ حرارت کو ۲۱۲ کہتے ہیں۔ یہ پیمانہ عام طور پر ڈاکٹر اور معالج استعمال کرتے ہیں۔ صحیح جسم انسانی کا درجہ حرارت اس کے مطابق ۹۸ء۴ ہے۔ سنٹی گریڈ پیمانہ میں یہ درجہ حرارت ۳۶ء۹ یا تقریباً ۳۷ کے برابر ہوتے ہیں۔ مقدار حرارت کی اکائی مقرر کرنے میں سنٹی گریڈ پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ فارن ہائیٹ کے مطابق کیلوری ۵۵/۹ یعنی ۵۵ء۰ حصہ چھوٹی ہو جائے گی۔

اسی طرح روشنی برق اور علم الصوت میں ضروری اکائیاں مقرر کیجا سکتی ہیں جنکا استحصار کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔

وقت کی تقسیم | ہم نے اعداد اساسی کا ذکر کرتے ہوئے ارادۃً وقت کی اکائی کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ تمام مختلف نظام صرف وقت کی اکائی کے متعلق متفق ہیں بلکہ وقت کی تقسیم کے مطابق بھی کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ ساٹھ ثانیہ کا ایک دقیقہ (منٹ) ہوتا ہے ساٹھ دقیقہ کا ایک گھنٹہ اور چوبیس گھنٹہ کا ایک دن رات اور سات دن رات کا ایک ہفتہ۔ یہاں تک کوئی اختلاف نہیں ہے اس کے بعد مہینہ اور سال میں کسی قدر اختلاف ہے۔ مگر علمی اور عملی کاموں کیلیے شمسی سال اور ماہ اب عام طور پر تمام دنیا میں مروج ہیں۔

ثانیہ اور دقیقہ | ثانیہ اور دقیقہ سیکنڈ اور منٹ کا صحیح لغوی ترجمہ ہیں اگر انگریزی الفاظ کو خواہ مخواہ استعمال کرنے کی عادت نہ ہو تو ثانیہ اور دقیقہ صحیح ہیں۔ ہاں اس خیال سے کہ سیکنڈ اور منٹ نہایت مختصر اور آسان الفاظ ہیں ان کے

چند مشہور درجات حرارت سلہ چونکہ عام طور پر عوام الناس درجہ حرارت سے ناواقف ہوتے ہیں اسلیے سنٹی گریڈ پیمانہ کے مطابق چند مشہور اور مفید درجات حرارت عام آگاہی کے لیے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

	درجہ سنٹی گریڈ
سورج	تقریباً ۷۰۰۰
بجلی کی آرک۔	۳۵۰۰
لوہا پگھلتا ہے	۱۵۰۰
حرارت کا درجہ ابیضاض	۱۴۰۰
چاندی پگھلتی ہے	۹۶۰
حرارت کا درجہ احمرار	۷۰۰

	درجہ سنٹی گریڈ
کوئلہ جلتا ہے۔	۴۰۰
پارہ کھولتا ہے۔	۳۵۷
سیسہ پگھلتا ہے	۳۲۷
قلعی پگھلتی ہے۔	۲۳۲
گندھک پگھلتی ہے۔	۱۱۵
نمک اور برف کے ملانے سے کم از کم خنکی	۱۷ء۷ ۱۱ء۵ درجہ
ہوا مائع ہو جاتی ہے۔	۱۸۰

رواج مین بھی سوائے زبان کی گندگی کے اور کوئی خاص اعتراض ثقل وغیرہ کا پیش نہین کیا جا سکتا۔

قمری ماہ کا فلسفہ مسلمانون کے ہان قمری مہینہ بلا وجہ مروج نہین ہی کاروبار کے لیے ضروری طور پر شمسی ماہ اور سال مسلمانون کو بھی اختیار کر لینا چاہیے اسکے فوائد اظہر من الشمس ہین قمری ہجری ۱۳۳۳ھ ہی لیکن اگر شروع شروع مین اسکے ساتھ ساتھ شمسی ہجری کا سال استعمال کیا جائے جیسا کہ مصر یا بعض دیگر ممالک اسلامیہ مین ہوتا ہی تو بتدریج شمسی سال مسلمانون کے درمیان بھی مروج ہو سکتا ہی۔ تاریخ قدیم مین البتہ اس تبدیلی سے دقت واقع ہو سکتی ہی لیکن وہ دقت اس نوع کی ہو گی جیسی کہ آجکل انگریزی خوان مسلمانون کو بالخصوص میلادی (ع) اور ہجری سال کی تطبیق مین واقع ہوتی ہی۔ قمری مہینون کا بڑا فائدہ رمضان اور حج کی عالمگیری پر غور کرنے سے سمجھ مین آسکتا ہی اور یہ ایسا فائدہ ہی کہ اس کا نعم البدل اور کسی طریقہ سے حاصل نہین ہو سکتا۔ اگر رمضان کا کوئی خاص وقت مقرر کر دیا جائے تو نصف کرۂ شمالی کے لیے اگر سہولت ہو تو نصف کرہ جنوبی کے لیے مشکل پڑے گی کیونکہ ان دونون مین موسم بالکل متضاد ہوتے ہین۔ ہماری سردی کا موسم وہان کی گرمی ہوتی ہی اور اگر اس کا کوئی ناقص حل کیا جائے تو ساری دنیا کے مسلمان ایک ہی وقت روزہ دار نہ ہون گے۔ علی ہذا القیاس حج کے متعلق کہا جا سکتا ہی اس خالص اسلامی مسئلہ کے متعلق تفصیل سے لکھنا موجودہ علمی مضمون کے منافی ہوگا۔ ہم اپنے مفصل خیالات کسی دوسرے موقع پر ظاہر کرین گے۔

شمس ہجری ۱۲۹۴ھ

دوپہر اور سہ پہر وقت کی تقسیم کے متعلق صرف یہ لکھنا باقی ہی کہ ہندوستان مین گھڑیون کی ایجاد سے پیشتر دن رات کے آٹھ پہر ہوتے تھے اور اگرچہ ہر پہر کی وسعت برابر نہ ہوتی تھی لیکن پھر بھی کام چلایا جاتا تھا اس تقسیم کی یادگار الفاظ دوپہر اور سہ پہر ابھی تک باقی ہی۔

(۵)

دوسرا نظام احاد س۔گ۔ث نظام احاد کے علاوہ دوسرا نظام جس سے انگریزون کے ذریعے سے ہم بھی واقف ہین۔ ف۔پ۔ث نظام احاد کہلاتا ہی اس مین طول کی اکائی فٹ ہی اور یہ ایک خاص سلاخ کا جو لندن مین محفوظ ہی تیسرا حصہ ہوتا ہی۔ مقدار مادہ کے لیے پونڈ ہی جسکی تعریف بھی کلوگرام کی طرح دھات کے ایک ٹکڑے سے کی جاتی ہی جو لندن مین محفوظ ہی۔ وقت کی اکائی ثانیہ یعنی ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کے وقفہ کا $\frac{1}{86400}$ وان حصہ ہی۔ اس نظام کی احاد بھی بدستور سابق حاصل کی جاتی ہی۔ طاقت کی اکائی کو ایک پونڈل کہتے ہین اور کام کی اکائی کو ایک فٹ پونڈ۔ ہم نے دیکھا ہی کہ زمین کی کشش کا اسراع علمی نظام احاد کے مطابق ۹۸۱ ہی اور یہی اس طاقت کا ہندسی معیار ہی جو زمین کی کشش ایک گرام کے اوپر لگاتی ہی۔

طاقت اور اسراع کی مزید تشریح طاقت اسراع اور مقدار مادہ کا تعلق اس مساوات سے ظاہر ہی۔ طاقت = مقدار مادہ × اسراع۔ اب اگر مقدار مادہ کو اکائی رکھا جائے تو طاقت = اسراع۔ ۹۸۱ کو سمجھنے کے لیے آپ یہ خیال فرمائین کہ ایک ساکن جسم اگر زمین کی طرف گرایا جائے تو شروع ثانیہ مین اسکی رفتار صفر ہوتی ہی اور اخیر ثانیہ مین ۹۸۱ سنٹی میٹر (۳۲.۲ فٹ) فی ثانیہ بالفاظ دیگر ایک ثانیہ مین کسی ساکن جسم کی رفتار مین جب وہ زمین کیطرف گرتا ہی ۹۸۱ سنٹی میٹر فی ثانیہ (۳۲ فٹ فی ثانیہ) کی تبدیلی واقع ہوتی ہی۔ اوسط رفتار ظاہر ہی کہ پہلے ثانیہ مین $\frac{981}{2}$ یعنی تقریباً ۴۹۰ سنٹی میٹر فی ثانیہ ہو گی۔ اس لیے پہلے ثانیہ مین ساکن جسم ۴۹۰ سنٹی میٹر (یعنی ۱۶ فٹ) فاصلہ زمین کیطرف گرتا ہی دوسرے مین ۱۴۷۱ سنٹی میٹر (۴۸.۳ فٹ) یعنی پہلے دو ثانیہ مین ۱۹۶۲ سنٹی میٹر (۶۴.۴ فٹ) گرتا ہی۔

مختلف مروجہ پیمانون کے باہمی تعلقات اب صرف ہندوستانی اوزان اور پیمانون کے علمی اوزان اور پیمانون کے ساتھ باہمی تعلقات بتلا دینے باقی ہین۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہین کہ ایک انچ تقریباً $2\frac{1}{2}$ سنٹی میٹر جس سے ایک فٹ مین تقریباً ۳۰ اور ایک گز مین ۹۱ سنٹی میٹر نکلتے ہین۔ ایک میٹر ۳۹ انچ یا ۳۹.۳۷ انچ۔ ایک ملی میٹر انچ کا ۱/۲۵ حصہ ہوتا ہی۔ ایک کلومیٹر تقریباً ۵ فرلانگ کے برابر ہوتا ہی اور سولہ سو میٹر تقریباً ایک میل ہوتے ہین ہندوستانی گرہ

ہاتھ اور قدم جو کہ علی الترتیب کپڑے اور زمین کی پیمائش میں کام آتے ہیں، مفصلہ بالا مساوات سے علمی اعداد کے ساتھ ملائے جا سکتے ہیں۔ پریشانی اور پراگندہ معانی کا ایک مجسم نمونہ ہندوستانی کوس ہے جس کی ملک کے مختلف حصص میں مختلف قیمتیں ہیں۔

رقبہ اور حجم کے پیمانے استعمال میں کم آتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو یک لخت سنٹی میٹر کو اپنی اکائی مقرر کر لینا چاہیئے، بلکہ یہ کام بتدریج ہونا چاہیئے جوں جوں ملک میں علمی تعلیم کا چرچا ہوگا سائنس دانوں کی تعداد بڑھے گی، اور آہستہ آہستہ سنٹی میٹر اور علمی نظام اعداد کی خوبیاں دلپذیر ہوتی جائینگی۔ اور پھر گو ایک حد تک اس امر سے بڑی سہولت ہوتی ہے کہ تجارتی کاروبار اور علمی تحقیقات کے ایک جیسے پیمانے ہوں لیکن ضرورت زیادہ تر صرف اس بات کی ہے کہ علمی کاموں کے لیے ہمارے ہاں وہی اکائیاں مروج ہو جائیں جو باقی مہذب ممالک میں رائج ہیں۔ تجارتی کاروبار بھی آہستہ آہستہ تغیر پذیر ہوتے جائیں گے لیکن یہ ہم ضرور کہیں گے کہ جہاں خالص ہندوستانی پیمانوں کو چھوڑا جائے اور ان کی جگہ کوئی غیر ہندوستانی پیمانہ اختیار کیا جائے وہاں بہتر ہوگا کہ ہم سائنٹفک نظام اعداد کو اپنا رہبر بنائیں۔ مثلاً اگر گرہ کو کسی زمانہ میں متروک کیا جائے تو انچوں کی بجائے سنٹی میٹر زیادہ موزوں ہوں گے

وزن اور حجم کے تناسب کو ہم پہلے بھی کثافت کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ امر واضح کرنا ہے کہ اگر دودھ کو بجائے تولنے کے ناپا جائے تو کثافت کا علم ہونا ضروری ہے اور حجم کے حساب سے دودھ یا کسی اور مائع کی خرید میں اسکی کثافت اضافی کا جاننا لازمی ہے۔

اوزان کے متعلق صرف یہ کہنا باقی ہے کہ ہمارے ہاں وزن کا تعلق شاذ ہی حجم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پونڈ اور سیر کا تعلق مختلف حالات میں مختلف ہوتا ہے ۸۰ تولہ یا ۱۶ چھٹانک کا سیر ۲۰۲ پونڈ کے برابر ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک پونڈ میں تقریباً ۸ چھٹانک ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی ایک پونڈ ۳۹ تولہ کا بھی ہوتا ہے اب چونکہ ایک پونڈ میں ۴۵۳ گرام ہوتے ہیں اور ۲۰۲ پونڈ ایک کلوگرام کے برابر ہوتے ہیں اسلیئے ایک سیر ایک کلوگرام سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ صحیح طور پر ایک سیر تقریباً ۱۰۴۵ گرام کے برابر ہوتا ہے اس لیے ایک چھٹانک میں تقریباً ۶۵ گرام ہوئے اور ایک تولہ میں تقریباً ۱۳ گرام ہوتے ہیں چونکہ ۱۲ ماشہ کا تولہ ہوتا ہے اس لیے ایک ماشہ تقریباً ایک گرام وزنی ہوتا ہے۔ علمی کاموں کے لئے گرام کے ایک ہزارویں حصہ کو ملی گرام کہتے ہیں۔ اس لیے ایک رتی میں تقریباً سوا سو ملی گرام ہوتے ہیں (علمی عملوں میں جو کیمیائی ترازو ہوتے ہیں انکی مدد سے بآسانی ایک ملی گرام کا دسواں بلکہ سوواں حصہ صحت کے ساتھ تولا جا سکتا ہے بالفاظ دیگر رتی کا دس ہزارواں حصہ بھی صحیح طور پر تولا جا سکتا ہے

رتی کے دس ہزارویں حصہ تولنے کی مثال

اس چھوٹے سے وزن کا صحیح مفہوم سمجھ میں یوں آجائے گا کہ آپ ایک ترازو کے دونوں پلڑوں میں کاغذ کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال کر ڈنڈی کو سیدھا کر لیں اور پھر ایک ٹکڑے کے اوپر پنسل سے رتی لکھ کر ترازو میں رکھیں تو جسقدر اختلاف وزن میں اس تحریر سے پیدا ہوگا، وہ سہولت کے ساتھ ہم اپنے ترازو کی مدد سے معلوم کر لیں گے!)

ایک گرام تقریباً ۱۵½ گرین کے برابر ہوتا ہے۔ اس لیے ایک گرین میں تقریباً ۶۵ ملی گرام ہوتے ہیں ہزار مکعب سنٹی میٹر پانی کا وزن ایک کلوگرام ہوتا ہے۔ اس لیے ایک سیر پانی کا حجم تقریباً ایک ہزار پینتالیس مکعب سنٹی میٹر ہوا چونکہ ہزار مکعب سنٹی میٹر کو ایک لیٹر بھی کہتے ہیں اس لیے ایک سیر پانی = ۱۰۴۵ لیٹر کے۔ اسی طرح ایک لیٹر پانی کا وزن ۲۰۲ پونڈ ہوتا ہے (جو ۴۰۳ پونڈ اور ڈبل روٹی کے برابر ہوتے ہیں) دس پونڈ پانی تقریباً ایک گیلن کے برابر ہوتا ہے اس لیے ایک گیلن میں ۴۰۵ لیٹر ہوتے ہیں چونکہ ایک گیلن میں چار کوارٹ ہوتے ہیں اس لیے ایک کوارٹ = ۱۰۱۲۵ لیٹر اور ایک پائنٹ = ۵۶۲ مکعب سنٹی میٹر۔

(۷)

مساوات وسعتی

علی ہذا القیاس تبی اکائیوں کے لیے تحویل کے جدول تیار کئے جا سکتے ہیں جو کہ سر دست مطلوب نہیں ہیں لیکن اکائیوں کے ایک نظام

سے دوسرے نظام مین تحویل کرنے کے لیے چند سہل قواعد بآسانی حاصل کیے جا سکتے ہین۔ مثلاً اگر بجائے مر ذ طول لی جائے م سے مقدار مادہ اور و سے وقت تو ہم دیکھتے ہین کہ رقبہ = ط × ط = ط^۲ رفتار = ط/و جسے یون بھی لکھا جا سکتا ہی (ط) (و)^{-۱} جہان نفی (یا -۱) کا مفہوم یہ ہی کہ کسر کے حصہ زیرین مین آتا ہی ایسی مساوات جن مین اکائیون کا ذکر نہین کیا جاتا مساوات وسعتی کہلاتی ہین اور ان سے کسی مقدار کی نہایت عام تعریف کا پتہ چلتا ہی اور یہ معلوم ہوتا ہی کہ مقدار کس حد تک اشیاء اساسی پر منحصر ہی۔ مثالات عملاً نہایت آسان ہین فرض کیجیے کہ ایک سطح کا رقبہ ۱۹٫۳۵ مربع سنٹی میٹر ہی اور ہم اسی سطح کا رقبہ مربع انچون مین نکالنا چاہتے ہین حالانکہ ہمین معلوم ہی کہ ایک انچ ۲٫۵۴ سنٹی میٹر کے برابر ہوتا ہی تو چونکہ رقبہ کی وسعت ط^۲ ہی اس لیے اس سطح کا رقبہ مربع انچون مین ۱۹٫۳۵/(۲٫۵۴)^۲ = ۱۹٫۳۵/۶٫۴۵ = ۳ نکلتا ہی۔ ایک زیادہ پیچیدہ مثال طاقت کی لی جا سکتی ہی طاقت = مقدار مادہ × اسراع اس لیے طاقت = م × ط/و^۲ = (م)(ط)(و)^{-۲} اسے الفاظ مین یون بیان کرینگے کہ طاقت کی وسعت م مین ایک ط مین ایک اور و مین نفی دو ہین۔ اب اگر ڈائن کو پونڈلون مین تحویل کرنا چاہتے ہین تو چونکہ وقت دونون نظامون مین جزو مشترک اور برابر ہی اس لیے ایک ڈائن = ۱/۴۵۳٫۵۹ × ۱/۳۰٫۴۸ = ۱/۱۳۸۲۵ پونڈل یعنی ایک پونڈل = ۱۳۸۲۵ ڈائن کے ※

(۸)

بہت بڑی اور چھوٹی رقوم کی تحریر کا ایک مختصر طریق نوشت

علمی نظام اعداد کے استعمال سے ایک دقت یہ لاحق ہوتی ہی کہ بسا اوقات بہت چھوٹی یا بہت بڑی رقوم کو لکھنا پڑتا ہی جن مین بہت سے صفر استعمال ہوتے ہین لیکن اس مشکل کا حل گذشتہ چند سال مین ایک مختصر طریق نوشت کی مدد سے ہو گیا ہی۔ اس مختصر طریق نوشت کے حصول کا انحصار دس کی طاقتون پر ہی۔ دس کی طاقت سے مراد یہ ہی:- $10 \times 10 = 100 = 10^2$، $10 \times 10 \times 10 = 1000 = 10^3$ وغیرہ یا $1/10 = 0.1 = 10^{-1}$، $1/100 = 0.01 = 10^{-2}$، $1/1000 = 0.001 = 10^{-3}$ یہان دس کے ساتھ اوپر کی طرف بائین جانب جو چھوٹا سا ہندسہ لکھا جاتا ہی سے دس کی طاقت کہتے ہین مثلاً اشلہ بالا مین $10^2 = 100$ مین ۲ کو دس کی طاقت کہا جاتا ہی یہ بھی ظاہر ہی کہ اگر دس کی طاقت مثبت ہی تو رقم ایک سے بڑی ہے اور اگر دس کی طاقت منفی ہی تو رقم ایک سے چھوٹی ہی۔ اس طریق نوشت کو ہم نے ذیل کی جدول مین واضح کرنے کی کوشش کی ہی۔

$$10^0 = 1$$

$10^{1} = 10$	$10^{-1} = 0.1 = 1/10$
$10^{2} = 100$	$10^{-2} = 0.01 = 1/100$
$10^{3} = 1000$	$10^{-3} = 0.001 = 1/1000$
$10^{4} = 10000$	$10^{-4} = 0.0001 = 1/10000$
$10^{5} = 100000$	$10^{-5} = 0.00001 = 1/100000$
$10^{6} = 1000000$	$10^{-6} = 0.000001 = 1/1000000$

وغیرہ وغیرہ

اس طریق عمل کی نگہداشت مین یہ بات یاد رکھنا موجب سہولت ہوگا کہ صفرون کی تعداد ہر حالت مین دس کی طاقت کے برابر ہی مثلاً ایک لاکھ مین پانچ صفر ہین تو ایک لاکھ = 10^5 یا دس لاکھ مین جو صفر ہین تو دس لاکھ (جسے ملین بھی کہتے ہین) = 10^6 اسی طرح کسری رقومات مین اگر نشان اعشاریہ (یعنی چھوٹی واو جو صفرون کے اوپر لکھی جاتی ہی) کے ماقبل کا صفر ایک سے پہلے کے صفرون مین شامل کر لیا جائے تو ۱۰ کی منفی طاقت کا ہندسہ صفرون کی مجموعی تعداد کے برابر ہوتا ہی۔ ایک بٹہ دس لاکھ = 10^{-6} اور ایک سو اسی حصے کو 10^{-2} یا ۱٫۰ [illegible] لکھین گے۔

اگر رقم مین ایک کے علاوہ اور ہندسے بھی ہین مثلاً پانچ کروڑ تو اس کے جزو بنائے جاتے ہین پانچ کروڑ = ۵ × ایک کروڑ = 5×10^7 کیونکہ ایک کروڑ کے لیے سات صفر ہوتے ہین = ۲۴ کروڑ = 24×10^7 لیکن چونکہ $24 = 2.4 \times 10^1$

※ یہ ایک وسیع الاطراف مضمون ہی۔ علم البرق مین تعیین اعداد مین بہت مدد ملتی ہی۔ ہم نے یہان صرف مختصراً اسکی طرف اشارہ کر دیا ہی۔

اس لیے ۲۴ کروڑ = $۲٫۴ \times ۱۰^{۸}$ اسی طرح کی لکھی ہوئی رقوم کی ضرب تقسیم دس کی طاقتون کو جمع یا تفریق کرنے اور باقی اجزا کی معمولی ضرب سے حاصل ہوتی ہے مثلاً ہمین ۳۶ کروڑ کو ۱۲ ہزار سے تقسیم کرنا ہے تو $۳٫۶ \times ۱۰^{۸} \div ۱٫۲ \times ۱۰^{۴} = ۳ \times ۱۰^{۴}$ اور اگر ان کو ضرب دینا ہو تو حاصل ضرب $۳٫۶ \times ۱٫۲ \times ۱۰^{۱۲} = ۴٫۳۲ \times ۱۰^{۱۲}$ ہوتا۔ اسی طرح منفی طاقتون کے متعلق کرنا چاہیئے۔ البتہ اس حالت مین الجبری جمع کی ضرورت ہوتی ہے۔ الجبری کی مثال یہ ہے $۵ \times -۳ = ۲$ یا $۷ \times -۳ = ۴$۔ بالفاظ دیگر الجبری جمع مین معمولی جمع تفریق دونون شامل ہوتے ہین۔ مثلاً ایک لاکھوین حصہ کو ۵ ہزار سے ضرب دینا ہے تو $۱۰^{-۵} \times ۵ \times ۱۰^{۳} = ۵ \times ۱۰^{-۲}$ اور اگر انھین اعداد کو تقسیم کرنا ہوتا تو $۱۰^{-۵} \div ۵ \times ۱۰^{۳} = ۱۰^{-۸} \times ۵^{-۱} = ۵ \times ۱۰^{-۱}$۔ غرضکہ اس مختصر طریق نوشت کی مدد سے بڑی سے بڑی رقم بآسانی لکھی جا سکتی ہے۔

(۹)

سائنٹیفک اعداد اب ہم اس مضمون کو علوم طبیعات مین سے علمی اعداد کی چند موٹی موٹی مثالین بیان کرنے کے بعد ختم کرتے ہین۔ علوم طبیعات مین انسانی دماغ ایک طرف کروڑہا در کروڑہا گرام اور ان سے بھی زیادہ سنٹی میٹر اوزان اور فاصلون کو دریافت کرتا ہے، دوسری طرف ایک سنٹی میٹر اور گرام کے کروڑوین حصے کو بھی اپنی دسترس سے باہر نہین سمجھتا۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہین کہ روشنی کی رفتار فی ثانیہ ۳×۱۰^{۱۰} سنٹی میٹر ہے۔ بعض ستارون کا بُعد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کی روشنی کو ہمارے پاس پہنچنے کے لیے ہزارہا سال درکار ہین ایسے بڑے فاصلون کے لیے روشنی کی رفتار فی ثانیہ یعنی ۳×۱۰^{۱۰} سنٹی میٹر کو اکائی قرار دینا بھی چندان مفید نہین پڑتا سورج ہم سے ۹ کروڑ میل دور ہے اور سورج کی روشنی ہمارے پاس ۸ یا ۹ دقیقہ مین پہنچتی ہے صرف اسی ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ستارون کا بعد کیا ہوگا۔

سب سے قریب ستارے الفا سنطاری کا بعد سب سے قریب ترین ستارے کی روشنی تقریباً ۴ سال مین ہمارے پاس پہنچتی ہے اور اس کا فاصلہ تقریباً $۳٫۶ \times ۱۰^{۱۸}$ سنٹی میٹر ہے یعنی ایک کے بعد اٹھارہ صفر (سیلون مین یہ فاصلہ = ۲×۱۰^{۱۳})۔ اگر آپ اس رقم کو شمار کرنے کی کوشش کرین تو بلا مبالغہ تین لاکھ سال درکار ہون گے۔ ہم عنقریب روشنی کی رفتار کے متعلق ایک دلچسپ بحث کے عنوان سے ایک جداگانہ مضمون شائع کرین گے۔ ستارون کے علاوہ ان کا وزن اور حجم بھی جن کے صحیح اندازہ کرنے کے طریقے آج کل بخوبی معلوم ہین اسی نسبت کے ساتھ بڑا ہے۔ اس کے بعد ہم نظام شمسی مین آتے ہین جہان مختلف سیارون کا فاصلہ سورج اور زمین سے ناپا گیا ہے۔ سورج سے زمین کا بعد $۱٫۵ \times ۱۰^{۱۳}$ سنٹی میٹر ہے عطارد جو کہ سورج سے قریب ترین سیارہ ہے سورج سے $۵٫۸ \times ۱۰^{۱۲}$ سنٹی میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اجرام فلکی مین ہمارا سب سے قریب ترین پڑوسی چاند ہے جس کا بُعد زمین سے $۳٫۸۵ \times ۱۰^{۱۰}$ سنٹی میٹر ہے۔ زمین کا محیط ۴×۱۰^{۹} سنٹی میٹر ہے اور کوہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی ۸×۱۰^{۵} سنٹی میٹر بلند ہے۔ آدمی کی اوسط لمبائی $۱٫۸ \times ۱۰^{۲}$ سنٹی میٹر ہے۔ اگر ان رقوم مین سنٹی میٹرون کی بجائے میٹر کلومیٹر یا میل لکھنے ہون تو علی الترتیب $۱۰^{۲}$، $۱۰^{۵}$ اور $۱٫۶ \times ۱۰^{۵}$ سے تقسیم کرنا ہوگا۔

چھوٹے اعداد یہ تو دوربین کے کرشمون کا اجمالی ذکر ہے۔ خوردبین کی مدد سے ہم بہت چھوٹے فاصلے کو دیکھ سکتے ہین۔ کسی آلہ کی امداد کے بغیر ان کو بآسانی انچ کے تین سوین $\frac{۱}{۳۰۰}$ حصے سے انچ سوین $\frac{۱}{۱۰۰}$ حصہ تک تمیز کر سکتی ہے بالفاظ دیگر اگر ایک انچ مین ۵۰۰ خط کھینچے جائین تو آنکھ ان کو علحدہ علحدہ دیکھ سکتی ہے۔ انچ کا پانچ سوان حصہ سنٹی میٹر کا دوسوان یا ملی میٹر کا بیسوان حصہ بنتا ہے۔ خوردبین کی مدد سے ہم ملی میٹر کا ہزاروان حصہ (جسے مکران بھی کہتے ہین) دیکھ سکتے ہین۔ روشنی کی بڑی سے بڑی لہرون کی لمبائی اس کے نصف سے شروع ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر روشنی کی ۳۴ ہزار لہرین ایک انچ مین تیرہ ہزار دوسو لہرین ایک سنٹی میٹر مین آجاتی ہین۔ سب سے چھوٹی ہستی جس سے انسان واقف ہے برقیہ یعنی برق سالبہ کا نخاذہ ہے جس کی مدد سے

برقیے نہ صرف علم البرق کے تمام عقدے حل ہوجاتے ہین بلکہ روشنی حرارت

نور ریڈیم کے عجیب و غریب خواص اور خود مادہ کی ماہیت کے متعلق ان کی مدد سے بہت کافی معلومات بہم پہنچتی ہیں۔

خاتمہ۔ باوجود اس حیرت انگیز وسعت کے انسانی علم نہ صرف محدود بلکہ مسلم طور پر بے حد و حساب ناقص ہے۔

فیروز الدین مراد

مبادئ حیات

از منشی تیرتھ رام صاحب فیروزپوری۔ ایڈیٹر رسالہ ترجمان۔ لاہور

گلی یا بازار و بیات میں، جہاں کہیں ہم گرد نظر ڈالتے ہیں اس قسم کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جنھیں دو خاص اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک بے جان مثلاً گھر، چٹانیں، پتھر وغیرہ اور دوسرے جاندار جیسے آدمی، چڑیاں، وعلی ہذا القیاس؛ آخر الذکر میں جنظاہری خود روی اور طاقت حرکت پائی جاتی ہے وہی انکی نمایان صفت ہے جو ان کو بے جان نوع کی اشیا سے تمیز کرتی ہے لیکن اگر ہم اس بارے میں زیادہ غور سے کام لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آخری قسم میں بعض ایسی چیزیں بھی شامل ہیں جو ہر چند کہ گھروں یا پتھروں کی طرح ایک ہی جگہ کھڑی رہتی ہیں اور بظاہر بے حس ہیں تاہم جاندار ضرور ہیں۔ میری مراد درختوں، گھاس، پودوں اور جھاڑیوں سے ہے۔ ان میں بھی پرندوں اور حیوانوں کی طرح جان ہے گو طاقت حرکت موجود نہیں، پرندے کی گردن مروڑ دو تو مر جائے گا، پودہ کی جڑ اکھاڑ ڈالو مرجھا جائے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جاندار دونوں ہیں گو ان کی زیست کا معیار جدا جدا گانہ ہے۔

بس مختصر لفظوں میں ہمارے گرد دو قسم کی موجودات ہیں:—

(۱) بے جان اشیاء (INORGANIO

(۲) جاندار وجود (ORGAH.C

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں کی تاریخ کا سراغ لگانا کہاں تک ممکن العمل ہے۔

میرے ہاتھ میں ایک شیشہ کا ٹکڑا یا اینٹ ہے میں جانتا ہوں کہ دونوں کی ترکیب ان نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات کی بدولت ہے جو کم و بیش ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں تحقیقات کرتے وقت یہ سوال مطلق پیدا نہیں ہوتا کہ اینٹ اینٹ سے پیدا ہوئی یا شیشہ شیشے سے۔ لیکن اگر بخلاف ازیں میں کسی شیشم کے درخت یا گھوڑے کے قریب کھڑا ہو کر اس پر غور کروں تو فوراً خیال ہوتا ہے کہ اسکی ابتدا نہایت چھوٹے درجے سے ہوئی تھی اور یہ کہ انھوں نے بتدریج اس حد تک ترقی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی ہاتھوں میں انھیں تیار کرنے کی قدرت نہیں اور یہ کہ گھوڑا گھوڑی سے اور شیشم کا درخت بیج سے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنے اردگرد جسقدر آدمی نظر آتے ہیں ان سب کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ ان کی ابتدا اُن کے والدین سے ہوئی۔ وہ براہ راست مٹی یا گوشت پوست سے تیار نہیں ہوئے۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ ایک باریک جرم کا کسی موجود جرم سے پیدا ہونا یا کوکر موتھے کا کوکر موتھے کے بیج سے پیدا ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جراثیم اور کوکر موتھے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر پنیر کو کسی نمدار جگہ پر پڑا رہنے دیا جائے تو اس کے اندر خود بخود کیڑے پیدا ہونے لگتے ہیں، تاہم حقیقت یہ ہے کہ علما نے اس بارے میں جو تحقیقات کی ہے اس سے وہ بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جو بات حضرت انسان کی پیدائش پر صادق آتی ہے وہی ادنیٰ درجہ کی حیوانی اور نباتاتی ہستیوں پر عاید ہوتی ہے۔ سائنس دانوں کا قول یہ ہے کہ پنیر کے کیڑے خود بخود پنیر کے اندر سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ انکی پیدائش بھی اُن کے والدین ہی کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ اس بارے میں علمائے یورپ نے وقتاً فوقتاً مختلف اصول قائم کیے ہیں۔ یہ اصول بجائے خود بہت بڑی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں اور جیسا کہ تاریخ علوم میں لازمی ہے ان میں وقتاً فوقتاً بعد کی تحقیقات کی بنا پر ترمیم و اصلاح ہوتی رہی ہے، ہاروے جس نے دوران خون کا مسئلہ دریافت کیا تھا اور وحید العصر سائنسدان تسلیم کیا جاتا ہے عمر بھر مُصر رہنے کے

بعد انجام کار اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ ہر قسم کی ہستی کی ابتدا بیضہ سے ہوتی ہے" لیکن اسکے بعد بیسوین صدی مین علمی ترقیات کی بدولت اور خوردبین کی مدد سے اس نظریہ مین بہت کچھ ترمیم ہو گئی ہے۔

ڈٹولف: ر چونے تحقیقات مابعد کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ "بدنی کوٹھریون کی ابتدا بدنی کوٹھریون سے ہوتی ہے" اس محقق کا بیان یہ تھا کہ ہر جاندار شے بدنی کوٹھریون یا خانون سے مرکب ہوتی ہے لیکن اسکے ساتھ ہی چونکہ اغلب ہے کہ اونے درجہ کی ہستیان ابھی اسقدر ارتقا حاصل نہین کر چکین کہ ان کے بدن کوٹھریون کی صورت مین آ گئے ہون، اس لیے اس نظریہ کی ترمیم شدہ اور صحیح صورت یہ ہے کہ "ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے" اس کا مطلب صاف لفظون مین یہ ہے کہ اگر ہم مین حیاتی عناصر جدید نہون تو نواحی حالات خواہ کیسے ہی کیون نہ ہون اس مین سے ایک چھوٹے سے چھوٹا کیڑا پیدا نہین ہو سکتا۔

یہ عقیدۂ زمانہ حال کے قریب قریب تمام ماہران علم الحیوٰۃ کا ہے۔

روے زمین پر ہستی کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی

آگے چل کر مین اس عالمگیر عقیدہ کی وجوہ پر تفصیلی بحث کرون گا مگر سردست یہ فرض کر لینے کے بعد کہ علما آغاز حیات کے بارے مین کسی متفقہ فیصلہ پر نہین پہنچے، مین ان مختلف خیالات کا سرسری طور پر ذکر کرون گا جو لوگون مین روے زمین پر ہستی کی ابتدا کے بارے مین قدیم سے چلے آتے ہین اس کے متعلق چار مختلف عقیدے یا بیان ہین، بلکہ شاید انھین ساڑھے تین کہنا زیادہ موزون ہوگا کیونکہ ایک تھوڑی زیادہ تر مذاقیہ ہی ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ جب سے سطح زمین اسقدر سرد ہوئی کہ اس پر پانی اپنی مائع صورت مین موجود رہنے لگا، اسی وقت سے لیکر دنیا مین جاندار مادہ کی نہایت باریک اور سادہ صورتین تیار ہو رہی ہین اور یہ کہ جہان کہین کیفیات مناسب حال ہین اب بھی ویسی ہی صورتین تیار ہوتی رہتی ہین۔ اس خیال کی مسئلہ بقا اور ارتقا سے مطابقت ہے جو زمانہ حال کا ایک عالمگیر اور نہایت قیمتی نظریہ ہے۔ اسکی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ روے زمین پر ہر جگہ ادنے ترین قسم کی ہستیان موجود پائی جاتی ہین لیکن

مین اوپر بیان کر چکا ہون کہ علماے حال اس امکان کے خلاف ہین۔

اس کے ساتھ ہی جب ہم زمانۂ حال کے عقیدہ "ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے" پر غور کرین تو خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابتدا مین جو ہستی یہان موجود تھی اور جو بعد کی تمام ہستیون کی مان تھی وہ کہان سے آئی تھی؟ اسکا ماہران علم الحیوٰۃ کے پاس کوئی جواب نہین۔ وہ کہتے ہین کہ یہ اصول دراصل ہمیشہ اسیطرح نہ تھا۔ اُن کا قول ہے کہ گو آج بے جان مادے سے جاندار چیز تیار نہین ہو سکتی تاہم ماضی بعید مین حالات اس قسم کے تھے کہ روے زمین پر ہستی کا آغاز قدرتی طور پر بذریعہ ارتقا ہو گیا تھا۔ ٹنڈل کہتا ہے:—

"اگر فرض کر لیا جاے کہ ایک سیارہ سورج سے جدا ہو کر اس سے اسقدر فاصلہ پر گھومتا رہے جسقدر کہ ہماری زمین ہے تو کیا اس کا ایک نتیجہ جاندار ہستیون (آرگینک) کا ظہور نہ ہوگا؟ مجھ سے پوچھو تو جواب مثبت مین ہے"

اور اس بارے مین زمانۂ حال کے باقی ماندہ علما بھی ٹنڈل ہی کے ہمخیال ہین۔

لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمانۂ ماضی مین وہ کون سے حالات تھے جن کی بدولت کرۂ زمین پر ہستی کا ارتقا عمل مین آیا؟ یہ تو یقیناً ناممکن ہے کہ اسکے لیے زیادہ تیز حرارت کی ضرورت ہو کیونکہ اس زمانہ مین کرۂ زمین کی حرارت اس درجہ سے کم ہوگی جس پر کہ پانی اُبلنے لگتا ہے لیک خیال یہ بھی ہے کہ شاید اس قدیم زمانہ مین جسے گذرے ہوے بقول لارڈ کیلون دس کروڑ سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو چکا ہے زمانہ موجودہ کی نسبت کرۂ ارض پر اس ارتقا کے لیے زیادہ موزون اسباب کیمیائی موجود ہونگے۔ لیکن ماہران علم کیمیا اس خیال کی تکذیب کرتے اور کہتے ہین کہ بخلاف ازین زمانہ موجودہ مین زمین بے شمار اقسام کے پیچیدہ کیمیائی مرکبات سے بھری ہوئی ہے جن کا جاندار مادہ کی صورت اختیار کر لینا ہر طرح قرین قیاس ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا آجتک کبھی نہین ہوا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ زمانۂ ماضی مین جبکہ یہ اشیا بھی اس کثرت سے موجود نہ تھین، جاندار مادہ جس مین اس قسم کے مرکبات پاے جاتے ہین، خود بخود پیدا ہو گیا، بڑی مشکل اور ناقابل یقین دلیل ہے۔

تیسرا عقیدہ وہ ہے جسکے بانی لارڈ کیلون ہین۔ لارڈ کیلون گرچہ علم الحیوٰۃ

کے ہریجین تاہم ایک جید اور متبحر عالم ضرور ہین۔ ان کی راے مین روے زمین پر جاندار مادہ کے اول مرتبہ ظہور پذیر ہونے کی دلیل سواے اسکے اور کوئی نہین کہ یہ خدا کا ایک خاص فعل تھا ان کے الفاظ یہ ہین کہ سائنس بتاتی ہے کہ وہ قوت تخلیق کی محتاج ہے۔ جب لارڈ کیلون نے یہ راے ظاہر کی تھی تو اکثر ماہرانِ علم الحیات نے اعتراضات اور نکتہ چینی کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔

مین اوپر بیان کر چکا ہون کہ کرۂ ارض پر ابتداے حیات کے بارے مین چار مختلف تھیوریان ہین۔ تین کا ذکر ہو چکا ہے چوتھی جو زیادہ تر ایک ناقیہ خیال ہے اور جسکے بانی خود لارڈ کیلون ہی ہین، یہ ہے کہ آج سے قرنہا قرن پہلے جب کسی دوسری دنیا مین قیامت برپا ہوئی ہوگی جراثیم حیات اس دنیا کی کائی سے ڈھنپے ہوے کھنڈرون مین مل کر اس دنیا پر پہنچ گئے ہونگے۔" یہ تخیل بڑا زبردست ہے مگر امید نہین کہ تحقیقات حالیہ کو پیش نظر رکھتے ہوے خود لارڈ کیلون بھی اس خیال کو صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ ہوے ہون۔ اگر ہم فرض کر لین کہ شہاب ثاقب در اصل مدار تارون کے ٹکڑے نہین بلکہ دوسری دنیاؤن کے کھنڈر ہوتے ہین اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی مان لین کہ ایسے شہاب اس دنیا تک پہنچتے ہوے راستہ مین اس قدر گرم نہین ہو جاتے کہ ان پر جسقدر جراثیم حیات موجود ہون وہ تلف ہو سکین، تو پھر سوال بدستور رہی قائم رہتا ہے کیونکہ اسکی توضیح کس طرح کی جا سکتی ہے کہ اس دوسری دنیا مین ابتداے حیات کیونکر ہوئی؟

پس معاملہ صرف پہلی دو دلائل ہی مین اٹک رہتا ہے یعنی یہ کہ یا تو بقول سیٹونسن اس وقت بھی روے زمین پر جاندار مادہ کی تیاری کا عمل ظہور مین آ رہا ہے اور ہمیشہ سے اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے، یا یہ کہ قدیم زمانہ ماضی مین ایک قدرتی ارتقاء کے ذریعہ سے اس قسم کا مادہ صرف ایک بار ظہور پذیر ہوا تھا اور اسکے بعد ایسا ہونا بند ہو گیا ہے۔

کیا بے جان مادہ سے جاندار مادہ تیار ہو سکتا ہے

ان دو دلیلون مین سے بھی گذشتہ ۴۰ سال کی سرگرم بحث کے بعد اب جس دلیل کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے یہی ہے کہ "ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے"۔ ٹنڈل، ہکسلے، پاسٹیور اور ڈاکٹر بیسٹیئن مین مدتون اس بارے مین بحث چھڑی رہی تھی، اور اس بحث کا علمی نتیجہ یہی نظریہ ہے علماے حال تسلیم کرتے ہین کہ "خود بخود آغاز حیات" کے فرضی خیال کی کامل طور پر تردید ہو چکی ہے اور امر مسلمہ یہی ہے کہ "ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے"۔ یہی عقیدہ ہے جو آجکل کے طلباے علم الحیوانات و علم النباتات کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔

لیکن زیادہ عرصہ نہین گذرا جبکہ زمانہ حال کے بعض مشہور سائنسدانون مین اس سوال پر بحث چھڑ گئی تھی۔ سر آلیور لاج اور پروفیسر رے لنکاسٹر نے اس بارے مین اخبار ٹائمز مین متعدد مضامین شائع کرائے تھے اور ڈاکٹر بیسٹیئن نے اسپر ایک کتاب لکھنے کے علاوہ ہفتہ وار اخبار "نیچر" مین بعض نہایت اہم آرٹیکل شائع کئے تھے۔ اس بحث کے دوران مین یہ امر بطریق احسن واضح کر دیا گیا تھا کہ اگر اس قسم کے مادون کو جنھین عام طور پر اگر کھلا چھوڑ دیا جاے تو ان مین لاانتہا کیڑے پیدا ہو جاتے ہین، اگر کافی طور سے اُبالا جاے اور اس کے بعد ایسے طریق پر محفوظ رکھ چھوڑین کہ وہ ہر قسم کی خارجی چھوت سے بچ رہین تو پھر ان مین نہ کیڑے نہ جراثیم غرض کچھ بھی نہین پیدا ہوتا۔ دلیل یہ ہے کہ اس مادہ مین جراثیم حیات پہلے سے موجود تھے جب اُسے اُبالا گیا تو وہ تلف ہو گئے اور اب اس وقت تک یہ مادہ اسیطرح بے جان پڑا رہے گا جب تک کہ خارجی طور پر اس مین جاندار مادہ کا تخم نہ پہنچایا جاے۔ پس ثابت ہوا کہ ہستی کا خود بخود ظہور مین آنا محض غلط خیال ہے ہستی کی ابتدا کسی موجودہ ہستی ہی سے ہو سکتی ہے۔

ان مباحثات کو یہین چھوڑ کر آؤ اب ہم ذرا یہ دیکھین کہ علماے قدیم کی اس بارے مین کیا راے تھی؟ آج تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گذرتا ہے کہ اپنے زمانہ کے مشہور سائنسدان عمانوئیل کینٹ نے نظریۂ سحاب کو دنیا کے روبرو پیش کیا تھا۔ اس نظریہ کا منشا یہ ہے کہ نظام شمس کا آغاز گیس کے ایک بادل سے ہوا تھا۔ جب اس دھندلے بادل مین سے زمین اپنی ابتدائی حالت مین ہٹ کر اپنے موجودہ مقام پر مستقر ہونے لگی تو اسکے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ پانی جو اس وقت تک گرم ہوائی

مین بخارات کی صورت مین موجود تھا اس نے مائع صورت اختیار کر کے اگر اور وہی سمندر رہا۔ اس نظریہ کو پیش خیال رکھتے ہوے مشہور معروف کونٹ ڈی بفن نے رائے ظاہر کی تھی کہ ہستی کی ابتدا شاید سمندرون بلکہ قطبی سمندرون مین ہوئی تھی کیونکہ سب سے پہلے وہی سرد ہوے ہون گے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہین گذرا کہ ایک عالم اس فرانسیسی نے کہا تھا کہ بدن انسانی مین نمک کا جو جز پایا جاتا ہے وہ دراصل اسی بات کی یادگار ہے کہ اسکے اسلاف کی پیدائش سمندر سے ہوئی تھی جس کا پانی کھاری ہوتا ہے۔

کینٹ کے بعد ہربرٹ اسپنسر نے ارتقاے عالمگیر کا نظریہ قائم کیا جو زمانہ حال کے تمام سائنٹیفک عقائد کی کنجی ہے۔ مگر اس نے بھی ابتداے حیات کے بارے مین یہی رائے ظاہر کی کہ ہستی کا آغاز جاندار مادہ ہی سے ہو سکتا ہے بے جان مادہ کبھی ارتقاء حاصل کر کے جاندار نہین بنتا۔

چارلس ڈارون نے جب قدرتی انتخاب کے ذریعہ سے پودون اور حیوانات کی اقسام کی ابتدا کا امکان ثابت کیا تو اس نے یہی فرض کر لیا تھا کہ شروع مین جاندار مادہ کی "بعض سادہ صورتین" موجود تھین۔ ان کی ابتدا کا مسئلہ چونکہ اسکے دائرہ بحث سے خارج تھا اس لیے اس نے اس پر کبھی رائے زنی نہین کی۔

پروفیسر ہیکل نے ابتداے حیات کے متعلق کاربن کا نظریہ قائم کیا تھا مگر اسکے بعض ایسے ماہرون کے سوا جو علمی معاملات مین کوئی مستند رائے نہین رکھتے، کبھی کسی شخص نے اسکے خیالات کی تائید نہین کی اور آخر کار اس کو یہی ماننا پڑا کہ بحالات موجودہ بے جان مادہ سے جاندار کی ابتدا نہین ہو سکتی۔

سوال کا دوسرا رُخ

سطور بالا مین جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے دو باتین واضح ہوتی ہین۔ ایک تو یہ کہ اگر کسی رقیق مادہ کو ابالا جائے تو اس کے اندر غیر معین عرصہ تک جراثیم پیدا نہین ہوتے اور دوسرے یہ کہ آجتک کوئی بڑے سے بڑا سائنسدان بھی آلات و مرکبات کی مدد سے ادنے سے ادنے قسم کا جاندار مادہ تیار نہین کر سکا علم کیمیا ترکیبی کے بانی موسیو برتھولٹ کے سب سے کامیاب مقلد بھی صرف اتنا کر سکے ہین کہ لاکھون جتن کر کے بعض سادہ قسم کا پروٹیڈ یا البومن وار مادہ تیار کر لین اور وہ بھی اس قسم کی متنوع حرارتون کی مدد سے جن کا نظام فطرت مین ظہور پذیر ہونا غیر ضروری ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اگر کسی ایسے مرکب کو جس مین بالعموم پڑا رہنے سے کیڑے نظر آنے لگتے ہون پاسٹیور یا برکفیلڈ کے طریقون پر فلٹر کیا جاے اور اسطرح اسکے اندر سے باریک ترین قسم کے جاندار مادے جدا کر دیے جائین تو اسمین اسوقت تک کسی قسم کے جراثیم پیدا نہین ہوتے جب تک کہ خارجی قوت اثر پذیر نہو اس حد تک اس نظریہ کی پورے طور پر تصدیق ہوتی ہے کہ ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے" مگر انصاف چاہتا ہے کہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی واضح طور پر دکھایا جائے اور اس کے بعد اس بارے مین کوئی خاص رائے قائم کرنے کی کوشش کیجائے۔

چالیس سال کا عرصہ گذرتا ہے کہ ڈاکٹر چارلٹن بیسٹین، ایف۔ آر۔ ایس) جو ہستی کے خود بخود ظہور پذیر ہونے کے قائل ہین اس بحث مین بظاہر مغلوب ہو گئے تھے لیکن حقیقت مین اُنھون نے اپنی بہت سی مصروفیتون کے باعث اس بحث مین حصہ لینا چھوڑ دیا تھا اور لوگ اُن کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کرنے لگے تھے۔ انھون نے کئی اہم کتابین شائع کین جن مین بدست خود پنسل سے تصویرین کھینچکر دکھایا تھا کہ خوردبین کے ذریعہ سے مجھے بہت سی ایسی باتین معلوم ہوئی ہین جو مقبول عام نظریہ کے خلاف ہین۔ لوگ ان کی تحقیقات پر ہنسی اُڑاتے اور ان تمام معلومات کو اُنکے تخیل کی بلند پروازی سے منسوب کرتے تھے۔ اس تہمت تو ڈاکٹر بیسٹین خاموش ہو رہے لیکن آخر کار میعاد مقررہ سے پانچ سال پہلے یونیورسٹی کالج ہسپتال کے عہدہ پروفیسری سے مستعفی ہو کر اُنھون نے خوردبینی فوٹوگرافی کا مشکل کام سیکھا، اور اس کے بعد کم و بیش پانچ ہزار اس قسم کی فوٹو کی تصاویر تیار کین جنکا تعلق کسی نہ کسی طرح آغاز حیات کے مسئلہ سے تھا۔ اس اثنا مین انھون نے جو عجیب و غریب مشاہدات کیے، ان کا حیرت خیز حصہ اس مضمون کی صورت مین قلمبند کیا گیا تھا جو انھون نے رائل سوسائٹی کے روبرو پیش کیا۔ لیکن انسان کی فطری کمزوریان اسے بیجد متعصب بنا دیتی ہین۔ منصرم سوسائٹی نے اس مضمون کو سننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کے ایک مشہور معروف ممبر نے تو اتنی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ رائل

سوسائٹی کی لائبریری میں دو قدم چل کر ڈاکٹر بسٹین کے تیار کردہ نمونوں کو دیکھ لیتا۔

اس سوال کے جواب میں کہ اُبلے ہوئے یا فلٹر کیے ہوئے رقیق مادوں میں جراثیم سے خالی رہنے کی تاثیر کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ ڈاکٹر بسٹین کہتے ہیں کہ جاندار مادہ کی پیدائش کے لیے بعض مخصوص کیمیائی مرکبات کی موجودگی لازمی امر ہے۔ پھر اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ اُبالنے کے عمل سے یہ مرکبات تلف ہو جاتے ہیں تو یہ امر صحیح نہیں سمجھا جا سکتا کہ جاندار مادہ بیجان عرق سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اب حقیقت میں یہ امر مسلمہ ہے کہ اُبلنے کے عمل سے اس رقیق مادہ کے کیمیائی مرکبات میں جسے اُبالا گیا ہے تبدیلی یا انحطاط واقع ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اعتراض کرے کہ فلٹر کرنے سے تو ایسی تبدیلی یا انحطاط ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ فلٹر کرنے کا عمل بھی فلٹر شدہ عرق کے اندر کیمیائی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ پس ان تجربات سے ہستی کے خود بخود پیدا ہونے کے خیال کی مطلق تردید نہیں ہوتی یہ ڈاکٹر بسٹین کی رائے ہے۔

یہاں تک تو منفی ثبوت تھا۔ اپنی تحقیقات کے مثبت نتائج کے بارے میں صاحب موصوف کا بیان ہے کہ بغور مشاہدہ کرنے سے دیکھا گیا ہے کہ ایک بالکل شفاف عرق میں کچھ عرصہ بعد ذرا ذرا سے سیاہی کے داغ نظر آنے لگتے ہیں جو بتدریج بڑے ہو کر بکٹیریا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس تبدیلی کے مختلف مدارج کو پورے طور سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر خوردبین کے ساتھ سنیمٹوگراف کی تصاویر اتارنے کا آلہ لگا دیا جائے تو ایسا کرنا ناممکن نہیں ہے اور اس کے بعد کسی شخص کو ڈاکٹر بسٹین کی تحقیقات پر حیرت گیری کا موقع نہ رہے گا۔

اس جگہ ڈاکٹر بسٹین کی ایک عجیب و غریب عکسی تصویر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں ایک نہایت چھوٹے آبی جانور (ذ. CYCLPP) کے نخاع کو سات سو گنا بڑا کر کے دکھایا گیا ہے۔ اس نخاع کے اندر جس میں چھوٹے سے چھوٹا جاندار بھی داخل نہیں ہو سکتا، بتدریج اس قسم کے داغ نمودار ہونے لگتے ہیں جو انجام کار بکٹیریا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ نخاع کے اندر ان کی موجودگی کی صورتیں صرف دو ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ وہ اس لحمی ریشہ میں بالکل ہی نئے پیدا ہوئے ہیں یا وہ ان بکٹیریا کی نمودار صورتیں ہیں جو ایسی باریک ہوتی ہیں کہ خوردبین سے بھی نظر نہیں آتی اور کسی طرح پر نخاع کے سخت پردہ میں سے ہو کر اندر داخل ہو جاتی ہیں۔ لیکن جواب کی آخری صورت محض ایک امر مفروضہ ہے جس کی تصدیق کے لیے ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں اور کسی خالص ثبوت کی عدم موجودگی میں اپنی بات پر اڑے رہنا سائنس نہیں بلکہ ایک ضد ہے۔ جو لوگ اس نظریہ کی تردید کر سکتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے جراثیم کی ہستی ثابت کریں جو خوردبین کے ذریعہ سے نظر نہیں آتے اور یہ بھی واضح طور پر دکھائیں کہ وہ CYCLOPS نخاع میں داخل ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر بسٹین کی ایک اور تیار کردہ عکسی تصویر میں آلو کی کوٹھریوں میں ایسے بکٹیریا کے ارتقاء کی صورتیں دکھائی گئی ہیں جن کے اجداد کے آلو میں پہلے سے موجود ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں صورتوں میں بکٹیریا ایک ایسے ریشہ کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو پہلے ہی "آرگینگ" ہے۔ لیکن اس سے کم از کم یہ تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ آج جو بکٹیریا روئے زمین پر موجود ہیں وہ سب انھیں بکٹیریا کی نسل میں ہیں جو کروڑوں سال پہلے یہاں موجود تھے اور یہ کہ قدرتی عمل ارتقاء کے ذریعہ سے آج بھی یہاں اسی طرح جاندار مادہ پیدا ہو رہا ہے جیسے کسی زمانہ میں ہوا تھا۔

نتیجہ کیا نکلتا ہے

ڈاکٹر بسٹین کی اس تحقیقات سے کسی قدر مشابہ اور لارڈ کیلون کے نظریہ کے خلاف پروفیسر پکرنگ کی تحقیقات ہیں جنھوں نے معلوم کیا ہے کہ چاند پر سبزی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اب یہ امر مسلمہ ہے کہ چاند زمین سے اُس وقت جدا ہوا تھا جب زمین اسقدر گرم تھی کہ اس پر کسی قسم کے جاندار مادہ کا قائم رہنا ناممکن تھا۔ اسلیے بقول پروفیسر پکرنگ چاند کی سطح پر یہ روئیدگی خود بخود پیدا ہو گئی ہے چونکہ چاند

مین اس قسم کی نباتات کی جستجو گی محض بے مطلب ہی اس لیے یہ قیاس لگانا کہ وہ خالق کون و مکان کا محل خاص ہی یقیناً غلطی ہی۔

اس مین شک نہین کہ جو کچھ ڈاکٹر سیٹین کہتے ہین خالص دہریت ہی کیونکہ اس سے اس ذات مطلق کے اختیارات مین فرق آتا ہی جو تمام اشیا کو بنانے یا بگاڑنے کی طاقت رکھتی ہی مگر ان فریقین کے دلائل زبردست ہین اور ایک ثالث شخص کو سوائے سننے اور خاموش رہنے کے کچھ بن نہین آتا۔ وہ جس کا کھوج لگانے مین شیون مین مین نے عمرین صرف کر دین اور جس کے لیے یا نیان مذاہب نے سوائے اسکے چارہ نہ دیکھا کہ اپنے پیروؤن کی تسکین خاطر کیلئے چند غیر مصدقہ اصول قائم کر دین اندھی سائنس اسکا حقیقی سراغ چلانے سے عاجز ہی اور علوم کے درمانے ہین صرف ایک دیوانہ بمک سے جانے کی قدرت رکھتے ہین جہاں پہنچ کر بے اختیار نظیر کا یہ شعر منھ سے نکل جاتا ہی ؎

پڑے بھٹکتے ہین لاکھون دانا کروڑون پنڈت ہزارون سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتین خدا ہی جانے

(ترجمہ) تیرتھ رام

العصر

کرۂ ہوائی کے متعلق دلچسپ معلومات

تمہید

عالم ارضیات[1] اور ہیئت والون کا متفق علیہ قیاس ہو کہ یہ زمین جس پر ہم بستے ہین خلا مین معلق ایک کرہ ہو، جو وقتِ معینہ[2] پر ایکدفعہ اپنے محور پر گھومتی، اور آفتاب کے تجاذب سے سال مین ایک دفعہ آفتاب کے گرد چکر لگاتی ہو۔ اسکا اندرونی حصہ مرکز کے قریب اغلباً مائع اور سیال ہو، لیکن سطح پر اور سطح سے بہت دور اندر کی طرف پتھرون اور چٹانون کی ایک موٹی ٹھوس تہ (کرسٹ = (Crust) مائع اور سیال مادہ کے انجماد سے پیدا ہوگئی ہو۔ اسکی سطح کے بعض حصص تو خشک ہین لیکن اکثر حصون کے اوپر پانی کے بخارات نے ٹھنڈے ہوجانے کی وجہ سے سمندر[3] کی شکل اختیار کرلی ہو۔ سطح زمین کے اوپر کئی میلون کی اونچائی تک ہوا[4] کا ایک وسیع اور عمیق سمندر ہو، اور اس سے اُدھر فضائے بسیط مین "ایتھر" کا بحرِ بیکران ہو۔

[1] فٹ نوٹ - جی آلوجسٹ (Geologist) یعنی عالمانِ علم طبقات الارض - ہم نے جی آلوجی (Geology) کا ترجمہ ارادۃً "ارضیات" کیا ہو۔ انگریزی زبان مین تمام علوم کے نام ایک ہی طرز پر وضع کئے گئے ہین، مثلاً زوآلوجی، فزی آلوجی، سوشی آلوجی، وغیرہ تمام جدید علوم اِسی طرز پر پکارے جاتے ہین۔ قدیم علوم مثلاً فزکس یا باٹونی وغیرہ مستثنیات ہین۔ کیا ہی اچھا ہو اگر اُردو مین بھی اسوا اُن علوم کے جن کے نام پہلے سے وضع ہو چکے ہین یا اب شکل سے (صفحہ دیکھو)

[2] اِس بحث کے متعلق ہم ایک جُداگانہ مضمون مین تفصیل کے ساتھ بحث کرینگے۔ دُنیا مین بہترین گھڑی مرورِ وقت کے اندازہ کے لیے زمین کی گردشِ لیل و نہار سمجھی جاتی ہو لیکن فی زمانا سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے یہ ثابت کردیا ہو کہ زمین کی روزانہ گردش کا وقت بڑھ رہا ہو۔ گویا ایک شبانہ روز کا عرصہ موجودہ زمانے مین آج سے چند ہزار صدیان پہلے سے چند ایک دقیقہ کی مقدار سے لمبا ہو۔ بالفاظ دیگر ہمارے دن رات لمبے ہورہے ہین لیکن سال اسی تناسب سے چھوٹا ہورہا ہو۔

[3] کرۂ آبی = ہائڈروسفیر Hydrosphere

[4] کرۂ ہوائی = Atmosphere

ا۔ کرۂ ہوائی کرۂ زمین کا ایک جزو لاینفک ہی

زمین اپنی سالانہ گردش مین ۱۸ میل فی ثانیہ یا تقریباً ۶۰ ہزار میل فی گھنٹہ کی حیرت انگیز رفتار سے حرکت کرتی ہو۔ لیکن کرۂ ہوائی بعینہ اسیطرح زمین کے ساتھ متصل رہتا ہو جسطرح ہم سطح زمین پر رہتے ہین۔ اسی طرح کرۂ ہوائی کرۂ زمین کے ساتھ زمین کی یومیہ گردش مین بھی متصل رہتا ہو۔ زمین کا محیط تقریباً ۲۵ ہزار میل ہو۔ لہذا خط استوا کے قریب کرۂ ہوائی کے وہ حصے جو سطح زمین سے قریب ہین ساڑھے دس سو میل فی گھنٹہ یا ۱۸ میل فی منٹ کی رفتار سے گھومتے ہین، اور وہ حصے جو عرض بلد ۳۰ کے قریب ہین ۹۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتے ہین، اور وہ حصے جو عرض بلد ۶۰ کے قریب ہین سوا پانچ سو میل فی گھنٹہ یا ۹ میل فی منٹ کی رفتار سے گھومتے ہین۔ بعض حضرات غلطی سے یہ خیال کرتے ہین کہ کرۂ ہوائی زمین کی روزانہ گردش مین شامل نہین ہوتا بلکہ زمین اُس کے نیچے اسطرح پھسلتی رہتی ہو جسطرح ایک متحرک جسم دوسرے ساکن جسم کے نیچے حرکت کرتا ہو۔ وہ یہ خیال نہین کرتے کہ کشش زمین جسکی بدولت باقی تمام مادی اجسام زمین کے ساتھ حرکت کرتے ہین ہوا پر بھی بحیثیت ایک مادی جسم ہونے کے اسی طرح عمل کرتی ہو اور زمین کے ساتھ کرۂ ہوائی اسیطرح گردش کرتا ہو جسطرح ایک متحرک صندوق کے ساتھ اسکے اندر کی چیزین حرکت کرتی ہین۔ ایسی مثالون مین ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہو کہ الفاظ کے مفہوم کو غلط طور پر محدود کر دیا جاتا ہو۔ اس بحث مین سطح زمین کے اوپر کرۂ ہوائی اور دیگر مادی اجسام کی وہی حالت ہو جو ہماری مثال مین صندوق کے اندر کی چیزون کی ہو۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) تبدیل کیے جا سکتے ہین تمام نئے نام "ارضیات" کے وزن پر یعنی "یات" کی آواز پر ختم ہون مثلاً علم ادب کو ادبیات، علوم طبعی کو طبعیات، کانون کے علم کو معدنیات، علم کیمیا کو کیمیات، علم نباتات کو نباتیات وغیرہ نام دیے جائین۔ ہماری زبان مین علمی ترقی کے لوازمات مین سے ایک یہ بھی ہو کہ اصطلاحات علمی مناسب طریقہ پر وضع کی جائین۔ میرا مدعا ہرگز یہ نہین ہو کہ موٹے موٹے عربی کے الفاظ اُردو لغت مین شامل کیے جائین؛ مین صرف بہترین یگانگت کا حامی ہون۔ انگریزی زبان مین علمی اصطلاحات مین کیسی عمدہ اور قابل تعریف یکجہتی ہو۔ کیمیات یعنی Chemistry کے متعلق علمی کتب کا اُردو مین ترجمہ کرنا تقریباً محال ہو، تاوقتیکہ جیسی یکسان اصطلاحات (Nomenclature) انگریزی زبان مین کیمیائی مرکبات کے لیے وضع ہین اُردو مین بھی وضع نہ کیجائین۔ ایک اور گزارش جو مین العصر کی علمی تحریک سے فائدہ اُٹھا کر علم دوست اصحاب کی خدمت مین پیش کرنا چاہتا ہون، وہ یہ ہو کہ تمام علمی آلات Scientific Instruments کا نام اُصول متذکرہ صدر کے مطابق اُردو لغت مین یکسان وضع کرنا چاہیے۔ مثلاً آلات بالعموم دو قسم کے ہوتے ہین۔ ایک وہ جن کے نام کا آخری حصہ اسکوپ (—scope) ہوتا ہو، دوسرے وہ جن کے نام کا آخری حصہ میٹر (—meter) ہوتا ہو۔ میٹر والے آلات وہ ہوتے ہین جن کی مدد سے مختلف چیزون کا صحیح طور پر اندازہ کیا جاتا ہو۔ برعکس اس کے اسکوپ والے آلات صرف چیزون کے باہمی تعلقات عام طور پر دکھانے کے لیے استعمال ہوتے ہین۔ میرے نزدیک اگر ان آلات کا ترجمہ "پیما" کی مدد سے کیا جائے تو نہایت موزون ہوگا، مثلاً الیکٹرومیٹر Electro-meter "برق پیما"، الیکٹراسکوپ Electro-scope "برق نما" وغیرہ۔ ایک تیسری قسم کے آلات جو حال ہی مین مروج ہوئے ہین خود بخود بغیر کسی بیرونی مدد کے اپنے مشاہدات لکھتے جاتے ہین۔ ایسے آلات حوالہ دینے کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہین۔ انکی صفت سیلف ریکارڈنگ ہو جسکا صحیح ترجمہ "خود نویس" ہو سکتا ہو۔ ایسے آلات بالعموم گراف —graph پر ختم ہوتے ہین۔ مین تجویز پیش کرتا ہون کہ انھین "نویس" کہا جائے۔ مثلاً تھرموگراف Thermograph جو محکمہ آب و ہوا مین استعمال ہوتے ہین "حرارت نویس" کہے جائین۔ فقط۔

جس طرح متحرک ہونے کے لیۓ صندوق اور اس کے اندر کی چیزین ایک جسم کا حکم رکھتی ہین اسطرح تجاذب مادی[1] کی بدولت زمین کرۂ ہوائی اور تمام مادی اجسام جو زمین کی کشش کے احاطۂ اثر مین داخل ہین زمین کی روزانہ اور سالانہ گردشون مین ایک جسم ایک حکم رکھتے ہین یہانتک کہ ہمارا چاند جو زمین سے تقریباً ۲½ لاکھ میل کے فاصلے پر ہے اسی طرح زمین کی مختلف حرکتون مین حصہ لیتا ہے جسطرح ہم اور تم جو کہ سطح پر رہتے ہین یا قصہ کہانیون کا سمندر جو زمین کی اندرونی چٹانون کے پتھرون کے اندر جا گزین ہے۔ اگر بفرض محال ایک لمحہ کے لیے یہ مان لیا جائے کہ کرۂ ہوائی زمین سے کم از کم اسکی روزانہ حرکت کے لحاظ سے علیحدہ ہے تو ایک غبارہ باز یا ہوا مین اُڑنے والے جانور اگر صبح کو ہندوستان کی زمین سے ہوا مین اُڑنا شروع کرے تو تقریباً بارہ گھنٹہ کے بعد شام کے وقت وسطی امریکہ یعنی میکسیکو وغیرہ کی زمین پر اُتر سکتا ہے!!!

متقدمین زمین کی روزانہ گردش کے قائل نہین تھے۔ منجملہ دیگر غلط اعتراضات کے جو وہ روزانہ گردش کے خلاف پیش کرتے تھے ایک اعتراض اسی نوع کا تھا جس کے متعلق ہم ابھی بحث کر چکے ہین۔ وہ کہتے تھے کہ اگر زمین دن رات مین ایک دفعہ گھومتی ہے تو جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے خط استوا اور اسکے قرب وجوار کے ممالک مین ہمیشہ اتنے زور کی آندھی چلنی چاہیۓ کہ درخت جڑ سے اُکھڑ جائین اور مکانات مسمار ہو جائین اس لیے کہ وہان ہوا کی رفتار زمین کے مقابلے مین ۱۰۴۰ میل فی گھنٹہ ہو گی۔ بالفاظ دیگر ان کا اعتراض یہ تھا کہ زمین تو ۱۰۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھیگی لیکن ہوا جو زمین کی حرکت مین کوئی حصہ نہین لے رہی زمین کی اشیاء کے اوپر اسی رفتار کے ساتھ رگڑ کھاتی رہیگی۔ زمانۂ حال مین تجاذب مادی کے مسئلہ کو سمجھ لینے کے بعد اس قسم کے جملہ اعتراضات خود بخود رفع ہو جاتے ہین۔

۲۔ ہوا مین مدوجزر۔ ہوائی جہاز رانی کا مسئلہ

زیادہ تر چاند کی کشش سے اور ایک تھوڑی حد تک سورج کی کشش سے سمندر مین دو دفعہ مدوجزر ہوتا ہے۔ پانی کا جو حصہ چاند کے مقابل آتا ہے وہ چاند کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندرگاہ مین ہر ۲۴ گھنٹہ مین سمندر کا پانی دو دفعہ اونچا چڑھتا ہے اور دو دفعہ معمول سے کم نیچے ہو جاتا ہے۔ جب سورج اور چاند کی کشش ایک ہی سمت مین اثر کرتی ہے تو بڑے جوار بھاٹے پیدا ہوتے ہین اور جب ان کی کشش مخالف سمتون مین اثر کرتی ہے تو معمول سے چھوٹے مدوجزر ہوتے ہین۔ سطح زمین کے نزدیک ایک بہت موٹی ٹھوس تہ ہونے کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ سمندر مین مدوجزر ہوتا ہے۔ اگر یہ تہ کم گہری ہو تو چونکہ پانی کے ساتھ نیچے سے سمندر کی تہ بھی اوپر کی طرف کھنچی آئے مدوجزر ایسے نمایان نہ ہون۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چاند اور سورج کی کشش سے کرۂ ہوائی مین بھی سمندر کی طرح مدوجزر ہوتا ہوگا۔ بہت سے سائنس دان علمی طریقے پر ہوائی مدوجزر کی تحقیقات مین مصروف ہین کیونکہ ہوائی مدوجزر نہ صرف علمی حیثیت سے دریافت طلب ہے بلکہ اب جبکہ ہوائی جہاز دن بدن زیادہ استعمال کیۓ جا رہے ہین اسکی ضرورت اور زیادہ ہو گئی ہے کرۂ ہوائی مین مدوجزر کے یہ معنی ہین کہ ہوائی جہاز رانون کو ملاحون کی طرح ہوائی مدوجزر کے اوقات کا خیال رکھنا لازم ہوگا۔ ہان چونکہ ہوائی سمندر ما سوائے

[1] تجاذب مادی سے مراد نیوٹن کا وہ عالمگیر قانون یعنی Law of Univereal Gravitation ہے جس کے مطابق عالم مین مادہ کا ہر ایک ذرہ باقی تمام مادی ذرات کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتا ہے۔

صرف چند ایک رکاوٹون کے جو بلند پہاڑون کی وجہ سے اس کی عالمگیر یکسانیت مین واقع ہوئی ہین مد و جزر کے لیے وسط سمندر کا جہان پانی کی سطح کا نشیب و فراز بندرگاہون سے کہین کم ہوتا ہی حکم رکھتا ہی اور دوسرے ہوا پانی سے کئی سو گنا ہلکی ہی کرۂ ہوائی مین مد و جزر کی وہ شدت نہین ہوتی جو تنگ بندرگاہون مین ہوتی ہی یہی وجہ ہی کہ آج تک اس صیغۂ علم کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہین کیگئی اور مقیاس الہوا مین پارے کے اوپر نیچے ہونیسے ہوائی مد و جزر کا پتہ نہین لگ سکتا جب تک زیادہ نازک طریقے اختیار نہ کیئے جائینگے یہ مسائل ایک بڑی حد تک علمی حیثیت سے راز سربستہ رہین گے۔

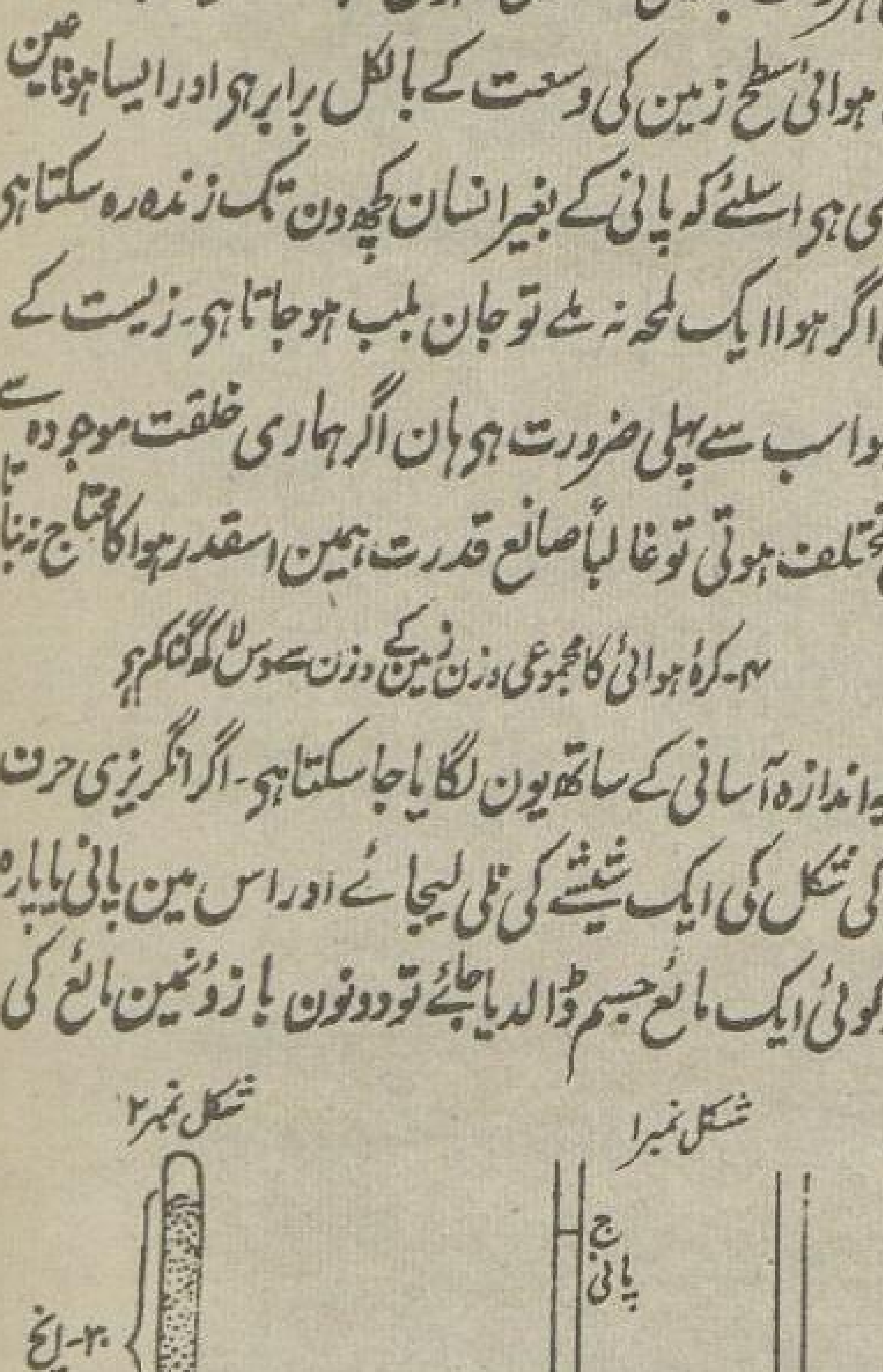
۳۔ ہوا کے اعلیٰ طبقات کے دلچسپ حالات

کرۂ ہوائی کے متعلق جدید ترین معلومات اس کے طبقات اعلیٰ کے حالات کی مفصل دریافت ہی۔ غبارہ کے ذریعے سے آدمی زیادہ سے زیادہ پانچ میل کی بلندی تک جا سکتا ہی۔ دُنیا مین سب سے اونچا پہاڑ بھی تقریباً پانچ میل بلند ہی لیکن ان پانچ میلون کی بلندی کا حال بھی ان طریقون سے وسیع طور پر فی الحال معلوم نہین ہی ہان حال ہی مین ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ہی جس سے ۱۰ میل کی بلندی تک کے حالات معلوم کیئے گئے ہین۔ اس سے پیشتر کہ ہم ان دلچسپ معلومات کا مفصل ذکر کرین ہم موازنہ کی خاطر کرۂ آبی اور کرۂ ہوائی کا مختصر مقابلہ کرتے ہین۔

جس طرح مچھلیان اور دوسرے آبی جانور پانی کے سمندر مین رہتے ہین اسی طرح انسان اور خشکی پر رہنے والے حیوانات ہوا کے ایک سمندر مین رہتے ہین جو پانی کے سمندر سے کیا بلحاظ وسعت اور کیا بلحاظ گہرائی کے ہر طرح سے بڑا ہی۔ سطح زمین کا صرف ایک چھوٹی حصہ خشک ہی جو عرف عام مین ربع مسکون کے غلط نام سے مشہور ہی۔ باقی تین چوتھائی حصہ پانی کے سمندرون سے گھرا ہوا ہی گویا سمندر کی وسعت سطح زمین کے مجموعی رقبہ کی تقریباً تین چوتھائی کے برابر ہی۔ لیکن کرۂ ہوائی کے متعلق یہ امر دلچسپی اور افادہ سے خالی نہین کہ سطح زمین کا ایک چپہ بھر حصہ تو ایک طرف ایک ذرہ بھی ایسا نہین جسے کرۂ ہوائی احاطہ کیئے ہوئے ہو اور جس کے ارد گرد ہوا کے سمندر کی لہرین ہر وقت جاری و ساری نہ ہون۔ بالفاظ دیگر رقبہ کے لحاظ سے کرۂ ہوائی سطح زمین کی وسعت کے بالکل برابر ہی اور ایسا ہونا عین ضروری ہی اسلئے کہ پانی کے بغیر انسان کچھ دن تک زندہ رہ سکتا ہی لیکن اگر ہوا ایک لمحہ نہ ملے تو جان بلب ہو جاتا ہی۔ زیست کے لیے ہوا سب سے پہلی ضرورت ہی ہان اگر ہماری خلقت موجودہ سے بالکل مختلف ہوتی تو غالباً صانع قدرت ہمین اسقدر ہوا کا محتاج نہ بناتا۔

۴۔ کرۂ ہوائی کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے دس لاکھ گنا کم ہی

یہ اندازہ آسانی کے ساتھ یون لگایا جا سکتا ہی۔ اگر انگریزی حرف یو U کی شکل کی ایک شیشے کی نلی لیجائے اور اس مین پانی یا پارہ یا اور کوئی ایک مائع جسم ڈالدیا جائے تو دونون بازوؤن مین مائع کی



سطح ایک جتنی بلندی پر ہو گی لیکن ایک بازو مین پارہ اور دوسرے

مین پانی ڈالا جائے تو پانی کی سطح ج کی بلندی خط مستقیم ا۔۰۰۱ سے اوپر پارہ کی سطح ب کی بلندی خط ا۔۔ا سے اوپر کی نسبت تقریباً ۱۳½ گنا زیادہ ہوگی اسلئے کہ پارہ پانی سے ۱۳½ گنا زیادہ بھاری ہے۔ دوسری شکل مین ایک شیشہ کی نلی پارہ سے بھر کر پارہ کے برتن مین الٹی کھڑی کی گئی ہے۔ نلی مین پارہ برتن کے پارہ کی سطح سے ۳۰ انچ اونچا کھڑا ہوتا ہے۔ یو شکل کی نلی والے تجربون سے فائدہ حاصل کرکے آپ کہہ سکتے ہین کہ یہان بھی ایک یو شکل کی نلی ہے جسکا ایک بازو دکھائی نہین دے رہا اس لیے کہ اسمین ہوا بھری ہے اور دوسرے بازو مین پارہ بھرا ہے۔ گویا ۳۰ انچ لمبی پارہ کی نلی ہوا کی ایک غیر مرئی لمبی نلی کے وزن کی وجہ سے پارہ کی بیرونی سطح سے (جس پر ہوا کے وزن کا دباؤ اثر کر رہا ہے) اوپر کھڑی ہے بعینہ اسیطرح جسطرح شکل اول مین پانی کی ایک ۱۳½ گنا لمبی نلی پارہ کی ایک چھوٹی نلی کو سہارا دیئے ہوئے ہے۔ ان تجارب کی بنا پر ہم فوراً کرۂ ہوائی کی بلندی کا اندازہ لگا سکتے ہین بشرطیکہ کرۂ ہوائی نیچے سے اوپر تک ایک جتنا کثیف ہو۔ اِس شرط کو صحیح مان کر یکسان کثافت کی ہوا کے کرہ کی بلندی چونکہ پارہ ہوا سے دس ہزار گنا بھاری ہے ۳۰ × ۱۰۰۰۰ انچ یعنی تقریباً پانچ میل نکلتی ہے لیکن چونکہ ہوا جون جون ہم اوپر چڑھتے ہین لطیف ہوتی جاتی ہے کرۂ ہوائی کی اصلی بلندی کا اندازہ تمام اِن باتونکا لحاظ کرکے تقریباً پینتالیس میل لگایا گیا ہے۔ اس علم کے ساتھ ہم کرۂ ہوائی کے وزن کا تناسب زمین کے وزن کے ساتھ تیسری شکل کی مدد سے معلوم کر سکتے ہین۔ زمین کی کثافت اضافی پانی کے مقابلے مین ۵½ ہے بالفاظ دیگر اگر زمین کا حجم رکھنے والے پانی کے پانچ گولے اکٹھے کئے جائین تو ان کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے کچھ کم ہوگا اب اگر آپ ایک مکعب فٹ پانی کا وزن جانتے ہین تو زمین کا وزن اِن اعداد سے بآسانی نکل سکتا ہے۔ زمین کا حجم $\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times (4000)^3$ مکعب میل ہے۔ کرۂ ہوائی کا وزن دریافت کرنے کے لیے ہم مقیاس الہوا کی نلی (شکل دوئم) کو پھر استعمال کرینگے۔ ہمکو کرۂ ہوائی کی بلندی بالکل صحیح طور پر معلوم نہین ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ تمام کرۂ ہوائی کا بوجھ پارہ کی ۳۰ انچ گہری تہ کے بوجھ کے برابر ہے پس شکل ۳ مین آپ یون سمجھئے کہ بجائے زمین کے گرد ۴۵ میل گہری ہوا کی ایک تہ ہونے کے پارہ کی ایک ۳۰ انچ گہری تہ ہے جس کا حجم تقریباً $4 \times \frac{22}{7} \times (4000)^2 \times \frac{30}{36 \times 1760}$ مکعب میل ہے۔ پارہ پانی سے ۱۳½ گنا زیادہ بھاری ہے اور زمین پانی سے ۵½ گنا بھاری ہے اِس لیے کرہ ہوائی کے وزن کو زمین کے وزن سے وہی نسبت ہے جو $4 \times \frac{22}{7} \times (4000)^2 \times \frac{30}{36 \times 1760} \times \frac{27}{2}$ کو $\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times (4000)^3 \times \frac{11}{2}$ سے ہے یا ایک کو دس لاکھ سے۔ المختصر کرۂ ہوائی کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے دس لاکھ گنا کم ہے۔

۵۔ ہوا کا دباؤ

بہت سے حضرات متعجب ہون گے کہ اگر فی الواقع ہوا کا اتنا بوجھ ہے اور ہم ہوا کے بوجھ کے نیچے ہین تو پھر کیون ہم اِس دباؤ کو محسوس نہین کرتے۔ بات اصل مین یہ ہے کہ ہوا کا دباؤ ہمارے اندر باہر ہمارے بدن مین مسامات وغیرہ کی وجہ سے دونون طرف برابر ہے اور اس لیے اِس کا مجموعی اثر ہمارے بدن کے اوپر صفر محض یعنی کالعدم ہے۔ اگر ایسا نہوتا تو چونکہ فی مربع انچ ہوا کا دباؤ تقریباً ۶½ سیر ہے اور تخمیناً ہمارے جسم کی بیرونی سطح کا رقبہ ۶۵ ہزار مربع انچ ہوتا ہے ہمارے جسم پر کچھ کم سوا چالیس ہزار سیر یا دس ہزار پانچ سو من کے دباؤ سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ کس عمدگی کے ساتھ ہم ہوا کے حیرت انگیز دباؤ سے بالکل بے خبر ہین اور اسے کبھی محسوس تک نہین کرتے۔ (پانی چونکہ ہوا سے تقریباً ساڑھے آٹھ سو گنا بھاری ہے اگر ہم پانی کی سطح سے ۳۲ فٹ نیچے جائین تو ہمارے جسم پر اتنا ہی دباؤ

پڑتا ہی جتنا کہ کرہ ہوائی کے بوجھ سے پڑسکتا ہی۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ اُن آبی جانوروں کی ہڈیان اور تمام جوارح کس قدر مضبوط ہوتے ہونگے جو سطح سمندر سے ہزاروں فٹ نیچے نشو ونما پاتے ہین!!!) اگر ایک شیشے کے برتن مین مخراج الہوا کی مدد سے ہوا کا اکثر حصہ خارج کردیا جائے اور شیشہ کافی مضبوط نہ ہو تو ہوا کے دباؤ کا اثر برتن کے ٹوٹ جانیسے آسانی کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہی۔ اگر ہمارے جسم بھی شیشہ کیطرح غیر مسامدار ہوتے اور ان کے آرپار ہوا نہ گذر سکتی تو نہایت سختی کے ساتھ ہمکو ہوا کے دباؤ کا یقینی احساس ہوتا۔ لیکن چونکہ ہوا ہمارے جسم کے اندر باہر آسانی سے گذرتی ہی اس لیے نتیجہ ہمارے حق مین حد درجہ مفید ہی۔

۶۔ اسٹرٹیوسفیر یا کرۂ زمہریر

کرہ ہوائی کے متعلق ایک دلچسپ امر جو متعدد اور مختلف تجارب اور مشاہدات کی بنا پر معلوم ہوا ہی یہ ہی کہ تقریباً چھ میل کی بلندی تک ہوا کا درجۂ حرارت تین سو فٹ کی بلندی کے لیے ایک درجہ فارن ہیٹ کم ہوتا چلا جاتا ہی۔ لیکن چھ میل کی بلندی سے اوپر درجۂ حرارت مین کوئی کمی واقع نہین ہوتی یہانتک کہ ۱۰ میل کی بلندی تک ایک ہی درجۂ حرارت ہوتا ہی۔ اس لحاظ سے کرۂ ہوائی دو حصوں مین منقسم ہوجاتا ہی ایک تو وہ حصہ جو سطح سے لگا ہوا تقریباً چھ میل کی بلندی تک اوپر جاتا ہی اور جس مین ہوا کا درجۂ حرارت بلندی کے ساتھ کم ہوجاتا ہی اور فی میل ۱۸ درجہ فارن ہیٹ کم ہوتے ہوتے انتہائی حد پر صفر سے تقریباً پچاس درجہ فارن ہیٹ نیچے یعنی منفی ۵۰ فارن ہیٹ ہوجاتا ہے۔ اس حصے کو کرہ حرارت (ٹراپو سفیر Troposphere) کے نام سے تعبیر کرتے ہین۔ دوسرے حصہ کو اسٹرٹیوسفیر (Stratosphere) کہتے ہین ہم اسکو کسی خاص صحیح نام سے اردو مین تعبیر نہین کرسکتے سہولت کے لیے مین نے جلدی سے اسکے لیے کرۂ زمہریر استعمال کرلیا ہی ہوا کے اس اعلیٰ طبقہ کا عجیب خاصہ یہ ہی کہ اس مین درجۂ حرارت میلوں تک یکسان رہتا ہی۔ شروع مین خیال کیا گیا تھا کہ اس طبقے کا درجۂ حرارت بدلتا نہین ہی اور اسے طبقۂ مساوی حرارت کہتے تھے لیکن بعد کے تجارب نے ثابت کردیا ہی کہ سطح زمین پر مختلف مقامات کے اوپر یہ طبقہ بھی مختلف بلندیوں پر شروع ہوتا ہی بلکہ اسکا اصلی درجۂ حرارت بھی مختلف ہوتا ہی۔ علاوہ ازین ایک ہی مقام کے اصلی درجۂ حرارت مین تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہی لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ایک امر جسکی وجہ سے یہ اعلیٰ طبقہ طبقۂ اسفل سے ممتاز ہی یہ ہی کہ جہان سے شروع ہوتا ہی اس کے پرے اور اوپر کیطرف پھر کوئی تبدیلی درجۂ حرارت مین واقع نہین ہوتی۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہوگا کہ ہوا کے اس اعلیٰ طبقہ اسٹرٹیوسفیر کا مطالعہ کن ذرائع سے کیا گیا ہی۔ ہم اوپر ذکر کرچکے ہین کہ پہاڑوں کی مدد سے یا انسانی غباروں کی مدد سے ہم زیادہ سے زیادہ بص مشکل ۵ میل سے کم تک کی بلندی پر پہنچ سکتے ہین۔ ہوا کے اعلیٰ طبقہ

(۱) درجۂ حرارت کی پیمائش کے لیے یوروپ مین اور دوسرے ممالک مین جہان یوروپ کے علوم مروج ہین برف اور بھاپ کی درجۂ حرارت کے درمیانی وقفہ کو مختلف پیمانوں کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہی۔ فارن ہیٹ کا پیمانہ ان مین سے ایک ہی۔ اسکے مطابق جمتے ہوئے پانی یا برف کا درجہ حرارت ۳۲ کہلاتا ہی اور کھولتے ہوئے پانی کی بھاپ کا درجۂ حرارت ۲۱۲۔ برف سے کم درجۂ حرارت کی پیمائش اسی حساب کے مطابق ہوتی ہی مثلاً ایک جسم کا درجۂ حرارت جو برف سے اتنا ہی زیادہ ٹھنڈا ہو جتنی کہ بھاپ بمقابلہ برف گرم ہی فارن ہیٹ کے پیمانے کے مطابق ۳۲ — ۱۸۰ یعنی منفی ۱۴۸ (منفی سے مراد صفر کے نیچے ہی) ہوگا۔ سنٹی گریڈ پیمانے پر برف اور بھاپ کی درجۂ حرارت کا وقفہ سو برابر حصوں مین منقسم ہوتا اور ریومر مین اسی حصوں پر برف کا درجۂ حرارت ایک مین صفر سنٹی گریڈ کہلاتا ہی اور دوسرے مین صفر ریومر کہلاتا ہی بھاپ کا درجہ ایک مین سو سنٹی گریڈ اور دوسرے مین ۸۰ ریومر

کا مطالعہ زمانۂ حال سے شروع ہوتا ہی۔ ۱۸۶۲؁ عیسوی مین ایک من چلے علم دوست یوروپ کا بیٹا گلیشر (Gleisher) اس امر کے درپے ہوا اور ایک بہادرانہ کوشش کے بعد ۲۹ ہزار فٹ کی انتہائی بلندی تک ہوا کی سیر کر آیا۔ بیسوی صدی کے شروع تک اس کے بعد پھر کوئی کوشش ہوا کے مطالعہ کی نہین کی گئی لیکن گذشتہ دس بارہ سالو نمین اپنے آپ کام کرنے والے آلات کی تکمیل کی وجہ سے یہ کام از سرِ نو نہایت زورون کے ساتھ شروع ہی۔

سب سے زیادہ مفید چیز اس ضمن مین آزمائشی غبارہ (سونڈنگ بیلون یعنی Sounding Baloon) ہی جو کہ نہایت عمدہ پتلے ربڑ کا بنا ہوا ہوتا ہی اور ہائیڈروجن گیس سے بھرا جاتا ہی صعود سے پہلے اس کا قطر تقریباً ایک گز ہوتا ہی۔ جون جون غبارہ اوپر چڑھتا ہی ہوا کے بیرونی دباؤ کے کم ہونے سے غبارہ کے اندر کی ہائیڈروجن گیس پھیلتی جاتی ہی حتی کہ ایک خاص حد تک پھیلنے کے بعد غبارہ پھٹ جاتا ہی اور نیچے گر پڑتا ہی۔ غبارہ کے اندر عام طور پر کم از کم دو آلات ہوتے ہین یعنی ایک آلہ حرارت نویس جو خود بخود درجۂ حرارت کی پیمائش کرتا ہی اور ایک کاغذ کے لمبے ٹکڑے پر ہر لمحہ ایک یادداشت لکھتا جاتا ہی اسے انگریزی اصطلاح مین تھرموگراف (Thermograph) کہتے ہین، دوسرا ہوا کے دباؤ کی پیمائش کے لیے ہوتا ہی اور پہلے کی طرح یہ بھی اپنا کام خود بخود کرتا ہی اور ایک کاغذ کے لمبے ٹکڑے پر یادداشت لکھتا ہی اسے ثقل نویس (بیروگراف Barograph) کہتے ہین ان دونون آلات کے مختصر مجموعہ کا نام میٹیروگراف Metereo graph ہی کمال یہ ہی کہ میٹیروگراف کا مجموعی وزن ایک چھٹانک سے کم ہوتا ہی دو اسی ہلکے پن کی وجہ سے غبارہ مع آلات دس بارہ پندرہ بلکہ بعض اوقات ۲۰ میل کی بلندی تک اوپر چڑھ جاتا ہی۔ غبارہ کے اندر آلات کے ساتھ ایک انعامی اشتہار ہوتا جس مین ملنے والے کے لیے غبارہ اور آلات کو حفاظت سے بند کر کے مالک کے پاس واپس بھیجنے کے لیے مفصل ہدایات درج ہوتی ہین۔ اس ترکیب سے بہت سے غبارے اپنے فرض کی تکمیل کے بعد اپنے مالک کے پاس پہنچ جاتے ہین۔ نہ صرف خشکی پر بلکہ سمندر مین بھی غبارہ کے ضائع ہونیکا کم امکان ہی کیونکہ یوروپ جہان یہ سب علمی چرچے ہین وہان کی ہوا مین بھی علم کی لہرین سرایت کر گئی ہین اور ہر پیر و جوان علمی مشاغل کی اعانت مین سرگرم ہی۔

اسٹرٹیوسفیر یعنی ہمارے کرۂ زمہریر کے متعلق ایک دلچسپ اور دریافت طلب امر یہ ہی کہ سطح زمین کے اوپر مختلف مقامات پر کرۂ حرارت (ٹراپوسفیر Troposphere) اور کرۂ زمہریر مین حد فاصل کی بلندی کیا ہی اور وہان درجۂ حرارت کیا ہی۔ بالعموم دونون کرون کی حدود فاصل ایک دوسرے سے بدیہی طور پر ممتاز ہوتی ہین گو بعض حالات مین یہ بھی پایا گیا ہی کہ درجۂ حرارت میلون تک بہت آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جاتا ہی۔ انگلستان کے اوپر کرۂ زمہریر کی نچلی تہ ۵ سے ۷ میل کی بلندی پر شروع ہوتی ہی اور اسکا درجہ حرارت تخمیناً منفی ۲۵ فارن ہیٹ ہی۔ دنیا کے مختلف حصون کے مشاہدات کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ کرۂ زمہریر کی بلندی خط استوا کے اوپر سب جگہون سے زیادہ اور قطبین کے اوپر سب جگہون سے کم ہی۔ جتنی زیادہ بلندی ہوتی ہی درجۂ حرارت اتنا ہی کم ہوتا ہی لہذا اگر کرۂ حرارت کسی مقام کے اوپر زیادہ بلندی پر ختم ہوتا ہی تو وہان کرۂ زمہریر کا درجۂ حرارت بہت کم ہوتا ہی۔ ان امور کے انطباق سے یہ حیرت افزا نتیجہ نکلتا ہی کہ سب سے زیادہ سردی ہوا کے اعلی طبقات مین خط استوا کے اوپر ہی نہ کہ قطبین کے اوپر۔ وسط افریقہ مین ایک صعود سے معلوم ہوا کہ کرۂ زمہریر کا درجۂ حرارت جھیل وکٹوریا نینزا کے اوپر منفی ۱۱۹ درجہ فارن ہیٹ یعنی پانی کے درجۂ حرارت انجمادی سے ڈیڑھ سو درجے نیچے ہی۔ مصنوعی طریقون سے اس سے کم درجہ کی سردی حاصل کرنا ممکن ہی لیکن غالباً قدرت مین یہ سب سے کم درجہ کی سردی ہوگی۔

فیروز الدین مراد

پانی

اسکی مختلف صورتون اور اسکی عمومیت پر ایک نظر

پانی کی نسبت تکوین سے کہنے مین ذرا بھی تامل نہین ہوسکتا کہ پانی عالمگیر ہی تخلیق عالم سے اسے خاص تعلق ہی۔ یہ ہر جگہ موجود ہی۔ کوئی جاندار شے اس سے خالی نہین ہی۔ اسکی نسبت جو آفرینش اور موجودات سے ہی اسکی نسبت وحشی اور مہذب ہر دو اقوام مین طرح طرح کے روایات اور خیالات رائج ہین یہان بخوف اختصار سے غیر تہذیب نا آشنا قومونکی روایات درج کیجاتی ہین جو مضمون ہذا کے لطف کو دوبالا کیے بغیر نہ رہینگی

جنوبی امریکہ مین ایک وحشی قوم رہتی ہی جو ابی پون کہلاتی ہی۔ لارڈ آویبری (سر جان لبک) مشہور محقق و عالم علم بنی آدم اسکی روایات کا ذکر کرتے ہوے کہتے ہین کہ اس قبیلہ کے خیال کے مطابق ابتدا مین پانی ہی پانی تھا جس کے درمیان سے دنیا نکلی۔ یہ خیال قدیم زمانہ کی بعض ترقی یافتہ قومون مین بھی رائج تھا۔ بابل مین نہایت قدیم زمانہ مین ایک قوم آباد تھی جس سے اہل بابل نے رسم و رواج، علم و فن، اور تہذیب و شائستگی حاصل کی تھی، اور خط میخی کی اختراع اس قوم سے منسوب کی جاتی ہی اس کا نام اکاڈمین تھا۔ اس کا یہ گمان تھا کہ موجودات پانی سے پیدا ہوئی تھین۔ ان کے خیال مین زیست کا قیام پانی پر موقوف ہی اور جب دنیا کو ترکیب دینے کے لیے ایک قدرت بالا کی ضرورت لاحق ہوئی تو وہ پانی کے اندر سے نکل آئی۔ مسٹر ٹائلر مشہور عالم انتھروپالاجی نے جنرل آف انتھروپالاجی مین جاپان کی ایک نہایت پرانی روایت کا ذکر کیا ہی جو تکوین کی بابت ہی اور وہ یہ ہی کہ ابتدا مین زمین پانی پر تیرتی تھی۔ اس کے درمیان سے ناگرموتھا نکلا جس کے اندر سے زمین بنانے والا دیوتا پیدا ہوا۔ کئی وحشی قبائل پالنیشیا اور آسٹینیشیا کے مختلف جزائر مین رہتے ہین جنکے درمیان تکوین کی بابت جو روایات رائج ہین ان سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ ابتدا مین ہر جگہ پانی تھا اس کے درمیان سے کرۂ ارض نکلی۔ ان قومون سے بہتر قبائل جو آہستہ آہستہ روشنی کی طرف لڑکھڑاتے ہوے چلے آرہے ہین ان کا یہ خیال ہی کہ زمین پانی کے اندر سے نکلی تھی۔ ابتداے عالم مین ہر جگہ پانی ہی پانی تھا۔ یہ نسبت شمالی

اور جنوبی امریکہ کے بعض حصون مین رہتے ہین۔ شمالی امریکہ کے ایک اور وحشی قبیلہ کا یہ خیال ہی کہ ابتدا مین سمندر تھے اور ان کے درمیان ایک جزیرہ تھا جو رفتہ رفتہ دنیا کی صورت مین تبدیل ہوگیا۔ برٹش کولمبیا (کنیڈا) مین ایک وحشی قبیلہ ہی اسکے ہان یہ روایت مروج ہی کہ ابتدا مین پانی تھا، اور اس کے اندر ایک چھچھوندر تھی جب[1] اسے بھوک لگی تو وہ پانی کی تہ مین خوراک کی تلاش مین گئی وہان کچھ پانی اسنے نکالکر جمع کرتی رہی جس سے بعد ازان دنیا بنی۔

اہل مین کا خیال دربارۂ تکوین سوال و جواب کی صورت مین ہی جو اس ملک کے مشہور حکیم کیفوشش سے عالم کی ابتدا کے باب مین پوچھے گئے تھے۔ حسب ذیل اقتباس کا ماخذ مسٹر میکلاکھی کا ترجمہ[2] ہی جو انھون نے حکیم موصوف کے سوال و جواب کا انگریزی مین کیا ہی "شروع مین دو چیزین پانی اور آگ تھین۔ پانی کے ساتھ جو چیزین مخلوط تھین، ان کے تہ پر بیٹھ جانے سے زمین پیدا ہوئی۔ اگر کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر قرب وجوار کی پہاڑیون کو دیکھو تو وہ سمندر کی لہرون کی مانند نظر آئین گی بعینہ ابتدا مین پانی اسطرح بھا بھر اتھا مین نہین جانتا کہ کس زمانہ مین منجمد ہوا تھا۔"

ہندؤن کی دھرم پستکون مین جہان تکوین کا ذکر ہی وہان پانی کو ایک خاص عظمت اور تفوق حاصل ہی۔ مثلاً رگوید کے ایتریہ ارنیہ[3] مین لکھا ہی "ابتدا مین عالم جوہر ہی جوہر تھا۔ اسکے سوا کوئی جاندار اور بیجان شے موجود نہ تھی۔ اُسے دنیا پیدا کرنے کا خیال آیا۔ اس نے پانی، روشنی اور مخلوقات وغیرہ پیدا کر دیے"۔ یجروید[4] مین لکھا ہی "ابتدا مین پانی ہی پانی تھا۔ یہ کونیا بھی آرنبھ مین جل تھی"۔ رگوید[5] کے آخری منترون مین پانی کو موجودات کا مبدا و ماخذ قرار دیا گیا ہی جس سے آگ اور ہوا نکلی۔ منو جی اپنے سدہانت مین لکھتے ہین "ابتدا مین تاریکی محیط تھی۔ ایشور بھگوان نے اصولِ اولیہ یعنی ابتدائی عناصر وغیرہ مع پانی پیدا کیے۔ اس کے اندر اُگنے والا تخم تھا۔ اس سے نہایت براق سنہری انڈا نکلا جس کے اندر[1] برھما جی تھے۔۔۔۔ الخ"

یونانیون مین سب سے مشہور شاعر ہومر ہی۔ اس نے رزمیہ کتابین تصنیف کر کے غیر فانی شہرت حاصل کی ہی۔ وہ ایک جگہ عالم کی ابتدا پر بحث کرتا ہی اور سمندر کو اس کا منبع[2] ٹھیراتا ہی یعنی یہ خیال ظاہر کیا ہی کہ دنیا سمندرون کے پیٹ سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد طالیس تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح مین پیدا ہوا۔ یہ شخص یونانی علوم تجربیہ کا محرک اور بانیٔ اول تھا۔ اس نے طبعیات ہیئیات وغیرہ کے متعلق کچھ انکشافات کئے۔ اس نے پانی کو منبع عالم اور علت العلل مانا۔ یہ شاید پہلا حکیم ہی جس نے اس مسئلہ کو فلسفیانہ اصول پر قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے شاگردون ہی نے اس نظریہ کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ طالیس کا یہ بھی خیال تھا کہ صورت بگڑنے پر چیزین پھر پانی ہی مین جا ملتی ہین جس سے وہ برآمد ہوتی ہین۔

دنیا کی بربادی کی نسبت پانی سے

کئی وحشی اور مہذب اقوام کے درمیان یہ روایت مروج ہی کہ یہ دنیا پانی کے وسیلہ سے برباد ہو چکی ہی۔ قدیم زمانہ میکسیکو کے باشندے آزتک اور یوکٹن (وسطی امریکہ) کے باشندے مایہ[3] کے ہان یہ روایت مشہور تھی کہ دنیا ایک مرتبہ پانی کے خوفناک طوفان اور تین مرتبہ آگ وغیرہ سے برباد ہو چکی ہی۔ بائیبل مین طوفان نوح کا ذکر آیا ہی جس سے تمام دنیا ایک مرتبہ غرقاب تباہ ہوئی تھی۔ زمانہ حال کے

---

[1] ماخوذ از "تاریخ عالم" جلد اول، مقدمہ مطبوعہ اخبار ٹائمز لندن سنہ ۱۹ء [2] منقول از "میزان الحق" انگریزی ترجمہ صفحہ ۷۱ [3] ایضاً صفحہ ۱۰ [4] ماخوذ از نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا جلد نمبر ۵ صفحہ ۷۴۵۔

[1] میزان الحق صفحہ ۱۹۔ [2] نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا صفحہ ۷۵۴۔ [3] ماخوذ از "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد اول صفحہ ۱۰۳۔

سائنس کے رو سے ان خیالات کی ایک حد تک تائید ہو چکی ہے۔ جیالوجی شہادت سب سے قوی اور نہایت معتبر ہے۔ ایک مقررہ میعاد کے بعد قطب شمالی کی طرف سے برف کے سیلاب آتے تھے اور دنیا پر چھا جاتے تھے۔ نباتات اور حیوانات کو برباد کر دیتے تھے جیالوجی مین اسکا نام عہدِ برف یعنی گلیشل پریڈ ہے۔ دنیا کی تباہی کی بابت سائنس دانون کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ قلت آب سے برباد ہوگی۔ پانی دن بدن گھٹتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ہماری کرۂ ارض کا حشر وہی ہوگا جو چاند کا ہوا ہے، یا سیارۂ مریخ کا ہوا چاہتا ہے، جہان پانی کا عنصر گھٹتے گھٹتے بہت تھوڑا سا رہ گیا ہے تھوڑے عرصہ مین وہ بالکل ختم ہو جائیگا اور وہان کے چرند و پرند انسان اور روئیدگی سب سوکھ کر برباد ہو جائے گی۔ دوسرا گمان یہ ہے کہ چند ہزار سال کے بعد دوسرا برفانی طوفان پھر آئیگا اور دنیا کو برباد کرے گا۔

پانی کی عمومیت اس دنیا کا کوئی حصہ نہین ہے جہان پانی کسی نہ کسی صورت مین موجود نہو، بلکہ حال کے سائنسی انکشافات کی روشنی مین یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ عالم پانی کے وجود سے خالی نہین ہے، ہمارے سرون پر گنبدِ فلک کی جو نیلگون چھت نظر آتی ہے بخارات کا کرہ ہے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کسی زمانہ مین چاند مین روئیدگی تھی۔ وہان آتش فشان تھے جنکے دہانے ابتک سطح چاند پر بذریعہ دوربین صاف دکھائی دیتے ہین۔ وہان کسی زمانہ مین پانی تھا، مگر حرارت کے اخراج کے ساتھ گھٹتے گھٹتے بالکل معدوم ہو گیا۔ اب وہان نہ سبزی ہے اور نہ روئیدگی، اب اُسے مردہ دنیا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اٹلی کے مشہور عالم ہیئیات شیاپرئلی نے ۱۸۷۷ء مین پہلے پہل یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مریخ (منگل) سیارہ آباد ہے۔ وہان انسان رہتے ہین جنھون نے آبپاشی کی غرض سے بڑی بڑی عظیم الشان نہرین بنا رکھی ہین جنکی ساخت دیکھکر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ وہان فصلین ہوتی ہین۔ الغرض منگل کی دنیا ہماری دنیا ایسی قرار پائی۔ پروفیسر لوئل نے یہ خیال ظاہر کیا، اور اسکی تائید اور علمائے فلکیات نے بھی کر دی ہے کہ مریخ مین پانی کا منبع قریب الاختتام ہے تھوڑے عرصے کے بعد بالکل خشک ہو جائے گا۔ اور وہان کے انسان اور جاندار اور نباتات بالکل نابود ہو جائینگی۔ بعض محققان عالم بالا کا یہ بھی خیال ہے کہ زحل (سنیچر) اور برہسپت مین بھی بڑی بڑی دوربینون کے وسیلہ سے روئیدگی کے آثار معلوم پڑتے ہین۔ مگر یہ صرف قیاس ہے کہ جو تصدیق طلب ہے۔ ممکن ہے کہ یہ یقینیات کا درجہ حاصل کرے یا بالکل بے بنیاد ثابت ہو۔ مگر ان واقعات سے پانی کی عالمگیری بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

پانی کا رتبہ عناصر اربعہ مین زمانہ قدیم کے ارباب تحقیق کا خیال جب مظاہر فطرت اور تبدلات طبعی کے اسباب کے کھوج کی طرف رجوع ہوا، تو انھین ہر جگہ اور تقریباً ہر شے مین کسی نہ کسی صورت مین پانی نظر آیا جس سے انھین ضرور حیرت ہوئی ہوگی۔ اور اسکی عالمگیری دیکھکر اسے دنیا و مافیہا کا مبدا و منبع قرار دیا۔ بعض یونانی اور ہندو فلاسفر اسکی نسبت متفق الرائے ہین۔

جب سلسلہ اسباب و نتائج کی تفتیش بہت ہوشیاری اور بالغ نظری سے ہونے لگی۔ اور علوم و فنون کو خاص وسعت حاصل ہو چکی، تو پانی کے ساتھ آگ، ہوا، اور خاک بھی موجودات کی علت قرار پائی اور رفتہ رفتہ عناصر اربعہ کا مسئلہ رائج ہو گیا جس کے نہ صرف یونان کے علماہی مسیح سے تین چار سو سال قبل قائل و حامی تھے، بلکہ ہندوستان والے بھی مانتے تھے۔ اور اسی پر ضخیم کتابین لکھی گئی ہین۔ ہمارے ہان پانچوان عنصر ایتھر مانی گئی تھی، جو مغرب مین کئی صدیان گزرنے کے بعد تسلیم ہوئی سکندریہ روما وغیرہ کے تمام محققین اور فلاسفر اس مسئلہ کے حامی تھے۔ اس کے متعلق تحقیق جاری رہی۔ یورپ کے ازمنۂ جہالت اور عرب کے زمانۂ عروج مین بھی عناصر اربعہ کا مسئلہ رہا۔ قرونِ وسطی مین بھی اس کا دور دورہ رہا۔ آخر کار جب یورپ مین عقلی بیداری کا زمانہ شان و شوکت کے ساتھ شروع ہوا، اور صدیون کی غفلت اور کاہلی کے بعد علمی ترقیان ہونے لگین

تو رابرٹ بایل نے سترھوین صدی مین پانی کو مرکب قرار دیا۔ عناصر اربعہ کے مسئلہ کو اسکی کیمیائی دریافتون سے بہت سخت صدمہ پہنچا، جو اٹھارہ انیس سو برس سے مفردات تسلیم ہوے تھے، وہ بالآخر مرکبات ثابت ہوے۔ پانی اپنے سوتیلے بھائیون سمیت مفردات و عناصر ابتدائی کے زمرہ سے خارج ہو کر مرکب قرار پایا۔

پانی کی نسبت دنیا اور جسم انسانی سے

پانی خشکی پر بھی غالب ہی۔ کرۂ ہوا اسی سے محیط ہی۔ اگر پانی کسی روز جوش مین آئے اور اپنا ظرف چھوڑ کر زمین پر چڑھ آئے، تو طرفۃ العین مین ہماری دنیا مافیہا کو ہڑپ کرلے، اور ہم سب چند منٹون کے لئے آبی مچھلیان بنجائین۔ کرۂ ارض کی ساحت خشکی اور تری، کل اُنیس کروڑ ستر لاکھ مربع ہی۔ اس مین بہتر فیصدی پانی ہی اور ۲۸ فیصدی زمین۔ بالفاظ دیگر چودہ کروڑ بیس لاکھ مربع میلون پر سمندر، دریا، جھیلین، وغیرہ قطعات آبی ہین، اور صرف ساڑھے پانچ کروڑ مربع میل خشکی ہی، جسکے ایک حصے پر انسان آباد ہین، اور دوسرا صحراؤن، جنگلون، اور بیابانون کا مسکن بنا ہوا ہی۔ سمندر کا عمق بالاوسط ۱۲۰۰۰ فٹ ہی، مگر بعض مقامات مین اس سے بھی گہرا ہی۔ مثلاً جزائر غرب الہند کے شمال کی طرف بحر اوقیانوس ۱۶۶۰ فیدم گہرا ہی اور بحر الکاہل مین گوام سے پچہتر میل جانب جنوب بڑی سے بڑی گہرائی ۳۱۶۱۴ فٹ معلوم ہوتی ہی اب اندازہ کیا جا سکتا ہی کہ کتنا پانی ہی اور اسکی مقدار کتنی ہوگی۔

انسان خلاصۂ عالم کہلاتا ہی، یعنی ایک بہت ہی محدود پیمانہ پر ایک ننھی سی دنیا ہی، جن چیزون سے دنیا مرکب ہی وہ تقریباً سب کی سب انسان کے بدن مین موجود ہین۔ بدن انسانی چودہ مختلف عناصر کا مجموعہ ہی۔ پانی کا جسم انسانی مین بڑا حصہ ہی۔ ڈیڑھ سو پونڈ (پونڈ آدھ سیر کا ہوتا ہی) وزنی جسم کے اندر ساڑھے نو گیلن[1] پانی ہوتا ہی یہ اوسط درجہ کا حساب ہی۔ بالاوسط انسان کے جسم کا بوجھ ایک من تیس سیر ہوتا ہی، جس مین ساڑھے چونتیس سیر کے قریب آبی عنصر پایا جاتا ہی اور جسم کے ہر حصہ مین موجود رہتا ہے گویا ہمارا بدن نصف پانی کا ہی اور باقی نصف اور چیزون سے مرکب ہی۔

پانی کی کیمیائی ترکیب

جیسا پیشتر مذکور ہوا، پانی دو ہزار برس تک مفرد اور عنصر شمار ہوتا رہا۔ آخر کار سترھوین صدی مین رابرٹ بائل (ایک مشہور انگریز کیمیا دان) کی کوششون سے مرکب ثابت ہوا، یایون کہو کہ اس عالم کی تحقیق نے عناصر اربعہ کا خاتمہ کر دیا۔ اسکے بعد اور اور ارباب کیمیا اسکی تفتیش کرتے رہے اور اب یہ امر ہر طرح پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہی کہ پانی ہائڈروجن اور آکسیجن سے مرکب ہی۔ اول الذکر ۱۱.۱۲ فیصدی اور ثانی الذکر ۸۸.۸۸ فی صدی مقدار مین پائی جاتی ہی۔

پانی کی تین حالتین

پانی کی تین بڑی صورتین ہین، جن سے ہر کوئی واقف ہی۔ اس کے ماسوا اور صورتون مین اور مرکبات کے ساتھ مخلوط بھی پایا جاتا ہی۔ مگر غیر مخلوط اور غیر مرکب حالت مین اسکی تین ہی صورتین ہین۔ یعنی مائع، ٹھوس یا منجمد بخارات یا گیس سنٹی گریڈ مقیاس الحرارت کے درجہ صفر اور فارن ہیٹ مقیاس الحرارت کی ۳۲ ڈگری تک پانی سیّال رہتا ہی اور اس سے نیچے منجمد ہو جاتا ہی۔ اول الذکر آلہ کے ۱۰۰ ڈگری اور موخر الذکر کے درجہ ۲۱۲ ڈگری پر اُبلتا ہی اور اپنی سیال صورت بدل کر بخار بن جاتا ہی۔ پانی کی بڑی سے بڑی کثافت درجہ ۴ ڈگری سنٹی گریڈ مقیاس الحرارت پر ہوتی ہی اسکی حرارت نوعی سوائے ہیڈروجن گیس کے سب چیزون سے بڑھ کر ہوتی ہی۔ پانی کو روئی یا گھاس یا گیس کی طرح دبا کر چھوٹا اور ٹھوس نہین بنایا جا سکتا۔ اگر بلندی سے خالص پانی کو دیکھا جاے تو اس کا رنگ بہت ہی ہلکا نیلگون ہوتا ہی جس پانی مین کیلسیئم کاربونیٹ ہو وہ غیر شفاف ہوتا ہی، اور اس مین سے

---

[1] ایک گیلن برابر ہی تین سیر دس چھٹانک کے۔

کوئی شے نظر نہین آتی لیکن اگر کاربانک ایسڈ گیس اسکے اندر داخل کرو تو اس کا رنگ زرد سے نیلا ہو جائے گا بعض عالمون نے اس سے یہ خیال اخذ کیا ہی کہ پانی کی طبعی رنگت کاربانک ایسڈ کی مقدار پر موقوف ہوتی ہی جو مختلف مقامات کے پانیون مین ملی ہوتی ہی تاہم اسکی رنگت کا انحصار ایک بڑے درجہ تک ظرف کے بیندہ اور آسمان کی نیلگونی پر ہی۔ جب پانی مائع حالت مین ہوتا ہی تو اس مین حرارت بآسانی سرایت نہین کر سکتی۔ بالکل خالص پانی مین بجلی کوئی اثر نہین پیدا کر سکتی۔ اور نہ اسے دوسری طرف نکلنے مین کوئی مدد ملتی ہی،

(۱) سیال پانی کی طبعی اقسام سب سے پہلے سیال پانی کی طبعی حالتون اور قسمون کا ذکر کیا جاتا ہی سب سے پہلی قسم مینھ کا پانی ہی۔ سورج کی گرمی سے بخارات اڑ کر ہوا مین جاملتے ہین، اور جب کرۂ ہوا کے کسی سرد طبقہ مین پہنچتے ہین تو بادلون کی صورت اختیار کر لیتے ہین، اور پھر بارش بن کر زمین پر آجاتے ہین، مگر کرۂ ہوا سے گزرتے وقت انکے ساتھ کئی چیزین ملجاتی ہین۔ مثلاً نوشادر، سوڈیم۔ کلورائیڈ اور دیگر قسم کے معدنی نمک اور کھائی نیز نباتاتی مادہ بھی پایا گیا ہی۔ جس خطہ مین کارخانے ہون اور وہان کوئلہ جلتا ہو، تو بارش کے پانی مین گندھک کا تیزآب ملا ہوا ہوگا۔ دوسری قسم سطح کا پانی ہی، جو دریاؤن اور ندی نالون اور تالابون مین ہوتا ہی۔ یہ بارش کے پانی سے کم خالص ہوتا ہی۔ اسکے اندر جو چیزین پائی جاتی ہین، وہ اس زمین کی نوعیت اور روئیدگی پر موجود ہی جسکے درمیان سے اسے گزرنا پڑتا ہی، اس پانی مین کاربونیٹ کلورائیڈ، الکلی کے سلفاٹ اور کئی قسم کی مٹیان ہوتی ہین۔ علاوہ ازین لوہے اور منگنیز کی بھی ہلکی مقدار پائی جاتی ہی، اور کئی قسم کی نباتات کے نمک بھی پائے جاتے ہین۔ تیسری قسم طبعی پانی کی کنوئین کا پانی ہی، جو کنوؤن سے نکالا جاتا ہی، اور جو انکے اندر زمین کے گہرے اور اندرونی طبقون سے آکر جمع ہوتا ہی۔ یہ پانی دیہات و قصبات مین کھانا پکانے پینے اور نہانے، دھونے کے کام آتا ہی، مگر اس مین بعض دفعہ مضر مواد بھی ملا ہوتا ہی، جس سے ہیضہ، ملیریا وغیرہ وبائی امراض پھیل جاتے ہین، اس پانی کے اندر شورہ اور نوشادر پایا جاتا ہی جس سے اس کا مزہ کھاری ہوتا ہی، اور یہ ظاہر کرتا ہی کہ اس مین نہایت سخت مضر صحت مواد موجود ہی، سو فٹ سے اوپر جو کنوئین گہرے ہوتے ہین ان کا پانی البتہ بہت خالص ہوتا ہی چوتھی قسم کا پانی معدنی ہی اس مین کئی قسم کی معدنیات کی مقدار پائی جاتی ہی جنکی خاصیت دوائی ہوتی ہی، اور عموماً کئی قسم کی بیماریون کے علاج مین کام آتا ہی۔ کوئی ٹھنڈا کوئی گرم اور کوئی شیر گرم ہوتا ہی۔ اسکے اندر الطائن نمک اور ایسڈ کاربونیٹ سلفاٹ اور کلورائیڈ، سلفیورک ایسڈ ہیڈروکلورک ایسڈ، اور سلکک ایسڈ پایا جاتا ہی، سوڈیم بھی بعض پانیون مین ہوتی ہی۔ پانچوین قسم فطرتی پانی کی سمندری پانی ہی، سمندر مین ہر قسم کے ندی نالون اور دریاؤن کا پانی گرتا رہتا ہی جو غیر خالص ہوتا ہی۔ اس مین کئی قسم کی اشیاء مخلوط حالت مین پائی جاتی ہین۔ اس کا مزہ تلخ اور نمکین ہوتا ہی۔ بخارات بن کر جو پانی اڑ جاتا ہی وہ البتہ خالص ہوتا ہی اور اسکے کثیف اجزا سمندر مین رہجاتے ہین۔ دنیا کے مختلف حصون مین سمندری پانی کے ساتھ مختلف چیزین مختلف تناسب اور مقدار مین پائی جاتی ہین۔ شمالی خطہ سمندر مین برف جم جاتی ہی جو نمک سے عموماً مبرا ہوتی ہی پانی کو ہلکا یا بھاری کہکر پکارا جاتا ہی جس کا یہ مطلب ہی کہ کیلسیئم اور میگنیشیئم کی مقدار خاص تناسب سے اسکے اندر موجود ہی۔

(۲) پانی کی منجمد حالت پانی کی دوسری صورت برف ہی جسے اسکی منجمد یا ٹھوس حالت سمجھا جاتا ہی۔ جب پانی مائع سے منجمد بنتا ہی تو اسکی جسامت مین توسیع ہو جاتی ہی یہی وجہ ہی کہ شملہ جیسے سرد برفانی مقامات مین جب رات کو پانی بھر کر رکھا جاتا ہی تو صبح کو گھڑے شکستہ پائے جاتے ہین۔ یہ کیفیت کا نگڑہ، کشمیر، مری، ڈلہوزی، کلو، منصوری وغیرہ مین بھی موسم سرما مین دیکھنے مین آتی ہی، جہان پانی کی نالیان ہوتی ہین وہ رات کو پانی جمنے سے پھٹ جاتی

ہین۔ پانی کا انجماد اور تبدیلی صورت ہوا کے درجہ حرارت برودت پر موقوف ہے۔ اگر ہوا مین گرمی ہے تو انجماد بآسانی واقع نہین ہوتا مگر جب برودت بہت ہو تو البتہ اسکی سیال صورت برباد ہو جاتی ہے۔ پہاڑون اور سرد مقامون مین موسم سرما مین پانی آپ سے آپ جم جاتا ہے جسے یخ کہتے ہین۔ یہ شفاف اور ٹھوس ہوتی ہے۔ اور جب بخارات تصاعد کرکے زمہریر مین پہنچتے مین تو وہ بھی جم جاتے ہین اور برف کے گالون کی صورت مین سرد پہاڑی مقامات مین گرتے ہین اور تہ بہ تہ جمکر یخ کا تختہ بنجاتے ہین۔ دوسری مصنوعی برف ہوتی ہے جو تمام بڑے بڑے شہرون مین گرمی کے موسم مین فروخت ہوتی ہے اور سب چھوٹے بڑے شربت یا پانی مین ڈال کر پیتے اور اپنے کلیجہ کی سوزش بجھاتے ہین۔

(۳) پانی بخارات یا گیس کی صورت مین

پانی تیسری صورت مین بخارات یا گیس بنتا ہے کرہ ہوا اس کا مسکن ہے۔ ہوا کی خنکی اور گرمی بخارات کی کثرت اور قلت پر منحصر ہے۔

پانی کا ایک گرام (چنے کے برابر وزن) جب ۱۰۰ ڈگری سنٹی گریڈ پر بھاپ بنتا ہے تو اسکے لیے حرارت کی ۵۳۶ ڈگری اکائیان درکار ہوتی ہین جو اسکے اندر جذب ہو کر اسکی ہیئت کو بدل دیتی ہین بھاپ کا کوئی رنگ نہین ہوتا اور بالکل صاف ہوتی ہے لیکن اگر سرد ہوا لگے تو انجماد واقع ہوتا ہے اور بخارات دھوئین کی صورت اختیار کر لیتے ہین۔ آفتاب کی حرارت سے دریاؤن، جھیلون، ندی نالون اور سمندرون سے ہر وقت بیشمار بخارات اڑتے رہتے ہین اور کرہ ہوا مین پہنچکر معلق ہو جاتے ہین۔ جب ہوا کی لہر انھین بالائی طبقات مین جہان برودت بہت ہوتی ہے لیجاتی ہے تو بادل کی شکل مین نمایان ہوتے ہین۔ پھر وہان سے مینھ یا برف یا اولے بنکر زمین پر آجاتے ہین، بہکر سمندر مین جاتے ہین جہان سے حرارت انھین پھر اوپر ڈھکیل دیتی ہے۔ اسی طرح آواگون کا سا دور جاری رہتا ہے اور پانی گنہگار کی طرح پورا نک کے خیال کے مطابق اسی چکر مین الجھا رہتا ہے۔ شروع سے چلا آتا ہے اور آخر تک چلا جائیگا۔

پانی کے فوائد

جاندار کائنات کو پانی کے وجود سے بیشمار فائدے حاصل ہوتے ہین۔ نباتات کی اسے روح کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اسکے بغیر انکی زیست ناممکن ہے۔ پھل پھول اور فصلین سبھی پانی کی احسان مند ہین۔ حضرت انسان بھی اپنے کو اس کے احسانون سے بری نہین سمجھ سکتے۔ ہوا سے دوسرے درجہ پر پانی ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ ہمیشہ اور ہر وقت ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ پیدائش سے لیکر وفات تک ہمارے ہمدوش رہتا ہے۔ جب ہم اس عالم مین داخل ہوتے ہین تو ہمارا یہ خیر مقدم کرتا ہے۔ اور ہمارے ہاتھ پاؤن اور بدن کو پاک و صاف کرکے اس دنیا کے تماشا گاہ مین لاتا ہے۔ اور پھر جب ہم یہان سے اگلے جہان کو کوچ کرتے ہین تو بھی قبر کے کنارہ تک ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ دوران مسافت مین جو گرد و غبار ہمارے پاؤن ٹانگون اور چہرون کو لگ جاتا ہے اور ہم خاکیون سے منسوب ہو جاتے ہین آخری الوداع کے وقت پانی اسے صاف کرتا ہے، اور ہم پاک اور شستہ ہو کر ملک عدم کی سرحد مین داخل ہوتے ہین۔ پانی کے ہم پر بیشمار احسان ہین جس سے سبکدوش ہونا ہمارے امکان سے بعید ہے بیماری کی حالت مین ہماری کئی ضروری خدمات بجا لاتا ہے۔ دوا کے ساتھ ملکر جسم کے اندر داخل ہوتا ہے، اور خون مین مخلوط ہو کر مضر مواد کو جسم سے خارج کرنے مین شامل حال رہتا ہے۔ مسامون کو صاف کرکے پسینہ کے لیے راستہ صاف کر دیتا ہے جو اسی کا چھیرا بھائی ہے جب حرارت بدن مین اعتدال سے بڑھکر ہمین پریشان کرتی ہے تو اسوقت سرد پانی یا برف اسے گھٹا کر ہمین تسکین دیتی ہے معدنیات کے ساتھ ملکر ہمارے جسم کے کئی دکھون کو دور کرتا ہے جب ہم توانا و تندرست ہوتے ہین تو پانی ہماری صحت اور طاقت کو برقرار رکھنے مین بڑا ساعی ہوتا ہے۔ ہمارے بدن کو کئی قسم کی غلاظتون سے صاف کرتا ہے ہمین اجلے کپڑے اسی کی بدولت پہننے کو نصیب ہوتے ہین ہماری رقیق غذا ان کے ساتھ مخلوط ہو کر پانی ہمارے

دل و دماغ اور تمام قوائے جسمانی کو تقویت دیتا ہے۔ ہماری عبادت مین بھی پانی شامل ہوتا ہے۔ مسلمان نماز پڑھنے سے پیشتر وضو اور ہندو اشنان کرتے ہین، عیسائی جب بچے یا کسی غیر آدمی کو اپنے مذہب مین شامل کرتے ہین تو اسے بھی پانی ہی کا بپتسمہ دیتے ہین۔ پاکیزگی عبادت مین نہایت ضروری ہے اور سب مذہب اسکی تلقین و تاکید کرتے ہین مگر پانی کے بغیر یہ بھی ممکن نہین۔ اسی طرح یہ ہماری عبادت مین شریک ہے۔ اگر پانی دھوبی بنکر ہمارے میلے کچیلے کپڑے صاف و سفید کرتا ہے تو مینھ کے ذریعہ سے بھنگی بنکر ہمارے یہان سے گلی کوچے صاف کر دیتا ہے اور ہمین کئی قسم کی تکلیفون سے بچاتا ہے۔ ایک حد تک پانی ہماری جان ہے۔

پانی کے کرشمے موجودات کے اندر اوس یا شبنم کو سبھی جانتے ہین۔ طلوع آفتاب سے پیشتر ذرا کسی باغ یا کھیت کی سیر کرو، وہان پانی اپنا نیا کرشمہ دکھاتا ہے۔ اسکے ننھے ننھے قطرے پھولون اور پودون پر جو بہار دیتے ہین وہ اور کہین دیکھنے مین نہ آئے گی۔ انکی طبعی آپ کے سامنے موتی اور ہیرے پانی ہو جاتے ہین اور یہی موتی پھولون اور پودونکی غذائے خاص ہین۔ ان پر پرورش پاتے ہین۔ کھیتیان انھین کے سبب سے لہلہاتی نظر آتی ہین یہ انھین شب کو غسل دیتی اور نیک دل دایہ کی طرح انھین ان کی دلپسند خوراک کھلاتی ہے۔ کونپلین اسی کے اشارے سے وجود پذیر ہوتی ہین۔ کلیان اسکے رونے سے ہنستی ہین۔ ننھے ننھے پھل اسکے دیکھنے کو آتے ہین اور شادمان ہوتے ہین۔ الغرض شبنم ان کی جان اور انکی غذائے پسندیدہ ہے جب سورج نکلتا ہے تو بیچاری شبنم اپنا بوریا بدھنا سنبھال اپنے عزیزون سے رخصت ہوتی ہے اور جب رات گئے پھر آن موجود ہوتی ہے اور ان کی پرورش کرتی ہے۔ اس کی محبت بھری کوششون سے پھل اور پھول، پودے اور نباتات، سبزی، ترکاری، کھیتی کیاری وغیرہ کمال پر پہنچتے ہین، اور اپنے اپنے خزانے حضرت انسان کے پاؤن مین لا کر ڈال دیتے ہین جس سے وہ شادمانی اور فراوانی کی زیست بسر کرتا ہے۔ پانی شبنم اور کہرہ وغیرہ بنکر بھی انسان کی خدمتگزاری سے انحراف نہین کرتا۔

پانی کی قوت پانی جب شتر بے مہار کی طرح بپھرتا ہے تو بربادی ڈھاتا ہے۔ فائدہ کے بجائے نقصان اور ظاہری دوستی کے پردہ مین دشمنی کرتا ہے، سمندر مین بگڑ کر جہازون کو ہڑپ کرتا ہے اور خشکی کی حالت مین دریا بنکر دیہات قصبات پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ راجہ اندر کا حکم پا کر مکانون کو ڈھاتا ہے اور جانداروں کو بے کفن گور مین لٹاتا ہے۔ فصلون کو برباد کرتا ہے اور ہزارون جاندارون کو مصیبت مین پھنساتا ہے۔ لیکن جب اُسے قابو مین کر لیا جاتا ہے تو اس سے طرح طرح کی خدمات لی جاتی ہین، دریاؤن سے نہرین کاٹ کر لاکھون کروڑون اراضی جو صدیون سے غیر مزروعہ اور غیر آباد پڑی ہوئی تھی سیراب کی جاتی ہے اور اس طرح ہزارون بندگان خدا کی روزی بہم پہنچتی ہے۔ ندی نالون کے کنارون پر پن چکیان لگا کر اس سے پسنہاری کی نوکری لی جاتی ہے جھرنون سے برقی قوت پیدا کی جاتی ہے جس سے ریلین اور کارخانے چلتے ہین اور لاکھون مصنوعات تیار ہوتی ہین۔ اسی پانی کی عجیب مخفی قوت برق سے کسی روز مارکونی اور اس کے ہمخیال ماہرانِ برقیات مریخ کے باشندون سے نامہ و پیام کا تبادلہ کرنے کی خوشگوار اور معرکۃ الآرا امیدین لگا رہے ہین، اس کام کے لیے نیاگرا کے آبشار روانہ برق پیدا کرنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ پانی اور آگ سے جو اسٹیم یعنی بھاپ یا دُخان پیدا کیا جاتا ہے اس سے انجن ہزارون من بوجھ اور بیسیون آدمیون کو شام تک سینکڑون میلون پر پہنچا دیتا ہے۔ پیدل سفر اور ہاتھ سے کام کرنے سے جو زحمتین حضرت انسان کو برداشت کرنی پڑتی ہین پانی کی بدولت اُن سے رستگاری نصیب ہو گئی ہے اور آرام و آسایش کے سامان بہم پہنچ گئے ہین۔

جہازرانی مین پانی نے بڑا حصہ لیا ہے اور اب ہوائی جہازرانی کو

بھی اپنا مرہونِ احسان بنائے گا جس کے متعلق اس قدر دھوم دھام سے کوششین ہو رہی ہین۔ جب پہلے پہل بیلون کا تجربہ کیا گیا تو پانی کی ایک کیمیائی جزیعنے ہیڈروجن سے کام لیا گیا تھا، اور اب بھی لیا جاتا ہی،

غرض کہ پانی کی خدمات اور احسانات کا کہان تک ذکر کیا جائے زمانۂ حال کے سائنس نے اسکے استعمالات اور فوائد کو بہیر اچھی طرح ظاہر کر دیا ہی۔

(منقول از ترقی)

مصنوعات دکن

ارباب سیاست مدن کا جدید فرقہ جس نے اس فن کو ایک مستقل علم بنا دیا ہے اور ترقی و تنزل ملک کے اسباب اور اسکے معالجات کو کمال شرح و بسط کے ساتھ مدون کیا ہے۔ دولت کی تعریف اسطرح کرتا ہے کہ۔ دولت روپیہ یا سونے چاندی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اشیاء احتیاج اور سامان عیش و آرام کا نام ہے۔ اس لیے جو ناظرین سیاست مدن کے اصول سے کسی قدر بھی واقف ہونگے وہ ضرور ہمارے اس قول کی تصدیق کرینگے کہ زندہ اور سرسبز و شاداب وہی ملک ہے جہان کے باشندے اپنے اشیاء مایحتاج کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہین اور اپنے ملک والون کی ضروریات کے پورا کرنے کے بعد دوسرے شہرون کو بھیجتے ہین تاکہ ان کی دولت کو اپنی محنت کے ذریعہ سے اپنی طرف جذب کرین۔ جو ملک اپنے حوائج ضروری آپ مہیا نہین کر سکتا بلکہ تمام خورد و نوش آرام و آسایش کے اسباب مین دوسرون کا دست نگر رہتا ہے۔ ایسے ملک کو اگر مردہ بدست زندہ کہین تو بیجا نہین ہے۔ جیسے کہ آجکل ہمارا ملک دکن ہے۔ بالفاظ دیگر جو ملک اپنے حوائج مین دوسرے کا محتاج نہو یا ان کا تبادلہ اپنے مصنوعات سے برابر کر سکتا ہو وہ زندہ یا دولتمند ملک ہے جیسے کہ آجکل انگلستان ہے۔ اب مین اس مطلب کو کہ ہمارا ملک دکن ایک مفلس ملک ہے اور انگلستان ایک دولتمند ملک ہے کسی قدر وضاحت سے بیان کرتا ہون۔ ہم لوگ جس قدر اشیاء احتیاج و سامان عیش و آرام استعمال کرتے ہین وہ ہمارے ملک کی بنی ہوئی نہین ہین۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ تمام اشیا ضرور لندن یا جرمن یا فرانس یا امریکہ کی بنی ہوئی ہوتی ہین اس سے

یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہمارا ملک ایک ایسا ملک ہے جو اپنے مصنوعات سے نہ اپنے باشندون کے لیے کافی سامان ارزانی کے ساتھ مہیا کر سکتا ہے نہ غیر ملکی اشیاء کا تبادلہ کرتا ہے۔ برعکس اسکے انگلستان ایسا ملک ہے جو اپنے باشندون سے گزر کر ہماری حاجات رفع کرتا ہے بلکہ آج تمام ہندوستان اس کا محتاج ہے علاوہ اسکے ہم براہتاً دیکھتے ہین کہ ہمارے مایحتاج جملہ اشیا از قسم پارچہ و آلات آہنی و چوبی سے صابون دیاسلائی۔ سوئی اور تلے گے تک یورپ ارزانی ولایت سے چلے آتے ہین اور ہمارے ملک سے سوائے اجناس خام کے کوئی چیز دستکاری کی نہین جاتی اور جاتی بھی ہے تو اس قدر کم کہ اس کا عدم و وجود برابر ہے۔ ہم یہان اصول علم پولیٹیکل اکانمی سے بحث کرنا نہین چاہتے لیکن جو کچھ اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے اب مین ناظرین کی توجہ اصل مطلب یعنی "دکن کن کن صنعتون کے لحاظ سے مشہور ہے انکے فروغ کا زمانہ کب تھا" کی طرف منعطف کرتا ہون۔

دکن کی گذشتہ اور موجودہ مصنوعات پر بحث کرتے وقت ضروری تھا کہ اسکی تجارت کا حال بھی لکھا جاتا لیکن بخوف طوالت مین اسکو قلم انداز کرتا ہون صرف اتنا بیان کرنا ضروری سمجھتا ہون کہ دکن مین پیٹھان[۱] (واقع رود گوداوری) اور تگر[۲] (دہارور) پہلی صدی عیسوی مین مشہور تجارتی منڈیان تھین۔

---

[۱] پٹن ضلع اورنگ آباد معروف بہ مونگی پٹن و مسقط الراس شالواہن بود کہ امروز ہم بسیاری بانی و بگرئی معروف و مشہور است ۱۲-

[۲] تگر نام دیوگیر دولت آباد است ۱۲-

دکن سے گاڑیون مین مال لدکر کوہ سمدرس سے ہوتا ہوا پیتھان جاتا تھا وہان سے دس دن مین نگرا پہنچتا تھا۔ پھر وہان سے دو تقسیمین ہوجاتی تھین۔ ایک طرف سے تو اجنٹہ کے گھاٹ سے ہندوستان کی جانب مال چلاجاتا تھا۔ دوسری جانب خلیج بنگال سے یورپ اور دوسرے ممالک کو روانہ ہوجاتا تھا۔

چودھوین صدی عیسوی مین یعنی بادشاہان بہمنیہ کے زمانہ مین انکے مشہور بندرگاہون دگو اور چول۔ بندر سے مال مصر و عربستان کو جاتا تھا۔ اور شاہی جہاز یورپ سے بھی مال لایا کرتے تھے دکن کی اشیاء برآمد اسوقت مندرجہ ذیل تھین۔

تیل۔ شکر۔ چانول۔ ادرک۔ روئی۔ کپڑا۔ ریشم۔ تاگہ۔ نیل۔ ہیرا۔ سنگ سلیمانی۔ موتی۔ معدنیات وغیرہ۔

دکن کی قدیم دستکاری یون تو دکن کی پرانی دستکاری کا حال ایلورا کے غار اور اجنٹہ کے نقش و نگار سے بخوبی معلوم ہوتا ہے لیکن علاوہ اسکے دکن مین سکیا منی یا بودھ کے زمانہ مین بھی کالنگا کی ململ مشہور تھین۔ اور مسولیا کی عمدہ ململ کا ذکر کتاب پیری پلس مین جو سنہ ۴۷ء مین تصنیف کی گئی ہے موجود ہے۔

تیرھوین صدی عیسوی مین مسلمان حملہ آورون نے دکن مین بہت سے کاریگرون کو آگرہ، دہلی، گجرات، احمد آباد سے بلا کر آباد کیا۔ اس کے بعد محمد تغلق نے چودھوین صدی عیسوی مین دولت آباد کے قریب بہت سی بستیان دستکارون کی بسائین۔ بادشاہان مغلیہ نے بھی بہت سے اہل حرفہ کو بسا کر نئی صنعتین ایجاد کین۔ دکن کے مصنوعات کی اعلیٰ درجہ کی ترقی کا زمانہ چودھوین صدی عیسوی سے آخر سترھوین صدی عیسوی تک یعنی بادشاہان بہمنیہ و ان کے بعد ریاست گولکنڈہ کے قیام تک سمجھنا چاہیئے۔ پس اسکے بعد ہی زوال کا زمانہ شروع ہوجاتا ہے۔

اب ہم ذیل مین اُن مصنوعات کو ترتیب وار بیان کرتے ہین جنکی وجہ سے دکن[1] مشہور تھا۔ ناظرین کو یہ خیال رہے کہ پہلے جو چیزین دکن مین بنتی تھین اب بھی بنتی ہین۔ صرف فرق اتنا ہے کہ پہلے کثرت سے تیار ہوتی تھین اور ان کی مانگ بھی اسی نسبت سے تھی۔ اب کس مپرسی کی حالت مین ہین۔

ہیرا تراشنا اور صاف کرنا دکن مین سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ کسطرح حیدرآباد سے ایک خاص قسم کی دستکاری نیست و نابود ہوگئی یعنی ہیرا تراشنا اور صاف کرنا سلطنت مغلیہ مین ریاست گولکنڈہ سے الحاق ہونے کے قبل تک اس ریاست کے مشرقی اور جنوبی اضلاع کی کانون مین بیش بہا پتھر ملا کرتے تھے اور حیدرآباد اور گولکنڈہ مین تراشنے اور صاف کرنے کے لیے لائے جاتے تھے۔ تمام فرنچ سیاحون نے ان مقامات کے ہیرے تراشنے والون کا ذکر کیا ہے۔ موسیو تھونیو ایک فرنچ سیاح جو سنہ ۱۶۶۶ء مین وارد گولکنڈہ ہوا اپنے سفرنامہ مین لکھتا ہے "قلعہ مین بادشاہ نے اچھے اچھے کاریگر آباد کیے ہین۔ ان کے لیے سرکاری مکانات بنوا دیے گئے ہین اور مکانون کا کرایہ نہین لیا جاتا۔ جوہریون کو بھی اس نے اپنے محلات مین رکھ چھوڑا ہے بیش بہا جواہرات کا کام انھین کے سپرد ہوتا ہے اور حکم دے رکھا ہے کہ وہ لوگ جو کام وہان کرین اس کا بھید کسی کو نہ بتائین ایسا نہو کہ اورنگ زیب کو یہ خبر ملجائے کہ شاہ گولکنڈہ کے یہان کاریگر ایسے ایسے قیمتی جواہرات کا کام کر رہے ہین اور وہ انھین اس سے طلب کرنے لگے۔ یہ قلعہ کے کاریگر بادشاہ کے تمام پتھرون کے بنانے مین لگے رہتے ہین اور گو وہ کثیر التعداد ہین۔ مگر دوسرا کام کرنے کے لیئے ان کو مشکل سے فرصت ملتی ہے۔ نیز زرون کو یہ لوگ تانبون کی کمان سے کاٹتے ہین۔ جب کاریگر کمان چلاتا ہے تو دوسرا شخص ایک نہایت رقیق محلل اس پر ڈالتا جاتا ہے یہ محلل جو سفید مرود کے سفوف کو پانی مین ملا کر بنایا جاتا ہے کاریگرون کے لیے

---

[1] دکن سے میری مراد صرف وہی ہے جو اس وقت ہمارے حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے زیر حکومت و فرمان ہے۔

بہت کچھ سہولت اور آسانی کا موجب ہی یہ سفید امرد وتپھر ون مین ملتا ہی اور اس سلطنت کے ایک خاص مقام پر ہوتا ہی۔ اُسے ملنگی زبان مین (کرونڈا) کہتے ہین۔ ایک کراون (دو روپیہ کلدار) کو آدھ سیر آتا ہی جب کاریگر اُسے کام مین لانا چاہتے ہین تو پیسکر سفوف بنالیتے ہین جب کسی ہیرے کو ریت کی کنکری یا کسی اور نقص کی وجہ سے تراشنا چاہتے ہین تو اس مقام پر جہان ان کو تراشنا ہوتا ہی ذرا سا نشان کردیتے ہین پھر ایک لکڑی لیتے ہین جس مین ایک سوراخ ہوتا ہی۔ ہیرے کو اس سوراخ پر رکھتے ہین اور لوہے کی ایک چھوٹی سی چھینی لیکر اس جگہ رکھتے ہین جہان چیرنے کا نشان بنا ہوا ہوتا ہی اور نہایت آہستہ آہستہ ٹھوکتے ہین اور اسطرح ہیرے کو تراش لیتے ہین۔"

لوہا | ممالک محروسہ سرکار عالی کے مشرقی اور متوسط اضلاع مین پایا جاتا ہی اور ورنگل۔ کنہ سمندر (کناسمدرم)، ونڈر وتی۔ کمار پلی۔ ایراپلی نرمل۔ گڈکول۔ ملیورم۔ راوتہ۔ جگتیال۔ ایل چل۔ رنگمپیٹھ۔ کنڈ ریورم کولور۔ انند گیری۔ لنگم پلی۔ نظام آباد۔ کلیانی وغیرہ مین گلایا جاتا تھا۔

فولاد | زمانہ قدیم مین ہندوستان کا فولاد مشہور تھا۔ عمدہ فولاد ممالک محروسہ مین کنا سندرم نرمل (ضلع نامدیڑ) کے قریب تیار ہوتا تھا ضلع الگنڈل ابراہیم پٹن۔ کوناپور جینلہ پیٹھ۔ گڈکول وغیرہ مین بھی فولادی چیزین تیار ہوتی تھین۔ لیکن کناسمندرم کے مقابلہ کا فولاد کہین نہین ہوتا تھا۔ ڈاکٹر واکر ابراہیم پٹن اور دوسرے دیہات علاقہ الگنڈل کے فولادی کارخانون کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہی کہ "جو فولاد ان دیہات مین بنایا جاتا ہی وہ کناسمندرم (کنہ سمندر) کے فولاد سے کم درجہ کا ہوتا ہی اور نصف قیمت بھی ملنی مشکل ہوتی ہی"۔ کناسمندرم جو زمانہ دراز سے فولاد کے لیے مشہور ہی۔ اب بھی وہان تھوڑا بہت کام چلتا ہی اور وہان سے دوسرے ملکون کو روانہ کردیا جاتا ہی۔ فولاد جاقو تلوار اور دوسرے ہتیارون کے بنانے مین کام آتا ہی پہلے اسکو مغل یا ایرانی کارخانون سے خریدتے تھے۔

ایک ایرانی نے ڈاکٹر والیس ماہر فن طبقات الارض سے جنھون نے کئی سال پیشتر فولادی بھٹیون کو دیکھا بیان کرتا تھا کہ ایران مین کئی بار امتحان کیا گیا لیکن کناسمندرم کے مقابلہ کا فولاد بنانے کی کوشش بیکار گئی۔

بیدری اشیاء | مشہور بیدری برتنون کی ایجاد ہندو راجگان بیدر کی طرف منسوب کی جاتی ہی۔ بیان کیا جاتا ہی کہ سب سے پہلے بیدر کے ایک ہندو راجہ نے ایک گلدان بت کے سامنے پھول وغیرہ رکھنے کے لیے بنوایا تھا۔ پھر اسکے جانشینون نے اس مین ترقی کی لیکن زمانہ حال مین جو شان و شوکت نظر آتی ہی وہ مسلمانون کی ایجاد ہی مسلمان فاتحین کی عادت تھی کہ جہان جاتے تھے وہان کے دستکارون ہی کی سرپرستی نہ کرتے تھے بلکہ دوسرے ممالک ہند اور مغربی ایشیا سے بھی مال منگوایا کرتے تھے

بیدری کام کی معمولی چیزین حسب ذیل ہوتی ہین۔

حقہ (اگر گڑی و فرشی)، پیکدان۔ پاندان۔ آفتابہ، صراحی، آبخورہ، رکابیان، ڈبیہ وغیرہ مسلمانون کی سلطنت برباد ہونے کی وجہ سے جس طرح ہندوستان کی دوسری مصنوعات کا زوال ہوا، اسی طرح اس کام کا بھی زوال ہوا۔ اس مین شک نہین کہ مشہور لوگون مثلاً ڈاکٹر ہین ڈاکٹر بیکر ڈاکٹر اسمتھ، مسٹر ہیملٹن۔ کپتان میو بالڈ وغیرہ نے اس کی طرف بہت توجہ کی لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا، دوسری وجہ زوال کی یہ ہی کہ ملک مین مانگ کم ہوگئی ہی کاریگر بہت غریب ہین۔ ان کے پاس سرمایہ اس قدر نہین ہی کہ قیمتی برتن تیار کرکے دوکان مین رکھین۔ تاہم اس گئی گذری حالت مین بھی ہر چیز فرمایش پر اب بھی تیار ہوجاتی ہی

تلوارین | کم درجہ کی تلوارون کے پھل حیدرآباد۔ گدوال، دنیز تو کولاپور وغیرہ مین تیار ہوتے ہین اب صرف حیدرآباد مین بنائے جاتے ہین جوہردار تلوارین ایران اور گجرات مین ہوتی ہین مگر ممالک محروسہ سرکار نظام کا مین جگدیپور ضلع کھمم مین بھی عمدہ تیار ہوتی ہین۔

تلوارون کے مفصلۂ ذیل اقسام ممالک محروسہ مین تیار ہوتے ہین

۱۔ جوہر دار۔ اس کی قیمت سب سے زیادہ ہوتی ہی اور کنا سمدرم کے فولاد سے تیار کی جاتی ہی۔

۲۔ سرہی۔ جگدیو پور مین تیار ہوتی ہی۔ اکثر راٹھور باندھتے ہین۔

۳۔ تیغہ۔ کم درجہ کے فولاد سے تیار ہوتا ہی۔

۴۔ اصیل۔ اس کی کئی قسمین ہین۔ صرف فرق اتنا ہی کہ بعض نسیدھی ہوتی ہین اور بعض خمدار۔ عام طور پر باندھی جاتی ہی۔ جگدیو پور مین تیار ہوتی ہی۔

۵۔ مصری۔ عمدہ فولاد سے تیار کیجاتی ہی معززین باندھتے ہین۔

۶۔ فرنگ۔ کم درجہ کے فولاد سے تیار ہوتی ہی۔ بہت چوڑی اور وزنی آتی ہی۔

۷۔ دھوپ۔ عمدہ فولاد سے تیار ہوتی ہی۔ شہر کے شرفا و معززین باندھتے ہین۔

۸۔ پٹہ۔ بہت پرانی وضع کی تلوار ہی۔ اب نہین بنائی جاتی شاذ و نادر نظر آتی ہی۔

۹۔ نواز خانی۔ یہ بھی پرانی وضع کی تلوار ہی۔ اب نہین بنائی جاتی۔

مذکورۂ بالا ہتیارون کے علاوہ مندرجہ ذیل ہتیار بھی ممالک محروسہ مین تیار ہوتے ہین۔

۱۰۔ جمبیہ۔ عمدہ تو عربستان مین بنتا ہی لیکن حیدرآباد مین بھی نرمل کے فولاد سے اچھا تیار کیا جاتا ہی۔ اس کی قیمت عـــہ سے عـــہ تک ہوتی ہی۔ عرب باندھتے ہین اور اس کو سونے اور چاندی سے مرصع کرتے ہین

۱۱۔ سکین۔ ایک قسم کا چاقو ہوتا ہی۔ اسکا پھل خمدار ہوتا ہی گدوال جگدیو پور حیدرآباد اور چند دیہات مین تیار ہوتا ہی۔

۱۲۔ کٹار۔ اکثر مہدوی پٹھان باندھتے ہین۔ گدوال اور ممالک محروسہ مین کئی جگہ تیار ہوتی تھی۔

۱۳۔ پیش قبض۔ اکثر روہیلے باندھتے ہین۔

۱۴۔ بانک۔ ایک قسم کا خنجر۔

۱۵۔ بچھو۔

۱۶۔ چھرا۔

۱۷۔ بلم۔

۱۸۔ خنجر۔

۱۹۔ سنانی۔

۲۰۔ صفدرہ۔

۲۱۔ قرولی

۲۲۔ سپر۔

۲۳۔ کرچ۔

۲۴۔ آتش گیر۔ (چمپٹہ) ممالک محروسہ مین ہر جگہ تیار ہوتا ہی عرب رکھتے ہین۔ سلحداری فوج کی تلوارین حیدرآباد کے ورکشاپ مین تیار ہوتی تھین۔ جب سے ورکشاپ بند ہوا اسوقت سے وہ تلوارین بننا بھی موقوف ہوگئین۔

بندوق دراز نالیون کی بندوقین جیسی کہ عربون کے پاس ہین گدوال اور چند دیہات مین بنائی جاتی تھین اب صرف حیدرآباد مین بنتی ہین۔

قرابین یعنی چھوٹی بندوق جسکا منہ بڑا ہوتا ہی۔ اکثر روہیلے رکھتے ہین اس کی دو قسمین ہین۔ شیر بچہ اور رفعت شکن۔ گدوال۔ اور نرمل وغیرہ مین ہوتی تھین۔

بارود بارود کا کارخانہ اب صرف حیدرآباد مین بمقام چندرائی گٹہ ہی۔ بارود عمدہ نہین ہوتی۔

کمربند تلوار لٹکانے کے کمربند حیدرآباد۔ گدوال۔ امرچنتہ ورنگل وغیرہ مین نہایت عمدہ بنائے جاتے ہین ان پر زردوزی کا کام کیا جاتا ہی بلکہ بعض امرا موتی۔ جواہر۔ بھی ٹانکتے ہین۔ معمولی قیمت عـــہ سے ۱ر تک ہوتی ہی۔

شطرنجیاں اور قالین زمانہ قدیم سے ورنگل کی شطرنجیاں مشہور ہیں دکن میں اس ایجاد کی حکایت اسطرح بیان کی جاتی ہے کہ مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ ایک سنی مسلمان شیخ تھا جس نے اس کام کو دکن میں شروع کیا۔

قالین تین قسم کے بنائے جاتے ہیں۔ ریشمی، سوتی، اونی۔

شطرنجی قالین مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں۔

۱۸۵۱ء میں انگلستان کی نمائش میں ریشمی قالین دکن سے بھیجے گئے تھے۔ ان کی قیمت ۱۲ پونڈ فی مربعہ گز تھی۔ ریشمی قالینوں کی معمولی قیمت ۱۲ روپیہ گز سے ۱۵ تک ہوتی ہے۔ اس وقت گلبرگہ کے محبس میں بھی شطرنجیاں اور قالین بنے جاتے ہیں

نرمل اور عالم پور میں شطرنجیاں بنی جاتی ہیں۔

کپڑا "کمخواب" کوئی ایسا زمانہ تھا کہ دکن میں اورنگ آباد کا کمخواب مشہور تھا پہلے یہ کثرت سے تیار ہوتا تھا اور نہایت گران بکتا تھا اور بہت پائدار ہوتا تھا۔

سنہ [illegible]ء میں ایک ایرانی سفیر شاہ گولکنڈہ سے ملنے کے لیے آیا اور اتفاق سے اسکو چھ سال تک دکن میں رہنا پڑا۔ واپسی کیوقت دکن کی مصنوعات بطور تحفہ لے چلا۔ ان میں ایک کمخواب کا تھان بھی تھا اسکی قیمت اسقدر تھی کہ اس قیمت سے پانچ سال تک کارخانہ کا کام چلتا رہا۔ پیٹھان میں بھی کمخواب بنتا تھا اب ممالک محروسہ میں صرف اورنگ آباد ہی ایک شہر باقی ہے جہاں چند کاریگر موجود ہیں تھوڑا بہت جو کچھ بناتے ہیں حیدرآباد بھیجدیتے ہیں۔

کمخواب کے تھان کا عرض ایک گز اور طول تین گز ہوتا ہے معمولی قیمت ۱۲ روپیہ سے ۵۰ روپیہ تک ہوتی ہے اور اعلےٰ درجہ کے کمخواب کے تھان کی قیمت ایک ہزار تک ہوتی ہے۔ مگر یہ فرمائش پر تیار ہوتا ہے مشجر، ہمرو، جامہ وار، زربفت، کلابتو، بادلہ، ریشمی کپڑے یہ چیزیں خاص اورنگ آباد میں تیار ہوتی ہیں،

"چھینٹ" حیدرآباد اور مچھلی بندر کی چھینٹ ایک زمانہ میں اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی اور اس تمام دنیا میں اسکی تجارت ہوتی تھی۔ یہ چھینٹیں نہایت پائدار اور خوشرنگ ہوتی تھیں اب اس کام کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

زریں کام کیے ہوئے پارچے رومال اور ریشمی ساڑیاں ناندیڑ و نارائن پیٹھ کی مشہور تھیں۔ اب بھی کچھ کام چلتا ہے۔

مندیل، سیلے، قوردار ململیں ناندیڑ کی مشہور ہیں۔ بہت عمدہ اور پائدار ہوتی ہیں۔

سوتی ساڑیاں، دھوتیاں۔ کھادی، لنگیاں۔ کمربند۔ رومال کمل، نمدہ، ٹاٹ ممالک محروسہ میں کئی جگہ مثلاً ناندیڑ، گدوال، جنتا گری ورنگل، اندور، گلبرگہ، نلدرگ، سنگاریڈی، عالمپور وغیرہ میں تیار ہوتے ہیں،

جاجم۔ پردے دسترخوان میدک کے مشہور ہیں۔

محبس گلبرگہ میں پردے کے کپڑے شکاری کپڑے۔ ڈیرے کے کپڑے بھی تیار ہوتے ہیں۔ تلنگانہ کی ململ اور دوسرے سوتی کپڑے زمانہ دراز سے مشہور ہیں۔ مارکوپولو جس نے بارھویں صدی میں ہندوستان کی سیاحت کی ہے۔ ورنگل کی مصنوعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس ریاست میں بکرم نہایت عمدہ بنتا ہے اور جو قیمتی ہوتا ہے وہ بہت صاف اور مہین مثل مکڑی کے جالے کے نظر آتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بادشاہ یا شہزادی ایسی نہیں ہے جو اسے پہن کر خوش نہ ہو۔

اس فقرہ پر کرنل یول نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ بکرم ایک خاص قسم کے سوتی کپڑے کو کہتے ہیں۔ مچھلی پٹن اور اسکے نواحی اضلاع دکن میں ململ اور رنگین چھینٹوں کے لیے مشہور تھے۔

رنگ نیل ہنمکنڈہ۔ الگندل۔ اور میدک میں تیار کیا جاتا تھا اب بہت سے اضلاع میں قدیم طریقہ نیل بنانے کا موقوف ہو گیا ہے نئے طریقہ سے بناتے ہیں۔ صرف تعلقہ کھمم میں قدیم طریقہ پر نیل بنتا ہے۔ اسوقت وہاں (۸۷) کارخانے نیل کے ہیں لیکن بہت چھوٹے چھوٹے

جمع کئے جاتے ہین - اس لیے عمدہ نہین بنتا - تاگا رنگنے کے لیے چند قسم کے رنگ مثلاً نارنجی گل انار - وغیرہ کسم کے پھول تینگ کی لکڑی اور جنگلی لکڑیون سے تیار کئے جاتے تھے - جو اس قدر پائدار ہوتے تھے کہ جس قدر اسکے رنگے ہوے کپڑے دھوئے جاتے تھے اُتنے ہی خوش رنگ اور چمکدار نکلتے تھے - اب انگریزی پاؤڈر کے رنگون نے ان قدیم رنگون کا خاتمہ کر دیا ہے - لیکن پُرانے وقتون کی جا نمازین شطرنجیان اور چھینٹین وغیرہ جن مین وہ رنگ سو برس پہلے کا اب تک دیکھا جاتا ہے اُس زمانہ کی یاد تازہ کرتی ہین -

تیل | تِل کھڑ - السی - کار ہلیا - ارنڈی وغیرہ کا تیل کولہون کے ذریعہ سے حیدرآباد اور ممالک محروسہ کے تقریباً ہر ضلع کے ہر بڑے گاؤن مین تیار ہوتا ہے - نئے طریقہ پر یعنی بذریعہ مِل کے تیل نکالنے کے کارخانے اکثر جگہ مثل اورنگ آباد و حیدرآباد فرخ نگر وغیرہ مین چند سال سے قائم ہوے ہین -

عطر | ہر قسم کا عطر خس، روسہ، حنہ، چنبیلی، صندل، اورنگ آباد و حیدرآباد مین تیار ہوتا ہے - مگر لکھنؤ و قنوج کا مقابلہ نہین کر سکتا - البتہ کیوڑا یہان کا ہر جگہ سے بہتر ہوتا ہے اور دلی، لکھنؤ قنوج کو یہان سے بھیجا جاتا ہے -

چرمی کام | حیدرآباد اور ممالک محروسہ سرکار عالی مین چمار ہر جگہ جوتے - ہارنس - زین بندوق کے غلاف وغیرہ تیار کرتے ہین - اچھور اور انارپیچ کے جوتے مشہور ہین - بہت ہی ملایم ہوتے ہین - بیڑ اور ناندیڑ کی چھاگلین مشہور ہین - حیدرآباد سکندرآباد اورنگ آباد وغیرہ مین بوٹ شوز وغیرہ کے کارخانے بھی ہین مگر کوئی کام قابل تعریف نہین ہوتا -

سونے کا کام | حیدرآباد اور ممالک محروسہ کے ہر ایک گاؤن مین سنار موجود ہین اور ہر قسم کے زیورات مثل پازیب توڑہ - پچھو - جھمکے کرن پھول - چاند بالیان وغیرہ تیار کرتے ہین -

چاندی کا کام | چاندی کا کام بھی ہر جگہ ہوتا ہے لیکن ایلگندل اورنگ آباد حیدرآباد کی تھالیان - عطر دان پاندان وغیرہ مشہور ہین - اورنگ آباد کا سومن کاری کا کام مشہور ہے اور نہایت نفیس ہوتا ہے چاندی کے تار کا کام کریم نگر مین بھی اچھا ہوتا ہے -

پیتل اور تانبے کا کام | پیتل اور تانبے کے گھڑے - تھالیان لوٹے رکابیان - کٹورے - دیگچیان - دیگین وغیرہ ہر جگہ تیار ہوتی ہین -

لوہے کا کام | ممالک محروسہ کے ہر ایک تعلقہ مین لوہار موجود ہین - مگر کوئی عمدہ کام نہین کرتے موٹے موٹے کام کرتے ہین - اپنی ضرورتون کو بقدر ضرورت پورا کر لیتے ہین - حیدرآباد مین چند سال سے بیرن یاقوت پولہ ایک آہنی کارخانہ قائم ہوا ہے - مگر کام سُستی سے چلتا ہے -

شراب | ممالک محروسہ مین مہوہ کی شراب ہر جگہ کثرت سے بنتی ہے -

گڑاکو | گڑاکو بھی ہر جگہ بنایا جاتا ہے تمباکو اور گڑ ملا کر بناتے ہین -

بھنگ | بھنگ بھی ہر جگہ بنائی جاتی ہے - گانجہ کو پیس کر اُبالتے ہین پھر اس مین گھی اور شکر ملاتے ہین،

گڑ شکر | گنّے کی پیداوار ممالک محروسہ مین کثرت سے ہوتی ہے اور بہ نسبت حصہ تلنگانہ کے مرہٹواری کے حصہ مین زیادہ ہوتی ہے اس لیے ہر جگہ گڑ اور شکر تیار کی جاتی ہے - بیدر کی شکر مشہور تھی اور اب زیادہ مشہور تھا حیدرآباد مین حسین شاہ ولی کی درگاہ کے قریب شکر بنتی ہے - درگاہ کی شکر کے نام سے مشہور ہے - دکن کی شکر صاف نہین ہوتی مگر میٹھی زیادہ ہوتی ہے -

نمک | ممالک محروسہ مین خصوصاً اورنگ آباد وغیرہ مین نمک بنایا جاتا ہے کئی سال سے سرکار انگریزی نے موقوف کر دیا اب صرف ضلع لنگسور مین نمک کی کان ہے - وہ بھی کڑوا ہونے کی وجہ سے کھانے کے قابل نہین ہوتا چمڑون کے لیے استعمال کیا جاتا ہے،

شورہ | ممالک محروسہ مین کئی جگہ شورہ تیار کیا جاتا ہے -

کاغذ | چند قسم کے دیسی کاغذ اندور - میدک حیدرآباد - گلبرگہ وغیرہ مین تیار کیے جاتے ہین - ان سب مین عمدہ کاغذ کاغذپورہ (دولت آباد کے قریب) ہوتا ہے -

لکڑی کا کام اندور، اورنگ آباد، ایلکندل، گلبرگہ، کھمم مین ہر قسم کی لکڑی کا کام ہوتا ہے۔ صندل کے صندوق، قلمدان، عطردان کھمم اور اورنگ آباد مین عمدہ بنتے ہین۔

پلنگ کے پائے بگین پلی مین نہایت عمدہ رنگ کے خصوصًا لاجوردی رنگ کے تیار کئے جاتے ہین۔

کانچ کا کام جالنہ، بکردان وغیرہ مین کانچ کی بوتلین اور گلاس وغیرہ تیار ہوتے ہین پہلے کام خوب چلتا تھا۔ اب بھی کاریگر موجود ہین لیکن کام بہت سُستی سے چلتا ہے ترقی کی امید نہین۔

مٹی کے برتن ممالک محروسہ سرکار عالی مین ہر قسم کے مٹی کے برتن مثل تھالی، لوٹہ، صراحی، آبخورہ، چلم وغیرہ تیار ہوتے ہین بھونگیر کے برتن زیادہ مشہور ہین۔ رنگین چلمین راچور مین عمدہ بنتی ہین۔ بچون کے کھلونے مثل سانپ، بچھو، کوا، بلی، تیتر، بٹیر وغیرہ اور پھل جیسے آم، شریفہ، بادام، پستہ وغیرہ جالنہ، اورنگ آباد، اندور مین عمدہ اور خوش رنگ بنائے جاتے ہین۔

ناظرین! آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ دکن کن کن صنعتون کے لحاظ سے مشہور ہے۔ ان صنعتون کے فروغ کا زمانہ کب تھا اب کونسی صنعتین دکن مین موجود ہین اور کمان کہان ہین اور کس حالت مین ہین۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جو انکے زوال کا باعث ہوے۔

مورخون نے مصنوعات دکن کے زوال کے کئی ایک اسباب لکھے ہین۔

(۱) اورنگ زیب کی خونخوار لڑائیان شاہان دکن کے ساتھ۔

(۲) مسلمانون کی سلطنت برباد ہونے کی وجہ سے جسطرح ہندوستان کی مصنوعات کا زوال ہوا اسی طرح دکن کی مصنوعات کا بھی ہوا۔

(۳) ملک مین مانگ کم ہو گئی۔ وجہ اسکی یہ ہوئی کہ یورپ سے اشیاء کثرت سے آنے لگین اور نہایت ارزان فروخت ہونا شروع ہوئین عام طور پر لوگ ان کو استعمال کرنے لگے۔

اب کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہین جن سے ان کو پھر فروغ ہو۔ یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے بڑے بڑے اہل الرائے اپنا اپنا زور صرف کر چکے ہین مگر نتیجہ کچھ نہوا۔

باشندگان ہندوستان و انگلستان کی توجہ مصنوعات دکن پر منعطف کرنیکے لئے گورنمنٹ نظام خلد اللہ ملکہ نے بہت کوششین کین۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء مین ورنگل کی مشہور شطرنجیان و قالین نمائش گاہ انگلستان مین روانہ کئے گئے اسکے بعد نومبر ۱۸۵۶ء مین سر سالار جنگ اول مرحوم نے حیدر آباد بمقام چادر گھاٹ ایک نمائش گاہ قائم کی جہان ممالک محروسہ سرکار نظام کی ہر ایک چیز جمع کی گئی لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہو سکا۔ اس مین شک نہین کہ اس وقت سے اب تک سرکار نظام تمام نمائشون مین خواہ ہند مین ہون یا یورپ مین برابر حصہ لیتی رہی ہے لیکن سوائے زوال کے ترقی کی کوئی صورت نظر نہین آتی اس کی وجہ کیا ہے۔

اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہین ہے کہ ہمارا تمدن درست نہین ہے۔

جب تک ہم خود اپنے تمدن کو درست نہ کرین اس وقت تک کچھ نہین ہو سکتا۔

سرکار ہمارے تمدن کو درست نہین کر سکتی ہے اس کا یہ کام نہین ہے کہ ہمارے خانگی انتظامات کی طرف متوجہ ہو اور ہم سے آثار بدتمیزی دور کرے سرکار کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے ہم کو حالت امن مین رکھا ہے اور ہماری تعلیم و تربیت مین لاکھون روپیہ صرف کرتی ہے اپنے فیض تربیت سے ہم کو اس قابل بنایا ہے کہ ہم تمدن کے معنی سمجھین اور اپنی حالت کو درست کرین یا یون کہو کہ سرکار نے ہمارے ہاتھ مین ایک شفاف آئینہ دیا ہے اور ہمین چاہیئے کہ اس مین اپنی صورت دیکھ کر اپنے چہرے کے عیوب سے واقف ہون اور ان کے ازالہ کی فکر کرین۔

ملک کا دولتمند ہونا اس پر موقوف نہین ہی کہ غیر ملکون سے روپیہ یا چاندی یا سونا اس مین لایا جاے بلکہ اسپر موقوف ہی کہ غیر ملکون سے وہ اشیاء معیشت لائی جائین جن کے پیدا کرنے کی انھین ملکون کو خصوصیت حاصل ہو اور اسکے عوض مین وہ چیزین بھجوائی جائین جن کو ہمارے ملک مین پیدا ہونے کی خصوصیت حاصل ہی۔

ہمین اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہماری ضرورت و آرام کی اشیا ہمارے ملک مین ارزانی کے ساتھ تیار ہونے لگین۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ اشیاء معیشت کو آسان و ارزان کرنے کی کیا تدبیر ہی۔

اس مسئلہ کا جاننا چند باتون کے جاننے پر موقوف ہی۔

محنت اور راس المال دولت پیدا کرنے کے لیے لازمی ہی۔

جو چیزین کہ محنت کرنے کی قابلیت کو زیادہ کرتی ہین وہ علم و ہنر ہین۔

تقسیم محنت سے پیدائش کی کسقدر آسانی ہوتی ہی۔

تقسیم راس المال یعنی کمپنی کے قائم کرنے سے کیا حاصل ہی۔

مختصر یہ کہ جب تک ہم اپنی بے خبری کو اپنے سے دور نہ کرین اور ان طریقون کو جو ملکی ترقی مین زیادہ موثر ہین اپنا نصب العین نہ بنائین اسوقت تک ممکن نہین کہ ہمارا ملک ترقی کر سکے۔ ہمین اپنے ملک کو دوسرے ملکون سے بے نیاز کرنے کے لیے ضروری ہی کہ ہم ان اصولون کی پیروی کرین۔ جو ہم کو غافل سے باخبر۔ کاہل سے چست مفلس سے دولتمند بنا سکتی ہین۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ملک جاپان سے سبق سیکھین تو روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے حوائج اپنے ملک مین تیار کر سکتے ہین۔

اے ملکی بھائیو ذرا غفلت سے بیدار ہو۔ بے خبری کو اپنے سے دور کرو۔ آنکھین کھولکر دنیا مین دیکھو کہ کیا ہو رہا ہی۔ ملک اور رعیت کیا چیز ہی ملک کی ترقی و تنزل کے کیا اسباب ہین؟ اور اس کا بھلا یا برا اثر ہم پر کیونکر پہنچتا ہی؟ اب ہم کو کونسی تدبیرین اختیار کرنی چاہئین؟ جبتک ہم اپنے ملک کی حالت پر سطح نظر نہ ڈالین گے اور اسکی اصلاح مین اپنی عزت و دولت و جان کو رہن نہ رکھین گے اسوقت تک ممکن نہین کہ ہمارا ملک ترقی کر سکے۔

اب مین اس مضمون کو بخوف طوالت ختم کرتا ہون فقط

حافظ سید ابراہیم (حیدرآبادی)

فہرست مضامین

نثر

نظم

فہرست مضامین

نثر

صفحہ

نظم

فہرست مضامین جلد سوم

نثر

نظم

فہرست مضامین جلد چہارم

نثر

نظم

فہرست تصاویر

فہرست مضامین جلد چہارم

نثر

نظم

فہرست تصاویر

فہرست مضامین جلد پنجم

نثر

نظم

فہرست تصاویر

فہرست مضامین جلد ششم

نثر

نظم

فہرست تصاویر

فہرست مضامین جلد ہفتم (۷)

(نثر)

(نظم)

Pyarelal Shakir's

AL-ASR

(1913-17)